حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی
کی
سیاسی ڈائری
اخبار و افکار کی روشنی میں
جلد چہارم
۱۹۴۶ء تا اختتام ۱۹۵۷ء
JAMIA HAMDARD
U111187
عطا فرمودہ
جانشین شیخ الاسلام حضرت مولانا سید ارشد مدنی مدظلہ العالی
تالیف و تدوین
ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری

شیخ العرب والعجم شیخ الاسلام حضرت مولانا

سیّد حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

کی

سیاسی ڈائری

اخبار وافکار کی روشنی میں

جلد چہارم

۱۹۴۶ء تا اختتام ۱۹۵۷ء

عطا فرمودہ

جانشین شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد ارشد مدنی مدظلہ العالی

(استاذ الحدیث دار العلوم دیوبند و صدر جمعیت علماء ہند)

تالیف وتدوین

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری

باہتمام: محمد ناصر خان

فرید بُک ڈپو (پرائیویٹ) لمٹیڈ

FARID BOOK DEPOT (Pvt.) Ltd.

New Delhi - 110002

حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی
سیاسی ڈائری

(جلد چہارم)

تالیف وتدوین .... ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری

باہتمام .... : محمد ناصر خان

صفحات 944

اشاعت 2018ء

Maulana Sayyad Hussain Ahmad Madani (R.A.) Ki
Siyasi Diary
Akhbâr wa Afkâr Ki Roshni Mein
(Vol. 4)

Compiled by : Dr. Abu Salman Shahjahanpuri
Edition : 2018
Pages : 944

ناشر

2158, M.P. Street, Pataudi House, Darya Ganj, New Delhi-2
Ph.: 011-23289786, 23289159 Fax: 011-23279998
E-mail: faridexport@gmail.com | Website: faridexport.com
Printed at : Farid Enterprises, Delhi-2

عرض ناشر

بحمد اللہ، ادارہ فرید بک ڈپو (پرائیویٹ لمیٹڈ) قرآن حکیم، احادیثِ مقدسہ، اسلامی تاریخ، فقہ، تبلیغی، اصلاحی، ادبی اور دیگر علوم وفنون پر اہم کتابوں کی طباعت واشاعت کے لیے پورے عالم اسلام میں مشہور ومقبول ہے۔ ادارہ کی اس نمایاں کامیابی میں اللہ رب العزت کی بے پایاں رحمت ونصرت اور بانی ادارہ خادم قرآن الحاج محمد فرید خاں مرحوم کا دینی وملی خلوص اور دعائیں شامل ہیں جنھوں نے قرآن مجید اور دینی لٹریچر کی اشاعت کو غیر منفعتی تبلیغی مشن کے طور پر جاری کیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ بانی ادارہ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ہم مسلسل آگے بڑھ رہے ہیں۔

ہندوستان کی تاریخِ آزادی علمائے دیوبند کے بے مثال جذبۂ حریت اور جہدِ مسلسل سے روشن ہے۔ حضرت مولانا امداد اللہ مہاجر مکی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمہم اللہ کے جانشین عظیم مجاہدِ آزادی شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی ذاتِ گرامی اسلامی ہند کی تاریخ کا درخشاں باب ہے۔ زیر نظر کتاب **''حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی سیاسی ڈائری: اخبار وافکار کی روشنی میں''** شیخ الاسلامؒ کی حیات، علمی، دینی وملی خدمات اور وطن کی آزادی میں عدیم المثال قیادت کی مستند و معتبر دستاویز ہے جسے نامور اسلامی دانشور حضرت مولانا ابوسلمان شاہجہانپوریؒ نے تالیف ومدون کیا ہے۔ '**سلسلۂ مقالاتِ سیاسیہ**' اسی سلسلے کے نہایت اہم مرقعے ہیں جو شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے تحریر کردہ نادر سیاسی مقالات کے مجموعے ہیں۔

ادارہ فرید بک ڈپو کو بجا طور پر فخر ہے کہ جمعیۃ علماء ہند کی سوسالہ تقریبات کے سلسلے میں اکابرینِ جمعیۃ علماء ہند کی یاد میں ان شاہکار کتابوں کو شائع کرنے کی سعادت ہمیں حاصل ہوئی ہے۔

اللہ جل شانہٗ کی بارگاہ میں دست بدعا ہوں کہ 'چراغ مدنی' اسی آب وتاب سے روشن رہے اور دارالعلوم دیوبند و جمعیۃ علماء ہند ملتِ اسلامیہ کی خدمت، حفاظت اور قیادت کی شاہراہ پر پیش رفت کرتے رہیں۔ آمین۔

خادم قرآن

(الحاج) **محمد ناصر خان**

اللّٰھُمَّ

صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ

کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ

اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

اللّٰھُمَّ

بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ

کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ

اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

پیش لفظ

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

"یہ مقدمہ جب لکھا گیا تو تقریباً دو سو کے قریب صفحات بن گئے تھے۔ اگرچہ اس میں کچھ دوسرے مباحث بھی تھے۔ لیکن سیاسی ڈائری جلد چہارم کے لیے جو ڈاکٹر صاحب نے تحریر فرمایا تھا اسے اس طویل تحریر سے لے لیا گیا۔ جس میں سیدی حضرت مولانا السید اسعد مدنی اعلی اللہ مقامہ (دائی سیاسی ڈائری) کی شفقتوں اور محبتوں کا ذکر ہے۔ اس لیے ہوسکتا ہے کہ کہیں کسی بحث میں تشنگی اور بعض جگہ بے ربط تعلق محسوس ہو۔ جو مقدمہ لکھا گیا تھا وہ عن قریب ان شاء اللہ الگ ایک مقالے کی صورت میں شایع کیا جائے گا۔ (شریفی)"

میں ۱۹۵۰ء میں پاکستان آیا تھا۔ ۱۹۶۲ء میں پہلی بار ایک پاکستانی کی حیثیت سے ہندوستان کا سفر اختیار کیا تھا۔ اس سفر کا مقصد عزیزوں سے ملنے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ یہ زمانہ میں نے لاڑکانہ، دادو، ان کے قصبات و دیہات اور نواب شاہ اور کراچی میں گزارا تھا۔ اس دوران کسی جگہ معاش و قیام کا کوئی معقول انتظام نہ ہوا تھا، لیکن کراچی پہنچ کر جلد ہی یہ فیصلہ کرلیا کہ اب یہی ہمارا دائمی مستقر ہوگا۔ اس دوران کئی جگہ کئی کئی سال قیام و سکونت کا اتفاق ہوا تھا لیکن کسی جگہ اجنبیت دور نہ ہو پائی تھی اور نہ وطن کی زندگی کا احساس اور لطف پیدا ہوسکا تھا۔ ہندوستان گیا تو اندازہ ہوا کہ جن گلی کوچوں میں کھیل کود کر بچپن گزارا تھا اب میرے لیے وہ بھی اجنبی بن چکے ہیں۔ ہر چیز بدلی ہوئی نظر آتی تھی۔ میں جہاں گیا زندگی کی گہما گہمی نظر آئی لیکن میرے دل کو سکون نہ ملا۔ میں بے چین تھا اور اجنبی بھی! ایک ماہ سے زیادہ قیام میرے لیے مشکل ہوگیا، کراچی واپس آیا تو میں اداس تھا۔

ہندوستان جانے سے پہلے میں نے پنجاب یونی ورسٹی سے ادیب فاضل (ہائی پروفیشنسی ان اردو) کا اور پھر میٹرک کا امتحان پاس کرلیا تھا۔ واپس آکر میں نے اپنی تعلیم پر توجہ دی اور جب ۱۹۸۸ء میں ہندوستان کا دوسرا سفر کیا تو میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل

کر چکا تھا۔ ایک کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر تھا اور چھوٹے سے سہی لیکن اپنے مکان میں رہتا تھا۔ تصنیف و تالیف کے شوق نے مجھے دو درجن سے زیادہ کتابوں کا مصنف بنا دیا تھا۔ میں کراچی کی ایک غریب بستی میں رہتا تھا، لیکن وہ بستی اور اس کے باسی میرے لیے اجنبی نہ تھے۔ میں نے اپنے لیے ایک دنیا تلاش کر لی تھی جو پاکستان سے ہندوستان تک پھیلی ہوئی تھی۔ میرے چاروں طرف ہزاروں واقف اور احباب و مخلص تھے اور میں اپنے تئیں ہرگز تنہا اور اجنبی محسوس نہ کرتا تھا۔ میں نے یہ دنیا بڑی مشکل سے تلاش کی تھی اور بڑی محنت سے اس میں اپنی جگہ بنائی تھی۔ اب میرے لیے یہ دنیا بہت پیاری تھی۔

۱۹۸۸ء میں میں نے ہندوستان کا دوسرا سفر کیا تھا۔ اس کا ایک پس منظر اور اس کی ایک طویل روداد ہے جو میں نے مرتب کر دی ہے، لیکن یہاں اس کے بیان کی گنجائش نہیں۔ صرف بات کو آگے بڑھانے کے لیے مختصراً بیان کیا جاتا ہے۔

۱۹۸۷ء کا آغاز تھا، محترم قاری رشید احمد صاحب نے بتایا کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے خلف الرشید و جانشین صادق حضرت مولانا سید اسعد مدنی صاحب کا فون آیا ہے، وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ چند دن میں کراچی تشریف لا رہے ہیں۔ پھر ایک روز قاری صاحب نے بتایا وہ آج شب کو کراچی پہنچیں گے اور جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن میں قیام فرمائیں گے۔ دوسرے روز صبح کو میں جامعہ میں پہنچ گیا اور حضرت مولانا سے ملاقات کی خوش وقتی حاصل کی۔ مولانا نے بہت محبت اور شفقت سے التفات فرمایا۔ کوئی دس پندرہ منٹ تک میرے ہی بارے میں اور میرے تحریر و تصنیف کے مشاغل کے بارے میں دریافت فرماتے رہے۔ قاری صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے انھیں بتایا کہ حضرت مولانا میرے تصنیف و تالیف اور ان کے موضوعات کے بارے میں گفتگو فرماتے رہے، ملاقات کا مقصد واضح نہیں ہوا۔ ہاں! یہ ضرور فرمایا کہ کبھی ہندوستان تشریف لائیے! قاری صاحب نے کہا وہ بھی معلوم ہو جائے گا، آپ ہندوستان ہو آئیے۔ ہندوستان جانے کا ارادہ بہت دنوں سے تھا، لیکن ۱۹۶۲ء کے بعد جا نہیں سکا تھا۔ غالباً اسی سال کے آخر یا ۱۹۸۸ء کے شروع میں حضرت مولانا کو پھر پاکستان کے سفر کا اتفاق ہوا۔ اس مرتبہ مولانا کی آمد کا سن کر میں نے خود حضرت سے ملاقات کا شرف حاصل کرنے کا عزم کیا۔ مولانا سے ملاقات ہوئی مولانا نہایت گرم جوشی سے ملے اور شفقت سے پیش

آئے۔ اس ملاقات میں بھی حضرت نے فرمایا آپ ہندوستان آئیے نا! بعد میں محترم قاری رشید احمد صاحب سے ذکر آیا تو انھوں نے فرمایا اب آپ ہندوستان ہو آئیے! اور میں نے پختہ عزم کرلیا۔ جولائی ۱۹۸۸ء میں میں ہندوستان پہنچ گیا۔ دہلی میں حضرت مولانا سے شرف ملاقات حاصل ہوا۔ حضرت نے بہت خوشی کا اظہار اور نہایت شفقت اور تواضع کا برتاؤ فرمایا۔ میں سب سے پہلے دارالعلوم دیوبند کو دیکھنا چاہتا تھا۔ حضرت نے جمعیت علمائے ہند کے ایک نوجوان جو دارالافتاء میں خدمات انجام دیتے تھے، کی معیت میں دیوبند بھیج دیا۔ دیوبند میں حضرت مولانا کے برادرِ خرد مولانا سید ارشد مدنی مدظلہٗ سے ملاقات ہوئی، بلکہ مجھے انھیں کا مہمان بننے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اسی ملاقات میں انھوں نے مجھے حضرت شیخ الاسلامؒ کی سیاسی ڈایری عنایت فرمائی، جس کا ذکر میں ڈایری کی جلد اوّل کے مقدمے میں کر چکا ہوں۔ دیوبند میں دو روز قیام کا اتفاق ہوا۔ مولانا ارشد مدنی صاحب بھی بہت محبت اور شفقت سے پیش آئے۔ میں نے دارالعلوم کو اندر باہر سے بہت اچھی طرح دیکھا۔ بزرگان دین خصوصاً حضرت شیخ الہندؒ اور شیخ الاسلامؒ کے مزارات پر حاضری دی اور فاتحہ پڑھی۔ دو روز کے بعد دہلی واپس ہوا اور دفتر جمعیت علما پہنچا ہی تھا، معلوم ہوا حضرت مولانا سید اسعد مدنی اپنی قیام گاہ پر انتظار فرما رہے ہیں۔ انھوں نے کچھ مہمانوں کو بلایا ہے اور ان سے میری ملاقات کرانی چاہتے ہیں۔ مولانا نے گاڑی بھیج دی تھی۔ چناں چہ اپنے خضرِ راہ نوجوان مفتی صاحب کے ساتھ مولانا کی کوٹھی پر پہنچا، لیکن میرے تاخیر سے پہنچنے کی وجہ سے بعض مہمان جا چکے، کچھ جا رہے تھے۔ مولانا نے میرا اُن سے تعارف کروایا کہ یہ پاکستانی اسکالر ہیں اور حضرت شیخ الاسلامؒ اور امام الہندؒ کے بہت معتقد ہیں۔ مہمانوں میں محترمہ نجمہ ہبت اللہ بھی تھیں۔ سب ہی نے خوشی کا اظہار فرمایا، خصوصاً نجمہ ہبت اللہ نے! لیکن یہ مجلس برخاست ہو چکی تھی اور کوئی بات نہیں ہو سکی۔ مجھے افسوس ہوا کہ تمام حضرات سے تعارف نہ ہو سکا۔

حضرت مولانا نے میرا پروگرام معلوم کیا۔ میں نے حضرت کو بتایا کہ دہلی سے باہر شاہ جہان پور، لکھنؤ، علی گڑھ اور آگرہ جانا چاہتا ہوں اور بقیہ دن دہلی کے اہل علم اور کتب خانوں وغیرہ سے استفادہ کرنے کا ارادہ ہے۔ دہلی میں مدرسۂ امینیہ اور جامعہ ملیہ اور تاریخی مقامات دیکھنا چاہتا ہوں۔ حضرت مولانا نے مفتی صاحب سے جو مجھے دیوبند لے کر گئے

تھے، مخاطب ہو کر فرمایا کہ آپ ابوسلمان صاحب کو یہ سفر کروا دیں، ان کے ساتھ رہیں اور ان کے کاموں میں مدد دیں۔ چناں چہ مفتی صاحب دہلی اور بیرون دہلی کے سفر میں میرے گائیڈ رہے اور آگرہ اور دہلی کے تمام تاریخی مقامات کی سیر کروائی اور میرے کاموں میں معاونت فرمائی۔ ان کی وجہ سے میرا سفر بہت آسان ہو گیا۔ شاہ جہان پور کے لیے میں نے خود ان سے کہہ دیا کہ میں خود چلا جاؤں گا۔ میرا دیکھا بھالا شہر ہے اور اپنے عزیزوں میں سے کسی کو ساتھ لے لوں گا۔ میرا سفر تقریباً تین ہفتے کا تھا۔ حضرت مولانا کی عنایت اور توجہ سے بہت آسان اور خوش گوار ہو گیا۔

اس سفر میں بہت سے تاریخی مقامات اور ادارے دیکھے۔ بیسیوں شخصیات سے ملاقاتیں ہوئیں، لیکن حاصل سفر دارالعلوم دیوبند، جامعہ ملیہ دہلی، مدرسۂ امینیہ، تاج محل، لال قلعہ، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی اور دیگر تاریخی مقامات کی سیر و مشاہدہ اور سب سے بڑھ کر حضرت مولانا کی سرپرستی، مولانا سید ارشد مدنی سے ملاقات اور مولانا سید اسجد مدنی سے دہلی کی صحبتیں تھیں جو ہمیشہ یاد رہیں گی۔ حضرت مولانا کی عنایت سے نہ صرف اسفار میں سہولتیں پیدا ہو گئیں تھیں بلکہ نہایت فخر اور مسرت اس بات کی تھیں کہ حضرت نے مجھے اور میری بیوی کے لیے سوٹ کے پارچہ جات عنایت فرمائے اور مولانا سید اسجد مدنی نے بچوں کے لیے مٹھائیاں وغیرہ اور اناس کا تحفہ عنایت فرما کر مشکور فرمایا تھا۔ خانوادہ حضرت شیخ الاسلام کی تواضعات اور عنایات کے لیے میں بہت ممنون ہوں اور سب سے بڑھ کر اس بات کا فخر حاصل ہوا کہ حضرت شیخ الاسلامؒ کی ڈائری کی تدوین کے لیے اعتماد فرمایا!

کراچی واپس آکر میں ڈائری کی تالیف و تدوین میں مصروف ہو گیا۔ میں اس ڈائری کو بہترین طریقے پر مرتب کرنا اور اسے نہایت مفید اور جامع بنانا چاہتا تھا۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا تھا کہ ہمارے بزرگوں نے مجھ پر جو اعتماد کیا ہے اس پر پورا اُترنے کی توفیق و سعادت حاصل ہو۔ کام کے دوران مشکلات بھی پیش آئیں۔ بیماری یا دیگر وجوہ سے تعطل بھی پیدا ہوا، لیکن اللہ کا ہزار ہا ہزار شکر ہے کہ ۲۰۰۰ء کے ختم ہوتے ہوتے چھ ہزار سے زیادہ صفحات کا مواد مرتب ہو چکا تھا۔ ۲۰۰۱ء کا آغاز ہی تھا کہ حضرت مولانا سید ارشد مدنی مدظلہٗ کے سفر پاکستان کے موقع پر یہ حضرت موصوف کے حوالے کر دیا۔

اب اس کا دوسرا مرحلہ کتابت، طباعت اور اشاعت کا شروع ہو رہا تھا۔ اس کی

اشاعت کا انتظام چوں کہ مجلس یادگار شیخ الاسلامؒ کے تحت ہونا تھا، جس کے صدر نشین حضرت مخدومی و مطاعی قاری شریف احمد صاحب دامت برکاتہم اور یہ خادم اس کا جنرل سکریٹری ہے اور انتظامات کی ذمے داری محترم قاری رشید احمد صاحب کی قرار پائی تھی، اس لیے یہ تمام ذخیرہ اسی وقت محترم قاری صاحب کے حوالے کردینے کی رسم بھی ادا ہوگئی۔ میں اس مرحلے میں بھی ذمے داریوں سے بری الذمہ نہیں ہوسکتا تھا۔

جولائی ۲۰۰۵ء میں مجھے ہندوستان کے تیسرے سفر کا اتفاق ہوا۔ یہ میرا علمی سفر تھا۔ ۱۶ر جولائی کو میں دہلی پہنچ گیا۔ معلوم ہوا کہ حضرت مولانا سید اسعد مدنی سفر میں ہیں۔ مولانا سید محمود مدنی جو جمعیت علمائے ہند کے سکریٹری جنرل ہیں، موجود تھے۔ پہلے انھی سے ملاقات ہوئی۔ یہ ان سے میری پہلی ملاقات تھی۔ مل کر طبیعت نہایت خوش ہوئی۔ نہایت مستعد اور ذہین نوجوان ہیں، جمعیت کے کاموں پر عبور اور ملک کی سیاسیات میں گہری نظر ہے۔ بااخلاق و بلند خیال ہیں، نہایت تواضع سے پیش آئے۔ قیام کے لیے مہمان خانے کا ایک کمرہ فوراً مخصوص کردیا۔ پروگرام پوچھا، میں نے تفصیل بتائی۔ کام کا سب سے بڑا میدان دہلی تھا۔ دیوبند، علی گڑھ، شاہ جہان پور، لکھنؤ، پٹنہ، کلکتہ، بھوپال، بمبئی کا ویزا تھا۔ شاہ جہان پور کا سفر عزیزوں سے ملاقات کے لیے تھا۔ اس کے علاوہ ہر جگہ کے اہل علم سے ملنا تھا اور لائبریریوں کو دیکھنا تھا۔ میں نے بتایا کہ سب سے پہلے تو حضرت مولانا سے ملاقات کا شرف حاصل کرنا تھا۔ مولانا محمود مدنی نے کہا حضرت مولانا چند دن میں تشریف لے آئیں گے۔ آپ جب تک دیوبند ہو آئیے۔ میں نے طے کرلیا کہ حضرت اسعد الملتؒ کے تشریف لانے تک دہلی ہی ٹھہروں گا۔ چناں چہ اگلے روز مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہٗ کی خدمت میں حاضر ہوا، ایک روز مدرسۂ امینیہ دیکھنے گیا، ایک روز آزاد بھون میں آئی سی سی آر کے دفتر گیا، اس کے ڈائریکٹر سے ملاقات کی اور اسی روز مکتبۂ جامعہ (ہیڈ آفس) کے ناظم و ایڈیٹر ''کتاب نما'' شاہد علی خاں سے ملاقات کی خوش وقتی میسر آئی۔ بڑی محبت سے ملے اور فوراً ہی میرے بارے میں کتاب نما کا خصوصی نمبر نکالنے کا فیصلہ کرلیا۔ اسی دوران حضرت مخدومی مولانا ارشد مدنی مدظلہٗ سے شرف نیاز حاصل ہوا۔ نہایت شفقت و محبت سے پیش آئے اور تواضع فرمائی۔ اس وقت تک حضرت شیخ الاسلامؒ کی سیاسی ڈائری کی چار جلدیں شایع ہوچکی تھیں۔ اس پر اپنی مسرت کا اظہار فرمایا۔ میں اللہ کا شکر گذار تھا کہ

۱۹۸۸ء میں جو ذمے داری قبول کی تھی اس سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق عطا ہوئی۔ ابھی تین یا چار روز ہی گزرے تھے اسعد الملت امیر الہند حضرت مولانا سید اسعد مدنی سفر سے تشریف لے آئے۔ انھیں سفر کے دوران ہی میرے دہلی پہنچنے کی اطلاع مل گئی تھی۔ فجر کی نماز کے لیے کمرے سے نکلا تو معلوم ہوا کہ حضرت تشریف لے آئے ہیں۔ نماز کے بعد سرسری ملاقات ہوئی۔ سلام دعا اور مزاج پرسی سے زیادہ موقع نہ ملا۔ مشتاقان دید کا ہجوم تھا۔ ناشتے پر یاد فرمایا۔ اپنے سامنے بٹھایا اور دستر خوان کی ہر چیز کی طرف توجہ دلائی اور اپنے دست مبارک سے عطا فرمائی۔ ناشتے سے فارغ ہو کر دیر تک احوال و عزائم دریافت فرمائے۔ میں نے عرض کیا: مقصود تو دہلی میں حاصل ہو گیا لیکن سفر کافی طویل ہے۔ میں نے غرض و مقامات سفر کی تفصیل بتلائی۔ حضرت نے خوشی کا اظہار فرمایا۔ تھوڑی دیر میں میں نے محسوس کیا کہ حضرت کی دید اور شرف ملاقات کے لیے کئی ارادت مند اور اصحاب اغراض جمع ہو گئے ہیں۔ مناسب نہیں سمجھا کہ ان کے شوق و مقاصد میں دیوار بنا رہوں، اس لیے اجازت لے کر اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ گزشتہ شام کو ایک صاحب سے جو دفتر، مطبخ اور دیگر ضروریات کی مارکیٹنگ کے لیے جاتے تھے، میں نے کہا تھا کہ ادویہ اور ضرورت کی چند چیزیں مجھے لا دیجیے گا۔ تھوڑی دیر میں وہ صاحب تشریف لے آئے۔ میں نے اشیائے ضرورت کا پرچہ اور کچھ رقم دے دی۔ وہ چلے گئے۔

اس روز میرا پروگرام مولانا آزادؒ لائبریری (آزاد بھون) جانے اور پھر جامعہ ملیہ جانے کا تھا۔ میں نے استقبالیہ میں کہا کہ کسی صاحب کو میرے ساتھ کر دیجیے۔ آزاد بھون کی لائبریری میں کچھ کتابیں پہنچانی ہیں۔ فوراً انتظام ہو گیا اور میں ان کے ساتھ کتابیں لے کر روانہ ہو گیا۔ آزاد بھون چوں کہ دفتر جمعیت علما سے قریب ہے، اس لیے رکشا وغیرہ کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ دس منٹ کے اندر وہاں پہنچ گیا، لیکن ڈایریکٹر صاحب موجود نہیں تھے، اس لیے کتابوں کا بنڈل ان کے دفتر میں دیا اور باہر نکل آیا۔ میں نے اپنے ساتھی سے کہا اب جامعہ ملیہ کے لیے مجھے رکشا کرا دیجیے اور آپ دفتر جائیے۔ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ مجھے رکشے میں بٹھایا اور خود دفتر چلے گئے۔

آج مجھے ڈاکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ کے ڈایریکٹر اور ''اسلام اور عصر جدید'' کے ایڈیٹر پروفیسر اختر الواسع اور ''جامعہ'' کے ایڈیٹر پروفیسر شمیم حنفی صاحبان سے ملاقات کرنی

تھی، لیکن میں پہلے شاہد علی خاں سے ملا اور ان سے غرض بیان کی۔ شاہد صاحب نے کہا میں نے انھیں آپ کی آمد کا بتایا تھا، وہ خود بھی آپ سے ملاقات کے متمنی ہیں۔ ان کا انسٹی ٹیوٹ قریب ہی ہے، وہ بارہ ساڑھے بارہ بجے تک کلاسوں سے فارغ ہو کر آ جاتے ہیں، ابھی تھوڑی دیر میں ان کے پاس چلتے ہیں۔ شاہد صاحب کے ساتھ کچھ وقت گزار کر ان کے دفتر گئے۔ وہ اس وقت تک آئے نہیں تھے، لیکن دس پندرہ منٹ سے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا کہ محترم اختر الواسع صاحب تشریف لے آئے۔ فوراً چائے منگوائی اس کے ساتھ لوازم بھی تھے۔ ابھی چائے پی رہے تھے کہ ایک صاحب سنجیدہ و سادہ وضع میں آہستہ سے کمرے میں داخل ہوئے۔ معلوم ہوا کہ یہ پروفیسر شمیم حنفی صاحب ہیں۔ انڈیا ونس فریڈم کے مکمل ایڈیشن کا اردو ترجمہ (۱۹۸۹ء) انھی نے کیا ہے۔ سلام دعا کے بعد چائے نوشی میں شریک ہو گئے۔ سوا ڈیڑھ گھنٹے کی نشست رہی۔ ان حضرات نے میرے احوال پوچھے۔ میں نے ان حضرات کے بارے میں کچھ "اسلام اور عصر جدید" رسالہ "جامعہ" اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بارے میں اپنی معلومات میں اضافہ کیا۔ معلوم ہوا کہ میرے اعزاز میں یا ملاقات کی خوشی میں تعارف کی ایک مجلس آراستہ کرنا چاہتے ہیں۔ میری مرضی اور اجازت چاہی۔ میں نے کہا مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن ایک ہفتے بعد کسی دن کا پروگرام بنا لیجیے۔ اختر الواسع صاحب نے کہا اس سے پہلے کیوں نہیں؟ میں نے کہا میرا ارادہ کل علی گڑھ جانے کا ہے۔ واپس آ جاؤں تو مناسب ہوگا۔

ان حضرات سے ملاقات بہت اچھی رہی۔ اختر الواسع کی گفتگو میں جوش و ولولہ تھا۔ شمیم حنفی صاحب کی گفتگو میں ایک خاص درجے کی سنجیدگی تھی اور سوا ڈیڑھ گھنٹے کی ملاقات میں اس کے درجے میں کوئی فرق نہ پڑا، لیکن بے دلی اور بے کیفی ہرگز نہ تھی۔ دونوں حضرات سے مل کر خوشی ہوئی۔ اجازت لے کر باہر نکلے۔ شاہد علی خاں اپنے دفتر چلے گئے اور میں جمعیت علمائے ہند کے دفتر آ گیا۔ عصر کی نماز کے بعد حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کئی مہمان موجود تھے۔ زیادہ ٹھہرنا مناسب نہ معلوم ہوا، چائے پی کر اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ اسی وقت ایک صاحب نے علی گڑھ کا ٹکٹ لا کر دیا۔ اور ٹرین کی روانگی کا وقت بتایا۔ بعد کے وقت میں صبح تک کوئی خاص بات ظہور میں نہیں آئی۔ اگلی صبح کو ناشتے پر حضرت مولانا نے یاد فرمایا۔ ناشتے کے بعد حضرت نے فرمایا آج آپ علی گڑھ جا رہے

ہیں، واپسی کب تک ہوگی؟ عرض کیا بعض حضرات سے ملاقاتوں میں اور یونی ورسٹی کی اور بعض ذاتی لائبریریوں سے استفادے میں تین چار دن تو یقیناً لگ جائیں گے۔ حضرت نے فرمایا چند دن کے لیے میں بھی باہر جاؤں گا۔ حضرت نے ازراہ شفقت ایک صاحب سے فرمایا ابوسلمان صاحب کو اسٹیشن پہنچانا اور گاڑی میں سوار کرا کے واپس آنا۔

اگلے روز میں علی گڑھ گیا، جہاں میں ڈاکٹر ریاض الرحمٰن خان شروانی کا مہمان تھا، لیکن قیام کا انتظام انھوں نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے نئے گیسٹ ہاؤس میں کیا۔ یہ انتظام شروانی صاحب نے میری سہولت کے پیش نظر کیا تھا۔ یہاں رہ کر میں یونی ورسٹی کی لائبریری سے جسے مولانا ابوالکلام آزادؒ کے نام سے منسوب کر دیا گیا ہے، زیادہ سہولت سے اور زیادہ دیر تک استفادہ کر سکتا تھا۔ یونی ورسٹی کے اساتذہ سے ملاقات میں زیادہ آسانی تھی، یہاں مقامی و بیرونی اہل علم ونظر کی آمد ورفت کا ایک سلسلہ ہمیشہ قایم رہتا ہے، ان کی صحبتوں سے استفادے میں بھی آسانی میسر آتی۔ یہ سہولتیں واقعی مجھے میسر آئیں۔ اس کے علاوہ شروانی صاحب روزانہ کار لے کر تشریف لاتے اور یونی ورسٹی سے باہر شہر میں جن حضرات سے مجھے ملنا ہوتا یا وہ ملوانا چاہتے مجھے لے جا کر ملوا لاتے۔ چناں چہ نواب رحمت اللہ خاں شروانی سے ایک ہفتے کے قیام کے دوران کئی بار مزمل منزل جا کر شرف نیاز حاصل کیا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین، ڈاکٹر حبیب الرحمٰن چغانی صاحب یونی ورسٹی میں تشریف لائے اور ان کے گھر جا کر بھی ان کی دعوتوں میں شریک ہو کر لطف اندوز ہوا۔ ایک مرتبہ محترم ریاض الرحمٰن شروانی کے ساتھ محترم ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب کے یہاں جا کر ملاقات کی سعادت حاصل کی۔ محترم ضیاء الدین اصلاحی صاحب ناظم دارالمصنفین اعظم گڑھ و ایڈیٹر معارف سے بھی علی گڑھ میں ملاقات کی خوش وقتی حاصل ہوئی۔ یہاں یونی ورسٹی کے مختلف شعبہ جات اسلامیات، عربی کے اساتذۂ گرامی اور سرسید اکیڈمی کے سکریٹری محترم اصغر عباس صاحب کی ملاقات سے لطف اندوز ہوا۔ یہیں محترم مہر الٰہی ندیم صاحب کی ملاقات سے لطف اندوز ہوا۔ علی گڑھ میں پورا ایک ہفتہ قیام رہا۔ آخری روز محترم شروانی صاحب نے اس ناچیز کے تعارف کے لیے علی گڑھ اور یونی ورسٹی کے اصحاب ذوق ونظر کی دعوت کا اہتمام کر لیا۔ یہ انتظام بھی گیسٹ ہاؤس ہی میں تھا۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد اور نواب رحمت اللہ خاں شروانی جیسے بزرگ شریک ہوئے۔ میں ان دونوں بزرگوں کے دولت کدوں پر

جا کر نیاز حاصل کر آیا تھا۔ انھوں نے اس نیاز مند کی عزت افزائی کے لیے زحمت اٹھائی تھی۔ ان کا مقام اس سے بہت بلند تھا، لیکن ان بزرگوں کے اخلاق و الطاف کریمانہ کو کیا کہیے! بزرگوں کے خصایص علیا کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ اپنے خردوں اور طالب علموں کی ازراہِ شفقت، ہمت و عزت افزائی سے دریغ نہیں فرماتے۔ محترمہ ڈاکٹر عابدہ سمیع صاحبہ نے بھی زحمت اٹھائی تھی۔ یہ خاتون مولانا مجید حسن پروپرائٹر مدینہ بجنور کی نواسی ہیں اور یونی ورسٹی کے شعبۂ سیاسیات سے تعلق ہے۔ ان کی تالیفات "ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ" اور "قومی محاذ آزادی اور یوپی کے مسلمان" سے میں استفادہ کر چکا تھا اور جب محترم ڈاکٹر شروانی کے ساتھ ان کے دولت کدے پر ملاقات کے گیا تھا تو اخبار جمہور (کلکتہ) کے اداریوں کا انتخاب خود انھوں نے اپنے دستخط کے ساتھ تحفہ عنایت فرمایا تھا۔

گیسٹ ہاؤس میں قیام کے دوران عطا خورشید صاحب اپنی اہلیہ شائستہ خاں سلمہا کے ساتھ ملاقات کے لیے آئے۔ خورشید صاحب نے مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک انڈکس نہایت جامع مرتب کیا ہے۔ ان کی اہلیہ محترم ڈاکٹر عابد رضا بیدار کی بیٹی ہیں اور مجھے بیٹی ہی کی طرح عزیز ہیں۔ دونوں سے مل کر طبیعت خوش ہوئی۔ لائبریری میں ان سے کئی بار ملاقات ہو چکی تھی۔ لائبریری کے انچارج شکیل احمد خاں صاحب سے بھی کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ بہت اخلاق سے ملے، چاے سے تواضع کی، لائبریری سے استفادے میں رہنمائی کی اور کئی مطلوبہ تحریرات کے زیروکس بنوا دیے۔

معلوم ہوا کہ محترم ڈاکٹر شروانی صاحب اہل علم کو مدعو کر رہے ہیں تو مجھے خیال ہوا کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے رسماً اظہار خیال کرنا پڑ جائے۔ میں یہ سوچ کر خوف زدہ ہو گیا۔ میں جن بزرگوں کا نیاز مند ہوں ان کی مجلس میں مجھے گفتگو کرنے میں تکلف ہوتا ہے۔ عشایے کے منتخب مدعوین کی موجودگی میں کیوں کر کچھ عرض کر سکوں گا؟ لیکن سر پر آپڑی ہے تو کچھ کہنا تو پڑے ہی گا! یہ سوچ کر میں نے پچھلی شب ہی کوٹوٹے پھوٹے لفظوں میں ایک مختصر تحریر مرتب کر لی تھی۔ اس کے بعد ایک حد تک دل مطمئن ہو گیا تھا، لیکن اللہ کا شکر ادا کیا، اس آزمایش کا موقع نہیں آیا۔ بہت سے لوگ تشریف لائے، الگ الگ گفتگو ہوئی لیکن مجلس سے خطاب کرنے کا موقع نہیں آیا۔ دوسرے روز میں واپس دہلی آ گیا تھا۔ دہلی آنے کے

بعد میں نے مذکورہ تحریر ڈاکٹر شروانی صاحب کو بھیج دی اور لکھ دیا کہ یہ اس موقع کے لیے لکھ لی تھی۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس تحریر کے ایک حصے کو "کانفرنس گزٹ، (علی گڑھ) کے شمارۂ ستمبر (۲۰۰۵ء) میں شایع کر دیا۔ تحریر کا جو حصہ ڈاکٹر صاحب نے حذف کر دیا تھا وہ درحقیقت آں موصوف ہی سے تعلق خاطر اور آں موصوف ہی کی شفقت اور عنایات کے تذکرے میں تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے میری پہلی کتاب "امام الہند (تعمیر افکار)" کے وقت ۱۹۶۲ء سے ہمیشہ میری رہنمائی فرمائی اور ہمت افزائی کی۔ میرے اور میرے کام کے بارے میں کسی اخبار، رسالے میں سب سے پہلی تحریر جامعہ دہلی میں انھی کے قلم سے یادگار ہے۔ یہ تحریر امام الہند پر تبصرے کی شکل میں ہے۔ اس میں تنقید بھی ہے تصحیح بھی ہے اور تحسین بھی ہے۔ ڈاکٹر صاحب میرے لیے مثل استاد کے ہیں۔ مذکورہ تحریر کے آغاز میں میں نے آں موصوف کی شفقت اور رہنمائی اور اسی دعوت کے اہتمام کے بارے سے خردنوازی اور محبت کا شکریہ ادا کیا تھا۔ اب جب کہ وہ اپنے ہی زیر ادارت کانفرنس گزٹ میں چھاپ رہے تھے تو اس تذکرے کی اشاعت مناسب نہیں سمجھی۔ اس عشائیے کا اہتمام ۲۴ رجولائی ۲۰۰۵ء کی شام کو کیا گیا تھا۔

دہلی واپس پہنچ کر میں نے شاہد علی خاں صاحب ناظم مکتبۂ جامعہ کو بتادیا کہ اب پروفیسر اختر الواسع صاحب کو بتادیں کہ وہ اپنی تقریب کے لیے کوئی تاریخ مقرر کر لیں۔ چناں چہ ۸راگست تاریخ مقرر کر لی گئی۔ تقریب کا اہتمام جامعۂ ملیہ کی ایک عمارت میں کیا گیا تھا۔ اچھی خاصی تعداد میں لوگ جمع ہو گئے تھے۔ بیشتر جامعہ کے اساتذہ تھے، کچھ باہر کے حضرات تھے۔ اخبارات کے نمایندے بھی تھے۔ تقریب کے صدر محترم ڈاکٹر مشیر الحسن شیخ الجامعہ تھے۔ شرکائے تقریب میں چند ہی حضرات سے واقف تھا۔ محترم پروفیسر سید شاہد مہدی صاحب سابق شیخ الجامعہ سے نیاز حاصل ہوا۔ تقریب کے آغاز سے پہلے میں نے انھیں کے پہلو میں جگہ پائی۔ موصوف بہت محبت اور شفقت سے پیش آئے۔ تقریب شروع ہوئی تو اسٹیج پر مجھے آں موصوف کا قرب حاصل رہا۔ یہ ان کے قرب کا نتیجہ تھا کہ گھبراہٹ میں کمی ہو گئی۔ میرے اعزاز میں اس تقریب کا اہتمام ڈاکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ نے کیا تھا۔ محترم مشیر الحسن صاحب ٹھیک وقت پر پہنچ گئے اور فوراً ہی تقریب کا آغاز کر دیا گیا۔ تقریب میں جو امور انجام دیے گئے وہ کچھ اس طرح تھے۔ میں جامعہ کی لائبریری کے

لیے پچاس کے قریب اپنی تالیفات لے گیا تھا وہ میں نے محترم شیخ الجامعہ کی خدمت میں پیش کیں۔ مجھے وہیں کسی نے بتایا تھا کہ شیخ الجامعہ نے لائبریری سے معلوم کیا تھا کہ لائبریری میں میری کتنی تالیفات و ترتیبات ہیں؟ نتیجہ یہ سامنے آیا کہ کسی ایک مصنف کی سب سے زیادہ تصنیفات و تالیفات میری ہی ہیں۔ بالفرض اگر ایسا نہ بھی ہو تو اب جو کتابیں پیش کی تھیں ان کی شمولیت کے بعد تو یہ بات ضرور حقیقت بن گئی ہوگی۔ شاید اسی امتیاز کی بنا پر جامعہ کی لائبریری کی طرف سے مجھے شیلڈ پیش کی گئی تھی۔ محترم شیخ الجامعہ نے اپنے نیاز مند اور اس کے تصنیف و تالیف کے کاموں کے بارے میں جو کلمات تحسین پیش کیے انھیں سن کر شرم سار ہوا۔ محترم پروفیسر اختر الواسع صاحب نے سپاس نامہ پیش کیا۔ اس میں بھی محبت و عقیدت کا بہ درجۂ مبالغہ اظہار کیا گیا تھا۔ سپاس نامہ سن کر بھی شرمندہ ہی ہوا۔ اس موقع کے لیے میں نے بھی ایک تحریر مرتب کر لی تھی، جس میں ان حضرات کی محبت کے شکریے کے سوا اور کوئی خاص بات نہ تھی۔ اس دوران چوں کہ شیخ الجامعہ صاحب معذرت کر کے تقریب سے چلے گئے تھے اور سابق شیخ الجامعہ پروفیسر سید شاہد مہدی صاحب کو اپنا قایم مقام بنا گئے تھے، اس لیے آخر میں ان کا تبصرہ تھا۔ آں موصوف نے بھی اپنے اس نیاز کی تعریف، اس کے کاموں اور اس سے بڑھ کر موضوعات کی ندرت اور پاکستان میں علمی خدمات انجام دینے کی تحسین فرمائی۔ جلسے کے اختتام پر ریفریشمنٹ کا انتظام تھا۔ شرکا اس سے لطف اندوز ہوئے۔

اسی زمانے میں جامعۂ ملیہ کے اکیڈمک اسٹاف کالج کے زیر اہتمام ہندوستان کے دس صوبوں سے اردو کے اساتذہ کا ایک ریفریشر کورس ہو رہا تھا۔ تین ہفتے کی تعلیم و تربیت کے بعد تقسیم اسناد کا جلسہ منعقد ہونے والا تھا۔ اس کے ڈائریکٹر پروفیسر محمد اختر صدیقی صاحب نے اس جلسے میں مہمان خصوصی بنا کر عزت افزائی فرمائی۔ اس میں بھی جامعہ کے مختلف شعبوں کے اساتذہ وغیرہ شریک تھے۔ اس جلسے میں بھی محترم پروفیسر اختر الواسع صاحب نے اور محترم ڈاکٹر خالد محمود صاحب ریڈر شعبہ اردو جامعہ ملیہ نے جو ریفریشر کورس کے کوآرڈی نیٹر بھی تھے، خاک سار کا تعارف کرایا۔ اکیڈمک اسٹاف کالج کے ڈائریکٹر صاحب نے بھی کلمات تحسین کہہ کر عزت افزائی فرمائی اور خاک سار کے ہاتھ سے تربیت پانے والے اساتذہ کو اسناد دلوائیں۔ اس جلسے کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ شاہد علی خاں

نے میرے تعارف میں ''کتاب نما'' کا جو خصوصی شمارہ شایع کیا تھا، اس کی رسمِ اجرا بھی اسی جلسے میں کرادی۔ اس تقریب کے لیے بھی میں نے ایک مختصر تحریر مرتب کرلی تھی جو پروفیسر محمد اختر صدیقی صاحب کے کلماتِ سپاس کے جواب میں پیش کردی۔ محترم صدیقی صاحب کا میں نے جلسہ ختم ہونے کے بعد بھی بہ طور خاص شکریہ ادا کیا۔ میں نے اس موقع پر پروفیسر محمد اختر صدیقی کے استقبالیہ اور متعارف کنندگان کے جواب میں جو مختصر تحریر پڑھی تھی وہ کتاب نما کے شمارۂ ستمبر میں شایع ہوگئی۔

اس سفر میں محترم شاہد علی خاں نے بہت عنایت فرمائی اور بڑی محبت کا ثبوت دیا۔ دونوں تقریبوں سے ان کا خاص تعلق تھا۔ کتاب نما کا خصوصی نمبر نکالنے میں انھی کی دل چسپی اور مستعدی کو دخل تھا۔ اکیڈمک اسٹاف کالج کے جلسۂ تقسیم اسناد کو ''کتاب نما'' کی خصوصی اشاعت کی تقریب اجرا بنا دینا بھی انھی کی ذہانت کا کرشمہ تھا۔ ''کتاب نما'' کے ستمبر کے شمارے میں استقبالیہ جلسے کا سپاس نامہ اور میرا جوابی خطبہ مع تصاویر کے نمایاں طور پر شایع کیا۔ یہ محض رسمی کارروائی نہ تھی، شاہد صاحب کی خاص توجہ کی کارفرمائی تھی۔ میں ان کا خاص طور پر شکرگزار ہوا۔

جامعۂ ملیہ میں خاک سار کی جو پذیرائی ہوئی تھی، اخبارات میں اس کا تذکرہ ہوا۔ تصویریں خاص طور پر چھپی تھیں، روداد میں تفصیل تھی۔ دہلی کے دو اخبار ''سہارا'' اور ''قومی زبان'' میری نظر سے گزر رہے تھے، دونوں میں تصویروں سے مزین رودادیں نمایاں طور پر شایع ہوئی تھیں۔ یہ اخبار جمعیت علماے ہند کے دفتر میں آتے تھے۔ مخدومی حضرت مولانا سید اسعد مدنی کی نظر سے گزر چکے تھے، میں خدمت میں حاضر ہوا تو خوشی کا اظہار فرمایا۔ میرے سامنے ہی صاحب زادہ مولانا سید محمود مدنی سلمہٗ کو یاد فرمایا، وہ تشریف لائے تو دریافت کیا: اخبار دیکھ رہے ہو؟ جی! دیکھ رہا ہوں۔ ابوسلمان صاحب کے بارے میں بھی کچھ دیکھا؟ جی ڈاکٹر صاحب کے بارے میں بھی سب پڑھا ہے۔ حضرت مولانا نے فرمایا: ''پھر کیا تم ان کے لیے کچھ نہ کروگے؟'' حضرت! کیوں نہیں کچھ کریں گے! اس سلسلے میں تو میں خود آپ سے مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ اسی وقت یہ طے کیا گیا کہ خاک سار کے اعزاز میں ایک جلسے کا اہتمام کیا جائے، جس میں خاص لوگوں کو بلایا جائے اور اس کے لیے مجھ سے وقت لے لیا جائے۔ حضرت کے علم میں تھا کہ دو ایک روز میں لکھنؤ، پٹنہ، کلکتہ وغیرہ کے سفر

پر نکلوں گا۔ گفتگو کے بعد یہ طے ہو گیا کہ حضرت چوں کہ ستمبر کے دوسرے ہفتے میں برطانیہ کے دورے پر جانے والے ہیں، اس لیے ستمبر کے پہلے ہفتے میں یہ جلسہ منعقد کر لیا جائے۔ اس لیے ضروری ٹھہرا کہ میں ۳۱/ اگست تک واپس دہلی پہنچ جاؤں۔ چوں کہ یہ جلسہ کسی ہال یا ہوٹل میں ہونا طے پایا تھا، اس لیے تاریخ انعقاد کا فیصلہ ہوٹل میں ہال کے مل جانے پر ہو گا۔

حضرت مولانا سے یہ مجلس ۱۱/ اگست کی شام کو ہوئی تھی، اسی روز شام کی گاڑی سے میں لکھنؤ کے لیے روانہ ہو گیا۔ لکھنؤ میں پورا ایک ہفتہ قیام رہا۔ یہ قیام میری عین خواہش کے مطابق ندوۃ العلما میں میسر آ گیا۔ اگر چہ ندوہ کے ناظم مولانا سید محمد رابع حسنی مدظلہٗ سے کوئی تعارف نہ تھا، لیکن دل مطمئن تھا کہ پہنچ جاؤں گا تو نکالا نہ جاؤں گا۔ اگر چہ میں نے پہلے سے کوشش کی تھی کہ حضرت مولانا حسنی صاحب کو اطلاع ہو جائے۔ کراچی ہی میں اسی خانوادۂ علم و تہذیب کے ایک فرد ڈاکٹر محمد یونس حسنی صاحب سے جو ہندوستان جا رہے تھے، گذارش کی تھی کہ مولانا حسنی مدظلہٗ سے ملاقات میں میرے عزم سفر لکھنؤ اور قیام کے بارے میں ضرور فرما دیں یا اگر لکھنؤ اور رائے بریلی نہ جا سکیں تو خط ضرور لکھ دیں۔ لیکن مجھے کراچی واپس پہنچ کر پتا چلا کہ نہ تو وہ لکھنؤ اور رائے بریلی خود جا سکے اور نہ خط ہی لکھا۔ لیکن حضرت مولانا سید رابع حسنی مدظلہٗ کی خدمت میں حاضر ہوا تو مولانا ایسی شفقت سے ملے کہ ایک لمحے کے لیے بھی محسوس نہیں ہوا کہ میں ان کے لیے اجنبی یا بن بلایا مہمان ہوں۔ ۱۲/ اگست کی صبح کو پہنچا تھا، ۱۹/ کی شام پٹنہ کے لیے روانہ ہوا۔ صبح ناشتے پر اور دوپہر اور شام کے کھانے پر بلاتے، اپنے پاس بٹھاتے اور نہایت شفقت سے دسترخوان کی ایک ایک چیز سے تواضع فرماتے۔ لکھنؤ میں گزارے ہوئے ایام مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے۔ اس کی بہترین یادوں میں میری خوش وقتی کے وہ یادگار لمحے بھی ہیں جو میں نے ندوۃ العلماء کے بزرگوں، خردوں، مخلصوں اور اصحاب ذوق کی صحبتوں میں گزارے تھے۔

۱۹/ کی شام کو ندوہ کے بزرگوں کی شفقت، تواضع اور خرد نوازی نیز دوسرے حضرات کی محبت اور اخلاص کی یادیں سمیٹ کر اگلے سفر پٹنہ کے لیے روانہ ہو گیا۔

پٹنہ میں ۲۰/ اگست کی صبح کو پہنچ گیا۔

لکھنؤ کے قیام کے آخری دن میں نے محترم احمد سعید ملیح آبادی ایڈیٹر آزاد ہند۔ کلکتہ کو خط لکھ دیا تھا کہ آج شام کو لکھنؤ سے پٹنہ کے لیے روانہ ہو رہا ہوں۔ کلکتہ کے سفر کے

کمرے میں آ گیا۔ تھوڑی دیر میں معلوم ہوا کہ حضرت نے ایک حکیم صاحب سے وقت لے لیا اور نو بجے ان کے پاس جانا ہے۔ عشاء کی نماز کے بعد دفتر کے ایک صاحب تشریف لائے اور کہا چلیے حکیم صاحب کے پاس! میں فوراً کھڑا ہو گیا۔ کمرے سے باہر نکلا۔ حضرت کی گاڑی میں تین صاحبوں کے ساتھ حکیم صاحب کے مطب پہنچا۔ حکیم صاحب نے صورت حال دیکھ کر کہا: آپ کا آپریشن ہو چکا ہے، پیشاب کی نلکی لگی ہوئی ہے، اگر رات کو کوئی تکلیف ہو گئی تو ڈاکٹر کی ضرورت پڑے گی، اس لیے ضروری ہے کہ آپ اسی وقت کسی ہسپتال میں داخل ہو جائیں۔ میں نے کہا آپ یہ بات اپنے لفظوں میں حضرت مولانا سے فرما دیجیے! انھوں نے اسی وقت مولانا کو فون کیا اور بتایا کہ انھیں میری نہیں کسی ہسپتال میں داخلے کی فوری ضرورت ہے۔ آپ فوراً اس کا انتظام کیجیے۔ مولانا نے فرمایا: آپ انھیں فوراً بھیج دیجیے۔ ہم دفتر واپس آئے تو مولانا ایک ہسپتال میں داخلے کا انتظام فرما چکے تھے۔ حضرت مولاناؒ نے پھر تسلی دی اور فرمایا اللہ پر بھروسا رکھیے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب پھر دو تین صاحبوں کے ساتھ مجھے روانہ کیا۔ ہم لوگ بارہ بجے کے قریب ہسپتال پہنچے۔

یہ ''سرا'' نامی ہسپتال زورولوجی کے مریضوں کا خاص ہسپتال تھا۔ اس کے مالک محترم ڈاکٹر عبدالخالق صاحب زورولوجسٹ کی حیثیت سے خاص شہرت رکھتے ہیں۔ حضرت شیخ الاسلامؒ کے خاص عقیدت مندوں میں اور حضرت مولانا سید اسعد مدنی سے بہت قریبی تعلقات ہیں۔ حضرت مولانا نے جوں ہی انھیں فون کیا کہ میں مریض کو بھیج رہا ہوں، انھوں نے اسی وقت ڈیوٹی ختم کر کے جانے والے ڈاکٹروں کو بھی روک لیا نیز رات کو ڈیوٹی پر رہنے والے ڈاکٹرز بھی آ گئے تھے۔ میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ میرے منتظر ہیں۔ انھوں نے فوراً ہی معاینہ کیا اور مشورہ کر کے ایک نتیجے پر پہنچ گئے۔ چوں کہ ایکسرے اور بعض ٹیسٹ ضروری تھے اور صبح ہی کو ہو سکتے تھے، اس لیے آخری فیصلے کو دوسرے دن کے لیے ملتوی کرنا پڑا اور رات کو دی جانے والی ادویہ اور ضروری احتیاط کے لیے ہدایات جاری کر دیں اور مجھے ایک کمرے میں بھیج دیا۔ میرے ساتھ دفتر سے تین چار صاحبان آئے تھے۔ ایک صاحب کو ایک خاص رقم دے کر ہدایت فرمائی تھی کہ جب تک ابوسلمان ہسپتال میں رہیں آپ ان کے ساتھ رہیں اور ڈاکٹر صاحب کوئی ٹیسٹ، کوئی دوا یا کوئی اور چیز تجویز کریں اس کی فراہمی کا فوراً انتظام کرنا اور ابوسلمان کی خدمت کے لیے ہر وقت مستعد

رہنا اور ان کے کھانے پینے کی کوئی چیز ڈاکٹر صاحب تجویز کریں یا خود ابوسلمان صاحب کا کسی چیز کا جی چاہے اسے فوراً فراہم کرنا۔ کسی وقت انھیں تنہا نہ چھوڑنا اور ان کے ساتھ ہی واپس آنا۔ ایک صاحب کی ذمے داری تھی کہ وہ صبح کو ہسپتال جاکر اور احوال معلوم کرکے دفتر آئیں اور شام کو دفتر سے پہلے ہسپتال جائیں اور خیریت معلوم کرکے اطلاع دیں اور پھر اپنے گھر جائیں۔ افسوس ہے کہ مجھے اس نوجوان صالح کا نام یاد نہیں رہا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس نوجوان نے وفا اور خدمت کا حق ادا کردیا۔ ۲۹ راگست کی شام سے میرے ساتھ تھا۔ ۱۰ ر ستمبر کی سہ پہر کو میرے ساتھ ہی دفتر آیا۔ اللہ تعالیٰ اسے خوش رکھے۔

اگلے روز ۳۰ راگست کی صبح کو ایکسرے اور الٹراساؤنڈ کرایا گیا اور سہ پہر کو محترم ڈاکٹر عبدالخالق صاحب راؤنڈ پر تشریف لائے اور بتایا کہ کل چار بجے آپ کا آپریشن ہے۔ میں نے کہا آپ کو معلوم ہے کہ میں ایک طالب علم ہوں اور علمی سفر پر ہندوستان آیا ہوں۔ آپ کو میرے حالات کا اندازہ ضرور ہوگا؟ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا آپ کو یہ فکر کیوں لاحق ہوگئی؟ آپ مولانا اسعد مدنی کے مہمان ہیں اور اب آپ میرے معزز مہمان ہیں۔ آپ کوئی فکر نہ کیجیے اور اپنے دل سے تمام خطرات کو دور کردیجیے اور تیار ہوجایئے، کل آپ کا آپریشن ہے! میری آنکھوں نے آنسو نکل آئے۔ میں کوئی جواب نہیں دے۔ کا۔ آپریشن ہوگیا۔ ۴ ریا ۵ رستمبر کو مولانا سید محمود مدنی سلمہ تشریف لائے اور بتایا کہ ۷ رستمبر کو آپ کے اعزاز میں جلسہ رکھا تھا۔ اب فرمایئے کیا کریں؟ میں نے کہا جو حال ہے آپ دیکھ رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے آج ہی پیشاب کی نلکی کو جسم سے جدا کیا ہے۔ مولانا محمود مدنی نے فرمایا میں ابھی ڈاکٹر صاحب سے ملا ہوں، انھوں نے آپ کو رِلیز کرنے سے بالکل انکار کردیا ہے۔ کیا پروگرام ملتوی کردیا جائے؟ میں نے کہا اس کے سوا چارہ کار بھی کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب حالت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ بالآخر مجوزہ تقریب ملتوی کردی گئی۔ شام کو ڈاکٹر صاحب تشریف لائے تو فرمایا تین چار روز ابھی اور آپ کو ہسپتال میں رہنا ہے۔

۹ ر تاریخ کو ڈاکٹر صاحب تشریف لائے، معائنہ کیا اور مجھ سے پوچھا آپ کیسا محسوس کرتے ہیں؟ میں نے انھیں بتایا کہ میں اپنے آپ کو بالکل ٹھیک محسوس کرتا ہوں۔ پیشاب تکلیف کے بغیر معمول کے مطابق ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا تو آج آپ چلے جائیں، حضرت مولانا سے ملیں اور ان کی تواضع اور صحبت سے لطف اندوز ہوں۔ کل

دس بجے تشریف لے آئیں۔ اگر حالت ٹھیک رہی تو سفر کی اجازت مل جائے گی۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کرنے کے لیے منہ کھولنا ہی چاہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے میرے لبوں پر انگلی رکھ دی اور کہا: ہاں ہاں! اپنے دماغ پر بوجھ نہ ڈالیے! میری آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں۔ ڈاکٹر صاحب سلام کر کے چلے گئے۔ میں اٹھا اور روانہ ہونے کے لیے تیار ہوگیا۔ میں نے ہسپتال میں گھوم پھر کر ڈیوٹی پر حاضر ڈاکٹروں، نرسوں اور عملے کے دوسرے افراد کا شکریہ ادا کیا اور جمعیت علماء ہند کے دفتر آگیا۔

سب سے پہلے حضرت فدائے ملت امیر الہند مولانا سید اسعد مدنی (رحمہ اللہ تعالیٰ) کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اللہ کا شکر ادا کیا اور مجھے دعاؤں سے نوازا اور فرمایا اب آپ آرام کریں، کوئی ضرورت ہو تو مجھے بتادیں، تکلف نہ کریں اور کسی قسم کی فکر نہ کریں۔ میں آپ کے ہسپتال سے آنے کے انتظار میں ہوں۔ مجھے برطانیہ کا سفر درپیش ہے۔ اب میں بھی اطمینان سے سفر پر روانہ ہو جاؤں گا اور ڈاکٹر صاحب آپ کو بھی سفر کی اجازت دے دیں گے۔ میں اجازت لے کر اپنے کمرے میں آگیا۔ عصر مغرب کی نمازیں اپنے کمرے ہی میں پڑھیں۔ عشاء کی نماز کے لیے نیچے مسجد میں گیا اور کھانا بھی مولانا کے ساتھ تناول کیا۔ پچھلے دس بارہ دنوں کے بعد رات کو نیند خوب گہری آئی۔ فجر کی نماز مسجد میں پڑھی۔ ناشتہ مولانا کے ساتھ کیا اور پھر اپنے کمرے میں آگیا تھوڑی دیر میں وہ عزیز آگئے جو گیارہ بارہ دن سے میرے ساتھ تھے۔ پوچھا کہ ہسپتال کب چلنا ہے؟ میں نے کہا: جس وقت جی چاہے چلیے۔ ڈاکٹر عبدالخالق صاحب ۱۱، ۱۲ بجے آتے ہیں۔ میرا خیال ہے ہمیں ۱۰ بجے یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ عزیز موصوف نے کہا ٹھیک ہے۔ آپ تیار رہیے گا۔ میں ٹیکسی لے کر ہی آؤں گا۔ یہ کہہ کر وہ چلے گئے اور میں اپنے خیالوں میں کھوگیا۔ ٹھیک دس بجے دروازے پر کھٹکا ہوا۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ عزیز موصوف نے کہا آیئے! میں تو تیار ہی تھا، فوراً ان کے ساتھ روانہ ہوگیا۔

میں گیارہ بجے ہسپتال پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر میں ڈاکٹر صاحب بھی تشریف لے آئے۔ حالات پوچھے، خیریت دریافت کی، مجھے صحت کی مبارک باد دی اور اجازت دی کہ میں سفر کرسکتا ہوں۔ یہ وقت ڈاکٹر صاحب کی مصروفیت کا ہوتا ہے، مریضوں کو دیکھتے ہیں اور ہسپتال میں راؤنڈ بھی کرتے ہیں۔ اس لیے زیادہ بیٹھنا میں نے مناسب نہ سمجھا۔ اجازت

چاہی تو ڈاکٹر صاحب نے ایک فائل عنایت فرمایا اور ہدایت کی کہ اس میں آپ کی بیماری کی پوری ہسٹری اور کاغذات ہیں۔ آپ جو دوا استعمال کر رہے ہیں استعمال کرتے رہیے۔ دس پندرہ دن کے بعد کسی ڈاکٹر کو یہ کاغذات دکھا کر مشورہ کر لیجیے گا۔ اگر وہ ضرورت سمجھے گا تو یہی دوا یا کچھ ردو بدل کے بعد نیا نسخہ لکھ دے گا، آپ اسے استعمال کیجیے گا۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ آپ کا آپریشن بہت کامیاب ہوا ہے۔ آپ کو کوئی شکایت نہیں ہے اور شاید ہی علاج جاری رکھنے کی ضرورت پیش آئے۔ یہ خیال رہے! ممکن ہے پیشاب میں کبھی خون کا کوئی ٹکڑا آجائے تو اس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں! کراچی پہنچ کر واقعتاً جیسا کہ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا مجھے کوئی تکلیف ہوئی، نہ بہت دنوں علاج جاری رکھنے کی ضرورت پیش آئی۔

ڈاکٹر صاحب سے رخصت ہو کر میں دفتر جمعیت علمائے ہند پہنچا۔ سب سے پہلے میں نے شاہد علی خاں کو فون کیا اور انھیں بتایا کہ میں ہسپتال سے آگیا ہوں اور بہت ضروری ہے کہ آپ سے ملاقات ہو۔ شاید میں ۱۲ر ستمبر کو کراچی واپس چلا جاؤں۔ انھیں میرے ہسپتال سے آنے کے جملے پر بڑی حیرت ہوئی، انھوں نے صورت حال دریافت کی، میں نے کہا آپ تشریف لائیں گے تو بتاؤں گا۔

عصر کی نماز کے لیے نیچے اُترا، نماز پڑھی تو حضرت مولانا کے کمرے میں ان کے ساتھ ہی چلا گیا۔ حضرت کو ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کی روداد اور سفر کی اجازت کی اطلاع دی۔ حضرت اس بات سے بہت مسرور ہوئے۔ اسی وقت دفتر کو ہدایت فرمائی کہ ۱۲ر کی فلائٹ سے ابوسلمان کی سیٹ او کے کروا دو۔ حضرت اس وقت بہت خوش تھے۔ اللہ کا بار بار شکر ادا کیا۔ مجھے پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ حضرت میری حالت کی طرف سے بہت فکر مند ہیں۔ فرمایا آپ کے لیے جلسے کے انتظام سے میں خوش تھا۔ لیکن یہ اللہ کو منظور نہ تھا۔ اب اس کے لیے اس وقت کوئی موقع باقی نہیں رہا۔ ان شاء اللہ آیندہ کوئی موقع اس کے لیے نکلے گا۔ میں مایوس نہیں ہوں۔ یہ فرما کر حضرت نے سوٹ کے کپڑے کا ایک پیکٹ میری طرف بڑھایا اور ایک بہت ہی خوب صورت ریشمی رومال میرے سر پر ڈال دیا اور فرمایا یہ میں نے جلسے کے موقع پر آپ کو دینے کے لیے منگوایا تھا۔ میں حضرت کی جانب سے اس اعزاز پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجالایا اور حضرت کا شکریہ ادا کرنا چاہا لیکن حضرت نے فوراً بات کا

رخ بدل دیا۔ فرمایا اب آپ اپنا سامان درست کرلیں، امید ہے آپ کی سیٹ کنفرم ہو جائے گی اور آپ اپنے بچوں اور عزیزوں میں کراچی پہنچ جائیں گے۔ میں نے ایک روز پہلے بھی حضرت کا شکریہ ادا کرنا چاہا تھا لیکن حضرت نے کوئی اور بات چھیڑ کر بات کا رخ بدل دیا تھا اور شکریے کا ایک جملہ بھی مکمل نہیں ہونے دیا تھا۔ اس وقت پھر وہی صورت حال پیش آئی۔ میں حضرت کے ساتھ چائے پی کر اوپر اپنے کمرے میں آ گیا۔ کتابوں کو سمیٹ چکا تھا، اس وقت ان کے دو تین پیکٹ مضبوط باندھ دیے۔

مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر اوپر پہنچا ہی تھا کہ شاہد علی خاں تشریف لے آئے۔ ہسپتال والی بات سے وہ بہت فکر مند تھے۔ میں نے انھیں قصہ سنایا تو وہ بہت افسردہ خاطر ہوئے اور علاج کے سلسلے میں حضرت مولانا نے جو توجہ فرمائی تھی اسے سن کر انھوں نے حضرت کی درد مندی اور غم گساری ملّت کو حضرت کی عام خصوصیت اور سیرت کی مستقل خوبی بتایا اور کہا آپ پر تو حضرت نے خصوصی توجہ فرمائی۔ ہندوستان میں اس وقت ان کی ذات مسلمانوں کے لیے بہت بڑا دنیاوی سہارا ہے۔ بعض مواقع پر بہت نازک حالات میں وہ مسلمانوں کے لیے سپر بن گئے اور انھوں نے بہت بہادری سے مقدمے کو پیش کیا۔ مجھے شاہد صاحب کی اس شہادت سے بہت خوشی ہوئی۔ شاہد صاحب نے شکوہ کیا کہ جامعہ کے احباب میں کسی کو یہ معلوم نہیں کہ آپ ان حالات سے دوچار ہوئے اور یہیں دہلی میں ہیں۔ ہم تو یہی سمجھ رہے تھے کہ آپ جنوب مشرقی شہروں کے دورے سے ابھی واپس نہیں آئے، ورنہ جامعہ کے کتنے ہی حضرات آپ کی عیادت کے لیے ہسپتال پہنچتے۔ میں نے ان کی اور دیگر احباب کی محبت کا شکریہ ادا کیا اور انھیں بتایا کہ اب میرے لیے سفر جاری رکھنا ممکن نہیں رہا۔ میں شاید ۱۲ ار کی فلائٹ سے کراچی واپس چلا جاؤں۔ اس لیے ایک گذارش ہے۔ میں نے انھیں بتایا کہ میں اپنے ضروری سامان اور کتابوں کے بوجھ کے ساتھ سفر کرنے کے لائق نہیں ہوں۔ آپ اتنا کیجیے کہ یہ کتابیں آپ کے سپرد کرنا چاہتا ہوں، آپ انھیں تھوڑا تھوڑا کر کے مجھے بھجوا دیں۔ شاہد صاحب نے نہایت خوش دلی کے ساتھ اس ذمے داری کو قبول کرلیا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور جیسا کہ میں نے اندازہ کیا تھا کہ پانچ پانچ کلو کے سات آٹھ پیکٹ بنیں گے اور ان پر کتنے کتنے روپے کا مع رجسٹری کی فیس، پیکنگ وغیرہ کا خرچ آئے گا، حساب کر کے شاہد صاحب کے حوالے کر دیا۔ اگرچہ انھوں نے بہت

اصرار کیا کہ اخراجات کی ضرورت نہیں، میں کتابیں آپ کو بھجوادوں گا، لیکن میں ان پر یہ بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے ان کی یہ بات نہیں مانی۔

الحمد للہ! شاہد صاحب نے اپنے وعدے کو نبھایا اور متعدد پیکٹوں میں وقفے وقفے سے تمام کتابیں اور دسیوں کتابوں اور اخبارات ورسایل سے ماخوذ مضامین کے سیکڑوں صفحات کے فوٹو اسٹیٹ مجھے بھجوادیے۔ میں شاہد صاحب کے اخلاص ومحبت سے پہلے ہی واقف تھا، ان کی اس مستعدی اور وعدہ وفائی سے ان کی محبت کا نقش دل پر ثبت ہوگیا۔

شاہد صاحب جانے ہی والے تھے کہ ہسپتال میں میرے تیمار دار نوجوان تشریف لے آئے۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ کتابیں شاہد صاحب کی گاڑی میں رکھوادیں۔ انھوں نے فوراً ہی بنڈل اٹھالیے اور شاہد صاحب کو نیچے جاکر رخصت کرآئے۔ وہ پلٹ کر اوپر آئے ہی تھے کہ عشاء کی اذان ہوگئی۔ انھوں نے بتایا کہ جن صاحب کو سیٹ کنفرمیشن کا کام سپرد کیا گیا تھا وہ تشریف لے آئے ہیں۔ سیٹ کنفرم تو نہیں ہوئی لیکن امید ہے، ہوجائے گی۔ وہ نماز کے بعد حضرت مولانا کو اپنی کارگذاری کی رپورٹ پیش کریں گے۔ مناسب ہوگا کہ اس وقت آپ موجود ہوں۔ میں آپ کو یہی اطلاع دینے آیا ہوں۔ نماز کے بعد میں مسجد میں ٹھہر گیا۔ حضرت مولانا اپنے کمرے میں تشریف لے گئے۔ چند منٹ میں وہ صاحب بھی تشریف لے آئے۔ ہم دونوں ایک ساتھ حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سلام عرض کیا۔ حضرت مولانا نے خود ہی ان سے پوچھ لیا کہ ابوسلمان صاحب کی سیٹ کنفرم ہوگئی؟ انھوں نے جواب دیا: حضرت سیٹ تو کنفرم نہیں ہوسکی، اس لیے کہ ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی دفتر بند ہوگیا تھا اور کل اتوار ہے، اس لیے کل دفتر بند رہے گا۔ لیکن موبائل پر ایجنٹ سے رابطہ کیا تھا۔ اس نے بتایا کہ جہاز میں ۴۵ سیٹیں خالی ہیں۔ اگر پیر کے روز ایئرپورٹ پر جلد پہنچ جائیں تو سیٹ ضرور مل جائے گی۔ حضرت مولانا نے فوراً دفتر سے ایک صاحب کو بلایا اور ڈرائیور اور ایک اور صاحب کو بھی بلایا اور تاکید کی کہ ابوسلمان صاحب پرسوں جائیں گے۔ ڈرائیور سے کہا کہ تمھیں نو بجے انھیں ایئرپورٹ پر پہنچانا ہے۔ دوسرے صاحب جنھیں بلایا تھا (مولانا محمود مدنی کے پرائیویٹ سیکریٹری تھے)، اُن سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ آپ کو ساتھ جانا ہے، اپنے ساتھ کسی کو لے لینا۔ انور حسین صاحب جمعیت کے شعبۂ تصنیف وترجمہ کے ایک رکن موجود تھے، انھوں نے کہا حضرت میں ان کے

ساتھ جاؤں گا۔ حضرت نے فرمایا: ٹھیک ہے! لیکن تاکید کی کہ جب ابوسلمان صاحب ایئرپورٹ کی عمارت کے اندر چلے جائیں تو آپ فوراً بھاگ نہ آئیں، جب کامل اطمینان ہوجائے اور ابوسلمان لاؤنج میں چلے جائیں، تب وہاں سے روانہ ہوں اور اگر سیٹ کنفرم نہ ہوسکے تو ابوسلمان صاحب کو واپس لے آنا اور اگلی فلائٹ سے روانہ کرنا۔ دفتر سے جن بزرگ کو بلایا تھا ان سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ آپ اس انتظام کے ذمے دار ہیں۔ کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔ انھوں نے جواب دیا، ان شاء اللہ اسی طرح ہوگا، جیسا کہ آپ نے ارشاد فرمایا ہے۔ پھر حضرت نے اس خاک سار کی طرف مخاطب ہوکر فرمایا: آپ کوئی فکر نہ کیجیے گا، یہ سب آپ کا خیال رکھیں گے۔ اگر کوئی ضرورت ہو تو ان سے (بزرگ کی طرف اشارہ فرمایا) کہہ دیجیے گا۔ افسوس ہے کہ ہم آپ کی کوئی خدمت نہیں کرسکے۔ (میں یہ بات سن کر لرز گیا۔ حضرتؒ نے تو وہ کچھ کیا تھا کہ اگر میں اپنے وطن اور خاندان میں ہوتا تب بھی اتنا کچھ نہ کرسکتا تھا اور حضرتؒ یہ فرماتے ہیں کہ ہم آپ کی کوئی خدمت نہ کرسکے)۔ ان شاء اللہ آپ کی سیٹ کنفرم ہوجائے گی اور آپ اپنے بچوں اور عزیزوں میں بہ خیریت پہنچ جائیں گے۔ آج ہی رات کو میں بھی برطانیہ جارہا ہوں۔ خدا آپ کا حامی و ناصر ہو! میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور حضرت نے گرم جوشی کے ساتھ میرا ہاتھ پکڑ لیا اور فی امان اللہ کہا میں اپنے کمرے میں آگیا۔ صبح کو فجر کی نماز کے لیے مسجد میں آیا تو معلوم ہوا کہ حضرت پروگرام کے مطابق سفر پر روانہ ہوچکے ہیں۔

جولائی ۲۰۰۵ء میں دہلی پہنچا تھا تو اس وقت تک حضرت شیخ الاسلامؒ کی سیاسی ڈائری کی چار جلدیں شایع ہوچکی تھیں اور حضرت مولاناؒ کی نظر سے گزر چکی تھیں۔ اس کارگذاری کے تذکرے پر حضرت نے اپنی مسرت کا اظہار فرمایا تھا، بقیہ جلدوں کے لیے حضرت بہت بے چین تھے اور اس خواہش کا اظہار فرمایا کہ جب جلدیں مرتب ہیں ایک جلد پریس میں اور دو جلدوں کی کتابت بھی ہوچکی ہے تو اب جی لگا کے اسے پایۂ تکمیل کو پہنچا دیجیے۔ اس کے باوجود کہ میں ہندوستان کے سفر کے دوران ہی ایک شدید حادثے سے دوچار ہوچکا تھا اور صحت کی ایسی حالت کو پہنچ چکا تھا، خیال تھا کہ ایک مدت تک کارگذاری کے نئے دور کا آغاز نہ کرسکوں گا۔ لیکن یہ عزم اسی وقت سے کرلیا تھا کہ اب ان شاء اللہ سستی اور کاہلی کو کام کی رفتار میں رکاوٹ نہ بننے دوں گا۔ میں ۱۲ر ستمبر ۲۰۰۵ء کو کراچی پہنچا تھا۔ اگلے دو مہینوں

میں میری صحت میں افاقہ ہوا تھا لیکن دوا سے ابھی چھٹکارا نہیں ملا تھا۔ رمضان کے معمولات نے صحت کو بگاڑا نہیں تھا لیکن کمزوری بڑھ گئی تھی۔ ابھی رمضان کو گزرے چند ہی دن ہوئے تھے کہ حضرت کو حادثہ پیش آنے اور ہسپتال میں داخلے کی خبر ملی۔ یہ نومبر کا پہلا ہفتہ تھا۔ حادثے کی خبر سے پریشانی ضرور ہوئی۔ دل میں کوئی تشویش اور خطرہ پیدا نہیں ہوا، لیکن بعد میں بے ہوشی کے طول کھینچنے کا حال معلوم ہوا تو تشویش پیدا ہوئی اور محسوس ہوا کہ خطرہ دل میں جھانک رہا ہے۔ اس کے بعد کان دہلی سے آنے والی خبروں پر لگ گئے اور وقت بے چینی سے گزرنے لگا۔ اللہ کی طرف سے حضرت کی صحت کے بارے میں ایک لمحے کے لیے مایوسی نہ ہوئی تھی، لیکن خطرے کا مہیب اندھیرا دل پر پوری طرح چھا گیا تھا۔ تین مہینے کی مدت روز و شب کا شمار کرتے کسی معجزۂ الٰہی کے انتظار میں گزری تھی۔ فروری ۲۰۰۶ء کا پہلا ہفتہ ابھی گزرا نہ تھا کہ فرستادۂ الٰہی دعوت نامۂ رفاقت لے کر آ پہنچا اور وہ الرفیق الاعلیٰ کے پاس سفرِ آخرت پر روانہ ہو گئے۔ جو کچھ ہوا مشیتِ الٰہی کے مطابق ہوا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسان ضعیف البنیان حوادث کا متحمل نہیں ہو سکتا اور جس برداشت کا ظہور ہوتا ہے جسے صبر اور رضا بہ رضائے الٰہی کا نام دیتے ہیں، اس کے سوا ہمارے پاس کوئی چارا ہی نہیں ہوتا۔ ہم کسی غم و اندوہ کو دل سے مٹا نہیں سکتے صرف گوارا بنا لیتے ہیں۔ اس لیے کہ اللہ کی بخشی ہوئی زندگی اور اس کی ذمے داریوں سے ہمارے لیے مفر نہیں۔ یہ اللہ ہی کا فضل تھا کہ اس نے ہمت بخشی۔ گو جان کو نقصان نہیں پہنچا، لیکن دل کو ہل جانے اور ذہن کو پریشان ہو جانے سے نہیں بچا سکا۔ یہ صرف اس لیے نہیں ہوا تھا کہ مجھ پر آں مرحوم علیہ الرحمہ کا ہندوستان کے پچھلے سفر میں ایک بہت بڑا احسان تھا بلکہ اس لیے کہ وہ میرے ممدوح خانوادۂ مدنی کی یادگار تھے۔ وہ حضرت شیخ الاسلامؒ کے جانشین تھے۔ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کا سہارا تھے۔ وہ ان کے مخلص و مدبر رہنما تھے۔ انھوں نے ہندوستان کے سیاسی حلقوں میں مسلمانوں کا اعتماد بحال کیا تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کے دلوں میں بھی جماؤ پیدا کیا تھا۔ ان میں حالات کا مقابلہ کرنے اور حوادث سے آنکھیں ملانے کی ہمت پیدا کی تھی۔ ان کی قیادت میں مسلمانوں کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا تھا۔ انھوں نے تاریخ بنائی تھی اور وہ خود بھی ایک تاریخ تھے۔ وہ ایک تہذیبی شخصیت بھی تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کی اقتصادی و معاشی فلاح و بہبود اور ٹیکنیکل ایجوکیشن کی ایک تحریک پیدا کی تھی، جو آں مرحوم کی زندگی

میں کامیابی کے ایک خاص مقام تک پہنچ گئی تھی اور حضرت کے اخلاص، ایثار اور مساعی جمیلہ کی شہادت بن گئی۔ پہلے وہ میرے لیے خانوادۂ مدنی کی ایک یادگار اور محبوب شخصیت تھے۔ ان سے محبت اور عقیدت مجھے اپنے بزرگوں سے میراث میں ملی تھی۔ لیکن ان کی شخصیت کے کمالات، سیرت کے فضائل، ملی خدمات، اور ان کے ذوق و کرامات علم و عمل کے مطالعے، مشاہدے اور فیضانِ نظر و صحبت نیز غور و فکر نے انھیں میرا ممدوح بنا دیا تھا۔

وطن واپس آکر میں سب سے پہلے حضرت مرحوم کی خوش نودی کے لیے سب سے پہلے حضرت شیخ الاسلامؒ کی سیاسی ڈائری کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دینا چاہتا تھا، لیکن پہلے معالجے کے تسلسل اور صحت کی کمزوری کی وجہ سے اور پھر آں مرحوم کے حادثے کے پیش آجانے کی وجہ سے پریشان ہو کر اس طرف توجہ نہ کر سکا تھا۔ پھر حضرت کے سانحۂ وفات نے حواس کو مختل کر دیا اور کئی مہینوں تک زندگی سے بے زاری اور تحریر و مطالعے سے اجنبیت کی کیفیات سے دو چار رہا۔ اگر حضرت مخدومی و مطاعی مولانا حافظ قاری شریف احمد دہلوی مدظلہم العالی و دامت برکاتہم کی توجہ عالی، رہنمائی اور دست گیری میسر نہ آتی تو نہیں کہہ سکتا کہ اپنی ذہنی کیفیات کے سحر سے کب نجات پاتا۔

خدا کا فضل ہے کہ رفتہ رفتہ زندگی سے بے زاری دور ہوئی اور تحریر و مطالعے سے از سر نو آشنائی پیدا ہوئی۔ آج یہ سوچ کر افسوس ہوتا ہے کہ پہلے ہی سستی اور کاہلی میں وقت ضائع ہوا اور اب ڈائری کی چوتھی جلد اُس وقت شائع ہو رہی ہے جب اس کا سب سے بڑا قدر دان اور اس کی اشاعت کا سب سے بڑا اشتیاق اس جہان فانی سے سفر آخرت پر روانہ ہو چکا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آں مرحوم زندہ ہوتے تو وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ اللہ تعالیٰ حضرت کو اعلیٰ علیین کی صحبتوں کا لطف بخشے اور ان کے وابستگانِ دامن اور منتسبین و متعلقین کو ان کے نقشِ قدم پر چلنے اور دین و ملت اور قوم و وطن کی بیش از بیش خدمت کی توفیق عطا فرمائے!

ابوسلمان

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

(۳۱ر جنوری ۲۰۰۸ء)

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

کی سیاسی ڈائری (جلد چہارم) ایک نظر میں

تقسیم شدہ ہندوستان
افغانستان
تبت
ایران
بلوچستان
پنجاب
پنجاب
سندھ
راجستھان
نیپال
اترپردیش
بہار
مدھیہ پردیش
مہاراشٹر
بحیرۂ عرب
خلیج بنگال
کرناٹک
تامل ناڈو
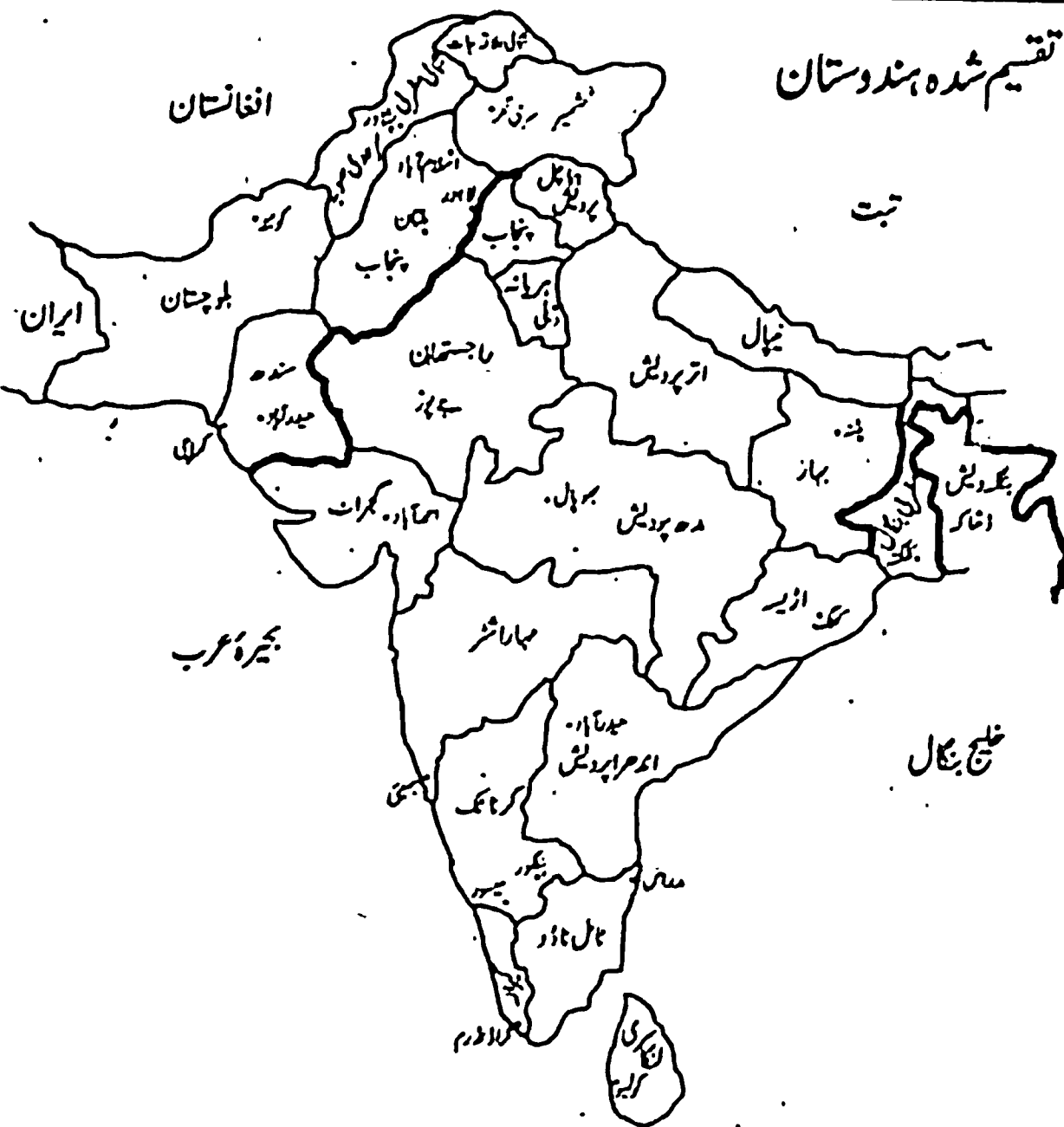
۱۹۴۶ء

کانگریس کی حیثیت:

یکم جنوری ۱۹۴۶ء/ ۲۷ محرم ۱۳۶۵ھ: معزالدین (ضلع رہتک) کے ایک سوال کے جواب میں حضرت مفتی صاحب نے فرمایا:

"کانگریس کی شرکت صرف سیاسی ہے۔ مذہب پر قایم رہتے ہوئے انگریزوں سے حکومت لینے میں کانگریس کی شرکت جایز ہے۔ مسلم لیگ میں بھی بے دین لوگ جیسے قادیانی، دہریے اور کیمونسٹ سب شریک ہیں۔ پھر ان کا اصول حکومت بھی وہی ہے جو کانگریس نے بتایا ہے یعنی سب رعایا کی حکومت، جس میں بے دین بھی شریک ہوں گے۔ اسلامی حکومت تو وہ بھی نہیں ہے۔" محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ۔ دہلی

(کفایت المفتی (جلد نہم)، کتاب السیاسیات)

رہائی کا اعلان:

۳ جنوری ۱۹۴۶ء: انڈین آرمی کے تین افسروں کی رہائی کے سلسلے میں آج نئی دہلی سے حسب ذیل سرکاری اعلان شایع ہے۔

"کپتان شاہ نواز خاں، کپتان سہگل اور لیفٹیننٹ ڈھلون تینوں کے خلاف کورٹ مارشل میں اس الزام میں سماعت ہوئی کہ انھوں نے ملک معظم کے خلاف جنگ کی۔ لیفٹیننٹ ڈھلون پر قتل کا بھی الزام ہے اور باقی دونوں پر اعانت قتل کا الزام تھا۔ کورٹ مارشل کا یہ فیصلہ ہے کہ تینوں ملک معظم کے خلاف جنگ کرنے کے جرم کے مرتکب ہوئے ہیں۔ کپتان شاہ نواز کے خلاف اعانت قتل کا جرم بھی ثابت ہے۔ لیفٹیننٹ ڈھلون قتل اور کپتان سہگل اعانت قتل کے الزام سے بری کردیے گئے۔ ملک معظم کے خلاف جنگ کرنے کے جرم کا مرتکب گردانے کے بعد عدالت پر یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ ملزمان کو موت

یا عمر قید کی سزا دے۔ قانون کے ماتحت اس سے کم کی سزا نہیں دی جا سکتی۔ کورٹ مارشل نے تینوں ملزموں کو عمر قید کی سزا دی اور ان کی برخاستگی اور ان کی بقایا تنخواہ الاؤنس کی ضبطی کا حکم دیا۔ کورٹ مارشل کا کوئی فیصلہ مکمل نہیں سمجھا جا سکتا، تاوقتیکہ اس کی تصدیق نہ ہو جائے۔ اس معاملے میں تصدیق کنندہ افسر یعنی کمانڈر انچیف نے یہ اطمینان کر لیا ہے کہ ہر ملزم کے متعلق کورٹ مارشل کا فیصلہ شہادت اور ثبوت کے مطابق ہے۔ اس لیے اس نے حکم سزا کی تصدیق کر دی ہے۔ لیکن تصدیق کنندہ افسروں کو سزاؤں میں کمی کرنے یا سزائیں معاف کر دینے کا اختیار ہے۔ جیسا کہ اخباروں میں اعلان کیا جا چکا ہے۔ حکومت ہند کی یہ پالیسی ہے کہ آیندہ صرف ایسے اشخاص کے خلاف سماعت کی جائے جن پر حکومت کے خلاف جنگ کرنے کے علاوہ وحشیانہ مظالم کرنے کا الزام ہو۔ البتہ یہ اعلان کیا جا چکا ہے کہ سزاؤں کے احکام پر نظر ثانی کرتے وقت تصدیق کنندہ افسر یہ دیکھے گا کہ ملزموں کے خلاف جو افعال ثابت ہوئے ہیں وہ مہذبانہ رویے کے اصولوں کے کہاں تک منافی ہیں۔ لیفٹیننٹ ڈھلون اور کپتان سہگل کو قتل اور اعانت قتل کے الزام سے بری کر دیا گیا اور یہ الزام نہیں لگایا گیا کہ وہ دوسرے وحشیانہ فعلوں کے مرتکب ہوئے۔ اگرچہ کپتان شاہنواز پر اعانت قتل کا الزام ثابت ہے اور ان کے خلاف جو واقعات ثابت ہیں، سنگین ہیں۔ تاہم تصدیق کنندہ افسر نے ان حالات کا لحاظ رکھا ہے جو اس وقت طاری ہیں۔ اس لیے کمانڈر انچیف نے فیصلہ کیا ہے کہ تینوں ملزموں سے سزاؤں کے معاملے میں یکساں سلوک کیا جائے اور تینوں کی عمر قید کی سزا معاف کر دی جائے مگر تصدیق کنندہ افسر نے ملزموں کی برخاستگی اور بقایا تنخواہ کی ضبطی کے حکم کی تصدیق کر دی ہے۔ کیوں کہ ہر حالت میں ایک افسر یا سپاہی کے لیے یہ بہت سنگین جرم ہے کہ وہ اپنے عہد وفاداری سے انحراف کرے اور حکومت کے خلاف جنگ کرے۔ یہ ایسا اصول ہے جس کی پابندی قانون کی رو سے قائم شدہ حکومت کے حق میں خواہ وہ موجود ہو یا آیندہ لازمی ہے۔

انڈین آرمی کے افسروں کا جلسہ:

۴ر جنوری ۱۹۴۶ء: ۳ر جنوری ۱۹۴۶ء کو دہلی میں ان افسروں کی تقریریں سننے کے لیے اتنا بڑا اجتماع ہوا کہ چشم دہلی نے اس سے پہلے کبھی ایسا اجتماع نہیں دیکھا تھا۔

کپتان عبدالرشید کی الگ پیروی:

یادش بہ خیر مسلم لیگ کو کب گوارا تھا کہ کسی معاملے میں ہندو مسلم اشتراک و اتحاد ہو، زعمائے لیگ نے کسی صورت سے عبدالرشید کپتان سے درخواست دلوادی کہ وہ اپنے مقدمے کی پیروی مسلم لیگ سے کرانا چاہتے ہیں۔ درخواست منظور ہوگئی، لیگی اخبارات کو بھی پروپیگنڈا کا موقع مل گیا۔

میجر جنرل شاہ نواز اور ان کے ساتھیوں نے پوری دلیری اور بہادری سے اعتراف کیا تھا کہ ہم نے اپنے محبوب وطن کی آزادی کی خاطر جنگ کی۔

دو معاہدے سامنے تھے۔ وطن عزیز کی آزادی کا فطری معاہدہ، اور تاج برطانیہ کی وفاداری کا مصنوعی معاہدہ جب ان دونوں معاہدوں کا ہم نے مقابلہ کیا تو ہمارے ضمیر نے شہادت دی کہ فطری معاہدے کے مقابلے میں جعلی اور مصنوعی معاہدے کی کوئی حقیقت نہیں۔ لیکن کپتان عبدالرشید کے وکلا نے کپتان عبدالرشید سے جو معصومانہ بیان دلوایا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ میں نے تاج سے کسی وقت بے وفائی نہیں کی۔ البتہ جب میں نے دیکھا کہ آزاد ہند فوج قایم ہو چکی ہے اور ممکن ہے وہ ہندوستان پر قابض ہو جائے تو چوں کہ اس میں ہندوؤں کا غلبہ تھا، لہٰذا میں اس میں اس لیے داخل ہو گیا تھا کہ یہ فوج مسلمانانِ ہند کو ظلم و ستم کا نشانہ نہ بنائے۔

کپتان عبدالرشید کو سزا:

میجر جنرل شاہ نواز کا بیان ایک حقیقت تھا۔ ملک نے تحسین کی، حکومت مرعوب ہوئی، افواج ہند کے ہر سپاہی کے دل میں ان بہادروں کی قدر و منزلت جگہ کر گئی۔ لیکن کپتان عبدالرشید کے بیان کا اثر اُلٹا پڑا اور نتیجہ بھی اُلٹا ہی رہا۔ یعنی کمانڈر انچیف نے رہا کرنے کے بجائے سات سال قید کا حکم سنادیا۔

مسٹر جناح بہت چراغ پا ہوئے کہ ہندو اور مسلمانوں میں امتیاز کیا گیا، مگر حکومت نے کوئی توجہ نہ کی۔ لیگ کی طرف سے عبدالرشید ڈے منایا گیا اور جلوس اور جلسوں کا اعلان کیا گیا۔ اُسی زمانے میں میرٹھ میں حضرت مولانا احمد سعید صاحب کی زیر صدارت جمعیت علما ضلع میرٹھ کی کانفرنس ہو رہی تھی۔ اس کانفرنس میں ایک تجویز کے ذریعے سے عبدالرشید

صاحب کی رہائی کا مطالبہ کیا گیا۔ اس تجویز کی بنا پر جمعیت علما کے کارکنوں نے جلوسوں اور جلسوں میں شرکت کی۔

کپتان رشید کی حمایت میں جلوس:

میرٹھ اور کلکتہ وغیرہ میں پولیس نے کچھ مزاحمت کی مگر مزاحمت کے وقت ذمے دار ان جلوس غایب ہو گئے اور جمعیت علما کے حامی نوجوانوں نے گولیوں کے سامنے سینہ پیش کر دیا۔ میرٹھ میں دو نوجوان شہید ہوئے۔ دونوں جمعیت علما کے ممبر تھے۔ کلکتہ میں شہید و زخمی ہونے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ کلکتہ میں مسلم طلبہ نے جلوس نکالا تھا لیکن جب پولیس نے جلوس کو روک دیا تو ان کی امداد کے لیے تمام طلبہ بلا امتیاز مذہب و ملت پہنچ گئے! اور اس شدت سے مقابلہ کیا کہ تین روز تک کلکتہ میں گویا انھیں کا قبضہ اور انھیں کی حکومت تھی۔

مسلم لیگ کا بزدلانہ اعلان:

اس وقت ہندو مسلم منافرت باہمی محبت سے بدل گئی تھی۔ ''ہندو مسلم اتحاد زندہ باد'' کے نعرے بلند ہو رہے تھے اور لوگ جنازہ اور ارتھی کو ایک ہی جوش کے ساتھ اُٹھا رہے تھے۔ لیکن تین روز بعد کلکتہ مسلم لیگ کے سکریٹری صاحب نے ایک اعلان کے ذریعے عوام کے جوش و خروش کو غلط قرار دیتے ہوئے ہدایت کر دی کہ مسلم لیگ کا کوئی ممبر اس میں شریک نہ ہو۔ اس حوصلہ شکن اعلان نے فضا کے جوش و خروش کو افسردگی اور مایوسی سے بدل دیا اور رفتہ رفتہ اتحاد و یک جہتی کا تمام اثر ختم ہو گیا۔

بہ ہر حال آزاد ہند فوج کا قیام اور اس کے متعلق ملک کا غیر معمولی جوش و خروش اس شدید جذبۂ انقلاب کا اعلان تھا جو ملک کے ہر چھوٹے بڑے ہندو مسلمان، سکھ اور پارسی وغیرہ کے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا۔

(علما حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے: ج ۲، ص ۸۲-۳۷۹)

الیکشن کمپین اور غنڈہ گردی:

۱۱ر جنوری ۱۹۴۶ء: کمیونسٹوں اور ملحدوں کو مسلم لیگ کی الیکشن کمپین کے پس پردہ،

مذہب، اس کے عقاید، خدا و رسول اور علمائے دین کے خلاف پروپیگنڈا کرنے اور نفرت پھیلانے کا خوب موقع مل رہا ہے۔ لیکن سنجیدہ حضرات پر ان کی توقع کے خلاف اس کا اثر ہوتا ہے۔ اس کا اندازا ایک خط کے مضمون سے کیا جا سکتا ہے جو علی گڑھ سے ایک صاحب نے جو ہر وقت یونی ورسٹی کو قریب سے دیکھتے رہتے ہیں، ایڈیٹر زمزم (لاہور) کے نام لکھا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''مولانا آپ میرے خیالات سے واقف ہی ہیں کہ میں اور میرا سارا خاندان پاکستان کا حامی اور لیگ کی پالیسی کا پیرو ہے، مگر چند امور ایسے ہیں جن کا تصور مجھے گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے۔ اگر میری بے چینی حد سے نہ بڑھ گئی ہوتی تو میں آپ پر ان کا اظہار کبھی نہ کرتا۔ میں نے ہمیشہ تعلیم یافتہ حضرات کو جاہل عوام پر ترجیح دی ہے۔ کیوں کہ علم، خواہ وہ کیسا ہی ہو بہ ہر حال جہل پر فوقیت رکھتا ہے۔ لیکن جب سے میں نے یونی ورسٹی کے طلبہ کی غنڈا گردی دیکھی ہے تو علم کے نام سے میری روح کانپنے لگی ہے۔ اللہ میری بے چینی دور کرے اور مسلم یونی ورسٹی کے طلبہ پر رحم فرمائے، ان کی حرکتوں کو دیکھ کر تو میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ موجودہ تعلیم انسان کو حیوان اور حیوان کو درندہ بنانے میں خاص کمال رکھتی ہے۔ خدا کی قسم! جاہل، ان تعلیم یافتہ حضرات سے ہزار درجے بہتر ہے۔ رام پور کا شہدہ بھی شریف ہے کہ وہ اپنے آپ کو شریف نہیں سمجھتا، کہاں سے وہ الفاظ لاؤں کہ ان روشن خیالوں کی سیرت کا ہلکا سا تصور ہی دماغ میں پیدا ہو جائے۔ دیکھتا ہوں اور تعلیم پر ہزار ہزار لعنت بھیجتا ہوں، دنیا کی وہ کونسی بدزبانی ہے جو ان کی زبان پر نہ ہو، اُٹھتے بیٹھتے ہر وقت ان کی زبان سے سن لیجیے:

خدا سے جنگ مولوی کو گالی:

مولوی.... سور کا بچہ، حرام زادہ؛ جہاں کسی کتے کو دیکھا اور ہنس کر بولے ''دیکھنا ذرا مولوی فلاں تشریف لے جا رہے ہیں۔'' اور جب سے الیکشن کے سلسلے میں انھوں نے باہر قدم نکالا ہے، زمین تھرا اُٹھی ہے۔''

ابھی ایک اقتباس اور بھی ملاحظہ ہو:

"خفا نہ ہوں، میری دعا ہے کہ پاکستان جلد قایم ہو، مگر میرا خیال ہے کہ پاکستان قایم ہونے سے پہلے خدانہ کرے اسلام کا گورستان بننے والا ہے، مسلم یونی ورسٹی میں غالب اکثریت کمیونسٹوں کی ہے، مگر ایسے کمیونسٹ نہیں جو زبان سے بھی اقرار کریں بلکہ ایسے دشمن خدا جو آج کل سب سے زیادہ خدا کا نام لے رہے ہیں! گذشتہ ہفتے یونی ورسٹی کے ایک ہونہار نے میری موجودگی میں ایک صاحب سے کہا، مولویت کو ختم کیے بغیر خدا ختم نہیں ہوگا۔ اور دوسرے نے کہا، بھئی خدا بھی بہت ہی سخت جان نکلا، مگر اب ہمیں پچھاڑنے کا موقعہ مل گیا ہے۔ یہ بھی کئی بار سنا ہماری جنگ نہ مولوی سے ہے نہ مالوی سے، ہماری جنگ تو خدا سے ہے۔ ایک صاحب نے یونی ورسٹی سے قادیان کو لمبا چوڑا خط لکھا ہے کہ علمائے سوء کی مذمت میں اسلامی لٹریچر میں جو کچھ بھی نظر سے گزرا ہو خصوصاً حدیثیں اور بزرگوں کے اقوال وہ سب جمع کر کے بہت جلد ارسال کر دیجیے، یہ انتخابات کا وقت ہے، مولویوں کو ختم کرنے کے لیے آپ ہمارا ہاتھ بٹائیے۔ فلاں احمدی صاحب جو یہاں تعلیم پا رہے ہیں ان کا سفارش نامہ بھی منسلک ہے۔ غرض کیا کیا لکھوں؟ چاہتا ہوں کہ خود کشی کر لوں، یا ان..... کا نام ونشان مٹا دوں۔ آپ کو پاکستان پر شبہ ہے، مجھے مسلمان پر کہ خدا نے اس مخلوق کو کیوں پیدا کیا؟..... انا للہ وانا الیہ راجعون۔"

(زمزم-لاہور-۱۱رجنوری ۱۹۴۶ء)

یہ خط زمزم (لاہور) میں ۱۱رجنوری ۱۹۴۶ء کو شایع ہوا تھا۔ اس کا عنوان تھا "اس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔" اور یہ بتانا بھی لاحاصل ہوگا کہ خط میں جن مولوی صاحب کا نام حذف کر کے اس جگہ پر نقطے لگا دیے ہیں، وہاں ہمارے ہی بزرگ کا نام ہوگا۔ مکتوب نگار نے تو دکھ کے ساتھ یہ بات لکھی ہوگی کہ پاکستان اسلام کا گورستان بننے والا ہے۔ لیکن پاکستان کے قیام کے بعد کی تاریخ پر جن حضرات کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ پاکستان میں اسلام ہی سب سے زیادہ مظلوم ہے۔ بلاشبہ اسلامی سیرت کے بہترین نمونے پائے جاتے ہیں، لیکن عام زندگی میں اسلامی اخلاق وتہذیب کی کارفرمائی کہیں نظر نہیں آتی۔ پاکستان کی

زندگی کا جو دن بھی آج تک نمودار ہوا ہے اس میں عام زندگی سے اسلام نکلتا چلا جا رہا ہے۔ پاکستان میں اسلامی نظام حکومت کے قیام کی توقعات ایک ایک کر کے ختم ہو چکی ہیں۔ عام معاشرتی، کاروباری، سیاسی زندگی میں اسلام کا کردار بہ حیثیت ایک عامل کے باقی نہیں رہا۔ یہ بات عام طور پر زبانوں پر ہے کہ پاکستان میں اسلام ختم ہو گیا۔ کچھ مخلصین اسلام کے احیا کی کوششوں میں ضرور مصروف ہیں لیکن ان کی کوششوں سے زیادہ تیزی کے ساتھ مایوسی کے اثرات پھیل رہے ہیں۔

مولانا ظفر احمد تھانوی کے رسالے کا رد:

۱۳ر جنوری ۱۹۴۶ء: حضرت مولانا ظفر احمد تھانوی کا جو بیان اخبار خلافت میں مورخہ ۶ر اکتوبر ۱۹۴۵ء کو شایع ہوا تھا، اس کے رد میں مولانا سید محمد میاں علیہ الرحمہ کے ایک مختصر رسالے کا حوالہ پچھلی سطروں میں گزر چکا ہے۔ اس سلسلے کا دوسرا رسالہ سابقہ سے دوگنی ضخامت کا ہے۔ اس رسالے کا نام "نتیع المبتدی" ہے اور اس کے فاضل مصنف حضرت مولانا محمد عبدالحق صاحب نافع مدرس دارالعلوم دیوبند ہیں۔ یہ رسالہ نہایت تحقیق کے ساتھ لکھا گیا ہے اور بہ دلایل واضحہ ثابت کیا گیا ہے کہ مسئلہ آزادی ہند میں مشرکین سے استعانت و اعانت اور کانگریس کے ساتھ اشتراکِ عمل جایز ہے اور مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی نے بعض کتب فقہیہ کی عبارات میں جو ناقابل اغماض تصرفات کر کے یہ فتویٰ دیا تھا کہ شرکتِ کانگریس حرام اور شرکتِ لیگ واجب ہے، اس رسالے میں ایسے تصرفات کو بے نقاب کر دیا گیا ہے اور مسلم لیگ سے اعتراضات کو دفع کرنے کے لیے موصوف نے جو سعی لاحاصل فرمائی ہے، اس کو بھی عیاں کر دیا گیا ہے۔

پہلے یہ رسالہ الگ اور مستقل حیثیت میں شایع ہوا تھا، بعدہ مولانا سید محمد میاں مرحوم نے مجموعہ مضامین و فتاویٰ بہ عنوان "جواز شرکتِ کانگریس اور ازالۂ شکوک" میں بھی اسے شامل کر لیا تھا۔ فاضل مصنف اس رسالے کی تحریر سے ۹ر صفر ۱۳۶۵ھ/۱۳ر جنوری ۱۹۴۶ء کو فارغ ہوئے تھے۔ اس رسالے کا نام "نتیع المبتدی" تاریخی ہے، جس سے ۱۳۶۵ھ نکلتے ہیں۔

مولانا آزاد کی حمایت میں شیخ الاسلام کا ایک مکتوب:

تحریک پاکستان کے زمانے میں امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی ذاتِ گرامی مسلم لیگیوں کا خاص نشانہ رہی۔ مولانا پر علمی و سیاسی تنقید تو کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ ان کے خلاف افسانہ طرازیاں، طعن و تشنیع اور طرح طرح کے الزامات و اتہامات سے لے کر ان کے سامنے بے حیائی کے مظاہرے اور جسمانی تشدد کیا گیا۔ لیکن اس صاحب عزیمت کی تمام چیخ و پکار اور سعی و عمل ملک، مخلوق خدا، ملت اسلامیہ ہند اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور استعمار سے انھیں آزادی دلانے کے لیے تھا۔ مولانا آزاد کی زبان پر اپنے نادان مخالفین کے لیے ایک لفظ بھی شکایت کا نہ آیا۔ اس کے اتفاق و اختلاف الحب في الله و البغض فی اللّٰہ کی مثال تھا۔ اس کے تمام اعمال کا تعلق صرف اللہ کی رضا جوئی سے تھا۔ اس کے قلب کی پکار تھی ان صلاتی و نسکی و محیایٰ و مماتی للّٰہ رب العالمین، اور اس کا تمام الم واندوہ صرف اللہ کے لیے تھا۔ انما اشکوبثی و حزنی الی اللّٰہ و اعلم من اللّٰہ مالا تعلمون ۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے ذہن و قلب پر جن حقایق کو آشکار کر دیا تھا، لوگ عام طور پر ان سے محض نا آشنا تھے۔

مولانا آزاد پر الزامات و اتہامات کے سلسلے میں کسی صاحب نے حضرت شیخ الاسلام سے سوال کیا تھا۔ حضرتؒ نے کیسا مدلل اور شافی جواب عنایت فرمایا۔ اور جس حد تک جو بات حضرت کے خیال میں درست نہ تھی اس کا بھی صاف اظہار فرمادیا۔ یہ حضرت کی حق گوئی کی بڑی دلیل ہے۔ مولانا آزاد نے حضرت کا قرب و تعلق ۱۹۲۰ء سے تھا اور تادمِ آخر رہا۔ یہ تعلق محض رسمی نہ تھا، اخلاص و محبت کا تعلق تھا جس کا مختلف مواقع پر اظہار ہوا۔ اب حضرت کا خط ملاحظہ ہو جو مولانا آزاد سے متعلق ہے:

> ”مولانا ابوالکلام آزاد صاحب مدظلہ کی ذہانت اور علوم عربیہ کی واقفیت میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا، ان کی تصانیف اور مضامین اس کے گواہ ہیں۔ میں نے بارہا ان کے ساتھ نماز بھی پڑھی ہے اور جماعت میں شریک ہوا ہوں، میں نے کبھی ان کو شراب پیتے ہوئے دیکھا نہیں اور نہ شراب کے نشے میں پایا۔ جو لوگ ان پر اس قسم کے الزام رکھتے ہیں کوئی چشم دید واقعہ ذکر نہیں کرتے، ایسے

اعتراضات اپنے مخالف پر کرنے مسلمانوں میں ہمیشہ سے ہر زمانۂ تحریک میں مشاہدہ ہوتے رہے ہیں۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ مولانا آزاد صاحب مدظلہٗ میں بعض کمزوریاں بھی ہیں کہ وہ پنج گانہ جماعت کے مساجد میں پابند نہیں ہیں، داڑھی بھی ایک قبضے کے مقدار میں نہیں رکھتے، فوٹو کھچواتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ مگر وہ مقصد اہم جو کہ فریضۂ اسلامی ہے، اس میں یقیناً وہ نہایت استقلال اور عالی ہمتی سے جفاکش اور جانباز ہیں، ان کو دینی ہمدردی بھی بڑے پیمانے پر حاصل ہے، اللہ تعالیٰ ان کی امداد فرمائے اور اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق دے۔ آمین۔

والسلام

ننگِ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ

۱۳رشعبان ۱۳۶۵ھ"

مسلم لیگ کی شرکت اور اس کی امداد کی حیثیت:

۲۲رجنوری ۱۹۴۶ء / ۸رصفر ۱۳۶۵ھ: مولوی حکیم محمد علی (ضلع رہتک) کے ایک استفسار کے جواب میں حضرت مفتی صاحب نے تحریر فرمایا:

"مسلم لیگ ایک سیاسی جماعت ہے اس کی شرکت اور امداد کسی مسلمان پر فرض نہیں۔ جو لوگ اس کو صحیح سمجھیں وہ شریک ہوں اور جو اس کو غلط اور مسلمانوں کے لیے مضر سمجھیں وہ شریک نہ ہوں۔ اس کو اسلامی فریضہ بنا دینا اور شریک نہ ہونے والے کو کافر بتانا جہالت اور حماقت ہے۔ موجودہ پوزیشن اس کی مسلمانوں کی نظر میں اسلامی اصول کے خلاف ہے۔ اس لیے اس کی شرکت بجائے مفید ہونے کے اسلام کے لیے مضر ہے۔ اسلام کا درد رکھنے والے اس میں شریک نہیں ہو سکتے۔"

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہٗ۔ دہلی

اسی قسم کا ایک استفسار مولوی عبدالخالق (ضلع بارہ بنکی) نے کیا تھا۔ اس کے جواب میں حضرت مفتی صاحب نے فرمایا:

"موجودہ حالات اور ہندوستان کے واقعات کا تقاضا ہے کہ کانگریس

میں شریک ہوکر ہندوستان کی آزادی کی کوشش کی جائے۔ مسٹر محمد علی جناح مسلمان قوم میں تو شامل ہیں مگر فرقۂ شیعہ میں سے ہونے اور یوروپین تہذیب کے پابند ہونے کی وجہ سے ان کو مسلمان کہنا اور سمجھنا ایک رسمی بات ہے۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہٗ۔ دہلی

(کفایت المفتی (جلد نہم)، کتاب السیاسیات)

۲۷ر جنوری ۱۹۴۶ء: چمپارن (بہار) کے ایک شاعر محمود عالم حسینی کی ایک نظم بہ عنوان ''شان حسین احمد'' شایع ہوئی۔ نظم کی زبان صاف وشستہ اور اسلوب دل کش ہے۔ اس کا پہلا شعر یہ ہے۔

حسین احمد کہ جس کو منبع لطف و کرم کہیے
جسے فخرِ عرب کہیے جسے شانِ عرب کہیے

(زمزم-لاہور)

بابو راجندر پرشاد کی پیشین گوئی:

جنوری ۱۹۴۶ء: جنوری ۱۹۴۶ء کے ابتدائی ہفتے میں ایک بیان بابو راجندر پرشاد نے دیا کہ ہندوؤں نے بٹوارے کی تجویز کی سخت مخالفت کی ہے اور مجلسِ احرار، جمعیت علما، مومن کانفرنس، شیعہ کانفرنس نے بھی شدید مخالفت کا اظہار کیا ہے۔ اگر بٹوارے کی تجویز منظور ہو ہی گئی تو دونوں کے دلوں میں بے اعتمادی، بے اعتباری قایم رہے گی اور دونوں کو فوجوں کی فکر پڑ جاے گی۔ مسلم لیگی خواہ کچھ کہیں اس میں شک نہیں کہ دنیا کی تمام اسلامی حکومتیں عیسائی حکومتوں کی طرح دنیادار اور لامذہب ہوتی جارہی ہیں۔ چناں چہ پاکستان کے لیے اسلامی حکومت کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔

شیخ الاسلام کا دورۂ سرحد:

یکم فروری ۱۹۴۶ء: ہمارے خاص نامہ نگار کے قلم سے:

ڈیرہ اسماعیل خان ۲۷ر جنوری، شیخ الاسلام مولانا مدنی صدر مسلم پارلیمنٹری بورڈ ۲۲ر جنوری سے صوبۂ سرحد کا طوفانی دورہ فرما رہے ہیں۔ ہمارے خاص نامہ نگار نے جو کہ حضرت مولانا کے ساتھ سفر کر رہا ہے، یہ اطلاع دی ہے کہ مولانا کے دورے نے مسلم لیگ

سرحد کی امیدوں کے قلعے کو پاش پاش کر دیا ہے۔ مسلم لیگ سرحد اندرونی اور بیرونی دباؤ سے مجبور ہو کر شکست کی طرف تیزی سے قدم بڑھا رہی ہے۔

مولانا ابوالقاسم حفظ الرحمٰن ناظم جمعیت علمائے ہند مردان کی طرف دورہ کر رہے ہیں۔ یہاں کے پاکستان کا آسمان زمین پر گر چکا ہے۔ اب سرحد کے غیور اور بہادر مسلمان پوری طرح یہ سمجھ چکے ہیں کہ پاکستان ایک انتخابی فریب ہے۔ وہ برملا کہتے ہیں کہ وہ ناپاک لوگ جو اپنے دل و دماغ اور اپنے گھروں کو پاکستان نہیں بنا سکتے ہیں وہ اسلامی حکومت کا نعرہ لگانے میں کیسے حق بہ جانب ہو سکتے ہیں؟ اس کے علاوہ اورنگ زیب پارٹی، سعد اللہ پارٹی اور نشتر پارٹی لیگ کے اندر ایک دوسرے کو شک و شبہے سے دیکھ رہی ہے اور ہمارے حق میں اس کا اچھا اثر ہو رہا ہے۔

مولانا مدنی نے ڈیرہ اسماعیل خان سے لے کر کوہِ سلیمان تک جمعیت علما کے جلسہ ہائے عام کے متعلق گذشتہ تین روز میں جو برقی پیغام وصول ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۳ رجنوری کو حضرت مولانا نے ڈیرہ اسماعیل خان کے علاقے کے چار مقامات کا دورہ فرمایا (۱) بڑا دابن (۲) موسیٰ زئی (۳) چودھواں (۴) گرھی شموزئی۔ اور ۲ بجے شب میں کلاچی پہنچے۔ ہر مقام پر زائرین کا اژدحام تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ صرف زیارت کے شوق میں بیس بیس پچیس پچیس میل سے پیدل چل کر آئے تھے۔ دورہ الحمد للہ! بہت کامیاب رہا۔ سفر کا سلسلہ جاری ہے اور ۲۸ رجنوری کو بمبئی ایکسپریس سے لاہور کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔ (مدینہ۔ یکم فروری ۱۹۴۶ء، ص:۱)

۲۴ رجنوری کو کلاچی، ڈیرہ اسماعیل خان میں جلسہ ہوا۔ کئی ہزار نفوس کا اجتماع تھا۔ حضرت مولانا نے بڑی پر جوش تقریر فرمائی۔ حضرت نے فرمایا کہ اے سرحد کے غیور مسلمانو! تم تو شیر ہو اور تمہاری مائیں شیرنیاں ہیں، تم کو ہندوؤں سے ڈرا کر بزدل بنایا جاتا ہے۔ ہمارے لیے تو سارا ہندوستان پاکستان ہے۔ ہمارے اسلاف نے ہندوستان کو شرک سے پاک کر کے اسے پاکستان بنایا تھا۔ مگر اب ہندوستان کو مسلم لیگ دو حصوں میں تقسیم کر کے اقلیت والے صوبوں کو پھر کفرستان بنانا چاہتی ہے۔ آخر میں حضرت نے فرمایا کہ مسلم لیگ انگریزوں کی نکالی ہوئی اسکیم پاکستان کے لیے نعرہ بلند کر رہی ہے۔ اس لیے اُسے ہرگز ووٹ نہ دینا چاہیے۔ صرف جمعیۃ العلماء، مسلم پارلیمنٹری بورڈ اور احرار وغیرہ کے نمائندوں

کو ووٹ دینا چاہیے۔ حضرت نے دوران تقریر میں کانگریس، جمعیت علما اور لیگ کی تاریخ بیان کر کے ارشاد فرمایا کہ جمعیت علما کو ووٹ دینا اسلام کو ووٹ دینا ہوگا۔ کیوں کہ اس وقت اسلام اور دہریت کا کھلا ہوا مقابلہ ہے۔ کلاچی سے تقریر فرما کر حضرت مولانا نے حسب ذیل بارہ مقامات پر تقریریں فرمائیں۔

(۱) یوٹہ (۲) تہالہ (۳) چاہ گاں (۴) کورائی (۵) بندکورائی (۶) پہاڑ پور (۷) یارک (۸) پڑو (۹) شہباز خیل (۱۰) تتر خیل (۱۱) غزنی خیل (۱۲) لکی مروت۔ دورانِ سفر میں تھوڑی تھوڑی دور کے بعد ہزاروں کا مجمع سڑک پر کھڑا ہو کر مولانا سے مصافحہ کرتا تھا اور تکبیر کے نعروں کے ساتھ مولانا کو رخصت کرتا تھا۔ جس کی وجہ سے اکثر مقامات پر پہنچنے میں دیر ہو جاتی تھی۔ متعدد مقامات پر بندوقوں کی سلامی دی گئی جس کو سن کر مسٹر جینا کو غش آ گیا تھا۔ آج جمعہ کی نماز بنوں میں پڑھی جائے گی۔ حضرت مولانا اور ان کے رفقائے سفر خیریت سے ہیں۔

عزیز احمد قاسمی۔ بی اے (جامعی)
از لکی مروت۔ ضلع بنوں
۲۵ رجنوری ۱۹۴۶ء

(مدینہ۔ بجنور، یکم فروری ۱۹۴۶ء، ص:۱)

چند اہم دستاویزات — جمعیت علمائے ہند اور کانگریس کا معاہدہ۔ (اداریہ)

(مدینہ۔ بجنور، یکم فروری ۱۹۴۶ء)

جنرل شاہ نواز پر لیگیوں کا حملہ:

کلکتہ ۲۵ رجنوری۔ یونائیٹڈ پریس کی اطلاع ہے کہ میجر جنرل شاہ نواز پر کچھ مسلمانوں نے جو کانگریس کے خلاف نعرے لگا رہے تھے حملہ کر دیا۔ مگر خوش قسمتی سے انھیں چوٹ نہیں آئی۔ جنرل شاہ نواز یہاں نیتا جی سبھاش چندر بوس کی سال گرہ کے سلسلے میں آئے ہوئے ہیں۔ آپ زکریا اسٹریٹ کی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھنے کے بعد باہر نکلے اور اخبار والوں کی طرف سے ہندوستان ''اسٹنڈرڈ'' کے منیجنگ ڈائرکٹر مسٹر سوریش موز مدار نے جس دعوت کا انتظام کیا تھا اس میں شرکت کے لیے روانہ ہوئے تھے کہ کچھ مسلمانوں نے ان کی کار کو گھیر لیا اور اس کا کانگریس کا جھنڈا پھاڑ ڈالا اور کانگریس کے خلاف نعرے

لگائے۔ دو آدمی جنرل شاہ نواز کو بچانے کے لیے جھپٹے، لیکن زخمی ہو گئے۔ جنرل شاہ نواز کو چوٹ نہیں آئی۔ جنرل شاہ نواز نے اس واقعے کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا اور کانگریس کے مخالفوں کی اس حرکت کو حقارت سے نظر انداز کر دیا۔ جن مسلمانوں نے یہ مظاہرہ کیا وہ وضع قطع اور نعروں سے لیگی معلوم ہوتے تھے۔ (مدینہ: یکم فروری ۱۹۴۶ء، ص:۱)

مجاہد اعظم — ایک نظم:

۳ر فروری ۱۹۴۶ء: حضرت شیخ الاسلام کی شان میں "مجاہد اعظم" کے نام سے سابق مدیر بے باک سہارن پور کے ایڈیٹر اسعدی کی ایک نظم شایع ہوئی ہے۔ اس کا پہلا مصرع یہ ہے:

وہ ذاتِ محترم وہ قافلہ سالارِ آزادی
وہ مہرِ حریت وہ گرمی بازارِ آزادی

(زمزم - لاہور - ۳ر فروری ۱۹۴۶ء)

مولانا منصور انصاری کا انتقال:

۷ر فروری ۱۹۴۶ء: مورخہ ۲۰ر صفر کو انجمن خدام الاسلام سورت کی جانب سے مجاہد جلیل مہاجر کبیر شیر دل مرحوم مولانا محمد میاں منصور انصاری قدس اللہ سرہٗ ونور اللہ مرقدہٗ کے انتقال پُر ملال کے سلسلے میں ایک تعزیتی جلسہ ہوا، جس میں مرحوم کی زندگی پر تقریریں کی گئیں اور سامعین سے مرحوم کی زندگی کو اپنے لیے اسوۂ حسنہ بنانے کے لیے اپیل کی گئی۔ نیز اس حادثہ کبریٰ پر اظہار افسوس کرتے ہوئے مرحوم کے حق میں دعائے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے بالخصوص مولانا حامد الانصاری غازی کے لیے صبر جمیل کی دعا کی گئی۔ حق تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ (سکریٹری انجمن)۔

(زمزم - لاہور، ۷ر فروری ۱۹۴۶ء)

کیبنٹ مشن بھیجے جانے کا فیصلہ:

مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں:

"۱۷ر فروری ۱۹۴۶ء کو رات کے ساڑھے نو بجے میں ریڈیو سن رہا تھا، جب مجھے برطانیہ کے نئے فیصلے کی خبر ملی۔ لارڈ پیتھک لارنس نے پارلیمنٹ میں اعلان کیا تھا کہ

برطانوی حکومت، ہندوستان کو ایک کیبنٹ مشن بھیجے گی، جو ہندوستان کے نمائندوں سے تو
ملک کی آزادی کے سوال پر گفت وشنید کرے گا۔ یہی بات اس پروگرام میں بیان کی گئی جس
کا خاکہ وائسرائے کی اسی دن کی تقریر میں پیش کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ یہ مشن لارڈ پیتھک
لارنس وزیر ہند، تجارتی بورڈ کے پریسیڈنٹ سر اسٹیفورڈ کرپس اور محکمہ بحریہ کے پہلے لارڈ
اے وی الیگزینڈر پر مشتمل ہوگا۔ کوئی آدھے گھنٹے کے اندر ایسوسی ایٹڈ پریس کا ایک نمائندہ
آیا اور اس نے مجھ سے پوچھا کہ میرے اوپر اس خبر کا کیا اثر ہوا؟ میں نے اس سے کہا کہ
"مجھے خوشی ہے کہ لیبر حکومت نے فیصلہ کن قدم اٹھایا ہے۔ مجھے اس کی بھی خوشی ہے کہ سر
اسٹیفورڈ کرپس مشن کے ایک رکن ہوں گے۔ وہ ہم سے گفتگو کر چکے ہیں، اس لیے ایک
پرانے دوست کی طرح ہیں۔"

میں نے یہ بھی کہا کہ "میرے نزدیک یہ بات بالکل واضح ہے کہ نئی حکومت
ہندوستان کے مسئلے سے جی نہیں چرا رہی ہے، بلکہ جرأت کے ساتھ دشواریوں کا مقابلہ
کر رہی ہے۔ یہ بہت اہم تبدیلی ہے۔" (انڈیا ونس فریڈم: ص ۳۳۲)

کیبنٹ مشن کا تقرر:

۱۷ر فروری ۱۹۴۶ء: ۱۷ر فروری ۱۹۴۶ء کو لارڈ پیتھک لارنس سیکریٹری آف
اسٹیٹس نے لندن میں دارالعوام میں اعلان کیا کہ برٹش حکومت نے ہندوستان میں تین وزرا
پر یعنی سکریٹری آف اسٹیٹس لارڈ پیتھک لارنس، بحریہ کے پہلے لارڈ مسٹر اے وی الیگزینڈر
اور پریسیڈنٹ بورڈ آف ٹریڈ سر اسٹیفورڈ کرپس پر مشتمل ایک کیبنٹ مشن بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے
تا کہ وہ ہندوستان کے نمائندوں سے گفتگو کر کے ملک میں اس پروگرام کے متعلق جس کا
وائسرائے نے اپنی ۱۷ر فروری کی تقریر میں ذکر کیا ہے قدم بڑھائیں۔ وزیر اعظم انگلستان
مسٹر اٹلی نے بھی دارالعوام میں ایسا ہی اعلان کیا کہ

> "برٹش گورنمنٹ کا یہ منشا ہے کہ یہ مشن ہندوستان کو جلد تر اپنی آزادی کے
> حاصل کرنے کے لیے ان کی مدد کرے۔ ہم کو اقلیتوں کے حقوق کا پورا لحاظ
> ہے، تا کہ وہ آزادی سے اور بلا خوف اپنی زندگیاں بسر کر سکیں۔ دوسری جانب
> ہم اقلیتوں کو اکثریت کی ترقی پر ویٹو کا حق نہیں دے سکتے۔" آپ یہ نہیں

کر سکتے کہ ایک طرف ہندوستان کو حکومت کی ذمے داری سونپیں اور دوسری طرف یہاں ولایت میں اقلیتوں کی تحفظ کی ذمے داری اپنے اوپر لیے رہیں اور اس کے لیے معاملات میں اقتدار اپنے ہاتھ میں رکھیں۔"

ملاحوں کی بغاوت:

۱۸ر فروری ۱۹۴۶ء: ہندوستانی فوج کے بری، بحری اور فضائی تینوں شعبوں کے ہندوستانی سپاہیوں اور دوسرے عملے میں ملک کی آزادی کے کے لیے جذبات اتنے شدید ہو گئے تھے کہ وہ اپنے انگریز آفیسرز کی کوئی ناروا بات برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے اور سیاسی جلسوں میں شرکت سیاسی رہنماؤں سے ملاقاتوں میں فوج کے ڈسپلن کی باتوں کو بھی نظر انداز کر دیتے تھے۔

۱۹۴۶ء کے آغاز میں جہاز "تلوار" کے کمانڈر کنگ نے ہندوستانی ملازمین کو کتیوں کے پلے کہہ دیا۔

پہلے تو ان ملاحوں نے جنھیں گالیاں دی گئی تھیں احتجاج کیا، شکایتیں کیں، عرضیاں لکھیں اور بیڑے کے قاعدوں کے اندر سب کچھ کر کے دیکھ لیا۔ پھر ستم پر ستم یہ ہوا کہ ۱۸ر فروری کی صبح کو "تلوار" میں جو ناشتہ دیا گیا، بالکل سڑا ہوا تھا۔ ملاح جو پہلے ہی غصے سے بھرے بیٹھے تھے، اب بغاوت پر تل گئے۔ "تلوار" کے تمام ۱۱۰۰ ملاح باہر نکل آئے اور انھوں نے ہڑتال کر دی۔ انھوں نے کام کرنے سے قطعاً انکار کر دیا اور افسروں کی "تعمیل حکم" کے لیے ہلے بھی نہیں۔ کمانڈر کنگ نے دھمکی دی کہ تمھیں بہت ہول ناک سزا دی جائے گی۔ لیکن ملاحوں کا ارادہ اس سے اور پختہ ہو گیا۔ شام کو انھوں نے جلسہ کیا اور اپنی مانگیں مرتب کیں۔ یہ بہت ہی اہم اور بڑے معنی خیز مطالبات تھے۔

پہلے تو ان کے اپنے مطالبات کی فہرست تھی، کھانا اچھا ہو، راشن کافی ملے، کمانڈر کنگ کو سزا دی جائے، ہندوستانی ملاحوں کو انگریز ملاحوں کے برابر تنخواہ ملے، فوج سے سبک دوشی زیادہ تیزی سے ہو وغیرہ وغیرہ۔

لیکن یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہو گیا، انھوں نے اپنے ہی نہیں بلکہ عوام کے مطالبات بھی پیش کیے۔ وہ مطالبات جو اس وقت ہندوستان کے ہر بچے فرزند کی زبان پر تھے، وہ یہ

مطالبات تھے:

ا۔ تمام سیاسی قیدیوں کو فوراً رہا کیا جائے اور آزاد ہند فوج کے قیدیوں کو رہا کیا جائے۔

۲۔ انڈونیشیا سے ہندوستانی فوجیں فوراً واپس بلائی جائیں۔

اس کی خبر ہر طرف بڑی تیزی سے سارے ہندوستانی بیڑے میں پھیل گئی۔

۱۹ر فروری ۱۹۴۶ء: دوسرے دن ہڑتال سارے بمبئی میں پھیل گئی۔ فورٹ بارک کے آٹھ سو ملاح، کاسل بارک کے اڑھائی ہزار ملاح، بندرگاہ کے جہاز، ضلع تھانہ میں ''اکبر'' نامی ساحلی ادارہ ''چیتا'' نامی ایک اور ساحلی ادارہ کولابا اور محل کے وائرلیس کے مرکز اندھیری میں ''گکری'' اور ''مچھلی مار'' نامی ساحلی ادارے اور ''حملہ'' نامی جہاز سب میں یہ لہر پھیل گئی۔ بارہ ساحلی اداروں اور بیس سے زاید بڑے جہازوں اور قریباً سو چھوٹے جہازوں کے ۲۰ ہزار ملاح مکمل ہڑتال پر تھے۔

جہازوں پر افسروں سے اسلحے چھین لیے گئے اور زیادہ تر کو جہازوں سے نکال دیا گیا۔ ملاحوں نے بڑے اطمینان سے جہازوں کا پورا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ جہاں ضرورت تھی وہاں گارڈ تعینات کر دیے گئے۔ ''میگزین'' اسلحہ اور کھانے کے ذخیروں پر قبضہ کر لیا گیا، بہت سی جگہوں پر انگریز کا جھنڈا یونین جیک بھی اتار لیا گیا اور اس کی جگہ ترنگے اور مسلم لیگ کے سبز اور لال جھنڈے فخر سے لہرا دیے گئے۔

تمام جہازوں سے ''تلوار'' میں رسل و رسایل کے مرکزوں سے اور ساحلی اداروں سے، پورے ہندوستانی بیڑے اور تمام دوسرے جہازوں کے وائرلیس پر برابر یہی پیام بھیجے جانے لگے کہ ''ہم ہڑتال پر ہیں۔ ہم نے اپنی لڑائی شروع کر دی، تم بھی ساتھ آجاؤ۔'' اور اب دوسری جگہوں پر بھی۔ کراچی میں، کوچین، کولمبو، وزیگاپٹم، سنگاپور اور کلکتہ میں۔ غرض ہر جگہ یہی ہڑتال کا ذکر چھڑا ہوا تھا۔ اور کوئی دوسری بات سننے ہی میں نہ آتی تھی۔

بمبئی میں ہڑتالی ملاحوں کے لیے یہ تاریخ ایک زبردست تاریخ تھی۔ صبح نو بجے آزاد میدان میں تمام ہڑتالی ملاحوں کا جلسہ ہوا، جس میں مطالبات کا اعلان کر دیا گیا اور سب جلوس کی شکل میں وہی نعرے لگاتے ہوئے چلے جو سارے ہندوستان کی زبان پر تھے۔ ''انقلاب زندہ باد'' ''جے ہند'' ''ہندو مسلم ایک ہو'' ''آزاد ہند فوج کے قیدیوں کو رہا

کرو' ان کے یہ جلوس اور موٹریں ترنگے، ہرے اور لال جھنڈوں میں نہائی ہوئی شہر میں ہر طرف پھر رہی تھیں۔........ بمبئی میں ہندوستان کی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہو رہا تھا۔

انگریز اپنی موجودگی کا ثبوت دینے سے کہاں باز آتے ہیں۔ چناں چہ اس روز لاٹھی چارج بھی کیا گیا لیکن ملاحوں نے اس کا مزا چکھا دیا۔ پولیس کے ایک ظالم انگریز افسر زخمی ہو گئے اور اسپتال کی ہوا کھانے کے لیے بھیج دیے گئے۔

اب انگریز آقاؤں کو احساس ہوا کہ یہ تو کوئی نئی بات ہو رہی ہے۔ بمبئی کا فلیگ آفیسر کمانڈنگ یعنی بمبئی کے ہندوستانی بیڑے کے لیے انگریزوں کا مقرر کیا ہوا ''خدا'' اور نائب امیر البحر ''راٹرے'' شام کو ''تلوار'' میں آیا جو ہڑتالی سرگرمیوں کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ اس نے شکایتوں کی فہرست طلب کی لیکن ملاحوں نے اس سے بات کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ پہلے ہمیں یہ یقین دلاؤ کہ ہم مطالبات پیش کرنے اور بات چیت کرنے کے لیے اپنے جو لیڈر مقرر کریں گے ان کو گرفتار نہیں کیا جائے گا۔

راٹرے کو یہ وعدہ کرنا پڑا۔ مطالبات کی فہرست اُسے دے دی گئی اور وہ یہ وعدہ کر کے چلا گیا کہ ساڑھے چار بجے تک ان کا جواب دے دوں گا۔ لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ ''حملہ'' کے تین سو ملاحوں کو گرفتار کر لیا۔

رات کو تمام جہازوں اور ساحلی اداروں میں ملاحوں نے اپنے اپنے جلسے کیے اور اپنی اپنی ہڑتال کمیٹیاں منتخب کیں تاکہ وہ اپنے ادارے یا جہاز میں ہڑتال چلائیں اور مرکزی ہڑتال کمیٹی کے لیے جو ہڑتال کو مجموعی طور سے چلانے کے لیے بنائی جا رہی تھی اپنے یہاں سے ایک ایک نمائندہ چنا۔

۲۰ر فروری ۱۹۴۶ء: ۲۰ر فروری کو دونوں طرف معرکے کی تیاریاں ہونے لگیں۔

سامراجیوں نے وہی دوہری چال چلی۔ پہلے تو تمام ساحلی اداروں میں فوج تعینات کر دی گئی۔ البتہ انھیں مسلح جہازوں پر اپنی فوج بھیجنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ دوسری طرف ملاحوں کا جوش ٹھنڈا کرنے کے لیے خوب اچھا کھانا بھیجا گیا جو بہ قول سرکاری بیان کے ''ہڑتالی لیڈروں کے دیے ہوئے مینو کے مطابق تھا۔''

لیکن ملاحوں نے ''اوول'' نامی میدان میں جلسہ کیا اور پھر اپنے اس ارادے کا اعادہ کیا کہ جب تک ان کے مطالبات پورے نہ ہوں گے اور فوج ہٹائی نہیں جائے گی اس وقت

تک ہڑتال جاری رہے گی۔ اس جلسے کے بعد پھر شہر کے جنوبی حصے میں جلوس نکلے اور ہڑتالیوں کے مظاہرے ہوئے۔ "راٹرے" نے ایک اور چال چلی اور حکم جاری کیا کہ تمام ملاح ساڑھے تین بجے تک اپنے اپنے بارک میں جمع ہو جائیں۔ ملاحوں نے اس حکم کو قریب قریب ٹھکرا دیا.....

اسی دوران کراچی میں بھی بمبئی کے ملاحوں کا پیام پہنچ چکا تھا، تمام جہازوں اور ساحلی اداروں نے اسے اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ اس سے ایک روز پہلے ہی "راڈر" چلانے کی تعلیم دینے والے اسکول "چمک" میں ملاحوں نے خفیہ جلسے کیے تھے اور طے کیا تھا کہ انھیں بھی ہڑتال میں شریک ہو جانا چاہیے، چناں چہ ۲۰ر تاریخ کی صبح تک "ہندوستان" اور "ٹراونکور" نامی دو جہازوں میں ہڑتال ہو گئی تھی اور ساحلی اداروں "چمک، بہار اور ہمالیہ" میں ہڑتال کا زوروں سے چرچا ہو رہا تھا۔ ہڑتال کسی وقت بھی شروع ہو سکتی تھی۔

کلکتہ میں بہالہ کے مقام پر "ہگلی" نامی ساحلی ادارہ اور "راج پوتانہ" نامی جہاز کے ملاحوں نے ہڑتال کر دی تھی۔ جنوب کی طرف کوچین کے علاقے میں دندوزوتھی کے مقام پر جو تارپیڈو کی تربیت دینے والا ادارہ تھا، وہاں بھی ہڑتال شروع ہو گئی تھی۔ لیکن ان سب میں بمبئی سرگرمیوں کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ راٹرے کے "بارک کو واپس جاؤ" والے حکم سے سارے شہر میں بڑی سنسنی پھیل گئی تھی۔

تقسیم ملک کا پیش خیمہ — گاندھی جی کی تشویش!

۲۰ر فروری ۱۹۴۶ء: حکومت برطانیہ نے ایک بڑا قدم اٹھایا۔ ۲۰ر فروری ۱۹۴۶ء کو ایٹلی نے اعلان کیا کہ برطانیہ "جون ۱۹۴۸ء تک اقتدار ہندوستان کے ذمے دار ہاتھوں میں منتقل کرنے کے لیے تیار ہے۔" انھوں نے مزید کہا کہ حکومت برطانیہ "اس پر بھی غور کرے گی کہ برطانوی ہند کا اقتدار مقررہ تاریخ پر کس کو سونپا جائے، کسی مرکزی حکومت کو یا کچھ علاقوں میں موجودہ صوبائی حکومتوں کو یا کسی اور طریقے سے جو نہایت معقول نظر آئے۔" ایٹلی نے کہا کہ ویول کو وائسرائے کے عہدے سے ہٹانا ہوگا اور ان کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن بادشاہ سلامت کے چچازاد لیں گے۔

گاندھی نے ایک خط میں نہرو کو لکھا:

"یہ اقدام قیام پاکستان پر منتج ہو سکتا ہے اور وہ صوبے یا علاقے پاکستان میں شامل ہو سکتے ہیں جو اس خواہش کا اظہار کریں۔" (مسلم افکار، ص ۲۵۶)

ملاحوں کی بغاوت:

۲۱ر فروری ۱۹۴۶ء: جمعرات ۲۱ر فروری اور جمعہ ۲۲ر فروری ۱۹۴۶ء، ہندوستان کی آزادی کی لڑائی کے تاریخی دن بن گئے۔ ۲۱ر تاریخ کو ہندوستانی ملاحوں اور سامراجی سپاہیوں میں پہلی بار بمبئی اور کراچی دونوں جگہ مسلح جنگ ہوئی۔ بمبئی میں معرکہ بالکل سویرے ہی شروع ہو گیا۔ ویسے تو اس سے ایک روز پہلے ہی شام کے وقت مراٹھا سپاہیوں کو تعینات کر کے سامراجیوں نے ملاحوں کے مرکزوں کو گھیر لیا تھا لیکن رات کو جب ملاحوں نے ان مراٹھا سپاہیوں سے اپیل کی "تم بھی تو ہندوستانی ہو، اور ہم بھی ہندوستانی ہیں۔ پھر آخر تم ہمارے اوپر گولیاں چلانے کیوں آئے ہو؟" تو سپاہیوں نے جواب دیا "ہم تمہارے اوپر گولیاں نہیں چلا سکتے، ہماری گولیاں بھی خالی ہیں۔"

۲۱ر تاریخ کی صبح کو قریباً پونے ۹ بجے ان سپاہیوں میں سے بعض کو "کاسل بارک" پر خالی فائر کرنے کا حکم دیا گیا۔ مراٹھا سپاہیوں نے خالی فائر کیے، یہ دیکھ کر گوروں کی اور ہمت بڑھی اور انھوں نے مراٹھا سپاہیوں کو حکم دیا کہ بارک کے اندر گھس جاؤ۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح ملاحوں کو ڈرا کر زیر کر لیا جائے گا۔ لیکن ملاح اتنی آسانی سے ڈرنے والے نہیں تھے۔ فوراً انھوں نے اپنے بارک کے گارڈ روم کا تالا توڑا اور قریب تیس رائفلیں بارہ ریوالور اور ان کی گولیاں نکال کر چند ہی منٹ کے اندر خاص خاص ملاحوں میں تقسیم کر دیں اور ان کو پھاٹکوں پر تعینات کر دیا گیا۔ مراٹھا سپاہیوں نے جب دیکھا کہ ان کی امید کے خلاف ملاح مقابلے کے لیے تیار ہو گئے ہیں تو وہ پیچھے ہٹ گئے۔

دو گھنٹے بعد دونوں طرف سے پھر گولیاں چلیں۔ اس بار ایک میگزین (بڑے اسلحہ خانہ) کا تالا توڑ کر قریب ۱۵۰ رائفلیں، چند ایک ریوالور اور تین مشین گنیں اور ان سب کی گولیاں کافی مقدار میں لے آئی گئیں۔ مشین گن سب سے زیادہ مفید اور کارگر اسلحہ تھا۔ اور انھیں ایسی جگہ لگا دیا گیا کہ جس طرف سے حملے کا سب سے زیادہ خطرہ تھا۔ اُدھر فوراً آتش باری شروع کی گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔ سامنے ذرا فاصلہ پر

گورے سپاہیوں کی بارک نظر آرہی تھی۔ جن سے ہندوستانیوں کو سب سے زیادہ خطرہ تھا۔ اس کے سامنے ملاحوں نے گولیوں کی سب سے زیادہ باڑھ لگادی۔ مشین گنیں بھی اسی کا رخ کر کے تڑتڑانے لگیں۔ کئی دستی بم بھی پھینکے گئے۔ کئی گورے زخمی ہوئے۔ مرنے والوں کی تعداد معلوم نہیں ہوسکی۔ ہندوستانی ملاح بھی گھائل ہوئے اور ایک نوجوان ملاح شہید ہوگیا۔ اس کی لاش بڑے احترام سے بارک کے سامنے والے احاطے میں لائی گئی۔ اور وہاں اسے ایک کپڑے میں لپیٹ کر اس پر خون کا ایک نشان بنا دیا گیا۔ تاکہ سارے ہندوستانی اس لڑائی میں جو بھی باقی تھی، اس خون کو یاد رکھیں۔

جیسے ہی کاسل بارک میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کے اس معرکے کی خبر پھیلی سمندر کے اندر جہاز بھی لڑائی کے لیے تیار ہوگئے۔ ہندوستانی بیڑے کے حاکم جہاز، ''نربدا'' سے ہر طرف حکم دے دیا گیا کہ ''تیار ہو جاؤ''۔ ''آسام اور پنجاب'' نامی جہازوں نے جب دیکھا کہ کچھ گورے سپاہی ایک اونچی جگہ پر جمع ہوکر کاسل بارک کے ہندوستانی ملاحوں پر آتش باری کی تیاری کر رہے ہیں تو انھوں نے اُسی مقام پر آتش باری کر دی اور انگریز تتر بتر ہوکر بھاگ گئے۔ اس طرح یہ لڑائی دیر تک چلتی رہی۔

پھر دوپہر کے بعد دو بج کر بیس منٹ پر ہندوستانی بیڑے کے سب سے بڑے افسر امیر البحر ''گوڈ فرے'' نے ریڈیو پر اپنی گونج گرج والی تقریر کی اور کہا کہ ہمارے پاس کہیں زیادہ طاقت موجود ہے، اور اگر ملاحوں نے ہتھیار نہ ڈالے اور ہار نہ مانی تو میں پورا ہندوستانی بیڑہ تباہ کر کے رکھ دوں گا۔ ان گیدڑ بھبکیوں نے ملاحوں کا ارادہ اور پختہ کر دیا۔ ''گوڈ فرے'' صاحب اس تقریر سے پہلے بھی ملاحوں میں دہشت پھیلانے کے لیے انگریزی طیاروں کی بندرگاہ کے علاقے میں اڑان کرا چکے تھے اور اب چند بڑے بڑے انگریزی جنگی جہاز اس جنگ میں حصہ لینے کے لیے پہنچ چکے تھے اور تیار کھڑے تھے.....

۲۱ر فروری کو کراچی میں بھی ہندوستانی بیڑے کے ہڑتالیوں نے ہندوستان کے بدیسی آقاؤں کے خلاف پہلی بار مسلح لڑائی لڑی۔ کراچی کے تمام ساحلی اداروں ''ہمالیہ، بہادر اور چمک'' کے ملاح ''ہندوستان'' کے ادارے میں جمع ہوگئے تھے، جو کراچی میں اُسی طرح ہڑتالی سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا تھا جیسے بمبئی میں ''تلوار''۔ دوپہر تک یہاں چھ سو ملاح آچکے تھے۔ حال آں کہ اس ادارے میں عام طور پر قریباً سو ملاح رہتے ہیں۔ انگریزوں

نے بھی پہلے ہی سے تیاری شروع کردی تھی۔ اور ''بلوچ رجمنٹ'' کے دو پلاٹونوں (قریب ساٹھ سپاہیوں) کو حکم دیا تھا کہ جاکر ''ہندوستان'' پر قبضہ کرلو۔ لیکن یہ سپاہی ہندوستانی تھے اس لیے انھوں نے اپنے بھائیوں کے خلاف قدم بڑھانے سے انکار کردیا۔ اس پر گورے سپاہیوں کو بڑھنے کا حکم دیا گیا۔ اُدھر ہندوستانی ملاحوں نے اپنے مرکز ''ہندوستان'' کے انگریز کمانڈنگ آفیسر کو حکم دیا کہ وہ فوراً وہاں سے نکل جائے۔ اس افسر نے جاتے جاتے اپنے پستول سے فائر کردیا۔ اُسے دیکھ کر گورے سپاہی ''ہندوستان'' کے ملاحوں پر گولیاں چلاتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ لیکن بمبئی کے کاسل بارک کی طرح کراچی کے ہندوستان میں بھی ہندوستانی جوان اس حملہ سے ذرا نہیں گھبرائے۔ انھوں نے آڑ لے کر ''اوئرلیکن'' نامی چھوٹی توپوں کے دہانے گوروں کی طرف کر کے کھول دیے۔ گوروں نے جب دیکھا کہ یہ ٹیڑھی کھیر ہے تو پیچھے بھاگ گئے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں گوروں نے پھر آتش باری شروع کی، جس سے دو ملاح شہید ہو گئے۔ ملاحوں نے دیکھا کہ چھوٹی توپوں کا اثر نہیں ہوتا تو انھوں نے چار انچ کے دہانوں والی بڑی توپوں سے گولہ باری شروع کردی۔ گورے پھر تتر بتر ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ ''چمک، بہادر اور ہمالیہ'' میں جو ہندوستانی ملاح رہ گئے تھے انھوں نے اپنے اپنے الگ جلسے کیے اور ہر جلسے میں مطالبہ کیا گیا کہ انگریز فوجیں فوراً واپس ہٹائی جائیں۔

دوسرے دن بائیس تاریخ کی صبح کو کراچی کی لڑائی اپنے شباب پر پہنچ گئی۔ اس وقت تک سمندر میں جوار بھاٹے کی واپسی لہر شروع ہو چکی تھی۔ پانی کی سطح بہت گر گئی تھی اور اس کے ساتھ ملاحوں کا خاص ''جنگجو جہاز'' ہندوستان کل کے مقابلے میں بہت نیچا ہو گیا تھا اور اس کی توپوں کی زد ٹھیک نہیں پڑتی تھی۔ اس کمزوری سے فایدہ اٹھا کر انگریزوں نے دس بجے صبح پھر ''ہندوستان'' پر حملہ کیا۔ ملاح پچیس منٹ تک کھڑے رہے اور موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لڑتے رہے۔ چھ شہید ہو گئے، ۲۵ زخمی ہوئے، لیکن دشمن کی طاقت بہت زیادہ تھی۔ ''ہندوستان'' کو سپر ڈالنی پڑی۔ ساڑھے تین سو ہندوستانی ملاح اسی وقت گرفتار کر لیے گئے۔

''ہندوستان'' کراچی میں ہڑتال کا سب سے بڑا اڈا تھا۔ اس کا معرکہ ختم ہو جانے کے بعد دوسرے اداروں کے ملاحوں نے بھی سپر ڈال دی اور ملاحوں کی ہڑتال ختم ہو گئی۔

لیکن کراچی کے عوام نے جدو جہد جاری رکھی۔ ۲۳ر تاریخ کو تمام کارخانوں اور کاروبار میں عام ہڑتال ہوئی اور تیس ہزار آدمیوں کا زبردست مظاہرہ ہوا۔ پولیس اور فوج نے مظاہرہ کرنے والوں پر گولیاں چلائیں۔

دوسری جگہوں پر بھی اکیس اور بائیس فروری کو ہندوستانی بیڑے میں زبردست ہڑتالیں ہوئیں۔ کلکتہ کے پورے سترہ سو ملاح باہر نکل آئے۔ کوچین میں سات سو ملاحوں نے ہڑتال کی۔ وزیگاپٹم میں تیرہ سو ملاحوں نے اکیس تاریخ کو ہڑتال شروع کی۔ لیکن ۲۲ر فروری کو اُسے بڑی سختی سے دبا دیا گیا اور قریباً تین سو آدمی گرفتار کر لیے گئے۔ جام نگر جیسی جگہ میں بھی جو کاٹھیاواڑ کی ایک پس ماندہ ریاست ہے اور ہڑتال کے اس دھارے سے بالکل الگ تھی، ''دلسورا'' نامی ساحلی ادارے کے تمام تین سو ملاحوں نے ہڑتال کی اور سخت مقابلے کے باوجود ۲۳ر تاریخ تک ڈٹے رہے اور جب بمبئی کی ہڑتال ختم ہوگئی تب واپس آگئے۔

لیکن ان میں سب سے زیادہ حوصلہ خیز اور دلیرانہ واقعہ ''کاٹھیاواڑ'' کا ہے۔ کاٹھیاواڑ ایک چھوٹے سے جہاز کا نام تھا۔ جس پر صرف ۱۲۰ر ملاحوں کا عملہ کام کرتا تھا۔ جب ہڑتال شروع ہوئی تو یہ جہاز گجرات کے ''موردی'' نامی بندرگاہ میں لنگر ڈالے ہوئے تھا۔ اس دور و دراز بندرگاہ میں ان بے چارے ہندوستانی ملاحوں کو اسی روز یعنی ۲۱ر تاریخ کو کاسل بارک کے معرکے کی بس اڑتی ہوئی خبریں ملی تھیں۔ لیکن ان کے لیے یہ دھندلا خاکہ ہی اس معرکے کی انقلابی اہمیت سمجھنے کے لیے کافی تھا۔ انھوں نے بھی ہڑتال کا فیصلہ کرلیا۔ اس وقت صبح ہوچکی تھی، جہاز تھوڑی دیر میں لنگر اٹھا کر سفر پر روانہ ہونے والا تھا۔ چناں چہ انھوں نے طے کیا کہ جیسے ہی جہاز سمندر میں پہنچے گا، ان کی ہڑتال شروع ہو جائے گی اور نہ صرف ہڑتال شروع ہو جائے گی، بلکہ وہ جہاز کے افسروں کو بے دخل کر کے خود قبضہ کرلیں گے اور جہاں جہاز جارہا ہے اس کے بجائے اسے بمبئی لے جائیں گے اور وہاں ہندوستانی بیڑے کے بڑے معرکے میں شریک ہوں گے۔

دس بجے صبح جہاز بندرگاہ سے چل پڑا۔ ملاحوں نے اپنا جلسہ کیا اور عین اسی وقت کراچی میں ''ہندوستان'' نے انھیں وائرلیس پر پیام بھیجا کہ ہماری مدد کو آؤ۔ انھوں نے طے کرلیا کہ بمبئی کے بجائے اب انھیں کراچی جانا ہے اور فوراً جہاز کے کپتان کو زبردستی جہاز

کے "پل" پر سے گھسیٹ لے گئے، اُسے اور دوسرے افسروں کو گرفتار کر کے بند کر دیا اور جہاز کا رخ کراچی کی طرف موڑ دیا۔ ایک بجے کے قریب انھوں نے ایک سرکاری وائرلیس کے مراسلے کو اپنے ریڈیو پر پکڑا جو نئی دہلی میں جنرل ہیڈ کوارٹر سے بمبئی کے انگریز افسروں کو بھیجا جا رہا تھا۔ اس میں اطلاع دی گئی تھی کہ اسی کراچی کے "ہندوستان" نے جس کی مدد کو وہ جا رہے تھے، ہتھیار ڈال دیے ہیں۔

اب انھوں نے ایک اور جلسہ کر کے پھر بمبئی جانے کا فیصلہ کیا۔ کپتان کو نکال کر اس سے کہا گیا کہ اگر تم بمبئی کی طرف چلو تو تمھیں جہاز چلانے کی اجازت دے دی جائے گی۔ کپتان کو یہ ڈر تھا کہ "ناتجربہ کار" ملاح اگر کہیں کوئی گڑبڑ ہی کر دیں اور جہاز کو کوئی حادثہ پیش آجائے تو اس کی اپنی بھی جان جائے گی۔ (حال آں کہ تین گھنٹے تک ملاح اس کے تجربے اور ہدایت کے بغیر پوری کامیابی سے جہاز چلاتے رہے تھے) اس لیے وہ فوراً تیار ہو گیا۔ لیکن اس اجازت کے باوجود جہاز کی کمان اور پورا اختیار ملاحوں نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھا اور راستے بھر وہ گاتے رہے اور جوش ملیح آبادی کا یہ شعر سمندر کی وسعتوں میں گونجتا رہا ؎

کام ہے میرا تغیر، نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

۲۲ فروری ۱۹۴۶ء: ۲۲ تاریخ کی صبح تک سارے ہندوستانی بیڑے کی ہڑتال پورے شباب پر پہنچ چکی تھی اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ بمبئی کے شہر میں بھی عام اور مکمل ہڑتال ہو گئی۔ جہازیوں کی مرکزی ہڑتال کمیٹی کی آواز پر سارے شہر نے لبیک کہی۔ سردار پٹیل، کانگریس اور لیگ کے لیڈروں نے اس ہڑتال کو روکنے کی کوشش کی لیکن عوام تلے بیٹھے تھے اور اب انھیں کوئی طاقت نہیں روک سکتی تھی۔

دس بجے صبح تک پوری حالت بالکل صاف ہو کر سامنے آگئی، ۳ لاکھ سے زیادہ مزدور اور تیس ہزار سے زاید طلبا ہڑتال پر تھے۔ ان کے علاوہ بمبئی کے لاکھوں شہری بمبئی کی سڑکوں پر مظاہرے کر رہے تھے۔ ترنگے، ہرے اور لال جھنڈے بمبئی میں ہر طرف ایک ساتھ لہرا رہے تھے، گلی گلی اور کوچہ کوچہ، انقلابی نعروں سے گونج رہا تھا۔ بمبئی جیسے انقلابی شہر نے بھی اتنی بڑی ہڑتال کبھی نہیں دیکھی تھی۔

دس بجے کے قریب بمبئی کے عوام پر انگریزوں کا حملہ شروع ہوا۔ اس وقت تک حکم

رانوں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اب بات صرف جہازیوں کی ہڑتال کی نہیں رہی ہے۔ انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ کانگریسی لیڈر جہازی جوانوں کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر رہے تھے اور اس لیے جہاں تک جہازیوں کا تعلق ہے ان سے بھگتنے کا کام کانگریس پر چھوڑ دینا چاہیے۔ اس لیے اب ہمارا خاص کام یہ ہے کہ اس بغاوت کی حمایت میں شہر میں جونئی بغاوت شروع ہوگئی ہے اُسے کچلا جائے اور اس غرض سے وہ جنرل لاک ہارٹ کو بمبئی پر حملے کی کارروائیوں کو چلانے کے لیے لے آئے۔ یہ جہازی افسر نہیں بلکہ فوجی افسر اور جنوبی فوج کا کمانڈر تھا۔ اس شخص نے گورے سپاہیوں کو لاریوں، توپ گاڑیوں، ٹینکوں اور بکتر بند موٹروں میں بٹھا کر اور ہر طرح کے اسلحوں سے لیس کر کے سارے شہر میں گھمانا شروع کیا۔ ان کی گاڑیاں زناٹے سے گزرتی تھیں اور سڑکوں کے دونوں طرف تڑا تڑ گولیاں برتی جاتی تھیں۔ ہر طرف ایک قتل عام کا منظر تھا۔ لوگ اندھا دھند مارے جا رہے تھے، لیکن ان گورے قاتلوں کے ہم راہ ایک بھی ہندوستانی سپاہی نہیں رکھا گیا تھا، انگریز کو ہندوستانی سپاہی پر بالکل بھروسا نہیں رہا تھا۔

اس روز بمبئی کی سڑکوں اور گھروں میں سیکڑوں آدمی مارے گئے اور بے شمار زخمی ہوئے۔ محض مرنے والوں کی تعداد ۲۷۰ بتائی جاتی ہے۔ لیکن عوام انگریز کے حملے سے بھاگے نہیں بلکہ بہادری سے لڑتے رہے۔ ڈیلا یل روڈ پر پورے تین گھنٹے تک مسلح جنگ ہوتی رہی۔ ڈنکن روڈ پر "آنکھ مچولی" جنگ کا سلسلہ گھنٹوں چلتا رہا۔ بدیسی فوج ہندوستانیوں کے دل میں ہیبت بٹھانے آئی تھی لیکن سیکڑوں کو قتل کرنے کے باوجود وہ اپنے اصل مقصد میں رتی بھر کامیاب نہیں ہوئی۔

اِدھر نہتے لوگ سڑکوں پر لڑ رہے تھے، ہندوستانی بیڑے کے جوانوں کی حمایت میں پانی کی طرح اپنا خون بہہ رہے تھے، گوری فوجوں، اس کے ٹینکوں، بکتر بند گاڑیوں اور مشین گنوں کو نیچا دکھا رہے تھے۔ اُدھر سیاسی رہنما اس جدوجہد کے آگے آ کر اس کی قیادت کرنے کے بجائے اسے دبانے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ سردار پٹیل سے مرکزی ہڑتال کمیٹی کے نمایندوں کا اصرار تھا کہ ہتھیار ڈلوانے سے پہلے حکومت کی طرف سے سرکاری طور پر اس کا وعدہ لیا جائے کہ ہڑتالیوں کی کسی قسم کی سزا نہیں دی جائے گی اور ان کی شکایتیں دور کی جائیں گی اور کانگریس اور لیگ دونوں حکومت کے وعدے کی ضمانت حاصل کریں۔

سردار صاحب نے صرف یہ یقین دلایا کہ "کانگریس انتہائی کوشش کرنے گی کہ کسی قسم کی بھی سزا نہ دی جائے اور ملاحوں کی جایز شکایتیں جس قدر جلد ممکن ہوں دور کی جائیں۔ اور انھوں نے ہڑتال کمیٹی کے صدر سے یہ بھی کہا کہ "کانگریس کا مشورہ یہ ہے کہ ہتھیار ڈال دیے جائیں۔

ملاحوں کی بغاوت کا خاتمہ:

۲۳ر فروری ۱۹۴۶ء: "کاٹھیواڑ" اپنے ملاحوں کی کمان میں بمبئی پہنچا، لیکن ۲۳ر تاریخ کو جب یہاں ہڑتال ختم ہو چکی تھی، اس لیے اور جہازوں کے ساتھ کاٹھیواڑ کو بھی ہتھیار ڈالنے پڑے۔ اس طرح "ہندوستان" کے اس "سفینۂ آزادی" کا جس کے ناخدا گورے افسر نہیں بلکہ صرف محب وطن ہندوستانی سورما تھے، پہلا اور ہماری تاریخ کا بے نظیر سفر ختم ہو گیا۔

بحریہ کے ہندوستانی عملے کی بغاوت کے سلسلے میں مولانا آزادؒ نے انڈیا ونس فریڈم میں جو کچھ تحریر کیا ہے اس سے اس کے پس منظر اور اس کی تاریخی اہمیت پر روشنی پڑتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

> "ہندوستانی بیڑے کے کچھ آفیسر کراچی میں مجھ سے ملے تھے۔ منجملہ اور شکایتوں کے انھوں نے نسلی امتیاز کا بھی ذکر کیا تھا، اور کہا تھا کہ اب تک اس امتیاز کے خلاف انھوں نے جو اجتماعی درخواستیں دی تھیں اور احتجاج کیا تھا اس کا کوئی اثر نہیں ہوا ہے۔ ان کی بے اطمینانی بڑھتی رہی اور دہلی میں، میں نے اچانک یہ خبر پڑھی کہ انھوں نے عملی احتجاج شروع کر دیا ہے اور حکومت کو مطلع کیا ہے کہ اگر ایک مقررہ تاریخ تک ان کے مطالبے پورے نہ کیے گئے تو وہ سب ایک ساتھ استعفا دے دیں گے۔ یہ تاریخ گزر گئی ہے اور انھوں نے اپنے فیصلے کے مطابق بمبئی میں ایک عام جلسہ کیا ہے، اس خبر کو سن کر سارے ملک میں بجلی کی سی لہر دوڑ گئی اور قوم کی بہت بڑی اکثریت ان کے ساتھ ہو گئی۔ حکومت بھی اس سے بہت پریشان ہو گئی۔ اس نے حفاظت کی خاطر برطانوی فوج تعینات کر دی اور ہندوستانی بیڑے کے تمام جہازوں پر انگریز آفیسر اور

ملاح مقرر کر دیے۔

میرے ذہن میں یہ بات صاف تھی کہ یہ عوامی تحریک یا عملی احتجاج کے لیے مناسب موقع نہیں ہے۔ ہم کو دیکھنا تھا کہ کیا ہوتا ہے اور برطانوی حکومت سے گفتگو بھی کرنا تھا۔ اس لیے میرے نزدیک ہندوستانی بیڑے کے آفیسروں کا یہ اقدام غلط تھا۔ اگر نسلی امتیاز کی وجہ سے انھیں تکلیف پہنچی تھی تو یہی تکلیف فوج اور ہوائی بیڑے کے لوگوں کو بھی تھی۔ ان کا احتجاج کرنا تو حق بہ جانب تھا، لیکن اس طرح کا عملی احتجاج مجھے مصلحت کے خلاف معلوم ہوتا تھا۔

مسز ارونا آصف علی نے بیڑے کے آفیسروں کے معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ان کی بہت جوشیلی حمایتی بن گئیں۔ وہ میری تائید حاصل کرنے کے لیے دہلی آئیں، میں نے ان سے کہا کہ بیڑے کے آفیسروں نے مصلحت اندیشی سے کام نہیں لیا ہے اور انھیں بغیر کسی شرط کے اپنی جگہوں پر واپس جانا چاہیے۔ بمبئی کانگریس کمیٹی نے مشورے کے لیے مجھے ٹیلی فون کیا اور میں نے اس کو بھی تار کے ذریعے یہی جواب دیا۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل اس وقت بمبئی میں تھے۔ انھوں نے بھی مجھ سے مشورہ کیا۔ میں نے ان سے کہا کہ بیڑے کے آفیسروں نے غلط قدم اٹھایا ہے اور انھیں اپنے کام پر واپس جانا چاہیے۔ سردار پٹیل نے پوچھا کہ اگر حکومت ان لوگوں کو کام پر واپس آنے کا موقع نہ دے تو انھیں کیا کرنا چاہیے؟ میں نے کہا کہ حالات کو دیکھتے ہوئے میرا اندازہ ہے کہ حکومت انھیں واپس آجانے کی اجازت دے دے گی۔ اگر حکومت کوئی دشواریاں پیدا کرے تو ہمیں مناسب کارروائی کرنی چاہیے۔

مجھے اگلے روز وزارت بنانے کے سلسلے میں پشاور جانا تھا۔ لیکن میں نے اپنا سفر ملتوی کر کے کمانڈر ان چیف سے ملاقات کی درخواست کی۔ لارڈ اوکن لک نے مجھے دوسرے روز صبح دس بجے پارلیمنٹ ہاؤس میں بلایا۔ میں نے دو معاملے ان کے سامنے غور کرنے کے لیے پیش کیے:

۱۔ کانگریس نے بیڑے کے آفیسروں کے فعل کو ناپسند کیا ہے اور انھیں بغیر کسی شرط کے کام پر واپس جانے کا مشورہ دیا ہے۔ مگر کانگریس چاہتی ہے

انھیں سزائیں نہ دی جائیں۔ اگر حکومت نے کینہ پروری کا طریقہ اختیار کیا تو کانگریس ان لوگوں کے معاملے کو اپنا مسئلہ بنا کر ان کی طرف سے پیروی کرے گی۔

۲۔ نسلی امتیاز کی اور دوسری شکایتیں جو بیڑے کے آفیسروں کو ہیں، ان کی تحقیق کر کے انھیں دور کر دینا چاہیے۔

لارڈ او کن لک نے بہت دوستانہ انداز سے گفتگو کی، بلکہ ان کا خلوص میری توقع سے بہت زیادہ تھا۔ انھوں نے کہا کہ بیڑے کے آفیسر بغیر کسی شرط کے کام پر واپس آ گئے تو انھیں کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔ جہاں تک نسلی امتیاز کا تعلق ہے وہ پوری کوشش کریں گے کہ اسے بالکل دور کر دیا جائے۔ ان کے جواب سے مجھے اطمینان ہو گیا اور میں نے ایک بیان شائع کیا جس میں بیڑے کے آفیسروں کو کام پر واپس جانے کو کہا گیا تھا اور انھیں یقین دلایا گیا تھا کہ انھیں کسی قسم کی سزا نہیں دی جائے گی۔''

اس واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا آزادؔ فرماتے ہیں:

''موجودہ حالات کے پس منظر میں بیڑے کے آفیسروں کی بغاوت خاص اہمیت رکھتی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد یہ پہلا موقع تھا جب کہ ڈیفنس فورس کے ایک حصے نے سیاسی اختلاف کی بنا پر انگریزوں کے خلاف کھلی بغاوت کی تھی۔ یہ بغاوت ایک تنہا مثال نہیں تھی، کیوں کہ اس سے پہلے سبھاش چندر بوس کی سرکردگی میں ہندوستانی فوج کے قیدیوں نے انڈین نیشنل آرمی قائم کی تھی۔ اس فوج نے ۱۹۴۴ء میں ہندوستان پر حملہ کیا اور ایک موقع پر امپھل پر تقریباً قبضہ کر لیا تھا۔ جاپان کے ہتھیار ڈال دینے کے بعد انگریزوں نے برما پر دوبارہ قبضہ کیا اور نیشنل آرمی کے بہت سے آفیسر گرفتار ہو گئے۔ انھیں نیشنل آرمی میں شامل ہونے پر بالکل ندامت نہیں تھی۔ ان میں سے کئی غداری کے الزام میں عدالت کے سامنے پیش کیے گئے تھے۔ ان باتوں سے انگریزوں کو یقین ہو گیا کہ جب تک ہندوستان کے سیاسی مسئلے کا اطمینان بخش حل نہ سوچا گیا وہ فوج کی وفاداری پر اعتبار نہ کر سکیں گے۔'' (انڈیا ونس فریڈم)

مولانا آزادؒ اور مسٹر جناح:

۱۲/ مارچ ۱۹۴۶ء: وایسرائے ہند لارڈ ویول نے اپنی ۱۲/ مارچ ۱۹۴۶ء کی ڈایری میں لکھا ہے:

''مسٹر جناح! مجھے آپ کے رویے کا اندازہ اور احساس ہے۔ لیکن کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ اس کمیٹی میں بیٹھنے کو تیار ہیں؟ اگر کانگریس (مولانا) آزاد کو اپنا نمایندہ مقرر کردے۔ تب انھوں (مسٹر جناح) نے وضاحت شروع کردی اور کہا ''اگرچہ ان کا (مولانا) آزاد سے کوئی ذاتی جھگڑا نہیں، وہ محض کانگریس کی کٹھ پتلی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ تب میں نے پوچھا کہ کیا وہ پٹیل کے ساتھ کانگریس کے نمایندے کے طور پر کمیٹی میں بیٹھنا پسند کریں گے؟ اس پر انھوں نے کہا کہ وہ اس پر اتفاق کریں گے۔'' لیکن کہا کہ کانگریس کبھی متفق نہیں ہوگی۔'' (کاروانِ احرار: جلد ۸، ص ۴۴)

مسٹر اٹیلی کا بیان:

۱۵/ مارچ ۱۹۴۶ء: کو مسٹر اٹیلی نے دار العوام میں ہندوستان کی صورت حال کے متعلق ایک بیان دیا۔ اس بیان کی ہند برطانوی تعلقات کی تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ہے۔ انھوں نے صاف تسلیم کرلیا کہ حالات بالکل بدل گئے ہیں اور ان پر ایک نئے نقطۂ نظر سے غور کرنا ضروری ہوگیا ہے۔ ان کے اس اعلان نے ہندوستان پر بہت اچھا اثر ڈالا کہ اگر پرانے طریقوں پر قایم رہنے کی کوشش کی گئی تو اس سے مسئلہ حل نہ ہوگا، بلکہ تعطل پیدا ہوجائے گا۔ (انڈیا ونس فریڈم: ص ۳۴۲)

حضرت شیخ الاسلامؒ کا ایک خط:

۱۵/ مارچ ۱۹۴۶ء: اس خط کے پس منظر کے بارے میں مولانا نجم الدین اصلاحیؒ نے یہ نوٹ تحریر فرمایا ہے:

''مولوی عبداللہ فاضل دیوبند سرخ پوش تحریک کے سرگرم رکن تھے اور ساتھ ہی جمعیت علما اور کانگریس سے بھی تعلق تھا۔ لیکن جب لیگی تحریک زوروں

پر ہوئی تو لیگ میں شریک ہو کر مقدم الذکر تحریک کو زک دینا تیر بہ ہدف سمجھا اور
خان برادران سے خفا ہو کر ان کی بعض حرکات کی شکایت حضرت مولانا مدنی
قدس سرہٗ سے کی، جس کے جواب میں مولانا رحمہ اللہ نے یہ والا نامہ تحریر فرمایا
اور بہ سبیلِ معارضہ مسٹر جناح مرحوم کے بعض اعمال کو ذکر کر دیا ہے۔"
حضرت شیخ الاسلامؒ کا مکتوب سامی یہ ہے:
"محترم المقام زید مجدکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ
مزاج شریف! والا نامہ باعث سرفرازی ہوا۔ یاد آوری کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جو امور ڈاکٹر خان، عبدالغفار خان، یونس خان کے متعلق جناب نے ذکر فرمائے ہیں یقیناً موجب صد ہزار افسوس ہیں مگر ذرا ادھر بھی نظر دوڑائیے خود قاید اعظم نے سول میرج پر ۱۹۱۷ء میں یا اس کے قریب اپنا نکاح ایک پارسی لڑکی سے کیا، پھر ان کی بیٹی نے ۱۹۳۷ء میں سول میرج پر ایک عیسائی کے ساتھ اپنا نکاح بمبئی میں گرجا میں کیا اور نکاح سے قبل پونہ میں چھ ماہ یا اس سے زائد بغیر نکاح کے ایک ہوٹل میں دونوں مجتمع ہو کر کورٹ شپ کرتے رہے۔ علیٰ ہذا القیاس اور بھی چند زعمائے لیگ کے واقعات ہو چکے ہیں۔ جب یہ امور زعمائے لیگ کے سامنے پیش کیے گئے تو انھوں نے یہ کہہ کر ٹالنا چاہا کہ یہ ان کے شخصی معاملات ہیں۔ جیسے ان کا بے نمازی ہونا وغیرہ، ان کو اجتماعی اور سیاسی معاملات سے تعلق نہیں۔ ہم قاید اعظم کو سیاسی امام اور رہنما قرار دیتے ہیں۔ تب قاید اعظم کی سیاسی کارروائی مرکزی اسمبلی کی میدان میں لائی گئی یعنی ان کی وہ تقریر جو کہ انھوں نے ۱۹۱۲ء میں سول میرج کے متعلق مسٹر بھوپندر ناتھ باسو کی ترمیم کی تائید میں کی تھی جو کہ گورنمنٹ کی اسمبلی رپورٹ ۱۹۱۲ء میں موجود ہے۔ اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

"یہ واقعہ ہے کہ اس کونسل میں ایک پبلک نمایندہ خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، ایسے مسئلے میں بڑی مشکل میں ہے کیوں کہ کٹر عقیدے کے لوگوں کی اکثریت اس کے خلاف رہے گی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ عوام کے کسی سچے نمایندے کے لیے کوئی وجہ نہیں کہ وہ جس بات کو صحیح جانتا ہو اس کے بے خوف انظہار سے باز رہے۔ اگر کسی قوم کی اکثریت کسی ایک خیال یا عقیدے کی پیرو ہے تو لازم نہیں کہ وہ خیال صحیح بھی ہو اور وہ لوگ صحیح راستے پر ہوں۔ اگر اس

کونسل میں کسی نمایندے کی پختہ طور پر یہ رائے ہے کہ یہ ترمیم اس کے ملک اور اس کی قوم کے لیے مفید ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ اس ترمیم کی حمایت کرے۔

آنریبل ممبر قانون (سر علی امام) نے کہا ہے کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے۔ قرآن میں صریح حکم ہے کہ ایک مسلمان سوائے کتابیہ کے کسی غیر مسلمہ سے شادی نہیں کر سکتا، لیکن میں اس ترمیم کو صحیح ثابت کر دکھاؤں گا۔ میں آنریبل ممبر سے دریافت کرتا ہوں کہ اس ملک کی قانون سازی میں کیا یہ پہلا موقع ہے کہ اس کونسل کو مسلم قانون (شریعت) کو منسوخ کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے؟ نہیں! ہمارے سامنے نظیریں موجود ہیں کہ شرعی قانون معاہدہ پر اب عمل درآمد نہیں ہوتا۔ اسلامی قانون فوج داری جس پر انگریزی حکومت کی آمد کے بعد تک عمل درآمد ہوتا رہا اب قطعی منسوخ ہو چکا ہے۔ قانون شہادت جس سے اب تک مسلمان آشنا رہے ہیں اب اس ملک میں ختم ہو گیا ہے۔ اس سے زیادہ اور لیجیے ۱۸۵۰ء کے قانون (منسوخی، امتناع فرقہ واری) کا حال ہی میں نفاذ ہوا ہے اور میں کونسل کو توجہ دلاتا ہوں کہ یہ وہی قانون ہے جس کے خلاف قرآن میں صاف حکم موجود ہے کہ کسی مسلمان کے مرتد ہو جانے پر اس کا حق وراثت ضبط کر لیا جاتا ہے۔ ممبر قانون نے شادی کے متعلق جیسا صاف حکم قرآن کا بتایا ہے ایسا ہی یہ حکم بھی ہے، پھر بھی قانون کے ذریعے اسے منسوخ کیا جا چکا ہے اور اب اگر کوئی مسلمان اسلام ترک کر دے (مرتد ہو جائے) تب بھی اس کا حق وراثت محفوظ رہے گا اور شریعت اسلام کے بل پر اس کا یہ حق اس سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ قرآن کا یہ حکم اب قطعی منسوخ ہو گیا۔ اب اس کا کوئی اثر نہیں ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ یہ ایسی نظیریں موجود ہیں جن کی پیروی کر کے ہم دور جدید کی ضروریات اور وقت کے تقاضوں کا ساتھ دے سکتے ہیں۔ بے شک جناب صدر! ہندو قانون ہو یا محمدی قانون...... جسے بھی آپ پیش نظر رکھیں ان کی وجہ سے بہت سی دقتوں اور مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر کوئی ہندو غیر ہندو (مسلمان عورت) سے شادی کرنا چاہے یا کوئی مسلمان

غیر کتابیہ سے شادی کرنے کا ارادہ کرے تو یہ مذہبی قانون اس کے حق میں
جنجال بن جاتے ہیں ایسی تکلیف دہ مداخلت کو ختم کرنے کے لیے جدید قانون
سازی سے امداد لینا لازمی ہے۔ قانون یہ نہیں کہتا کہ ہر مسلمان کو غیر مسلم کے
ساتھ یا ہر ہندو کو غیر ہندو کے ساتھ ضرور ہی شادی کرنا ہوگی۔ البتہ اگر تعلیم
یافتہ، روشن خیال اور ترقی پسند ہندوستانیوں کی کافی تعداد موجود ہے۔ خواہ ہندو
ہوں یا مسلمان یا پارسی اور وہ شادی کا ایسا دستور اختیار کرنا چاہیں جس میں
زمانہ حال کے خیالات اور مذاق سے مطابقت ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ ایسے لوگوں
کو انصاف سے محروم رکھا جائے۔"

(گورنمنٹ آف انڈیا گزٹ ۱۹۱۲ء شعبہ قانون سازی، ص ۱۶۱-۱۶۰)

اس تمام تقریر پر اور بالخصوص خط کشیدہ جملوں پر غور فرمایئے کہ کس طرح سول میرج
کو قانون خلاف قرآن و شریعت بنانے کی کوشش تمام مسلمانان ہند کے لیے اسمبلی میں
کر رہے ہیں اور قرآن کو منسوخ بتاتے ہیں۔ انھوں نے اپنی جدو جہد میں کوئی دقیقہ اٹھا
نہیں رکھا۔ مگر اکثر ممبروں نے خلاف کیا، اس لیے یہ قانون پاس نہ ہو سکا۔ پھر ۱۹۲۳ء میں
یہی بل دوسری ترمیم کے ساتھ پیش ہوا اور بعض ہندو فرقوں کے لیے پاس بھی ہو گیا۔ مگر
مسلمان ہندو عیسائی، یہودی کے لیے پاس نہ ہو سکا، کیوں کہ انھیں کی اکثریت تھی۔ پھر
۱۹۲۷ء میں پیش کیا گیا مگر جمعیت کی جدو جہد کی بنا پر پاس نہ ہو سکا۔

محترما! خان برادر وغیرہ نے برا فعل کیا ہے جس کے وہ ذمے دار ضرور ہیں، مگر یہاں
لیگ کے قاید اعظم اس فعل کے مرتکب بھی ہیں اور اس کو قانون بنوانے اور تمام مسلمانان ہند
پر نافذ کرنے کی کوشش بھی کر چکے ہیں۔ خان برادران مسلمانوں کی نمایندگی کے مدعی نہیں
ہیں۔ صرف ایک خاص حلقے کے ڈاکٹر خان نمایندہ ہیں۔ قاید اعظم دس کروڑ مسلمانوں کی
واحد نمایندگی کے دعوے دار ہیں اور تمام مسلم لیگ کے ڈکٹیٹر ہیں۔ خلاف شریعت اسلامیہ
متعدد چیزیں مرکزی اسمبلی میں عمل میں لا چکے ہیں۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۵ء کے آخر تک ہی
کے کارنامے ملاحظہ فرمالیجیے۔

علاوہ ازیں خان برادران نے خود غرضی اور عوام کشی کے مظاہرات اب تک نہیں کیے
اور ان کے اقوال و افعال برطانوی شہنشاہیت (جو کہ اسلام اور مسلمانوں کی سب سے بڑی

دشمن ہے) کے خلاف ظاہر و باہر ہیں۔ بہ خلاف لیگ اور اس کے قاید کے کہ وہ برطانوی شہنشاہیت کی حمایت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اس لیے یقیناً خان برادران کے رفقا اہون البلیتین ہیں جس کا حکم شرعی موجود ہے۔ بالخصوص اس بنا پر کہ لیگ اور اس کی وزارتوں نے ملک اور مسلمانوں کی بربادی کے عظیم الشان کارنامے اس تھوڑی مدت میں انجام دیے۔ بنگال میں ۳۵ لاکھ آدمیوں کی بربادی جن میں ۸۰ فیصدی مسلمان تھے۔ سندھ میں حروں کی بربادی جن کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔ پنجاب میں خاک ساروں پر فائرنگ، آسام اور سرحد وغیرہ میں سنڈیکیٹ اور ٹھیکوں کی بربادکن عمل درآمد اور سب جگہوں میں انگریزی امداد اور رشوت ستانی کی انتہائی قوت یہ ایسے امور نہیں ہیں جن سے چشم پوشی کی جائے! جس طرح کفر اور معصیت کلی مشکوک ہے اسی طرح مصایب اور بلایا بھی تشکیک رکھتی ہیں حکم فقہی اذا ابتلی الانسان ببلیتین فلیختر اھو نھما پر غور فرمائیے۔

علما کی تذلیل اور توہین میں بھی سب سے اولین قدم قایداعظم نے اٹھایا۔ اس نے کلکتہ میں، دہلی عربک کالج میں ۱۹۳۷ء اور دوسری جگہوں میں بڑے فخر کے ساتھ اعلان کیا کہ ہماری اولین کامیابی یہ ہے کہ ہم نے علما کے اقتدار کو ختم کر دیا۔ ہم نے مسلمانوں کو علما کی گندی سیاست سے نکال لیا وغیرہ وغیرہ۔ ان کے اتباع تو دن رات علما اور مذہب کے خلاف آج بھی برابر آوازے نکالتے ہی رہتے ہیں۔ کمیونسٹ (منکرین خدا و رسول علیہ السلام اور اعدائے مذہبیت) قادیانی، شیعہ، ملاحدہ سب کے سب لیگ میں دخیل ہی نہیں بلکہ زعما بنے ہوئے ہیں۔ جو سیات بعض ناعاقبت اندیش سرخ پوشوں وغیرہ نے کیے ہیں وہ باوجود اس ادعا کے کہ ہم نے یہ ان علما کے متعلق کیے ہیں جو انگریزوں کی تائید کر رہے ہیں ان کی اصلاح بھی بعد میں کی۔ مگر یہ لیگیان کرام تو روز بہ روز اسلام دشمنی میں بڑھتے ہی جاتے ہیں۔ اس لیے ان کو ووٹ دینا اور ان کی تائید کرنا تو کسی طرح قرین مصلحت و جواز نہیں ہوتا۔ ہاں سب کی اصلاح کی کوشش ضروری ہے۔ سرخ پوشوں اور خان برادران وغیرہ کی اصلاح زیادہ تر اقرب ہے، یہ دین سے علانیہ بغاوت نہیں کر رہے ہیں۔ صورت اور سیرت میں بہ نسبت زعمائے لیگ اقرب الی الاسلام ہیں، اس لیے غور و فکر اور حکمت و موعظۂ حسنہ کو عمل میں لانا اور ان کو ساتھ لے کر سب سے بڑے دشمن کو زک دینا از بس ضروری ہے جو کہ اہم ترین مقصد ہے۔

آپ کا والا نامہ مجھ کو ۵؍مارچ کو جب کہ میں بنگال، بہار، یوپی کے دورے کے بعد دیوبند گیا ملا، مگر ۶؍مارچ کو پھر مجھ کو سفر کرنا پڑا۔ میں آج ۱۵؍مارچ کو سفر ہی میں نواکھالی بنگال سے یہ جواب لکھ رہا ہوں۔ اس لیے آپ تاخیر کی بنا پر برافروختہ نہ ہوں۔ دعوات صالحہ سے فراموش نہ فرمائیں۔ والسلام

ننگِ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ
وارد حال گوپال گنج ضلع نواکھالی
۱۵؍مارچ (۱۹۴۶ء)

حضرت شیخ الاسلامؒ نے محمد علی جناح کی جس تقریر کا حوالہ گورنمنٹ آف انڈیا گزٹ ۱۹۱۲ء سے دیا ہے، اب وہ مکمل تقریر سید شریف الدین پیرزادہ نے اپنی دستاویزی تالیف "کلیکٹڈ ورکس آف قاید اعظم محمد علی جناح" جلد اول (۱۹۰۶ء تا ۱۹۲۱ء)، کراچی ۱۹۸۴ء میں شامل کرلی ہے (دیکھیے صفحہ ۳۵ تا ۳۸) اور اس طرح پیرزادہ کے ذوق علمی نے شائقین کے لیے اصل تقریر سے استفادہ آسان کردیا ہے۔

(اس تقریر کا اردو ترجمہ "مقالاتِ سیاسیہ" (حصۂ اوّل) میں ملاحظہ فرمائیں)

مسٹر جناح کی توقع:

۱۶؍مارچ ۱۹۴۶ء: ۱۶؍مارچ ۱۹۴۶ء کو کوئٹہ میں تقریر کرتے ہوئے مسٹر جناح نے کہا کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد ہندو، مسلمانوں کو یہودیوں کی طرح مٹادیں گے۔

(حسرت موہانی - ایک سیاسی ڈاری، مولانا آزاد - ایک سیاسی ڈاری، صفحہ ۳۷۶)

۱۹۴۷ء میں پاکستان کا قیام عمل میں آیا تھا اور پاکستان کے لیگی رہنماؤں کے عقیدے کے مطابق ہندوستان میں ہندو حکومت ہی قایم ہوئی، اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً ساڑھے تین کروڑ رہ گئی تھی۔ اب ہندوستان کے مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ ان کی تعداد ۲۰ کروڑ سے زیادہ ۲۲ کروڑ تک ہے اور تقریباً ۱۶ کروڑ کی تعداد تو حکومت ہند نے تسلیم کی ہے۔ اس سے تحریک پاکستان کے سب سے بڑے رہنما کی پیشین گوئی کی سچائی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

جناح صاحب کی یقین دہانی:

۲۰ر مارچ ۱۹۴۶ء: کو لاہور میں قاید اعظم سے آل انڈیا سکھ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے دو رہنما مسٹر سروپ سنگھ اور امر سنگھ نے ایک ملاقات کی۔ یہ ملاقات قریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک رہی۔ جس میں مسلم لیگ کے صدر قاید اعظم محمد علی جناح نے سکھوں کو یقین دلایا کہ

''میں سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان سمجھوتا کرانے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنے کو تیار ہوں۔'' (روزنامہ انقلاب: لاہور، ۲۳ر مارچ ۱۹۴۶ء)

۲۰ر مارچ ۱۹۴۶ء: تقسیم پنجاب کی کانگریسی قرارداد نے حالات میں ایسا زہر گھولا کہ نہ صرف پنجاب متاثر ہوا بلکہ دیگر اکثریت کے مسلمان صوبوں نے بھی اپنے گردوپیش کا جایزہ لینا شروع کر دیا۔ ۲۰ر مارچ کے اخبارات میں سندھ کی یہ خبر شایع ہوئی۔

''کراچی۔ ۱۹ر مارچ۔ آج سندھ اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی کا اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں فیصلہ کیا گیا کہ جون ۱۹۴۸ء میں سندھ کی خودمختاری کا اعلان کر دیا جائے گا۔ اس قرارداد کے آخر میں یہ بھی کہا گیا کہ اگر صوبائی گروہ بندی کا متفقہ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان کوئی سمجھوتا نہ ہوسکا تو جون ۱۹۴۸ء میں سندھ اپنی خودمختاری کا اعلان کرنے میں حق بہ جانب ہوگا۔''

سکھوں کو حق ہے کہ..... جناح صاحب کا بیان:

۲۱ر مارچ ۱۹۴۶ء: کو قاید اعظم نے لاہور میں ایسوسی ایٹڈ پریس کے نامہ نگار کو بیان دیتے ہوئے اعلان کیا کہ

''سکھ ایک قوم ہے۔ انھیں اس بات کا حق ہے کہ وہ اپنی الگ ریاست کا مطالبہ کریں۔ میں ان کے اس مطالبے کے خلاف نہیں، بہ شرطے کہ مجھے بتایا جائے کہ اس قسم کی آزاد سکھ ریاست کہاں بنائی جاسکتی ہے۔

آل انڈیا سکھ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر اور سیکریٹری آج مجھ سے ملے ہیں اور ان سے میرا تبادلہ خیال ہوا ہے۔ میں نے ان پر یہ بات واضح کر دی ہے کہ سکھوں کو بہ طور ایک قوم کے اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی الگ ریاست بنائیں۔'' (کاروانِ احرار: جلد ۸، صفحہ ۵۰)

کیبنٹ مشن کا ورودِ ہند:

۲۳ر مارچ ۱۹۴۶ء: کیبنٹ مشن ۲۳ر مارچ کو ہندوستان پہنچا۔ سر اسٹیفورڈ کرپس اس سے پہلے جب ہندوستان آئے تھے تو بنگال کے ممتاز کانگریسی لیڈر مسٹر جے سی گپتا نے میزبانی کے فرائض انجام دیے تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ وہ کرپس سے ملنے کے لیے دہلی جا رہے ہیں۔ میں نے سر اسٹیفورڈ کے نام ان کو ایک خط دیا، جس میں ان کے دوبارہ ہندوستان آنے پر ان کا خیر مقدم کیا تھا۔ (انڈیا ونس فریڈم)

ہم کوئی تجویز لے کر نہیں آئے — کیبنٹ مشن:

۲۵ر مارچ ۱۹۴۶ء: کو برطانوی کیبنٹ مشن بغیر کسی فارمولا کے ہندوستان پہنچا۔ مشن کے لیڈر لارڈ پیتھک لارنس نے ۲۵ر مارچ کو پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

> ''ہم کوئی تجویز یا فارمولا لے کر نہیں آئے، تاہم یہ ارادہ لے کر ضرور آئے ہیں کہ ہندوستانی لیڈروں سے مذاکرات کے بعد ایسا خاکہ بنایا جائے گا جس کے تحت ہندوستان کے لیے مکمل ڈومینن اسٹیٹس کا انتظام ہو سکے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ اس ہسٹری کو جلد مرتب کریں اور درمیانی عرصے کے لیے انتظامات فی الفور کیے جائیں۔
>
> آزادی اور حق خود اختیاری کا فیصلہ اصولی طور پر ہو چکا ہے۔ اب ہم نے باہمی اعتماد سے کوئی ایسی راہ نکالنی ہے کہ ہندوستانی اپنے نئے دستور اساسی کے متعلق باہمی طور پر فیصلہ کریں۔ اس میں اضطراب کم ہو اور آسانی زیادہ۔ یہ بھی لازمی ہے کہ اس سلسلے میں ہندوستانی ریاستوں کو بھی دعوت دی جائے، کیوں کہ انھیں بھی ہندوستان کے مستقبل کے متعلق نمایاں حصہ لینا ہے۔''

لیگیوں کی سہروردی وزارت کے خلاف بغاوت:

۲۶ر مارچ ۱۹۴۶ء: بنگال اسمبلی کے ۸۰ مسلم لیگی ممبر بنگال کی موجودہ سہروردی وزارت کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر چکے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے وزارت کے

خلاف الزامات کی ایک طویل فہرست شائع کی ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ برسرِ اقتدار وزارت نااہل افراد پر مشتمل ہے۔ وہ پولیس کے تشدد اور محکمہ سول سپلائی کی بدعنوانیوں کی ذمے دار ہے۔ بنگال میں فرقہ وارانہ کشیدگی کی وزارت ہی ذمے دار ہے۔

(امرت بازار پتریکا۔ بمبئی۔ ۲۶/ مارچ ۱۹۴۶ء بہ حوالہ کاروانِ احرار: جلد ۸، ص ۱۸۲)

اس سلسلے کی دوسری رپورٹ چودھری خلیق الزماں نے کتاب ''شاہ راہ پاکستان'' کے صفحہ ۱۳۱ پر درج ہے کہ

> ''مارچ کے تیسرے ہفتے میں بنگال کے تین زعما مسٹر نورالدین، مسٹر حمید الحق چودھری اور موہن میاں مجھ سے ملنے دلّی آئے۔ انھوں نے کہا کہ وہ شہید سہروردی کے خلاف بنگال اسمبلی میں عدم اعتماد کی تحریک پیش کرنا چاہتے ہیں جس کے لیے ان کے پاس ستر (۷۰) مسلم ممبران کی دستخطی منظوری موجود ہے۔
>
> بعد میں مسٹر جناح نے مجھ سے کہا کہ میں کلکتہ جا کر اس قصے کو کسی طرح ختم کرادوں۔ دو ایک دن بعد کلکتہ جا کر میں نے سہروردی کے آفس میں مخالفین کی روئیداد سنی، یہ بات بھی سننے میں آئی کہ شہید سہروردی شیاما پرشاد مکرجی سے متحدہ بنگال کی اسکیم کے لیے کوشاں ہیں۔
>
> مسٹر سہروردی مسٹر جناح کی اجازت سے متحدہ بنگال کے لیے ضرور کوشاں تھے لیکن اس وقت تک حالات میں اتنی تلخی پیدا ہو چکی تھی کہ یہ کوشش بارآور نہ ہوئی۔'' (کاروانِ احرار: جلد ۸، صفحہ ۱۸۲)

اللہ بخش کے قاتل کو پھانسی:

۳۰/ مارچ ۱۹۴۶ء: خان بہادر اللہ بخش سومرو سابق وزیر اعظم سندھ کے قاتل مہابت خاں کو ۳۰/ مارچ ۱۹۴۶ء کو سکھر جیل میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

مہابت خان حروں میں سے تھا۔ قتل کے بعد کافی دیر تک مفرور رہا۔ آخر ایک قریبی ریاست سے گرفتار کرلیا گیا تھا۔ اس کا ایک ساتھی گزشتہ سال مارا جا چکا ہے۔

مہابت خاں کو سیشن ٹریبونل نے جرگے کے تحت سزائے موت کا حکم دیا تھا۔

(کاروانِ احرار: جلد ۸، ص ۷۹)

مسٹر جناح کا ہندوستانی ہونے سے انکار:

۳۱ مارچ ۱۹۴۶ء: ۳۱ مارچ ۱۹۴۶ء کو نیوز کرانیکل کے نمایندے کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے مسٹر جناح نے فرمایا:

پاکستان کے سوال پر کسی مفاہمت کا امکان نہیں۔ ہندوستان کوئی ایک ملک نہیں ہے۔ میں اپنے آپ کو ہندوستانی تسلیم نہیں کرتا۔ ہندوستان ایک ایسی مملکت ہے جس میں کئی قومیتیں موجود ہیں۔ ان میں دو بڑی قومیں بھی موجود ہیں۔ ہم صرف اس کے طالب ہیں کہ ہماری قوم کے لیے ایک مکمل آزاد ریاست پاکستان کے نام سے قایم کردی جائے۔ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہندوستان میں ڈھائی کروڑ مسلمان رہ جائیں گے مگر اس کا کوئی علاج بھی نہیں ہے۔

ایک متحدہ وفاق کی صورت میں مسلم صوبہ جات بھی جہاں مسلمان ستر فیصدی ❶ اکثریت میں ہیں، ہندوؤں کے قبضۂ قدرت میں آجائیں گے۔ پاکستان میں ان کی حالت ضرور اچھی ہوگی۔

ہندوستان میں اگر ڈھائی کروڑ مسلمان ہوں گے تو پاکستان میں بھی ڈھائی کروڑ غیر مسلم ہوں گے۔ (علماے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے: ج ۲، ص ۳۹۵)

حاشیہ ❶: ستر فیصدی کا تخیل غلط ہے سینسس آف انڈیا ۱۹۴۱ء صفحہ ۹۸-۹۹ حصہ اول جلد اول مرتبہ ایم ڈبلیو ایم۔ یائیس۔ ڈی آئی اے ای سی ایس۔ سینس کمشنر آف انڈیا اور کتاب ۱۹۴۱ء کی مردم شماری پر جامع تبصرہ مصنفہ چودھری رحم علی صاحب ہاشمی کی تفصیلات کے بہ موجب پاکستانی صوبہ جات (پنجاب، بنگال، سندھ، سرحد، بلوچستان، آسام) کی کل آبادی دس کروڑ ستر لاکھ چار ہزار سات سو تراسی (۱۰۷۰۰۴۷۸۳) ہوتی ہے۔ ان صوبہ جات میں مسلمانوں کی کل تعداد پانچ کروڑ اکیانوے لاکھ ایک ہزار دو سو سات (۵۹۱۰۱۲۰۷) ہے۔ اور بلا غیر مسلم آبادی کل تعداد چار کروڑ اناسی لاکھ تین ہزار پانچ سو چھیتر (۴۷۹۰۳۵۷۶) ہے۔ لہٰذا مسلمان فیصدی ۵۵ اعشاریہ ۵ (۵۵،۵) (تقریباً) ہوتے ہیں اور غیر مسلم ۵۴ اعشاریہ ۵ فیصدی (۵۴،۵، تقریباً)۔ انھیں اعداد و شمار کے لحاظ سے وزارتی مشن نے دستور ساز اسمبلی میں مسلمانوں کو نشستیں دی ہیں۔ لہٰذا پاکستان میں مسلمانوں کو ستر (۷۰) فیصدی اور غیر مسلموں کو تیس (۳۰) فیصدی بیان کرنا ناعاقبت اندیشانہ خطرناک پروپیگنڈا ہے۔ (محمد میاں غفی عنہ)

دہلی کے پولیس مینوں کی ہڑتال:

مارچ ۱۹۴۶ء میں دہلی کے پولیس مینوں نے بھی بھوک ہڑتال کر دی اور پھر جلوس نکالتے ہوئے تقریباً نوے پولیس مین گرفتار کر لیے گئے۔ اگرچہ یہ تحریک پولیس میں عام نہ ہو سکی اور چند روز میں حالات پر قابو پالیا گیا۔ مگر پولیس جیسے ناز بردار و فادار محکمے کی یہ حرکت تاریخ ہندوستان میں بالکل نئی حرکت تھی۔

صوبہ سرحد کی صورت حال:

بکنگھم، جب مارچ ۱۹۴۶ء میں صوبہ سرحد سے روانہ ہوئے تھے تو صوبے کی عمومی صورت حال پرامن تھی۔ اگرچہ مسلم لیگ کو ہندوستان بھر میں مسلمانوں کی زبردست حمایت حاصل تھی لیکن سرحد میں ڈاکٹر خان صاحب کی قیادت میں کانگریس پارٹی نے جنوری ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات میں خاصی اکثریت حاصل کر لی تھی، کچھ عرصے تک وہ صوبے میں قاعدے قرینے سے حکومت کرتی رہی اور یہ صوبہ بہ ظاہر مطمئن نظر آتا تھا۔ لیکن جلد ہی واقعات کا جو ریلا آیا اس نے ثابت کر دیا کہ سرحد کے عوام پر کانگریس کی گرفت کی اساس سیاسی وفاداری پر نہیں تھی۔ مشرقی ہندوستان کے ہندو مسلم فسادات بڑی تیزی سے مغربی اور شمالی ہندوستان میں بھی آ گئے تھے جس سے پورے شمالی ہندوستان میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان نفرت کی آگ بھڑک اُٹھی۔ بالآخر پنجاب اور سرحد کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جس کی وجہ سے نظم و نسق جزوی طور پر درہم برہم ہو گیا۔ سرحد میں ڈاکٹر خان صاحب کو بعض مقامی مراکز میں حمایت حاصل رہی لیکن عوام کی ہمدردیاں جو ہمیشہ ہی جذباتی طور پر مسلم لیگ کے ساتھ رہی تھیں، ایک سیاسی نظریے کی حیثیت سے بھی مسلم لیگ کی طرف چلی گئیں۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ ماضی میں کبھی کسی نے بھی کانگریس کے حق میں ووٹ دیا ہی نہیں تھا۔ ۱۹۴۶ء گزرنے کے ساتھ ساتھ ہر ضلع میں ہندو مسلم فسادات بدترین صورت اختیار کرتے چلے گئے اور ۱۹۴۷ء کے ابتدائی مہینوں میں ہر روز مزید گاؤں میں آگ لگنا شروع ہو گئی۔ ڈاکٹر خان صاحب اور ان کے وزیروں نے غیر معمولی طور پر استقامت کا مظاہرہ کیا حال آں کہ وہ اپنے دلوں میں جانتے تھے کہ حالات مایوس کن صورت اختیار کر چکے ہیں۔ یہاں تک کہ اپریل ۱۹۴۷ء میں قانون ساز اسمبلی کا بجٹ

اجلاس بھی بلوائیوں نے درہم برہم کردیا۔ ان کا مقصد صاف ظاہر تھا کہ وہ کانگریس سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے تاکہ یہ خطرہ ٹل جائے کہ صوبۂ سرحد کو جس میں ۹۵ فیصد مسلمان ہیں کہیں ہندوستان کے اس علاقے میں شامل نہ کردیا جائے جو ہندوؤں کو ملنے والا تھا۔ اگرچہ ان کے مقاصد کے حق میں عوام کی بہت بڑی تعداد تھی جن میں بہت سے انتہائی قابل احترام اور باعزت مسلمان بھی شامل تھے۔ جنھوں نے حکومت کو پریشان کرنے کے لیے جان بوجھ کر فنی قسم کے جرائم کیے۔ ہندوؤں پر قاتلانہ حملے روزمرہ کا معمول بن چکے تھے اور عورتوں کے جلوس سرکاری عمارات کے باہر زور شور سے نعرے لگاتے رہتے تھے، لیکن اس کے باوجود حکومت کا اصرار تھا کہ پارلیمانی اکثریت نے کانگریس کو صوبے پر حکومت کرنے کا حق دیا ہے اور فرض سونپا ہے اور اس کا اہل گردانا ہے۔

جب وایسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپریل میں سرکاری دورہ کیا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے فوراً ہی صورت حال کو بھانپ لیا اور چند دنوں کے بعد انھوں نے اعلان کردیا کہ صوبۂ سرحد کے مستقبل کا فیصلہ استصواب رائے سے کیا جائے گا۔ جس کے بعد مسلم لیگ کا ایجی ٹیشن فوراً ہی بند ہوگیا۔ ضلع پشاور میں چارسدہ کے علاقے میں گولیوں کے معمولی سے تبادلے کے سوا رائے شماری کا مرحلہ ہیجان خیز مسرت کی عمومی فضا میں گزر گیا۔ مرد ضلع ہزارہ اور دور دراز علاقوں سے پولنگ اسٹیشنوں تک پہنچے۔ تقریباً ۹۸ فیصد ووٹ صوبے کو پاکستان میں شامل کرنے کے حق میں تھے۔ چوں کہ کانگریس نے رائے شماری کا بائی کاٹ کیا تھا اس لیے مخالفت میں کوئی ووٹ نہیں آیا اور وایسرائے کے اعلان کے پیش نظر وقت آنے پر شمال مغربی سرحدی صوبہ پاکستان کا حصہ بن گیا۔

(ہند میں انگریز سیاست: ص ۱۷-۱۱۶)

افاداتِ اشرفیہ کے جواب میں:

یکم اپریل ۱۹۴۶ء: مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے ''افادات اشرفیہ و مسایل سیاسیہ'' کے عنوان سے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ کے افادات وارشادات پر مشتمل وقت کے سیاسی مسایل کے بارے میں ایک کتابچہ شایع فرمایا تھا، اس میں چوں کہ اس کتابچے کی تالیف میں انصاف اور دیانت علمی سے کام نہیں لیا گیا تھا، اس لیے اظہار حقیقت اور بیانِ واقعہ کے لیے مولانا عبدالاحد سورتی صاحب علیہ الرحمہ نے قلم اٹھایا اور

حضرت تھانویؒ کے صحیح ملفوظات وارشادات اور تحریرات پیش کر کے کتابچے کی تلبیسات اور تحریر و بیان کی پے چیدگیوں کو واضح فرما دیا ہے۔ حضرت مولانا سورتی مرحوم کا یہ رسالہ ''افادات اشرفیہ کا دوسرا رخ مسمّٰی بہ اشرف الافادات'' کے عنوان سے وسط ۱۹۴۶ء میں شعبۂ نشر واشاعت مرکزیہ جمعیت علماے ہند (دہلی) نے دلّی پرنٹنگ ورکس، دہلی میں چھپوا کر شایع کیا تھا۔ ''سخن اولین'' کے عنوان سے رسالے کا تعارف مولانا سید محمد میاں علیہ الرحمہ نے کرایا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

''حضرت حکیم الامۃ مولانا شاہ اشرف علی صاحب قدس سرہ کے تفقہ اور زہد وتقویٰ میں کلام نہیں کیا جا سکتا۔ مگر آپ عملی اور فکری طور پر ہمیشہ سیاسیات سے علاحدہ رہے، حتیٰ کہ اخبار کا مطالعہ بھی آپ تضیع اوقات سمجھتے تھے۔

اتفاق سے ایک مخصوص مذاق کے حضرات آپ کے حاضر باش تھے جو واقعات کو اپنے خیالات کی عینک سے دیکھتے اور اپنے مذاق کے بہ موجب ان کی ترجمانی کرتے۔

اہل غرض نے حضرتؒ کی گوشہ نشینی اور اس مخصوص ماحول سے بسا اوقات غلط فایدہ اٹھایا۔ واقعات کو غلط انداز میں پیش کر کے ان کے مطابق فتویٰ لکھوایا اور اس کی لاتعداد اشاعت سے اپنی اغراض پوری کیں۔

بہ ہر حال جب کہ مدار فتویٰ کسی بزرگ کے ملفوظات وارشادات نہیں ہیں تو اس بحث میں پڑنا بھی لاحاصل ہے۔

مگر گذشتہ الیکشن کے دوران حضرت مولانا محمد شفیع صاحب نے ''افادات اشرفیہ ومسایل سیاسیہ'' کے عنوان سے ایک رسالہ شایع کیا۔

کسی بزرگ کے ملفوظات کی ترتیب کے وقت مصنف کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اس موضوع سے متعلق جملہ ملفوظات کو جمع کر دے تاکہ پڑھنے والا متکلم کی مراد کو صحیح طور پر سمجھ سکے۔

مگر افسوس افادات اشرفیہ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جمعیت علماے ہند اور کانگریس کی مخالفت اور مسلم لیگ کی حمایت مصنف کے پیش نظر ہے اور وہ اپنی ذہنیت کے آئینے سے متکلم کی رونمائی کرنا چاہتا ہے۔

مولانا محمد شفیع صاحب کے اس طرز عمل نے خود حضرت تھانوی قدس سرہٗ کے انصاف پسند متوسلین اور معتقدین کو مجبور لیا کہ وہ تصویر کا دوسرا رخ بھی پیش کریں تا کہ حکیم الامتؒ کی حکمت و دانش مندی کا صحیح انداز ہ ہو سکے۔

ہم شکر گذار ہیں عزیز محترم مولانا عبدالاحد صاحب سورتی کے کہ آپ نے یہ رسالہ ''شعبۂ نشر و اشاعت جمعیت علماے ہند'' کو پیش کیا، جو ''اشرف الافادات'' کے عنوان سے شائع کیا جارہا ہے۔

اس رسالے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے حضرت حکیم الامتؒ کے ان حکیمانہ ارشادات کو جمع کیا گیا ہے جو لیگ کی حقیقت کے پیش نظر حکیم الامتؒ کی شان حکمت کو نمایاں کرتے ہیں۔

ممکن ہے افادات اشرفیہ کے مصنف و ناشر ہماری مجبوریوں کو محسوس نہ کریں، مگر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے انصاف پسند اور صداقت طلب متوسلین و مسترشدین سے توقع ہے کہ وہ ''اشرف الافادات'' کی اشاعت کو وقت کی اہم ضرورت قرار دیں گے اور اس اعلان حقیقت پر شعبۂ نشر و اشاعت جمعیت علماے ہند کے شکر گذار ہوں گے۔''

انتخابات میں غیر لیگی جماعتوں کی شکست — مولانا آزادؒ کا بیان:

۲؍اپریل ۱۹۴۶ء: کو کانگریس کے صدر مولانا ابوالکلام آزادؒ نے غیر لیگی جماعتوں کی انتخابات میں شکست کے اسباب بیان کرتے ہوئے کہا:

''ہندوستان کی چاروں سرحدوں کے اندر پورے ہندوستان کے سرکاری افسر لیگ کی دوستی اور جانب داری کا دم بھر رہے تھے۔ یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ ایک غیر ملکی حکومت کے حکام محض اسلام اور مسلمانوں کے فایدے کے لیے لیگ کی حمایت پر مجبور ہوئے۔ حتیٰ کہ سرحد کے گورنر نے ایک نواب کو کانگریس کے مقابلے کے لیے لیگ کے ٹکٹ پر کھڑا ہونے کے لیے زور دیا۔ گورنر نے تردید کی مگر مولانا نے دوبارہ اس کو چیلنج دیا اور اپنا بیان واپس لینے سے انکار کر دیا۔''

نئی دہلی ۱۴؍اپریل: صدر کانگریس مولانا ابوالکلام آزادؔ نے ایک دوسرے بیان میں کہا کہ

''بنگال کے انتخابات لیگ کی حرکتوں اور سرکاری حکام کی چشم پوشی اور عملی کارروائیوں کی وجہ سے ایک مذاق ہو کر رہ گئے۔''

اپنے دعوے کی تائید میں مولانا آزادؔ نے نمونے کے طور پر چند واقعات پیش کیے، جن میں امیدواروں کے اغوا سے لے کر ووٹروں کے خلاف تشدد تک کے واقعات شامل ہیں۔ مولانا نے کہا:

''لیگ نے اَن پڑھ پیروں اور ملاؤں کی سرپرستی حاصل کر کے لیگ کے خلاف ووٹ دینے والوں کو عذابِ الٰہی کی دھمکیاں دیں۔''

سرکاری حکام کی لیگ نوازی کی تفصیل بیان کرتے ہوئے مولانا آزادؔ نے کہا کہ

''ان کا طرز عمل ایسا تھا کہ الیکشن کے نتائج پر بھی شبہ ہوتا ہے اور اسی بنا پر یہ الزامات لگائے جا رہے ہیں کہ بہت سے مقامات پر ووٹ کے بکسوں میں دست اندازی کی گئی ہے۔

بنگال کے انتخابات کو دراصل عام معنوں میں انتخاب کہنا دشوار ہے۔ موجودہ زمانے کے انتخابات میں سیاسی جماعتیں اپنے رائے دہندگی کے حلقوں کے سامنے وہ متبادل پروگرام پیش کرتی ہیں، جسے وہ مجالس قانون ساز میں چلانا چاہتے ہیں۔ لیکن بنگال کے انتخابات کی حیثیت ان سے زیادہ اس جہاد کی تھی جس میں بدترین قسم کے مذہبی جذبات کو برانگیختہ کیا گیا۔ بنگال میں بہت سے ایسے ناخواندہ اور نیم خواندہ لوگ پائے جاتے ہیں جو خاندانی وراثت کے بل پر پیر اور مذہبی پیشوا بن بیٹھے ہیں۔ ان میں اکثریت ان کی ہے جو عربی کی ایک سطر بھی نہیں پڑھ سکتے اور اسلام کے مذہبی ادب سے بالکل نابلد ہیں۔ اس کے باوجود صوبے کے مختلف حصوں بالخصوص مشرقی علاقوں میں ان کے بہت سے ماننے والے ہیں جن کی جہالت اور سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر یہ لوگ اپنی موجودہ حیثیت برقرار رکھتے ہیں۔

لیگ نے مذہبی جنون کو ایک اتنے بڑے پیمانے پر بیدار کرنے کے لیے

جس کی اس سے پہلے کوئی مثال نہیں ملتی، ان لوگوں کی امداد حاصل کر لی اور انتخاب میں کوئی سیاسی مسئلہ اٹھانے یا اس پر بحث کرنے کے بجائے اس کو ایک مذہبی جنگ بنا دیا گیا۔

فتوؤں کے ذریعے اعلان کر دیا گیا کہ لیگ کو ووٹ دینا اسلام کو ووٹ دینا ہے اور لیگ کے خلاف ووٹ دینا دائمی عذاب کو دعوت دینا ہے۔ غیر لیگی امیدواروں کو کافر اور مرتد قرار دے دیا گیا اور کہا گیا کہ اگر وہ کامیاب ہو گئے تو ہندوستان میں اسلام ختم ہو جائے گا۔ ان پیروں اور مولویوں کے زبانی وعظ.....فتوؤں کی حدود سے بھی آگے نکل گئے۔

حکام کی سازش:

انتہائی زہریلی قسم کی مذہبی لعنت ملامت کے ساتھ ساتھ جسمانی تشدد بھی اتنے بڑے پیمانے پر کیا گیا جس کی مثال نہیں ملتی۔ انتخابات کے دوران امن و نظم قایم رکھنے میں حکومت کی ناکامی اتنی نمایاں تھی کہ اس پر ایک سازش کا شبہ ہوتا ہے۔ میں انتخابات کے سلسلے میں لیگ کی حمایت میں سرکاری حکام کی بین صوبہ جاتی سازش کا پہلے بھی تذکرہ کر چکا ہوں۔ بنگال میں سازش بالکل کھلی ہوئی تھی۔ بہت سے واقعات میں حکام نے کھلم کھلا لیگ کی حمایت کی۔ مجھے ذے دار پبلک کارکنوں نے جن کی صداقت پر شبہ کرنے کی مجھے کوئی وجہ نہیں ہے، بتایا ہے کہ مسلم حکام کی اکثریت نے ایسی روش اختیار کر رکھی تھی کہ یہ تمیز کرنا دشوار تھا کہ یہ لوگ سرکاری ملازم ہیں یا لیگ کے کارندے۔ چھوٹے درجے کے افسروں نے جب یہ دیکھا کہ اعلا حکام ان کی سرگرمیوں پر کوئی توجہ نہیں دیتے تو ان کی ہمت اور جرأت اور بڑھ گئی۔

مجھے اس بات پر کوئی شبہ نہیں کہ اگر اس معاملے کی تحقیقات کرنے کے لیے ایک غیر جانب دار عدالت مقرر کی جائے تو بڑے چھوٹے افسروں کی انتہائی جانب داری، پاس داری، دخل اندازی اور فرائض سے کوتاہی کے بہت سے واقعات سامنے آجائیں گے۔

ان کا طرز عمل ایسا تھا کہ الیکشن کے نتائج پر بھی شبہ ہوتا ہے اور اسی بنا پر یہ الزامات لگائے جارہے ہیں کہ بہت سے مقامات پر ووٹ کے بکسوں میں دست اندازی کی گئی۔

عذاب الٰہی کی دہائی اور کھلم کھلا سرکاری پاس داری کے علاوہ لیگ نے انتخابات میں اپنی کامیابی کے لیے زیادہ تر دھمکی اور تشدد پر انحصار کیا۔ امیدواروں کو نقل وحمل کی آزادی سے جو انتخابی مہم میں ضروری ہے، محروم کردیا گیا۔ پولنگ بوتھ تشدد اور غنڈہ گردی کے مرکز بن گئے۔ ووٹ کو راز میں نہیں دیا گیا۔ دوسرے فریق کے پولنگ ایجنٹوں کو کام نہیں کرنے دیا۔

دوسری جماعتوں کا ضبط:

غیر لیگی امیدواروں اور ان کے حامیوں کے گھروں کو آگ لگادی گئی۔ حملہ اور مار پیٹ کے لاتعداد واقعات پیش آئے۔ غیر لیگی امیدواروں کا جان و مال غیر محفوظ ہوگیا اور یہ سب اس وجہ سے نہیں ہوا کہ لیگ کو عوام کی کسی بڑی اکثریت کی تائید حاصل تھی۔ دوسری جماعتوں نے اپنے ماننے والوں کو پرامن فضا قایم رکھنے کی سخت ہدایتیں کردی تھیں۔ لیکن دوسری جماعتوں کے ضبط کا نتیجہ صرف یہ ہوا کہ لیگ کے حمایتیوں کی غنڈہ گردی اور تشدد میں مزید اضافہ ہوگیا۔

بنگال میں متعدد حلقے ایسے ہیں جہاں دوسری جماعتوں کو کافی تائید حاصل ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر ان مقامات پر مسلم پارلیمنٹری بورڈ یا کرشک پرجا پارٹی کے امیدوار چاہتے تو وہ غنڈہ گردی کا جواب دے سکتے تھے، لیکن انھوں نے عدم تشدد کی فضا قایم رکھی۔

جہاں جہاں غیر لیگی امیدواروں کے حامیوں نے بھی معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور غنڈہ گردی کا مقابلہ کیا جیسا کہ بارلی سال میں اور کھلنا، فرید پور، میمن سنگھ اور مرشد آباد کے بعض حصوں میں ہوا وہاں غیر لیگی امیدوار زبردست اکثریت کے ساتھ کامیاب ہوئے۔

چند واقعات کی تفصیل:

ایک مختصر بیان میں اس قسم کے تمام واقعات درج کرنا ناممکن ہے، پھر بھی میں بہت زیادہ نمایاں واقعات کے نمونے یہاں پیش کرتا ہوں:

ا۔ لیگ نے بہت سے پیروں اور ملاؤں سے کہہ کر فتوے اور فرمان جاری کرادیے، جن میں ووٹروں سے کہا گیا کہ وہ لیگی امیدواروں کو ووٹ دیں ورنہ مرنے کے بعد ان پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عذاب الٰہی نازل ہوگا۔

۲۔ سرکاری مداخلت کی مثال میں بنگال اسمبلی کے سابق ڈپٹی اسپیکر مسٹر جلال الدین ہاشمی کا وہ بیان پیش کروں گا، جس میں انھوں نے ست کھیڑا کے سب ڈویژنل افسر پر الزام لگایا ہے کہ انھوں نے ۱۹ مارچ کو محمود آباد پولنگ پر مجمع کو مسٹر ہاشمی کی موٹر پر حملہ کرنے کے لیے اکسایا۔ یہاں تک کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو مداخلت کرنا پڑی اور انھوں نے دفعہ ۱۴۴ کے تحت حکم امتناعی جاری کردیا۔ مسٹر فضل الحق نے گورنر کو مطلع کیا کہ بگراہاٹ کے حلقے میں ایک سرکل آفیسر ان کے مقابل لیگی امیدوار ڈاکٹر معظم کا ایک قریبی رشتہ دار ہے۔ یہ افسر چھ سال سے اس حلقے میں تعینات تھا اور وہاں اس کا کافی اثر قایم ہو چکا تھا جسے وہ ڈاکٹر معظم کی حمایت میں استعمال کررہا تھا۔ حکومت نے سرکاری افسر اور لیگی امیدوار کی قرابت داری کے متعلق کوئی بات نہیں کہی اور جواب دیا کہ سرکل افسر اس حلقے میں صرف تین برس سے ہے۔ صرف یہی نہیں ہوا کہ بار بار مسٹر فضل الحق صاحب کی استدعا کے باوجود آفیسر مذکور بدلا نہ جا سکا بلکہ اس کو ایک موقع دے دیا گیا کہ اپنے سرکاری اثر اور رسوخ سے فایدہ اٹھا کر وہ لیگی امیدواروں کی طرف داری کر سکے۔

مسٹر نوشیر علی سابق اسپیکر بنگال اسمبلی نے کھلم کھلا ایک بہت بڑے آفیسر کے خلاف الزام عاید کیا کہ انھوں نے مسلم لیگی امیدوار کی مدد کی ہے اور گورنر کو تار کے ذریعہ مطلع بھی کیا تھا کہ رائے دہندگی کے لیے مقام اور رخ کا جو انتخاب کیا گیا ہے خود اسی سے افسر مذکور کی طرف داری کا پتا چلتا ہے۔ لیکن ان کے تمام احتجاجات بالکل بے سود ثابت ہوئے۔

امیدواروں پر حملے:

ہر ہر قدم پر غیر لیگی امیدواروں کی نقل و حرکت میں مداخلت کی گئی۔ مسٹر فضل الحق، مسٹر عبدالحلیم غزنوی اور مسٹر محی الدین خاں پر حملہ کی خبر اخباروں میں شایع ہو چکی ہے۔ صوبائی انتخاب میں اس قسم کی مداخلت میں اور بھی زیادتی ہو گئی۔ ۵ر دسمبر ۱۹۴۵ء کو بہ مقام شکمیر، لیگی غنڈوں نے مسٹر جلال الدین ہاشمی کی موٹر کار پر سخت حملہ کیا۔ ۲۷ر دسمبر کو دوبارہ تھانہ کے پولیس کے افسروں کی موجودگی میں لیگیوں نے مسٹر ہاشمی صاحب کو مار پیٹ کی۔ پھر ۱۹ر مارچ کو مامور پور پولنگ اسٹیشن (مقام رائے دہندگی) پر پولیس آفیسروں کی موجودگی میں مسٹر ہاشمی کو لیگی غنڈوں نے زدوکوب کیا۔ برہم پوردیہی حلقے سے مسٹر سید بدرالدجیٰ غیر لیگی امیدوار کو لیگیوں نے بھگیر تھ پور پولنگ اسٹیشن میں داخل ہی نہیں ہونے دیا۔ ڈاکٹر ثناء اللہ چاٹگامی شمال مشرقی حلقے سے امیدوار تھے۔ ۵ر مارچ ۱۹۴۶ء کو پھاٹک چاری تھانہ میں مقام تنو پور پر سب رجسٹرار مسلمانوں کی شادیوں کے رجسٹرار یونین بورڈ کے صدر اور مقامی اسکول کے ہیڈ ماسٹر کی موجودگی میں مسلم لیگیوں نے ڈاکٹر ثناء اللہ صاحب کو مار پیٹ کی۔ آپ جس موٹر پر سوار تھے اس کو بھی تباہ کر دیا گیا۔ دوسرے دن ایک دوسری کار میں یہ سفر کر رہے تھے۔ ان کو زبردستی فتح آباد سے واپس کر دیا گیا۔ جب انھوں نے ریل گاڑی سے سفر کرنے کا ارادہ کیا تو چودھریا ہاٹ پر ان پر سخت خشت باری کی گئی۔

مسٹر سید نوشیر علی سابق اسپیکر بنگال اسمبلی پر مقامات ماگورا، بونا گاؤں، ناپیٹا، چارابھائیا اور موہاٹیر وغیرہ پر تقریر کرتے وقت حملہ کیا گیا۔

بھگا لے جانا اور بند کر دینا:

مسٹر حبیب الرحمن چودھری کو جو شمال مشرقی پٹرا سے امیدوار تھے، لیگی غنڈے بھگا لے گئے۔ جب تک پولیس ان کی رہائی کے لیے نہ آسکی۔ مسٹر فاتح علی کو جو کشور گنج سے امیدوار تھے، بند رکھا گیا اور ان کو قتل کی دھمکی دی گئی۔

سراج گنج کے ایک امیدوار مسٹر برکت علی کو لیگی غنڈے بھگا لے گئے اور ان کو اس پر مجبور کیا کہ وہ اعلان کریں کہ وہ انتخاب نہیں لڑیں گے۔ مولوی ریاض احمد (فیلفاہاری حلقہ) اور مولانا منیر الزماں اسلام آبادی (چاٹگام) کے مکانات جلا ڈالے گئے۔ جب سید پور کا انجن آگ بجھانے کو گیا تو لیگی لیڈروں نے پانی کے نل ہی کو کاٹ دیا اور ان لوگوں کو دھمکی دی جو آگ بجھانے آئے تھے۔

مولوی عبدالرزاق (فینی) کو پولنگ اسٹیشن جانے سے روک دیا گیا اور عین ووٹنگ کے روز ان کو گھر سے اس لیے باہر نہیں نکلنے دیا تا کہ وہ اپنے پولنگ ایجنٹ کے نام داخل نہ کر سکیں۔

دھمکی اور تشدد:

برہم پورد یہی حلقے کے تمام مقامات سے دھمکی اور تشدد کی خبر موصول ہوتی رہی ہے۔ گورو ئی موبر، بھکیرت پور اور ملنگی کے مرکزوں میں لیگی غنڈوں نے پولنگ بوتھ ہی پر قبضہ کر لیا۔ اصلی ووٹروں کو مار بھگا دیا گیا اور جس طرح چاہا نقلی ووٹ بھر دیا گیا۔ بکسی میل چنکھالی اور جمیر اہاٹ کے پولنگ بوتھوں پر اسی طرح کے واقعات سننے میں آئے ہیں۔ کناربی ہاٹ، ننو پور، گھیرا اور فتح پور میں بھی ووٹروں کو مار بھگایا گیا اور نقلی (بوگس) ووٹ داخل کیے گئے۔ فتح پور میں ڈاکٹر ثناءاللہ کے پولنگ ایجنٹ کو زدوکوب کیا گیا۔

فینی میں غیر لیگی امیدوار کے ووٹروں کو بھگایا گیا۔ بعض مقامات پر تو ایسا دیکھا گیا کہ بکس میں دس دس بارہ بارہ ووٹوں کا پیکٹ پڑا ہوا ہے۔ حمر سے بھی اس قسم کی متواتر خبریں موصول ہوئی ہیں۔

تحقیقات کی ضرورت:

یہ میرے لیے بہت تکلیف دہ ہوا کہ مجھ کو حکومت کے خلاف اس قسم کا سخت بیان دینا پڑا، لیکن فرائض کی انجام دہی سے میں مجبور ہوں۔ اگر غیر

سرکاری لوگ اس قسم کی بے ایمانی کرتے تو اس پر بھی اعتراض عاید ہوتا۔لیکن یہ حرکت اس وقت اور بھی زیادہ نا قابل برداشت ہو جاتی ہے جب اس کے ذمے دار ایسے لوگ دیکھنے میں آتے ہیں جو حکومت کے ملازم ہیں اور جنھوں نے حکومت کے سامنے غیر جانب داری کا حلف اٹھایا ہے۔ان تمام حقیقت کی روشنی میں حکومت کا فرض ہے کہ اس کے متعلق تحقیقات کیجے اور میرا خیال ہے کہ اگر صحیح معنوں میں تحقیق کی جائے تو اکثر انتخابات ناجایز قرار پائیں گے،اگر انصاف اور اصول سے انتخاب ہو تو یقین ہے کہ مسلم لیگ کے خلاف دوسری جماعت کے امیدوار کثرت سے کامیاب ہو جائیں۔''

(کاروانِ احرار: جلد ہفتم،ص ۷۸-۷۱)

جناح صاحب کی وزارتی مشن سے ملاقات:

۴/اپریل ۱۹۴۶ء:مسٹر جناح مشن سے ملاقات کرنے پہنچے،یہ سلسلہ تین گھنٹے تک جاری رہا۔ویول کا کہنا ہے''میرے خیال میں دو گھنٹے تو بالکل ضایع ہوئے۔'' پھر انھوں نے ہندوستان کا تاریخی تجزیہ کرنا شروع کیا کہ ماضی کی طویل تاریخ کو دیکھا جائے تو ہندوستان بہت کم عرصے کے لیے متحد رہا ہے۔ ہندوستان کا موجودہ اتحاد فی الحقیقت مصنوعی اور غیر فطری ہے جو صرف برطانوی حکومت کے فوجی غلبے اور تسلط کی وجہ سے قایم ہے۔ہندو اور مسلمان مذہبی اعتقادات،تہذیبی اطوار اور رہن سہن کے طریقوں کے اعتبار سے دو الگ الگ قومیں ہیں۔''ہندو مسلمان کے ساتھ ہاتھ ملانے کے بعد اسے دھوتا ہے؛ ہندو گائے کی پرستش کرتے ہیں جب کہ مسلمان اسے شوق سے کھاتے ہیں۔ ہندو اپنے مکان میں مسلمان کو کرائے پر جگہ دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ہندو معاشرہ اور فلسفہ دنیا سے بالکل الگ تھلگ ہے۔تم دس کروڑ مسلمانوں کو پچیس کروڑ ہندوؤں کے ساتھ کس طرح اکٹھے رکھ سکتے ہو،جن کا ضابطہ حیات اس قدر مختلف ہے''۔''مسٹر جناح کیا آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ بنگال کے ہندو اور مسلمان کا تفاوت پٹھان اور سندھ کے مسلمان سے زیادہ ہے؟'' کرپس نے استفسار کیا۔جناح کی دلیل یہ تھی کہ تمام مسلمانوں کے اصول یک ساں ہیں۔وہ ایک خدا پر ایمان رکھتے ہیں،ان کے نزدیک تمام انسان برابر ہیں اور بھائی بھائی

ہیں۔ ہندوان میں سے کسی اصول کو نہیں مانتے۔ ویول کہتا ہے کہ میں نے پاکستان کی سرحدات کے بارے میں پوچھا تو آدھ گھنٹے کی دل چسپ گفتگو کے بعد بھی کچھ ہاتھ نہ لگا۔ اس ملاقات کی جو خفیہ رپورٹ تیار ہوئی اس میں جناح کے بارے میں لکھا ہے کہ اس سے وہ شخص یاد آتا ہے جس پر اپنے ماں باپ کو مار دینے کا الزام تھا اور اس نے عدالت سے اس بنا پر رحم کی استدعا کی تھی کہ وہ یتیم ہے۔

(مولانا ابوالکلام آزاد اور قوم پرور مسلمانوں کی سیاست: ص ۳۲۵)

لاہور ریزولیوشن میں تبدیلی:

مرکزی مسلم لیگ کے عہدے داران اور نومنتخب ممبران قانون ساز مجالس مرکزی و صوبائی کا ایک مشترکہ اجلاس دلی میں ہوا۔ (۷/تا۹/اپریل ۱۹۴۶ء) اجلاس میں قرارداد لاہور (۲۳/مارچ ۱۹۴۰ء) میں نہایت اہم بنیادی ترمیم کی گئی۔ اس سے آزاد اور خود مختار ''مملکتوں'' کا لفظ حذف کر کے صرف ''ایک آزاد اور خود مختار مملکت'' بنانے کے الفاظ شامل کیے گئے۔ آزاد پاکستان اور ہندوستان کے لیے دو الگ الگ آئین مرتب کرنے اور علاحدہ علاحدہ دستور ساز ادارے قایم کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔

آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے قایداعظم نے کہا:

''اقلیتوں کے مسئلے کا جو حل ان میں پیش کیا گیا ہے اس سے زیادہ منصفانہ کوئی اور فیصلہ نہیں ہوسکتا۔ بہ ہر حال وہ اس سے بہتر شرایط نہیں منوا سکتے۔ انھوں نے کونسل سے کہا کہ کیبنٹ مشن نے جو تجویزیں پیش کی ہیں وہ زیادہ سے زیادہ ہیں جسے وہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اس بنا پر انھوں نے کونسل کو مشورہ دیا کہ اسکیم کو منظور کر لے اور کونسل نے متفقہ طور پر اس کے حق میں رائے دی۔''

اسی شب ریزولیوشن پیش کرتے ہوئے مسٹر حسین شہید سہروردی نے اس کے حق میں زبردست تقریر کی۔

''ہم پر امن زندگی گزارنے کے خواہش مند ہیں، ہمارا سول وار شروع کرنے کا ارادہ نہیں ہے، لیکن ہمیں ایک ٹکڑا زمین درکار ہے جہاں ہم امن

سے زندگی گزار سکیں..... میں نے اس پر بہت غور کیا ہے کہ کیا مسلمان خانہ جنگی کے لیے تیار ہیں۔ مجھے دیانت داری سے کہنے کی اجازت دیں کہ ہر بنگالی مسلمان اپنی جان قربان کرنے کے لیے تیار ہے۔''

اس کے ساتھ ہی انھوں نے قایداعظم کی جانب منہ پھیر کر کہا:

''میں آپ سے بنگالیوں کو آزمانے کی درخواست کرتا ہوں۔''

پھر یہی حسین شہید سہروردی تین جون پلان تقسیم ہند منصوبہ کے اعلان کے بعد وایسرائے ماؤنٹ بیٹن سے خواست گار ہوئے کہ انھیں تھوڑی سی مہلت دی جائے تو وہ بنگال کو متحد رکھنے، خودمختار اور آزاد بنانے میں کامیاب ہوسکتے ہیں اور قایداعظم کو بھی اس پر رضامند کرسکتے ہیں۔ انھیں اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بنگال کے دیگر مسلم لیگیوں کا تعاون حاصل تھا۔ قایداعظم نے بھی اس منصوبہ پر خوشی کا اظہار کیا تھا اور کانگریس کے بنگالی رہنما اور مسلم لیگی قایدین بنگال مل کر اسے منطقی نتیجے پر پہنچانے کی کوشش کرتے رہے اور کنونیشن میں کیے ہوئے حلف کو پس پشت ڈال دیا۔ حال آں کہ اس وقت پاکستان کے قیام کا اصولی فیصلہ ہوگیا تھا۔ اب اس آفتاب کے طلوع ہونے میں زیادہ دیر نہ رہ گئی تھی۔

چودھری خلیق الزماں نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔''اب مسلمان اپنی تقدیر کا فیصلہ خود کریں گے۔'' انھوں نے اپنا رخ قایداعظم کی طرف موڑتے ہوئے کہا''ہم پاکستان کے حصول کے لیے جان کی بازی لگا دیں گے''۔''میں نے ریزولیوشن پیش کرتے وقت اس نہایت عمدہ تجویز کی اہمیت پر زور دیا۔'' خلیق الزماں رقم طراز ہیں۔ لیکن پاکستان کے بعد ان کا ذاتی کردار انتہائی دوغلا اور شرم ناک تھا۔

جب پاکستان معرض وجود میں آگیا اور ہندوستان آزاد ہوگیا تو بھارتی ترنگے کو سلامی دی، ہندوستان سے وفاداری کا حلف اٹھایا۔ بعدازاں راہِ فرار اختیار کرکے پاکستان آگئے اور یہیں براجمان ہوگئے۔ پاکستان مسلم لیگ کے آرگنائزر اور پھر صدر بنے، بنگال کے گورنر بن گئے اور گراں قدر متروکہ املاک اپنے اور اپنے اہل خاندان کے نام سندھ میں منتقل کرالی۔ ہندوستان کے مسلمان مرکزی اسمبلی پارٹی مسلم لیگ کے قاید کی طرف ایڑیاں اٹھا اٹھا کر دیکھتے رہے۔

ملک فیروز خان نون تازہ وارد مسلم لیگ نے کونسل سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

''نہ تو ہندو اور نہ ہی انگریز ابھی اس سے آشنا ہیں کہ ہم پاکستان حاصل کرنے کے لیے کس حد تک مستعد ہو چکے ہیں۔ ہم ایک عظیم المیے کی دہلیز پر پہنچ چکے ہیں۔ اگر برطانیہ نے ہم پر اکھنڈ حکومت مسلط کی تو مسلمان ایسی تباہی مچائیں گے کہ ہلاکو اور چنگیز خاں بھی شرما جائیں۔''

ویول کہتا ہے:

''فیروز خان نون نے زیادہ خوش فہمی کے انداز میں کہا کہ ہر ہندوستانی کی یہ خواہش ہے کہ وہ سلطنت برطانیہ میں شامل رہے۔''

یہ تھا کردار اور تضاد ان کا یعنی یہ انگریزوں کے انخلا کے سرے سے خواہش مند ہی نہ تھے۔ مسلمانوں سے کسی اور زبان میں گفتگو کرتے تھے اور اپنے آقاؤں سے کسی اور زبان میں!

خان عبدالقیوم خان نے تالیوں کی گونج میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

''خدا کا شکر ہے، ہمارا ایک جھنڈا ہے، ایک رہنما ہے، ایک پلیٹ فارم ہے اور ایک نظریہ ہے..... پاکستان..... جس کے لیے ہم برسرِ پیکار ہیں۔ ہم صرف آخری حکم کے منتظر ہیں کہ ہم پاکستان حاصل کرنے کے لیے جو کچھ کر سکتے ہیں کر گزریں۔''

خان عبدالقیوم خان اپنی تصنیف ''گولڈ اینڈ گنز آن دی پٹھان فرنٹیر'' میں مسلم لیگ میں شامل ہونے والوں کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

''مسلم لیگ کو صوبہ سرحد کے مفاد پرستوں کی حمایت حاصل ہونے لگی ہے۔ جن میں اعزازی مجسٹریٹ، ذیل دار، بڑے زمین دار اور رجعت پسند شامل ہیں۔ یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ ان کے لیے یہ ایک عمدہ موقع ہے۔ ''اسلام خطرے میں ہے'' کا نعرہ بلند کر کے اقتدار پر قبضہ کیا جا سکتا ہے اور اپنے طبقے کے مفادات حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ جنھیں کانگریس نے بھونڈے طریقے سے دبایا ہوا ہے۔''

تب ''خانِ اعظم'' سرخ پوش تھے، خدائی خدمت گار تھے، خان عبدالغفار خان کے

پیروکار تھے، انھیں کے طفیل غیر منقسم ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کے رکن بنے تھے اور بعد میں کانگریس اسمبلی پارٹی کے ڈپٹی لیڈر بنائے گئے تھے۔ سر یامین خان اس روایت کی صحت کے ذمے دار ہیں کہ وہ کانگریس اسمبلی پارٹی کے لیڈر مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی کی مخبری کرتے تھے اور مسلم لیگ کو خبریں پہنچایا کرتے تھے..... وہ ۱۹۴۳ء سے ہی مسلم لیگ میں شامل ہونے کے لیے پر تول رہے تھے۔ پاکستان کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"..... یہ کس قسم کی مسلم ریاست ہوگی جہاں مشرقی صوبوں میں تقریباً آدھی آبادی غیر مسلم ہوگی؟ کیا یہ مستحکم ریاست ہوگی؟ توانا ہوگی؟ کیا یہ امن برقرار رکھ سکے گی؟ اگر مسلمان، جو کہ ہندوستان کی آبادی کا ایک چوتھائی ہیں ضرور علاحدہ ریاست یا ریاستیں قایم کرنا چاہتے ہیں، تو مشرقی پاکستان کے غیر مسلموں کو جن کی تعداد مسلمانوں کے برابر ہے، اس حق سے کس طرح محروم بنایا جا سکتا ہے؟ پھر یہ سوال شمال مغربی پاکستان میں پیدا ہوگا۔ کیا پنجاب، جو اس ریاست کا اہم ستون ہوگا، مسلم توانا ریاست بن سکے گا، جہاں ۴۳ فیصد مشتعل غیر مسلم اس علاقے میں آباد ہوں گے جو ہندوستان سے متصل ہے؟"

یہ سوال بحث طلب ہے کہ اجلاس عام (۲۳ر مارچ ۱۹۴۰ء) کے فیصلوں میں کوئی محدود ایوان بنیادی تبدیلی کرنے کا مجاز ہے اور نیا فیصلہ جمہوری اور جایز کہلانے کا مستحق ہے؟ جن ممبران نے قرارداد لاہور میں ترمیم کی انھوں نے الیکشن اس غرض سے لڑا ہی نہ تھا، بلکہ انھوں نے تو ۱۹۴۰ء کی قرارداد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے الیکشن میں حصہ لیا تھا۔ جس کا مقصد ایک سے زاید آزاد اور خود مختار ریاستوں کا قیام تھا۔ عوام نے ان کے حصول کے لیے اعتماد بخشا تھا۔ نہایت افسوس کا مقام ہے کہ الیکشن میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد نو منتخب ممبران نے سادہ لوح عامتہ المسلمین کے ساتھ کیے ہوئے وعدوں کو فراموش کر دیا اور ان کے اعتماد کو شدید دھچکا لگایا۔ مسلم لیگ کا فیصلہ جمہوری اصولوں کے منافی تھا، یہی وجہ تھی کہ جب فیصلہ کن مرحلہ آیا تو بنگال کے مسلم لیگی بنگال کو متحد رکھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔

مشن نے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ جناح سے ملاقات (۱۶ر اپریل) کے

دوران پیتھک لارنس نے کہا کہ مکمل پاکستان کے مطالبے کو تسلیم کرنے کے امکانات کم ہیں
اور دونوں جانب تمام علاقے کا حصول معقول امید نہیں کہا سکتی، جب کہ اس میں کافی تعداد
میں غیر مسلم آباد ہیں۔ مسٹر کرپس نے اپنی انتہائی خفیہ دو تجاویز کا نقشہ مسٹر جناح کے سامنے
غور کرنے کے لیے پیش کیا۔ پہلی تجویز کے مطابق تین حصوں پر مشتمل آل انڈیا یونین کی
تجویز تھی۔ جس میں ہندو اکثریتی صوبے، مسلم اکثریتی صوبے اور ریاستیں شامل تھیں۔
یونین حکومت کے پاس محدود اختیارات تجویز کیے گئے تھے جن میں دفاع، امورِ خارجہ اور
مواصلات شامل تھے دوسری تجویز کے مطابق برطانوی ہندوستان کو ہندوستان اور پاکستان
میں تقسیم کرنا مقصود تھا اور اس میں ریاستوں کو شامل کیا جا سکتا تھا۔ پاکستان کی صحیح حد بندی
شمال مشرق اور شمال مغرب کے تمام اضلاع میں آبادی کے لحاظ سے کی جانی تھی۔ کیوں کہ
پاکستان کے مطالبے کی بنیاد دو قومی نظریے پر تھی، اس لحاظ سے اگر غیر مسلم علاقوں کو اس میں
شامل کیا جاتا تو یہ اس تصور سے بالکل بے تعلق ہوتا۔ پھر یہ بے جوڑ تعلق پاکستان کی معیشت
کے لیے بھی سود مند نہ ہوتا۔ اس سے پاکستان کا استحکام بھی متاثر ہوتا، اگر وسیع اقلیت کو ان
کی منشا کے خلاف ایسے علاقوں میں شامل کر دیا جاتا۔ سیکریٹری آف اسٹیٹ نے مسٹر جناح
کو اس فارمولے پر مزید غور کرنے کا مشورہ دیا اور مشن کچھ سستانے کی غرض سے چند یوم
کے لیے سری نگر چلا گیا۔

کشمیر سے مراجعت اور گفتگو کا نیا دور:

کرپس نے سری نگر روانگی سے قبل جناح سے ایک اور ملاقات کی تھی (۱۷ اپریل)
اس میں مسٹر جناح نے ایک مرکز کو ماننے سے یکسر انکار کیا۔ اس نے عندیہ ظاہر کیا کہ
ملک معظم کی حکومت اپنا ایوارڈ جاری کر دے جسے ہر حال میں تمام پارٹیاں حقارت سے
مسترد کر دیں گی، لیکن اسے قبول کر لینے کے بھی امکانات ہیں۔ کرپس نے گاندھی جی سے
ملاقات کی اور بتایا کہ جناح اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ گاندھی جی نے اس سے
اتفاق کیا کہ مسٹر جناح مولانا آزادؒ سے نہیں ملیں گے اور میرا ان سے ملنا بے سود ہوگا۔
گاندھی جی نے خیال ظاہر کیا کہ شاید وہ نہرو سے ملاقات کے لیے تیار ہو جائیں۔ کرپس اور
دیگر وزرا کا خیال تھا کہ جناح اور نہرو کے درمیان ملاقات ضرور ہونی چاہیے۔ کسی سمجھوتے

کی امید سے نہیں بلکہ خالصتاً تشہیر کے نقطۂ نظر سے کہ ہم نے مفاہمت کی پوری کوشش کی ہے۔

مشن کشمیر سے واپس دہلی پہنچ گیا۔ (۲۴/اپریل) ان اثنا میں کوئی پیش رفت نہ ہوئی۔ بلکہ مایوسی میں اضافہ ہوا۔ کرپس نے ویول کو بتایا کہ کسی فارمولے پر اتفاق نہیں ہو رہا۔ (۲۵/اپریل) مسٹر جناح نے تھوڑی بہت امید کو یہ کہہ کر بالکل ختم کر دیا کہ میں نے جو کچھ اب تک کہا ہے۔ یہ میری ذاتی رائے ہے اور ضروری نہیں کہ لیگ بھی ایسا ہی سوچتی ہو۔ البتہ انھوں نے اس سے اتفاق کیا کہ وہ تین مرحلے کے آئینی منصوبے کو مذاکرات کی بنیاد بنانے کے لیے مسلم لیگ کے سامنے پیش کرنے کے لیے تیار ہیں۔ بہ شرطے کہ اس سلسلے میں کانگریس کا رویہ مثبت ہو۔

دوسری شملہ کانفرنس میں شرکت کے لیے دعوت نامے:

معاملات اس قدر نازک اور حساس تھے کہ ہر کوئی پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا۔ تجاویز پر ردِ عمل ظاہر کرتے وقت اپنا بنیادی نقطۂ نظر بیان کرنے سے کوئی نہیں چوکتا تھا۔ لارڈ پیتھک لارنس نے کانگریس کے صدر مولانا ابوالکلام آزادؔ کو ایک مکتوب ارسال کیا۔ (۲۷/اپریل ۱۹۴۶ء) جس کی ابتدا میں مشن کی کارروائی میں حصہ لینے کے لیے اپنے چار نمایندے نام زد کرنے کی دعوت دی تھی۔ ایسا ہی دعوت نامہ مسلم لیگ کے صدر مسٹر محمد علی جناح کو روانہ کیا تھا۔ تاکہ مذاکرات کے ذریعے مفاہمت کی راہ تلاش کی جا سکے۔ مذاکرات کے لیے ایک اسکیم تیار کی گئی تھی جس کے بنیادی اصول حسب ذیل تھے:

یونین گورنمنٹ کا قیام جس کے پاس خارجہ امور، ڈیفنس اور مواصلات کے محکمے ہوں گے۔

صوبوں کے دو گروپ ہوں گے ایک میں ہندو اکثریتی صوبے شامل ہوں گے اور دوسرے میں مسلم اکثریتی صوبے۔ ان کی تحویل میں تمام دیگر امور ہوں گے جنھیں وہ اپنے پاس رکھنے کے خواہش مند ہوں۔ صوبائی حکومتیں بقایا تمام امور اپنے پاس رکھیں گی اور باقی ماندہ خود مختارانہ حقوق انھیں حاصل ہوں گے۔

یہ پہلو دھیان میں رہے کہ ہندوستانی ریاستیں اپنا جائز مقام ہندوستان کے ڈھانچے

میں متعین کریں گی، ان شرایط پر جوان سے مذاکرات کے ذریعے طے ہوں گے۔
(مولانا ابوالکلام آزادؒ اور قوم پرور مسلمانوں کی سیاست: ص ۲۱-۲۲۵)

وزارتی مشن سے مولانا آزادؒ کی پہلی ملاقات:

۶/اپریل ۱۹۴۶ء: مولانا آزادؒ نے کیبنٹ مشن سے ملاقات کی۔ مشن سے گفتگو کی تفصیل کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں:

"میں کیبنٹ مشن کے ممبروں سے پہلی مرتبہ ۶/اپریل ۱۹۴۶ء کو ملا۔ مشن نے تبادلہ خیال کے لیے پہلے سے کچھ سوالات تیار کر لیے تھے۔ پہلا سوال ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسئلے سے متعلق تھا۔ جب مشن نے مجھ سے سوال کیا کہ میں فرقہ وارانہ گتھی کو کس طرح سلجھا سکتا ہوں، تو میں نے وہی حل پیش کیا جو میں نے پہلے سے سوچ رکھا تھا۔ جونہی میں نے کہا کہ لازمی اختیارات کی فہرست جو کم سے کم ہوں گے، مرکز کے پاس ہوگی اور اس کے علاوہ اختیاری امور کی بھی فہرست ہوگی، تو لارڈ پیتھک لارنس نے کہا دراصل آپ فرقہ وارانہ مسئلے کا ایک نیا حل پیش کر رہے ہیں۔

سر اسٹیفورڈ کرپس نے خاص طور پر میری تجویز میں دل چسپی لی اور بڑی دیر تک مجھ سے جرح کرتے رہے۔ آخر میں معلوم ہوتا تھا کہ وہ میرے نقطۂ نظر سے مطمئن ہو گئے ہیں۔" (انڈیا ونس فریڈم: ص ۲۲۴)

مسٹر جناح کا متذبذب رویہ:

۹/۸/اپریل ۱۹۴۶ء: بین الاقوامی حالات نے اور خود ان واقعات نے جو ہندوستان میں رونما ہو چکے تھے، مدبرین برطانیہ کو مجبور کیا کہ کانگریس سے مخالفت کی پالیسی کو کم از کم ظاہری طور پر ترک کر کے تعاون کا ہاتھ اس کی طرف بڑھائیں اور اپنی تمام جدو جہد اس مقصد پر صرف کر دیں۔ وزارتی مشن کی تشریف آوری اس جدو جہد کا پیش خیمہ تھی۔
یہ صورت حال مسٹر جناح اور ان کی لیگ کے لیے ایک اندوہ ناک حادثے کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس وقت لیگ کے سامنے دو راستے تھے۔ حصول پاکستان کے لیے

برطانیہ کا مقابلہ یا برطانوی نظریے کی اطاعت اور مطالبۂ پاکستان کی تاویل:

مسٹر جناح نے اولاً پہلا راستہ اختیار کیا۔ کیوں کہ مسلمانوں کے جذبات کو فرو کرنے کے لیے اس کے بغیر چارہ نہ تھا۔ چناں چہ ۹/اپریل کو جب کہ وزارتی مشن ہندوستانی لیڈروں سے ملاقاتیں کر رہا تھا مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے ممبروں کا کنونشن اور اجتماع کیا گیا۔ ہندوستان کے طول و عرض میں مسلم لیگ کے اثر و رسوخ کا مظاہرہ بھی اس کنونشن کا مقصود تھا۔ چناں چہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ دہلی میں یہ اجتماع ہوا۔

حضرات مقررین نے ہندو مسلم منافرت اور اشتعال انگیزی میں اپنا پورا زور بیان صرف کر دیا۔ سر فیروز خان نون نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

> ''اگر ہم یہ سمجھیں گے کہ ہمیں متحدہ مرکز کی حکومت یعنی ہندو راج میں رکھا جا رہا ہے تو ہم برطانیۂ عظمیٰ سے جنگ کریں گے اور وہ خون کی ندیاں بہائیں گے جس سے چنگیز اور ہلاکو کے کارنامے بھی شرمندہ ہو جائیں گے۔
>
> اس صورت میں مسلمانوں کی نگاہیں صرف روس پر لگی ہوں گی۔ پنجاب میں اس وقت ایک بڑی تحریک موجود ہے۔ زمین دار بھی کمیونزم کی حمایت میں ہیں۔'' (خلافت بمبئی ۱۱/اپریل ۱۹۴۶ء: ج ۲۵، ص ۸۶)

دو روز کے اجلاس میں ایک طویل تجویز پاس کی گئی جس کا ضروری اقتباس درج ذیل ہے:

> ''چوں کہ مسلمانان ہند کا یقین ہے کہ اسلامی ہند کو ہندوؤں کے تسلط و غلبے سے محفوظ رکھنے اور ذاتی شعور و صلاحیتوں کی بنا پر اپنے آپ کے لیے ارتقا کے مکمل اور بہترین مواقع پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ایک آزاد و خود مختار حکومت کا قیام عمل میں لایا جائے۔ بنگال اور آسام جس کا شمال مشرقی جزو ہوں اور پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان شمال مغرب میں.....
>
> لٰہذا ہندوستان کی مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے مسلم لیگی ممبران کی کنونشن عمیق غور و فکر کے بعد اعلان کرتی ہے کہ اسلامی ہند ہرگز ہرگز ایسے اعلان کو تسلیم نہیں کرے گا جو اکھنڈ ہندوستان کی بنیادوں پر وضع کیا گیا ہو۔ نہ

ہی وہ کسی ایسے واحد آئین ساز مشنری میں شرکت کریں گے جو اس سلسلے میں قایم کی گئی ہو۔

نیز اگر حکومت برطانیہ نے انگریزوں کے بجائے ہندوستانی عوام کے نام اختیارات حکومت منتقل کرنے کے سلسلے میں ہندوستان کے داخلی نظم و نسق اور امن کی بحالی کے لیے کوئی ایسا فارمولا وضع کیا جو مندرجہ ذیل اصولوں کے معیار پر پورا نہ اترتا ہو تو اسلامی ہند ہندوستانی سیاسی مسئلے کے تصفیے کے لیے اپنی اعانت و تعاون پیش نہیں کرے گا۔

مطالبات

۱۔ کہ ہندوستان کے شمال مشرق میں بنگال اور آسام، شمال مغرب میں پنجاب، شمالی مغربی سرحدی صوبہ کے پاکستانی علاقوں میں جہاں کہ مسلمان بھاری اکثریت میں ہیں ایک آزاد خود مختار ریاست کی بنیاد ڈالی جائے اور پاکستان کے قیام کی فوری گارنٹی دی جائے۔

۲۔ کہ پاکستان اور ہندوستان کے عوام اپنے اپنے آئین مرتب کرنے کے سلسلے میں دو علاحدہ علاحدہ آئین ساز ادارے قایم کریں۔

۳۔ کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی ۲۳ر مارچ ۱۹۴۰ء والی لاہور والی قرارداد کی شرایط کے مطابق پاکستان اور ہندوستان کی اقلیتوں کے لیے تحفظات مقرر کیے جائیں۔

۴۔ کہ مرکز میں کسی عارضی حکومت کی تشکیل یا اس میں شرکت کی گارنٹی اس وقت دے سکتی ہے جب مسلم لیگ کا مطالبۂ پاکستان فوری طور پر تسلیم کرلیا جائے اور اس کی شرایط کو بغیر مزید تاخیر کے عملی جامہ پہنایا جائے۔

یہ کونشن زوردار لہجے میں اس امر کا اعلان کرتی ہے کہ اگر اکھنڈ ہندِوستان کی بنیادوں پر کوئی آئین ٹھونسنے کی کوشش کی گئی یا مسلم لیگ کے مطالبۂ پاکستان کی شرایط کے خلاف مرکز میں کوئی عارضی حکومت قایم کرنے کی کوشش کی گئی تو مسلمانان ہند کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہ جائے گا کہ وہ تمام وسایل کو کام میں لاکر اور اپنے قومی وجود اور تحفظ و بقا کے لیے اس سے

پوری مزاحمت کریں گے۔''

(خلافت۔ بمبئی: ۱۰ اپریل ۱۹۴۶ء، جلد ۲۵، صفحہ ۸۶)

اس کنونشن میں مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے تمام اراکین اور لیگ کے ذمے دار ممبران سے ایک عہد لیا گیا۔ عہد نامے کے الفاظ حسب ذیل تھے:

عہد نامہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ ان صلوٰتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العالمین۔

''میری تمام عبادات و اعمال اور زندگی و موت خدا کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے۔''

''میں جو کہ مسلم لیگ پارٹی کا..... اسمبلی یا کونسل میں ممبر ہوں اس عہد نامے کے ذریعے پوری سنجیدگی اور خلوص اور عزم صمیم کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ مسلمان قوم جو برصغیر میں اقامت گزین ہے اس کا تحفظ اسلامی نجات و ترقی صرف حصول پاکستان کے ذریعے ہی ممکن ہے جو کہ صرف واحد مساویانہ باعزت صحیح حل ہے۔ پاکستان ہی اس عظیم برصغیر کی اقلیتوں اور قومیتوں کے لیے امن، آزادی اور خوش حالی کا ذریعہ ہے۔ میں پوری ایمان داری کے ساتھ عہد کرتا ہوں کہ میں بڑی خوشی اور مستعدی کے ساتھ ان تمام ہدایات و احکام کو بجالاؤں گا جو آل انڈیا مسلم لیگ کی طرف سے کسی بھی تحریک کے چلانے کے سلسلے میں جو وہ مسلمانوں کے محبوب مقصد پاکستان کے حصول کے لیے چلائے گی نافذ ہوں گے اور یہ باور کرتے ہوئے جیسا کہ میں باور کرتا ہوں کہ میرا کاز حق پسندانہ اور منصفانہ ہے۔ عہد صمیم کرتا ہوں کہ ہر اس خطرے، ہر اس امتحان اور قربانی کے لیے تیار رہوں گا جو مجھ سے طلب کی جائے گی۔ خدا میرے ارادے میں استقامت بخشے اور میرے قدموں کو متزلزل نہ ہونے دے اور مجھے منکروں کے پھندے سے بچائے۔

(دستخط)

اس عہد کی ایک ایک کاپی ہر ایک ممبر کو بانٹ دی گئی اور ایک ایک کاپی نواب زادہ

لیاقت علی خان نے اپنے پاس رکھ لی۔
(روزانہ انجام۔ دہلی: مورخہ ۸ر جمادی الاولی ۱۳۶۵ھ مطابق ۱۲ راپریل ۱۹۴۶ء، جلد ۹، صفحہ ۱۱۷)
عہد و میثاق کی تجدید و توثیق کے بعد ۱۰ راپریل کو کنونشن کا اجلاس بہ خیر و خوبی ختم ہوگیا۔ پاکستان کے متعلق عہد کی تجدید بھی ہوگئی۔ لیکن اس اجلاس نے نہ وزارتی مشن کے سامنے کوئی روشنی پیش کی نہ ان سنجیدہ مسلمانوں کے سامنے جو ہندو ہندوستان کے مسلمان باشندوں کو بھی زندگی کا حق دار سمجھتے ہیں، چناں چہ ایک نمایندہ پریس کے سوال کے جواب میں مسٹر جناح نے فرمایا:

”جن صوبوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں اُن کے لیے تین صورتیں ہیں۔ ایک غریب الوطن غیر ملکی کی طرح زندگی بسر کریں۔ (جن کا کوئی حق یا کوئی حصہ حکومت میں نہ ہوگا اور وہ اپنے آبائی وطن میں رہتے ہوئے اسی طرح غریب الوطن اجنبی اور حق حکومت سے محروم رہیں گے۔ (جیسے کوئی افریقہ، نیپال یا آزاد قبایل کا باشندہ) یا

ہندو نیشن اختیار کرلیں۔ (معاذ اللہ!) جس کے معنی مسٹر جناح کی تفسیر کے بہ موجب ہندو مذہب ہیں۔ کیوں کہ نظریہ نیشن کی بنیاد ہی اس پر ہے کہ نیشن کو مذہب کے ہم معنی قرار دیا جائے)۔

تیسری صورت یہ ہے کہ پاکستان تشریف لے آئیں وہاں میں ان کا استقبال کروں گا۔“

ایک اور سوال کا جواب دیتے ہوئے مسٹر جناح نے فرمایا:

”میں کانگریس سے کہتا ہوں تقسیم کرو۔ میں تمہارے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتا۔ اگر تم اس کے سوا کچھ اور کہتے ہو تو یہ دھوکا ہے۔ ان دونوں قوموں میں جن میں ایک اور تین کا تناسب ہو۔ مساویانہ حصے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ چیز غیر فطری اور مصنوعی ہے۔ زندگی کے ہر معاملے میں ہمارا اختلاف ہے۔ اس لیے اس قسم کا آئین کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ ہم مساویانہ حصہ نہیں مانگتے، ہم صرف ایک چوتھائی مانگتے ہیں۔ ہم ہندوؤں کو ۳/۴ حصہ دیتے ہیں۔ تاکہ وہ اپنے فلسفۂ تمدن اور عقاید کے مطابق رہ سکیں اور ہم اپنے فلسفۂ زندگی

کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ ہم نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے سے متباین ہیں
بلکہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔"

اخباری نمایندے نے جب دریافت کیا کہ کیا تدبر اور سیاست کا یہ اقتضا نہیں ہے کہ اختلافات کو بڑھانے کے بجائے ان کو کم کیا جائے؟ مسٹر جناح نے فرمایا:

"بے شک! مگر ہمیں صرف موجودہ حالات اور حقایق سے کام لینا ہے اور چاہے کتنا ہی تدبر کیوں نہ ہو وہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے مناقشے کو نہیں مٹا سکتا۔" (اجمل۔ بمبئی: ۱۲/اپریل ۱۹۴۶ء، جلد ۸، صفحہ ۷۷، بہ حوالہ علماے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے: حصہ دوم، ص ۹۷-۳۸۹)

شیعہ پولی ٹیکل کانفرنس کی تجاویز:

۹/اپریل ۱۹۴۶ء: لکھنؤ۔ ۹/اپریل ۱۹۴۶ء آل انڈیا شیعہ پولی ٹیکل کانفرنس کی سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی نے اپنے اجلاس میں تین ریزولیوشن پاس کیے:

۱۔ شیعہ کمیونٹی مسٹر جناح کے پاکستان کے حق میں نہیں۔

۲۔ اس امر پر اظہار افسوس کیا گیا کہ شیعوں کے کسی نمایندے کو کیبنٹ مشن نے ملاقات کے لیے نہیں بلایا۔

۳۔ مسلم لیگ شیعوں کی نمایندگی نہیں کرتی۔ اس ضمن میں کانگریس نے شیعوں کی شکایات کے متعلق جو دوستانہ رویہ اختیار کر رکھا ہے، اس کی تعریف کی۔

(روزنامہ "ویر بھارت" لاہور: ۱۰/اپریل ۱۹۴۶ء)

مسٹر جناح کا رویہ — جی ایم سید کا بیان:

۱۰/اپریل ۱۹۴۶ء: سندھ کے مشہور سیاسی رہنما جی ایم سید نے دہلی میں قیام کے دوران ایک بیان میں کہا ہے:

"قیام دہلی کے دوران میں نے نیشنلسٹ مسلمانوں کے لیڈروں اور کانگریسی لیڈروں کے ساتھ بات چیت کی ہے، لیکن مسٹر جناح نے میرے ساتھ بات چیت کرنے سے انکار کر دیا اور شرط پیش کی کہ جب تک میں ان کے سامنے غیر مشروط طور پر ہتھیار نہ ڈال دوں اور اپنی آیندہ نیک چلنی کا یقین

نہ دلاؤں وہ میرے ساتھ کوئی بات چیت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔"

جی ایم سید نے بیان کے آخر میں کہا:

"ایک وقت آئے گا کہ مسٹر جناح کو یہ احساس ہوگا کہ ان کا فرقہ وارانہ رویہ مسلمانوں کے مفاد کے منافی ہے۔ مسٹر جناح نے اس وقت جو رویہ اختیار کر رکھا ہے اس سے ہندوستان کا کچھ نہیں بن سکتا۔ بلکہ اس کی آزادی رک جائے گی۔" (روزنامہ "ویر بھارت" لاہور ۱۰ اپریل ۱۹۴۶ء)

مسلمانوں کا حق خود ارادیت — سردار پٹیل کی ضمانت:

۱۰ اپریل ۱۹۴۶ء: ۱۰ اپریل ۱۹۴۶ء کو آل انڈیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر سردار پٹیل نے ڈیلی "ورکر" کے نامہ نگار "مسٹر رجنی پام دت" کو بیان دیتے ہوئے حق خود ارادیت اور حق علاحدگی کے متعلق کانگریس کے نقطۂ نظر کی تشریح اس طرح کی کہ کانگریس کی موجودہ پالیسی یہ ہے کہ اگر لیگ یہ سمجھتی ہے کہ کانگریس کی موجودہ پالیسی کی وجہ سے مسلمانوں کی ترقی رکتی ہے تو کانگریس صوبوں کی دوبارہ تقسیم پر راضی ہے۔ یہ تقسیم اس طرح ہونی چاہیے کہ جن علاقوں میں ان کی اکثریت ہے وہاں انھیں مکمل خود اختیاری مل جائے، بہ شرطے کہ وہ مشترکہ مفاد کے لیے ایک مشترکہ پالیسی پر رضامند ہو جائیں۔ کانگریس ملک کی تقسیم پر کسی حالت میں اس لیے راضی نہیں ہو سکتی کہ اس کی وجہ سے وفاق کے دونوں اجزا کا مفاد خطرے میں پڑ جائے گا۔ اس طرح کی تقسیم کی اجازت دینا خطرناک ہوگا۔ آج کل دنیا کی بڑی طاقتیں اپنی سرحدوں پر محفوظ علاقے قایم کرنے پر غور کر رہی ہیں۔ ایک نیا ہندوستان جب اپنی آزادی حاصل کرے گا تو اپنی آزادی کو کسی طرح محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ اگر اس نے اپنی سرحدوں کے اندر ایک خطرناک علاقہ بنا لیا، لیکن کانگریس وفاق کے کسی جزو کو اس کی مرضی کے بغیر ہندوستانی یونین میں رہنے کے لیے مجبور نہیں کرے گی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی کانگریس کسی علاقے کے علاحدہ ہونے کے لیے اپنی رضاکارانہ مرضی بھی نہیں دے گی، وہ عدم تشدد کے اصول پر اس بات کی برابر تلقین کرتی رہے گی کہ علاقے ہندوستانی یونین میں شریک ہوں۔ اس کے لیے کبھی بھی وہ تشدد کو استعمال نہ کرے گی۔

(قومی آواز: مورخہ ۱۲ اپریل ۱۹۴۶ء: جلد ۱، صفحہ ۹۵)

مسلمان اپنے فیصلے میں بالکل آزاد ہیں! پنڈت جواہر لال نہرو:

پنڈت جواہر لال نہرو نے ۳ر اپریل کو ''رائٹر'' کے سیاسی نامہ نگار فریز روایٹن کو بیان دیتے ہوئے پاکستان سے متعلق ایک سوال کے جواب میں کہا: جہاں تک کانگریس کا تعلق ہے وہ کسی فیصلے کو منوانے کے لیے اکثریت یا اقلیت پر کوئی جبر نہیں کرے گی۔ ہم نے یہ بات صاف صاف کہہ دی ہے کہ ایسی صورت پیدا کرنی ضروری ہے جب ہر جماعت یہ خیال کرنے پر مجبور ہو جائے کہ فیصلے کا انحصار کسی غیر ملکی طاقت کے بجائے خود ہندوستانیوں پر ہے۔...... مجلس آئین ساز کو آخری فیصلے کا حق دینا خاص اہمیت رکھتا ہے، لیکن کسی فیصلے کو بہ جبر عاید کرنے کے بجائے یہ اعلان کر دینا چاہیے کہ کسی علاقے کو مجلس آئین ساز میں شرکت کے لیے مجبور نہیں کیا جائے گا۔ حال آں کہ اس میں شرکت کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہے گا...... اگر پنجاب یا سندھ یا کچھ اور علاقے مجلس آئین ساز میں شریک نہیں ہونا چاہتے تو انھیں فی الحال اس کا حق ہوگا لیکن بعد میں اس علاقے کے عوام کی رائے لینی ضروری ہوگی۔ مجوزہ آئین کے مطابق رضا مند وحدتوں کا ایک وفاق قایم کیا جائے گا جنھیں زیادہ سے زیادہ خود مختاری حاصل ہوگی اور کم سے کم مشترکہ مفاد کے لیے ایک مرکز ہوگا...... میرے نزدیک وفاع اور مجوزہ تعمیر نو کے لحاظ سے پاکستان نا قابل عمل ہے۔ یہ میرے سمجھ میں نہیں آتا لیکن لوگوں کو اطمینان دلانے کے لیے انھیں اپنی مرضی کے خلاف کچھ کرنے پر مجبور نہیں کیا جا رہا ہے۔ ہم انھیں الگ ہونے کی اجازت دینے کے لیے تیار نہیں۔ میری سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آتی ہے کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو جو اقتصادی اور صنعتی اعتبار سے بہت پست ہے دوسروں کے اقتصادی اقتدار کا خوف ہو سکتا ہے، ہم ان کے خوف کو دور کرنے کی غرض سے ہر امکانی امداد کے لیے تیار ہیں اور صنعتی اور دوسرے اعتبار سے غیر ترقی یافتہ علاقوں کی ترقی کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہیں۔ (مدینہ: ۱۳ر اپریل ۱۹۴۶ء، جلد ۳۵، صفحہ ۲۷)

مسلمانوں کی تشویش — مولانا آزادؒ کی رائے:

''۱۲ر اپریل ۱۹۴۶ء: کو میں دہلی پہنچا۔ میرا خیال تھا کہ اس وقت سب سے اہم مسئلہ جس پر غور کرنا چاہیے، ہندوستان اور برطانیہ کا سیاسی اختلاف نہیں ہے، بلکہ ہندوستان کا فرقہ وارانہ مسئلہ ہے۔ شملہ کانفرنس نے مجھے یقین دلا دیا تھا کہ سیاسی مسئلہ مفاہمت کی

ایک منزل تک پہنچ چکا ہے، مگر فرقہ وارانہ اختلافات اب بھی جوں کے توں باقی ہیں۔ اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ مسلمان ایک جماعت کی حیثیت سے اپنے مستقبل کے بارے میں بہت ہی فکر مند تھے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض صوبوں میں ان کی اکثریت مسلم تھی، اس لیے انھیں ان صوبوں کے معاملات میں کسی قسم کا اندیشہ نہیں تھا، مگر مجموعی حیثیت سے وہ ہندوستان میں اقلیت میں تھے۔ اس لیے وہ اس خوف سے پریشان رہتے تھے کہ آزاد ہندوستان میں ان کی حیثیت اور ان کا مرتبہ شاید محفوظ نہیں رہے گا۔"

(انڈیا ونس فریڈم: ص ۲۲۳)

ورکنگ کمیٹی میں مولانا آزاد کا بیان:

"ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ۱۲/اپریل کو منعقد ہوا، جس میں میں نے کیبنٹ مشن سے اپنی گفتگو کی رپورٹ پیش کی۔ میں نے فرقہ وارانہ مسئلے کا جو حل پیش کیا تھا اس کو میں نے کافی تفصیل سے بیان کیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب گاندھی جی اور دوسرے ساتھیوں کو میری اس اسکیم پر گفتگو کا موقع ملا۔ ورکنگ کمیٹی کو شروع میں اس حل کے بارے میں بہت سے شکوک تھے۔ چناں چہ ممبروں نے طرح طرح کی دقتیں اور شبہات بیان کیے۔ میں نے ان کے اعتراضات کے جواب دیے اور جو پہلو صاف نہیں تھے ان کی وضاحت کی۔ بالآخر ورکنگ کمیٹی کو میری تجویز کے صحیح ہونے کا یقین ہو گیا اور گاندھی جی نے ظاہر کر دیا کہ وہ اس حل سے پورے طور پر متفق ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ گاندھی جی نے یہ کہہ کر مجھے مبارک باد دی کہ میں نے ایک ایسے مسئلے کا حل ڈھونڈ نکالا ہے جس نے ہر ایک کو زچ کر دیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ میرا حل سب سے کٹر مسلم لیگیوں کے خوف کو بھی دور کر دے گا۔ اسی کے ساتھ اس کی پشت پر فرقہ وارانہ رجحانات کے بجائے سچی قومیت کی روح ہے۔ گاندھی جی مصر تھے کہ ہندوستان جیسے ملک میں صرف وفاقی دستور ہی قابل عمل ہو سکتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے بھی انھوں نے میرے حل کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ اگرچہ اس میں کوئی انوکھا اصول پیش نہیں کیا گیا ہے، مگر اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کے ماحول میں وفاقیت کے اصول کے معنی کیا ہیں؟

سردار پٹیل نے مجھ سے سوال کیا کہ کیا مرکزی حکومت کا دائرۂ عمل صرف تین معاملوں تک محدود ہوگا؟ انھوں نے کہا کہ کچھ ایسے امور ہیں جیسے کہ کرنسی اور فنانس، جن کا

اپنی نوعیت کے لحاظ سے مرکز میں ہونا ضروری ہے۔ انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ تجارت اور صنعت کو صرف کل ہند بنیاد پر ترقی دی جا سکے گی اور یہی صورت حال تجارتی پالیسی کی بھی ہے۔

مجھے ان اعتراضات کے جواب دینے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ گاندھی جی نے خود ہی میرے نقطۂ نظر کو اپنا لیا اور سردار کو جواب دینے لگے۔ انھوں نے کہا کہ یہ فرض کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ صوبائی حکومتیں کرنسی اور محصول جیسے مسایل پر مرکز سے اختلاف کریں گی۔ اس میں ان کا اپنا فایدہ ہوگا کہ ان معاملات میں کوئی متفقہ پالیسی اختیار کی جائے۔ اس لیے اس پر اصرار کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ کرنسی یا مالیات کو مرکزی امور کی لازمی فہرست میں شامل کیا جائے۔'' (انڈیا ونس فریڈم: ص ۲۵-۲۲۴)

لیگی ارکان سے مشن کی گفتگو:

۱۴ راپریل ۱۹۴۶ء: چودھری خلیق الزماں نے وایسرایگل لاج میں کیبنٹ مشن کی جانب سے اپنے ایک ڈِنر کا ذکر اپنی خودنوشت شاہراہ پاکستان (صفحہ ۹۴-۹۹۳) میں کیا ہے۔ اس میں بعض باتیں غور طلب ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''۱۴ راپریل کی شب میں کیبنٹ مشن کے ساتھ وایسرایگل لاج میں میرا ڈِنر ہوا۔ جب میں وہاں پہنچا تو نواب زادہ لیاقت علی خان بھی ڈِنر کے لیے آ چکے تھے۔ کھانے کے بعد ہم لوگ ایک دوسرے چھوٹے کمرے میں اٹھ گئے۔ سر اسٹیفورڈ کریس نے ایک طرح کا ناٹک کیا یعنی خود لیمن سوڈا اور دوسرے قسم کے مشروبات لاکر رکھے اور اپنے ہاتھ سے تمام کھڑکیاں اور دروازے بند کردیے۔ جس صوفے پر میں بیٹھا تھا اُس کے داہنی جانب مسٹر الیگزنڈر بیٹھے اور بائیں جانب ایک کرسی پر لارڈ پیتھک لارنس بیٹھے تھے۔ نواب زادہ لیاقت علی خان لارڈ پیتھک لارنس کے بائیں جانب بیٹھے۔ سر اسٹیفورڈ ایک چھوٹی کرسی پر میرے پاس آکر بیٹھ گئے اور مجھ سے بنا کسی تمہید کے کہنے لگے کہ ''آپ کسی قسم کا ایک کم زور برائے نام مرکز کیوں نہیں قبول کر لیتے'' میں نے کہا وضاحت کیجیے، کس قسم کا کم زور مرکز؟ انھوں نے جواب

دیا ایسا مرکز جس کے ساتھ کوئی قانون ساز اسمبلی نہ ہو۔ محض ایک قسم کا بورڈ یا بارہ آدمیوں کی ایک ایجنسی جس میں چار مسلمان چار ہندو اور چار اسٹیٹس کے نمایندے ہوں۔ میں نے کہا اسٹیٹس کے نمایندے تو توازن بگاڑ دیں گے۔ انھوں نے کہا کہ نہیں دو مسلم اسٹیٹس کے نمایندے حیدر آباد اور بھوپال اور دو ہندو اسٹیٹس کے نمایندے کشمیر اور میسور۔ میں نے کہا کہ اگر اس قسم کا مرکز صرف دفاع، امورِ خارجہ اور مواصلات کے متعلق ہو تو مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ مسلم لیگ اس پر غور کرنے کے لیے کیوں نہ تیار ہوگی، مگر مجھے شک ہے کہ کانگریس اس کو قبول نہ کرے گی۔ اس کے بعد مجھ سے مشن کی بڑی دیر تک برٹش سیاست اس کی خامیوں اور اس کی خوبیوں کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ جس کے بعد تقریباً ساڑھے دس پونے گیارہ پر ان سے رخصت ہوا اور راستے بھر تعجب کرتے ہوئے اپنے گھر گیا کہ تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹہ گفتگو میں نواب زادہ لیاقت علی خان نے ایک مرتبہ بھی کسی مسئلے پر اپنی زبان نہ کھولی اور خاموش بیٹھے میری باتیں سنتے رہے۔ میں نے ان سے کبھی اس کی وجہ نہ پوچھی اور نہ کبھی انھوں نے مجھے بتائی۔''

کانگریس کا عظیم الشان جلسہ اور حضرت شیخ الاسلامؒ کی تقریر:

۱۴؍اپریل ۱۹۴۶ء: سہارن پور-۱۴؍اپریل ۹ بجے شب جوبلی باغ میں کانگریس کا ایک عظیم الشان اجلاس منعقد ہوا۔ شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے تقریر کی۔ آپ نے فرمایا:

''آج کل ہندوستان میں فساد کا شور بپا ہے۔ لوگوں میں غلط افواہیں پھیلی ہوئی ہیں۔ ہر طرف کشت و خون جاری ہے۔ ۳۰ سال تک لوگوں نے مصیبتیں اٹھائیں، جن کا نتیجہ ہے کہ حکومتِ برطانیہ جون ۱۹۴۸ء کا اعلان کرنے پر مجبور ہوئی۔ ان فسادات میں موجودہ تعلیم یافتہ طبقے کا بھاری ہاتھ ہے۔ تعلیم یافتہ طبقہ مجبور ہے، کیوں کہ اس نے خود ایسا نہیں کیا۔ بلکہ مختلف طریقوں سے اسکولوں میں، کالجوں میں ان کے دماغوں میں زہر داخل کیا گیا

ہے۔ ہندو مسلم فرقہ پرستی کے جراثیم ان کے دماغوں میں داخل کیے گئے۔ جس کا لازمی نتیجہ فساد کی صورت میں رونما ہوتا تھا۔ خلافت کے زمانے میں فرقہ وارانہ جھگڑے شروع ہوئے۔ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۸ء تک ملک میں شدید فسادات ہوئے۔ جو انگریز کی سازش کا نتیجہ تھے۔ اور آج بھی انگریز ہندوستان سے جا رہا ہے، مجھے تعجب ہوتا اگر ہندوستان میں فسادات نہ ہوتے۔ جب بھی طاقت ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہوئی ہے تب ہی یہ فرقہ وارانہ جھگڑے کرا دیے جاتے ہیں اور ملک کی قوت کو کم زور بنایا جاتا ہے۔ انگریز چاہتا ہے کہ ہندوستانی چیخ چیخ کر کہیں کہ انگریزو! مت جاؤ۔ تمہارے رہنے ہی سے ہندوستان کی بقا ہے۔ اور آج جو یہ فسادات ہو رہے ہیں۔ یہ باقاعدہ طور پر شروع کرائے گئے ہیں۔''

آپ نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا:

''ہندوستان کی جس قوم کے دل میں جتنا زیادہ تشدد کا جذبہ پیدا ہوگا وہ قوم اتنی ہی جلدی فنا ہو جائے گی اور سیاسی طور پر کم زور ہو جائے گی۔ جس کے دل میں طاقت کا جذبہ ہو وہ اپنا جذبہ نکال لے۔ دنیا میں کسی کا غرور باقی نہیں رہا۔ قدرت ظالموں سے انتقام لے گی اور تم امان مانگو گے، مگر تمھیں امان نصیب نہ ہوگی۔ یہ جنگ ہندو مسلمان کی نہیں۔ یہ ظالموں اور شیطانوں کی جنگ ہے۔ اس لڑائی میں شہید صرف وہ ہیں جو بے گناہ مارے جائیں۔ میں ان ہندو اور مسلمانوں کو بہادر سمجھتا ہوں جو قاتلوں، فسادیوں کو گرفتار کرائیں۔ عورتیں اور بچوں کو قتل کرنا کہاں کی بہادری ہے؟''

آپ نے فرمایا:

''گاندھی کی تقریروں کے وعظ تم پر کوئی اثر نہیں کرتے، سب بے کار ہو گئے؟ کیوں کہ تم ضدی ہو۔ قدرت تمہارے ہاتھوں سے تمہارے گھر تمہارے شہر برباد کر رہی ہے۔ اور تم بہادروں کے راگ الاپتے ہو۔ سہارن پور آج تک امن میں ہے۔ اگر سہارن پور کے سپرنٹنڈنٹ صاحب چاہتے ہیں کہ شہر میں امن رہے۔ تو میں انھیں مشورہ دیتا ہوں کہ اگر کبھی خوانخواستہ شہر کی

فضا خراب ہو جائے تو تمام میونسپل کمشنز اور اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر، محلوں کے ذمے دار صاحبان کو بالا کر امن کا ذمہ لے لیں اور اگر وہ ذمہ نہ لیں تو پھر ان کو جیل بھیج دیں۔ کیوں کہ یہی لوگ عوام سے ووٹ لینے کے لیے فساد کراتے ہیں۔ اگر یہ نہ چاہیں تو فساد ہرگز نہیں ہوتا۔" (زمزم۔ لاہور: اپریل ۱۹۴۶ء)

ملک کا سیاسی مسئلہ اور اس کا حل! مولانا آزادؒ کا بیان:

۱۵/اپریل ۱۹۴۶ء: ۶/اپریل کو مولانا آزادؒ نے کانگریس کے صدر کی حیثیت سے کیبنٹ مشن سے ملاقات میں جو فارمولا پیش کیا تھا اور مشن نے اسے پسند بھی کیا تھا، اس سے پہلے مولانا نے اس منصوبے کے بارے میں اپنے کسی کانگریسی ساتھی کو اعتماد میں نہیں لیا تھا اور کسی کو کچھ معلوم نہ تھا کہ مولانا کے ذہن میں کیا ہے۔ ۱۲/اپریل کو ورکنگ کمیٹی کے ارکان کو پہلی بار معلوم ہوا کہ مولانا نے مشن سے کن پوائنٹس پر گفتگو کی ہے اور ان کا منصوبہ کیا ہے؟ کمیٹی کے ارکان کو مولانا نے اپنے منصوبے سے پوری طرح مطمئن کر دیا تھا۔ لیکن ملک کے عوام و خواص میں ابھی تک کسی کو معلوم نہ تھا کہ مولانا کا یا کانگریس کا فارمولا کیا ہے؟ اور وہ ملک کے بہت الجھے ہوئے اور نہایت پیچیدہ فرقہ وارانہ مسئلے کو کس طرح سلجھانا چاہتی ہے؟ مولانا فرماتے ہیں:

"اب جب کہ میں نے اپنی اسکیم پر اپنے ساتھیوں اور کیبنٹ مشن کے ممبروں سے گفتگو کر لی تھی، تو میں نے سوچا کہ اس کو ملک کے سامنے پیش کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ چناں چہ ۱۵/اپریل ۱۹۴۶ء کو میں نے مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے مطالبے کے بارے میں ایک بیان جاری کیا۔"

انڈیا ونس فریڈم میں مولانا آزادؒ نے یہ بیان درج کر دیا ہے۔ مولانا نے بیان میں فرمایا تھا:

"مسلم لیگ نے پاکستان کی جو اسکیم تجویز کی ہے، اس پر میں نے ہر پہلو سے غور کیا ہے۔ ایک ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے میں نے سوچا ہے کہ پورے ہندوستان کے مستقبل پر اس سے کیا اثر ہوگا، ایک مسلمان کی حیثیت سے میں نے دیکھا ہے کہ مسلمانوں کے مستقبل پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔

اسکیم کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ نہ صرف بہ حیثیت مجموعی پورے ہندوستان کے لیے بلکہ خاص طور پر مسلمانوں کے لیے بھی نقصان دہ ہوگی، اور دراصل جتنے مسئلے اس کے ذریعے حل ہوں گے، ان سے زیادہ نئے مسایل اٹھ کھڑے ہوں گے۔

مجھے اس کا اعتراف ہے کہ پاکستان کا نام ہی میرے حلق سے نہیں اترتا، اس سے یہ خیال پیدا کیا جاتا ہے کہ دنیا کے کچھ حصہ پاک اور کچھ ناپاک ہیں۔ پاک اور ناپاک علاقوں کی یہ تقسیم سراسر غیر اسلامی ہے، بلکہ اسلام سے انحراف ہے۔ اسلام کسی ایسی تقسیم کو تسلیم نہیں کرتا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"خدا نے ساری زمین کو میرے لیے مسجد بنایا ہے۔"

اس کے علاوہ معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کی اسکیم شکست خوردہ ذہنیت کی علامت ہے اور اس کا خیال اسی طرح پیدا ہوا ہے جیسے یہودیوں میں قومی وطن کا خیال! یہ اس بات کا اعتراف ہے کہ ہندوستانی مسلمان ہندوستان میں اپنی حیثیت قایم نہیں رکھ سکتے اور اس پر راضی ہیں کہ ایک کونے میں، جو ان کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہو، سمٹ کر بیٹھ جائیں۔

یہودیوں کی اس آرزو سے ہم دردی کی جا سکتی ہے کہ ان کا ایک قومی وطن ہو، کیوں کہ وہ پوری دنیا میں منتشر ہیں اور کسی ایک علاقے میں بھی وہ حکومت کے انتظامات پر اثر نہیں ڈال سکتے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی حالت اس سے بالکل مختلف ہے۔ ان کی تعداد نو کروڑ سے اوپر ہے اور کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے وہ ہندوستانی زندگی کا اتنا اہم عنصر ہیں کہ حکومت کے انتظامات اور پالیسی پر فیصلہ کن حد تک اثر ڈال سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ قدرت نے ان کو چند مخصوص علاقوں میں بڑی تعداد میں یک جا بھی کر دیا ہے اور اس طرح انھیں تقویت پہنچائی ہے۔

ان حالات میں پاکستان کے مطالبے میں کوئی جان نہیں رہتی، کم از کم میں ایک مسلمان کی حیثیت سے ایک لمحے کے لیے بھی اپنے اس حق کو

چھوڑنے پر تیار نہیں ہوں کہ پورے ہندوستان کو میدان عمل سمجھوں اور اس کی سیاسی اور معاشی زندگی کی تشکیل میں شرکت کروں۔ میرے نزدیک بزدلی کی بات ہے کہ میں اپنی آبائی جائداد سے دست بردار ہو جاؤں اور اس کے ایک ٹکڑے پر قناعت کر لوں۔

جب کہ سب کو معلوم ہے کہ مسٹر جناح کی پاکستان کی اسکیم دو قومی نظریے پر مبنی ہے۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ہندوستان میں بہت سی قومیں آباد ہیں، جن کے درمیان مذہب بنائے امتیاز ہے۔ ان میں جو دو بڑی قومیں ہیں یعنی ہندو اور مسلمان ان کی اس اعتبار سے کہ وہ دو الگ قومیں ہیں، دو الگ ریاستیں ہونی چاہئیں۔ ڈاکٹر ایڈورڈ ٹامس نے ایک مرتبہ مسٹر جناح سے کہا کہ ہندو اور مسلمان ہندوستان کے ہزاروں شہروں، قصبوں اور گانوؤں میں مل جل کر رہتے ہیں۔ تو مسٹر جناح نے جواب دیا کہ اس کا ان کی جداگانہ قومیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مسٹر جناح کے نظریے کے مطابق چوں کہ یہ دونوں قومیں ہر بستی، ہر گاؤں اور ہر شہر میں ایک دوسری سے ٹکراتی رہتی ہیں۔ اس وجہ سے وہ چاہتے ہیں کہ ان کو دو ریاستوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

میں اس کے لیے تیار ہوں کہ اس مسئلے کے باقی تمام پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا جائے اور اس پر صرف مسلمانوں کے مفاد کے نقطۂ نظر سے غور کیا جائے۔ میں اس سے بھی آگے جانے اور یہ کہنے کے لیے تیار ہوں کہ اگر یہ ثابت کر دیا جائے کہ پاکستان کی اسکیم سے مسلمانوں کو کسی طرح سے بھی فایدہ پہنچ سکتا ہے تو میں اس کو منظور کر لوں گا اور دوسروں کو اسے منظور کرنے پر آمادہ کرنے کے لیے کوشش کروں گا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر میں اس اسکیم کا خود مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کے نقطۂ نظر سے جایزہ لوں، تو بھی اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ اس سے ان کو ذرا بھی فایدہ نہیں ہو سکتا اور ان کے جایز اندیشے دور نہیں ہو سکتے۔

آیئے ذرا ٹھنڈے دل سے ان نتایج پر غور کریں، جو پاکستان بن جانے سے برآمد ہوں گے۔ ہندوستان دو ریاستوں میں تقسیم ہو جائے گا جن میں

سے ایک میں مسلمانوں کی اکثریت ہوگی اور دوسری میں ہندوؤں کی۔ ہندوستان میں ساڑھے تین کروڑ مسلمان باقی رہ جائیں گے جو پورے ملک میں چھوٹی چھوٹی اقلیتوں کی شکل میں بکھرے ہوئے ہوں گے۔ وہ یوپی میں ۱۷ فیصد، بہار میں ۱۲ فیصد اور مدراس میں ۹ فیصد ہوں گے۔ یعنی آج کل کے مقابلے میں وہ ہندو اکثریت کے صوبوں میں اور زیادہ کمزور ہوں گے۔ انھوں نے تقریباً ایک ہزار سال سے ان علاقوں کو اپنا وطن سمجھا ہے اور ان میں اسلامی تہذیب اور تمدن کے مشہور مراکز تعمیر کیے ہیں۔

ان لوگوں کی ایک روز صبح کو آنکھ کھلے گی تو وہ دیکھیں گے کہ راتوں رات اجنبی اور پردیسی بن گئے ہیں۔ وہ صنعتی، تعلیمی اور معاشی لحاظ سے پس ماندہ ہوں گے اور ایسی حکومت کے رحم وکرم پر ہوں گے جو خالص ہندو بن گئی ہوگی۔

دوسری طرف خود ریاست پاکستان میں وہ غیر محفوظ اور کمزور ہوں گے۔ پاکستان کے اندر کہیں بھی ان کی اتنی بڑی اکثریت نہیں ہوگی جتنی ہندوستان کی ریاست میں ہندوؤں کی۔

در اصل مسلمانوں کی اکثریت اتنی کم ہوگی کہ ان علاقوں کے غیر مسلمانوں نے جو تعلیمی اور سیاسی سبقت حاصل کرلی ہے وہ اس کو بے اثر کردے گی۔ اگر ایسا نہ ہوتا اور پاکستان میں مسلمانوں کی بھاری اکثریت ہوتی تب بھی اس کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمانوں کا مسئلہ تو حل نہ ہوتا وہ تو باقی ہی رہتا۔

اس بات سے کہ دو ملک ایک دوسرے کے مدمقابل ہوں، ان دونوں کی اقلیتوں کا مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔ اس سے صرف یہ ہوسکتا ہے کہ اقلیتوں کو یرغمال سمجھنے کا طریقہ جاری ہوجائے اور سزا دینے اور بدلہ لینے کی کارروائیاں ہونے لگیں۔ اس وجہ سے پاکستان کی اسکیم مسلمانوں کی کسی دشواری کا علاج نہیں ہے، وہ ان صوبوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں ان کے حقوق کا تحفظ نہیں کرتی اور پاکستان کے شہری ہوتے ہوئے انھیں ہندوستانی یا بین الاقوامی امور میں وہ حیثیت حاصل نہیں ہوسکتی جو کہ انڈین یونین جیسی کسی بڑی

ریاست کے شہری بن کر وہ حاصل کر سکتے ہیں۔

بحث کی خاطر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر پاکستان خود مسلمانوں کے مفاد کے لیے اس قدر مضر ہے تو مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد اس کے فریب حسن میں کیوں گرفتار ہوگئی؟ اس کا جواب ہمیں انتہا پسند فرقہ پرست ہندوؤں کے رویے میں ملتا ہے جب مسلم لیگ نے پاکستان کی گفتگو چھیڑی تو انھیں اس میں اتحاد اسلامی کی ایک ناپاک سازش نظر آنے لگی اور انھوں نے اس خوف میں اس کی مخالفت شروع کی کہ یہ ہندوستانی مسلمانوں اور مسلمانوں کی ریاستوں کے درمیان جتھابندی کا پیش خیمہ ہے۔

اس مخالفت نے لیگ کے حامیوں کو اور اُکسایا، انھوں نے ایک سیدھے سادے مگر غیر معمولی منطقی استدلال سے کام لے کر کہا کہ چوں کہ ہندو اتنی شدت سے پاکستان کی مخالفت کرتے ہیں اس لیے یقیناً اس میں مسلمانوں کا فایدہ ہوگا۔ اس طرح جذباتی ہیجان کی ایسی فضا پیدا ہوگئی جس میں سوچ سمجھ کر اچھے برے کے درمیان تمیز کرنا ناممکن ہوگیا اور خاص طور پر مسلمانوں کا نوجوان اور اثر پذیر طبقہ جذبات کی رو میں بہہ گیا۔ مگر مجھے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ جب موجودہ ہیجانی کیفیت دور ہو جائے گی اور اصل مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جا سکے گا تو جو لوگ اس وقت پاکستان کی حمایت کر رہے ہیں، وہ خود ہی اس کو مسلم مفاد کے لیے مضر ٹھیرا کر اس سے منہ پھیر لیں گے۔

میں نے کانگریس کو جو فارمولا قبول کرنے پر راضی کر لیا ہے اس میں وہ تمام خوبیاں جو پاکستان کی اسکیم میں ہیں، حاصل ہو جائیں گی اور اس اسکیم میں جو خامیاں اور خرابیاں ہیں ان کے مضر اثرات سے بچا جا سکے گا۔ پاکستان کی بنیاد مسلمانوں کی اکثریت کے علاقوں میں مرکز کی مداخلت کا خوف ہے، کیوں کہ مرکز میں ہندوؤں کی اکثریت ہوگی۔ کانگریس اس خوف کو اس طرح دور کرتی ہے کہ صوبوں کو پوری خود مختاری دی جائے گی اور جو اختیارات مرکز کو نہ دیے جائیں گے وہ بھی صوبوں کو حاصل ہوں گے۔ اس نے مرکزی معاملات کی دو فہرستیں رکھی ہیں، ایک لازمی اور دوسری اختیاری۔ اس طرح اگر کوئی

صوبہ چاہے تو سوائے ان اختیارات کے جو مرکز کے سپرد کیے جائیں گے اور کم سے کم ہوں گے وہ باقی تمام معاملات اپنے انتظام میں رکھ سکتا ہے۔ اس بنا پر کانگریس کی اسکیم کے ذریعے اس کا یقین ہو جاتا ہے کہ مسلم اکثریت کے صوبوں کو اندرونی معاملات میں آزادی ہوگی کہ جس طرح چاہیں اپنی ترقی کی تدبیریں کریں اور اسی کے ساتھ ان معاملوں میں جن کا تعلق پورے ہندوستان سے ہے، وہ مرکز پر اپنا اثر ڈال سکیں گے۔

ہندوستان کی صورت حال کچھ ایسی ہے کہ مرکزیت پر مبنی وحدانی حکومت قایم کرنے کی ہر کوشش لازمی طور پر ناکام ہوگی۔ اسی طرح ہندوستان کو دو ریاستوں میں تقسیم کرنے کی کوشش بھی ناکام ہو کر رہے گی۔ اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد بالآخر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مسایل کا حل صرف اس طریقے پر ممکن ہے جو کانگریس کے فارمولے میں مضمر ہے اور جس میں صوبوں اور پورے ہندوستان کے لیے ترقی کی گنجایش ہے۔ کانگریس کا فارمولا مسلم اکثریت کے علاقوں کے اس خوف کو دور کرنے کے لیے بالکل کافی اور مناسب ہے جس کی وجہ سے پاکستان کی اسکیم بنائی گئی ہے۔ دوسری طرف اس میں پاکستان کی اسکیم کی خرابیاں نہیں ہیں اور اس کی بدولت وہ مسلمان جو اقلیت کے صوبوں میں ہیں، خالص ہندو حکومت کے ماتحت نہ ہو جائیں گے۔

میں ان لوگوں میں سے ہوں جو فرقہ وارانہ تلخی اور اختلافات کی موجودہ کیفیت کو ہندوستانی زندگی کا ایک عارضی دور سمجھتے ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ یہ اختلافات اس وقت دور ہو جائیں گے جب ہندوستان پر اپنے مستقبل کی تعمیر کی ذمے داری آ جائے گی۔ مجھے اس وقت گلیڈ اسٹون کا ایک قول یاد آ رہا ہے کہ جو شخص پانی سے ڈرتا ہے اس کا سب سے اچھا علاج یہ ہے کہ اسے پانی میں ڈال دیا جائے۔ ٹھیک اسی طرح خدشوں اور شبہوں کو رفع کرنے کے لیے ہندوستان کو اپنے معاملات کا انتظام و انصرام اپنے ہاتھ میں لینا ہوگا۔

جب ہندوستان اپنی قسمت کا مالک ہو جائے گا تو وہ فرقہ وارانہ بدگمانی اور کش مکش کی موجودہ کیفیت کو بالکل بھول جائے گا اور دور جدید کی زندگی کے

مسائل کو جدید نقطۂ نظر سے حل کرے گا۔ بلاشبہ اختلافات باقی رہیں گے، مگر وہ معاشی ہوں گے، فرقہ وارانہ نہ ہوں گے۔ سیاسی پارٹیوں کی باہمی مخالفتیں جاری رہیں گی، مگر ان کی بنیاد مذہب پر نہیں بلکہ طبقہ وارانہ ہوگی، فرقہ وارانہ نہیں ہوگی اور اسی لحاظ سے پالیسی کی تشکیل بھی ہوگی۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ محض ایک عقیدہ ہے جو ممکن ہے بعد کے واقعات سے صحیح ثابت نہ ہو، تو میں اس کے جواب میں کہوں گا کہ بہرحال ۹ کروڑ مسلمان ایک ایسا عنصر ہیں جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور حالات چاہے جیسے بھی ہوں ان میں اتنی طاقت ہوگی کہ اپنے مستقبل کو خطرات سے محفوظ رکھ سکیں۔

لاہور ریزولیوشن کے بعد لیگ تقسیم کی راہ پر کچھ قدم اور آگے بڑھا چکی تھی، مگر اس نے یہ بات پوری طرح واضح نہیں کی تھی کہ دراصل اس کا مطالبہ کیا ہے؟ ریزولیوشن کے الفاظ مبہم تھے اور اس کی کئی تاویلیں کی جاسکتی تھی، مگر اس کا مفہوم صاف تھا۔ مسلم لیگ کا مطالبہ تھا کہ مسلم اکثریت کے صوبوں کو مکمل خودمختاری دی جائے۔ سکندر حیات خان نے اس ریزولیوشن کی تائید کرتے ہوئے اس کی یہی تاویل کی تھی۔ مگر اب لیگ کے لیڈروں نے اپنے مطالبے کے معنی میں بہت زیادہ وسعت پیدا کردی تھی۔ وہ ملک کی تقسیم اور مسلم اکثریت کے علاقوں میں ایک آزاد ریاست کے قیام کی مبہم باتیں کرنے لگے تھے۔ کیبنٹ مشن اس مطالبے کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کے برعکس مشن ایک ایسے حل کے حق میں تھا۔ جو کم و بیش میری تجویز کے مطابق تھا۔"

(انڈیا ونس فریڈم (اردو):۲۹-۲۲۵)

مولانا آزاد" انڈیا ونس فریڈم جب ۱۹۵۷ء میں مرتب کروار ہے تھے تو مولانا نے اپنے اس فارمولے کے بارے میں فرمایا تھا:

"مسلم لیگ نے پہلی مرتبہ اپنے لاہور کے ریزولیوشن میں، جو بعد میں پاکستان ریزولیوشن کے نام سے مشہور ہوا، ہندوستان کی تقسیم کا ذکر کیا تھا۔ میں نے جو حل پیش کیا تھا اس میں مسلم لیگ کے اندیشوں کو دور کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اب جب کہ میں نے اپنی اسکیم پر اپنے ساتھیوں اور کیبنٹ مشن کے

ممبروں سے گفتگو کرلی تھی، تو میں نے سوچا کہ اس کو ملک کے سامنے پیش کرنے کا وقت آ گیا۔ چناں چہ ۱۵/اپریل ۱۹۴۶ء کو میں نے مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے مطالبے کے بارے میں ایک بیان جاری کیا۔

ہندوستان کی تقسیم ایک حقیقت ہے اور اس کو دس سال ہو چکے ہیں۔ اب جو میں اپنے بیان پر دوبارہ نگاہ ڈالتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت میں نے جو کچھ کہا تھا وہی ہوا۔ چوں کہ اس بیان میں ہندوستانی مسئلے کے حل کے متعلق میں نے اپنی قطعی رائے ظاہر کی تھی، اس لیے میں سمجھتا ہوں کے یہاں پر مجھے اس بیان کو درج کر دینا چاہیے۔ یہ میں نے اس وقت کہا تھا اور اب بھی میں کہوں گا کہ مسئلے کا یہی حل درست تھا۔'' (انڈیا ونس فریڈم (اردو): ص ۲۲۵)

مولانا آزادؒ کے اس بیان پر ۳۸ برس کا عرصہ بیت چکا ہے۔ اس عرصے میں ہر صبح کو طلوع ہونے والے سورج نے اس کی سمت پر اپنی مہر تصدیق ثبت کی ہے۔ مولانا نے جو کچھ حالات اور مستقبل کے بارے میں فرمایا تھا اس کا ایک ایک حرف صحیح ثابت ہو چکا ہے۔

وزارتی مشن سے حضرت مولانا مدنیؒ کی ملاقات:

۱۶/اپریل ۱۹۴۶ء: برطانوی پارلیمانی وفد کی جانب سے جمعیت علمائے ہند اور کل ہند مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے صدر مولانا سید حسین احمد مدنی کو ۱۶/اپریل کو وفد سے ملاقات اور ملک کے سیاسی مسئلے کے بارے میں تبادلۂ خیالات کے لیے دعوت دی ہے اور مسلم پارلیمنٹری بورڈ میں شامل جماعتوں کے تین نمایندوں کو بھی اپنے ساتھ لانے کی اجازت دی ہے۔

چناں چہ ۱۶/اپریل کو حضرت صدر صاحب جمعیت علمائے ہند و کل ہند مسلم پارلیمنٹری بورڈ بہ معیت عبدالمجید صاحب خواجہ — صدر کل ہند مسلم مجلس، شیخ حسام الدین صاحب صدر کل ہند مجلس احرار اسلام، شیخ ظہیر الدین صاحب صدر کل ہند مومن کانفرنس نے وزارتی مشن سے ملاقات کی۔ جناب حافظ محمد ابراہیم وزیر صوبۂ یوپی بہ حیثیت ترجمان جناب صدر مدظلہ العالی کے ہم راہ تشریف لے گئے۔

اس ملاقات سے پیشتر ضرورت محسوس ہوئی کہ جمعیت علمائے ہند کے فارمولے کے

بنیادی اصولوں کے پیش نظر سنٹرل مسلم پارلیمنٹری بورڈ اور دوسری مسلم آزاد خیال جماعتوں نے جو مسودے تیار کیے ہیں ان پر ایک مرتبہ پھر غور کر لیا جائے۔ چناں چہ ۱۲/ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۵ھ مطابق ۱۵/ اپریل ۱۹۴۶ء کو مجلس عاملہ کا دوبارہ اجلاس طلب کیا گیا اور مجلس احرار و مومن کانفرنس وغیرہ دوسری آزاد خیال مسلم جماعتوں کے ذمے دار حضرات کو بھی اس اجلاس میں مدعو کیا گیا۔ یہ اجلاس دفتر مرکزیہ جمعیت علمائے ہند میں صدر جمعیت و مسلم پارلیمنٹری بورڈ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی صدارت میں ہوا۔

جمعیت علمائے ہند کے فارمولے کے بنیادی اصول کو تسلیم کرتے ہوئے جو متعدد فارمولے مختلف آزاد خیال جماعتوں کی طرف سے پیش کیے گئے تھے اس اجلاس میں ان پر غور کیا گیا اور اگر چہ تمام زیر بحث مسایل متفقہ طور پر طے ہو چکے تھے۔ مگر احتیاطاً مناسب نہ سمجھا گیا کہ تحریری طور پر تمام مسایل کو مشن کے سامنے پیش کر دیا جائے بلکہ تجویز کیا گیا کہ مشن کو اپنا فارمولا اور اس کے بنیادی نظریات سمجھا دیے جائیں۔ نیز طے کیا گیا کہ جمعیت علمائے ہند کے فارمولے میں دفعہ (د) کی تشریح کرتے ہوئے جو تین متبادل صورتیں پیش کی گئی ہیں ان میں سے سر دست صرف مساوات کی صورت معین طور پر پیش کی جائے۔ یعنی یہ کہ

مرکز میں ہندو ۴۵، مسلمان ۴۵، دیگر اقلیتیں دس۔

یہ بھی طے ہوا کہ عارضی حکومت میں بھی ہندو مسلم مساوات کا مطالبہ کیا جائے 0۔

نیز طے ہوا کہ مطالبہ کیا جائے کہ نمایندہ اسمبلی کا انتخاب ہر عاقل بالغ کی رائے سے ہو۔ البتہ جداگانہ یا مخلوط انتخاب کا معاملہ سر دست اپنی جانب سے پیش نہ کیا جائے۔

مفصل بحث و تمحیص کے بعد مشن سے گفتگو کے لیے مندرجہ ذیل نکات تجویز کیے گئے۔

(۱) آزادیٔ ملک۔

(۲) برطانیہ سے مطالبہ کہ وہ کسی درجے تک بھی تفصیل میں جائے بغیر محض نمایندہ اسمبلی بنا کر اور عارضی حکومت قایم کر کے کل معاملہ ہندوستان کے باشندوں پر چھوڑ دے، وہ خود طے کریں کہ ملک تقسیم ہو یا نہ ہو۔ اور اگر ملک متحد رہے تو کس صورت میں؟

(۳) لیکن اگر اس وقت تفصیلات کی طرف قدم بڑھا دیا جائے تو حسب ذیل امور کا

اختیار کیا جانا ضروری ہے:

(الف) آزادیٔ مذہب، کلچر، ثقافت، زبان، رسم الخط، مذہبی تعلیم، مذہبی تبلیغ، پرسنل لا، مذہبی عقاید و اعمال، عبادت گاہیں، اوقاف۔ یہ امور بہ طور فنڈامنٹل رائیٹس (بنیادی حقوق) ہوں۔ حکومت کی طرف سے کوئی مداخلت نہ ہو۔

(ب) صرف ایک وفاق۔

(ج) صوبوں کی مکمل آزادی مع تفویض اختیارات زایدہ غیر مصرحہ۔

(د) صوبوں کا حق خود ارادیت۔

(ہ) مساوات تعداد یعنی ہندو ۴۵ فیصد، مسلمان ۴۵ فیصد، دیگر اقلیتیں ۱۰ فیصد۔

نوٹ: اس سلسلے میں باہمی سوال و جواب کے بعد یہ واضح کیا گیا کہ ہمارا مطالبہ جمعیت علماے ہند کے فارمولے کی روشنی میں یہ لچک رکھتا ہے کہ عارضی حکومت اور مستقل لیجسلیچر میں مسلمانوں کی نمایندگی ایسے اصول پر مبنی ہونا از بس ضروری ہے جو مسلمانوں کو ہندو اکثریت کے رحم و کرم پر نہ چھوڑ دے اور ملک کی بڑی اکثریت ثانوی اکثریت کو تعداد کے بل بوتے پر نقصان نہ پہنچا سکے۔

(و) موجودہ مرکزی حکومت کا خاتمہ اور عارضی حکومت میں ہندو مسلم مساوات۔

(ز) نمایندہ اسمبلی بر بناے راے دہندگی ہر عاقل و بالغ۔

وزارتی مشن سے ملاقات کے نتیجے اور اس فارمولے کی اہمیت کے بارے میں مولانا سید محمد میاںؒ فرماتے ہیں:

"۱۶ اپریل ۱۹۴۶ء کو ۴ بجے شام سے سوا پانچ بجے تک وزارتی مشن کے ارکان سے ملاقات ہوئی۔ وزارتی مشن کے ارکان نے جمعیت علما کے فارمولے سے خاص دل چسپی لی۔ حتیٰ کہ ملاقات کے مقررہ وقت (یعنی نصف گھنٹہ) سے زاید ۴۵ منٹ تک ارکان مشن فارمولا کے مضمرات اور اس کے مختلف پہلوؤں کے متعلق سوالات کرتے رہے اور ان کے جوابات پر مسرت و اطمینان ظاہر کرتے رہے۔ اس فارمولے کے ساتھ وزارتی مشن کی دل چسپی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ تقریباً ایک ماہ بعد یعنی ۱۶ مئی ۱۹۴۶ء کو وزارتی مشن نے جو فارمولا پیش کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ بجنسہٖ جمعیت علماے ہند کا فارمولا تھا۔ صرف پیرٹی اور مساوات کی شرط تشنۂ تکمیل تھی اور کانگریس اور کیبنٹ مشن نے قولاً اس کو تسلیم نہیں کیا

تھا۔ لیکن اس فارمولا کے بہ موجب عارضی حکومت کی تشکیل کی جارہی تھی تو اگر مسلم لیگ کی ناعاقبت اندیشانہ ضد آڑے نہ آتی تو ۱۴ ممبران میں سے ۶ ممبر مسلمان ہوتے یعنی ۵ لیگ کے نامزد اور ایک مسلم ممبر کانگریس کی طرف سے اور اس طرح عارضی گورنمنٹ میں مسلمانوں کا تناسب تقریباً ۴۵ فیصدی ہوتا اور اس رواج کے قایم ہوجانے کے بعد یقین تھا کہ پیرٹی کا مسئلہ بھی مناسب صورت سے حل ہوجاتا۔ اور اگر بالفرض مسلمانوں کو مرکز میں تینتیس فیصدی نشستیں بھی دی جاتیں تو نقصان صرف اتنا ہی تھا کہ ممبری کے خواہش مند حضرات زیادہ تعداد میں اسمبلی میں نہ پہنچ سکتے۔ اس کے بر مقابل فایدہ یہ تھا کہ

(۱) ہر فرقہ وارانہ مسئلے میں ان کو حق استرداد دے دیا گیا تھا یعنی آئینی طور پر یہ تسلیم کرلیا گیا تھا کہ جس مسئلے کو مسلم ممبران اسمبلی کی اکثریت فرقہ وارانہ قرار دے دے وہ اسمبلی یا پارلیمنٹ میں پیش نہ ہوسکے گا اور اگر پیش ہوچکا ہو تو وہ پاس نہ کیا جائے گا۔

(۲) اگر یہ اختلاف ہوتا کہ یہ مسئلہ فرقہ وارانہ ہے یا نہیں ہے تو ایک فیڈرل کورٹ مقرر کیا گیا تھا جو اس بحث کا فیصلہ کرتا۔

(۳) اس طرح تمام فرقہ وارانہ امور کی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوتی اور اس طرح اکثریت اقلیت کے تابع ہوکر زندگی بسر کرتی۔

مذکورۂ بالا تفصیلات کے علاوہ اس فارمولے کا مفاد یہ تھا کہ

(الف) صوبہ سرحد، صوبہ سندھ، صوبہ بلوچستان اور جب ریاست کشمیر کو یونین کے ایک صوبے کی حیثیت دے دی جاتی تو پورا صوبہ کشمیر مذہبی، معاشی اور کلچرل امور میں قطعاً خودمختار ہوتے۔

(ب) پورا صوبہ پنجاب اور پورا صوبہ بنگال جس کا دارالحکومت (دنیا کا دوسرا بڑا شہر) کلکتہ تھا..... مسلم اکثریت کے زیر اقتدار رہتا۔ اور

(ج) صوبہ دہلی اور بہ شمول سلہٹ صوبہ آسام کی سیاست اور حکومت میں مسلمانوں کا حصہ تقریباً مساوی ہوتا کیوں کہ صوبہ دہلی میں مسلمان تقریباً ۴۵ فیصد تھے۔ اور صوبہ آسام میں تقریباً ۳۵ فیصد۔

(د) ہندوستان کے باقی صوبوں میں مسلمان لاوارث یتیم کی طرح نہ ہوتے۔ کیوں کہ

۱۔ملازمتوں اوراسمبلیوں میں ان کا حصہ کم ازکم تیس فیصد ہوتا۔
۲۔وزارتوں میں ان کی موثر شمولیت ہوتی۔
۳۔وہ ایسے مرکز کے ماتحت ہوتے جن میں ان کی تعداد بیرئی نہ ملنے کی شکل میں ۳۳فیصد ہوتی،اورفرقہ وارانہ امور کی زمام ان کے ہاتھ میں ہوتی۔

لیکن افسوس مسلمانوں کی اکثریت کا مزاج بگڑ چکا تھا۔کھرے کھوٹے کی تمیز جاتی رہی تھی،ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں مگر دماغ معطل ہوگئے تھے اور وہ چراغ گل ہوگئے تھے جو قلب مومن کے نہاں خانے میں روشن ہوا کرتے ہیں اور جس کی روشنی سے وہ مستقبل کو حال کی طرح دیکھا کرتا ہے۔

لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ.

''سر کی آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں لیکن سینوں کے اندر جو دل میں ان کی آنکھیں ہیں وہ اندھی ہو جاتی ہیں۔''

(حیاتِ شیخ الاسلام:ازمولانا سید محمد میاں،لاہور،ص ۸۱-۱۷۹)

حاشیہ ①:اس مقام پر مولانا سید محمد میاںؒ نے مندرجۂ ذیل حاشیہ تحریر فرمایا:

''مولانا ابوالکلام صاحب آزاد کے حسن تدبر سے یہ مطالبہ پورا ہوگیا تھا۔بلکہ ایسی صورت ہوگئی تھی کہ اعلا ہندو کے مقابلے میں مسلمان دو چند ہوگئے تھے۔کیوں کہ مسلم لیگ کو پانچ مسلمانوں کی نام زدگی کا حق دیا گیا تھا اور کانگریس کو اگرچہ ۶؍ارکان کی نام زدگی کا حق دیا گیا تھا۔مگر کانگریس نے اپنے کوٹے کو اس طرح تقسیم کیا تھا کہ اعلا ہندو تین،سکھ ایک،اچھوت ایک،مسلمان ایک۔اس طرح انٹرم گورنمنٹ میں تین اعلا ذات ہندوؤں کے مقابلہ میں ۶ مسلمان ہوگئے تھے۔اور انٹرم گورنمنٹ کے ۱۴؍ممبروں کی مجموعی تعداد کے لحاظ سے تقریباً پینتالیس فیصدی مسلمان ہوگئے تھے۔مگر مسٹر جناح صاحب نے نہ صرف یہ کہ اس حسن تدبر کی قدر نہیں کی بلکہ مسلم لیگ کے کوٹے میں ایک اچھوت کو داخل کرکے ۴۵ فیصدی سے ہٹا کر صرف ۳۵ فیصد یعنی تقریباً ایک تہائی مسلمان کردیے۔''

آزاد ہند فوج کے ارکان کو رہا کیا جائے:

۱۶؍اپریل ۱۹۴۶ء:آزاد ہند فوج کے متعلق مندرجۂ ذیل تجویز پاس کی گئی۔

جمعیت علماے ہند کی مجلس عاملہ کا یہ جلسہ حکومت ہند کو ایک بار پھر توجہ دلاتا ہے اور اس سے پرزور مطالبہ کرتا ہے کہ وہ آزاد ہند فوج کے تمام ارکان کو غیر مشروط طور پر رہا کر دے، جمعیت علماے ہند اس مسئلے میں متعدد مرتبہ اپنے اس اذعان و یقین کا اعادہ کر چکی ہے کہ آزاد ہند فوج کا ہر شخص بلاشبہ ملک و قوم کا جانباز اور فدا کار سپاہی اور آزادیٔ ہند کا دل دادہ ہے۔ اس لیے آزاد ہند فوج کو کسی صورت سے بھی مجرم تصور کرنا حقیقت کے خلاف ہے۔

مسلم لیگ کے صدر نے فرمایا:

۱۷ اپریل ۱۹۴۶ء: صدر مسلم لیگ نے دہلی میں لیگی خیال کے مسلمانوں کا جو کنونشن بلایا تھا۔ اس کی تقریر رئیس احمد جعفری نے ''خطبات قاید اعظم'' میں نقل کی ہے۔ آپ اسے دیکھ سکتے ہیں اس میں دھمکی تو ہے، مسایل کے حل کے لیے کوئی نسخۂ کیمیا اثر نہیں۔ یا ایک خوش فہمی ہے کہ اقلیت والے صوبوں کے مسلمانوں کے امراض کا موثر علاج ''قیامِ پاکستان'' ہے۔ اس واقعے پر ساٹھ برس کی مدت گزر چکی ہے۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ نہ خوش فہمی کا کوئی نتیجہ نکلا نہ دھمکی کام آئی۔ اس تقریر میں مسلم لیگ کے صدر مسٹر محمد علی جناح نے فرمایا:

> ''جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ میرا تعلق بھی ایک اقلیت کے صوبے سے ہے، سات کروڑ برادرانِ اسلام کو اپنی مملکت قایم کر لینے دیجیے، اگر دنیا میں اقلیت والے صوبوں کے لیے کوئی تحفظ ہو سکتا ہے تو سب سے زیادہ موثر قیام پاکستان ہے۔''

اسی تقریر میں انھوں نے یہ بھی فرمایا:

> ''ہمارا یہ منشا نہیں ہے کہ پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی ساتھ اختلافات اور جھگڑے شروع ہو جائیں۔ ہمارے سامنے بہت کافی کام ہوگا۔ اسی طرح برادرانِ وطن کو اپنی مملکت میں بہت سے کام کرنے ہوں گے۔ لیکن اگر وہ ہماری اقلیتوں کے ساتھ بدسلوکی شروع کر دیتے ہیں اور ان کو ستاتے ہیں تو پاکستان ایک خاموش تماشائی نہ بنے گا۔''

پاکستان نہ صرف قایم ہوگیا بلکہ اس واقعے پر نصف صدی کا عرصہ گزر چکا ہے۔ مسلم لیگ کے انداز سیاست اور پاکستان کے قیام سے اقلیت کے صوبوں (ہندوستان) کے مسلمانوں کو کوئی فایدہ تو نہ پہنچا، بلکہ لیگیوں اور ان کی پاکستانی حکومتوں کی اشتعال انگیز تقریروں سے ہندوستان کے فرقہ پرستوں کو مسلمان اقلیت کے خلاف اور شمالی اور ہندوستان کے مسلمانوں کو مزید مشکلات اور خرابیٔ حالات کا سامنا کرنا پڑا۔

پاکستان کی تمام لیگی حکومتوں اور ان کے لیڈروں کو ہمیشہ ہندوستان کی حکومت اور فرقہ پرستوں کی مسلمانوں سے بدسلوکی کی شکایت رہی لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ پاکستان ان کی کوئی مدد نہیں کرسکا، کرسکتا بھی نہیں تھا۔ اس کی حیثیت واقعتاً ایک تماشائی ہی کی بنی رہی۔

پاکستان کا قیام اور مسٹر جی ایم سید کی تشویش:

۱۹/اپریل ۱۹۴۶ء: سندھ کے معروف لیگی رہنما مسٹر جی ایم سید نے جنھیں گذشتہ دنوں مسلم لیگ کے صدر قایداعظم محمد علی جناح نے بعض جماعتی امور کے باعث مسلم لیگ سے الگ کردیا تھا، کیبنٹ مشن سے ملاقات کے بعد کراچی میں ۱۹/اپریل ۱۹۴۶ء کو اپنے اخباری بیان میں کہا کہ

> ''اگر مسلم صوبوں کو پاکستان کے مرکز میں مساوی نمایندگی نہ دی گئی تو سندھ، پنجاب کے مسلمانوں کی کالونی بن کر رہ جائے گا۔ اگر مرکز میں آبادی کے تناسب سے نمایندگی دی گئی تو پنجاب کو سندھ سے پانچ گنا نشستیں مل جائیں گی۔ اس طرح پنجابی سندھ کو اپنی کالونی بنا کر چھوڑیں گے۔ میں نے کیبنٹ مشن کے سامنے اس امر پر زور دیا ہے کہ صوبوں اور ریاستوں کو مکمل خودمختاری حاصل ہونی چاہیے۔ ہر خودمختار اسٹیٹ کے لیے علاحدہ کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی ہونی چاہیے۔ سنٹر کے لیے علاحدہ اسمبلی ہونی چاہیے جس میں ہندو اور مسلمانوں کی تعداد برابر برابر ہو۔ مثلاً ہر ایک کے لیئے چالیس فیصد۔ ہر ایک خودمختار اسٹیٹ کو علاحدگی کا حق ہونا چاہیے۔ اس وقت کانگریس متحدہ ہندوستان کے حق میں ہے اور لیگ تقسیم شدہ ہندوستان کے حق میں۔ ان

دونوں کے درمیان سمجھوتا ناممکن ہے۔

موجودہ حالات میں ہندوستان کا مسئلہ حل کرنے کے لیے میرا فارمولا ہی کارگر ہو سکتا ہے۔ اسے نیشنلسٹ مسلمانوں کی جماعتوں مثلاً جمعیت علماے ہند، مجلسِ احرار، کرشک پرجا پارٹی، مومن کانفرنس اور دیگر جماعتوں نے منظور کر لیا ہے۔ نیز میں اس سلسلے میں کانگریس کے ساتھ بھی گفتگو کر رہا ہوں۔ میں صوبوں کی خود مختاری کا حامی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ڈیفنس اور غیر ملکی معاملات مرکز کو تفویض کیے جانے چاہییں۔ لیکن ان شعبہ جات میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مساوی نمایندگی ملنی چاہیے۔ ان محکمہ جات میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو پینتالیس پینتالیس فیصد نمایندگی دی جائے اور باقی دس فیصد دیگر اقلیتوں کے لیے مخصوص رکھی جائے۔"

(کاروانِ احرار: جلد ۸، ص ۱۰-۱۰۹)

ارکان مشن سے کانگریس کے صلاح و مشورے:

"۲۴؍اپریل ۱۹۴۶ء: مشن ۲۴؍اپریل کو دہلی واپس آیا اور وایسرائے کے ساتھ مل کر دستور کے متعلق جو گفتگو ہوئی تھی اس پر نظرِ ثانی کی۔ کئی مرتبہ بحث کرنے کے بعد سر اسٹیفورڈ کرپس مجھ سے ان مسایل کے بارے میں تبادلہ خیال کرنے آئے، جو اس دوران میں پیدا ہوئے تھے۔ ۲۸؍اپریل کو مشن نے ایک بیان جاری کیا کہ بڑی پارٹیوں کے درمیان باہمی رضامندی سے معاہدہ کرنے کے لیے گفتگو کرنا مناسب ہوگا، اس لیے مشن نے کانگریس اور لیگ کے صدور کو دعوت دی کہ وہ اپنی اپنی پارٹیوں کی ورکنگ کمیٹی کے نمایندے شملہ میں مشن سے مل کر گفتگو کرنے کے لیے نام زد کر دیں۔ ورکنگ کمیٹی نے کیبنٹ مشن سے گفتگو کرنے کے لیے نمایندوں کو مقرر کرنے کا اختیار مجھے دے دیا۔ چناں چہ میں نے جواہر لال اور سردار پٹیل کو اپنے رفیق کار کی حیثیت سے کانگریس کی نمایندگی کے لیے نام زد کیا۔ حکومت نے شملہ میں ہمارے قیام کا انتظام کر دیا۔ گاندھی جی باضابطہ طور پر گفتگو کرنے والوں میں شامل نہیں تھے، مگر مشن نے ان کو شملہ آنے کی دعوت دی تاکہ ضرورت کے وقت ان سے مشورہ کیا جا سکے۔ انھوں نے مشن کی دعوت قبول کر لی

اور آکر ''منیورولا'' میں ٹھیر گئے۔ ہم وہاں ورکنگ کمیٹی کے غیر رسمی جلسے کرتے رہے۔ تا کہ گاندھی جی بھی ان میں شریک ہو سکیں۔'' (انڈیا ونس فریڈم: ص ۲۳۰)

وزارتی مشن کی سرگرمیاں۔ مولانا سے انٹرویو:

۲۵ / اپریل ۱۹۴۶ء: نئی ۲۵ / اپریل۔ اخبار ''مدینہ'' کے نامہ نگار نے مولانا آزادؒ صدر کانگریس سے وزارتی مشن کی سرگرمیوں کے متعلق ملاقات کی اور ان سے پوچھا کہ آج کل مسلمانوں کی قدر و قیمت متعین کرنے کے لیے مختلف نعرے بلند کیے جا رہے ہیں اور خاص خاص نصب العین متعین کیے جا رہے ہیں اور اگر ان سے انکار کیا جاتا ہے تو طوفان بپا ہو جاتا ہے۔

مولانا آزاد: بے شک صورت حال یہی ہے۔ اس سے گھبرانا نہیں چاہیے، ادنا درجے میں بھی پریشان نہ ہونا چاہیے، ہمیں اپنے ایمان اور یقین کی مدد سے اپنی راہ خود متعین کرنی چاہیے اور اس کے بعد اس پر قدم جما لینے چاہییں۔ ہم جب تک ایک بات کو اپنی جگہ حق سمجھتے ہیں اس کو چھوڑ دینے کا کوئی موقع نہیں۔ میری راہ سوچی اور سمجھی ہوئی راہ ہے۔ اگر میں تن تنہا رہ جاؤں تب بھی اپنے مقام کو نہ چھوڑوں گا۔ ہاں اگر مجھ پر واضح ہو جائے کہ حق اس کے خلاف ہے تو میں اپنی جگہ ضرور چھوڑ دوں گا اور اس ایک لمحے کو کفر سمجھوں گا جو حق کے خلاف ہو۔

نامہ نگار: مولانا آپ کے بیانات امیدوں سے پُر ہیں مگر ہم جس صورتِ حال کو دیکھ رہے ہیں ان پر ہماری امیدیں ہمارا ساتھ نہیں دیتیں۔ لارنس مشن نے کام کو اتنا پھیلا دیا ہے کہ اس کا سمیٹنا مشکل ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس دروازے پر پہنچ چکے ہیں جہاں شملہ کانفرنس ناکام ہوئی تھی۔

مولانا آزاد: نہیں نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ میں نے جن امیدوں کا اظہار کیا ہے میں پختگی سے ان پر قایم ہوں، ہم کامیابی کے دروازے پر کھڑے ہیں (اس موقع پر مولانا کی آنکھوں سے نور برسنے لگا، آواز سنگین ہوگئی، پیشانی کی رگیں گہرائی سے ابھر کر سطح پر آ گئیں) فرمایا شملہ کا مزاج اور تھا اور دہلی کا مزاج اور ہے۔ وہ وقت دوسرا تھا اور آج وقت کی رفتار دوسری ہے۔ ہندوستان کی آزادی ایک طے شدہ حقیقت ہے۔

نامہ نگار: مگر شملہ کانفرنس کے موقعے پر بھی اس قسم کی امیدوں کا اظہار کیا گیا تھا۔
مولانا آزاد: ٹھیک ہے مگر میری امیدوں کی وابستگی صرف لارنس مشن کی آندھی سے نہیں ہے بلکہ گردوپیش کے حالات سے ہے۔ دنیا جس راہ سے گزر رہی ہے اور قوموں کو جن احوال سے سابقہ ہے ان کی رُو سے ہندوستان کی آزادی ایک تقدیر بن چکی ہے اور مجھے اس بارے میں ذرہ برابر شک نہیں۔

مولانا نے فرمایا میں غور وفکر کے بعد جس نتیجے پر پہنچا ہوں مسلمانوں کے لیے اسی کو مفید سمجھتا ہوں، اس کے علاوہ تباہی ہے۔ مسلمان ایک دن یہ جان لیں گے کہ پاکستان ان کے درد کا علاج نہیں ہے۔ میں جس چیز کو مسلمانوں کی موت کے ہم معنی سمجھتا ہوں اس پر اپنے ہاتھ سے کبھی دستخط نہیں کروں گا۔ ایک ایسا وقت اور موقع آنا چاہیے جب ہندوستان آزاد ہو، باہر کی مداخلتیں یک سر مفقود ہوں اور ہندوستانی زندگی کے عناصر اپنے اتحاد کا تجربہ کریں۔ صوبائی وحدتیں بالکل آزاد ہوں۔ مرکز کو کم از کم اختیار ہو۔ اس طرح مسلمان اپنے صوبوں میں آزاد قسمت کے مالک ہوں گے اور سارے ہندوستان کی قسمت میں حصہ دار رہیں گے۔ پاکستان کی صورت میں مسلمان اپنی وحدت اور طاقت کو ضائع کر دیں گے اور اپنے ملک میں غیر ملکی ہو جائیں گے۔ پاکستان کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان دو جگہ تقسیم ہو جائیں۔ اور ملک کے بڑے حصے کو خالص ہندوؤں کے ماتحت دے دیا جائے۔ میں تین کروڑ مسلمانوں کو ہندو راج کے حوالے نہیں کر سکتا۔ (زمزم-لاہور: ۳۰/اپریل ۱۹۴۶ء)

کابینہ مشن کے سربراہ چوں کہ لارڈ پیتھک لارنس تھے اس لیے اسے ''لارنس مشن'' بھی کہا گیا ہے۔

آئندہ صدر بننے سے مولانا آزادؒ کا انکار!

۲۶/اپریل ۱۹۴۶ء: کو صبح آٹھ بجے آل انڈیا ریڈیو نے صدر کانگریس مولانا آزادؒ کا یہ اعلان نشر کیا کہ

''مختلف صوبوں میں کانگریسی ڈیلیگیٹوں کا چناؤ اب ختم ہو گیا۔ آئندہ سال کے لیے صدر کے انتخاب کا وقت آ گیا ہے۔ اس لیے مناسب خیال کرتا ہوں کہ اس بارے میں اپنی رائے عوام کے روبرو پیش کروں۔ جب سے میں

جیل سے آیا ہوں، میرے پاس اس قسم کی تجویزیں آتی رہی ہیں کہ میں ایک سال اور صدارت سنبھالے رہوں۔ میں نے اس قسم کی تجویزوں کی حمایت نہیں کی۔ میں گزشتہ چھ سالوں سے یہ عہدہ سنبھالے ہوئے ہوں۔ اتنے طویل عرصے تک اس عہدے پر کوئی شخص نہیں رہا۔ حالات ایسے تھے کہ میرے لیے اس عہدے پر رہنا لازمی ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے فرایض اور ملک کی خدمت اپنی قابلیت کے مطابق سرانجام دینے کی کوشش کی۔ لیکن اب میں معافی چاہتا ہوں۔ تمام حالات پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ پنڈت جواہر لال صدارت کے لیے موزوں ترین آدمی ہیں جب کہ وہ پیشتر تین بار کانگریس کے صدر رہ بھی چکے ہیں۔''

(روزنامہ ''تیج'' دہلی: ۲۸/اپریل ۱۹۴۶ء)

شیخ الاسلامؒ کی صدارت میں دہلی کا تاریخی جلسہ:

۲۶/اپریل ۱۹۴۶ء: ۲۶/اپریل ۱۹۴۶ء کو اردو پارک دہلی میں پانچ لاکھ انسانوں کا اجتماع زیرِ صدارت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ منعقد ہوا۔ جس میں عام مسلمانوں اور دیگر لوگوں کے علاوہ امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ، پنڈت جواہر لال نہرو اور برطانوی مشن کے سربراہ لارڈ پیتھک لارنس بھی شریک ہوئے۔ یہ اجتماع سرزمین ہند پر بین الاقوامی اجتماع تھا جس میں دیگر مسلمان زعما کے مختصر بیانات کے بعد امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری نوراللہ مرقدہٗ نے مفصل خطاب فرمایا جس کا خلاصہ ہدیۂ ناظرین ہے:

......تقریباً ساڑھے تین بجے رات حضرت امیر شریعتؒ مائیک پر تشریف لائے، آپ نے انسانی سروں کے اس بحرِ بیکراں پر ایک بھرپور نظر ڈالی، ایک مرتبہ دائیں دیکھا اور پھر بائیں دیکھا جیسے لوگوں کی پیشانیوں سے موضوعِ خطاب کے نکات چن رہے ہوں۔ پھر خطبۂ مسنونہ سے پہلے آپ نے تقریر کا آغاز یوں فرمایا: ''آپ حضرات درود شریف پڑھیں۔'' پھر دوبارہ فرمایا ''درود شریف پڑھیں۔'' پھر تیسری مرتبہ بھی یہی فرمایا۔ لوگ حیران تھے کہ آج شاہ جی اتنے بڑے عظیم الشان، عدیم المثال سیاسی اجتماع سے تقریر کا آغاز

کس انداز سے کر رہے ہیں؟ اس سے پہلے سیاسی تقریروں میں ایسا نہیں کرتے تھے۔ عوام کی نگاہوں سے اُبھرنے والے اس سوال کے جواب میں حضرت امیر شریعتؒ نے خود ہی فرمایا:

''آج میں نے یہ اس لیے کیا ہے کہ اتنے بڑے عظیم اجتماع کے باوجود لوگ صبح کے اخبار میں لکھ دیں گے کہ مجمع تو واقعی پانچ لاکھ کا تھا مگر اس میں مسلمان ایک بھی نہ تھا، اس لیے میں نے درود شریف پڑھوالیا ہے تاکہ دوستوں کو معلوم ہو جائے کہ اس اجتماع میں مسلمان ہیں یا یہ اجتماع ہی مسلمانوں کا ہے۔''

اس پر تمام مجمع کشتِ زعفران بن گیا۔ بعد ازاں آپ نے اپنے مخصوص انداز میں قرآن کریم کی تلاوت شروع کی، جوں جوں وقت گزرتا گیا حضرت امیر شریعتؒ کے گلے کی حلاوت اور سوز سے ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے آیاتِ خداوندی کا نزول ہو رہا ہے، الفاظ جیسے جیسے پڑھتے قرآن کریم اپنے معانی و مطالب خود واضح کرتا چلا جاتا۔ لاکھوں آدمیوں کا یہ اجتماع پتھروں کا ڈھیر معلوم ہوتا تھا، چاروں طرف ہُو کا عالم اور ایک ایسا سناٹا تھا کہ سوئی گرے تو آواز آئے اور عوام تھے کہ مبہوت ہو کر بیٹھے تلاوتِ کلام الٰہی سن رہے تھے۔ ڈیڑھ رکوع پڑھنے کے بعد حضرت امیر شریعت نے تلاوت ختم کی تو پنڈت جواہر لال نہرو اٹھا اور مائیک پر حضرت امیر شریعتؒ کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا اور معذرت خواہانہ انداز میں گویا ہوا:

''بھائیو! میں تو صرف بخاری صاحب کا قرآن کریم سننے کے لیے حاضر ہوا تھا، اب میں معذرت کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں، برطانوی مشن کی آمد کے باعث مصروفیت بہت زیادہ ہے۔''

اس کے بعد جواہر لال نہرو اور لارڈ پیتھک لارنس اسٹیج سے اُتر کر چلے گئے۔ حضرت امیر شریعتؒ نے خطبۂ مسنونہ کے بعد تقریر کا آغاز یوں فرمایا:

''حضرات! آج میں نے کوئی تقریر نہیں کرنی بلکہ چند حقایق ہیں جنھیں بلا تمہید کہنا چاہتا ہوں، آئینی اور غیر آئینی دنیا میں خواہ اس علاقے کا تعلق ایشیا سے ہو یا یورپ سے، اس وقت جو بحث چل رہی ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستان کی ہندو اکثریت کو مسلم اکثریت سے جدا کر کے برصغیر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے، قطع نظر اس کے کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟

مجھے پاکستان بن جانے کا اتنا ہی یقین ہے جتنا اس بات پر کہ صبح کو سورج مشرق ہی سے طلوع ہوگا، لیکن یہ پاکستان وہ پاکستان نہیں ہوگا جو دس کروڑ مسلمانوں کے ذہنوں میں موجود ہے اور جس کے لیے آپ بڑے خلوص سے کوشاں ہیں۔ ان مخلص نوجوانوں کو کیا معلوم کہ کل اُن کے ساتھ کیا ہونے والا ہے! بات جھگڑنے کی نہیں، بات سمجھنے اور سمجھانے کی ہے۔ سمجھا دو مان لوں گا، لیکن تحریک پاکستان کی قیادت کرنے والوں کے قول و فعل میں بلا کا تضاد ہے اور بنیادی فرق ہے۔ اور اگر مجھے کوئی اس بات کا یقین دلا دے کہ منقسم پاکستان کے کسی قصبے کی گلی میں، کسی شہر کے کسی کوچے میں حکومتِ الٰہیہ کا قیام اور شریعت اسلامیہ کا نفاذ ہونے والا ہے تو رب کعبہ کی قسم! آج ہی میں اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آپ کا ساتھ دینے کو تیار ہوں۔ لیکن یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ جو لوگ اپنے جسم پر اسلامی قوانین نافذ نہیں کر سکتے وہ دس کروڑ افراد کے وطن میں کس طرح اسلامی قوانین نافذ کر سکتے ہیں؟ یہ ایک فریب ہے اور میں فریب کھانے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوں۔"

پھر آپ نے اپنی کلہاڑی کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر تقسیم کے بعد مشرقی اور مغربی پاکستان کا نقشہ سمجھانا شروع کر دیا، آپ نے فرمایا:

"اِدھر مشرقی پاکستان ہوگا اور اُدھر مغربی پاکستان ہوگا، درمیان میں ہندو کی ۴۰ کروڑ کی آبادی ہوگی اور وہ حکومت لالوں کی حکومت ہوگی۔

کون لالے؟ لالے، دولت والے لالے، ہاتھیوں والے لالے، لالے مکار لالے! ہندو اپنی مکاری اور عیاری سے پاکستان کو ہمیشہ تنگ کرتے رہیں گے، اسے کمزور کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ اس تقسیم کی بہ دولت آپ کا پانی روک دیا جائے گا، آپ کی معیشت تباہ کرنے کی کوشش کی جائے گی اور آپ کی یہ حالت ہوگی کہ بہ وقتِ ضرورت مشرقی پاکستان مغربی پاکستان کی اور مغربی پاکستان مشرقی پاکستان کی مدد سے قاصر ہوگا۔ اندرونی طور پر پاکستان میں چند خاندانوں کی حکومت ہوگی اور یہ خاندان زمین داروں، صنعت کاروں اور سرمایہ داروں کے خاندان ہوں گے۔ انگریز کے پروردہ

فرنگی سامراج کے خود کاشتہ پودے، سردں، نوابوں اور جاگیرداروں کے خاندان ہوں گے جو اپنی من مانی کارروائی سے ہر محبِ وطن اور غریب عوام کو پریشان کر کے رکھ دیں گے۔ غریب کی زندگی اجیرن ہو جائے گی، ان کی لوٹ کھسوٹ سے پاکستان کے کسان اور مزدور نانِ شبینہ کو ترس جائیں گے۔ امیر روز بہ روز امیر تر اور غریب روز بہ روز غریب تر ہوتے چلے جائیں گے۔''

رات کافی بھیگ چکی تھی، حضرت امیر شریعتؒ اپنی سیاسی بصیرت کے موتی بکھیر رہے تھے اور مستقبل سے ناآشنا مسلمان منہ کھولے انجانے واقعات کو حیرت و استعجاب کے عالم میں سن رہے تھے۔ حضرت امیر شریعتؒ نے ہندو سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''پاکستان کی بنیاد ہندو کی تنگ نظری اور مسلمان دشمنی پر استوار ہوئی ہے۔ دولت سے پیار کرنے والے ہندو نے گائے کی پوجا کی، پیپل مہاراج پر پھول چڑھائے، چیونٹیوں کے بلوں پر شکر اور چاول ڈالے، سانپ کو اپنا دیوتا مانا لیکن مسلمان سے ہمیشہ نفرت کی اس کے سائے تک سے اپنا دامن بچائے رکھا۔ پھر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ ذات پات کے پجاری بڑے سے بڑے ہندو نے اچھوتوں پر اپنے مندروں کے دروازے کھول دیے لیکن مسلمانوں کے لیے اپنے دل کے دروازے کبھی وانہ کیے۔ آج اسی تعصب، تنگ نظری اور حقارت آمیز نفرت کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمان اپنا الگ وطن مانگنے پر مجبور ہوا ہے، اور کانگریس یہ سب کچھ دیکھ کر بھی اپنی مصلحتوں کی بنا پر خاموش رہی۔ اگر کانگریسی راہنما ہندو مہاسبھائیوں، جن سنگھی انتہا پسندوں اور اسی قسم کی تحریکوں کو اپنے اثر سے ختم کر دیتے اور وہ کر بھی سکتے تھے تو مسلم لیگ کے یہاں پہنچنے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہتی۔ مگر کیا کیا جائے کہ یہ کوڑھ کانگریس کے اندر سے پھوٹا ہے۔ جو بیماری جسم کے اندر سے پیدا ہو اُس کا علاج محض باہر کے اثرات کو تبدیل کرنے سے نہیں ہو سکتا۔ کانگریس نے ہمارے ساتھ بھی نباہ نہ کیا، اگر مسلم لیگ سے بگاڑ پیدا کیا تھا تو نیشنلسٹ مسلمان کی بات ہی مان لی ہوتی، لیکن ایسا نہ ہو سکا اور ہوا کیا کہ آج اس قدر قربانیوں کے باوجود دونوں فرنگی کو اپنا ثالث مان رہے ہیں۔ کون فرنگی؟ جو ہندوستان کے لیے کبھی بھی صحت مند

اور انصاف پر مبنی فیصلہ ہرگز نہیں دے سکتا۔اے کاش! کانگریس نے ہم سے
ہی نہیں تو مسلم لیگ سے ہی بنائی ہوتی تاکہ آپس میں مل بیٹھ کر کوئی صحیح حل
تلاش کرلیا جاتا۔"

رات کافی گزر چکی تھی، سحر قریب تھی اور حضرت امیر شریعتؒ بے تکان بولے جارہے
تھے، کیا مجال کہ ایک متنفس بھی کہیں سے ہلا ہو، یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ جیتے جاگتے انسان
نہیں بلکہ انسان شکل وصورت کی مورتیاں پڑی ہوئی ہیں۔آخر میں حضرت امیر شریعتؒ نے
زوردار آواز میں کہا کہ

"کانگریس اور مسلم لیگی دونوں سنو!

میر جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ لے
پھر التفاتِ دل دوستاں رہے نہ رہے!

یاد رکھو! کہ اگر آج تم باہم بیٹھ کر کوئی معاملہ طے کر لیتے تو وہ تمہارے حق
میں بہتر ہوتا، تم الگ الگ رہ کر باہم شیر وشکر رہ سکتے تھے، مگر تم نے اپنے
تنازعے کا انصاف فرنگی سے مانگا ہے اور وہ تم دونوں کے درمیان کبھی نہ ختم
ہونے والا فساد برپا کر کے جائے گا، جس سے تم دونوں قیامت تک چین سے
نہیں بیٹھ سکو گے اور آئندہ بھی تمہارا آپس کا کوئی ایسا تنازعہ باہمی گفتگو سے کبھی
بھی طے نہیں ہو سکے گا۔آج انگریز سامراج کے فیصلے سے تم تلواروں اور
لاٹھیوں سے لڑو گے تو آنے والے کل کو توپ اور بندوق سے لڑو گے۔تمہاری
اس نادانی اور من مانی سے اس برصغیر میں جو تباہی ہوگی، عورت کی جو بے حرمتی
ہوگی، اخلاق اور شرافت کی تمام قدریں جس طرح پامال ہوں گی، تم اس وقت
اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ یہاں وحشت ودرندگی
کا دور دورہ ہوگا، بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہوگا، انسانیت اور شرافت کا گلا
گھونٹ دیا جائے گا اور کسی کی عزت محفوظ نہیں ہوگی، نہ مال، نہ جان، نہ ایمان،
اور اس سب کا ذمہ دار کون ہوگا؟ تم دونو! (بہت خوب) لیکن اس وقت تم یہ
نہیں دیکھ سکتے، تمہاری آنکھوں پر اپنی خودغرضی اور ہوس پرستیوں نے پردے
ڈال رکھے ہیں اور تم ایک ایسے شخص کی مانند ہو کہ جو عقل تو رکھتا ہو مگر صحیح سوچنے

سے عاری ہو، کان ہیں مگر سن نہیں سکتا، آنکھیں ہیں مگر بصارت چھن چکی ہے،
اس کے سینے میں دل تو دھڑک رہا ہے مگر احساسات سے خالی محض گوشت
پوست کا ایک لوتھڑا۔''

ابھی تقریر جاری تھی کہ صبح کی اذان کی آواز کانوں میں پڑی اور حضرت امیر شریعتؒ
نے دہلی والوں سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''دہلی والو! سن رکھو! میری یہ باتیں یاد رکھنا، حالات بتا رہے ہیں کہ اب
زندگی میں جیتے جی کبھی بھی ملاقات نہ ہو سکے گی ؎

اب تو جاتے ہیں مے کدہ سے میر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

حضرات! یہ تھے وہ چند حقایق جن کو میں بغیر کسی تمہید کے کہنا چاہتا تھا سو آج میں نے
کہہ دیے، اور اب ؎

مانو نہ مانو جانِ جہاں اختیار ہے
ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں

(ماخوذ از ''امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی پیشین گوئی''۔ شائع کردہ: چودھری محمد اکرم صاحب
اچھرہ، لاہور۔ بہ حوالہ ''چراغ محمد: از قاضی محمد زاہد الحسینی'' صفحہ ۹۸-۳۹۴)

مولانا آزادؒ کی غلطی اور اس کا اعتراف:

۲۶/اپریل ۱۹۴۶ء: ''مجھے اس کی فکر تھی کہ میرے بعد جو صدر ہو، وہ میرے نقطۂ
نظر سے متفق ہو اور اسی پالیسی پر عمل کرے جسے میں نے اختیار کیا تھا۔ اس رائے کی
موافقت اور مخالفت میں تمام دلیلوں کو جانچنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ جواہر لال کو صدر
ہونا چاہیے۔ چناں چہ ۲۶/اپریل ۱۹۴۶ء کو میں نے ایک بیان جاری کیا، جس میں ان کا
نام صدارت کے لیے تجویز کیا اور کانگریس کے ممبروں سے اپیل کی کہ وہ جواہر لال کو
بالاتفاق منتخب کریں۔ غالباً گاندھی جی کسی حد تک سردار پٹیل کو صدر بنانے کی طرف مایل
تھے، لیکن جب میں نے جواہر لال کا نام تجویز کر دیا تو انھوں نے پھر اپنی رائے کا پبلک میں
اظہار نہیں کیا۔ کچھ لوگوں نے سردار پٹیل اور اچاریہ کرپلانی کے نام تجویز کیے۔ مگر آخر میں

سب جواہر لال کو صدر بنانے پر متفق ہو گئے۔

میں نے اس سلسلے میں اپنے بہترین اندازے کے مطابق فیصلہ کیا تھا، لیکن حالات نے اس کے بعد جو صورت اختیار کی اس نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ شاید یہ میری سیاسی زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ مجھے اپنے کسی اور فیصلے پر کبھی اتنا افسوس نہیں ہوا، جتنا اس نازک مرحلے میں کانگریس کی صدارت چھوڑنے کے فیصلے پر ہوا تھا۔ یہ میری ایک ایسی سیاسی غلطی تھی جس کے لیے گاندھی جی کے الفاظ مستعار لیے جائیں تو ہمالیہ پہاڑ جیسی غلطی قرار دیا جا سکتا ہے۔

میری دوسری غلطی یہ تھی کہ جب کانگریس کی صدارت کے لیے خود میں نے کھڑے نہ ہونے کا فیصلہ کیا تو سردار پٹیل کی حمایت نہیں کی۔ اگرچہ ہم دونوں میں بہت سے مسایل میں اختلاف تھا، لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر سردار پٹیل میرے بعد صدر ہوتے تو وہ کیبنٹ مشن پلان پر کامیابی سے عمل درآمد کراتے اور وہ یہ غلطی کبھی نہ کرتے جو جواہر لال سے سرزد ہوئی اور جس کی وجہ سے مسٹر جناح کو پورا پلان تباہ کر دینے کا موقع مل گیا۔ میں ان غلطیوں کے لیے اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکتا، اس لیے کہ مجھے یقین ہے کہ اگر یہ غلطیاں میں نے نہ کی ہوتیں تو پچھلے دس سال کی تاریخ اس سے قطعی مختلف ہوتی۔

میرے اس فیصلے سے پورے ملک میں کانگریس کے اندر ہل چل پیدا ہو گئی۔ کلکتہ، بمبئی اور مدراس سے کئی ممتاز لیڈر مجھے اس پر راضی کرنے کے لیے آئے کہ میں اپنا فیصلہ واپس لے لوں اور اپنے نام کو پیش کرنے کی اجازت دے دوں۔ اخبارات میں بھی اسی قسم کی اپیلیں شایع ہوئیں۔ لیکن میں ایک فیصلہ کر چکا تھا اور اپنی رائے بدلنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آئی۔" (انڈیا ونس فریڈم: ص ۲۳۸)

مشن کا منصوبہ اور کانگریس لیگ کے نمایندوں کا انتخاب:

۲۷ را پریل ۱۹۴۶ء: لارڈ پیتھک لارنس نے مولانا ابوالکلام آزادؔ اور مسٹر جناح سے درخواست کی کہ وہ اپنی اپنی جماعتوں کے چار چار نمایندے نام زد کر دیں جن سے مشن کے منصوبے پر گفتگو کی جا سکے۔ مشن کا منصوبہ یہ ہے:

(ا) پورا ہندوستان ایک یونین گورنمنٹ کے ماتحت ہوگا، جس کے پاس صرف امور

خارجہ، دفاع اور مواصلات کے محکمے ہوں گے۔

(۲) صوبوں کے دو گروہ ہوں؛

(الف) وہ صوبے جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔

(ب) وہ صوبے جن میں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔

(۳) حکومت کے تمام شعبے صوبوں کی حکومت کے ماتحت ہوں گے، غیر متعینہ شعبے بھی صوبوں ہی کے ماتحت ہوں گے۔

(۴) ملک کے دستوری ڈھانچے میں دیسی ریاستیں بھی مفاہمت کے بعد اپنی جگہ پائیں گی۔

(۵) مرکز کے پاس تین محکمے ہوں گے لیکن اگر کوئی صوبہ اپنے شعبوں میں سے کوئی شعبے مرکزی حکومت کے حوالے کرنا چاہے تو یہ اسے اختیار ہوگا۔

لارڈ پیتھک لارنس کے خط کے جواب میں کانگریس نے نمایندوں کی فہرست بھیج دی ہے، جو یہ ہے:

۱۔ مولانا ابوالکلام آزاد	صدر آل انڈیا کانگریس کمیٹی
۲۔ پنڈت جواہر لال نہرو	رکن مجلس عاملہ کانگریس
۳۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل	رکن مجلس عاملہ کانگریس
۴۔ خان عبدالغفار خان	رکن مجلس عاملہ کانگریس

اگر چہ مسلم لیگ نے لارڈ موصوف کے خط کے جواب میں کئی سوالات اٹھائے لیکن اس نے ذیل کے نمایندے نام زد کر دیے:

۱۔ مسٹر محمد علی جناح	صدر آل انڈیا مسلم لیگ
۲۔ نواب زادہ لیاقت علی خان	سیکریٹری مسلم لیگ
۳۔ نواب محمد اسماعیل خاں	رکن مجلس عاملہ مسلم لیگ
۴۔ سردار عبدالرب نشتر	رکن مجلس عاملہ مسلم لیگ

حضرت شیخ الاسلامؒ کی ایک اپیل:

۳۰/ اپریل ۱۹۴۶ء: حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کی ایک اپیل پر

ایڈیٹر زمزم لاہور نے ایک اداریہ لکھا ہے۔ اس میں وہ فرماتے ہیں:

مولانا حسین احمد صاحب مدنی صدر جمعیت علما نے ارکان جمعیت اور بہی خواہانِ ملّت کے نام ایک دردمندانہ اپیل شایع کی ہے جس میں فرمایا ہے کہ "خلق کی خدمت جمعیت کے ہر ایک ممبر اور ہر ایک رضا کار کا طرۂ امتیاز ہونا چاہیے۔" اس سلسلے میں مولانا مدظلہٗ نے ابتدائی مذہبی تعلیم، شبینہ مدارس اور نماز باجماعت کے قیام کے لیے کوشاں ہونے کی خاص طور پر تاکید فرمائی ہے۔ یقین ہے کہ مولانا کی اپیل صدا بہ صحرا ثابت نہیں ہوگی اور دین وملّت کا ہر خیر خواہ اپنے اپنے ذوق کے مطابق ان کاموں پر اپنی قوت خرچ کرے گا۔ بے شک فوز وفلاح کی اس دعوت میں اختلافات کو بھول جانا چاہیے اور خالص جذبۂ خدمت کی بنا پر جان ودل سے ہر بے پڑھے، ہر بے نماز اور دینی معلومات نہ رکھنے والوں کی امداد کرتے ہوئے اسوۂ نبی کو اپنا طرۂ امتیاز بنانا چاہیے۔ (زمزم، ۳۰ راپریل ۱۹۴۶ء)

اپریل ۱۹۴۶ء: دہلی ان دنوں بین الاقوامی سیاست کا مرکز بن رہی تھی۔ برطانوی نمایندوں کے علاوہ قریباً سب ہی سیاسی شخصیتیں یہاں پر جمع تھیں۔ سوچ وفکر، عقل ودانش کے گھوڑے سرپٹ دوڑے چلے جارہے تھے۔ ہر ایک کی تمنا تھی کہ اس کی بات رہ جائے۔ اس ہجوم میں ایسے لوگ بھی شریک تھے جو ثمر آور باغ میں داخل ہو رہے تھے اور اپنی جھولی بغیر کسی کانٹے کی چبھن کے بھر لینا چاہتے تھے۔ اور جن کے لہو سے چمن میں بہار آئی تھی وہ باد سموم کے خوف سے اپنا دامن سمیٹ رہے تھے۔ کچھ ایسے تن آسان بھی جمع تھے جو ساحل پر کھڑے طوفان کا نظارہ کرنے کے عادی تھے۔

انھی ایام میں مرکزی احرار رہنماؤں کی ملاقات کانگریس ہائی کمان سے ہوئی۔ شیخ حسام الدین، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، ماسٹر تاج الدین انصاری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی۔ پہلے تو بھنگی کالونی میں گاندھی جی سے ملے اور بعد میں مولانا ابوالکلام آزاد سے ملنے مسٹر آصف علی کے گھر گئے۔ ان ملاقاتوں میں جمعیت علمائے ہند اور احرار کے مشترک فارمولے پر گفتگو رہی۔ گو جواہر لال سمیت ان سب نے جمعیت اور احرار کی مشترک تجاویز کو مسلمانانِ ہند کے لیے مفید اور اطمینان بخش قرار دیا۔ لیکن چوں کہ مولانا آزاد کے فارمولے میں ان تجاویز کا متن قدرے موجود تھا، لہٰذا یہ بات یہیں تک رہی۔

شملہ کانفرنس کا آغاز (دوسرا دور):

۵رمئی ۱۹۴۶ء: دوسری شملہ کانفرنس شروع ہوئی۔ کانگریس نے اپنے وفد میں دو مسلمان شامل کیے تھے۔ اس پر مسٹر جناح مشتعل تھے وہ اپنی دلی کیفیت کو چھپا نہ سکے اور تمام آداب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے انھوں نے مولانا سے ہاتھ ملانے سے انکار کر دیا۔ جب کہ مولانا نے مصافحہ کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تھا۔ سکریٹری آف اسٹیٹ لارڈ پیتھک لارنس نے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی کہ دونوں جماعتوں کے درمیان حتمی مفاہمت کی کوشش کرنا ہے۔ گفتگو کی بنیاد دعوتی مکتوب میں فراہم کر دی گئی ہے۔ انھوں نے ذرا وضاحت سے کہا کہ مشن خیال کرتا ہے کہ ہندوستان کی ایک یونین ضرور ہونی چاہیے جس کی تحویل میں لازمی شعبہ جات ہوں۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ فرقہ وارانہ مسئلے کو حل کرنے کے لیے صوبوں کی گروپ بندی سے ہی بہترین امید وابستہ کی جا سکتی ہے۔ تب کانگریس کے پیش کردہ متبادل کا جائزہ لیا گیا اس میں ایک وفاقی مرکز کا قیام تھا جس کے پاس لازمی اور اختیاری شعبہ جات ہوں۔ لیکن ان کے (مشن) نزدیک یہ قابل عمل نہ تھا۔ لارڈ پیتھک لارنس نے تجویز پیش کی کہ گفتگو کا مرکز وہی ہوگا جو دعوت نامے میں مذکورہ ہے۔

مولانا آزاد نے کہا کہ قبل اس سے کہ ایجنڈے پر گفتگو شروع ہو کانگریس کی بنیادی پوزیشن واضح کر دینا ضروری ہے جو کہ یہ ہے کہ وہ ہندوستان کی مکمل آزادی کی بنیاد پر کارروائی میں حصہ لے رہی ہے۔

اس پر سیکریٹری آف اسٹیٹ لارڈ پیتھک لارنس نے کہا کہ وفد کا مقصد آئین ساز ادارہ قائم کرنا ہے جو آئین مرتب کرے، جس کے مطابق ہندوستان کو آزادی ملے گی، اگر یہ ہندوستانی عوام کی خواہش ہو۔ وائسرائے لارڈ ویول کا کہنا تھا کہ آزادی کے مسئلے پر فیصلہ آئین ساز اسمبلی کرے گی۔

مولانا آزاد نے کانگریس کا وہی مقصد پھر دہرایا کہ وہ اس کارروائی میں ہندوستان کی مکمل آزادی کی بنیاد پر حصہ لے رہی ہے جس میں سرزمین ہندوستان سے برطانوی افواج کا جلد از جلد انخلا بھی شامل ہوگا، جب کہ عملی طور پر ان کے انخلا کے لیے وقت درکار ہوگا۔ مولانا نے کانگریس کے موقف کے لیے اپنے جوابی خط (ڈاکومنٹ نمبر ی ۱۵۳، ۲۸ر

اپریل) کا حوالہ دیا۔ مسٹر جناح کی استدعا پر یہ خط اور دعوت نامے کے جواب میں ان کا خط (ڈاکومنٹ ۱۶۰، ۲۹ر اپریل) دونوں پڑھ کر سنائے گئے اور ان کی نقول مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کو مہیا کی گئیں۔

تب یونین کی تحویل میں شعبہ جات پر بحث کا آغاز ہوا۔ وائسرائے نے وضاحت کی کہ یہ تجویز کیا گیا تھا کہ یہ کم از کم ڈیفنس، امورِ خارجہ اور مواصلات ہوں گے۔ کانگریس کے نمائندوں نے کہا کہ ہمارے خیال میں بعض دوسرے درجے کے متعلقہ محکمے بھی ان کے ساتھ ہونے چاہییں اور مرکز لازمی طور پر مالی امور میں خود کفیل ہو۔ کانگریس کا یہ بھی خیال تھا کہ مرکز کو مالی وسایل پر براہِ راست اختیار حاصل ہونا چاہیے اور مرکز کو اکائیوں سے مالی امداد کا ملنا اطمینان بخش طریقِ کار نہیں ہوگا۔

(مولانا ابوالکلام آزاد اور قوم پرور مسلمانوں کی سیاست: ۳۹-۳۲۸)

کانفرنس کا اجلاس ۸ر مئی پر ملتوی کیا گیا تھا۔ کیوں کہ ۸ر مئی کو گاندھی جی کی تجویز کے مطابق مشن نے اپنا مجوزہ منصوبہ تحریری طور پر کانگریس اور مسلم لیگ کے صدور کو بھیجا۔ تاکہ وہ اس پر غور اور اپنے رفقائے کار سے مشورہ کرنے کے بعد کوئی موقف اختیار کرسکیں اور ۹ر مئی کے بعد از سہ پہر اجلاس میں پیش کرسکیں۔ آل انڈیا نیشنل کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ کے صدور مولانا ابوالکلام آزاد اور مسٹر محمد علی جناح کے نام مکتوب سے منسلک منصوبہ (۸ر مئی) کا مکمل متن:

"(۱) کل ہند یونین کی ایک حکومت اور قانون ساز ادارہ ہوگا جس کی تحویل میں امورِ خارجہ، دفاع، مواصلات، بنیادی حقوق کے شعبے ہوں گے اور ان شعبوں کے لیے درکار ذرایع آمدن کے لازمی اختیارات حاصل ہوں گے۔

(۲) بقایا تمام اختیارات صوبوں کی تحویل میں ہوں گے۔

(۳) صوبوں کی گروپ بندی کی جاسکے گی اور انھیں یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ صوبائی شعبوں میں اپنی حسب پسند شعبے مشترک رکھیں۔

(۴) گروپس اپنی ایگزیکیٹو اور قانون ساز ادارے قایم کرسکیں گے۔

(۵) یونین کے قانون ساز ادارے مسلمانوں کے اکثریتی اور ہندوؤں کے اکثریتی صوبوں سے مساوی تعداد میں نمایندگان کی تعداد سے تشکیل پائیں گے۔ خواہ یہ صوبے باہم

مل کر گروپ بنائیں یا نہ بنائیں۔ علاوہ بریں ریاستوں کے نمایندے بھی اس میں شامل ہوں گے۔

(۶) یونین کی حکومت بھی اسی تناسب سے تشکیل پائے گی جس طرح کے قانون ساز ادارہ۔

(۷) یونین اور گروپوں کے دستوروں میں یہ شق شامل کی جائے گی کہ کوئی صوبہ اپنے قانون ساز ادارے کی اکثریت کی رائے سے ابتدائی دس برس کے بعد دستور کی شرائط پر نظر ثانی کا مطالبہ کرسکتا ہے اور اسے ایسا ہر دس سال کے وقفے کے بعد کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ نظر ثانی کے مقصد کے لیے ابتدائی بنیاد کے مطابق ادارہ تشکیل دیا جائے گا اور اس میں رائے دہی کا وہی طریقِ کار ہوگا اور اسے دستور میں ہر طریقے سے ترمیم کرنے کا اختیار ہوگا۔

(۸) متذکرۂ بالا بنیادوں پر دستور وضع کرنے کے لیے دستور سازی کا نظام مندرجۂ ذیل طریقے پر کیا جائے گا۔

(الف) ہر صوبائی اسمبلی میں موجود مختلف پارٹیوں کی قوت کے تناسب سے نمایندے منتخب کیے جائیں گے۔ وہ اپنی تعداد کا دسواں حصہ ہوں گے۔

(ب) ریاستوں کے نمایندگان ان کی آبادی کی بنیاد پر اور اسی تناسب سے لیے جائیں گے، جس اصول پر برطانوی ہند سے لیے جائیں گے۔

(ج) اس طریقے سے معرضِ وجود میں آنے والی دستور ساز اسمبلی کا نئی دہلی میں ممکن حد تک جلد از جلد اجلاس منعقد ہوگا۔

(د) اپنے ابتدائی اجلاس میں عمومی نوعیت کے معاملات طے کرنے کے بعد یہ تین حصوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ ایک حصہ ہندو اکثریتی صوبوں کا نمایندہ ہوگا، ایک حصہ مسلم اکثریتی صوبوں کا نمایندہ ہوگا اور ایک حصہ ریاستوں کا نمایندہ ہوگا۔

(ہ) پہلے دو حصوں کا الگ الگ اجلاس منعقد ہوگا جس میں وہ اپنے گروپ میں شامل صوبوں کے دستور وضع کریں گے اور اس کے بعد اگر وہ چاہیں تو گروپ کا دستور بھی بنا سکتے ہیں۔

(و) جب یہ طے پا جائے گا تب ہر صوبے کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ چاہے تو اپنے

ابتدائی گروپ سے نکل کر دوسرے گروپ میں شامل ہو جائے یا گروپوں سے باہر رہے۔

(ز) اس کے بعد تینوں اداروں کا پھر مشترکہ اجلاس ہوگا جس میں متذکرۂ بالا نمبرا تا نمبر ۷ پیراگرافوں کے خطوط پر یونین کا دستور تشکیل دیں گے۔

(ح) یونین کے دستور میں کوئی اہم نکتہ جس سے فرقہ وارانہ مسئلہ متاثر ہوتا ہو، اسمبلی اس وقت تک منظور نہیں کرے گی جب تک دونوں بڑے فرقوں کی اکثریت اس کے حق میں رائے ظاہر نہ کر دے۔ (ایضاً، ص ۵۱-۳۵۰)

۱۲؍مئی ۱۹۴۶ء: مسلم لیگ نے اپنی کم از کم شرائط سے پیتھک لارنس کے ذریعے مشن کو آگاہ کر دیا۔ جیسا کہ مسٹر جناح نے لارڈ پیتھک لارنس کے نام خط میں لکھا ہے۔ حال آں کہ اس سے ویول کے اس اندیشے کی تصدیق ہوتی ہے کہ اب مطالبات بڑھا چڑھا کر پیش کیے جائیں گے بلکہ ان میں اضافہ بھی ہوا ہے۔

مسلم لیگ کا شرائط نامہ ملاحظہ ہو:

(۱) چھ مسلم صوبوں پنجاب، صوبہ سرحد، بلوچستان، سندھ، بنگال اور آسام کو ملا کر ایک گروپ بنا دیا جائے۔ جو دفاع، امورِ خارجہ، مواصلات جو دفاعی مقاصد کے لیے ضروری ہوں، کے علاوہ دیگر تمام شعبہ جات اور معاملات میں بااختیار ہوگا۔ مسلم صوبوں کا گروپ (جو پاکستان کہلائے گا) اور ہندو صوبوں کا گروپ آئین ساز اسمبلی میں اکٹھے بیٹھ کر آئین بنائیں گے۔

(۲) ان چھ مسلمان صوبوں کی ایک علاحدہ آئین ساز اسمبلی ہوگی جو ان کے گروپ اور اس میں شامل صوبوں کا آئین وضع کرے گی اور صوبہ اور مرکز (فیڈریشن آف پاکستان) کے شعبہ جات کا تعین کرے گی اور صوبوں کے لیے بقیہ خودمختاری کا بھی تعین کرے گی۔

(۳) آئین ساز ادارے کے لیے انتخاب اس طرح عمل میں آئے گا پاکستان گروپ کے ہر صوبے کے مختلف فرقوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے صحیح نمایندگی ملے۔

(۴) جب پاکستان کی وفاقی حکومت اور صوبوں کا آئین تیار ہو جائے تو کسی بھی صوبے کو گروپ سے علاحدہ ہونے کا اختیار حاصل ہوگا بہ شرطے کہ ریفرینڈم کے ذریعے اس صوبے کے عوام کی خواہش معلوم کر لی جائے۔

(۵) آئین ساز اسمبلیوں کے مشترکہ اجلاس میں بحث ہوسکتی ہے کہ یونین کا آئین ساز ادارہ ہونا چاہیے یا نہیں۔ یونین کے لیے مالیات کے حصول کا مسئلہ بھی مشترکہ اجلاس کی صواب دید پر چھوڑ دیا جائے، لیکن اس سے کسی طرح بھی ٹیکس لاگو کرنا مراد نہیں ہوگا۔

(۶) یونین کی ایگزیکیٹو اور قانون ساز ادارہ (اگر کوئی ہو) میں دونوں گروپوں کو مساوی نمائندگی حاصل ہوگی۔

(۷) یونین کے آئین میں کوئی بھی ایسا بڑا نکتہ جس سے فرقہ وارانہ مسئلہ متاثر ہوتا ہو، اس وقت تک منظور نہیں کیا جائے گا جب تک ہندو گروپ اور پاکستان گروپ کے آئین ساز اداروں کے ممبران کی اکثریت موجود نہ ہو اور وہ علاحدہ علاحدہ اس کے حق میں رائے ظاہر نہ کردیں۔

(۸) یونین میں کوئی اختلافی مسئلہ، خواہ اس کا تعلق قانون سازی، ایگزیکیٹو یا انتظامیہ سے ہو، تین چوتھائی اکثریت کی تائید سے پیش کیا جائے گا۔

(۹) گروپ اور صوبے کے دساتیر میں مختلف فرقوں کے مذہب، کلچر، اور دیگر معاملات کے لیے تحفظات اور بنیادی حقوق فراہم کیے جائیں گے۔

(۱۰) یونین کے آئین میں یہ شق بھی رکھی جائے گی جس کی رو سے کوئی صوبہ اپنی قانون ساز اسمبلی کے اکثریتی ووٹ کے ذریعے آئین کی شرائط پر نظرِ ثانی کا مطالبہ کرسکے اور ابتدائی دس سال گزرنے کے بعد اسے کسی بھی وقت یونین سے علاحدگی اختیار کرنے کی آزادی حاصل ہونی چاہیے۔

آخر میں کہا گیا ہے کہ ہم ان اصولوں کو پرامن اور دوستانہ طور پر طے کرنے کے لیے پیش کرتے ہیں، ساری پیش کش اور مذکورہ بالا معاملات باہمی طور پر مربوط ہیں۔

(نیز دیکھیے شاہراہِ پاکستان، چودھری خلیق الزماں)

اس مسئلے پر آل انڈیا نیشنل کانگریس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد نے لارڈ پیتھک لارنس کو کانگریس کی جانب سے طے کردہ تجاویز سے تحریری طور پر آگاہ کیا۔ کہ شاید سمجھوتے کے لیے بنیادیں ہاتھ آجائیں۔ ساتھ ہی انھوں نے مسلم لیگ کی تجاویز پر کانگریس کے نقطۂ نظر سے علاحدہ نوٹ کی صورت میں ردِعمل ظاہر کیا، کانگریس کی تجاویز حسب ذیل تھیں:

(۱) آئین ساز اسمبلی مندرجۂ ذیل طریقے سے تشکیل پائے گی۔

(الف) آئین ساز اسمبلی کے لیے نمایندگان ہر صوبائی اسمبلی متناسب نمایندگی کے اصول پر واحد قابل انتقال ووٹ کے ذریعے چنے گی۔ یہ نمایندے اسمبلی کے جملہ ممبران کا 1/5 تناسب ہوگا اور یہ اسمبلیوں کے ممبر یا دیگر ہو سکتے ہیں۔

(ب) ریاستوں کی نمایندگی آبادی کی بنیاد کے تناسب سے برطانوی ہند کے طرز پر دی جائے گی۔ ان کے انتخاب کے مسئلے پر بعد میں غور کیا جائے گا۔

(۲) آئین ساز اسمبلی فیڈرل یونین کے لیے آئین وضع کرے گی، یہ آل انڈیا فیڈرل گورنمنٹ اور قانون ساز ادارے پر مشتمل ہوگی۔ خارجہ، ڈیفنس، مواصلات، بنیادی حقوق، کرنسی، کسٹم، اور منصوبہ بندی کے شعبے اس کی تحویل میں ہوں گے۔ اسی طرح ایسے دیگر شعبے جو بہ غور جانچ پڑتال کے بعد ان سے قریبی تعلق رکھنے والے ہوں۔ فیڈرل یونین کو ان شعبہ جات کے لیے ریونیو اکٹھا کرنے کا ضروری اختیار ہوگا اور وہ بہ طور استحقاق ریونیو اکٹھا کرے گی۔ فیڈرل یونین کو یہ حق بھی حاصل ہوگا کہ آئین کے تعطل اور ہنگامی حالت کی عمومی صورت میں تدارک کے لیے قدم اٹھائے۔

(۳) بقیہ تمام اختیارات صوبوں یا یونٹ کو حاصل ہوں گے۔

(۴) صوبوں کے گروپس تشکیل پا سکیں گے، یہ گروپس صوبائی شعبہ جات کا تعین کر سکیں گے۔ جن کو باہمی طور پر وہ مشترکہ رکھنے کے خواہش مند ہوں۔

(۵) جب آئین ساز اسمبلی آل انڈیا فیڈرل یونین کا آئین وضع کر لے جیسا کہ مذکورۂ بالا پیرا نمبر ۲ میں کہا گیا ہے، تب صوبوں کے نمایندگان گروپس تشکیل دے سکتے ہیں۔ اپنے گروپ میں شامل صوبوں کے آئین وضع کر سکتے ہیں۔ اگر چاہیں تو گروپ کا آئین بھی بنا سکتے ہیں۔

(۶) کوئی بڑا نکتہ جس سے فرقہ وارانہ مسئلہ متاثر ہوتا ہو، آئین ساز اسمبلی میں زیرِ غور نہیں آئے گا اور نہ ہی منظوری حاصل کرے گا، جب تک کہ متعلقہ فرقہ یا فرقوں کے ممبران کی اکثریت اسمبلی میں حاضر نہ ہو اور اس کے حق میں علاحدہ علاحدہ رائے ظاہر نہ کر دے۔ اگر اس پر اتفاق نہ ہوگا کہ یہ اہم فرقہ وارانہ مسئلہ ہے تو اسے ثالث کے سپرد کر دیا جائے گا۔ شک کی صورت میں کہ آیا کوئی نکتہ بڑا فرقہ وارانہ مسئلہ ہے، اسپیکر فیصلہ کرے گا اور خواہش ظاہر کی جائے تو اس مسئلے کو فیڈرل کورٹ کے حوالے کیا جا سکتا ہے۔

(۷) آئین سازی کے دوران میں اختلافات رونما ہونے کی صورت میں خاص مسئلے کو ثالث کے سپرد کر دیا جائے گا۔

(۸) آئین پر کسی وقت بھی نظر ثانی کے لیے نظام کی گنجایش موجود ہوگی۔ اگر اس کے لیے خواہش ہو تو اسے خاص طور پر شامل کیا جا سکتا ہے کہ دس سال بعد سارے آئین پر نظر ثانی کر لی جائے۔

کانفرنس کا پانچواں اور آخری روز:

اس کشیدہ فضا میں کانفرنس شروع ہوئی (۱۲ مئی)۔ آزاد اور جناح کے مراسلات موصول ہو چکے تھے۔ فریقین کے درمیان بعد اور دوری میں اضافہ ہو چکا تھا۔ کسی پیش رفت کی توقع عبث تھی۔ مسٹر جناح نے کہا کہ کانگریس کے ساتھ اختلاف اصولی ہے اور یہ حل نہیں ہو سکتا۔ اس کے جواب میں نہرو نے کہا کانگریس جس حد تک جا سکتی تھی گئی ہے اس سے زیادہ نہیں جا سکتی۔ جناح نے کہا کہ مسلم لیگ بہت زیادہ آگے گئی ہے جب کہ کانگریس اپنی جگہ سے سرکی تک نہیں۔ ایک موقع پر گفتگو میں کافی گرما گرمی پیدا ہو گئی۔ کانفرنس کی ناکامی کے بارے میں تو دو رائیں نہ تھیں۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ ناکامی کے لیے کسے ذمہ دار ٹھہرایا جائے۔ چناں چہ فیصلہ ہوا کہ کسی بھی فریق کو مورد الزام نہ ٹھہرایا جائے، کانفرنس ختم ہو گئی۔ مشن نے بتایا کہ اب وہ خود ایک اعلان کے ذریعے سے ہندوستان کے آئینی مستقبل کا خاکہ پیش کرے گا۔

کانفرنس کی ناکامی کا اعلان نامہ:

۱۲ مئی ۱۹۴۶ء: اس سلسلے میں جو اعلان جاری ہوا اس کا متن حسب ذیل تھا:

> ''برطانوی وزارتی نمایندے اور وایسرائے بڑے افسوس کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ شملہ کے مذاکرات میں مسلم لیگ اور کانگریس کے رہنماؤں کے درمیان کوئی مفاہمت نہیں ہو سکی۔ لیکن ہم اس بات کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں کہ اس ناکامی کے باوجود وہ فریضہ ختم نہیں ہوا جس کے لیے ہم اپنی حکومت اور اپنی قوم کی طرف سے ذمے دار بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ لہٰذا

مشن اپنی طرف سے مناسب تجاویز ملک کے سامنے پیش کرے گا۔"
(مولانا ابوالکلام آزاد اور قوم پرور مسلمانوں کی سیاست: ص۲۶-۳۶۳)

مولانا آزاد کا بیان:

۱۳ر مئی ۱۹۴۶ء: کیبنٹ مشن نے بیانِ ناکامی کے ساتھ ہی کانگریس سے درخواست کی تھی کہ فی الحال مشن سے مراسلت کو شایع نہ کیا جائے۔ مولانا آزاد چند دن کے لیے توقف پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ مولانا نے ایک بیان میں کہا:

"برطانوی وزارتی مشن کی خواہش ہے کہ کانفرنس کی کارروائی اور متعلقہ خطوط اور دیگر کاغذات ابھی چند روز صیغۂ راز میں رکھے جائیں۔ ہم اس پر راضی ہو گئے ہیں۔ لہٰذا ہم فی الحال کانفرنس کی کوئی تحریر یا کاغذات شایع نہیں کر سکتے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عوام کو یہ سب جاننے کا حق ہے اور انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اب تک کیا ہوا۔ لیکن میرا یقین ہے کہ حالات کی نزاکت کے زیر نظر چند دن کے لیے ہماری معذرت قابل قبول ہوگی۔ نیز اخبارات سے بھی یہ اپیل ہے کہ جب تک اصل واقعات سامنے نہ آجائیں وہ رائے زنی اور قیاس آرائی سے پرہیز کریں۔"

کانگریس اور لیگ کے متعلق مفتی محمد شفیعؒ کے فتوے کا جواب:

۱۵ر مئی ۱۹۴۶ء: "کشف الغوایہ عن الوقایہ" یہ مولانا سید محمد میاں علیہ الرحمہ کا رسالہ ہے جو حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی کے رسالہ "وقایۃ المسلمین عن ولایۃ المشرکین یعنی کانگریس اور مسلم لیگ کے متعلق شرعی فیصلہ" کے جواب میں لکھا گیا تھا۔ یہ رسالہ حضرت مصنف (مولانا سید محمد میاں) نے ۱۷ر ربیع الاول ۱۳۶۵ھ (فروری ۱۹۴۶ء) میں مکمل کر کے اخبار میں اشاعت کے لیے دے دیا تھا، لیکن اس وقت الیکشن کے ہنگاموں کی وجہ سے شایع نہ ہو سکا تھا۔ چند ماہ بعد ۱۲ر جمادی الثانیہ ۱۳۶۵ھ/ ۱۵ر مئی ۱۹۴۶ء کو نظر ثانی کے بعد کتابچے کی شکل میں جمعیت علمائے ہند کی جانب سے دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی سے مولانا وحید الدین احمد قاسمیؒ نے شایع کر دیا تھا۔

یہ ۷۹ صفحات کا مفصل اور بہت مدلل رسالہ ہے۔ اس میں حضرت مصنف نے مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی علیہ الرحمہ کے تمام اشکالات کو رفع اور اعتراضات کو بہ دلایل رَدّ فرمادیا ہے۔

وزارتی مشن پلان کی اشاعت:

۱۶ رمئی ۱۹۴۶ء: مشن کے ممبروں نے جو تجاویز مرتب کی تھیں:

۱۶ رمئی کو مسٹر ایٹلی نے دارالعوام میں اعلان کیا۔ پارلیمنٹ میں عام اطلاع کے لیے ایک تحریر بھی شایع کی گئی جس میں یہ پلان درج تھا اور یہ بیان کیا گیا تھا کہ ہندوستان کا ایک نیا دستور جلد سے جلد تیار کرنے کے لیے برطانوی کیبنٹ اس انتظام کو سب سے زیادہ مناسب سمجھتی ہے۔ میں نے کیبنٹ مشن پلان کو ضمیمہ میں درج کردیا ہے اور اگر کوئی شخص چاہے تو اس کا میری اسکیم سے مقابلہ کرسکتا ہے جسے میں نے اپنے ۱۵ راپریل کے بیان میں پیش کیا تھا۔ (انڈیا ونس فریڈم، ص ۲۳۱)

اتفاق سے مشن کا یہ بیان انڈیا ونس فریڈم میں شامل ہونے سے رہ گیا تھا۔ اس کمی کا احساس ۱۹۶۰ء سے ۱۹۹۷ء تک نہ پبلشر کو ہوا نہ کسی قاری کو! خاک سار ابوسلمان نے "انڈیا ونس فریڈم" کے نام سے جو اردو ترجمہ مقدمہ وحواشی سے مزین ومدون کیا تھا اس کی دوسری اشاعت (۱۹۹۷ء) کی تیاری کے لیے نظر ثانی کے وقت اس خامی پر نظر پڑی اور اسے شامل کرلیا گیا۔ اب جو تیسرا ایڈیشن آیا ہے اس مین دیگر قیمتی اضافات کے ساتھ وزارتی مشن پلان بھی مع تتمہ کے شامل ہے۔ اس کے سوا انڈیا ونس فریڈم کی کسی اشاعت یا اس کے ترجمے میں یہ پلان شامل نہیں۔

وزارتی مشن کا پلان:

۱۶ رمئی ۱۹۴۶ء: (الف) جس کا اس نے ۱۶ رمئی ۱۹۴۶ء کو اعلان کیا تھا، اس کے ساتھ مشن کی ۲۵ رمئی کی توضیحات بھی شامل کردی ہیں جو اس نے مسلم لیگ کی ۲۲ رمئی اور کانگریس کی ۲۴ رمئی کی قراردادوں کا جایزہ لے کر جاری کی تھیں۔ (ا۔س۔ش)

"(۱) ۱۵ ر مارچ کو کابینی وفد کے ہندوستان روانہ ہونے سے پہلے برطانوی وزیر

اعظم مسٹر ایٹلی نے یہ الفاظ کہے تھے:

''میرے ساتھی اس ارادے کے ساتھ ہندوستان جارہے ہیں کہ اسے جتنی جلد اور جتنے مکمل طور سے ہو سکے آزادی حاصل کرنے میں اپنے امکان بھر زیادہ سے زیادہ مدد دیں۔ یہ فیصلہ کرنا ہندوستان کا کام ہے کہ موجودہ حکومت کی جگہ کس قسم کی حکومت قایم کی جائے؟ لیکن ہماری خواہش ہے کہ اسے یہ فیصلہ کرنے والی مشنری قایم کرنے میں مدد دیں۔

مجھے امید ہے کہ ہندوستان اور اس کے باشندے دولتِ مشترکہ کے اندر رہیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کو اس میں بڑا فایدہ ہوگا۔ لیکن اگر وہ ایسا پسند کریں تو یہ ان کی آزادانہ مرضی سے ہونا چاہیے۔ برطانوی دولتِ مشترکہ اور سلطنت بیرونی جبر کے رشتے سے منسلک نہیں ہے۔ یہ آزاد قوموں کی ایک آزاد انجمن ہے۔ اگر اس کے برخلاف ہندوستان آزاد رہنا چاہے تو ہماری رائے میں اسے اس کا حق ہے۔ ہمارا کام یہ ہوگا کہ اس عبوری دور کو زیادہ سے زیادہ پرامن اور آسان بنانے میں مدد دیں۔''

(۲) ان تاریخی الفاظ کی ہدایت کے ساتھ ہم کابینی وزیروں اور وایسرائے نے ہندوستان کی دو بڑی سیاسی جماعتوں کو ہندوستان کے اتحاد یا تقسیم کے بنیادی مسئلے پر سمجھوتا کرنے میں مدد دینے کے لیے اپنے امکان بھر پوری کوشش کی۔ نئی دہلی میں طویل گفت و شنید کے بعد ہم شملہ میں ایک کانفرنس میں لیگ اور کانگریس کو یک جا کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ وہاں پورے طور پر تبادلۂ خیال ہوا اور دونوں جماعتیں سمجھوتے کی کوشش کرنے اور اس کی صورت نکالنے کے لیے تیار تھیں۔ مگر ان کے درمیان اجزا میں جو خلیج رہ گئی اسے پاٹنا ناممکن ہوگیا اور اس طرح کوئی سمجھوتا نہ ہو سکا چوں کہ کوئی سمجھوتا نہیں ہوا، اس لیے ہم اسے اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ہم ایسا بندوبست پیش کردیں جو ہمارے خیال میں نئے دستور کی جلد تیاری کے تیقن کے لیے سب سے اچھا ہے۔ یہ بیان برطانیہ میں ملک معظم کی حکومت کی پوری پوری منظوری کے ساتھ دیا جارہا ہے۔

(۳) اس لیے ہم نے طے کیا ہے کہ فوراً ایسا بندوبست کردیا جائے جس کے ذریعے ہندوستان کے باشندے ہندوستان کے آیندہ دستور کی بابت فیصلہ کرسکیں اور فوراً ہی ایک

عبوری حکومت قایم کر دی جائے، جو نئے دستور کی تشکیل تک برطانوی ہند کا نظم و نسق چلا سکے۔ ہم نے قوم کے چھوٹے اور بڑے دونوں طرح کے طبقوں کے ساتھ انصاف کرنے کی کوشش کی ہے، جس کے ذریعے مستقبل کے ہندوستان کی حکومت کے لیے ایک قابل عمل طریقہ نکل آئے اور جس سے دفاع کے لیے ایک مستحکم بنیاد بن جائے اور سماجی، سیاسی، معاشی میدانوں میں ترقی کا ایک اچھا موقع مل جائے۔

(۴) اس بیان میں ان طویل بیانات پر جو وفد کے سامنے پیش کیے گئے ہیں، تبصرہ کرنا مقصود نہیں ہے۔ لیکن یہ بیان کر دینا مناسب ہوگا کہ ہم نے مسلم لیگ کے حامیوں کے سوا تقریباً تمام طبقوں میں ہندوستان کی سالمیت کی ایک عام خواہش پائی۔

پاکستان اور اس کی مضمرات:

(۵) لیکن یہ بات ہمارے لیے ہندوستان کی تقسیم کے امکان پر قریبی اور غیر جانبدارانہ غور و خوض کرنے میں حارج نہیں ہوئی۔ اس لیے ہم مسلمانوں کے اس حقیقی اور شدید تردد سے بہت زیادہ متاثر تھے کہ کہیں ان کے اوپر ہندو اکثریت کا مستقل راج نہ قایم ہو جائے۔

یہ احساس مسلمانوں میں اتنا قوی اور وسیع ہو گیا ہے کہ اسے محض کاغذی تحفظات سے دور نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اگر ہندوستان میں داخلی امن قایم ہوتا ہے تو اسے ان طریقوں کے ذریعے قایم کرنا ہوگا جن سے مسلمانوں کو تمام ایسے امور پر قابو حاصل ہو جائے جو ان کے تمدنی، مذہبی اور دوسرے مفادات کے لیے بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔

(۶) اس لیے ہم نے پہلے مسلم لیگ کے مطالبے کے مطابق پاکستان کی ایک الگ اور پورے طور پر سے آزاد اور با اقتدار مملکت کے مسئلے پر غور کیا۔ اس طرح کہ پاکستان دو علاقوں پر مشتمل ہوتا۔ ایک شمال مغرب جس میں پنجاب، صوبۂ سرحد اور سندھ، بلوچستان کے صوبے ہوتے۔ دوسرا شمال مشرق جس کے اندر بنگال اور آسام کے صوبے ہوتے۔ لیگ سرحدوں کا تصفیہ بعد کو کرنے پر تیار تھی۔ لیکن اس بات پر اصرار کر رہی تھی کہ پہلے پاکستان کے اصول کو تسلیم کر لیا جائے۔ پاکستان کی الگ مملکت کے لیے ایک استدلال یہ تھا کہ مسلم اکثریت کو اپنی خواہش کے مطابق اپنے طرز حکومت کے تصفیے کا حق حاصل ہو اور

دوسرے یہ کہ اس میں ایسے کافی بڑے علاقوں کو شامل کرلیا جانا ضروری ہے جن میں مسلمانوں کی اقلیت ہے، تاکہ پاکستان نظم ونسق اور معاشیات کے اعتبار سے قابل عمل ہو جائے۔

مذکورۂ بالا چھ صوبوں سے مل کر جو پاکستان بنے گا اس میں غیر مسلم اقلیتوں کی تعداد بہت کافی ہوگی، جیسا کہ ذیل کے اعداد سے معلوم ہوتا ہے:

مغربی شمالی علاقہ	مسلمان	غیر مسلم
پنجاب	۱,۶۲,۱۷,۲۴۲	۱,۲۲,۰۱,۵۷۷
صوبہ سرحد	۲۷,۸۸,۷۹۷	۲,۴۹,۲۷۰
سندھ	۳۲,۰۸,۳۲۵	۱۲,۲۶,۶۸۳
برطانوی بلوچستان	۴,۳۸,۹۳۱	۶۲,۷۰۱
کل میزان	۲,۲۶,۵۳,۲۹۵	۱,۳۷,۴۰,۲۳۱
کل فیصد	۶۲ء۰۷ فیصد	۲۷ء۹۳ فیصد
شمالی مشرقی علاقہ	مسلمان	غیر مسلم
بنگال	۳,۳۰,۰۵,۴۳۴	۷,۲۳,۰۱,۰۹۱
آسام	۳۴,۴۴,۴۲۷	۶۷,۶۲,۲۵۶
کل میزان	۳,۶۴,۴۹,۸۶۱	۷,۹۰,۶۳,۳۴۷
کل فیصد	۵۱ء۶۹ فیصد	۴۸ء۳۱ فیصد

مسلم اقلیتوں کی تعداد جو کہ باقی ہندوستان میں رہ جائے گی، تقریباً ۲ کروڑ ہوگی، جو تقریباً ۱۸ کروڑ ۸۰ لاکھ کی آبادی میں بٹی ہوئی ہوگی۔

ان اعداد وشمار سے پتا چلتا ہے کہ اگر مسلم لیگ کے مطالبے کے بہ موجب پاکستان کی ایک الگ ریاست قایم کی گئی تو اس سے مسلم اکثریت کا مسئلہ حل نہیں ہو سکے گا۔

تقسیم کی دشواریاں:

ساتھ ہی ساتھ ہم کو اس بات میں بھی کوئی صداقت نظر نہیں آتی کہ پاکستان میں

پنجاب، بنگال اور آسام کے ان اضلاع کو شامل رکھا جائے جن میں کہ غیر مسلموں کی اکثریت ہے۔ ہماری رائے میں جو دلیلیں پاکستان کے حق میں استعمال کی جاسکتی ہیں وہی دلیلیں اس بات کے لیے بھی استعمال کی جاسکتی ہیں کہ ان اضلاع کو پاکستان سے الگ کر دیا جائے۔ اس بات کا اثر سکھوں پر خاص طور سے پڑتا ہے۔

(۷) اس وجہ سے ہم نے خیال کیا کہ ایک چھوٹی سی آزاد پاکستانی ریاست کو جس میں کہ اکثریت مسلمانوں کی ہو، سمجھوتے کی بنا قرار دیا جائے۔ لیکن مسلم لیگ کے نزدیک ایسا پاکستان غیر ممکن ہے، کیوں کہ اس طرح پاکستان سے یہ علاقے خارج ہو جائیں گے۔

۱۔ پنجاب میں انبالہ اور جالندھر کے اضلاع۔

۲۔ سوائے سلہٹ کے سارا آسام۔

۳۔ مغربی بنگال کا ایک بہت بڑا حصہ مع کلکتہ کے، جس میں مسلمانوں کی آبادی ۲۳ء۶ فیصد ہے۔

ہم کو اس بات کا یقین ہے کہ کوئی ایسا حل جس میں کہ پنجاب اور بنگال کی کوئی زبردست تقسیم کرنا پڑے، جیسا کہ اسی طرح ہو جائے گا، وہ خود ان صوبوں کے رہنے والوں کی اکثریت کی مرضی اور مفاد کے خلاف ہوگا۔ بنگال اور پنجاب دونوں ایسے علاقے ہیں جن کی اپنی زبان ہے اور اپنی طویل تاریخ اور روایات ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ پنجاب کی تقسیم نے فوری طور پر سکھ بھی تقسیم ہو جائیں گے اور دونوں طرف بہت کافی تعداد میں ہوں گے۔ اس وجہ سے ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ بڑا پاکستان بنے یا چھوٹا پاکستان، کسی سے بھی فرقہ وارانہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔

(۸) مذکورۂ بالا طاقت ور دلایل نے قطع نظر اس راہ میں بہت بھاری انتظامی، اقتصادی اور دفاعی دشواریاں بھی ہیں۔

❁ سارے ہندوستان کے رسل و رسایل، ڈاک اور تار کا انتظام متحدہ ہندوستان کے نقطۂ نظر سے کیا گیا ہے۔ اس کو توڑ ڈالنے سے ہندوستان کے دونوں حصوں کو سخت نقصان پہنچے گا۔

❁ متحدہ دفاع کا مسئلہ اس نے بھی زیادہ اہم ہے۔ ہندوستان کی دفاعی فوج متحدہ ہندوستان نے بنائی گئی ہے۔ اس کو اگر دو ٹکڑوں میں توڑا جائے گا تو اس سے ہندوستانی فوج

کی کافی پرانی روایات اور جسارت کو سخت ضرب پہنچے گی اور اس راہ میں بہت سے خطروں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ہندوستانی بحری فوج اور ہندوستانی ہوائی فوج بہت کم مؤثر رہ جائیں گی۔

❁ پاکستان کے دونوں علاقوں کے حصے میں ہندوستان کی سب سے زیادہ کم زور سرحدیں پڑتی ہیں اور ان کے دفاع کے لیے پاکستان کے علاقے کی گہرائی بالکل ناکافی ثابت ہوگی۔

(۹) ایک بات اور بھی مدنظر ہے وہ یہ کہ اگر ہندوستان تقسیم ہوگیا تو ہندوستانی ریاستوں کو اپنے سے وابستہ کرنے میں دشواریاں بڑھ جائیں گی۔

(۱۰) آخری بات یہ جغرافیائی واقعہ ہے کہ پاکستان کے دونوں حصوں کے درمیان تقریباً سات سومیل کی دوری ہوگی اور دونوں کے درمیان رسل و رسایل خواہ جنگ کی حالت ہو یا صلح کی، ہندوستان کی مرضی پر منحصر ہوں گے۔

(۱۱) اس وجہ سے ہم لوگ برطانوی حکومت کو اس بات کا مشورہ نہیں دے سکتے ہیں کہ فرماں روائی کو جو اس وقت اس کے ہاتھ میں ہے وہ بالکل جداگانہ ریاستوں کو سونپے۔

کانگریس کی تجاویز:

(۱۲) لیکن اس فیصلے سے ہم نے مسلمانوں کے اس حقیقی اندیشے سے چشم پوشی نہیں کی ہے کہ کہیں ان کا کلچر اور ان کی سیاسی، سماجی زندگی ایک پوری طرح وحدانی ہندوستان میں، جہاں ہندو اپنی بڑی عددی اکثریت کی وجہ سے حاوی ہوں گے، مغلوب نہ ہو جائے۔ اس اندیشے کو دور کرنے کے لیے کانگریس نے ایک ایسی اسکیم پیش کی ہے جس کے تحت صوبوں کو پوری خودمختاری حاصل ہوگی اور مرکز کے پاس کم سے کم شعبے رہیں گے۔ مثلاً امورِ خارجہ، دفاع اور رسل و رسایل۔

اس اسکیم کے تحت صوبے اگر بڑے پیمانے پر معاشی اور انتظامی منصوبہ بندی کے ساتھ شرکت کرنا چاہیں تو اوپر کے بیان کیے ہوئے لازمی امور کے علاوہ مرکز کو اختیاری امور بھی سپرد کر سکتے ہیں۔

(۱۳) اس اسکیم سے ہماری رائے میں خاصی دستوری دشواریاں اور نقایص پیدا ہو جائیں گے مرکز میں ایک ایسی عاملہ اور مجالس قانون ساز سے کام لینا دشوار ہوگا جس میں

بعض وزیر جن سے لازمی امور متعلق ہوں پورے ہندوستان کے سامنے جواب دہ رہیں اور وہ وزیر جن سے لازمی امور متعلق نہ ہوں صرف ان صوبوں کے سامنے جواب دہ رہیں جو ان امور میں ایک ساتھ رہنا پسند کریں۔ یہ دشواری مرکزی مجلس قانون ساز میں اور بڑھ جائے گی جہاں بعض ارکان کو ایسے امور کے تذکرے اور مشورے اور ان کے متعلق راے شماری سے خارج کر دینا پڑے گا جو ان صوبوں سے تعلق رکھتے ہوں۔

اس اسکیم کی عملی دشواریوں کے علاوہ ہماری راے میں یہ مناسب نہیں ہوگا کہ دوسرے صوبوں کو جو اختیاری مسایل مرکز کے سپرد کر دینے پر تیار نہ ہوں اس غرض کے لیے اپنی گروہ بندی کرنے کے حق سے محروم کر دیا جائے۔

ہندوستانی ریاستیں اور برطانوی ہند:

(۱۴) اپنی سفارشات پیش کرنے سے پہلے ہم برطانوی ہند کے ساتھ ہندوستانی ریاستوں کے تعلقات سے بحث کرنا چاہتے ہیں۔ یہ چیز صاف ظاہر ہے کہ برطانوی ہند کے آزادی حاصل کر لینے کے بعد خواہ وہ برطانوی دولتِ مشترکہ کے اندر ہو یا اس سے باہر، ریاستی حکمرانوں اور برطانوی تاج کے درمیان موجودہ تعلق برقرار نہیں رہ سکے گا۔ اقتدارِ اعلا نہ تو تاج برطانیہ کے پاس رہ سکتا ہے اور نہ ہی حکومت کو منتقل کیا جا سکتا ہے۔ ہم نے ریاستوں کی طرف سے جن لوگوں سے ملاقات کی انھوں نے اس بات کو پوری طرح تسلیم کر لیا ہے اس کے ساتھ ہی انھوں نے ہم کو یقین دلایا ہے کہ ریاستیں ہندوستان کی نئی ترقی میں اشتراکِ عمل کرنے کو تیار ہیں۔ اس اشتراکِ عمل کی صحیح صورت کا تعین نئے دستور کی تیاری کے دوران گفت و شنید کے ذریعے ہوگا اور ان کا کسی طرح یہ مطالبہ نہیں ہے کہ تمام ریاستوں کے لیے صورت یک ساں رہے گی۔ اس لیے ہم نے آگے کے پیروں میں ریاستوں سے اتنی مفصل بحث نہیں کی ہے جتنی کہ برطانوی ہند کے صوبوں سے۔

دستور کی بنیادی شکل:

(۱۵) اب ہم اس حل کی نوعیت بیان کریں گے جو ہماری راے میں تمام جماعتوں اور ان کے ضروری مطالبات کو دیکھتے ہوئے مناسب اور اس کے ساتھ ہی ساتھ پورے

ہندوستان کے لیے ایک مستحکم اور قابل عمل دستور کی تیاریوں میں ممد اور معاون ہوگا۔ ہم سفارش کرتے ہیں کہ دستور کو مندرجۂ ذیل بنیادی شکل اختیار کرنی چاہیے:

(الف) برطانوی ہند اور ریاستوں کی ایک یونین ہو جس کے ہاتھ میں امور خارجہ، دفاع اور رسل و رسایل ہوں اور جسے ان کے لیے ضروری اخراجات کے واسطے رُپیہ حاصل کرنے کا اختیار ہو۔

(ب) یونین میں ایک عاملہ اور ایک مجلس انتظامیہ ہو جو برطانوی ہند اور ریاستوں کے نمایندوں پر مشتمل ہو۔

(ج) یونین کے معاملات کے علاوہ تمام معاملات و اختیارات باقی صوبوں کے ہاتھ میں ہوں گے۔

(د) یونین کے حوالے کر دیے جانے والے اختیارات کے علاوہ ریاستوں کے ہاتھ میں تمام معاملات اور اختیارات ہوں گے۔

(ہ) صوبوں کو اپنی مجالس عاملہ اور مجالس انتظامیہ کے ساتھ گروہ بندی کا اختیار ہوگا اور ہر گروہ کو حق ہوگا کہ صوبہ جاتی اختیارات مشترک کر لیے جائیں۔

(و) یونین اور گروپ کے دستور میں ایک یہ بھی شرط شامل ہوگی جس کی رو سے صوبے اپنی مجالس قانون ساز کی اکثریت سے ایک دس سال کی ابتدائی میعاد اور اس کے بعد ہر دس سال پر دستور کی شرایط پر از سر نو غور کر سکیں۔

(۱۶) ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ مندرجۂ بالا خطوط پر کسی دستور کی تفصیل بیان کی جائے بلکہ ہندوستان کے لیے ہندوستانیوں کے تیار کردہ آئین کی تیاری کے لیے راستہ صاف کرنا چاہتے ہیں۔

پھر بھی ہمارے لیے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ آیندہ دستور کی عام بنیاد کے لیے یہ سفارش کریں، کیوں کہ گفت و شنید کے دوران ہم پر یہ بات واضح ہو گئی کہ جب تک ایسا نہ کیا جائے گا اس وقت تک دستور سازی کے انتظامات میں دو بڑے فرقوں کے اشتراک کی کوئی امید نہیں۔

(۱۷) اب ہم اس دستوری انتظام کا ذکر کریں گے جو نئے دستور کو چلانے کے لیے ضروری ہے۔

ٹھیک ٹھیک نمایندگی:

(۱۸) نئے دستوری نظام کے فیصلے کے لیے کوئی مجلس قایم کرتے وقت پہلا مسئلہ جہاں تک ممکن ہو پوری آبادی کی وسیع پیانے پر اور ٹھیک ٹھیک نمایندگی ہے۔ ظاہر ہے کہ بالغ راے دہندگی کی بنیاد پر انتخاب ہی سب سے زیادہ اطمینان بخش صورت ہے لیکن ایسی کارروائی پر اس وقت عمل پیرا ہونے کا مطلب صرف یہ ہوگا کہ نئے دستور کی تیاری میں بہت نامناسب تاخیر ہوگی، اس لیے سب سے مناسب قابل عمل متبادل صورت یہی ہے کہ حال کی منتخبہ صوبہ جاتی مجالس قانون ساز کو انتخاب کرنے والی جماعت تسلیم کرلیا جائے۔ لیکن ان کی تشکیل میں دو باتیں ایسی ہیں جو اس اقدام کو مشکل بنا دیتی ہیں۔ صوبہ جاتی مجالس قانون ساز کی رکنیت کا تناسب متعلقہ صوبے کی آزادی کے مطابق نہیں ہے۔ آسام کی آبادی ایک کروڑ ہے اور وہاں کی اسمبلی میں ۱۰۸ ممبر ہوتے ہیں۔ بنگال کی آبادی چھ گنی ہے لیکن وہاں کی اسمبلی میں صرف ۲۵۰ ممبر ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ کیمونل ایوارڈ کے مطابق اقلیتوں کو آبادی سے زاید نمایندگی دی گئی ہے۔ اس لیے صوبہ جاتی مجالس قانون ساز میں فرقوں کی نمایندگی ان کی آبادی کے تناسب سے نہیں ہے۔ بنگال اسمبلی میں مسلمانوں کو صرف ۴۸ فیصدی نشستیں حاصل ہیں، حال آں کہ صوبے میں ان کی آبادی ۵۵ فیصدی ہے۔ ان خامیوں کو دور کرنے کے لیے مختلف طریقوں پر اچھی طرح غور و خوض کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سب سے زیادہ معقول اور قابل عمل صورت حسبِ ذیل ہوگی:

(الف) ہر صوبے کے لیے اس کی آبادی کے تناسب سے اس کی نشستوں کی ایک مجموعی تعداد مقرر کردی جائے، جو بالغ راے دہندگی کے بجاے بنیاد کی تجویز کے طور پر تقریباً دس لاکھ آبادی پر ایک نمایندے کی شکل میں ہو۔

(ب) نشستوں کی صوبہ جاتی تعین کے بعد ہر صوبے مین فرقہ وارانہ تناسب کے مطابق نشستیں تقسیم کردی جائیں۔

(ج) ہر صوبے کے مقررہ نمایندے اس کی مجلس قانون ساز کے اراکین منتخب کریں گے۔

صرف تین فرقے:

ہمارا خیال ہے کہ ان مقاصد کے لیے ہندوستان میں صرف تین فرقے تسلیم کیے جائیں؛ عام، مسلم اور سکھ۔ عام میں وہ تمام فرقے شامل ہوں گے جو مسلمان اور سکھ نہیں ہیں۔ چوں کہ چھوٹے فرقوں کی آبادی کی بنیاد پر بہت کم یا بالکل نمایندگی نہ حاصل ہوگی، کیوں کہ انھیں آبادی سے زاید نمایندگی نہ مل سکے گی، اس لیے ہم نے پیراگراف ۲۰ مندرجۂ ذیل میں ایسی تجاویز پیش کی ہیں جن کی رو سے مخصوص مناد کے تمام معاملات میں انھیں پوری نمایندگی حاصل ہوگی۔

(۱۹) ا۔ اس لیے ہماری تجویز یہ ہے کہ ہر صوبہ جاتی مجلس قانون ساز نمایندوں کی مندرجہ تعداد منتخب کرے گی۔ مجلس کا ہر حصہ (عام، مسلم یا سکھ) آبادی کے تناسب کے مطابق واحد منقولہ (سنگل ٹرانسفرایبل) ووٹ کے ذریعے اپنے نمایندے منتخب کرے گا۔

گوشوارۂ نمایندگی:

(الف)

صوبے	عام	مسلم	میزان
مدراس	۴۵	۴	۴۹
بمبئی	۱۹	۲	۲۱
یوپی	۴۷	۸	۵۵
بہار	۳۱	۵	۳۶
کراچی	۱۶	۱	۱۷
اڑیسہ	۹	-	۹
میزان	۱۶۷	۲۰	۱۸۷

(ب)

صوبے	عام	مسلم	سکھ	میزان
پنجاب	۸	۱۶	۴	۲۸

صوبے	عام	مسلم	سکھ	میزان
سرحد	-	۳	-	۳
سندھ	۱	۳	۳	۷
میزان	۹	۲۲	۷	۳۸

(ج)

صوبے	عام	مسلم	میزان
بنگال	۲۷	۳۳	۶۰
آسام	۷	۳	۱۰
میزان	۳۴	۳۶	۷۰

میزان برائے برطانوی ہند = ۲۹۲

میزان تعداد برائے ریاست = ۹۳

میزان = ۳۸۵

مجلس دستور ساز میں نمایندگی:

نوٹ: چیف کمشنر کے صوبوں کی نمایندگی کے لیے مرکزی مجلس قانون ساز میں دہلی، اجمیر، میرواڑہ اور کورگ کونسل کے ایک ایک رکن کا اضافہ کردیا جائے گا۔

دفعہ "ب" میں برطانوی بلوچستان کے ایک نمایندے کا اضافہ کردیا جائے گا۔

۲۔ ارادہ کیا جاتا ہے کہ مجلس دستور ساز میں ریاستوں کو مناسب نمایندگی حاصل ہوگی، جو برطانوی ہند کے حساب کی بنیاد کے مطابق ۹۳ سے زاید نہ ہوگی۔ لیکن انتخاب کا طریقہ مشاورت سے طے کیا جائے گا۔ ابتدائی دور میں ریاستوں کی نمایندگی ایک گفت و شنید کی کمیٹی کرے گی۔

۳۔ اس طرح منتخب ہونے والے نمایندوں کا نئی دہلی میں جلد از جلد ایک اجلاس ہوگا۔

۴۔ پہلے ایک ابتدائی اجلاس ہوگا جس میں کارروائی کی تمام ترتیب کا فیصلہ کیا جائے

گا۔ صدر اور دوسرے عہدہ داروں کا انتخاب ہوگا اور شہریوں، اقلیتوں، قبایلی اور علاحدہ کردہ علاقوں کے لیے ایک مشاورتی کمیٹی (ایڈوائزری کمیٹی) مقرر کی جائے گی۔

اس کے بعد صوبہ جاتی نمایندے الف، ب اور ج کے تین حصوں میں تقسیم کر دیے جائیں گے۔

صوبائی آئین کا تصفیہ:

۵۔ یہ حصے اپنے اپنے صوبوں کے لیے صوبہ جاتی آئین کا تصفیہ کریں گے اور یہ بھی طے کریں گے کہ ان صوبوں میں کوئی گروہی دستور قایم کیا جائے یا نہیں اور اگر قایم کیا جائے تو کسی گروہ کے اختیار میں کون کون سے صوبائی معاملات ہوں۔

صوبوں کو اختیار ہوگا کہ وہ ذیلی دفعہ (۸) کی رو سے گروپ سے علاحدہ ہو جائیں۔

۶۔ اجزا اور ریاستوں کے نمایندوں کے انتخاب کے تصفیے کے لیے ایک اور اجلاس ہوگا۔

۷۔ یونین کی مجلس دستور ساز میں دفعہ ۱۲۶ مذکورۂ بالا یا کسی سوال کی تبدیلی کے لیے موجودہ بننے والے نمایندوں کی اکثریت کی رائے لینی ضروری ہوتی ہے۔

یونین کی مجلس دستور ساز میں دفعہ ۱۲۶ مذکورۂ بالا یا کسی سوال کی تبدیلی کے لیے موجودہ بننے والے نمایندوں کی اکثریت کی رائے لینی ضروری ہوتی ہے۔

اسمبلی کا صدر اس امر کا فیصلہ کرے گا کہ کس قرارداد سے کوئی بڑے فرقہ وارانہ مسایل پیدا ہو سکتے ہیں اور اگر دونوں فرقوں میں سے کسی ایک فرقے کے نمایندوں کی اکثریت اس کی درخواست کرے تو وہ اپنا فیصلہ دینے سے پہلے فیڈرل کورٹ سے مشورہ کرے گا۔

۸۔ جدید آئینی انتظامات کے عمل میں لائے جانے کے بعد صوبوں کو اختیار ہوگا کہ وہ اپنے مقررہ گروپ سے علاحدہ ہو جائیں۔ اس کا فیصلہ نئے آئین کے مطابق عام انتخاب کے بعد صوبے کی نئی مجلس قانون ساز کرے گی۔

(۲۰) شہریوں کے حقوق اقلیتوں اور قبایلی اور علاحدہ کردہ علاقوں کی مشاورتی کمیٹی میں متعلقہ مفاد کی پوری پوری نمایندگی اور اس کا کام بنیادی حقوق، اقلیتوں کے تحفظ اور قبایلی اور علاحدہ کردہ علاقوں کے نظم و نسق کے انتظامات کے لیے یونین کی مجلس قانون ساز

کو ایک رپورٹ پیش کرنا ہوگی اور وہ مشورہ دے گی کہ یہ حقوق صوبہ جاتی یا گروہ داری یا یونین کے آئین میں شامل کیے جائیں۔

(۲۱) ہز ایکسیلنسی وائسرائے فوراً صوبائی مجالس قانون ساز سے درخواست کریں گے کہ وہ اپنے نمایندے منتخب کرلیں اور ریاستوں سے کہیں گے وہ ایک گفت وشنید کی کمیٹی مقرر کردیں۔ امید کی جاتی ہے کہ دستور سازی کا کام اتنی رفتار سے چل سکے گا جتنی رفتار سے کام کی پے چیدگیاں اس کی اجازت دیں، تاکہ عبوری دور کم سے کم ہو جائے۔

(۲۲) یونین کی دستور ساز اسمبلی اور برطانیہ سے ایک ایسا معاہدہ ترتیب دینا ضروری ہوگا جس میں بعض ایسے امور کا بندوبست کردیا جائے جو اقتدار کی منتقلی سے پیدا ہوں۔

عبوری دور کا بندوبست:

(۲۳) دستور سازی کے دوران میں ہندوستان کا نظم ونسق بھی جاری رکھنا ہوگا، اس لیے ہم فی الفور ایک ایسی عبوری حکومت کے قیام کو بڑی اہمیت دیتے ہیں، جسے بڑی بڑی سیاسی جماعتوں کی تائید حاصل ہو۔ عبوری دور میں یہ ضروری ہے کہ ان دشوار کاموں کی انجام دہی کے لیے، جن سے حکومتِ ہند دوچار ہے، زیادہ سے زیادہ اشتراکِ عمل ہو۔ روز مرہ کے نظم ونسق کے بھاری کام کے علاوہ قحط کے زبردست خطرے کا بھی مقابلہ کرنا ہے اور بعد جنگ ترقی کے سلسلے میں بھی فیصلے کرنے ہیں، جن کا ہندوستان کے مستقبل پر دوررس اثر پڑے گا۔ اس کے علاوہ اہم بین الاقوامی کانفرنسیں بھی ہیں جن میں ہندوستان کی نمایندگی ہوگی۔ ان تمام کاموں کے لیے ایک ایسی حکومت ضروری ہے جسے عوام کی نمایندگی حاصل ہو۔

اس مقصد کے لیے وائسرائے نے بات چیت شروع کردی ہے اور ان کو امید ہے کہ عن قریب وہ ایک ایسی عبوری حکومت بنالیں گے جس میں تمام محکمے اور رکن جنگ کا محکمہ بھی ایسے ہندوستانی لیڈروں کے سپرد کردیا جائے جن کو عوام کا اعتماد حاصل ہوگا۔ حکومتِ برطانیہ اس حکومت کے ساتھ جو اس طرح تشکیل پائے گی، پورا پورا تعاون کرے گی، تاکہ نظم ونسق کے کام مکمل ہوتے رہیں اور انتقال اختیارات کا کام جہاں تک ممکن ہو جلد از جلد آسان طریق سے ہو سکے۔

اہلِ ہند سے اپیل:

(۲۴) ہندوستان کے عوام اور رہنماؤں سے جن کو مکمل آزادی کا موقع مل رہا ہے، ہم آخر میں یہ کہیں گے کہ ہم کو اور ہماری حکومت اور ہمارے ہم وطنوں کو امید تھی کہ ہندوستان کے لوگ خود ہی اس نئے دستور کو تیار کرنے کے طریقے پر، جس کے تحت ان کو زندگی بسر کرنا ہے، کوئی سمجھوتا کرلیں گے۔ ہم نے ہندوستانی جماعتوں کے ساتھ مل کر اس کے لیے کوشش کی اور ہر طرف سے بہت زیادہ صبر اور خیر خواہی کا مظاہرہ ہوا، مگر یہ مقصد پورا نہیں ہوسکا۔ اس لیے اب ہم آپ کے سامنے تجویزیں پیش کرتے ہیں۔ تمام فریقوں کے نقطۂ نظر سے بہت کچھ غور کرنے کے بعد ہم کو امید ہے کہ ان تجویزوں سے آپ کو کم سے کم وقت میں اور داخلی ہنگامے اور جھگڑے کے کم سے کم خطرے کے ساتھ ایسی آزادی حاصل کرنے میں مدد ملے گی۔ یہ امکان ضرور ہے کہ سب جماعتیں ان تجویزوں سے پوری طرح مطمئن نہ ہوں، لیکن آپ غالباً ہمارے اس خیال سے متفق ہوں گے کہ ہندوستان کی تاریخ کے اس نازک ترین لمحے میں باہمی رواداری کی ضرورت ہے

متبادل صورت کیا ہوگی:

ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ آپ اس بات پر غور کریں کہ ان تجویزوں کو مسترد کرنے کی صورت میں کیا حالت ہوگی۔ ہم نے اور ہندوستانی جماعتوں نے مفاہمت کے لیے آخری حد تک کوششیں کی ہیں، ان کے بعد بھی ہم کو یہ کہنا پڑتا ہے کہ صرف ہندوستانی جماعتوں کے درمیان کسی باامن سمجھوتے کی امید بہت ہی کم ہے۔ اس لیے اس کی متبادل صورت یہ ہے کہ تشدد، ہل چل اور خانہ جنگی تک کا زبردست خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ اس قسم کی بد نظمی اور خانہ جنگی اور اس کے نتیجے کی بابت کوئی رائے قایم نہیں کی جاسکتی، لیکن یہ بات یقینی ہے کہ اس طرح لاکھوں مردوں، عورتوں اور بچوں پر زبردست تباہی نازل ہو جائے گی۔ یہ ایک ایسا امکان ہے جس کو اہل ہند، ہمارے ہم وطن اور ساری دنیا یک ساں طور پر ناپسند کریں گے۔

اس لیے ہم یہ تجویزیں آپ کے سامنے اس قوی امید کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ آپ اس رواداری اور خیر خواہی سے، جسکے ساتھ یہ پیش کی گئی ہیں، ان کو قبول کرلیں گے اور

ان پر عمل کریں گے۔ ہم ان تمام لوگوں سے جو ہندوستان کا بھلا چاہتے ہیں اپیل کرتے ہیں کہ وہ اپنی نگاہ کو اپنے فرقے یا اپنے مفاد سے آگے بڑھا کر ہندوستان کی پوری چالیس کروڑ آبادی تک لے جائیں۔

ہمیں امید ہے کہ نیا ہندوستان برطانوی دولتِ مشترکہ کا رکن رہنا پسند کرے گا۔ ہمیں امید ہے کہ آپ ہر حال میں ہماری قوم کے ساتھ قریبی اور دوستانہ تعلق قایم رکھ سکیں گے۔ لیکن یہ ایسے مسئلے ہیں جن کی بابت آپ کو خود ہی آزادانہ طور پر فیصلہ کرنا ہے۔ یہ فیصلہ جو بھی ہو مگر ہم آپ کے ساتھ دنیا کی بڑی قوموں کی برادری میں آپ کی روز افزوں خوش حالی اور ایک ایسے مستقبل کے متمنی ہیں جو آپ کے ماضی سے بھی زیادہ شان دار ہو۔

اسی روز لندن دارالعوام میں برطانوی وزیر اعظم مسٹر ایٹلی نے پارلیمنٹ میں اعلان کیا، جس میں مندرجۂ بالا پلان کا ذکر کیا گیا کہ ہندوستان کا ایک نیا دستور جلد سے جلد تیار کرنے کے لیے برطانوی کیبنٹ مشن اس انتظام کو سب سے زیادہ مناسب سمجھتی ہے۔

وزیر ہند کا بیان:

کیبنٹ مشن کے پلان کے اعلان پر ۱۶ مئی شام پونے آٹھ بجے لارڈ پیتھک لارنس (سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا) نے آل انڈیا ریڈیو سے ایک تقریر نشر کرتے ہوئے اس پلان پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا:

"برطانیہ کو ہندوستان کے متعلق مدت سے تشویش تھی اور برطانیہ چاہتا تھا کہ جس طرح سر اسٹیفورڈ کرپس اور مسٹر اے وی الیگزینڈر کو یہ گتھی سلجھانے کے لیے ہندوستان بھیجا، تا کہ ہندوستان کو اپنے پاؤں پر کھڑا کر سکیں اور ہندوستانیوں کو ان کی مشکلات رفع کرنے کے سلسلے میں پوری مدد دے سکیں۔ میں اس امر کی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں کہ حکومتِ برطانیہ کو ہرگز یہ خیال نہیں کہ ہندوستان پر برطانیہ کا بنا ہوا آئین تھوپ دیا جائے۔ برطانیہ مدت سے کہہ رہا ہے کہ آئین بنانے کا کام ہندوستانیوں کا اپنا کام ہے اور وہی اس کام کو اچھی طرح سرانجام دے سکتے ہیں۔ ہمیں اس امر کا احساس ہے کہ اس سلسلے میں ہندوستانیوں کو مشکلات پیش آئیں گی، لیکن ان کا رفع کرنا ضروری ہے اور ہم اس مشکل میں ہندوستان کی مدد کرنے کو تیار ہیں۔ اس وقت ہندوستان میں سب سے بڑی دو سیاسی

جماعتیں ہیں:
۱۔ **مسلم لیگ:** جسے انتخابات میں مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت کی حمایت حاصل ہے۔
۲۔ **کانگریس:** جسے انتخابات میں دوسری قوموں کی بہت بڑی اکثریت حاصل ہوئی۔

مسلم لیگ نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ ہندوستان کو مسلم ہندوستان (آزاد اور خود مختار پاکستان) اور ہندوستان میں تقسیم کر دیا جائے۔ مسلم لیگ کا خیال ہے کہ جب تک ہندوستان کی تقسیم عمل میں نہیں لائی جائے گی ہندوستان کی آئینی گتھی نہیں سلجھے گی۔ مسلم لیگ یہ بھی چاہتی ہے کہ آئین بنانے والی جماعتیں بھی دو ہونی چاہییں تا کہ دونوں خود مختار حکومتوں کا آئین ایک ہی وقت میں تیار کیا جا سکے۔

دوسری طرف کانگریس پارٹی ہے۔ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ ہندوستان اکھنڈ رہے۔ وزارتی مشن اور وائسرائے نے پہلے دہلی میں ان لیڈروں کو بلایا اور ان کی باتیں سنیں۔ ہماری کوشش یہ تھی کہ ان دونوں میں مفاہمت ہو جائے اور دونوں کو ایک ایسے پلیٹ فارم پر کھڑا کر دیا جائے تا کہ آئندہ قدم اٹھانے میں آسانی رہے اور ہندوستان کا آئین ایسے طریقے سے بن سکے کہ مستقبل میں رکاوٹیں پیدا نہ ہوں۔ یہ امر مسلم ہے کہ رضا کارانہ طریقے پر جو اقدام کیا جائے وہ زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے۔ ہم نے پوری کوشش کی کہ دونوں جماعتیں باہمی آئین بنانے کے متعلق کوئی فیصلہ کر لیں تا کہ ہمیں اپنا ایوارڈ دینا نہ پڑے۔ ہم نے دہلی میں مذاکرہ کر کے دونوں کو اس امر پر آمادہ کر لیا کہ دونوں جماعتوں کے لیڈر شملہ کانفرنس میں شریک ہوں اور بالمشافہ بات چیت کر کے اہم امور کا تصفیہ کر لیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ کانفرنس بڑی حد تک مفید ثابت ہوئی، کیوں کہ دونوں پارٹیاں ایک دوسری کو کافی حد تک مراعات دینے پر آمادہ ہو گئیں۔ لیکن بعد میں معلوم ہو گیا کہ ان دونوں جماعتوں میں پورا اتفاق نہیں ہو سکتا۔ ہمیں مسلمانوں کے خوف و ہراس کا اچھی طرح احساس ہو گیا تھا اور ہم مسلمانوں کو اس میں حق بہ جانب سمجھتے ہیں۔ مسلمانوں کو یہ ڈر ہے کہ اگر ہندوستان اکھنڈ رہا تو ہندو اکثریت ان پر چھا جائے گی۔ ہندو اپنی تعداد کی وجہ سے مسلمانوں کو پنپنے نہیں دیں گے۔ مسلمان آواز نہیں اٹھا سکیں گے اور اگر آواز اٹھائیں گے بھی تو کوئی سننے والا نہیں ہوگا۔

یقیناً ہر گورنمنٹ کے لیے ان خدشات کا رفع کرنا ضروری ہے۔ لیکن مسلم لیگ نے اس کا جو علاج سوچا ہے اس سے ہم متفق نہیں۔ مسلم لیگ چاہتی ہے کہ مسلمانوں کی آزاد اور خود مختار گورنمنٹ قایم کردی جائے تا کہ وہ جس طرح چاہیں زندگی بسر کر سکیں۔ لیکن اس چیز کا کوئی حل نظر نہیں آتا۔ مسلم لیگ نے پاکستان کے لیے جن علاقوں کا نام لیا ہے ان میں چالیس فیصدی غیر مسلم بستے ہیں اور ان میں بعض ایسے علاقے بھی ہیں جہاں غیر مسلموں کی آبادی مسلمانوں سے بہت زیادہ ہے۔ بہ طور مثال کلکتہ کا علاقہ جہاں مسلمانوں کی تعداد غیر مسلموں سے ایک تہائی سے بھی کم ہے۔ اس کے علاوہ اگر پاکستان کے علاقے باقی ماندہ ہندوستان سے الگ کر دیے جائیں تو ہندوستان کے دفاع کو سخت صدمہ پہنچے گا۔ ہندوستان کی اتنی بڑی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کرنا ناممکن ہے۔ تقسیم کی وجہ سے ہندوستان کے اقتصادیات کو بھی سخت نقصان پہنچے گا اور ہندوستان تجارتی لحاظ سے بھی سخت کم زور ہو جائے گا۔ ہم نے مندرجۂ بالا وجوہ کی بنا پر نظریۂ پاکستان کے حق میں رائے نہیں دی، نہ ہی اس کی سفارش کی۔ کیوں کہ ہم سمجھتے ہیں کہ اس سے ہندوستان کی گتھی نہیں سلجھ سکے گی۔ مسلم لیگ کے سوا ہندوستان کی سب پارٹیاں پاکستان کی مخالف ہیں، لہٰذا اس پر عمل کرنا اور بھی مشکل ہو جائے گا۔ مشن کی طرف سے جو سفارشات کی گئی ہیں ان میں سے سب سے زیادہ اہمیت یونین کو دی گئی ہے جسے ایگزیکیٹو اور لیجسلیچر یعنی (گورنمنٹ اور پارلیمنٹ) بنانے کا اختیار ہوگا۔ اس یونین کے اختیارات دفاع، امورِ خارجہ اور رسل و رسایل پر مشتمل ہوں گے۔ مرکزی پارلیمنٹ کو حق حاصل ہوگا کہ وہ ان اختیارات کو عملی صورت دینے کے لیے ٹیکس لگا سکے۔ صوبوں کو مندرجۂ بالا اختیارات کے سوا باقی ماندہ سارے اختیارات حاصل ہوں گے۔ صوبوں کو تمام امور میں آزادی حاصل ہوگی۔ صوبوں کو اختیار حاصل ہوگا کہ وہ گروپ سسٹم کے تحت ایک دوسرے سے مل کر ایک قسم کی فیڈریشن بنالیں۔ اگر صوبے چاہیں تو ان فیڈریشنوں میں علاحدہ ایگزیکیٹو اور علاحدہ لیجسلیچر بنائی جا سکتی ہیں اور صوبے مل جل کر ان کے اختیارات کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ اس طرح مسلمانوں کے وہ خدشات دور ہو سکتے ہیں جو ان کے خیال میں تقسیم ہند کے بغیر دور نہیں ہو سکتے۔ وزارتی مشن چاہتا ہے کہ ہندوستان کا آئین بنانے کی طرف زیادہ توجہ دی جائے۔ ساتھ ہی ہم چاہتے ہیں کہ عارضی گورنمنٹ بن جائے تا کہ آئین بنانے والی جماعت کی تشکیل میں آسانی رہے۔ وایسرائے ہند کے

مشورے سے وزارتی مشن نے یہ طے کیا ہے کہ آئین بنانے والی اسمبلی کے ارکان صوبائی اسمبلیوں سے لے جائیں۔ ہم نے قرار دیا ہے کہ ۱۰ لاکھ اشخاص کی نمایندگی کے لیے ایک شخص چنا جائے۔ اسی بنا پر صوبوں کی اسمبلیوں سے نمایندے لیے جائیں اور فرقہ وارانہ تناسب سے ان کی تقسیم عمل میں لائی جا سکتی ہے۔ آئین بنانے والی اسمبلی میں ریاستوں کے بھی نمایندے لے جائیں گے۔ آئین بنانے والی اسمبلی کے ارکان ابتدائی میٹنگ کے بعد تین گرہوں میں منقسم ہو جائیں گے اور صوبوں کا آئین بنائیں تو مجھے امید ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔ میں پھر اس امر کو واضح کرنا چاہتا ہوں کہ مستقبل کا آئین بنانا ہندوستان کا اپنا کام ہے، لیکن ہم اس کے لیے ہندوستان کی ہر ممکن مدد کرنے کو تیار ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان پھولے پھلے اور اسے آزاد قوموں کی صف میں ایک ممتاز جگہ ملے۔ یقیناً اگر آزادی کے بعد ہندوستان میں امن رہا تو ہندوستان دنیا کی بڑی طاقت بن جائے گا اور وہ قیام امن کے سلسلے میں دوسری قوموں کی مدد بھی کر سکے گا۔ لیکن اگر ہندوستان میں (بدامنی میں) اضافہ رہا تو وہ انقلابوں کا گھر بن جائے گا اور اس کی آزادی کسی اہمیت کی مالک نہیں رہے گی۔ ملک میں سخت خوں ریزی ہوگی اور آئے دن فتنہ وفساد برپا ہوں گے۔ ہمیں ہندوستان کی مشکلات کا اچھی طرح علم ہے اور ہم اس کی امداد کرنے سے ہرگز نہیں ہچکچائیں گے، لیکن اس کی ذمہ داری ہم پر نہیں بلکہ خود ہندوستان پر عاید ہوگی۔"

ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا کا بیان ہے کہ آج رات پونے نو بجے ایک پریس کانفرنس منعقد ہوئی جس میں وزارتی مشن کے ارکان شریک ہوئے۔ اس کانفرنس میں وزیروں نے آج کے اعلان کی تشریح کی۔ کل صبح بھی ایک پریس کانفرنس ہوگی جس میں آج کے اعلان کے پیدا کردہ سوالات کا جواب دیا جائے گا۔ گروپ بنانے کے بعد بڑی میٹنگ میں شامل ہو جائیں گے۔ اگر کوئی صوبہ ایک دفعہ ایک گروپ مین شامل ہو جائے تو وہ دس سالہ انتخاب کے لیے اگر چاہے تو دوسرے گروپ میں شامل ہو سکتا ہے۔ وزارتی مشن نے ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں کو تین بڑے فرقوں کی حیثیت دی ہے۔ البتہ دوسری اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے ایک اسپیشل کمیٹی بنادی جائے گی۔

میں نے اس وقت ہندوستانی ریاستوں کے متعلق کچھ نہیں کہا، لیکن ہندوستان کا کوئی قانون ریاستوں کو نظر انداز نہیں کر سکتا، کیوں کہ ریاستیں ہندوستان کا ایک تہائی حصہ ہیں اور

آبادی کے لحاظ سے وہ ایک چوتھائی ہیں۔ امر مسلمہ ہے کہ ہندوستان کی آزادی کی صورت میں ریاستوں کو ہندوستان کی آزاد گورنمنٹ ہی سے سمجھوتا کرنا پڑے گا۔ اس لیے ضروری ہے کہ وہ آئین بنانے کے متعلق آل انڈیا یونین سے مفاہمت کریں اور اس کے لیے ابتدائی بات چیت ہونا ضروری ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ مرکز میں فوراً ایک عارضی گورنمنٹ بنادی جائے، چناں چہ وایسرائے اس کے لیے لیڈروں سے مذاکرات کررہے ہیں۔"

(ب)

۲۵ رمئی ۱۹۴۶ء: کابینہ مشن نے حسب ذیل ضمنی بیان جاری کیا:

(۱) وفد نے صدر مسلم لیگ کی ۲۲ رمئی اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کی ۲۴ رمئی کی قرارداد کا بہ غور جایزہ لیا۔

(۲) صورتِ حال یہ ہے کہ طویل مذاکرات کے بعد بھی ہندوستانی رہنما وفد کی پیش کردہ ان سفارشات پر متفق ہونے میں ناکام رہے، جن میں دونوں اہم پارٹیوں کے خیالات کو یک جا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہماری اسکیم جامع طور پر قایم ہے اور وہ اسی وقت کامیاب ہوسکتی ہے جب باہمی تعاون کے جذبے کے ساتھ قبول کی جائے اور اس پر عمل کیا جائے۔

(۳) وفد متذکرہ بیان اور قرارداد میں اٹھائے گئے نکات کا اجمالی ذکر بھی ضروری سمجھتا ہے۔

(۴) دستور ساز اسمبلی کے اختیارات اور فرایض اور اس کا طریق کار کابینہ وفد کے بیان سے بالکل واضح ہے۔ ایک مرتبہ دستور ساز اسمبلی قایم ہوگئی اور اس نے مقررہ اصولوں پر کام شروع کردیا تو اس کی صواب دیدوں اور اس کے فیصلوں میں مداخلت کا کوئی خیال نہیں ہے۔ جب دستور ساز اسمبلی اپنے کام کی تکمیل کرے گی تب ہز میجسٹی کی حکومت پارلیمنٹ سے سفارش کرے گی کہ وہ ہندوستانی عوام کو اقتدارِ اعلا منتقل کرنے کے لیے ضروری اقدامات کرے۔ یہ خودمختاری دو باتوں کی پابند ہوگی، جن کا ذکر ہمارے بیان میں کردیا گیا اور جو متنازعہ نہیں ہیں، یعنی اقلیتوں کے تحفظ کے لیے مناسب قوانین (بیان کے پیراگراف ۲۰ کے مطابق) حکومت سے معاہدے کیے جائیں گے (بیان کے پیراگراف ۲۲ کے مطابق)۔

(۵) یہ انتخابات کے معینہ اصولوں کے مطابق ہوگا کہ دستور ساز اسمبلی کے لیے چند یورپین منتخب کیے جاسکیں۔ انھیں یہ حق دیا جائے یا نہیں؟ اس کا فیصلہ کرنا ان پر منحصر ہے۔

(۶) بلوچستان کے نمایندوں کا انتخاب شاہی جرگہ اور کوئٹہ میونسپلٹی کے غیر سرکاری اراکین کی مشترکہ میٹنگ میں کیا جائے گا۔

(۷) اس مشترکہ دستور ساز کونسل کو ووٹ دینے کا حق ہوگا جب کہ سرکاری اراکین کو ہدایت کردی جائے گی کہ وہ الیکشن میں حصہ نہ لیں۔

(۸) بیان کے پیراگراف ۱۵ کے بارے میں کانگریس کی قرارداد نے جو وضاحت کی ہے کہ صوبے پہلے ہی مرحلے میں فیصلہ کریں گے کہ وہ اس سیکشن میں رہیں گے یا نہیں، جس میں انھیں شامل کیا گیا ہے، وفد کی منشا کے مطابق نہیں ہے۔ جن وجوہ کی بنا پر گروپ بنائے گئے ہیں وہ سب کو معلوم ہیں اور یہ اسکیم کا بنیادی جز ہے۔ اس میں ترمیم پارٹیوں کے درمیان معاہدے کی صورت ہی میں ہوسکتی ہے۔

دستور ساز اسمبلی کا کام مکمل ہونے کے بعد گروپ سے باہر ہونے کا فیصلہ عوام خود کریں گے۔ نئے صوبائی دستور کے تحت جو پہلے انتخابات ہوں گے، اس میں گروپ سے علاحدہ ہونے کا مسئلہ سب سے اہم ہوگا۔ انتخابات میں رائے دہندگان فیصلہ کرنے کے لیے خالص جمہوری انداز میں اپنا حق استعمال کریں گے۔

(۹) یہ سوال کہ دستور ساز اسمبلی میں ریاستوں کی نمایندگی کس طرح ہو، بالکل واضح ہے کہ اس بارے میں ریاستوں سے بات چیت کی جائے۔ اس امر کا فیصلہ وفد کو نہیں کرنا ہے۔

(۱۰) یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ عارضی حکومت کی بنیاد نئی ہوگی۔ تمام وزارتوں پر بہ شمول وزارت جنگ، ہندوستانی مقرر ہوں گے۔ ان سب کا انتخاب ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کے مشورے سے ہوگا۔ یہ ہندوستانی حکومت میں ایک غیر معمولی تبدیلی ہوگی اور آزادی کی جانب ایک بڑا اقدام ہوگا۔ ہز میجسٹی کی حکومت ان تبدیلیوں کے اثرات کو پوری اہمیت دے گی اور ہندوستانی حکومت کو روزمرہ امور کی انجام دہی کے معاملے میں پوری آزادی ہوگی۔

(۱۱) جیسا کہ کانگریس نے تسلیم کیا ہے، موجودہ دستور درمیانی وقفے میں نافذ العمل ہوگا، اس لیے عارضی حکومت مرکزی دستور سازی کی قانوناً ذمہ دار نہیں ہوگی۔ اس لیے

اراکین حکومت کے لیے یہ امر مانع نہیں ہوگا کہ اگر وہ کسی مرحلے پر قانون سازی کے ذریعے اہم اقدام کروانے میں ناکام رہے یا ان کے خلاف تحریک عدم اعتماد منظور ہوئی تو وہ انفرادی یا اجتماعی طور پر مستعفی ہو جائیں۔

(۱۲) نیا آئین بن جانے کے بعد برٹش فوج کا ہندوستان میں رکھنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ لیکن درمیانی وقفے میں جو امید ہے کہ مختصر ہوگا، موجودہ آئین کا نفاذ ہے، جس میں ہندوستان کے تحفظ کی ذمہ داری برٹش پارلیمنٹ پر ہے، اس وقت تک انگریزی فوج کا ہندوستان میں رہنا ضروری ہے۔

(انڈیا ونس فریڈم: مرتبہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری، صفحہ ۸۰-۳۶۱)

کابینہ مشن پلان اور لیگی رہنماؤں کے رویے:

۶ر جون ۱۹۴۶ء: دہلی میں مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہوا۔ اس میں کہا گیا کہ چوں کہ کیبنٹ مشن کے بیان میں پاکستان کے آیندہ حصول کی بنیاد موجود ہے..... جس سے امید ہوتی ہے کہ آگے چل کر آزاد اور خود مختار پاکستان وجود میں آجائے گا..... ان وجوہ کی بنا پر مسلم لیگ آئین ساز اسمبلی میں اس اسکیم کو مان کر شریک ہوگی۔

مدراس کے حاجی عبدالستار سیٹھ، بہار کے حسین امام اور محمد نعمان اور یوپی کے چودھری خلیق الزماں نے اس تجویز کی تائید کی تھی لیکن متعدد مقتدر لیگیوں نے اس کی مخالفت کی۔ نواب سر محمد یامین نے نامۂ اعمال میں تجویز کی مخالفت میں اپنی تقریر نقل کی ہے۔ اس کونسل کے اس فیصلے سے لیگیوں میں عام بے چینی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر اس فیصلے پر پہنچنا تھا تو گذشتہ چھ سات سال کی نفرت انگیز اور اشتعال پرور فرقہ وارانہ سیاست کا کیا جواز تھا۔

سر محمد یامین خان نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی اور اعداد و شمار سے ثابت کیا مشن پلان تسلیم کرنا نہ ہمارے مفاد میں ہے اور نہ یہ ہماری گذشتہ چھ سالہ سیاسی جدوجہد کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس پلان کو منظور کر کے ہم کچھ حاصل نہیں کر رہے، بلکہ ہم سب کچھ ضائع کر رہے ہیں۔ یہ پلان مسلمانوں کے اطمینان کے لیے کافی نہیں۔ اس کے منظور کرنے سے مسلمانوں مین بددلی پیدا ہو جائے گی اور مسلمان سیاسی طور پر تباہ ہو جائیں گے۔ ان کی تقریر کافی طویل تھی اور اعداد و شمار کی حد تک کامیاب مخالفانہ تقریر تھی۔ من جملہ اور بہت سے

دلایل کے انھوں نے لکھا ہے:

میں نے مخالفت کی اور کہا کہ یہ پاکستان کے مطالبے کو ختم کرنے کا جعل ہے۔

سیکشن "بی" کی یہ حالت ہے کہ اگرچہ ۲۲ مسلمان اور ۱۳ ہندو و سکھ ہوں گے لیکن صوبہ سرحد سے تینوں مسلمان ڈاکٹر خان صاحب کی پارٹی کے آئیں گے۔ پنجاب میں ملک خضر حیات خان اور ان کی پارٹی ۱۶ میں سے ۶ لے لے گی۔ سندھ میں اللہ بخش سابق وزیر کا بھائی لیگ کا مخالف ہے۔ وہاں ۴ ممبران میں سے ایک لیگ کے خلاف ہوگا۔ اس طرح ۲۲ مسلمان ممبروں میں سے ۱۰ مسلمان ممبر لیگ کے خلاف ہو کر ۱۳ غیر مسلموں سے ساز باز کر لیں گے۔ لیگ کے ساتھ صرف ۱۲ رہ جائیں گے۔

ادھر سیکشن "سی" میں مسلم ۳۶ اور غیر مسلم ۳۴ ہیں۔ اگر دو مسلمان ٹوٹ جائیں تو غیر مسلموں کے ساتھ ۳۸ ووٹ اور مسلم لیگ کے ساتھ ۳۲ رہ جائیں گے۔ لیکن مجھ کو اس سے بھی بری صورت نظر آ رہی ہے۔ چوں کہ بنگال میں مسلمان خواجہ ناظم الدین گروپ، مولوی فضل الحق اور حسین شہید سہروردی گروپ میں تو منقسم ہیں ہی، ان کے علاوہ خود غرض افراد اپنے ذاتی عارضی فایدے کے واسطے قوم کو آسانی سے بیچ دیں گے۔......

اس تھوڑے سے اضافہ سے جو مسلمانوں کو آبادی کے تناسب سے مشن نے دیا ہے کوئی فایدہ نہیں اس کے بجائے تو کمیونل اوارڈ کے ذریعے ہم کو جو تناسب ملا تھا وہ کہیں بہتر تھا۔ بنگال میں مسلمان ۱۱۹، ہندو مع اچھوت ۸۰، آسام میں مسلمان ۳۴ ہندو ۴۸۔ جس کے معنی ہوئے جملہ مسلمان ۱۵۳، ہندو ۱۲۸ سیکشن "سی" میں ہیں۔

سیکشن "بی" میں پنجاب میں مسلمان ۸۶ غیر مسلم مع ہندو سکھ ہندوستانی عیسائی کے ۷۷، سندھ میں مسلمان ۳۴ ہندو ۱۹، صوبہ سرحد میں مسلمان ۳۶ ہندو مع سکھ ۱۲۔ سیکشن "بی" میں جملہ مسلمان ۱۵۶ اور غیر مسلم ۱۰۸ ہیں۔

اس کے مقابلے میں یو پی میں مسلمان ۶۶ ہندو مع اچھوت ۱۶۴، بہار میں مسلمان ۴۲ ہندو ۱۰۶، بمبئی میں مسلمان ۳۰ ہندو ۱۱۰، مدراس میں مسلمان ۲۹ ہندو ۱۵۲، سی پی میں مسلمان ۱۰ ہندو ۸۷۔ جملہ سیکشن "اے" میں مسلمان ۱۸۱، غیر مسلم ۶۱۹ ہیں یعنی مسلمان تقریباً ۳۰ فیصدی ہیں لیکن اسکیم پیش کردہ کیبنٹ مشن میں سیکشن "اے" میں مسلمان ۲۰ ہندو ۱۶۷ ہوں گے یعنی مسلمانوں کا تناسب صرف ۱۲ فیصدی رہ جائے گا۔

اس کو خیال کیجیے کہ یو پی میں مسلمان ۸۵ لاکھ، بہار میں مسلمان ۵۵ لاکھ، اس طرح ان دو صوبوں میں مسلمانوں کی آبادی ۱۴۰ لاکھ یعنی ایک کروڑ چالیس لاکھ ہے، جب کہ سیکشن ''بی'' کے دو صوبوں کے علاوہ پنجاب کے یعنی سندھ کی ۳۲۰۸۳۲۵، صوبہ سرحد ۲۷۸۸۷۹۷ کی جملہ مسلم آبادی ۵۹۹۷۱۲۲ ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ مسلم کلچر کے دو بڑے صوبوں کو جن کی آبادی ایک کروڑ چالیس لاکھ ہے ہم ہندوؤں کے رحم و کرم پر چھوڑتے ہیں۔ مسلم تہذیب و تمدن کے حفاظت کی بابت زبانی جمع خرچ کرتے ہیں لیکن ان مسلم تہذیب کے صوبہ جات کو ان کے حوالے کرتے ہیں جو اس اسکیم کے تحت آپ کی ہر چیز کو جس کے تحفظ کے واسطے لڑ رہے ہیں تباہ اور برباد کر دیں گے، نہ جدا نمائندگی رہے گی نہ جدا انتخاب، اس لیے کوئی شخص منہ سے اسلام کا تحفظ نکالنے والا نہ ہوگا۔ نہ اردو زبان ہوگی نہ آپ کی مذہبی تعلیم، نہ یوم نجات پہلے کی طرح آپ منا سکیں گے۔ بمبئی، مدراس اور سی پی تو مسلم تہذیب کے گہوارے نہیں ہیں اس لیے وہاں کے مسلمان تو زیادہ تباہ نہ ہوں گے۔ ہم یو پی کے مسلمان ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار ہیں، اگر ہماری قربانی سے کوئی فایدہ حاصل ہو۔ لیکن اس اسکیم میں ہم تباہ اور پنجاب و بنگال کو کوئی فایدہ نہیں بلکہ کمیونل اوارڈ سے بھی ان کو کم مل رہا ہے۔

سب سے بڑی خرابی اس میں کل کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کے مشترکہ اجلاس کی ہے جو اپنا چیئرمین منتخب کرے گی۔ دیسی ریاستوں کو چھوڑ کر صرف برٹش انڈیا میں ۲۹۳ ممبروں میں مسلمان ۷۸ ہوں گے۔ اس سے بالکل ظاہر کہ اس کے چیئرمین بابو راجندر پرشاد ہوں گے نہ کہ آپ (کے) قاید اعظم صاحب۔ اس چیئرمین کے اختیارات کو دیکھیے کہ کس قدر وسیع ہیں۔......

تمام افسران ہندوؤں کے مقرر کردہ ہوں گے۔ آپ کے سیکشن میں بنائے ہوئے آئین میں مجموعی کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی ترمیم کر سکے گی جس کی امداد خود آپ کے سیکشن ''بی'' اور ''سی'' کے غیر مسلم ممبر اور چند مسلم ممبر کریں گے۔ آپ کے لیے یونین سے نکلنا ناممکن ہوگا۔ نہ تو ''بی'' گروپ کی نہ ''سی'' گروپ کی اکثریت آپ کے ساتھ ہوگی لہٰذا یہ اسکیم پاکستان کا خاتمہ کرتی ہے اور ان صوبوں کے مسلمانوں کو جہاں اسلامی تہذیب ہے خندق میں ڈالتی ہے۔ جو لوگ اس کی تائید کر رہے ہیں یہ ناسمجھی سے کر رہے ہیں۔

ساری کونسل حیران تھی کہ میں مسلم لیگ پارٹی کا سیکریٹری اپنی پارٹی کے لیڈر سے اختلاف کرر ہا ہوں۔ میں نے کہا یہ پارٹی کا سوال نہیں بلکہ مسلمانوں کی موت وزیست کا سوال ہے۔"

سر محمد یامین خاں کی تقریر سے مسٹر محمد علی جناح بھی پریشان ہوگئے اور تجویز کی حمایت میں ان کا انداز خطابت بالکل بدل گیا۔ یامین خاں لکھتے ہیں:

"قایداعظم محمد علی جناح جو نہایت سلجھی ہوئی عقل والے آدمی ہیں انھوں نے صورت کی اہمیت کا اندازہ کر کے اپنے خاص طرز میں کونسل سے کہا کہ ہم بہت مشکل سے انگریزوں سے یہ مراعات حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں، ورنہ وہ تو بالکل کانگریس کے ہاتھ میں تھے۔ اگر آپ اس کو منظور نہ کریں گے، تو کیبنٹ مشن اور وایسرائے سب اختیارات کانگریس کے سپرد کردیں گے، چوں کہ انگلینڈ کی لیبر گورنمنٹ کانگریس کی طرف دار ہے اور وایسرائے شروع ہی سے متحدہ ہندوستان چاہتا ہے۔ اگر کیونل اوارڈ پر ہی ایک کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی بنی تو اس میں بھی آپ اقلیت میں ہوں گے اور وہ جو چاہے گی وہ آئین بنائے گی۔

سیڑھیوں سے جب اترنے لگے تو بہت لوگ میرے گرد جمع ہوگئے، میں نے کہا کہ آپ نے اپنے مطالبۂ پاکستان کو گڑھے میں ڈال کر دفن کر دیا۔ ۱۹۴۰ء سے جس اصول پر لڑ رہے تھے وہ ختم کر دیا۔ صرف چند ممبریاں ایگزیکیٹو کونسل میں مل جائیں گی تو کیا مگر پبلک کو تیار پاکستان کے لیے کیا گیا، اب خود اس کو آپ چھوڑ بھاگے۔ اس سے تو ہم ہندوؤں سے بہت سی مراعات دوستی کے ذریعے حاصل کر لیتے۔

جس وقت میں زور زور سے کہہ رہا تھا قایداعظم نیچے اترے لیکن بجائے اس کے کہ اپنی کامیابی کی بشاشت ہو ان کے چہرے پر سنجیدگی اور پریشانی عیاں تھی۔"

یامین خاں کی تقریر کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سے لیگیوں کی رائے بدل گئی۔ بہار کے محمد نعمان نے تجویز کی حمایت کی تھی لیکن بہ قول یامین خاں کے، انھوں نے اعتراف کیا کہ وہ یہ

نہ سمجھ سکے تھے کہ وہ اپنے صوبے کو کس قدر نقصان پہنچا رہے تھے۔
(تفصیل کے لیے دیکھیے: نامۂ اعمال، جلد دوم، ص ۱۱۲۳ تا ۱۱۳۰۔ آئینۂ ادب۔ لاہور، ۱۹۷۰ء)

مولانا حسرت موہانی نے اس تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے کہا:

''ہم نے مسلمانوں کو دھوکا دیا، اسلام سے غداری کی، قرآن سے غداری کی۔'' (علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے۔ حصہ دوم، از مولانا محمد میاں، ص ۴۱۱، کتب خانہ فخریہ، مرادآباد، ۱۹۴۸ء)

ایک لیگی رہنما کا بیان:

۶/ جون ۱۹۴۶ء: روزنامہ انقلاب۔ لاہور کی ۶/ جون کی اشاعت میں پروفیسر ڈاکٹر محمد عاشق، مسلم لیگ بٹالہ ضلع گورداس پور کا ایک تفصیلی بیان شایع ہوا ہے۔ چوں کہ یہ پورا بیان قابل مطالعہ ہے اس لیے درج کیا جا رہا ہے:

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہم کو اس بات کا اعتراف کر لینا چاہیے کہ وہ پاکستان جس کی بنیاد قرارداد لاہور تھی، جس کا گذشتہ چھ سال سے ہندوستان کے گوشے گوشے میں پروپیگنڈا کیا جا رہا تھا، جس کے نام پر انتخابات کی جنگ لڑی گئی تھی اور جس کے ساتھ مسلمانوں کی موت اور زندگی کا تصور وابستہ کیا گیا تھا، وزارتی مشن نے اس کو منظور نہیں کیا۔ اندریں حالات اگر کوئی شخص مسلمانوں سے یہ کہنے کی جرأت کرتا ہے کہ پاکستان مل گیا ہے تو وہ اپنے نفس کو دھوکا دیتا ہے اور ساتھ ہی پوری قوم کو فریب دینے کی مذموم کوشش کرتا ہے۔

(کاروانِ احرار: جلد ۷، صفحہ ۲۱۳)

قراردادِ لاہور:

۲۳/ مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ نے تقسیم ہند کی جو قرارداد منظور کی تھی۔ اس میں پاکستان کا لفظ نہیں ہے۔ یہ محض اتفاقی طور سے ہماری سیاسی لغت میں داخل ہو گیا ہے۔ اس لیے اس لفظ کے محاسن و معائب سے قطع نظر ہمیں اپنے سیاسی نصب العین کے لیے لامحالہ قرارداد لاہور ہی کو محور بنانا پڑتا ہے۔ اب تک قاید اعظم نے کانگریس کے لیڈروں اور برطانوی حکومت کے نمایندوں سے وقتاً فوقتاً جو گفت و شنید کی ہے اس میں وہ مطالبۂ پاکستان

کی وضاحت کے لیے ہمیشہ قرارداد لاہور ہی کو معرض بحث میں لایا کرتے تھے۔اس قرارداد کے پہلے حصے میں تقسیم ہند کا اصول بیان کیا گیا ہے اور دوسرے حصے میں مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کو اس بات کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ مجوزہ اصول کے تقسیم پر ایک کانسٹی ٹیوشن مرتب کرے، افسوس ہے کہ سات سال کے عرصے میں مجلس عاملہ نے قرارداد کے اس اہم ترین حصے کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ اگر ایک دستور مرتب ہو گیا ہوتا تو آج ہم اس الجھن میں گرفتار نہ ہوتے کہ پاکستان کیا ہے اور پاکستان کیا نہیں ہے۔تاہم اس رنج دہ بحث کو چھوڑ کر مجلس عاملہ کے ذہین و فطین ممبروں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے واضح اور غیر مشتبہ فیصلے کے باوجود سات سال کے عرصے میں دستور کا خاکہ کیوں تیار نہیں کیا۔ہمیں اس بات کی طرف توجہ کرنی چاہیے کہ مسٹر جناح نے اپنے اشارات سے پاکستان کا خاکہ مسلمان جمہور کے دماغوں میں اجاگر کیا ہے۔ گذشتہ سات سال میں قاید اعظم اور مسلم لیگ کے ذمہ دار لیڈروں نے پاکستان کے متعلق جو کچھ کہا اور لکھا ہے اس سے مندرجہ ذیل باتیں پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہیں۔

۱۔ مسلمان اور ہندو دو جداگانہ قومیں ہیں، مسلمان ہندو کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔

۲۔ پاکستان میں مسلمان ہندوؤں کے قبضے اور تسلط سے بے نیاز ہو کر اسلامی تصورات کے مطابق حکومت کریں گے۔

۳۔ ہندوستان کسی ملک کا نام نہیں اور ہم ہندوستانی نہیں ہیں۔

۴۔ ہندوستان نہ کبھی اکھنڈ تھا، نہ ہے، نہ رہے گا۔

۵۔ شمال مغربی پاکستان سے شمال مشرقی پاکستان تک ہم کو ایک راستے کی ضرورت ہے، جو ہماری ملکیت ہوگا۔

۶۔ مسلمان ہندوستان میں ایک مرکزی حکومت کا تصور بھی گوارا نہیں کر سکتے۔

۷۔ اگر پاکستان قایم نہ ہوا تو مسلمان کا نام ہندوستان کی سرزمین سے مٹ جائے گا۔

۸۔ جنگ کے بعد ہم مرکز میں عارضی حکومت کو ایک لمحے کے لیے بھی برداشت نہیں کریں گے۔

۹۔ اگر پاکستان کا اصول تسلیم کر لیا جائے تو ہم مرکز میں عارضی حکومت قبول کر لیں گے۔

آج سے دو ماہ پہلے جب مسٹر جناح نے یہ الفاظ کہے تھے جو مذکورۂ بالا شق نمبر ا میں درج ہے تو بعض لوگوں نے حیرت سے کان کھڑے کر لیے تھے کہ پاکستان کے فوری قیام کے مطالبے اور محض پاکستان کا اصول تسلیم کرانے میں زمین آسمان کا فرق ہے اور چوں کہ جنگ کے بعد مرکز میں عارضی حکومت کا تصور بھی پاکستان کے لیے تباہ کن ہے اس لیے اس قسم کی عارضی حکومت بہ ہر حال نا قابل قبول ہونی چاہیے۔ لیکن ہم یہ سمجھ کر مطمئن ہو گئے تھے کہ پہلے پاکستان کا اصول تو تسلیم کر لیا جائے گا، خواہ اس کی عملی صورت پچاس سال کے بعد پیدا ہو۔

مشن کا فیصلہ:

وزارتی مشن کے فیصلے نے واضح، دو ٹوک اور غیر مشتبہ الفاظ میں پاکستان کا اصول تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس موضوع پر مشن کے الفاظ ایسے صاف اور صریح ہیں کہ ان کی دوسری تعبیر قطعاً نہیں ہو سکتی۔ ملاحظہ فرمایئے:

"مسلم لیگ اس بات کے لیے تیار تھی کہ پاکستان کی حدود کی ترمیم کا مسئلہ کچھ دیر کے لیے ملتوی کر دیا جائے اور سر دست پاکستان کا اصول تسلیم کر لینا چاہیے۔ لیگ کا یہ مطالبہ دو وجوہ پر مبنی ہے۔

اول یہ کہ مسلم اکثریت کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی خواہشات کے مطابق اپنے علاقے میں حکم رانی کرے اور

دوم یہ کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اقلیت ہے ان کو بھی پاکستان کی حدود میں شامل کیا جائے تاکہ انتظامی اور اقتصادی نقطۂ نگاہ سے پاکستان کی تجویز قابل عمل ہو سکے۔

پاکستان کی مجوزہ حدود میں مسلم اور غیر مسلم آبادیوں کا تناسب کچھ ایسا ہے کہ مسلم لیگ کی بیان کردہ تجویز کے مطابق ایک آزاد و مقتدر پاکستان کا قیام فرقہ وارانہ مسئلے کو حل نہیں کر سکتا۔ یہ بات بھی خلاف انصاف ہے کہ پاکستان کی مقتدر و خود مختار ریاست میں پنجاب، بنگال اور آسام سے ان اضلاع کو شامل کیا جائے، جن کی غالب اکثریت غیر مسلموں پر مشتمل ہے۔"

اس کے بعد وزارتی مشن نے پاکستان کے نظریے کے خلاف ایک ایک کر کے ذیل کے دلایل پیش کیے ہیں:

''۱۔ پنجاب، بنگال اور آسام کے صوبوں کو ان کی موجودہ حدود کے ساتھ پاکستان میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔

۲۔ پنجاب، بنگال اور آسام کے ان اضلاع کو جہاں غیر مسلموں کی اکثریت سے خارج کر کے جو پاکستان بنے گا، وہ قابل عمل نہیں ہوگا اور نہ لیگ کو یہ صورت منظور ہے۔

۳۔ اکھنڈ ہندوستان کے وسایل، نقل وحمل اور رسل ورسایل کو (جن میں تار اور ڈاک کا انتظام بھی ہو) دو یا تین حصوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔

۴۔ دفاع کا مسئلہ ایسا نازک ہے کہ ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کرنا ممکن نہیں۔

۵۔ ہندوستانی ریاستیں تقسیم شدہ برطانوی ہند کے مختلف حصوں کے ساتھ تعلقات قایم نہیں رکھ سکتیں۔

۶۔ شمالی مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے درمیان سات سو میل کا فاصلہ ہے۔ اس فاصلے کی حفاظت بہ حالت جنگ و بہ صورت امن ہندوستان کے رحم پر ہے۔ اس واسطے ہندوستان کو اکھنڈ رکھنا ضروری ہے۔''

تقسیم ہند کے خلاف یہ عذر پیش کر کے مشن نے آخر میں صاف صاف لکھا ہے:

> ''ہم حکومت برطانیہ کو ہرگز یہ مشورہ نہیں دیں گے کہ وہ اختیارات کی باگ ڈور جو اس وقت برطانیہ کے ہاتھ میں ہے، تقسیم کر کے ہندوستان کی دو مختلف اور آزاد ریاستوں کے سپرد کردے۔''

مذکورۂ بالا عبارت واقتباس کو غور سے پڑھنے کے بعد اگر کوئی ستم ظریف یہ کہے کہ پاکستان کا فوری قیام اگرچہ منظور نہیں ہوا، لیکن پاکستان کا اصول تسلیم کرلیا گیا ہے، لہٰذا اب ہمیں مرکز کی عارضی حکومت میں شریک ہوجانا چاہیے تو اس کا یہ قول اس قابل نہیں کہ سنجیدہ لوگوں کی محفل میں اس کا ذکر بھی کیا جائے۔

مسلمانوں کو بہ طیب خاطر یا بہ جبر واکراہ یہ حقیقت تسلیم کرلینی چاہیے کہ مشن نے پاکستان کا اصول منظور نہیں کیا۔

مرکز:

مسلم لیگ کی ان قرارداد کی روشنائی ابھی خشک نہیں ہوئی، جن میں یہ بار بار کہا گیا تھا

کہ ہم ایک مرکز کو ہرگز قبول نہیں کریں گے اور لیگ کے بلند آہنگ لیڈروں کی وہ آواز بھی اب تک فضا میں گونج رہی ہے جس میں پیہم تکرار کے ساتھ یہ کہا گیا تھا کہ ہندوستان میں ایک مرکز خواہ وہ کسی صورت میں ہو ہم ہرگز قایم نہیں ہونے دیں گے۔ مشن نے فیصلہ کر دیا ہے کہ ہندوستان میں ایک مرکزی حکومت ہوگی جس میں برطانوی ہند کے نمایندوں کے علاوہ ریاستیں بھی شامل ہوں گی۔ اس حکومت کو قانون سازی کے اختیارات بھی حاصل ہوں گے اور مندرجہ ذیل محکمے اس کے سپرد ہوں گے:

۱۔ فوج

۲۔ معاملات خارجہ اور

۳۔ وسایل نقل و حمل۔

ان محکموں کے انصرام و انتظام کے لیے روپیہ فراہم کرنے کا اختیار، یہ کہنا بے کار سی بات ہے کہ جس مرکزی حکومت کو فوج اور معاملات خارجہ پر پورا اختیار ہو اس کے ہاتھ میں سارے ملک کی جان ہوتی ہے۔ فوج اور خارجہ پالیسی پر اقتدار حاصل کر لینے کے بعد ملک کی زندگی اور موت صرف مرکز کے ایک اشارے کی محتاج رہ جاتی ہے۔ مرکزی حکومت کی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کی تعداد مساوی نہیں ہوگی۔ اس مجوزہ دستور ساز اسمبلی میں برطانوی ہند کے نمایندوں کی کل تعداد ۲۹۲ ہوگی، جن میں مسلمانوں کی تعداد صرف ۷۸ ہے، ۹۳ نمایندے ریاستوں کی طرف سے شریک ہوں گے۔ جن میں غالباً ۸۰ غیر مسلم ہوں گے۔ ایسی مجلس دستور ساز سے توقع رکھنا کہ وہ مرکز میں مسلمانوں اور ہندوؤں کو مساوی حقوق دے گی خام خیال ہے۔ سب سے بڑا ظلم یہ ہوا ہے کہ مرکزی حکومت میں ریاستیں بھی شامل کر دی گئی ہیں۔ ریاستوں کی مجموعی آبادی دس کروڑ کے قریب ہے، جس میں بہ مشکل ایک کروڑ مسلمان ہوں گے۔ اتنی عظیم الشان غیر مسلم آبادی کو مرکزی حکومت کے ساتھ ملا کر برطانوی ہند کے مسلمانوں کے ساتھ حد درجے ناانصافی کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ریاستوں کا سیاسی رجحان بے انتہا خود غرضانہ اور رجعت پسندانہ ہے۔ اس زمانے میں ریاستوں کے نمایندوں کے ساتھ مل کر ترقی پسندانہ حکومت قایم نہیں ہو سکتی۔ ۱۹۲۵ء کے فیڈریشن میں مسٹر جناح کو ایک بہت بڑا اعتراض یہ تھا کہ اس میں ریاستیں شریک تھیں۔

صوبوں کی حلقہ بندی:

وزارتی مشن میں لے دے کے صوبوں کی حلقہ بندی ایک ایسی چیز ہے جس پر بعض نادان دوست گھی کے چراغ جلا رہے ہیں اور دانا دوست ماتم وشیون برپا کررہے ہیں۔ اسکیم کی اس حصے کے حسن وقبح پر بحث کرنے سے قبل ایک مسلم لیگی کی حیثیت سے ہمیں یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے کہ سیاسی منطق کی کسی بعید ترین تاویل سے بھی ہم اس حلقہ بندی کو پاکستان کا نام نہیں دے سکتے۔ یہ حلقہ بندی ایک بہت بڑا فریب ہے، جسے وزارتی مشن نے جال ہم رنگ زمین بنا کر مسلمانوں کے لیے بچھایا ہے۔ ایک صوبہ کسی خاص گروہ میں شامل بھی ہوسکتا ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے مان لیجیے کہ پنجاب، سرحد اور سندھ ایک گروہ میں شامل ہونا منظور کرتے ہیں۔ اب استقلال ملکی کا تقاضا یہ ہے کہ اس گروہ کو مرکز کے استبداد سے الگ ہونے اور ایک آزاد اور خودمختار مملکت کی صورت اختیار کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ وزارتی مشن نے اس چیز سے انکار کیا ہے۔

ہماری ذاتی رائے یہ ہے کہ اگر ایک مرتبہ لیگ نے کانسٹی ٹیوشن بنانے والی اسمبلی اور مرکز کی عارضی حکومت کی شرکت قبول کرلی تو ہم ایک ایسے جال میں گرفتار ہوجائیں گے جس کی بندشیں روز بہ روز سخت ہوتی جائیں گی اور ایک وقت ایسا آئے گا کہ استقلال قومی کا وہ تصور جسے قرارداد لاہور یا پاکستان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، ایک بھولا ہوا خواب بن کر رہ جائے گا۔ ممکن ہے کہ بعض لوگ یہ کہیں کہ مرکزی حکومت کے بغیر چارہ نہیں۔ ایسے خوش فہم حضرات کی خدمت میں گذارش ہے کہ اگر آپ مرکزی حکومت کے بغیر گزارہ نہیں کرسکتے تو کانگریس سے سمجھوتا کرنے میں آپ کو کیا عذر تھا۔ کانگریس نے ۱۹۴۴ء کی دونوں قرار دادوں میں اور پھر ستمبر ۱۹۴۵ء کی قرارداد پونا میں یہ کہا تھا کہ ہندوستان کا آئین فیڈرل ہوگا اور مرکز کے پاس صرف وہی اختیار ہوں گے جو صوبے اپنی رضامندی سے اس کی تحویل میں دینا پسند کریں گے۔ کانگریس نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر کوئی صوبہ مرکز کے تحت رہنا پسند نہیں کرے گا تو مرکزی حکومت بہ جبر اپنے ماتحت نہیں رکھ سکے گی۔ ہم نے کھلے لفظوں میں کانگریس کی اس قرارداد کو پاکستان کے منافی قرار دیا تھا۔ خدارا! بتایا جائے کہ آج ہم کس منہ سے وزارتی مشن کے فیصلے کو پاکستان کے مترادف قرار دے کر اور اس کو ایک صحیفہ آسمانی سمجھ کر آنکھوں سے لگانے کو تیار ہوسکتے ہیں۔

خاتمۂ سخن:

مجلس دستور ساز کے نمایندے جس طریق سے منتخب ہوں گے اس مجلس میں اس بات کا فیصلہ کرنا کہ آیا فلاں مسئلہ فرقہ وارانہ ہے یا نہیں، بنیادی حقوق اور اقلیتوں کے سوالات اور اس قسم کے بیسیوں پیچیدہ مسایل ہیں جن پر اس وقت بھی بے شمار اعتراض کیے جا سکتے ہیں اور جب دستور سازی کے دوران میں ان کا تصفیہ غیر مسلم اکثریت کے ناخن تدبر پر آ کر ٹھہر گیا تو یہ سارا ڈھانچہ ہمارے لیے ایک وبال بن جائے گا جس سے حسب منشا عہدہ برآ ہونا یا جس سے چھٹکارا پانا مشکل ہوگا۔ سردست اس مباحثے کو چھوڑ کر ایک خاص معاملے کی طرف اشارہ کیے بغیر اس مضمون کو ختم کرنا ممکن نہیں۔ اب تک ہم یہ سنتے آئے تھے کہ پاکستان کا سنگ بنیاد قرارداد لاہور ہے، کیوں کہ مسلم لیگ کے آئین میں اس قرارداد کو لیگ کا نصب العین تسلیم کیا جا چکا ہے۔ اب ۱۹ر مئی ۱۹۴۶ء کو جب وہ خط و کتابت شایع ہوئی جو مسلم لیگ کے صدر اور کانگریس کے پریذیڈنٹ اور وزارتی مشن کے درمیان ہوتی رہی ہے تو ہماری نظر سے وہ خط بھی گزرا جو مسٹر جناح نے مشن کو لکھا تھا اور جس میں انھوں نے لیگ کے وہ مطالبات درج کیے تھے جس میں وہ کانگریس سے تعاون کرنے کو تیار ہیں۔

ان مطالبات کے مطالعے سے پہلی بار یہ حقیقت واضح ہوئی کہ قرارداد کی تفسیر اور عملی طور پر پاکستان کی تعریف کیا ہے اور اگر ہندوستان میں پاکستان قایم ہوا تو لیگ کے نقطۂ نگاہ سے اس کی آئینی صورت کیا ہوگی۔ مسٹر جناح نے جو مطالبات درج کیے ہیں، ان میں ذیل کے نکات بہت اہم اور غور طلب ہیں:

"۱۔ ہندوستان میں ایک مرکزی حکومت ہوگی، جس کے پاس ایگزیکیٹو اختیارات ہوں گے اور دستور ساز اسمبلی نے منظور کیا تو اس حکومت کو قانون سازی کے اختیارات بھی مل جائیں گے۔

۲۔ اس مرکزی حکومت کی تحویل میں تین محکمے ہوں گے:

(الف) فوج (ب) معاملاتِ خارجہ (ج) وسایل نقل و حمل

۳۔ دستور ساز اسمبلی کو یہ اختیار بھی ہوگا کہ وہ ایسا قانون بنائے جس سے مرکزی حکومت کو روپیہ جمع کرنے کا حق مل جائے اگرچہ اسے ٹیکس لگانے کا حق نہیں ہوگا۔

۴۔ پاکستانی علاقے کا دستور بن جانے کے بعد ہر صوبے کو یہ حق ہوگا کہ وہ چاہے تو

پاکستان سے الگ ہو جائے۔ اس اختیار پر صرف اس صورت میں عمل ہو سکے گا جب کسی صوبے کی مجموعی آبادی کا بیشتر حصہ الگ ہونے کا خواہش مند ہو۔''

اس تمام بحث و تمحیص سے یہ بات بالکل واضح ہو گئی ہے کہ مسلم لیگ کے صدر محترم کے نزدیک پاکستان کی صحیح اور قابل عمل تعریف کیا ہے اور اب پاکستان کا نعرہ لگاتے وقت ہمارے سامنے قرار داد لاہور نہیں بلکہ جناح کا وہ خط ہوگا جس میں انھوں نے پاکستان کی تشریح کی ہے اور یہی خط آیندہ سیاسی گفت و شنید میں اسلامیان ہند کے متفقہ مطالبے کی حیثیت اختیار کرے گا جس میں ایک مرکز سے مراد اکھنڈ ہندوستان ہے دو اسمبلیاں نہیں ہیں۔'' (روز نامہ انقلاب - لاہور: ۶ / جون ۱۹۴۶ء، بہ حوالہ کاروانِ احرار۔ جلد ۷، ص ۲۱۱-۲۱۳)

مولانا غلام رسول مہر کی رائے:

روز نامہ انقلاب - لاہور نے مسلم لیگ کے اس فیصلے کے خلاف کئی مقالات لکھے تھے۔ ایک مقالۂ افتتاحیہ کے چند جملے یہ ہیں:

''اگر مرکز کو کسی شکل میں بھی قبول کرنا مسلمانوں کی سیاسی، اقتصادی، معاشرتی، تعلیمی اور ثقافتی بے حسی کا سر چشمہ اور ہندو راج کے قیام کا مقصد تھا تو اب اس میں سے پاکستان پیدا کرنے کی امیدیں کیوں کر صورت پذیر ہوں گی؟ ہائی کمان کے موجودہ فیصلے کے حامیوں کو یا تو اعتراف کرنا چاہیے کہ مسٹر جناح نے پہلے جو کچھ فرمایا تھا وہ صحیح نہ تھا۔ حال آں کہ ہمارے نزدیک وہ کاملاً صحیح تھا یا پھر یہ ماننا چاہیے کہ لیگ ہائی کمان نے اب جو فیصلہ کیا ہے وہ صحیح نہیں۔ دونوں چیزیں بہ یک وقت درست نہیں ہو سکتیں۔''

(روز نامہ ''انقلاب'': ۲۰ / جولائی ۱۹۴۶ء۔ علماے حق، ص ۴۱۱)

مولانا محمد میاں کا تبصرہ:

مولانا محمد میاں نے مسلم لیگ کے اس فیصلے پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:

''مختصر یہ کہ مسلم لیگ نے اپنے اجلاس مورخہ ۶ / جون ۱۹۴۶ء میں وزارتی مشن کی سفارشات منظور کرتے ہوئے نمایندہ اسمبلی کی شرکت منظور کر لی۔ یعنی

تقسیم ہند اور پاکستان کے مطالبے کو خیر باد کہتے ہوئے ایک یونین، ایک مرکز، ایک اسمبلی تسلیم کرلی۔ عام مسلمان جو پاکستان کو اسلامی حکومت سمجھ کر اس کے لیے جان قربان کرنے کا تہیہ کرچکے تھے، خود اپنے زعما کی اس کم زوری سے متاثر ہوئے اور لیگ کی طرف سے ایک گونہ بے اعتمادی پیدا ہونے لگی۔"

مسلم لیگ کونسل کا اجلاس:

۶/۵ر جون ۱۹۴۶ء: کانگریس ابھی حتمی طور پر کسی فیصلے پر نہیں پہنچی تھی کہ دہلی میں ۶،۵ر جون ۱۹۴۶ء کو مسلم لیگ کی جنرل کونسل کا اجلاس ہوا، جس میں قایداعظم نے ابتدائی تقریر کرتے ہوئے کہا:

"مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی نے وزارتی مشن کی تجاویز پر ٹھنڈے دل سے غور کیا اور اس پر بحث کی۔ اس کی خوبیوں اور برائیوں کو مسلم عوام کے زاویہ نگاہ سے پرکھا۔ اب یہ معاملہ کونسل میں پیش کردیا گیا ہے۔ کونسل کو صورتِ حال کی نزاکت کو سامنے رکھ کر اس اہم معاملے پر غور کرنا چاہیے اور ہر ممبر کو وزارتی مشن کی تجاویز پر حوصلے سے غور کرنا ہے اور پوری آزادی سے اپنا زاویہ نگاہ بیان کریں۔ معاملہ اس قدر اہم ہے کہ تمام ممبروں کو پوری طرح اس اہم مسئلے کی طرف متوجہ ہونا چاہیے اور نہایت آزادی سے اس پر بحث کریں تاکہ کوئی ایسا فیصلہ کیا جاسکے جو کہ مسلمانوں کے مفاد کے منافی نہ ہو۔"

اس کے بعد کونسل کا اجلاس چند گھنٹوں کے لیے ملتوی کردیا گیا۔ اس کے بعد کونسل کا جنرل اجلاس دوبارہ شروع ہوا۔ اس اجلاس کی کارروائی سر محمد یامین کی کتاب "نامۂ اعمال" حصہ دوم کے صفحہ ۱۱۲۳ تا ۱۱۲۹ سے ماخوذ ہے:

"۶ر جون ۱۹۴۶ء امپیریل ہوٹل نئی دہلی کی اوپری منزل کے بڑے ہال میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا جلسہ منعقد ہوا۔ نیچے نیشنل گارڈ اور والنٹیر متعین تھے کہ کسی شخص کو جو کونسل کا ممبر نہیں ہے اور اس کے پاس ٹکٹ داخلہ نہیں ہے اس کو سیڑھیوں پر نہ چڑھنے دیں۔ چوں کہ یہ خیال تھا کہ کانگریس کچھ لوگوں کو خاک سار بنا کر شور و شغب کرائے گی، ہال میں ایک پتلا سا مگر اونچا اسٹیج بنا تھا جس پر قایداعظم محمد علی جناح کرسیٔ صدارت پر بیٹھے، ان کے

بائیں طرف نواب زادہ لیاقت علی خان بہ حیثیت سیکریٹری مسلم لیگ بیٹھے۔ جس سمت میں لیاقت علی خان تھے اسی طرف نیچے پانچ چھ کرسیاں فرش پر ایک قطار میں بقیہ ہال کی طرف منہ کر کے بچھائی گئی تھیں۔ ان پر چند لوگ ہر ایک صوبے کے ایک ایک دو دو بٹھائے گئے، جن کو تیار کیا گیا تھا کہ وہ ریزولیوشن کی تائید کریں گے۔ باقی سب ممبران کی کرسیاں صدر جلسہ کی طرف منہ کر کے بچھائی گئی تھیں۔ تمام ہال کھچا کھچ کونسل کے ممبران سے جو تمام ہندوستان سے اس اہم جلسے میں شرکت کی غرض سے آئے ہوئے تھے، بھرا ہوا تھا۔

میں ہال کے بیچ میں ایک کرسی پر جا بیٹھا، جہاں سٹی مسلم لیگ کے صدر نصیرالدین ایڈووکیٹ بیٹھے تھے اور مجھ کو ہال میں آتا دیکھ کر اپنے پاس بلا لیا تھا۔ مجھ کو یہ بات ناپسند تھی جو کچھ دنوں سے وجود میں آگئی تھی کہ کارروائی شروع ہونے سے قبل قصیدہ خوانی ہو اور لیڈر کو مغل بادشاہ بنایا جائے اور ممبران درباری ہوں۔ چند خوش آمدیوں نے یہ طریقہ شروع کر دیا تھا۔ اس سے پارٹی کے لیڈر کا دماغ خراب ہو جاتا ہے اور وہ اپنے آپ کو بجائے پارٹی کا ایک فرد سمجھنے کے پارٹی سے بہت بالاتر اور اس کا حاکم سمجھنے لگتا ہے، جو اسلامی جمہوریت کے بالکل متضاد ہے۔ چوں کہ سخت گرمی تھی اس لیے اس پر وقت ضایع نہیں کیا گیا۔ صرف تلاوتِ قرآن ہوئی، اس کے بعد قایداعظم نے تقریر کی اور کہا کہ کیبنٹ مشن سے بہت گفت وشنید کے بعد یہ نتیجہ نکلا ہے جو کیبنٹ مشن کے بیان مورخہ ۱۶ر مئی میں ہے اور اس کی وضاحت بیان مورخہ ۲۵ر مئی میں ہے۔ اگرچہ پاکستان ہم کو نہیں دیا جا رہا لیکن اس کے برابر ہے اور اس کے لیے راستہ صاف ہوتا ہے۔ اس کے بعد نواب زادہ لیاقت علی خان نے مفصلہ ذیل ریزولیوشن پیش کیا جس کو ورکنگ کمیٹی آل انڈیا مسلم لیگ نے بنا کر اور منظور کر کے کونسل کی منظوری کے واسطے بھیجا ہے۔

ریزولیوشن:

(۱) کونسل آف انڈیا مسلم لیگ کی یہ میٹنگ کیبنٹ مشن اور وایسرائے کے بیان مورخہ ۱۶ر مئی و دیگر سرکاری کاغذات متعلقہ پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد اور ان امور کی اونچ نیچ اور اثرات کو سمجھنے کے بعد جو اس بیان میں ہیں اپنی رائے قوم کی رہبری اور ورکنگ کمیٹی کی ہدایت کے واسطے ریکارڈ کرتی ہے۔

(۲) یہ کہ اسٹیٹ منٹ مذکور کی دفعہ نمبر ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱ میں جس طرح مسلمانوں کے مطالبۂ پاکستان کا حوالہ دیا گیا ہے اور اس سے نتیجہ اخذ کیا گیا ہے وہ غیر ضروری، بے جا، غیر منصفانہ اور ناقابل یقین دہانی ہے اور سرکاری کاغذ جو برٹش گورنمنٹ کی طرف سے جاری کیا گیا اس میں اس کا اندراج نہیں ہونا چاہیے تھا ان فقرات میں واقعات کو توڑ پھوڑ کر ایسی زبانوں میں بیان کیا گیا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کیبنٹ مشن نے ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے یہ لکھے ہیں اور مسلمانوں کے جذبات کا قطعی خیال نہیں کیا۔

مزید یہ کہ ان فقرہ جات کا مضمون خود مشن کے بیان کے فقرے ۵ اور ۱۲ کے متضاد ہے۔ جس کو مشن تسلیم کرتا ہے اور حسب ذیل فقروں میں تحریر کرتا ہے:

اول: مشن اس بات سے کہ مسلمانوں کو جائز اور زوردار واقعات پر مبنی اندیشہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایک مستقل ہندوؤں کی اکثریت کا شکار نہ بنالیں بہت متاثر ہوا۔

دوم: یہ اندیشہ مسلمانوں میں اس قدر سرایت کر گیا ہے اور اسی قدر وسیع پیمانے پر پھیل گیا ہے کہ اس کو محض کاغذی کارروائی سے نہیں مٹایا جا سکتا۔

سوم: اگر ملک میں امن رکھنا ہے تو یہ ضروری ہے کہ ایسا آئین بنایا جائے جن میں ان کو پورا اختیار ان امور پر ہو جو ان کی تہذیب، مذہب، اقتصادیات اور دیگر مسایل کو قایم اور محفوظ رکھنے کے لیے ضروری ہیں۔

چہارم: مسلمانوں کو یہ اصل اور جائز اندیشہ ہے کہ ان کی تہذیب، پولیٹکل و سوشل زندگی ہندوؤں کی اکثریت میں غرق ہو جائے گی اگر اکھنڈ ہندوستان رہا۔

اس لیے ہر ایک کو متنبہ کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ مسلمانوں کا نظریہ اب بھی پاکستان ہے جو اٹل ہے اور جس کے حصول کے لیے وہ آخری دم تک جدوجہد جاری رکھیں گے اور کسی قربانی سے خواہ وہ کتنی ہی بڑی ہو گریز نہ کریں گے۔

(۳) باوجود ان غلط الفاظوں کے استعمال کے جو کیبنٹ مشن نے اپنے بیان میں کیے ہیں اور بغیر ان سے متاثر ہوئے اور آئین کی تبدیلی کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اور یہ سمجھتے ہوئے کہ کیبنٹ مشن کے بیان میں پاکستان کے آیندہ حصول کی بنیاد موجود ہے، چوں کہ صوبہ جات کو سیکشن ''بی'' اور ''سی'' میں شریک ہونا ضروری ہے۔ جس سے امید ہوتی ہے کہ آگے چل کر آزاد اور خود مختار پاکستان وجود میں آجائے گا اور دونوں بڑی قوموں

ہندوؤں اور مسلمانوں کو آزاد سلطنتیں مل جائیں گی اور دوسرے لوگوں کو بھی جو اس براعظم میں آباد ہیں۔

ان وجوہات کی بنا پر مسلم لیگ آئین ساز اسمبلی میں اس اسکیم کو مان کر شریک ہوگی۔ لیکن اس پر نظر رکھے گی کہ اگر موقع کا تقاضا ہوا تو صوبہ یا گروپ یونین سے علاحدہ کر لے گی جس کا کہ اشارتاً اسی اسکیم میں وعدہ ہے۔ مسلم لیگ آخری فیصلہ اس وقت کرے گی جب کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی اپنا کام ختم کر لے گی اور آئین کی اصلی صورت نکل آئے گی جو سیکشنوں سے گفتگو کے بعد ظاہر ہوگی۔ مسلم لیگ اس حق کو محفوظ رکھتی ہے کہ کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کے بننے کے دوران میں یا کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کی کارروائی کے دوران یا اس کے بعد اس سے علاحدہ ہو جائے۔ اگر اس کو یہ یقین ہو جائے گا کہ ان اصولوں کے خلاف کارروائی کی جا رہی ہے جو اوپر بیان کیے گئے ہیں۔

(۴) مرکز میں ایگزیکیٹو کونسل جو عارضی بنائی جانی تجویز ہے اس کی بابت یہ کونسل پریذیڈنٹ مسلم لیگ کو اختیار دیتی ہے کہ وہ وائسرائے سے اس معاملہ میں گفتگو کر کے مناسب فیصلہ کریں۔

اس ریزولیوشن کی تائید حاجی عبدالستار سیٹھ نے مدراس کی طرف سے، سید حسین امام و مسٹر محمد نعمان بہار سے، چودھری خلیق الزماں نے یوپی کی طرف سے کی۔"

مسلم لیگ نے پلان منظور کر لیا:

مسلم لیگ نے یوں ہی پلان منظور نہیں کر لیا تھا کہ جناح صاحب نے مسئلہ کونسل میں رکھا، ارکان کو آزادانہ غور و فکر کا موقع دیا اور رائے شماری کے بعد اعلان کر دیا گیا کہ پلان منظور ہے۔ جناح صاحب نے کونسل کے سامنے جس انداز و الفاظ میں مسئلے کو پیش کیا تھا اس میں ان کا ایما شامل تھا کہ اسے منظور کر لیا جائے۔ اس کے سوا مسئلے کا کوئی حل نہیں۔ آگے بارگیننگ کا راستہ بند ہے۔ کونسل نے اپنے قاید کے ایما کے مطابق منظوری کا فیصلہ دے دیا اور مخالف آرا جو سر یامین خاں اور مولانا حسرت موہانی جیسے اشخاص کی تھیں، یک سر نظر انداز کر دی گئیں۔ جہاں تک اس فیصلے کا تعلق ہے، ضابطے کے مطابق ہوا تھا اور اس کے لیے جو طریقۂ کار اختیار کیا گیا تھا، اس پر بھی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ سیاسی جماعتوں کے فیصلے اسی

طرح ہوتے ہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ مسٹر جناح کے ذہن کو کیسے بنایا گیا تھا اور انھیں اس فیصلے پر کس طرح آمادہ کیا گیا تھا؟ اس مسئلے پر ایچ ایم سیروائی نے اپنی کتاب ''تقسیم ہند — افسانہ اور حقیقت'' (ترجمہ و تدوین ڈاکٹر صفدر محمود۔ لاہور۔ ۱۹۹۰ء، دوسرا ایڈیشن) میں روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

پلان منظور کرنے کا پس منظر:

''مسلم لیگ کے کابینہ مشن پلان کو قبول کرنے کا ایک مخصوص پس منظر تھا جسے عام طور پر سمجھا نہیں گیا۔ جناح نے ۲۲ رمئی کو مسلم (لیگ) کونسل کے فیصلے سے قبل ایک بیان کے ذریعے پلان پر تنقید کی اور ۲۴ رمئی کو سر کرپس کے ہندوستان کے دورے کے درمیان پرائیویٹ سیکریٹری میجر ووڈرو دیاٹ نے جناح سے ملاقات کی۔ جناح سے گفتگو کے بعد اوران کا موڈ سمجھنے کے بعد ویاٹ نے جناح سے کہا کہ کیا یہ ممکن ہوگا کہ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی درج ذیل خطوط پر قرارداد پاس کرے:

''حکومت برطانیہ نے پاکستان کی خوبیوں پر رائے دے کر غیر مناسب حرکت کی ہے۔ انھیں کروڑوں لوگوں کے مطالبے کو مسترد کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ ان کا پاکستان کے بارے میں تجزیہ نہایت افسوس ناک تھا۔ لیکن مسلمانوں نے کبھی بھی کسی سے یہ توقع نہیں رکھی کہ وہ انھیں پاکستان دے دے گا۔ وہ جانتے ہیں کہ انھیں پاکستان اور اپنے زور بازو سے حاصل کرنا ہے۔ کیبنٹ مشن پلان میں دی گئی اسکیم نا قابل عمل ہے اور یہ کامیاب نہیں ہوسکتی۔ یہ جاننے کے باوجود کہ مشینری کام نہیں کرسکتی، وہ پلان کو قبول کریں گے، تاکہ وہ ثابت کریں کہ وہ اسے موقع دینا چاہتے ہیں اور وہ ہرگز اسے ناکام بنانے کی کوشش نہیں کریں گے، لیکن وہ اس بیان یعنی منصوبے کو پاکستان کی راہ پر پہلا قدم سمجھ کر قبول کریں گے۔''

یہ تجویز سن کر وہ (جناح) خوش ہوگیا اور اس نے کہا:

''تم میرا مدعا اچھی طرح سمجھ گئے ہو اور مجھے یقین ہے کہ مسلم لیگ ایسا ہی کرے گی۔''

ویاٹ کے جناح کے ساتھ انٹرویو کے بعد مشن اور وائسرائے نے ایک بیان جاری کیا، جس میں انھوں نے کہا کہ کانگریس کی گروپنگ کے بارے میں توضیح مشن کی سوچ کے مطابق نہیں ہے اس لیے یہ ناقابل قبول ہے۔ مشن نے واضح کیا کہ گروپنگ اس منصوبے کا ضروری حصہ ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے کانگریس کا عبوری قومی حکومت اور ڈومینین سطح کی کابینہ کا مطالبہ بھی مسترد کر دیا جس کا مطلب آزادی نکلتا تھا۔ ۶ر جون ۱۹۴۶ء کو مسلم لیگ کونسل نے ویاٹ کے اندازے کے مطابق ایک قرارداد کے ذریعے کابینہ مشن پلان قبول کر لیا اور ویاٹ کے بتائے ہوئے خطوط پر یہ ریزولیوشن پاس کیا، جس کا متعلقہ حصہ درج ذیل ہے:

''ان وجوہات کی بنا پر مسلم لیگ اسکیم منظور کر رہی ہے اور دستور ساز اسمبلی میں شرکت کرے گی۔ کابینہ مشن پلان میں صوبوں یا گروپوں کی یونین سے علاحدگی کا حق مضمر ہے، مسلم لیگ اس کے لیے مناسب موقع کا انتظار کرے گی۔ مسلم لیگ کے فیصلے اور بالآخر رویے کا انحصار دستور ساز اسمبلی کی کارکردگی اور ان دساتیر کی نوعیت (ہیئت) پر ہوگا جو یہ ادارہ مشترکہ طور پر اور اس کے تینوں سیکشن علاحدہ علاحدہ غور و خوض کر کے بنائیں گے۔ مسلم لیگ یہ حق رکھتی ہے کہ وہ دستور ساز اسمبلی کی پیش رفت اور کارکردگی کے پیش نظر کسی وقت بھی اپنے اس رویے پر نظر ثانی کر لے یا بدل لے۔ اگر بعد ازاں بھی حالات کا تقاضا ہو تو مسلم لیگ وفاقی اصولوں کے پیش نظر اور اپنے طے شدہ مقاصد کے حصول کے لیے اپنے رویے میں تبدیلی لا سکتی ہے۔''

(صفحہ ۷۷، ۷۸)

صدر مسلم لیگ کی برہمی:

۲۴ر مئی ۱۹۴۶ء: مسلم لیگ کے صدر مسٹر محمد علی جناح نے ایک بیان میں وزارتی مشن کے منصوبے پر سخت برہمی کا اظہار کیا ہے۔ انھوں کہا:

''مشن نے پاکستان کے مطالبے کو قبول نہیں کیا، بلکہ ہمارا مطالبہ رد کرنے کے سلسلے میں بہت سی فرسودہ اور مجہول وجوہات دی ہیں اور بہت گری ہوئی زبان استعمال کی ہے، جس سے ہندوستان کے مسلمانوں کو صدمہ پہنچا

ہے۔ مشن نے غالباً یہ حرکت کانگریس کی خوش نودی کے لیے کی۔"

مسلم لیگ کو راضی کرنے کی کوشش — حالات پر تبصرہ:

مسٹر جناح کے بیان (۲۳ر مئی) اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کی قرارداد (۲۴ر مئی) نے مشن اور وایسرائے گھبرا گئے تھے۔ کانگریس پر ان کا زور نہیں چل رہا تھا۔ اسے مطمئن کرنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ اس نے بڑے اہم اور مضبوط نکات اٹھائے تھے اور تضادات کی درست نشان دہی کی تھی۔ مشن کے پاس ان کا خاطر خواہ اور اطمینان بخش جواب نہ تھا۔ اب مشن کے پاس ایک راستہ رہ گیا تھا کہ کسی طرح مسلم لیگ کو راضی کر کے سبک سری سے بچا جائے اور سرخ روئی حاصل کی جائے۔ چناں چہ اور مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کرپس کے ذاتی معاون ووڈرو ویاٹ نے شملہ پہنچ کر مسٹر جناح سے ملاقات کی، جس کا احوال اس نے تحریری صورت میں محفوظ کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

> "مسٹر جناح اعصابی طور پر تھکے ہوئے تھے...... وہ اس پر بہت زیادہ پریشان تھے کہ کانگریس اور مشن کے درمیان رابطے کا نتیجہ منصوبے میں تبدیلی کی صورت میں رونما نہ ہو۔ ووڈرو ویاٹ نے مسٹر جناح کو تسلی دی کہ یہ غیر اغلب ہے کہ اس میں تبدیلی کی جائے۔ پھر مسٹر جناح نے کہا کہ مشن کا بیان قابل عمل منصوبہ نہیں ہے۔ جو انتظام پیش کیا گیا ہے وہ قابل عمل نہیں اور نہ ہی ہوسکتا ہے، کیوں کہ کانگریس کی طرف سے تعاون کا جذبہ مفقود ہے۔ مشن نے ابھی تک ہندوستان کی حالت کا صحیح اندازہ ہی نہیں لگایا یہاں سرجیکل آپریشن کی ضرورت ہے۔ اس بیان سے کوئی تصفیہ نہیں ہوسکتا۔ میں یہ خیال نہیں کرتا کہ برطانیہ کا ارادہ برا ہے لیکن اسے تجربے سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ سبق حاصل کرنے کے دو طریقے ہیں، یا تجربے کے ذریعے سے، یا پھر اس شخص سے نصیحت حاصل کرنے سے جو اس بارے میں کچھ جانتا ہے۔ اگر اس کا خیال ہے کہ مشن اس کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائے گا، تب وہ ان کو کچھ تجاویز دے گا کہ مشن کو کس طرح کارروائی کرنی چاہیے؟ اور بیان کو ایک طرف رکھ دے لیکن اسے بھروسا نہیں ہے کہ وہ مشن پر مکمل اعتماد کرسکے۔ میں نے انھیں یقین دلایا کہ مشن آپ کے

اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائے گا۔ یہ بات بہت زیادہ خلاف قیاس ہے کہ وہ اپنے
بیان کو کسی طرح بھی تبدیل کرے۔ یک دم اس نے کہا "اچھا! تب مجھے تجاویز
پیش کرنے کا کوئی فایدہ نہیں" ویاٹ کہتا ہے کہ وہ جو تجویز پیش کرنے کے
خواہش مند تھے اور جس کے لیے راز داری کے متمنی تھے ان کا نظریہ یہ تھا کہ
برطانیہ ہندوستان کو ایک مرکز کے تحت اکٹھے رکھنے کے لیے بندھنی قوت
(Binding Force) کے طور پر پندرہ سال کے لیے یہاں مقیم رہے۔
خارجہ اور ڈیفنس کے امور پر پاکستان اور ہندوستان کے وزرائے اعظم سے
مشورہ کرنے کے بعد قدم اٹھائے۔"

اسٹینلے وول پرٹ لکھتا ہے کہ جناح کے نقطۂ نظر سے یہ معقول حل دکھائی دیتا ہے،
اس سے بہت ہی کم تباہی ہوگی اور تمام ہندوستانیوں کو زیادہ استحکام اور ضمانت حاصل ہوگی،
خاص طور پر اقلیتوں کو۔ عوام کے سامنے انھیں اس کے اظہار کی جرأت نہیں ہوئی۔ میجر
ویاٹ کے مطابق وہ مشن منصوبہ پر مسلمانوں کے ابتدائی شدید ردِ عمل سے سخت پریشان
تھے۔ دوسرے یونین گورنمنٹ سے اتفاق کرنے کے مسئلے پر انھیں پریشانی لاحق تھی۔ ان کا
کہنا تھا کہ پہلے حصے کا باقی منصوبے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، اس کے ابتدائیہ کی وجہ سے
زیادہ مشکلات پیدا ہوگئی ہیں۔ منصوبے کے بعض پہلوؤں پر رائے زنی کرتے ہوئے انھوں
نے کہا:

(الف) صوبوں کے مسلمان گروپس کو مرکز اور دوسری جگہوں پر مساوی نمایندگی
نہیں دی گئی۔

(ب) آئین ساز اسمبلی میں مسلمانوں کو حقیقی تحفظ فراہم نہیں کیا گیا، کیوں کہ اس کا
چیئرمین ہندو ہوگا، جب تک مسلمان یہ اعتراض نہ کریں کہ چیئرمین کا انتخاب فرقہ وارانہ
مسئلہ ہے۔ اس صورت میں آئین ساز اسمبلی کا فوراً خاتمہ ہو جائے گا۔

(ج) ریاستوں کا مسئلہ بہت زیادہ مبہم ہے۔

(د) صوبوں کو دس سال بعد علاحدگی کا حق نہیں دیا گیا، حال آں کہ کانگریس نے
ہمیشہ اس کی حمایت کی ہے اور اس مرتبہ شملہ میں اس نے کوئی اعتراض بھی نہیں کیا۔

(ہ) یونین کو مالیات کے لیے اختیارات دیے گئے ہیں۔ یہ فرقہ وارانہ مسئلہ نہیں ہے

جو کم از کم شعبے یونین گورنمنٹ کی تحویل میں دیے گئے ہیں ان کے علاوہ بھی مرکز کے لیے ٹیکس نافذ کرنا ناگزیر ہوگا۔

میجر ویاٹ نے مسٹر جناح کو گفتگو میں پوری طرح جانچ لیا تھا۔ اب اس نے مسٹر جناح کا ہم درد بن کر بڑی مکاری سے گفتگو کا آغاز کیا اور مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کی طرف سے ممکنہ ریزولیوشن پاس کرنے کے بارے میں استنسار کیا۔ پھر میجر ویاٹ نے خود ہی ریزولیوشن تجویز کرنا شروع کر دیا۔

''برطانوی حکومت نے اپنے اعلان میں پاکستان کا مجملاً تذکرہ کر کے تجاوز کیا ہے۔ کروڑوں عوام کی خواہش کو مسترد کر دینا اس کے دائرۂ اختیار میں نہیں۔ پاکستان کے بارے میں اس کا تجزیہ شرم ناک ہے۔ مسلمانوں نے کسی سے پاکستان ملنے کی توقع نہیں رکھی ہے، وہ جانتے ہیں کہ اسے اپنے قوت بازو سے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مشن کے بیان میں جو اسکیم دی گئی ہے۔ وہ ناقابل عمل ہے، چل نہیں سکتی ہے، یونین گورنمنٹ کام نہیں کر سکتی، آئین ساز اسمبلی کام نہیں کر سکتی، لیکن یہ ظاہر کرنے کے لیے وہ اسے آزمانا چاہتے ہیں۔ حال آں کہ وہ جانتے ہیں کہ یہ نظام کام نہیں کر سکتا وہ اسے قبول کر لیں گے اور بلاوجہ سبوتاژ کرنے کی کوشش نہیں کریں گے...... بلکہ وہ بیان کو پاکستان کی شاہ راہ پر پہلے قدم کے طور پر تسلیم کر لیں گے۔''

میجر ویاٹ لکھتا ہے کہ مسٹر جناح میری باتیں سن کر خوشی میں آپے سے باہر ہو گئے اور کہا ''ہاں! یہ بالکل درست ہے، تم سمجھ گئے ہو۔'' وائٹ مزید لکھتا ہے کہ مجھے پورا یقین ہے ''مسلم لیگ یہی کچھ کرے گی۔''

مسٹر جناح کے لیے ایک اور مشن:

میجر ویاٹ نے اپنے نوٹ میں لکھا کہ عبوری حکومت میں شمولیت پر رضامندی کی صورت میں مسٹر جناح اس میں مسلم لیگ کے لیے مساوی نمایندگی طلب کرے گا۔ آئین ساز ادارے کے قیام کے بارے میں مسٹر جناح کے صحیح صحیح خیالات جاننے کے لیے وائسرائے کے ایک معاون مسٹر بی این راؤ کو متعین کیا گیا۔ مسٹر راؤ نے جناح سے شملہ میں

ملاقات کی (۳۰ رمئی) اس کی رپورٹ مسٹر راؤ نے مسٹر ایبل کو انتہائی خفیہ بھیجی۔ یہ ایک گھنٹہ کی گفتگو کا لب لباب تھا۔ مسٹر راؤ لکھتا ہے:

''پہلے تو میں نے مشن منصوبہ کے حوالے سے مسٹر جناح کو مبارک باد دی کہ آپ کو اپنے مطالبۂ پاکستان کا ۸۰ فیصد مل گیا ہے'' یہ سن کر مسٹر جناح مسکرائے اور بولے ''کیا تم ایسا سمجھتے ہو۔'' میں نے جواب دیا ''ایک غیر جانب دار منصف کے طور پر میں ایسا ہی خیال کرتا ہوں۔'' مسٹر راؤ نے اس ابتدائی گفتگو کے ذریعے ساز گار ماحول پیدا کر لیا۔ وہ خود کہتا ہے کہ اس کے بعد میں نے اپنی گفتگو کا رخ اپنے اصل مقصد کی طرف موڑا، جس کی خاطر میں یہاں آیا تھا۔ میں نے مسٹر جناح سے سوال کیا ''مرکز میں آئین سازی کا کام کرنے کے لیے ادارے کے قیام کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟'' مسٹر جناح نے جواب دیا ''میں نے ان معاملے پر غور نہیں کیا۔ در حقیقت میں اس کا کوئی جواب نہیں دے سکتا، جب تک کہ لیگ کونسل اپنے اجلاس میں ابتدائی مسایل کے بارے میں فیصلہ نہیں کر لیتی، لیکن میرا خیال ہے کہ وایسرائے اس مسئلے کے لیے با اختیار ہے وہ اسے خود کرے گا۔'' مسٹر راؤ نے جواب دیا۔ ''شاید وہ عبوری حکومت میں شامل دونوں پارٹیوں سے مشورہ کرے گا۔'' مسٹر جناح نے اس پر کہا ''ہاں! یہ درست ہے، وہ دونوں پارٹیوں سے مشورہ کرے گا لیکن فیصلہ اس کا اپنا ہوگا۔'' مسٹر راؤ کہتا ہے ''میں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔''

''تب مسٹر جناح نے ایبل کے میرے بارے میں خوب گفتگو کی لیکن مسٹر راؤ نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ پھر مسٹر راؤ نے استفسار کیا کہ نئے آئین میں ریاستوں کے بارے میں ان کی رائے کیا ہے؟ مسٹر جناح نے جواب دیا۔ پہلے ہمیں برطانوی ہند میں اپنے معاملات درست کرنے ہوں گے، ریاستوں کے مسئلے پر مغز کھپانے کے لیے بہت وقت ہوگا۔ بعد میں مسٹر راؤ نے آسام کا تجزیہ کیا اور کہا کہ آسام کے اکثر باشندے مسلم یا ہندو بنگال سے علاحدہ رہنے کے خواہش مند ہوں گے۔

مسلم لیگ سے تیسرا رابطہ:

ادھر شملہ میں مسٹر جناح سے رابطوں کا سلسلہ جاری تھا۔ ادھر دہلی میں مسلم لیگ کے جنرل سیکریٹری کو بھی مایل کرنے کی کوششیں ہو رہی تھی۔ یہ کام وایسرائے کے ذاتی معاون

مسٹر آئی ڈی اسکاٹ کے سپرد ہوا۔ اس نے نئی تکنیک اختیار کی۔ نواب زادہ لیاقت علی خان کو رات کے وقت مدعو کیا۔ نواب زادہ لیاقت علی خان کی خوب تواضع کی۔ پہلے تو جنز (GINS) کے دو بڑے پیگ پیش کیے اور بعد میں وہسکی، ''جب مقدس پانی اندر گیا تو سچائی باہر آنے لگی۔'' اسکاٹ لکھتا ہے۔ ''وہ ذرا کھلا'' (Heloosened up a bit) اس نے مسلم لیگ کے سیکریٹری جنرل کو اس کیفیت میں دیکھا تو عبوری حکومت میں شمولیت کے مسئلے پر نواب زادہ کو ٹٹولنا شروع کیا۔ نواب زادہ لیاقت علی خان نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا کہ وہ عبوری حکومت میں شامل ہونے کے خواہش مند ہیں لیکن اندیشہ یہ ہے کہ کہیں مسلم لیگ نے وزارتی مشن منصوبہ منظور کرلیا اور کانگریس نے مسترد کردیا تو وائسرائے صاف جواب دے دے گا۔'' ''آپ کا بہت بہت شکریہ۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی پیش کش سے استفادہ نہیں کرسکتا۔''

نواب زادہ لیاقت علی خان نے ضمانت طلب کرلی:

لیاقت علی خان نے مسٹر اسکاٹ سے پوچھا۔ ''کیا لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے اجلاس سے قبل مسٹر جناح کو یقین دہانی کرائی جاسکتی ہے کہ اگر لیگ نے منصوبہ منظور کرلیا اور کانگریس نے مسترد کردیا تو لیگ کو ایگزیکیٹو کونسل میں اپنے کوٹے کی سیٹوں کو پر کرنے کا اختیار ہوگا! اور کانگریس کے رویے کو خاطر میں نہیں لایا جائے گا؟'' مسٹر اسکاٹ نے جواب دیا ''ایسا واقعتاً ہوگا۔'' ساتھ ہی اس نے الٹ صورت دکھا کر فضا کو مایوس کن بنادیا کہ لیگ کے رد کرنے اور کانگریس کے قبول کرنے کی حالت میں ایسی ہی یقین دہانی ہم کانگریس کو کرانے سے صاف انکار کرچکے ہیں، کیوں کہ یہ مسلمانوں کے مفادات کے لیے شدید خطرناک ہوگا اور درحقیقت اس کا مطلب یہ ہوگا کہ لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں رہے گا کہ اگر اس نے کانگریس کے ہاتھوں اسٹیم رولنہیں ہونا تو جھک جائے اور اسے قبول کرلے۔ لیاقت علی خان نے اسکاٹ کی رائے سے اتفاق کیا اور کہا ''کیا وائسرائے مخفی طور پر بھی مسٹر جناح کو ضمانت نہیں دے سکتا؟ کہ لیگ کے قبول کرنے اور کانگریس کے مسترد کرنے کی صورت میں لیگ کو اس کے حصے کی سیٹیں حاصل کرنے کی دعوت دی جائے گی۔ اگر اس قسم کی ضمانت مل جائے تو اس سے ہمیں احتجاج کرنے کے

ساتھ ساتھ مشن منصوبہ کی منظوری کی قرارداد پاس کرانے میں کافی سہولت میسر آجائے گی۔"
اس پر مسٹر اسکاٹ نے لیاقت علی خان سے کہا "میں وایسرائے کو اس سے مطلع کروں گا۔"
اسکاٹ لکھتا ہے کہ گفتگو کے دوران میں یہ بھی واضح ہوا کہ مسلم لیگ نئی ایگزیکیٹو کونسل میں کانگریس کے ساتھ مساوی نمایندگی کی توقع رکھتی ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ کانگریس نے شملہ میں اس فارمولے کو تسلیم کرلیا تھا۔ دوسری طرف مجھے بھی ہوراک الیگزینڈر کے ذریعے معلوم ہوا کہ کانگریس مساوی نمایندگی کے فارمولے پر عمل درآمد کے لیے بالکل تیار ہے، لیکن مستقبل میں بہ طور اصول کے اس کی پابندی قبول نہیں کرے گی۔
بی ای بی ایبل وایسرائے کو لکھتا ہے: "مشن کے بارے میں میں جو کچھ سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر کانگریس اسکیم کو منظور کرتی ہے اور لیگ نامنظور کرتی ہے تو عبوری حکومت قایم کرنے کی کوشش کی جائے گی، اس میں کانگریس کے علاوہ ایسے مسلمان مل جائیں گے جو اس میں شامل ہونے کے لیے رضامند ہوں اور ہمیں اسکیم کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اس سوال کو حل کرنا مشکل ہے کہ لیگ کو کانگریس کے بغیر ایگزیکیٹو کونسل میں شامل ہونے کی اجازت دی جائے! میں یہ نہیں سمجھتا کہ ہم نے اس وقت کوئی وعدہ کیا ہوا ہے کہ لیگ کو بغیر کانگریس کے حکومت سونپ دی جائے۔ ایسی حکومت کو موجودہ حکومت کی نسبت زیادہ شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا۔
وہ اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ جناح ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ سے قبل ملاقات کا خواہش مند ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں یہ مشن کے لیے بہت اچھا ہے۔ اس اہم مسئلہ پر آیا ہم کسی ایک پارٹی کے ساتھ جائیں گے، ہمیں کہنا چاہیے کہ ہم کسی پارٹی سے قطعی وعدہ نہیں کرسکتے۔ ہم پارٹیوں کی شرایط کا جایزہ لیں گے، جو وہ اسکیم کو قبول کرنے کے بارے میں لگائیں گی۔ ہماری نیت یہ ہے کہ جو پارٹی بھی اسکیم کو قبول کرے اسے اس فیصلے کی وجہ سے نقصان نہ پہنچے۔ ایبل کہتا ہے "اس نوع کی ضمانت جناح کو مطمئن کردے گی۔"

ویول کی پریشانی:

اسکاٹ اور ایبل کے نوٹس نے ویول کو پریشان کردیا۔ کیوں کہ یہ اس کی توقع سے

زیادہ برعکس تھے۔ اس نے ان نوٹس اور دیگر ذرایع کی اطلاعات کی روشنی میں ۱۲ر جون کو جو تجزیہ کیا اس سے اسے درپیش مشکلات کی نشان دہی ہوتی ہے۔ چناں چہ وہ اپنے اس انتہائی خفیہ تجزیے میں لکھتا ہے کہ اگر مسلم لیگ کی عبوری حکومت یا آئین ساز اسمبلی میں شمولیت اختیار کرنے سے انکار کی صورت میں سلسلہ منقطع ہوتا ہے اور لیگ ناممکن العمل شرایط عاید کرتی ہے، کانگریس بلاشبہ ہم سے ان کے بغیر پیش رفت کی توقع رکھے گی اور وزیراعظم کے بیان کا حوالہ دے گی۔ اگر ہم اس کی توقعات پر پورے نہیں اترتے تو وہ ہم پر بے ایمان ہونے کا الزام لگائیں گے اور مجھے ایک دم بحران کے پیدا ہونے کی توقع ہے..... ہمیں مسلم لیگ کو آگاہ کر دینا چاہیے کہ ہم ہندوستان کو آزادی دے رہے ہیں، آپ کی ضد بازی کے باوجود، ہندوؤں کی بالادستی قایم کرنے میں کانگریس سے تعاون کرنے کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں۔ اسی طرح ہم مسلم لیگ کے مکمل پاکستان کے قیام کے لیے مدد کرنے کا عزم نہیں رکھتے۔ ہمیں کانگریس کو اس کے بار بار کے دعاوی کے حوالے سے یاد دلانا چاہیے کہ ملک کے ان حصوں کو آزاد کر دیا جائے گا جو اس کے خواہش مند ہوں گے، اور مسلم اکثریتی علاقوں پر برطانیہ کی حکم رانی جاری رہے گی، یہی اس کے بریک ڈاؤن پلان کی روح تھی، وہ کسی نہ کسی طرح اور کسی نہ کسی حصے پر برطانوی کنٹرول جاری رکھنا چاہتا تھا۔

پھر آئین سازی کے مسئلے کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے۔ ''اگر کانگریس انکار کرتی ہے اور مسلم لیگ راضی ہوتی ہے تو اس سے کانگریس میں بائیں بازو کو تقویت ملتی ہے۔ اس صورت میں ہمیں گروپ ''بی'' اور ''سی'' کے آئین ساز اداروں کو کام کرنے کی اجازت دے دینی چاہیے۔ میرا خیال ہے ہمیں گروپ بندی پر مضبوطی سے قایم رہنا چاہیے۔ اگر صوبہ سرحد اور آسام آئین ساز ادارے میں اپنے نمایندے بھیجنے سے انکار کریں تو ان کے بغیر بھی آئین سازی کا کام ہونا چاہیے۔ باقی ہندوستان کی صوبائی اسمبلیوں کو ہم دعوت دیں کہ وہ ہندوستان کی آئین ساز اسمبلی کے لیے اپنے نمایندے منتخب کریں جو صوبوں کے آئین کا فیصلہ کریں اور گروپ بندی کا اگر ان کی خواہش ہو تو، اس پلان کا اصل مطلب مرکز کو معطل کر کے صوبوں اور گروپوں کے آئین کو چلا کر آزمانا ہے۔ لارڈ ویول کا یہ منصوبہ ملک کو تقسیم کرنے کی دانستہ کوشش تھی۔ اب تک تو ڈھیلے ڈھالے ہی سہی، مرکز کا تصور قایم تھا اس کے اختیارات کے بارے میں بحث ہو رہی تھی، نمایندگی میں برابری کے مسئلے پر

اختلاف تھا لیکن یونین گورنمنٹ کے قیام کے مسئلہ پر تو اتفاق تھا۔ اب لارڈ ویول نے تجربہ کرنے کے نام پر نیا شوشہ چھوڑ دیا۔ مرکزی حکومت کے قیام کے لیے مضحکہ خیز نظریہ پیش کیا کہ یہ سرکاری افسران پر مشتمل بنادی جائے۔ کانگریس کے بغیر لیگ کے نمایندے اس میں شریک کرنا مناسب نہ ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ویول اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔ جب ہی تو وہ جو ۱۹۴۶ء میں سو سال پرانے طریقے سے ہندوستان پر بیوروکریسی کے ذریعے حکومت کرنا چاہتا تھا۔ حال آں کہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس خواہش کو عملی جامہ نہیں پہنایا جاسکتا۔ ابھی اس کی سیاہی بھی خشک نہ ہونے پائی تھی کہ اس نے اپنے ڈرافٹ کے اس حصہ میں تبدیلی کی اطلاع مشن کے اراکین کو دی (۳رجون)۔ اس تبدیلی کا اصل مقصد مسلم لیگ کی خوش نودی حاصل کرنا تھا کیوں کہ آج ہی مسٹر جناح کی ملاقات وایسرائے سے متوقع تھی۔ وایسرائے کے نائب ذاتی معاون مسٹر ایبل نے مسٹر ٹرن بل کو مطلع کیا کہ لارڈ ویول چاہتے ہیں کہ ایگزیکیٹو کونسل کے بارے میں پیرا کو یوں پڑھا جائے۔ ''میں عبوری حکومت میں مسلم لیگ کے رہنماؤں کا تقرر کروں گا اور وہ محکموں کا معقول حصہ حاصل کریں گے، تاہم کونسل میں ان کی بالادستی قایم نہیں ہوگی اور وہ اقلیت میں ہی رہیں گے۔''

اس ترمیم کے ذریعے دراصل ویول نے مسلم لیگ کے لیے منصوبہ منظور کرلینے کی راہ ہموار کردی۔ ایبل کے مطابق لارڈ ویول کو اطلاع ملی تھی کہ مسٹر جناح آج (۳رجون) کی متوقع ملاقات میں اس پر زور دیں گے۔ اس بنا پر وایسرائے اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ لیگ کے ساتھ تعاون کرنے سے محض اس لیے انکار نہیں کرسکتا کیوں کہ کانگریس نے عبوری حکومت میں شامل نہ ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔

مسٹر جناح کی شملہ سے دہلی آمد اور سیاسی سرگرمیاں:

مسٹر جناح دوسری شملہ کانفرنس میں شمولیت کے لیے شملہ گئے تھے۔ دن رات کی بھاگ دوڑ سے ان کی صحت مزید بگڑ گئی تھی، چناں چہ انھوں نے کانفرنس کے اختتام پر آرام اور بہ حالی صحت کے پیش نظر مزید کچھ دن شملہ میں قیام کرانے کا فیصلہ کیا۔ ابھی وہ زیادہ ستانے بھی نہ پائے تھے کہ ۱۶رمئی کے اعلان سے ان کے اعصاب مزید متاثر ہوئے، چناں چہ وہ غور و خوض اور صحت کی سراغ رسانی کی غرض سے مئی کے آخر تک شملہ میں قیام

پذیر رہے اور جون کے ابتدائی ایام میں دہلی تشریف لائے کہ مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی اور کونسل کے اجلاس ہونے والے تھے جن میں گروپ اسکیم پر غور اور فیصلہ ہونا تھا۔

وائسرائے سے ملاقات:

ویول لکھتا ہے مسٹر جناح صبح دس بجے ان سے ملنے آئے۔ وائسرائے کا تاثر تھا کہ مسلم لیگ عبوری حکومت میں شامل ہونے پر تیار ہو جائے گی۔ چناں چہ انھوں نے مسٹر جناح سے مسلم لیگی ممبروں کی لسٹ مانگی، مسٹر جناح نے انکار کر دیا کہ پہلے وہ اس مسئلے پر کونسل سے مشورہ کر لیں۔ تب مسٹر جناح نے مولانا آزاد کی وائسرائے کے ساتھ خط و کتابت کے بارے میں پوچھا۔ وائسرائے نے اس خط کی نقل مسٹر جناح کو دکھادی جو انھوں نے ۳۰ رمئی کو مولانا آزاد کو لکھا تھا۔ انھوں نے سوائے اس کے مزید تبصرہ نہیں کیا کہ کانگریس ہمیشہ جھگڑا کرتی ہے اور مراعات مانگتی ہے۔ پھر انھوں نے یونین قانون ساز ادارے میں مسلم لیگ کو مساوی نمایندگی نہ ملنے کی شکایت کی اور اس پر اصرار کیا۔ حال آں کہ میں نے یونین کے مسئلے پر اتفاق کر کے بہت بڑی رعایت دی ہے۔ اس ابتدائی گفتگو کے بعد مسٹر جناح نے اپنا رخ اصل معاملے کی جانب پھیرا۔ ''اگر کانگریس انکار کر دے اور مسلم لیگ شامل ہونے کا فیصلہ کرے تو آپ کیا کریں گے؟'' ویول لکھتا ہے کہ میں اس سوال کی پہلے ہی توقع رکھتا تھا اور میں نے اپنے پرائیویٹ سیکریٹری کے ذریعے سیکریٹری آف اسٹیٹ سے قبل از وقت مشورہ کر رکھا تھا۔ چناں چہ ویول نے فوراً جواب دیا ''مسلم لیگ کو یقین کرنا چاہیے کہ وہ خسارے میں نہیں رہے گی، اگر وہ مشن منصوبے کے مطابق کام کرنے کے لیے تیار ہو۔'' ویول کہتا ہے مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کا اجلاس آج شام چھ بجے ہو رہا تھا، مسٹر جناح نے اس سے زیادہ تعین کے لیے کچھ اور کی خواہش ظاہر کی۔ مسٹر جناح کے مطابق اس کے لیے تحریر ورکنگ کمیٹی میں مددگار ثابت ہوگی۔ اس پر وائسرائے نے جواب دیا ''وہ مشن کے مشورہ کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔'' تب جناح نے کہا ''مسئلہ بڑی اہمیت کا حامل ہے کچھ کریں۔'' میٹنگ ختم ہوگئی۔

گیارہ بجے وائسرائے کی مشن کے ارکان سے ملاقات ہوتی ہے۔ اس نے مسٹر جناح سے اپنی گفتگو کا احوال بتایا اور جناح کے...... ''بڑی اہمیت کے حامل مسئلے پر کچھ

کرنے کی استدعا'' مشن تک پہنچائی۔ ویول لکھتا ہے ''مجھے جناح کو زبانی یقین دہانی کرانے کی اجازت مل گئی، اگر وہ منظور کرتی ہے اور کانگریس نامنظور۔''

چار بجے جناح سے ملاقات کا وقت مقرر تھا۔ چناں چہ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد وائسرائے نے پہلا کام یہ کیا کہ جناح کے لیے ضمانت نامہ تیار کروایا۔ جس میں لکھا تھا ''اگرچہ وزارتی مشن آپ کو تحریری یقین دہانی نہیں کرا سکتا کہ موجودہ مذاکرات کی ناکامی کی صورت میں کیا لائحہ عمل اختیار کیا جائے گا۔'' میں مشن کی جانب سے آپ کو ذاتی یقین دہانی کراتا ہوں کہ ہم کسی پارٹی کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں کریں گے۔ ہم اس پر عمل درآمد شروع کر دیں گے، لیکن ہم امید کرتے ہیں کہ دونوں پارٹیاں منصوبے کو منظور کر لیں گی۔'' وائسرائے نے ان سے کہا ''مجھے آپ پر بھروسہ ہے کہ یقین دہانی کو عام مشتہر نہ کریں گے، اگر ضروری ہوا تو صرف اپنی ورکنگ کمیٹی کو بتادیں کہ آپ اس نقطے پر مطمئن ہیں۔'' یہ تحریر مسٹر جناح کو دکھائی، انھوں نے اس پر اطمینان کا اظہار کیا اور وائسرائے نے یہ تحریر اٹھا کر اپنے فائل میں رکھ لی۔ شام کے اجلاس میں جناح نے اراکین ورکنگ کمیٹی کو اس نکتے پر اپنے اطمینان سے مطلع کیا۔

اگرچہ مسٹر جناح وائسرائے کی یقین دہانی پر مطمئن ہو گئے تھے اور اس کا اظہار انھوں نے ورکنگ کمیٹی میں بھی کیا تھا، لیکن وائسرائے کو اس پر اطمینان خاطر نہ تھا۔ شاید اسے یہ بھی گمان ہو کہ ورکنگ کمیٹی مسٹر جناح کے اطمینان پر مطمئن نہ ہو اور پیش رفت نہ ہو سکے، منصوبہ مسلم لیگ کی طرف سے دھرے کا دھرا رہ جائے۔ چناں چہ اس نے ممکنہ اندیشہ ہائے دور دراز کے پیش نظر مشن کے اراکین سے مشورہ کیے بغیر مسٹر جناح کو راز داری سے (Confidential) ذاتی مراسلہ لکھا۔ معلوم ہوتا ہے وائسرائے رات بھر سو نہیں سکا۔ چناں چہ اس نے ۴؍جون کو ایک ایسا قدم اٹھایا جس پر اس کا ضمیر مطمئن نہ تھا اور اس کا اخلاقی جواز نہ تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس قدر اہم اقدام کا ذکر اس نے اپنی ڈائری میں نہیں کیا اور مخفی رکھا، لیکن ٹرانسفر آف پاور دستاویز نے اس راز داری کا پردہ چاک کر دیا اس سے وائسرائے کی مسلم لیگ کی طرف داری اور وفاداری صاف ظاہر ہوتی ہے۔ اس رازدارانہ مکتوب میں اس نے زبانی یقین دہانی کو تحریری صورت میں مسٹر جناح کو بھیجا، تاکہ ورکنگ کمیٹی میں انھیں درپیش متوقع مشکلات سے نجات مل جائے اس نے ۳؍جون کے مسودہ

(جو اس نے اپنی فائل میں رکھ لیا تھا) کی ابتدائی سطر سے یہ الفاظ خود حذف کر دیے۔

''وزارتی مشن آپ کو تحریری یقین دہانی نہیں کرا سکتا......''

''میں وزارتی مشن کی جانب سے آپ کو ذاتی طور پر یقین دہانی کراتا ہوں.....''
باقی تمام تحریر کو جوں کا توں ہی رہنے دیا۔ اس سے مسٹر جناح کی مشکل یقیناً کم ہوگی۔ ورنہ تو مشن منصوبے کے خلاف عامتہ المسلمین کا ردِعمل ان ٹیلی گراموں سے ظاہر ہے جو مسٹر جناح کو ملک بھر سے شملہ میں موصول ہوئے۔ مسٹر جناح واقعی ان سے گھبرائے ہوئے تھے۔

مشن منصوبے پر مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی اور کونسل کی کارروائی کی تفصیل دوسری جگہ پر دی گئی ہے، لیکن جب اس مسئلے پر دونوں جگہوں میں ممبران نے اعتراض کیا تو ''مسٹر جناح نے ان کو اعتماد میں لے کر وہی جواب دیا۔ چناں چہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے جو قرارداد مشن منصوبہ کی منظور کی۔ وہ ہو بہو اس طرح تھی جیسا کہ مسٹر ووڈ رو ویاٹ نے انھیں شملہ میں بھجایا تھا۔ جس کا ذکر پچھلے صفحات میں گزر چکا ہے۔ مشن منصوبے کی ابتدا میں پاکستان کے بارے میں جو منفی تجزیہ کیا گیا ہے اس کی قرارداد میں شدید مذمت کی گئی ہے۔ قائد اعظم نے اپنی تقریر میں کونسل کو ہدایت کی کہ ''میں مشن منصوبے کو رَدّ کرنے کا مشورہ نہیں دے سکتا۔ میرا مشورہ ہے کہ اسے قبول کر لیا جائے۔'' کونسل نے اس پر قرارداد کی منظوری دے دی۔ اس طرح مسٹر ووڈ رو ویاٹ کا شملہ کا سفر کامیابی سے ہم کنار ہوا۔

اس کی منظوری کے ساتھ ہی مسلم لیگ نے ۲۳ر مارچ ۱۹۴۰ء کی قرارداد لاہور سے انحراف پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ اب اس کے نزدیک متحدہ ہندوستان میں ہی مسلمانوں کا دین، مذہب، تاریخ، ثقافت اور روایات محفوظ ہو گئے تھے اور انھیں کوئی خدشہ نہ رہا تھا۔ نہ ہی اب ''اسلام خطرے میں'' رہا تھا، جس کے لیے گذشتہ کئی برسوں سے واویلا کیا جا رہا تھا اور مسلمانوں کے مذہبی جذبات اور خیالات کا استحصال ہو رہا تھا۔

مشن منصوبہ، مسلم لیگ کی قبولیت پر مولانا آزاد کا تبصرہ:

اس مسئلے پر مولانا نے اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''کانگریس اور مسلم لیگ کا کیبنٹ مشن پلان کو منظور کرنا، ہندوستان کی آزادی کی تاریخ کا ایک شان دار واقعہ تھا۔ اس سے یہ ثابت ہوا تھا کہ ''ہندوستانی آزادی کا پیچیدہ معاملہ گفتگو اور مفاہمت کے

ذریعے طے پایا، نہ کہ تشدد اور جنگ کے ذریعے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ فرقہ وارانہ مشکلات قطعی طور پر ماضی کی داستان بن گئی ہیں۔ سارے ملک میں شادمانی کا احساس تھا اور تمام لوگ آزادی کے مطالبے میں متحد ہو گئے تھے۔''

(ابوالکلام آزاد اور قوم پرور مسلمانوں کی سیاست: ص ۵۳-۳۴۴)

تبصرۂ مزید:

یہ تھی مولانا کی اسکیم جس کی بنیاد پر وزارتی مشن نے ہندوستان کے مستقبل کی عمارت تعمیر کی اور اس کی تفصیلات تیار کیں جسے کانگریس اور مسلم لیگ نے بہ سروچشم قبول کیا۔ مسلم لیگ کا اس پر مطمئن ہونا زیادہ اہم اور تاریخی واقعہ ہے کہ اسے اس پلان میں مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے فرقہ وارانہ مسایل کا اطمینان بخش حل نظر آیا، اندیشے اور خطرات ختم ہوئے اور مسلمانوں کے مفادات کو آئینی تحفظ مل گیا۔ یہی وجہ تھی کہ مسلم لیگ نے مسلمانوں کے لیے علاحدہ وطن کے قیام کے مطالبے سے دست کشی اختیار کر لی اور ہندوستان کے اتحاد پر اتفاق رائے ظاہر کیا۔ اس اسکیم کے دو پہلو تو مولانا آزاد کے تجویز کردہ تھے۔ اس کا تذکرہ اسکیم کے پیرا نمبر ۱۲ میں بھی کیا گیا ہے کہ کانگریس نے ایک اسکیم پیش کی ہے جس کے مطابق صوبوں کو مکمل خود مختاری ہوگی اور مرکز کے پاس صرف تین محکمے خارجہ امور، دفاع اور مواصلات ہوں گے۔

(الف) ہندوستان آزاد ہوگا، متحد رہے گا اور اس کا آئین وفاقی طرز کا ہوگا۔

(ب) مرکز کے پاس صرف تین محکمے ہوں گے۔ ان میں دفاع، خارجہ امور اور مواصلات کے شعبہ جات شامل ہوں گے۔

مشن نے اپنے پلان میں ایک نئے پہلو کا اضافہ کیا۔ اس کے مطابق ملک کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ مشن کے ممبروں کا خیال تھا کہ اس انتظام سے اقلیتوں کے دلوں میں زیادہ اطمینان اور اعتماد پیدا ہوگا۔ مسلمان اقلیت مکمل طور پر مطمئن ہو جائے گی اور لیگ کے تمام خدشات دور ہو جائیں گے۔

گروپوں کی تشکیل حسب ذیل طریقے پر ہونا تھی:

گروپ ''اے'' یوپی، بہار، سی پی، اڑیسہ، بمبئی اور مدراس کے صوبوں پر مشتمل تھا۔ اس میں ۱۶۷ اور ۲۰ مسلمان نمائندے رکھے گئے تھے۔ ایک ایک نمائندہ دہلی، اجمیر اور

کورگ کے علاقوں سے لیا جاتا تھا۔

گروپ ''بی'' میں پنجاب، سرحد اور سندھ کے صوبے شامل تھے، اس میں ۲۲ر مسلمان، ۹ر ہندو، اور ۴ر سکھ، کل ۳۵ر ممبروں کو شامل ہونا تھا، اس میں ایک نمائندہ بلوچستان سے بھی لیا جاتا تھا۔

گروپ ''سی'' بنگال اور آسام کے صوبوں پر مشتمل ہونا تھا۔ اس میں ۳۶ مسلمان اور ۳۴ ہندو نمائندے ہونے تھے۔

دستور ساز اسمبلی میں متذکرۂ بالا نمائندگی برطانوی ہندوستان کو حاصل ہونا تھی جب کہ ۹۳ نمائندے ریاستوں سے شامل کیے جانا تجویز کیا گیا تھا۔

برطانوی ہندوستان کے علاقوں سے نمائندوں کا انتخاب صوبائی اسمبلیوں نے متناسب نمائندگی کی بنیاد پر واحد قابل انتقال ووٹ کے ذریعے کرنا تھا۔ تمام نمائندوں کو دہلی میں جلد از جلد جمع ہونا تھا اور کاروبار مملکت چلانے کے لیے دستور وضع کرنا تھا۔ اگر اس انتظام پر عمل درآمد ہوتا اور بہ وجوہ ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا (جس کا ذکر آگے آئے گا) تو یہ صورت موجودہ پاکستان سے کہیں بہتر ہوتی، کیوں کہ گروپ ''بی'' میں پورا پنجاب شامل ہوتا اور اس صورت میں کشمیر کے لیے اس گروپ میں شامل ہونے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہ ہوتا۔ پورا بنگال اور پورا آسام گروپ ''سی'' میں ہوتے۔ یہ انتظامات ابتدائی طور پر دس برسوں کے لیے تھے، اس کے بعد کوئی گروپ مرکز سے اور کوئی صوبہ گروپ سے علاحدہ ہونے کا آئینی اختیار رکھتا تھا۔

مسلم لیگ نے اسکیم کو منظور کیا تھا اور مسلمانوں کے لیے علاحدہ وطن کے مطالبے سے دست بردار ہوگئی تھی۔ اس منصوبہ کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ فرقہ وارانہ مسئلہ یا قانون وفاقی دستور یہ میں پیش نہیں ہوسکتا تھا، یہ مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کو زبردست آئینی تحفظ حاصل تھا۔ بالفاظ دیگر یہ اسکیم پاکستان سے بہت زیادہ مفید تھی بلکہ دس سال کا قلیل عرصہ گزر جانے کے بعد تو یہ اسکیم ۱۵ر اگست والے پاکستان سے ہر اعتبار سے بہتر، افضل اور اعلا تھی، کیوں کہ دس برس گزرنے پر ''بی'' اور ''سی'' گروپ مرکز سے علاحدگی اختیار کرنے کا آئینی حق استعمال کرتے تو اس پاکستان میں پورا بنگال پورا آسام، پورا پنجاب اور کشمیر شامل ہوتے۔ اس کا سہرا مولانا ابوالکلام آزاد کے سر ہے جنھوں نے [illegible] کے فرقہ وارانہ

سنگین مسئلے کے حل کی بنیادیں فراہم کیں اور کیبنٹ مشن نے اسے حکّ و اضافہ کے ساتھ پیش کیا۔ مسلم لیگ کونسل کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے قایدِ اعظم نے کہا تھا:

''اقلیتوں کے مسئلے کا جو حل اس میں پیش کیا گیا ہے اس سے زیادہ منصفانہ کوئی اور فیصلہ نہیں ہوسکتا۔ بہ ہر حال وہ اس سے بہتر شرایط نہیں منوا سکتے۔ انھوں نے کونسل سے کہا۔ کیبنٹ مشن نے جو تجویزیں پیش کی ہیں وہ زیادہ سے زیادہ ہیں جنھیں وہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اس بنا پر انھوں نے مسلم لیگ کو مشورہ دیا کہ اسکیم منظور کرلے اور کونسل نے اتفاق سے اس کے حق میں رائے دی۔''

چودھری خلیق الزماں کے مطابق پلان پر غور کرنے کے لیے مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ جس میں ممبران نے اپنی رائے ظاہر کی۔ مسٹر جناح اس مسئلے پر بالکل کھلا ذہن رکھتے تھے وہ رقم طراز ہیں:

''مسٹر جناح نے ہر ممبر سے پلان کے بارے میں رائے طلب کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس معاملے میں بالکل کھلا ذہن رکھتے تھے۔ ورکنگ کمیٹی میں اس کے خلاف کوئی آواز بلند نہیں ہوئی اور تمام ممبران نے اسے قبول کرلینے پر اتفاق کیا۔ اجلاس کے خاتمے پر مسٹر جناح نے مجھے قرارداد تیار کرنے کو کہا جسے میں نے تیار کیا۔''

جب منصوبہ بہ وجوہ ناکام ہوگیا تو اس موقع پر مسٹر جناح نے نہایت افسردگی اور یاس کے ساتھ تقریر کی جس کا تذکرہ چودھری محمد علی نے اپنی تصنیف میں کیا ہے:

''مذاکرات کے دوران میں مسلم لیگ انصاف کے جذبے سے سرشار رہی۔ حتیٰ کہ سارے ہند کی آزادی کی خاطر اس نے آزاد و خودمختار مملکت پاکستان کو بھی کانگریس کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا۔ لیگ نے رضا کارانہ طور پر اتحادیہ ہند کو تین امور تفویض کیے، بلکہ یہ مراعات دے کر لیگ نے اعلا درجے کی سیاست اور تدبر کا ثبوت دیا۔''

جنوری ۱۹۴۷ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سکریٹری جنرل نواب زادہ لیاقت علی خان نے ایک موقع پر وایسرائے ہند لارڈ ویول سے کہا تھا:

''مسلم لیگ ہی وہ واحد فریق ہے جس نے خلوصِ دل سے کابینہ مشن

پلان منظور کیا۔"

اگر چہ مسلم لیگ نے ۲۹ر جولائی ۱۹۴۶ء کو اس سے دست کشی اختیار کر لی لیکن اس پر عمل درآمد کی آخر وقت تک خواہش مندرہی، کیوں کہ اسکیم مسلم لیگ کے مطالبۂ پاکستان سے بدرجہا بہتر وارفع تھی۔ یہ مولانا ابوالکلام آزاد کی سیاسی بصیرت، فراست، دانش اور شہ دماغ کا کمال اعجاز تھا کہ ہندوستان کے نہایت ہی گنجلک فرقہ وارانہ مسئلے کا قابل قبول اور قابل عمل حل ڈھونڈ ھ نکالا۔ جس پر دو شدید متحارب سیاسی جماعتیں مسلم لیگ اور کانگریس متفق ہو گئے اور تیسرا فریق حکومت برطانیہ بھی اس انتظام پر مطمئن تھا۔ چودھری خلیق الزماں فرماتے ہیں کہ "یہ فارمولا تو مسلم لیگ نے ۱۹۲۴ء میں، علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء اور خود انھوں نے ۱۹۳۹ء میں پیش کیا تھا۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس وقت اتفاق رائے کیوں نہ ہوا؟ مسلم لیگ اور کانگریس میں اختلافات کی خلیج وسیع سے وسیع تر کیوں ہوتی چلی گئی؟ تا آں کہ مسلم لیگ نے مسلمانوں کے لیے علاحدہ وطن کا مطالبہ کیا۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ یہ تمام تجاویز بالکل سطحی، نامکمل اور غیر واضح تھیں۔ فریقین مبہم تجاویز پر کس طرح مطمئن ہو سکتے تھے؟ لہٰذا انھیں لائق اعتنا نہ سمجھا گیا۔ جوں ہی مولانا آزاد نے مثبت، واضح اور ٹھوس صورت میں بنیادیں فراہم کیں۔ مسلم لیگ اور کانگریس نے اس پر صاد کر دیا۔ مسلم لیگ تقسیم ملک کے مطالبے سے دست بردار ہو گئی اور ہندوستان کو متحد رکھنے پر اتفاق رائے کر لیا۔

وائسراے کے نام مسٹر جناح کا خط:

۸ر جون ۱۹۴۶ء: مسٹر جناح نے ۸ر جون کو بھی وائسراے ہند کو ایک خط لکھا تھا جس میں پوری قوت سے کہا تھا:

> "آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ممکن ہے کانگریس اپنے کوٹے میں کسی مسلمان کو شامل کر کے ایک تکلیف دہ رویہ اختیار کرے۔ اس لیے میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ وہ ہماری راہ میں بڑی رکاوٹ ہوگی۔"

(قومی آواز: یکم جولائی ۱۹۴۶ء، جلد ۱، ص ۱۶۸۔ انجام: ۲ر جولائی ۱۹۴۶ء، جلد ۱۷، ۱۵۴)

۱۹ر جون ۱۹۴۶ء: ۱۹ر جون کو بھی مسٹر جناح نے وائسراے اور وزارتی مشن کے نام ایک مختصر خفیہ خط بھیجا تھا جو معنی خیز طور پر کسی نہ کسی طرح اخبارات میں شائع ہو گیا، مسٹر

جناح نے اس میں کہا تھا:

''مسلم لیگ یہ ہرگز برداشت نہیں کرسکتی کہ عارضی حکومت میں کوئی غیر لیگی مسلمان شامل کیا جائے۔ یہ ہمارا بنیادی اصول ہے اور ہم اس کو پس پشت نہیں ڈال سکتے۔'' (انصاری: ۱۸/اکتوبر ۱۹۴۶ء)

وزارتی مشن کی تجاویز پر جمعیت علما کا تبصرہ:

۱۰ تا ۱۲/جون ۱۹۴۶ء: ۱۶/مئی ۱۹۴۶ء کو وزارتی مشن نے اپنی جو تجاویز ہندوستان کے سیاسی اور فرقہ وارانہ مسئلے کے حل کے لیے پیش کی تھیں، ان پر غور کرنے کے لیے جمعیت علماے ہند کی مجلس عاملہ کا ایک اہم اجلاس حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی کے زیرِ صدارت دفتر جمعیت علماے ہند۔ دہلی میں ۱۰، ۱۱، ۱۲/جون ۱۹۴۶ء کو منعقد ہوا۔ مجلس عاملہ نے طویل بحث و مذاکرہ کے بعد ذیل کی تجویز کے ذریعے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے:

''جمعیت علماے ہند کی مجلس عاملہ کا یہ جلسہ وزارتی مشن کی شایع کردہ تجاویز پر اپنے خیالات کا حسب ذیل اظہار کرنا ضروری سمجھتا ہے۔

وزارتی مشن نے ہندوستان کو یہ حق دیا ہے کہ وہ اپنی حسب منشا قانون بنانے کے بعد آزاد ہے کہ چاہے برطانوی کامن ویلتھ میں شریک رہے اور چاہے اپنی مکمل علاحدگی کا اعلان کردے۔ یہ اعلان و اظہار وزارتی مشن کی طرف سے اس کی نیک نیتی کا اطمینان دلانے کے لیے کافی تھا مگر مشن کی طرف سے ہندوستان کی مختلف جماعتوں کو قانون بنانے کا موقع دینے میں جو صورت اختیار کی گئی اور جو راستہ تجویز کیا گیا وہ مختلف و متعدد شبہات کا مرکز ہے ہم مشن کے اعلان کے متعلق بعض ضروری چیزیں کہہ دینا ضروری سمجھتے ہیں۔

(۱) وزارتی مشن کی اسکیم میں ہندوستانی حکومت کی تقسیم قبول نہیں کی گئی اور پاکستانی وغیر پاکستانی علاقے قائم نہیں کیے گئے۔ یہ بات ہندوستان اور مسلمانوں کے لیے مفید ہے، نیز مشن کی اسکیم میں مرکز کے پاس صرف ضروری اور لازمی مضامین کا ہونا تسلیم کیا گیا ہے۔ جو جمعیت علما کی رائے تھی اور جو مناسب اور صحیح ہے۔ مگر اس کے ساتھ گروپنگ سسٹم کا قیام اور صوبوں کے حق خود ارادیت کے خلاف صوبوں کو جو باہمی عارضی جوڑ لگایا گیا ہے، یہ بات خواہ قابل عمل قرار پائے یا نہ پائے اور مستقل حیثیت اختیار کرے یا نہ کرے لیکن اس

سے صرف ایک ہی بات حاصل ہو سکتی ہے کہ یہ حیلہ جو طبیعتوں کے لیے نفتنے کا ذریعہ بن سکتا ہے اور اس کے ذریعے سے افتراق انگیزی کو مدد مل سکتی ہے۔

(۲) رائے دہی بالغان کے طریقے سے انتخاب کر کے منتخب شدہ اشخاص کی کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی بنانے کو ترک کر دیا گیا۔ حال آں کہ بہتر اور منصفانہ طریقہ وہی تھا اور اس کے لیے جو عذر بیان کیا گیا وہ قابل اعتبار نہیں ہے۔

(۳) عارضی حکومت ایسے اصول و اختیارات کے ساتھ قایم ہونی چاہیے جو مکمل حکومت خود اختیاری کا نمونہ ہو۔

(۴) عارضی حکومت کی نمایندگی میں ہندو مسلم مساوات کا اصول اختیار کرنا چاہیے۔ پارٹیوں یا جماعتوں کی نمایندگی کا اصول اختیار نہیں کرنا چاہیے۔

(۵) اہم فرقہ وارانہ معاملات کے بارے میں مشن نے تحفظ کی جو صورت تجویز کی ہے اس کے متعلق یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ چوں کہ یہ بنیادی معاملہ ہے اس لیے اس کا نفاذ مرکزی مجلس اور صوبہ جاتی مجالس میں یک ساں ہونا چاہیے۔

(۶) اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ جب چیئرمین کسی فرقہ وارانہ اختلافی مسئلے میں فیڈرل کورٹ سے مشورہ کرے گا تو وہ کورٹ کے فیصلے کا پابند ہوگا۔"

(ضمیمہ، جمعیت علما کیا ہے؟: جلد۲، صفحہ ۳۴-۴۳)

شیخ الاسلام مولانا مدنی کا ردِ عمل:

۱۸ر جون ۱۹۴۶ء: وزارتی مشن کا فارمولا جناح صاحب نے مان لیا اور اپنی منظوری سے وائسرائے کو مطلع کر دیا۔ اسے عام طور پر لیگ کے حلقے میں پسند نہیں کیا گیا اور پاکستان کے مطالبے سے جناح صاحب کی غیر سنجیدگی اور فرار قرار دیا گیا۔ مولانا حسرت موہانی کے اس معاملے میں جذبات بہت شدید تھے۔ حضرت شیخ الاسلام نے اسے لیگ کی انگریز پرستی سے تعبیر کیا ہے اور اپنے بیان میں حسرت موہانی مرحوم کے بیان سے استدلال کیا ہے۔ حضرت فرماتے ہیں:

"لیگ کی انگریز پرستی کے واقعات ابتدا سے بے شمار واقع ہوتے رہے ہیں۔ مرتب مکالمہ ❶ کہاں تک ان پر پردہ ڈالتا ہوا مسلمانوں کی آنکھ میں دھول ڈالنے کی کوشش کرے گا! کیا ان تمام کوششوں میں مسٹر جناح پیش پیش نہیں تھے؟ دور کیوں جائیں، ابھی

وزارتی ڈیلی گیشن کی تجاویز پر لیگ کا مہر قبولیت ثبت کر دینا کیا انگریز پرستی اور اس کے اشاروں پر چلنے کا کھلا ہوا مظاہرہ نہیں ہے؟ کہاں طلب پاکستان کے بلند آواز ہنگامے، اور وہ شوراشوری، اور وہ کنونشن کانفرنس میں اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ ..... الآیۃ، کے ماتحت عہد نامے، وہ ہلاکو اور چنگیز کے دریائے خون بہا دینے کے آوازے! کہاں یہ ایک بے اقتیار یونین کی قبولیت!! اور بے معنی و بے اختیار تین گروپوں کی قرارداد کا مان لینا اور یہ کہہ دینا کہ پاکستان کی بنیاد ہم کو حاصل ہوگئی ہے اس سے بڑھ کر بھی انگریز کے اشاروں پر چلنے اور مسلمانوں کو دھوکا دینے کی کوئی نظیر ہوسکتی ہے؟ العجب العجب! اسی بنا پر مولانا حسرت موہانی جو کہ لیگ کے بہت سرگرم کارکن ہیں اور اسی کے ٹکٹ پر یوپی اسمبلی میں کامیاب ہوئے ہیں، لیگ کے پروپیگنڈا الیکشن میں شہر شہر پھرتے ہیں۔ عین کونسل کے جلسے میں اور اس کے بعد دوستوں کی مجلس میں فرمایا:

''ہم نے اسلام کو دھوکا دیا ہے، ہم نے مسلمانوں کو دھوکا دیا ہے، ہم نے قرآن کو دھوکا دیا ہے، ہم نے اپنے نفس اور پروردگار کو دھوکا دیا ہے، کیا یہی پاکستان ہے جس کا حلف دہلی میں اٹھایا گیا تھا۔''

حضرت شیخ الاسلام کا بیان قومی آواز۔ لکھنؤ کی اشاعت مورخہ ۱۸/ جون ۱۹۴۶ء سے نقل کیا ہے، جو ''جب لیگ نے کابینی تجاویز کو منظور کیا تو حسرت نے کہا.....'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اس پر ایڈیٹر قومی آواز نے لکھا تھا:

''یہ ہے مسلمانوں کی رائے عامہ۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس فیصلے کا استقبال صرف ان مسلمانوں نے کیا ہے جو آج تک انگریزی عہد حکومت میں خوشامد پرستی کے نقطۂ عروج پر تھے اور آج کانگریسی حکومتوں کی خوشامد کر کے نفع اندوزی کی اسکیمیں بنا رہے ہیں۔''

مرتب ''مکالمۃ الصدرین'' غور فرمائیں اور اس مصرعے کو بار بار پڑھیں۔

وهل يصلح العطار ما افسد الدهر!

من زخوباں چشم نیکی داشتم
خود غلط بود آں چہ من پنداشتم

حاشیہ ❶: مولوی محمد طاہر قاسمی مکالمۃ الصدرین۔

پنڈت نہرو کے بیان کی وضاحت:

۲۵ر جون ۱۹۴۶ء: کانگریس نے کابینہ مشن منصوبہ کو بچانے کے لیے ایک مرتبہ پھر اپنے پہلے ریزولیوشن کا اعادہ کیا، جو اس نے ۱۹ر جون ۱۹۴۶ء کو منظور کیا تھا۔ تاکہ پنڈت جواہر لال نہرو کے بیان (۱۰ر جولائی ۱۹۴۶ء) سے پیدا ہونے والے شبہات سے لیگ کا دل صاف ہو۔ ریزولیوشن کے پیرا نمبر ۲ میں بالکل صاف لکھا ہے ''کمیٹی اس بات کو واضح کرنا چاہتی ہے کہ اس نے اسکیم کو پورا پورا تسلیم کرلیا ہے۔'' آخر میں کہا ہے ''کانگریس اس فیصلے پر قایم ہے اور اس کے مطابق دستور ساز اسمبلی میں کام کرے گی۔'' یہ ریزولیوشن بنیادی طور پر مولانا آزادؔ کی تحریک اور کاوش سے منظور ہوا تھا۔ کیوں کہ ان کے نزدیک ''کابینہ مشن منصوبہ سے روگردانی کا مطلب ہندوستان کی تباہی تھا۔'' چناں چہ انھوں نے بلا کم و کاست کہا کہ کانگریس کی رائے کو اس کا صدر بھی بدلنے کا مجاز نہیں ہے۔ کانگریس کے صدر نہیں چاہتے تھے کہ ریزولیوشن میں ان کے بیان (۱۰ر جولائی) کا ذکر کرکے کانگریس لاتعلقی ظاہر کرے۔ ان کے نزدیک اس سے کانگریس کی سبکی ہوتی تھی۔ پندت نہرو کی ان خواہش اور اس کے اظہار کا تذکرہ ''انڈیا ونس فریڈم'' کے ایڈیشن ۱۹۵۹ء میں نہیں ہے۔ ں کا انکشاف تیس صفحات کی اشاعت سے ہوا ہے۔ ۱۹۸۸ء ایڈیشن کے مطابق ان کا ستدلال تھا:

> اگر ورکنگ کمیٹی اس بات کا اعادہ کرنا چاہتی ہے کہ کانگریس کیبنٹ مشن پلان منظور کرچکی ہے تو انھیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ لیکن اگر ورکنگ کمیٹی نے یہ قرارداد پاس کی کہ کانگریس کے صدر کا بیان کانگریس کی پالیسی کی ترجمانی نہیں کرتا تو یہ بات کانگریس اور خود اُن کے لیے پریشانی کا باعث ہوگی۔''
>
> (انڈیا ونس فریڈم (اردو)۔ کراچی ۱۹۹۷ء: ص ۲۴۲)

مسٹر جناح کو اس قدر شدید اور ناقابل واپسی بیان دینے کا حق نہ تھا۔ کونسل جو جماعت کا سب سے بڑا ادارہ تھا اس نے انھیں یہ اختیار نہ دیا تھا۔ بلکہ ۲۹ر جولائی کے ریزولیوشن نمبر ایک پیرا نمبر ایک کے آخر میں صاف اور واضح طور پر لکھا ہے ''اگر واقعات یں تبدیلی ہوئی تو کونسل بھی اپنے رویے پر نظر ثانی کرکے اس میں تبدیلی کرے گی۔'' یہ ختیار کونسل نے اپنے ہاتھ میں رکھا تھا۔ صدر کو تفویض نہیں کیا تھا۔ کانگریس کا موجودہ

ریزولیوشن (۸ر اگست ۱۹۴۶ء) اپنے الفاظ اور معانی و مطالب کے اعتبار سے پچھلے ریزلیوشن (۲۵ر جون ۱۹۴۶ء) کی نسبت زیادہ واضح، جامع اور فصیح و بلیغ تھا۔ اس سے صورت حال میں یک سر تبدیلی رونما ہو گئی تھے۔ مسلم لیگ کی قرارداد کے مطابق اس پر غور اور نظر ثانی کے لیے کونسل کا اجلاس بلایا جانا چاہیے تھا۔ تاکہ کونسل نئے سرے سے جایزہ لیتی اور اس کی روشنی میں فیصلہ کرتی، لیکن مسلم لیگ کے صدر اور سکریٹری صاحبان نے کونسل کے فیصلے پر عمل درآمد نہ کر کے جمہوری اصولوں کے منافی غیر صحت مند روایت کا اضافہ کیا۔ دراصل مسلم لیگ کے صدر پر کانگریس سے مفاہمت نہ کرنے اور ہندوستان کو متحد نہ رکھنے کے لیے بمبئی کی تاجر برادری کا زبردست دباؤ تھا اور مسلم لیگ کی اعلا قیادت اسے برداشت نہ کر سکتی تھی۔ وہ ایسے اقدامات اور بیان بازی پر مجبور ہوتی رہی جس کا اختیار ورکنگ کمیٹی اور کونسل نے نہیں دیا تھا۔ تاکہ ۱۶ر مئی کا فارمولا کامیابی سے ہم کنار نہ ہو۔ اگر مسٹر جناح کونسل کا اجلاس بلا کر اسے نئی صورت حال پر نظر ثانی کی دعوت دیتے تو ممکن تھا کہ کونسل اپنے سابقہ فیصلے پر غور کر کے نیا لائحۂ عمل طے کرتی، کانگریس سے مفاہمت کی راہ اختیار کرتی اور در پیش مسایل کو گفتگو کے ذریعے پر امن طور پر طے کرنے کا فیصلہ کرتی۔ غالباً اسی صورت حال سے بچنے کے لیے کونسل کا اجلاس نہیں بلایا گیا بلکہ اس کے برعکس مسلم لیگ کے صدر نے ۱۶ر اگست ۱۹۴۶ء کو ''ڈایریکٹ ایکشن ڈے'' منانا ہی ضروری خیال کیا۔ سر محمد یامین رقم طراز ہیں: ''لیکن کوئی پروگرام نہیں بنایا۔'' حال آں کہ ریزولیوشن میں ورکنگ کمیٹی کو پروگرام بنانے کی واضح ہدایت کی گئی تھی۔ ''وہ ڈایریکٹ ایکشن کے لیے پروگرام تیار کرے گا تاکہ ریزولیوشن میں بیان کردہ پالیسی پر عمل کیا جا سکے اور مسلمانوں کو اس لڑائی کے واسطے تیار کیا جائے جو ضرورت پڑنے پر لڑی جائے گی۔'' مسلم لیگ کی اعلا قیادت تجربہ کار نہ تھی، اس نے کوئی پروگرام نہ بنایا اور اس کے بغیر ہی مسلمانوں کو محاذ آرائی کی آگ میں جھونک دیا۔ جیسا کہ مسٹر جناح نے خود اقرار کیا تھا۔ ''یہ مسلم لیگ کی تاریخ اور روایت کے برعکس فیصلہ تھا۔'' دراصل مسلم لیگ ایجی ٹیشن کی سیاست کی شدید مخالف ہو گی۔ سر سید احمد خاں اسے مسلمانوں کے لیے مہلک خیال کرتے تھے۔ جس جماعت کا خمیر ہی ایجی ٹیشن کی سیاست کے خلاف اٹھایا گیا ہو وہ اپنے اصل سے کٹ کر کس طرح کامیاب کردار ادا کر سکتی ہے؟

مسلم لیگ کونسل کا اجلاس نظر ثانی کے لیے بلانا اس لیے بھی ضروری تھا کہ پہلا فیصلہ تو جذباتی تھا۔ کونسل اور مسلم لیگ کی قیادت مسلمانوں کے مراعات یافتہ طبقے پر مشتمل تھی۔ انگریزی حکومت کا شاید ہی کوئی خطاب یافتہ مسلمان زمین دار، جاگیردار، خان، وڈیرا، تمن دار، سر، نواب، خان بہادر، نواب بہادر وغیرہ ایسا ہو جس نے لیگ کے شجر سایہ دار کے نیچے پناہ نہیں لی۔ مسلم لیگ نے انھیں ایک نئی راہ پر سفر شروع کرنے کی دعوت دی جو ان کی تاریخ، روایات، مزاج، مفادات اور سماجی کردار سے بالکل مختلف بلکہ متصادم تھا۔ اس ذہنی شعوری تبدیلی کے لیے وقت درکار ہوتا ہے، اس کے بغیر ان سے کسی بڑے انقلابی اقدام کا ساتھ دینے کی توقع وابستہ کرنا خود فریبی کے مترادف ہے۔ وہ معاشرے میں اونچے مقام پر فائز ضرور نظر آتے تھے، اپنے ناموں کے ساتھ بڑے بڑے خطابات اور القابات بھی فخر سے چسپاں کرتے تھے لیکن اندر سے کھوکھلے تھے ان کی مالی حالت برطانوی سرکار کی اعانت کی مرہون منت تھی، جو مختلف مراعات سے نوازتی اور ان کی جیبوں کو بھر کر ان کا "عزو شرف" قایم رکھتی تھی۔ مسلم لیگ کی اعلا قیادت نے اس پہلو کو پیش نظر نہیں رکھا اور جلد بازی میں خطابات واپس کرنے کا فیصلہ کر دیا۔ یہ بھی نظر ثانی کا متقاضی تھا۔ یہ لوگ سرکار دولت مدار سے محاذ آرائی کرنے کے خسارہ کا سودا کس طرح کر سکتے تھے؟ چناں چہ آزمایش کے وقت انھوں نے پیٹھ دکھائی اور مسلم لیگ اور مسلمانوں کی رسوائی اور روسیاہی کا سبب بنے۔

جو لوگ خطابات کا بوجھ بہ خوشی اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے تھے اور برطانوی سرکار کی خدمت گذاری کے عوض تمغات سینوں پر سجا کر اکڑ اکڑ کر چلنے میں فخر محسوس کرتے تھے بھلا ان سے خیر کی توقع کس طرح وابستہ کی جا سکتی تھی؟ مسلم لیگ نے دوسرا ریزولیوشن پاس تو کر دیا۔ لیکن جو لوگ اس سے متاثر ہوتے تھے۔ ان کے دلوں کی کیفیت دیکھو تو خون کے آنسو رو رہے تھے۔ سر محمد یامین کہتے ہیں "انھوں نے اپنا خطاب واپس کر دیا تو ڈاکٹر ضیاء الدین احمد نے ان سے گلہ کیا کہ ان سے مشورہ کیے بغیر یہ قدم کیوں اٹھایا۔" اگر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد جیسے صف اول کے مسلم لیگی خطاب واپس کرنے پر آمادہ اور تیار نہ تھے بلکہ دوسروں کے ایسا کرنے پر ناخوش تھے تو دیگر حضرات کا اندازہ لگانے میں دشواری محسوس نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کا تعلق علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے تھا۔ جو نئی نسل کو مسلم لیگ کی ایجاد دو قومی نظریہ کے سانچے میں ڈھالنے اور پاکستان کی اسلامی ریاست کے انتظام کو

چلانے کے لیے اسے فکری اور عملی طور پر تیار کرنے کے ذمہ دار تھے۔ جب کہ ان کا ذاتی کردار مداہنت پر مبنی تھا، ہمت سے عاری تھا، جرأت مندی سے محروم تھا اور ایثار و قربانی کے جذبے سے نا آشنا تھا۔ تو ان کی تربیت یافتہ نرسری سے کیا توقع وابستہ کی جا سکتی تھی؟ اس نے جو گل کھلائے تاریخ اس کی شہادت دے چکی ہے۔

نئی نسل کی بات تو چھوڑیے، پرانی نسل کی اعلا قیادت کے ''کارنامے'' قابل فخر نہیں، بلکہ سر شرم و ندامت سے جھک جاتا ہے۔ دو صوبوں کے گورنروں کی رپورٹوں کا ذکر انھی صفحات میں موجود ہے۔ انھوں نے جو تجزیہ اور پیشین گوئی کی مختصر عرصہ گزرنے کے بعد حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی۔ مسلم لیگی قایدین نے خطابات استعمال کرنے شروع کر دیے۔ سر یامین لکھتے ہیں ''آل انڈیا مسلم لیگ کے ریزولیوشن کی پاس داری میں اپنے آپ کو ''سر'' کے لقب سے کہلوانا بند کر دیا تھا..... جب مسلم لیگ حکومت میں شامل ہو گئی، مسٹر جناح گورنر جنرل پاکستان بن کر بادشاہ کے ملازم بن گئے، بادشاہ کی وفاداری کا حلف اٹھالیا اور اس ریزولیوشن کو نظر انداز کر دیا جو ان کی صدارت میں اواخر جولائی ۱۹۴۶ء میں بمبئی کے اجلاس میں پاس ہوا تھا، نیز پاکستان بن جانے کی وجہ سے وہ مسلم لیگ بھی ختم ہو گئی، ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے بادشاہ کا عطیۂ اعزاز و خطاب ''سر'' جس کو میں نے اپنے نام کے شروع سے حذف کر دیا تھا دوبارہ جاری کرنے کا اعلان کر دیا۔

یو پی کے گورنر نے ایک سرکردہ مسلم لیگی خاتون رہنما بیگم اعزاز رسول کے ساتھ اپنی گفتگو کی رپورٹ وایسرائے کو بھیجی ہے۔ (۷ /اگست ۱۹۴۶ء) جس میں اس نے لکھا کہ بیگم اعزاز رسول نے گورنر کو بتایا کہ وہ اور اسی قسم کے دوسرے لوگ قرارداد بمبئی (۲۹ / جولائی ۱۹۴۶ء) سے خاصے دہشت زدہ ہو گئے ہیں۔ اس نے اپنے تلے انداز میں اس کے لیے مسٹر جناح کو مورد الزام ٹھہرایا۔

بیگم صاحب کو مستقبل میں رونما ہونے والے واقعات پر شدید تشویش کا اظہار کیا ہے۔ اس کا شوہر جو ایک نواب ہے، نے پہلے تو اپنے خطاب سے دست برداری کا اعلان کیا، بعد میں اس دست برداری سے لاتعلقی کا اعلان کر دیا۔ مسلم لیگ میں شامل جاگیر داروں کا ذکر کرتے ہوئے گورنر نے لکھا ''مجھے اس پر کچھ حیرانی بھی ہوئی کہ خطاب یافتہ مسلم لیگی اپنے خطابات سے دست برداری میں پس و پیش سے کام لے رہے ہیں۔ اس

سلسلے میں اِکا دُکا خط موصول ہو رہے ہیں۔ لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔ اگر آں جناب کو اعتراض نہ ہو تو یہ امتیازی نشان ابھی میرے پاس ہی پڑے رہنے دیں کہ جونہی نہرو اور جناح مرکز میں مخلوط وزارت بنانے پر متفق ہو گئے..... تو مجھے یقین ہے کہ یہ لوگ اپنے خطابات واپس مانگیں گے...... یہاں مسلم لیگ کی قیادت زیادہ تر تعلقہ داروں اور زمین داروں کے قبضے میں ہے۔ اگر وہ تحریک میں شامل ہوئے بھی تو بہت محتاط ہو کر اور بے دلی کے ساتھ آئیں گے۔ تاہم مشکل یہ ہے کہ ان کی قیادت موثر نہیں ہے۔ مسلمانوں کی زیادہ تر آبادی شہروں میں ہے۔ جاگیردار مراعات یافتہ طبقہ ہونے کے باعث تشدد کے بہ ہر صورت خلاف ہے، اس کا اثر ورسوخ اور جڑیں دیہاتوں میں ہیں۔''

پنجاب کے گورنر نے جو رپورٹ وائسرائے کو روانہ کی تھی اس میں اس نے پنجاب کے وفاداران ازلی خاندانوں کے بارے میں لکھا ہے کہ ''ان خاندانوں کے اعلا تعلیم یافتہ مسلمان جن کو پہلی بار برطانیہ سے کھلی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا ہے، مایوسی کا شکار ہیں۔ خطابات سے دست کشی کی رفتار بھی مسلم لیگ کی توقع سے کم رہی ہے۔''

(ابوالکلام آزاد اور قوم پرور مسلمانوں کی سیاست، ص ۲۵-۴۲۲)

مسٹر جی ایم سید کا بیان:

۱۹؍جون ۱۹۴۶ء: کراچی ۱۹؍جون۔ مسٹر جی ایم سید نے ایک اور بیان کے دوران کہا کہ مسٹر جناح نے جبری گروہ بندی پر کافی اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ حال آں کہ اس سے سندھ کو نقصان پہنچنا یقینی ہے۔ ممکن ہے اس سے ہندوستان میں خانہ جنگی شروع ہو جائے۔ گروہ میں شرکت سے مندرجۂ ذیل نقصانات پہنچیں گے:

(۱) گروہ کے نظم ونسق میں غیر مسلموں کی نمایندگی زیادہ ہو جائے گی۔

(۲) ۲۶۵ ممبروں میں سے سندھ کے ممبروں کی تعداد صرف ۴۵ ہوگی۔

(۳) زراعت میں پنجاب اور سندھ کا مقابلہ ہوگا۔ جس میں پنجاب بہت آگے بڑھ جائے گا۔ اسی طرح سے پنجابی سندھیوں سے زیادہ ترقی کر لیں گے اور صوبے کی معاشی زندگی پر بہت خراب اثر پڑے گا۔

(۴) سندھ کو دریائے سندھ کا کافی پانی نہ مل سکے گا جس سے کسانوں کے مفاد کو بہت نقصان پہنچے گا۔

(۵) سندھ کی اپنی صنعتی ترقی کی راہ میں بہت سی دشواریاں حایل ہوجائیں گی۔
(٦) سندھی زبان کے بجائے پنجابی یا اردو رائج ہوجائے گی۔
(۷) غیر سندھیوں کے اثر سے سندھی ادب کی نشو ونما ختم ہوجائے گی۔
(وزارتی مشن: مرتبہ انیس الرحمٰن، ص ۸۰-۸۱، ۱۹۴٦ء مکتبہ نئی زندگی۔ الہ آباد)

کانگریس کی منظوری:

۲٦/ جون ۱۹۴٦ء: کو کانگریس ورکنگ کمیٹی نے کیبنٹ مشن کی تجویز کو منظوری دے دی۔ اس طرح اس پلان کو لیگ کانگریس کا منظور کرنا ہندوستان کی آزادی کی تاریخ کا ایک شاندار واقعہ تھا جو تشدد اور جنگ کے بغیر طے پایا۔
(حسرت موہانی - ایک سیاسی ڈائری، ص ۲۵۲)

ریلوے ملازمین کی طرف سے ہڑتال کی دھمکی:

۲۷/ جون ۱۹۴٦ء: ریلوے کے ملازمین نے اپنے کچھ مطالبات حکومت کے سامنے پیش کردیے اور جب حکومت نے ان کے تسلیم کرنے میں پس وپیش کیا تو ریلوے فیڈریشن نے تمام ہندوستان میں اسٹرائیک کی تجویز پاس کردی اور ریلوے بورڈ کو نوٹس دے دیا کہ ۲۷/ جون ۱۹۴٦ء سے ریلوے کے تمام ملازمین اور ورکشاپوں کے تمام مزدور اسٹرائیک کردیں گے۔ ہندو مسلم اختلاف اس وقت بھی ناپید ہوگیا تھا اور یقین تھا کہ یہ اسٹرائیک مکمل طور پر کامیاب ہوگی۔ اسی زمانے میں احقر (مولانا سید محمد میاںؒ) نے جمعیت علمائے ہند کی خدمات کے سلسلے میں پنجاب سے ملتہائے ہندوستان یعنی شیلانگ اور گوہاٹی (صوبہ آسام) تک سفر کیا۔ سب جگہ اسٹرائیک کا جوش مساوی درجہ پر پایا۔ بالآخر حکومت مطالبات کے سامنے جھکنے پر مجبور ہوئی اور اسٹرائیک کو ملتوی کیا گیا۔
چند لیگی دوستوں سے جو ریلوے میں ملازم ہیں احقر کی گفتگو ہوئی اور جب میں نے ان کو اسٹرائیک پر آمادہ پاکر گفتگو کی تو شرکت کانگریس کا جواز جو آج تک ان کی سمجھ میں نہ آیا تھا اس وقت آسانی سے سمجھ میں آگیا۔

پوسٹ مینوں کی ہڑتال:

۲۷ر جون ۱۹۴۶ء کے بعد ابھی دو ہفتے بھی نہ گزرنے تھے کہ ۱۱ر جولائی ۱۹۴۶ء سے پوسٹ مینوں نے اسٹرائیک شروع کردی۔ حکومت نے اس وبا کو دبانے کی بہت کوشش کی مگر یہ اسٹرائیک دن بہ دن ترقی کرتی رہی، بالآخر حکومت کو دب کر سمجھوتا کرنا پڑا اور مکمل ایک ماہ بعد ۱۱ر اگست ۱۹۴۶ء کو یہ اسٹرائیک ختم ہوئی۔

(علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے: (حصہ دوم) ص ۸۴-۳۸۳)

راجہ صاحب محمود آباد کے انکشافات:

جون ۱۹۴۶ء: مختار مسعود نے ''آواز دوست'' میں راجہ صاحب محمود آباد سے اپنے ایک انٹرویو کا ذکر کیا ہے۔ مختار مسعود صاحب لکھتے ہیں:

''مسلم لیگ کے ایک اور سربرآوردہ قاید راجہ صاحب محمود آباد کا شمار قاید اعظم کے معتمد ترین رفقا میں تھا۔ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے سیکریٹری مالیات اور ورکنگ کمیٹی کے سدا اہم رکن رہے۔ علاوہ بریں انھیں اپنے طبقے کے ناطے مسلم لیگ میں بلند مقام و مرتبہ حاصل تھا۔ پاکستان بن جانے کے بعد بھی ان کی ذات کبھی متنازعہ نہیں رہی۔ بلکہ وہ مسلم لیگی اور غیر لیگی حلقوں میں ہمیشہ یک ساں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ قیام پاکستان کے بعد انھوں نے عملی سیاست میں حصہ نہیں لیا۔ اگر وہ ایسا کرتے تو ان کے گرد ایک مؤثر ہجوم جمع ہوسکتا تھا۔ راجہ صاحب محمود آباد کے حوالے سے جناب مختار مسعود نے بڑے معلومات افزا انکشافات کیے ہیں۔ ان سے پتا چلتا ہے کہ پاکستان کیوں کر بنا؟ اس کے محرکات کیا تھے؟ اس کے پس پشت کون سی قوتیں کارفرما تھیں؟ اور اگر پاکستان معرض وجود میں نہ آتا تو مسلم لیگی قیادت کا آیندہ اندازِ فکر اور پروگرام کیا تھا؟ لکھتے ہیں:

> ''.....قاید اعظم کو ۱۹۴۵ء میں تپ دق کا مرض ہوگیا تھا اور اس راز کا علم صرف مس فاطمہ جناح اور ڈاکٹر اے رحمٰن کو تھا۔ دونوں نے اس بات کو پوشیدہ رکھنے کا حلف اُٹھا رکھا تھا۔ میں اس انوکھی خبر پر چونکا اور بولا کہ قاید اعظم کے عزم و ہمت کی داد دینی پڑتی ہے۔ جب ان کا جسم اندر سے پگھل رہا تھا وہ دشمنوں کے سامنے چٹان بن کر کھڑے ہوگئے۔ راجہ صاحب نے اس بات

سے پوری طرح اتفاق نہ کیا بلکہ اختلاف کی ایک نئی راہ کی طرف یوں اشارہ کیا
کہ بہت سے فیصلے قایداعظم نے عجلت میں کیے ہوں گے کہ شاید موت کسی اور
فیصلے کی مہلت ہی نہ دے۔ جب ہندوستان کے آخری وایسرائے نے اپنا قطعی
فیصلہ قایداعظم کو سنایا اور ایک ایسے پاکستان کی پیش کش کی جس کا حدود اربعہ
نادرست اور نامکمل تھا اور کہا یا اس کٹے پھٹے پاکستان کو قبول کر دیا متحدہ
ہندوستان! تو وہ بے حد غم زدہ اور پریشان ہوئے۔ قایداعظم نے جب اس کا
ذکر راجہ صاحب سے کیا اس وقت وہ نزار و نڈھال تھے اور وہ آرام کرسی پر ڈھیر
ہو گئے۔ ٹھنڈی آہ بھری، سوچ میں ڈوب گئے۔ دیر کے بعد صرف اتنا کہا کم از
کم ہمیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی جگہ تو میسر آئی۔"

وزارتی مشن پلان پر کانگریس کی تجویز:

۶ / جولائی ۱۹۴۶ء: ۶ / جولائی کو ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا اور اس نے آل انڈیا
کانگریس کمیٹی کے لیے تجویز کے مسودے تیار کیے۔ پہلا ریزولیوشن کیبنٹ پلان سے متعلق
تھا، اسے پیش کرنا میرے سپرد کیا گیا، کیوں کہ سوشلسٹ خیال کے لوگوں کی طرف سے
شدید مخالفت کا اندیشہ تھا۔

جب آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ شروع ہوا تو میں نے جواہر لال سے کہا کہ نئے
صدر کی حیثیت سے میری جگہ صدارت کے عہدے کو سنبھالیں۔ سردار پٹیل نے شکریے کی
تجویز پیش کی، جس میں انھوں نے میری ان خدمات کو سراہا جو میں نے کانگریس کے صدر کی
حیثیت سے اس نازک زمانے میں انجام دی تھیں اور تفصیل کے ساتھ بتلایا کہ بہت سی
ہمت شکن دشواریوں کو کس طرح دور کیا گیا۔ اس کے بعد میں نے کیبنٹ مشن پلان کے
بارے میں ریزولیوشن پیش کیا اور اختصار کے ساتھ اس کی خاص خاص باتوں کا ذکر کیا۔
سوشلسٹ خیال کے لوگوں نے بڑی شد و مد سے اس کی مخالفت کی۔ کانگریسی سوشلسٹوں
نے مخالفت میں پیش قدمی کی، کیوں کہ یہ ایک عام اور عامیانہ طریقہ بن گیا تھا کہ انتہاپسندی
کا نقطۂ نظر اختیار کر کے ہر دل عزیزی حاصل کی جائے۔ ان سوشلسٹوں نے حقیقت کو پس
پشت ڈال کر اداکاری کے انداز دکھائے۔ یوسف مہر علی اس وقت بہت بیمار تھے، مگر

حاضرین جلسہ کی ہم دردی حاصل کرنے کے لیے یہ لوگ ان کو اسٹریچر پر لے آئے۔ انھوں نے بھی کیبنٹ مشن پلان کے خلاف تقریر کی۔

میں نے اپنے جواب میں تفصیل کے ساتھ پلان کے امکانات اور نتائج کو واضح کیا اور بتلایا کہ دراصل یہ پلان کانگریس کی فتح کی علامت ہے۔ میں نے کہا کہ اس کے ذریعے تشدد اور خون ریزی کے بغیر آزادی حاصل ہو جائے گی۔ برطانیہ کا ہندوستان کے قومی مطالبے کو تسلیم کر لینا جب کہ پر امن ایجی ٹیشن اور گفتگو کے سوا کوئی ذریعہ اختیار نہیں کیا گیا تھا، ایک ایسا واقعہ ہے جس کی دنیا کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ چالیس کروڑ انسانوں کی ایک قوم، فوجی اقدامات کی بہ دولت نہیں بلکہ گفتگو اور مفاہمت کے ذریعے آزاد ہو رہی ہے۔ صرف اس نقطۂ نظر سے ہی دیکھا جائے تو یہ بڑی حماقت ہوگی، اگر ہم اپنی کامیابی کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہ کریں۔ میں نے یہ بھی کہا کہ کیبنٹ مشن پلان میں کانگریس کے تمام اہم اصولوں کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ کانگریس چاہتی تھی کہ ہندوستان آزاد ہو اور متحد رہے اور انتشار پیدا کرنے والے رجحانات کو روکا جائے، اس لیے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ کانگریسی سوشلسٹوں جیسے لوگ کیسے کہتے ہیں کہ ہم نے فتح نہیں حاصل کی ہے، شکست کھائی ہے۔

میری تقریر کا حاضرین پر فیصلہ کن اثر ہوا، جب ووٹ لیے گئے تو ریزولیشن بھاری اکثریت سے منظور ہو گیا۔ اس طرح ورکنگ کمیٹی نے کیبنٹ مشن پلان کو قبول کر لینے کا جو فیصلہ کیا تھا، اس پر منظوری کی مہر لگ گئی۔ (انڈیا ونس فریڈم (اردو): ص ۴۰-۲۳۹)

۷؍ جولائی ۱۹۴۶ء: مسلم لیگ نے کیبنٹ مشن پلان کو منظور کر لیا تھا۔ ایسا ہی کانگریس ورکنگ کمیٹی نے بھی کیا تھا، مگر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی منظوری ضروری تھی۔ ہم نے سوچا تھا کہ یہ محض رسمی کارروائی ہوگی، کیوں کہ اب تک آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ہمیشہ ورکنگ کمیٹی کے فیصلوں کی تصدیق کی ہے۔ چناں چہ ۷؍ جولائی ۱۹۴۶ء کو بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس بلایا گیا۔ جب ایک مرتبہ اس کا فیصلہ ہو گیا تو میں سمجھا کہ میرا دہلی میں قیام کرنا ضروری نہیں ہے۔ یہاں گرمی ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی، اس لیے میں ۳۰؍ جون کو کلکتہ واپس چلا گیا اور ۴؍ جولائی کو کلکتہ سے بمبئی کے لیے روانہ ہوا۔ سرت چندر بوس بھی اسی گاڑی میں سفر کر رہے تھے۔ تقریباً ہر اسٹیشن پر بہت سے لوگ جمع ہوتے اور سب کا کہنا یہ تھا کہ مجھے کانگریس کی صدارت سے الگ نہیں ہونا چاہیے۔ سرت بابو تقریباً ہر

بڑے اسٹیشن پر میرے ڈبے میں آتے اور بار بار کہتے کہ "دیکھیے پبلک کیا چاہتی ہے اور اس کے باوجود آپ نے کیا کیا ہے۔" (انڈیا ونس فریڈم (اردو): ص ۳۹-۲۳۸)

پلان کی منظوری سے لیگ کی دستبرداری اور کانگریس کی پریشانی اور ریزولیوشن:

۲۷/جولائی ۱۹۴۶ء: مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ۲۷/جولائی کو بمبئی میں منعقد ہوا۔ مسٹر جناح نے اپنی افتتاحی تقریر میں پاکستان کے مطالبے کو دہرایا اور کہا کہ مسلم لیگ کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں رہ گیا ہے۔ تین روز کی بحث کے بعد کونسل نے ایک ریزولیوشن منظور کیا، جس میں کیبنٹ مشن پلان کو مسترد کر دیا گیا تھا۔ اس نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ پاکستان کو حاصل کرنے کے لیے ڈایریکٹ ایکشن کی پالیسی پر عمل کرے۔

میں اس نئی صورت حال سے سخت پریشان ہوا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ جس اسکیم کے لیے میں نے اتنی جدوجہد کی تھی وہ خود ہمارے ہاتھوں برباد ہو رہی ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ معاملے کی موجودہ صورت پر غور کرنے کے لیے ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ فوراً بلانی چاہیے۔ چناں چہ ۸/اگست کو ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا۔ میں نے کہا کہ اگر ہم صورت حال کو بگڑنے سے بچانا چاہتے ہیں تو ہمیں یہ بات صاف کر دینا چاہیے کہ کانگریس کی رائے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ریزولیوشن میں ظاہر کر دی گئی ہے اور کوئی شخص، چاہے وہ کانگریس کا صدر ہی کیوں نہ ہو، اس کے بدلنے کا مجاز نہیں ہے۔ (جواہر لال نہرو کا نظریہ یہ تھا کہ اگر ورکنگ کمیٹی اس بات کا اعادہ کرنا چاہتی تھی کہ کانگریس کیبنٹ مشن پلان منظور کر چکی ہے تو انھیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ لیکن اگر ورکنگ کمیٹی نے یہ قرارداد پاس کی کہ کانگریس کے صدر کا بیان کانگریس کی پالیسی کی ترجمانی نہیں کرتا تو یہ بات کانگریس اور ان کے لیے پریشانی کا باعث ہوگی)۔

ورکنگ کمیٹی بڑی مشکل میں پڑ گئی۔ ایک طرف کانگریس کے صدر کی عزت پر حرف آتا تھا، دوسری طرف جو سمجھوتا اتنی مشکلوں سے کیا گیا تھا وہ خطرے میں تھا۔ صدر کے بیان کی تردید کرنے سے کانگریس کم زور ہوتی، لیکن کیبنٹ مشن پلان کو چھوڑنا ملک کو تباہی کی نذر کرنا تھا۔ بالآخر ہم نے ایک ایسے ریزولیوشن کا مسودہ تیار کیا، جس میں پریس کانفرنس کا

کوئی ذکر نہیں تھا، مگر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے فیصلے کی حسب ذیل الفاظ میں دوبارہ توثیق کی گئی تھی۔

"ورکنگ کمیٹی کو یہ دیکھ کر افسوس ہوا ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل نے اپنے پچھلے فیصلے کو منسوخ کرتے ہوئے طے کیا ہے کہ وہ دستور ساز اسمبلی میں شریک نہیں ہوگی۔ ایسے دور میں جب کہ ہم بیرونی حکومت کی غلامی سے مکمل آزادی کی طرف تیزی سے جارہے ہیں اور جب وسیع اور پیچیدہ سیاسی اور معاشی مسایل کا سامنا کرنا اور ان کو حل کرنا ہے، ہندوستان کے عوام اور ان کے نمایندوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ اشتراک عمل درکار ہے۔ تاکہ یہ تبدیلی خوش گوار طریقے پر عمل میں آئے اور تمام متعلقہ لوگوں کے لیے مفید ثابت ہو۔ کمیٹی اس بات سے واقف ہے کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے مقاصد اور نقطۂ نظر میں فرق ہے، پھر بھی ملک کے اجتماعی مفاد اور ہندوستانی قوم کی آزادی کی خاطر کمیٹی ان تمام لوگوں سے اشتراک عمل کی اپیل کرتی ہے۔ جو ملک کی آزادی اور بہبودی چاہتے ہیں۔ اس امید میں کہ قومی فرایض کی ادائیگی میں اتحاد عمل کرنے سے ہندوستان کے بہت سے مسایل کے حل کی صورت نکل آئے گی۔

کمیٹی کے علم میں مسلم لیگ کے اعتراضات آئے ہیں، جن کا منشا یہ دکھانا ہے کہ کانگریس نے ان تجویزوں کو جو ۱۶ مئی کے بیان میں درج تھیں، مشروط طریقے پر تسلیم کرلیا ہے، کمیٹی اس بات کو واضح کردینا چاہتی ہے کہ اس نے اسکیم کو پورا پورا تسلیم کرلیا ہے۔ اگرچہ وہ ان تمام تجویزوں کو جو ۱۶ مئی کے بیان میں درج ہیں، پسند نہیں کرتی۔ اس نے اس کی تشریح اس مقصد سے کی ہے کہ اسکیم میں جو تضاد نظر آتے ہیں ان کو دور کردیا جائے اور ان اصولوں کی روشنی میں، جو حکومت کے "بیان" میں درج ہیں ان باتوں کا ذکر کردیا جائے جو غلطی سے نظر انداز کردی گئی ہیں۔ کمیٹی یہ سمجھتی ہے کہ صوبائی خودمختاری کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور ہر صوبے کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی "گروپ" میں شامل ہو یا نہ ہو۔ تشریح کے سلسلے میں جو سوالات پیدا ہوں گے، ان کا فیصلہ اس طریق کار کے مطابق کیا جائے گا جو "بیان" میں مقرر کیا گیا ہے اور کانگریس دستور ساز اسمبلی میں اپنے نمایندوں کو ہدایت کرے گی کہ وہ اس کے مطابق عمل کریں۔

ورکنگ کمیٹی نے اس بات پر زور دیا ہے کہ دستور ساز اسمبلی کو فرماں روا کی حیثیت

سے آخری فیصلہ کرنے کا اختیار ہوگا، یعنی اسے حق ہوگا کہ کسی بیرونی طاقت یا اقتدار کی مداخلت کے بغیر ہندوستان کے لیے ایک دستور وضع کرے۔ لیکن یہ قدرتی بات ہے کہ وہ اپنے منصب کو ادا کرتے وقت ان حدود کا لحاظ رکھے گی جو اس کے عمل کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اس لیے وہ آزاد ہندوستان کا دستور مرتب کرنے میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کرے گی اور اس کی گنجایش رکھے گی کہ ان تمام لوگوں کو جن کے مطالبے یا اعتراض حق بہ جانب معلوم ہوتے ہوں، زیادہ سے زیادہ آزادی اور اطمینان حاصل ہو۔ اس مقصد کی خاطر اور اسی خواہش کے تحت کہ وہ دستور ساز اسمبلی میں باعمل شرکت کرے اور اس کو کامیاب بنائے، ورکنگ کمیٹی نے اپنا ریزولیوشن ۲۶ رجون ۱۹۴۶ء کو منظور کیا تھا، جس کی بعد میں ۷ر جولائی ۱۹۴۶ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے تصدیق کر دی۔ کانگریس نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اس فیصلے پر قایم ہے اور اس کے مطابق وہ دستور ساز اسمبلی میں کام کرے گی۔''

ورکنگ کمیٹی کو توقع ہے کہ مسلم لیگ اور دوسری متعلقہ پارٹیاں قوم کے وسیع تر مفاد میں جب کہ ان کا اپنا مفاد بھی اس میں ہے، وہ اس عظیم کام میں شریک ہوں گی۔

ہمیں امید تھی کہ ورکنگ کمیٹی کا یہ ریزولیوشن معاملے کو بگڑنے سے بچالے گا۔ اب اس میں شک وشبہ کی گنجایش باقی نہیں رہی تھی کہ کانگریس نے کیبنٹ مشن پلان کو پورا پورا منظور کرلیا ہے۔ اگر مسلم لیگ ہمارے ریزولیوشن کو تسلیم کر لیتی تو وہ اپنے وقار کو صدمہ پہنچائے بغیر اپنے پچھلے مقام پر واپس آسکتی تھی۔ مگر مسٹر جناح نے اس کو منظور نہیں کیا اور کہا کہ جواہر لال کا بیان ہی کانگریس کے ذہن کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ اگر کانگریس اس قدر جلد اپنی رائے بدل سکتی ہے جب کہ انگریز ابھی ملک میں موجود ہیں اور اس کے ہاتھوں میں اختیار نہیں آیا ہے، تو اقلیتیں کس بھروسے پر یقین کرلیں کہ جب انگریز چلے جائیں گے تو کانگریس پھر بدل نہیں جائے گی اور اس کا نقطۂ نظر وہی نہ ہو جائے گا جو جواہر لال نہرو نے اپنے بیان میں اختیار کیا ہے۔'' (انڈیا ونس فریڈم (اردو): ص ۲۴۳-۲۴۱)

مسلمانوں کی واحد نمایندہ جماعت اور اس کے رہنما:

جون، جولائی ۱۹۴۶ء: مولانا دین محمد وفائی نے ''آل انڈیا مسلم لیگ'' کے عنوان

سے اس کے رہنماؤں کی سیرت کے بارے میں اپنے رسالے "توحید" (کراچی) میں ایک اداریہ لکھا ہے۔ وہ اس میں لکھتے ہیں:

"ہندوستان میں پچھلے آٹھ برسوں میں مسلم لیگ نے اتنا زور پکڑا ہے کہ اسے مسلمانوں کی واحد نمایندہ جماعت ہونے کا زعم پیدا ہو گیا ہے۔ اس کا دعوٰی ہے کہ وہی مسلمانوں کے تمام مسایل حل کر سکتی ہے اور مسلمانوں کی خوش حالی اور فلاح و بہبود کے تمام کام اسی کے ذریعے انجام پائیں گے۔ مسلمان سمجھنے لگے کہ وہ پاکستان میں قرآنی حکومت اور اسلامی نظام قایم کرے گی اور تمام مسایل کے حل اور انجام دہی کے لیے مسلم لیگ کا وجود بس کرتا ہے۔ لیکن دوسری طرف صورت حالت یہ تھی کہ مسلم لیگ کی ہائی کمانڈ کو اسلام کے کسی رکن یا شعار سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہ تھا۔ ان کی شکل وصورت اور زندگی کے طور طریقے اسلام کے قطعاً خلاف تھے۔ سوٹ بوٹ میں رہتے تھے، ڈاڑھیاں منڈاتے تھے، نماز کے قریب نہ جاتے تھے، روزے کبھی نہ رکھتے تھے، شرابیں پیتے تھے، حرام اور پلید چیزیں کھاتے تھے، مسلمانوں کے لیڈر ہونے کی حیثیت سے ان میں کچھ تو اسلام اور مسلمانوں کے طور طریقوں کا رنگ ہونا چاہیے تھا، جن کی پیروی سے عام مسلمانوں میں بھی اسلامی زندگی کا کچھ اثر ظاہر ہوتا۔ لیکن افسوس کہ ایسی کوئی امید پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔

دوسری طرف ایک غیر برہمن ہندو بیرسٹر مہاتما گاندھی کو دیکھو! اس نے روحانیت کا ایک رنگ پیدا کر لیا ہے۔ وہ روزانہ اپنے طریقے پر اللہ کی عبادت کرتا ہے۔ اپنے تمام کام اللہ کے حوالے سے اور اس کے نام سے شروع کرتا ہے۔ ہندو کہلاتا ہے، لیکن بت برستی کے قریب نہیں جاتا۔ اس نے انسانی اخلاق اور انسانیت کی خدمت کو اپنی زندگی کا اصول بنا لیا ہے۔ وہ کسی کو ایذا نہیں دیتا، وہ دکھی انسانوں کا خیر خواہ و خدمت گذار اور آزادی کا طالب ہے۔ ہمارے امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی گاندھی جی کی بابت "ہمارے وطن کے محترم فلاسفر" کا احترام آمیز جملہ استعمال کرتے ہیں۔

غور کرو! جو ہندو گاندھی جی اور ان کی زندگی کو دیکھے گا اور ان کے خیالات کو پڑھے گا اس کے دل میں ہندو دھرم اور ہندو فلسفے کی عزت، حرمت اور کشش کیوں نہیں پیدا ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ گاندھی جی کی پیروی کرنے والے سیکڑوں ایسے ہندو مل جائیں گے جو سچائی اور مقاومت بالصبر (ستیہ گرہ) میں کامل یقین رکھتے ہیں اور سچائی کے راستے پر چلنے کی پوری

کوشش کرتے ہیں اور انسانیت کی خدمت کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

اس کے برعکس لیگ جو واحد نمایندہ اسلامی جماعت ہونے کی مدعی ہے، اس کے بڑے بڑے لیڈروں کو دیکھو کہ ان کی زندگیوں کے اطوار کیا ہیں! کیا مسٹر جناح اور لیاقت علی کو دیکھ کر کسی کو خدا یاد آسکتا ہے؟ ان کی زندگیوں کے اعمال دیکھ کر کسی مسلمان کے دل میں اسلامی احکام پر عمل کرنے اور اسلامی شعار کو اپنانے کی تحریک پیدا ہوسکتی ہے؟ اور ان کے شب و روز کے معمولات دیکھ کر کسی مسلمان کی نظر میں اسلامی اخلاق و سیرت کی عظمت و برتری کا نقشہ پھر سکتا ہے؟

میرا مطلب یہ ہے کہ مغرب زدگی اور الحاد و بے دینی اور اخلاق و مذہب سے مادر پدر آزادی سے بچانے کے لیے ہمارے ان لیڈروں نے کیا سبیل نکالی ہے؟ جس پر چل کر مسلمان نوجوانوں کو بے دینی کے طوفان سے بچایا جاسکے۔"

(ماہنامہ توحید، کراچی: جون، جولائی ۱۹۴۶ء صفحہ ۲ تا ۴)

لیگ کی علمائے دین سے نفرت:

مولانا دین محمد وفائی اسی ادارتی مقالے میں "علمائے کرام سے نفرت" کے عنوان سے لکھتے ہیں:

"مسلم لیگ نے پچھلے آٹھ برسوں میں پاکستان کے مسئلے پر مسلمانوں کے دلوں میں ان علمائے کرام کے خلاف شدید نفرت پیدا کردی ہے جن کا خیال ہے کہ تقسیم ملک کی تجویز ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کے مسئلے کا واقعی حل نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ سارا ہندوستان مسلمانوں کا ملک ہے اس لیے پورے ہندوستان میں مسلمانوں کی آبرومندانہ اور عزت و وقار کی زندگی تلاش کرنی چاہیے، نہ کہ اس میں ایک ٹکڑا اپنے لیے الگ کرکے تمام ہندوستان اور اس کی صدیوں پر پھیلی ہوئی اسلامی تاریخ اور آثار و روایات سے دست بردار ہوجانا اور ہندوستان کے چار کروڑ مسلمانوں کو ہندوؤں کے حوالے کردینا چاہیے۔ (جو مسلم لیگ کے بہ قول متعصب، تنگ نظر، اسلام دشمن اور مسلمانوں اور ان کی تہذیب اور اردو کو مٹانے کے درپے ہیں اور ان کی طرزِ زندگی مسلمانوں سے اس درجے مختلف ہے کہ دونوں قومیں ایک ملک میں ایک ساتھ رہ ہی نہیں سکتیں۔ ا۔س۔ش) بلاشبہ ایسا کرنا ایک صریح ناانصافی اور وطن دشمنی ہے اور ایسی پست ہمتی کی بات ہے کہ ایک مسلمان اس کا تصور بھی

نہیں کر سکتا۔ مگر افسوس کہ لیگی لیڈر ہندوستان کے کل دس کروڑ مسلمانوں کے لیے عزت و وقار کی زندگی کے حصول کے لیے سوچنے کے بجاے ان علماے حق، بہی خواہانِ ملت، فدایانِ اسلام، اور مخلصانِ قوم کو بے دھڑک ہندوؤں کے غلام اور ان کے ایجنٹ کہتے ہیں۔ وہ ان پر پاکستان میں قایم ہونے والی خالص اسلامی اور قرآنی حکومت کی مخالفت کا الزام لگاتے ہیں اور مسلمانوں کو ہندوؤں کا غلام بنانے کی سفارش کا انھیں مجرم گردانتے ہیں اور خدا کا دل میں ذرا خوف نہیں لاتے (اور نہیں سوچتے کہ حسین احمد مدنی اور ابوالکلام آزاد اسلام کے غدار ہیں تو پھر مسلمان اور اسلام کا وفادار کون ہے؟ (ا-س-ش) اس پروپیگنڈے کا نتیجہ یہ ہے کہ عام مسلمان تمام علماے دین اور کل مذہبی گروہ سے دور ہوتے جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے نہ تو مسلمانوں میں اسلام سے سچی محبت اور واقفیت رہی ہے، نہ انھیں عمل کی توفیق ہوتی ہے۔ وہ مسٹر جناح کی مغرب زدگی اور یورپین اخلاق و اطوار ہی کو خالص اسلام اور ان کے طرزِ معاشرت کو اسلامی زندگی کا نمونہ سمجھنے لگے ہیں۔ حال آں کہ ان میں نہ خداشناسی کی صفت ہے، نہ قرآن دانی کا جوہر ہے اور نہ ان کے کسی عمل سے اسلام کے احترام کا پتا چلتا ہے۔

مسلم لیگ نے پورے آٹھ برس اس مقصد سے کہ "لے کے رہیں گے پاکستان" ہنگامہ برپا کیا اور اسی بنیاد پر حضرت شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی ہر طرح بے عزتی کرائی، آزاد خیال اور حریت پرست مسلمانوں پر تشدد کروایا اور غنڈہ گردی اور بے حیائی کا کوئی عمل نہ تھا جس کا بے شرمانہ بھرپور مظاہرہ نہ کیا ہو۔ انھوں نے "اسلامی نظام حکومت" کے قیام کے نام پر اخلاق و تہذیب کی اقدار کو ملیا میٹ کروایا اور شرافت کی حدوں کو تڑوایا اور اعلان کیا کہ چوں کہ یہ علماے دین اور آزاد خیال مسلمان قیام پاکستان کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ اس لیے یہ ملت کے دشمن، کافر اور واجب القتل ہیں۔ یاللعجب!

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی آزادی اور پاکستان کا قیام نہ ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے، نہ علماے کرام کے پاس اس مسئلے کا حل ہے اور نہ آزاد خیال اور نیشنلسٹ مسلمانوں کے پاس۔ یہ سارا معاملہ برطانیہ کے قبضۂ قدرت میں ہے اور اسی کو فیصلہ کرنا ہے کہ اس مسئلے کو کیسے حل کیا جائے اور ہندوستان کو کیا دیا جائے اور کیا نہ دیا جائے؟ چناں چہ حال ہی میں

ہندوستان کے مسئلے پر غور و تصفیہ کے لیے وزارتی وفد ہندوستان آیا تھا۔ وہ تین مہینے تک ہندوستان کے ہر طبقۂ خیال اور جماعت کے لیڈروں سے گفتگو کرتا رہا۔ لیکن مسلم لیگ کے لیڈروں کو ان کی ہنگامہ آرائی کے بعد بھی کیا حاصل ہوا؟ وزارتی مشن کی اسکیم کے مطابق ہندوستان کو جو کچھ دینا تجویز ہوا ہے، وہ یہ ہے:

(۱) پاکستان کا مطالبہ تسلیم نہیں کیا گیا۔

(۲) مرکز میں مسلمانوں کو ہندوؤں کے برابر سیٹیں نہیں دی گئیں۔

(۳) مسلم لیگ کا مطالبہ کہ اچھوتوں کو ہندوؤں سے الگ کیا جائے، تسلیم نہیں کیا گیا۔ اس کے بجائے کانگریس کی بات مانی گئی۔

(۴) ہندوؤں اور مسلمانوں کو الگ الگ دو قومیں تسلیم نہیں کیا گیا بلکہ ایک ہندوستانی قوم کی دو کمیونٹی سمجھا گیا۔

(۵) ہندوستان کو ہندو ہندوستان اور مسلم ہندوستان کے دو ٹکڑوں میں الگ الگ تسلیم نہیں کیا گیا۔

(۶) مرکزی اسمبلی میں لیگ کو سو میں صرف پینتیس سیٹیں دینا منظور کیا گیا۔

اس کے بعد مسلم لیگ کی بے بسی ملاحظہ ہو کہ اس کے لیڈروں نے اپنے مقاصد اور مطالبات کے برخلاف مذکورہ دفعات میں سے ایک ایک بات کو منظور کیا۔ فقط اس امید پر کہ شاید عارضی حکومت میں ہندوؤں کے برابر جگہیں مل جائیں۔ لیکن افسوس کہ وائسرائے نے اُن کی ان آرزوؤں پر بھی پانی پھیر دیا۔ اب وہ حسرت و حیرت سے آنسو بہا رہے ہیں کہ انھوں نے کیا سوچا تھا اور کیا ہوگا! (ماہنامہ توحید-کراچی: جون جولائی ۱۹۴۶ء، صفحہ ۴ تا ۶)

مختلف کانگریسی مسلمان ممبران کی انتخاب میں کامیابی:

جولائی ۱۹۴۶ء: جولائی ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں صوبہ سرحد سے مولانا آزاد، خان عبدالغفار خان، ایک کانگریسی مسلمان اور ممبر چنے گئے۔ اتر پردیش سے رفیع احمد قدوائی۔ دہلی سے آصف علی بیرسٹر، اور بنگال سے مسٹر فضل حق منتخب ہوئے۔ یہ سب نمائندے مسلم لیگ امیدواروں کو شکست دے کر منتخب ہوئے تھے۔ بنگال سے ڈاکٹر امید کر وکیل اور پنجاب نے مسٹر جناح چن کر آئے۔ (حسرت موہانی — ایک سیاسی ڈائری: ص ۲۵۵)

مولانا آزاد کے نام حضرت شیخ الاسلام کا ایک تاریخی خط:

۷/اگست ۱۹۴۶ء: ایک مدت سے حضرت شیخ الاسلام کا یہ معمول تھا کہ رمضان المبارک کا مہینہ سلہٹ میں گزارتے تھے۔ شب و روز تراویح، نوافل، تلاوت اور ذکر و وعظ میں بسر ہوتے تھے اور قرب و دور کے سیکڑوں حضرات اس موقع سے فایدہ اٹھاتے اور حضرت کی صحبت اور مشاغل روز و شب سے فیض یاب ہونے کے لیے سلہٹ پہنچ جاتے تھے۔ لیکن لوگوں کی انفرادی خدمت اور مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کی فکر اس وقت بھی پیش نظر رہتی تھی، جیسا کہ حضرت کے اس مکتوب سامی سے واضح ہے۔ مکتوب الیہ مولانا ابوالکلام آزادؒ ہیں جو اس وقت ہندوستان کی عارضی حکومت میں وزیر تعلیم کے منصب پر فایز تھے۔ اصل خط عربی میں تھا، یہاں اس کا اردو ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔

سیدنا المحترم لا زالت معالیکم فی غایتہ من الارتقاء. آمین

بعد ہدیۂ سلام مسنون کے خدمت اقدس میں عرض ہے کہ خاک سار ۳/ رمضان المبارک کی صبح مع الخیر سلہٹ پہنچا، چوں کہ برقیات اور مراسلات کا سلسلہ منقطع ہے، اس لیے حالات اس کے مقتضی ہوئے کہ حامل رقعہ کو جناب کی خدمت میں بھیجوں، مجھ کو جناب والا کے حسن اخلاق سے امید ہے کہ میری درخواست پر توجہ فرمائیں گے۔

سیدی! جب سے میں یہاں آیا ہوں برابر یہ شکایت سنتا ہوں کہ صوبہ آسام میں اسلامی وزارت قایم نہیں ہو رہی ہے، جس کی وجہ سے اسلامی مفاد کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے۔ وطن پرست اشخاص اور ارکان جمعیت مجھ سے اس بات کی شکایت کر رہے ہیں اور مجھے اس کام کے لیے ترغیب دے رہے ہیں۔ لہٰذا جناب والا! اس مہم کو انجام دینے کی طرف خصوصی توجہ فرمائیں۔ اس صوبے کے باشندوں کو اس بات کی زبردست خواہش ہے کہ اس علاقے میں مجالس تین ہوئی تھیں، پھر کیا بات ہے کہ حکومت اور زعماقوم صرف ایک مجلس کے قیام پر اکتفا کر رہے ہیں۔ بلکہ ان کو تینوں پوری کرنی چاہییں۔ اور مولانا محمد ابراہیم صاحب اگرچہ انگریزی کے فاضل نہیں ہیں، پھر بھی ان شاء اللہ اپنے کار منصبی کو پوری مہارت اور انتہائی جدو جہد سے انجام دیں گے، لیکن جہاں تک میں نے مولانا عبدالرشید صاحب کے حالات کی تحقیق کی موصوف بڑے تجربہ کار اور انگریزی سے بھی کافی واقف ہونے کی وجہ سے اپنے تمام فرایض کو باحسن وجوہ انجام دے سکیں گے۔

دوسرا مسئلہ ان مہاجرین کا ہے جو بنگال چھوڑ کر آسام آ رہے ہیں۔ یہ مسئلہ نہایت اہم اور نازک ہے۔ امید ہے کہ جناب والا اس کو جلد از جلد حل فرمائیں گے کہ جو شخص اس صوبے میں ۱۹۴۵ء تک آ کر آباد ہو گیا ہے اس کو یہاں رہنے دینا چاہیے، یہ دونوں سیاسی مسایل سخت تردد اور کش مکش کا باعث ہیں۔ یہاں ایک تیسرا مسئلہ بھی ہے یعنی کانگریس کے مندوبین کے لیے مسلمانوں کا انتخاب، یہ مسئلہ بھی مسلمانوں کے لیے سخت پےچیدہ ہے، کیوں کہ ابنائے وطن مسلمانوں کو اس بات کا موقع ہرگز نہ دیں گے کہ وہ کانگریس کے کسی عہدے پر فایز ہوں اور نہ کوئی مسلمان کانگریس کی ہائی کمان کا رکن ہو سکتا ہے، اگر کونسلوں میں مسلمانوں کی سیٹیں محفوظ نہ کی گئیں تو پھر مسلمانوں کا ان کونسلوں میں جانا ناممکن ہو جائے گا۔

سلہٹ　　　　　　　　　　　　والسلام

۹ رر مضان المبارک ۱۳۶۵ھ　　　　　　حسین احمد غفرلہٗ

(مطابق ۷ راگست ۱۹۴۶ء)

پوسٹ مینوں کی ہڑتال کا خاتمہ اور ریلوے ملازمین کا نوٹس:

۱۱ راگست ۱۹۴۶ء: ۲۷ رجون کو جنرل طور پر پوسٹ مینوں نے ملک میں اسٹرائیک شروع کر دی تھی۔ جسے حکومت دبانے میں ناکام رہی۔ ۱۱ راگست ۱۹۴۶ء کو ڈیڑھ ماہ کے بعد یہ اسٹرائیک ختم ہوئی۔ اسی تاریخ کو ریلوے کے تمام ملازمین اور ورکشاپوں کے تمام مزدوروں نے اسٹرائیک کرنے کا نوٹس حکومت کو دے دیا۔

(حسرت موہانی — ایک سیاسی ڈایری: ص ۲۵۲)

مرکز میں حکومت کے قیام کی پنڈت نہرو کی دعوت:

۱۲ راگست ۱۹۴۶ء: کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ریزولیوشن نے کیبنٹ مشن پلان کو مکمل طور پر تسلیم کر لیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ عارضی حکومت اور وہ تجاویز جن پر بعد کو عمل ہونے والا تھا دونوں تسلیم کی گئی تھیں۔ ورکنگ کمیٹی کی طرف سے کیبنٹ مشن پلان کی اس غیر مبہم منظوری کا وایسرائے نے فوراً جواب دیا اور ۱۲ راگست کو ان الفاظ میں جواہر لال کو مرکز میں عارضی حکومت قایم کرنے کی دعوت دی گئی۔

''ہز ایکسی لینسی وائسرائے نے ہز میجسٹی کی حکومت کی منظوری سے
کانگریس کے پریسیڈنٹ کو دعوت دی ہے کہ وہ عارضی حکومت کے فوری قیام
کے بارے میں تجاویز پیش کریں اور صدر کانگریس نے اس دعوت کو قبول کرلیا
ہے۔ پنڈت جواہرلال نہرو جلد ہی نئی دہلی آکر ہز ایکسی لینسی وائسرائے سے
اس تجویز پر گفتگو کریں گے۔''

مسٹر جناح نے اسی دن ایک بیان جاری کیا، جس میں انھوں نے کہا کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے تازہ ترین ریزولیوشن سے جو ۱۰؍اگست کو وردھا میں منظور کیا گیا ہے، کوئی بات نہیں بنتی، کیوں کہ اس میں ان ہی خیالات کی تکرار ہے جن کا اظہار کانگریس بالکل شروع میں کرچکی ہے، بس الفاظ بدل گئے ہیں۔ انھوں نے جواہرلال کی دعوت کو کہ انٹیرم حکومت کے قیام میں تعاون کریں، نامنظور کردیا۔ اس کے بعد ۱۵؍اگست کو جواہرلال نے مسٹر جناح سے ان کے مکان پر ملاقات بھی کی، مگر ان کی گفتگو کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور صورت حال بہت جلد بد سے بدتر ہونے لگی۔ (انڈیا ونس فریڈم: ص۲۴۴)

پنڈت نہرو کو حکومت بنانے کی دعوت پر مسٹر جناح کا ردعمل:

۱۲؍اگست ۱۹۴۶ء: ۲۹؍جولائی کے لیگ ریزولیوشن اور اگست کی کانگریس قرارداد کے بعد ۱۲؍اگست ۱۹۴۶ء کو وائسرائے ہند لارڈ ویول نے اعلان کیا کہ

''ہز ایکسی لینسی وائسرائے نے ملک معظم کی حکومت کی منظوری سے
کانگریس کے صدر پنڈت جواہرلال نہرو کو دعوت دی ہے کہ وہ عارضی حکومت
کی فوری تشکیل کے بارے میں تجویز پیش کریں اور اس سلسلے میں بہت جلد آکر
وائسرائے سے ملیں۔ چناں چہ کانگریس پریسیڈنٹ نے یہ دعوت منظور کرلی
ہے۔ نیز یہ بھی ہدایت کی ہے کہ وہ مسٹر جناح کا تعاون حاصل کرنے کی بھی
کوشش کریں۔'' (ہفت روزہ خلافت۔ بمبئی: ۱۴؍اگست ۱۹۴۶ء)

اس پر نہرو ۱۴؍اگست کو مسٹر جناح سے ملاقات کا وقت لے کر ۱۵؍اگست کو ان سے بمبئی جاکر ملے۔ اس ملاقات کا ذکر مسٹر محمد علی جناح نے ۱۸؍اگست کو ایک بیان کے ذریعے یوں کیا کہ

"جو تجاویز جواہر لال نے پیش کیں وہ یہ تھیں کہ کانگریس وزارت بنائے گی اور ۱۴ نشستوں میں سے ۵ نشستیں مسلم لیگ کو دینے پر تیار ہے اور باقی نشستیں کانگریسی نمائندوں سے پر کی جائیں گی، جن میں ایک کانگریس کا پسند کردہ مسلمان بھی شامل ہوگا۔ نیز یہ کہ یہ کابینہ صرف موجودہ مرکزی اسمبلی کے سامنے جواب دہ ہوگی، جہاں کہ کانگریس کو ایک مسلمان ووٹ کے مقابل میں کم از کم تین ووٹ حاصل ہیں اور مزید یہ کہ وایسرائے ایک آئینی گورنر جنرل ہوگا۔ وہ اپنا حق استرداد استعمال نہیں کر سکے گا اور نہ کوئی بیرونی طاقت اس کابینہ کے کاموں میں مداخلت کر سکتی ہے۔

یہ نہیں ہے کہ وہ موجودہ آئین کے مطابق گورنر جنرل کی ایگزیکیٹو کونسل مرتب کر رہے ہیں، بلکہ اس طرح مرتب کی ہوئی حکومت ایک عارضی قومی حکومت ہوگی۔

یہ وہ پلان ہے جس کا اظہار جواہر لال نہرو نے مجھ سے کیا اور یہ ظاہر ہے کہ میں اس قسم کی تجاویز کو قطعاً منظور نہیں کر سکتا تھا۔ کیوں کہ اس کو منظور کرنے کے بعد مسلم مطالبہ اور ہماری منزل پاکستان پر گفتگو کرنے کے لیے کچھ باقی نہیں رہتا۔" (ہفت روزہ "اجمل" بمبئی: ۱۹ اگست ۱۹۴۶ء)

یہ بیان جس انداز سے مرتب کیا گیا ہے۔ کانگریس کے خلاف غلط فہمی اور بدظنی کے سوا اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا، عارضی حکومت ۱۴ ممبران کی تقسیم یہ تھی:

کانگریس ۶، لیگ ۵، دیگر اقلیتیں ۳، کانگریس کے ممبران میں ایک مسلمان تھا، اس طرح کانگریس ۶، لیگ ۶ ہو جاتے لیکن بدقسمتی سے جناح صاحب اپنی ۵ نشستوں میں سے ایک نشست ایک غیر مسلم منڈل کو دے دی اور لیگ کے چار ہی رہ گئے۔ اب ماتم کس بات کا کیا جائے!

مسٹر جناح کا یوم راست اقدام اور اس پر ردِ عمل:

۱۶ اگست ۱۹۴۶ء: کا دن کلکتہ ہی کے لیے نہیں بلکہ پورے ہندوستان کے لیے سیاہ دن تھا۔ حالات نے جو پلٹا کھایا تھا اس کی وجہ سے کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان

مفاہمت کے ذریعے مسائل کے پر امن طریقے پر حل ہونے کی امید جاتی رہی۔

''یہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک عظیم ترین المیہ تھا اور مجھے انتہائی دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس صورت حال کی ذمہ داری سب سے زیادہ جواہر لال پر تھی۔ ان کے اس افسوس ناک بیان نے کہ کانگریس کیبنٹ مشن پلان میں ردو بدل کرنے کے لیے آزاد ہوگی۔ فرقہ وارانہ اور سیاسی سمجھوتے کے سوال کو دوبارہ کھڑا کر دیا۔ مسٹر جناح نے ان کی غلطی سے پورا فایدہ اٹھایا اور کیبنٹ مشن پلان کی منظوری کے فیصلے کو واپس لے لیا۔''

(انڈیا ونس فریڈم (اردو): ص ۲۴۵)

۱۶ر اگست ۱۹۴۶ء: مسٹر جناح نے ۱۶ر اگست کو یوم راست اقدام منانے کا اعلان کیا تھا۔ بنگال کے چیف منسٹر مسٹر سہروردی نے اس روز عام تعطیل کا اعلان کر دیا۔ سید عثمان سکریٹری کلکتہ مسلم لیگ نے جگہ جگہ یہ اشتہار چسپاں کرایا، جس کا عنوان تھا آل انڈیا یوم نفیر جہاد پاکستان اور دس کروڑ مسلمانانِ ہند کی لام بندی۔ مسلم لیگ کا انقلابی قدم۔ نفیر جہاد پر لبیک کہو۔ ملت اسلامیہ کی لام بندی کا اعلان کرو۔ اور اپنے دورِ جدید کا فاتحانہ آغاز کرو۔ مسلمانو! اٹھو نئی شان سے اٹھو اور دنیا کو اپنی اٹھان اپنے ابھار اور اپنے انقلاب سے حیران کر دو۔ (علمائے حق......: ص ۴۹۴)

تاریخ ہند میں یہ دن ماتمی دن رہے گا کہ کلکتہ جیسے عظیم شہر میں ایسا سخت تشدد بپیدا کیا گیا ہے جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ لوٹ مار، قتل و غارت گری کا طوفان برپا ہو گیا، ہزاروں جانیں ضایع ہوئیں، ان گنت لوگ زخمی ہوئے، کروڑوں کا مال لوٹا اور برباد کیا گیا۔ لیگ کے جلوس پر جلوس نکلتے رہے اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے شہر پر مسلمانوں اور غنڈوں کا قبضہ ہو گیا۔ مولانا آزاد ورکنگ کمیٹی کی شرکت کے لیے کلکتہ ڈمڈم ہوائی اڈے پر جانے لگے تو راستے میں کچھ ٹھیلہ گاڑی والوں نے مولانا کو پہچان کر لاٹھیوں سے کار پر حملہ کر دیا۔ اور بدقت تمام غنڈوں سے بچ کر مولانا آزاد ہوائی اڈے پہنچے تو دیکھا کہ ہوائی اڈہ پر ایک بہت بڑا فوجی دستہ ملٹری لاریوں کا انتظام کر رہا ہے۔ مولانا نے پوچھا کہ وہ امن و امان بحال کرنے میں مدد کیوں نہیں کرتے؟ تو جواب میں ملٹری افسروں نے کہا کہ حکومت نے ہم کو صرف تیار رہنے کا حکم دیا ہے، کچھ کرنے کا نہیں۔ غرضے کہ پورے کلکتہ شہر میں فوج اور پولیس تیار کھڑی رہ کر بے قصور اور معصوم مردوں اور عورتوں کا قتل عام دیکھتی رہی؛ عام طور پر یہی سمجھا گیا کہ تمام تر

خرابی اور بدمزگی کا سبب جواہرلال نہرو کا وہ جذباتی بیان تھا۔ اگر کانگریس کی صدارت جواہر لال کے ہاتھ نہ آتی تو شاید کلکتہ کو یہ دن دیکھنا نہ پڑتا، جسے لیگی وزارت نے دکھادیا۔ جب ۱۶/اگست ۱۹۴۶ء کو مسلم لیگ نے اپنی حکمتِ عملی کی تبلیغ کے لیے عام ہڑتال کا اعلان کیا تب بنگال اور سندھ میں صوبائی لیگی وزارتیں کام کرنے لگ گئی تھیں۔ ان صوبوں کی وزارتوں نے عام سرکاری تعطیل کردی، دفتروں کے ساتھ بنکوں کو بھی جبراً بند کردیا گیا تھا۔ بنگال کے ہندوؤں نے وزیر اعلا مسٹر سہروردی سے ہڑتال نہ کرانے کی مانگ کی، کیوں کہ امن عامہ کو خطرہ لاحق تھا۔ لیکن لیگی وزیر مسٹر سہروردی نہ مانے اور ہڑتال کے پرامن ہونے کا دعویٰ کر گئے جس کے نتیجہ میں مذکورہ قیامت صغریٰ بپا کی گئی، جو مسلم لیگ کے اعلان ڈایریکٹ ایکشن کی ایک واضح جھلک تھی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مسلم لیگی بہادر انگریزی سرکار کا سامنا کرتے لیکن ان سورماؤں نے اپنے ہی ہم وطن ہندوؤں کو نشانہ بنایا (جو اقلیت میں تھے)، جس میں ہندوؤں کے ساتھ نہ جانے کتنی معصوم جانیں غریب مسلمانوں کی بھی گئیں۔ بابو راجندر پرشاد نے اپنی کہانی کے صفحہ ۱۰۷۸ پر لکھا ہے کہ ۱۶/اگست سے ۱۷/اگست تک بلوہ روکنے کی کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ اور ہزاروں آدمی قتل کر دیے گئے، ہزاروں مکان لوٹے اور جلائے گئے۔ روک تھام اس وقت شروع ہوئی جب فساد بہت بڑھ گیا۔ چار دن تک خون ریزی قتل اور زیادتیاں ہوتی رہیں، چھ سات ہزار آدمی کا خون ہوا۔ سڑکوں پر تین دن تک لاشیں پڑی رہیں۔ تین ہزار سے زیادہ لاشیں جابہ جا سے ہٹائی گئیں، بہت سی لاشیں زمین دوز نالے میں ڈال دی گئیں، جس کا اندازہ نہیں۔ اس طرح کا قتل عام کلکتہ میں کبھی نہیں ہوا تھا۔ شاید نادر شاہ کے دلّی والے قتل عام کے سوا ہندوستان میں کہیں ایسا نہیں ہوا۔ مسلم لیگ کے ایک خاص لیڈر فیروز خان نون نے سچ ہی کہا تھا کہ ہم ایسی حالت پیدا کردیں گے جو چنگیز خان اور ہلاکو خان نے بھی نہیں پیدا کی تھی۔ مسلم لیگ کی براہ راست کارروائی کا اثر ڈھاکہ، بنارس، الہ آباد، رانی گنج، دہلی اور کئی جگہ ہوا اور بلوے فساد پھوٹ پڑے مگر وہاں کے سرکاری کارکنوں نے حالات پر قابو حاصل کرلیا۔ مسلم لیگ کے حمایتی انگریزی اخبار ''اسٹیٹس مین'' نے کلکتہ کے بارے میں لکھا کہ لیگی وزارت قیام امن میں اپنے کو نالایق ثابت کرچکی ہے، ایسی ہی باتیں انگلینڈ کے اخباروں نے بھی لکھیں۔ لیکن لیگ کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ مذکورہ حادثے سے ملک میں واویلا مچ گیا، گھبراہٹ پیدا ہوگئی۔ شروع میں تو ہندو مارے گئے بعد میں جتنے مرے ان

میں شاید زیادہ تعداد مسلمانوں کی ہی تھی۔ بہ ہر حال چاہے ہندو زیادہ مرے ہوں یا مسلمان اس میں شک نہیں کہ مرنے والوں میں سب سے زیادہ بے قصور لوگ تھے جو بلوہ میں شریک نہیں ہوئے مگر شکار ہو گئے، کروڑوں کی جائیداد برباد ہو گئی، زیادہ تر ہندوؤں کا مال برباد ہوا۔

یوم راست اقدام اور اس کے نتائج:

۱۶راگست ۱۹۴۶ء: مسٹر محمد علی جناح نے ۱۶راگست کو یوم راست اقدام کا اعلان کر کے اور بنگال کی لیگی حکومت نے اس روز عام تعطیل کا اعلان کر کے تباہی و بربادی کا جو دروازہ کھولا تھا، اس پر مولانا فرید الوحیدی نے اپنی لاجواب تالیف ''شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی..... ایک تاریخی مطالعہ'' میں ''فریڈم ایٹ مڈ نائٹ'' اور بعض دوسرے حوالوں سے بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

اس پالیسی کے نتیجے میں پورے شہر کلکتہ بلکہ پورے بنگال میں ایک ہفتے تک بلوائیوں فسادیوں اور غنڈوں کا راج رہا اور انھوں نے جس طرح چاہا ظلم و بربریت کا ناچ ناچا۔ ان حالات پر ایک رپورٹ سنیے:

> ''مسلمان مسلم لیگ کی للکار سن کر باہر نکلے تھے۔ مسلم لیگ نے ۱۶ر اگست ۱۹۴۶ء کو ڈائریکٹ ایکشن کا دن مقرر کیا تھا تاکہ انگریزوں اور کانگریس پارٹی کے سامنے یہ ثابت کیا جا سکے کہ مسلمان پاکستان لے کر رہیں گے اور ضروری ہوا تو اس کے لیے کسی ڈائریکٹ ایکشن سے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ مسلمانوں کی ٹولیوں نے جہاں بھی پایا ہندوؤں کو مار ڈالا اور لاشیں شہر کے کھلے نالوں میں پھینک دیں۔ پولیس کے بھی ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ جلد ہی شہر کے درجنوں مقامات پر دھویں کے ستون آسمان کی طرف سر اٹھانے لگے۔ ہندوؤں کی بستیاں خاک ہو رہی تھیں، بازاروں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ ہندو کیوں پیچھے رہتے، ان کی ٹولیوں نے بھی اپنی جھونپڑپٹی سے نکلنا اور موت کے گھاٹ اتارنا شروع کر دیا۔ کلکتہ نے اپنی تاریخ میں اتنے برے چوبیس گھنٹے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ انسان انسانیت کو بھول کر خون خوار جانوروں سے بھی بدتر ہو گیا تھا۔ ہگلی ندی کتنی لاشوں کو بہا کر سمندر کے اندر لے گئی؟ اس کا کوئی

حساب نہیں ہے۔ شہر کی سڑکیں اور گلیاں بھی ڈراؤنی اور بھیانک لاشوں سے
اَٹی پڑی تھیں۔ جو لوگ کم زور اور مجبور تھے ہر جگہ انھی پر زیادہ ظلم ڈھایا گیا۔
جب قتل عام ہوا تو شہر پر گدھوں نے قبضہ کرلیا۔ شہر میں بیس ہزار لوگ قتل
ہوئے تھے۔ ۱۶؍اگست سے ۱۷؍اگست تک بلوہ روکنے کی کوئی کارروائی نہیں
کی گئی اور ہزاروں انسان قتل کر دیے گئے۔ ہزاروں مکان لوٹے اور جلائے
گئے۔ چار دن تک خوں ریزی، قتل اور زیادتیاں ہوتی رہیں۔ چھ سات ہزار
آدمیوں کا خون ہوا۔ تین دن تک سڑکوں پر لاشیں پڑی رہیں۔ تین ہزار سے
زیادہ لاشیں جا بجا سے ہٹائی گئیں۔ بہت سی لاشیں زمین دوز نالوں میں ڈال
دی گئیں جن کی تعداد کا اندازہ ہی نہیں ہو سکا۔''
(آدھی رات کی آزادی، ص ۲۸، ماونٹ بیٹن این آفیشل آٹو بایوگرافی، ص
۳۵۳۔ مولانا آزاد۔۔ایک سیاسی ڈایری: ص ۳۹۰)

یہ خون ریزی اور تباہی بہت جلد کلکتہ سے نواکھالی منتقل ہو گئی جہاں ہندو آبادی صرف
بیس فیصدی تھی۔ شاید نفیر جہاد پاکستان کے لیے نواکھالی کا میدان کلکتہ سے زیادہ ہم وار
تھا۔

''بابو راجندر پرشاد اپنی تصنیف میں کہتے ہیں، نواکھالی اور تری پورہ کے
ضلعوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، ہندوؤں پر حملہ کر دیا گیا۔ بہت
سے ہندو مارے گئے اور ہندو آبادی کے گاؤں کے گاؤں جلا دیے گئے اور
ہزاروں کی تعداد میں مسلمان بنا لیے گئے۔ بیشتر عورتوں کے ساتھ جبراً شادی
کر لی گئی۔ بہت سی بھگا کر کہیں سے کہیں کر دی گئیں۔ ان واقعات کا حاصل یہ
نکلا کر ہندوؤں میں جذبۂ انتقام سرایت کر گیا۔ ادھر مسلم لیگ کے لیڈر اور
اخبارات روزانہ زہر اگلتے رہتے تھے اور ہندوؤں کو جنگ کے لیے للکارتے
تھے۔'' (مولانا آزاد۔ ایک سیاسی ڈایری: ص ۳۹۳)

(شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی: ص ۹۳-۵۹۱)

''ڈایریکٹ ایکشن ڈے''

۱۶؍اگست ۱۹۴۶ء: مسٹر جناح نے ۱۲؍اگست کو اعلان کیا کہ ۱۶؍اگست کا دن

ہندوستان بھر میں ''ڈائریکٹ ایکشن ڈے'' کے طور پر منایا جائے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے مسلم لیگ کی اعلا قیادت نے اس کا پروگرام مرتب نہیں کیا۔ مقامی مسلم لیگیوں نے اپنی اپنی صواب دید کے مطابق جلسے جلوسوں کا اہتمام کیا۔ ۱۶ر اگست کو کلکتہ میں قیامت ٹوٹ پڑی۔ وائسرائے کلکتہ کے ہول ناک حالات کا جائزہ لینے کے لیے ۲۴ر اگست کو بہ ذات خود کلکتہ پہنچا۔ اس نے زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں اور حکام سے ملاقات کر کے احوال سے آگاہی حاصل کی۔ فرقہ وارانہ فسادات اس قدر وسیع تھے کہ اتلاف جان و مال کا صحیح اندازہ ممکن نہ تھا۔ محض قیاس آرائیاں تھی۔ ان کے مطابق پانچ ہزار بے گناہ انسان جاں بہ حق ہوئے۔ پندرہ ہزار زخمی ہوئے اور ایک لاکھ کے قریب بے گھر، لیکن سی پی کے گورنر سر ہنری ٹونہم کے بیان کے مطابق ہلاک شدگان کی تعداد چالیس ہزار سے زاید تھی۔ حکومت بنگال نے صرف ان لاشوں کو شمار کیا جو گلی کوچوں میں بکھری پڑی تھیں، جو لاشیں دریا برد کر دی گئیں وہ شمار نہیں کی گئیں۔ مالی نقصان کا اندازہ دو ارب روپے لگایا گیا۔

(ابوالکلام آزاد اور قوم پرور مسلمانوں کی سیاست: ص ۲۷-۴۲۶)

بنگال کے فرقہ وارانہ فسادات پر ردِ عمل:

وائسرائے ماؤنٹ بیٹن کہتا ہے کہ ۸ر اپریل ۱۹۴۷ء کو شام چھ بجے مسٹر جناح مجھ سے ملنے کے لیے آئے۔ انھوں نے مجھے ''ڈائریکٹ ایکشن'' کا پس منظر سمجھاتے ہوئے کہا کہ ''جب تک انھوں نے ''ڈائریکٹ ایکشن'' کا حربہ استعمال نہیں کیا مسلم لیگ کی پوزیشن زیادہ سے زیادہ کم زور ہوتی گئی۔''

سر محمد یامین لکھتے ہیں:

> ''کلکتہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں سخت کشیدگی پیدا ہو گئی تھی وہ ڈائریکٹ ایکشن کا مفہوم نہ سمجھتے تھے۔ ہندوؤں نے یہ خیال پیدا کر دادیا کہ مسلمان کو ماریں گے اور لوٹیں گے۔ ادھر مسٹر حسین شہید سہروردی نے جو بنگال کے وزیر اعظم ہیں، اور لیگ کے سربرآوردہ ممبر ہیں ناعاقبت اندیشی سے آج کی عام تعطیل کر دی۔ ڈائریکٹ ایکشن کس طرح ہوگا اس کی کوئی ہدایت نہیں کی۔ مسلم لیگ نے جلوس نکالا۔ اس کے ہم راہ غنڈے ہو گئے۔ ادھر ہندو

غنڈے جمع ہو گئے۔ اور خوب کشت و خون ہوا، ہزارہا آدمی زخمی ہوئے، صدہا مارے گئے، آگ لگائی گئی، مال لوٹا گیا اور خوب شور و شغب ہوا۔"

چودھری خلیق الزماں رقم طراز ہیں:

"ہندوستان اور پاکستان میں جتنا اتلاف جان و مال ہوا اس کا ذکر کرنا بے کار ہے۔ اب چودہ برس بعد قلب و جگر کے ناسوروں کو کریدنے سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ اس لیے جہاں تک ممکن ہوگا اس کے ذکر سے گریز کروں گا۔ باوجود اس کے یہ لکھنا پڑتا ہے کہ کلکتہ میں ۱۶ر اگست ۱۹۴۶ء کو اتنا بڑا فرقہ وارانہ فساد ہوا، جس سے پہلے کوئی اس کی نظیر نہیں ملتی۔"

اگرچہ "ڈائریکٹ ایکشن ڈے" مسلم لیگ کی ہدایت کے مطابق پورے ہندوستان میں منایا گیا، جلسے منعقد ہوئے، جلوس نکالے گئے، دھواں دھار اشتعال انگیز تقریریں ہوئیں، لیکن فرقہ وارانہ جنون، وحشت اور بربریت کا ہول ناک خون ریز مظاہرہ صرف صوبۂ بنگال کے شہر کلکتہ میں ہی ہوا۔ جہاں مسلم لیگ کی حکومت مسٹر حسین شہید سہروردی کی سربراہی میں قایم تھی۔ شورش کاشمیری لکھتے ہیں "بنگال کے وزیر اعظم لاہور سے پنجابی نوجوانوں کو پولیس میں بھرتی کر کے لے گئے، انھوں نے اعلان کر رکھا تھا وہ کانگریس کی عبوری مرکزی حکومت کو ان حالات میں نہیں مانیں گے۔" فرقہ وارانہ قتل و غارت گری، لوٹ مار اور آتش زنی کی جو ابتدا کلکتہ سے ہوئی تھی اس نے جلد ہی پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جب یہ حقیقت منظر عام پر آئی کہ کلکتہ میں مسلمانوں کو جان و مال کا زیادہ نقصان برداشت کرنا پڑا ہے تو نوا کھالی، جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی، فسادات پھوٹ پڑے (اکتوبر) اور کلکتہ کا بدلہ یہاں چکایا۔ بس پھر کیا تھا نوا کھالی سے یہ وبا بہار پہنچی (اواخر اکتوبر) بہار سے گڑھ مکتیشر (اوایل نومبر) اور پھر پورے ہندوستان میں متعدی مرض کی طرح پھیل گئی۔

بہار کی صورتِ حال:

بہار میں مسلمانوں کو جس عذاب کا سامنا کرنا پڑا تھا اس کی نقشہ کشی شورش کاشمیری نے کی ہے جو جیوش احرار کو لے کر بے گھروں کی آباد کاری اور بحالی کے لیے بہار گئے تھے۔

انھوں نے چشم دید حالات کی دل دوز اور ہول ناک تصور کشی کی ہے۔ لکھتے ہیں ''ہم ایک حویلی میں داخل ہوئے، اندر قدم رکھا تو ویرانی ہی ویرانی تھی، تمام چوبی دروازے نکال لیے گئے تھے، سامان لوٹ لیا گیا تھا، دیواروں پر لہو کی دھاریں تھیں، کپڑوں کو آگ لگادی گئی تھی..... میں اس لرزہ خیز حالت کو دیکھ کر سہم گیا اور جب گاؤں کا مسلمان محلّہ دیکھا تو میرے بدن کا انگ انگ کانپ اٹھا، جنگ کی تباہ کاریوں کا نقشہ یاد آگیا کہ فاتح قومیں کس طرح آبادیوں کو برباد کرتی ہیں۔ برقعوں میں دوڑتی ہوئی لڑکیوں کے کٹے ہوئے سر دیکھے، اوپلوں کی آگ سے جلی ہوئی لاشیں، کتابوں کی راکھ، ٹوٹے ہوئے برتن، پھٹی ہوئی دیواریں، زنانہ میں کنواں، کنویں میں تعفن، انسانوں کے گوشت کی سڑاند، ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کا بجھا ہوا لاؤ، فضا میں نالۂ ناکشیدہ اور ہوا میں آہِ نارسیدہ، شقاوت، بربریت، تعدی، استبداد، ہلاکت، بے رحمی، سنگ دلی اور خون ریزی کی منہ بولتی تصویریں، کیلوں سے دیواروں میں ٹھکے ہوئے معصوم بچے، مقتول سہاگنوں کا لٹا پٹا سہاگ، بچوں کے پنجر...... مرنے والے کون تھے؟ کسان، مزارع، مزدور، محنت کش، کمیرے اور ان کی مائیں، بہنیں، بیٹیاں، بیویاں، جگر پارے، نورِ نظر، برباد کون ہوا تھا؟ ان کے سہاگ ان کی عزتیں، ان کے ناموس، ان کی حمیت، ایک آگ تھی جو پہلے سلگائی گئی، پھر بھڑکائی گئی، آخر بجھادی گئی، آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا۔''

آغا شورش کاشمیری نے حکومت کی غفلت شعاری، تساہل پسندی، بے اعمالیوں اور مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگنے والوں کو بے نقاب کرنے کے لیے دوقومی نظریہ کے پشتی بان ممبران صوبائی اسمبلی اور مسلمان سرکاری افسروں سے رابطہ قایم کیا کہ وہ احتجاجاً مستعفی ہوجائیں۔ حسن امام نے کہا ''اس سے کیا بنتا ہے؟ صوبے کا انسپکٹر جنرل پولیس مسلمان تھا، اس کی ریٹائرمنٹ میں تین چار ماہ باقی تھے وہ ہندو پولیس افسروں کو اس ذبحِ عظیم کے لیے موردالزام ٹھہرا کر وزارت کی چشم پوشی پر احتجاجاً مستعفی ہوسکتا تھا۔ اس سے نہ صرف صوبے کی حکومت بدنام ہوتی بلکہ مرکزی حکومت کو بھی لینے کے دینے پڑ جاتے۔'' سب ظلم کا واویلا کرتے تھے لیکن عملی قدم اٹھانے پر کوئی تیار نہ تھا، بس زبانی کلامی مسلمانوں کے غم میں شریک تھے۔ مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے جو رضا کار ریلیف کے کام کے لیے وہاں گئے تھے ان کے رہنما گراں ہوٹلوں میں مقیم تھے۔ مولانا آزاد کی تحریک پر مجلس احرار کے رضا کار اور

صوبۂ سرحد سے سرخ پوش باچا خان کی رہنمائی میں وہاں مسلمانوں کی بحالی اور آبادکاری کے لیے طویل عرصہ تک کام کرتے رہے۔ باچا خان کے برقی پیغام پر گاندھی جی ہندو عوام اور پریس کی مخالفت کے باوجود پٹنہ پہنچے اور صوبائی کانگریسی وزارت کو لعن طعن کیا۔

"تم نے ستیہ کو ذبح کیا ہے اور اہنسا کو آگ میں جھونکا ہے، میں تم سے خوش نہیں ہوں۔"

مولانا (آزاد) فسادزدہ علاقوں کے دورے پر بہار پہنچے، ایک جگہ لاشوں کا ڈھیر دیکھ کر سکتے میں آ گئے۔ لاشیں دفن کروائیں فاتحہ پڑھی اور ضلع کانگریس کے صدر سے مصافحہ کیے بغیر لوٹ گئے۔ مقامی عہدے داروں کو بھی شرف باریابی نہ بخشا۔ ان سے طنزاً صرف اتنا کہا "تم نے اہنسا کی لاج رکھ لی ہے، واقعی تم بڑے ستیہ وادی ہو۔"

لیگی قیادت اور بہار:

دوقومی نظریے کی سیاست کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھنے والے مسلمانوں کی امداد و اعانت کے لیے قوم پرست مسلمانوں کے ادنا رضا کار سے لے کر اعلا قیادت تک موقع پر پہنچے۔ لیکن دوقومی نظریہ کا پشتی بان کوئی اعلا رہنما زخم خوردہ اور ستم رسیدہ مسلمانوں کو دلاسہ دینے نہ آیا، یہ بے چارے ایڑیاں اٹھا اٹھا کر مسلم لیگی قایدین کی راہ تکتے رہے، جن کی جذباتی تقاریر نے انھیں مشتعل بنا رکھا تھا اور یہ سب کیا دھرا انھی حضرات کی غلط سیاست کا تھا۔ مسلم لیگ کی اعلا قیادت میں سے کسی کو اس طرف آنے کی توفیق نہ ہوئی۔ حال آں کہ ان کی آمد سے جہاں متاثرہ مسلمانوں کی ہمت افزائی ہوتی وہاں حکومت پر اس کا بہت زیادہ اثر ہوتا وہ اپنی ندامت مٹانے اور سرخروئی کے لیے لازماً ایسے اقدامات کرتی جس کا فایدہ صرف تباہ حال مسلمانوں کو پہنچتا، لیکن مسلمانوں کی واحد نمایندگی کے کسی دعوی دار کو اس طرف منہ اٹھا کر دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ مسلم لیگی قایدین کے فسادزدہ علاقوں کا دورہ نہ کرنے کے اقدام پر روزنامہ "اسٹیٹ مین" نے تنقید کی تو سردار عبدالرب نشتر نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے اس کی شکایت کی۔

لیگ کا ریلیف فنڈ:

اس کے برعکس باچا خان کی سربراہی میں صوبۂ سرحد کے سرخ پوش اور احرار کے رضا

کار تقسیم ملک تک بہاریوں کی بحالی اور آباد کاری میں مصروف رہے۔ مسلم لیگ نے "بہار ریلیف فنڈ" قایم کیا، اس میں پچھتر لاکھ روپے جمع ہوئے، اس فنڈ سے بہاریوں کی آباد کاری کے لیے ایک پیسہ خرچ نہیں کیا۔ یہ فنڈ اب بھی حبیب بنک میں پڑا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس فنڈ نے حبیب بنک کی نشو و افزایش میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔
(ابوالکلام آزاد اور قوم پرست مسلمانوں کی سیاست: ص ۴۲۷-۳۰)

عارضی حکومت ــــ مولانا آزادؒ کی عدم شرکت:

مولانا ابوالکلام آزادؒ نے فرمایا:
۱۷/ اگست ۱۹۴۶ء: کانگریس نے عارضی حکومت کی تشکیل کا کام پارلیمنٹری پارٹی کے سپرد کیا تھا۔ چناں چہ میں، جواہر لال نہرو، سردار پٹیل اور راجندر پرشاد اس سلسلے میں ۱۷ / تاریخ کو ملے۔ میرے ساتھیوں کا اصرار تھا کہ مجھے انٹیرم حکومت کی کابینہ میں شامل ہو جانا چاہیے۔ گاندھی جی کا بھی یہی خیال تھا۔ میرے لیے یہ مسئلہ بہت نازک تھا، لیکن بہت سوچنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے الگ رہنا چاہیے۔
(انڈیا ونس فریڈم: ص ۲۵۰)

عارضی حکومت کا قیام ــــ مولانا آزاد کا بیان:

۱۸/ اگست ۱۹۴۶ء: مولانا ابوالکلام صاحب آزاد نے ۱۸/ اگست ۱۹۴۶ء کو ایک بیان میں فرمایا:

> "سب جانتے ہیں کہ کانگریس نے عارضی مدت کی تجاویز کو مشروط ہونے کی بنا پر رَدّ کر دیا تھا۔ والیسرائے نے اب نیا دعوت نامہ بھیجا ہے جو غیر مشروط ہے اور کانگریس آزاد ہے جو تجویز چاہے پیش کرے۔ لیکن لیگ اور دیگر فرقوں سے مصالحت کے پیش نظر کانگریس کسی نئی تجویز کو پیش کرنے سے باز رہی اور وہ پہلی ہی بنیاد پر عارضی حکومت بنانے کے لیے تیار ہے، یعنی ۶ کانگریسی، ۵ لیگی، اور تین دیگر اقلیتوں کے نمایندے، کل ۱۴۔
>
> لیگ نے قطعی طور پر سے تسلیم کر لیا تھا۔ چناں چہ کانگریس کے رَدّ کر دینے کے بعد بھی وہ اسی بنیاد پر عارضی حکومت کے بنانے پر مصر رہی۔ اسی

طرح کانگریس نے وہ پیش کش لیگ کے سامنے رکھ دی ہے جو وہ برطانیہ کی طرف سے پہلے قبول کر چکی ہے، صرف فرق اتنا ہے کہ اب برطانیہ نہیں بلکہ (کانگریس) کابینہ بنا رہی ہے۔ بد قسمتی سے مسٹر جناح نے کانگریس کی طرف سے تعاون کی اپیل کو رد کر دیا۔ وقت بہت نازک ہے اور خطرات سے پر ہے۔ لہٰذا غصہ اور جلد بازی سے کوئی قدم نہ اٹھانا چاہیے۔ برطانیہ اس پر رضا مند ہو گیا ہے کہ بغیر اس کی مداخلت کے ہندوستانی خود معاملات طے کریں۔ مسلم لیگ کے لیڈروں کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں۔ اب دیکھنا ہے کہ کانگریس نے دوستی کا جو ہاتھ بڑھایا ہے وہ اسے پکڑتے ہیں یا حقارت سے جھٹک دیتے ہیں۔ میں پھر مسلم لیگ کے لیڈروں سے اپیل کرتا ہوں کہ ٹھنڈے دل سے صورت حالات کا جائزہ لیں اور ایک ایسا فیصلہ کریں جو ملک اور قوم کے لیے فائدہ مند ہو۔''

(اخبار اجمل۔ بمبئی: ۱۹/اگست ۱۹۴۶ء، جلد ۱۹، ص ۲۰۶)

عارضی حکومت کا قیام — مسٹر جناح کا بیان:

۱۸/اگست ۱۹۴۶ء۔ مسٹر جناح نے اپنے ۱۸/اگست ۱۹۴۶ء کے بیان میں جواہر لال کی ملاقات پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا جو تجاویز جواہر لال نے پیش کیں وہ یہ تھیں کانگریس وزارت بنائے گی اور وہ چودہ نشستوں میں سے پانچ نشستیں مسلم لیگ کو دینے پر تیار ہے اور باقی نو نشستیں کانگریس نمایندوں سے پوری کی جائیں گی۔ جن میں ایک کانگریس کا پسند کردہ مسلمان بھی شامل ہوگا۔ اور یہ کہ یہ کابینہ صرف موجودہ مرکزی اسمبلی کے سامنے جواب دہ ہوگی۔ جہاں کہ کانگریس کو ایک مسلمان ووٹ کے مقابلے میں کم از کم تین ووٹ حاصل ہیں اور مزید یہ کہ وائسرائے ایک آئینی گورنر جنرل ہوں گے اور وہ اپنا حق استرداد نہیں استعمال کر سکتے۔ (کتنا بڑا جرم ہے!) اور نہ کوئی دوسری بیرونی طاقت اس کابینہ کے کاموں میں مداخلت کر سکتی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ وہ موجودہ آئین کے مطابق گورنر جنرل کی ایگزیکیٹو کونسل مرتب کر رہے ہیں۔ بلکہ اس طرح مرتب کی ہوئی حکومت ایک عارضی قومی حکومت ہوگی۔ یہی وہ پلان تھا جس کا اظہار جواہر لال نے مجھ سے

کیا اور وہ بالکل ظاہر ہے کہ میں اس قسم کی تجویز کو قطعاً منظور نہیں کرسکتا تھا کیوں کہ اس کو منظور کرنے کے بعد مسلم مطالبہ اور ہماری منزل پاکستان پر گفتگو کرنے کے لیے کچھ باقی نہیں رہ جاتا۔ (اجمل۔ بمبئی: ۱۹/ اگست ۱۹۴۶ء، ۲۱/ رمضان المبارک ۱۳۶۵ھ)

اس بیان پر مولانا سید محمد میاں نے ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:

مسٹر جناح نے اس بیان میں جس غلط بیانی اور توہم پرستی سے کام لیا ہے وہ قاید اعظم کے لیے حد درجہ شرم ناک ہے۔

"آپ نے کانگریسی مسلمان کو گویا دایرۂ اسلام سے بھی خارج سمجھا اور اقلیتوں کے نمایندوں کو بھی کانگریس نمایندہ ہی کہا۔ مزید براں مرکزی اسمبلی میں کانگریس کو لیگ کے مقابلے میں تین گنا زیادہ بتایا۔ حال آں کہ مرکزی اسمبلی ❶ میں ۱۴۲ ممبروں میں کانگریس کے ممبر صرف چھپن (۵۶) ہیں۔ چالیس ممبر سرکاری ہیں اور لیگ کے ممبر تیس (۳۰) ہیں۔ باقی دوسری جماعتوں اور اقلیتوں کے ممبر ہیں۔ اب تمام غیر لیگی ممبروں کو کانگریس ممبر قرار دینا اور یہ سمجھ لینا کہ ہر موقع پر وہ کانگریس ہی کا ساتھ دیں گے۔ انتہا درجے کی توہم پرستی ہے جو مرکزی اسمبلی کی تاریخ کے سراسر مخالف ہے۔ مسٹر جناح نے اس اعلان میں اس کا بھی اعتراف کرلیا کہ ان کی اور ان کی لیگ کی سیاست کا مدار صرف وایسرائے بہادر اور وزیر ہند کی نظر عنایت پر ہے۔

خود اپنی قوت کے اعتماد پر مسلم لیگ اپنی سیاست میں ناکام ہے یا یہ کہ اپنی کوئی سیاسی قوت رکھتی ہی نہیں۔

بہ ہر حال مسٹر جناح نے مصالحت کے اس زرین موقع کو بھی کھو دیا اور جو دلیلیں پیش کیں وہ قطعاً لغو اور لچر۔ جو چیز ان دلایل سے نمایاں تھی وہ یہ کہ وایسرائے کے ویٹو اور امتیازی اختیارات کا بار بار تذکرہ کر کے اپنی نیاز مندی کا خوش آمدانہ ثبوت دیا جارہا تھا اور کانگریس کے برخلاف برطانوی ارکان دولت کو برانگیختہ کیا جارہا تھا۔"

حاشیہ ❶: مرکزی اسمبلی میں ۱۹۴۵ء کے انتخابات کے بہ موجب پارٹی پوزیشن حسب ذیل ہے۔

کانگریس چھپن (۵۶)، مسلم لیگ تیس (۳۰)، اکالی (۲)، یوروپین (۸)، دیگر متفرق (۶)، کل (۱۰۲) ممبر جو انتخاب کے ذریعہ ممبر بنے۔ ان کے علاوہ چالیس سرکاری ممبر ہوتے ہیں

جن کی تفصیل یہ ہے کہ

وائسرائے کے نامزد ممبر (نان آفیشل) ۱۴، سرکاری (آفیشل جو سرکاری عہدے کی بنا پر اسمبلی کے ممبر بن جاتے ہیں) ۲۶۔ کل ۴۰۔

مسلم لیگ کا یوم راست اقدام اور مسلمانوں کی تباہی:

۲۲/اگست ۱۹۴۶ء: ۱۴/اگست ۱۹۴۶ء کو مسٹر محمد علی جناح کے ڈائریکٹ ایکشن ڈے منانے کے اعلان اور مسٹر حسین شہید سہروردی وزیراعظم بنگالی کے اس روز عام تعطیل کر دینے سے کلکتہ میں جو فسادات پھوٹ پڑے تھے جس میں ہزاروں مسلمان شہید اور گھر تباہ ہو گئے۔ ظلم و بربریت کا ہر طرف بازار گرم ہو گیا۔ یہ فتنے کا پہلا بیج تھا جو ایک رہنما کے فیصلے نے بویا تھا۔ اس پر مزید ظلم یہ کہ اسے جہاد قرار دیا گیا۔ میر مشتاق احمد (دہلی) نے حضرت مفتی صاحب سے استفسار کیا تھا:

سوال: کلکتہ کے فساد کو بعض لوگ جہاد سے تعبیر کر رہے ہیں اور مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو بھڑکا کر اس سے ناجائز فایدہ اٹھا رہے ہیں۔ جناب سے درخواست ہے کہ مذہبی اور اخلاقی نقطۂ خیال سے جہاد پر چند سطور اپنے دست مبارک سے تحریر فرمائیں۔ نیز اس بات پر روشنی ڈالیں کہ بچوں، عورتوں اور بوڑھوں ناتوانوں کو بے خبری میں تلوار کے گھاٹ اتارنا کسی طرح بھی جائز ہے؟

۲۲/اگست ۱۹۴۶ء   المستفتی میر مشتاق احمد، دہلی

جواب: اس فساد کو جہاد بتانے والے کیا یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس کی ابتدا مسلمانوں نے بہ نیت جہاد کی تھی؟ اگر وہ تسلیم کرتے ہوں تو پھر ان مجاہدین کے امیر اور پیشوا پر یہ ذمہ داری عاید ہو گی کہ اس نے عورتوں، بوڑھوں، بچوں پر کیوں تعدی کرنے دی؟ کیوں کہ جہاد میں عورتوں، بچوں، بوڑھوں سے تعرض نہیں کیا جاتا۔ ہمیں تو ابھی تک فساد کی صحیح نوعیت معلوم نہیں ہو سکی۔ ہاں اس کی شخصی صورت کہ عورتوں بوڑھوں بچوں کو قتل کیا، جلا دیا، ہاتھ پاؤں کاٹ دیے، مکانوں کو جلا دیا۔ یہ شرعی جہاد کی صورت نہیں ہے۔ اسے تو فساد ہی کہا جا سکتا ہے۔   محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ- دہلی

(کفایت المفتی (جلد نہم) کتاب السیاسیات)

عارضی قومی حکومت کا قیام:

۲۴ر اگست ۱۹۴۶ء: ضروری امور کے طے کرنے میں تقریباً دو ہفتہ صرف ہوئے۔ پھر اگست کی آخری تاریخوں میں ارکان حکومت اوران کے متعلق محکموں کا اعلان کر دیا گیا اور ۲ر ستمبر ۱۹۴۶ء/ ۵ر شوال المعظم ۱۳۶۵ھ یوم دوشنبہ کو نام زد ارکان نے اپنے محکموں کا چارج لے کر کام شروع کر دیا۔

۲۴ر اگست ۱۹۴۶ء کو ارکان حکومت کے ناموں کے اعلان کے ساتھ وایسرائے ہند نے ایک تقریر براڈ کاسٹ کی، اس تقریر میں آپ نے لیگ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

"کسی کو اس بات پہ مجھ سے زیادہ یقین نہ ہوگا کہ ہندوستان کی تمام جماعتوں اور فرقوں کے مفاد کی خاطر ایک ایسی مخلوط حکومت کی ضرورت ہے جس میں دونوں بڑی جماعتوں کو نمایندگی حاصل ہو۔ مجھے علم ہے کہ صدر کانگریس پنڈت جواہر لال نہرو اور ان کے رفقا کار اس خیال پر میری طرح شدت سے متفق ہیں۔ میری طرح صدر کانگریس کی اب بھی یہی کوشش ہوگی کہ لیگ کو حکومت میں شامل ہونے پر راضی کیا جائے۔ مجھے اس پیش کش کو جو کہ مسلم لیگ کو کی گئی ہے اور جواب بھی قایم ہے وضاحت سے بیان کرنا چاہیے۔ وہ چودہ ممبروں پر مشتمل حکومت کی پانچ نشستوں کے لیے نام پیش کر سکتی ہے، جن میں ۶ کانگریس نام زد کرے گی اور تین اقلیتوں کے نمایندے ہوں گے۔ اگر یہ نام میرے لیے قابل قبول ہوں اور ملک معظم بھی انھیں منظور کر لیں تو حکومت کو فوراً تبدیل کر کے انھیں اس میں شامل کر لیا جائے گا۔

مسلم لیگ کو اس بات کا کوئی خوف نہ ہونا چاہیے کہ کسی اہم معاملے میں اسے ووٹ کی اکثریت سے شکست دے دی جائے گی، مخلوط حکومت صرف اس شرط پر ہی قایم رہ سکتی اور کام کر سکتی ہے کہ اس میں شریک ہونے والی دو پارٹیوں کو اطمینان حاصل ہو۔ میں یہ خیال رکھوں گا کہ وزارت کے اہم قلم دانوں کی تقسیم مساوی طور پر ہو۔ مجھے خلوص کے ساتھ اعتماد ہے کہ لیگ اپنی پالیسی پر دوبارہ غور کرے گی اور حکومت میں شامل ہونے کا فیصلہ کرے گی۔ اس دوران ہندوستان کے نظم ونسق کو جاری رہنا ہے اور بعض ایسے مسایل در

پیش ہیں جن کا فیصلہ کرنا ضروری ہے۔ میں خوش ہوں کہ ملک کے سیاسی خیالات کی بہت بڑی جماعت کے نمایندے حکومت کا کام چلانے میں میرے شریک کار ہوں گے۔ میں اپنی کونسل میں ان لوگوں کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ میں خوش ہوں کہ اب سکھوں نے بھی آئین ساز اسمبلی اور عارضی حکومت میں شریک ہونے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ فیصلہ خردمندانہ ہے۔" (تیج: ۲۸/اگست ۱۹۴۶ء، جلد ۲۵، ص ۱۷۳)

۲۵/اگست ۱۹۴۶ء: کو مسٹر جناح نے ایک بیان جاری کیا جس میں وایسرائے کی اس تقریر کے متعلق کہا کہ "گم راہ کن اور واقعات کے خلاف ہے۔"
(قومی گزٹ۔ دہلی: ۲۷/اگست ۱۹۴۶ء)

عبوری حکومت کے ایک مسلمان ممبر پر لیگیوں کا قاتلانہ حملہ:

۲۵/اگست ۱۹۴۶ء: کانگریس نے عارضی حکومت میں سر شفاعت احمد، آصف علی اور سجاد ظہیر کو نام زد کیا تھا۔ لیکن لیگیوں کو یہ بات ہرگز گوارا نہ تھی کہ حکومت میں کوئی ایسا مسلمان شامل ہو جسے لیگ نے نام زد نہ کیا ہو۔ سر شفاعت احمد پر انھیں خاص طور پر غصہ تھا اس لیے کہ وہ اس سے قبل نہ صرف مسلم لیگ میں شامل رہ چکے تھے بلکہ سنٹرل اسمبلی میں لیگ کے پارلیمنٹری سکریٹری بھی رہ چکے تھے۔ ان پر قاتلانہ حملے کا ایک خاص پس منظر تھا۔ جانباز مرزا نے اپنی تالیف کاروانِ احرار (جلد ۷) میں اس واقعے کی تفصیل اور اس کے پس منظر پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

۲۵/اگست ۱۹۴۶ء وایسرائے ہند کی عبوری حکومت کے نام زد ممبر سر شفاعت احمد پر رات آٹھ بجے شملہ میں دو مسلم نوجوانوں نے حملہ کردیا۔

وہ سیر و تفریح سے واپس آرہے تھے کہ دھر بنگاہ کے قریب انھیں چھرا گھونپ دیا گیا۔ اس حملے میں ان کے جسم پر سات زخم آئے۔ سر، سینہ اور گردن کے زخم مہلک تھے۔ انھیں فوراً ہسپتال بھیج دیا گیا۔

اس حادثے کا ذکر کرتے ہوئے سر محمد یامین خان اپنی کتاب "نامۂ اعمال" کے حصہ دوم کے صفحہ ۱۸۱ پر رقم طراز ہیں:

"شفاعت احمد خاں یہاں شملہ پر چہل قدمی کے لیے حسب معمول ایک تنہا سڑک پر جا رہے تھے کہ پیچھے سے ایک دل جلے کشمیری نو جوان نے گردن پر چھرا دے مارا اور بھاگ گیا۔ گردن پر گہرا زخم لگا اور خون بہت نکلا۔ یہ زمین پر گر گئے اور بے ہوش تھے، وہاں سے اٹھا کر ایک قریب کے گھر میں لے جایا گیا اور ان کے بھائی کرنل (اے) رحمان اور بیگم (اے) رحمان کو اطلاع ہوئی، وہ فوراً آئے۔

کرنل (اے) رحمان بہت غصے میں بھر گئے اور محمد جان کے سامنے جو قریب ہی رہتے تھے کہا اگر شفاعت احمد مر گئے تو میں جناح کو پھانسی دلوا دوں گا۔ لوگوں نے سمجھایا کہ ایسی بات نہ کہیے۔ سرجن آ گئے۔ گردن پر ٹانکے لگے اور شفاعت احمد بچ گئے۔

شفاعت احمد کے قتل کا اصل منصوبہ:

مجھ کو بعد میں معلوم ہوا کہ "سازش اصل یہ تھی کہ چوٹ سے زخمی کر کے کھڈ میں دھکیل دیں تاکہ سر کی چوٹ سے یہ معلوم ہو کہ پہاڑ سے گرنے سے موت ہوئی ہے اور تمام ہڈیاں پسلیاں ٹوٹ جائیں گی۔ اگر زندہ بچ جائیں تو بھی آیندہ مفلوج اور بے کار ہو جائیں گے۔

شفاعت احمد حملے سے بچ گئے۔ مگر مسلم لیگیوں میں اس واقعے سے ڈر پھیل گیا کہ اگر کسی نے غداری کی تو اس کا بھی یہی حشر ہو گا۔"

سر محمد یامین خان حکومتِ برطانیہ کے خطاب یافتہ ہیں اور سنٹرل اسمبلی میں مسلم لیگ کے پارلیمنٹری سیکریٹری رہ چکے ہیں۔ ان کی مندرجۂ بالا عبارت سے مترشح ہوتا ہے کہ سر شفاعت احمد پر قاتلانہ حملہ سوچے سمجھے پروگرام کا ایک حصہ ہے۔ جسے سر یامین خان نے بے نقاب کر دیا۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ شفاعت احمد کے بعد مسٹر آصف علی اور سجاد علی ظہیر بھی ایسے حملے کا شکار ہوتے۔

سیاسی اختلاف کی بنا پر مسلمان کا مسلمان کے خلاف اس حد تک آمادۂ پیکار ہو جانا کہاں تک درست ہے؟ اس سوال کا جواب آیندہ مؤرخ کی ذمہ داری ہے۔

(کاروانِ احرار: (جلد ۷)، ص ۵۹-۲۵۸)

عارضی حکومت کا قیام۔ وائسرائے کی تقریر:

۲۸ر اگست ۱۹۴۶ء: وزارتی مشن کے منصوبے کو مسٹر محمد علی جناح نے منظور کر لینے

کے بعد مسترد کر دیا۔ وائسرائے ہند لارڈ ویول نے اپنی نشری تقریر مورخہ ۲۴ر اگست میں ان کے خدشات دور کرنے کی سعی کی ہے۔ ویسرائے نے کہا:

"عارضی حکومت میں شرکت کی دعوت دیتے ہوئے لارڈ ویول وائسرائے ہند نے ۲۴ر اگست ۱۹۴۶ء کو اپنی براڈ کاسٹ تقریر میں کہا تھا: مسلم لیگ کو اس بات کا کوئی خوف نہ ہونا چاہیے کہ کسی اہم معاملے میں اسے ووٹ کی کثرت سے شکست دے دی جائے گی۔ مخلوط حکومت صرف اس شرط پر ہی قایم رہ سکتی ہے اور کام کر سکتی ہے کہ اس میں شریک ہونے والی دو پارٹیوں کو اطمینان حاصل ہو۔ میں خیال رکھوں گا کہ وزارت کے اہم قلم دانوں کی تقسیم مساوی طور پر ہو۔ مجھے خلوص کے ساتھ اعتماد ہے کہ لیگ اپنی پالیسی پر دوبارہ غور کرے گی۔ (تیج: ۲۸ر اگست ۱۹۴۶ء)

عارضی حکومت کی حلف وفاداری اور لیگ کا یوم ماتم:

اواخر اگست ۱۹۴۶ء: آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکریٹری نواب زادہ لیاقت علی خان صاحب نے ہدایت کی ہے کہ ۲ر ستمبر کو تمام دکانوں اور مکانات پر سیاہ جھنڈیوں کا مظاہرہ کیا جائے۔ مسرت کے موقع پر ماتمی مظاہرہ خود اشتعال انگیز تھا۔ چناں چہ بمبئی میں یکم ستمبر ہی سے لیگ اور کانگریس کی جھنڈیوں کا مقابلہ شروع ہو گیا۔ لیگ کی سیاہ جھنڈیوں کے مقابلے میں کانگریس کے ترنگے جھنڈے لہرانے شروع کر دیے گئے اور اسی سے فساد کا آغاز ہو گیا۔ حکومت بمبئی نے حالات پر قابو پانے کی انتہائی جدوجہد کی۔ تاہم یہ سلسلہ دو ماہ سے زاید جاری رہا اور ہوم منسٹر بمبئی کے بیان کے بہ موجب تقریباً ایک ہزار اشخاص ہلاک ہو گئے اور نو نے لاکھ کا مالی نقصان ہوا۔

بمبئی کے علاوہ مالیگاؤں، ڈھاکہ اور الہ آباد میں بھی فسادات ہوئے مگر ان کا دایرہ بہت محدود رہا۔ تقریباً ایک درجن آدمی ہلاک ہوئے۔ باقی تمام ہندوستان میں امن رہا۔

(علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے: (حصہ دوم)، ص ۲۶۳)

عارضی حکومت کا حلف، لیگ کا مظاہرہ اور احرار کا جلسہ:

۲ر ستمبر ۱۹۴۶ء: کونئی مرکزی کابینہ نے حلف وفاداری اٹھایا۔ مسلم لیگ نے اسے یوم سیاہ کے طور پر منایا اور مظاہرے کیے۔ اسی شام باغ بیرون دہلی گیٹ۔ لاہور میں ایک

عظیم الشان اجتماع عام سے خطاب کرتے ہوئے مجلس احرار کے نومنتخب صدر امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے کابینہ مشن پلان اور عبوری حکومت میں نمایندگی پر مسلم لیگی نقطۂ نظر کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا:

''مسلم لیگ نے وزارتی مشن تجویز کو قبول کر کے ایک مرکز اور ایک قوم کے اصول کو تسلیم کر لیا اور پاکستان کے مطالبے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا تھا، لیکن ڈیڑھ ماہ کی قلیل مدت گزرنے کے بعد اسی مسلم لیگ نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا۔ اب سارا جھگڑا اور معاملہ نشستوں کا رہ گیا ہے کہ مسلمانوں کو پانچ ملیں اور چھ نہ ملیں۔ میں مسٹر جناح سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کون سا بد بخت ہوگا جو کانگریس کی طرف سے حکومت میں شامل ہو کر مفاد کو نظر انداز کرے گا۔ احرار نے کانگریس کے سامنے پینتالیس اور دس کا فارمولا رکھا تھا لیکن اب مسلم لیگ نے اسے مسترد کر کے پینتیس فیصد قبول کر لیا ہے۔ اس طرح مسلم لیگ نے کانگریس کے ساتھ پینتالیس فیصد نیابت کے فارمولے پر بات چیت کا راستہ روک دیا ہے۔''

مسلم لیگ کی ضد بازی، بے جا اصرار، غیر حقیقت پسندانہ روش اور غیر مستقل مزاجی کا جائزہ لیتے ہوئے مجلس احرار کے صدر نے کہا:

''میری بات یاد رکھو! اگر قاید اعظم اپنی ضد پر اڑے رہے تو پھر ہندوستان ہی تقسیم نہیں ہوگا پاکستان بھی تقسیم ہوگا۔''

یہ الفاظ شاہ جی نے اس وقت کہے تھے جب وزارتی مشن منصوبے پر عمل درآمد کے لیے کوششیں ہو رہی تھیں۔ کانگریس اور مسلم لیگ اس کی تشریحات اور تاویلات اپنی اپنی مرضی اور منشا کے مطابق کر رہی تھیں۔ منصوبے کا مستقبل تاریک ہو رہا تھا۔ اس وقت شاہ جی نے متنبہ کیا کہ مفاہمت کی راہ اختیار کی جائے، بہ صورت دیگر ہلاکت خیزیوں کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ ملک تقسیم ہوا تو پھر تقسیم در تقسیم کا چکر بھی چلے گا، ملک ہی نہیں صوبے، اضلاع اور تحصیل تک تقسیم کی زد سے بچ نہ سکیں گے اور اس تقسیم سے جو تباہی مچے گی اس کی نقشہ کشی کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

''میں آج جہاں کھڑا ہو کر بول رہا ہوں ایک ویرانہ بننے والا ہے۔ مجھے

یوں محسوس ہوتا ہے کہ چاروں طرف آگ لگی ہوئی ہے، قافلے آ رہے ہیں اور قافلے جا رہے ہیں۔ ہندوستان مسلمانوں کے لیے ایک زندہ قبرستان ہوگا۔

یاد رکھو! تقسیم اگر ہوئی تو امرتسر تک کا علاقہ ہندوستان لے جائے گا اور پاکستان پر رفتہ رفتہ وہی لوگ قابض ہو جائیں گے جو آج بھی انگریز کے غم خوار اور نمک خوار ہیں۔ یہ امرا کی ایک جنت ہوگی۔ ننانوے فیصد عوام کے لیے یہی شب و روز ہوں گے اور اسلام ایک مسافر کی طرح ہوگا۔"

آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر مسٹر جناح نے عید الفطر کے پیغام میں نیشنلسٹ مسلمانوں کو مسلم لیگ میں شمولیت کی دعوت دی تھی۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری قبل ازیں آل پارٹیز کانفرنس کے انعقاد کی تجویز پیش کر چکے تھے۔ مسٹر جناح کے پیغام کا خیر مقدم کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

"......ہم نے گزشتہ برس مسٹر جناح کے سامنے تجویز رکھی تھی اور اس کے لیے تمام مسلمان جماعتوں کو مولانا آزاد کے مکان پر جمع کرنے کا ذمہ لیا تھا۔ لیکن مسٹر جناح نے ہماری اس اپیل کو بہرے کانوں سنا۔ ہم چاہتے تھے کہ مسٹر جناح اس کانفرنس میں بتائیں کہ پاکستان مسلمانوں کے لیے کس طرح مفید ہے۔

ایک طرف وہ غیر لیگی مسلمانوں کو مسلمان ہی نہیں مانتے اور دوسری طرف انھیں لیگ میں شمولیت کی دعوت دے رہے ہیں۔ اس واحد نمایندگی کے زعم میں جب انھیں ہندو اور انگریز سے منہ کی کھانی پڑی تو نیشنلسٹ مسلمانوں کے ساتھ احرار کو بھی دعوت دی جا رہی ہے...... میں اب بھی انھیں دعوت دیتا ہوں کہ وہ آل پارٹیز کانفرنس میں شریک ہو کر اپنی بات سمجھائیں۔"

(ابوالکلام آزاد اور قوم پرست مسلمانوں کی سیاست: ص ۶۳۱-۶۲۹)

عبوری کابینہ اور مسلم لیگ کا پر تشدد احتجاج:

۲ ستمبر ۱۹۴۶ء: ۲ ستمبر کو وائسرائے نے اپنی نئی کابینہ کے ساتھ وزرا سے حلف اٹھوایا۔ مسلم لیگ کے لیے یہ صدمے کا دن تھا، اس نے بس مس کر دی تھی۔ چناں چہ مسلم

لیگ نے اپنے پیروکاروں کی تسلی اور حوصلہ افزائی نیز قیادت نے اپنی خفت مٹانے کے لیے ۲ر ستمبر کو ''یوم سیاہ'' منانے کا اعلان کر دیا۔ ۲ر ستمبر کی رات کو مجلس احرار نے باغ بیرون دہلی گیٹ میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا۔ ظاہر ہے ان کی سیاست کے اعتبار سے یہ جلسہ نئی حکومت کے قیام کو حق بہ جانب ثابت کرنے کے لیے منعقد کیا جا رہا تھا۔ جب احرار کے شعلہ نوا خطیب سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے تلاوت قرآن کے بعد تقریر کا آغاز کیا تو کوتوالی کی طرف سے مسلم لیگ کے کارکنوں نے نئی حکومت کے خلاف نعرہ بازی شروع کر دی، شور وغل برپا کیا اور جلسہ درہم برہم کرنے کی کوشش کی، لیکن جب آغا شورش کاشمیری نے اسٹیج سے انھیں للکارا اور احرار رضا کاروں کو چوکس رہنے کا حکم دیا تو لیگ کے مظاہرین کے احتجاجی جذبات ٹھنڈے پڑ گئے اور جلسے پرسکون ماحول میں جاری رہا۔ اختلاف رائے کا جمہوری حق استعمال کرنے والوں کے خلاف مسلم لیگ کا یہ پہلا غیر جمہوری مظاہرہ نہ تھا بلکہ یہ مسلم لیگ کا سیاسی کلچر ہے۔ ۲۴ر اگست کو جب نئی عبوری حکومت کے ناموں کا اعلان ہوا تو اس کے ایک مسلمان وزیر شفاعت احمد خاں پر شملہ پر قاتلانہ حملہ کیا۔ اس حملے میں وہ بچ تو گئے لیکن شدید مضروب ہوئے۔ چناں چہ وہ ۲ر ستمبر کو حلف نہ اٹھا سکے اور روبہ صحت ہونے کے بعد حلف اٹھایا۔ یوپی کی کابینہ کے ایک مسلمان وزیر رفیع احمد قدوائی کے بھائی شفیع احمد کو مسوری میں قتل کر دیا۔ غرض مسلم لیگ سیاست میں تشدد پر انحصار کرتی تھی اور اسے معیوب نہ سمجھتی تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی کے ساتھ شرم ناک سلوک کی تفصیل دوسری جگہ دی گئی ہے۔ (ایضاً، ص ۳۵-۴۳۴)

مسٹر جناح اور لوئی فیشر کا انکشاف:

روزنامہ ''ہندوستان اسٹینڈرڈ کلکتہ'' نے اپنی اشاعت مورخہ ۲ر ستمبر ۱۹۴۶ء میں امریکن مصنف ''مسٹر لوئی فیشر'' کا ایک بیان شائع کیا تھا۔ یہ بیان بہت طویل ہے۔ ہم اس کا اہم اقتباس ذیل میں درج کرتے ہیں:

''ونسٹن چرچل ہندوستان کی آزادی کے سخت دشمن رہے ہیں۔ خود ان کی پارٹی کے بہت سے ممبر آزادئ ہند کے متعلق اختلاف رکھتے ہیں۔ لیکن چرچل کی شاہیت پسند پالیسی اپنی جگہ پر قایم ہے۔ مسٹر محمد علی جناح اور ان کی

لیگ نے جس کے وہ صدر ہیں، گذشتہ چند سالوں میں آزادی ہند کے بارے میں کسی خلوص کا ثبوت نہیں دیا ہے۔

زمین داروں کا طبقہ جس کی لیگ کی کونسل اور کمیٹیوں میں بھاری اکثریت ہے، نئے ہندوستان کی تعمیر کے خلاف ہے۔ کیوں کہ اس میں ان کا نقصان اور غریب کسانوں کا فایدہ ہے۔

اس لیے اس سے زیادہ قدرتی بات کیا ہو سکتی ہے کہ چرچل اور جناح کے درمیان گزشتہ مہینوں میں ہندوستان کی قسمت سے متعلق نامہ و پیام ہوتا رہا ہے۔ اور ان دونوں نے نہایت رازدارانہ طور پر آپس میں خط و کتابت اور راز و نیاز کی باتیں کی ہیں۔

برطانوی وزارتی وفد (کیبنٹ مشن) کی تجاویز اور دستور ساز اسمبلی میں شرکت کو منظور کر لینے کے بعد مسلم لیگ کا ان تجاویز پر دوبارہ غور کرنا، اور کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی سے مقاطعہ کا فیصلہ کر دینا چرچل کے ایک خفیہ خط کے بعد ظہور پذیر ہوا ہے۔

برطانوی مشن نے انتھک کوشش کی کہ سیاسی طاقت برطانیہ کے ہاتھوں سے ہندوستانیوں کو منتقل کر دینے کا راستہ صاف کر دے۔ مگر چرچل اور جناح دونوں ان کوششوں کو ناکام کرنے کی سعی میں مصروف ہیں۔

مسٹر جناح کے نئے طرز پالیسی کا ایک پہلو کلکتہ میں قتل و غارت گری کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ جو شخص اپنے پیرووں کو قابو میں نہیں رکھ سکتا وہ انھیں ضرور بے لگام کر دے گا۔

طویل المیعاد تجاویز کو رد کر دینے میں مسٹر جناح نے انتہائی غیر ذمہ داری سے کام لیا ہے۔ لیکن چرچل کی غیر ذمہ داری اور بھی زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔ کیوں کہ وہ بہت اونچے عہدے پر رہ چکے ہیں اور غالباً وہ امن و قانون کے مغربی اصول سے واقف ہوں گے۔

شاید جناح کو معلوم نہ ہو کہ چرچل کا اثر برطانیہ میں اور ٹوری پارٹی میں بڑی حد تک زایل ہو چکا ہے، لیکن چرچل شاید یقین کرتا ہے کہ جناح کے

روڑے مزدور حکومت کو ہندوستان آزاد کرنے سے باز رکھیں گے......

درحقیقت یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ جناح اور اس کی مسلم لیگ (یعنی زمینداروں کی انجمن) چرچل کی شاہیت پسند ٹوری پارٹی کی طرف جھکی ہوئی ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ ہندوستان کے سمجھدار اور روشن خیال مسلمان جناح کی رہنمائی میں چل رہے ہیں۔"

(ہندوستان اسٹینڈرڈ: ۲ر ستمبر ۱۹۴۶، ص ۴، کالم ۴و۵)

مسٹر جناح صاحب نے ۳۱ر اگست ۱۹۴۶ء کو ایک بیان کے ذریعہ اس الزام کی تردید کرنی چاہی مگر اس تردید کو اعتراف بھی کہا جا سکتا ہے۔

مسٹر جناح کے مکمل بیان کا ترجمہ درج ذیل ہے:

"میری توجہ اس پریس نوٹ کی طرف مبذول کرائی گئی جو کہ مسٹر مائیکل فوٹ ممبر پارلیمنٹ نے (لیبر حکومت کے سرکاری ترجمان) ڈیلی ہیرالڈ میں شائع کی ہے کہ ایک زمانے سے میرے اور چرچل کے درمیان خط و کتابت ہو رہی ہے۔ یہ غلط اور شرارت آمیز ہے۔ میں نے مسٹر اٹیلی وزیر اعظم برطانیہ کو ۶ر جولائی ۱۹۴۶ء کو لکھا کہ کس طرح وزارتی وفد اور وائسرائے نے مسلم لیگ کو نظر انداز کیا ہے اور اس کے ساتھ میں نے اپنے بیانات مورخہ ۲۷، ۲۸ر جون مع چند دیگر ضروری کاغذات کے شامل کر دیے تھے۔ یہ خط وزارتی وفد کی روانگی کے وقت لکھا گیا تھا، کیوں کہ یہ اعلان کیا گیا تھا کہ یہ تمام معاملات پارلیمنٹ کے سامنے رکھے جائیں گے۔

اسی قسم کا ایک خط میں نے مسٹر چرچل کو بھی لکھا جس میں چند ضروری کاغذات اور تفاصیل شامل تھیں۔ اس کے بارے میں اٹیلی کو بھی مطلع کر دیا تھا۔ مجھے دونوں کے جوابات موصول ہوئے ہیں۔ پھر دونوں کو تفصیلی حالات سے مطلع کیا جو نازک صورت اختیار کرنے والے ہیں۔"

(روزنامہ ہندوستان اسٹینڈرڈ: ۲ر ستمبر ۱۹۴۶، ص ۴، کالم ۵)

مولانا سید محمد میاں نے جناح صاحب کے اس بیان پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:

"ممکن ہے بہ قول مسٹر جناح "ایک زمانہ" سے چرچل جناح خط و

کتابت کا سلسلہ نہ رہا ہو۔ لیکن اس الزام کے جواب سے مسٹر جناح نے پہلو بچالیا کہ جب کہ وسط جون میں وزارتی مشن کی تجاویز کو منظور کر چکے تھے تو اواخر جولائی میں ان سے انکار کرنا چرچل کے کسی خفیہ خط یا اشارے سے نہیں ہوا۔ علاوہ ازیں دسمبر ۱۹۴۶ء اور مارچ ۱۹۴۷ء میں پارلیمنٹ میں مسٹر چرچل نے جو تقریر کی وہ ''کنزرویٹو'' اور ''لیگ''، ''چرچل'' اور ''جناح'' اتحاد نظر اور قدرتی تعاون اور اشتراک کا بین ثبوت اور شاہد عدل ہے۔''

(علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے: ص ۴۹۰-۴۹۳)

نئی مرکزی حکومت کی حلف وفاداری:

۲ر ستمبر ۱۹۴۶ء: نئی مرکزی حکومت کے چودہ ارکان میں سے سات نے حلف وفاداری اٹھایا۔

پنڈت جواہر لال نہرو، سردار ولبھ بھائی پٹیل، بابو راجندر پرشاد، مسٹر آصف علی، سید علی ظہیر، مسٹر جگ جیون رام اور مسٹر سرت چندر بوس۔

اس کے ساتھ ہی وائسرائے کی صدارت میں نئی حکومت کا پہلا اجلاس ہوا۔ جب وائسرائے ہاؤس میں یہ کارروائی ہو رہی تھی باہر مسلم لیگ سے متعلق لوگوں نے مخالف نعرے لگائے۔ سیاہ جھنڈیاں لہرائیں، ان کے مخالف کانگریسیوں نے بھی ترنگے جھنڈے لہرائے اور حکومت کے حق میں نعرے لگائے، تاہم کوئی تصادم نہیں ہوا۔

لیگ کی خدمات-مسٹر جناح کا انٹرویو:

مسٹر محمد علی جناح نے ڈیلی میل کے نمائندے کو ایک انٹرویو دیا تھا، لیکن وہ اس کی تالیف، مطالب کے انداز، اسلوب اور پیش کش کے مطمئن نہیں ہوئے۔ اب انھوں نے اس انٹرویو کی تفصیلات شائع کی ہیں۔ انٹرویو میں وزارتی مشن کی مسلم لیگ کے ساتھ نا انصافی، عارضی حکومت کے قیام کے سلسلے میں پنڈت نہرو کی تقریر اور بمبئی میں ان سے ملاقات کا تذکرہ کیا ہے۔ اسی سلسلے میں انھوں نے ۱۹۴۲ء میں حکومت برطانیہ سے تعاون، فوج میں مسلمانوں کی بھرتی کے سلسلے میں مسلم لیگ کی خدمات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"جب ۱۹۴۲ء میں کانگریس نے برطانیہ کے خلاف طوفان بدتمیزی برپا کردیا تھا اور یہ وقت تھا کہ دشمن ہندوستان کے دروازے پر دستک دے رہا تھا، مسلمانوں نے اس خطرناک تحریک (کانگریس کی ہندوستان چھوڑ دو تحریک) مین شامل ہونے سے انکار کردیا تھا۔ اس وقت میں نے دیہات کا دورہ کرکے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ قبریں بھی عورتیں کھودا کرتی تھیں۔ کیوں کہ مسلم مرد جنگ میں برطانیہ کی حفاظت کے لیے جانیں لڑا رہے تھے۔"

(گفتار قاید اعظم: مرتبہ احمد سعید، اسلام آباد، ۱۹۷۶ء، صفحہ: ۳۰۲)

جمعیت علماے ہند کی تجاویز:

۲۱ ستمبر ۱۹۴۶ء: ۲۱ ستمبر ۱۹۴۶ء کو مجلس عاملہ جمعیت علماے ہند کا اجلاس شروع ہوا۔ اور ۲۲ ستمبر کو تقریباً پانچ گھنٹے متواتر مجلس مشاورت کا اجلاس ہوتا رہا۔ اس کے بعد ۲۳ اور ۲۴ کو مجلس عاملہ نے اپنے متعدد اجلاسوں میں حسب ذیل تجاویز منظور کیں۔

تجویز نمبر ۱: مجلس عاملہ جمعیت علماے ہند کا یہ اجلاس اگرچہ اس اعلان کو جو برطانوی حکومت نے ہندوستان کی آزادی کے متعلق کیا ہے، نیز اس کارروائی کو جو ہندوستانیوں کی طرف اختیارات منتقل کرنے کے متعلق کی گئی ہے بڑی حد تک قابلِ اطمینان سمجھتا ہے، مگر اس امر کو واضح کردینا چاہتا ہے کہ آزادیٔ وطن کی جدوجہد ابھی ختم نہیں ہوئی ہے اور آزادی طلب جماعتوں کی منزل مقصود ابھی دور ہے۔

اجلاس ہذا کی راے میں یہ امر نہایت افسوس ناک ہے کہ مسلم لیگ کی غلط قیادت کے باعث عارضی حکومت میں مسلمانوں کو اب تک وہ درجہ حاصل نہیں ہوسکا جو ان کی قومی و وطنی اہمیت کے اعتبار سے ان کا جایز حق ہے۔

مجلسِ عاملہ اس حقیقت سے بھی چشم پوشی نہیں کرسکتی کہ عارضی حکومت کی تشکیل کے موقع پر کانگریس ہائی کمانڈ نے قوم پرور مسلمانوں کے ساتھ وہ طرز عمل اختیار نہیں کیا جو اس کا فرض تھا۔ اگر مسلم لیگ کی غیر موجودگی کی صورت میں مسلم نشستوں کا پُر کرنا ضروری سمجھا گیا تھا تو اس کے لیے وہی ممبر مسلمانوں کو مطمئن کرسکتے تھے جو قوم پرور مسلم جماعتوں کے منتخب کردہ ہوتے۔

مزید برآں حکومت کے ممبروں میں اہم محکمے مساویانہ طریقے پر تقسیم نہ کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا گیا وہ بھی مسلمانوں کے نزدیک تسلی بخش نہیں ہے۔

مجلس عاملہ مندرجۂ بالا وجوہ کی بنا پر کانگریس ہائی کمانڈ کے طریق کار کو قومی نقطۂ نگاہ سے قابل اعتراض سمجھتی ہے اور امید کرتی ہے کہ عارضی حکومت کو پوری طرح مفید اور نمایندہ بنانے کے لیے جلد از جلد مؤثر طریقے اختیار کیے جائیں گے۔

تجویز نمبر۲: مجلس عاملہ جمعیت علماے ہند کا یہ اجلاس ان ہندو مسلم فسادات پر جو الہ آباد، ناسک، ڈھاکہ، بمبئی، سلہٹ وغیرہ مختلف مقامات پر رونما ہوئے، بالخصوص اس ہولناک اور دہشت انگیز قتل و غارت گری پر جو کلکتہ میں واقع ہوئی، انتہائی رنج و غم اور انتہائی نفرت کا اظہار کرتا ہے۔

غریبوں، مزدوروں، بے گناہ راہ گیروں اور مسافروں کا قتل عام، پر امن شہریوں کے مال و جائیداد کی بربادی، عورتوں پر سفاکانہ دست درازی، اور معصوم بچوں کا وحشیانہ قتل کسی مذہب میں بھی روا نہیں۔ اور دنیا کی کوئی تہذیب بھی ان مظالم کو برداشت نہیں کر سکتی۔

اجلاس اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتا کہ یہ فسادات گذشتہ فسادات سے جدا سیاسی اختلاف کے ساتھ گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے حد درجے افسوس ناک ہیں۔

یہ اجلاس ان فسادات کے نتائج کو ملک کے تمام باشندوں کے لیے عموماً اور مسلمانوں کے لیے خصوصاً انتہا درجے خطرناک تصور کرتا ہے اور باشندگانِ ملک سے امن پسندی اور باہمی اعتماد کی اپیل کرتے ہوئے اس حقیقت پر تنبیہ کرنا ضروری سمجھتا ہے کہ یہ قتل و خون ریزی کسی سیاسی مقصد کے حصول کے لیے مفید ہونے کے بجائے انتہا درجے نقصان رساں اور تباہ کن ہے۔

تجویز نمبر۳: مجلس عاملہ جمعیت علماے ہند کا یہ اجلاس بلوے، فساد اور غارت گری کے ان افسوس ناک واقعات پر جو ۱۶ر اگست کو سلہٹ میں خصوصاً نئی سڑک کی مسجد میں رونما ہوئے، اپنے افسوس اور غیظ و غضب کا اظہار کرتا ہے۔ اس فساد میں نمازِ جمعہ کے بعد مسجد میں مسلمانوں کو چھروں اور لاٹھیوں سے زخمی کیا گیا۔ شہر کے اندر لوٹ مچائی گئی۔ مولانا مزمل علی صاحب رکن جمعیت علماے ہند اور ان کے رفقا کو زد و کوب کیا گیا اور ان کا ہوٹل لوٹا اور برباد کیا گیا، جس سے تقریباً تیس ہزار روپے کا نقصان ہوا۔ یہ تمام شرم ناک اور ذلیل

حرکتیں ایسی ہیں کہ کوئی حق پسند جماعت ان پر ملامت کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔

اجلاس ہذا کو اس پر مزید افسوس ہے کہ یہ تمام حرکتیں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کے سامنے اور ان کی موجودگی میں ہوئیں اور وہ ان کے انسداد سے قاصر رہے۔ اس کے بعد مجرموں کی گرفتاری میں بھی لاپرواہی سے کام لیا گیا۔

اجلاس ہذا حکومت آسام سے مطالبہ کرتا ہے کہ ان تمام واقعات کی غیر جانب دارانہ تحقیقات کرا کے مجرموں کو قرار واقعی سزا دے اور جو افسر کہ اس معاملے میں خطا کار ثابت ہوں ان کے خلاف ضابطے کی کارروائی عمل میں لائے اور اسی سلسلے میں جو مالی نقصانات ہوئے ہیں ان کی تلافی کرے۔

نشست چہارم: ۲۷ر شوال کے آخری اجلاس میں زیادہ تر وقت قانون انفساخ زمیندار کے متعلق بحث مباحثہ میں صرف ہوا اور اس سلسلے میں تحفظ اوقاف کا مسئلہ اہمیت کے ساتھ مجلس کے پیش نظر رہا۔ تفصیلی بحث کے بعد مسئلہ زیر بحث کے متعلق طے پایا کہ اس مسئلے کے متعلق شرعی نقطۂ نظر کے مطابق فیصلہ صادر کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنا دی جائے۔

حضرت ناظم اعلا صاحب جمعیت علماے ہند کو اس کمیٹی کا داعی (کنوینر) قرار دیا گیا اور چوں کہ حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند اور خانقاہِ امدادیہ تھانہ بھون کی جانب سے بھی اس مسئلے کے متعلق دل چسپی کا اظہار کیا گیا تھا اور علماے کرام کے ایک اجتماع کی ضرورت ظاہر کی گئی تھی، لہٰذا یہ بھی طے پایا کہ اس کمیٹی کا اجلاس دارالعلوم دیوبند میں ۲۶، ۲۷ر اکتوبر کو کیا جائے اور ناظم اعلا صاحب کو اختیار دیا گیا کہ وہ حسب ضرورت دوسرے علماے کرام کو اس اجتماع میں شرکت کی دعوت دے دیں۔

کُل مشرق فلسطین کانفرنس کا مسئلہ بھی اجلاس میں پیش ہوا اور طے ہوا کہ فلسطین سے متعلق جمعیت علماے ہند کی خدمات کی رپورٹ عربی یا انگریزی میں مرتب کرا کر عرب ہائی لیگ کے سکریٹری کے نام جلد از جلد بھیج دی جائے۔

مندرجۂ ذیل تجویز کی منظوری کے بعد اجلاس بہ خیر و خوبی ختم ہوا۔

تجویز نمبر ۴: مجلس عامہ جمعیت علماے ہند کا یہ اجلاس ہندوستان کی موجودہ صورتِ حال کو انتہائی تشویش اور افسوس کی نظر سے دیکھتا ہے کہ ایک فریق نے اسلامی اخلاق و تعلیم کے خلاف مسلمانوں کے باہمی سیاسی اختلاف کو آڑ بنا کر اور عوام کو اشتعال دلا کر مسلمانوں

نے خلاف اجتماعی یا انفرادی حملے شروع کردیے ہیں۔ حال آں کہ اسلام ایک لمحے کے لیے بھی اس خلاف انسانیت فعل کی اجازت نہیں دیتا اور نہ اسے برداشت کرسکتا ہے کہ مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے خلاف باہم دست و گریباں ہوں اور مسلمان مسلمانوں کی توہین و تذلیل کے مرتکب ہوں۔

جو جماعت یا افراد اپنے پیروؤں کی ان ناجائز اور خلافِ اسلام حرکات کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور جو افراد اس مجرمانہ اقدام کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ وہ اسلامی احکام کی علانیہ خلاف ورزی کرتے ہیں اور ایسے ملک میں جہاں مسلم و غیر مسلم مشترک آبادی ہے اس قسم کی مجرمانہ حرکت سے مقدس اسلام کی امن پرور تعلیم کو انتہائی نقصان پہنچا رہے ہیں۔

تمام مسلمانوں کو لازم ہے کہ وہ اس شر انگیز طرزِ عمل سے مجتنب رہیں اور عام مسلمانوں کو اسلامی تعلیم کے موافق امن پروری کی ہدایت کریں اور باوجود سیاسی اختلاف کے ایک دوسرے کی اذیت رسانی سے اجتناب کریں۔

(ضمیمہ جمعیت علما کیا ہے؟: جلد۲، ص۴۲-۳۹)

علامہ مشرقی کا خط مسٹر جناح کے نام:

۲۵ رستمبر ۱۹۴۶ء: علامہ عنایت اللہ مشرقی نے اپنے ایک بیان میں کہا:

”میں نے ۹ رستمبر ۱۹۴۶ء کو ایک خط مسلم لیگ کے صدر مسٹر جناح کو لکھا تھا۔ اس خط کا مضمون یہ تھا کہ اگر مسٹر جناح مجھے بہ ذریعہ تحریر یقین دلا دیں کہ وہ پاکستان کو ہندوستان کی مجموعی آزادی کے طور پر حاصل کرنا چاہتے ہیں اور وہ ہندوستان کو انگریزوں کے پنجے سے آزاد کرانے کے واضح اصول پر مسٹر گاندھی کے ساتھ کام کریں گے تو میں خاک سار نظام کی ساری جمعیت ان کے حوالے کردوں گا۔

یہ خط میں نے مسٹر جناح کی اس اپیل کے جواب میں بھیجا تھا جو انھوں نے عید کے دن دیگر مسلمان جماعتوں کے علاوہ خاک ساروں سے بھی اپیل کی تھی کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہو کر آزادی کی لڑائی لڑیں تا کہ ہندوستان کو غلامی سے نجات دلائی جائے۔

لیکن اس خط کا مسٹر جناح نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چناں چہ آج میں نے مسٹر جناح کو رجسٹری قانونی نوٹس بھیج دیا ہے، جس کا مضمون یہ ہے کہ اگر انھوں نے دس روز کے اندر اندر میرے خط کا جواب نہ دیا تو میں عدالت میں ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کرنے پر

مجبور ہو جاؤں گا اور اس طرح مرد، عورتیں اور بچوں کی اس خون ریزی کو بند کرادوں گا جس کا حکم مسٹر جناح نے اس وقت دے رکھا ہے۔" (روزنامہ "انقلاب" لاہور: ۲۵ر ستمبر ۱۹۴۶ء)

پنڈت نہرو — عبوری حکومت کی ذمہ داری — ریڈیو تقریر:

۲۷ر ستمبر ۱۹۴۶ء: پنڈت جواہر لال نہرو نے عبوری حکومت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد ۲۷ر ستمبر کو آل انڈیا ریڈیو پر تقریر کی۔ انھوں نے کہا:

"دوستو اور رفیقو! جے ہند، چند دن ہوئے کہ میں اور میرے رفقا حکومت ہند کے اعلا عہدوں کی کرسیوں پر بیٹھ گئے ہیں۔ اس پراچین بھومی میں ایک نیا راج قایم ہو گیا ہے۔ یہ عارضی اور عبوری حکومت یا جس نام سے ہم اسے موسوم کریں۔

یہ ہندوستان کی آزادی کے حل کا پہلا زینہ ہے۔ ہندوستان کے طول و عرض سے اور دنیا کے کونے کونے سے ہمیں کئی ہزار پیغامات تبریک وصول ہوئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ہم نے اس تاریخی واقعے پر کوئی تقریب منانے کا فیصلہ نہیں کیا، بلکہ لوگوں کو جوش و خروش کے جذبات واظہار راے سے باز رکھا۔ چوں کہ ہم انھیں یہ احساس کرانا چاہتے ہیں کہ ہماری یلغار ابھی جاری ہے اور ہم نے اسے منزل تک پہنچانا ہے۔ راستے میں رکاوٹیں اور تکالیف حایل ہیں اور یہ سفر اس قدر آسان نہیں جیسا کہ لوگوں نے اسے سمجھ رکھا ہے۔ اس موقعے پر کسی طرح کی کم زوری یا کوئی غلطی کافی ہلاکت خیز ثابت ہو سکتی ہے۔

کلکتہ کے الم ناک سانحہ سے دل مجروح ہو چکے ہیں۔ وہاں بھائی نے بھائی کے خلاف ہاتھ اٹھایا ہے، جو آزادی ہم حاصل کر رہے ہیں اور جس کے لیے ہم کڑی آزمایش اور تکالیف جھیلتے رہے ہیں وہ ہندوستان کے تمام باشندوں کے لیے تھیں۔ کسی ایک طبقے یا گروہ یا کسی ایک مذہب کے لیے نہیں تھیں۔ ہمارا مقصد ایسی آزادی کا حصول ہے جس میں ہم سب برابر کے حصہ دار ہوں گے۔ جب صورت یہ ہے تو پھر یہ سر پھٹول اور ایک دوسرے کے خلاف شک وشبہ کیوں ہو رہا ہے؟

میں آج اپنے آیندہ پروگرام کا ذکر نہیں کروں گا۔ اس لیے آپ کو کچھ عرصہ انتظار میں رہنا پڑے گا۔ سر دست میں آپ کے پیغام محبت کا شکریہ ادا کر رہا ہوں۔

ہمارے دورِ جدید کا آغاز ہو چکا ہے۔ ہماری یہ پرانی اور بہادر سرزمین ایک دفعہ

آزمایش اور حقیقت سے گزری ہے اور یہ اب پھر حیران ہو رہی ہے۔ اس کی آنکھیں جانبازوں کے خون سے روشن ہیں۔ اسے اپنی ذات اور مقاصد پر اعتماد ہے۔ یہ درجہ بہ درجہ گذشتہ آفتوں میں سے گزری ہے۔ لیکن اب اس کی نظریں دنیا کے دستور پر پڑ رہی ہیں اور اس نے احترام عالم کے سامنے دست مروت دراز کر دیا ہے۔ اگرچہ دنیا خود لڑائی جھگڑے کے خیال میں غرق ہے۔

عبوری نیشنل حکومت بڑی اسکیم کا حصہ ہے۔ اس میں دستور ساز اسمبلی بھی شامل ہے۔ اسمبلی آزاد ہندوستان کا دستور تیار کرنے کے لیے بہت جلد اپنا اجلاس منعقد کرے گی۔ یہ صرف آزادیٔ کامل کا احساس ہے کہ ہم اس حکومت میں شامل ہو گئے ہیں۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ حصولِ آزادی کے لیے اس حکومت میں کام کرتے رہیں تاکہ ہمیں اپنے داخلی اور خارجی تعلقات دونوں میں آزادی حاصل ہو جائے۔

ہم بین الاقوامی کانفرنسوں میں ایک آزاد قوم کی حیثیت سے پورا پورا حصہ لیتے رہے اور ہم وہاں دوسری اقوام کے محکوم نہیں بنیں گے۔ اپنی آزادانہ پالیسی کارفرما رکھیں گے۔ ہم اقوامِ عالم کے ساتھ براہِ راست وابستگی کا سلسلہ قایم کریں گے اور دنیا کی آزادی اور امن کی خاطر ان سے تعاون کرتے رہیں گے۔

ہماری کوشش حتی الوسع یہ ہوگی کہ ہم گروپوں کی طاقت حاصل کرنے والی سیاست سے الگ رہیں اور ایک دوسرے فرقے سے فوقیت حاصل کرنے کی جو کوشش کرے اس سے دور رہیں۔ ہم سابقہ جھگڑوں کے باوجود انگلستان اور برطانوی کامن ویلتھ کے ممالک کے ساتھ تعلقات قایم رکھنے کے خواہاں ہیں۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس کامن ویلتھ کے ایک سلسلے میں نسلی امتیاز اور تعصب کی بنا پر ہندوستانیوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ اس قسم کے عقاید کو برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے تو ہم کو گہرے جھگڑے اور عالم گیر تباہی یقیناً نظر آتی ہے۔ جے ہند۔"

ڈایریکٹ ایکشن اور لیگ کی مجلس عمل:

۱۵/اکتوبر ۱۹۴۶ء: سر ضیاء الدین احمد کے بیان کے مطابق سردار عبدالرب نشتر کے سوا مجلس عمل کا کوئی اور ممبر ڈایریکٹ ایکشن کا حامی نہ تھا۔ (اخبار تیج: ۱۵/اکتوبر ۱۹۴۶ء)

حکومت میں لیگ کی شمولیت، مجلس احرار کا بیان!

۷راکتوبر ۱۹۴۶ء: عبوری حکومت میں مسلم لیگ کی شمولیت کے فیصلے پر بحث کرتے ہوئے مجلس احرار کا ترجمان روزنامہ ''آزاد'' لاہور اپنے مقالۂ افتتاحیہ میں رقم طراز ہے:

''...... ''نیشنلسٹ مسلمان'' کے سوال پر جو ہنگامے برپا کیے گئے، شملہ کانفرنس ناکام ہوئی، وزارتی وفد کی پہلی پیش کش واپس لی گئی اور ہر دفعہ اس سوال کو اتنی اہمیت دی گئی گویا مسلمانوں کا قومی نصب العین یہی ہے۔''

آگے چل کر معاصر مذکور مسلم لیگ سے استفسار کرتا ہے:

''کیا اب نیشنلسٹ مسلمان کے نہ لیے جانے کا مطالبہ منظور ہو گیا؟ اور یہ سارا ہنگامہ صرف اس لیے کھڑا کیا گیا تھا کہ علی گڑھ کے چھوکروں سے مولانا ابوالکلام آزاد کی داڑھی نچوائی جائے اور سید پور میں شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کی قبا پر گستاخ ہاتھ دراز کیے جائیں؟ اور پھر اس طرح ''دینی معصیت'' اور قومی گناہ کے بالواسطہ مجرموں کے لیے عبوری حکومت میں پانچ نشستیں حاصل کی جائیں؟ سوچیے ''پاکستان اور صرف پاکستان'' دو آئین ساز مجالس، واحد نمایندگی اور اس قسم کے دوسرے جائز اور ناجائز مطالبات کا نتیجہ آج کیا ہے؟ پانچ نشستیں اور پھر یہ سب کچھ اس خدمت کی قیمت ہے جو مسلم لیگ نے ہندوستان اور بیرون ہندوستان میں انگریز کے لیے کیا۔''

تقسیم پنجاب پر کانگریس کی قرارداد پر رائے زنی کرتے ہوئے مجلس احرار کے جنرل سیکرٹری نواب زادہ نصر اللہ خان نے ایک اخباری بیان میں کہا:

''ہم بنگال اور پنجاب کی تقسیم کے نظریے کو کسی صورت میں پسند نہیں کریں گے اور اس سے نہ صرف مسلمانوں کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہے بلکہ ہندوستان کی یک جہتی جس کے لیے کانگریس برسوں سے جدوجہد کرتی رہی ہے کالعدم ہو جاتی ہے۔''

(ابوالکلام آزاد اور قوم پرست مسلمانوں کی سیاست: ص ۶۳۲-۶۳۱)

لیگ کی نمایندہ حیثیت — مسٹر جناح کا خط:

۱۷ اکتوبر ۱۹۴۶ء: مسٹر جناح نے پنڈت نہرو کو ایک خط لکھا ہے، اس میں وہ فرماتے ہیں:

''کانگریس مسلم لیگ کے اس دعوے کو چیلنج نہیں کرتی بلکہ تسلیم کرتی ہے کہ وہ مسلمانوں کی ایک بھاری اکثریت کی نمایندہ ہے۔ اس لیے ڈیموکریٹک اصول کی بنا پر اس کو ہی ہندوستانی مسلمانوں کی نمایندگی کا حق حاصل ہے، لیکن کانگریس اس امر کو منظور کرنے کے لیے تیار نہیں کہ مسلم لیگ کسی ایسی پابندی کو قبول کرے جس کی بنا پر کانگریس اپنے نمایندے لیگ کی مرضی کے مطابق منتخب کرنے پر مجبور ہو۔

مکتوب مسٹر جناح بہ نام نہرو
مورخہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۴۶ء''

(وریر بھارت لاہور، ۱۷ اکتوبر ۱۹۴۶ء۔ آزاد لاہور ۱۸ اکتوبر ۱۹۴۶ء)

افاداتِ اشرفیہ کی تلبیس:

مولانا حکیم امیر علی صاحب (ملتان) نے حضرت شیخ الاسلام سے چند سوالات پوچھے تھے۔ حضرت نے ان کے جواب میں ذیل کا مکتوب تحریر فرمایا اور اس کے ساتھ مولانا سید محمد میاںؒ اور حضرت مفتی کفایت اللہ شاہ جہان پوری ثم دہلویؒ کی دو تحریرات روانہ فرمائیں۔ حضرت نے اسی خط میں اہل تھانہ بھون اور مولوی شفیع کے لیے بہ ظاہر تلبیس، کج فہمی، کج رائی کے سخت الفاظ استعمال کیے ہیں۔ لیکن یہ الفاظ حقیقت سے بہت کم ہیں۔ اہل تھانہ بھون سے مراد مولوی شبیر علی، مولوی ظفر احمد وغیرہ ہیں۔ مولوی شفیع سے مراد مفتی اعظم پاکستان مولانا محمد شفیع دیوبندی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کے عیوب و خبائث کی پردہ پوشی فرمائے اور ان کی نیکیوں کو قبول فرمائے۔ آمین۔ حضرت شیخ الاسلامؒ کا مکتوب سامی اور منسلکہ تحریرات یہ ہیں:

محترم المقام زید مجدکم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاج شریف!

والا نامہ باعثِ سرفرازی ہو۔ یاد آوری کا شکر گزار ہوں، حوالہ جات مذکور کی تلاش میں دیر لگی۔ میرے پاس افادات اشرفیہ نہیں تھی اور نہ اس سے پہلے دیکھا تھا۔

عالی جاہا! ان تمام سوالات کے جواب دیے جا چکے ہیں اور اخباروں میں شایع بھی ہو چکے ہیں۔ منسلکہ اوراق ملاحظہ فرمائیے۔ آپ کی تحریر سے سخت تحیر ہوا۔ اگر منسلکہ جوابات کافی ہوں تو فبہا ورنہ بہ وقت حاضری مزید عرض و معروض کی نوبت آئے گی۔ مولانا خدا بخش صاحب اور دوسرے معزز بزرگوں کی خدمت میں سلام مسنون عرض کر دیں۔ افسوس ہے کہ اہلِ خانقاہ تھانہ بھون اور خود مولوی شفیع صاحب نہایت زیادہ تلبیس سے کام لیتے ہیں یا کج فہمی اور کج رائی کے شکار ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہدایت فرمائیے۔ والسلام

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ

۱۲/ ذی قعدہ ۱۳۶۵ھ / ۸/ اکتوبر ۱۹۴۶ء

حضرت کے گرامی نامے کے ساتھ ذیل کی تحریرات شامل تھیں:

افادات اشرفیہ کا ایک معمہ اور جمعیت علمائے ہند کے متعلق غلط الزام کی تردید:

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمتہ اللہ علیہ تحریکِ خلافت میں شریک نہیں ہوئے تھے، کانگریس اور جمعیت علمائے ہند کے وہ باضابطہ ممبر نہیں رہے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ تحریکات کے موقعوں پر واقعات کو توڑ موڑ کر پیش کیا جاتا تھا اور ان کے بہ موجب حضرت موصوفؒ سے جوابات حاصل کر کے زیادہ سے زیادہ اس کی اشاعت کی کوشش کی جاتی تھی۔ بہ ہر حال اس حقیقت کا نہ کسی کو انکار ہے نہ انکار کی ضرورت، اسی سلسلے کے مضامین کا ایک مجموعہ مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی نے ''افادات اشرفیہ'' کے عنوان سے شایع فرمایا ہے۔

چوں کہ حضرت تھانوی قدس سرہٗ العزیز کے خیالات کا ہمیں پہلے سے علم تھا اس لیے اس رسالے کے حاصل کرنے اور مطالعہ کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوئی۔ مگر ہم شکر گذار ہیں جناب مولانا عبدالرحیم صاحب راندیری مدظلہٗ و عزیزم محترم مولوی سید عبدالحق

صاحب کے کہ ان حضرات نے اس غلط الزام کی طرف توجہ دلائی جو اس رسالے میں جمعیت علمائے ہند پر لگایا گیا ہے اور اس کے ساتھ اخبار نقیب کے فایل سے نقل کر کے وہ جوابات بھی بھیج دیے جس سے اس بہتان کی تردید ہو جاتی ہے۔

''افاذات اشرفیہ'' کے مقدمہ میں صفحہ ۳ پر درج ہے کہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے مسایل حاضرہ کی مکمل تحقیق کے لیے چند سوالات جمعیت علما اور مسلم لیگ کے پاس بھیجے۔ لیگ کی طرف سے جوابات آئے، مگر جمعیت علما کی طرف سے باوجود چند مرتبہ یاددہانی کے کوئی جواب نہیں آیا۔ پھر صفحہ ۵۳ کے حاشیے پر اسی الزام کو دہرایا گیا ہے۔ اس الزام کی تردید کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم حضرت علامہ مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کے (جو اس زمانے میں کل ہند جمعیت علما کے صدر تھے) جوابات پیش کریں۔ جو اخبار نقیب مورخہ ۲۶/ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۸ھ/ ۹/ جولائی ۱۹۳۹ء میں شایع ہو چکے ہیں۔ ان سوالات کے جوابات زیادہ مفصل بھی ہو سکتے تھے، مگر بہ ظاہر مفاہمت کی اہمیت اور خواہش حضرت مفتی صاحب کے پیش نظر ہے، اس لیے جوابات میں اجمال اور بہت زیادہ نرمی سے کام لیا گیا۔ ذیل میں اخبار نقیب کا مضمون بجنسہٖ اور بہ لفظہٖ نقل کیا جاتا ہے۔ (محمد میاں عفی عنہ ناظم جمعیت علمائے ہند- دہلی)

حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کا خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون کے سوالوں کا جواب:

سوال نمبر۱: جمعیت علما کے نزدیک مذہبی حیثیت سے کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت کیوں ضروری ہے اور کانگریس سے علاحدگی میں کیا ضرر ہے؟

جواب: نہ صرف جمعیت علمائے ہند، بلکہ ہندوستان کی تمام معتد بہ جماعتوں کا نصب العین یہ ہے کہ انگریزی حکومت سے ہندوستان کو آزاد اور خود مختار بنایا جائے اور اس کے لیے یہ مسئلہ بھی متفق علیہ ہے کہ جب تک ہندوستان کی تمام قومیں متحد ہو کر انگریزی حکومت سے آزادی کا مطالبہ نہ کریں گی بہ ظاہر اسباب آزادی حاصل نہ ہوگی، اس لیے جمعیت علما آزادی کی خاطر کانگریس کی شرکت کو ضروری سمجھتی ہے اور چوں کہ انگریزی حکومت سے مسلمانوں کی مذہبی مرکزیت اور اسلامی قوت کو سخت ضرر پہنچ رہا ہے اور پہنچنے کا اندیشہ ہے اس لیے مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ انگریزی اقتدار کو جہاں تک ہو سکے کم زور

کرنے کی سعی کریں۔

سوال نمبر۲: کانگریس میں مسلمانوں کا داخلہ جس صورت سے انفرادی اور غیر منظم اور غیر مشروط طریقے پر اس وقت ہو رہا ہے اور مسلم نشستوں کے لیے کانگریس براہِ راست امیدوار کھڑے کرتی ہے اس سے اسلام اور مسلمانوں کو خطرہ ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو اس سے بچنے کی کیا صورت ہے؟

جواب: کانگریس ایک مشترکہ جماعت ہے، مسلمان اپنے مذہب پر پختہ رہتے ہوئے بھی کانگریس میں شریک ہو سکتے ہیں۔ اسلام سے بے تعلق غیر کانگریسی مسلمانوں میں جو مغربی تعلیم اور یورپین تہذیب کے دل دادہ ہیں بہت زیادہ ہیں۔ کانگریسی مسلمان کانگریسی ہونے کی جہت سے اس قدر اسلام سے بے تعلق نہیں جس قدر یورپین تہذیب کے دل دادہ غیر کانگریسی مسلمان ہیں۔

سوال نمبر۳: مسلم لیگ سے جمعیت علما کو کیوں اختلاف ہے؟ جب کہ وہ مسلمانوں کو منظم کر رہی ہے اور اس کا مقصد بھی آزادیٔ کامل کی تحصیل ہے، جیسا کہ اس سال لکھنؤ میں اس نے اعلان کیا۔

جواب: اس لیے کہ مسلم لیگ کی اکثریت انگریزی حکومت کو خدا کی رحمت کا سایہ سمجھتی ہے اور انگریزوں کے دامن میں پناہ لینا چاہتی ہے اور انگریزی شہنشاہیت کی حمایت کرتی ہے اور انگریزی اقتدار کی بنیاد مضبوط کرتی ہے اور سرمایہ داروں کی نہ صرف حامی ہے بلکہ سرمایہ دارانہ نظام کو مستحکم رکھنا چاہتی ہے، قوم کے لیے کوئی ٹھوس کام نہیں کرتی بلکہ مسلم لیگ کی رکنیت اور عہدہ داری کو حصول مناصب جلیلہ کا ذریعہ سمجھتی ہے اور اس راستے سے بڑے بڑے عہدے حاصل کرتی ہے۔ لکھنؤ میں آزادیٔ کامل کا تو اعلان کر دیا اور یہ بھی اقرار ہے کہ تنہا مسلمان آزادیٔ کامل حاصل نہیں کر سکتے، اس کے باوجود آزادیٔ کامل حاصل کرنے کا طریقہ (ہندو مسلم) اتحاد کو اختیار نہیں کرتی۔ ایسی صورت میں ہم آزادیٔ کامل کے محض زبانی اعلان کو ابلہ فریبی نہ سمجھیں تو کیا سمجھیں؟

سوال نمبر۴: اگر مسلم لیگ میں کچھ مفاسد اور منکرات شرعیہ موجود ہیں تو کیا یہ صورت ممکن نہیں کہ جمعیت علما مسلم لیگ میں شریک ہو کر اس کو مخلص اور فعال لوگوں سے بھر دے اور مسلمانوں کی تنظیم کو مکمل اور مفاسد و منکرات سے پاک کر دے؟

جواب: مسلم لیگ میں شریک ہوکر اس کو منکرات سے خالی کر دینا تجربے سے ناممکن ثابت ہوا ہے۔ اگر ہو سکتا ہے تو بہ قول مسلم لیگ ۹۰ فیصد مسلمان مسلم لیگ میں شریک ہیں، لیکن کیا وہ مسلم لیگ سے کسی ایک منکر کو بھی آج تک ہٹا سکے؟ کہا جاتا ہے کہ علما بھی ۸۰ فیصد مسلم لیگ میں شریک ہیں، لیکن کیا ان ۸۰ فیصد علما کا مسلم لیگ پر کچھ اثر ہے؟ اگر ہے تو یہ لیگ کے پلیٹ فارم سے علما کو برباد کرنے اور ان کو خوار کرنے کی پرزور تلقین کیوں ہو رہی ہے؟ اور حاملین افرنجیت کی خالص تقلید اور اتباع اور پیروی کرنے کا کیوں حکم دیا جاتا ہے؟

سوال نمبر ۵: کیا مسلم لیگ اور جمعیت علما کے تصادم سے تشتت اور افتراق پیدا نہیں ہوتا ہے اور کیا تشتت مضر نہیں ہے اور اگر ہے تو جمعیت علما نے اس ضرر کے انسداد کے لیے کوئی صورت اختیار کی ہے؟

جواب: ہوتا ہے اور ضرور ہوتا ہے، مگر اس کی ذمے داری کس پر ہے؟ لیگ پر اور صرف لیگ پر کہ وہ علما کے خلاف عموماً اور کانگریسی مسلمانوں کے خلاف خصوصاً عوام کو بھڑکاتی ہے اور طرح طرح کے فسادات اٹھاتی ہے اور آپس میں لڑاتی ہے۔ ابھی حال میں جمعیت علما کے جلسے میں شرکت سے مسلم لیگیوں کو منع کرنے کے لیے مسٹر جناح کا بیان اخبارات میں شایع ہو چکا ہے، اس سے آپ لیگ کے قاید اعظم کی ذہنیت کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ اتفاق اور اتحاد بین المسلمین کی آڑ میں کس قدر تفریق و تشتت پیدا کر رہے ہیں۔

سوال نمبر ۶: کانگریس کے ساتھ مل کر جو آزادی حاصل ہوگی اس کا انجام حکومت مشترکہ ہے جس میں عنصر کفر غالب اور عنصر اسلام مغلوب ہوگا۔ ایسی حکومت یقیناً اسلامی نہ ہوگی، تو اس کے لیے جدوجہد کرنا مسلمانوں کے ذمے کس دلیل سے واجب ہے۔ نیز اس کی ضمانت کیا ہے کہ ہندو انگریزوں کو ہندوستان سے بے دخل کرنا چاہتے ہیں۔ کانگریس کے اقتدار سے اس وقت ہندوؤں کے حوصلے جس قدر بڑھنے لگے ہیں اور مسلمانوں پر بازاروں میں، دیہاتوں میں اور سرکاری محکموں میں جو مظالم وہ برپا کرنے لگے ہیں جمعیت علما نے اس کے انسداد کی کیا تدبیر سوچی ہے اور اس کے لیے جمعیت علما نے کوئی قدم اٹھایا ہے یا نہیں؟

جواب: لیکن کیا مسلم لیگ خالص اسلامی حکومت قایم کرنے کی سعی کر رہی ہے؟ وہ بھی تو اس مشترکہ حکومت کے اصول کو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ گول میز کانفرنس میں تسلیم

کرچکی ہے۔ اگر ہندو انگریز کو نکالنا نہیں چاہتے ہیں تو پھر جمعیت علما ان کے ساتھ اشتراکِ عمل نہیں کرے گی۔ یہ اشتراک تو صرف انگریزوں کی قوت کم زور کرنے اور ہندوستان کے آزاد کرنے کے مقصد کے لیے ہے۔

سوال نمبر ۷: کانگریسی وزارتوں نے زمین داروں کی اراضی کو کاشت کاروں کی مملوک بنا دینے کی تجویز سوچی ہے جو یقیناً ظلم ہے اور جو لوگ کانگریس میں شریک ہیں وہ سب کے سب اسی ظلم میں شریک ہیں، پھر اس سے بچنے کی کیا جمعیت علما نے کچھ تدبیر کی اور کون سا عملی قدم اٹھایا؟

جواب: جو قوانین شریعت کے خلاف وضع کیے جائیں ان کی پوزیشن انگریزی موجودہ قوانین جیسی ہے۔ حکومت کے موجودہ قوانین میں کس قدر قوانین شریعت کے خلاف ہیں اور آئے دن لیجسلیٹو اسمبلی میں قوانین غیر مشروعہ مسلم لیگ کی تائید و حمایت سے شایع ہو رہے ہیں۔ ابھی آر سی بل کا معاملہ سامنے ہے۔ جمعیت علما تو ہر خلافِ شرع قانون کے خلاف انتہائی جدوجہد کرے گی اور کرچکی ہے اور کر رہی ہے، اس کی ابھی حال کے جلسے کی تجاویز پڑھیے اور دیکھیے کہ اس نے کانگریسی حکومت سے کس قدر احتساب کیا ہے اور جمعیت کے محترم ارکان کا مدحِ صحابہؓ کے قضیے میں طرزِ عمل سامنے رکھیے تو آپ کو جمعیت علما کا مطمعِ نظر صاف معلوم ہو جائے گا اور پھر لیگ کے طرزِ عمل سے آپ اس کو جانچ سکیں گے۔

سوال نمبر ۸: کانگریس میں بندے ماترم کا گیت گایا جاتا ہے جو مضامین شرکیہ پر مشتمل ہے اور قومی جھنڈے کو سلامی دیتے ہیں۔ کیا ان افعال میں شرکت کرنا گناہ نہیں ہے؟ اگر ہے تو جمعیت علما نے مسلمانوں کو کیا ہدایت کی اور اس پر اور اس قسم کے دیگر مسئلوں پر صدائے احتجاج بلند کی تھی؟

جواب: بے شک! بندے ماترم کا گیت قابلِ اعتراض تھا، مگر کانگریس نے اس کے قابلِ اعتراض بند اس میں سے علاحدہ کر دینے کا فیصلہ کر دیا ہے۔ جھنڈے کی سلامی مسلم لیگ بھی کرتی ہے اور اسلامی حکومتوں میں بھی ہوتی ہے، وہ ایک فوجی عمل ہے، اس میں اصلاح ہو سکتی ہے مگر مطلقاً اس کو مشرکانہ عمل قرار دینا صحیح نہیں ہے۔

سوال نمبر ۹: صدر کانگریس اور ان کے ہم خیال اشتراکیت کے حامی اور مذہب و خدا کے دشمن ہیں، ان کی تقریریں خدا اور مذہب کے خلاف شایع ہوتی رہتی ہیں۔ جمعیت علما

نے ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی یا نہیں اور مسلمانوں کو ایسے کافروں کی تعظیم سے روکا ہے یا نہیں؟

جواب: صدر کانگریس کی شخصی رائے سے کانگریس کو الزام دینا معقول بات نہیں ہے۔

سوال نمبر ۱۰: کانگریس کے ساتھ مل کر جو آزادی حاصل ہوگی اس کی کیا ضمانت ہے کہ اس میں مسلمانوں کے مذہبی و سیاسی حقوق کی پوری حفاظت ہوگی؟ جب کہ کانگریس اور ان کے ذمے دار ارکان مذہب اور حقوق کا نام لینا جرم سمجھتے ہیں اور اس کو فرقہ پرستی قرار دیتے ہیں۔ نیز جمعیت علما نے کانگریس کے ساتھ تعاون کر کے مسلمانوں کے مذہب اور سیاست کے تحفظ میں اس وقت تک کون سا کام کیا ہے؟

جواب: مسلمان اپنے مذہبی اور سیاسی حقوق کی حفاظت اپنی قوت اور قربانی سے کر سکتے ہیں نہ کہ کانگریس کے وعدوں سے اور نہ انگریز کے وعدوں سے۔

سوال نمبر ۱۱: جمعیت علما نے اچھوت اقوام میں تبلیغ اسلام کے لیے کوئی عملی قدم اٹھایا ہے یا نہیں؟ جس کی مذہباً و سیاستاً سخت ضرورت ہے اور ان کے اسلام میں داخل ہونے کی بھی قوی امید ہے؟

جواب: یہ سوال زیادہ تر اس جماعت سے کیا جانا چاہیے جو ۹۰ فیصد مسلمانوں کی نمائندہ ہے اور اسی جماعت کے علما سے۔

محمد کفایت اللہ کان لہٗ۔ دہلی

مہر دارالافتا، مدرسۂ امینیہ، دہلی

(عصر جدید، مدینہ بجنور، ۱۷ فروری ۱۹۴۶ء: جلد ۳۵، ص ۱۳)

ڈائریکٹ ایکشن کے فسادات کے مقتولین:

۱۰ اکتوبر ۱۹۴۶: ۱۶ اگست کو مسلم لیگ کے ڈائریکٹ ایکشن کے نتیجے میں تمام اخبارات میں مقتولین کی تعداد دس ہزار آئی ہے، مگر ۱۰ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو سر ہنری ٹوٹنہم گورنر وسطی ہند نے بیان کیا کہ حکومت بنگال نے کلکتہ کے فسادات کے ہلاک شدگان کی تعداد چار ہزار بتائی ہے۔ اسے حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ ہلاک شدگان کی تعداد چالیس ہزار سے زاید ہے۔ حکومت بنگال نے صرف ان لاشوں کو شمار کیا جو

گلی کوچوں میں پائی گئیں۔ باقی جولاشیں دریا برد کی گئیں وہ شمار نہیں ہوئیں۔
(آزاد-لاہور ۱۵رذی تعدہ ۱۳۶۵ھ/۱۱راکتوبر ۱۹۴۶ء)

مسٹر جناح کا خط لارڈ ویول کے نام:

۱۴راکتوبر ۱۹۴۶:

ڈیئر لارڈ ویول!

آپ کے ۱۳راکتوبر کے خط کا شکریہ۔ میں آپ کو مسلم لیگ کے ۵ نمایندوں کے نام بھیج رہا ہوں، جیسا کہ ہماری کل کی ملاقات میں طے پایا تھا۔

(۱) مسٹر لیاقت علی خان، آنریری سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ ایم ایل اے۔ (مرکزی)

(۲) مسٹر آئی آئی چندریگر، ایم ایل اے بمبئی، صدر صوبائی مسلم لیگ اور لیڈر بمبئی اسمبلی لیگ پارٹی۔

(۳) مسٹر عبدالرب نشتر ایڈوکیٹ، صوبہ سرحد ممبر۔ ورکنگ کمیٹی آل انڈیا مسلم لیگ کمیٹی آف ایکشن وکونسل۔

(۴) مسٹر غضنفر علی خاں ایم ایل اے (پنجاب)، ممبر کونسل آل انڈیا مسلم لیگ پروینشل مسلم لیگ وممبر پنجاب مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی۔

(۵) مسٹر جوگندر ناتھ منڈل ایڈوکیٹ، (بنگال) حال وزیر حکومت بنگال۔

آپ کا مخلص

ایم اے جناح

انٹیرم گورنمنٹ میں لیگ کی شمولیت:

۱۵راکتوبر ۱۹۴۶: مسلم لیگ اس وقت نہ صرف مایوسی کا شکار تھی بلکہ وہ انتہائی غصے کی حالت میں تھی۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ برطانیہ نے اسے دھوکا دیا ہے۔ اس نے دلی اور دوسرے مقامات پر مظاہرے کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ کامیاب نہ ہوئی۔ بہرحال ملک میں ہر طرف تلخی اور بے چینی تھی اور لارڈ ویول اس نتیجے پر پہنچے کہ لیگ کو انٹیرم حکومت میں شامل ہونے پر ضرور راضی کر لینا چاہیے۔ اس لیے انھوں نے مسٹر جناح کو دلی بلایا۔ وہ آئے اور لارڈ ویول سے ان کی کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ آخر کار ۱۵راکتوبر کو مسلم لیگ نے انٹیرم

حکومت میں شامل ہونے کا فیصلہ کرلیا۔

اس موقع پر میں نے ایک بیان شایع کیا جس میں میں نے کہا کہ کیبنٹ مشن کی تجاویز سے مسلم لیگ کے تمام وہ اندیشے، جنھیں حق بہ جانب کہا جاسکتا ہے، دور ہوجاتے ہیں۔ مجلس دستور ساز میں مسلم لیگ آزادی کے ساتھ کام کرسکتی تھی اور اپنا نظریہ اس کے سامنے پیش کرسکتی تھی۔ اس لیے مسلم لیگ کے پاس مجلس دستور ساز کے بائی کاٹ کا مطلق کوئی جواز نہیں تھا۔ اس کے بعد جب میں لارڈ ویول سے ملا تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ انھیں میری بات بہت پسند آئی تھی اور انھوں نے میرے بیان کی ایک نقل لیاقت علی خان کو بھیجی تھی، اس درخواست کے ساتھ کہ اسے مسٹر جناح کو دکھلا دیں۔ (انڈیا ونس فریڈم: ص ۲۵۱)

فسادات نواکھالی:

لیکن یکا یک پورے ہندوستان میں سنسنی پھیل گئی جب ۱۵/ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو یہ خبر شایع ہوئی کہ ضلع نواکھالی (بنگال) میں مسلمانوں نے وہاں کی ۱۵ فیصدی اقلیت پر (ہندوؤں پر) حملہ کردیا۔ دیہات تباہ کردیے، باشندگان دیہات کو قتل کردیا، عورتوں اور لڑکیوں کو اغوا کرلیا گیا، مردوں اور بچوں کو زبردستی مسلمان بنایا گیا۔ وغیرہ وغیرہ۔ ممکن ہے ناعاقبت اندیش مسلمان اس خبر سے خوش ہوئے ہوں، مگر مسلمانوں کے حقیقی خیر اندیش اور سچے ہم درد اس خبر سے پریشان ہوگئے، کیوں کہ یہ دوسری تباہ کن بدعت تھی۔ یعنی اکثریت کی جانب سے اقلیت کو ختم کردینے کی سفاکانہ بدعت، جس کا نقصان ہندو سے زیادہ مسلمان کو پہنچ سکتا ہے۔

علاوہ ازیں یہ قابل نفرین حرکت اسلامی روایات کے سراسر اور اسلامی تعلیمات کو رسوا کرنے والی تھی۔ کیوں کہ "لَا اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ" کے قطعاً مخالف تھی اور دشمنان اسلام کے لیے نظیر پیش کررہی تھی کہ "اسلام کی اشاعت تلوار" سے ہوئی ہے۔ چناں چہ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی، حضرت مولانا ابوالکلام صاحب آزاد، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ناظم اعلا جمعیت علماے ہند اور دیگر اکابر ملت نے اسلام کے نام پر اپیلیں کیں۔ نواکھالی کے ان کوتاہ اندیش انسانوں کے فعل سے اظہار بے زاری کیا۔ مگر یہ بیانات نقار خانہ میں طوطی کی صدا ثابت ہوئے۔

دو ماہ بعد نواکھالی میں یہ آگ کیوں بھڑکی؟ اس کی صحیح وجہ اگر چہ اب تک منکشف نہیں ہوسکی۔ لیکن ہمارے خیال میں وہی انتقامی جذبہ اس فساد کا محرک تھا جس کی چنگاریاں ہنگامۂ کلکتہ نے ستم رسیدہ دلوں کے اندر پنہاں کردی تھیں۔

ناخواندہ، دیہاتی، جاہل یا جہل مرکب میں مبتلا، نیم ملا خطرۂ ایمان کی مصداق خواندہ مسلمانوں نے جہاد کا لفظ غلط اور احمقانہ طور پر استعمال کیا اور اسلام کو بدنام کرنے، مسلمانوں کو برباد اور رسوا کرنے کے لیے ایک اسپرٹ عوام میں پیدا کی۔ اُن پڑوسیوں پر جن کے حقوق اسلام نے رشتے داروں کے برابر قرار دیے ہیں، اجتماعی طور پر حملہ کیا گیا۔ اول ان سے مسلمان ہونے کی فرمائش کی گئی۔ عام طور پر اس فرمائش کو منظور کرلیا گیا۔ چنان چہ اس پورے ہنگامے میں جس [illegible] نے شور سے ہندو پریس نے آسمان کو سر پر اٹھالیا اور جس نے تمام ہندوستان کے ہندوؤں کو مشتعل کردیا، صرف سوا دو سو یا ڈھائی سو ہندو ہلاک ہوئے۔ البتہ جبریہ تبدیل مذہب اور اغوا کے واقعات بہ کثرت ہوئے۔ چند دیہات کو لوٹا گیا اور برباد کیا گیا۔

ہمسایہ اور پڑوسیوں کے ساتھ یہ حرکت اگر چہ اسلامی نقطۂ نظر سے انتہا درجے نفرت انگیز تھی، لیکن جہاد اسلامی کا بگڑا ہوا دھندلا سا نقش جوان کے دماغوں میں تھا اس کا یہ فایدہ ضرور ہوا کہ ہزاروں جانیں قتل وخون سے بچ گئیں اور نمایشی اسلام نے بھی حملہ آوروں کے خنجروں کو کند کردیا۔ (علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے: حصہ دوم، ص ۹۹-۴۹۷)

مہاتما گاندھی کی اپیل:

۱۷/ اکتوبر ۱۹۴۶: کانگریس کے رہنما مہاتما گاندھی نے ۱۵/ اکتوبر کو نئی دہلی میں اپنی پرارتھنا کے موقع پر کہا:

> ''دو خبروں نے مجھے بڑا پریشان کررکھا ہے۔ ایک تو آسام میں سیلاب نے تباہی مچا رکھی ہے، جس سے لاکھوں انسان خانماں ویران ہوچکے ہیں۔ دوسرا یہ کہ مشرقی بنگال کے ضلع نواکھالی میں شدید فرقہ وارانہ فساد ہورہے ہیں۔ اخباری اطلاعات سے پتا چلتا ہے کہ مسلم لیگ عبوری حکومت میں شامل ہورہی ہے۔ مجھے امید ہے کہ مسلم لیگی حضرات بھائیوں کی طرح کام کرنے کی

غرض سے حکومت میں آ رہے ہیں۔ اگر انھوں نے ایسا کیا تو یہ بہت اچھا ہوگا۔ میں ہندوؤں سے کہہ چکا ہوں کہ وہ مسلمانوں کو برا نہ جانیں اور ان کے خلاف دل میں جگہ پیدا نہ کریں۔ مسلم لیگ سے بھی میری یہی اپیل ہے کہ وہ اگر پاکستان کے لیے لڑنا چاہیں تو وہ صاف اور محتاط انداز میں لڑائی کریں۔ قاید اعظم فرما چکے ہیں کہ پاکستان میں ہر ہر شہری کے ساتھ منصفانہ سلوک ہوتا رہے گا۔ جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہ علاقہ ان کے لیے ایسا ہی ہے جیسے پاکستان۔ میری گذارش ہے کہ مسلمان وہاں ہندوؤں کو خون کا بھائی سمجھیں، دشمن نہ جانیں۔ مجھے امید ہے ہندو اور مسلمان ایک عہد کریں گے کہ آج کے بعد وہ ایک دوسرے کو تکالیف نہیں پہنچائیں گے۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا میری خواہش یہی ہوگی کہ میں چھتوں پر چڑھ کر پکارتا رہوں کہ ہندو اور مسلمانوں نے آزادی حاصل نہیں کی اور وہ کبھی آزادی حاصل نہیں کر سکیں گے۔ جو آدمی یا قوم ایسا وطیرہ اختیار کرے اسے آزادی ہرگز نہیں مل سکتی۔'' (روزنامہ انقلاب لاہور۔ ۱۷/اکتوبر ۱۹۴۶ء)

۱۷/اکتوبر ۱۹۴۶ء: عارضی حکومت میں مسلم لیگ کے نمایندوں کی شمولیت کے فیصلے کے بارے میں مجلس احرار اسلام ہند کے ترجمان روزنامہ ''آزاد'' لاہور نے مندرجۂ ذیل اداریہ لکھا ہے:

''لیگ کے تازہ فیصلے کی اصل اور اس کا نتیجہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا اور ہمیں معاف کیا جائے ہم اس طرز استدلال سے متفق نہیں جو لیگی معاصروں نے اپنے زعما کے ''بیانات اور استدلات'' کے منصۂ شہود پر آنے سے پہلے اختیار کر لیا ہے اور اپنی سپر اندازی کے لیے وجۂ جواز تلاش کی جا رہی ہے۔

اگر عبوری حکومت میں نو کے مقابلے میں پانچ نشستیں ہی لیگ کا مطمح نظر تھا اور پھر جن حالات میں شرکت کا فیصلہ کیا گیا — وہی طریق کار درست اور بجا ہے تو یہ پہلے کیوں نہ سوچا گیا؟

پھر اگر ایسوسی ایٹیڈ پریس کی یہ اطلاع درست ہے کہ لیگ وائسرائے کی پیش کش کے مطابق اپنے حقوق کی بنیادوں پر شامل ہو رہی ہے تو جب وائسرائے نے اپنے نشریے میں

پکارا تھا اور خود پنڈت جواہر لال نہرو یہی دعوت لے کر گئے تو اس وقت اس پیش کش کو مسلمانوں کی قومی ہستی کے لیے خطرناک قرار کیوں دیا گیا؟ اور یہ کیوں کہا گیا کہ لارڈ ویول بدعہدی کر رہے ہیں؟ کیا بدعہدی کا یہ دھبہ نواب بھوپال کی درمیانی وادی سے دھل گیا ہے۔

''نیشنلسٹ مسلمان'' کے سوال پر جو ہنگامے برپا کیے گئے، شملہ کانفرنس فیل ہوئی، وزارتی وفد کی پہلی پیش کش واپس لی گئی اور ہر دفعہ اس سوال کو اتنی اہمیت دی گئی گویا مسلمانوں کا قومی نصب العین ہی یہی ہے۔

کیا اب نیشنلسٹ مسلمان کے نہ لیے جانے کا مطالبہ منظور ہو گیا؟ اور یہ سارا ہنگامہ صرف اس لیے کھڑا کیا گیا تھا کہ علی گڑھ کے چھوکروں سے مولانا ابوالکلام آزاد کی داڑھی نچوائی جائے اور سید پور میں شیخ الاسلام کی قبا پر گستاخ ہاتھ دراز کیے جائیں؟ اور پھر اس طرح ''دینی معصیت'' اور قومی گناہ کے بالواسطہ مجرموں کے لیے عبوری حکومت میں پانچ نشستیں حاصل کی جائیں سوچیے ''پاکستان اور صرف پاکستان'' دو آئین ساز مجالس واحد نمائندگی اور اس قسم کے دوسرے جائز و ناجائز مطالبات کا نتیجہ آج کیا ہے؟ پانچ نشستیں اور پھر یہ سب کچھ اس کی قیمت ہے جو مسلم لیگ نے ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان میں انگریز کے لیے کیا۔

مسلم لیگ اب کہاں کھڑی ہے؟ اور ہندوستان میں اب کس قسم کا پارٹ ادا کرنا چاہتی ہے؟ نیز نواب بھوپال دہلی کیوں پہنچے؟ لارڈ ویول نے جناح سے معانقہ کی دوبارہ ضرورت محسوس کیوں کی؟''

(روزنامہ آزاد۔لاہور: ۱۷راکتوبر ۱۹۴۶ء۔کاروانِ احرار: جلد ۷، ص ۶-۴۰۵)

۲۳راکتوبر ۱۹۴۶ء: ۲۳راکتوبر کو آل انڈیا مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ جس میں پانچ نام طے کر لیے گئے۔ اس موقعے پر قائداعظم نے کونسل مسلم لیگ میں سے کسی کو اپنے راز میں لیے بغیر کونسل سے ازخود نام پیش کرنے کی منظوری حاصل کر لی۔

مسلم لیگ کی اس کارروائی کے متعلق میاں بشیر احمد ایڈیٹر ماہنامہ ''ہمایوں'' لاہور نے روزنامہ ''نوائے وقت'' میں ایک مضمون لکھا تھا، جسے بعد میں ۲۴رجون ۱۹۶۳ء کے ہفت روزہ ''چٹان'' نے نقل کیا۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''جب عبوری حکومت میں لیگ کی شمولیت کا سوال زیرِ بحث آیا تو قاید

اعظم نے ارکانِ عاملہ سے پوچھا: تمہاری کیا رائے ہے؟

سب نے کہا نہرو اور پٹیل کو زیر کرنے کے لیے آپ کا شمول ضروری ہے۔ جواب میں قایداعظم نے فرمایا مسلم لیگ کو کس کے حوالے کروں؟

اس پر سب نے عرض کیا ہم آپ کے خادم موجود ہیں۔

قایداعظم نے جواب دیا قوم کو آپ پر اعتماد نہیں، وہ آپ کو کھوٹا سکہ سمجھتی ہے۔''

بہ قول میاں بشیر احمد قایداعظم نے کونسل مسلم لیگ کے ارکان سے کہا کہ قوم کو آپ پر اعتماد نہیں، وہ آپ کو کھوٹے سکے سمجھتی ہے۔ (کاروانِ احرار: جلد ۷، ص ۷-۴۰۶)

۲۳ / اکتوبر ۱۹۴۶ء: سر محمد یامین خان کے بہ قول آج مسٹر محمد علی جناح نے وایسرائے سے ملاقات کی اور لیگ کی طرف سے انٹیرم گورنمنٹ میں شریک کرنے کے لیے پانچ نام اس کے حوالے کر دیے۔ ان میں لیاقت علی خاں، عبدالرب نشتر، آئی آئی چندریگر، غضنفر علی خان کے علاوہ ایک اچھوت لیڈر جوگندر ناتھ منڈل کا نام بھی ہے۔ لیکن ۲۵ / اکتوبر کو جب وایسرائے نے مسلم لیگ کے ممبران کے ناموں کا اعلان کیا تو عام سیاسی حلقوں میں یہ نام حیرت سے اور لیگی حلقے میں ناپسندیدگی کے ساتھ سنا گیا اور شدید ردِ عمل سامنے آیا۔ چودھری خلیق الزماں اپنی خودنوشت ''شاہراہِ پاکستان'' میں لکھتے ہیں:

''ہم میں سے اکثر لوگوں کو بعض ناموں کے اعلان پر حیرت ہوئی۔ خصوصاً جب خواجہ ناظم الدین اور نواب اسماعیل خان کے بجائے مسٹر منڈل کا نام تجویز ہوا۔ حال آں کہ ان دونوں کا نام وایسرائے نے بھی اپنی فہرست میں رکھا تھا۔ مزید برآں تعجب یہ تھا کہ کہاں تو مسٹر جناح کانگریس کو یہ حق بھی دینے کے لیے تیار نہیں تھے کہ وہ اپنے کوٹے سے کسی غیر مسلم لیگی کو لے اور کہاں انھوں نے خود منڈل کو اپنی فہرست میں شریک کر لیا۔ میں نے اس سے اختلاف کیا اور نواب اسماعیل خان نے اپنا اختلافی نوٹ لکھایا۔ اس کے بعد فوراً خواجہ ناظم الدین میرے پاس آئے اور کہا کہ آپ نواب صاحب کو سمجھائیں کہ وہ اپنا اختلاف کارروائی میں نہ لکھائیں۔ میں نے انکار کیا کہ میں نواب صاحب سے اس بارے میں کچھ نہ کہوں گا۔ کیوں کہ علاوہ اور وجوہات

کے یہ تو مسٹر جناح کے دو قومی نظریے کے بھی خلاف ہے۔'' (صفحہ:۱۱۲۵)

اس سلسلے میں سر محمد یامین خان کے بیان میں قدرے تفصیل ہے۔ وہ اپنی خود نوشت ''نامۂ اعمال'' میں لکھتے ہیں:

''ورکنگ کمیٹی سے مسٹر جناح نے یہ اختیار اپنے لیے لے لیا تھا کہ وہ چاہے جس جس کا نام وائسرائے کو ۵ ممبریوں کے لیے لیگ میں سے دے دیں۔ چون کہ ورکنگ کمیٹی میں نام طے کرنا اس لیے دشوار تھا کہ کسی کے خلاف کوئی ممبر زبان نہیں کھول سکتا تھا، لہٰذا مسٹر جناح نے اپنے ہاتھ میں رکھا اور نہایت خفیہ رکھا۔ غالباً ایک دوسے کسی خاص خاص شخص کی بابت مشورہ کیا تھا۔ آج ملاقات کے دوران یہ پانچوں نام دے آئے۔''

مسٹر جناح کا خط وائسرائے کے نام:

۲۵ر اکتوبر ۱۹۴۶ء:

ڈیئر لارڈ ویول

آپ کا ۲۵ر اکتوبر کا وہ خط مجھے ساڑھے پانچ بجے شام کو ملا، جس میں محکموں کی تقسیم کے بارے میں آپ کا فیصلہ درج ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ میں اس تقسیم کو مساوی اور منصفانہ نہیں مان سکتا، لیکن ہم تمام نشیب وفراز پر تبادلۂ خیالات کر چکے ہیں اور چوں کہ آپ کا فیصلہ آخری ہے اس لیے میں اس معاملے کو مزید بڑھانا نہیں چاہتا۔

میں ان مسلم لیگی ممبروں کے نام بھیج رہا ہوں جن کے لیے یہ محکمے کس طرح تقسیم کیے جائیں۔

مالیات: مسٹر لیاقت علی خان — کامرس: مسٹر آئی آئی چندریگر

پوسٹ اینڈ ایر: مسٹر عبدالرب نشتر — صحت: مسٹر غضنفر علی خاں

لیجسلیٹو: مسٹر جوگندر ناتھ منڈل

آپ کا مخلص

ایم اے جناح

۲۵/اکتوبر ۱۹۴۶ء: لیگی رہنماؤں کے خلاف توقع منڈل کی نام زدگی پر ان کے شدید ردِعمل اور غم و غصے کو سر یامین خان نے زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''آج رات کو ٹھیک نو بجے مسلم لیگ کے اور بقیہ ممبران کے ناموں کا اعلان وایسرائے کرنے والے تھے، اس لیے اکثر نواب اسماعیل خاں اور خواجہ سر ناظم الدین کے دوستوں نے ان کے اعزاز میں امپیریل ہوٹل نئی دہلی میں دعوت رات کے ڈنر کی دی، اس میں بہت سے اخباری نمایندے بھی مدعو تھے۔ سب کو یقین تھا کہ یہ دو تو ضرور ہوں گے۔ چوں کہ لیاقت علی خاں نے اکثر لوگوں سے کہا تھا کہ شاید وہ اس لیے نہ لیے جائیں کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے سیکرٹری ہیں اور اس کے فرائض ادا کرنے ہوتے ہیں۔ علاوہ اس کے وایسرائے نے ان کا نام پہلے اعلان کیا تھا، اب کوئی وجہ نہیں کہ مسٹر جناح ان کا نام نہ دیں۔ لہٰذا اخبار والے شروع سے ان دونوں سے دریافت کر رہے تھے کہ آپ دونوں کے علاوہ بقیہ تین کون ہیں؟ آپ دونوں تو یقینی ہیں۔ ہر اخبار والا اس فکر میں تھا کہ ذرا بھی اشارہ ملے تو فوراً تار ارادیں۔ یہ دونوں کہتے تھے کہ ہمیں نہیں معلوم، لیکن کوئی باور نہیں کرتا تھا۔ جب نو بجنے میں دس منٹ رہے دریافت کیا، پھر جب پانچ منٹ رہ گئے تو کہا کہ لو اب تو بتا دو۔ پھر انکار ہوا تو اخبار والے ڈائننگ روم سے بیٹھنے کے کمرے میں گئے جہاں ریڈیو تھا۔ ٹھیک نو بجے وایسرائے نے اپنی کیبنٹ کا اعلان کیا۔ اس کو سن کر جب اخبار والے اور ان دونوں کے مداح واپس آئے تو ان کے چہروں پر بجائے خوشی کے افسوس کے آثار نمایاں تھے۔ نواب اسماعیل خاں اور خواجہ ناظم الدین کھانے کی میز پر آمنے سامنے کی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ دونوں نے بے تابی سے دریافت کیا کہ آیا اعلان ہو گیا یا نہیں۔ کچھ نے کہا ہاں ہو گیا۔ سب نے کہا کہ اس کا افسوس اور تعجب ہے کہ آپ دونوں میں سے کوئی نہیں لیا گیا اور غیر معروف لوگ لیے گئے۔ ان دونوں کے منہ قدرتاً فق ہو گئے اور دونوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ چندریگر کا نام کسی نے کبھی آل انڈیا معاملات میں سنا بھی نہیں تھا اور وہ کون شخص منڈل ہے، لوگوں نے دریافت کیا۔ کئی بولے اس کو کیسے لیا گیا۔ غضنفر علی خاں بھی مستقل مزاج نہیں سمجھے جاتے تھے، اگرچہ چند مسلم لیگ کے ممبروں نے اپنے اپنے صوبے کے لیے درخواست کی تھی۔ مگر ممبریاں صرف پانچ تھیں اور صوبے گیارہ۔ لہٰذا ہر صوبے کو ممبری نہیں مل سکتی تھی۔ وہ ڈنر جو خوشی اور مبارک باد کے لیے کیا گیا تھا اور چند تو ہار لیے آئے تھے جو

دوسرے کمرے میں رکھے تھے ان سب آرزوؤں پر پانی پھر گیا اور ان دونوں کی یہ حالت ہوئی جیسے سانپ سونگھ گیا۔

اس کے بعد باہر بھی مسلم لیگی حلقوں میں غم وغصہ منڈل کے لیے جانے پر بے حد تھا اور اکثر لوگوں نے کہا کہ قایداعظم کو کیا ہو گیا کہ مسلمانوں کو جو پانچ جگہ لیگ کی ملیں ان میں سے ایک اچھوت کے حوالے کر دی۔ اب تک تو یہ بھی گوارا نہ تھا کہ کانگریس کسی مسلمان کو بھی لے، حال آں کہ وہ کانگریس کا ممبر ہو اور کانگریس کو اس سے محروم کرنا چاہتے تھے کہ ان کا کوئی مسلمان ممبری میں نہ آئے۔ اب قایداعظم کو کس نے یہ حق دیا تھا کہ وہ لیگ سے باہر کے آدمی کو جو اچھوت قوم کا ہے اس کو لیگ کا نمایندہ بنائیں۔ بعض زیادہ غصے میں تھے اور کہتے تھے کہ قایداعظم ڈکٹیٹر بن گئے ہیں۔ کونسل آف انڈیا مسلم لیگ کا جلسہ ہوا تو ہم بھی صاف صاف کہہ کر قایداعظم کی کرکری کریں گے اور منڈل سے استعفیٰ دلوائیں گے اور چندریگر کو محض اس لیے لیا ہے کہ بمبئی شہر میں لوگ خوش رہیں۔ ایک اس پر بولے کہ اپنوں اپنوں کو دیں، خیر یہ بھی گوارا کیا جا سکتا لیکن اس اچھوت کو تمام راز کی باتوں میں شریک کرنا پڑے گا۔ غم وغصے کی حالت میں بہت بے جا الفاظ بھی استعمال کیے اور کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی مفسد آدمی نے یہ دھوکا دیا ہے اور ناظم الدین سے بدلا لیا گیا ہے۔ ایک صاحب نے کہا کہ چوں کہ کانگریس نے ایک مسلمان کو اپنے حصے میں سے جگہ دی تو اس کا جواب قایداعظم نے جن پر مسلمان اعتبار کرتے ہیں یہ دیا کہ مسلمانوں کے پانچ نمایندوں میں سے جس کی منظوری کونسل مسلم لیگ نے دی تھی ایک نمایندگی بغیر کونسل کی منظوری کے اچھوت کو اپنی ضد پوری کرنے کے واسطے کیسے دی۔ غرض کہ غصہ مسلمانوں میں بہت رہا۔

نام جو نئی ایگزیکیٹو کونسل کے اعلان ہوئے وہ یہ ہیں اور جو محکمے ملے وہ ان کے نام کے آگے ہیں:

کانگریس چھ ممبر:

(۱) جواہر لال نہرو	(وزارتِ خارجہ و دولت مشترکہ)
(۲) سردار ولبھ بھائی پٹیل	(ہوم انفارمیشن و براڈکاسٹنگ)
(۳) ڈاکٹر راجندر پرشاد	(خوراک وزراعت)

(۴) آصف علی (کمیونی کیشن وریلوے)

(۵) راج گوپال آچاریہ (تعلیم وفن کاری)

(۶) مسٹر جگ جیون رام (لیبر)

مسلم لیگ پانچ ممبر:

(۱) لیاقت علی خاں (فنانس)

(۲) چندریگر (تجارت)

(۳) سردار عبدالرب نشتر (مواصلات، ڈاک خانے، ہوائی پرواز)

(۴) راجہ غضنفر علی خاں (صحت)

(۵) جوگندر ناتھ منڈل (قانون سازی)

سکھ: سردار بلدیو سنگھ (دفاع)

پارسی: بھبا (ورکس، مائنس اینڈ پاور)

عیسائی: جان میتھائی (انڈسٹریز وسپلائی) (نامۂ اعمال: ص ۹۹)

سر محمد یامین خاں کی روایت کے مطابق ایک لیگی کے بہ قول "جناح صاحب نے منڈل کی نام زدگی کا فیصلہ کانگریس کے جواب میں ضد میں آکر کیا تھا۔ اگر جناح صاحب ضد سے کام نہ لیتے اور منڈل کے بجائے بھی کسی مسلمان کو نام زد کرتے تو کیبنٹ میں ۵ مسلمان، ۶ ہند اور ۳ سکھ، پارسی، عیسائی وغیرہ دیگر اقلیتوں کے ممبر ہوتے۔ اس طرح حکومت میں مسلمانوں کی تعداد کانگریس کے ہندو ممبران سے زیادہ اور پوزیشن بہت مستحکم ہوتی۔ یہ بھی سوچیے کہ اگر کانگریس کے ایک مسلمان ممبر کو بھی شمار کرلیا جائے تو صورتِ حال یک سر بدل جاتی! مسلمان ۶ ہوتے، کانگریسی ممبر ۵ رہ جاتے اور اقلیتیں ۳۔ لیکن افسوس کہ ضد کہیے، دشمنی یا تعصب کہیے، عقل پر کیسے پردے پڑ گئے تھے کہ اتنی صاف روشن اور واضح بات بھی انھیں نہ سوجھی جن پر اعتماد کر کے فیصلہ کرنے کا حق دیا گیا تھا۔ نہ کسی میں اتنی جرأت پیدا ہوئی کہ اس حقیقت کو علی الاعلان بر وقت دنیا پر واضح کر دیتا۔

۲۵ر اکتوبر ۱۹۴۶ء: نواکھالی کے فسادات پر پوری طرح قابو نہ پایا جاسکا تھا کہ بہار میں فسادات پھوٹ پڑے۔ مولانا سید محمد میاںؒ نے فسادات کے واقعات اور ان کے نتائج پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

ان فسادات کا سلسلہ ۲۵/اکتوبر ۱۹۴۶ء کو چھپرا شہر اور تحصیل چھپرا (چھپرا سب ڈویژن) سے شروع ہوا۔ اور ۵/نومبر ۱۹۴۶ء/۱۰/ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ تک اس کا سلسلہ شد و مد سے جاری رہا۔

ضلع پٹنہ کے سب ڈویژن بارہ، سب ڈویژن بہار شریف اور صدر سب ڈویژن بہار یعنی تحصیل پٹنہ۔

ضلع گیا کے صدر سب ڈویژن یعنی تحصیل گیا اور سب ڈویژن جہان آباد۔ سب ڈویژن نوادہ۔

شہر مونگیر اور تحصیل مونگیر نیز تحصیل جموئی ضلع مونگیر کا ایک گاؤں۔ شہر بھاگل پور اور تحصیل بھاگل پور، نیز تحصیل بانکہ ضلع بھاگل پور کے چند مواضعات۔

ضلع سنتھال پرگنہ کی تحصیل صاحب گنج اور تحصیل گڈا کے سرحدی مواضعات

مذکورہ بالا بارہ تحصیلیں اس فساد کی آماج گاہ رہیں اور کم و بیش دس ہزار مسلمان مرد عورتیں اور بچے اس فساد کی نذر ہو گئے۔ ہزاروں گھر تباہ اور لاکھوں مسلمان خانماں برباد ہو گئے۔

یہ حملے اجتماعی طور پر ہوئے۔ ایک ایک حملے میں ہزاروں بلوائیوں نے حصہ لیا۔ بہت سے مواقع پر مسلمانوں نے استقلال سے مقابلہ کیا۔ بعض بعض جگہ وہ کامیاب بھی ہو گئے مگر عموماً ناکامی رہی۔ درحقیقت ایک سیلاب کی صورت تھی۔ بلوائیوں کے ہجوم نے جس طرف رخ کر لیا۔ تباہ و برباد کرتا ہوا چلا گیا۔ مال و اسباب لوٹا گیا۔ مکانات نذر آتش کیے گئے۔ آبادیوں کو برباد کیا گیا۔ بچوں اور عورتوں کو ذبح کیا گیا۔ کم زور انسانوں کو بے دریغ قتل کیا گیا۔ غرض وحشت، بربریت، خون خواری اور کمینگی کی جو حرکتیں ہو سکتی ہیں، انتہائی بے حیائی کے ساتھ ان کا مظاہرہ کیا گیا۔

مگر عصمت دری، اغوا اور تبدیل مذہب کے واقعات بہت کم پیش آئے، کیوں کہ ان کے جذبۂ انتقام یا جذبۂ درندگی اور وحشت کو سکون صرف قتل و ذبح ہی سے ہوتا تھا۔

(علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے: حصہ دوم، ص ۳-۵۰۲)

۲۶/اکتوبر ۱۹۴۶ء: مسٹر اچاریہ کرپلانی صدر آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے نواکھالی کے دورے کے بعد ۲۶/اکتوبر ۱۹۴۶ء کو ایک بیان دے دیا۔ یہ بیان ۱۴ نمبروں پر مشتمل

ہے۔اہم نمبر یہ ہیں:

(۱) نواکھالی اور ٹپرہ کے اضلاع میں جو حملہ ہوا وہ طے شدہ مسلم پالیسی اور تیاری کے بعد کیا گیا۔ اگر براہِ راست مسلم لیگ نے اس میں حصہ نہیں لیا تب بھی یہ اس کے پروپیگنڈے کا اثر ضرور ہے۔

(۲) حکام کو پہلے سے اطلاع دے دی گئی تھی مگر انھوں نے کوئی انتظام نہیں کیا۔ مسلمان افسروں نے چشم پوشی اختیار کی، مسلمانوں کا عام خیال تھا کہ ہندوؤں کے خلاف جو کچھ بھی کیا جائے گا حکومت کوئی کارروائی نہیں کرے گی۔

(۳) سیکڑوں کی تعداد میں اکٹھا حملہ کیا گیا۔ اولاً لیگ کے لیے جبریہ چندہ وصول کیا جاتا تھا اور بعض دفعہ کلکتہ کے مصیبت زدگان کے لیے چندہ وصول کرتے تھے۔ مسلم لیگ زندہ باد، لے کے رہیں گے پاکستان کے نعرے لگاتے تھے۔ ہندو آبادی سے یہ بھی کہا گیا کہ یہ لوٹ مار اور قتل، کلکتہ میں مسلم جانوں کا انتقام ہے۔ جبریہ کلمہ پڑھوانے کے بعد بھی بسا اوقات ہر ایک چیز کو لوٹ لیا۔ ہندو گھروں کی مورتیاں توڑیں، مندر لوٹ لیے گئے، جبریہ شادیاں، زنا بالجبر، ایک جگہ غنڈوں نے عورتوں کو لٹا کر ان کی پیشانیوں کے تلک پاؤں کے انگوٹھوں سے مٹائے۔ پولیس کہتی تھی کہ ہمیں اپنی بچاؤ کے سوا گولی چلانے کا حکم نہیں۔ تمام ہنگاموں کے باوجود گیارہ بارہ روز کے عرصے میں صرف پچاس مسلمان گرفتار کیے گئے۔

(تیج، ۳۰/اکتوبر ۱۹۴۶ء: جلد ۲۵، ص ۲۲۳)

۲۹/اکتوبر ۱۹۴۶ء: آل انڈیا ریڈیو پر وائسرائے ہند لارڈ ویول نے اپنی تقریر نشر کرتے ہوئے کہا کہ

> ''میں صرف چند الفاظ کہوں گا، لیکن یہ میرے ضمیر کی آواز ہوگی اور یہ ہندوستان کے اہم مسائل سے متعلق ہوگی۔
>
> اول: میں آپ پر زور دینا چاہتا ہوں کہ کولیشن گورنمنٹ کے قیام سے ہندوستان کی آزادی کی طرف ایک اور اہم قدم اٹھایا گیا ہے۔ میری یہ خواہش اور امید ہے کہ اس حکومت کے تمام عناصر اکٹھے ہو کر کام کریں اور موجودہ اہم مسائل کو حل کر طے کریں گے اور نئے آئین کو ترتیب دیتے وقت رفاقت کے جذبے سے کام لیں گے۔ اس طرح کہ برطانوی حکومت ہندوستان کو مکمل

اختیار منتقل کرنے کے قابل ہو جائے۔ لیکن جب ہمارے دلوں میں تشویش اور مسلسل خطرات ہوں گے تو ہندوستان اپنی منزل مقصود کی طرف کیسے بڑھ سکتا ہے اور ہم اپنے بڑے مقصد کی طرف کیسے توجہ دے سکتے ہیں۔ ہم اور دوسرے سبھی ملک یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ہندوستان کے طول وعرض میں فرقہ وارانہ جھگڑوں کی تشویش کب ختم ہوگی؟

میری اور میری حکومت کی دلی خواہش ہے اس لیے اپنی اور اپنی حکومت کی طرف سے میں پُرزور اپیل کرتا ہوں کہ فرقہ وارانہ جنگ ختم کردی جائے، جس نے ملکی زندگی کو مسموم اور نیک نامی کو دھکا لگایا ہے۔

ہمیں گزشتہ ناگوار نفرت انگیز ایذارسانیوں کو بھول جانا چاہیے اور مستقبل میں ایک آزاد، طاقت ور اور خوش حال ہندوستان کی تعمیر میں باہم کوشش کرنی چاہیے۔" (روزنامہ انقلاب-لاہور: ۳۱ر اکتوبر ۱۹۴۶ء)

کلکتہ اور نواکھالی کے قتل عام کا جوردِعمل بہار میں ہوا، یہاں کی اکثریت نے اقلیت پر جو ستم ڈھائے وہ تاریخ میں اپنی مثال آپ ہیں۔ بہار میں چوں کہ نشانۂ ستم مسلمان بنے تھے، اس لیے مسلم لیگ کے اخبارات اور اہل قلم نے اس کی بڑی بھیانک تصویریں کھینچیں۔ اس میں میں کوئی شک کبھی نہ تھا کہ واقعات بہت بھیانک پیش آئے تھے۔ مولانا فرید الوحیدی نے ان واقعات پر بڑا بے لاگ تبصرہ کیا ہے اور قدرت اللہ شہاب جو پاکستان سول سروس کے ایک بہت نام ور آفیسر تھے ان کی مشہور تالیف "شہاب نامہ" سے ایک اقتباس بھی دیا ہے۔ مولانا وحیدی لکھتے ہیں:

کلکتہ اور نواکھالی کی لاقانونیت اور بربریت کا ردِعمل فوراً ہی بہار میں شروع ہوا۔ یہاں مسلمان اقلیت میں تھے اور ہندو فرقہ پرستی اور تعصب کو سنہرا موقع ہاتھ لگا تھا۔ ان کے حملے مسلمان آبادیوں پر بڑی پلاننگ اور تنظیم کے ساتھ ہونے لگے۔ انتظام یہ ہوتا تھا کہ دور دراز علاقوں سے اجنبی فسادی جتھے بلائے جاتے تھے تاکہ ایسا نہ ہو کہ حملے کے دوران ظالموں کے دل میں جان پہچان اور صدیوں کے رہن سہن کی وجہ سے مروت اور نرمی آجائے۔ کلکتہ میں مسلم لیگ کی حکومت تھی تو بہار میں کانگریس کی بادشاہت تھی۔ وہاں مسلم حکومت نے بلوہ فساد کرایا تو یہاں کانگریس حکومت خاموش تماشائی بنی رہی۔ بہادر اور ملک

کے سپوت حملوں کے لیے گاؤں بھی وہ منتخب کرتے تھے جہاں مسلم آبادی پانچ سات یا دس فیصدی ہوتی تھی۔ دس دس پندرہ پندرہ ہزار ظالموں کے منظم، مسلح اور صف بند جتھے جیکارے لگاتے، سنکھ بجاتے اور بھجن گاتے ہوئے بستیوں اور گاؤوں پر ٹوٹ پڑتے تھے اور نہتے، بے قصور اور کمزور مسلمانوں کو چن چن کر برچھیوں، بھالوں اور چھروں سے ذبح کرتے تھے۔ بہت سے جیالے، متوالے اور نشۂ مستی میں غرق بہادر عورتوں اور بچوں کو گھروں میں بند کر کے آگ لگا دیتے تھے اور پھر تڑپنے سسکنے اور زندہ جل کر مرنے کا تماشہ دیکھتے تھے۔ درجنوں عبادت گاہیں شہید کر ڈالی گئیں۔ سیکڑوں عورتوں اور کنواریوں نے کنوؤں میں کود کر اپنی عزت و آبرو بچائی۔ لاتعداد معصوم اور ننھے بچوں کو درختوں، کھمبوں اور دیواروں پر کیلوں میں گاڑ کر اور لٹکا کر تڑپا تڑپا کر مارا گیا۔ ان مظالم کی داستانیں تاریخ کے سینوں میں یقیناً محفوظ رہیں گی اور کبھی نہ کبھی وہ وقت ضرور آئے گا کہ خاک و خون میں آلودہ یہ کہانیاں اپنی اصلی اور بھیانک صورتوں میں نمودار ہوں گی، مگر سر دست ان کی تفصیل و تحقیق ہمارے لیے آسان نہیں ہے، تاہم دو چار مناظر تو دیکھتے ہی چلیں:

''گاندھی جی بہار تشریف لائے۔ یہاں پر انھوں نے جو کچھ دیکھا، اس نے ہندو جاتی کی امن پسندی، صلح جوئی اور غیر تشدد پسندی کے متعلق ان کے بہت سے مفروضات کی کایا پلٹ دی۔ یہاں پر وسیع و عریض علاقوں میں مسلمانوں کا نام و نشان بھی مٹ گیا تھا، گھر لٹ چکے تھے، مسجدیں ویران پڑی تھیں، کنویں مسلمان عورتوں کی لاشوں سے اٹا اٹ بھرے پڑے تھے۔ کئی جگہ ننھے منے بچوں کے ڈھانچے اب تک موجود تھے جنھیں لوہے کے کیل گاڑ کر درختوں اور دیواروں کے ساتھ ٹانگ دیا گیا تھا۔ یہ روح فرسا نظارے دیکھ کر گاندھی جی کو غالباً زندگی میں پہلی بار یہ احساس ہوا کہ ہندو قوم اتنی نرم دل، امن پسند اور غیر متشدد نہیں ہے جتنا وہ سمجھتے اور پرچار کرتے رہے ہیں۔ گاندھی جی کے ساتھی سیکرٹری اور سوانح نگار پیارے لال نے اپنی کتاب ''مہاتما گاندھی دی فرسٹ فیز'' میں بڑے واضح طور پر اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ بہار کی خوں ریزی دیکھ کر گاندھی جی کی آنکھوں سے پردہ اٹھ گیا اور متحدہ ہندوستان کے متعلق ان کا دیرینہ خواب ٹوٹ کر پاش پاش ہو گیا۔''

(''شہاب نامہ'': ص ۱۸۱ بہ حوالہ: شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی''، ص ۹۴-۵۹۳)

مسٹر اصفہانی، قحط بنگال اوران کا مشن:

یکم نومبر ۱۹۴۶ء: مسٹر اصفہانی بنگال کے بہت بڑے تاجر ہیں۔ جب صوبۂ بنگال میں قحط پڑا اور لاکھوں مرد عورتیں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئے اس وقت ان کے گوداموں میں لاکھوں ٹن چاول بھرا ہوا تھا، کیوں کہ بنگال کے وزیر اعظم مسٹر حسین شہید سہروردی جنھیں مجاہد اعظم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے بنگال میں سول سپلائیز کے وزیر تھے اور انھوں نے اپنے دوست اصفہانی کو چاولوں کا ٹھیکہ دے دیا تھا۔ حال ہی میں مسٹر اصفہانی اور راجہ صاحب محمود آباد نے گھنشیام داس برلا اور مسٹر سرکار کے ساتھ مل کر ایک لمیٹڈ کمپنی قایم کی ہے۔ جس میں چاروں حصہ دار برابر کے شریک ہیں۔ اس کمپنی کا نام ''اصفہانی کیمیکلز'' ہے۔

(انصاری۔ یکم نومبر ۱۹۴۶ء زیر عنوان مسٹر اصفہانی کا مشن)

مسٹر اصفہانی صاحب نے فرمایا کہ مسلم لیگ احتجاجی طور پر عارضی حکومت میں شامل ہوئی ہے تا کہ نظام حکومت کو کم سے کم جزوی طور پر کانگریس کے اجارہ دارانہ کنٹرول سے نکالا جائے۔ لیگ قطعی طور پر مطالبۂ پاکستان پر قایم ہے اور اس نے جو نیا فیصلہ کیا ہے اس کا منشا صرف یہ ہے کہ پاکستان کی جنگ حکومت کے اندر اور باہر دونوں جگہ لڑی جائے۔ میں ہندوؤں کی یہ بات نہیں مان سکتا کہ ہندوستان میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں وہ انگریزوں نے پیدا کیے ہیں۔ درحقیقت ہندو مسلمانوں کے اختلافات مستقل اور ازلی ہیں۔

(بہ حوالہ ''علماے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے'': ص ۲۷۴-۲۷۳)

فسادات اور حضرت شیخ الاسلام کا بیان:

یکم نومبر ۱۹۴۶ء: دہلی ۲۸/ اکتوبر۔ مولانا حسین احمد مدنی صدر جمعیت علماے ہند نے ایک بیان میں کہا ہے کہ مشرقی بنگال کے اضلاع نوا کھالی اور ٹپرہ کے شرم ناک واقعات جو اخبارات میں شایع ہوئے ہیں اگر تمام کے تمام جزوی طور پر درست ہیں تو واقعی افسوس ناک اور قابل نفرت ہیں۔ شریعت اسلام اور انسانیت کے اصول اس بات کو برداشت نہیں کر سکتے۔ خوف ناک واقعات جو اشاعت میں آ رہے ہیں ان سے نہ صرف ہمیں شرم محسوس ہوتی ہے بلکہ دل پر بھی چوٹ لگتی ہے۔ یہ انسانیت سوز واقعات اسلام اور مسلمانوں کے لیے داغ ہیں، لوگوں کو ایمان لانے کے لیے جبر کرنا اور عورتوں کا اغوا غیر اسلامی طریقے ہیں۔

ایسے طریقوں کے خلاف قرآن مجید میں تنبیہ کی گئی ہے۔ صحیح اسلامی طریقہ یہ ہے کہ انسانیت کے دایرے میں رہ کر معقول طور پر عمل کیا جائے۔

احکام قرآنی کے مطابق تبدیل مذہب کے لیے کسی جبر کی اجازت نہیں ہے۔ مسلمان شاہان سلف کی تاریخ کہتی ہے کہ انھوں نے بھی اس طرح جبر کی اجازت نہیں دی۔ ہمارے ملک کی سیاسی پوزیشن بھی اس بات کا مطالبہ کرتی ہے۔

غیر اسلامی رویہ:

پُر امن غیر مسلموں کو ذبح کرنا، ہمسایوں کو قتل کرنا، ان کا مال واسباب لوٹنا، ان کے مکانوں اور کھیتوں کو جلانا، ان کو شہر بدر کرنے پر مجبور کرنا اور کسی قسم کی دھمکی دینا انتہائی بربریت کی کارروائیاں ہیں۔ قرآن شریف میں متعدد جگہ اس قسم کی کارروائیوں سے روکا گیا ہے۔ مسلمانوں کو تاکید کی گئی ہے کہ بلا امتیاز مذہب وملت اپنے ہمسایوں سے نرمی کا برتاؤ کریں۔ موجودہ حالات میں ان چیزوں کو جہاد کہنا جہالت ہے۔ اس طرح غیر تعلیم یافتہ لوگ گم راہ ہوتے ہیں۔ یہ تمام مسلمانوں کا پہلا فرض ہے کہ خود ان باتوں سے علاحدہ رہیں اور دوسروں کو بھی روکیں۔ اسلام میں کٹر دشمن کے ساتھ بھی ایسا سلوک کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر کوئی غیر مسلم مسلمان پر حملہ کرے تو مسلمان کو صرف اپنا جانی مالی بچاؤ کرنے کی اجازت ہے، وہ اپنی توہین کے خلاف بھی بچاؤ کر سکتا ہے۔

(مدینہ۔ بجنور: یکم نومبر ۱۹۴۶ء، ص ۱)

بہار کے فسادات اور جمعیت علماے ہند کا ردِ عمل:

۳ رنومبر ۱۹۴۶ء: نواکھالی کے فسادات کے ردِ عمل میں بہار میں نہایت خوف ناک فسادات شروع ہو گئے۔ جمعیت کے رہنماؤں نے ان کے خلاف اپنے شدید رنج اور افسوس کا اظہار کیا۔ مجلس عاملہ نے اس پر سخت تجویز پاس کی اور مولانا سید محمد میاں ناظم جمعیت علماے ہند کی سربراہی میں ایک وفد صوبۂ بہار بھیجا۔ جس نے ۱۲ رنومبر سے ۲۵ رنومبر ۱۹۴۶ء تک فساد زدہ علاقوں کا دورہ کر کے اپنی رپورٹ مرتب کی۔ یہ رپورٹ ۱۴ تا ۱۶ ردسمبر کے مجلس عاملہ کے اجلاس میں پیش کی گئی۔ اس رپورٹ کی سفارشات کی روشنی میں ذیل کی تجاویز پاس کی گئی ہیں:

تجویز نمبر۱: مجلس عاملہ جمعیت علماے ہند کا یہ اجلاس بہار میں مظلوم مسلمانوں کی خون ریزی خصوصاً مسلمان، عورتوں اور بچوں کے بے دردانہ قتل، اغوا اور فساد و غارت گری، جبری تبدیل مذہب (شدھی) کے ہول ناک واقعات پر اپنے انتہائی غیض وغضب اور نفرت کا اظہار کرتا ہے اور بہار کی حکومت کو اس کی غفلت اور نا قابلیت کا ملزم سمجھتا ہے اور بعض ہندو کانگریسی عہدے داروں اور ورکروں کی اس فساد میں شرکت اور رہنمائی کو سخت نفرت وغضب کی نظر سے دیکھتا ہے اور مطالبہ کرتا ہے کہ کانگریس ہائی کمانڈ اس افسوس ناک قضیے کی پوری تحقیقات کرے اور جن کانگریسیوں کے متعلق یہ نفرت آمیز کام ثابت ہو ان کو قانونی سزا کے ساتھ ساتھ کانگریس سے نکال دے۔

البتہ یہ جلسہ ان نیک خیال ہندوؤں کا شکر گذار ہے جنھوں نے مسلمانوں کو قتل و غارت گری سے بچایا اور محفوظ مقامات تک پہنچانے میں ان کی امداد کی۔

تجویز نمبر۲: مجلس عاملہ جمعیت علماے ہند کا یہ اجلاس ان ہول ناک واقعات پر جو بہار میں پیش آئے اور جن کے تصور سے مسلمانوں کا مستقبل صوبۂ بہار میں انتہا درجے خطرناک اور مخدوش ہو گیا ہے، مندرجہ ذیل امور کا حکومت بہار سے مطالبہ کرتا ہے، تا کہ مسلمانوں کو صوبۂ بہار میں اطمینان نصیب ہو اور ان مظالم کی جو اُن پر ہوئے ہیں تلافی ہو سکے۔

(۱) جانی و مالی نقصانات کی پوری تحقیقاتی تفاصیل اسپیشل کمیٹی کے ذریعے مرتب کرائی جائیں اور جانی و مالی نقصانات پر مجرمین کو عبرت ناک سزائیں دی جائیں اور مالی نقصانات کے معاوضے دیے جائیں۔

(۲) مقدمات کی سماعت کے لیے ہائی کورٹ کے معیار کے ججوں پر مشتمل ایک ٹربیونل قایم کیا جائے اور جو لوگ مجرم ثابت ہوں ان کو عبرت ناک سزائیں دی جائیں۔

(۳) جو لوگ اپنے تحفظ کے لیے اسلحہ کا لائسنس لینا چاہیں ان کو لائسنس دیا جائے۔

(۴) جن مسلمانوں، مردوں یا عورتوں کو زبردستی ہندو بنالیا گیا ان تک پہنچنے اور ان کو اسلام میں واپس آنے اور محفوظ مقامات میں ان کو جگہ دینے کے لیے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔

(۵) مسلمانوں کی حفاظت کے لیے فوج یا مسلح پولیس قایم کی جائے اور جب تک حالت قابل اطمینان نہ ہو جائے یہ انتظام قایم رکھا جائے۔ اس فوج یا پولیس میں اکثریت

مسلمانوں کی ہو اور آفیسرز بھی مسلمان ہوں۔

(۶) جہاں کہیں مسلم اقلیت خطرے میں ہو وہاں اکثریت سے اقلیت کی جان و مال کی حفاظت کے لیے انفرادی یا اجتماعی ضمانتیں لی جائیں۔

(۷) صوبے کی جمعیت علما کے مشورے اور تعاون سے حکومت بہار تحفظ امن کے لیے ایک کمیٹی بنائے جو حکومت بہار کو اور اس کی ضلع وار شاخیں مقامی حکومتوں کو نقصانات کی تلافی اور حفظ امن کی تدابیر کے لیے مشورہ دیتی رہیں۔

(۸) اشتعال انگیز مضامین کی اشاعت کو قطعاً بند کر دیا جائے اور اخبارات کی کڑی نگرانی کی جائے۔

(۹) بہار میں جو مسلمان گرفتار کیے گئے ہیں ان کو رہا کر دیا جائے۔

(۱۰) باہمی اعتماد پیدا کرنے کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترک باا ثر وفود دیہاتوں مین بھیجے جائیں۔

(۱۱) مسلم اقلیت کے مقامات میں جہاں دور دور تھانے ہیں، ان کی حفاظت کے لیے مزید پولیس اسٹیشن قریب قریب قایم کیے جائیں۔

(۱۲) پناہ گزینوں کی واپسی کا جب تک مستقل قابلِ اطمینان انتظام نہ ہو جائے، ان کے امدادی کیمپ قایم رکھے جائیں۔ (ضمیمہ جمعیت علما کیا ہے؟: ص ۴۳ و ۴۴)

فسادات بنگال و بہار — مجاہدِ ملت کا بیان:

۳ر نومبر ۱۹۴۶ء: مشرقی بنگال کے ضلع نواکھالی اور پٹرہ میں ناعاقبت اندیشی کے جو افسوس ناک واقعات اور امن سوز تفصیلات اخبارات مین شایع ہوئی ہیں، اگر وہ کلی یا جزوی طور سے صحیح ہیں تب بھی حد درجے شرم ناک اور قابل نفرین و ملامت ہیں۔ نہ شریعت اسلامیہ ان کی اجازت دیتی ہے نہ عقل و انسانیت ان کی روادار ہے۔

اخباروں کے کالم کے کالم ایسے دردناک واقعات سے بھرے ہوتے ہین جن کو معلوم کر کے نہ صرف شرم سے گردنیں نیچی ہو جاتی ہیں۔ بلکہ دل بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے، یہ ناشائستہ اعمال موجودہ اسلام کے لیے کلنگ کے ٹیکے اور مسلمانوں کے لیے انتہائی بدنام کنندہ ہیں۔

(الف) لوگوں کو تبدیل مذہب کے لیے مجبور کرنا اور زبردستی کسی مرد یا عورت کو مسلمان کرنا یا کسی عورت کا اغوا کرنا! یہ امور ہرگز ہرگز اسلام میں جائز نہیں ہیں۔ قرآن میں مختلف مقامات پر اس سے منع کیا گیا ہے۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ. (سورۂ بقرہ:۲۵۶)

''زبردستی نہیں دین کے معاملے میں، بے شک جدا ہو چکی ہے ہدایت گم راہی سے۔''

دوسری جگہ ہے:

اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ. (سورۂ یونس:۹۹)

''اب کیا تو زبردستی کرے گا لوگوں پر کہ ہو جائیں باایمان۔''

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِO (سورۂ ق:۴۵)

''جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں، ہم خوب جانتے ہیں، آپ ان پر (من جانب اللہ) جبر کرنے والے (کر کے) نہیں بھیجے گے بلکہ صرف ہوشیار کرنے والے اور داعی ہیں۔ (جب یہ بات ہے) تو آپ قرآن کے ذریعے سے (عام طور سے یکھو اور خاص طور سے صرف) ایسے لوگوں کو نصیحت کرتے رہیں جو میری وعید سے ڈرتے ہیں۔

چوتھی جگہ ہے:

فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌO لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍO

(سورۂ غاشیہ:۲۲-۲۱)

''سو تو سمجھائے جا۔ تیرا کام تو یہی سمجھانا ہے۔ تو نہیں ان پر داروغہ۔''

ہاں عمدہ دلایل اور بیان سے سمجھا سمجھا کر دین اسلام کی طرف بلانا چاہیے اور عمدہ اخلاق اور بہترین گفتگو سے لوگوں کو جذب کرنا چاہیے، یہی اسلامی طریق ہے۔ جس طرح یہ قرآنی آیات صاف طور سے بتلا رہی ہیں کہ دین کے معاملے میں کسی پر زبردستی اور جبر جائز نہیں ہے، اسی طرح بادشاہانِ اسلام کی تاریخ بھی یہی روشنی ڈالتی ہے کہ شہنشاہ جہانگیر اپنی تزک میں صفحہ ۸۲ پر اپنے احکام میں افیسران ملک کو احکام لکھتا ہوا منجملہ دوسری ممنوعات کے

زبردستی مسلمان کرنے کو بھی سختی سے منع کرتا ہے۔ اسی طرح اورنگ زیب، بابر، ہمایوں، اکبر نے بھی کیا۔ بالخصوص اورنگ زیب کے متعلق کپتان الیگزنڈر اور مسٹر آرنلڈ وغیرہ کی تصریحات صاف روشنی ڈالتی ہیں۔ سیاسیات ملکیہ اور اخلاق انسانیہ کا بھی یہی تقاضہ ہے۔

(ب) پرامن غیر مسلموں اور ہمسایوں کو قتل کرنا، ان کے مال کو لوٹنا، ان کے مکانات اور کھیتوں کو جلانا، ان کو ڈرا دھمکا کر جلاوطن کرنا موجودہ احوال میں انتہائی ظلم وتعدی کے معاملات ہیں۔

اس قسم کے فساد سے قرآن وشریعت میں جگہ جگہ سختی سے منع کیا گیا ہے۔ ہمسایوں کے ساتھ خواہ وہ کسی مذہب کے پیرو ہوں، احسان اور بھلائی کرنے کی تاکید قرآن، شریعت اور احادیث میں نہایت زوردار الفاظ میں متعدد مقامات پر آئی ہے۔ موجودہ احوال میں اس قسم کے قابل ملامت اعمال کو جہاد قرار دے کر عوام کو گم راہ کرنا سخت جہالت اور ناعاقبت اندیشی ہے۔ تمام مسلمانوں کو ایسی گم راہ کن پالیسی سے بچنا اور لوگوں کو بچانا ازبس ضروری ہے۔ اسلام دشمنوں سے بھی بے انصافی اور زیادتی کرنے سے منع کرتا ہے۔

وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی. (سورۂ مائدہ:۸)

''ہرگز آمادہ نہ کرے تم کو کسی قوم کی دشمنی اس پر کہ تم ان سے بے انصافی کرو۔ انصاف کرو وہ پرہیزگاری سے قریب تر ہے۔''

ہاں اگر کوئی غیر مسلم کسی مسلمان پر حملہ کرے تو اس کو اپنی جان، مال، عزت کی حفاظت ضروری ہوگی۔

ننگِ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ

۲۸/ذی قعدہ ۱۳۶۵ھ

۲۵/اکتوبر ۱۹۴۶ء

محمد حفظ الرحمٰن ناظم جمعیت علمائے ہند

(زمزم-لاہور: ۳/نومبر ۱۹۴۶ء، ص ۶)

یونیسکو:

۴/نومبر ۱۹۴۶ء: اقوامِ متحدہ کا تعلیمی، علمی اور ثقافتی ادارہ ''یونیسکو'' ۴/نومبر ۱۹۴۶ء

کو وجود میں آیا۔ اس کا مقصد اس کے آئین کے مطابق یہ ہے کہ قوموں کے درمیان تعلیم، سائنس اور تہذیب و ثقافت کے میدانوں میں تعاون کو ترقی دے کر امن اور سلامتی کو بڑھایا جائے، تاکہ انصاف، قانون کی برتری اور حقوق انسانی اور بنیادی آزادی کا احترام بڑھے۔ یہ وہ باتیں ہیں جن پر اقوامِ متحدہ کے منشور میں زور دیا گیا ہے۔ اس تنظیم کے تین ادارے یہ ہیں:

(۱) جنرل کانفرنس جس میں ہر رکن ریاست کا ایک نمائندہ ہوتا ہے۔ اس کا اجلاس ہر دو سال کے بعد ہوتا ہے جس میں پروگرام اور بجٹ منظور کیا جاتا ہے۔

(۲) مجلسِ انتظامیہ یا انتظامیہ بورڈ، جو چوبیس ممبروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کا جلسہ کم سے کم سال میں دو بار ہوتا ہے۔ یہ بورڈ کانفرنس کے اختیار کیے ہوئے پروگرام کی تعمیل کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

(۳) سکریتاریہ جس کا افسر اعلا ڈائریکٹر جنرل کہلاتا ہے۔ اس کا صدر دفتر پیرس میں ہے۔

یونیسکو اقوامِ متحدہ کی ایک خصوصی ایجنسی ہے۔

(فرہنگ سیاسیات: مرتبین محمد محمود فیض، احسن علی جعفری، دہلی ۱۹۸۴ء: ص ۶۴)

حادثہ گڑھ مکتیسر:

۶ر نومبر ۱۹۴۶ء: ابھی بہار کے ہنگامے پوری طرح فرو نہ ہوئے تھے کہ ۶ر نومبر ۱۹۴۶ء/ ۱۱ر ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ کو گڑھ مکتیسر کا حادثہ پیش آ گیا۔

گڑھ مکتیسر ضلع میرٹھ کا ایک مشہور اور بہت پرانا حصہ ہے جو ہندوؤں کے لیے ایک تیرتھ کی حیثیت رکھتا ہے۔

کسی زمانے میں یہ دریائے گنگا کے کنارے پر تھا۔ مگر اب دریائے گنگا اس قصبہ سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر ہے۔

اس مقام پر دریائے گنگا ضلع میرٹھ اور ضلع مراد آباد کے درمیان حد فاصل ہے۔ چناں چہ نہان کے میلے میں جو کاتک مہینہ میں گنگا کے دونوں کناروں پر لگتا ہے، گڑھ مکتیسر کے جانب میلے کے انتظامات کی نگرانی کلکٹر میرٹھ کے سپرد ہوتی ہے اور دوسری جانب میلے کے انتظامات مراد آباد کا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کرتا ہے۔

اس میلے میں تقریباً چھ سات لاکھ ہندوؤں کا اجتماع ہوتا ہے۔
۶ نومبر کو دوپہر کے وقت ایک تماشہ گاہ پر فساد کا آغاز ہوا اور ہندوؤں کی ایک مخصوص ٹولی نے جس کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ وہ رہتک کے جاٹوں کی جماعت تھی مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا۔

اس حقیقت کو چھپا لینا فن تاریخ کی دیانت کے خلاف ہے کہ عام ہندو مسلمانوں کے قتل کے درپے نہ تھے، بلکہ اس فساد سے وہ بھی سراسیمہ ہو گئے اور میلے سے بھاگنا شروع کر دیا اور اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عام ہندوؤں نے مسلمانوں کی حفاظت کی اور ان کو اس نرغے سے نکال دینے میں عجیب عجیب صورتیں اختیار کیں۔

تاہم قتل و غارت گری کا یہ سلسلہ رات کے نو دس بجے تک جاری رہا اور پولیس قابو نہ پا سکی۔ ۷ نومبر کو میلے میں غالباً اس لیے امن رہا کہ تمام مسلمان نکل چکے تھے۔ البتہ اس غارت گر اور سفاک جماعت نے گڑھ مکتیسر کا رخ کیا۔ مسلمانوں کا جو محلہ سامنے آیا اس کو برباد کر دیا۔

تقریباً پونے دو سو مسلمان مرد عورتیں اور بچے شہید کر دیے گئے اور لاکھوں روپیہ کا مال تباہ کر دیا گیا۔ میلے میں شہید ہونے والے مسلمانوں کی تعداد اس کے ماسوا ہے۔ اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ بچ نکلنے کے امکانات میلے میں بہت کافی تھے اور مسلمانوں نے ان سے فایدہ بھی اٹھایا۔ تاہم دو سو کے قریب مسلمان میلے میں بھی شہید کر دیے گئے۔

اس قتل و غارت گری کی نوعیت کو واضح کرنے کے لیے جمعیت علماے ہند کے وفد کی رپورٹ کا یہ فقرہ کافی ہے۔

> "بے رحم قاتلوں کے اس گروہ نے جو انسانیت سوز اور نفرت انگیز حرکات اس قتل عام میں کی ہیں ان کے آثار اور شہادتوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو نہ اپنی انسانیت کا شعور تھا، نہ ان مظلوموں کے جان دار ہونے کا کوئی احساس تھا جو ان کی درندگی اور بہیمیت کا شکار ہوئے۔ جوانوں، بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کا قتل عام زندہ جلانا، بچوں کی تڑپتی ہوئی نعشیں نیزوں پر چڑھانا، ماؤں کی گودوں میں سے چھین چھین کر ان کو ہلاک کرنا، بوڑھی عورتوں کو چھتوں اور بالا خانوں سے گرا کر ہلاک کرنا اور عورتوں کے ساتھ بردہ بے

رحمانہ اور قابل لعنت سلوک کرنا، جو ایک آبرو باختہ غنڈے کے دماغ میں آسکتا ہے، گڑھ مکتیسر کے فسادیوں کی وہ حرکات ہیں جن پر انسانیت ہمیشہ شرماتی رہے گی۔

اس ہول ناک فساد میں راشٹریہ سیوک سنگھ اور جاٹ کانفرنس کی اشتعال انگیزیوں کو بڑا دخل ہے اور اوّل الذکر کی تو شرکت بھی بتائی جاتی ہے۔''

اسی بیان میں کہا گیا ہے کہ

''میلے میں اور قصبے میں بہت سے ہندوؤں نے اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر مسلمانوں کو بچانے کی کوشش کی اور مختلف طریقوں سے بلوائیوں کے نرغے سے نکالا اور اس سلسلے میں بعض ہندوؤں کو زدوکوب بھی کیا گیا اور مسلمانوں کو پناہ دینے کے جرم میں ان کے مال و اسباب کو لوٹ لیا گیا۔ چناں چہ مقامی ہسپتال کے ایک ہندو ڈاکٹر کا مکان اس لیے تباہ کر دیا گیا کہ اس نے بابو نور الدین صاحب مرحوم اور ان کی بعض رفقا کو بچانے کی کوشش کی تھی۔''

(رپورٹ جمعیت علمائے ہند، بہ حوالہ انصاری: ۲ر دسمبر ۱۹۴۶ء- سنڈے ایڈیشن)

گڑھ مکتیسر (ضلع میرٹھ) میں جو ہول ناک فساد ہوا تھا اور اس میں ہندوؤں کا خصوصاً اور مسلمانوں کا عموماً جو جانی و مالی نقصان ہوا تھا، جمعیت علمائے ہند کے صدر حضرت شیخ الاسلام نے بہ نفس نفیس ایک جماعت کو ساتھ لے کر گڑھ مکتیسر کا دورہ کیا اور مرتبہ رپورٹ کی روشنی میں مجلس عاملہ نے اپنے اجلاس مورخہ ۱۴ تا ۱۶ر دسمبر ایک قرارداد پاس کی اور سفارشات مرتب کر کے حکومت سے چند اہم مطالبات کیے۔

واضح رہے کہ جمعیت کا یہ دوسرا وفد تھا جس نے گڑھ مکتیسر کا دورہ کیا تھا۔ مذکورہ اجلاس عاملہ نے جو قرارداد اور سفارشات مرتب کی تھیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے:

گڑھ مکتیسر کے حادثے کی اطلاع پاتے ہی حضرت ناظم اعلا صاحب مولانا ضیاء الحسن صاحب کے ہم راہ گڑھ مکتیسر تشریف لے گئے اور قرب و جوار کے مسلمانوں کے تحفظ کے ضروری انتظامات کیے۔ اس کے بعد دوبارہ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی صدر جمعیت علمائے ہند، حضرت ناظم اعلا صاحب جمعیت علمائے ہند،

مولانا محمد میاں صاحب فاروقی الہ آبادی، مولانا حکیم عبدالجلیل صاحب ندوی (پشاور) پر مشتمل ایک وفد نے گڑھ مکتیسر جا کر حالات کا معائنہ کیا اور ایک رپورٹ مرتب کی۔ اجلاس عاملہ میں رپورٹ پیش کی گئی۔ چناں چہ اجلاس عاملہ نے مندرجہ ذیل تجویز منظور کی:

مجلسِ عاملہ جمعیت علمائے ہند کا یہ اجلاس گڑھ مکتیسر میں ہندوؤں کی غارت گری خون ریزی اور سفاکی پر انتہائی نفرت اور غیظ و غضب کا اظہار کرتا ہے۔ اس واقعہ میں ہندو جاٹ کانفرنس اور راشٹریہ سیوک سنگھ کی نہ صرف اشتعال انگیزیوں کو دخل ہے، بلکہ ان جماعتوں کے کارکنوں نے مقامی لوگوں اور ہندو یاتریوں کو اشتعال دلا کر مسلمانوں پر حملہ کیا اور انتہائی سفاکی اور وحشت و بربریت سے کام لیا۔ مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کو بے دریغ شہید کیا گیا۔ عورتوں کا اغوا کیا گیا اور لاکھوں روپے کا مال لوٹا اور تباہ کیا گیا۔ یہ فسادات ہندوستان کی ہر ملت کے لیے خطرناک اور تباہ کن ہیں اور ہندوستان کی ترقی کے لیے حد درجے خطرناک ہیں۔

مجلسِ عاملہ اپنے مؤقر وفد کی رپورٹ پر مہر تصدیق ثبت کرتی ہے اور اس کی سفارشات کے پیش نظر حکومتِ یوپی سے مطالبہ کرتی ہے کہ

(۱) جلد از جلد ایک اسپیشل تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی جائے اور مجرمین اور غفلت شعار حکام کو عبرت آموز سزا دی جائے۔

(۲) اغوا شدہ عورتوں اور بچوں کا پتا لگا کر ان کے متعلقین کو واپس دلایا جائے۔

(۳) مسلمانوں کو اپنی حفاظت کے لیے اسلحہ کے لائسنس حاصل کرنے کی سہولت دی جائے۔

(۴) جیسا کہ حکومت نے اعلان کیا ہے۔ جانی، مالی نقصانات کی تلافی کی جائے اور پس ماندگان کی ضروریات کے لیے ان کے وظائف مقرر کیے جائیں اور یتیم بچوں کی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ مجلسِ عاملہ کا یہ اجلاس یوپی کانگریس کمیٹی سے مطالبہ کرتا ہے کہ اس فساد میں کانگریس کے نام سے جو ناجائز فایدہ اٹھایا گیا ہے اس کی مکمل تحقیقات کرائے اور کانگریس کے ارکان میں جس پر یہ جرم ثابت ہو جائے اس کو حکومت کی طرف سے سزا کے علاوہ کانگریس سے خارج کر دیا جائے۔

نیز یہ جلسہ ان نیک خیال ہندوؤں کی قدر کرتا ہے، جنھوں نے مسلمانوں کو قتل و

غارت گری سے بچایا اور محفوظ مقامات تک پہنچانے میں ان کی امداد کی۔

(ضمیمہ جمعیت علما کیا ہے؟: ص ۴۴و۴۵)

گڑھ مکٹیسر کے فسادات:

بہار کے فسادات نے یو پی کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا اور بہیمیت اور بربریت کا جو کھیل بہار میں کھیلا گیا تھا گڑھ مکٹیسر میں کھیلا گیا۔ مولانا فرید الوحیدی نے اپنی تالیف لطیف میں اس پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"بہار سے چل کر یہی آگ یو پی پہنچی، گنگا کے کنارے مشہور تیرتھ استھان گڑھ مکٹیسر میں ہر سال بڑا میلہ لگتا ہے۔ لاکھوں یاتری اشنان کرنے، پاپ دھونے اور پوتر ہونے کے لیے حاضری دیتے ہیں۔ گڑھ مکٹیسر میں خاصی آبادی مسلمانوں کی بھی ہے جو ہزاروں کی تعداد میں دوکانیں رکھتے، خوانچے لگانے اور رونق دیکھنے کے لیے ہمیشہ سے میلے میں شریک ہوتے ہیں۔ یہاں حملے اور قتل و غارت کی منظم تیاری کی گئی۔ قصبے کے لوگ تو محلے اور گھر جانتے پہچانتے تھے مگر باہر کے یاتریوں کی نشاندہی کے لیے مسلمان محلوں، مکانوں اور دوکانوں پر مخصوص قسم کی علامتیں لگادی گئیں، میلے والوں کے پہلے ہی ریلے میں مسلمانوں پر حملہ ہوا اور ایک ہی دو دن کے اندر قصبے کے سارے مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ زندہ جلانے، کنوؤں میں دھکیلنے، عصمت دری کرنے اور دودھ پیتے بچوں کو ہوا میں اچھال کر برچھی بھالوں میں پرو لینے کے نئے نئے طریقے آزمائے گئے۔ قصبے کے ایک مشہور کانگریسی بابو نورالدین شہید کے خاندان کے ایک ایک فرد کو بڑی بے رحمی سے ذبح کیا گیا تھا۔ فساد کی اطلاع ملی تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ دوسرے ہی دن بہ نفس نفیس وہاں پہنچے۔ راقم السطور (فرید الوحیدی) بھی حضرت کے ہم رکاب تھا وہاں پہنچ کر جھلسے ہوئے مکانوں، جلی ہوئی لاشوں اور ماحول سے برستی ہوئی عبرتوں اور حسرتوں کے علاوہ کچھ ہاتھ نہ آیا۔ پھر بھی اتنا تو ہوا کہ شہدا کی لاشوں اور ہڈیوں کی راکھ کے ڈھیر تو ٹوٹے ہوئے دلوں کے ساتھ چند آنسوؤں کا نذرانہ چڑھانے کا موقع مل گیا۔ اس فساد سے دو دن پہلے ۲۷ رنومبر کو کانگریس کے سالانہ اجلاس میرٹھ میں ولبھ بھائی پٹیل نے بنگال کے فساد کی خبریں سن کر کہا تھا کہ

"تلوار کا جواب تلوار سے اور اینٹ کا جواب پتھر سے دو۔ غنڈوں اور

فسادیوں سے مقابلہ کرو اور لڑائی کے لیے تیار رہو۔"

اس کے بعد ہی گڑھ مکتیسر سے یہ آگ بھڑکی تھی اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ یوپی کا کتنا بڑا علاقہ اس کی لپیٹ میں آجاتا، مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے موقع پر پہنچ جانے سے اُن کے شعلوں پر پانی پڑ گیا اور جیسے جیسے اخبارات میں حضرتؒ کے جانے اور تاثرات کی خبریں عام ہوتی گئیں یہ آگ ٹھنڈی ہوتی چلی گئی۔

ان تمام قتل گاہوں کلکتہ، نواکھالی، بہار، یوپی وغیرہ میں کنوؤں میں ڈوب کر جان دینے والیوں گڑھوں اور سوراخوں میں پھینکے جانے والوں، دریاؤں اور تالابوں میں ڈبوئے جانے والوں اور زندہ جلائے جانے والوں کا حساب و کتاب اور اعداد و شمار تو تاریخ کبھی نہیں بتلا سکے گی مگر جو لاشیں سڑکوں، چوراہوں، گزرگاہوں اور میدانوں میں پڑی ہوئی ملی ہیں صرف انھی کا حساب پچاسوں ہزار تک پہنچتا ہے۔ ملک کی تاریخ میں ہندوستانیوں کے درمیان یہ پہلا مکمل، منظم اور ایسا تباہ کن فساد تھا، اس پر ایک رپورٹ ملاحظہ ہو:

"ہندوستان کے شہروں میں ہندو مسلم فساد کوئی نئی یا عجیب چیز نہ تھی، لیکن جس پیمانے پر (ڈایریکٹ ایکشن کے موقع پر) کلکتہ میں کشت و خون کا بازار گرم ہوا اس نے سب کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ یہ دونوں فرقوں یا گروہوں کی لڑائی نہ تھی بلکہ دراصل یہ دو نوں کی جنگ تھی۔ برصغیر میں پہلی مرتبہ دو قومی نظریہ بساطِ سیاست سے نکل کر میدانِ کارزار میں اتر آیا تھا اور کلکتہ کے اس قتل عام نے مستقبل کے نقشے پر بڑے گہرے اور دور رس اثرات مرتب کیے۔"

مستقبل کے نقشے پر گہرے اور دور رس اثرات کی طرف اشارہ بڑے پتے کی بات ہے۔ دراصل اس قتل عام کے بعد ہی کانگریسی حلقوں کے دماغ میں پہلی بار یہ خیال پیدا ہوا کہ اب ہندو مسلم اتحاد کے پیچھے بھاگنا بے کار ہے۔ بہتر ہے کہ مسلم لیگ کو پاکستان دے کر جھگڑا ختم کر دیا جائے۔ "وہ سمجھتے تھے کہ پاکستان پانچ سات سال سے زیادہ نہیں چل پائے گا۔ جناح صاحب کی طرح ولبھ بھائی پٹیل کو بھی جلدی تھی۔ ان پر دو بار دل کا دورہ پڑ چکا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ تیسرا اور آخری دورہ پڑنے سے پہلے وہ کچھ دیکھ لیں۔"

(شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی: ص ۹۶-۵۹۵، بہ حوالہ مولانا آزاد- ایک سیاسی ڈایری: ص ۲۹۹۔ شہاب نامہ: ص ۲۷۴۔ آدھی رات کی آزادی: ص ۱۰۲)

۷؍نومبر ۱۹۴۶ء: آزاد ہند فوج کے مقدمے میں کامیابی اور فوج کے رہنماؤں کی رہائی کی خوشی میں ۸؍نومبر ۱۹۴۶ء کو دہلی میں جشن فتح منایا گیا۔ دس ہزار فوج نے جلوس میں حصہ لیا۔ مگر عین جلوس کے وقت ٹاؤن ہال کو آگ لگا دی گئی۔ دفتر جل گیا، عمارت کو شدید نقصان پہنچا اور پولیس کی گولیوں سے آٹھ آدمی ہلاک اور بہت سے زخمی ہو گئے۔
(حسرت موہانی - ایک سیاسی ڈائری)

بہار میں فسادات پھوٹ پڑے:

نومبر ۱۹۴۶ء: بہار میں مسلمانوں پر قتل و غارت گری کا جو سیلاب اُمڈ آیا ہے وہ حد درجہ افسوس ناک اور قابل نفرت ہے۔ قوم پرور ہندوؤں کا فرض ہے کہ وہ اس غنڈہ ازم کو روکیں اور حکومتِ بہار اپنے اعلانات کے مطابق ان کا پوری طرح انسداد کرے۔ مسلم اقلیت کے صوبے میں یہ غندہ گردی اکثریت کے لیے شرم ناک ہے۔ نواکھالی کے واقعہ کو بہانہ بنا کر دوسرے صوبوں کے بے گناہ انسانوں پر قتل و غارت گری روا رکھنا شرافت اور انسانیت سے بعید ہے۔ (روزنامہ ''انقلاب'' لاہور: ۱۰؍نومبر ۱۹۴۶ء)

مولانا ابوالکلام آزاد:

۱۰؍نومبر ۱۹۴۶ء:

> ''اب عمل کا وقت ہے، باتیں بنانے یا مضمون لکھنے کا نہیں۔ بہار میں جو خوف ناک مصیبت نازل ہوئی ہے وہ انسانیت پر بے پناہ حملے کے مترادف ہے۔ یہ خطرناک سانحہ ہے، جسے ہم روک نہیں سکتے۔
>
> میں جو کچھ عوام کے گوش گذار کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اب زیادہ مصلحت اختیار کرنے کا موقع نہیں مل سکے گا۔ اب حکومت کے سامنے ہزارہا پناہ گزینوں کا مسئلہ ہے۔ حکومت ان پناہ گزینوں کی ضرورت پوری کرنے کی پوری پوری کوشش کر رہی ہے۔'' (روزنامہ انقلاب - لاہور: ۱۱؍نومبر ۱۹۴۶ء)

ڈاکٹر راجندر پرشاد:

> ''اگر ہندو سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کو دبا کر وہ امن کی زندگی بسر کر سکتے ہیں

تو وہ سخت غلطی پر ہیں۔ ان ہندوؤں میں اکثر ایسے ہیں جو اضطراب و پریشانی کے باعث سو نہیں سکتے۔ اس لیے کہ انھیں جانوں کا خطرہ ہے۔ یہ اس کا نتیجہ ہے جو انھوں نے بہار میں مسلمانوں کے ساتھ کیا۔"

(روزنامہ انقلاب-لاہور: ۱۲ر نومبر ۱۹۴۶ء)

لیگ کا عاقبت نااندیشانہ بیان:

۱۱ر نومبر ۱۹۴۶ء: بہار میں فرقہ وارانہ فسادات میں مسلمانوں کو سخت مالی اور جانی نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ بہار کے مسلمانوں کی مدد کے لیے سرحد کے خدائی خدمت گاروں کا وفد بادشاہ خان کی سربراہی میں پنجاب سے مجلسِ احرار کے رضا کاروں اور ان کے رہنما دہلی و یوپی سے جمعیت علماے ہند کے رہنما اور کارکن، لکھنؤ سے ندوۃ العلماء کے طلبہ اور بہار کے کانگریسی اور جمعیت کے لیڈر اپنی جانوں کی پروا کیے بغیر، سروں کو اپنی ہتھیلیوں پر رکھے ہوئے بہار کے قصبات و قریات میں مارے مارے پھر رہے تھے، لیکن بہار کے لیگی رہنماؤں نے جو صوبے سے فرار اختیار کرلیا تھا یا محفوظ مقامات پر چھپے بیٹھے تھے، کسی نے میدان میں نکل کر مظلومین کی دست گیری کی ہمت نہ کی۔ تحریک پاکستان کے قاید اعظم اور مسلم لیگ کے صدر مسٹر محمد علی جناح نے مسلمانانِ بہار سے اپیل کی ہے، اس میں انھیں تسلی دینے اور ان کے زخموں پر مرہم رکھنے کا کیسا حق ادا کیا ہے۔ اس کا اندازہ ان کے ان جملوں سے کیا جاسکتا ہے۔ فرماتے ہیں:

> "اقلیت والے صوبوں میں مسلمانوں پر جو مظالم توڑے گئے ہیں، جو بے گناہ مسلمان شہید کیے گئے ہیں یا زخمی ہوگئے ہیں یا مال اسباب لوٹا گیا ہے ان کی قربانی رایگاں نہیں جائے گی۔ وہ یہ سمجھ لیں کہ انھوں نے جنگ پاکستان اور آزادی کے لیے اپنا حق ادا کردیا ہے۔"

(خطبات قاید اعظم مرتبہ رئیس احمد جعفری)

کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کے التوا کا مطالبہ اور اس کی ناکامی:

۱۱ر نومبر ۱۹۴۶ء: کلکتہ، نواکھالی: بہار اور گڑھ مکتیسر کے فسادات سے اپنے مقصود کو پورا کرنے میں مسٹر جناح نے کوتاہی نہیں کی۔

چناں چہ گڑھ مکٹیسر کے فساد (۶ر نومبر ۱۹۴۶ء) کے فوراً بعد مسٹر جناح نے ۱۱ر نومبر کی نئی دہلی سے ایک بیان جاری کیا۔ جس میں آپ نے ارشاد فرمایا:

''اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کے بے پناہ مصایب اور ان کا جو قتل عام ہوا ہے اور جس طرح ان پر سفاکانہ اور بہیمانہ مظالم ہوئے وہ رایگاں نہ جائیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ قربانی ہمارے مطالبۂ پاکستان کو 'مسلّمہ'' کردے گی۔ جو لوگ مارے گئے یا مجروح ہوئے یا جن کا مالی نقصان ہوا ان سب کو تسلی دینی چاہیے کہ انھوں نے ہماری آزادی اور حصول پاکستان کے سامنے اپنا حق ادا کر دیا ہے۔''

(روزنامہ منشور-دہلی: ۱۴ر نومبر ۱۹۴۶ء/ ۱۹ر ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ، جلد ۹، ص ۳۶۰)

دوسری جانب آپ نے ۲۲ر نومبر ۱۹۴۶ء کو سلطنت برطانیہ کے نایب اعظم ''وایسرائے ہند'' کو خط لکھا کہ

چوں کہ حالات بہت زیادہ خراب ہیں لہٰذا کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کی تاریخ جو ۹ر دسمبر ۱۹۴۶ء طے ہو چکی ہے ملتوی کر دی جائے۔

وایسرائے بہادر نے اس مطالبے کو معقول قرار دیا اور پنڈت جواہر لال نہرو کو آمادہ کرنا چاہا کہ وہ اس مطالبے کو منظور کرلیں۔

لیکن اگر فضا کے موجودہ تکدر کے باعث اسمبلی کا اجلاس ملتوی کیا جا سکتا تھا تو اس کی کیا ضمانت ہوسکتی تھی کہ آیندہ جو تاریخ بھی مقرر کی جائے گی اس سے چند روز پیشتر ملک کے لاکھوں میل مربع طول و عرض میں بہار جیسا کوئی قتل عام نہیں ہوگا؟ لہٰذا پنڈت جواہر لال نہرو نے التوائے تاریخ سے انکار کر دیا۔ وایسرائے بہادر نے ''ثالث بالخیر'' بن کر ۲۵ر نومبر کو جناح اور جواہر لال نہرو کی مشترکہ میٹنگ اپنے یہاں کی۔ مگر پنڈت جواہر لال نہرو کا اصرار بدستور رہا کہ ۹ر دسمبر سے کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کا اجلاس ہوگا وہ ملتوی نہیں ہوسکتا۔

اس وقت یقیناً انقلاب فرانس کا نقشہ وایسرائے کی نظروں کے سامنے آگیا ہوگا کہ ''لوئی شانز دہم'' نے کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی منظور کر کے اس کو مسترد کر دیا تو انقلابی جماعت نے شہنشاہ کی حکم عدولی کرتے ہوئے دستور ساز اسمبلی منعقد کی اور پرسکون تبدیلی نے خونی انقلاب کی شکل اختیار کر لی۔ جس کے طوفان میں فرانس کے اسپیریلزم کا بیڑہ ہمیشہ کے لیے

غرق ہو گیا۔ بہ ہر حال پنڈت جواہر لال نہرو کے اصرار کے سامنے لارڈ ویول وائسرائے ہند کو ہتھیار ڈالنے پڑے، مگر اب ایک دوسری نوعیت سے جدو جہد شروع ہوئی جس کی تفصیل یہ ہے کہ ۲۷ر نومبر ۱۹۴۶ء کو پارلیمنٹ کی طرف سے لیگ، کانگریس اور سکھوں کے نمایندوں کو لندن طلب کیا۔ لیکن کانگریس نے اس دعوت کو بے معنی قرار دیا اور اپنے نمایندے لندن بھیجنے سے انکار کر دیا۔ چناں چہ اعلان ہوا کہ ۳۰ر نومبر ۱۹۴۶ء کو وائسرائے ہند، مسٹر جناح اور نواب زادہ لیاقت علی خاں کے ہم راہ لندن جائیں گے، لیکن برطانوی کیبنٹ اس سے مطمئن نہیں ہوا۔ چناں چہ ۲۹ر نومبر ۱۹۴۶ء کو برطانوی حکومت کے وزیر اعظم مسٹر اٹیلی اور پنڈت نہرو کے درمیان پیغامات کا تبادلہ ہوا۔ ان پیغامات میں مسٹر اٹیلی نے پنڈت نہرو کو یقین دلایا کہ برطانوی حکومت وزارتی مشن کی تجاویز میں تبدیلی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی اور نہ ہی وہ دستور ساز اسمبلی کے ۹ر دسمبر کے اجلاس کو ملتوی کرنا چاہتی ہے۔ اس یقین دہانی پر پنڈت نہرو نے لندن جانے کی دعوت منظور کر لی۔

(انصاری: ۶ر محرم الحرام ۱۳۶۶ھ/ یکم دسمبر ۱۹۴۶ء)

چناں چہ ۳۰ر نومبر کو وائسرائے ہند، پنڈت جواہر لال نہرو، مسٹر جناح اور سردار بلدیو سنگھ کے ساتھ ہوائی جہاز کے ذریعے لندن روانہ ہو گئے۔ یہ وعدہ کر لیا گیا تھا کہ پنڈت جواہر لال نہرو کو ۹ر دسمبر سے پہلے ہندوستان پہنچا دیا جائے گا۔ چناں چہ خاص طور پر تیز رفتار ہوائی جہازوں کا انتظام کیا گیا۔

لارڈ ویول اور ہندوستانی لیڈروں کو ۴ر دسمبر (چہار شنبہ) کی دوپہر کو قصرِ بکنگھم میں شاہ جارج کے ساتھ ضیافت کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ مگر راستے میں ہوائی جہاز کچھ خراب ہو گیا اور چند گھنٹہ مالٹا میں قیام کرنا پڑا۔ اس لیے دوپہر کی دعوت کا پروگرام فسخ ہو گیا، رات کو دعوت ہوئی۔

مضحکہ انگیز نقالی:

مسٹر اٹیلی وزیر اعظم برطانیہ کے اس پختہ وعدے کے بعد کہ نہ وزارتی مشن کی تجاویز میں کوئی تبدیلی ہوگی اور نہ کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کی تاریخوں میں التوا ہوگا۔ مسٹر جناح اور ان کے رفیق کا لندن جانا لا حاصل اور فعل عبث تھا۔

مسٹر جناح نے بھی مسٹر اٹیلی کو پیغام بھیجا:

''آج رات کو مجھے آپ کا وہ پیغام ملا جو آپ نے پنڈت نہرو کو بھیجا ہے۔ لیکن مجھے وہ پیغامات موصول نہیں ہو سکے جو پنڈت نہرو نے آپ کو بھیجے ہیں۔ آپ کے اس پیغام کے بعد اور ایک نئی صورت پیدا ہو گئی ہے اور ہمارے لندن جانے کی دعوت قبول کرنے کے حالات بدل گئے ہیں۔''

مسٹر اٹیلی نے مسٹر جناح کو جواب دیا:

''مجھے امید ہے کہ آپ لندن آئیں گے۔ آپ کے انکار کی وجہ صرف یہ ہو سکتی ہے کہ آپ پنڈت نہرو کے نام میرے پیغام کا مطلب غلط سمجھے ہیں۔ اس میں کوئی بات ایسی نہیں جو تمام نظریوں اور نکتوں پر غور کرنے کی راہ میں حایل ہو سکے۔''

مسٹر جناح صاحب بالقابہ نے جواب دیا:

''میں آپ کے اس پیغام کا جو مجھے آج صبح ملا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ کی جانب سے وضاحت کیے جانے اور اطمینان دلانے پر میں نے کل صبح لندن کے لیے روانہ ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

(انصاری، سنڈے ایڈیشن: ۲ر دسمبر ۱۹۴۶ء۔ بہ حوالہ: علماے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے (حصہ دوم): ص ۲۵-۵۲۲)

۱۲ر نومبر ۱۹۴۶ء: پٹنہ۔ ''پٹنہ ٹائمز'' نے اپنی ۳ر نومبر کی اشاعت میں پٹنہ ڈویژن کے بنگالی کمشنر کے مسلمانوں کے قتل عام کے سلسلے میں طرز عمل کا ذکر کیا ہے۔ اخبار کی خبر کے مطابق جب پٹنہ کے مسٹر امام الدین نے کمشنر این بکشی سے رابطہ کر کے مسلمانوں کے لیے امدادی کاموں کی ضرورت پر زور دیا تو کمشنر نے سختی سے جواب دیا کہ یہ میرا کام نہیں ہے۔ آپ کی مسلم لیگ کو پہلے سے اس صورت حال کے لیے تیار رہنا چاہیے تھا، کیوں کہ وہ نواکھالی میں قتل عام کی ذمہ دار ہے۔ (جنگ۔ کراچی)

۱۳ر نومبر ۱۹۴۶ء: کلکتہ۔ شیلانگ کی ایک اطلاع کے مطابق آسام کی حکومت نے لوگوں کو جبراً بے دخل کرنے کی مہم شروع کر کے اس صوبے میں بھی صورت حال خراب کرنی شروع کر دی ہے۔ برپتیہ، منگلڈیا سب ڈویژن کے تقریباً آٹھ ہزار خاندانوں کو نوٹس

جاری کیے گئے ہیں کہ وہ صوبے سے چلے جائیں ورنہ انھیں جبراً نکال دیا جائے گا۔

(جنگ۔کراچی)

۱۴ر نومبر ۱۹۴۶ء: نئی دہلی۔قاید اعظم محمد علی جناح نے غیر ملکی صحافیوں کو دیے گئے انٹرویو میں واضح کیا ہے کہ عبوری حکومت کو کوئی ایسی کارروائی کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی جو انڈیا کے مستقبل کے نقشے یا ہمارے مطالبۂ پاکستان پر بالواسطہ یا بلاواسطہ اثر انداز ہو۔انھوں نے کابینہ کے مسلم لیگی ارکان کو مسلمانوں کے مفادات کا محافظ قرار دیا اور اعلان کیا کہ برٹش انڈیا کے مسئلے کا واحد حل اس کی پاکستان اور ہندوستان میں تقسیم ہے۔

(جنگ۔کراچی)

فسادات کی صورت حال— پنڈت جواہر لال نہرو کا بیان:

۱۴ر نومبر ۱۹۴۶ء کو مسٹر مدن دھاری سنگھ اور مسٹر عبدالرحمٰن صدیقی نے پنڈت جواہر لال نہرو سے سوال کیا کہ

''وزرا نے بنگال اور بہار کے ان علاقوں کا معائنہ کیا جہاں فسادات ہوئے، وہاں کی کیا کیفیت ہے؟''

پنڈت جواہر لال نہرو نے دونوں کا ایک ساتھ جواب دیا:

''اخبارات ان فسادات اور قتل و غارت کے حالات سے بھرے پڑے ہیں جو واقع ہوئے۔گورنمنٹ ان کو چھپانا نہیں چاہتی۔اسمبلی کو پورے حالات بتانا ضروری ہے تاکہ وہ انسداد کا طریقہ اختیار کر سکے۔حالات نہایت خراب ہیں لیکن اخبارات جس طرح بڑھا چڑھا کر مبالغہ کے ساتھ خبریں شایع کرتے ہیں ان سے اور زیادہ اشتعال پیدا ہوتا ہے۔غلط خبریں بہت جلد ملک میں پھیل جاتی ہیں، ہم کو بدامنی اور فساد میں مبتلا کر دیتی ہیں۔فرقہ وارانہ فسادات کو بتانے کے لیے پچھلے واقعات کو ظاہر کرنا ہوگا، چوں کہ یہ زنجیر کی ایک کڑی دوسری سے وابستہ ہے۔نفرت کا سبق اور تشدد اپنے زہریلے پھل لاتے ہیں۔ہوا ہونے سے آندھی آتی ہے۔جب سے عارضی گورنمنٹ نے حکومت کی باگ سنبھالی وہ انھیں فرقہ وارانہ فسادات کا مقابلہ کرنے میں مشغول ہے۔ہم نے کلکتہ کے فسادات کے جو ۱۶ر اگست کو شروع ہوئے کئی

دن بعد حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ اگر چہ قانوناً صوبائی معاملات میں "گورنر جنرل ان کونسل" کو مداخلت کا اختیار نہیں ہے، صرف گورنر جنرل کو ہے۔ تاہم ہم نے یہ خیال کر کے کہ ملک ہم سے رہنمائی کی توقع رکھتا ہے ہم نے جو کچھ مدد کر سکتے تھے کی۔ تمام فسادات کے دوران خواہ وہ کلکتہ میں ہوئے یا نوا کھالی میں یا مشرقی بنگال یا بہار میں گورنمنٹ اس کوشش میں رہی کہ اس خطرے سے ملک کو جو ملک بھر میں پھیل چلا ہے اپنی ذمہ داری سے بچائے۔"

(کاروانِ احرار: جلد ۸، صفحہ ۴۳۵)

۱۵ر نومبر ۱۹۴۶ء: اوکھلائی دہلی میں جامعہ ملیہ کا سہ روزہ جشن سیمیں (سلور جوبلی) زیرِ صدارت ہز ہائی نس نواب حمید اللہ خاں صاحب بھوپال منعقد ہوا۔ سامنے کی قطار میں ایک طرف پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، سید آصف علی، مسٹر راج گوپال اچاریہ بیٹھے تھے۔ دوسری جانب سامنے کی صف میں مسٹر جناح، مس فاطمہ جناح، نواب زادہ لیاقت علی خاں، سردار عبدالرب نشتر اور نواب غضنفر علی خاں موجود تھے۔ ڈائس کی پچھلی صف میں مولانا سید سلیمان ندوی، سر شیخ عبدالقادر، ڈاکٹر عبدالحق، حفیظ جالندھری، اور دیگر شرفا اہل کمال حضرات تشریف فرما تھے۔

کانگریس کا میرٹھ سیشن:

۱۹-۲۳ر نومبر ۱۹۴۶ء: کانگریس کا سالانہ اجلاس میرٹھ شہر میں منعقد ہوا۔ جہاں سے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ابتدا ہوئی تھی۔ یہ اجلاس ۱۹ تا ۲۳ر نومبر تک جاری رہا۔ اجلاس ایسے حالات میں منعقد ہو رہا تھا جب پورے ہندوستان کی فضا فرقہ وارانہ خون ریز فسادات اور کشیدگی سے لبریز تھی۔ انسانی جسموں کے جلنے کی سڑانڈ سے دماغ پھٹے جا رہے تھے اور نفسیاتی طور پر ہر شخص ان کے اثرات کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ ظاہر ہے یہ صورت حال حساس طبع انسانوں کے لیے شدید کرب ناک تھی۔ وائسرائے اور مسلم لیگ کے رویے نے حالات کو نہایت مایوس کن بنا دیا تھا۔ اس کی تفصیل پنڈت جواہر لال نہرو کی تقریر میں ملتی ہے جو انھوں نے مجلس مضامین میں کی۔ (۲۱ر نومبر) انھوں نے وائسرائے کو موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے کہا:

''وہ کابینہ کی گاڑی کے پہیے ایک ایک کر کے نکال رہا ہے اور جس جذبے کے تحت عبوری حکومت کی ابتدا ہوئی تھی وایسرائے اسے ان خطوط پر چلانے میں ناکام ہو چکا ہے۔''

لیگ کے رویے کو بے نقاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

''جب سے وہ حکومت میں شامل ہوئی ہے اس کا مقصد برطانیہ کی حمایت کرنا رہ گیا ہے۔ میں نے ایک مرتبہ مسٹر جناح کو لکھا تھا کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے باہمی اختلافات جو عبوری حکومت میں پیدا ہوئے، یہ وایسرائے کی مداخلت کے بغیر آپس میں طے کر لینے چاہییں۔ مسٹر جناح نے اس تجویز کو قطعی طور پر مسترد نہیں کیا، لیکن حکومت میں شمولیت کے بعد لیگ اپنے آپ کو بادشاہ کی پارٹی ثابت کرنے کی دوڑ دھوپ میں لگی ہوئی ہے۔ برطانوی حکومت نے اپنے مقصد کے لیے اس سے فایدہ اٹھایا ہے۔ اعلا برطانوی سرکاری افسروں اور لیگ میں ذہنی ہم آہنگی ہے۔''

صورت حال بڑی نازک ہو چکی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ہم مزید کب تک عبوری حکومت میں شامل رہیں گے۔ جب موقع آئے گا تو ہم اپنی جدو جہد کی نوعیت متعین کرنے پر غور کریں گے۔ میں وایسرائے کو متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے صبر کا پیمانہ تیزی سے لبریز ہونے کی طرف بڑھ رہا ہے۔''

ان خیالات کا اظہار پنڈت نہرو نے وہ قرارداد پیش کرتے ہوئے کیا جس کا مقصد آئین ساز اسمبلی میں کانگریس کے نمایندوں کی رہنمائی کرنا تھا کہ وہ آئین ساز اسمبلی میں ''آزاد اور خود مختار جمہوریہ'' کا آئین تشکیل دیں۔ یہ ریزولیوشن متفقہ طور پر منظور ہوا۔ کانگریس نے ''جمہوریہ'' کی اصطلاح پہلی مرتبہ استعمال کی تھی۔ پنڈت نہرو نے کہا اس موقع پر ''جمہوریہ'' کا نظریہ پیش کرنے کا کانگریس کا مقصد ہندوستان کے رجعت پسندوں کی حالیہ چالوں کا جواب ہے۔

پنڈت نہرو نے مجلس مضامین کو بتایا کہ وایسرائے نے انھیں ضمانت دی تھی کہ مسلم لیگ کے ارکان کابینہ میں ایک ٹیم کے طور پر کام کریں گے اور مسلم لیگ طویل المیعاد منصوبہ منظور کر لے گی۔ لیکن دونوں بنیادی ضمانتوں کو ہوا میں پھینک دیا گیا ہے۔ جس روز لیگیوں

نے عہدے سنبھالے اسی دن لیگ کے ترجمان نے بیان دیا کہ یہ نہ تو کابینہ ہے اور نہ ہی مخلوط حکومت۔ مسٹر جناح نے ۱۷ر نومبر کے مراسلہ بہ نام وایسرائے میں واضح کر دیا ہے ''لیگ نے طویل المیعاد منصوبہ منظور نہیں کیا۔'' اس پر مسٹر نہرو نے استفسار کیا ''ان حالات میں مسلم لیگ عبوری حکومت میں کس طرح شامل رہ سکتی ہے؟''

پنڈت نہرو نے انکشاف کیا کہ وہ پچاس مرتبہ مستعفی ہونے کے بارے میں سوچ چکے ہیں اور دو مرتبہ وایسرائے سے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے۔ انھوں نے الزام لگایا کہ موجودہ مصیبت برطانوی افسروں کی پیدا کردہ ہے کیوں کہ وہ روایتی طور پر کانگریس کے خلاف ہیں، مسلم لیگ کو اپنا ساتھی سمجھتے ہیں کیوں کہ مسلم لیگ بھی کانگریس کے خلاف عمل پیرا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے عبوری حکومت کی تشکیل کے فیصلے کی توثیق کے لیے قرارداد پیش کی۔ چوں کہ یہ رسمی کارروائی تھی اس لیے مولانا نے اس موقع پر کوئی تقریر نہیں کی۔ پنڈت ولبھ بھائی پٹیل نے مختصراً تائیدی الفاظ کہے کہ عبوری حکومت پرانی ایگزیکیٹو کونسل نہیں ہے۔ اس پر دو گھنٹے تک بحث ہوتی رہی۔ مولانا آزاد نے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے یقین دلایا کہ ورکنگ کمیٹی پوری طرح چوکس ہے اور طیش میں آکر اعلان جنگ کرنا دانش مندی نہیں۔ مولانا کا جواب سن کر قرارداد متفقہ طور پر منظور کر لی گئی۔

یہ تو تھا منطقی استدلال اور حالات کا بیان، اس کے باوجود کانگریس لیگ سے مفاہمت کی خواہش مند تھی۔ پنڈت نہرو نے کہا:

> ''آئین ساز اسمبلی میں لیگ کی شمولیت کا خیر مقدم کیا جائے گا، لیکن میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں خواہ وہ شامل ہو یا باہر رہے، ہم آئین ساز اسمبلی میں ہندوستان کی جمہوریہ قایم کرنے کے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے پوری طرح تیار اور منظم ہو کر جائیں گے۔ ہم وہاں معمولی چیزوں پر جھگڑنے کے لیے نہیں جا رہے ہیں۔''

سردار پٹیل نے اپنی تقریر میں ایک جملہ ایسا ادا کر دیا جس کا مفہوم یہ بھی تھا ''تلوار کا جواب تلوار سے دیا جائے گا۔'' بعض کے نزدیک اس کا مطلب یہ تھا ''غنڈوں سے بچنے کے لیے تیار رہو۔ فسادیوں سے خود مقابلہ کرو اور اپنے جان و مال کی خود حفاظت کرو۔'' اس تقریر کا سخت نوٹس لیا گیا۔ حکیم عبدالجلیل (صوبہ سرحد) کے علاوہ سزاردنا آصف علی اور

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے بہت سخت جوابی تقاریر کیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

''اگر کانگریس نے ملک میں خونی سیلاب اور طوفان و بربادی کو نہ روکا تو پھر کانگریس کا وجود بھی باقی نہ رہ سکے گا۔ کانگریسیوں کو اپنے قلب پر ہاتھ رکھ کر سوچنا چاہیے کہ وہ خود تو وقت کے مجنونانہ جذبات کی رو میں نہیں بہے چلے جارہے ہیں؟ اگر کانگریس کے اراکین فی نفسہٖ ان خون انگیزیوں سے متاثر ہوچکے ہیں تو پھر خوف ہے کہ رشتۂ حیات کانگریس کے ایام بہت مختصر ہیں۔ اگر کانگریس نے اس نازک ترین دور میں اپنے فرائض کو نہ پہچانا تو وہ اپنے محضر قتل پر خود ہی دستخط کردے گی۔

ہر ایک کانگریس مین کا فرض ہے کہ وہ فرقہ وارانہ جھگڑے سے اپنا دامن پاک رکھے اور جارحانہ اقدام کرنے والوں کے مقابلے پر کچلے ہوئے مظلوموں کی اعانت کرے۔

عزیزانِ من! سچائی اور خلوص کے سوا کوئی بھی فولادی دیوار خونی طوفان کو روک نہیں سکتی۔ مسلمان کانگریس مینوں کو اپنی روایات کے پیشِ نظر ایمان داری، دیانت، خلوص اور سچائی کے ساتھ کام کرنا ہے۔ اگر سچائی کے ساتھ فرقہ وارانہ خون ریزی کو روکنا چاہیں گے تو کامیابی یقینی ہے۔ مایوسی کی ضرورت نہیں۔''

میرٹھ کانگریس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ چوں کہ مسلم لیگ نے ۱۶ رمئی کے اعلان قبول کرنے سے انکار کردیا ہے لہٰذا اسے عبوری مخلوط حکومت سے نکال دیا جائے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے مسلم لیگی رکن عبوری حکومت راجہ غضنفر علی نے کہا:

''.....اگر کانگریس برطانوی مشن کے اعلانات کے مطابق مرتب منصوبہ کا اعلانیہ انکار کرنے کے باوجود عبوری حکومت میں رہ سکتی ہے تو میں کوئی وجہ نہیں سمجھتا کہ مسلم لیگ کیوں نہیں رہ سکتی۔''

یہ استدلال بجائے خود بالکل غلط تھا۔ عبوری حکومت میں مسلم لیگ کی شمولیت مشروط تھی۔ جسے پورا کرنا مسلم لیگ کا فرض تھا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ کانگریس پر الزام جڑنے شروع کیے۔ (ابوالکلام آزاد اور قوم پرست مسلمانوں کی سیاست: ص ۴۵-۴۴۳)

حکومت میں مولانا آزاد کی شرکت کا فیصلہ:

۳۰/نومبر ۱۹۴۶ء: آخر مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق اعلان ہو ہی گیا کہ آپ مسٹر آصف علی کی جگہ عبوری حکومت میں وزیر بنا دیے گئے۔ ہمیں اس تقرر پر بے انتہا ملال ہے اس لیے نہیں کہ آپ وزارت کی کرسی پر کیوں بٹھا دیے گئے بلکہ اس لیے کہ وزارت کا منصب آپ کے فضل و کمال کے مقابلے میں فروتر اور ہیچ ہے۔ ایک لاکھ وزارتیں آزاد کے قدموں پر قربان، ایک ہزار شہنشاہیتیں آپ کی جوتیوں پر نثار، قوم کو قطعی ضرورت نہیں کہ آپ وزیر بنیں، قوم اور ملک کو ضرورت ہے کہ آپ کی تربیت گاہ سے سیاست و مذہب کی سوتیں اُبلیں اور ہندوستان کی سرزمین پر آپ کے علم و کمال کے دریا رواں ہوں۔ وزارت کے لیے وزرا کی کمی نہیں، جس کو چاہا ہاتھ پکڑ بٹھا دیا۔ لیکن ابوالکلام کہاں سے پیدا ہوں گے کہ ابوالکلام کی جگہ سنبھالیں اور ان کے قلم و زبان سے علم و معرفت کے فوارے چھوٹیں۔ وزارت کوئی ایسا منصب نہیں جس کے لیے خاص صلاحیتوں کی ضرورت ہو۔ ایک جاہل کو اقتصادیات کا وزیر بنایا جا سکتا ہے، لیکن ابوالکلام بننا آسان نہیں۔ صدیوں کی جانکاہیوں، انقلاب انگیزیوں اور تجدید اور اصلاح کی کارفرمائیوں کے بعد مشکل سے ایک ابوالکلام پیدا ہوتا ہے اور جب وہ پیدا ہوا تو ملک و ملت کی آرزوؤں کو پامال کر کے اس متاعِ گراں مایہ کو وزارت پر قربان کر دیا گیا، کیا لطف آئے گا آزاد کو اس وزارت میں جہاں ناتربیت یافتہ حق ناشناس جہلا پہلو بہ پہلو نور میں تاریکی کا پیوند لگاتے نظر آئیں گے۔ ایک طرف اسرارِ شریعت اور معرفت قرآنی کا یہ امام بیٹھا ہوگا اور دوسری طرف جاہ و ثروت کے بتوں کی اکڑی ہوئی گردنیں ہوں گی۔ آزاد باہر بھی اکیلے تھے، اندر بھی اکیلے ہی رہیں گے۔ کاش! وہ باہر کی تنہائی کو اندر کی تنہائی پر قربان نہ کرتے۔ (زمزم - لاہور: ۳۰/نومبر ۱۹۴۶ء)

ہندوستانی رہنماؤں کی لندن طلبی:

۳۰/نومبر ۱۹۴۶ء: ۲۷/نومبر کو کانگریس، مسلم لیگ اور سکھوں کے نمایندے کو برطانوی پارلیمنٹ کی طرف سے لندن طلب کر لیا گیا۔

اس دعوت کو کانگریس نے بے معنی قرار دے کر اپنے نمایندوں کو لندن بھیجنے سے انکار کر دیا۔

اس پر اعلان ہوا کہ وائسرائے ہند کے ہم راہ مسٹر جناح اور نواب زادہ لیاقت علی خاں ۳۰ر نومبر کو لندن روانہ ہوں گے۔ مگر برطانوی پارلیمنٹ اس سے مطمئن نہیں تھی۔ چناں چہ ۲۹ر نومبر کو برطانوی وزیر اعظم مسٹر اٹیلی اور پنڈت جواہر لال نہرو کے درمیان پیغامات کا تبادلہ ہوا، جس میں مسٹر اٹیلی نے پنڈت نہرو کو یقین دلایا کہ "برطانوی حکومت وزارتی مشن کی تجویز میں تبدیلی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔"

اس پر جواہر لال نہرو نے اٹیلی سے یہ وعدہ بھی لے لیا کہ میں ۹ر دسمبر سے پہلے ہندوستان پہنچ جاؤں گا۔ اس یقین دہانی پر پنڈت جواہر لال، سردار بلدیو سنگھ، قاید اعظم محمد علی جناح، خاں لیاقت علی خاں ۳۰ر نومبر ۱۹۴۶ء کو لندن روانہ ہو گئے۔

کپتان عبدالرشید کی پیروی — مسلم لیگ کی سیاست:

نومبر ۱۹۴۶ء: مسلم لیگ نے آزاد ہند فوج کے مقدمہ کو بھی کانگریس اور مسلم لیگ کے سیاسی اختلافات کی نذر کر دیا۔ چناں چہ عبدالرشید نامی فوج کے ایک کپتان سے مسلم لیگ نے درخواست دلوادی تھی کہ وہ اپنے مقدمہ کی پیروی مسلم لیگ سے کروانا چاہتے ہیں، جو منظور ہو گئی۔ اب کپتان نے اپنے بیان میں اعتراف کیا کہ ہم نے اپنے محبوب وطن کی آزادی کی خاطر جنگ کی تھی۔ جس میں تاج برطانیہ کی وفاداری کا مصنوعی معاہدہ بھی پیش نظر تھا۔ اس طرح ان کے وکیل نے جو معصومانہ بیان دلوایا اس کا منشا یہ تھا کہ اگر آزاد ہند فوج ہندوستان پر قابض ہو گئی تو مسلمانانِ ہند ظلم و ستم کا نشانہ بنیں گے۔ میجر جنرل کا بیان ان کے خیال میں حقیقت تھا، لیکن نتیجہ الٹا نکلا اور میجر کو سات سال کی سزا ہو گئی، جس سے مسلم لیگ برافروختہ ہو گئی، حکومت پر قومیت کا الزام عاید کر گئی۔ اس میں شک نہیں کہ میجر نے اگر کانگریس کا تعاون لیا ہوتا تو شاید بری ہو جاتا۔

ہندوستانی رہنماؤں کی لندن طلبی:

نومبر ۱۹۴۶ء: ۱۶ر اگست کو مسلم لیگ کے ڈایریکٹ ایکشن کے پروگرام سے جو خطرناک صورت حال ہندوستان میں پیدا ہو گئی تھی اور عمل اور ردِ عمل کے نتیجے میں کلکتہ، الہ آباد، ناسک، ڈھاکا، بمبئی، سلہٹ، گڑھ مکٹیسر، نواکھالی، بہار وغیرہ میں فسادات پھوٹ

پڑے تھے اور کانگریس، مسلم لیگ، ہندو، مسلمانوں میں سے کوئی اپنی ذمہ داری محسوس کرنے اور قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس نے برطانوی حکومت کو بڑی تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ ان حالات کے پیش نظر مسٹر ایٹلی وزیر اعظم انگلستان نے مسٹر محمد علی جناح، پنڈت جواہر لال نہرو اور سردار بلدیو سنگھ کو مذاکرات کے لیے ۶؍دسمبر کو دعوت نامہ بھیجا ہے۔

لارڈ ویول اور ہندوستانی رہنما لندن پہنچ گئے:

۲؍دسمبر ۱۹۴۶ء: ۲؍دسمبر ۱۹۴۶ء کو بعد دوپہر دو بج کر دس منٹ پر ہندوستانی رہنما بہ معہ لارڈ ویول لندن کے ہوائی اڈے پر اترے، جہاں ان کا شاندار خیر مقدم کیا گیا۔ برطانیہ کی طرف سے وزیر ہند لارڈ پیتھک لارنس اور مسٹر آرتھر نے وائسرائے اور ہندوستانی رہنماؤں کا استقبال کیا۔ (کاروانِ احرار: جلد ۸)

ہندوستانی اور برطانوی لیڈروں کی کانفرنس اور ناکامی:

۴؍دسمبر ۱۹۴۶ء: ہندوستانی رہنماؤں اور برطانوی حکمرانوں کے درمیان کانفرنس شروع ہوئی۔ وزیر اعظم برطانیہ لارڈ ایٹلی، وزیر ہند لارڈ پیتھک لارنس، مسٹر محمد علی جناح، پنڈت جواہر لال نہرو، لیاقت علی خاں اور سردار بلدیو سنگھ شریک ہوئے۔ چوں کہ اجلاس انتہائی خفیہ تھا اس لیے کوئی کارروائی منظرِ عام پر نہ آسکی۔

۶؍دسمبر ۱۹۴۶ء: وزیر اعظم لارڈ ایٹلی نے کانفرنس کی ناکامی کا اعلان کر دیا۔

دستور ساز اسمبلی کا افتتاح:

۹؍دسمبر ۱۹۴۶ء: ۹؍دسمبر کو حسبِ اعلان مجلس قانون (آئین) ساز کا اجلاس شروع ہوا۔ سوال یہ ہوا کہ جب تک مستقل صدر کا انتخاب نہ ہو جائے کام کیسے چلایا جائے؟ چناں چہ سب سے سن رسیدہ ڈاکٹر سچدانند کو عارضی طور پر صدر منتخب کر کے اجلاس کا کام شروع ہوا، پھر اجلاس نے مستقل صدر کے لیے بابو راجندر پرشاد کا انتخاب کیا۔

(حسرت موہانی - ایک سیاسی ڈائری: ص ۲۵۹)

۱۰؍دسمبر ۱۹۴۶ء: مسٹر ایٹلی نے ۱۰؍دسمبر ۱۹۴۶ء کو اپنی کابینہ کے ارکان کے ساتھ گفتگو میں کہا:

''شاید صورت حال اس طرح کا رخ اختیار کر جائے جس کا نتیجہ ہندوستان میں خانہ جنگی اور خون کی ندیاں بہہ نکلیں۔ ہندوستان کے رہنماؤں کو احساس ہی نہیں کہ امنِ عامہ اور حکومت کے خاتمے کا خطرہ موجود ہے۔''

(تقسیم ہند افسانہ اور حقیقت، از ایچ ایم سیروائی: ص ۹۲)

۱۱؍دسمبر ۱۹۴۶ء: وزیر اعظم بہار اور ڈاکٹر سید محمود کے نام مولانا سید حسین احمد مدنی کا برقیہ۔ (زمزم-لاہور: ۱۱؍دسمبر ۱۹۴۶ء)

ہندوستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کا افتتاح:

۱۱؍دسمبر ۱۹۴۶ء: وائسرائے ہند لارڈ ویول کے اعلان کے مطابق جدید ہندوستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کا افتتاحی اجلاس ۹؍دسمبر کی بجائے ۱۱؍دسمبر ۱۹۴۶ء کی صبح دس بجے شروع ہوا۔ اجلاس میں قریباً دوسو پانچ منتخب نمائندے جن میں نو عورتیں بھی شامل تھیں، شریک ہوئے۔

کونسل آف چیمبر کو اس موقع پر خوب صورت انداز میں روشن کیا گیا تھا۔ ممبران صدارتی کرسی کی طرف رخ کیے قطار در قطار نصف دائرے میں بیٹھے تھے۔ پہلی صف میں مولانا ابوالکلام آزاد، مسٹر آصف علی، خان عبدالغفار خاں، رفیع احمد قدوائی (وزیر داخلہ یوپی) ان کے بعد مختلف صوبوں کے ممبران اپنے اپنے ضلع کے لباسوں میں ملبوس بیٹھے تھے۔

اجلاس کے شروع میں صدر کانگریس اچاریہ کرپلانی نے صدارت کی تحریک پیش کرتے ہوئے اردو زبان میں کہا:

''اس تاریخی اور مبارک موقعہ پر اس اعزاز کے مستحق ڈاکٹر سچدانند سنہا سے زیادہ کوئی نہیں ہوسکتا، جو نہ صرف معمر ہیں بلکہ ملک کی سیاسی زندگی میں بھی واجب الاحترام ہیں۔

اس تجویز کے بعد ڈاکٹر سچدانند سنہا نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا:

''ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی کو امریکا کے دستور کا بہ غور مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس لیے نہیں کہ ہم اس کو اپنالیں، بلکہ اس لیے کہ ہندوستان کی ضرورتوں کے مطابق اس کو سمجھ کر اپنے سانچے میں ڈھال لیں۔ امریکا کا

دستور مقتدر راضی ناموں اور مقتدر مفاہمتوں پر مبنی ہے اور مجھے قومی کاموں کا
پچاس سالہ جو تجربہ ہے اس کی بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان جیسے ملک کا
دستور مرتب کرنے میں معقولیت پسند راضی ناموں اور مدبرانہ مفاہمتوں کی
جتنی ضرورت ہے اتنی کسی اور ملک کو نہیں۔

مجھے برطانوی بلوچستان کے خان عبدالحمید خان کی انتخابی عذر داری
وصول ہوئی ہے، جس میں دستور ساز اسمبلی کے لیے برطانوی بلوچستان کے
نمایندے کی حیثیت سے نواب محمد خان جوگیزئی کے انتخاب کے جواز کو چیلنج کیا
گیا ہے۔ میرا فیصلہ یہ ہے کہ مستقل صدر کے انتخاب کے بعد جب تک اس کا
فیصلہ نہ ہو جائے۔ نواب محمد خان جوگیزئی باقاعدہ منتخب کیے ہوئے رکن تصور
کیے جائیں۔'' (اخبار ''قومی آواز'' لکھنؤ: ۱۲ر دسمبر ۱۹۴۶ء)

اس عارضی کارروائی کے بعد دستور ساز اسمبلی کے مستقل صدر کے لیے ڈاکٹر راجندر پرشاد (بہار) کا نام کانگریس پارٹی کی طرف سے پیش کیا گیا۔ چوں کہ دوسرا کوئی نام مقابلے میں نہیں تھا، لہٰذا ڈاکٹر راجندر پرشاد کو دستور ساز اسمبلی کا مستقل صدر قرار دیا گیا۔

پہلی قرارداد:

۱۳ر دسمبر کو عارضی حکومت کے نائب صدر پنڈت جواہر لال نہرو نے جدید ہندوستان دستور ساز اسمبلی میں حسب ذیل قرارداد پیش کی:

''یہ کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی اپنے اس پکے اور سنجیدہ جیسے کا اظہار کرتی ہے کہ
ہندوستان کے آزاد بالادست ری پبلک ہونے کا اعلان کیا جائے اور یہ اپنی
آیندہ حکومت کے لیے ایک آئین مرتب کرے جس میں وہ علاقے جن پر
اب برطانوی ہندوستان مشتمل ہے اور وہ علاقے جو ہندوستانی ریاستوں کے
باہر ہیں اور ایسے دوسرے علاقے جو آزاد بالادست ہندوستان میں شامل
ہونے پر رضامند ہیں، ایک یونین میں ہوں اور جس میں یہ علاقے اپنی
موجودہ حدود کے ساتھ یا ان حدود کے ساتھ جنھیں کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی طے
کرے آئین کے قانون کی رو سے خود مختار وحدتوں کی حیثیت حاصل کریں

گے اور قایم رکھیں گے اور انھیں اختیارات ماتحتی بھی حاصل ہوں گے اور حکومت اور انتظام کے تمام اقتدار اور اختیار کو بروے کار لائیں گے۔ ایسے اقتدار اور اختیار کو محفوظ اور مستثنیٰ رکھتے ہوئے جو یونین کو حاصل ہیں اور ودیعت کیے گئے ہیں یا جو داخلی اور معنوی طور پر یونین کا حق ہیں یا اس کا نتیجہ ہیں اور جس میں بالادست آزاد ہندوستان کے اور اس کی تشکیلی اجزا کے تمام اقتدار اور اختیار حکومت کے ترجمان عوام سے حاصل شدہ ہوں اور جس میں ہندوستان کے تمام باشندوں کے لیے سماجی، اقتصادی اور سیاسی انصاف حیثیت اور موقعوں کی برابری اور قانون کی نظر میں خیال، اظہار، عقیدہ، دین، عبادت، پیشہ، جماعت بندی اور عمل کی آزادی، قانون اور اخلاقِ عامہ کے ماتحت حاصل ہو اور جس میں اقلیتوں، پس ماندہ اور قبایلی علاقوں اور دوسرے پس ماندہ طبقوں کے لیے کافی تحفظات رکھے گئے ہوں اور جس میں پبلک کے علاقوں کا استحکام اور خشکی، تری اور فضائی بالادست حقوق مہذب قوموں کے انصاف اور قانون کی رو سے حاصل رہیں اور دنیا میں اپنی مستحق اور باعزت جگہ حاصل ہو اور دنیا میں امن اور بنی نوع انسان کی بہبودی کے لیے اپنا پورا اور رضا کارانہ حصہ ادا کر سکے۔" (روزنامہ "تیج" دہلی۔ ۱۵ر دسمبر ۱۹۴۶ء)

اس قرارداد پر بحث ہنوز شروع ہوئی ہی تھی کہ ڈاکٹر جے کار نے تجویز پیش کی کہ

"اس قرارداد پر مزید بحث ملتوی کردی جائے اور اسمبلی کا اجلاس بھی فی الحال ملتوی کردیا جائے تاکہ حکومتِ برطانیہ کے تازہ اعلان (۶ر دسمبر ۱۹۴۶ء) کی روشنی میں مختلف پارٹیاں اپنا اپنا رویہ متعین کرسکیں۔ ممکن ہے آیندہ اجلاس میں مسلم لیگ بھی شریک ہوجائے۔"

چناں چہ اس پر اسمبلی کا اجلاس ۲۰ر جنوری ۱۹۴۷ء تک کے لیے ملتوی کردیا گیا۔ (مدینہ۔ بجنور: ۲۸ر جنوری ۱۹۴۷ء، بہ حوالہ علماے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے (حصۂ دوم): ص ۵۱-۵۴۷)

۱۱ر دسمبر ۱۹۴۶ء: ۱۱ر دسمبر ۱۹۴۶ء کو مجلس دستور ساز کی پہلی نشست ہوئی۔ سوال اُٹھا کہ مجلس کا صدر کون ہو؟ جواہر لال اور پٹیل چاہتے تھے کہ کسی ایسے آدمی کو صدر بنایا جو

وزارت میں نہ ہو۔ ان دونوں نے مجھ پر زور دیا کہ میں اس عہدے کو قبول کرلوں، لیکن میں اس پر راضی نہیں تھا اور کئی نام تجویز ہوئے لیکن کسی پر اتفاق رائے نہ ہوسکا۔ آخر کار ڈاکٹر راجندر پرشاد کو منتخب کیا گیا۔ اگر چہ یہ حکومت کے رکن تھے، لیکن ان کا انتخاب بہت مناسب ثابت ہوا، کیوں کہ انھوں نے بہت امتیاز کے ساتھ اپنے فرایض انجام دیے اور کئی نازک معاملوں میں بہت قیمتی مشورے دیے۔ (انڈیا ونس فریڈم: ص ۶۱-۰۶۲)

۱۲؍دسمبر ۱۹۴۶ء: خان عبدالغفار خان نے نئی دہلی میں ایک اخباری ملاقات کے سلسلے میں بیان کیا تھا کہ

"سرحد میں سرکاری افسران خانہ جنگی کے لیے فضا تیار کررہے ہیں۔ قبایلی علاقے کے لوگ اپنے بھائی ہیں، ہماری اور ان کی رگوں میں ایک ہی خون دوڑ رہا ہے وہ کوئی غیر نہیں ہیں۔ اس سے قبل جب ہم نے جنگ آزادی کی تیاری کی انھوں نے ہمارا پورا ساتھ دیا اور وہ ہمیشہ قوم پرور عناصر کے ساتھ رہے ہیں۔ ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ وہ ہندوستان کو خوش حال اور اعلا مرتبہ پر دیکھیں۔ لیکن ادھر ایک سال سے انھیں بہکانے کی برابر کوشش کی جارہی ہے اور ان کے دل میں خوف اور شبہات پیدا کیے جارہے ہیں اور بے چینی کے لیے فضا تیار کی جارہی ہے۔

قبایلی علاقے کے سیاسی محکمے کے بہت سے افسران کی مسلسل کوشش ہے کہ جس طرح ممکن ہو کانگریس اور عارضی حکومت کو بدنام کیا جائے اور بھائیوں میں یعنی قبایلی علاقے کے لوگوں اور پٹھانوں میں کشیدگی پیدا کرکے پورے ملک میں ایک فساد برپا کردیا جائے اور اس طرح حصول آزادی میں روڑا اٹکایا جائے۔

قبایلی علاقے کے افسران کے پاس صرف کرنے کے لیے کافی رقم ہوتی ہے اور ان کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہوتی ہے۔ کابینی وفد کے آنے اور عارضی حکومت قایم ہونے کے بعد سے وہاں کے فرقہ وارانہ پروپیگنڈا کرنے والی جماعتوں کے داخلے کی یا تو ہمت افزائی کرتے رہے یا کم از کم اس سے چشم پوشی کرتے رہے۔ بہت سے ایسے لوگوں کو قبایلی علاقوں میں تقریروں کے لیے

بلایا گیا جن کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ مسلم لیگ سے تعلق رکھتے ہیں۔
لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ برطانوی افسران کے ایجنٹ ہیں اور ان سے بڑے
بڑے وظیفے پاتے ہیں۔ میں ان واقعات کو اچھی طرح جانتا ہوں اور اُن
لوگوں کو بھی جانتا ہوں جنھیں اس غرض کے لیے مدعو کیا گیا۔ اس قسم کی
کارروائیوں کا مقصد سرحد میں خانہ جنگی پیدا کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں یعنی
نہ صرف ہندو مسلمانوں میں جنگ بلکہ مسلمان مسلمانوں کے درمیان بھی قتل و
غارت گری کرانا اُن کا اصل منشا ہے۔

میں نے قبایلی علاقے میں خدائی خدمت گاروں کو محبت و عدم تشدد کا
پیغام دے کر روانہ کیا، لیکن یہ بات وہاں کے افسران کو پسند نہ آئی اور انھوں
نے خدائی خدمت گاروں کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا۔ مجھے اس حرکت پر ذرا
بھی تعجب نہیں ہوا بلکہ اس سے میرے خیال کی اور تائید ہوگی۔"

(قومی آواز: ۱۶ر دسمبر ۱۹۴۶ء، جلد ا، ص ۳۲۸)

جمعیت علماے ہند کی قرارداد:

۱۴ر دسمبر ۱۹۴۶ء: ۱۴ سے ۱۶ر دسمبر ۱۹۴۶ء تک جمعیت علماے ہند کی مجلسِ عاملہ
نے دہلی میں بحث کے بعد حسب ذیل قرارداد منظور کی۔

"گروپنگ سسٹم کو مسلمانوں کے لیے جمعیت علما کے خیال میں کچھ مفید
نہیں ہے۔ تاہم چوں کہ ہندوستان کے لیے دستور اساسی کی مجلس میں مسلم
لیگ کی شرکت اسی مسئلے پر مرکوز ہو رہی ہے۔ اس لیے جمعیت علماے ہند کی
راے ہے کہ کانگریس کو یہ موقع ہاتھ سے نہ دینا چاہیے اور گروپنگ سسٹم کی جو
تشریح کیبنٹ مشن کی ہے اس کو تسلیم کر لینا چاہیے تاکہ ہندوستان کی آزادی
میں تمام ہندوستانی متفقہ طور پر شریک ہو کر اصل مقصد حاصل کر سکیں۔"

(علماے حق: ص ۳۹-۵۳۸)

سرخ پوش، احرار اور جمعیت کے امدادی وفود کی بہار میں آمد:

۱۹ر دسمبر ۱۹۴۶ء: سرحد سرخ پوشوں کے رہنما خان عبدالغفار خان خدائی خدمت

گاروں کی جماعت کے ساتھ بہار پہنچے۔ جمعیت علماے ہند کا وفد مولانا سید محمد میاں کی معیت میں بہار گیا، خاک سار (جماعت) بھی پہنچے۔

مجلسِ احرار ہند نے ۱۹رنومبر کو سارے ہندوستان میں یوم بہار منانے کا اعلان کرتے ہوئے مسلمانانِ ہند سے اپیل کی کہ بہار کے مصیبت زدگان کے لیے گرم کپڑے، اناج اور مالی امداد کی سخت ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ ہی احرار رہنماؤں کا ایک وفد جس میں شیخ حسام الدین، ماسٹر تاج الدین انصاری، آغا شورش کاشمیری، اور جیوش احرار کے سالار چودھری معراج دین شامل تھے، بہار پہنچا۔

مجلسِ احرارِ اسلام کی قرارداد:

۲۰ردسمبر ۱۹۴۶ء: جمعیت علماے ہند کے بعد مجلسِ احرار ہند کی ورکنگ کمیٹی نے اپنے اجلاس لاہور منعقدہ ۲۰ تا ۲۲ردسمبر کی مسلسل بیٹھک میں ملکی حالات، مسلم لیگ اور کانگریس کے قضیے پر جو ۶ردسمبر کے برطانوی اعلان نے پیدا کردیا تھا، بحث کی۔ اس اجلاس میں احرار رہنماؤں کے علاوہ جمعیت علماے ہند کے ناظم اعلا مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور مومن کانفرنس کے صدر شیخ ظہیرالدین ایڈوکیٹ نے بھی شمولیت کی۔ سہ روزہ گفتگو کے بعد مجلسِ احرار کی ورکنگ کمیٹی نے حسبِ ذیل دو قراردادیں منظور کیں۔

قرارداد نمبرا: مجلسِ عاملہ احرار ہند کا یہ اجلاس مجلس دستور ساز کے انعقاد، مسلم لیگ کے ارکان کی عدم شمولیت اور قوم پرور مسلمان جماعتوں کے مستقبل کے متعلق نظریات پر کامل غور کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ ملک وملت کے مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل تجاویز غیر مبہم طور پر ملک کی مختلف سیاسی جماعتوں اور شرکاے مجلس دستور ساز کے سامنے رکھی جائیں۔

یہ اجلاس ان تجاویز کو اسلامیانِ ہند کے کم از کم مطالبات تصور کرتا ہے اور جو آئین ان بنیادوں پر استوار نہ کیا گیا وہ مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہ ہوگا۔

(الف) ہندوستان کی مکمل آزادی کو قریب تر لانے کے لیے برطانوی افواج کا اس ملک سے اخراج لازمی ہے۔ مجلسِ دستور ساز غیر ملکی افواج کا وجود ہندوستان میں قطعی طور پر ممنوع قرار دے۔ ہندوستانی افواج دیگر اسلامی ممالک سے واپس بلائی جائیں۔ ملکی فوج

میں مسلمانوں کی نیابت ان کی سابقہ فوجی روایات کی بنا پر مؤثر ہونی چاہیے۔

(ب) صوبوں کی کامل خود اختیاری کے ساتھ مرکز کا قیام بھی ضروری ہے، مرکز کے پاس دفاع، امورِ خارجہ اور مواصلات کے مضامین ہوں۔ مرکز میں ہندو مسلم مساوی نیابت کے فارمولے پر عمل کیا جائے، تاکہ ہندوستان کی دو بڑی قوموں میں سے کسی کو دوسری قوم کے سیاسی غلبے اور اقتدار کا خطرہ باقی نہ رہے۔

(ج) اگر کسی قوم کی اکثریت کسی معاملے کو فرقہ وارانہ نوعیت کا قرار دے دے تو وہ مسئلہ اسی قوم کے ووٹوں سے طے ہوگا۔ کسی دوسری قوم کو اس میں مداخلت کا اختیار نہ ہوگا۔ فیڈرل کورٹ کسی قوم کی درخواست پر یہ فیصلہ کرے گا کہ مسئلہ فرقہ وارانہ ہے یا نہیں۔

(د) مرکزی محکمہ قضا کا قیام عمل میں لایا جائے، تاکہ مسلمانوں کا پرسنل لا محفوظ رہے اور ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کی زندگی کو شرعی قانون کے تابع بنایا جا سکے۔

(ہ) بیرونی ممالک اوز بالخصوص اہم اور بڑے ملکوں سے سفارتی تعلقات قایم کرتے ہوئے مسلمانوں کو مؤثر نیابت دینے کے اصول کو مدنظر رکھا جائے۔ دوسرے ممالک سے سیاسی اور تجارتی تعلقات کسی بیرونی طاقت کے اثر سے بے نیاز ہو کر قایم کیے جائیں۔

(و) پس ماندہ صوبوں کو ترقی یافتہ صوبوں کے معیار پر لانے کے لیے مرکز انھیں مستقل امداد دے۔ تاکہ تعلیم، صنعت، تجارت اور زندگی کے دوسرے اہم شعبوں میں وہ ہندوستان کے باقی حصوں سے پیچھے نہ رہیں۔

(ز) ریاستوں سے برطانوی اقتدار کا فوراً خاتمہ ہونا چاہیے اور مجلسِ دستور ساز میں مہاراجوں اور نوابوں کے نام زد ارکان کی بجائے ریاست کے باشندوں کے منتخب افراد کو نشستیں دی جائیں۔

(ح) ہندوستان میں غیر ملکی سرمایے سے قایم شدہ بڑی صنعتیں یا تجارتی ادارے مناسب معاوضہ دے کر ہندوستانی بنا لیے جائیں۔

(ط) مجلسِ دستور ساز سرمایہ داری اور جاگیرداری کے متعلق واضح فیصلہ کرے کہ بڑی صنعتیں اور جاگیریں بہر صورت قومی ملکیت قرار دی جائیں گی اور مزدور اور کاشت کار کی اقتصادی حالت کو بہتر بنایا جائے گا۔

نوٹ: اس حقیقت کی روشنی میں کہ وزارتی مشن کی تجاویز دس سال کے بعد آئین پر نظر ثانی کا موقع دیتی ہے۔ مجلسِ عاملہ احرار ہند پر زور الفاظ میں اعلان کرنا چاہتی ہے کہ صوبہ جات حقِ خود اختیاری سے کاملاً مستفیض ہونے کی بنا پر حسب خواہش مرکز سے علاحدگی اختیار کریں گے۔ (روزنامہ "آزاد" لاہور: ۲۶ر دسمبر ۱۹۴۶ء)

قرارداد نمبر ۲: مجلسِ عاملہ احرارِ ہند کا یہ اجلاس بہار اور گڑھ مکتیسر کے دل گداز اور جگر خراش واقعات پر انتہائی غم و غصے کا اظہار کرتا ہے، سفاکی اور بربریت کے ان ہنگاموں کی مثال زمانہ امن کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔

یہ اجلاس انتقام کے پردے میں مجنونانہ حرکات کی انتہائی مذمت کرتا ہے اور جن ذمہ دار کانگریسی اور دوسرے سیاسی کارکنوں نے قتل و غارت گری کے ان اقدامات میں حصہ لیا ہے انھیں بھی حد درجہ نفرین اور ملامت کا مستحق سمجھتا ہے۔

مجلسِ احرار کے وفد کی رپورٹ سننے کے بعد اس میں بھی کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ اسلامیانِ بہار کی ہلاکت و بربادی ایک منظم سازش کا نتیجہ تھی۔ اس سلسلے میں حکومتِ بہار اور یو پی کے تساہل کا ہر عنوان مذموم اور معیوب ہے، لیکن مفسدہ پردازوں کی تباہ کاریوں کے انسداد کی جو کوشش پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد نے کی، مجلسِ عاملہ کا یہ اجلاس انھیں قدر و احترام سے دیکھتا ہے اور ان نیک خیال ہندوؤں کو بھی مستحقِ تحسین سمجھتا ہے جنھوں نے مسلمانوں کو قتل و غارت گری سے بچانے کی کوشش کی۔

مجلسِ عاملہ کا یہ اجلاس حکومت بہار اور یو پی سے مندرجہ ذیل مطالبات کرتا ہے۔

(الف) آزاد تحقیقاتی کمیشن کی تشکیل فی الفور ہونی چاہیے۔

(ب) مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا کرنے کے لیے انھیں اسلحہ کے لائسنس دے جائیں۔

(ج) سربر آوردہ مجرموں کو قرار واقعی سزا دی جائے۔ اس کام کے لیے اسپیشل ٹربیونل ہو، جس میں ہائی کورٹ کے جج نامزد کیے جائیں۔

(د) خانماں برباد مسلمانوں کے مکانات کی تعمیر حکومت کے ذمے ہونی چاہیے، احرار اتلافِ مال کا بھی اندازہ مرتب کرنے کے لیے حکومت سے مطالبہ کرتی ہے کہ نقصان زدہ لوگوں کو معاوضہ دیا جائے۔

(ہ) جن سرکاری افسروں نے فسادات میں حصہ لیا ہے انھیں معطل کر کے ان پر مقدمات چلائے جائیں۔(روزنامہ ''آزاد'' لاہور: ۲۵؍دسمبر ۱۹۴۶ء)

مجلسِ احرار کے دوسری امدادی وفد کی بہار روانگی:

۲۹؍دسمبر ۱۹۴۶ء: صوبہ بہار میں مسلمانوں پر جو تباہی نازل ہوئی اس کو بھی مسلمان سیاسی جماعتوں نے مشترک طور پر محسوس کیا۔ چناں چہ پیشتر مجلسِ احرار نے اپنا ایک وفد ماسٹر تاج الدین انصاری کی معیت میں روانہ کیا تھا۔ جس کی رپورٹ ۲۲؍دسمبر کی مجلسِ عاملہ کے اجلاس میں پیش کر دی گئی۔ اس رپورٹ کی بنا پر ۲۹؍دسمبر ۱۹۴۶ء کو آغا شورش کاشمیری ممبر آل انڈیا احرار ورکنگ کمیٹی کی معیت میں پنجاب جیوش کے ۱۳ سالاروں کا ایک وفد مصیبت زدہ بہاریوں کے لیے اپنے ساتھ پانچ سو سے زاید کمبل، خوراک کا کثیر انتظام لے کر روانہ ہوا۔

جمعیت علما کے مقاصد اور مولانا خدا بخش کا اعلان:

دسمبر ۱۹۴۶ء: سرحد جمعیت علماے ہند کی اہمیت اور اس کے پروگرام کی اشاعت میں مسلمانوں سے تعاون کی اپیل کے سلسلے میں مولانا ابوسعید خدا بخش ملتان کو یہ تحریر بہ طور اعلان اشاعت کے لیے روانہ فرمائی:

حامداً ومصلیاً!

موجودہ زمانے اور احوال میں مسلمانانِ ہندوستان کے لیے صرف جمعیت علماے ہند کا دستور اساسی اور نصب العین اور اس کا عملی راستہ تمام مشکلات اور مصایب کا حل ہے۔ جس کا منبع قرآن وحدیث اور اسلافِ کرام اہل سنت والجماعت کا اتباع ہے۔ بنا بریں مسلمانانِ پنجاب سے پر زور درخواست ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ جمعیت کے ممبر بنیں اور اس کے نظام کو جہاں تک ممکن ہو عملی جامہ پہنائیں۔ حضرت مولانا خدا بخش صاحب حلقۂ جنوبیہ کے ناظم اعلا ہیں۔ میں امیدوار ہوں کہ ناظرین ان کی امداد واعانت اور ان کے پیش کردہ پروگرام پر عامل بننے میں کسی ممکن سعی سے گریز نہ فرمائیں

گے۔ اشد ضرورت ہے کہ مسلمان بے دار اور منظم ہو کر جادۂ شریعت غرّا پر عمل پیرا ہوں اور انتہائی صبر و استقامت اور امن و امان کے سائے میں اسلام اور مسلمانوں کو روز افزوں ترقی کے بام پر پہنچائیں۔ تقویٰ اور عبادت کے دامن کو کسی جگہ اور وقت میں ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔

(دستخط مبارک حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ)"

(الجمعیۃ۔ دہلی۔ شیخ الاسلام نمبر ۱۹۵۸ء: ص ۱٦۸)

آصف علی — امریکا میں ہندوستانی سفیر:

دسمبر ۱۹۴٦ء: نیو دہلی۔ ۲۷ر دسمبر۔ آج قصرِ وائسرائے سے ایک اعلان جاری ہوا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ مسٹر آصف علی کے ولایات متحدہ امریکا میں سفیر مقرر کیے جانے سے عارضی عبوری حکومت میں جو جگہ خالی ہوئی تھی ملک معظم جارج ششم نے اس پر مولانا ابوالکلام آزاد کا تعین کیا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ مولانا آزاد محکمۂ تعلیم کے انچارج ہوں گے اور مسٹر گوپال اچاریہ کو مسٹر آصف علی کا محکمہ دیا جائے گا۔ محکموں میں جو اہم تغیرات رونما ہونے والے ہیں ان کے متعلق جلد تر سرکاری اعلان جاری ہوگا۔ (مدینہ۔ بجنور: دسمبر ۱۹۴٦ء)

۴٦-۱۹۴۵ء کے مرکزی اور صوبائی انتخابات کو مسلم لیگ نے سیاسی انتخابات کے بجائے کفر و اسلام کا معرکہ بنا دیا تھا اور حالات ایسے پیدا کر دیے تھے کہ باشعور اور سنجیدہ ووٹرز کا گھر سے نکلنا اور اپنے ووٹ کا آزادانہ استعمال ناممکن ہو گیا تھا۔ جمعیت علمائے ہند سے متاثر اور نیشنلسٹ خیال کے امیدواروں کی جانیں خطرات میں گھری ہوئی تھیں۔ ہر وقت خطرہ تھا کہ کسی جگہ کوئی حادثہ پیش آ جائے۔ ان خطرات کے باوجود نیشنلسٹ خیال کے امیدواروں کو جتنی تعداد میں ووٹ ملے وہ موجب حیرت تھا۔ اگرچہ انتخاب کا نتیجہ وہی نکلا جو متوقع تھا اور ہر اس موقع پر ایسے حالات میں نکلنا چاہیے، جہاں آرا کی فکری اور سیاسی اہمیت کو محسوس کرنے کے بجائے ووٹوں کو گن کر فیصلہ کیا جاتا ہو۔ مولانا سید محمد میاں نے اپنی تالیف لطیف "حیات شیخ الاسلام" میں مسلم لیگ کی غنڈہ گردی پر روشنی ڈالنے کے ساتھ الیکشن کے نتیجے پر بھی فکر انگیز بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

اس قسم کی غنڈہ گردی اور منظم سازشوں نے الیکشن کی کامیابی کو قطعاً ناممکن بنا دیا تھا۔

مگر تاہم
(الف) صوبائی اسمبلیوں میں مجموعی حیثیت سے ۱۶ فیصدی نشستیں قوم پروروں نے حاصل کرلیں۔
(ب) ووٹوں کے اعداد و شمار نے ظاہر کیا کہ تقریباً چالیس فیصدی ووٹ جمعیت علما کے حق میں پڑے۔
(ج) ہندوستان کی سیاست میں جمعیت علماے ہند نے ایک آئینی حیثیت حاصل کرلی۔
(د) دہریت اور لادینی کے اس طوفانی دور میں مذہبی طبقہ بھی ہندوستانی سیاست کا ایسا اہم عنصر بن گیا جس کو کسی وقت نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔
(ہ) وہ علما جن کے اقتدار کو ختم کرنے کا اعلان کردیا گیا تھا خود اعلان کرنے والوں کو ان کے دامن میں پناہ لینی پڑی اور لیگ کے جن زعما نے ۱۹۳۷ء کے الیکشن کی کامیابی کو اپنے مینوفسٹو کا کمال گردانا تھا ان کو اس مرتبہ کامیابی کے بعد علماے کرام کا شکریہ ادا کرنا پڑا۔ بے شک یہ شکریہ جمعیت علماے اسلام کے اراکین کا ادا کیا گیا مگر دنیا جانتی ہے اور ہر ذی فہم سمجھ سکتا ہے کہ اگر جمعیت علماے ہند میدان میں نہ ہوتی تو جمعیت علماے اسلام کے قیام کی ضرورت ہی پیش نہ آتی اور مولوی کی حیثیت مسجد کے حجرے تک محدود ہو کر رہ جاتی۔

ہم آخر میں حضرت مولانا ابوالکلام کا ایک بیان نقل کرتے ہیں جو انھوں نے اپنی پوری ذمے داری کے ساتھ شائع کرایا۔ اس بیان سے ان مشکلات کا اندازہ ہو جاتا ہے جو اس الیکشن میں پیش آئیں۔ نیز معلوم ہوتا ہے کہ اگر راے دہندگان کو طرح طرح کی غیر آئینی کارروائیوں سے مرعوب نہ کیا جاتا اور ان کو آزادانہ راے دینے کا موقع ملتا تو جمعیت علماے ہند پچاس فیصدی نشستیں ضرور حاصل کرلیتی۔ (حیات شیخ الاسلام: ص ۷۸-۱۷۷)

دسمبر ۱۹۴۶ء: ماہِ رواں کے ابتدائی ہفتے میں الیکشن کی ہماہمی ختم ہو چکی تھی۔ صوبہ سرحد سے مولانا آزاد، خان عبدالغفار خان اور ایک کانگریسی ممبر منتخب ہوئے۔ اتر پردیش سے رفیع احمد قدوائی، دہلی سے بیرسٹر آصف علی، بنگال سے فضل حق کا انتخاب ہوا۔ مذکورہ غازیان و مجاہدین آزادی وطن مسلم لیگ کے دیو پیکر سرکردہ نمایندوں کو شکست دے کر ظفر یاب ہوئے۔ بنگال سے ڈاکٹر امبیڈکر وکیل اور پنجاب سے مسٹر جناح چن کر آئے۔

۱۹۴۷ء

کانگریس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس:

۶ر جنوری ۱۹۴۷ء: ۶ر دسمبر ۱۹۴۶ء کے برطانوی اعلان پر سوچ و فکر کے لیے کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ۲۳ر دسمبر ۱۹۴۶ء کی جو کارروائی شروع جنوری پر ملتوی کر دی تھی، ۶ر جنوری ۱۹۴۷ء کو اس کا یہ اجلاس پھر سے شروع ہوا۔ اور حسبِ ذیل قرارداد منظور کی۔ (یہ قرارداد اپنے مقاصد کے چار اُصولوں پر مشتمل ہے)

(۱) کانگریس اختلافی نکات کی تشریح کے لیے ہمیشہ فیڈرل کورٹ میں معاملہ پیش کرنے کی حامی رہی ہے۔ چوں کہ حکومت برطانیہ اور مسلم لیگ اس کے لیے رضامند نہیں ہیں اس لیے فیڈرل کورٹ میں معاملہ پیش کرنا فضول ہے۔

(۲) کمیٹی یہ محسوس کرتی ہے کہ برطانوی وزارتی مشن کے ۱۶ر مئی ۱۹۴۶ء کے بیان سے صوبہ آسام، صوبہ سرحد اور صوبہ پنجاب کے سکھوں کے لیے زبردست مشکلات پیدا کی گئی ہیں اور ۶ر دسمبر ۱۹۴۶ء کے بیان کی تفصیل و تشریح سے یہ مشکلات اور زیادہ بڑھ گئی ہیں۔ کانگریس کسی ایسے جبر میں شریک نہیں ہو سکتی جو کسی صوبے میں اس کی مرضی کے خلاف عاید کیا جائے۔

(۳) کمیٹی کی رائے ہے کہ ایک آزاد اور خود مختار ہندوستان کا دستور زیادہ سے زیادہ سمجھوتا کرنے کے بعد ہندوستان کے لوگوں کو اس طرح بنانا چاہیے کہ اس میں کسی بیرونی طاقت کی مداخلت نہ ہو۔

(۴) کمیٹی کی خواہش ہے کہ نمایندہ دستوری اسمبلی تمام پارٹیوں کی خیر سگالی اور نیک نیتی کے ذریعے آزاد ہندوستان کا دستور بنانے کی مہم کو جاری رکھے۔ اس لیے دو مختلف تفسیروں کی وجہ سے پیدا ہونے والی مشکلات کے پیش نظر یہ رائے دیتی ہے کہ مجوزہ سیکشنوں میں حکومتِ برطانیہ کی تفصیل کو قبول کر لیا جائے، لیکن یہ بات صاف ہے کہ اس کی وجہ سے کسی صوبے پر یا صوبے کے کسی حصے پر جبر نہیں ہوگا۔ اس قسم کے جبر کی صورت میں

ضروری اقدام کا حق محفوظ ہے اور اس کا دارومدار آیندہ حالات پر ہے۔
مندرجۂ بالا قرار داد پر کانگریس ورکنگ کمیٹی کے مختلف حضرات نے حسبِ ذیل تقریریں کیں۔ آسام کے نمایندہ مسٹر بیدناتھ نے کہا کہ

''آسام کے لیے سیکشنوں میں بیٹھنا موت کے مترادف ہوگا۔''

آسام کی دوسری نمایندہ شریمتی پشپالتا نے اعلان کیا کہ ''آسام ۶/دسمبر ۱۹۴۶ء کے برطانوی اعلان کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔''
سوامی سبجانند: ''اس ریزولیوشن کا پاس ہونا کانگریس کے لیے خودکشی کے برابر ہوگا۔''
سردار موتا سنگھ (پنجاب) نے سکھوں کے جنگی رجحان کو بیان کرتے ہوئے کہ کہا: ''۶/دسمبر ۱۹۴۶ء کے بیان کو تسلیم کرنا ہندوستان کے جسم پر عمل جراحی کرنا ہے اور اس کے گلے پر چھری پھیرنا ہے۔ بابو جے پرکاش نرائن (سوشلسٹ لیڈر) نے کہا کہ کانگریس ۱۶/مئی ۱۹۴۶ء سے اس وقت تک فیصلے کر رہی ہے۔ اگر کمیٹی سمجھ بوجھ سے فیصلہ نہ کرے گی تو مجھ جیسے لوگوں کے لیے اس میں رہنا مشکل ہوگا۔
سرت چندر بوس (بنگالی لیڈر) نے اس فیصلے کے خلاف غصے میں آکر استعفیٰ دے دیا۔ ان سب کے جواب میں مولانا ابوالکلام آزاد نے کہا:

> ''گروپ بندی کو لازمی کردینے سے صوبۂ آسام کے لوگوں میں سخت بے چینی پھیل گئی کیوں کہ سیکشن ''سی'' میں صوبۂ بنگال کی خالص اکثریت ہے۔ آسام کو ڈر ہے کہ صوبۂ بنگال اپنی اکثریت کے بل بوتے پر ایسا آئین تیار کرے گا کہ بعد ازاں صوبۂ آسام کا گروپ سے نکلنا ہی ناممکن ہو جائے گا۔
>
> وزیرِ ہند اور سر اسٹیفورڈ کرپس نے پارلیمنٹ میں بیان دیتے ہوئے واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ صوبوں کا گروہوں سے علاحدہ ہو جانے کا حق ہر صورت میں برقرار رہے گا اور کوئی ایسا آئین بنانا جس میں صوبوں کے اس حق کو چھیننے کی کوشش کی جائے گی۔ کیبنٹ مشن کے ۱۶/مئی ۱۹۴۶ء کے اعلان کی اسپرٹ کے خلاف رہے گا۔ کانگریس نے ۶/جنوری کے ریزولیوشن کے ذریعے حکومتِ برطانیہ کا ۶/دسمبر کا اعلان منظور کرلیا ہے اور یہ بات مان لی ہے کہ سیکشنوں میں جو فیصلے ہوں گے وہ سیکشنوں کے ممبروں کی کثرتِ آرا سے ہوں گے اور اگر

سیکشن گروہ بندی کا دستور بنانا چاہیں تو اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی۔ بہ شرطے کہ صوبوں کے لیے حق علاحدگی کا استعمال محفوظ رہے۔

اب معاملے کی صورت صرف یہ ہے کہ اگر صوبۂ بنگال ایسا قانون بناتا ہے کہ صوبۂ آسام کے لیے گروپ بندی سے باہر نکلنا ناممکن ہو جائے تو ایسی صورت میں صوبۂ آسام کو واک آؤٹ کرنے کا حق قدرتی طور پر حاصل ہے اور اس کو کوئی نہیں روک سکتا۔ لیکن اگر بنگال ایسی زیادتی نہیں کرتا تو کوئی جھگڑا بھی پیدا نہیں ہوتا۔ صرف حق کا معاملہ ہے کہ جدید آسام کو ایک حق حاصل ہے، اگر چاہے تو وہ علاحدہ ہو جائے۔''

مولانا نے یہ بھی واضح کر دیا کہ

''میرا خیال یہی ہے کہ چھوٹے بڑے صوبوں سے علاحدگی خود ہی پسند نہ کریں گے، بہ شرطے کہ کوئی ایسا قانون نہ بنایا جائے جس سے ان کا حق خود ارادیت سلب ہوتا ہے۔'' (اخبار مدینہ: ۱۳ر جنوری ۱۹۴۷ء)

مولانا آزاد کی اس واضح تشریح کے بعد کانگریس کی قرارداد منظور کر لی گئی۔

(روزنامہ ''انقلاب'' کا پریس نوٹ)

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے تازہ بیان میں کانگریس کی ۶ر جنوری والی قرارداد کی جو وضاحت فرمائی ہے اس میں گروہ بندی کے متعلق مسلم لیگ اور کانگریس کے جھگڑے کو حقیقتاً بالکل ختم کر دیا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ اب لیگ دستور ساز اسمبلی میں شریک نہ ہو۔ مولانا کے بیان کا متن یہ ہے:

''(۱) اب کانگریس نے یہ مان لیا ہے کہ گروہ بندی کے متعلق بھی ہر فیصلہ مختلف سیکشنوں کے مجموعی ووٹوں سے ہوگا۔

(۲) دستور ساز اسمبلی کے سلسلے میں صوبوں کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہیں تو نئے انتخابات کے بعد محض اپنی اکثریت کے فیصلے کی بنا پر گروہ بندی سے علاحدگی کا فیصلہ کر لیں۔''

مولانا فرماتے ہیں کہ

''اگر اس اجازت میں خلل ڈال دیا جائے یا دروازہ بند کرنے کی کوشش

کی گئی تو یقیناً بعض صوبوں کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں رہے گا کہ وہ باہر نکل جائیں۔

ہمیں اعتراف کرنا چاہیے کہ کانگریس کی قرارداد کے الفاظ اور عام انداز سے اس مفہوم کی واضح تصدیق نہیں ہوتی۔ لیکن جب مولانا آزاد یہ مطلب بیان کرتے ہیں تو اس میں شبہ کیوں کیا جائے؟ مولانا سے بڑھ کر کانگریس کے نقطۂ نگاہ کی نمایندگی کا حق اور کون ادا کر سکتا ہے۔ ہم لیگ کے کارفرماؤں سے باادب التجا کرتے ہیں کہ اب گومگو کی پالیسی ترک کر کے دستور سازی کے کام میں حصہ لیا جائے۔"

(روزنامہ 'انقلاب': ۳ر فروری ۱۹۴۷ء، بہ حوالہ کاروانِ احرار: جلد ۸، ص ۳۸-۴۱)

مولانا آزاد کی حکومت میں شرکت:

۱۵ر جنوری ۱۹۴۷ء: کو مولانا ابوالکلام آزاد ہندوستان کی نیشنل گورنمنٹ میں شامل کر لیے گئے۔ انھیں وزیر تعلیم بنایا گیا ہے۔ اس سے پیشتر یہ ذمہ داری راج گوپال اچاریہ کے پاس تھی۔

انٹیرم گورنمنٹ میں اپنی شمولیت کے بارے میں خود مولانا فرماتے ہیں:

"میں ذکر کر چکا ہوں کہ ستمبر ۱۹۴۶ء میں انٹیرم حکومت بنی تو گاندھی جی اور میرے ساتھیوں نے اصرار کیا کہ میں اس میں شریک ہو جاؤں۔ لیکن میرا خیال تھا کہ کانگریس کے لیڈروں میں سے کم از کم ایک پرانے آدمی کو حکومت سے باہر رہنا چاہیے۔ میں سمجھتا تھا کہ اس طرح میں منصفانہ طریقے سے حالات کا جائزہ لے سکوں گا۔ چناں چہ میں نے آصف علی کو وزارت میں شامل کر دیا۔ انٹیرم حکومت میں لیگ کی شرکت کے بعد نئی مشکلات پیدا ہو گئیں۔ اب میری شمولیت کا سوال پھر اٹھا۔ گاندھی جی اب پہلے سے بھی زیادہ مصر تھے، انھوں نے کہا میرا ذاتی نظریہ جو بھی ہو، ملک کے مفاد کی خاطر وزارت میں شامل ہونا میرا فرض ہے، انھوں نے یہ بھی کہا کہ میرا وزارت میں نہ ہونے سے نقصان پہنچ رہا تھا۔ جواہر لال کا بھی یہی خیال تھا۔

گاندھی جی کی رائے تھی کہ محکمہ تعلیم میرے لیے نہایت موزوں رہے گا اور ملک کا

اصل مفاد بھی اسی میں ہے۔ انھوں نے کہا کہ آزاد ہندوستان کا یہ بنیادی مسئلہ ہے کہ مستقبل میں تعلیم کا نظام کیا ہو؟ چناں چہ ۱۵؍جنوری ۱۹۴۷ء کو میں نے محکمہ تعلیم کی ذمہ داری سنبھال لی۔ اس وقت تک تعلیم کے ممبر راج گوپال آچاریہ تھے۔

میں نے تعلیم کے میدان میں جس پالیسی اور پروگرام پر عمل کیا وہ ایک الگ کتاب کا موضوع ہوگا۔ ان مسایل پر میرے خیالات یک جا کتابی شکل میں شایع کیے جا چکے ہیں، اس لیے میں یہاں اس بارے میں کچھ نہیں کہوں گا۔ بلکہ صرف ملک کے عام سیاسی حالات سے بحث کرنا چاہتا ہوں، جو لیگ اور کانگریس میں نا اتفاقی کی وجہ سے روز بہ روز نازک تر اور مشکل تر ہوتے جا رہے تھے۔" (انڈیا ونس فریڈم: ص ۲۶۱)

وزیرستان کو آزاد اور خودمختار سلطنت بنانے کا مطالبہ:

۲۵؍جنوری ۱۹۴۷ء: اخبارات میں آزاد قبایل کے چار سرداروں کا ایک مشترک بیان شایع ہوا جو ذیل میں درج ہے:

"لاہور۔ ۲۲؍جنوری: ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا کو بیان دیتے ہوئے چار بڑے قبایلی سرداروں نے مطالبہ کیا کہ وزیرستان کو آزاد اور خودمختار سلطنت تسلیم کر لینا چاہیے۔ ان کی عنانِ حکومت ملکوں اور قبایلیوں کے ہاتھوں میں ہونی چاہیے۔

آپ نے مزید مطالبہ کیا کہ وزیرستان سے برطانوی فوجیں اسکاؤٹس اور ٹروپ فوراً بلا لیے جائیں، تاکہ جرگوں میں کامل اتحاد ہو سکے۔ وزیرستان بالکل خودمختار اور اس کی طرزِ حکومت شریعت اسلامیہ کے اصولوں پر ہوگی۔

دستخط کنندگان میں کرنل شاہ پسند خان سابق اے ڈی سی سابق شاہ افغانستان، امان اللہ خان چیف آف لنگر خول قبیلہ، کیپٹن میر بادشاہ خان چیف آف مسعود (مل خیل)، خان حبیب اللہ خان وزیر توری خیل، فقیر ایپی صاحب کا بھتیجا، ملک خیر خان مسعود سالار اعظم محافظین وزیرستان۔

بیان میں بتلایا گیا ہے کہ اگر آج وزیرستان آزاد کر دیا جائے تو اس کے پہاڑوں میں اس قدر دولت ہے کہ وہ آیندہ پندرہ برس میں دنیا کی سب سے زیادہ امیر حکومت ہوگی۔

ان میں کوئلے، چاندی، اور سونے کی کانیں نہایت افراط سے ہیں۔ پیٹرول اور مٹی کا تیل بھی ان میں نہایت کثرت سے ملتا ہے۔ اگر آزاد جرگہ کی سرکردگی میں انجینئر مقرر کیے جائیں تو ان پہاڑوں سے اتنی نئی نئی چیزیں نکلیں گی کہ ہندوستان تو کیا یورپ والے انگشتِ بدنداں ہوکر رہ جائیں گے۔

یہ نظریہ وزیرستان کے بے تاج بادشاہ فقیر اپی صاحب اور شاہ زادہ فضل دین کا ہے۔ (کاروانِ احرار: جلد ۸، صفحہ ۶۷-۶۸)

احرار وفد کی بہار سے واپسی:

۲۵ر جنوری ۱۹۴۷ء: دسمبر ۱۹۴۶ء کے شروع میں آغا عبدالکریم شورش (کاشمیری) تیرہ احرار سالاروں کی معیت میں مظلومین بہار کی امداد کے لیے پٹنہ۔ بہار پہنچے۔ وہ اپنے ساتھ کمبل، پہننے کے کپڑے اور خوراک کا کافی سامان لے کر گئے تھے۔ ۲۵ر جنوری ۱۹۴۷ء کو واپسی لاہور پہنچنے پر اس نے پچیس فل اسکیپ صفحات پر مشتمل رپورٹ دفتر مرکزیہ کو پیش کی۔ رپورٹ کی ابتدا میں لکھا:

''میں نے بہار پہنچ کر محسوس کیا کہ متاثرہ علاقوں کے لیے ماسٹر تاج الدین انصاری کی بے حد ضرورت ہے۔ کیوں کہ جن حصوں کو تباہی کا سامنا کرنا پڑا ہے وہ اکثر و بیشتر مومن برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس وقت بہار کا مسلمان شدید ابتلا میں محصور ہے، جو کچھ میری آنکھوں نے دیکھا ہے وہ قلم بیان کرنے سے عاجز ہے۔ میں نے اپنے قیام کے دوران متاثرہ علاقوں میں گھوم پھر کر فساد کے مختلف پہلوؤں پر بہت سی معلومات جمع کی ہیں، میں دو ایک روز تک اپنی رپورٹ مجلسِ عاملہ کے سپرد کر دوں گا۔

چوں کہ پنجاب میں فرقہ وارانہ کش مکش کے باعث آئینی گرفت موجود ہے، اس لیے حوادث کی تفصیل لکھنے سے معذور ہوں۔ لیکن مسلمانانِ بہار کے زہرہ گداز مصایب اور وزارتِ بہار کی موجودہ روش کے متعلق تین چار روز تک مقالات کا مسلسل سلسلہ شروع کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے جو تاثرات فراہم کیے ہیں اور فساد کے پس منظر کے علاوہ جو نتائج مجھے نظر آئے ان کے بارے میں میں نے گاندھی جی، مسٹر محمد علی جناح، مولانا ابوالکلام آزاد،

پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا حسین احمد مدنی، خان عبدالغفار خان، سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا حبیب الرحمٰن کو بعض خاص امور کے متعلق مختلف خطوط لکھے ہیں۔

میرے ساتھ احرار سالاروں نے دن رات مختلف علاقوں کا دورہ کیا۔ حالات فراہم کیے، تباہ حال لوگوں کو ریلیف پہنچائی گئی۔ مکانوں سے رضا کاروں نے لاشیں اٹھائیں اور بعض شہری پناہ گزینوں کی درخواست پر ان کے دیہاتوں میں جا کر ان کا سامان نکالا اور فصلیں کٹوانے میں مدد دی۔

احرار سالاروں نے مختلف دیہاتوں سے اغوا شدہ لڑکیوں کا پتا بھی چلایا اور وہ ان کے نکالنے میں دن رات لگے رہے۔

پناہ گزینوں کے کیمپ میں احرار رضا کار پہنچے اور حتی الامکان مدد پہنچاتے رہے۔ کئی مقامات پر احرار رضا کاروں نے اپنی جانیں خطرے میں ڈال کر لوگوں کو بچایا۔

رزاق بیگھ (پٹنہ کا ایک گاؤں) کی ایک فیملی کی درخواست پر جس کے تمام مرد قتل ہو گئے تھے اور صرف چھ عورتیں اور ایک لڑکا بچا تھا، اس علاقے میں ابھی تک سکون کے حالات پیدا نہیں ہوئے۔ چودھری معراج دین سالار کی معیت میں چالیس احرار رضا کاروں کا ایک قافلہ پہنچا اور وہاں کے ہندو باشندوں کی شدید مزاحمت کے باوجود تباہ حال گھر کی ایک دیوار کے عقب سے اہل خاندان کی استدعا پر تقریباً پچیس ہزار روپیہ کی مالیت کا سونا نکالا اور ان کے حوالے کر دیا۔

ایک گاؤں وزیر پور میں بھی جس کا صرف ایک آدمی بچا ہے، رضا کاروں نے ڈھور ڈنگروں کی طرح کام کیا۔

قیام پٹنہ کے دوران وزارت بہار کے اعلا احکام، نیشنلسٹ مسلمانوں اور لیگ کے بڑے لیڈروں سے بھی ملاقات کی۔

۲۰ رجنوری کو میں نے بہار کے وزیر اعظم شری کرشنا سنہا اور مسٹر انور مزائن وزیر مالیات سے تین گھنٹے تک ملاقات کی اور انھیں علاقے کے حالات سے مطلع کیا۔ نیز مجلس عاملہ احرار ہند کی حادثۂ بہار کے متعلق تجاویز وزارت کے روبرو رکھیں اور اس سلسلے میں مفصل گفتگو کی۔'' (کاروانِ احرار: جلد ۸، صفحہ: ۷۰-۶۸)

شرمناک واقعہ:

۲۵ر جنوری ۱۹۴۷ء: جنوری ۱۹۴۷ء کے آخری ہفتے میں ضلع ہزارہ کے جن دیہات پر حملہ کیا گیا تھا ان میں وہ علاقہ بھی تھا جو "ملاچ علاقہ" کے نام سے مشہور ہے۔ ملاچ علاقہ کے ایک سکھ نوجوان کو قتل کیا۔ اس کی نوخیز بیوی "مسماۃ پاسری" کو جو قریب پورے دن کی حاملہ تھی، اغوا کر کے ۲۵ر جنوری ۱۹۴۷ء کو خفیہ طور پر "ایبٹ آباد" لایا گیا اور میرزماں ساکن موضع فلگری بالا (علاقہ کالا باغ) سے اس کی شادی کردی گئی۔ جب اس واقعے کی اطلاع ڈپٹی کمشنر کو ہوئی تو ۲ر فروری کو وہ کالا باغ گیا اور ۹ر فروری کو مسماۃ پاسری کو گرفتار کر کے اپنی حراست میں پشاور لے آیا اور وہاں اس کی حفاظت کے انتظامات کر دیے۔

(علمائے حق اور......: جلد۲: ص ۵۷۶)

مسلم لیگ کے خلاف مولانا حسرت موہانی کا بیان:

۲۹ر جنوری ۱۹۴۷ء: لکھنؤ (۲۹ر جنوری) اور نیشنل پریس کو خصوصیت کے ساتھ انٹرویو دیتے ہوئے مولانا حسرت موہانی ممبر آل انڈیا مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی نے کہا کہ

"آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلسِ عمل۔ مجلسِ عمل نہیں بلکہ حقیقت میں وہ ایک مجلس بے عمل ہے۔ وہ مسلمانوں کے لیے کوئی پروگرام مرتب کرنے سے قاصر رہے۔ اگر انگریز اس بات پر اتر آئے کہ طول و عرض ہند میں بہ یک وقت مسلمانوں کے خلاف جارحانہ کارروائیاں جاری کردے جیسا کہ وہ ایک بڑے صوبے میں کر کے دیکھ چکا ہے تو ہم خواب کے متوالوں کو اس طرح بے جن پائیں گے کہ ہم کو خبر تک نہ ہوگی۔

مولانا نے آگے چل کر کہا:

البتہ میں پنجاب مسلم لیگ کو اس کے اس باہمت اقدام پر مبارک باد دیتا ہوں۔

(روزنامہ "انقلاب" لاہور: ۳۱ر جنوری ۱۹۴۷ء)

عربی فارسی کمیٹی کا اجلاس اور مولانا آزاد کی صدارت:

یکم فروری ۱۹۴۷ء: صوبۂ متحدہ کی عربی اور فارسی کمیٹی کا ایک عام اجلاس آئندہ ماہ فروری میں بہ مقام لکھنؤ منعقد ہوگا۔ جلسے میں ممبران کمیٹی کے علاوہ دیگر اشخاص بھی مدعو کیے

جائیں گے اور کمیٹی کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد عربی فارسی اور متعلقہ مضامین کی دوبارہ تنظیم کے متعلق کمیٹی کے سامنے تقریر فرمائیں گے۔

ممالک متحدہ کی عربی اور فارسی کمیٹی کی سب کمیٹیوں کے اجلاس ۱۶ر فروری ۱۹۴۷ء کو اور غالباً ۱۷ر فروری ۱۹۴۷ء کو بھی لکھنؤ میں سیکریٹریٹ کی عمارت میں منعقد ہوں گے۔

(مدینہ۔ بجنور: یکم فروری ۱۹۴۷ء)

یکم فروری ۱۹۴۷ء: کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی میں مسلم لیگ کو شرکت کی دعوت — مولانا ابوالکلام آزاد۔ (مدینہ۔ بجنور: یکم فروری ۱۹۴۷ء)

مولانا آزاد کے بیان پر انقلاب کا افتتاحیہ:

۲ر فروری ۱۹۴۷ء: مولانا آزاد کے اس توضیحی بیان کے بعد روزنامہ انقلاب نے اپنے افتتاحیہ میں جس کا عنوان تھا "اب لیگ کی شرکت میں کون سا امر مانع ہے؟" تحریر کیا۔

> "ہمارے نزدیک مولانا کا بیان کانگریس کے تمام بڑے لیڈروں کی رائے اور مشورے کے مطابق اور ان کے اتفاق سے ساری پوزیشن کو زیادہ سے زیادہ واضح کرنے کے لیے دیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ارکانِ عاملہ لیگ کے نزدیک یہ کافی نہ ہو۔ لیکن بہتر ہو کہ وہ توضیحات کی رسمی تصدیق میں وقت صرف کرنے کے بجائے ویسے ہی اس کی تصدیق کرالیں۔
>
> (روزنامہ انقلاب۔ لاہور: ۹ر ربیع الاول ۱۳۶۶ھ/۲ر فروری ۱۹۴۷ء)

مساۃ پاسری کے اغوا کا مقدمہ:

۱۸ر فروری ۱۹۴۷ء: خان صاحب عبدالرشید خان سٹی مجسٹریٹ پشاور کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا۔ مساۃ پاسری نے اپنی ماں نیز میر زماں اور دوسرے رشتہ داروں کی موجودگی میں بیان دیا کہ — مجھ سے جبراً اسلام قبول کرایا گیا، میر زماں سے زبردستی شادی کردی گئی اور میں ابھی تک سکھ ہوں۔

اس ابتدائی کارروائی کے بعد سٹی مجسٹریٹ نے مساۃ پاسری کو ایبٹ آباد بھیج دیا کہ

وہاں ڈپٹی کمشنر کی حفاظت میں رہے۔

مسماۃ پاسری کا یہ معاملہ سرحدیوں کے اشتعال کے لیے کافی تھا۔ لیگ کی طرف سے کہا گیا کہ لڑکی نے اپنی خوشی سے اسلام قبول کیا تھا، لہٰذا وہ مسلمان ہے اور اس کو میر زماں کو واپس دینا چاہیے۔

۱۹ر فروری ۱۹۴۷ء: مسلم لیگ کا ایک جلوس ڈپٹی کمشنر کے پاس درخواست لایا کہ مسماۃ پاسری کو واپس نہ کیا جائے۔ ڈپٹی کمشنر نے اطمینان دلایا کہ ان کی درخواست صوبائی حکومت کے پاس بھیج دی جائے گی، لیکن جب جلوس واپس ہونے لگا تو راستے میں ہندو دکان داروں پر حملہ کر دیا، کچھ دکانیں لوٹیں اور دس ہندوؤں کو زدوکوب کیا۔ پولیس نے فوراً مداخلت کی اور حالات پر قابو پالیا۔ سترہ گرفتاریاں عمل میں آئیں۔

۲۰ر فروری ۱۹۴۷ء: کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے دفعہ ۱۴۴ نافذ کردی۔ اس کے برخلاف ہوتی مردان کے تھانے کے قریب ایک چھوٹا سا مجمع اکٹھا ہوگیا، مگر پرامن رہا۔ تھوڑی دیر بعد خان عبدالقیوم خان، محمد اکبر خان اور پیر محمد خان پلیڈر کے ہم راہ پشاور سے آگئے۔ انھوں نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے اجازت چاہی کہ دس منٹ کے لیے مجمع سے خطاب کرنے کا موقع دیا جائے، تا کہ مجمع سے منتشر ہونے کی درخواست کرسکیں۔ ان کو اس شرط پر اجازت دے دی گئی، لیکن جب وہ تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تو انھوں نے کہا کہ وہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی دفعہ ۱۴۴ کے حکم کی خلاف ورزی کرنے کے ارادے سے آئے ہیں۔ چناں چہ خان عبدالقیوم خان اور ان کے دونوں ساتھی گرفتار کر لیے گئے اور مجمع کو اشک آور گیس سے منتشر کر دیا گیا۔

(حکومت سرحد کا بیان: مجریہ ۲۰ر فروری ۱۹۴۷ء بہ حوالہ قومی آواز: ۲۲ر فروری ۱۹۴۷ء)

یہ تھا لیگ کی سول نافرمانی کا مبارک افتتاح۔ زمین پہلے سے ہم وار کی جا چکی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ تحریک زور پکڑنے لگی۔ انتہا یہ کہ چند روز بعد ڈاکٹر خان وزیر اعظم کی کوٹھی پر حملہ کیا گیا، اگر چہ وہ ناکام رہا۔ ماہ مئی میں پشاور جیل کو توڑنے کی کوشش کی گئی، سپرنٹنڈنٹ جیل کو پیٹا گیا، جیل خانہ میں آگ لگا دی گئی۔

(علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے: جلد ۴، ص ۷۷-۵۷۶)

مسٹر اٹلی کا ہندوستان سے دست برداری کا اعلان:

۲۰ر فروری ۱۹۴۷ء: مسٹر اٹلی وزیر اعظم انگلستان نے آج اعلان کیا ہے کہ برطانیہ ۱۶ر جون ۱۹۴۸ء تک ہندوستان سے دست بردار ہو جائے گا۔ انھوں نے اپنے اعلان میں کہا ہے:

"اگر ایک متحدہ دستور کے پوری نمایندہ کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کے ذریعے بنائے جانے کا ۱۶ر جون ۱۹۴۸ء تک کوئی امکان نظر آئے تو برٹش گورنمنٹ کو اس پر غور کرنا پڑے گا کہ وہ متحدہ ہند کی گورنمنٹ کو ہندوستان کی حکومت کے سپرد کردے یا تاریخ متعینہ پر ملک کے کچھ حصوں میں موجودہ صوبائی حکومتوں کو یا اسی قسم کے کسی اور ذریعے سے جو ہندوستانی عوام کے مفاد میں نظر آئیں، اقتدار حکومت تفویض کردیے۔"

مسٹر اٹلی نے مزید کہا:

"حکومت نے لارڈ ویول کے جانشین کے طور پر ایڈمرل وائی اسکاؤنٹ ماؤنٹ بیٹن کا تقرر منظور کرلیا ہے، جنھیں یہ کام سپرد کیا جائے گا وہ برطانوی ہند پر حکومت کرنے کی ذمے داری باشندگان ہند کو ایسے طریقے کے مطابق منتقل کریں جس سے ہندوستان کی آیندہ مسرت اور خوش حالی کا بہترین یقینی بندوبست ہو جائے۔ وائسرائے کی تبدیلی مارچ میں ہوگی۔"

نئی صورت حال پر مولانا کا ردعمل:

مولانا کا کہنا ہے کہ مسٹر اٹلی کے فیصلے کا محرک یہ عزم تھا کہ ہندوستان کو آزاد ہونے میں مدد کرنی ہے۔ کوئی شخص جس کی ذہنیت ذرا بھی سامراجی ہوتی وہ ہندوستان کی کم زوری سے فایدہ اٹھا سکتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی نااتفاقی سے برطانوی حکومت نے ہمیشہ فایدہ اٹھایا اور یہی ہندوستان کے مطالبۂ آزادی کے خلاف سب سے بڑا ہتھیار تھا۔ مسٹر اٹلی عہد کر چکے تھے کہ لیبر حکومت کوئی بھی ایسی بات نہیں کرے گی جس سے اس پر الزام عاید ہو سکے..... اگر ان کی نیت صاف نہ ہوتی اور انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی نااتفاقی سے فایدہ اٹھانا چاہا ہوتا تو اٹھا سکتے تھے اور ہماری مخالفت کے باوجود دس برس تک

حکومت کر سکتے تھے..... ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ فرانس برطانیہ سے کم زور ہوتے ہوئے بھی دس سال تک انڈو چائنا پر حکومت کرتا رہا..... دوسری طرف اگر لارڈ ویول کی تجویز پر عمل کیا گیا ہوتا اور ہندوستان کے مسئلہ کا حل دو سال تک اٹھا رکھا گیا ہوتا تو ممکن ہے مسلم لیگ مخالفت سے عاجز آ کر مصالحت کر لیتی۔ اگر مسلم لیگ تعمیری طریقہ اختیار نہ کرتی تو غالباً خود مسلمان عوام اس کے تخریبی رویے سے دل برداشتہ ہو کر اسے رد کر دیتے۔ ہوسکتا ہے ہندوستان کی تقسیم کا دل فگار حادثہ پیش نہ آتا..... قوموں کی زندگی میں ایک دو برس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی، غالباً آنے والی نسلیں یہ کہیں گی کہ لارڈ ویول کی پالیسی پر عمل کرنا زیادہ صحیح ہوتا۔

لارڈ ویول کے بارے میں مولانا اور ان کے رفقا کے خیالات مختلف تھے۔ مولانا نے ایک اخباری بیان میں لارڈ ویول کے کام کے بارے میں اپنی رائے عوام کے سامنے رکھی۔ جس میں ماضی کے حالات کا احاطہ کیا گیا تھا۔ مولانا لارڈ ویول کو ایک ان گھڑ اور بے ریا سپاہی سمجھتے تھے، جس کا انداز و گفتار سیدھا تھا۔ ان کے نزدیک لارڈ ویول میں سیاست دانوں کی پرکاری نہیں تھی۔ وہ فوراً معاملے پر آ جاتے تھے اور ان کا انداز اتنا بے لاگ ہوتا تھا کہ دل پر ان کے خلوص کا نقش بیٹھ جاتا تھا۔ مولانا کہتے ہیں میں نے ملک کو یہ مشورہ دینا اپنا فرض سمجھا کہ اپنے سیاسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے تعمیر پسندانہ رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ اس وقت سے آج تک شبہات اور اختلافات کی فضا کے باوجود میں اس راہ سے نہیں ہٹا ہوں۔ یہ سب جانتے ہیں کہ شملہ کانفرنس کے بعد سے کم از کم چار بار خارجی اور اندرونی دباؤ ڈال کر یہ کوشش کی گئی کہ کانگریس کوئی سیاسی تحریک شروع کرنے پر مجبور ہو جائے اور عملی احتجاج کا طریقہ اختیار کرے، لیکن مجھے پورا یقین تھا کہ برطانوی حکومت کے مصالحتی رویے کے پیش نظر یہ راستہ غلط ہوگا۔

مولانا لکھتے ہیں:

> ''میں نے کانگریس کو استقلال کے ساتھ ایک راہ پر چلتے رکھنے کے لیے اپنے پورے اثر سے کام لیا اور آج مجھے اطمینان ہے کہ حالات کا جو تجزیہ میں نے کیا تھا وہ غلط نہیں تھا۔''

لارڈ ویول کی علاحدگی کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"مجھے نہیں معلوم کہ پچھلے تین ہفتوں میں لارڈ ویول اور حکومت برطانیہ
کے درمیان کیا گفت وشنید ہوئی ہے، لیکن ظاہر ہے ایسے اختلافات ہوئے
ہوں گے جن کی وجہ سے لارڈ ویول کو استعفیٰ دینا پڑا۔ صورت حال کے بارے
میں ان کی جو رائے ہے، ہم ان سے اختلاف کر سکتے ہیں، لیکن ان کے خلوص
اور ان کی ایمان داری پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ میں یہ بھی نہیں بھول سکتا کہ آج
ہندوستان اور برطانیہ کے تعلقات کی بدلی ہوئی فضا دراصل اس دلیرانہ قدم کی
وجہ سے ہوئی ہے جو لارڈ ویول نے جون ۱۹۴۵ء میں اٹھایا تھا۔"

مولانا نے لارڈ ویول کے بارے میں جن نیک جذبات کا اظہار کیا ہے وہ دراصل ان کے اپنے خلوص نیت اور سنجیدگی کے آئینہ دار ہیں، انھیں اپنی مومنانہ سرشت کے آئینہ میں دوسروں کے چہرے بھی بے داغ اور صاف نظر آتے ہیں۔ انھوں نے مسایل کے حل اور تصفیے سے کبھی مایوسی کا اظہار نہیں کیا بلکہ ہمیشہ پرامید رہے۔ لارڈ ویول بریک ڈاؤن پلان کابینہ مشن منصوبے کا نعم البدل خفیہ خفیہ اٹھائے پھرتا تھا۔ یہ منصوبہ ہندوستانی سیاست دانوں سے مخفی تھا۔ اگر یہ منصوبہ مولانا پر منکشف ہو جاتا جس کا مقصد ہندوستان کے اتحاد کو ختم کرنا تھا اور مسلم اکثریتی آبادی کے علاقوں پر برطرف اقتدار مسلط رکھنا تھا، تو ویول کے بارے میں ان کے خیالات بالکل مختلف ہوتے۔ مولانا کے بیان کا ویول پر اچھا اثر ہوا تھا۔ انھوں نے ایک دوست سے کہا "مجھے خوشی ہے کہ ہندوستان میں کم از کم ایک ایسا شخص تو ہے جس نے میری بات سمجھنے کی کوشش کی ہے۔"

لارڈ ویول علاحدگی کے حکومتی فیصلے سے شدید دلبرداشتہ تھے۔ اس کا اندازا مولانا کے بیان سے ہوتا ہے جس کا ذکر ان کے سوانح نگار مسٹر ہمایوں نے کیا ہے۔ روانگی سے ایک روز قبل لارڈ ویول نے کابینہ کے جلسے کی آخری مرتبہ صدارت کی۔ کارروائی ختم ہونے پر انھوں نے ایک مختصر سا بیان دیا جس سے میں بہت متاثر ہوا۔ لارڈ ویول نے کہا:

"میں ایک بہت بڑی مشکل وقت میں وائسرائے بنا۔ میں نے اپنی
ذمے داری کو پورا کرنے کی امکانی کوشش کی۔ اب ایسی صورت حال پیدا ہوگئی
ہے کہ مجھے مستعفی ہونا پڑا ہے۔ تاریخ بتلائے گی کہ اس مسئلے پر میرا استعفیٰ دینا
صحیح تھا یا نہیں؟ بہ ہر حال میری آپ سے درخواست ہے کہ عجلت میں کوئی فیصلہ

نہ کریں۔"

یہ کہہ کر لارڈ ویول نے اپنے کاغذات سنبھالے اور اٹھ کر چلے گئے۔ اپنی کابینہ کے اراکین کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہ دیا اور اگلے روز دلی سے روانہ ہو گئے۔ ویول کی علاحدگی پر دور حاضر کے مورخین نے طویل تبصرے اور تجزیے کیے ہیں۔ گزشتہ صفحات میں ہم نے بھی ہلکا سا تذکرہ کیا ہے، لیکن ٹرانسفر آف پاور میں یہ داستان تفصیل سے دیکھی جا سکتی ہے۔ ویول کا کہنا ہے کہ میں نے ہندوستان کی آزادی کی تاریخ مقرر کر دینے کا مطالبہ کیا تھا، لیکن حکومت نے میری استدعا قبول نہیں کی، مگر نئے گورنر جنرل نے بھی اس کے بغیر ذمے داریاں سنبھالنے سے اتفاق نہیں کیا۔

پنجاب و بنگال کی تقسیم پر مسلم لیگ کی آمادگی:

۲۱ر فروری ۱۹۴۷ء: مسلم لیگ کیبنٹ مشن پلان کے اعلان سے قبل ہی تقسیم پنجاب اور بنگال پر رضامند ہو چکی تھی اور بعد میں کئی دیگر علاقوں سے بھی دست کشی کی پیش کش کر چکی تھی۔ ۲۱ر فروری ۱۹۴۷ء کو سر آغا خان وایسرائے ویول سے ملے تو انھوں نے پاکستان کے قیام کی ضرورت پر گفتگو کی۔ انھوں نے وایسرائے سے کہا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا متفق رائے ہونا ناممکن ہے۔ انھوں نے کہا کہ جناح شمال مشرق میں امرتسر اور انبالہ وغیرہ اور بنگال و آسام کے ہندو اضلاع چھوڑنے پر رضامند ہے، لیکن کلکتہ نہیں۔ مسٹر جناح تو پورے بنگال کو پاکستان سے خارج کرنے پر آمادہ تھے۔ جب بنگال کے مسلم لیگی اور ہندو لیڈروں نے بنگال کو متحد رکھنے کی تحریک شروع کی تھی۔ گورنر بنگال (Casey) کیسے وایسرائے ویول کو ۱۴ر دسمبر ۱۹۴۶ء کو لکھتا ہے کہ مجھے پورا یقین ہے اگر مسلمانوں کو اس حقیقت کا علم ہو جائے کہ کلکتہ کی مشرقی پاکستان میں شمولیت مکمل طور پر ناممکن ہے تو یہ شدید صدمہ کا باعث ہوگا۔ وہ آگے چل کر مزید لکھتا ہے کہ خواجہ ناظم الدین کا خیال ہے کہ مشرقی پاکستان مکمل آزاد اور خود مختار ریاست ہوگا۔ خواجہ ناظم الدین، سہروردی، فضل الحق اور دیگر بنگالی مسلمان سمجھتے ہیں کہ مشرقی پاکستان میں ہندو اور مسلمان پر امن طور پر رہیں گے اور نظام حکومت میں مشترکہ طور پر آبادی کے تناسب سے حصہ ملے گا۔

(ابوالکلام آزاد اور......:ص ۵۴۶-۴۷)

سرحد میں بدامنی پھیلانے کا منصوبہ — ڈاکٹر خان کا بیان:

یکم مارچ ۱۹۴۷ء: یکم مارچ ۱۹۴۷ء کو ڈاکٹر خان نے ایک بیان جاری کیا۔ جس کا اہم جزیہ ہے:

''بعض غیر ذمہ دار طبقے نے صوبہ سرحد میں بدامنی پھیلانے کے بعد سرحد کی حکومت کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا ہے کہ حکومت شہری حقوق کو دبانا چاہتی ہے۔ اگرچہ میں عام طور پر اخباری پروپیگنڈے کی پرواہ نہیں کرتا، مگر چوں کہ یہ اعتراضات مسلسل کیے جا رہے ہیں لہٰذا اس حقیقت کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ صوبۂ سرحد میں اس جماعت سے زیادہ عوام کی آزادی کا کوئی حامی نہیں، جس کا میں لیڈر ہوں۔ اس جماعت کے ہر ممبر نے عوام کے حقوق کی حفاظت کی ہے اور ان کے حصول کے لیے قربانیاں پیش کی ہیں، لیکن شہری حقوق کی اجازت کے یہ معنی ہرگز نہیں ہو سکتے کہ لوٹ مار کی اجازت دی جائے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ سرحدی حکومت نے مسلم لیگ کی تقریروں، نعروں اور مظاہروں میں کبھی مداخلت نہیں کی۔ حتیٰ کہ لیگ کی گالیوں اور اشتعال انگیز سرگرمیوں کے خلاف بھی کوئی کارروائی نہیں کی، لیکن جب پر امن شہریوں پر جارحانہ حملے کیے گئے اور ان کی دوکانیں لوٹ لی گئیں تو حکومت اسے تماشائی کی حیثیت سے نہ دیکھ سکی۔ جو حرکتیں ۱۸ر فروری کو مردان میں اور ۲۰ر کو پشاور میں کی گئیں انھیں کوئی حکومت برداشت نہیں کر سکتی۔'' (انجام - دہلی: ۴ر مارچ ۱۹۴۷ء)

بڑی دشواری یہ تھی کہ حکام اور افسران حکومت پر بھی لیگ کا اثر غالب تھا۔ عوام کی حفاظت کے لیے وہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی کرتے تھے، لہٰذا خان عبدالغفار خان نے خدائی خدمت گاروں کو مامور کیا کہ وہ عوام اور بالخصوص ہندوؤں کی حفاظت کریں۔ یہ حفاظت اور بدامنی کی متصادم جدوجہد کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ اس میں سیکڑوں بے گناہ موت کے گھاٹ بھی اتارے جا چکے ہیں اور بہت سی بستیاں نذر آتش کی جا چکی ہیں۔

باایں ہمہ ڈاکٹر خان وزیر اعظم سرحد کا استقلال قابل داد ہے کہ وہ لیگ کے کسی نرغے سے بھی اپنے عزم میں متزلزل نہیں ہوئے اور خضر حیات کی طرح لیگ سے خفیہ ساز باز کا ارادہ بھی نہیں کیا۔ حال آں کہ خضر حیات سے زیادہ لیگی حلقوں میں ان کی قدر کی جاسکتی تھی اور لیگ اس پر راضی ہوسکتی تھی کہ وزارت عظمٰی ڈاکٹر خان کے سپرد رہے، بہ شرطے کہ وہ لیگ کے سامنے شکست تسلیم کرلیں۔ (علمائے حق اور...... جلد۲،ص ۷۹-۵۷۸)

پنجاب کی سیاست اور خضر حیات وزارت کا استعفٰی:

۳/ مارچ ۱۹۴۷ء: ۳/ مارچ ۱۹۴۷ء کو وزیر اعظم پنجاب نے اپنی کیبنٹ سے مشورے کے بعد وزارتِ عظمٰی سے استعفٰی دے دیا۔ اس کے ساتھ ہی پریس کانفرنس میں حسبِ ذیل بیان دیا:

''لاہور ۳/ مارچ: ملک سر خضر حیات خان ٹوانہ وزیر اعظم پنجاب نے گذشتہ شب دس بجے گورنر پنجاب کو اپنا استعفٰی پیش کردیا۔ اس استعفٰی نے سیاسیات پنجاب کی بساط الٹ کر رکھ دی۔ پنجاب اسمبلی کا بجٹ سیشن آج منعقد ہونے والا تھا، مگر وزارت کے مستعفی ہونے کے باعث نئی وزارت کی تشکیل تک یہ اجلاس ملتوی کردیا گیا۔ استعفٰی پیش کرنے سے پہلے وزیر اعظم پنجاب نے اپنے چھاؤنی لاہور کے بنگلے پر اپنے کولیشن پارٹی کی ایک میٹنگ کی جو مسلسل دو گھنٹے جاری رہی۔ اس میٹنگ کے خاتمے پر سر خضر نے گورنر پنجاب کو اپنا استعفٰی پیش کردیا۔ گورنر پنجاب نے ملک خضر حیات سے کہا کہ وہ نئی وزارت بننے تک ''نگراں حکومت'' کی حیثیت سے حکومت کا کام جاری رکھیں۔ ملک سر خضر حیات خان نے اپنی مستعفی ہونے کے متعلق حسبِ ذیل بیان دیا ہے۔

ملک معظم کی حکومت نے لازمی قرار دے دیا کہ صوبوں کی مختلف پارٹیاں صوبائی معاملات میں برابر کی حصہ دار رہیں اور اس طرح ملکی معاملات کے سنبھالنے میں مساویانہ حیثیت سے عہدہ برآ ہوں۔ اس لیے اب مجھ پر یہ لازم ہوگیا ہے کہ میں مسلم لیگ کے لیے میدان خالی کردوں تاکہ وہ دوسری پارٹیوں کے ساتھ ساتھ صوبائی معاملات میں اشتراک عمل کرسکے۔ ہوسکتا ہے کہ مسلم لیگ مسلم مفاد کے پیش نظر ان ذمے داریوں سے بہ طریق احسن عہدہ برآ ہوسکے۔ کیوں کہ اگر میں بہ حیثیت لیڈر کولیشن پارٹی اس وزارت کو چلانے کی

جدو جہد کروں جس میں مسلم لیگ شامل نہیں، تو ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر بہت شدید قسم کی مشکلات پیدا ہو جائیں۔ ان تمام امور کی اصل وجہ یہ ہے کہ صوبۂ پنجاب کو مختلف آئین کے حل کرنے کا سامنا ہو گیا ہے۔ اگرچہ میں بہ حیثیت لیڈر کولیشن پارٹی ان عقدوں کو حل کرنے کی اس وقت تک کوشش کرتا رہا ہوں، لیکن اب میں سمجھتا ہوں کہ یہ ذمے داریاں اب اس پارٹی کے شانوں پر ڈال دی جائیں جسے مسلمانوں کی اکثریت کی نمایندگی حاصل ہے۔ اس وقت میں نے جو قدم اٹھایا ہے اس سلسلے میں میرا یہ کہنا کوئی ضروری نہیں کہ میں صوبے کی فرقہ وارانہ فضا کو خوش گوار رکھنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہوں گا۔

فرقہ وارانہ تصفیے وغیرہ کے لیے بھی جہاں تک میرے امکان میں ہے میری خدمات بدستور حاضر رہیں گی اور میں اس سلسلے میں کسی قسم کی تنگ دلی سے ہرگز کام نہ لوں گا۔

ملک خضر حیات نے مزید اعلان کیا ہے کہ میں نے ۲۶ ر فروری کو جو بیان دیا تھا اس میں کہا تھا کہ ملک معظم کی حکومت کے ۲۰ ر فروری کے بیان نے یک سر ایک نئی صورتِ حالات پیدا کر دی ہے، چناں چہ اس نئی صورتِ حالات کی روشنی میں پنجاب کے تمام لیڈروں کا فرض ہے کہ وہ فیصلہ کریں کہ پنجاب کا مستقبل کیا ہونا چاہیے اور اس صوبے کو اپنی ذمے داریوں سے کیوں کر عہدہ برآ ہونا چاہیے۔ اس تمام صورت حالات کا جس سے ہمارا صوبہ اس وقت دوچار ہے انتہائی عمیق نگاہ اور تجربہ سے مطالعہ کیا ہے اور انتہائی غور و غوض کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔ اسے میں نے آج منظرِ عام پر لاتے ہوئے عوام الناس کے سامنے رکھ دیا ہے۔

گزشتہ سال گورنر پنجاب کی دعوت پر جب میں نے کولیشن حکومت کی ذمے داریوں کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھایا تھا اس وقت مجھے یقین کامل تھا کہ صوبے کا مفاد اور صوبے کی مختلف پارٹیوں کی بہتری اسی میں ہے کہ پنجاب میں ایک غیر فرقہ وارانہ یا کولیشن وزارت قایم کی جائے۔ جہاں تک آئینی ارتقا کا تعلق ہے صوبے کی ہر پارٹی کو یک سر آزادی دے دی گئی تھی کہ وہ اپنا طریق کار تجویز اور اختیار کرے۔

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں نے صاف اعلان کر دیا تھا کہ میں اور میرے دوسرے مسلمان ساتھی مسلم مفادات کی پوری پوری نگہداشت کریں گے۔ چناں چہ ہم نے ہمیشہ مسلمانوں کے مطالبات کی پوری پوری حمایت کی۔ جیسی کہ میری پہلے رائے تھی آج بھی

انتہائی وثوق کے ساتھ اعلان کرتا ہوں، صوبہ پنجاب کا نظم ونسق بہترین طور پر صرف ایک غیر فرقہ وارانہ یا کولیشن وزارت ہی انجام دے سکتی ہے۔ اس کے برعکس جو بھی اقدام کیا جائے گا اس کے نتائج بھی ظاہر ہیں۔ چناں چہ انھی بنیادوں پر میں نے امکانی جدوجہد کے ساتھ صوبائی اور انتظامی حیثیت میں ہمیشہ امتیاز قایم رکھا۔ مجھے یقین تھا کہ جب تک انھی اصولوں پر عمل درآمد ہوتا رہے گا اس وقت تک یہ کولیشن وزارت صوبے کے نظم ونسق سے عہدہ برآ ہونے کے ساتھ فرقہ وارانہ سمجھوتے کو بھی برقرار رکھیں گے اور ہوسکتا ہے کہ پنجاب کے یہ انتظامات دوسرے صوبوں کے لیے بھی بہ طور نمونہ مفید ثابت ہوں۔ مگر اب افسوس کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ فرقہ وارانہ افتراق کی خلیج آج بھی اتنی ہی وسیع ہے جتنی کہ یہ گذشتہ سال تھی۔ تاہم کولیشن وزارت نے جو اصول وضع کیے تھے ہوسکتا تھا کہ وہ انھیں اپنائی ہوئی اطمینان کے ساتھ کام کرتی چلی جاتی۔ مگر ملک معظم کی حکومت کے تازہ اعلان نے صوبہ اور مرکز کے آئینی و انتظامی معاملات کے سلسلے میں نئے عقدے پیدا کردیے ہیں، اس لیے جن اصولوں پر یہ وزارت چل رہی تھی وہ اب بے معنی ہوکر رہ گئے ہیں۔

ملک معظم کی حکومت نے قطعی اعلان کردیا ہے کہ سیاسی اختیارات ہندوستانیوں کو منتقل کرنے کے سلسلے میں فوری سرگرمیاں شروع کردی جائیں اور جون ۱۹۴۸ء تک اس کی تکمیل ہوجائے۔ چناں چہ ملک معظم کی حکومت کے اس اعلان کی روشنی میں لازم ہوگیا ہے کہ صوبے کی تمام سیاسی پارٹیوں کو ان اختیارات میں حصہ لینے کا موقع دیا جائے تا کہ ایک ایسا نظام قایم ہوجائے جو وقت پر جملہ اختیارات کو فی الفور سنبھال لے۔ چناں چہ انھیں وجوہات کی بنا پر میں نے گورنر پنجاب کو اپنی حکومت کا استعفیٰ پیش کردیا ہے۔ مجھے یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ میں اور دیگر مسلمان بھی خود مختاری کے پیشِ نظر مسلمانوں کے مطالبات کی حمایت بدستور کرتے رہیں گے۔"

(کاروانِ احرار: جلد ۸، ص ۱۳۱-۱۲۹)

خضر حیات کے استعفے پر جناح صاحب کی مسرت:

۳؍ مارچ ۱۹۴۷ء: خضر حیات خان کے استعفے نے مسٹر جناح صاحب کے دل و دماغ پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ آپ نے ۳؍ مارچ کو بیان دیا کہ

"مجھے آج صبح یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ ملک خضر حیات خان نے

اپنا اور اپنی کابینہ کا استعفیٰ داخل کر دیا ہے۔ انھوں نے ایک عاقلانہ فیصلہ کیا ہے اور مجھے امید ہے کہ ڈاکٹر خان صاحب بھی اس پر عمل کریں گے۔''

تقسیم ناگزیر ہے تو صوبے بھی تقسیم کرو! کانگریس:

۸ر مارچ ۱۹۴۷ء: کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ۸ر مارچ ۱۹۴۷ء کو اپنی ایک تجویز کے ذریعے یہ مطالبہ کیا ہے کہ اگر ہندوستان کی تقسیم ناگزیر ہے تو پنجاب کے ان رقبوں کو جن میں ہندو اور سکھ اکثریت ہے بقیہ صوبے سے الگ کر دیا جائے۔

کانگریس اس وقت تک ملکی تقسیم کے معاملے میں پوری طرح سنجیدہ نہیں تھی لیکن مسلم لیگ نے جس زور شور کے ساتھ تقسیم ملک کی تحریک کو بڑھاوا دیا تھا، خصوصاً ۲۰ر فروری کے مسٹر اٹلی وزیر اعظم انگلستان کے بعد اس نے جو ہنگامہ شروع کیا تھا اور جو اشتعال وہ پھیلا رہی تھی اسے اس سے باز رکھنے کے لیے یہ مطالبہ پیش کیا تھا۔

مسٹر اٹلی کے بیان پر جمعیت کی قرارداد اور دیگر تجاویز:

۱۳ر مارچ ۱۹۴۷ء: مسٹر اٹلی وزیر اعظم برطانیہ نے اپنے اعلان مورخہ ۲۰ر فروری ۱۹۴۷ء میں ظاہر کیا تھا کہ جون ۱۹۴۸ء میں جملہ اختیارات ہندوستانیوں کو منتقل کر دیے جائیں گے۔ اس اعلان اور اس کے بعد کے پیش آنے والے نازک ترین سیاسی حالات کے پیش نظر ۱۳ر مارچ ۱۹۴۷ء کو مجلسِ عاملہ جمعیت علماے ہند کا اجلاس طلب کیا گیا۔ چناں چہ ۱۳ر مارچ کو شام کے تین بجے زیرِ صدارت شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی صدر جمعیت علماے ہند دفتر مرکزیہ جمعیت علماے ہند (دہلی) میں اجلاس شروع ہوا جس میں حضرت شیخ الاسلام کے علاوہ مندرجۂ ذیل حضرات اراکین مجلسِ عاملہ نے شرکت فرمائی۔

حضرت علامہ مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب، حضرت مولانا احمد سعید صاحب نایب صدر جمعیت علماے ہند، حضرت مولانا محمد صادق صاحب کراچی، حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب مراد آباد، مولانا نور الدین صاحب بہاری، مولانا سید محمد شاہد صاحب فاخری، مولانا عبد الحلیم صاحب صدیقی، مولانا بشیر احمد صاحب، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب

ناظم اعلا جمعیت علماے ہند۔ (محمد میاںؒ)

مجلسِ عاملہ کے اراکین کے علاوہ مندرجۂ ذیل حضرات نے بھی شرکت فرمائی جن کو شرکتِ اجلاس کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔

حاجی مولانا بخش صاحب ایم ایل اے (سندھ)، مولانا مفتی محمد عتیق الرحمٰن صاحب، سید محمد صاحب جعفری، مولانا اسماعیل صاحب (سندھ)، مولانا محمد الفاروقی صاحب الہ آباد، مولانا حامد الانصاری صاحب غازی (مدیر اخبار مدینہ)، محمد اجمل خاں صاحب، مسٹر ریاض الدین صاحب نایب صدر مومن کانفرنس (الہ آباد)، مولانا محمد قاسم صاحب شاہ جہان پوری، مولانا مجید حسن صاحب (مالک اخبار مدینہ بجنور)۔

اس اجلاس میں مندرجۂ ذیل تجاویز منظور کی گئیں:

"(۱) جمعیت علماے ہند کی مجلسِ عاملہ کا یہ جلسہ وزیر اعظم برطانیہ کے ۲۰؍فروری ۱۹۴۷ء کے اعلان آزادیٔ ہند کو جہاں تک کہ ہندوستانیوں کو ہندوستان کی زمامِ حکومت سپرد کرنے کی تاریخ متعین کرنے کا تعلق ہے بڑی حد تک قابل اطمینان سمجھتا اور لیبر گورنمنٹ کے مدبرانہ اقدام کو بہ نظر استحسان دیکھتا ہے۔ ہاں! اس امر کا اظہار ضروری سمجھتا ہے کہ اس اعلان میں انتقال اختیارات کا طریقہ صاف طور پر ظاہر نہ کرنا پیچیدگی اور تشویش پیدا کرتا ہے۔

مجلسِ عاملہ اس حقیقت کا اعلان بھی ضروری سمجھتی ہے کہ جمعیت علماے ہند نے ملک و مذہب کی اہم خدمت کے طور پر ہندوستان میں برٹش حکومت کے استیصال اور آزادیٔ کامل کے حصول کے لیے جو جدو جہد کی اور مسلمانانِ ہند اور کارکنان جمعیت نے اس سلسلے میں جو بیش بہا قربانیاں پیش کیں، برٹش حکومت کا ۲۰؍فروری کا یہ اعلان کہ جون ۱۹۴۸ء میں ہندوستان کی زمامِ حکومت کلیتاً ہندوستانیوں کے ہاتھ میں دے دی جائے گی ان کا کامیاب نتیجہ ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ ہندوستان کی حکومت کن ہندوستانیوں کے ہاتھ میں اور کس طرح دی جائے تو جمعیت علما اس مسئلے کو محاذ جنگ بنانا نہیں چاہتی، کیوں کہ یہ مسئلہ باشندگانِ ہند کے باہمی سمجھوتے اور اعتماد سے انجام پا سکتا ہے اور اس کو اسی طرح طے ہونا چاہیے۔

(۲) جمعیت علماے ہند ہمیشہ اس مسلک کی پابند رہی ہے کہ ہندوستان میں فرقہ

وارانہ تقسیم کا اصول ملک کے لیے عموماً اور مسلمانوں کے لیے خصوصاً مضر اور تباہ کن ہے۔ اس ملک میں کوئی ایسی تقسیم جو فرقہ وار بنا پر کی جائے اور مذہبی اعتبار سے ملک کو جدا جدا ٹولیوں میں تقسیم کر دے مسلمانوں کے لیے خاص طور پر کم زور کرنے والی اور مضرت رساں اور ملک کے لیے بھی عام طور پر تباہ کن ثابت ہوگی۔

جمعیت علما اپنے اس نقطۂ نگاہ پر اب تک قایم ہے اور اس کو صحیح اور مفید سمجھتی ہے۔

جمعیت علمائے ہند کی مجلسِ عاملہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کی اس تجویز پر انتہائی حیرت و استعجاب کا اظہار کرتی ہے جس میں اس نے پنجاب کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا مشورہ دیا ہے اور غیر مسلم پنجاب و مسلم پنجاب کو دو منطقوں میں تقسیم کیا ہے۔

جمعیت علمائے ہند کی یہ پختہ رائے ہے کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کی یہ تجویز فرقہ وارانہ ہے اور کانگریس کی سیاسی روایات کے بالکل خلاف ہے۔

جمعیت علمائے ہند کی مجلسِ عاملہ کا یہ جلسہ اپنے اس خطرے کا نہایت صفائی کے ساتھ اظہار کرتا ہے کہ اگر کانگریس ورکنگ کمیٹی کی اس فرقہ وارانہ تجویز پر عمل کیا گیا تو اس سے ملک میں ایسی تقسیم کا دروازہ کھل جائے گا جس کو بند کرنا ناممکن ہوگا اور اس ملک کی وحدت پارہ پارہ اور ٹکڑے ہو کر رہ جائے گی۔

(۳) جمعیت علمائے ہند کی مجلسِ عاملہ کا یہ جلسہ ان نئے حالات کی بنا پر جو وزیر اعظم برطانیہ کے بیان سے پیش آرہے ہیں اور ۱۹۴۸ء میں ہندوستان کی آزادی سے پیش آنے والے ہیں، مسلمانوں کے باہمی اتحاد اور اتفاق کو ان کے مذہبی و قومی تحفظات کے لیے ضروری و لازمی سمجھتا ہے اور ہندوستان کے تمام مسلمانوں سے پر زور درخواست کرتا ہے کہ اس وقت تمام مسلم جماعتوں کے نمایندوں کا ایک جگہ جمع ہو کر اس بات پر غور کرنا نہایت ضروری ہے کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے مذہبی و قومی تحفظات کے حصول کی کیا صورت ہے اور وہ کس طرح حاصل ہو سکتے ہیں۔ اگر اس وقت مسلمانوں نے اس طرف سے لاپرواہی برتی اور ضد و مناقشت سے کام لیا تو آزاد ہندوستان میں ان کے لیے کوئی مناسب مقام نہ ہوگا اور ان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔"

(جمعیت علما کیا ہے؟ ضمیمہ حصہ دوم: ص ۳-۱)

فسادات پر اور حروں کے مسئلے کی قراردادیں:

۹ رتا ۱۱ر مئی ۱۹۴۷ء: جمعیت علمائے ہند کی مجلس مرکزیہ کا خصوصی اجلاس منعقدہ لکھنؤ میں بہار اور گڑھ مکتیسر کے فسادات کے بارے میں نیز ایک تجویز ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت سندھ میں حروں پر مظالم اور ان کی تحقیق کے لیے ایک کمیشن کے قیام کے بارے میں بھی منظور کی گئی تھی۔ یہ تینوں تجاویز ذیل میں نقل کی جاتی ہیں:

تجویز نمبر ۵۔ متعلق فسادات بہار:

جمعیت علمائے ہند کا یہ اجلاس فسادات بہار سے متعلق اجلاس مجلس عاملہ منعقدہ ۱۳ رتا ۱۵ ر مارچ ۱۹۴۷ء کی مندرجہ ذیل تجویز کی تصدیق کرتا ہے اور حکومتِ بہار کو توجہ دلاتا ہے کہ وہ اپنی مجرمانہ غفلت کی تلافی کے لیے زیادہ سے زیادہ کوشش کرے تاکہ مسلمانانِ بہار کو اطمینان نصیب ہو:

وزارتِ بہار نے فساداتِ بہار کے انسداد اور فساد زدہ علاقے میں مسلمانوں کو دوبارہ آباد کرنے اور مجرمین کو کیفر کردار تک پہنچانے کے متعلق جو سرکاری اعلان کیا ہے اور اس کے مطابق حکام کو سرکلر جاری کیے وہ جمعیت علمائے ہند کے مطالبات کی روشنی میں اگرچہ ایک حد تک غنیمت کہے جاسکتے ہیں، لیکن جہاں تک ان انتظامات کی عملی تشکیل کا تعلق ہے ہنوز قابل اطمینان نہیں ہیں اور آبادکاری اور مجرمین کی گرفتاری اور قتل و غارت کے انسداد میں حکومت کے عملی اقدامات اطمینان بخش نہیں ہیں۔

اس لیے یہ جلسہ حکومتِ بہار کو پرزور توجہ دلاتا ہے کہ وہ اپنے فرض کا احساس کرتے ہوئے اپنے ہی اعلان کے مطابق فوری اقدامات کرے، تاکہ مصیبت زدہ مسلمانوں کو خصوصاً اور مسلمانانِ بہار کو عموماً امن و اطمینان نصیب ہو سکے۔

تجویز نمبر ۶۔ متعلق فساداتِ گڑھ مکتیسر:

مجلسِ مرکزیہ جمعیت علمائے ہند کا یہ اجلاس گڑھ مکتیسر کے حادثہ فاجعہ سے متعلق مظلومین کی دادرسی اور تلافی مافات کے لیے حکومت یوپی کے موجودہ طرز عمل اور افسران متعلقہ کی مجرمانہ غفلت کو سخت تشویش کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور حکومت سے پرزور مطالبہ کرتا

ہے کہ وہ اپنے اعلان کے مطابق مظلومین کے نقصانات کی جلد سے جلد تلافی کرے اور مظلومین کی امداد کے اعلان کو جلد از جلد پورا کرے۔

تجویز نمبر ۹- حروں پر مظالم کے بارے میں تجویز میں کہا گیا ہے:

۱۹۴۱ء جب کہ ڈیفنس آف انڈیا رولز کا دور دورہ تھا، سندھ کے حروں پر ان کی ایک تحریک کے سلسلے میں لرزہ براندام مظالم کیے گئے، ان کے رہنما پیر پگاڑو کو پھانسی دی گئی اور مارشل لا نافذ کر کے سیکڑوں حروں کو گولیوں کا نشانہ بنا دیا گیا اور کھلی عدالت میں ان پر مقدمہ چلائے بغیر ان پر اور ان کے ہم دردوں پر انتہا درجہ کا وحشیانہ سلوک روا رکھا گیا، عورتوں کی عصمت دری، بستیوں کی بربادی، جائیدادوں کی ضبطی، بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کے استثنا کے بغیر ان کو قتل و غارت کا شکار بنایا گیا، حتیٰ کہ حکومت سندھ نے حُرا ایکٹ پاس کر کے ان پر مظالم کو دائمی حیثیت دے دی اور جرائم پیشہ اقوام سے بدتر شمار کیا جانے لگا، جوڑا کوؤں سے زیادہ کڑی نگرانی میں محبوس و محصور کر دیے گئے۔

جمعیت علمائے ہند ان مظالم کے خلاف انتہائی غم و غصہ اور غیض و غضب کا اظہار کرتی رہی اور آج بھی اس طرز عمل کو انسانیت سوز سمجھ کر انتہائی نفرت کا اظہار کرتی ہے اور حکومت ہند و حکومت سندھ سے پرزور مطالبہ کرتی ہے کہ وہ غیر مشروط طور پر ان پر سے ہر قسم کی پابندی کو ہٹائے اور ضبط شدہ جائیدادوں کو واپس کرے اور ایک آزاد کمیشن کے ذریعے گذشتہ مظالم کی تحقیقات کے بعد افسران متعلقہ کو قرار واقعی سزا دے اور تلافیٔ مافات کے طور پر ان کے بچوں کی تعلیم اور رہائش و آبادکاری کا انتظام مناسب طور پر کرے۔

ان تجاویز کی منظوری کے بعد آخری تجویز میں جناب صدر کی اجازت سے حضرت مولانا شاہ محی الدین صاحب امیر شریعت صوبۂ بہار کی وفات حسرت آیات پر ہندوستان کے مشہور قومی کارکن اور ہم درد ملک و ملت پروفیسر عبدالباری کی اندوہ ناک شہادت پر بچھرایوں ضلع مراد آباد کے مشہور رئیس صاحب خیر، مولوی عبدالحفیظ صاحب کے حادثۂ ارتحال پر اور سید پور کے خاموش مبلغ مولانا سید تخلیص حسن صاحب کی رحلت پر دلی رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے دعائے مغفرت اور تعزیت کی تجویز منظور کی گئی اور ان تمام مرحومین کے پس ماندگان کے ساتھ اپنی پوری ہم دردی کا اظہار کیا گیا۔ (جمعیت نے کیا کیا ہے؟: ص ۱۱، ۱۲، ۱۳)

سندھ اسمبلی کی قرارداد:

۲۰ / مارچ ۱۹۴۷ء: تقسیم پنجاب کی کانگریسی قرارداد نے حالات میں ایسا زہر گھولا کہ نہ صرف پنجاب متاثر ہوا بلکہ دیگر اکثریت کے مسلمان صوبوں نے بھی اپنے گردوپیش کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ ۲۰ / مارچ کے اخبارات میں سندھ کی یہ خبر شایع ہوئی۔

کراچی۔ ۱۹ / مارچ۔ آج سندھ اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی کا اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں فیصلہ کیا گیا کہ جون ۱۹۴۸ء میں سندھ کی خودمختاری کا اعلان کر دیا جائے گا۔ اس قرارداد کے آخر میں یہ بھی کہا گیا کہ اگر صوبائی گروہ بندی متعلقہ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان کوئی سمجھوتا نہ ہو سکا تو جون ۱۹۴۸ء میں سندھ اپنی خودمختاری کا اعلان کرنے میں حق بہ جانب ہوگا۔ اس خبر کے ایک ہفتے بعد ۲۶ / مارچ کو ''امرت بازار پتریکا'' بمبئی نے خبر شایع کی کہ

بنگال اسمبلی کے ۸۰ مسلم لیگی ممبر بنگال کی موجودہ سہروردی وزارت کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر چکے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے وزارت کے خلاف الزامات کی ایک طویل فہرست شایع کی ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ برسراقتدار وزارت نااہل افراد پر مشتمل ہے۔ وہ پولیس کے تشدد اور محکمۂ سول سپلائی کی بدعنوانیوں کی ذمے دار ہے۔ بنگال میں فرقہ وارانہ کشیدگی کی وزارت ہی ذمے دار ہے۔

اس سلسلے کی دوسری رپورٹ چودھری خلیق الزماں نے کتاب ''شاہ راہِ پاکستان'' کے صفحہ ۱۰۴۱ پر درج ہے کہ مارچ کے تیسرے ہفتے بنگال کے تین زعما مسٹر نورالدین، مسٹر حمید الحق چودھری اور موہن میاں مجھ سے ملنے دلی آئے۔ انھوں نے کہا کہ وہ شہید سہروردی کے خلاف بنگال اسمبلی میں عدم اعتماد کی تحریک پیش کرنا چاہتے ہیں، جس کے لیے ان کے پاس ستر مسلم ممبران کی دستخطی منظوری موجود ہے۔

بعد میں مسٹر جناح نے مجھ سے کہا کہ میں کلکتہ جا کر ان قضیے کو کسی طرح ختم کرادوں۔ دو ایک دن بعد کلکتہ جا کر میں نے سہروردی کے آفس میں مخالفین کی روئیداد سنی، یہ بات بھی سننے میں آئی کہ شہید سہروردی شیاما پرشاد مکرجی سے متحدہ بنگال کی اسکیم کے لیے کوشاں ہیں۔ (کاروانِ احرار: جلد ۸، ص ۱۸۲)

ماؤنٹ بیٹن کی آمد اور ویول کی روانگی:

۲۲؍ مارچ ۱۹۴۷ء: ۲۱؍ مارچ کو ہندوستان کا نیا وایسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کراچی پہنچا۔ رات کراچی میں گزاری، دوسرے روز صبح ۲۲؍ مارچ کو نئی دہلی پہنچ گیا اور سابق وایسرائے لارڈ ویول سے ملاقات کی۔ ۲۳؍ مارچ کو لارڈ ویول لندن کو روانہ ہو گیا۔ ۲۴؍ مارچ کی صبح کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے وایسرائے ہاؤس میں ہندوستان کے نئے وایسرائے کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔

یہ واقعہ ۲۲؍ مارچ کا ٹھیک اس وقت کا ہے جب لارڈ ماؤنٹ بیٹن مطالعہ گاہ میں لارڈ ویول سے مصروف گفتگو تھے۔

اپنے ذاتی کمرے میں پہنچنے کے ساتھ ایڈوینا ماؤنٹ بیٹن نے ایک نوکر کو حکم دیا کہ ان کے دو چھوٹے چھوٹے نازک کتوں کو بھوک لگی ہوگی، ان کے لیے کھانے کو کچھ لے آؤ۔

اس وقت ایڈوینا ماؤنٹ بیٹن کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں جب آدھ گھنٹے کے بعد دو نوکر بڑی سنجیدگی سے ان کی خواب گاہ میں آئے۔ دونوں شان دار خوب صورت وردیاں پہنے ہوئے تھے، دونوں کے ہاتھ میں چاندی کی ایک ایک ٹرے تھی، ہر ٹرے میں چینی کی ایک پلیٹ تھی، ہر پلیٹ میں تازہ بھنا ہوا مرغ تھا۔ شان دار، مزیدار قاشوں میں کٹا ہوا۔

لیڈی ماؤنٹ بیٹن مرغ کی ان قاشوں کو دیکھتی رہ گئیں۔ گذشتہ چند ہفتوں کی بھاگ دوڑ میں ابھی لیڈی ماؤنٹ بیٹن نے ایسا مزیدار کھانا چکھا تو کیا سونگھا بھی نہیں تھا۔ دونوں چھوٹے کتے ان کے پیروں کے پاس پڑے بھونک رہے تھے۔ انھوں نے کتوں کو اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور دل میں سوچا:

"ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ ایسا مزیدار کھانا کتوں کو کیسے دیا جا سکتا ہے۔"

انھوں نے نوکروں سے کہا: "پلیٹیں اِدھر لاؤ! انھوں نے ہاتھ بڑھایا۔ نوکر پلیٹیں دے کر چلے گئے۔

لیڈی ماؤنٹ بیٹن دونوں پلیٹیں اٹھا کر غسل خانے کے اندر چلی گئیں اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ وہ عورت جو چند دنوں بعد وایسرائے کی شریک حیات کی حیثیت سے ہزاروں لوگوں کو دعوت دینے والی تھی وہ اس وقت غسل خانے میں بھنے ہوئے مرغ کھا رہی تھی جو کتوں کے لیے تیار کیے گئے تھے۔ (آدھی رات کی آزادی: ص ۶۶-۶۷)

لارڈ ویول کا آخری بیان:

۲۳ر مارچ ۱۹۴۷ء: روانگی سے ایک روز پیشتر لارڈ ویول نے کابینہ کے اجلاس کی آخری مرتبہ صدارت کی۔ کارروائی ختم ہونے سے پیشتر انھوں نے مختصر سا بیان دیا۔

''میں ایک بہت ہی مشکل وقت میں وایسرائے بنا، میں نے اپنی ذمے داری کو پورا کرنے کی امکانی کوشش کی۔ اب ایسی صورت پیدا ہوگئی ہے کہ مجھے مستعفی ہونا پڑا ہے، تاریخ بتلائے گی کہ اس مسئلے پر میرا استعفی دینا صحیح تھا یا نہیں۔ بہ ہر حال میری آپ سے درخواست ہے کہ عجلت میں کوئی فیصلہ نہ کریں۔

آپ لوگوں نے میرے ساتھ جو تعاون کیا اس کا میں شکر گزار ہوں۔''

یہ کہہ کر لارڈ ویول نے اپنے کاغذات سنبھالے اور اٹھ کر چلے گئے۔

جمعیت کے آیندہ صدر:

۲۳ر مارچ ۱۹۴۷ء: مرکزیہ جمعیت علماے ہند کے آیندہ صدر — شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی ہوں گے۔ مولانا سید محمد میاں ناظم جمعیت علماے ہند کا اعلان۔

(زمزم۔ لاہور، ۲۳ر مارچ ۱۹۴۷ء، ص۴)

ماؤنٹ بیٹن کا حلف وفاداری اور لیڈروں سے صلاح و مشورہ:

۲۳ر مارچ ۱۹۴۷ء: غیر منقسم ہندوستان کے آخری وایسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن ۲۲ر مارچ ۱۹۴۷ء کو نئی دہلی پہنچے۔ ۲۴ر مارچ کو حلف اٹھایا اور ہندوستانی راے عامہ کے لیڈروں پنڈت جواہر لال نہرو اور نواب زادہ لیاقت علی خاں سے علاحدہ علاحدہ طویل ملاقاتیں کر کے ملک کی صورت حالات اور ان کی جماعتوں کے مؤقف سے براہِ راست آگاہی حاصل کی۔ چودھری محمد علی کے مطابق وہ کانگریس اور مسلم لیگ کے اعلا قایدین کا اعتماد حاصل کرنے میں جلد ہی کامیاب ہوگیا۔ یہاں تک کہ مسٹر محمد علی جناح یخ بستہ وقار کے پیکر تھے، وایسرائے کا ذکر بڑی گرم جوشی سے کیا کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دونوں جماعتوں کے قایدین کو خوش رکھنے کے طریق کار پر بڑی ہوشیاری اور فراست

سے عمل پیرا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسے کابینہ مشن منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کی ہدایت کی گئی تھی، لیکن برطانوی حکومت اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ تھی کہ دونوں جماعتوں کا اس پر اتفاق رائے انتہائی مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ اسی لیے تو اسے کہا گیا تھا کہ اگر یکم اکتوبر تک مفاہمت کی کوئی صورت نظر نہ آئے تو رپورٹ کریں کہ تمہاری رائے میں جون ۱۹۴۸ء تک اقتدار کی منتقلی کیسے ہونی چاہیے؟ (ابوالکلام آزاد اور...... ص ۴۷۶)

۲۴ر مارچ ۱۹۴۷ء: گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی حلف وفاداری کی تقریب کا حوالہ خود اپنی رپورٹ میں کیا ہے۔ اس کا ایک مختصر اقتباس یہ ہے:

حلف برداری کی تقریب پچھلے پیر وار ۲۴ر مارچ کو پوری شان و شوکت سے ہوئی۔ کابینہ کے تمام وزرا موجود تھے لیکن صرف آدھ درجن والیان ریاست۔ میں نے فیصلہ کیا کہ ایک مختصر بیان دینے کا یہ ایک اچھا موقع ہے جس کی نقل ساتھ منسلک ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ اس بیان کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ مسٹر لیاقت علی خاں نے دوسرے روز میرے ساتھ ملاقات کے دوران استفسار کیا کہ کیا یہ تقریر کرنے کا خیال ان کو خود سوجھا تھا؟ جب میں نے اس کا جواب اثبات میں دیا تو انھوں نے دریافت کیا کہ کیا وہ (لیاقت علی خان) اس کا حوالے دے سکتے ہیں؟ کیوں کہ ان کو کم از کم تین مواقع پر یہ کہا گیا ہے کہ یہ تقریر کانگریس پارٹی کی درخواست پر کی گئی تھی۔ "(تحریک پاکستان اور انتقال اقتدار: ٹرانسفر آف پاور سے ماخوذ اہم ڈاکومنٹ کا ترجمہ) فکشن ہاؤس۔ لاہور، ۱۹۹۷ء: ص ۸۰

۲۴ر مارچ ۱۹۴۷ء: کو ہندوستان پر حکومت کرنے والا آخری انگریز وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن تخت نشین ہونے والا تھا۔ انگلستان کے شہنشاہ کا بیسواں اور آخری نمائندہ۔ دربار ہال جہاں یہ جشن ہونے والا تھا اس کی شان و شوکت اور خوب صورتی کی مثالیں دنیا میں بہت کم ملتی ہیں۔ جب ماؤنٹ بیٹن اس تقریب کے لیے تیار ہو رہے تھے تو ان کے ذہن میں گزرے ہوئے دنوں کی یادیں گھوم رہی تھیں۔

تقریباً پچیس سال پہلے وہ انگلستان کے ولی عہد کے ساتھ ہندوستان آئے تھے، اس وقت وائسرائے کی شان و شوکت ٹھاٹھ باٹھ کو دیکھ کر شاہ زادے کی زبان سے بے اختیار نکل گیا تھا۔

"مجھے پہلی بار یہ معلوم ہوا ہے کہ بادشاہ کو کس طرح رہنا چاہیے۔"

ماؤنٹ بیٹن بھی وائسرائے کے رہن سہن سے بے حد مرعوب ہوئے تھے۔ اس وقت کسی نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وائسرائے کا وہی تخت پچیس سال بعد ماؤنٹ بیٹن کا انتظار کرے گا۔

دروازے پر کسی نے ہلکی سی دستک دی، انھوں نے پلٹ کر دیکھا، اپنے بھورے بالوں پر ہیروں سے آراستہ مکٹ لگائے خوب صورت دروازے میں کھڑی لیڈی ماؤنٹ بیٹن مسکرا رہی تھیں۔ ریشم کے سفید گاؤن میں ان کا اکہرا بدن اتنا حسین اور دل کش نظر آرہا تھا جتنا اس دن جب شادی کی رسم کے بعد وہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی بانہوں میں بانہیں ڈالے گرجا گھر سے باہر نکلی تھیں۔

شوہر اور بیوی میں بعض باتوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ زبردست تناؤ میں بھی لارڈ ماؤنٹ بیٹن کبھی اتنے بے چین نہیں ہوتے تھے کہ رات کو آرام کی نیند نہ سوسکیں۔ اس کے برعکس ایڈوینا کو اکثر و بیشتر خواب آور گولیوں کے بغیر نیند نہیں آتی تھی۔

اپنے نانا کی بڑی جائیداد ایڈوینا کو وراثت میں ملی تھی۔ ماؤنٹ بیٹن سے شادی سے پہلے ہی ایڈوینا کے تعلقات انگلستان کے شاہی خاندان سے تھے۔ اس کی ماں کا انتقال بچپن میں ہی ہوگیا تھا۔ اس کچی عمر میں اسے کئی ایسے تلخ تجربے ہوئے جن کی وجہ سے وہ اپنی ذات کے اندر کھوگئی۔ ذرا سی بات سے اسے بڑی ٹھیس لگتی تھی۔ کسی تلخ تجربے کو بھولنا اس کے لیے ناممکن تھا۔ ناخوش گوار یادیں گھن کی طرح اس کی شخصیت کو اندر سے کھائے جارہی تھیں۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو نکتہ چینی کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا تھا اور وہ خود نکتہ چینی سننے کو تیار رہتے تھے۔ ان سے بات کرنے والے کو ہر لفظ سنبھال کر بولنا پڑتا تھا۔ اس تضاد کے باوجود میاں بیوی میں ایک بات مشترک تھی، دونوں انسانیت کے پرستار تھے اور انسانی قدروں کی حفاظت کے لیے جان پر کھیل جانا ان کے لیے مشکل نہیں تھا۔

(آدھی رات کی آزادی: ص ۶۷، ۶۸)

چند اہم تاریخی ڈاکومنٹس:

ڈاکومنٹ نمبر ۷: مسٹر ایبل کی جانب سے تمام گورنرز کے سیکریٹریوں کے نام (سوائے یوپی اور مدراس کے)

وائسرائے ہاؤس

نئی دہلی

۲۲ر مارچ ۱۹۴۷ء

خفیہ نمبر ۲-۱۲۹۹

میرے پیارے!

گورنر کے سیکرٹیریٹ میں موجود ریکارڈ کی جانچ پڑتال کے متعلق عزت مآب گورنر نے پہلے ہی کچھ احکامات جاری کردیے ہوں گے۔ اگر نہیں تو اگلے سال انتقال اقتدار کے نقطۂ نظر کے پیش نظر اس پر غور کیا جاسکتا ہے۔

اس مقصد کے لیے کاغذات کو مندرجۂ ذیل طریقے سے واضح طور پر تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(۱) غیر مستقل مفادوالے کاغذات جنھیں ضایع کردیا جائے۔

(۲) ہراس پھیلانے والی نوعیت کے کاغذات۔

(۳) صوبائی حکومت کے لیے مفادات والے کاغذات، یعنی پبلک سروس کمیشن کے متعلق کنونشن والے کاغذات جو کیٹے گری-۲ کی ذیل میں نہیں آتے۔ (۲) کیٹے گری-۳ کی ذیل میں آنے والے کاغذات کو آسانی سے سپرد کیا جاسکتا ہے۔ کیٹے گری-۲ کی ذیل میں آنے والے کاغذات ضایع کردیے جائیں، بہ شرطے کہ وہ ہزمیجسٹی کی حکومت کے لیے مستقل مفاد کا باعث نہ بننے والے ہوں۔ اس حیثیت میں معاملے کی رپورٹ مجھے کی جائے اور اگر ضروری ہوا تو میں انڈیا آفس سے مشورہ کروں گا۔

(۴) ہزمیجسٹی کی حکومت کی بابت کوئی خفیہ کاغذات اس دفتر کو ریفرنس کے بغیر سپرد نہ کیے جائیں۔

آپ کا مخلص

بی ای بی۔ ایبل

(۱) گورنر کے سیکرٹری (مدراس) نے بہ ذات خود یہ مسئلہ ایبل کے سامنے اٹھایا۔ اس پر اس نے گورنر کے سیکرٹری (یوپی) کو برائے ہدایت لکھا اور اس کے لیے مسٹر ایبل کے خطوط ان دونوں گورنر کے سیکرٹریوں کو ان مقاصد کے لیے لکھے تھے۔ جو ذرا مختلف انداز کے تھے۔ آر ۳/۱/۱۴۹ ایف ایف: ۷۱، ۶۴، ۵۸، ۵۰، ۴۹،

(۲) جہاں تک معلوم ہے صرف دو گورنروں کے سیکرٹریوں نے فائلیں لندن منتقل کیں۔ تب پنجاب سے (جو کہ اب معاینہ کے لیے انڈیا آفس کے ریکارڈ میں نمبر آر ۸۔۷۶۱/۱/۳ کے تحت موجود ہیں) اور چھیالیس بنگال سے (جو کہ اب نمبر آر ۸۶۔ ۱/۲/۳ کے تحت موجود ہیں)۔

ڈاکومنٹ نمبر ۸: محکمہ تعلقات خارجہ حکومت ہندوستان کی طرف سے سیکرٹری آف اسٹیٹ کے لیے ٹیلی گرام ایل/ پی اینڈ جے/۱۰/ ۸/۷ الف ۲۶

نئی دہلی　　　　　　　　　　　　فوری

۲۴/ مارچ ۱۹۴۷ء　　　　　　　　موصول: ۲۴/ مارچ چھ بج کر بیس منٹ صبح

نمبر ۲۳۴۶۔مراسلہ پرنسپل انفارمیشن آفیسر کی جانب سے

مندرجہ ذیل مواد ۵ بجے (جی ایم ٹی) ۲۴/ مارچ ۱۹۴۷ء سے قبل شایع کرنے کے لیے نہیں ہے۔ ذیل میں عزت مآب لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی طرف سے آج تقریب حلف برداری کے موقع پر دیے گئے خطاب (تقریر) کا خلاصہ دیا جارہا ہے۔

آغاز: اگرچہ میرا یقین ہے کہ تقریب حلف برداری کے موقع پر تقریر کرنا کوئی معمول کی بات نہیں ہے، پھر بھی میں آپ کے لیے اور ہندوستان کے لیے چند الفاظ کہنا چاہوں گا۔

یہ عمومی وایسرائے شپ کا عہدہ نہیں ہے جو میں نے سنبھالا ہے۔ ہز میجسٹی کی حکومت کو جون ۱۹۴۸ء تک اقتدار منتقل کرنا ہے، اس کے لیے آئینی انتظامات کیے جانے ہیں اور انتظامیہ کے متعلق کئی پے چیدہ سوالات حل کرنے ہیں۔ ان سب پر عمل درآمد کے لیے وقت درکار ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگلے چند ماہ کے اندر اندر کسی حل کا تلاش کیا جانا ضروری ہے۔

مجھے یقین ہے کہ ہندوستان کا ہر سیاسی لیڈر اسی طرح محسوس کرتا ہے جیسا کہ میں اپنے سامنے کام کی اہمیت کو محسوس کرتا ہوں۔ میں جلد ہی ان کے ساتھ مشورہ کروں گا اور انھیں وہ تمام مدد فراہم کروں گا، جو کہ میرے بس میں ہو سکتی ہے۔ اس دوران میں ہم سے ہر ایک کو کوئی ایسا لفظ کہنے سے گریز کرنا چاہیے یا کسی ایسے اقدام سے پرہیز کرنا چاہیے جو مزید تلخی کا باعث بنے یا معصوموں کو مزید نشانہ بنایا جائے۔ میں بہت لوگوں کو جانتا ہوں جو اس مقصد کو حاصل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ میں ان کے ساتھ ہر ممکن تعاون کروں گا۔

بہت سے ہندوستانی میرے دوست ہیں، ان میں سے کچھ اس وقت بنے تھے جب میں یہاں پچیس سال پہلے آیا تھا۔ میں دہلی ہی میں تھا جہاں میری بیوی اور میرے درمیان منگنی ہوئی۔ تین سالوں کے دوران جب میں جنوب مشرقی ایشیائی کمان میں تھا، میں نے ہندوستانی لڑاکا فوج میں بہت سے دوست بنائے جن کے ساتھ تعلق رکھنے میں مجھے بہت فخر ہے۔

لارڈ ویول کی جانشینی کوئی آسان کام نہ ہوگا، جس نے ہندوستان کو اپنی حکومت کے راستے پر گامزن کرنے کے لیے اتنا کام کیا ہے کہ میں نے اس کی ہمیشہ تعریف کی ہے اور جو کام اس نے شروع کیا تھا اس کو اختتام تک پہنچانے کے لیے میں اپنے آپ کو وقف کردوں گا۔

میں اپنے کام کی مشکلات کی بابت الجھن میں نہیں ہوں، مجھے بڑی تعداد میں عظیم نیک خواہشات کی ضرورت ہوگی اور میں ہندوستان سے اپنی توقعات رکھتا ہوں۔ ❶

ختم شد

ضروری احتیاط! براہ کرم فوری طور پر بعد میں موصول ہونے والے تار کا انتظار کیجیے۔ جس میں آخری لمحے کی ترمیم اگر کوئی ہوئی، شامل ہوگی۔

مواد کو مقررہ وقت سے پہلے جاری نہ کیا جائے۔

انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ کے لیے (براہ کرم اس کی ایک نقل سد ہیر گھوش کے لیے) ٹیکسٹ میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔

حاشیہ ❶: یہ وہ تقریر ہے جو ماؤنٹ بیٹن نے حلف وفاداری کی تقریب کے موقع پر کی اور جس کا حوالہ ۲۴ مارچ ۱۹۴۷ء کے پہلے اندراج میں آیا ہے۔

ڈاکومنٹ نمبر ۱۱: ریئر ایڈمرل وائسکاؤنٹ ماؤنٹ بیٹن آف برما اور پنڈت نہرو کے درمیان ملاقات کا ریکارڈ۔

ماؤنٹ بیٹن کے پیپرز۔ وائسرائے کا انٹرویو نمبر ۳

۲۴ مارچ ۱۹۴۷ء (انتہائی خفیہ)

میں پنڈت نہرو کے انتہائی خلوص سے متاثر ہوا ہوں۔ میں نے ان سے اس استفسار کے ساتھ گفتگو کا آغاز کیا کہ آپ کی رائے میں موجودہ وقت میں ہندوستان کو کون سے سنگین

مسایل کا سامنا ہے؟ انھوں نے مجھ کو جواب دے کر ورطۂ حیرت میں ڈال دیا کہ ملک کی اقتصادی حالت زیادہ گھمبیر ہے، اس پر حقیقی طور پر قابو نہیں پایا جارہا تھا۔ فارورڈ پلاننگ ڈیپارٹمنٹ اٹھارہ ماہ پہلے ہی بند کر دیا گیا تھا اور انھوں نے اس پر بہت تاسف کا اظہار کیا۔ انھوں نے ایک غیر جانب دار آدمی کو اس کا انچارج بنانے کی ضرورت محسوس کی، کیوں کہ مسلم لیگ والے اس تمام جدید منصوبہ بندی کے مخالف ہیں۔ جس کا مقصد ایک متحدہ ہندوستان کے لیے منصوبہ بندی کرنا ہے۔

تب ہم نے کرپس کی پیش کش اور کابینہ مشن کی تاریخ پر گفتگو کی۔ نہرو مشن کے بیان اور لارڈ ویول کے ساتھ نوے فیصد متفق دکھائی دیتے تھے۔ میں نے ان کے اختلافات کو چیلنج کیا اور ان دلایل کو جن کا انھوں نے اظہار کیا، ان کے دلایل معقول تھے۔

میں نے ان سے مسٹر جناح کے بارے میں دریافت کیا، انھوں نے جناح کے کردار کے بارے میں یادگار لفظی تصویر کشی کی۔ انھوں نے مسٹر جناح کو تاریخ میں انتہائی غیر معمولی انسانوں میں سے ایک انسان قرار دیا۔ وہ مالی طور پر کامیاب شخص ہیں، اگرچہ ایک درمیانے درجے کے وکیل ہیں۔ جناح نے زندگی میں کامیابی دیر سے حاصل کی ہے۔ ساٹھ سال کی عمر کو پہنچنے تک وہ سیاسی طور پر کامیاب ہو سکے ہیں۔ نہرو نے جناح کے مسلک کی وضاحت کی، جس کے بارے میں انھوں نے تسلیم کیا کہ اس سے ان کو بہت بڑی کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ ان کی بنیاد ہمیشہ یہ رہی ہے کہ ایسے مثبت قدم اٹھانے سے گریز کیا جائے جن سے ان کے پیروکاروں میں پھوٹ پڑنے کا اندیشہ ہو۔ وہ اجلاس منعقد کرنے اور سوالات کا جوابات دینے سے انکار کرتے ہیں۔ وہ کبھی کوئی ترقی پسند بیان نہیں دیتے، کہیں اس سے مسلمانوں میں اندرونی اختلاف رائے پیدا نہ ہو جائے۔ ان منفی خصوصیات کی بنا پر ان کو مسلمانوں میں مقبولیت عام حاصل ہوئی ہے، اس لیے یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ منطق رواج پا سکے گی۔ (تحریک پاکستان اور انتقال اقتدار، مرتبہ محمد فاروق قریشی)

ڈاکومنٹ نمبر ۲۱: ایبل کا نوٹ،

سرکاری خط و کتابت کی فایل۔ ماؤنٹ بیٹن پیپرز

۲۶ر مارچ ۱۹۴۷ء

وی پی مینن ریفارمز کمشنر کا غیر معمولی طرز زندگی ہے۔ اس کا تعلق مالابار، مدراس

پریذیڈنسی کے زمین دار خاندان سے ہے، لیکن اس نے کم تنخواہ والے کلرک کی حیثیت میں سرکاری ملازم کے طور پر ابتدا کی۔ میرا خیال ہے دو پونڈ ماہانہ پر۔ بعد ازاں وہ مدراس کا ریونیو آفیسر بن گیا، پھر اس نے استعفیٰ دے دیا اور حکومت ہندوستان کے ریونیو آفس میں بہ طور کلرک ملازمت اختیار کر لی۔

وہ ریفامز آفس میں ۱۹۱۴ء تک رہا جہاں اس کا واسطہ آئینی معاملات سے رہا۔ وہ ۱۹۴۲ء سے اس وقت تک اس کا سربراہ ہے۔

وہ گورنر جنرل کے سیکریٹریٹ کا ممبر ہے اور لارڈ لن لتھگو اور لارڈ ویول کو اب اس پر بہت زیادہ اعتماد تھا۔ وہ ایک سے زاید مرتبہ وایسرائے سے بات چیت کرنے کے لیے لندن گیا۔

وہ ہندوستانی آئین پر ہر قسم کی معلومات کا انسائیکلوپیڈیا ہے— اس کا علم اور فیصلے بڑے قیمتی ہیں۔

وہ اب تک اعلا پالیسی کے بارے میں ہر شے سے واقف ہے جو کہ وایسرائے اور انڈیا آفس کے درمیان ہوتی ہے۔ بعد ازاں اس پر اعتماد کرنے میں کوئی کمی ہوگی ❶، کیوں کہ وہ ہندو ہے اور کانگریس کا اس پر دباؤ ناگزیر ہے کہ وہ ان کو (حکومتی حلقوں میں) وقوع پذیر ہونے والے واقعات سے آگاہ کرے۔ اکثر اوقات وہ بہت زیادہ کارآمد ہوتا ہے۔ کانگریس سے حاصل کردہ معلومات، رجحانات اور ردِعمل کی وجہ سے، لیکن اس میں ایک خطرہ بھی ہے کہ وہ ان معلومات کے عوض وایسرائے کے کچھ خفیہ رازوں کو کانگریس تک پہنچادے۔ اگرچہ میرا خیال یہ ہے کہ وہ دانستہ ایسا نہیں کرے گا۔ بہ ہر حال ہندوستانی افسران اب بہت زیادہ مشکل حالات کا سامنا کر رہے ہیں۔ مختلف فرقوں کے درمیان یہ احساسات بہت زیادہ ہے جیسے خانہ جنگی کی کیفیت ہو۔ اگر افسر غیر جانب دار رہنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کو دونوں جانب سے شبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، تب وہ ایک یا دوسری طرف سے تحفظ حاصل کرنے کے لیے مایل ہوتا ہے۔ اس کے فرقے سے تعلق کی وجہ سے مین کانگریس کے عمومی نکتۂ نظر کو درست طور پر جایز سمجھنے میں حق بہ جانب ہے۔

اگر چہ وہ میرا دیرینہ دوست ہے اور وہ ان لوگوں میں شامل ہے جن کو میں دہلی کے لوگوں میں نے پسند کرتا ہوں۔ میں اس کا قایل ہوں کہ اس کو حسب سابق اعتماد میں لینا

ممکن نہیں۔

حاشیہ ❶: یعنی اب آیندہ اس پر اعتماد نہیں کیا جائے گا، جس کے وجوہ بھی اسی مراسلے میں بیان کر دیے گئے ہیں۔ (ا۔س۔ش)

ڈاکومنٹ نمبر ۲۳: سر الیف موڈی (گورنر سندھ) بہ نام ریئر ایڈمرل وا۔کاؤنٹ ماؤنٹ بیٹن آف برما ایل/ پی اینڈ جے/ ۵/ ۲۶۳: الیف الیف ۵-۵۴

ڈی او نمبر ۱۶۵/ ایف آر

گورنمنٹ ہاؤس سندھ

کراچی، ۲۶/ مارچ ۱۹۴۷ء

۲۔ جیسا کہ میں نے عزت مآب سے کہا تھا۔ جب میں کراچی میں آپ سے ملا تھا کہ میرے وزرا اچانک سیاسی صورت حال پر چوکنا ہو گئے۔ اس کی وجہ وہ رپورٹ ہے جو ان کو ایک مسلمان آئی سی ایس افسر نے دی تھی۔ یہ مسلمان افسر سرکاری کام سے پنجاب گیا تھا۔ اس نے رپورٹ دی کہ پنجاب کے مسلمانوں اور سکھوں میں سمجھوتا کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے اور دونوں فریق ایسی باتیں کر رہے ہیں کہ اندرونی خانہ جنگی کا دور ابھی آنے والا ہے۔ اس مسلمان افسر کی رپورٹ کے مطابق پنجاب کے مسلمان اس سے خائف تھے کہ خانہ جنگی کے لیے سکھ مسلمانوں سے نسبتاً زیادہ بہتر منظم ہیں اور ان کو مشرقی پنجاب کی سکھ ریاستوں کی افواج کی حمایت بھی حاصل ہوگی۔ یہی وجہ تھی کہ سندھ مسلم لیگ پارٹی نے فوراً ایک اجلاس بلایا اور اس میں اپنے ممبران کی ایک کمیٹی بنائی، جس کو اختیار دیا گیا کہ وہ صوبے کے اپنے چھ ممبر نامزد کر سکتی ہے جو لازمی طور پر مسلم لیگ کے ممبر ہوں، اس کا کام سندھ کے لیے آئین تیار کرنا ہوگا جس کے مطابق برطانوی حکومت اقتدار منتقل کر سکے۔ انھوں نے حکومت سندھ سے کہا کہ

(۱) فوری طور پر سندھ کے ہوم گارڈ قایم کیے جائیں اور ان کو مسلح کیا جائے۔

(۲) سندھ پولیس رینجرز کی تعداد میں اضافہ کیا جائے (سندھ پولیس رینجرز ایک نیم فوجی ادارہ تھا جو پولیس کے ان سپاہیوں پر مشتمل تھا جن کو حروں کی سرکوبی کے لیے رکھا گیا تھا)، تا کہ وہ برطانوی افواج کے سندھ سے انخلا کے بعد اس کے فرایض سنبھال سکیں۔

(۳) دیہات میں حفاظتی انتظامات کیے جائیں۔

۳۔ میں سمجھتا ہوں اس ریزولیوشن کو خفیہ رکھنا مقصود تھا لیکن اسی شام کو ایک وزیر نے یہ خبر اخبار کو دے دی۔ دوسرے روز میرے ایک یا دو وزیروں نے اس کا ذکر مجھ سے کیا۔ وہ اس پر بالکل خوش دکھائی نہیں دیتے تھے۔ میں نے ان سے اتفاق کیا۔ وہ اس امکان کو نظر انداز نہیں کر سکے کہ برطانوی حکومت کے تازہ ترین بیان اور کرپس کی پیش کش کے مطابق حکومت اپنے اختیارات سندھ کے حوالے کر دے۔ اس بات کا امکان بھی تھا کہ ہم کو اگلے سال امن برقرار رکھنے کے لیے خاص انتظامات کرنے پڑیں، لیکن میں نے تجویز کیا کہ آئین ساز اسمبلی کی روایت کے مطابق بہتر ہوتا کہ مذکورہ کمیٹی سندھ اسمبلی منتخب کرتی، بجائے اس کے کہ مسلم لیگ پارٹی اسے تشکیل دیتی۔ وزیروں نے میری رائے سے اتفاق کیا اور اس کے نتیجے میں ایک ریزولیوشن کا مسودہ تیار کیا گیا جس کو سندھ اسمبلی میں پیش کیا جانا تھا۔

۴۔ میں نے یہ بھی تجویز کیا کہ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے جناح کو اعتماد میں لینا چاہیے اور آپ کو مطلع کر دیا جائے کہ کیا کچھ سوچا گیا ہے۔ انھوں نے دونوں تجاویز سے اتفاق کیا۔ جناح نے فون پر اس منصوبے کو منظور کیا لیکن وہ اس وقت تک کوئی حتمی بات نہیں کہہ سکتے جب تک کہ اپنی ورکنگ کمیٹی کی رائے حاصل نہ کرلیں۔ میں نے مسلم لیگ پارٹی کے ریزولیوشن اور اس ریزولیوشن کا مسودہ جو کہ سندھ اسمبلی میں پیش کیا جانا تھا سر ایرک میویل کو دیا۔ موجودہ صورت حال یہ ہے کہ فی الوقت مسلم لیگ پارٹی کی طرف سے نام زد کی گئی کمیٹی جو وزرا، اسپیکر اور ایک یا دو مسلم ایم ایل اے پر مشتمل تھی، ختم ہو چکی ہے۔

(تحریک پاکستان اور انتقال اقتدار: ص ۵۲-۵۱)

۲۷ مارچ ۱۹۴۷ء:

ڈاکومنٹ نمبر ۲۷: مولانا آزاد اور ریئر ایڈمرل واسکاؤنٹ ماؤنٹ بیٹن آف برما کے درمیان ملاقات کا ریکارڈ۔ ویسرائے کے انٹرویوز کا ریکارڈ نمبر ۱۴۔

ماؤنٹ بیٹن پیپرز (انتہائی خفیہ)

مولانا آزاد دل ربا شخصیت ہیں، حال آں کہ وہ انگریزی سمجھتے ہیں لیکن انھوں نے اس کے باوجود مجھ سے ایک مترجم کے ذریعے گفتگو کی۔ انھوں نے مجھ کو بتایا کہ وہ اس خاص موقع پر کانگریس کی صدارت سے علاحدہ نہ ہوتے تو کانگریس کابینہ مشن پلان منظور کر لیتی۔

انھوں نے کہا پہلا الزام لازمی طور پر کانگریس پر آتا ہے، اگر چہ یہ مسلم لیگ تھی جو ضد پر قایم تھی۔ ان کا خیال ہے کہ اس کا موقع ہے کہ میں (وایسراے) مسٹر جناح کو ''ڈی فلیٹ'' کر سکوں، یہ مقصد کچھ تو ان کی خوش آمد کر کے اور کچھ اس طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ ان کے پاس اپنے موقف پر قایم رہنے کے لیے در حقیقت کوئی ٹھوس شے نہیں ہے۔ ان کا ایک بڑا مقصد مرکزی حکومت میں اپنے وزرا کو شامل کرنا تھا اور وہ کسی طور پر یہ نہیں چاہتے کہ ان وزارتوں کو چھوڑ دیا جائے۔

(وایسراے کی اس ملاقات کا بقیہ حصہ چوتھی اسٹاف میٹنگ کی کارروائی میں شامل ہے۔)

ڈاکومنٹ نمبر ۲۸: نواب آف بھوپال کی ریئر ایڈمرل وائکاؤنٹ ماؤنٹ بیٹن آف برما سے ملاقات

(جو گورنر بمبئی کی وساطت سے ہوئی)

ٹیلی گرام ماؤنٹ بیٹن پیپرز۔ سرکاری خط وکتابت کی فایل

انتقال اقتدار، حصہ اول (الف)

فوری۔ خفیہ

۲۷ر مارچ ۱۹۴۷ء رات دس بج کر چالیس منٹ پر

موصول: ۲۸ر مارچ ۱۹۴۷ء صبح ایک بج کر تیس منٹ پر

نمبر سی ۱۴۱۔ میں نے مسٹر جناح سے چار گھنٹوں تک بات چیت کی۔ وہ چار یا پانچ دنوں تک دہلی جا رہے ہیں۔ اب اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ مسلمان کسی قسم کی یونین گورنمنٹ پر رضامند ہوں۔ اگر حکومت برطانیہ تقسیم ہند پر راضی ہوتی ہے اور پاکستان کے مطالبے کو منظور کرتی ہے تو مجھے یہ جان کر خوشی ہوگی کہ مسٹر جناح کو دولت مشترکہ میں رہنے پر راضی کیا جا سکتا ہے۔

جب وقت آئے گا تو وہ اس سے اتفاق کریں گے؟ لیکن قدرتی طور پر اس مرحلے پر اس کا عام اعلان یا ذکر کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس قسم کا اعلان قبل از وقت ہوگا۔

جب وایسراے مسٹر جناح سے ملاقات کریں گے تو مجھ یقین ہے کہ وایسراے جناح کو یہ شبہ نہیں ہونے دیں گے کہ میں نے وایسراے کو اس سلسلے میں کوئی اطلاع دی ہے۔

ڈاکومنٹ نمبر ۲۹: وائسرائے کی چوتھی اسٹاف میٹنگ کی کارروائی

ماؤنٹ بیٹن پیپرز

۲۸ر مارچ صبح دس بجے منعقد ہونے والی اس میٹنگ میں جن افراد نے شرکت کی ان کے نام یہ ہیں۔ ریئر ایڈمرل وائسکاؤنٹ ماؤنٹ بیٹن آف برما، لارڈ اسمے، سر میویل، مسٹر ایبل، مسٹر کرسٹائن، کرنل کیوری، کیپٹن برک مین، مسٹر کیمبل جانسن، لیفٹیننٹ کرنل ارسکن کروم۔

شق نمبر ۷

ہندوستان کی مسلح افواج:

وائسرائے نے کہا کہ انھوں نے گزشتہ شام ہندوستان کے کمانڈر انچیف اور فوجی کمانڈروں کو ڈنر پر مدعو کیا تھا۔ فیلڈ مارشل آکن لک نے کہا کہ ہندوستان کی افواج کو اطمینان بخش تقسیم کے لیے آٹھ سے دس برس درکار ہوں گے۔ مسلم لیگ کی اعلان کردہ پالیسی یہ تھی کہ وہ متحدہ فوج رکھنا نہیں چاہتی، لیکن فوج کو فرقہ وارانہ طور پر تقسیم کرنے کا یقینی مطلب یہ تھا کہ غیر مسلم پارٹیاں زیادہ مضبوط ہو جائیں گی، وہ اس قابل ہو جائیں گی کہ جنرل ہیڈکوارٹر سپلائی کے ذخیروں اور افسروں کی وسیع اکثریت کو اپنے قبضے میں لے لیں۔ اس صورت میں مسلمانوں کو بہت کم حصہ ملے گا۔ ان کا (وائسرائے) ارادہ تھا کہ وہ یہ بات مسٹر جناح کے علم میں لائیں۔

لارڈ اسمے نے بتایا کہ پوری ہندوستانی فوج میں ایک بھی مکمل مسلمان یونٹ نہیں ہے۔ جب کہ کئی مکمل یونٹ کلی طور پر دوسرے فرقوں کے افراد پر مشتمل ہیں۔

وائسرائے نے زور دے کر کہا کہ جس کسی کے پاس متحدہ فوج کا کنٹرول ہوگا، یا جس کے پاس موثر ترین فوج ہوگی، وہی ہندوستان پر قبضہ برقرار رکھ سکے گا۔ ہندوستان کی مسلح افواج جن میں بحریہ اور فضائیہ بھی شامل تھی، سودے بازی کا ایک بڑا مسئلہ بن گئی تھیں۔ ان کے نزدیک ”کابینہ مشن منصوبہ“ کی ایک ممکنہ خامی یہ بھی تھی کہ اگر فوج کو فسادات روکنے اور گڑبڑ بند کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تو مرکزی حکومت کو اقلیتی جماعت پر مکمل گرفت کا موقع مل جاتا تھا۔ اس کا حل ڈھونڈنا ضروری تھا کہ اس قسم کی صورت حال پیدا نہ ہونے پائے۔ ہوسکتا ہے کہ ہندوستان کی فوج کو اندرونی طور پر استعمال کرنے کے لیے صرف

دونوں بڑی جماعتوں کی اکثریت کا ووٹ حاصل کرنا ضروری ہو۔ اگرچہ مقامی ٹروپس صوبائی حکومتوں کے ماتحت ہوتے، اس کے باوجود مرکزی حکومت ٹروپس کو تعینات کر کے بہت زیادہ اثر حاصل کر لیتی۔ ہوسکتا تھا کہ اتفاق رائے پیدا ہونے سے قبل فوجوں کی تعیناتی خاص مقامات پر ہوتی یا اسی قسم کے تحفظات کے لیے (حکومت) کوئی قدم اٹھاتی۔

لارڈ اسمے نے بتایا کہ بنیادی طور پر ایسے تحفظات کی اس وقت تک کوئی قدر نہیں جب تک کہ دونوں بڑی جماعتیں تعاون نہ کریں۔ اگر یہ تعاون نہیں کرتیں، تو قواعد اور تحفظات دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ وائسرائے نے کہا۔ اگرچہ یہ بڑی حد تک درست ہے مگر اس کے باوجود ہنوز ان کی خواہش ہے کہ ممکنہ تحفظات کے بارے میں جائزہ لیا جائے تاکہ وہ ان کو مسٹر جناح کے سامنے پیش کر سکیں۔

وائسرائے نے مندرجۂ ذیل اقدامات کیے:

(۱) سی وی ایس (چیف آف دی وائسرائے اسٹاف) سے کہا گیا کہ وہ غور کر کے بتائیں کہ کابینہ مشن منصوبہ میں کیا تبدیلیاں کی جائیں جن کے ذریعے مسلح افواج کو اندرون ملک بہ خوبی کام میں لایا جا سکے۔

(۲) سی وی ایس سے مزید کہا گیا کہ ہندوستانی مسلح افواج کو فرقہ وارانہ بنیادوں پر تقسیم کے ممکنہ نتائج پر بھی غور کریں اور اس موضوع پر ان (وائسرائے) کو مختصر طور پر بتائیں۔

(۳) پرسنل سیکریٹری کو ہدایت کی کہ وہ ایک نوٹ بک رکھیں جس میں کھلے کاغذات شامل کیے جا سکیں، یہ نوٹ بک اس جیسی ہو جو اس نے جنوب مشرقی ایشیا کمانڈ کے لیے رکھی تھی اور اس میں ایسے موضوعات کا اندراج کیا جائے۔

شق نمبر ۱۱

وائسرائے نے اُس ٹیلی گرام کی طرف توجہ دلائی جو نواب بھوپال کی طرف سے موصول ہوا تھا، اس میں انھوں (نواب بھوپال) نے مسٹر جناح کے ساتھ چار گھنٹے کی گزشتہ روز کی ملاقات کا حال بیان کیا تھا۔ اس میں مسٹر جناح کی اس تقریر کا حوالہ بھی دیا گیا تھا جو اخبار میں شائع ہو چکی ہے۔ اس میں پاکستان کے قیام کی بنیاد پر صلح کرنے کا ذکر تھا۔

مسٹر ایبل نے کہا کہ نواب بھوپال کے ٹیلی گرام میں ذکر موجود ہے کہ مسٹر جناح کو مطالبۂ پاکستان تسلیم کر کے دولت مشترکہ میں رہنے پر قایل کیا جا سکتا ہے، عین ممکن ہے کہ یہ ''کانفرنس سے پہلے'' کی پیش کش ہو جو کہ مسٹر جناح کے غیر مفاہمانہ رویے کو دور کرنے کے لیے ہو، مسٹر جناح کا یہ رویہ ان کی تقریر سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔

وایسرائے نے اپنی اس پالیسی کا اعادہ کیا کہ وہ ہندوستان کے مختلف علاقوں کے نمایندوں سے یہ پوچھنا پسند نہیں کریں گے کہ وہ دولت مشترکہ میں شامل رہیں گے یا نہیں۔ البتہ یہ الگ بات ہے کہ مسٹر جناح اور ریاستوں کے والی کابینہ مشن منصوبہ اس شرط پر منظور کرلیں کہ وہ دولت مشترکہ سے قریبی روابط رکھیں گے۔

وایسرائے نے کہا کہ مسٹر جناح کے ساتھ ان کی پہلی ملاقات میں (مسٹر جناح نے وایسرائے کی پیش کش کو قبول کرلیا تھا کہ وہ خطوط کے ذریعے نہیں بلکہ اخبارات کے ذریعے انٹرویو دیں گے) کہا تھا کہ انھیں اپنا ذہن مکمل طور پر کھلا رکھنا چاہیے اور مسٹر جناح سے ان کے خیالات جاننے کے متمنی ہیں۔ وہ مسٹر جناح کو مطلع کریں گے کہ پاکستان کے قیام میں تقسیم کا یہی اصول پنجاب اور بنگال کی تقسیم پر بھی لاگو ہوگا۔

سر ایرک میویل نے اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ کلکتہ کے بغیر پاکستان غیر مکمل رہے گا۔ اس پر وایسرائے نے جواب دیا کہ اس کی جگہ مشرقی پاکستان کے لیے چٹا گانگ کافی ہے۔

مسٹر ایبل نے کہا کہ پاکستان کے ناقابل عمل ہونے کے بارے میں مسٹر کپلینڈ کی تصنیف ''مسئلہ ہندوستان'' (The Indian Problem) میں ایک عمدہ مدلل خلاصہ ہے۔

وایسرائے نے کہا کہ ان کو مولانا آزاد سے معلوم ہوا ہے کہ لارڈ ویول نے کابینہ مشن منصوبے کا طویل المیعاد حصہ مسٹر جناح کو قبول کرنے کی پیش کش کی تھی تا کہ مسلم لیگ عبوری حکومت میں شامل ہو۔ اگرچہ مسٹر جناح نے اس کا براہِ راست جواب نہیں دیا، لیکن ان کی طرف سے عبوری حکومت میں (مسلم لیگ) ممبروں کا تقرر اس کا غماز تھا کہ انھوں نے یہ شرط منظور کرلی ہے۔ اس لیے مولانا آزاد نے تجویز پیش کی کہ وایسرائے مسٹر جناح کو یہ انتخاب کرنے کا موقع دے کہ یا تو وہ کابینہ مشن منصوبے کو عملی صورت اختیار کرنے دیں یا

پھر عبوری حکومت سے اپنے نمایندے واپس لے لیں۔ان متبادل (تجاویز) پر غور کرنے اور ان کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لیے مسٹر جناح کے واسطے انتہائی پریشان کن اور ناموزوں وقت ہوگا۔وایسرائے نے کہا کہ مولانا آزاد نے اس سلسلے میں کہا ہے کہ ان کی رائے میں کانگریس پارٹی ذرا آگے بڑھ کر کابینہ مشن منصوبے کو بلا تامل منظور کرلے گی، بہ شرطے کہ مسلم لیگ پہل کرتے ہوئے اس کو منظور کرنے کا اعلان کردے۔

مسٹر ایبل نے کہا کہ یہ ایک لحاظ سے درست معلوم ہوتا ہے کہ مسلم لیگ کی حکومت میں شمولیت ڈھونگ ہے۔دوسری طرف انھوں نے ہمیشہ کہا ہے کہ وہ کابینہ مشن منصوبہ منظور کرنے کے لیے تیار ہیں بہ شرطے کہ کانگریس اس کو بغیر استثنیات کے قبول کرے۔.......

(تحریک پاکستان اور انتقال اقتدار: ص ۵۸-۵۵)

ڈاکومنٹ نمبر ۳۴: وایسرائے کی چھٹی اسٹاف میٹنگ کی کارروائی باؤنٹ پیپرز۔

ضمیمہ نمبر ۳۴

(انتہائی خفیہ)

۲۱/مارچ ۱۹۴۷ء

کابینہ مشن منصوبہ کا متبادل

وایسرائے نے کہا کہ ان کا بنیادی مقصد یہ رہا ہے اور یہی رہے گا کہ وہ ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں کو مکمل طور پر قایل کریں کہ ہندوستان کے مستقبل کے لیے کابینہ مشن منصوبہ منظور کرلیا جائے۔ان کو یقین کامل ہے کہ یہی منصوبہ بہترین حل ہے۔بہ ہر حال اس منصوبے کو منظور نہ کرنے کی صورت میں متبادل منصوبہ بندی لازمی طور پر کی جائے گی۔وہ فی الوقت مندرجہ ذیل متبادل خطوط پر سوچ بچار میں مصروف ہیں!

۱۔ایک ایسا منصوبہ جس کی بروح تقسیم ہو، چند امور پر مرکزی اختیار ہو، یہ منصوبہ تجربے کے طور پر شروع کیا جائے اور اس پر مستقبل قریب میں عمل شروع کیا جائے۔

۲۔تقسیم کے نتیجے میں جو تین اکائیاں معرض وجود میں آئیں گی ان کی صورت اس طرح ہوگی۔

(الف) ہندوستان: اس میں ہندو آبادی کی اکثریت کے علاقے شامل ہوں گے۔

(ب) پاکستان: اس میں مسلمانوں کی آبادی کے اکثریتی علاقے شامل ہوں گے۔

(ج) ہندوستان کی ریاستیں۔

۳۔ ہر اکائی کو ڈومینین کا درجہ دیا جائے گا۔ جہاں تک ریاستوں کا تعلق ہے تو بڑی ریاستوں کو ڈومینین کا درجہ حاصل ہوگا جب کہ چھوٹی ریاستوں کو موزوں اکائی کے ساتھ الحاق کرنا ہوگا۔

۴۔ پاکستان کا مطالبہ منظور ہونے کی صورت میں اسی اصول کی بنا پر پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا جواز بھی ہوگا۔

۵۔ منصوبے کو مئی ۱۹۴۷ء میں عملی جامہ پہنایا جائے گا اور اس کو جون ۱۹۴۸ء تک تجرباتی طور پر آزمایا جائے گا۔

۶۔ مرکزی اتھارٹی (جسے ''مرکزی حکومت'' یا ''مرکزی کونسل'' کے نام سے پکارا جائے گا) کے پاس دفاع، امور خارجہ، مواصلات، خوراک اور خزانے کے محکمے ہوں گے۔

۷۔ مرکزی اتھارٹی اور ہندوستان کا دارالخلافہ دہلی ہوگا۔

۸۔ جو خاص محکمے مرکزی حکومت کی تحویل میں ہوں گے ان کو ایک کونسل یا بورڈ چلائے گا۔

۹۔ وائسرائے کو ان مخصوص محکموں کے بارے میں کونسل کے فیصلوں کو ویٹو کرنے کا اختیار بدستور جاری رہے گا۔

۱۰۔ جون ۱۹۴۸ء سے تین ماہ قبل یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ مرکزی اتھارٹی اس تاریخ کے بعد باقی رہے یا نہیں۔

وائسرائے نے کہا کہ اس منصوبے کی خوبیاں یہ ہیں کہ اس سے مکمل انتقال اقتدار موجودہ اندازے سے نسبتاً زیادہ جلدی عمل پذیر ہو جاتا ہے، اس سے تمام جماعتیں فایدہ اٹھائیں گی، اور عبوری عرصے میں برطانیہ کی مدد جاری رہ سکے گی جو کہ ہندوستان کی بہتری کا متمنی ہے اور اس سے کم از کم ہندوستان کو ڈومینین کا درجہ حاصل کرنے کے فواید کا تجربہ حاصل ہوگا۔ اس سے پہلے کہ منصوبے پر مزید پیش رفت ہو وہ منصوبے کے قابل عمل ہونے کے بارے میں مطمئن ہونا چاہتا ہے۔

سر کونرڈ کورفیلڈ نے کہا کہ جہاں تک ریاستوں کا مسئلہ ہے وہ منصوبے کے بنیادی خیال سے متفق ہے اور یہ قابل عمل ہے۔

مسٹر ایبل نے ان دشواروں کا ذکر کیا جو کسی قسم کے پاکستان کی حکومت کے قیام سے

اس دوران پیدا ہوسکتی تھیں۔ سر کونرڈ کورفیلڈ نے اس سے اتفاق کیا اور کہا کہ صوبوں کے سوا کوئی طاقت پاکستان سے دست بردار نہیں ہوگی۔

سر ایرک میویل نے کہا کہ اس کے خیال میں ''ڈومینین اسٹیٹس'' والا فارمولا مکمل طور پر تسلی بخش نہیں ہے۔ وائسرائے نے اس سے اتفاق کیا اور کہا کہ کوئی اور فارمولا بنانا پڑے گا۔

لارڈ اسمے نے خیال ظاہر کیا کہ اصل دشواری مرکزی اتھارٹی بنانے میں پیش آئے گی۔ مسٹر ایبل نے کہا کہ مسلم لیگ کو اس پر مجبور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ مرکزی محکموں میں دلچسپی لے۔ اس نے مزید کہا کہ تقسیم ہونے والے صوبوں کی حدود کے تعین کے لیے کافی وقت درکار ہوگا۔

وائسرائے نے کہا کہ اس کے خیال میں مشکل ترین مرحلہ وہ ہوگا جب آخری فیصلہ کرنا ہوگا کہ مرکزی اتھارٹی کو ۱۹۴۸ء کے بعد بھی برقرار رکھا جائے یا نہیں۔ اس سلسلے میں اس نے ''ہنسارڈ'' میں شایع ہونے والی تقریروں کا حوالہ دیا جو ہندوستان کے بارے میں مسٹر ڈلیاکس اور مسٹر چرچل نے بحث کے دوران کی تھیں۔ انھوں نے تجویز کیا تھا کہ اقوام متحدہ کے ذریعے کوئی نظام قایم کیا جائے۔

وائسرائے نے کہا کہ ہندوستان کے مستقبل کا آئین بنانے کے لیے تین نمونے موجود ہیں ریاست ہائے متحدہ امریکا، آسٹریلیا کی دولت مشترکہ، جہاں حال ہی میں ریاستوں نے وفاقی اختیارات مرکزی حکومت کو سونپ دیے ہیں اور یونین آف سوویت سوشلسٹ ری پبلک، جہاں یوکرائن کو مثال کے طور پر اعلا انتظامی اختیارات حاصل تھے لیکن اس کے باوجود اس کو مرکز میں نمایندگی حاصل تھی۔

وائسرائے نے اپنے اسٹاف کے سینیئر ممبروں سے کہا کہ وہ مندرجۂ بالا منصوبے پر مزید غور کریں اور اس کی دشواریوں کو دیکھیں۔

(تحریک پاکستان اور انتقال اقتدار: ص ۶۸-۶۶)

حالات پر مولانا آزاد کا تبصرہ:

ماؤنٹ بیٹن نے اس ذہنی بیداری اور تیز رفتاری کے ساتھ کام کیا تھا کہ کانگریس کے رہنماؤں کے فکر کی نہ صرف باگ ڈور موڑ دی تھی، بلکہ انھیں تقسیم کو تسلیم کر لینے پر ایک حد

تک آمادہ کرلیا تھا۔ وقت کی اس رفتار پر مولانا ابوالکلام کی نظر تھی۔ مولانا نے حالات پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی۔ مولانا فرماتے ہیں:

"اب جب کہ جواہر لال اور سردار پٹیل دونوں تقسیم کے موافق ہو گئے تھے میری امید گاندھی جی سے وابستہ ہوگئی تھی۔ اس زمانے میں وہ پٹنہ میں مقیم تھے۔ اس سے پہلے کچھ مہینے انھوں نے نواکھالی میں گزارے تھے، جہاں کے مقامی مسلمان ان سے بہت متاثر ہوئے تھے اور ہندو مسلم اتحاد کی ایک نئی فضا پیدا ہوگئی تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملنے دلی آئیں گے اور وہ ۳۱ر مارچ کو دلی آ بھی گئے، میں فوراً ان سے ملنے گیا۔ پہلا جملہ جو انھوں نے مجھ سے کہا وہ یہ تھا:

"تقسیم اب واقعی ایک خطرہ بن گئی ہے۔ ولبھ بھائی اور جواہر لال نے تو شاید ہتھیار ڈال دیے ہیں، تمہارا کیا ارادہ ہے، تم بھی بدل گئے سو یا تم میرا ساتھ دو گے۔"

میں نے جواب دیا:

"میں جیسے پہلے تقسیم ملک کے خلاف تھا، اب بھی ہوں، بلکہ میں تو کہوں گا کہ تقسیم کا جتنا سخت مخالف میں اب ہوں اتنا پہلے کبھی نہ تھا، مگر میں اس بات سے بے حد پریشان ہوں کہ جواہر لال اور سردار پٹیل نے ہار مان لی ہے یا جیسا آپ نے فرمایا ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ اب مجھے جو امید ہے وہ آپ سے ہے۔ اگر آپ نے استقلال کے ساتھ تقسیم کی مخالفت کی تو ہم اب بھی بچ سکتے ہیں، لیکن آپ بھی دب گئے تو مجھے ڈر ہے کہ ہندوستان تباہ ہو جائے گا۔"

گاندھی جی نے کہا:

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے! اگر کانگریس تقسیم کو تسلیم کرے گی تو وہ صرف میری لاش کو روند کر کرے گی۔ جب تک کہ میرے جسم میں جان ہے میں تقسیم پر کبھی راضی نہ ہوں گا اور اگر میرا بس چلا تو کانگریس کو بھی راضی نہیں ہونے دوں گا۔"

"اسی روز بعد میں گاندھی جی ماؤنٹ بیٹن سے ملے، دوسرے دن ان کی پھر ملاقات ہوئی۔ ۲ر اپریل کو وہ ایک بار پھر ملے۔ پہلی ملاقات سے واپسی کے فوراً بعد پٹیل گاندھی جی کے پاس آئے، گاندھی جی نے خود کچھ مہینے پہلے یہی تجویز کیا تھا، میں نے انھیں یاد دلایا کہ

قوموں کی زندگی میں دو تین سال کی مدت کوئی بڑی مدت نہیں ہوا کرتی، اگر ہم دو تین سال انتظار کرلیں تو مسلم لیگ مصالحت پر مجبور ہوجائے گی۔ میں جانتا تھا کہ اگر فیصلہ اس وقت کیا گیا تو تقسیم ناگزیر ہوگی، دو تین سال بعد کسی بہتر حل کی توقع کی جاسکتی ہے، گاندھی جی نے میری تجویز کورد نہیں کیا لیکن انھوں نے کچھ بہت دل چسپی بھی نہیں لی۔

اس اثنا میں ماؤنٹ بیٹن نے تقسیم سے متعلق اپنی تجویز مرتب کرلی تھی، اب انھوں نے برطانوی حکومت سے گفتگو کرنے اور اس کی منظوری حاصل کرنے کے لیے لندن جانے کا فیصلہ کیا۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ وہ اپنے منصوبے کے لیے کنزرویٹو پارٹی کی تائید بھی حاصل کرلیں گے۔ کنزرویٹو پارٹی نے کیبنٹ پلان کی اس بنا پر مخالفت کی تھی کہ اس سے مسلم لیگ کا تقسیم کا مطالبہ پورا نہ ہوتا تھا۔ اب جب کہ ماؤنٹ بیٹن کی تجویز کی بنیاد ہی تقسیم پر تھی تو ظاہر ہے کہ یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ مسٹر چرچل اس کی حمایت کریں گے۔

ملک کو تقسیم سے بچانے کی آخری کوشش:

مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں:

''کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ۴ مئی کے جلسے کے بعد میں شملہ چلا گیا۔ چند روز بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن بھی وہیں آگئے۔ وہ لندن کے لیے روانہ ہونے سے پہلے چند روز آرام کرنا چاہتے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ ۱۰ مئی کو دلی واپس جائیں اور ۱۸ مئی کو لندن کے لیے روانہ ہوجائیں، میں نے سوچا کہ کیبنٹ مشن پلان کو بچانے کی آخری کوشش کرلوں، چناں چہ ۱۴ مئی کی رات کو میں ان سے ملا۔ تقریباً ایک گھنٹے تک گفتگو جاری رہی، میں نے ان سے اپیل کی کہ وہ کیبنٹ مشن پلان کو دفن نہ کریں۔ میں نے کہا کہ ہمیں صبر سے کام لینا چاہیے کیوں کہ اس پلان کو کامیاب بنانے کی امید اب بھی باقی ہے۔ اگر ہم نے عجلت سے تقسیم کو تسلیم کرلیا تو اس سے ہندوستان کو ایک مستقل نقصان پہنچے گا۔ ایک بار ملک تقسیم ہوگیا تو پھر کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے اور تقسیم کو مسترد کرنے کا بھی امکان نہ ہوگا۔

میں نے ماؤنٹ بیٹن سے یہ بھی کہا کہ غالباً مسٹر اٹلی اور ان کے ساتھی کیبنٹ مشن پلان کو آسانی سے ترک نہیں کریں گے، کیوں کہ اسے ان لوگوں نے خود بڑی کاوش کے بعد

تیار کیا تھا۔ اگر ماؤنٹ بیٹن نے بھی اس سے اتفاق کیا اور احتیاط سے کام لینے پر زور دیا تو کابینہ کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اب تک کانگریس اس پر اصرار کر رہی تھی کہ ہندوستان کو فوراً آزاد کیا جائے۔ اب خود کانگریس ہی یہ چاہتی ہے کہ سیاسی مسئلے کا حل دو ایک سال کے لیے ملتوی رکھا جائے۔ ظاہر ہے اگر برطانیہ کانگریس کی اس فرمایش پر عمل کرے تو اس پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔ میں نے ماؤنٹ بیٹن کو معاملے کے ایک اور پہلو کی طرف توجہ دلائی، وہ یہ کہ اگر اب برطانیہ نے ہندوستان کو آزادی دینے میں عجلت کی تو غیر جانب دار لوگ یہی نتیجہ نکالیں گے کہ برطانیہ ہندوستان کو ایسے حالات میں آزاد کرنا چاہتا تھا جب وہ اس سے پورا پورا فایدہ نہ اٹھا سکے۔ ہندوستان کی خواہش کے خلاف تقسیم پر اصرار کرنے سے شبہ ہوگا کہ برطانیہ کی نیت صاف نہیں ہے۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مجھے یقین دلایا کہ وہ برطانوی کابینہ کے سامنے اصل اور صحیح حال پیش کریں گے اور وہ سب کچھ بیان کر دیں گے جو پچھلے دو مہینوں میں انھوں نے دیکھا سنا ہے۔ وہ کابینہ کو اس سے بھی مطلع کریں گے کہ کانگریس کا ایک اہم طبقہ یہ چاہتا ہے کہ اس مسئلے کو دو ایک سال کے لیے ملتوی رکھا جائے۔ انھوں نے مجھے یقین دلایا کہ وہ مسٹر اٹلی اور سر اسٹیفورڈ کرپس کو بتا دیں گے کہ اس معاملے میں میری راے کیا ہے۔ کسی قطعی فیصلے پر پہنچنے کے لیے برطانوی حکومت کے پاس یہ سارا مواد موجود ہوگا۔

میں نے ماؤنٹ بیٹن سے یہ بھی کہا کہ وہ تقسیم کے ممکن نتائج کو بھی ذہن میں رکھیں۔ تقسیم کے بغیر ہی کلکتہ، نواکھالی، بہار، بمبئی اور پنجاب میں فسادات ہوئے ہیں۔ ہندوؤں نے مسلمانوں پر مسلمانوں نے ہندوؤں پر حملے کیے ہیں۔ اس فضا میں اگر ملک تقسیم ہوا تو خون کی ندیاں بہہ جائیں گی اور اس خون خرابے کی ذمے داری انگریزوں پر ہوگی۔ بغیر کسی تامل کے ماؤنٹ بیٹن نے فوراً جواب دیا:

> ''میں اس ایک معاملے میں تو آپ کو پورا یقین دلانا چاہتا ہوں کہ فسادات اور خون ریزی بالکل نہیں ہونے دوں گا۔ میں سپاہی ہوں، ایک بار جب تقسیم اصولاً مان لی جائے گی تو میں احکامات جاری کر دوں گا کہ ملک میں کہیں فرقہ وارانہ فساد نہ ہونے پائیں اور اگر اس قسم کی کوئی تحریک ہوئی تو میں سخت سے سخت قدم اٹھاؤں گا اور ابتدا ہی میں فساد کو دبا دوں گا۔ اس کام کے

لیے میں فوجی پولیس پر بھی بھروسا نہیں کروں گا، بلکہ میں بلاواسطہ فوج اور ہوائی بیڑے سے کام لوں گا اور ٹینک اور ہوائی جہازوں کے ذریعے شرارت کرنے والوں کو کچل ڈالوں گا۔"

لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے گفتگو کا میرے اوپر یہ اثر ہوا کہ وہ ذہن میں تقسیم کا کوئی صاف نقشہ لے کر لندن نہیں جا رہے ہیں اور انھوں نے کیبنٹ پلان کو بلائے طاق نہیں رکھا دیا ہے۔ بعد کے واقعات نے مجھے اپنی رائے بدلنے پر مجبور کیا۔ جس طریقے سے انھوں نے بعد کو عمل کیا اس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ فیصلہ کر چکے تھے اور لندن اسی نیت سے جا رہے تھے کہ برطانوی کابینہ کو ہندوستان کی تقسیم مان لینے پر آمادہ کر سکیں۔

(انڈیا ونس فریڈم (اردو): ص۸۵-۲۸۴)

یکم اپریل ۱۹۴۷ء: گاندھی جی نے یکم اپریل کو دوسری مرتبہ ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات کی اور پیش کش کی کہ موجودہ عبوری حکومت ختم کر کے مسٹر جناح کو کابینہ بنانے کی دعوت دی جائے اور وہ تمام کابینہ مسلمانوں پر مشتمل بنا لے۔ گاندھی جی نے یقین دلایا کہ وہ یہ پیش کش سنجیدگی سے کر رہے ہیں۔ لیکن ماؤنٹ بیٹن نے گاندھی جی کی پیش کش کو مسٹر جناح تک نہیں پہنچایا۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کا ذکر کیمبل جانسن نے "مشن ودتھ ماؤنٹ بیٹن" میں بھی نہیں کیا۔ دراصل ماؤنٹ بیٹن گاندھی جی کے پلان کو عملی جامہ پہنانے کے حق میں نہ تھا۔ کیوں کہ اس سے ہندوستان کے متحد رہنے کے امکان پیدا ہوتے۔ کانگریس اور مسلم لیگ قریب آتے تھے۔ ہندوستانیوں میں اتحاد کا امکان برطانیہ کے سامراجی مفادات سے متصادم تھا۔ بلکہ اس نے پنڈت نہرو کو کہہ دیا تھا کہ وہ اس منصوبے پر غور کرنے کے لیے اس وقت تک تیار نہیں ہے جب تک اس کو کانگریس کے بارسوخ ممبروں کی حمایت حاصل نہ ہو۔ (ابوالکلام آزاد اور.....: ص۵۷۷)

۲/اپریل ۱۹۴۷ء:

ڈاکومنٹ نمبر۵۳: ریئر ایڈمرل وائکاؤنٹ ماؤنٹ بیٹن آف برما اور مسٹر گاندھی کے درمیان ملاقات کا احوال

ماؤنٹ بیٹن پیپرز — وائسرائے کا انٹرویو نمبر ۲۳

انتہائی خفیہ

۲/اپریل ۱۹۴۷ء

یہ ملاقات ڈھائی بجے دوپہر سے ساڑھے چار بجے تک جاری رہی۔

ابتدا میں ہم نے بنگال اور بہار میں تحقیقات کرانے کے بارے میں گفتگو کی۔ میں نے گورنر بہار، سردار پٹیل اور اپنے نقطۂ نظر سے آگاہ کیا کہ یہ تحقیقات تضیع اوقات اور سرمایہ ہیں اور سیاسی طور پر جھگڑوں میں اضافہ کرتی ہیں۔

انھوں نے اس نظریے سے قطعی طور پر اتفاق نہیں کیا ان کے خیال میں یہ ضروری تھا کہ بہار کی کانگریسی حکومت ہر حال میں تحقیقات کرانے پر اعتماد ظاہر کرے، اس سے بہار کے ہندوؤں نے جو زیادتیاں کی ہیں وہ ظاہر ہوں گی۔

اس پر ہمارے درمیان اتفاق تھا کہ یہ معاملہ صوبائی حکومت کے طے کرنے کا ہے۔ میں نے یہ تجویز پیش کی کہ وہ اس مسئلے پر وزیر داخلہ سردار پٹیل سے گفتگو کریں۔

اس کے بعد مسٹر گاندھی نے اپنا عظیم منصوبہ پیش کیا جس پر وہ مضبوطی سے قایم تھے۔ یہ منصوبہ دراصل وہ منگل کے روز مجھے بتا چکے تھے۔ میں اس کو یہاں تفصیل سے دہراؤں گا۔

وہ چاہتے تھے کہ میں مسٹر جناح کو ہندوستان کی حکومت تشکیل دینے کی دعوت دوں۔ یہ وہی حکومت ہوگی جس کو میں اقتدار منتقل کروں گا۔ وہ کہتے ہیں کہ وزرا کا انتخاب مسٹر جناح پر چھوڑ دینا چاہیے، چاہے وہ سارے وزیر مسلم لیگی ہی کیوں نہ بنالیں۔ وہ اگر چاہیں تو مخلوط حکومت بنا سکتے ہیں اور اس میں نہرو اور دوسرے کانگریسی ممبروں کے علاوہ اقلیتوں کے نمایندوں کو بھی شامل کر سکتے ہیں۔ درحقیقت ان کی تجویز یہ تھی کہ مسٹر جناح کو مشورہ دیا جائے کہ وہ کوشش کر کے ایک اعلا درجے کی ٹیم اکٹھی کریں، جس کو اسمبلی کا اعتماد حاصل ہو۔

انھوں نے مجھ کو یقین دلایا کہ مسلم لیگ میں نشتر اور غضنفر علی سے زیادہ قابلیت کے افراد موجود ہیں۔

مسٹر گاندھی نے کہا کہ اگر مسٹر جناح یہ پیش کش ٹھکرا دیں تو اس صورت میں حکومت سازی کی پیش کش ہندوستان کی ایک ہی بڑی پارٹی کانگریس کو کی جائے۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ مختلف آرا رکھنے والوں کو مخلوط وزارت میں شامل کرنے کی دعوت دی جائے گی جس میں مسلم لیگ بھی شامل ہوگی۔

میں نے ان (مسٹر گاندھی) کی سرزنش کرتے ہوئے کہا کہ وہ اصل میں کانگریس کی

مرکزی حکومت بنانا چاہتے ہیں اور مسٹر جناح کو ابتدائی پیش کش محض ایک چال ہے۔

انھوں نے زبردست خلوص کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ ایسا ہرگز نہیں ہے اور مسٹر جناح کو حکومت دینے کے لیے اپنی تمام خدمات ابھی اور اسی وقت میرے حوالے کرنے کے لیے تیار ہیں اور اس سلسلے میں پہلے تو وہ کانگریس میں اپنا اثر ورسوخ استعمال کریں گے اور دوسرے ہندوستان کے طول وعرض میں گھوم کر عوام کو یہ فیصلہ منظور کرنے کے لیے آمادہ کریں گے۔ انھوں نے مجھے اپنے پرخلوص ہونے کی یقین دہانی کرائی اور میں نے اس کو تسلیم کرلیا۔

انھوں نے مجھ سے اتفاق کیا کہ میں اس منصوبے پر مولانا آزاد اور نہرو سے گفتگو کروں۔ آخر میں انھوں نے تجویز کیا کہ میں ان دونوں کے علاوہ مسٹر کرپلانی سے گفتگو کروں۔ انھوں نے اس سے بھی اتفاق کیا کہ اس منصوبے کی نہایت اہمیت کے پیش نظر مکمل رازداری سے کام لیا جائے، خاص طور پر اخبارات سے اس کو مخفی رکھا جائے۔

....

(تحریک پاکستان اور انتقال اقتدار: ص ۷۴-۷۲)

ڈاکومنٹ نمبر ۵۵: ریئر ایڈمرل و اسکاؤنٹ ماؤنٹ بیٹن آف برما اور مولانا آزاد کے درمیان ملاقات کا ریکارڈ

ماؤنٹ بیٹن پیپرز — وایسرائے کا انٹرویو نمبر ۲۳

۲راپریل ۱۹۴۷ء انتہائی خفیہ

یہ ملاقات پانچ بجے بعد سہ پہر سے پانچ بج کر پینتالیس منٹ تک جاری رہی۔ وایسرائے نے مولانا کا تعارف کیمبل جانسن سے کرایا۔

وایسرائے نے بغیر کسی تمہید کے سیدھا استفسار گاندھی کے پلان کے بارے میں کیا، جو گاندھی نے اسی صبح مولانا کو بتایا تھا۔

انھوں نے مجھ کو یہ کہہ کر ششدر کردیا کہ ان کے خیال میں یہ منصوبہ پوری طرح قابل عمل ہے، کیوں کہ گاندھی بلاشبہ ساری کانگریس پر اس کو قبول کرنے اور اس پر وفاداری کے ساتھ عمل کرنے کے لیے اثر انداز ہوسکتے تھے۔ ان کا مزید خیال یہ تھا کہ اس امر کا امکان ہے کہ میں (وایسرائے) مسٹر جناح کو یہ منصوبہ قبول کرنے پر مایل کرسکتا ہوں اور ان

کا یہ بھی خیال تھا کہ اس منصوبے پر عمل درآمد کی صورت میں خون ریزی کو جلد بند کرنے اور انتقال اقتدار کا آسان راستہ ہے۔

جب میں نے ان سے پوچھا کہ وہ صاف صاف اور قطعی طور پر بتائیں کہ گاندھی منصوبہ بہتر ہے یا کابینہ مشن منصوبہ، تو انھوں نے تسلیم کیا کہ اگر تمام جماعتیں خلوص نیت سے کابینہ مشن منصوبے کو قبول کر لیں تو یہ گاندھی منصوبے سے بہتر ہے۔

میں نے ایک گھنٹہ پہلے مسٹر گاندھی کو جو متبادل تجاویز دی تھیں جب میں نے ان کا ذکر کیا تو انھوں (مولانا) نے کہا کہ یہ بہت اچھا متبادل ہے۔

درحقیقت مولانا نے کہا کہ جتنی جلدی فیصلہ کیا جا سکے اور اس پر عمل درآمد ہو اور دیر تک میرے (وائسرائے) مرکز میں رہنے کے باعث حالات درست سمت میں ٹھیک طریقے سے نپٹائے جاتے رہیں گے اور میرا ہندوستان سے رخصت ہو جانا مستقبل کے لیے بہتر ہوگا۔

میں نے ان کو دعوت دی کہ وہ کابینہ کے ساتھ میرے طریق کار پر تنقیدی رائے دیں۔ انھوں نے میری بڑی تعریف کی جسے میں نے اپنی مکمل دل داری خیال کیا۔ میں نے ان سے التجا کی کہ وہ مخلصانہ تعمیری نقطۂ نظر ظاہر کریں۔ انھوں نے جواب دیا کہ وہ بالکل خلوص سے کہہ رہے ہیں اور ان کو یقین تھا کہ یہ خیالات کابینہ کے ہر ممبر کے ہیں۔

نوٹ: میں سمجھتا ہوں کہ کابینہ کا ہر ممبر غالباً خود کو اور اپنی پارٹی کو مورد عنایت بنانے کی کوشش میں ہے اور یہ کہ اس مرحلے پر اس قسم کی دل داری کی توقع رکھنی چاہیے۔ (تحریک پاکستان اور انتقال اقتدار: ص ۷۷-۷۶)

ڈاکومنٹ نمبر ۶۵: ریئر ایڈمرل وائسکاؤنٹ ماؤنٹ بیٹن آف برما اور مسٹر لیاقت علی خان کے درمیان ملاقات کا ریکارڈ

ماؤنٹ بیٹن پیپرز — وائسرائے کا انٹرویو نمبر ۲۶

۳ اپریل ۱۹۴۷ء انتہائی خفیہ

یہ ملاقات صبح گیارہ بج کر دس منٹ پر شروع ہوئی اور بارہ بج کر پندرہ منٹ تک جاری رہی۔ ڈان اخبار میں شائع ہونے والی خبر کہ مسلم لیگ کی ایکشن کمیٹی میں عبوری حکومت میں شامل وزرا حصہ لے رہے ہیں، میں نے لیاقت علی خان کی توجہ اس جانب

مبذول کرائی۔ انھوں نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ عبوری حکومت میں شامل اکثر وزرا یا تو کانگریس یا مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں اس کو تسلیم کرتا ہوں لیکن میں نے شکایت کی کہ مسلم لیگ کے وزرا ایکشن کمیٹی میں سرگرم حصہ لیتے ہیں، انھوں نے کہا کہ یہ عبوری حکومت میں شامل ہونے سے قبل ہی ایکشن کمیٹی سے منسلک تھے۔

میں نے ان سے کہا کہ ان ارکان کو اپنے ہی مفاد کی خاطر یا تو استعفیٰ دے دینا چاہیے یا پھر ایکشن کمیٹی کی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لینا چاہیے۔ میں نے کہا کہ فرصت ملنے پر ممکن ہے میں اپنی اس رائے کا اظہار مسٹر جناح سے کروں۔ میں نے اس موضوع پر اپنی بات ختم کرتے ہوئے ان کو متنبہ کیا کہ ایسی سرگرمیوں میں حصہ لینے نے حکومت میں شامل ہونے کی وجہ سے مسلم لیگ مشکل پوزیشن میں پھنس جائے گی۔

میں نے ان سے پوچھا کہ اگر میں کانگریس سے کابینہ مشن کے ۱۶ مئی کے بیان کے الفاظ اور روح کے مطابق صدقِ دل سے عمل کرنے کی یقین دہانی حاصل کرلوں تو اس صورت میں کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ مسٹر جناح اپنے اصل معاہدے کی طرف واپس لوٹ آئیں گے؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ فرقہ وارانہ تلخی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ اب اس کا موقع نہیں۔

تب میں نے ان سے کہا کہ اگر وہ میری جگہ ہوتے تو انتقال اقتدار کے لیے کیا حل پیش کرتے؟

اس پر وہ متوجہ کرنے کے سے انداز میں مسکرائے اور کہا "جب سے میرا واسطہ عبوری حکومت کے کانگریسی وزرا سے پڑا ہے مجھے اس حقیقت کا احساس ہو چلا ہے کہ ان کے ساتھ کام کرنا قطعاً ناممکن ہے۔ ان میں مفاہمت اور منصفانہ طرزِ عمل کا فقدان ہے۔ ان میں سے اکثر صرف یہ سوچتے رہتے ہیں کہ کس طرح سے مسلم لیگ کو نیچا دکھایا جائے اور اپنی پوزیشن کو بہتر بنانا چاہیے۔" انھوں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ صورت حال اس قدر ناگفتہ بہ ہو چکی ہے کہ اگر عزت مآب مسلم لیگ کو صرف سندھ کا صحرا دے دیں تو میں اب بھی اس کو قبول کرنے کو ترجیح دوں گا اور ایک الگ مسلم ریاست بنانا پسند کروں گا، بجائے اس کے کہ کانگریس کے ساتھ بندھ کر زیادہ معقول

مراعات کے ساتھ کام کروں۔" (تحریک پاکستان اور انتقال اقتدار: ص۸۹-۸۸)

ڈاکومنٹ نمبر ۸۵: انتقال اقتدار سے پہلے عبوری حکومت کی (جدید) تشکیل کے لیے ایک خاکہ

(۱) مسٹر جناح کو کابینہ تشکیل کرنے کا اختیار دیا جائے گا۔

(۲) کابینہ کے وزرا منتخب کرنے کا اختیار بھی مسٹر جناح کے پاس ہوگا، اس کے تمام وزرا مسلمان ہو سکتے ہیں یا وہ ہندوستانی عوام کے تمام طبقات اور تمام مذاہب کے نمایندے ہو سکتے ہیں۔

(۳) اگر مسٹر جناح یہ پیش کش قبول کر لیتے ہیں تو کانگریس بلا ہچکچاہٹ پر خلوص تعاون کی ضامن ہے۔ بہ شرطے کہ مسٹر جناح کی کابینہ کے تمام اقدامات کلی طور پر ہندوستان کے عوام کے مفاد میں ہوں۔

(۴) ہندوستان کے عوام کے مفاد میں کیا ہے اور کیا نہیں ہے اس کا فیصلہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اپنی ذاتی حیثیت میں کریں گے۔

(حاشیہ کا نوٹ: شق نمبر تین اور چار بعد میں حذف کر دی گئیں اور ان کی جگہ شق نمبر ۸ شامل کی گئی)۔

(۵) مسٹر جناح کو لازمی طور پر یہ یقین دلانا ہوگا کہ ان کی تشکیل کردہ کابینہ خواہ وہ مسلم لیگ یا کسی اور جماعت کی نمایندگی کرتی ہو وہ تمام اپنی بھرپور کوشش کریں گے کہ پورے ہندوستان میں امن و امان قایم ہو۔

(۶) نیشنل گارڈ یا اس نوعیت کی نجی فوج قایم نہیں کی جائے گی۔

(مسٹر گاندھی کے ڈرافٹ (خاکہ) اس حصے کو شق نمبر تین اور چار کی جگہ شامل کیا گیا)

(۷) اس فریم ورک کے اندر مسٹر جناح کو مکمل آزادی حاصل ہوگی کہ وہ اگر چاہیں تو انتقال اقتدار سے قبل پاکستان کا منصوبہ پیش کریں، لیکن اس کے لیے شرط یہ ہوگی وہ معقولیت سے کام لیں اور ہتھیاروں اور خانہ جنگی کی دھمکی نہ دیں، جس کے استعمال کی وہ ہر وقت قسم کھاتے رہتے ہیں۔ چناں چہ اس سلسلے میں صوبے یا اس کے کسی حصے کو کسی طرح مجبور نہیں کیا جائے گا۔

(۸) اسمبلی میں کانگریس کو فیصلہ کن اکثریت حاصل ہے، لیکن کانگریس اپنی اکثریت کو کبھی بھی لیگ کی پالیسی کے خلاف اس بنا پر استعمال نہیں کرے گی کہ اس سے کانگریس لیگ کو ہم نوا بن جاتی ہے۔ وہ تہہ دل سے لیگ کی حکومت کی حمایت کرے گی۔ شرط یہ ہوگی کہ لیگ کی حکومت کے تمام اقدامات ہندوستان کے مفاد میں ہوں۔ اس کا فیصلہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن ایک انسان کی حیثیت میں کریں گے، حکومت برطانیہ کے نمائندہ کے طور پر نہیں۔

(۹) اگر مسٹر جناح اس پیش کش کو مسترد کر دیں تو یہی پیش کش مناسب ردوبدل کے ساتھ کانگریس کو کی جائے۔ (تحریکِ پاکستان اور انتقال اقتدار: ص ۲۲-۱۲۱)

۱۰/اپریل ۱۹۴۷ء:

ڈاکومنٹ نمبر ۱۱۰: وائسرائے کی اسٹاف میٹنگ گفتگو کا غیر جاری شدہ ریکارڈ نمبر ۵- ماؤنٹ بیٹن پیپرز

ماؤنٹ بیٹن پیپرز　　　　　　　　　　　　　　انتہائی خفیہ

وائسرائے کی بارھویں اسٹاف میٹنگ جو وائسرائے ہاؤس نئی دہلی میں ۱۰/اپریل ۱۹۴۷ء کو دس بجے صبح ہوئی۔ مندرجہ ذیل افراد شریک ہوئے۔ ریئر ایڈمرل وائکاؤنٹ ماؤنٹ بیٹن آف برما، لارڈ اسمے، سر ایرک میویل، مسٹر ایبل، کیپٹن بروک مین، مسٹر کیمبل جانسن لیفٹیننٹ کرنل کروم۔

منصوبے کا خاکہ:

وائسرائے نے کہا کہ ان کے ذہن میں موجود منصوبے کے بنیادی نکات یہ ہیں:

(۱) اگرچہ مسٹر جناح پاکستان حاصل کرنے کا تہیہ کیے ہوئے ہیں اور کانگریس ماسوائے مسٹر گاندھی کے پاکستان کا مطالبہ ماننے پر رضامند ہے۔ ہندوستان کے مستقبل کے منصوبے کا اعلان کرتے وقت پاکستان کا ذکر نہیں ہونا چاہیے۔

(۲) صوبوں کو اقتدار منتقل کر دیا جائے گا اور وہ اپنی صواب دید کے مطابق ایک یا زیادہ گروپوں میں شامل ہونے کے لیے آزاد ہوں گے۔ یہ گروپ اپنی آئین ساز اسمبلی بنانے کے مختار ہوں گے۔ ریاستیں اپنی مرضی کے مطابق گروپوں میں شریک ہونے کی مجاز

ہوں گی۔

(۳) عبوری حکومت، جو ممکن ہے مسٹر جناح کی شمولیت سے زیادہ مستحکم ہو جائے، کم از کم جون ۱۹۴۸ء تک قائم رہے گی۔ صوبے چند مخصوص شعبوں کے سوا باقی تمام شعبوں کو اپنی حسب خواہش پاس رکھنے کے مجاز ہوں گے۔

(۴) پنجاب اور بنگال کو تقسیم کر دیا جائے گا۔

(۵) صوبہ سرحد میں عام انتخاب ہوں گے اور ممکن ہے دوسرے صوبوں میں بھی انتخاب کرائے جائیں۔

(۶) اس خاص منصوبے کے علاوہ جس کا محض اعلان کیا جائے گا اور یہ اتفاق رائے کا مرہون منت نہ ہوگا، ایک چارٹر کی صورت میں ہندوستان کے رہنماؤں کو بتانا ہوگا کہ بعض نکات کو برطانوی انخلا کے بعد کس طرح نپٹانا ہے، اس کے لیے ان سے معاہدہ کرنا ہوگا۔ مثال کے طور پر فوج اس وقت جہاں جہاں کھڑی ہے وہ اسی صورت میں رہے گی اور اس سلسلے میں کمانڈر انچیف ہمارے ہندوستان سے رخصت ہونے سے پہلے پروگرام مرتب کریں گے۔ (تحریکِ پاکستان اور انتقال اقتدار: ص ۱۵۳)

ریکارڈ میں اس منصوبے پر گفتگو ہے۔ مختلف اہم نکات زیر بحث آئے ہیں۔ یہ منصوبہ جون ۱۹۴۸ء میں انتقال اقتدار سے پہلے فریم ورک کے طور پر استعمال میں لانے کے لیے تھا۔ (ا۔ن۔ش)

ڈاکومنٹ نمبر ۱۱۶: ریئر ایڈمرل وائسکاؤنٹ ماؤنٹ بیٹن آف برما اور مسٹر جناح کے درمیان ملاقات کا ریکارڈ

ماؤنٹ بیٹن پیپرز — وائسرائے کا انٹرویو نمبر ۴۶

۱۰ اپریل ۱۹۴۷ء انتہائی خفیہ

مسٹر جناح چار بجے بعد از دوپہر آئے.....

مسٹر جناح اس سے زیادہ اور کیا کہتے کہ کابینہ مشن منصوبہ کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں۔ چناں چہ ہم نے ان کی تقسیم ہند کی خواہش کو منطقی طور پر پرکھنے کی کوشش کی۔ مسٹر جناح نے کہا کہ دراصل وہ ''عمل جراحی'' چاہتے ہیں جس سے گروپ ''بی'' اور ''سی'' کے علاقوں کے پانچ صوبوں کو کاٹ کر پاکستان میں شامل کر دیا جائے اور باقی چھ صوبے

ہندوستان کے حوالے کر دیے جائیں۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ وقت مذاکرات اور تفاصیل میں جانے کی اجازت نہیں دیتا۔ انھوں نے مجھ پر زور دیا کہ میں ایک فیصلہ جلد از جلد صادر کر دوں اور تفصیلات بعد میں طے ہوتی رہیں گی۔

لارڈ اسمے اور میں نے بہت کوشش کی کہ ان کو سمجھا سکیں کہ جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ کسی فیصلے پر عمل درآمد کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے گا ہمارے لیے فیصلہ پر پہنچنا ناممکن ہوگا۔

اس کے بعد میں نے مسٹر جناح کو سمجھایا کہ حال آں کہ میں اب تک ایک کھلے ذہن سے سوچتا رہا ہوں لیکن ان کے فیصلے کو تسلیم کرنے سے اس کے منطقی انجام تک پہنچنا ہوگا۔ میں نے متحدہ ہندوستان کے مسئلے پر ان کو بتایا ''آپ ایک بڑی اقلیت کے لیے تقسیم کی وسیع بنیاد پر مدعی ہیں؛ اگر میں آپ کی یہ بات مان لیتا ہوں تو کانگریس کے اس مطالبے کو کیسے رد کر سکتا ہوں جو بڑی ہندو اقلیت کے لیے پنجاب اور بنگال کی تقسیم پر زور دے گی۔'' ان نکات پر ہم ایک دوسرے کو دلایل دیتے رہے۔ مسٹر جناح کا بنیادی نقطہ یہ تھا میں ان کو لازمی طور پر ان کا ''زندہ رہنے والا'' پاکستان دوں۔ انھوں نے مجھ کو بتایا کہ پولینڈ کی تقسیم حساب کتاب کے قاعدے کے مطابق نہیں کی گئی نہ ہی عوام کی خواہشات کو مدنظر رکھا گیا۔

میں نے ان سے کہا میں ان بنیادوں پر پیش رفت نہیں کر سکتا اور میں وہ راستہ اختیار کروں گا جو عام طور پر قابل قبول ہوگا۔ کیوں کہ موجودہ حالات میں میکانکی طور پر عوام کی راے معلوم کرنا ممکن ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے میرے ذہن میں یہ ہے کہ میں فوری طور پر اعلان کروں کہ اقتدار جون ۱۹۴۸ء میں صوبوں کے حوالے کر دیا جائے گا اور صوبوں کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ چاہیں تو صوبوں کے کسی گروپ میں شامل ہو جائیں یا بالکل خودمختار رہیں۔ میرا خیال تھا کہ سندھ، نصف پنجاب اور غالباً صوبہ سرحد ایک گروپ تشکیل دے لیں گے، بنگال کا ایک حصہ دوسرا گروپ ہوگا اور یہ دونوں پاکستان قایم کریں گے۔ باقی صوبے میرے خیال کے مطابق ہندوستان میں شامل ہوں گے۔

میں نے ان کو بتایا کہ پاکستان اور ہندوستان اپنی اپنی آئین ساز اسمبلی قایم کریں گے اور ہندوستانی ریاستوں کو موقع دیا جائے گا کہ وہ دونوں میں سے کسی ایک اسمبلی کے ساتھ الحاق کر لیں۔ اگر چہ یہ معلوم کرنا باقی ہوگا کہ اس پر عمل درآمد کس طرح کیا جائے۔

مسٹر جناح گفتگو کا یہ رنگ دیکھ کر پریشان اور کبیدہ خاطر ہوتے چلے گئے اور انھوں نے کہا کانگریس میرے راستے کا روڑا ثابت ہو رہی ہے اور انھوں نے دھمکی دی کہ اس صورت میں وہ صوبۂ آسام کی تقسیم کا مطالبہ کریں گے۔ میں نے جواب دیا کہ یقیناً میں کانگریس کی طرح آپ کو بھی یہ حق دوں گا اور اگر وہ آسام کے مسلم اکثریتی علاقوں کو بنگال کے ساتھ ملانا چاہتے ہیں تو وہ مجھ کو اپنی تجاویز سے مطلع کریں۔ میں نے جواب دیا کہ یقیناً میں کانگریس کی طرح آپ کو بھی یہ حق دوں گا اور اگر وہ آسام کے مسلم اکثریتی علاقوں کو بنگال کے ساتھ ملانا چاہتے ہیں تو وہ مجھ کو اپنی تجاویز سے مطلع کریں۔ میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ یہ اسکیم عارضی ہے، جب تک میں یہ معلوم نہ کر سکوں کہ اس پر عمل درآمد کے لیے کیا طریقہ اختیار کرنا ہوگا نہ ہی میں یہ بتا سکتا ہوں کہ آیا یہ اسکیم درحقیقت قابل عمل ہے یا اس کو نافذ کرنے کے لیے کتنا وقت درکار ہوگا۔

انھوں نے کہا کہ میں نے جس اسکیم کا خاکہ بتایا ہے وہ ان کے خیالات کی کسی طرح بھی ترجمانی نہیں کرتا۔ اس لیے وہ اس اسکیم پر عمل درآمد کے لیے کوئی خاطر خواہ مشورہ نہیں دے سکتے۔ لارڈ اسمے نے یہ ذمہ داری قبول کی کہ وہ اس اسکیم پر عمل درآمد کے لیے طریق کار وضع کریں گے جو مسٹر جناح کے خیالات جاننے کے لیے ان کو پیش کیا جائے گا۔

میں نے ان سے کہا کہ اگر تحقیق کے دوران یہ ثابت ہو جائے کہ یہ اسکیم جون ۱۹۴۸ء تک پوری طرح نافذ نہیں ہو سکتی تب ہم کوشش کریں گے کہ ایک ایسی تجویز وضع کریں جس کو لاگو کرنے کے لیے ہندوستانی ہمارے ہندوستان سے رخصت ہو جانے کے بعد مذاکرات جاری رکھ سکیں۔

تب ہم نے اس پر غور کیا کہ میں جو آخری تجاویز حکومت برطانیہ کو پیش کروں اس کا طریقہ کار کیا ہو۔ مسٹر جناح نے مجھ پر زور دے کر کہا کہ اس سلسلے میں خط و کتابت نہ کی جائے اور ہم میں اس پر اتفاق ہو گیا کہ یہ اچھا ہوگا کہ تجاویز کو پہلے وزیر اعظم کے سامنے پیش کیا جائے، بجائے اس کے کہ پہلے ان تجاویز کا باقاعدہ طور پر زعماؤں کے سامنے اعلان کیا جائے۔ مسٹر جناح نے کہا کہ پہلے ان کا ارادہ ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ کرنے کا تھا لیکن اب انھوں نے اس کو ترک کر دیا ہے۔

انھوں نے اجازت چاہی کہ ان کو پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے بارے میں کانگریس

کی تجاویز سے آگاہی حاصل کرنے دی جائے تاکہ ان کی روشنی میں وہ اپنی متبادل تجاویز پیش کر سکیں۔

میں نے فیصلہ کیا کہ میں پنڈت نہرو کو بلاؤں اور ان سے پنجاب اور بنگال کی تقسیم کی صورت میں مجوزہ سرحدوں کے بارے میں دریافت کروں اور ان کے ساتھ اس مسئلے کے حل پر بھی گفتگو کروں جو میں نے جناح کے ساتھ طے کیا تھا۔

میں نے کہا کہ میں پنڈت نہرو کو مشورہ دوں گا کہ آئین ساز اسمبلی کا اجلاس ۲۸ر اپریل کو منعقد نہ کیا جائے اور اس اجلاس کو اس وقت تک کے لیے ملتوی کر دیا جائے جب تک فیصلے کا اعلان نہیں ہوتا۔

لارڈ اسمے نے وہ مسودہ پیش کیا جو انھوں نے دونوں جماعتوں کے رہنماؤں کے مشورے کے بعد متفقہ طور پر اپیل کے لیے تیار کیا تھا، تاکہ تشدد اور اشتعال انگیزی کی روک تھام کی جا سکے۔ مسٹر جناح اس کو اپنے ساتھ لے گئے تاکہ وہ احتیاط کے ساتھ اس کی عبارت پر غور کر سکیں۔ سر ایرک میویل ان سے مسودے کی عبارت کے بارے میں آخری منظوری حاصل کریں گے تاکہ اس کو پنڈت نہرو کو دکھایا جا سکے۔

آخر میں، میں یہ ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں کہ گفتگو کے دوران مجھ کو مسٹر جناح کی تلخ گلہ گذاری کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کے پاکستان سے پنجاب اور بنگال کو آدھا کاٹ کر اور کلکتہ کو اس میں سے نکال کر اگر نا ممکن نہیں تو اقتصادی طور پر پاکستان کو چلانا بہت دشوار ہوگا۔ میں نے اس موقع سے فایدہ اٹھاتے ہوئے ان کو کابینہ مشن منصوبے کی طرف رجوع کرنے کی کوشش کی۔ میں نے ان سے کہا کہ میں آپ سے بالکل متفق ہوں کہ کرم خوردہ پاکستان جو ممکن حد تک میں ان کو پیش کرتا ہوں اس کا چلانا تقریباً ناممکن ہے اور یہ میری سمجھ سے بالا ہے کہ وہ کابینہ مشن منصوبے کو قبول کیوں نہیں کرتے، جس کے ذریعے ان کو پورا پنجاب پورا بنگال بہ شمول کلکتہ اور سارا سندھ مکمل خود اختیار صورت میں ملتا ہے اور درحقیقت کارآمد اور قابل عمل ہے۔

میں نے ان سے کہا کہ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں کہ جو اسکیم میں نے ان کو دینے کے لیے تیار کی ہے اور جو وہ کابینہ مشن منصوبے کے ذریعے حاصل کر سکتے تھے، دونوں کے درمیان صرف یہ فرق ہے کہ موخر الذکر اسکیم کے تحت ایک چھوٹا اور کم زور مرکز دہلی میں ہوتا

جو ڈیفنس، مواصلات اور خارجہ امور کو کنٹرول کرتا۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ تین شعبے جنرل ڈیفنس کے تحت باہم اکٹھے کر دیے جائیں تو مجھ کو کوئی ایسی صورت نظر نہیں آتی جس سے نئی اسکیم پر عمل درآمد کیا جائے اور وہ مرکز میں جنرل ڈیفنس کے لیے قایم ہونے والی تنظیم میں شامل ہونے سے کس طرح انکار کر سکتے ہیں۔ درحقیقت میں نے پیشین گوئی کی کہ وہ تقریباً کرم خوردہ اور نا قابل عمل پاکستان حاصل کر رہے ہیں۔ جس کو دفاع کے مقاصد کے لیے مرکزی سطح پر ایک مشترکہ تنظیم قایم کرنے کی ضرورت ہوگی۔ جب کہ اگر وہ صرف کابینہ مشن منصوبے کی طرف رجوع کریں تو وہ اپنی حسب پسند پورا پاکستان حاصل کر سکتے ہیں۔ اس صورت میں مرکزی سطح پر زیادہ دباؤ والی تنظیم بھی نہیں ہوگی جو کہ ان کو کرم خوردہ پاکستان حاصل کرنے کی صورت میں جلد یا بہ دیر قبول کرنا پڑے گی۔ مزید برآں میں نے کہا کہ وہ ہندوستان کی عظیم قوت کو تباہ کر رہے ہیں اور ہمیشہ کے لیے دوسرے درجے کی طاقت سے بھی نیچے کھینچ رہے ہیں۔

ڈاکومنٹ ۱۱۶ میں جب جناح صاحب کو بتایا کہ ملک کی فرقہ وار تقسیم کے مطالبے کے جواب میں کانگریس پنجاب و بنگال کی تقسیم کا مطالبہ کرے گی تو انھوں نے پریشانی اور کبیدہ خاطری کے ساتھ کہا کہ کانگریس ان کے راستے کا روڑا بن رہی ہے اور انھوں نے دھمکی دی کہ وہ آسام کی تقسیم کا مطالبہ کریں گے! جب اس سے پنڈت نہرو کو متنبہ کیا گیا تو انھوں نے صفائی کے ساتھ جواب دیا: ''یہ ایک معقول مطالبہ ہوگا۔ اس کے ساتھ آسانی سے اتفاق کیا جا سکتا ہے۔'' (ڈاکومنٹ نمبر ۱۲۵: ص ۱۷۵)

غور کیجیے! بھلا کتنا فرق تھا دو بڑے صوبوں کے مع بنگال اور دارالحکومت ''کلکتہ'' کے ہاتھ سے نکل جانے میں اور آسام کے ایک ضلع سلہٹ کے ہاتھ آ جانے میں! اور کتنی پستی و بلندی تھی لیگ اور کانگریس کے رہنماؤں کے خیالات اور ان کی سیرتوں میں؟ سر دھنیے اور ماتم کیجیے!

ڈاکومنٹ نمبر ۱۱۹: وایسرائے کی اسٹاف میٹنگ، گفتگو کا غیر جاری شدہ ریکارڈ نمبر ۶

ماؤنٹ بیٹن پیپرز — انتہائی خفیہ

وایسرائے کی تیرھویں اسٹاف میٹنگ جو ۱۱ر اپریل ۱۹۴۷ء کو صبح دس بجے وایسرائے ہاؤس میں ہوئی، اس میں شریک مندرجہ ذیل حضرات نے بات چیت میں حصہ لیا۔ ریئر

ایڈمرل واسکاؤنٹ ماؤنٹ بیٹن آف برما، لارڈ اسمے، سرای میویل، مسٹر ایبل، کیپٹن بروک مین، مسٹر آئی ڈی اسکاؤٹ، مسٹر کیمبل جانسن، لیفٹیننٹ کرنل اریکسن کروم

وائسرائے نے کہا کہ یہ ہمیشہ اس کے ذہن میں رہے گا اور اس کی اصل خواہش یہی ہے کہ اقتدار متحدہ ہندوستان کو منتقل کیا جائے، جس کا مرکز مضبوط ہو۔ اس کے بعد دوسری بہتر تدبیر یہ ہے کہ متحدہ ہندوستان کو کم زور مرکز کے ساتھ اقتدار دے دیا جائے، جیسا کہ کابینہ مشن منصوبہ میں کہا گیا ہے۔ وہ اب تک مسٹر جناح کے ساتھ چھ مرتبہ ملاقات کر کے گفتگو کر چکے ہیں۔ گذشتہ روز کی میٹنگ تین گھنٹے تک جاری رہی۔ (ڈاکومنٹ نمبر ۱۱۶) انھوں نے مسٹر جناح پر ہر طرح کے دلایل آزمائے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دلایل کا مسٹر جناح پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں نے مسٹر جناح کو ہندوستان کو متحد رکھنے کے کئی فواید گنوائے، ان میں سے ایک یہ تھا کہ ہندوستان ایک انتہائی مضبوط ملک بن سکتا ہے اور عالمی طاقتوں کی صف اول میں کھڑا ہو سکتا ہے۔ انھوں نے مسٹر جناح سے کہا کہ وہ آخر ایسے بڑے فواید کو کس طرح نظر انداز کر سکتے ہیں۔ مسٹر جناح ان کی موجودگی میں پاکستان کے حق میں اس وقت ایک بھی معقول دلیل پیش نہیں کر سکے۔ درحقیقت انھوں نے کوئی جوابی دلیل پیش نہیں کی۔ انھوں نے یہ تاثر دیا جیسے وہ میری بات سن ہی نہ رہے ہوں۔ ان پر دلیل کوئی اثر نہیں کرتی۔ انھوں نے بار بار ہر طرح سے بات چیت کی، جس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ انھوں نے مسٹر جناح کو یقین دلایا کہ وہ ہندوستان کے پہلے سربراہ مملکت ہوں گے اور وہ ہندوستان کے عوام کے بہترین مفاد میں جو کچھ ہوگا وہ خود کریں گے۔ مسٹر جناح نفسیاتی کیس تھے۔ ان پر پاکستان کی دھن سوار تھی۔ جس کا نتیجہ یقینی طور پر مسلمانوں کے لیے ناقابل تلافی نقصان کے سوا کچھ اور نہ تھا۔ وائسرائے نے کہا کہ یہ صاف نظر آتا ہے کہ اگر کابینہ مشن منصوبے کو نافذ کرنے کی کوئی کوشش کی گئی تو مسلم لیگ ہتھیار اٹھا لے گی۔ جب مسٹر جناح سے نہیں ملے تھے اس وقت تک انھوں نے یہ ممکن نہیں سمجھا تھا کہ ایک ایسا انسان جس میں کلیتاً احساس ذمے داری کا فقدان ہو اس قدر زیادہ اختیار کا حامل رہے۔

لارڈ اسمے نے کہا کہ وہ سمجھتے ہیں کہ مسٹر جناح کی ذہنی ساخت میں ہندوؤں کے خلاف حقارت اور شدید نفرت کے جذبات ہیں۔ ان کی سوچ سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمام ہندو کم تر انسان ہیں، جن کے ساتھ مسلمانوں کا رہنا ناممکن ہے۔ وائسرائے نے کہا کہ ہندو

اور مسلمانوں کو ہر حال میں اکٹھے رہنا ہوگا۔ انھوں نے مسٹر جناح کو بتادیا ہے کہ کانگریس ہندوؤں کو متحد رکھنے کی بہت زیادہ خواہش مند ہے۔ اس مقصد کی خاطر شاید وہ کانگریس کو اس پر آمادہ کرلیں کہ وہ پورا بنگال، پورا پنجاب، صوبہ سرحد اور پورا آسام مسلمانوں کے حوالے کردے اور کم زور مرکز قبول کرلے۔ انھوں نے مسٹر جناح سے یہ بھی کہا کہ ان کو یقین ہے کہ مرکز کے آئین کو اس طرح تشکیل دیا جائے گا کہ کوئی بھی جماعت دوسری جماعت کی رضامندی کے بغیر مسلح افواج کو حرکت نہ دے سکے، لیکن اس بار بھی مسٹر جناح نے سنی اَن سنی کردی۔ (تحریکِ پاکستان اور انتقالِ اقتدار: ص ۶۳-۱۶۲)

ڈاکومنٹ نمبر ۱۲۲: ریئر ایڈمرل وائسکاؤنٹ ماؤنٹ بیٹن آف برما اور لیفٹیننٹ کرنل ڈی لافارو کے درمیان ملاقات کا ریکارڈ

ماؤنٹ بیٹن پیپرز — وائسرائے کا انٹرویو نمبر ۴۹

۱۱/اپریل ۱۹۴۷ء　　　　　　　　انتہائی خفیہ

یہ ملاقات بارہ بج کر پینتالیس منٹ سے ایک بج کر پینتالیس منٹ تک جاری رہی۔

لیفٹیننٹ کرنل ڈی لافارو (Lt. Col. de la Farue) حکومت صوبہ سرحد کے چیف سیکرٹری ہیں۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ ان کے خیال میں صوبے میں صاف ستھرے انتخاب کرانے کے نتیجے میں مسلم لیگ کی بجائے کانگریس کو اقتدار حاصل ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ یہ ضروری ہوگیا ہے کہ صوبے میں دفعہ ۹۳ نافذ کردی جائے، کیوں کہ اگر انتخاب برسر اقتدار جماعت نے کرائے تو یقیناً دھاندلی کرے گی، لیکن دفعہ ۹۳ کے نفاذ کے باوجود انتخاب کے نتیجے میں کانگریس واپس اقتدار میں آئے گی۔

انھوں نے کہا کہ عبدالغفار خان صوبہ سرحد میں انتہائی غیر مقبول شخص ہیں، لیکن ان کے بھائی ڈاکٹر خان صاحب بہترین انسان ہیں اور ان کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ اعصابی مریض ہیں اور غیر متوازن شخصیت ہیں بالکل خرافات ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنے بے قابو مزاج کے باعث پُر ہیجان ہوجاتے ہیں۔ ایک مرتبہ ان پر ہاتھ بھی اٹھانا پڑا تھا تاکہ وہ ہوش میں آجائیں، اس کے بعد سے وہ آپس میں بہترین دوست بن گئے۔

میں نے ان سے کہا کہ عام حالات میں انتہائی نامناسب سمجھتا کہ وہ اپنے گورنر کے

بارے گفتگو کریں، لیکن لارڈ اسے بھی یقیناً اس کا اقرار کریں گے کہ موجودہ انتہائی بحران کے دور میں مجھے پنڈت نہرو کی گورنر سرحد کے بارے میں حیران کن رپورٹ پر کسی برطانوی کی رائے لینا پڑے گی۔ درحقیقت پنڈت نہرو نے ان کو ہٹادینے کی بات کی تھی اور یہ بات انھوں نے مجھ سے بالکل واشگاف الفاظ میں کہی تھی۔

کرنل ڈی لا نارو نے بڑی جرأت مندی سے جواب دیا کہ اگرچہ گورنر صوبۂ سرحد کے بارے میں بڑی معلومات رکھتے ہیں، لیکن یہ درست ہے کہ وہ کانگریس کی حکومت کے خلاف ہیں اور ان کا رویہ جانب دارانہ ہے اور صوبے کے انصاف پسند لوگوں کے اعتماد سے محروم ہو چکے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ گورنر کا اس عہدے پر برقرار رہنا برطانوی وقار کے منافی ہے۔ (تحریکِ پاکستان اور انتقال اقتدار: ص ۱۷۰-۱۷۱)

ڈاکومنٹ نمبر ۱۳۲: ریئر ایڈمرل وائسکاؤنٹ ماؤنٹ بیٹن آف برما اور سردار پٹیل کے درمیان ملاقات کا ریکارڈ

ماؤنٹ بیٹن پیپرز — وائسرائے کا انٹرویو نمبر ۵۵

انتہائی خفیہ

۱۲؍اپریل ۱۹۴۷ء

یہ ملاقات تین بجے شروع ہو کر چار بج کر پندرہ منٹ تک جاری رہی۔

سب سے پہلے میں نے سردار پٹیل کو مسٹر جناح کے ساتھ مذاکرات کا احوال بتایا اور یہ بھی بتایا کہ میں نے قبل ازیں ان کے یا کانگریس کے کسی رکن کے ساتھ انتقال اقتدار کے مسئلے کا حل تلاش کرنے کے لیے مشورہ کیوں نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں صدقِ دل سے مسٹر جناح کو ہندوستان کے بہترین مستقبل میں اپنے خیالات سے آگاہ کرسکوں جس پر کانگریس یا اس کے کسی ممبر کے نکتۂ نظر کی چھاپ نہ ہو۔ میں نے ان کو بتایا کہ میرے اپنے خیالات یہ ہیں کہ ہندوستان کے بہترین مستقبل کے لیے ایک پائیدار یونین تشکیل دی جائے، جس کا مرکز مضبوط ہو۔ (یعنی اس کے پاس بہت زیادہ اختیارات ہوں) میں موجودہ عبوری حکومت کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں، جس میں مسٹر جناح کو شامل کرنا اور ایک اہم محکمہ ان کے سپرد کرنے کا امکان ہے۔ تاکہ جب میں جون ۱۹۴۸ء میں یہاں سے رخصت ہوں تو اس وقت اقتدار اس مرکزی حکومت کے حوالے کیا جائے۔

میں نے ان سے کہا کہ میرا اگلا بہترین حل کابینہ مشن منصوبہ ہے اور ایک حل جو میں

مسلط نہیں کرنا چاہتا وہ پاکستان ہے، لیکن پاکستان ناگزیر ہوا تو یہ کٹا پھٹا پاکستان ہوگا۔

تب میں نے سردار پٹیل سے استفسار کیا کہ کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ کانگریس کابینہ مشن منصوبہ بغیر کسی استثنا کے قبول کر سکتی ہے؟ انھوں نے مجھ سے استفسار کیا آیا میرا مطلب یہ ہے کہ کانگریس برطانوی حکومت کے چھ یا سات دسمبر کے بیان کو قبول کرلے گی؟ میں نے ان کو بتایا کہ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر مسٹر جناح کو کابینہ مشن منصوبہ قبول کرنے پر رضامند کرنا ہے تو اس صورت میں کانگریس اور ان (مسٹر جناح) کو منصوبے کی ایک جیسی تشریح تسلیم کرنا ہوگی یا پھر کم از کم ایسی تشریح جس پر سب متفق ہوں۔ سردار پٹیل نے مجھے بتایا کہ آخر کار میں نے ہی کانگریس کو کابینہ مشن منصوبہ منظور کرلینے پر آمادہ کیا تھا۔ انھوں نے یاد دلایا کہ کانگریس میں وہ کابینہ مشن منصوبے کے زبردست حامی کار ہیں۔

(یہاں اس کا ذکر ریکارڈ پر لانا دلچسپی کا موجب ہوگا کہ لارڈ ویول نے مجھ کو ۲۲ر مارچ کو بتایا تھا کہ سر اسٹیفورڈ سردار پٹیل کے پاس گئے اور ان کو کابینہ مشن منصوبہ منظور کرلینے پر راضی کیا اور کہا کہ اگر (کانگریس) نے اسے قبول نہ کیا تو مسلم لیگ کے لیے میدان کھلا ہوگا۔ ان کا اندازہ تھا کہ اس طرح کابینہ مشن منصوبے کو کامیابی سے ہم کنار کیا جا سکے گا اور جہاں تک ممکن ہو سکے اس کی ناکامی کو مخفی رکھا جائے)

سردار پٹیل نے مجھ کو بتایا کہ برطانیہ نے ہمیشہ یہ غلطی کی ہے کہ وہ مذاکرات کے دوران میں مسٹر جناح کے لیے راہ ہموار کرتے چلے گئے ہیں، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کو اہانت کا سامنا کرنے سے بچ نکلنے کا موقع ملتا رہا۔ انھوں نے کہا کہ مسٹر جناح اسی صورت میں کابینہ مشن منصوبہ قبول کریں گے جب حالات کا جبران کے لیے کوئی متبادل راستہ نہ چھوڑے۔ ان کا کہنا تھا کہ جوں ہی میں نے بنگال کی تقسیم کا اعلان کیا بنگال کے مسلمان لیگ سے علاحدگی اختیار کرلیں گے تاکہ بنگال کو متحد رکھا جا سکے۔ ان کا خیال تھا کہ پنجاب کے اس کی پیروی میں نکل آنے کا امکان کم موجود ہے، یہ بعید نہیں ہوگا کہ مسلم لیگ مسٹر جناح کے خلاف بغاوت کا علم بلند کردے، جب وہ دیکھے کہ مسٹر جناح کے پاس پاکستان کی صورت میں دینے کے لیے سندھ اور آدھے پنجاب سے زیادہ اور کوئی علاقہ نہیں ہے، جب کہ صوبۂ سرحد پر بدستور کانگریس کی بالادستی قایم رہے۔

چناں چہ ان کا خیال تھا کہ اس صورت میں مسٹر جناح کو یا تو میری شرایط ماننے کے

لیے مجبور ہونا پڑے گا یا لیگ میں ان کو زوال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ سردار پٹیل نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ دونوں حالتوں میں ان سے تعاون کریں گے اور اس موقع پر کانگریس سے کابینہ مشن منصوبہ منظور کر لینے کے لیے میری مدد کریں گے۔ انھوں نے مجھ سے یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ کابینہ مشن منصوبے کے بارے میں کانگریس کی موجودہ پوزیشن کے بارے میں صحیح صحیح اطلاع دیں گے۔

انھوں نے نہایت تلخ انداز میں حکومت برطانیہ کے فیصلے کے بارے میں شکایت کی جس کا علم ان کو حال ہی میں ہوا تھا اور جس کے مطابق حکومت برطانیہ نے سیکرٹری آف اسٹیٹ کو جون ۱۹۴۸ء سے پہلے سبک دوش کر دینے سے انکار کر دیا تھا۔ انھوں نے مجھ سے استفسار کیا کہ ان کے خیال میں اس صورت میں عبوری حکومت کے لیے ملک کا نظام چلانا ممکن ہوگا جب کہ اسے ملازمین پر اختیار حاصل نہ ہو اور وہ حکومت کے غیر وفادار ملازمین سے کس طرح چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں جو مرکزی حکومت کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔

میں نے ان سے کہا کہ اگر وہ غیر وفادار ملازمین کے معاملات ٹھوس ثبوت کے ساتھ میرے علم میں لائیں تو میں خو :ان کے خلاف ضروری اقدامات کروں گا۔

میں نے ان سے کہا کہ اب چوں کہ ہندوستان کو متحد رکھنے کے بارے میں انتہائی شکوک پیدا ہو چکے ہیں، درحقیقت پاکستان ہمارے سامنے خوف ناک شکل میں کھڑا ہے، اس موقع پر میں نہیں کہہ سکتا کہ سیکرٹری آف اسٹیٹ کی خدمات کس کو منتقل کی جائیں۔ ابھی تو یہ بھی صورت واضح نہیں ہے کہ پاکستان اور ہندوستان میں کون لوگ برسر اقتدار ہوں گے۔

آخر میں انھوں نے غیر جذباتی انداز میں دلایل پر مبنی ایک طویل الزام لارڈ ویول کے خلاف اور ان کے انداز حکومت کے خلاف لگایا کہ عبوری حکومت کے قیام سے قبل تک لارڈ ویول نے ایک مضبوط مرکز کے ذریعے حکومت کی اور اس نے اس طریقے سے صوبوں میں امن و امان قایم رکھا۔ جب عبوری حکومت تشکیل پا گئی تب: لارڈ ویول نے یہ اختیارات صوبوں کو منتقل کر دیے تا کہ صوبے مرکزی حکومت کے احکامات کی خلاف ورزی کر سکیں اور کانگریس کی ہدایت کے برعکس مسلم لیگ کو عبوری حکومت میں شامل کر کے ہندوستان کو اس قدر ناتواں بنا دیا ہے کہ ہندوستان بڑی تیزی کے ساتھ ایک لاقانونیت کی شکار ریاست کی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے۔

انھوں نے مجھ سے درخواست کی کہ مرکز کو مستحکم بناؤں اور سرکش صوبوں کو قابو میں کرنے کے لیے مرکزی حکومت کو سہارا دوں اور اس کا مظاہرہ کروں (یعنی ثبوت دوں) کہ میرا مقصد صحیح طور پر امن و امان اور قانون کی حکم رانی قایم کرنا اور خون خرابہ روکنا ہے۔

میں نے جواب دیا کہ میں تو ہندوستان کے مسئلے کا حل تلاش کرنے میں پہلے سے مصروف ہوں اور چاہتا ہوں کہ جلد از جلد اس کا حل مل جائے اور اس کا اعلان کر دوں۔ جس کے بارے میں میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ کسی بھی دوسرے اقدام کی نسبت اس کے ذریعے سے زیادہ بہتری ہو سکتی ہے اور اندرونی کش مکش سے نجات مل جائے گی۔ اس اثنا میں میں ایک صلح نامہ چاہتا ہوں جس پر مسٹر گاندھی اور مسٹر جناح کے دستخط ہوں۔

ڈاکومنٹ نمبر ۱۳۳: ریئر ایڈمرل وائسکاؤنٹ ماؤنٹ بیٹن آف برما اور مولانا آزاد کے درمیان انٹرویو کا ریکارڈ

ماؤنٹ بیٹن پیپرز — وائسرائے کا انٹرویو نمبر ۵۶

۱۲ر اپریل ۱۹۴۷ء انتہائی خفیہ

یہ ملاقات شام سوا چار بجے سے سوا پانچ بجے تک جاری رہی۔

میں نے مولانا آزاد سے مسٹر جناح کے ساتھ اپنی گفتگو کا سرسری سا تذکرہ کیا۔ میری گفتگو سننے کے بعد انھوں نے کہا اب جب کہ مجوزہ کابینہ مشن منصوبے پر عمل درآمد کی صورت میں مکمل پاکستان حاصل ہو سکتا ہے، کٹا پھٹا پاکستان مسلمانوں کی تباہی کا باعث ہوگا اور اگر مسٹر جناح اب بھی اس کو حاصل کرنے پر مصر ہیں تو یہ فیصلہ خودکشی کے مترادف ہوگا۔

انھوں نے کہا کہ وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ مسٹر جناح کابینہ مشن منصوبے کو قبول کیوں نہیں کرتے؟ جب کہ اس میں دس سال بعد مسلمانوں کو حسب خواہش مرکز سے علاحدگی کا اختیار ہوگا۔

انھوں نے کہا کہ میں نے مذاکرات کو بالکل درست نہج پر رکھا۔ انھوں نے مجھ کو ہدایت کی کہ میں ان نکات کو ٹھیک سے معلوم کروں جن کی بنا پر مسٹر جناح نے کابینہ مشن منصوبے کی منظوری واپس لینے کا فیصلہ کیا ہے۔ تب میں کوشش کروں کہ ان نکات پر مسٹر جناح کی تسلی کروں۔

وہ مسٹر جناح کے اعتراضات کو دو طرح کے خیال کرتے ہیں:

(۱) گروپ ''سی'' میں شامل صوبے کس طریقے پر کام کریں گے؟ ان کی اصل پریشانی بنگال اور آسام ہے لیکن اس کو تو حکومتِ برطانیہ نے اپنے اعلان چھ اور سات دسمبر کے ذریعے دور کر دیا ہے۔

(۲) کابینہ کی تشکیل کے بارے میں معمولی سا نکتہ ہے، مسٹر جناح اس پہلو پر بہت زیادہ اصرار کرتے ہیں کہ اگر اقلیتوں کی جگہ کابینہ میں خالی ہوتی ہے تو اس کو پر کرنے کے لیے ان سے رائے لی جائے۔ مولانا آزاد نے کہا کہ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ کانگریس مسلم لیگ کے اس مطالبے سے اتفاق کر سکتی ہے، اگر اس سلسلے میں ہل چل کی جائے۔

انھوں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اگر میں بنگال کو تقسیم کرنے کا اعلان کر دوں تو ان کو اندازہ ہے کہ بنگال کے مسلمان مسلم لیگ سے الگ ہو جائیں گے، لیکن پنجاب کے معاملے میں یہ امکان نسبتاً کم ہے۔ آخر میں انھوں نے کہا کہ اگر یہ بات عام لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ مسٹر جناح نے (صوبوں کی) تقسیم پر اتفاق کر لیا ہے تو اس صورت میں ان صوبوں کے مسلمانوں کا تشدد آمیز ردعمل رونما ہوگا جو مسلم لیگ کے خلاف بغاوت کی شکل بھی اختیار کر سکتا ہے۔

مولانا آزاد نے کابینہ مشن منصوبے پر کانگریس اور مسلم لیگ کو رضامند بنانے کی کوششوں میں میری ہر ممکن مدد کرنے کے لیے اپنی خدمات رضاکرانہ طور پر پیش کیں۔ انھوں نے مجھ سے وہی باتیں کہیں جو ہر ایک نے مجھ سے کہی تھیں کہ ان کو یقین تھا کہ اگر مسٹر جناح واقعی طور پر کابینہ مشن منصوبہ قبول کر لیں تو آیندہ چند ماہ کے اندر کسی وقت بھی کانگریس کا تعاون حاصل ہونے کے کافی امکانات موجود ہیں۔

اس کے بعد انھوں نے (مولانا نے) سرحد کا مسئلہ اٹھایا اور کہا کہ اس صوبے میں حکومت نے ہمیشہ دو عملی کی حکمت اختیار کیے رکھی ہے۔ حکومت (گورنر) کی ذمہ داری صوبائی حکومت کے ساتھ قبایل کے سیاسی امور کے بارے میں بھی ہوتی ہے۔ ۱۹۳۸ء میں کانگریس کی وزارت نے اس مشکل کو محسوس کیا تھا اور شدید طریقے سے اس کی شکایت کی تھی۔ گذشتہ برس کے انتخابات کے بعد جب مولانا آزاد پشاور گئے تو انھوں نے دیکھا کہ کانگریس کے نومنتخب ممبران اسمبلی اس وقت تک وزارت سازی کے حق میں نہ تھے جب تک گورنر کے رویے اور پولی ٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے بارے میں ان کو مطمئن نہیں کر دیا جاتا، اس

لیے وہ اس سلسلے میں لارڈ ویول سے ملاقات کرنے کے لیے پشاور سے دہلی گئے۔ لارڈ ویول نے کہا کہ ڈاکٹر خان صاحب کو تشویش کرنے کی ضرورت نہیں۔ لارڈ ویول نئے گورنر کو ہدایات جاری کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں کہ وہ کانگریس کی حکومت کے ساتھ ٹھیک طریقے سے پیش آئے۔ مولانا آزاد کے کہنے پر لارڈ ویول نے یقین دہانی کا ایک خط تحریر کیا جس کی نقل مولانا آزاد اپنے ہم راہ لے کر پشاور گئے اور اس بنا پر ڈاکٹر خان صاحب کو حکومت سازی کے لیے آمادہ کیا۔

جوں ہی سر اولف کیرو نے چارج سنبھالا اس نے اپنے طرز عمل سے واضح کر دیا کہ وہ کانگریس کا زبردست مخالف اور مسلم لیگ کا طرف دار ہے۔ سوال یہ نہ تھا کہ اس نے لارڈ ویول کے وعدے کی پاس داری نہ کرتے ہوئے کانگریس کی حکومت سے تعاون نہ کیا بلکہ اس نے سوچی سمجھی اشتعال انگیزی کو چھپانے کی زحمت گوارا نہ کی۔ مولانا نے کہا کہ وہ اس سے اس تکلیف دہ نتیجے پر پہنچے کہ اگر ناممکن نہیں تو کانگریس کی حکومت کے لیے یہ مشکل تر ضرور ہے کہ وہ گورنر کے ساتھ تعاون کے سلسلے کو جاری رکھے۔

میں نے ان سے کہا کہ مجھ کو اس نوعیت کی رپورٹیں پنڈت نہرو، مسٹر گاندھی اور خان عبدالغفار کی وساطت سے بھی ملی ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ کانگریس کا مصدقہ نقطۂ نظر ہے۔ مجھے یہاں آئے ہوئے تین ہفتے اور ایک گھنٹہ ہوا ہے۔ اس اثنا میں اپنی اولین ترجیح یعنی ہندوستان کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے مکمل طور پر مصروف رہا ہوں اور میں اسی مسئلے کو اپنی ترجیح خیال کرتا ہوں اور اس موقع پر میں صوبۂ سرحد کے مسئلے پر توجہ دینے کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ جوں ہی فیصلے کا اعلان ہوا تو میں سمجھتا ہوں کہ غالباً صوبۂ سرحد میں دفعہ ۹۳ کا نفاذ لازمی ہوگا اور نئے انتخاب کرانا ہوں گے۔ اس کے بعد میں اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے پوری طرح تیار رہوں گا کہ آیا موجودہ گورنر کو وہاں رہنا چاہیے؟ میں نے ان کو بتایا کہ لارڈ ویول نے مجھ کو گورنر کے خلاف مہم سے خبردار کیا تھا اور رائے دی تھی کہ میں جلد بازی میں کوئی کارروائی نہ کروں۔

مولانا نے افسوس ظاہر کیا کہ مجھ کو صوبۂ سرحد میں نئے سرے سے الیکشن کرانے کی ضرورت محسوس ہوئی، جب کہ وہاں صرف ایک سال قبل صوبے میں منصفانہ الیکشن ہو چکے ہیں اور چند شہری علاقوں میں مسلم لیگ کے پروپیگنڈا کے سوا صورت حال کو تبدیل کرنے

کے لیے کچھ نہیں ہوا۔ درحقیقت ان کا خیال تھا کہ نئے انتخابات میں کانگریس پھر منتخب ہو جائے۔

میں نے ان سے کہا کہ پنڈت نہرو کا خیال ہے کہ شاید کانگریس دوبارہ کامیاب نہ ہو سکے، کیوں کہ سرحد کے لوگ ہمیشہ حکومت کے خلاف ووٹ دیتے ہیں۔ مولانا آزاد نے مجھ سے استفسار کیا کہ آیا میں دوسرے صوبوں میں بھی انتخاب کرانے کے لیے تیار ہوں؟ میں نے جواب دیا ''نہیں، جب تک کہ یہ ثابت نہ کر دیا جائے کہ وہاں الیکشن کرانا ضروری ہیں۔'' تب انھوں نے پوچھا صوبۂ سرحد میں انتخاب کرانا کیوں ضروری خیال کرتا ہوں؟ میں نے جواب میں کہا کہ یہ تمام دوسرے صوبوں میں جدا حلقۂ انتخاب کی وجہ سے پیشین گوئی کی جا سکتی ہے، جو کافی حد تک درست ثابت ہو سکتی ہے کہ مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان مقابلے کی صورت میں کس کو کامیابی نصیب ہوگی۔ کیوں کہ تمام مسلمان مسلم لیگ کو ووٹ دیتے ہیں۔ جب کہ صوبۂ سرحد میں الیکشن کانگریسی مسلمانوں اور مسلم لیگی مسلمانوں کے درمیان ہوتے ہیں اور یہاں الگ حلقۂ انتخاب نہیں ہیں اس سے یہ نتیجہ سامنے آئے گا کہ یہاں کے لوگ لیگ کی حکومت چاہتے ہیں یا کانگریس کی؟

مولانا آزاد نے کہا کہ اگر میں الیکشن کرانے پر مصر ہوں تو وہ خیال کرتے ہیں کہ انتخاب اسی صورت میں ہوں گے جب میں نے پاکستان بنانے کے حق میں فیصلہ دیا، اگر کابینہ مشن منصوبہ منظور کر لیا جائے تو اکثر صوبوں میں، جن میں صوبۂ سرحد بھی شامل ہے، مخلوط حکومت قایم ہوگی۔ (تحریکِ پاکستان اور انتقالِ اقتدار: ص ۹۶-۱۹۱)

مسٹر جناح کا اتحاد سے گریز:

۱۳/اپریل ۱۹۴۷ء: مسٹر محمد علی جناح نے ایک بار پھر مسلمانوں کے اتحاد کی اپیل کو ٹھکرا دیا۔ مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی ناظم اعلا جمعیت علماے ہند نے ایک آل پارٹیز کانفرنس میں شریک ہو کر تمام مسلمان پارٹیوں سے مشترکہ لائحہ عمل اختیار کرنے کی اپیل کی تھی۔ جناح صاحب فرماتے ہیں کہ سب کو مسلم لیگ میں شامل ہو کر اپنے اخلاص کا ثبوت دینا چاہیے۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کے اتحاد کی صرف یہی ایک صورت تھی کہ تمام مسلمان اپنی اپنی پارٹیاں توڑ کر ان کی قیادت میں مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع

ہو جائیں۔اس سے پہلے وہ مولانا شبیر احمد عثمانی کی کوششوں کو بھی یہی کہہ کر ناکام بنا چکے تھے۔حقیقت یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کا متحد ہونا پسند ہی نہ کرتے تھے۔اب آپ روزنامہ زمزم-لاہور کی رپورٹ ملاحظہ فرمایئے:

نئی دہلی۔۱۳؍اپریل: مسٹر محمد علی جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ نے مولانا حفظ الرحمٰن جنرل سیکرٹری جمعیت علما کے تار کے جواب میں تمام مسلمانانِ جمعیت علما سے مسلم لیگ میں شامل ہو جانے کی اپیل کی ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن نے مسٹر جناح سے ایک آل پارٹی کانفرنس منعقد کر کے مسلمانوں کو متحد کرنے کی التجا کی تھی۔

مسٹر جناح نے مذکورہ بالا اپیل کے جواب میں مولانا حفظ الرحمٰن کو لکھا ہے کہ میں برطانیہ کے ۲۰؍فروری کے وہائٹ پیپر کے پیش نظر آپ کے خیال کی تائید کرتا ہوں اور میں نے اس ضرورت کا اظہار کئی بار کیا ہے۔میں اس امر میں آپ سے متفق ہوں کہ اس موقع پر مسلمانوں کو بالکل متحد ہو جانا چاہیے۔گذشتہ دو تین ہفتے میں میں نے ایک سے زاید مرتبہ تمام مسلمانوں سے اپیل کی ہے کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں۔مولانا حفظ الرحمٰن نے لکھا تھا کہ "برطانیہ کے ۲۰؍فروری کے بیان کے پیش نظر مسلمانوں کو متحد کرنا ضروری ہے۔آپ نے یہ بھی لکھا تھا کہ کہ کسی اسلامی جماعت کا فیصلہ خواہ وہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو، دوسری جماعتوں سے مشورے کے بغیر احکام قرآنی کی رو سے درست نہیں۔آپ نے آخر میں کہا تھا کہ جمعیت اس معاملے میں مسٹر جناح سے تعاون کرنے کے لیے تیار ہے۔"

مسٹر جناح نے بیان جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اس موقع پر ہمیں کسی گھریلو اختلاف میں نہیں پڑنا چاہیے، یہ وہ چیز ہے جسے ہم اپنے طور سے نئے آئین کے ماتحت رفع کر سکتے ہیں۔چوں کہ بیرونی خطرہ سر پر ہے اس لیے اندریں حالات میں آپ سے صدقِ دل سے پُرزور اپیل کرتا ہوں کہ آپ بلا پیش و پس مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں۔

مسلم قوم کی مشکلات رفع کرنے اور پاکستان حاصل کرنے میں حصہ لیں۔یہ چیز اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے کہ ہم آپس میں متحد ہوں اور مسلم لیگ کے صدقِ دل سے وفادار بن جائیں جو کہ مسلمانوں کی منظم اور مسلم جماعت ہے۔میں نے یہ امر واضح کر دیا کہ کوئی مسلمان جو مسلم لیگ میں شامل ہونا چاہے، خواہ پہلے اس کا کوئی بھی مسلک رہا ہو، اس کا خیر

مقدم کیا جائے گا اور میں اس سلسلے میں جمعیت علماے ہند کے ہر رکن کو خوش آمدید کہوں گا۔
میں یقین کرتا ہوں کہ آپ میری اس اپیل پر جوشِ دل سے توجہ کریں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حالات میں اور ہندو جماعتوں کے تازہ مسلک کے پیش نظر کوئی چیز آپ کو میری التجا منظور کرنے میں مانع نہیں ہوگی۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے صورت حال کو اچھی طرح جانچ لیا ہے اور میں آپ کے اس جذبے کی بہت قدر کرتا ہوں کہ اس اہم موقع پر ہم متحد ہو جائیں۔(ا۔پ)(زمزم۔لاہور:۱۳/اپریل ۱۹۴۷ء،ص۴)

حضرت شیخ الاسلام کا ایک تاریخی خط:

۱۴/اپریل ۱۹۴۷ء: آزادی کی تحریک میں کس کس طرح روڑے اٹکائے گئے، کیا کیا مسایل پیدا کیے گئے، کیسی کیسی بحثیں چھیڑی گئیں اور اعتراضات اٹھائے گئے اور کس کس طرح انگریزوں کا حقِ نمک ادا کرتے ہوئے آزادی کی منزل سے ملک کو دور سے دور تر لے جانے، برٹش عہد استعمار کو طویل تر کرنے کے لیے کون کون سے حربے استعمال کیے گئے تھے اور مسلمانوں نے عقل وبصیرت سے کام لینے سے کیسے انکار کر دیا تھا؟ سوچتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے۔ آج بہت سی باتیں تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں لیکن ماضی میں مسلمانوں کی نادانیاں موجودہ نسل کے لیے عبرت وغفلو کا سب سے بڑا درس ہیں۔ حضرت شیخ الاسلام کا یہ مکتوب سامی ہمیں اسی نقطۂ نظر سے پڑھنا چاہیے کہ یہ ہماری تاریخ، ہماری نادانیوں کی داستان ہمارے لیے ایک عظیم درس عبرت ہے اب یہ ہماری غفلت و نادانی پر تاریخ کا تازیانہ بھی بن چکا ہے۔ حضرت کا یہ مکتوب بھی چاہ میراں والا ضلع مظفر گڑھ کے حافظ محمد صدیق کے نام ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

محترم المقام زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاج شریف، والا نامہ باعثِ سرافرازی ہوا، احوال مندرجہ کو پڑھ کر سخت تعجب ہوا۔ آپ جیسا سمجھ دار تجربہ کار بھی غلط جذبات میں پھنس رہا ہے۔ میرے محترم دوست! آپ کو معلوم ہے کہ اگرچہ تمام غیر اسلامی مذاہب اور ان کے ماننے والے اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں، مگر سب دشمن ایک طرح کے نہیں ہوتے، کوئی بڑا ہے، کوئی چھوٹا

ہے، ہر دشمن سے اس کے درجے کے موافق مقابلہ کرنا لازم ہوگا۔ جب سے اسلام نے ظہور کیا ہے انگریز نے برابر اسلام اور مسلمانوں کو اس قدر نقصان پہنچایا کہ کسی دوسری قوم نے نقصان نہیں پہنچایا۔ انگریز دو سو برس سے زیادہ عرصے سے اسلام کو فنا کر رہا ہے، اس نے ہندوستان کی اسلامی طاقت کو فنا کیا، بادشاہوں، نوابوں اور امرا کو قتل کیا، ان کی فوجوں کو برباد کیا، حکومت ہائے اسلامیہ کو تہ و بالا کیا، خزانوں کو لوٹا، اپنے اقتدار کا خزانہ قایم کیا، اپنے قوانین کو جاری کیا، ہندوستان کی تجارت، صنعت و حرفت، علم، تہذیب وغیرہ کو برباد کیا، ٹیکسوں اور لگانوں وغیرہ کے ذریعے سے ہر قسم کی مالی لوٹ جاری کر کے اپنے ملک کو غنی اور ہندوستان کو کنگال بنایا، ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کو انتہائی ذلیل، نادار، بے کار، بے روزگار بنایا، مسلمانوں سے ہندوستان کے دوسرے مذہب والوں کو متنفر کر کے دشمنی کی آگ بھڑکائی اور ہر جگہ بے ہتھیار اور کم زور کیا، ہندوستان میں اسلامی قوانین کے خلاف شراب اور منشیات کی آزادی، زنا اور بدکاری کی آزادی، الحاد و زندقہ و ارتداد کی آزادی، عدالتوں میں خلاف اسلام قانون کا اجرا اور وہاں کے موافق فیصلہ جات جاری کیے۔ محکمہ قضا کے خلاف معاہدہ ہٹا کر مسلمانوں کے اسپیشل قوانین کو ملیامیٹ کیا وغیرہ وغیرہ۔ ہندوؤں کو قصداً بڑھا کر ہر محکمے اور ہر شعبۂ زندگی میں قومی تر کیا اور سود در سود کو جاری کیا۔ غرضے کہ ہر طرح سے اسلام اور مسلمانوں کو ہندوستان میں برباد کیا اور جب کہ مسلمانوں نے اپنے فطری اور شرعی حق آزادی کے لیے جدوجہد کی تو ان پر اس قدر مظالم کیے کہ ان کی یاد سے بھی دل تھرا اتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی تاریخ اور اس سے پہلے کے واقعات دیکھیے، معاہدات اور وعدے جو کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے کیے تھے اور جو ۱۸۵۷ء میں ہوئے ان کو بار بار توڑتے رہے۔ غرضے کہ ہندوستان مسلمانوں کے خصوصاً اور تمام ہندوستان کے باشندوں کے ساتھ عموماً وہ شرم ناک معاملے کیے کہ وہ ہندوستان جو کبھی جنت نشان تھا جہنم نشان بن گیا۔ وہ ہندوستان جو کہ دولت اور ثروت کا مرکز تھا وہ فقر و فاقہ، افلاس و تنگ دستی کا اڈہ ہوگیا۔ وہ ہندوستان جو کہ علم و حکمت کا سمندر تھا وہ جہالت اور بددینی کا چٹیل میدان ہوگیا۔ وہ ہندوستان جو کہ تمام دنیا کا محتاج الیہ تھا وہ سب سے زیادہ مفلس، قلاش، مسکین، فاقہ مست، بے کمال، بے روزگار، گرانی اور پس ماندگی کا شکار ہوگیا۔ یہ مظالم تو تھے ہی..... جن میں مسلمان سب سے زیادہ تباہ ہوئے۔

وکٹوریہ کے اعلان ۱۸۵۸ء میں پرزور وعدہ کیا گیا تھا کہ اپنی قلم رو کو نہ بڑھائیں گے اور دوسرے علاقوں پر اب کے بعد قبضہ نہ کریں گے، مگر تھوڑے ہی عرصہ تقریباً ۲۰ برس کے اندر افغانستان پر یکے بعد دیگرے چڑھائی کی اور ہزاروں مسلمان کا خون بہایا، چار مرتبہ حملے کیے، آزاد مسلم علاقوں پر قبضہ کرتے رہے۔ سوات، بنیر، چترال، کوہاٹ، آفریدی علاقے، مسعودی علاقے، وزیری علاقے وغیرہ اور اسی طرح بلوچستانی علاقوں پر کیا کیا مظالم نہیں ڈھائے اور یکے بعد دیگرے خلافِ عہد ان علاقوں کو اپنی قلم رو میں ملاتے رہے، وہاں کے باشندوں کو غلام بنایا، آزادی خواہوں کو قتل و غارت کیا۔

آپ اپنے ہی علاقے کی تاریخ دیکھیے، یہ سب کچھ تو ہندوستان اور اس کے اطراف کے ملکوں پر ہوا ہی تھا جو کہ ہمیشہ ہندوستان ہی کی غلام فوجوں، وہاں کی رسدوں، ہتھیاروں وہاں کی نقدی طاقتوں کے ذریعے سے ہوتا رہا۔

مگر اسی کے ساتھ، عراق، شام، مصر، فلسطین، عرب، شمالی آئرلینڈ، مشرقی افریقہ، سوڈان، برما وغیرہ کے اسلامی عروج کو پامال کیا، خلافت عظمیٰ کو زیروزبر کیا۔ حجاز، جدہ، مکہ اور مدینہ پر چڑھائی کی۔ چناق قلعہ، سمرنا، استنبول وغیرہ میں کیا کیا نہیں کیا اور ان مقامات میں خون کی ندیاں کیا نہیں بہائیں؟ پھر اس پر طرہ یہ کہ یورپین طاقتوں میں اسلامی ممالک کو تقسیم کیا۔ طرابلس، صحرائے لیبیا، ادرنہ، سورکن وغیرہ اٹلی کو، ریف اسپین کو الجیریا تیونس، فاس، مراکش وغیرہ فرانس کو، وسط ایشیا اور شمالی ایشیا کے ممالک بخارا، سمرقند، گرجستان، ازبکستان، داغستان، قرقستان وغیرہ روس کو برابر معاہدوں وغیرہ کے ذریعے سے تقسیم کرتے رہے۔ ٹرکی سے بلغیریا، یونان، مقدونیہ، رومانیہ، ہرسکٹ، البانیہ، سردیہ، مانٹی گرو، کریٹ، بلقان وغیرہ کو مجبور کر کے آزاد کراتے اور اسلامی طاقت کو فنا کراتے رہے۔ ان دل خراش اور ہوش و حواس کو مٹا دینے والے واقعات سے تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں جو کہ عموماً ان تین سو سال کے اندر یعنی تقریباً ۱۶۴۰ء سے ۱۹۴۰ء تک میں واقع ہوئے ہیں اور جن میں انگریز ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں، پھر بتلائیے کہ انگریز کے برابر دنیا میں کس قوم نے آج تک اسلام اور مسلمانوں کی دشمنی کا ثبوت دیا ہے؟

ہندو تو آپ کا ایک ہزار برس یا زاید سے رعیت چلا آتا ہے اور اس کو بھی اسی انگریز نے آپ کے مقابل کھڑا کیا اور بڑھایا ہے، اس لیے آپ کو غور کرنا چاہیے کہ آپ کا فریضہ کیا

ہے، انگریز کو مٹانا اور انتقام لینا اور اس کے اقتدار کو گھٹانا یا ہندو کو؟ انگریز کو اپنے اقتدار کو باقی رکھنے اور اپنی تجارت وغیرہ کے لیے ضرورت ہے کہ آبنائے دور سے بمبئی تک کا سمندر اور ان کے سواحل اپنے قبضہ واقتدار میں رکھے۔ اپنے لیے امن وامان اور تجارت اس راستے میں قایم کرے جس کی بنا پر اس کو بحرۂ اٹلانٹک، بحرۂ روم، بحرۂ قلزم، بحرۂ ہند، بحرۂ فارس پر قبضہ کرنا اور اطمینان حاصل کرنا ضروری ہے۔ ہوائی جہازوں کے لیے، سمندری جہازوں کے لیے لندن سے ہندوستان تک اگر مراکز اور مخازن نہ ہوں گے تو وہ ہندوستان میں اپنے مقاصد حاصل نہیں کرسکتا ہے۔ اس لیے ان تمام ممالک کو جو کہ راستے میں ہیں ہمیشہ زیروزبر کرتا رہا اور ہندوستان ہی کی فوجوں سے کرتا رہا، ہندو کو ان ممالک میں غلام بنانے اور ان پر اقتدار قایم رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہندو میں بالفعل اتنی طاقت نہیں ہے جتنی انگریز میں ہے، اس لیے ماضی، حال، مستقبل میں سب سے بڑا دشمن انگریز ہی ہے۔ ہندو کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ ممکن ہے کہ وہ مستقبل میں ایسا ہی یا اس سے زیادہ ہوجائے، مگر یہ امر مظنون یا موہوم ہے، اسی بنا پر ہمیشہ اکابر اسلام نے ہندوستان میں انگریز سے آزادی حاصل کرنا اور اس کے اقتدار کو مٹانا ضروری سمجھا اور اسی بنا پر کانگریس بنائی گئی اور اس لیے مسلمانوں نے اس میں شرکت کی اور اسی لیے جمعیت علما اس کے ساتھ اشتراک عمل کیے ہوئے ہے، جب تک ہندوستان مکمل آزاد نہ ہوجائے، یعنی کم از کم تمام انگریزی فوجیں اور وایسرائے اور گورنر انگریز یہاں سے چلے نہ جائیں اور مکمل اختیارات ہندوستانیوں کے قبضے میں نہ آجائیں یہ فریضہ باقی ہے۔ ہاں! اگر کانگریس یہ اعلان کردے کہ اب ہم انگریز کو یہاں سے نکالنا نہیں چاہتے تو بے شک ہم کو اس سے اشتراکِ عمل سے رُکنا پڑے گا۔ باقی رہا ان منافات کا حاصل کرنا جن کو آپ یا کوئی دوسری جماعت مسلمانوں کے لیے مستقبل میں مفید یا ضروری سمجھتے ہیں، یہ بعد کا مسئلہ ہے۔ دفع ضرر منفعت سے مقدم ہے۔ اگر گاؤں میں آگ لگی ہے تو پہلے آگ بجھایئے پھر اپنی زمینوں کی تقسیم کا فیصلہ کیجیے۔ اگر مریض ہیں تو پہلے مرض کو دفع کیجیے پھر تقویت کی فکر کیجیے گا۔

میرے محترم! آپ خود جانتے ہیں کہ انگریز کا ہمیشہ سے اصول رہا ہے ''لڑاؤ اور حکومت کرو۔'' اسی اصول اور عمل درآمد کے ذریعے سے اس نے ہندوستان پر قبضہ کیا اور آج تک قبضہ کیے ہوئے ہے۔ اسی اصول کی بنا پر اس نے کانگریس کے مقابل ۱۹۰۶ء میں

لیگ اور مہا سبھا کی بنیاد ڈالی اور آج تک دونوں کو پالتا رہا اور بڑھاتا رہا اور اسی اصول کے مطابق جب بھی زمانہ ہائے سابقہ میں آزادی کے لیے جدو جہد اُبھری تو اس نے لڑائی مختلف مقامات میں فرقہ وار کرائی اور حسبِ قوت تحریکِ آزادی فرقہ وارانہ فسادات بھی زور پکڑتے رہے۔ اس جنگِ عمومی کے بعد چوں کہ تحریکِ آزادی بہت قوت پذیر ہوئی ہے اس لیے یہ فرقہ وارانہ فسادات بھی اسی پیمانہ پر ہیں، لیگ اور مہا سبھا اس کے آلہ ہائے کار ہیں۔ اس لیے دونوں خوب اُودھم مچاتے رہے تاکہ یہ عذر ہاتھ لگے کہ بغیر ہمارے (انگریزوں کے) ہندوستان میں امن و امان نہیں رہ سکتا اور تاکہ ہندوؤں اور سکھوں کی طرف سے پنجاب، سرحد، سندھ، اور بنگال کی سمت سے کہ سرکار (انگریز) آپ ہی کا راج ہمارے لیے بہتر ہے، آپ نہ جایئے، یوپی، بہار، مدراس، بمبئی سے مسلمانوں کی آواز اُٹھے کہ سرکار آپ کے بغیر ہم زندہ نہیں رہ سکتے، آپ یہاں سے نہ جایئے! تو آقا صاحب (انگریز) دنیا میں یہ مشہور کریں کہ ہم کیا کریں، ہم تو ہندوستان چھوڑنے کے لیے تیار تھے، ہم نے تو انتقالِ اختیارات کی تاریخ بھی معین کردی تھی اور ہم نے تو انتقالِ اختیارات کے لیے وائسرائے بھی بھیج دیا تھا، مگر ہندوستان کے عوام ہندو اور مسلمان ہمارا جانا نہیں پسند کرتے اور ہمارے ہی سائے کو رحمانی سمجھتے ہیں، ہم مجبور ہیں۔

محترما! آپ غور سے واقعات کو دیکھیں اور تفتیش کریں، ان سب واقعات میں مسٹر چرچل اور کنزرویٹیو اور ٹوری پارٹی کا کھلا ہوا ہاتھ ہے اور ممکن ہے کہ دوسری پارٹیوں کا خفیہ ہاتھ بھی ہو۔ اگر آپ میرے پاس ہوتے تو میں انگریزوں کی شہادتیں بھی دکھلاتا۔

میرے محترم! تحریر میں سب باتوں کا لانا بہت مشکل ہے، اتنی فرصت کہاں سے لاؤں، ان حقائق پر غور کرنے کے بعد آپ اب ان تفصیلات پر نظر ڈالیے جو موجودہ فتنوں کا باعث ہو رہی ہیں:

(۱) لیگ کا نظام ترکیبی کیا ہے، بالخصوص ورکنگ کمیٹی اور کونسل کا۔ کیا اس میں نواب، مہاراجہ، سرکاری خطاب یافتہ بڑے بڑے زمین دار، علاقہ دار، پیلنشنر وغیرہ سرکار پرستوں کا غلبہ اور اکثریت نہیں ہے؟

(۲) کیا یہ لوگ ہمیشہ سے انگریز پرست نہیں رہے ہیں؟

(۳) کیا لیگ نے انگریزوں ہی کی عنایتوں کے پیٹ سے جنم نہیں لیا؟ شملہ کے

ڈیپوٹیشن ۱۹۱۶ء کو بہ عہد لارڈ منٹو اور اس کی تمام تفصیلوں پر نظر ڈالیے اور اگر پتا نہ ہو تو کتاب ''مسلمانوں کا روشن مستقبل'' مطبع نظامی شہر بدایوں سے منگا کر دیکھیے۔

(۴) کیا لیگ نے کبھی اپنی تمام عمر میں بہ جز ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۹ء کبھی ہندوستان کی آزادی کے لیے کوئی جدوجہد اور قربانی کی ہے؟

(۵) کیا لیگ کے ہائی کمان اور اعلا عہدہ داروں کو اسلام اور مذہب سے قریب کا تو درکنار دور کا بھی واسطہ رہا ہے یا اب موجود ہے؟

(۶) کیا لیگ کے زعما میں کلیت یا اکثریت مخلص غیور لوگوں کی ہے یا خود غرضوں جاہ پرستوں کی اور وزارت اور عہدوں کے بھوکوں کی؟

(۷) کیا لیگ اور اس کے زعما ہی نے اکثریت کے صوبوں کو ۱۹۱۶ء سے لے کر ۱۹۳۰ء تک نقصان نہیں پہنچایا اور اپنی اغراض کے لیے اقلیت کے صوبوں میں وتیج لے کر اکثریت کے صوبوں کو اقلیت میں نہیں لائے؟

(۸) کیا لیگ اور اس کے زعما ہی نے ۱۹۳۱ء میں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں اقلیتوں کا معاہدہ وغیرہ کر کے مسلمانانِ ہند کو برباد نہیں کیا، کیا اس معاہدے میں انگریزوں اور اینگلو انڈین اور ہندوستانی عیسائیوں کے لیے بنگال میں ۱۳ نشستیں تسلیم کی گئیں؟

(۹) کیا لیگ اور اس کے زعما بلکہ جملہ کارکنوں نے ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۵ء تک انتہائی تنفر اور عداوت کی فرقہ ورانہ آگ ہر پلیٹ فارم اور ہر پریس و آرٹیکل اور ہر لیکچر وغیرہ میں نہیں لگائی؟

(۱۰) کیا لیگ اور اس کے زعما نے اپنے اعلانات اور اشتعال آمیز بیانات کے بعد دہلی میں کونسل بلا کر اکثریت عظیمہ سے ایک مرکز (خلافتِ پاکستان) قبول نہیں کیا اور ڈیلی گیشن کی تجویز کیا منظور نہیں کی؟

(۱۱) کیا پھر لیگ نے ۲۹/ جولائی ۱۹۴۶ء کو بمبئی میں اس تجویز اور منظوری کو رد کر کے ۱۶/ اگست ۱۹۴۶ء کو ڈائریکٹ ایکشن کو پاس نہیں کیا۔

(۱۲) کیا ڈائریکٹ ایکشن پاس کرنے کے بعد لیگ کی طرف سے ہر جگہ کے لیے اعلانِ جہاد اور اشتعال انگیز تقریریں، تحریریں، پوسٹر وغیرہ شایع نہیں کیے گئے؟

(۱۳) کیا اس تاریخ ۱۶/ اگست سے پہلے کہیں بھی ہندوستانی باشندوں میں عام فرقہ

وارانہ فسادات ہوئے تھے؟ یہی ہندو اور یہی سکھ وغیرہ یہاں بستے تھے، یہ فسادات اس وقت تک نہ ہوتے تھے۔

(۱۴) کیا ان فسادات عامہ کی ابتدا اسی صوبے اور شہر سے ۱۶ اگست کو نہیں ہوئی جس میں تمام حکومت اور اقتدار لیگ کے قبضہ میں تھا؟

(۱۵) کیا نواکھالی اور ٹپرہ میں جو مظالم خلافِ انسانیت اور خلافِ شریعت واقع ہوئے وہ لیگ ہی کے کیے ہوئے نہ تھے۔

(۱۶) کیا ان مظالم کی داستانیں خود لیگ کے زیرِ حکم صوبے اور وہاں کے اخباروں، تاروں، ٹیلی فونوں، ریڈیو سے مبالغہ آمیز شایع نہیں ہوئے، کیا لیگ کی حکومت نے ان پر کوئی سنسر کیا تھا؟

(۱۷) کیا لیگ کی حکومت نے کوئی اطمینان بخش کارروائی ان فسادات کو روکنے کی وہاں کی؟

(۱۸) کیا بہار اور گڑھ مکٹیسر میں جو واقعات ہوئے ان میں یہی اعلان اور جذبہ ظاہر نہیں کیا گیا کہ یہ نواکھالی اور مشرقی بنگال کے مظالم کا بدلہ ہے۔

(۱۹) کیا لیگ اور اس کے زعما ہمیشہ یہی فلسفہ نہیں پیش کرتے رہے کہ مسلم اقلیت کے صوبوں میں جو معاملہ ہندو اکثریت مسلمانوں کے ساتھ کرے گی، ہم اس کا بدلہ پاکستان میں ہندو اقلیت کے ساتھ عمل میں لائیں گے؟

(۲۰) کیا یہ فلسفہ صحیح تھا، اور جب کہ ابتدا مسلم لیگ نے مشرقی بنگال میں کردی اور لیگیوں کی طرف سے اس پر کوئی ایکشن نہیں لیا گیا اور بہار اور گڑھ مکٹیسر میں اسی فلسفے کا اعلان کرتے ہوئے ہندوؤں نے مسلمانوں پر مظالم کی بوچھاڑ کردی تو کیا ہم کو الزام دینے کی گنجایش باقی رہتی ہے؟

(۲۱) کیا ہر قسم کی اشتعال انگیزی، بھڑکانا، الٹی میٹم دینا، اعلان جنگ کرنا، مسلمانوں کی واحد نمایندگی کی دعوے دار جماعت سے نہیں ہوا؟ غور فرمایئے! قاید اعظم ایک کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کی مخالفت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> (۱) ہلاکو اور چنگیز خان کے خونی باب کی پھر سے تقلید کریں گے۔ ہم بہترین حالات کی امید کرتے ہیں، لیکن بدترین کے لیے تیار رہیں۔ ہمیں

پاکستان سے کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔" (ڈان۔۸/اپریل ۱۹۴۶ء)

(۲) ڈائریکٹ ایکشن کا فیصلہ ہماری تاریخ اور ہماری پالیسی میں ایک انقلابی قدم ہے اور پاکستان کی جنگ کے لیے تیار رہنا ہے۔

(ڈان۔۱۵/اگست ۱۹۴۶ء)

(۳) ہندوستان میں زبردستی خانہ جنگی ہونے والی ہے، نئے سرے سے گفت وشنید شروع کی جائے۔ ملک کے سامنے دو راستے ہیں، ایک خانہ جنگی، دویم گفت وشنید کے ذریعے باہمی سمجھوتا۔ (ڈان۔۱۲/دسمبر ۱۹۴۶ء)

(۴) ڈائریکٹ ایکشن سے پاکستان حاصل کریں گے۔

(ڈان۔یکم اگست ۱۹۴۶ء)

(۵) مسلمانوں کو ایک زبردست جنگ کرنی ہے، خطرناک اور سنگین صورت پیدا ہوگئی ہے، ہم جدوجہد کی آگ سے کامیاب نکلیں گے۔

(۲۸/اگست ۱۹۴۶)

(۶) نواب ممدوٹ ۲/اپریل ۱۹۴۶ء "پاکستان حاصل کریں گے یا تباہ ہوجائیں گے۔"

(۷) نوابزادہ لیاقت علی خان ۳/اپریل ۱۹۴۶ء "پاکستان کی جنگ کے لیے خون کا ہر قطرہ محفوظ رکھو، سب سے پہلے میں اس جنگ میں اپنا خون بہاؤں گا، مسلمان ایک منظم فوج ہیں۔"

(۸) مسٹر سہروردی وزیر بنگال (دہلی کنونشن میں) پاکستان دس کروڑ مسلمانوں کی آواز ہے، پاکستان نہ ماننے والوں کے لیے ہندوستان میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ بنگال کے مسلمان سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہیں۔

(۹) خان بہادر اسماعیل: ۶/اپریل ۱۹۴۶ء "پاکستان کے لیے کوئی قربانی زیادہ نہیں ہے۔"

(۱۰) خان بہادر اسمٰعیل، ۱۱/اپریل ۱۹۴۶ء "ہم بہار کے مسلمان پاکستان کے لیے خون کا آخری قطرہ بہادیں گے۔"

(۱۱) نواب سر مخدوم، ۱۲/اپریل ۱۹۴۶ء "پاکستان کو منظور نہ کرنے سے

ہندوستان کا امن اور سلامتی خطرے میں پڑ جائیں گے۔"

(۱۲) مسٹر عبدالقیوم، ۲۶/اپریل ۱۹۴۶ء "ہم لڑیں گے اور دنیا کے لیے مریں گے۔"

(۱۳) بہار مسلم اسٹوڈینس کے سیکرٹری ۲۷/اپریل ۱۹۴۶ء "بہار کے مسلمان طلبا پاکستان کے لیے خون کا آخری قطرہ بہادیں گے۔

(۱۴) اورنگ زیب خاں، ۲۹/اپریل ۱۹۴۶ء "ہم پاکستان کی بھیک نہیں مانگتے، بلکہ اسے بہ زور شمشیر حاصل کریں گے۔"

(۱۵) مسلم نیشنل گارڈ جمشید پور، ۸/مئی ۱۹۴۶ء "اگر پاکستان نہ دیا گیا تو ہم وہ تباہی مچائیں گے جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہ ملے گی۔"

(۱۶) خان بہادر اسماعیل کا مسٹر جینا کو تار ۶/جون ۱۹۴۶ء "ہم آپ کے حکم کے منتظر ہیں، پاکستان کے لیے خون بہادیں گے۔"

(۱۷) نواب ممدوٹ، ۵/ستمبر ۱۹۴۶ء "جہاد شروع ہونے والا ہے تیار ہو جاؤ۔"

لیگ کے اخباروں کو ملاحظہ فرمایئے، ہم نے تو بہت تھوڑے نوٹس ڈان سے نقل کیے ہیں۔ کیا یہ ہندوؤں اور نیشنلسٹوں وغیرہ کو الٹی میٹم نہیں ہے، کیا یہ سب کو ڈرانا، دھمکانا، اشتعال دینا نہیں ہے؟

اب آپ ہی انصاف فرمایئے کہ الزام کس پر عاید ہوتا ہے؟ آپ (مسلمانانِ لیگ) ہی اشتعال انگیز تقریریں کریں، چیلنج دیں، الٹی میٹم دیں، اعلانِ جنگ کریں، ابتدائے ظلم کریں، تمام انتقامی کارروائیوں کی ابتدا عمل میں لائیں اور پھر موردالزام دوسروں کو قرار دیں۔ میرٹھ میں جو کچھ کہا گیا تھا وہ تو یہی تھا کہ "تلوار کا جواب ہم تلوار سے دیں گے۔" اس پر لوگ برافروختہ ہوئے اس نے کیا غلط کیا ہے، وہ تو جواب کا لفظ کہتا ہے، جس کے معنی ظاہر ہیں کہ اگر ہم پر کوئی تلوار سے حملہ آور ہوگا تو ہم بھی جواب میں تلوار استعمال کریں گے۔ جب کہ لیگ تلوار اور خون بہانے وغیرہ سے دھمکاتی ہے اور پھر اس کے بعد عملی میدان میں نکل بھی آتی ہے تو جواب دینے والا مجبور ہے، وہ موردِ الزام کیوں کر ہوسکتا ہے؟ ابتدائی ظلم جس نے کیا وہ موردِ الزام ہوگا، یا جس نے جواب دیا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

المستبان ماقالا فعلی البادی منهما۔

''گالی گلوچ کرنے والے دو شخصوں نے جو کچھ بکا ان سب کا گناہ ابتدا کرنے والے پر ہے۔''

جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

لا یسب احد کم و الدیہ.....الخ

''آپ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی اپنے والدین کو گالی نہ دے۔''

لوگوں نے کہا یا رسول اللہ دنیا میں بھی کوئی اپنے والدین کو گالی دیتا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں! دوسرے کے والدین کو گالی دیتا ہے تو وہ دوسرا اس کے ماں باپ کو گالی دیتا ہے، (لہٰذا اس نے اپنے والدین کو گالی دی)۔قرآن شریف میں ہے:

وَلَا تَسُبُّو الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ.....الخ

''تم کافروں کے معبودوں کو گالی مت دو، ورنہ وہ اللہ تعالیٰ کو نادانی سے گالی دیں گے۔''

خلاصہ یہ کہ شرعی، عقلی، عادی ہر حیثیت سے چھیڑنے اور ابتدا کرنے والا ہی موردِ الزام اور گناہ گار قرار دیا جاتا ہے۔اگر کسی نے گدھے کو چونکا لگایا اور گدھے نے لات مار کر نقصان پہنچایا تو یہ نقصان چونکا لگانے والے ہی کی طرف منسوب ہوتا ہے، گدھا موردِ الزام نہیں قرار دیا جا سکتا۔

پنجاب اور سرحد کے مظالم پر بھی غور فرمایئے کہ ابتدا کہاں سے اور کس سے ہوئی اور ان سب کے ساتھ ساتھ یہ بھی غور کیجیے کہ انسانی اور اسلامی شرافت ان تمام اعمال میں کہاں تک کام میں لائی گئی ہے۔وہ قوم جو کہ قرآن اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی تبع ہونے کی دعوے دار ہے وہ کس طرح اپنے دایرے سے خارج ہو رہی ہے؟ پھر کنارا اگر کچھ جواباً یا بغیر جواب ناشایستہ اور جاہلانہ اعمال کریں تو ان پر کس طرح گرفت کی جا سکتی ہے۔

ہم پٹیل یا دوسرے متعصب اشخاص کے حامی نہیں ہیں، مگر انصاف اور معقولیت کو نظر انداز کیوں کر کر سکتے ہیں؟ ہم کو کہا گیا ہے:

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا.

''تم خدا کے راستے میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں اور

زیادتی مت کرو۔"

ہم کو کہا جاتا ہے:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلٰى اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا.

"تم کو کسی قوم کی عداوت اس جرم میں مبتلا نہ کرے کہ بے انصافی کرنے لگو۔"

یہاں مسلمان خود ہی ابتدا کرتے ہیں اور خود ہی تعدی کرتے ہیں اور آپ جذبات میں آکر جامے سے باہر ہو رہے ہیں۔

میرے محترم بھائی! اگر آپ حقیقت بین آنکھ سے دیکھیں گے تو آپ کو پتا چلے گا کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے انگریز کی پرانی اسکیم کے مطابق ہو رہا ہے جو کہ ۱۹۳۱ء میں ظاہر ہو گئی تھی۔ مسٹر بلوڈن جج صوبہ یوپی کے ایک خط کا پریس کے ہاتھ لگ جانے پر اس کا اعلان ہو گیا تھا۔

(دیکھیے پاکستان کیا ہے؟ حصہ اول مرتبہ حسین احمد مدنی، دفتر مرکزی جمعیت علمائے ہند۔ دہلی)

انگریز ان اسلامی اکثریت کے صوبوں کو اپنی تجارتی منڈی اور ان کے بندرگاہ کراچی، کلکتہ، چاٹگام کو اپنا تجارتی ساحل اور وہاں کے باشندوں کو اپنا غلام رکھنا چاہتا ہے، ہندو اکثریت کے صوبوں سے مایوس ہو چکا ہے، ان کو اور ان کے سواحل وغیرہ کو چھوڑ کر مسلمانوں سے کام چاہتا ہے اور اسی کے کھیل کھیل رہا ہے۔ بہرحال اسی کا فتنہ ہے اور ہندوستانی مسلمان، ہندو سکھ وغیرہ اس میں پھنس رہے ہیں۔ ذرا سوچ سمجھ کر ٹھنڈے دل سے رائے قایم کیجیے۔ انگریز اور خود غرضوں کے آلۂ کار نہ بنیے، اگر احرار نے کوئی فیصلہ کیا ہے تو وہ خود اس کے ذمے دار ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ خان برادرز نے صوبۂ سرحد کو آزادی کے قریب کیا ہے ورنہ انگریز اور ہندو ریفارم اسکیم کے بھی روادار نہ تھے۔ وٹھل بھائی پٹیل اور مفتی کفایت اللہ صاحب کی رپورٹ اور بادشاہ خاں صاحب اور سرخ پوشوں کی جدوجہد اور قربانیوں نے اثر ڈالا، یہ لیگی خوانین اور امرا جو کہ آج پیش پیش ہیں ہر زمانے میں انگریز کا ساتھ دیتے رہے اور قومی کارکن کو برباد کرتے رہے ہیں۔ یہ تو نہ دین کے ہیں اور نہ دنیا کے۔ کانگریس کا نواکھالی کے مظلومین کے لیے کچھ دینا اور بہار کے مظلومین کے لیے کچھ نہ دینا اگر ثابت ہو جائے تو آپ کی ناواقفیت ہوگی کہ اس کو موردِ الزام قرار دیں۔ بہار کی کانگریسی حکومت اس وقت سے مسلمان پناہ گزینوں پر غذا اور کپڑوں اور دوسرے مصاریف

میں جو کچھ خرچ کر چکی ہے اور آج ان کے بسانے میں جو کچھ خرچ کر رہی ہے وہ اس مقدار سے کئی گنا زیادہ ہے، جو کہ کانگریس نے نواکھالی وغیرہ کے مظلومین کو دیا ہے۔ بنگال کی حکومت نے مظلومین کو کیا دیا ہے؟ اس کی تحقیق فرمایئے، پھر ان سب سے قطع نظر کرنے کے بعد بھی اگر آپ کے ذکر کیے ہوئے الزامات صحیح اور واقعی بھی ہوں تو عرض یہ ہے کہ آیا ان کے ہوتے ہوئے وہ فریضہ جو کہ انگریز کے متعلق آپ پر عاید ہوتا ہے، ساقط ہو جاتا ہے یا نہیں؟ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ساقط ہو گیا فبہا و نعمت۔ جو کچھ چاہیں فیصلہ کریں اور اگر ساقط نہیں ہوتا تو اپنی پوری جدو جہد انگریزی اقتدار کو مٹانے میں خرچ کیجیے، اس کے بعد پھر انصاف سے اپنے حقوق برادرانِ وطن سے منوایئے اور اس راستے میں قربانیوں سے دریغ نہ کیجیے۔ ہم سب آپ کے ہم نوا اور ہم راہ ہیں اور ہوں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری اس پریشان تقریر میں جس کو میں نے انتہائی عدیم الفرصتی کی بنا پر کئی دن میں لکھا ہے، آپ کے تمام شبہات کا جواب آ گیا ہے۔ ایک بات اور عرض کرتا ہوں کہ کسی نظام کے افراد کی غلط کاریوں سے اس نظام کو باطل نہیں کیا جا سکتا، جب تک کہ نظام بدل نہ جائے۔ کانگریس آزادی حاصل کرنے اور غلامی ختم کرنے کے لیے ایک نظام ہے، اس کے افراد میں گم راہ بھی ہیں، جب تک ایسے گم راہ لوگ اس نظام کو حسبِ انصاف رہنے سے بدل نہیں دیتے اس سے روگردانی صحیح نہ ہو گی۔ البتہ ان گم راہ افراد کے اعمال پر نکتہ چینی کرنی صحیح اور لازم ہو گی، جیسا کہ جمعیت کر رہی ہے۔

والسلام

اخیر میں آپ کو اس پر بھی متنبہ کر دینا چاہتا ہوں کہ اخباروں میں جو چیزیں چھپ رہی ہیں وہ سب صحیح نہیں ہوتیں، بالخصوص لیگی اخباروں میں۔ لہٰذا ان پر اعتماد غلط ہے، بغیر تنقید اعتبار نہ کیا کیجیے۔

حسین احمد غفرلہٗ

۲۳ر جمادی الاولیٰ ۱۳۶۶ھ

مولانا آزاد کا ایک تاریخی خط:

ڈاکومنٹ نمبر ۱۴۲: رئیر ایڈمرل وائسکاؤنٹ آف برما کے نام مولانا آزاد کا خط۔ سرکاری خط و کتابت کی فائل ''مولانا آزاد'' ماؤنٹ بیٹن پیپرز

۱۲ر اپریل ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے مولانا ابوالکلام آزاد کی ملاقات ہوئی تھی۔ جس کی روداد ڈاکومنٹ نمبر ۱۳۳ میں گزر چکی ہے۔ اسی گفتگو کے ایک نکتے کی وضاحت میں ۱۴ر اپریل کو مولانا نے لارڈ موصوف کو ایک خط لکھا تھا۔ انتقال اقتدار کی دستاویزات میں ''ڈاکومنٹ نمبر ۱۴۲'' کے طور پر یہ خط بھی محفوظ کر دیا گیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

۲۲۔ پرتھوی راج روڈ۔ نئی دہلی

۱۴ر اپریل ۱۹۴۷

پیارے لارڈ ماؤنٹ بیٹن!

جب گذشتہ ہفتہ کے روز آپ سے ملا تھا تو ایک نکتے پر آپ سے گفتگو کرنا بھول گیا تھا۔

آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے زور دیا تھا کہ لیگ کو کابینہ مشن منصوبے اور اس بارے میں ۶ر دسمبر کی تشریح کو قبول کر لینا چاہیے۔ کانگریس نے دونوں کو منظور کر لیا ہے۔ بہ ہر حال اگر لیگ یہ دلیل دے کہ کانگریس کی منظوری برائے تشریح ۶ر دسمبر لیگ کے اعتراضات دور نہیں کرتی تو اس صورت میں میں مندرجہ ذیل حل پیش کرتا ہوں کہ کانگریس اور لیگ دونوں اس پر اتفاق کر لیں کہ ۶ر دسمبر کے بیان کی جو تشریح آپ کریں گے وہ دونوں کے لیے قابل قبول ہوگی۔ آپ یہ فریضہ وایسرائے ہونے کی حیثیت میں انجام نہیں دیں گے بلکہ ذاتی حیثیت میں۔

مجھے امید ہے کہ آپ اس تجویز کو مسٹر جناح کے ساتھ آیندہ ملاقات میں پیش کریں گے اور اگر وہ اس حل کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہوں تو مجھے امید ہے کہ میں کانگریس کو اس کے لیے آمادہ کر لوں گا۔

آپ کا مخلص

اے کے آزاد

مسٹر محمد علی جناح ماؤنٹ بیٹن کی نظر میں!

اپریل ۱۹۴۷ء کے پہلے نصف میں ماؤنٹ بیٹن اور جناح کے درمیان چھ ملاقاتیں ہوئیں۔ آخر انھیں ملاقاتوں میں یہ طے کیا گیا کہ ہندوستان کی گتھی کو کس طرح سلجھایا جائے؟

ماؤنٹ بیٹن کے الفاظ میں — ''میں جانتا ہوں کہ میں ہر بات کو صحیح روشنی میں پیش کرنے میں استاد ہوں اور ہمیشہ یہ چاہتا ہوں کہ لوگ کبھی کوئی غلط کام نہ کریں۔ اپنی تمام تر صلاحیت اور مہارت کام میں لا کر میں نے ان مذاکرات میں حصہ لیا۔ ملک کا بٹوارا کرانے پر جناح اس طرح تلے ہوئے تھے کہ شاید انھوں نے میرا ایک لفظ سننے کی کوشش نہیں کی، لیکن میں نے ایسی ہر چال چلی جو میں چل سکتا تھا۔ ایسی ہر اپیل میں نے کی جو میں سوچ سکا۔ پاکستان بنانے کا خواب انھیں گھن کی طرح لگ چکا تھا۔ کوئی دلیل کام نہ آئی دو وجہیں ایسی تھیں جن کی بہ دولت جناح کی طاقت بہت زیادہ تھی۔ وہ اپنے آپ کو مسلم لیگ کا قاید اعظم منوانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ مسلم لیگ کے دوسرے لیڈر شاید سمجھوتے کے لیے تیار ہو جاتے لیکن جب تک جناح زندہ تھے ان کی زبان نہیں کھل سکتی تھی۔

دوسری وجہ زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ سال بھر پہلے نوا کھالی اور کلکتہ میں مسلمانوں نے ہندوؤں کا قتل عام کر کے سڑکوں اور گلیوں میں خون کی ندیاں بہادی تھیں۔ ان بھیانک واقعات کی یاد لوگوں کے ذہن سے الگ نہیں ہوئی تھی۔ مسلم لیگ نے ہمیشہ کے لیے سب کو بتا دیا تھا کہ اس کے مطالبے کو ٹھکرانے کا نتیجہ کتنا خوف ناک ہو سکتا ہے۔

جناح سے آخری ملاقات کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے سوچا کہ گر اسی طرح سارا وقت باتوں میں گزر گیا تو اس ملک میں خانہ جنگی کی آگ بھڑک اٹھے گی اور انگلستان کی ساری عزت مٹی میں مل جائے گی۔

اداس لہجے میں ماؤنٹ بیٹن نے اپنے چیف آف اسٹاف لارڈ اسے کی طرف دیکھا اور کہا کہ جس بٹوارے کو ٹالنا ناممکن ہے اس کا انتظام اور طریقۂ کار مرتب کرنا کیوں نہ شروع کر دیا جائے؟

وائسرائے کی رپورٹ:

اب آپ ماؤنٹ بیٹن کے الفاظ میں مسٹر محمد علی جناح کی شخصیت و سیرت اور افکار کا مطالعہ فرمائیے:

۱۳ر تا ۱۸ر اپریل ۱۹۴۷ء:

۱۱۔ میں نے گذشتہ ہفتے کے دوران مسٹر جناح سے چھ مرتبہ ملاقات کی، ان میں سے

ہر ایک اوسطاً دو سے تین گھنٹے تک جاری رہی۔ گفتگوئیں انھی خطوط پر ہوئیں جن کا ذکر میں گذشتہ ہفتے کی رپورٹ میں کر چکا ہوں۔ انھوں نے بالکل صاف طور پر بتایا کہ مسلم لیگ کسی بھی طرح کابینہ مشن منصوبے پر نظر ثانی کرنے کے لیے تیار نہیں ہے اور وہ پاکستان حاصل کرنے کے لیے کمر بستہ ہے۔ میں نے ان کو مسٹر اسمے سے ملاقات کرنے کے لیے کہا اور کہا کہ وہ پاکستان کے بارے میں معلومات فراہم کر دیں لیکن جب اسمے نے مسٹر جناح کے ساتھ ملاقات کے دوران تیار کردہ یادداشتیں مجھ کو دکھائیں تو معلوم ہوا کہ مسٹر جناح نے کہا تھا "یہ آپ کا منصوبہ ہے میرا نہیں۔" جب ان سے اپنی اسکیم کی وضاحت چاہی اور پوچھا کہ اس کو عملی جامہ کس طرح پہنایا جائے گا تو انھوں نے جواب دیا "آپ کو عمل جراحی کے ذریعے ہندوستان اور اس کی مسلح افواج کو لازمی طور پر نصف نصف کاٹنا پڑے گا اور ایک نصف مجھ کو دے دیں جو مسلم لیگ کا حصہ بنتا ہے۔" اس پر میں نے ان سے کہا کہ اگر میں آپ کی دلیل کو مانتے ہوئے ہندوستان کی تقسیم کرنے کی حامی بھر لوں تب میں کانگریس کے ایسے ہی دلایل کو مسترد نہیں کر سکتا جو وہ بنگال اور پنجاب کو تقسیم کرنے کے لیے دے گی۔ یہ سن کر وہ بالکل سراسیمہ ہو گئے اور انھوں نے پنجاب اور بنگال کے اتحاد کو برقرار رکھنے کے لیے بڑے لمبے چوڑے دلایل دیے کہ پنجابی اور بنگالی اپنے صوبوں کے اتحاد کو قایم رکھنا چاہتے ہیں اور وہ ان کی تقسیم کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

۱۲۔ میں نے ان سے کہا کہ میں ان کے دلایل سے اس قدر متاثر ہوا ہوں کہ مجھے ان کو تسلیم کرنے میں کوئی عذر نہیں ہے۔ یہ سن کر وہ خوش ہوئے لیکن ان کی خوشی لمحاتی تھی جب میں نے ان سے کہا کہ ان کے دلایل سن کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہندوستان کی تقسیم مجرمانہ فعل ہوگا۔ اس کے بعد پھر لا حاصل بحث کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

۱۳۔ آخر میں میں نے ان کو بتایا کہ میں نے انتقال اقتدار کے مسئلہ پر سوائے گاندھی کے اور کسی کانگریسی ممبر کے ساتھ گفتگو دانستہ نہیں کی کیوں کہ میں موخر الذکر کی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے حق میں نہ تھا۔ مجھے کسی نے پروپیگنڈے کے ذریعے متاثر نہیں کیا بلکہ میں بجائے خود اس نتیجے پر پہنچا کہ ہندوستان کا فایدہ اسی صورت میں ہے کہ اس میں مکمل اتحاد ہو اور مستحکم ترین مرکزی حکومت۔ اصل میں میں عبوری حکومت میں مسٹر جناح کی شمولیت سے حکومت کو مستحکم دیکھنا چاہتا تھا تاکہ میں جون ۱۹۴۸ء میں اقتدار اسی حکومت کے حوالے

کردوں۔ اگر یوپ کو بلیک ماس میں مدعو کرتا تو وہ اتنا زیادہ سراسیمہ نہ ہوتا (جس قدر خوف زدہ مسٹر جناح میری گفتگو سن کر ہوئے) میں نے بلا توقف ان کو یقین دلایا کہ میں اپنے ذاتی محسوسات کو ہندوستان کے مسئلے کے اس بہتر حل کی راہ میں حایل نہیں ہونے دوں گا جو موجودہ حالات میں ہندوستان کے عوام کے لیے قابل قبول ہوگا۔ لیکن میں نے ان کو خبردار کیا کہ اگر آخر کار میں نے فیصلہ کیا کہ حکومت برطانیہ کو ملک تقسیم کرنے کی سفارش کروں تو اس صورت میں اس اصول کا اطلاق صوبوں پر بھی ہوگا اور تقسیم کے بعد فرقوں کے حدود کا بھی تعین ہوگا، کیوں کہ مجھے معلوم ہے کہ پنجاب اور بنگال کے غیر مسلمان فرقوں پر اگر مسلمانوں کی حکومت مسلط کردی گئی تو وہ اس کے خلاف بالکل اسی طرح اٹھ کھڑے ہوں گے جس طرح کانگریس کے تسلط کی صورت میں مسلم لیگیوں کے اٹھ کھڑے ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے۔

۱۴۔ میں نے ان کو بتایا کہ یہ میری آئینی ذمے داری ہے کہ سیکرٹری آف اسٹیٹ کے توسط سے حکومتِ برطانیہ اور پارلیمنٹ کے لیے ہندوستان کے امن و امان کی حفاظت کروں۔ میں مسلح افواج کی تقسیم پر رضامند نہیں ہوں گا جو تو میائے جانے کی وجہ سے پہلے ہی اس قدر کم زور ہو چکی ہیں کہ ان میں تقسیم کے اثرات کو برداشت کرنے کی سکت نہیں رہ گئی ہے۔ اگر آخر کار تقسیم کے حق میں فیصلہ ہوا تو اس صورت میں میں بہ ہر حال ان سے کہوں گا کہ میں اس مسئلے کو تفتیش کے لیے ڈیفنس کمیٹی کے سپرد کرنے پر تیار ہوں۔

۱۵۔ اگرچہ جناح نے اپنے دوستانہ رویے میں تبدیلی رونما نہیں ہونے دی لیکن ان کے دلایل زیادہ سے زیادہ کم زور اور بے جان ہونے لگے اور انھوں نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی:

> ''اگر آپ اپنی قاہرانہ منطق سے قایل کرنے کے لیے تکرار کرتے رہے تو ہم کسی نتیجے پر پہنچ نہیں پائیں گے۔''

۱۶۔ میں جناح کو نفسیاتی مریض سمجھتا ہوں، دراصل جب تک میں ان سے ملا نہیں تھا میں یہ خیال نہیں کرتا تھا کہ ایک ایسا شخص جس کو انتظامی امور کا کوئی تجربہ نہیں ہے اور نہ ہی احساس ذمے داری ہے اس قدر سیاسی قوت کا مالک ہے۔

۱۷۔ آخر میں نے ان سے کہا کہ وہ مجھ سے زیادہ سے زیادہ یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ

صوبوں کو اور جہاں ضرورت ہو آدھے صوبوں کو اجازت دے دوں کہ یہ فیصلہ کریں آیا وہ پاکستان میں شامل ہونے کے خواہش مند ہیں؟ فی الحال لگتا ہے کہ وہ سندھ اور مغربی پنجاب یقینی طور پر حاصل کرلیں گے، صوبہ سرحد ابھی تک شک والی بات ہے۔ (اور اگر یہ صوبہ بھی ان کو مل جاتا ہے تو قبایل کو خاموش رکھنے کے لیے ساڑھے تین کروڑ روپے سالانہ خرچ کرنے ہوں گے) مشرق میں ان کو بنگال انتہائی غیر مفید حصہ ہاتھ آئے گا، جس میں کلکتہ شامل نہیں ہوگا اور اگر وہ چاہیں گے تو آسام میں سے سلہٹ لے سکیں گے۔

۱۸۔ چوں کہ میں ہندوستان سے رخصت ہونے سے قبل مسلح افواج کی تقسیم پر رضامند نہ تھا اس لیے یہ ضروری ہے کہ ایک مرکزی نظام کے ذریعے فوج کو کنٹرول کیا جائے تا کہ فوج مجموعی طور پر ہندوستان کے دفاع اور سلامتی کے تقاضوں کو پورا کرسکے اور یہ مرکزی ادارہ اس وقت تک کام کرتا رہے گا جب تک مسلح افواج تقسیم نہیں ہوجاتیں۔

۱۹۔ میں نے اختصار کے ساتھ ان (مسٹر جناح) کو بتایا کہ ان کے سامنے مندرجۂ ذیل متبادل ہیں:

الف: کابینہ مشن پلان کو قبول کرنے کی صورت میں ان کے پاکستان کو پانچ مکمل صوبے ملتے ہیں جو مکمل طور پر خودمختار ہوں گے اور مرکز بہت زیادہ کم زور ہوگا جس کے پاس صرف تین شعبے ہوں گے، جن کو عام فہم زبان میں دفاع کہا جاسکتا ہے۔

ب: ایک نہایت ہی کرم خوردہ پاکستان، جس کے مشرقی اور شمالی مغربی حصے خلاف توقع طور پر اقتصادی اعتبار سے مسلے ہوں گے اور جن کو اب بھی اور ہمارے رخصت ہونے کے بعد بھی دفاع سمیت کئی دیگر امور میں مرکز کے تعاون پر طویل مدت کے لیے انحصار کرنا پڑے گا۔

۲۰۔ انھوں نے کہا ''مجھے اس کی پروا نہیں کہ آپ مجھ کو کس قدر چھوٹا (پاکستان) دیتے ہیں، اصل مسئلہ یہ ہے کہ آپ جو کچھ بھی مجھے دیں وہ مکمل صورت میں ہونا چاہیے، میں کوئی غیر پسندیدہ تجویز آپ کے سامنے رکھنا نہیں چاہتا، لیکن آپ یہ تو خیال کریں کہ نیا پاکستان سلطنت برطانیہ میں ڈومینین کا درجہ حاصل کرنے کے لیے استدعا کرے گا۔'' میں نے ان کو مشورہ دیا کہ اس سلسلے میں وہ خود سر ٹیرینس سے گفتگو کریں، کیوں کہ میں حکومت برطانیہ سے یہ سفارش نہیں کرسکوں گا کہ وہ کرم خوردہ قسم کے پاکستان کا بوجھ اٹھائیں۔

۲۱۔ انھوں نے گفتگو کا اختتام قدرے معقول انداز میں کیا اور معذرت کرتے ہوئے کہا کہ وہ کابینہ مشن منصوبے پر از سرِ نو غور نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ یہ اسی صورت میں قابل عمل ہو سکتا تھا جب باہمی تعاون اور بھروسے کے جذبات کارفرما ہوں۔ ایک سال قبل اس پر عمل درآمد ممکن تھا اور اب یہ صورت حال ہے کہ حالات میں بہتری پیدا ہونے کی بجائے متواتر خرابی ہو رہی ہے اور یہ بالکل واضح ہے کہ کانگریس کسی بھی حالت میں اس منصوبے کو اس کی روح اور الفاظ کے مطابق قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

۲۲۔ اس سے صاف نظر آتا ہے کہ کابینہ مشن منصوبہ مسلم لیگ پر مسلط کرنے کی کوئی بھی کوشش کی گئی تو یہ جماعت ہتھیاروں سے اس کی مزاحمت کرے گی۔

تین ہفتوں تک تمام سیاسی رہنماؤں سے مسلسل مذاکرات کرنے کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو مطلع کروں کہ میرا ذہن کن خطوط پر کام کر رہا ہے۔

۲۴۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ہمیں خانہ جنگی سے بچنے اور انتظامیہ کے مفلوج ہونے سے قبل مستقبل قریب میں کوئی ایک فیصلہ کر لینا چاہیے۔ یہاں اس پر مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور گورنروں کو بھی اس میں ذرہ برابر شبہ نہیں ہے۔ اس لیے اولاً میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہمیں اپنے فیصلے کا اعلان زیادہ سے زیادہ مئی کے اختتام سے پہلے کر دینا چاہیے۔

۲۵۔ دوسرے مجھے کابینہ مشن منصوبے کو منظور کر لینے کی امید بہت کم ہے اور مجھے یہ خطرہ نظر آ رہا ہے کہ تقسیم ہی ممکنہ متبادل راستہ رہ جائے گا۔

۲۶۔ تیسرے میں شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ تقسیم کا ایسا منصوبہ تیار کیا جائے جس سے طرفین (شاید اشارہ باشندگان ہند مسلمانوں اور ہندوؤں کی طرف ہے۔) باہمی طور پر قرابت داری سے محروم نہ ہوں اور یہ صورت انتقال اقتدار سے قبل ہی اختیار کرنی ہو گی، اگر دانائی اور فراست سے کام لیا جائے تو ممکن ہے کہ تقسیم میں مضمر حیران اور پریشان کن پیچیدگیاں فریقین کی سمجھ میں آ سکیں۔

۲۷۔ میں اس مرحلے پر منصوبے کا پہلا مسودہ بھی آپ کو ارسال نہیں کر سکتا، کیوں کہ ابھی بہت ہی ابتدائی منزل میں ہے، لیکن میں نے اس پر گورنروں کے ساتھ گفتگو کی ہے اور مجھے امید ہے کہ میں اس سلسلے میں آئندہ ہفتے آپ کو رپورٹ بھیج سکوں گا۔ ممکن ہے اس ماہ

کے آخر تک میں لارڈ اسمے کو مسودے کے ساتھ گفتگو کے لیے انگلستان بھیجوں تاکہ کسی واضح سمجھوتے پر جلد از جلد پہنچا جا سکے۔

۲۸۔ ایک مرتبہ اس کا فیصلہ ہو جائے تو میرا منصوبہ یہ ہے کہ جناح، نہرو، پٹیل، لیاقت، بلدیو سنگھ، اور غالباً نواب بھوپال اور مہاراجہ پٹیالہ کو شملہ میں اپنے ساتھ قیام کرنے کی دعوت دوں۔ اس مقصد کے لیے میرے ذہن میں ۱۵ر مئی کی تاریخ ہے۔ ایک متبادل تجویز یہ بھی ہے کہ اس کی نسبت زیادہ وسیع ''گول میز کانفرنس'' بلائی جائے، تب میں ایک آخری اور بھرپور کوشش کروں گا کہ کابینہ مشن منصوبہ کی بنیاد پر مفاہمت کی کوئی راہ نکل آئے۔ اگر میں اس میں ناکام ہوا تو آخری حربے کے طور پر اپنا تقسیم کا منصوبہ پیش کروں گا۔ (تحریکِ پاکستان اور انتقالِ اقتدار: ص ۹۰-۲۸۶)

یہ گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی پندرہ روزہ رپورٹ کا جو اس نے انڈیا آفس لندن کو بھیجی تھی، ایک اقتباس ہے۔ یہ رپورٹ ۳۶ پیراگرافوں پر مشتمل ہے۔ یہاں ان کے نمبر ۱۱ تا ۲۸، صرف ۱۸ پیراگرافوں کو مقتبس کیا ہے جن کا تعلق مسلم لیگ کے رویے اور ان کے افکار سے تھا۔ پوری رپورٹ قابلِ مطالعہ اور بصیرت افروز ہے۔ اس سے سبق حاصل کرنے کے لیے ''تحریک پاکستان اور انتقالِ اقتدار'' (ٹرانسفر آف پاور کی مجلدات سے ماخوذ ۲۲ر مارچ ۱۹۴۷ء تا ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کے اہم ڈاکومنٹس کے ترجمے پر مشتمل ہے۔) سے رجوع کرنا چاہیے۔

(مترجم: محمد فاروق قریشی (ایڈوکیٹ-لاہور-ناشر: فکشن ہاؤس-لاہور، ۱۹۹۷ء)

مسٹر جناح اور تقسیم پنجاب اور بنگال:

۱۸ر اپریل ۱۹۴۷ء: لاہور ۱۸ر اپریل۔ اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ کا نامہ نگار...

۱۸ر اپریل ۱۹۴۷ء: لاہور ۱۸ر اپریل۔ اخبار سول ان خبر کا ذمہ دار ہے کہ قائد اعظم مسٹر محمد علی جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ نے تقسیم پنجاب کے متعلق کانگریس کے مطالبے کو اصولی طور پر تسلیم کر لیا ہے۔ یہ یقین کرنے کی وجوہ پائی جاتی ہیں کہ قائد اعظم نے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو مطلع کر دیا ہے کہ وہ انبالہ ڈویژن کو صوبۂ پنجاب سے علاحدہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔ معتبر حلقوں کا بیان ہے کہ اس سے بھی آگے جانے کے لیے اور سکھوں کو مطمئن کرنے کے لیے مسلم اکثریت اور غیر مسلم اکثریت کے علاقوں کے اصول کو تسلیم

کرنے کے لیے تیار ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مسٹر جناح کا نظریہ یہ ہے کہ اگر شمال مغربی پاکستان میں سکھوں کی ایک بڑی مخالف آبادی ہو تو امن قایم نہ ہوگا، مزید معلوم ہوا ہے کہ جناح صاحب نے بنگال کی تقسیم رد کر دی ہے۔ (سہ روزہ زمزم۔ لاہور: ۲۳ر اپریل ۱۹۴۷ء)

خضر حیات اور تقسیم پنجاب:

۱۹ر اپریل ۱۹۴۷ء: ملک خضر حیات خان نے ۲۵ر مارچ کو پنجاب کی تقسیم کے خلاف ایک بیان شایع کرایا تھا۔ اب انھوں نے ۹ر اپریل کو ایک بیان میں کہا ہے کہ

> ''یہ تمام فرقوں کے لیے تباہ کن ہوگا اگر صوبہ پنجاب کے ٹکڑے کر دیے گئے۔''

ریاست قلات کا مستقبل اور پاکستان کے لیے صنعت کاروں کی سرمایہ کاری:

۲۲ر اپریل ۱۹۴۷ء: کیمبل جانسن ۲۲ر اپریل ۱۹۴۷ء کے ضمن میں پیرا نمبر ۲ میں لکھتا ہے:

> ''مسلم لیگ گروپ ''بی'' اور ''سی'' سے دست برداری کے لیے تیار تھی اور اسے کرم خوردہ پاکستان قبول تھا، اگر اس کا مرکز آزاد اور خود مختار ہو۔''

یہی حیران کن نہیں ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ ہوش ربا واقعہ یہ ہے کہ ۴ر اگست کو یعنی آزادی سے صرف دس یوم قبل ریاست قلات کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک اجلاس دہلی میں منعقد ہوا۔ جس میں وایسرائے ہند ماؤنٹ بیٹن، مسٹر جناح، مسٹر لیاقت علی خاں، چیف منسٹر قلات اور سر سلطان احمد قانونی مشیر ریاست قلات نے شرکت کی اور حسب ذیل امور پر اتفاق رے ہوا:

(الف) ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کو ریاست قلات کی وہ خود مختار حیثیت بحال ہو جائے گی جو اسے ۱۸۳۸ء میں حاصل تھی۔

(ب) قلات اور پاکستان کی آیندہ حکومت کے اگر کسی سبب سے تعلقات استوار نہ ہو سکیں تو ریاست قلات افغانستان میں شمولیت اختیار کر سکتی ہے۔ ۱۸۳۹ء اور ۱۸۴۱ء کے معاہدات کے تحت حکومت برطانیہ قلات کی جغرافیائی حیثیت کی بنیاد پر اس صورت میں

احتیاطی تدابیر اختیار کرنے پر مجبور ہو سکتی ہے۔

یہ تھا مسلم لیگ کا رویہ انتقال اقتدار سے صرف دس یوم قبل! وہ پاکستان کی جغرافیائی حدود کو بے دریغ قربان کرنے میں لگی ہوئی تھی اور اس کے رقبے کو بے رحمی سے لٹایا جا رہا تھا۔ پنجاب اور بنگال کو تقسیم کرنے کی پیش کش ہوتی ہے، پورے بنگال کو پاکستان سے خارج کر دینے میں خوشی محسوس کی جاتی ہے۔ صرف سندھ کے صحراؤں پر اکتفا کیا جاتا ہے اور ریاست قلات سے بھی دست کشی اختیار کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ مسلم لیگ کے اسی غیر مستقل رویے اور گومگو کی روش خود غرضی اور لالچ کے باعث مسلمانوں کو زبردست خسارے کا سامنا کرنا پڑا۔ دراصل مسلم لیگ کے لیے بہت زیادہ سرمایہ کاری بمبئی کی مسلمان تاجر برادری نے کی تھی تاکہ پاکستان قایم ہو سکے، کیوں کہ متحدہ ہندوستان میں اسے ہندو سرمایہ کار اور صنعت کار سے مقابلے کا سامنا تھا اور اس پر مسابقت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا، چناں چہ یہ لوگ ایک مرکز میں اپنے مفادات کو محفوظ خیال نہ کرتے تھے۔ انھوں نے مسلم لیگ کو گروپ اسکیم پر قایم نہ رہنے دیا اور مسلم لیگ نے اسے قبول کرنے کے بعد پسپائی اختیار کر لی۔ گروپ اسکیم دراصل بمبئی کی مسلمان سرمایہ کار برادری کے اقتصادی مفادات سے متصادم تھی، اس وجہ سے مسلم لیگ نے کانگریس کی یقین دہانیوں کے باوجود نظر ثانی نہیں کی اور مسلم لیگ آزاد مرکز کے تحت کم از کم علاقے پر بھی رضا مند ہو گئی۔ اس کے دباؤ کی وجہ سے مسلم لیگ نے کٹا پھٹا اور کرم خوردہ پاکستان قبول کیا۔ پاکستان میں یہ برادری خوب مزے لوٹ رہی ہے اور ملک کے پچاسی فیصد تجارتی اور صنعتی ذرایع آمدن پر اس کا قبضہ ہے۔ حال آں کہ آبادی میں ان کا تناسب اعشاریہ چند فیصد ہے۔ علاوہ ازیں پنجاب، سندھ اور سرحد کے جاگیرداروں اور زمین داروں کا مفاد اسی میں تھا۔ اس کا اعتراف علامہ اقبال نے اپنے خطبۂ الٰہ آباد میں بھی کیا تھا "پنجاب کے مسلمان بالخصوص قرضوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔" حقیقت یہ ہے کہ پنجاب اور سندھ کے جاگیرداروں، زمین داروں اور وڈیروں کی زمینیں ہی نہیں فصلیں بھی ہندو ساہوکار اور مہاجن کے پاس رہن تھیں۔ ہندوستان کے ایک مرکز کی صورت میں ان کا مستقبل تاریک تھا، چناں چہ انھوں نے بھی گروپ اسکیم کی مخالفت کی اور الگ وطن کے قیام پر زور دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان کے معرض وجود میں آنے سے ہندو مہاجن اور ساہوکار ترک وطن

کر کے چلا گیا اور اس کے ساتھ ہی مسلمان زمین دار قرضوں کے بوجھ سے آزاد ہو گئے اور پھر سے زمینوں کے مالک بن گئے۔ قیام پاکستان سے اب تک یہ طبقہ ملک کے سیاسی اقتدار پر قابض ہے اور اول الذکر صنعتی اور تجارتی شعبے پر قبضہ کر کے لوٹنے میں لگا ہوا ہے۔

(ابوالکلام آزاد اور......: ص ۴۸-۵۴۷)

ایک پاکستان یا کئی پاکستان!

۲۴ر اپریل ۱۹۴۷ء: نئی دہلی۔ ۲۴ر اپریل۔ یونائیٹڈ پریس آف انڈیا کی روایت ہے کہ اب جب کہ ہندوستان کی مجموعی تقسیم یا جزوی تقسیم کا نظریہ کانگریس نے بھی تسلیم کر لیا ہے، اس لیے مسلم لیگ ہائی کمانڈ کے سامنے اس وقت یہ مسئلہ ہے کہ آیا پاکستان کی واحد آزاد ریاست قایم کی جائے یا اسے مشرقی اور مغربی پاکستان کی دو ریاستوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ واضح رہے کہ مسلم لیگ کے ۱۹۴۰ء کی لاہور والی قرارداد میں ایک یا اس سے زاید آزاد پاکستان ریاستوں کا مطالبہ کیا گیا تھا، مگر اس وقت سے بعض مسلم لیگی لیڈروں میں واحد پاکستانی آزاد ریاست کا تصور پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن بنگال اور سندھ کی طرف سے جداگانہ آزاد ریاستیں قایم کرنے اور مرکزی یونین یا کسی اور یونین کے ساتھ وابستگی کی مخالفت کی جا چکی ہے۔ اب صورتِ حالات بدل گئی ہے۔ چناں چہ مسٹر اللہ بخش مرحوم سابق وزیر اعظم سندھ کے صاحب زادے مسٹر رحیم بخش نے مسٹر جناح کے ساتھ ملاقات کے دوران میں اس امر کی ضمانت طلب کی ہے کہ سندھ کو قطعی آزاد پاکستانی ریاست تسلیم کیا جائے گا۔ چناں چہ پتا چلا ہے کہ مذکورہ بالا نظریہ اب مسلم لیگ کے نمایندوں کی اس میٹنگ میں خاص طور پر موضوعِ سخن ہوگا جو اس ماہ کے آخر میں لاہور میں منعقد ہونے والی ہے۔

(روزنامہ ''آزاد'' لاہور: ۲۵ر اپریل ۱۹۴۷)

متحدہ بنگال کے وزیر اعظم:

۲۹ر اپریل ۱۹۴۷ء: مسٹر حسین شہید سہروردی وزیر اعظم بنگال نے آج سہ پہر ایک پریس کانفرنس میں تقریر فرماتے ہوئے ایک غیر متحدہ ہندوستان میں بنگال کی متحدہ اور آزاد حیثیت کی پر زور حمایت کی۔ بنگال عظمیٰ کی نوعیت کی مزید تشریح کرتے ہوئے وزیر اعظم موصوف نے فرمایا کہ ہمیں چاہیے کہ تقسیم بنگال کے مطالبے پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ بنگالی ہندو الگ اور علاحدہ وطن کیوں چاہتے ہیں؟ مجھے کچھ دیر کے لیے یہ فرض کر لینا چاہیے

کہ یہ مطالبہ ہندوؤں کی قلیل تعداد کی طرف سے نہیں ہے بلکہ اس کی پشت پر ہندوؤں کی ایک غالب اکثریت ہے۔اس کے علاوہ اس کی حمایت اچھوت اور متعدد دیگر ہندو جماعتیں کر رہی ہیں۔کیا یہ حقیقت ہے کہ ان کا مذہب اور ان کی تہذیب اور ان کی زبان کو موجودہ حکومت کے تحت کسی قسم کا گزند پہنچا ہے اور کیا وہ آیندہ اور مستقبل کی حکومت کے لیے اس امر کی ضمانت دے سکتے ہیں کہ ان کا مذہب اور تہذیب اور زبان مجروح نہیں ہوگی؟ اگر انھیں مغربی بنگال کا ایک حصہ علاحدہ صوبے کی صورت میں دے دیا جائے، میرا دل کہتا ہے کہ ہندوؤں کا یہ مطالبہ ہندوؤں کے لیے سم قاتل ثابت ہوگا۔لہٰذا میں ہر اعتدال پسند ہندو سے پرزور اپیل کروں گا کہ وہ اس اسکیم کو ختم کردے، جس کی تہہ میں کبھی نہ ختم ہونے والی شرارت اور ہنگامہ آرائی کارفرما ہے۔وہ چیز فی الحقیقت حکومت کی تشکیل اور باہمی مفاہمت سے ظہور پذیر ہوسکتی ہے، جس پر ملّت وقوم کے افراد مطمئن اور مسرور ہوجائیں گے اور سرزمین بنگال کی عظمت رفتہ رفتہ پھر عود کر آئے گی۔اخبار نویسوں نے وزیر اعظم موصوف پر متعدد سوالات کیے اور ان سے درخواست کی گئی کہ آزاد اور غیر منقسم بنگال اور پاکستان کے درمیان کس طرح یک سانیت قایم کی جاسکتی ہے۔وزیر اعظم موصوف نے ان سوالات کا جواب دینے کے لیے بنگال عظمیٰ کا ہلکا سا تصور پیش کرنے سے بھی انکار کردیا۔البتہ انھوں نے کہا کہ وہ مسایل جن کے متعلق مختلف جماعتوں میں وسیع اختلاف ہیں حکومت بنگال کی آیندہ تشکیل میں کسی طرح متحد و معاون نہیں ہوسکتے اور بنگال کی نجات غیر منقسم اور آزاد بنگال میں ہی مضمر ہے۔

نیز آزاد بنگال کو پاکستان سے متحد رہنے یا علاحدہ رہنے کا کلی طور پر اختیار ہوگا۔

(روزنامہ ''آزاد'' لاہور: ۲۹ر اپریل ۱۹۴۷ء)

خودمختار بنگال کی اسکیم اور لیگ:

۳۰ر اپریل ۱۹۴۷ء: اب بنگال پروویژنل مسلم لیگ کے سیکرٹری مسٹر ابوالہاشم کا بیان پڑھیے جو انھوں نے ۳۰ر اپریل ۱۹۴۷ء کو پریس میں دیا۔

''متحدہ اور خودمختار بنگال سے ہمارے صوبے میں موجودہ خرابیاں رفع ہوسکتی ہیں۔ میری دانست میں بنگال کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو مسٹر سی آر داس کے فارمولے پر عمل کرتے ہوئے سیاسی طاقت اور اقتصادی مفاد کے حصول کے لیے پچاس فیصد کی مساوی

نمائندگی قبول کرنی چاہیے۔ بنگال کی گذشتہ روایات اور شاندار مستقبل کے نام پر میں بنگال کے نوجوانوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ رجعت پسند خیالات کو ترک کر دیں۔ اس وقت بنگال دوراہے پر کھڑا ہے۔ یہاں کے سو فیصد سرمائے پر غیر ملکیوں کا قبضہ ہے۔ بنگال میں ہندوستان امریکی اور برطانی سرمایہ داروں کی لوٹ کھسوٹ جاری ہے۔

سوشلسٹ خیالات کی نشر و اشاعت سے غیر ملکی عیاروں کے دل میں یہ خوف پیدا ہوا ہے کہ ان کی املاک پر زبردستی قبضہ کیا جائے گا۔ اندریں حالات غیر ملکی سرمایہ داروں کی یہ دلی خواہش ہے کہ بنگال کو تقسیم کر کے اسے اس قدر پاہج اور ناکارہ بنا دیا جائے کہ وہ آئندہ ان کی ریشہ دوانیوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔ بنگال میں موجودہ فرقہ وارانہ فسادات کا فیصلہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اینگلو امریکی مفاد اور ان کے ہندوستانی ساتھی ان فسادات کو ہوا دے رہے ہیں۔ عام طور پر معزز اور معتبر اشخاص کو اسلحہ کا لائسنس حاصل کرنے میں مشکلات پیش آ رہی ہیں۔

لیکن برطانوی اور امریکی ساخت کے خطرناک اسلحے کی بہت بڑی تعداد جو ہندوستان میں موجود ہے، ہندو اور مسلمان غنڈوں کو کھلے بندوں تقسیم کر دی گئی ہے اور یہی غنڈے تقسیم بنگال کے غیر ملکی ایجنٹوں کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ تقسیم بنگال کا تقسیم ہند سے کوئی باہمی تعلق نہیں، جو اشخاص تقسیم بنگال کو پاکستان کا جواب تصور کرتے ہیں وہ مسلم لیگ کی لاہور والی قرارداد سے قطعاً ناآشنا ہیں۔ وہ اس قرارداد میں مسلم ریاست یا مصنوعی طریق سے غیر ملکی عناصر کو زبردستی کسی علاقے میں داخل کرنے یا کسی آبادی میں وسیع پیمانے پر مداخلت کرنے کی کوئی تجویز پیش نہیں کر سکے۔" (کاروانِ احرار: جلد ۸، ص ۳۲-۲۳۱)

متحدہ بنگال کی تقسیم پنجاب اور لیگی رہنما:

اپریل ۱۹۴۷ء: سر شاہ نواز (ممدوٹ) کی ذاتی رائے ہے کہ پنجاب سے انبالہ ڈویژن نکال دیا جائے۔ بنگال کے رہنما حسین شہید سہروردی بنگال کو پاکستان سے الگ کر کے اسے متحدہ رکھنے کی خواہش کر رہے ہیں۔ یہ دونوں سیاست داں آل انڈیا مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کے ممبر ہیں اور دونوں ہی محبِ وطن، لیکن سندھ اور پنجاب کے جن لوگوں نے ان کی سیاسی رائے سے اختلاف کیا یا بہ قول سر شاہ نواز ممدوٹ دہلی، علی گڑھ اور بلند شہر کو

پاکستانی پنجاب میں شامل کرنے کو کہا، وہ غدار ہیں۔ (کاروانِ احرار: جلد ۸، ص ۲۲۴)

۶ ر مئی ۱۹۴۷ء: ملک فیروز خان نون نے پنجاب کی تقسیم کے مطالبے کے خلاف ایک بیان شایع کرایا ہے جس میں انھوں نے کہا ہے:

''ہم مسلمان پنجاب کی ایک انچ زمین بھی چھوڑنے کو تیار نہیں ہیں۔''

اس سلسلے میں انھوں نے کئی استدلال پیش کیے ہیں، لیکن انھوں نے غور نہیں کیا کہ جو دلایل وہ پنجاب کو متحد رکھنے کے لیے دے رہے وہ ہندوستان کو متحد رکھنے کے لیے اس سے زیادہ سودمند ہیں۔ جیسا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مسٹر محمد علی جناح سے اپنی ایک گفتگو میں کہا تھا۔

ملک کی سیاسی صورت حال اور جمعیت علما کی تجویز:

۹ تا ۱۱ ر مئی ۱۹۴۷ء: جمعیت علماے ہند کا ایک خصوصی اجلاس حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کی صدارت میں ۹ تا ۱۱ ر مئی ۱۹۴۷ء لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں ملک کی سیاسی صورت حال کے متعلق ایک مفصل پالیسی بیان بہ صورت تجویز منظور کیا ہے۔ اس تجویز میں کہا گیا ہے:

''اس وقت ہندوستان ایک عظیم سیاسی انقلابی دور سے گزر رہا ہے، دوسو برس پرانی شہنشاہیت کا بوسیدہ نظام حکومت مضمحل ہو رہا ہے اور اس کی جگہ ایک نئی سیاسی طاقت جنم لے رہی ہے۔

پچھلی ایک صدی کی جد و جہد آزادی اور مسلسل قربانیوں کا حاصل آج ہمارے سامنے ہے۔ مجلسِ دستور ساز اور عبوری حکومت کے قیام کے بعد اس نئے تاریخی دور کی ابتدا ہو چکی ہے۔ دوسری طرف وہ تمام طبقات جو پرانے اور بوسیدہ نظام حکومت میں اپنی کوئی جگہ رکھتے تھے ان تبدیلیوں کے خلاف صف آرا ہیں۔ رجعت وارتقا کی یہ کش مکش انقلاب کا ایک طبعی تقاضا ہے، لیکن بدقسمتی سے ہندوستان میں یہ تقاضا فرقہ وارانہ تصادم کی شکل میں پورا ہو رہا ہے۔ برطانوی سیاست کاروں اور وطن دشمن عناصر کے نامبارک اتحاد نے ملک کی اندرونی زندگی میں ایک خطرناک برہمی اور انتشار پیدا کر دیا ہے۔

جمعیت علماے ہند ان حالات کو تشویش و اضطراب کے ساتھ دیکھتی ہے اور ان کو

آزادیٔ ہند کے محبوب نصب العین، ملک کے مجموعی مفاد، اہل وطن کی باہمی وفاداری اور دایمی امن واطمینان اوران مشترکہ مقاصد کے لیے تباہ کن سمجھتی ہے جن کے لیے جمعیت علماے ہند اور دوسری آزادی پسند جماعتوں نے ماضی میں عظیم الشان قربانیاں پیش کی ہیں۔

جمعیت علماے ہند اس بات کو واضح کردینا چاہتی ہے کہ ۲۰ر فروری ۱۹۴۷ء کے برطانوی اعلان نے ہندوستان کی آزادی اور ترقی کے جو امکانات پیدا کیے ہیں ان سے پورا فایدہ اٹھانا ایک محتاط اور بے لاگ سیاسی رہنمائی پر منحصر ہے۔

جمعیت علماے ہند نے ۲۰ر فروری کے اعلان انتقال اختیارات کو پر امید نگاہوں سے دیکھا ہے اور اس حقیقت کو محسوس کیا ہے کہ بین الاقوامی مسایل کے الجھاؤ نے ہندوستان پر برطانیہ کے شہنشاہی اقتدار کو ناممکن بنادیا ہے، لیکن اس کے ساتھ برطانوی سیاست کی نفسیات کو نظر انداز نہیں کیا جو برطانیہ کی خارجی سیاست کی رہنمائی کرتا رہا ہے۔

اس لیے اس اہم اور نازک موقع پر جمعیت علما اس بات سے متنبہ کرنا ضروری سمجھتی ہے کہ ۲۰ر فروری کے اعلان کی اس نظر فریب صداقت کے پیچھے ایک شکست خوردہ حریف کی ناکامی اور بے بسی کا تلخ احساس بھی موجود ہے۔ اس لیے برطانیہ ہندوستانی عوام کے بڑھتے ہوئے شعور آزادی کے مقابلے میں پسپا ہوتے ہوئے سب کچھ تباہ کردینے کی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔

گذشتہ دو سال میں ہندوستانی سیاست کی سطح پر اس نے جس طرح فرقہ پرست ذہنیت کو ابھارا ہے، وہ برطانیہ کی اس پالیسی کے بے نقاب کردینے کے لیے کافی ہے۔ ہندوستان خالی کرنے کے اعلانات کے ساتھ وہ اس ملک کو متحارب فرقوں کا میدان جنگ بنانے کے منصوبے بھی تیار کررہا ہے، تاکہ ہندوستان کی وحدت اور یک جہتی کے ویران کھنڈروں پر خود برطانیہ یا انگریزی بولنے والی کوئی قوم ایک نئی شہنشاہیت کے امکانات کی آزمایش کرسکے۔ اس لیے جمعیت علماے ہند تاریخ کے اس پیچیدہ اور نازک ترین دور میں حالات کی نزاکت اور اپنی ذمے داریوں کو پوری طرح محسوس کرتے ہوئے ایک مرتبہ پھر یہ اعلان کرنا ضروری سمجھتی ہے کہ ہندوستان کی مکمل آزادی جمعیت علماے ہند کا اولین اور محبوب ترین نصب العین ہے۔ جمعیت علما اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ مسلمانانِ ہند اور

تمام ممالک اسلامیہ کی مذہبی و سیاسی آزادی اور سیاسی فلاح و بہبود بلکہ تمام ایشیا کی آزادی اور ترقی صرف اسی پر منحصر ہے کہ ہندوستان سے برطانوی شہنشاہیت کا کلیتاً استیصال کیا جائے۔ لہٰذا آزادیٔ ہند کی آخری عملی حد تک وہ ملک کی ہر اس سیاسی جماعت کے ساتھ اشتراک عمل کرے گی جو ہندوستان سے برطانیہ کے مکمل اخراج کو اپنا نصب العین قرار دیتی ہو، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی صاف صاف کہہ دینا چاہتی ہے کہ جہاں تک ملک کی سیاسی منصوبہ بندی اور آزاد ہندوستان میں مسلم مفاد کا تعلق ہے، جمعیت علمائے ہند اپنی ایک مستقل جگہ رکھتی ہے۔ جو اس کے مجوزہ فارمولے سے ظاہر ہے۔ جمعیت علمائے ہند اگرچہ اس پر مضبوطی سے قایم ہے، لیکن انتہائی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جمعیت علمائے ہند کے اس فارمولے کو جو مسلمانانِ ہند کے لیے ازبس مفید ہے، مسلم لیگ نے پاکستان کا نظریہ پیش کر کے جو مسلمانوں کی ملی وحدت اور اجتماعی حیات کے لیے باعث ہلاکت ہے، عملی تشکیل سے محروم کر دیا اور گذشتہ انتخاب میں برطانوی حکومت اور لیگ کی سازش نے آئینی حل کو کانگریس اور لیگ کے درمیان محدود کر کے لاینحل بنا دیا۔ ہمیں افسوس ہے کہ کانگریس بھی اس نازک مرحلے پر اپنی جگہ مستحکم نہ رہ سکی اور اس نے اپنی روایات کے خلاف تقسیم پنجاب کے مسئلے پر مہر تصدیق ثبت کر کے قومی نقطۂ نظر کو سخت نقصان پہنچایا۔ جمعیت علمائے ہند ان تاریک پہلوؤں کے متعلق صاف صاف اعلان کر چکی ہے کہ وہ مسلم لیگ کے مزعومہ پاکستان، ہندو مہاسبھا کے اکھنڈ ہندوستان اور کانگریس کی حالیہ تجویز "تقسیم پنجاب" یعنی تقسیم در تقسیم کو ایک لمحے کے لیے بھی گوارا نہیں کر سکتی۔

جمعیت علمائے ہند غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ ملک کے لیے عموماً اور مسلمانوں کے لیے خصوصاً موجودہ صورت میں صرف ایک ہی راہ ہے کہ آزاد ہندوستان کے دستوری اساس و بنیاد کے طور پر کیبنٹ مشن کے فیصلے ہی کی پابندی کی جائے، جس کے متعلق جمعیت علمائے ہند کی ورکنگ کمیٹی نے شروع ہی میں سفارش کی تھی۔ نیز پنجاب و بنگال کے تمام باشندوں سے پرزور اپیل کرتی ہے کہ وہ کسی حال میں بھی تقسیم پنجاب و بنگال کو قبول نہ کریں۔"

تجویز نمبر ۲: ملک میں فرقہ وارانہ فساد کے سلسلے میں منظور کی گئی ہے، اس میں کہا گیا ہے:

''جمعیت علمائے ہند کا یہ اجلاس ملک میں فرقہ وارانہ فسادات کو انتہائی نفرت و حقارت سے دیکھتا ہے اور ان سے اپنی مکمل بے زاری کا اعلان کرتا ہے۔ ان فسادات میں جس درندگی اور بہیمیت کا اظہار کیا جاتا ہے اس کو کوئی مذہب اور کوئی سوسایٹی بھی برداشت نہیں کرسکتی۔ ان وحشیانہ ہنگاموں میں اب تک جو کچھ کیا گیا وہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک شرم ناک باب ہے، جس نے پورے ہندوستان کو تمام دنیا میں شرمندہ کیا اور اس کی ترقی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ یہ خلافِ انسانیت قتل و غارت گری نہ ہندوستان کی کسی قوم و ملت کے لیے مفید ہوسکتی ہے نہ ان کے کسی سیاسی یا مذہبی مقصد و منشا کو پورا کرسکتی ہے۔ البتہ ہندوستان کی غلامی کی مدت کو طویل اور اس کی زنجیروں کو زیادہ مضبوط کرسکتی ہے۔ اجلاس ہذا تمام ہندوستانیوں سے امن پسندی اور صلح و آشتی کی اپیل کرتے ہوئے ہر بہی خواہ ملک و ملت کے لیے ضروری سمجھتا ہے کہ وہ ان فسادات سے بے زاری کا اعلان کرے اور ان کے روکنے میں آخری حد تک اپنی پوری کوشش صرف کردے اور اس سلسلے میں جو بے گناہ اشخاص بہیمانہ مظالم کا شکار ہوئے ہیں، جمعیت کا یہ اجلاس ان کے پس ماندگان سے دلی ہم دردی کا اظہار کرتے ہوئے باشندگان ہند سے ان کی ہر قسم کی امداد و اعانت کی درخواست کرتا ہے۔''

(ضمیمہ: جمعیت علما کیا ہے؟: ص ۱۰-۷)

وزارتی منصوبے کے لیے ماؤنٹ بیٹن سے مولانا آزاد کا اصرار:

۱۴ مئی ۱۹۴۷ء: تقسیم ہند کا ایک نہایت اہم پہلو پنجاب کا دو حصوں میں بٹوارا تھا۔ سر خضر حیات کی وزارت کے مستعفی ہوجانے کے بعد پنجاب کے گورنر نے ۵ مارچ ۱۹۴۷ء کو ''گورنر راج'' نافذ کردیا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب کہ تقسیم کی بات چل رہی تھی۔ مولانا آزاد نے ۱۴ مئی کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات کی اور انھیں مشورہ دیا کہ کیبنٹ مشن کو مسترد نہ کیا جائے، اس ملک کی سیاسی گتھی سلجھانے کے لیے دو ایک سال کا اور موقع ملنا چاہیے۔ اسی گفتگو کے دوران مولانا آزاد نے وایسرائے کو اس بڑے خطرے سے بھی آگاہ کیا جو تقسیم کے نتیجے میں پیش آنے والا تھا۔ مختلف مقامات سے ہندو مسلم فسادات کی خونی داستانیں سننے میں آرہی تھیں۔ اگر ملک کا واقعی بٹوارا ہوا تو خون کی ندیاں بہنے لگیں گی، جس کی ذمے داری برطانیہ پر ہوگی۔ ماؤنٹ بیٹن نے اس کے جواب میں بڑے اعتماد کے ساتھ مولانا

آزاد کو بہ ظاہر مطمئن کرنے کی خاطر کہا:

''ایک بار تقسیم کا اصول طے ہو جانے پر...... اگر کہیں بھی شورش یا ہنگامے نے سر اٹھایا تو...... میں فوج اور ایئر فورس کو حرکت میں لے آؤں گا اور توپ، ٹینک اور ہوائی جہاز کو کام میں لا کر شورش کو کچل دوں گا۔''

سیروائی لکھتے ہیں کہ ماؤنٹ بیٹن کی یہ یقین دہانی برطانوی حکومت کو تو مطمئن کر گئی مگر جب ملک کا بٹوارا طے پا گیا تو پنجاب کی تقسیم کے لیے ریڈ کلف کمیشن کے تقرر کا اعلان کیا گیا اور اس اعلان کے ساتھ پنجاب کی سرزمین پر خوف و ہراس کے گہرے بادل چھانے لگے اور انتقال آبادی میں تیزی آ گئی۔ پنجاب کی تقسیم کی تفصیلات ریڈ کلف ایوارڈ کے مطابق ۱۶/اگست کو عام کی گئیں۔ اس علاقے میں (حکومت ہند کے ریکارڈ کے مطابق) چھ لاکھ جانیں گئیں اور ایک کروڑ چالیس لاکھ آدمی ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔

(تقسیم ہند - افسانہ اور حقیقت، از سید شہاب الدین دسنوی (مقالہ) خدا بخش لائبریری جرنل ۱۱۲؛ صفحہ ۵۹-۱۵۸)

حضرت شیخ الاسلام کی ایک تاریخی تقریر:

۱۵/مئی ۱۹۴۷ء: لکھنؤ، ۱۰/مئی۔ مولانا حسین احمد مدنی نے جمعیت علمائے ہند کی کونسل کی اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے اپنے پیروؤں پر یہ زور دیا کہ انگریز جون ۱۹۴۸ء تک ہندوستان سے نہ گئے تو انھیں نکالنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ آپ نے مزید کہا کہ انگریزوں کو جون ۱۹۴۸ء سے پہلے ہی بوریا بستر گول کر لینا چاہیے، کیوں کہ ہندوستان میں ان کا قیام شرارت کا باعث ہوگا۔ ہمیں انگریزوں کی رحم دلی پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے، اگر جون ۱۹۴۸ء سے پہلے چرچل پارٹی برسر اقتدار آ گئی تو پھر یہ وعدے ختم ہو جائیں گے۔ فرقہ وارانہ اتحاد پر زور دیتے ہوئے آپ نے فرمایا غدر ۱۸۵۷ء میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کے شانہ بہ شانہ آزادی کے لیے خون بہایا تھا۔ اب آزاد ہند فوج ہندو مسلم اتحاد کی شان دار مثال ہے۔ جو لوگ ''اسلام خطرے میں'' کا نعرا لگاتے ہیں تو وہ اسلام کے دشمن ہیں۔ (روزنامہ زمزم، لاہور: ۱۵/مئی ۱۹۴۷ء، ص ۳)

ماؤنٹ بیٹن کی لندن روانگی:

۱۸ رمئی ۱۹۴۷ء: لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہر چند کوشش کی کہ کیبنٹ مشن پلان مسلم لیگ کو دوبارہ قبول کر لینے پر آمادہ کر لیا جائے، لیکن وہ اس میں قطعی ناکام ہو گئے۔ اب وہ تقسیم ہند کے پلان پر فریقین کی رضامند حاصل کر کے ۱۸ رمئی کو لندن روانہ ہو گئے ہیں تاکہ برطانوی حکومت سے اس کی منظوری حاصل کر سکیں۔

جمعیت علما کی قرارداد:

۱۹ رمئی ۱۹۴۷ء: تقسیم پنجاب و بنگال کی مذمت - جمعیت علمائے ہند کی قرارداد

(زمزم ـ لاہور: ۱۹ و ۲۳ رمئی ۱۹۴۷ء، ص ۳)

ہندوستان کے حالات کی مزید خرابی — وزیر ہند کا اعتراف:

۲۱ رمئی ۱۹۴۷ء: ۲۱ رمئی کو برطانوی پارلیمنٹ میں ایک سوال کے جواب میں وزیر ہند لارڈ لیسٹوویل نے انکشاف کیا:

گذشتہ ۱۸ رنومبر ۱۹۴۶ء سے اب تک ساڑھے سات ہزار اشخاص ہلاک اور تین ہزار تین سو سولہ مجروح ہوئے ہیں۔ وزیر ہند نے کہا میں اس سے اتفاق کرتا ہوں کہ گورنمنٹ کے ۲۰ رفروری کے اعلان کے بعد حالات بہتر ہونے کی بجائے کہیں زیادہ بگڑ گئے ہیں، لیکن اس خرابی کا گورنمنٹ برطانیہ سے کوئی تعلق نہیں۔

(روزنامہ ''زمیندار'' لاہور، ۲۳ رمئی ۱۹۴۷ء)

خود مختار اور آزاد بنگال — ایک مبینہ معاہدہ:

۲۲ رمئی ۱۹۴۷ء: ۲۲ رمئی کو کلکتہ سے ایسوسی ایٹیڈ پریس نے ایک خبر مہیا کی جو ۲۴ رمئی کے ملکی اخبارات میں شایع ہوئی کہ بنگال کے ہندو مسلمانوں کے درمیان سمجھوتا طے پا گیا، جو ذیل میں درج ہے:

''مسٹر سرت چند بوس اور ممتاز کانگریسی اور لیگی رہنماؤں میں مذاکرات نے واضح اور قطعی صورت اختیار کر لی ہے۔ چناں چہ نئی صوبائی وزارت کی

تشکیل اور آیندہ دستور کے لیے مفصلہ ذیل اصول اور شرایط طے کی گئی ہیں۔

(۱) بنگال آزاد ریاست کی حیثیت اختیار کر گیا اور باقی ہندوستان کے ساتھ اپنے تعلقات کے متعلق فیصلہ کرنے کا خود ہی مجاز ہوگا۔

(۲) بنگال کے آیندہ دستور میں صوبائی اسمبلی کا انتخاب مشترکہ نیابت اور حق رائے دہی بالغان پر ہوگا، لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں کی آبادی کے تناسب پر اراکین کی تعداد مخصوص کر دی جائے گی۔ ہندوؤں اور اچھوتوں کے درمیان بھی ان کی آبادیوں کی تناسب سے سیٹیں مخصوص کر دی جائیں گی۔ یا کسی طریقے پر عمل درآمد کیا جائے گا جو دونوں کی باہمی رضامندی سے طے کیا جائے۔ حلقہ ہائے انتخاب ایک سے زیادہ جاتیوں کے لیے ہوں گے اور ووٹ منقسم صورت میں ہوں گے نہ کہ محض کثرتِ تعداد کے اصول پر، امیدوار صرف اپنی قوم سے اکثریت حاصل کر سکے گا بلکہ دوسری اقوام کے ڈالے گئے ووٹوں میں سے کم از کم پچیس فیصدی ووٹ حاصل کرنے لازمی ہوں گے۔ اگر امیدواران میں سے کوئی بھی اس معیار پر پورا نہیں اترا تو پھر صرف وہی امیدوار کامیاب سمجھا جائے گا جس نے اپنی قوم کی اکثریت حاصل کی ہو۔

(۳) جس وقت برطانوی گورنمنٹ بنگال کی آزاد ریاست کو تسلیم کرنے کا اعلان کر دے اور یہ بھی واضح ہو جائے کہ اب بنگال تقسیم نہیں کیا جائے گا تو فوراً موجودہ وزارت ختم ہو جائے گی اور اس کی جگہ نئی مشترکہ عارضی وزارت اس طریق سے قایم کر دی جائے گی کہ اس میں وزیر اعظم کو چھوڑ کر ہندوؤں جن میں اچھوت بھی شامل ہوں گے اور مسلمانوں کے نمایندے برابر کی تعداد میں شامل ہوں گے۔ اس وزارت میں وزیر اعظم مسلمان ہوگا اور ہوم منسٹر ہندو۔

(۴) جس وقت تک کہ نئے آئین کے ماتحت صوبائی اسمبلی اور وزارت کی ترتیب و تشکیل عمل میں نہیں لائی جاتی۔ اس وقت تک کے لیے عارضی طور پر پولیس اور فوج میں ہندو اور مسلمانوں کی بھرتی مساوی رکھی جائے گی اور افسران سب کے سب بنگالی نژاد ہوں گے۔"

یو پی کے لیگی رہنما — فرار کی تیاری:

۲۲ رمئی ۱۹۴۷ء: اس کے باوجود یو پی کے مسلمان کو اپنے رؤسا اور لیڈروں پر تکیہ رہا کہ یہ ہماری ڈھارس بندھائیں گے، لیکن جیسے ہی ۲۲ رمئی ۱۹۴۷ء کے اخبارات میں یہ خبر شایع ہوئی کہ

❁ مہاراجہ محمود آباد نے کراچی میں دو بنگلے خرید لیے۔

❁ تبادلۂ آبادی شروع ہو گیا۔

کراچی۔ ۲۲ رمئی مہاراجہ محمود آباد نے جو یو پی کے سب سے بڑے زمین دار ہیں، سندھ میں جائیداد خریدنی شروع کر دی۔ معلوم ہوا ہے کہ آپ نے کراچی میں دو عظیم بنگلے خرید لیے ہیں۔ راجہ صاحب محمود آباد کا کہنا ہے کہ انھوں نے یہ قدم چودھری خلیق الزمان کی ہدایت پر اٹھایا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی یو پی کا مسلمان بے اختیار کہہ اٹھا

باغ باں نے آگ دی جب آشیانے کو میرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

(ہفت روزہ "الفضل" سہارن پور: ۲۹ رمئی ۱۹۴۷ء)

مسٹر جناح کا مطالبہ راہ داری:

۲۲ رمئی ۱۹۴۷ء: رائٹر کے حوالے سے قاید اعظم محمد علی جناح کا ایک بیان شایع ہوا، جس میں مطالبہ کیا گیا کہ مشرقی و مغربی پاکستان کو ملانے کے لیے آٹھ سو میل کا راستہ ملنا چاہیے۔ (روز نامہ "زمیندار" لاہور: ۲۳ رمئی ۱۹۴۷ء)

مسٹر محمد علی جناح کے اس بیان پر مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی اور لیگ کونسل کے رکن چودھری خلیق الزماں نے اس بیان پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا:

"ماؤنٹ بیٹن کی عدم موجودگی میں مسٹر جناح کا ایک بیان اخبارات میں شایع ہوا کہ وہ پاکستان کے دونوں حصوں کے لیے ایک گزر گاہ چاہتے ہیں۔ برٹش گورنمنٹ تو اس پر کیا توجہ دیتی خود مسلم لیگ والوں نے اس کو ایک سیاسی شوشہ سمجھ کر کوئی اہمیت نہ دی۔ جب ہم پنجاب کا بٹوارا منظور کر چکے تھے۔ تو گزر گاہ کون دیتا؟" (شاہراہِ پاکستان: ص ۱۰۴۹)

"عہد لارڈ ماؤنٹ بیٹن" کے مؤلف کیمبل جانسن نے اس بیان پر یہ تبصرہ کیا ہے:

جناح نے سیاست کی فضا میں زبردست بم پھینکا جو موقع محل کے لحاظ سے موزوں اور مناسب ثابت ہوا۔ انھوں نے مطالبہ پیش کیا کہ مغربی اور مشرقی پاکستان کو ملانے کے لیے آٹھ سو میل طویل قطعۂ زمین دی جائے۔ اس نوعیت کے مطالبے کو پیش کرنے کا فن غالباً انھوں نے اسٹالن سے سیکھا ہے۔"

(عہد لارڈ ماؤنٹ بیٹن: ص ۱۲۵)

یہی مؤلف اس بیان پر "ہندوستان ٹائمز" کے اداریے کا ایک جملہ نقل کرتا ہے جو بہت تیکھا ہے، حقیقت پر مبنی ہے، لیکن اشتعال انگیز بھی نہیں۔ اخبار لکھتا ہے:

"پاکستان کے وجود کا انحصار اگر اس قطعۂ زمین پر ہے تو پاکستان ہرگز وجود میں نہیں آ سکتا۔" (عہد لارڈ ماؤنٹ بیٹن: ص ۱۳۶)

جناح صاحب کی تقسیم رضامندی سے سر یامین کا اختلاف:

مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کے ممبر سر محمد یامین اپنی کتاب "نامۂ اعمال" حصۂ دوم کے صفحہ ۱۲۹۱ پر لکھتے ہیں:

"شملہ میں ایک اخباری نامہ نگار (مسٹر شرما) نے مجھے یہ خبر سنائی کہ پنجاب کی تقسیم کا معاملہ انگریز گورنر سر ایون جینکس کی اسکیم کے مطابق طے پا چکا ہے۔ یعنی سترہ ضلع پاکستان کو اور بارہ ضلع ہندوستان کو ملیں گے۔

یہ سن کر مجھے حیرت ہوئی کہ قایداعظم اس پر کیوں کر رضامند ہو سکتے ہیں، یہ تو اقتصادی نقطۂ نظر سے بالکل غلط ہے اور کمشنری جالندھر کو کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟ یہاں کے مسلمان لاہور کے علاوہ بہت زیادہ تعلیم یافتہ ہیں اور اس سے ملحق کپورتھلہ ریاست میں پچھتر فیصد مسلمان ہیں۔ اور مالیر کوٹلہ ریاست مسلمانوں کی ہے اور وہاں کی آبادی سب مسلمان ہے۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ قایداعظم نواب ممدوٹ سے مشورہ کیے بغیر ایسی تقسیم کو کیسے منظور کریں گے؟"

لیکن بعد میں نامہ نگار کی اطلاع درست نکلی۔

تقسیم پنجاب سے مسٹر جناح کی رضامندی:

۲۲ر مئی ۱۹۴۷ء: جیسے کہ لندن روانگی سے پیشتر وایسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے لیاقت علی خان سے کہا تھا کہ لیگ پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے بارے میں اپنی رائے سے میرے سیکرٹری کو مطلع کردے، وہ مجھے لندن بھیج دے گا۔ ۲۲ر مئی کو قائد اعظم نئی دہلی وایسرائے کے سیکرٹری سے ملے۔ دونوں کے درمیان ملاقات پر کیا طے ہوا؟ وایسرائے کے سیکرٹری نے جواب میں کیا کہا؟ یہ سب صیغۂ راز میں رہا۔ البتہ سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور نے دوسرے روز انکشاف کیا کہ وایسرائے کے سیکرٹری سر ایرک میویل نے سول اینڈ ملٹری گزٹ کے نمایندے کو بتایا کہ مسٹر جناح سے ملاقات کا مقصد ماؤنٹ بیٹن کے دستوری پلان پر مسٹر جناح کے دستخط حاصل کرنا تھا۔ اس گفتگو کے دوران میں وایسرائے کے سیکرٹری نے کہا کہ مسٹر جناح نے بنگال اور پنجاب کی تقسیم سے اتفاق کرلیا ہے۔

(روزنامہ آزاد: ۲۳ر مئی ۱۹۴۷ء)

بنگال کو متحد رکھنے کے لیے سمجھوتا اور مسٹر جناح کی منظوری:

۲۴ر مئی ۱۹۴۷ء: دو قومی نظریہ کے زبردست پشتی بان ''ڈائریکٹ ایکشن ڈے'' کے مسلم لیگی ہیرو مسٹر حسین شہید سہروردی اور بنگال مسلم لیگ کے دیگر قایدین قیام پاکستان کے لیے مصروف جہد تھے لیکن جب قرارداد لاہور کو عملی جامہ پہنانے کا وقت قریب آیا تو یہ حضرات اس سے فرار اختیار کرگئے اور بنگال کو پاکستان میں شامل ہونے سے روکنے کی کوششوں میں مصروف ہوگئے۔ وہ چاہتے تھے کہ بنگال تقسیم ہوکر پاکستان میں شامل نہ ہو بلکہ متحد رہے اور خودمختار و آزاد ہوجائے۔ انھوں نے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بنگال کانگریس اور ہندو سبھا کی حمایت بھی حاصل کرلی۔ اس سلسلے میں جو سمجھوتا طے پایا اس کی خبر ایسوسی ایٹیڈ پریس آف انڈیا نے (۱۴ر مئی ۱۹۴۷ء) اخبارات کو مہیا کی جس میں سمجھوتا کی تفصیلات درج تھیں:

مسٹر سرت چندر بوس اور ممتاز کانگریسی و مسلم لیگی رہنماؤں میں مذاکرات نے واضح شکل اختیار کرلی ہے۔ چناں چہ آیندہ کی صوبائی وزارت کی تشکیل اور دستور کے اصول اور شرائط طے پاگئی ہیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) بنگال آزاد ریاست کی حیثیت اختیار کر لے گا تو باقی ہندوستان کے ساتھ تعلقات کا فیصلہ کرنے کا مجاز و مختار ہوگا۔

(۲) بنگال کے آیندہ دستور میں انتخاب مشترکہ نیابت کی بنیاد پر ہوں گے اور ہر بالغ مرد و عورت کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہوگا..... ہندوؤں اور مسلمانوں کو نمایندگی آبادی کی بنیاد پر ملے گی۔

(۳) جب برطانوی حکومت بنگال کی آزاد ریاست کا اعلان کر دے گی تو موجودہ وزارت فی الفور ختم ہو جائے گی اور اس کی جگہ نئی مشترکہ وزارت قایم کر دی جائے گی۔ اس میں وزیر اعظم کو چھوڑ کر مسلمانوں اور ہندوؤں کے نمایندے برابر تعداد میں شامل ہوں گے۔

(۴) وزیر اعظم مسلمان ہوگا اور ہوم منسٹر ہندو۔

(۵) پولیس اور فوج میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مساوی بھرتی کیا جائے گا اور تمام افسران بنگالی نژاد ہوں گے۔

مسٹر حسین شہید سہروردی نے ۲۶ر اپریل کو ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات کی اور اسے کہا تھا کہ اگر انھیں مناسب وقت دیا جائے تو وہ بنگال کو اس پر راضی کرائے گا کہ بنگال متحد رہے اور آزاد ہو اور وہ مسٹر جناح کو بھی اس پر آمادہ کر لیں گے، اس صورت میں بنگال پاکستان میں شامل نہ ہو۔ مسٹر حسین شہید سہروردی نے وایسرائے کے سامنے جس عزم کا اظہار کیا تھا اسے واقعی پورا کر دکھایا۔ مسٹر جناح اسی دن وایسرائے سے ملنے گئے تو ماؤنٹ بیٹن نے بالکل سیدھے طور پر سہروردی کی ملاقات اور تجویز کا ذکر کیا اور ان کی رائے دریافت کی تو مسٹر جناح نے بغیر ہچکچاہٹ کے جواب دیا:

> ''.....میں خوش ہوں گا، کیوں کہ کلکتہ کے بغیر بنگال کا کیا فایدہ؟ ان کے لیے بہتر ہے کہ وہ متحد رہیں اور آزاد رہیں۔''

یقین ہے ان کے ہمارے ساتھ دوستانہ تعلقات ہوں گے۔ ماؤنٹ بیٹن کہتا ہے کہ سہروردی نے مجھے یقین دلایا ہے کہ اگر بنگال متحد رہا اور آزاد ہو تو وہ برطانوی دولت مشترکہ میں شامل ہوگا۔ اب بنگال کو راضی کرنا باقی رہ گیا تھا۔ یہ کام مسٹر سہروردی نے ایک ماہ سے کم عرصے میں کر دکھایا۔ متذکرہ بالا مشترکہ اعلامیہ اس کا ثبوت ہے۔ چودھری محمد علی نے اس

پہلو پر مزید روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''وزیر اعظم بنگال حسین شہید سہروردی نے سبھاش چندر بوس کے بھائی سرت چندر بوس کی تائید سے ایک آزاد اور خود مختار بنگال کی آواز اٹھائی اور انگریز گورنر بھی اس کا حامی تھا..... کلکتہ میں گاندھی جی سے سرت چندر بوس سہروردی اور دوسرے لیڈروں نے ملاقات کی جن میں بنگال مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری ابوالہاشم بھی شامل تھے، موخر الذکر کی گفتگو سے گاندھی جی کو خوش گوار حیرت ہوئی کیوں کہ وہ متحدہ بنگال کی حمایت مشترکہ زبان، مشترکہ ثقافت اور مشترکہ تاریخ کی بنیاد پر کرتا تھا۔ جس نے بنگال کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک وحدت میں پرو رکھا تھا۔''

دو قومی نظریے کے بنگالی علم بردار مسٹر حسین شہید سہروردی کے بارے میں ایک اور مصنف رقم طراز ہے کہ سہروردی کا موقف یہ تھا:

''..... ہم بنگالی مشترکہ مادری زبان رکھتے ہیں اور ہمارے اقتصادی مفادات مشترکہ ہیں..... بنگال کی پنجاب کے ساتھ بہت معمولی مماثلت ہے، بنگال آزاد ریاست ہوگا اور اس کا فیصلہ خود کرے گا کہ کیا اس نے پاکستان کے ساتھ ناتہ رکھنا ہے؟ جناح متحدہ آزاد بنگال کے قیام کا کھلے دل سے خیر مقدم کرے گا۔''

تو یہ تھا مسلم لیگ کے قایدین کا انداز سیاست، انھی تضادات سے بھرپور سیاست کے باعث مسلمانوں کو خسارے کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ مسٹر جناح نے تو مشن سے کہا تھا:

''ایک مرتبہ پاکستان کا مطالبہ تسلیم کرلیا جائے تو اس کی سرحدات کے تعین پر گفتگو ہو سکتی ہے۔''

مسٹر جناح نے ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات کی تو اس کا تاثر یہ تھا:

''مسٹر جناح نے اپنے منصوبے کے کسی پہلو پر غور ہی نہیں کیا، اسے اپنی زندگی کا سب سے بڑا دھچکا اس وقت لگے گا جب وہ حقیقت کی دنیا میں قدم رکھے گا۔''

(ابوالکلام آزاد اور..... : ص ۶۵-۵۶۴)

پنجاب کی تقسیم اور لیگ کی رضامندی پر پنجاب کا ردِ عمل:

۳۱ر مئی ۱۹۴۷ء: احرار، سوشلسٹ پارٹی پنجاب اور کسان ورکرز نے ایک مشترکہ بیان جاری کیا جس میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کے فیصلے تقسیم پنجاب اور بنگال کی تجویز کی شدید مخالفت کی اور کہا کہ یہ تجویز کانگریس کے اصولوں کے منافی ہے۔

مجلسِ احرار کے ترجمان اخبار نے ''پنجاب کو تقسیم سے بچاؤ'' کے زیر عنوان مقالہ سپرد قلم کرتے ہوئے تقسیم ہند منصوبے کے اعلان سے صرف تین یوم قبل انتباہ کیا:

''.....ہمیں تقسیم پنجاب اور بنگال میں سخت خسارہ نظر آرہا ہے۔ جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے ہمارے حصے میں پس ماندہ اور ریگستانی علاقے آرہے ہیں اور ہمارا بہترین خطہ ہم سے زبردستی چھینا جارہا ہے۔

تقسیم کے ردو قبول کا مسئلہ میز پر بیٹھ کر طے نہ ہو سکے گا۔ مسلمانانِ ہند عموماً اور مسلمانانِ پنجاب خصوصاً معاملے کی نزاکت کو سمجھ لیں۔ انھیں اپنے دل کی بات رہنماؤں کے سامنے کہہ دینی چاہیے۔ ہمارے رہنما مانیں یا نہ مانیں، وہ اس وقت دوراہے پر کھڑے ہیں۔ رہنماؤں کا فرض ہے کہ وہ جھوٹے وقار اور سابقہ اعلانات کو پس پشت ڈال کر معاملے کی نوعیت کو از سر نو سمجھیں۔ کروڑہا مسلمانوں کی تقدیر بننے اور بگڑنے کا آخری مرحلہ آن پہنچا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ مسلمان قوم کسی ایسے خسارے میں پڑ جائے جس سے چھٹکارا حاصل کرنا مشکل ہو۔''

لاہور کے ایک اور روزنامہ ''انقلاب'' نے اپنے مقالہ افتتاحیہ میں صوبائی تقسیم کے مہیب خطرات سے آگاہ کرتے ہوئے تین اہم پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ معاصر مذکور نے لکھا:

''(الف) پاکستان مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ آبادی کی آزادی پر مبنی ہے، لیکن پنجاب اور بنگال کی تقسیم سے کم و بیش ایک کروڑ سے زاید مسلمان پاکستان سے منقطع ہو جائیں گے۔

(ب) سترہ اور بارہ ضلعوں کے علاقے اقتصادی، انتظامی، دفاعی اور ارتقائی نقطۂ نگاہ سے بالکل بے بس ہو کر رہ جائیں گے۔

(ج) اس طرح فرقہ وارانہ مسئلہ حل نہ ہوگا بلکہ اس صورت میں یہ درجہا

خراب تر صورت اختیار کرلے گا۔"

۳؍جون پلان تقسیم ہند منصوبے پر مجلسِ احرار نے ۱۲؍جون ۱۹۴۷ء کو ایک متفقہ قرار داد میں اپنا ردِعمل ظاہر کرتے ہوئے کہا:

"آل انڈیا مجلسِ احرار کی ورکنگ کمیٹی کا یہ اجلاس ۳؍جون کے برطانوی اعلان کو اقوام ہند خصوصاً مسلمانانِ ہند کے لیے انتہائی خطرناک تصور کرتا ہے۔ یہ اسکیم ہندوستان میں رہ جانے والے کروڑوں مسلمانوں کے لیے نہایت نقصان دہ ثابت ہوگی اور پاکستان کو فوجی اور اقتصادی اعتبار سے یورپین اقوام کا محکوم بنا دے گی۔

تقسیم پنجاب اور بنگال کا مسئلہ پاکستان اور ہندوستان کی مملکتوں کے درمیان ہمیشہ تنازعات پیدا کرتا رہے گا اور دونوں مملکتوں میں فرقہ وارانہ کش مکش جاری رہے گی۔

اندریں صورت مجلسِ احرار کی یہ رائے ہے کہ برطانوی حکومت کی اس اسکیم کے خلاف جدوجہد جاری رکھی جائے۔"

(ابوالکلام آزاد اور قوم پرست مسلمانوں کی سیاست: ص ۳۳-۶۳۲)

تقسیم ہند کے پلان سے وزیراعظم برطانیہ کا اتفاق:

۳۱؍مئی ۱۹۴۷ء: لارڈ ماؤنٹ بیٹن وزیراعظم برطانیہ سے تقسیم ہند کے پلان کی منظوری لے کر لوٹ آئے۔ انھوں نے ہندوستانی زعما کو اپنی اپنی تجاویز سے اس شرط کے ساتھ مطلع کیا ہے کہ جب تک وہ اپنی اپنی پارٹیوں سے اس پلان کی منظوری حاصل نہ کرلیں اس وقت تک وہ صیغۂ راز میں رہیں گی۔

بنگال و پنجاب کی تقسیم پر مسلم لیگ کی رضامندی:

۲؍جون ۱۹۴۷ء: ہندوستان کی سرزمین پر مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کا آخری جلسہ ۲؍جون ۱۹۴۷ء کو ہوا، جس میں ہندوستان کی تقسیم کے ساتھ پنجاب اور بنگال کی تقسیم بھی مسلم لیگ نے قبول کرلی۔ برٹش گورنمنٹ کی تقسیم کے مطابق پنجاب اور بنگال کے جو اضلاع جن

میں ضلع کے ساتھ تحصیلوں میں بھی مسلمانوں کی کھلی اکثریت تھی، پاکستان کا حصہ قرار دیے گئے ہیں، مگر دوسرے اضلاع کے مطابق فیصلہ کمیشن پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ یہ کمیشن بعد میں اپنا کام شروع کرلے گا اور حد بندی قایم کرے گا۔

ورکنگ کمیٹی کے اس فیصلے پر چودھری خلیق الزماں نے جو خود بھی اس کے ایک رکن تھے اور فیصلے میں ان کی رائے بھی شامل تھی، لکھا ہے:

"لارڈ ماؤنٹ بیٹن ۳۱ رمئی ۱۹۴۷ء کو وزیر اعظم برطانیہ سے تقسیم ہند کے لیے رضا مندی حاصل کرکے ہندوستان لوٹ آئے اور ہندوستانی زعما کو اپنی تجاویز سے اس شرط کے ساتھ مطلع کردیا کہ وہ جب تک اپنی اپنی انجمنوں سے ان پر رضامندی نہ حاصل کرلیں اس وقت تک وہ صیغۂ راز میں رہیں۔

مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کا ہندوستان کی سرزمین پر آخری جلسہ ۲ر جون ۱۹۴۷ء کو منعقد ہوا، جس میں پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی تقسیم بھی مسلم لیگ نے قبول کی۔ برٹش گورنمنٹ کی تقسیم کے مطابق پنجاب اور بنگال کے ان اضلاع جن میں ضلع اور تحصیلوں میں بھی کھلی ہوئی مسلم اکثریت تھی، پاکستان کے حصے قرار دے دیے گئے، مگر دوسرے اضلاع کے متعلق فیصلہ کمیشن پر چھوڑ دیا گیا جو بعد میں اپنا کام شروع کرے گا اور حد بندی قایم کرے گا۔

جس حشر سے میں ڈرتا تھا بالآخر میرے نقطۂ نظر سے میرے سامنے پیش تھا، ہندوستان کی مسلم سیاست برٹش دور میں توازن کے اصول پر برابر قایم رہی تھی۔ جداگانہ انتخاب اسی توازن کے سلسلے کی ایک کڑی تھی، مگر جب مسلمانوں کو محسوس ہوا کہ ۱۹۳۵ء کے دستور میں برٹش نے اپنے سرکاری بلاک کو خارج کرکے سات صوبوں میں مسلم قلیل اقلیت کو ہندو اکثریت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے تو انھوں نے پاکستان کے مطالبے کے ذریعے اس توازن کو برقرار رکھنے کی کوشش کی، مگر صوبہ پنجاب اور بنگال کی تقسیم نے اس توازن کو بالکل غتر بود کردیا، کیوں کہ اس سے مسلمان دو حصوں میں تقسیم ہوگئے اور ان دونوں حصوں میں پاکستان اور اقلیتی صوبوں میں کم از کم تین سو میل کا فصل حایل ہوگیا، جس کی وجہ سے دس بارہ کروڑ مسلمان تقریباً نصف نصف ہندوستان اور پاکستان میں بٹ گئے اور ہندوستان میں ان کی چار پانچ کروڑ آبادی بے یار و مددگار رہ گئی اور پھر یہ بھی ایک سانحہ ہے کہ پاکستان

کے مغربی اضلاع اور مشرقی اضلاع میں ایک ہزار میل کا فصل ہو گیا۔ نیز یہ خطرہ بھی پیش نظر تھا کہ پنجاب کے اضلاع کی تقسیم کہیں ایسی نہ ہو جائے کہ ہندوستان کو کشمیر کے لیے راستہ مل جائے، یہ تمام مسایل مجھے عرصہ سے پریشان کیے ہوئے تھے، جن کا مفصل ذکر میں نے مسٹر جناح سے اپنے ۱۷/ اکتوبر ۱۹۳۹ء کے خط میں کر دیا تھا۔ مگر اس وقت وہ لاہور کی پاکستان کی تجویز کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے تھے، کیوں کہ اس تجویز میں پنجاب اور بنگال کے پورے صوبوں کا مطالبہ نہیں کیا گیا تھا بلکہ اس میں صوبوں کی تقسیم کے لیے کھلا ہوا مواد موجود تھا۔

اکثر سمجھ دار اور فہیم سیاست داں آج اٹھارہ برس بعد بھی یہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ مسلمانوں کو مل سکتا تھا وہ مل گیا اور اس سے زایدہ وہ برٹش گورنمنٹ سے کچھ حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ۱۹۴۰ء کے پاکستان ریزولیوشن میں مسلم لیگ نے اسی قدر طلب کیا جس کو وہ ضروری سمجھتی تھی کہ انگریز کے ذریعے حاصل کر لے گی۔ پھر اگر دینا انگریز ہی کے ہاتھ میں تھا تو ہم اس سے کم از کم مکمل پاکستان مانگتے اور جنگ میں اس کی پوری مدد کر کے ان کی خوش نودی حاصل کرتے، جس کو میرے اصرار کے باوجود انھوں نے منظور نہ کیا۔ اب تقسیم کے بعد خود مسٹر جناح نے پاکستان میں اپنی ایک تقریر میں کہا کہ انگریز نے ہم کو ایک کٹا پٹا مجروح اور پاش پاش پاکستان دیا ہے۔ پنجاب تقسیم ہو رہا تھا، بنگال بھی تقسیم ہو رہا تھا۔ کشمیر پر بھی ہمارا قبضہ نہ تھا، لہٰذا اس کو کٹا پٹا کہنا بھی غلط تھا، کیوں کہ ''ک'' جو کشمیر کی علامت تھی وہ بھی غایب تھی اور ہمیں صرف ''پالستان'' مل رہا تھا۔

جب مکمل پاکستان کا مسلم لیگ کی طرف سے مطالبہ ہی نہیں ہوا تو پھر انگریزوں پر یہ الزام لگانا کس طرح جایز ہو سکتا ہے؟

میرا اپنا نظریہ یہ تھا کہ باوجود ہمارے پاکستان کی تجویز کے انگریز ہم کو پورا پاکستان دے کر جاتا۔ بہ شرطے کہ ہم اپنی وار پالیسی سے اس کو یہ موقع نہ دیتے کہ وہ کانگریس اور لیگ کی وار پالیسیوں میں کوئی تفریق نہ کر سکے اور نہ امریکا اور مغربی دنیا کو یہ گمان دلائے کہ ہندوستان کی دونوں پارٹیوں کو جنگ سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔ اس وقت ہندوستان کی سیاست کا نقشہ کچھ اور ہی ہوتا۔ کانگریس نے ہمارے اس رویے سے پورا فایدہ اٹھایا اور موقع پاتے ہی ۸/ مارچ ۱۹۴۷ء کو تقسیم پنجاب کا مطالبہ کر دیا جس میں وہ سو فیصدی کامیاب ہو گئی۔

ان سب تخیلات کے ساتھ ورکنگ کمیٹی میں میں نے کس دل سے تقسیم پنجاب کی حمایت کی اس کے لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میرے دل میں صرف ایک جذبہ یہ تھا کہ بہر نوع ایک چھوٹا سا پاکستان بھی پاکستان نہ ہونے سے یقیناً بہت بہتر ہے اس لیے میں نے بھی دوسروں کی طرح تقسیم پنجاب اور بنگال کی تائید کی۔ مگر اس کو میں قطعی مسلم لیگ کی شکست سمجھا، کیوں کہ جن اقلیتوں کے تحفظ کے لیے ہم ۱۹۳۷ء میں مجتمع ہوئے تھے۔ ان اقلیتوں کو تو ہم اور بدتر حالت میں چھوڑ رہے تھے اور خود اکثریتی صوبوں کی تقسیم کر رہے تھے اور یہ تقسیم ہمارے لیے کسی طرح فخر ومباہات کی وجہ نہیں بن سکتی تھی؟ اس دن کے جلسے میں کوئی اور مسئلہ سوائے کراچی کو پاکستان کا کیپٹل بنانے کے پیش نہیں ہوا۔ شہید سہروردی نے اپنی یونائیٹیڈ بنگال کی تحریک کے متعلق بھی کچھ نہیں کہا۔ عام طور پر ہم سب یہ سمجھے کہ تقسیم ہند کے تمام سوالات ۱۶ر جون ۱۹۴۸ء تک طے ہو جائیں گے اور اس عرصے میں اور اس کے بعد کچھ عرصے تک گورنر جنرل دونوں ملکوں کا ایک ہی رہے گا، تا آں کہ نیا دستور نافذ نہ ہو۔ ۸ر جون ۱۹۴۷ء کو مسلم لیگ کونسل نے ورکنگ کمیٹی کے فیصلے کی تائید کر دی۔ دوسرے دن جب جلسہ ہوا تو ''خاکسار والنٹیر'' امپیریل ہوٹل میں جہاں جلسہ ہوا تھا گھس آئے اور اس کو درہم برہم کرنے کی کوشش کی، جن کو بڑی مشکل سے وہاں سے نکالا گیا۔ اس مظاہرے سے ان کا کیا مقصد تھا؟ علامہ مشرقی مرحوم ہی بتا سکتے تھے۔''

(شاہراہ پاکستان: ص ۵۳-۱۰۵۰)

ماؤنٹ بیٹن کا رہنماؤں سے قوم کے پلان پر آخری مشورہ:

۲ر جون ۱۹۴۷ء: صبح کا وقت، ہندوستان کے سات لیڈروں نے وائسرائے کی مطالعہ گاہ میں قدم رکھا۔ وہ سات لیڈر اس مسودے کا جائزہ لینے آئے تھے جس کے لیے لارڈ ماؤنٹ بیٹن خود لندن جا کر اٹلی حکومت اور ونسٹن چرچل کی رضامندی حاصل کر کے آئے تھے۔ اس مسودے کی بنیاد پر ملک کو دو ٹکڑوں میں بانٹ کر ایک ٹکڑا اس کو اور ایک ٹکڑا اس کو دیا جانا تھا۔

صرف ۴۸ گھنٹے قبل وائسرائے لندن کی منظوری حاصل کر کے دہلی واپس آئے تھے۔ کمرے کے درمیان رکھی گول میز کے چاروں طرف لیڈر ایک ایک کر کے بیٹھنے

لگے۔ کانگریس کی نمایندگی کر رہے تھے نہرو، پٹیل اور صدر کی حیثیت سے آچاریہ کرپلانی۔ مسلم لیگ کے نمایندے تھے جناح، لیاقت علی خاں اور سردار عبدالرب نشتر۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن دیوار کی طرف بیٹھے تھے۔ ان کے دو مشیر ساتھ تھے، لارڈ اسمے، اور ایرک میویل۔ سرکاری فوٹو گرافر اس تاریخی موقعے کی تصویریں بڑی تیزی کے ساتھ لے رہا تھا۔

سب کے چہروں پر گہری سنجیدگی تھی، فضا پر گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا، وایسرائے بن کر دہلی آنے کے بعد ماؤنٹ بیٹن نے پہلی بار بند کمرے میں لیڈروں سے الگ الگ ملنے اور دوستانہ انداز میں بات کرنے کے بجائے کھلی گول میز کانفرنس کا اہتمام کیا تھا، اس کے باوجود ماؤنٹ بیٹن نے طے کیا تھا کہ جو کچھ کہا جانا ہے وہ خود کہیں گے۔ اگر ہر آدمی کو بولنے کا موقع دیا گیا تو یہ مجلس شور مچانے کا مقابلہ بن جائے گی۔ ماؤنٹ بیٹن اس خطرے سے دور رہنا چاہتے تھے۔

انھوں نے مختصراً یہ بتایا کہ تقسیم کی اس تجویز کے بارے میں انگلستان کے کس لیڈر سے کیا بات ہوئی؟ انھوں نے بار بار اس پر زور دیا کہ ہمیں اس پر انتہائی عجلت سے کام کرنا ہے، وقت بہت کم ہے۔ ہر شخص کو اس تجویز میں کوئی نہ کوئی ایسا حصہ ضرور مل جائے گا جس سے اسے اتفاق نہ ہو، لیکن غور کرتے وقت ہمیں حصوں کے بجائے مجموعی طور پر تجویز ذہن میں رکھنا چاہیے۔ تب ہی تجویز کا مقصد ابھر کر ہمارے سامنے آئے گا اور ہم فضول بحثوں میں الجھنے کے بجائے تیزی سے آگے بڑھ سکیں گے۔

''کل صبح میں آپ سے پھر ملنا چاہوں گا۔'' وایسرائے نے کہا

''اس سے پہلے آدھی رات تک اگر آپ تینوں پارٹیاں مجھے یقین دلا دیں کہ آپ سے قبول کرنے کو تیار ہیں تو آخری سمجھوتے کی بنیاد بن جائے گی۔ اس کے بعد میری تجویز یہ ہے کہ اس بات کی خبر دنیا کو دینے کے لیے آل انڈیا ریڈیو سے اعلان کر دیا جائے۔ اُدھر لندن ریڈیو سے کلیمنٹ اٹلی ہمارے فیصلے کی منظوری کا اعلان کر دیں گے۔

ماؤنٹ بیٹن نے اپنی بات ختم کی، کمرے پر سکوت طاری ہو گیا۔

اس سکوت کو ماؤنٹ بیٹن نے توڑا۔

حضرات! میں آدھی رات تک آپ کے ردِ عمل کا انتظار کروں گا۔

کانگریس نے پلان منظور کرلیا:

کانگریس نے اپنا پیغام بھجوا دیا کہ انھیں ملک کے بٹوارے کی تجویز منظور ہے۔ سکھوں کی منظوری بھی وایسرائے کو حاصل ہو چکی تھی۔ معاملہ اگر اٹکا تو کہاں اٹکا؟ محمد علی جناح پر۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ جناح کا بھی آج مون برت ہے۔

مسٹر جناح کا منظوری سے گریز:

برس ہا برس سے جناح نے جو خواب دیکھے تھے ان کے پورے ہونے میں اب صرف اتنی دیر تھی کہ وہ ''ہاں'' کہہ دیں، لیکن نہ جانے وہ کون سی پراسرار وجہ تھی جس کی بہ دولت وہ تقسیم کی اس تجویز پر ہاں نہیں کہہ پا رہے تھے۔ ان کی ساری زندگی ''نہیں'' کہنے میں گزری تھی اور ''نہیں'' ان کے دماغ میں اس حد تک بیٹھ چکی تھی کہ اب جب سب کچھ ان کے حق میں تھا تو جناح کے ہونٹوں سے ''ہاں'' نہیں نکل رہا تھا۔

ان کا ایک ہی کہنا تھا کہ تقسیم کے اس مسودے پر جب تک مسلم لیگ کی کونسل میں غور نہیں ہو جاتا میں اکیلا اسے منظور نہیں کر سکتا اور کونسل کے اراکین کو دہلی بلانے کے لیے کم سے کم ایک ہفتے کا وقت چاہیے۔

اس وقت تک جناح کے ساتھ جتنے مذاکرات ہوئے تھے ان میں وایسرائے کو ہمیشہ مایوسی ہوئی تھی۔ اب ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ جناح پاکستان چاہتے تھے، وہ ان کو دیا جا رہا تھا۔ کانگریس نے مان لیا۔ سکھوں نے اسے حلق کے نیچے اتار لیا۔ عین وقت پر جناح کی طرف سے اڑنگا ڈالنے کا کیا مطلب.....؟

جناح صاحب کی ضد:

کانگریس اور سکھوں کو اگر ذرہ برابر شبہ ہوا کہ جناح صرف اس لیے ٹال مٹول کر رہے ہیں کہ انھیں اپنی ایک آدھ شرط منوانی ہے تو سمجھوتے کی اتنی بڑی عمارت جو اتنی پریشانیوں کے بعد کھڑی کی گئی ہے اسے زمین دوز ہونے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگے گا۔

جناح اپنی بات پر اڑے ہوئے تھے:

''مگر مسلم لیگ کی طرف سے میں اکیلا کیسے حامی بھر سکتا ہوں۔ میں تنہا تو

مسلم لیگ نہیں ہوں؟''

ماؤنٹ بیٹن کے لیے اپنی مایوسی اور غصے کو دبانا مشکل ہوگیا۔ انھوں نے صفائی سے کہا:

''دیکھیے مسٹر جناح! دنیا میں آپ کہیں بھی جائیے اور کچھ کہیے، مجھے کوئی سروکار نہیں۔ لیکن کم سے کم میرے سامنے ایسا مت کہیے کہ آپ ہی مسلم لیگ نہیں ہیں۔''

جناح اپنی ضد سے ہلے نہیں:

''یہ معاملہ قانون کا ہے اور میں غیر قانونی ہاں نہیں کہہ سکتا۔''

ماؤنٹ بیٹن کی دھمکی:

اب ماؤنٹ بیٹن نے اپنی تیور بدل لیے:

''مسٹر جناح! اب میں آپ سے ایک خاص بات کہنے جا رہا ہوں، اس ٹال مٹول سے پاکستان کا آپ کا خواب ہمیشہ کے لیے ٹوٹ سکتا ہے، میں نہیں چاہتا کہ اتنا زبردست نقصان آپ صرف اس لیے اٹھائیں کہ آپ کے منہ سے ایک چھوٹا سا لفظ ''ہاں'' نہیں نکل سکا۔ جس چیز کو پانے کے لیے آپ نے اپنی تمام عمر داؤں پر لگا دی، اسے آپ پانے سے پہلے پھینک دینا چاہتے ہیں۔ میں آپ کو ایسا نہیں کرنے دوں گا۔ میرا ارادہ یہ ہے کہ اس تجویز کو آپ کی طرف سے میں خود منظور کر دوں''

''کس طرح؟'' جناح نے حیرت سے پوچھا۔

''کل جب جلسہ ہوگا تو میں یہ کہوں گا کہ کانگریس کا جواب چند برائے نام ترمیمات کے ساتھ مل گیا ہے، جن کے بارے میں انھیں مطمئن کر دوں گا۔ سکھوں نے تجویز منظور کر لی ہے۔ اس کے بعد یہ کہوں گا کہ کل رات مسٹر جناح کے ساتھ میری بہت طویل دوستانہ گفتگو ہوئی۔ ہم نے تجویز کی باریکیوں پر تفصیل سے غور کیا اور مسٹر جناح نے مجھے ذاتی طور پر پورا یقین دلایا کہ تجویز انھیں پسند ہے۔ اس جملے کے ساتھ میں آپ کی طرف گھوم کر دیکھوں گا اور مجھ سے نظر ملنے کے بعد میں نہیں چاہتا کہ آپ کچھ بولیں، میں یہ بھی

نہیں چاہتا کہ کانگریس آپ کو کچھ بولنے کے لیے مجبور کرے۔ آپ کو صرف ایک کام کرنا ہے، مجھ سے نظر ملنے کے ساتھ آپ کو سر ہلا کر ہاں کہہ دینا ہے۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو سارا معاملہ چوپٹ ہو جائے گا۔ کانگریس اور سکھوں کے دل میں آپ کے متعلق شکوک پیدا ہوں گے اور وہ اس تجویز کی حمایت سے دست بردار ہو جائیں گے، پھر میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔ سب خاک میں مل جائے گا۔ یہ دھمکی نہیں ہے، میری پیشین گوئی ہے۔"

مسٹر جناح کو ہاں کہنی پڑی:

چناں چہ ہندوستان کو تقسیم کرنے کی تجویز کے لیے وایسرائے نے جو جلسہ کیا تو انھوں نے تینوں پارٹیوں کا تجویز کو منظور کرنے کے لیے شکریہ ادا کیا اور جناح کی طرف گھوم کر دیکھا، وہ لمحہ ماؤنٹ بیٹن کے لیے جان لیوا تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت اس کے دل کی دھڑکن بند ہو گئی ہے۔

جناح کا چہرہ جذبات سے عاری تھا، اس کی ہر شکن نہیں! نہیں! کہہ رہی تھی۔ لیکن جناح نے بہت دھیرے سے اپنا سر ہلا کر "ہاں" کہہ دی۔ سر کی وہ جنبش اتنی خفیف تھی کہ وہاں موجود افراد کو بہ مشکل اس کا اندازہ ہو سکا، لیکن جناح کے سر کی اس ہلکی سی جنبش سے ایک نیا ملک وجود میں آ گیا — پاکستان!

جو تاریخی فیصلہ اس وقت کیا گیا تھا اس کی دھار چھری کی طرح ہر لیڈر کے دماغ میں بیٹھنے لگی۔ جو چوٹ انھیں لگی تھی اس کی شدت کا انھیں صحیح اندازہ بھی نہ ہو سکا تھا کہ ماؤنٹ بیٹن نے اشارہ کر کے ہر لیڈر کے سامنے میز پر اس دستاویز کی ایک ایک نقل رکھوا دی جو سنگل اسپیس میں ٹائپ ہونے کے باوجود ۳۴ صفحات میں پھیلی ہوئی تھی۔ آخری نقل وایسرائے کے سامنے رکھی گئی۔

تقسیم کے انتظامی مسایل:

اس دستاویز کا عنوان تھا "تقسیم کے انتظامی مسایل" ماؤنٹ بیٹن نے یہ عنوان سب کو پڑھ کر سنایا۔ یہ سنسنی خیز ۳۴ صفحات ماؤنٹ بیٹن اور ان کے عملے نے بڑی توجہ اور احتیاط سے تیار کیے تھے اور ہندوستان کے لیڈروں کو اس موقعے پر بہ طور تحفہ دیے جا رہے تھے۔

اس دستاویز کی زبان انتظامی اصطلاحات سے بوجھل تھی لیکن تقسیم کے فیصلے کے ساتھ کتنی الجھنیں ایک لمحے میں پیدا ہوگئی تھیں اس کا وہم وگمان بھی وہاں موجود سات لیڈروں میں سے کسی کو نہیں تھا۔

اس لیے جیسے جیسے صفحات ان کی نظر سے گزرے ان کے چہرے کا رنگ اڑتا گیا۔ کتنے بڑے پیانے پر کتنی پے چیدگیاں اچانک ان کے سامنے کھڑی ہوگئی تھیں۔ انسانی تاریخ میں بٹوارے کا اتنا بڑا مسئلہ کسی ملک کے سامنے نہیں آیا تھا۔

گذشتہ تین سو برسوں میں ملک میں متعدد تکنیکی ترقیاں ہوئی تھیں، انھیں ایک ایک کر کے تقسیم کرنا تھا۔ بینکوں میں رکھی نقد رقم، ڈاک گھروں میں پڑی ٹکٹیں، کتب خانے، قرضہ جات، دنیا کا تیسرے نمبر کا ریلوں کا نظام، دوائیں، جھاڑو، اسپتال، یونی ورسٹیاں، مختلف سرکاری خدمتیں، سوتی دھاگے، صابن کی بٹیاں اور نہ جانے کتنی طرح کی چیزیں تھیں جنھیں تقسیم کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔

ان ساتوں لیڈروں کو پہلی بار یہ اندازہ ہوا کہ آگے چل کر انھیں کتنے مشکل اور تکلیف دہ فرائض انجام دینے ہیں۔ کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ (آدھی رات کی آزادی، ص ۳۲-۱۲۹)

محمد علی جناح کے مصنف ہیکڑ بولائیتھو کی تائید:

۲رجون ۱۹۴۷ء: پاکستان کی سرکاری تالیف ''محمد علی جناح'' از ہیکڑ بولائیتھو میں ۲رجون کی کارروائی کو کیمپ بیل جانسن کے حوالے سے اس طرح بیان کیا گیا ہے:

دوسری جون کو وایسرائے اور ہندوستانی لیڈروں کی ملاقات دو گھنٹے تک جاری رہی۔ وہاں ان سب نے حکومت کے منصوبے کا مطالعہ کیا اور ان پر اس کا جو اثر ہوا وہ کیمپ بیل جانسن نے اپنی کتاب میں یوں بیان کیا ہے:

> ''پنڈت نہرو نے کہا کہ کانگریس اس تجویز سے پوری طرح متفق نہیں، لیکن اس کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد وہ اسے قبول کرلے گی۔''

قائداعظم نے کوئی قطعی بات نہ کی اور یہ شرط لگائی کہ انھیں یہ تجویز مسلم لیگ کی مجلس عاملہ اور (مسلمان) قوم کے سامنے منظوری کے لیے پیش کرنا ہوگی۔ ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی واضح کردیا کہ ان کا منشا یہ نہیں کہ حکومت کا منصوبہ ناکام ہوجائے، بلکہ ان کی دلی

خواہش ہے کہ اپنی مجلس عاملہ کو یہ تجویز قبول کرنے پر آمادہ کرلیں۔ انھوں نے وایسرائے کو یقین دلایا کہ وہ اس مقصد کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اب ایک دفعہ پھر کپلنگ کی نصیحت کو نظر انداز کر دیا اور اس مشرقی قوم کو تیزی سے آزادی کی منزل کی طرف بڑھانا چاہا۔ اس مرتبہ بھی وہ کامیاب رہے۔ انھوں نے کانگریس، لیگ اور سکھوں کے نمایندوں کو ہدایت کی کہ وہ آدھی رات تک وایسرائے کو اپنی اپنی جماعت۔ کے فیصلے سے مطلع کر دیں۔ تینوں جماعتوں کے رہنماؤں نے وایسرائے کی ہدایت کی تعمیل کی۔ جناح بہ ذاتِ خود وایسرائے محل پہنچے، لیکن وہاں انھوں نے جو گفتگو کی اس سے خاصی مشکل پیدا ہوگئی۔ کیمپ بیل جانسن لکھتے ہیں کہ وایسرائے کے انتہائی اصرار کے باوجود قاید اعظم اپنی اس بات پر اڑے رہے کہ جب تک مسلم لیگ کوئی فیصلہ نہ کرے، وہ منصوبے کی منظوری کا پکا وعدہ نہیں کر سکتے۔ اس موقعے پر پھر انھوں نے اسی طرح احتیاط سے اور نپی تلی بات کی، جیسے وکالت کے زمانے میں ججوں کے سامنے کیا کرتے تھے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ مسلم لیگ کے آئین کی رو سے کونسل کی منظوری کے بغیر وہ اس معاملے میں کوئی فیصلہ کرنے کے مجاز نہیں۔

جناح کا یہ رویہ دیکھ کر ماؤنٹ بیٹن نے بھی ذرا سخت لہجہ اختیار کیا اور کہا:

"اگر آپ اسی وقت کوئی قطعی فیصلہ نہیں کرتے تو کانگریس اور سکھوں کے نمایندے بھی کل صبح کے اجلاس میں ہمارا منصوبہ مسترد کر دیں گے۔ اگر ایسا ہوا تو تمام ملک میں ابتری پھیل جائے گی اور مجھے ڈر ہے کہ اس افراتفری میں کہیں آپ پاکستان سے ہاتھ نہ دھو بیٹھیں۔"

اس پر قاید اعظم نے اپنے شانوں کی جنبش سے اپنی بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "ہر چہ بادا باد"

اس کے بعد وایسرائے نے قاید اعظم سے ایک آخری استدعا کرتے ہوئے کہا:

"مسٹر جناح! اس منصوبے کی تیاری پر بہت محنت کی گئی ہے اور میں آپ کو یہ اختیار نہیں دے سکتا کہ آپ بنا بنایا کھیل بگاڑ دیں اور یہ ساری محنت رایگاں جائے۔ اگر آپ مسلم لیگ کی طرف سے منصوبہ منظور نہیں کرتے تو میں خود اپنی ذمے داری پر یہ اعلان کر دوں گا کہ منصوبہ مسلم لیگ کو بھی منظور ہے۔

اگر بعد میں آپ کی کونسل نہ مانے تو آپ سارا الزام میرے سر ڈال دیں، میں بھگت لوں گا۔"

پھر ماؤنٹ بیٹن نے سختی سے جناح کو ہدایت کی کہ

"کل صبح کے اجلاس میں میں سب کے سامنے کہوں گا کہ مسٹر جناح نے لیگ کی طرف سے مجھے پورا اطمینان دلایا ہے اور مجھے یقین ہے کہ لیگ کی طرف سے کوئی رکاوٹ نہ ہوگی اور جب میں یہ کہوں تو آپ ہرگز میری تردید نہ کریں۔ پھر جب میں آپ کی طرف دیکھوں تو آپ سر ہلا کر اپنی رضامندی ظاہر کریں۔"

قائداعظم نے یہ تجویز مان لی اور اس پر ماؤنٹ بیٹن نے ان سے یہ آخری سوال پوچھا:

"کیا میں مسٹر اٹیلی کو یہ مشورہ دے دوں کہ وہ پارلیمنٹ میں منصوبے کی منظوری کا اعلان کر دیں؟"

جناح اس پر بھی راضی ہو گئے۔ (محمد علی جناح از ہیکٹر بولائیتھو: ص ۸۲-۲۸۰)

ماؤنٹ بیٹن مشن تقسیم ہند کا اعلان:

۳ر جون ۱۹۴۷ء: ماؤنٹ بیٹن نے ۲ر جون ۱۹۴۷ء کو کانگریس، مسلم لیگ اور سکھوں کے نمائندوں کی میٹنگ کا اہتمام کیا۔ اب کانگریس کی صدارت شری اچاریہ کرپلانی کے پاس تھی۔ پنڈت نہرو نے وائسرائے سے کہا کہ ویسے تو مجھے اور سردار پٹیل کو گفتگو کرنی ہے، لیکن اب کانگریس کے صدر جے بی کرپلانی ہیں اس لیے جماعت کی ذمے داری وہی قبول کرنے کے مجاز ہیں، اس اعتبار سے ان کی موجودگی ضروری ہے۔ وائسرائے نے ان سے اتفاق کیا۔ مسٹر جناح کو نئی صورت حال کا علم ہوا تو انھوں نے بھی مسلم لیگ کے وفد میں ایک فرد کا اضافے کا مطالبہ کیا۔ چناں چہ ماؤنٹ بیٹن نے سردار عبدالرب نشتر کو مسلم لیگ کے نمائندے کے طور پر وفد میں شامل کرنے پر رضامندی ظاہر کر کے مسئلہ حل کر دیا۔ اب یہ میٹنگ سات بڑوں پر مشتمل تھی۔

کانگریس: پنڈت جواہر لال نہرو، سردار ولبھ بھائی پٹیل، جے بی کرپلانی۔

مسلم لیگ: محمد علی جناح، نواب زادہ لیاقت علی خاں، سردار عبدالرب نشتر۔
سکھ: سردار بلدیو سنگھ
برطانیہ: لارڈ ماؤنٹ بیٹن، لارڈ اسمے (وائسرائے کا اعلا مشیر)، سر ایرک میویل
ابتدا میں ماؤنٹ بیٹن نے بڑے اعتماد سے گفتگو کا آغاز کیا:

''گذشتہ پانچ سالوں میں کئی نہایت اہم میٹنگیں ہوئی ہیں، جس میں جنگ عظیم دوم کی تقدیر کا فیصلہ ہوا ہے۔ لیکن میں صاف دلی سے اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے ایسا کوئی فیصلہ یاد نہیں پڑتا جس نے عالمی تاریخ پر ایسا اہم اثر ڈالا ہو جو فیصلہ اس میٹنگ میں کیا جائے گا۔ میں نے جس سے بھی اس مسئلے پر گفتگو کی ہے اسے موجودہ غیر یقینی صورت حال ختم کرنے کا خواہش مند پایا ہے، اس لیے جس قدر جلد انتقال اقتدار عمل میں آئے اتنا ہی بہتر ہوگا۔''

ماؤنٹ بیٹن نے دنیا کو دکھانے کے لیے ایک مرتبہ پھر رسمی طور پر کابینہ مشن منصوبے کو زندہ کرنے کی کوشش کی۔ مسٹر جناح نے آخری مرتبہ بھی اسے مسترد کر دیا۔ حال آں کہ ماؤنٹ بیٹن تقسیم ہند کا منصوبہ جس کی منظوری حاصل کرنے کے لیے اس نے سب کو اکٹھا کیا تھا، بغل میں دبائے بیٹھا تھا اور یہی اس کی منزل مقصود تھی، باقی سب کچھ مکر اور عیاری تھا۔ اگر اس موقع پر کابینہ مشن منصوبے پر کسی طرح بھی گفتگو کے لیے حامی بھر لی جاتی تو ماؤنٹ بیٹن کو لینے کے دینے پڑ جاتے۔ مسٹر اٹیلی اور اس کی کابینہ منہ دیکھتے رہ جاتے۔ اگرچہ ماؤنٹ بیٹن نے اس کا متبادل پہلے ہی سوچ رکھا تھا، جس کا ذکر آگے آئے گا، پھر بھی شدید مشکلات پیدا ہوتیں اور وائسرائے کا ہندوستان متحد رکھنے کا ڈھونگ بے نقاب ہوتا۔

بہ ہر حال ماؤنٹ بیٹن نے کہا:

''کانگریس ہندوستان کی تقسیم کو تسلیم نہیں کرتی، لیکن اگر یہ ناگزیر ہے تو ہندو اور مسلم اکثریتی علاقوں کے جبر سے بچنے کے لیے صوبوں کی تقسیم ضروری ہے۔''

مسٹر جناح نے صوبوں کی تقسیم کی مزاحمت کی، لیکن ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ جاری رکھا۔ ماؤنٹ بیٹن نے بتایا کہ لندن میں تقسیم ہند کا منصوبہ ایک پارٹی کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ اس کو حزب اختلاف کنزرویٹو پارٹی کی حمایت بھی حاصل ہے..... اس نے کلکتہ کو کھلی بندرگاہ

بنانے کے لیے ریفرنڈم کرانے کا مطالبہ مسترد کر دیا۔ جب منصوبے کی کاپیاں فریقین میں تقسیم کر دی گئیں تو ماؤنٹ بیٹن نے استدعا کی کہ میں یہ نہیں کہتا کہ منصوبے پر پورے اتفاق کا اظہار کریں، جس کے بعض حصے آپ کے اصولوں کے خلاف ہوں گے۔ آپ اسے امن کے جذبے کے تحت قبول کر لیں اور خون ریزی کے بغیر اس کو خلوص سے نافذ ہونے دیں۔ ماؤنٹ بیٹن اپنے منصوبے پر کانگریس، مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹیوں اور سکھوں کا ردِ عمل تحریری طور پر آدھی رات تک مل جانے کا خواہش مند تھا۔ کرپلانی اور بلدیو سنگھ نے بروقت اطلاع دینے کی حامی بھری۔ جناح نے کہا:

"ورکنگ کمیٹی سے مشورہ کرنے کے بعد رات گیارہ بجے خود آ کر اطلاع کروں گا۔"

وائسرائے کہتا ہے:

"میٹنگ کے بعد میں نے جناح کو روکا اور اس پر زور دیا کہ انکار کرنے کا سوال نہیں ہے۔"

وول پرٹ لکھتا ہے:

"یہ لازمی طور پر اس صورت میں ہوا جب ماؤنٹ بیٹن نے مسٹر چرچل کا پیغام جناح کو دیا۔"

وعدے کے مطابق مسٹر جناح رات گیارہ بجے وائسرائے سے ملنے آئے۔ وائسرائے مسٹر جناح کے منفی رویے سے آگاہ تھے کہ وہ تحریری جواب دینے میں پس و پیش کر رہے ہیں، اس لیے اس نے لارڈ اسے کو بھی بہ طور گواہ گفتگو میں شامل رکھنا ضروری خیال کیا۔ مسٹر جناح کا کہنا تھا کہ وہ مختارِ کل نہیں ہیں، مسلم لیگ کا فیصلہ کونسل کرے گی اور اس کے اجلاس کے انعقاد کے لیے ایک ہفتے کی مہلت درکار ہوگی۔ میں آپ کو یہ یقین دہانی کرا سکتا ہوں کہ میں کونسل کو آپ کا منصوبہ منظور کرنے کی ترغیب دوں گا اور میری ورکنگ کمیٹی آپ کی حمایت کرے گی۔ تب ماؤنٹ بیٹن نے یاد دلایا کہ آپ جو خاص داؤ پیچ ہمیشہ استعمال کرتے ہیں کانگریس ان کو بہت زیادہ شک کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ ماؤنٹ بیٹن نے متنبہ کیا کہ نہرو کرپلانی اور سردار پٹیل نے قطعی طور پر کہہ دیا ہے کہ اگر مسلم لیگ نے ان کے ساتھ بہ یک وقت پلان کو منظور نہ کیا تو ہم بھی مسترد کر دیں گے۔ مزید برآں اسے آخری

تصفیے کے طور پر قبول کیا جائے۔ لیکن جناح نے حسب معمول لیت ولعل سے کام لینا شروع کیا اور مسلم لیگ کونسل کو فیصلے کے لیے مجاز قرار دے کر بریت حاصل کرنے کی کوشش کی۔

ماؤنٹ بیٹن نے جناح سے کہا:

''اگر آپ کا رویہ یہی ہے تب کل صبح کے اجلاس میں کانگریس اور سکھ اپنی منظوری سے انکار کر دیں گے اور تعطل ہوگا اور آپ اپنے پاکستان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔''

یہ سن کر جناح نے کہا:

''میں مسلم لیگ کا مختار مطلق نہیں ہوں، ہر شے آئینی طریقے سے طے پائے گی۔''

ماؤنٹ بیٹن نے کہا:

''آپ بچہ بننے کی کوشش نہ کریں۔ میں جانتا ہوں کہ مسلم لیگ میں کون کیا ہے۔ میں آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں، میں آپ کو اپنا وضع کردہ پلان تباہ کرنے کی اجازت نہیں دوں گا، جسے ہم نے بڑی مصیبت اور تکلیف سے تیار کیا ہے اگر تم اسے مسلم لیگ کی طرف سے قبول کرنے کی ذمہ داری نہیں لیتے تو میں اسے مسلم لیگ کے لیے قبول کرلوں گا۔ اگر آپ کی کونسل اس کی توثیق کرنے میں ناکام ہوتی ہے تو اس کا الزام مجھ کو دے سکتے ہیں۔ میری صرف ایک شرط ہے، کل صبح (۳ر جون) کے اجلاس میں میں کہوں گا کہ کانگریس نے بعض مستثنیات کے ساتھ منصوبے کی منظوری کی اطلاع دی ہے اور میں اس سے مطمئن ہوں۔ سکھوں نے بھی منصوبہ منظور کرلیا ہے۔ تب میں کہوں گا کہ میں نے مسٹر جناح سے طویل دوستانہ مذاکرات کیے ہیں، ہم نے منصوبے کو تفصیل سے دیکھا ہے۔ مسٹر جناح نے مجھے ذاتی طور پر یقین دہانی کرائی ہے کہ وہ منصوبے سے اتفاق کرتے ہیں آپ اس کی تردید نہیں کریں گے۔ اس موقع پر میں اپنا رخ آپ کی جانب پھیروں گا، میں نہیں چاہتا کہ آپ بولیں، لیکن میں آپ سے صرف ایک شے چاہتا ہوں کہ آپ اپنا سر ہلائیں جس سے ظاہر ہو کہ آپ اس سے متفق ہیں۔ میں اس سے زیادہ آپ کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔''

ماؤنٹ بیٹن نے اپنی ذاتی رپورٹ میں لکھا ہے: انھوں نے نصف گھنٹہ صوبوں کی تقسیم سے متعلق ورکنگ کمیٹی کا احتجاج بیان کرنے میں صرف کیا..... تب میں نے ان سے سیدھا سوال کیا: ''آیا آپ کی ورکنگ کمیٹی پلان کو منظور کر رہی ہے؟'' انھوں نے جواب دیا ''میں پر امید ہوں۔'' آپ ذاتی طور پر اس کو منظور کرتے ہیں؟ ویسرائے کا اگلا سوال تھا۔ تو انھوں نے جواب دیا ''میں ذاتی طور پر آپ کی تائید کرتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ آل انڈیا کونسل سے منظور کرانے کی پوری کوشش کروں گا۔'' وائسرائے کا آخری استفسار تھا۔ ''کیا میں مسٹر اٹیلی کو پیغام بھیج دوں کہ منصوبے کا باقاعدہ اعلان کر دیں؟'' اس کا جواب مسٹر جناح نے ''ہاں'' کہہ کر دیا۔ ملاقات ختم ہوگئی تو کانگریس کا تحریری جواب موصول ہوا جس میں منصوبے کی منظوری دی گئی تھی اور یہ شرط بھی عاید کی تھی کہ صوبۂ سرحد کے ریفرنڈم میں دو کی بجائے تین سوال پوچھے جائیں کہ ''وہاں کے عوام ہندوستان یا پاکستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا اپنے صوبے کو الگ آزاد مملکت بنانا چاہتے ہیں۔''

۳ رجون ۱۹۴۷ء کی صبح دس بجے کانگریس، مسلم لیگ اور سکھوں کے سات نمایندے وائسرائیگل لاج نئی دہلی میں تقسیم ہندوستان کی باقاعدہ منظوری دینے کے لیے جمع ہوئے، جس کا انتظام وائسرائے ایک روز قبل مکمل کر چکا تھا اور راستے کی دشواریوں کو نہایت فراست اور حکمت سے نپٹا چکا تھا۔ وائسرائے نے سکوت کو توڑتے ہوئے خود گفتگو کا آغاز کیا۔ تینوں پارٹیاں میرے منصوبے کے بارے میں مستثنیات رکھتی ہیں۔ کانگریس نے پلان کی منظوری دے دی ہے اور سرحد کے ریفرنڈم میں آزاد مملکت کے حق میں رائے دہی کا موقع دینے کا مطالبہ کیا ہے۔ مسٹر جناح نے پوچھا: کانگریس یہ حق صرف صوبۂ سرحد کو دینا چاہتی ہے یا ہندوستان کے باقی صوبوں کو بھی اس قسم کا موقع دینے پر رضامند ہے؟ اس پر ماؤنٹ بیٹن نے کہا ''میں نے کانگریسی رہنماؤں کو اس طرف متوجہ کیا ہے، انھوں نے اس تجویز سے دست کشی اختیار کر لی ہے۔'' سکھوں کا بھی مثبت جواب موصول ہو گیا ہے۔ گذشتہ شب میں نے مسٹر جناح سے دوستانہ طویل گفتگو کی ہے، انھوں نے مجھے یقین دلایا ہے جسے میں نے قبول کر لیا ہے اور میں اس پر مطمئن ہوں۔ اس کے ساتھ ہی ماؤنٹ بیٹن نے مسٹر جناح کی جانب رخ کیا جو ان کے دائیں جانب بیٹھے تھے، انھوں نے اپنی تھوڑی کو خفیف سی آدھ انچ کی جنبش دی اور زبان سے کوئی لفظ ادا کیے بغیر پاکستان حاصل کر لیا۔ جسے انھوں

نے ناممکن العمل خواب کہا تھا۔ دراصل سیاست میں کوئی شے حرف آخر نہیں ہوتی۔ حالات کا جبر نا قابل تصور تبدیلیاں پیدا کر دیتا ہے۔

وزیر اعظم برطانیہ مسٹر ایٹلی نے ۳؍ جون ۱۹۴۷ء کو دارالعوام میں ماؤنٹ بیٹن منصوبے کا اعلان کیا۔ اس پر حزب اختلاف کنزرویٹو پارٹی نے محتاط انداز میں منظوری کا اظہار کیا، جس کا انتظام ماؤنٹ بیٹن اپنے حالیہ دورۂ انگلستان کے دوران میں کر چکا تھا۔

قایدِ حزب اختلاب سر ونسٹن چرچل نے کہا:

> ''معلوم ہوتا ہے کہ کرپس مشن کے وقت جن دو شرطوں کی پیش بینی کی گئی تھی، وہ پوری ہو گئی ہیں۔ یعنی ہندوستان کی جماعتوں کے درمیان سمجھوتا اور..... ایک مدت کے لیے درجہ دومینین، جس میں ہندوستان یا اس کا کوئی حصہ پوری آزادی کے ساتھ یہ فیصلہ کرنے کا مجاز ہوگا کہ دولت مشترکہ میں شامل رہے یا نہیں، اگر ..... واضح ہو جاتا کہ دونوں شرایط برقرار رکھی گئی ہیں تو پھر..... اس ایوان کی سب جماعتیں اس پیش کش اور اعلان کی پوری طرح پاس داری کریں گی۔''

(ابوالکلام آزاد اور.......: ص ۹۳-۴۹۰)

ماؤنٹ بیٹن پلان:

۳؍ جون ۱۹۴۷ء:

ڈاکومنٹ نمبر ۴۵

۲۰؍ فروری ۱۹۴۷ء (ڈاکومنٹ نمبر ۴۳۸، ٹرانسفر آف پاور جلد نہم) کو حکومتِ برطانیہ نے اس عندیہ کا اظہار کیا تھا کہ وہ برطانوی ہندوستان کا اقتدار جون ۱۹۴۸ء تک ہندوستانیوں کو منتقل کر دے گی، حکومتِ برطانیہ کو امید تھی کہ ملک کی بڑی پارٹیاں کابینہ مشن منصوبے کو قابل عمل بنانے میں تعاون کریں گی اور ایک آئین تشکیل دیں گی جو تمام لوگوں کے لیے قابل قبول ہوگا، لیکن یہ امید بر نہ آئی۔

۲۔ مدراس، بمبئی، یوپی، بہار، سی پی، برار، آسام، اوڑیسہ اور صوبہ سرحد کے اکثر نمایندگان پہلے ہی نیا آئین بنانے کا کام شروع کر چکے ہیں۔ ان کے علاوہ دہلی، اجمیر، میواڑ اور کورگھ کے نمایندے بھی اس کام میں شامل ہیں۔ دوسری طرف مسلم لیگ، جس

میں بنگال، پنجاب، سندھ اور برطانوی بلوچستان کے نمائندوں کی اکثریت شامل ہے، نے فیصلہ کیا ہے کہ آئین ساز اسمبلی میں شرکت نہ کی جائے۔

۳۔ حکومت برطانیہ کی ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ اقتدار ہندوستانی عوام کی منشا کے مطابق منتقل کیا جائے۔ یہ نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ طے پا سکتا تھا اگر ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کے درمیان مفاہمت ہوتی۔ ایسی مفاہمت کی عدم موجودگی میں ہندوستان کے عوام کی رائے معلوم کرنے کی ذمے داری حکومتِ برطانیہ کے کندھوں پر آن پڑی ہے۔ ہندوستان کے لیڈروں سے پوری طرح مشورہ کرنے کے بعد حکومتِ برطانیہ نے مندرجہ ذیل منصوبہ تیار کیا ہے۔ حکومتِ برطانیہ واضح کرنا چاہتی ہے کہ وہ ہندوستان کے لیے کوئی آئین تیار کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ یہ کام ہندوستانیوں کو خود کرنا ہوگا۔ نہ ہی اس منصوبے میں کوئی ایسی شے ہے جس کی رو سے ہندوستان کو متحد رکھنے کے لیے فرقوں کے درمیان مذاکرات کا ڈول ڈالنے میں مانع ہو۔

تصفیہ طلب امور:

۴۔ ملک معظم کی حکومت کا کوئی ارادہ نہیں ہے کہ موجودہ آئین ساز اسمبلی کے کام میں رکاوٹ کھڑی کی جائے۔ اب جب کہ درج ذیل صوبوں کے لیے خاص انتظام کر دیا گیا ہے، ملک معظم کی حکومت کو اعتماد ہے کہ اس اعلان کے نتیجے میں ان صوبوں کے مسلم لیگی نمائندے بھی آئین سازی کے کام میں حصہ لیں گے۔ ان کے نمائندوں کی اکثریت پہلے ہی آئین سازی کا کام کر رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی واضح ہے کہ اس آئین ساز اسمبلی کا وضع کردہ آئین ملک کے ان حصوں پر لاگو نہیں ہو سکے گا جو اسے قبول کرنے کے لیے رضا مند نہ ہوں گے۔ ملک معظم کی حکومت کو اطمینان ہے کہ جس طریق کار کا خاکہ ذیل میں دیا گیا ہے ان علاقوں کے عوام کی رائے معلوم کرنے کے لیے بہترین ہے، اب عوام نے فیصلہ کرنا ہے آیا ان کے لیے آئین:

(اے) موجودہ آئین ساز اسمبلی تشکیل دے یا

(بی) ایک نئی علاحدہ آئین ساز اسمبلی بنائے جس میں ان علاقوں کے نمائندے شامل ہوں گے، جنھوں نے یہ فیصلہ کیا ہوگا کہ وہ موجودہ آئین ساز اسمبلی میں حصہ نہیں لیں گے۔

جب یہ طے پا جائے گا تو ایسے ادارے یا اداروں کا تعین ممکن ہو جائے گا جن کو اقتدار منتقل کیا جائے۔

بنگال اور پنجاب:

۵۔ پنجاب اور بنگال ہر ایک کی صوبائی اسمبلی (ان میں یورپین ممبر شامل نہیں ہوں گے) سے کہا جائے گا کہ وہ دو حصوں میں اکٹھی ہوں، ان میں سے ایک کا حصہ مسلم اکثریتی اضلاع کے نمایندوں پر مشتمل ہوگا جب کہ دوسرے حصے میں باقی تمام اضلاع کے نمایندے ہوں گے۔ اضلاع کی آبادی کے تعین کے لیے ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار فیصلہ کن تصور ہوں گے۔ ان دونوں صوبوں کے مسلم اکثریتی اضلاع اعلان نامہ کے ضمیمہ میں درج ہیں۔

۶۔ ہر ایک قانون ساز ادارے کے دونوں حصوں کے ممبران، جن کے علاحدہ علاحدہ اجلاس ہوں گے، کو اپنی راے ظاہر کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ آیا صوبے کو تقسیم کیا جائے یا نہیں، اگر ہر حصے کی سادہ اکثریت تقسیم کے حق میں فیصلہ کرتی ہے تو صوبے کو تقسیم کر دیا جائے اور اس مقصد کے لیے انتظامات کر دیے جائیں گے۔

۷۔ تقسیم کے مسئلے پر فیصلہ کرنے سے پہلے بہتر یہ ہوگا کہ ہر حصے کے نمایندوں کو پہلے ہی یہ معلوم ہو کہ اگر دونوں حصے اکٹھے رہنے کا فیصلہ کریں گے تو کون سی آئین ساز اسمبلی میں پورے صوبہ کو شریک ہونا ہوگا۔ اس لیے اگر کسی قانون ساز ادارے کا کوئی ممبر یہ مطالبہ کرتے ہیں تو اس صورت میں قانون ساز اسمبلی کے تمام ممبروں کا اجلاس منعقد ہوگا (اس میں یورپین ممبر شامل نہیں ہوں گے) اس اجلاس میں اس مسئلے پر فیصلہ ہوگا کہ اگر صوبے کے دونوں حصے متحد رہنے کا فیصلہ کریں تو سارا صوبہ کون سی آئین ساز اسمبلی میں شامل ہوگا۔

۸۔ اگر فیصلہ تقسیم کے حق میں ہو تو قانون ساز اسمبلی کا ہر حصہ ان علاقوں کی طرف سے جن کی وہ نمایندگی کرتا ہے، فیصلہ کرے گا کہ پیراگراف نمبر ۴ درج بالا کے کون سے متبادل کو وہ اختیار کرنا چاہتا ہے۔

۹۔ اگر تقسیم کے مسئلے کا فوری فیصلہ مقصود ہو تو اس صورت میں بنگال اور پنجاب کی قانون ساز اسمبلیوں کے ممبران دو حصوں میں اجلاس منعقد کر لیں، ان اجلاسوں میں مسلم

اکثریتی اضلاع اور غیر مسلم اکثریتی اضلاع کے ممبران شامل ہوں گے۔ (مسلم اکثریتی اضلاع کی تفصیل ضمیمہ میں دی گئی ہے) یہ عارضی نوعیت کا ابتدائی اقدام ہے ظاہر ہے کہ صوبوں کی حتمی تقسیم کے لیے سرحدات کے تعین کے لیے تفصیلی چھان پھٹک کی ضرورت ہے اور جوں ہی کسی صوبے کے تقسیم کے حق میں فیصلہ صادر کردیا گورنر جنرل حد بندی کمیشن مقرر کریں گے، اس کے اراکین اور دایرۂ کار کے بارے میں تعین متعلقہ فریقوں کے مشورے سے کیا جائے گا۔ کمیشن کو ہدایت دی جائے گی کہ پنجاب کے دونوں حصوں کی سرحدات کا تعین اس بنیاد پر کرے کہ کون کون سا متصل علاقوں میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کی اکثریت آباد ہے۔ اسی طرح کی ہدایات بنگال کی حد بندی کمیشن کو بھی ہوں گی۔ جب تک حد بندی کمیشن کی رپورٹ نافذ العمل نہیں ہوتی جب تک عارضی سرحدات، جن کی تصریح ضمیمہ میں کی گئی ہے، نافذ العمل ہوں گی۔

سندھ:

۱۰۔ سندھ قانون ساز اسمبلی کا خاص اجلاس (جس میں یورپین ممبر شامل نہیں ہوگے) منعقد ہوگا جس میں پیراگراف نمبر ۴ بالا میں درج متبادلات میں سے کسی ایک کے حق میں فیصلہ کرے گا۔

صوبہ سرحد:

۱۱۔ شمالی مغربی سرحدی صوبے کی صورت حال استثنائی ہے۔ اس کے تین میں سے دو ممبران آئین ساز اسمبلی موجودہ اسمبلی میں شریک ہورہے ہیں، اگر سارا یا پنجاب کا کوئی حصہ موجودہ آئین ساز اسمبلی میں شریک نہ ہونے کا فیصلہ کرتا ہے تو جغرافیائی محل وقوع نیز دیگر وجوہات کی بنا پر اسے اپنی پوزیشن پر نظر ثانی کا موقع دیا جانا ضروری ہے۔ چناں چہ اس صورت میں شمال مغربی سرحدی صوبے کی موجودہ صوبائی اسمبلی کی فہرست رائے دہندگان کی بنیاد پر ریفرنڈم کرایا جائے گا، تاکہ عوام پیراگراف نمبر ۴ میں مذکور متبادلات میں سے کسی ایک کے حق میں فیصلہ کرسکیں۔ ریفرنڈم گورنر جنرل کی نگرانی میں ہوگا اور صوبائی حکومت سے مشورہ کیا جائے گا۔

برطانوی بلوچستان:

۱۲۔ برطانوی بلوچستان نے آئین ساز اسمبلی کے لیے اپنا نمایندہ منتخب کیا ہوا ہے، لیکن وہ موجودہ آئین ساز اسمبلی میں شریک نہیں ہوتا۔ صوبے کے جغرافیائی محل وقوع کے پیش نظر اس صوبے کو بھی اپنی پوزیشن پر نظر ثانی کا موقع ملنا چاہیے تاکہ پیراگراف نمبر ۴ میں مندرج متبادلات میں سے کسی ایک کا انتخاب کر سکے۔ گورنر جنرل غور کر رہے ہیں کہ اس کی بہترین صورت کیا ہو سکتی ہے۔

۱۳۔ اگرچہ آسام زیادہ تر غیر مسلم غلبے کا صوبہ ہے، لیکن اس کا ضلع سلہٹ جو کہ بنگال سے متصل ہے، میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ مطالبہ یہ کیا جا رہا ہے کہ اگر بنگال تقسیم ہوتا ہے تو سلہٹ کو بنگال کے مسلم حصے میں مدغم کیا جائے۔ چناں چہ اگر بنگال کو تقسیم کرنے کا فیصلہ ہوتا ہے تو ضلع سلہٹ میں ریفرنڈم کرایا جائے گا۔ اس کی نگرانی گورنر جنرل کریں گے اور وہ صوبائی حکومت سے مشورہ کریں گے۔ ریفرنڈم اس مسئلے پر ہوگا آیا ضلع سلہٹ صوبہ آسام میں حسب سابق شامل رہے یا اگر مشرقی بنگال کا صوبہ رضامند ہو تو اس میں مدغم کر دیا جائے۔ اگر ریفرنڈم کے نتائج مشرقی بنگال میں ادغام کے حق میں برآمد ہوتے ہیں تو ایک حد بندی کمیشن قایم کیا جائے گا، جس کے فرائض اور اختیارات پنجاب اور بنگال کے حد بندی کمیشن جیسے ہوں گے۔ یہ کمیشن ضلع سلہٹ اور اس سے ملحقہ اضلاع، جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، کی حد بندی کرے گا، یہ علاقے مشرقی بنگال میں شامل کر دیے جائیں گے۔ آسام کا باقی صوبہ ہر حال میں موجودہ آئین ساز اسمبلی کی کارروائیوں میں حصہ لیتا رہے گا۔

اسمبلیوں میں نمایندگی:

۱۴۔ اگر یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ پنجاب اور بنگال کو تقسیم کر دیا جائے تو اپنے نمایندے چننے کے لیے نئے الیکشن کرانا ضروری ہوگا، یہ انتخاب اس اصول کی بنا پر ہوں گے جس کا تذکرہ کابینہ مشن منصوبہ ۱۶ مئی ۱۹۴۶ء میں موجود ہے، یعنی دس لاکھ کی آبادی کا ایک نمایندہ۔ اگر سلہٹ مشرقی بنگال میں شامل ہونے کا فیصلہ کرتا ہے تو یہاں بھی اسی قسم کے انتخاب ہوں گے۔ ہر علاقے کو مندرجہ ذیل تعداد میں نمایندے چننے کا حق حاصل ہوگا:

صوبہ	جنرل سیٹ	مسلم سیٹ	سکھ سیٹ	میزان
ضلع سلہٹ	۱	۲	-	۳
مغربی بنگال	۱۵	۴	-	۱۹
مشرقی بنگال	۱۲	۲۹	-	۴۱
مغربی پنجاب	۳	۱۲	۲	۱۷
مشرقی پنجاب	٦	۴	۲	۱۲

۱۵۔ انتخاب میں تفویض کیے گئے اختیار کی روشنی میں مختلف علاقوں کے نمایندگان یا تو موجودہ آئین ساز اسمبلی میں شریک ہوں گے یا نئی آئین ساز اسمبلی قایم کریں گے۔

انتظامی امور:

۱٦۔ تقسیم کی صورت میں جو انتظامی امور سامنے آئیں گے ان کا فیصلہ کرنے کے لیے جلد از جلد مذاکرات کیے جائیں گے۔

(اے) (یہ بات چیت) مختلف جانشین حکومتوں کے نمایندوں کے درمیان ہوگی اور اس میں ان تمام محکموں کا مسئلہ زیر غور آئے گا جو اس وقت مرکزی حکومت کی تحویل میں ہیں۔ ان میں دفاع، مالیات اور مواصلات کے شعبہ جات بھی شامل ہیں۔

(بی) ملک معظم کی حکومت اور جانشین حکومتوں کے درمیان انتقال اقتدار سے پیدا شدہ امور کے بارے میں معاہدات کے لیے۔

(سی) اگر صوبوں کو تقسیم کیا جاتا ہے تو اس صورت میں تمام صوبائی امور اثاثہ جات اور قرضوں کی تقسیم، پولیس اور دوسرے ملازمین، ہائی کورٹس اور صوبائی ادارے وغیرہ پر گفتگو ہوگی۔

شمالی مغربی سرحدی صوبے کے قبایل:

۱۷۔ ہندوستان کی شمال مغربی سرحد پر واقع قبایل کے ساتھ متعلقہ جانشین حکومت معاہدوں کے لیے گفتگو کرے گی۔

ریاستیں:

۱۸۔ حکومت برطانیہ واضح کردینا چاہتی ہے کہ جن فیصلوں کا اعلان اوپر کیا گیا ہے ان کا تعلق صرف برطانوی ہندوستان کے ساتھ ہے اور ہندوستانی ریاستوں کے بارے میں حکومت کی پالیسی وہی ہے جس کا ذکر کابینہ مشن میمورینڈم ۱۲ رمئی ۱۹۴۶ء میں کیا گیا ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔

کام کی رفتار تیز کرنے کی ضرورت:

۱۹۔ یہ بہت ضروری ہے کہ مندرجۂ بالا کارروائیاں ممکنہ حد تک جلد پایہ تکمیل تک پہنچ جائیں، تاکہ جانشین حکومتوں کو اقتدار سنبھالنے کے سلسلے میں تیاریاں مکمل کرنے کا وقت مل جائے۔ تاخیر سے بچنے کے لیے مختلف صوبے یا صوبوں کے حصے ممکنہ حد تک آزادانہ طور پر کام شروع کردیں گے اور پلان میں درج شرائط کو ملحوظ رکھیں۔ موجودہ آئین ساز اسمبلی اور نئی آئین ساز اسمبلی (اگر بنائی گئی) اپنے اپنے علاقوں کے لیے دساتیر بنائیں گی، اپنے لیے قواعد و ضوابط بنانے کی انھیں مکمل آزادی ہوگی۔

فوری انتقالِ اقتدار:

۲۰۔ بڑی سیاسی جماعتوں نے بار بار اس خواہش پر زور دیا ہے کہ ہندوستان میں اقتدار ممکنہ حد تک جلد منتقل کردیا جائے۔ حکومت برطانیہ کو ہندوستان کی اس خواہش سے بڑی ہم دردی ہے اور وہ یہ کام جون ۱۹۴۸ء سے بھی پہلے کرنا چاہتی ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ انتقالِ اقتدار کے سلسلے میں آزاد ہندوستانی حکومت یا حکومتیں قایم کردی جائیں اور انھیں مقررہ مدت سے پہلے اقتدار سونپ دیا جائے۔ چناں چہ اس خواہش کو بہت جلد عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک ہی قابل عمل طریقہ ہے کہ حکومتِ برطانیہ پارلیمنٹ کے رواں اجلاس میں مسودہ قانون پیش کرے، جس میں ڈومینین اسٹیٹس کی بنیاد پر ایک یا دو جانشین حکومتوں کو اقتدار اسی برس منتقل کردیا جائے۔ اس سے قانون ساز اسمبلیوں کے اختیارات متاثر نہیں ہوتے کہ وہ اپنے ماتحت ہندوستان کے حصے کے بارے میں فیصلہ کریں، آیا یہ برطانوی دولت مشترکہ میں شامل رہے گا یا نہیں؟

مزید اعلانات گورنر جنرل کرے گا:

۲۱۔ گورنر جنرل وقتاً فوقتاً ایسے مزید اعلانات کریں گے جو مندرجۂ بالا تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ضروری ہوں گے۔ ان کا تعلق طریق کار سے ہو یا دوسرے معاملات سے۔

اپنڈیکس:

۱۹۴۱ء کی مردم شماری کی روشنی میں بنگال اور پنجاب کے مسلم اکثریتی اضلاع

۱۔ بنگال	
چٹا گانگ ڈویژن	چٹا گانگ، نوا کھالی، پٹرا۔
ڈھاکہ ڈویژن	باقر گنج، ڈھاکہ، فرید پور، میمن سنگھ
پریذیڈنسی ڈویژن	جیسور، مرشد آباد، ندیا
راج شاہی ڈویژن	بوگرا، دیناج پور، مالدہ، پبنہ، راج شاہی، رنگ پور
۲۔ پنجاب	
لاہور ڈویژن	گوجرانوالہ، گورداس پور، لاہور، شیخو پورہ، سیال کوٹ
راول پنڈی ڈویژن	اٹک، گجرات، جہلم، میانوالی، راول پنڈی، شاہ پور
ملتان ڈویژن	ڈیرہ غازی خان، جھنگ، لائل پور، منٹگمری، ملتان، مظفر گڑھ

(تحریک پاکستان اور انتقالِ اقتدار: ۷۰۳-۶۹۷)

ماؤنٹ بیٹن کی تنبیہ اور پیشین گوئی:

۳ رجون ۱۹۴۷ء: تقسیم ایک حقیقت تھی یا برصغیر کے ارتقا کے سفر میں ایک بے کیف وقفہ، آخری وایسرائے لارڈ لوئیس فرانسس البرٹ وکٹر نکولس ماؤنٹ بیٹن نے اس سوال کا جواب دیا تھا۔ انھوں نے ہندوستان کی تقسیم پر اتفاق رائے حاصل کرنے کے فوراً بعد نجی طور پر لکھا تھا:

> ''اس مجنونانہ فیصلے کی ذمے داری دنیا کی نگاہوں میں پورے طور پر ہندوستانیوں پر ڈالی جانی چاہیے۔ ایک دن وہ اس فیصلے پر جو وہ عن قریب لینے والے ہیں خود کفِ افسوس ملیں گے۔'' (ہندوستان اپنے حصار میں: صفحہ ۲۹)

تقریر میں جناح صاحب کی ریڈیو اصول کی خلاف ورزی:

۳ر جون ۱۹۴۷ء:

ڈاکومنٹ نمبر ۵۱: رئیر ایڈمرل وا سکاؤنٹ ماؤنٹ بیٹن آف برما کے نام سردار پٹیل کا مراسلہ۔ آر/۱۱۳/ ۱۵۰: الف ۲۵۳

ممبر آف کونسل انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ

نئی دہلی

۳ر جون ۱۹۴۷ء

میرے پیارے لارڈ ماؤنٹ بیٹن!

مجھے اس سے بڑا گہرا رنج پہنچا ہے کہ مسٹر جناح نے اس معاونت کا ناجائز فایدہ اٹھایا ہے جو آل انڈیا ریڈیو نے انھیں فراہم کی تھی۔ انھوں نے براڈ کاسٹ سے متعلقہ قواعد و ضوابط کی خلاف ورزی کی اور آپ جانتے ہیں کہ براڈ کاسٹ کے یہ ضابطے قوانین قدرت کی طرح بے لچک اور سخت ہیں۔ میں نے ان کے اسکرپٹ (مسودہ تقریر) کو براڈ کاسٹ سے پہلے نہیں دیکھا تھا، لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ انھوں نے نہ صرف اسکرپٹ سے ہٹ کر تقریر کی بلکہ انھوں نے سیاسی، دھڑے بازی اور پروپیگنڈا تقریر کر کے (براڈ کاسٹنگ کے اصولوں کی) بے حرمتی کی ہے۔ اگر مجھے اس کا علم بروقت ہو جاتا تو میں یقیناً مسٹر جناح کو (اس نوعیت کی تقریر کرنے سے) روک دیتا اور آل انڈیا ریڈیو کو مسلم لیگ کا پلیٹ فارم بنانے کی اجازت نہ دیتا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں نہ صرف ایک ایسی تحریک کو درست قرار دیا جس کے نتیجے میں بہت زیادہ خون ریزی ہو چکی ہے اور املاک تباہ ہوئی ہیں، بلکہ انھوں نے صوبہ سرحد کے ووٹروں سے یہ اپیل بھی کی ہے کہ وہ مسلم لیگ کی ہدایت کے مطابق اپنا ووٹ استعمال کریں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اس سے اتفاق کریں گے کہ یہ صوبۂ سرحد کی حکومت کے ساتھ صریحاً ناانصافی ہے۔

مجھے اس کا پورا احساس ہے کہ آپ خود بھی اس کی توقع نہیں رکھتے تھے یا اسے روکنے کے لیے آپ کو بروقت معلوم نہیں ہو سکا، لیکن مجھے انتہائی مایوسی ہوئی ہے کہ مسٹر جناح نے آپ کی طرف سے دی گئی رعایت اور التفات کا ناجائز فایدہ اٹھایا ہے، خاص طور پر ایک ایسے موقع پر جس کی بڑی مقدس حیثیت ہے اور ہندوستان اور دنیا کی نگاہیں ہماری طرف لگی

ہوئی ہیں۔ میں تو صرف توقع ہی کرسکتا ہوں کہ اس کے اثرات زیادہ شرانگیز ثابت نہ ہوں جن کے باعث مسٹر جناح کو اپنے سامعین کے سامنے سبک سر ہونا پڑے۔

(تحریکِ پاکستان اور انتقالِ اقتدار: ص ۱۲-۱۱۷)

۳ رجون کا اعلان اور خان برادرز کی پریشانی:

مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں:

نئی صورت حال پر غور کرنے کے لیے ۳ رجون کو ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا۔ سب سے پہلے جو مسئلہ زیر بحث آیا وہ صوبہ سرحد کا مستقبل تھا۔ ماؤنٹ بیٹن پلان نے صوبہ سرحد کو ایک عجیب سی مشکل میں ڈال دیا تھا۔ عبدالغفار خان اور ان کی پارٹی نے ہمیشہ کانگریس کا ساتھ دیا تھا اور لیگ کی مخالفت کی تھی۔ مسلم لیگ خان بھائیوں کو اپنا جانی دشمن تصور کرتی تھی۔ لیگ کی مخالفت کے باوجود صوبہ سرحد میں خان برادرز نے کانگریسی حکومت بنانے میں کامیابی حاصل کی تھی اور یہ حکومت اب تک برسر اقتدار تھی۔ تقسیم کی وجہ سے خان برادرز اور کانگریس دونوں کے لیے تکلیف دہ صورت حال پیدا ہوگئی تھی۔ دراصل تقسیم کا مطلب یہ تھا کہ خان برادرز اور ان کی پارٹی یعنی خدائی خدمت گاروں کو لیگ کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا گیا تھا۔

میں ذکر کرچکا ہوں کہ گاندھی جی کے ماؤنٹ بیٹن پلان کو قبول کر لینے پر مجھے تعجب اور افسوس ہوا تھا۔ اب انھوں نے ورکنگ کمیٹی میں تقسیم کی موافقت میں تقریر کی، لیکن چوں کہ مجھے پہلے ہی ان کے خیالات کا کچھ اندازا ہوگیا تھا، اس لیے ان کی تقریر میرے لیے زیادہ غیر متوقع نہیں تھی۔ لیکن ہم سمجھ سکتے ہیں کہ عبدالغفار خان پر اس کا کیا اثر ہوا ہوگا؟ ایسا لگتا تھا کہ ان کے ہوش وحواس بالکل گم ہوگئے ہیں۔ چند منٹ تک ان کے منہ سے ایک بول نہ نکلا۔ پھر انھوں نے ورکنگ کمیٹی سے اپیل کی اور اسے یاد دلایا کہ انھوں نے ہمیشہ کانگریس کا ساتھ دیا ہے اور اب اگر کانگریس نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تو سرحد پر اس کا بہت خراب ردِ عمل ہوگا، ان کے دشمن ان پر ہنسیں گے اور ان کے دوست بھی کہیں گے کہ جب تک کانگریس کو صوبہ سرحد کی ضرورت تھی ان خدائی خدمت گاروں کی حمایت کی، مگر جب لیگ سے مصالحت کرنے کی خواہش ہوئی تو اس نے سرحد اور اس کے لیڈروں سے مشورہ بھی نہیں

کیا اور تقسیم کی مخالفت کرنا چھوڑ دیا۔ خان عبدالغفار خان نے کئی بار دہرایا کہ اگر کانگریس نے خدائی خدمت گاروں کو بھی بھیڑیوں کے سامنے نوچنے کے لیے ڈال دیا تو یہ صوبہ سرحد کے ساتھ غداری ہوگی۔

گاندھی جی کے دل پر عبدالغفار خان کی اپیل کا بہت اثر ہوا اور انھوں نے کہا کہ وہ ماؤنٹ بیٹن سے اس مسئلے پر گفتگو کریں گے۔ وہ وایسرائے سے ملے اور اس مسئلے کو اٹھاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ وہ اس وقت تک ملک کو تقسیم کرنے کی تجویز کی موافقت نہیں کریں گے جب تک انھیں یہ اطمینان نہیں ہو جائے گا کہ مسلم لیگ خدائی خدمت گاروں کے ساتھ انصاف سے پیش آئے گی۔ جن لوگوں نے مشکلوں اور مصیبتوں کے زمانے میں کانگریس کا ساتھ دیا تھا ان کی طرف سے وہ کیسے منہ موڑ سکتے تھے؟

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے وعدہ کیا کہ وہ اس سلسلے میں مسٹر جناح سے گفتگو کریں گے۔ چناں چہ انھوں نے گفتگو کی، جس کے بعد مسٹر جناح نے خان عبدالغفار خان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ ان دونوں کی ملاقات ہوئی، لیکن گفتگو بے نتیجہ رہی۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ جب کانگریس نے تقسیم کو تسلیم کر لیا تو خان عبدالغفار خان اور ان کی پارٹی کا مستقبل کیا ہو سکتا تھا۔ (انڈیا ونس فریڈم: ص ۸۹-۲۸۸)

ڈاکومنٹ نمبر ۱۰۱ (ٹرانسفر آف پاور: جلد ۱۱)

۷ جون ۱۹۴۷ء: مسٹر جناح نے تجویز پیش کی کہ حد بندی کمیشن کا چیئرمین ایسے شخص کو ہونا چاہیے جسے حد بندی کے اصولوں کا وسیع تجربہ ہو۔ میں نے اس سے اتفاق کیا اور کہا کہ میں کانگریس کے لیڈروں کو تجویز دوں گا کہ حد بندی کمیشن کے تینوں ممبر یو این او کی طرف سے مہیا کیے جانے چاہییں۔ کانگریس، مسلم لیگ اور دوسری متعلقہ پارٹیوں کے نمائندے ماہر اسیسر کے طور پر موجود ہوں گے۔ اغلباً تقسیم کی زد میں آنے والے ہر صوبے کے تین نمائندے۔ میں نے مسٹر جناح سے کہا کہ مغربی حد بندی کمیشن کے دائرۂ کار کے بارے میں پیراگراف تجویز کریں جو سکھوں کے حوالے سے ہو۔

میں نے تجویز پیش کی کہ ملک معظم کی حکومت اور دونئی ڈومینینز کے درمیان ایک سہ فریقی معاہدہ طے پانا چاہیے۔ مسٹر جناح نے ''سہ فریقی'' معاہدے پر اعتراض کیا۔ انھوں

نے ''دوطرفہ معاہدات کے مترادف'' الفاظ استعمال کرنے کو ترجیح دی۔

میں نے مسٹر جناح سے کہا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا جو اجلاس ۹ رجولائی کو ہو رہا ہے اس میں جو قرارداد پیش کی جائے گی وہ مجھے اس کے نکات دکھائیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ یہ قرارداد اغلباً مختصر ہوگی اور اس میں مندرجۂ ذیل نکات شامل ہوں گے۔

(الف) ہم اس منصوبے کو مسئلے کا واحد حل جان کر قبول کرتے ہیں۔

(ب) ہم نے متحدہ ہندوستان پر کبھی اتفاق نہیں کیا۔

(ج) ہم پنجاب اور بنگال کی تقسیم سے اتفاق نہیں کرتے بلکہ ہم جب منصوبے پر غور کرتے ہیں تو اسے مجموعی طور پر پیش نظر رکھنا پڑے گا۔

اس موقعے پر بھاول پور کے دیوان بھی آگئے اور انھوں نے پنجاب کی تقسیم کی صورت میں ریاست کو پیش آسکنے والی مشکلات کی تفصیل بتائی۔ یہ دشواریاں زرعی ضروریات کے لیے پانی کی سپلائی سے متعلق تھیں۔ میں نے سر ایرک میویل سے کہا کہ وہ ان سے رابطہ رکھیں۔ انھوں نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ ریاست کے ساتھ موجودہ معاہدات مزید پانچ سال کی مدت تک قایم رہنے چاہییں۔

مسٹر جناح کی جچی تلی رائے تھی کہ جانشین اتھارٹیز ریاست کے ساتھ موجودہ معاہدات پر قایم رہنے کی قانونی طور پر پابند ہیں۔ میں نے کہا کہ میں اس پر کانگریس کے رہنماؤں سے گفتگو کروں گا اور اس مسئلے پر رولنگ کے لیے سیکرٹری آف اسٹیٹ سے کہوں گا۔ (تحریکِ پاکستان اور انتقالِ اقتدار: ص ۲۸-۲۷)

انقلاب کے دو تاریخی اداریے:

۷ رجون ۱۹۴۷ء: روزنامہ انقلاب۔ لاہور نے آج کی اشاعت میں برطانوی وزارتی مشن پلان پر دو اداریے لکھے ہیں۔ پہلے اداریے میں وہ لکھتا ہے:

''ہمارے بعض بھائیوں نے بڑے شد و مد سے فرمایا کہ مسلمانوں نے پاکستان حاصل کرلیا، لیکن جب اس شے کو پاکستان بنانے کا فیصلہ کرلیا گیا ہو جو حسن اتفاق سے میسر آجائے تو ہمارے لیے اس معاملے پر بحث کی کون سی گنجایش ہے؟ ہمیں اعتراف کرنا چاہیے کہ ایسی ڈھٹائی کی جسارت ہم میں اب تک پیدا نہیں ہوئی اور خدا نہ کرے کبھی پیدا

ہو۔ جو لوگ مسلمانانِ ہند کے بنیادی قومی مقاصد سے بے تکلف اس قسم کا استہزا کر سکتے ہیں وہ قوم کی جو خدمت انجام دے سکیں گے اس کے متعلق کچھ عرض کرنا فضول ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مسلمان ایسا پاکستان لینے کے لیے اٹھے تھے جو ہندوستان کے پورے چھ صوبوں پر مبنی تھا۔ دو بڑے صوبے یعنی پنجاب اور بنگال اور چار چھوٹے صوبے یعنی آسام، سرحد، سندھ اور برطانوی بلوچستان۔ اس غرض کے لیے انھوں نے مسلم اقلیت کے صوبوں کو یہ سمجھ کر نظر انداز کیا تھا کہ مسلم اور غیر مسلم اقلیتوں کا معاملہ اسلامی اور غیر اسلامی خطوں کے نمایندوں کی رضامندی سے باہم طے ہو جائے گا۔ لیکن جو کچھ ہوا اس کو مسلمان جو چاہیں کہیں جو چاہیں سمجھیں وہ اپنی کامل شکست کو بھی فتح و کامرانی، فیروز مندی اور کاربرآری قرار دینا چاہیں تو کوئی انھیں روک نہیں سکے گا۔ لیکن اگر وہ اپنے مقصد و نصب العین اور پیشِ نظر فیصلے کا موازنہ کریں گے تو ہمیں یقین ہے کہ ان کو خوشی اور شادمانی کا کوئی بعید سا امکان بھی نظر نہ آئے گا۔ بلکہ اس حالت پر انھیں ماتم کی صفیں بچھانی چاہییں۔ اُسے پاکستان کہنا ایک پاک تصور کی کھلی ہوئی ہتک ہے۔ نعرہ بازیوں کا وقت گزر چکا ہے، اب عقل مندی اور ذی فہم انسانوں کی طرح حقایق پر غور کا وقت ہے۔

اس خطرے سے عام مسلمانوں کو آگاہ کرنے کے لیے ہم نے ہزار کوششیں کیں، لیکن اس بات کی خوشی نہیں کہ جو کچھ ہم کہہ رہے تھے وہ درست ثابت ہوا، انتہائی رنج و قلق ہے۔ لیکن اب بھی ہمارے نزدیک صحیح راہ عمل یہی ہے کہ اس مصیبت کو روکا جائے اور اس افتاد کا دروازہ بند کیا جائے۔“

انقلاب کی اسی اشاعت مورخہ ۷/جون میں دوسرا اداریہ یہ ہے:

”پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا فیصلہ ہو گیا اور حد بندی کے کمیشن مقرر کر دیے گئے۔ اب اس بحث سے کیا حاصل ہو سکتا ہے کہ ۱۹۴۶ء میں لیگ کے سامنے جو پیش کیا گیا تھا وہ وہی تھا جو آج قبول کیا گیا ہے۔ اگر یہ ثابت بھی کر دیا جائے کہ حقیقت یہی ہے تو کیا لیگ موجودہ فیصلے کو بدل دے گی؟ ہرگز نہیں۔ لہٰذا یہ بحث اب بداہتہً فضول اور عبث ہے۔ تاہم واقعہ یہی ہے کہ اب جو قبول کیا گیا ہے وہ وہی ہے جو ۱۹۴۴ء میں کانگریس دے رہی تھی۔ ہمارے ایک لیگی معاصر کو خدا جانے کیوں اصرار ہے کہ اس سلسلے میں جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ جھوٹ ہے۔ اس غلط فہمی کے سدِ باب کے لیے ضروری ہے کہ حقیقت حال پھر واضح کی

جائے اور جھوٹ کو اس کے اصل مرجع در آب تک چھوڑ دینا چاہیے۔

۱۰ اراپریل ۱۹۴۴ء کو مسٹر راج گوپال اچاریہ نے ایک خط کے ذریعے چند تجاویز مسٹر جناح کے پاس بھیجی تھیں۔ یہ چھ دفعات پر مشتمل تھیں۔ مقصود یہ تھا کہ انھیں کانگریس اور لیگ کے درمیان سمجھوتے کی بنیاد قرار دیا جائے۔ دوسری اور چوتھی دفعہ کا متن یہ تھا:

جنگ کے خاتمے پر ایک کمیشن مقرر کیا جائے گا جو ہندوستان کے شمال مغرب اور مشرق میں ان متصل اضلاع کا تعین کرے گا جن میں مسلمانوں کو مطلق اکثریت حاصل ہے۔ اس طرح متعین شدہ علاقوں کے تمام باشندوں سے بالغوں کے حق رائے (دہی کے اُصول پر) یا کسی دوسرے ذریعے لیکن اصل حق رائے کی بنا پر استصواب کیا جائے گا۔ اگر اکثریت کا فیصلہ ہو کہ ہندوستان سے الگ ایک خودمختار اسٹیٹ بنائی جائے تو اس فیصلے کو عملی جامہ پہنا دیا جائے گا۔ علاحدگی کی حالت میں دفاع، تجارت و سایل حمل ونقل اور دوسرے ضروری مقاصد کے تحفظ کے لیے باہمی معاہدے ہو جائیں گے۔

مسٹر راج گوپال اچاریہ کے دعوے کے مطابق گاندھی جی ان تجاویز کے حامی تھے۔ مسٹر جناح نے ۲ر جولائی ۱۹۴۴ء کو جواب دیا کہ میں خود ان کے قبول یا عدم قبول کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ البتہ گاندھی جی یہ تجاویز براہِ راست میرے پاس بھیج دیں تو انھیں مجلسِ عاملہ لیگ کے سامنے پیش کر دوں گا۔

مسٹر راج گوپال اچاریہ نے سمجھا کہ جب مسٹر جناح خود ان کی حمایت کے لیے تیار نہیں ہیں تو انھیں مجلسِ عاملہ کے سامنے پیش کرنے سے کیا حاصل ہوگا۔ اس طرح یہ معاملہ التوا میں پڑ گیا۔ مسٹر راج گوپال کے نزدیک لیگ کی قرارداد لاہور کے تمام مطالبات ان تجاویز میں آ گئے تھے۔

۳۰ر جولائی ۱۹۴۴ء کو لاہور میں لیگ کونسل کا اجلاس ہوا، جس میں مسٹر جناح نے ایک لمبی تقریر فرمائی۔ ان کا خاص موضوع یہی تجاویز تھیں۔ ہم پوری تقریر کو یہاں پیش نہیں کر سکتے، لیکن اس کے دو فقرے خاص توجہ کے محتاج ہیں۔ یعنی ان کا (راجہ جی کا) فارمولا لیگ کی مارچ ۱۹۴۰ء والی قرارداد کا غلط چربہ ہے، یہ اس کی نفی ہے۔ اس کا مدعا یہ ہے کہ قرار دار مذکور کو تارپیڈو مار کر فنا کر دیا جائے اور جب وہ کہتے ہیں کہ ان کے فارمولے میں لیگ کے تمام مطالبات آ گئے ہیں جو مسلم لیگ نے اپنی قرارداد میں پیش کیے تھے تو یہ اس قرارداد

کی بدترین تخریب ہے۔ چوں کہ گاندھی جی بھی ان تجاویز کے حامی تھے۔ لہٰذا مسٹر جناح نے آخر میں فرمایا:

جس حد تک تجاویز کی حقیقی حیثیت کا تعلق ہے میں کہتا ہوں کہ گاندھی جی جو کچھ پیش کر رہے ہیں یہ محض سایہ ہے، چھلکا ہے، پولا ہے، لنگڑا، اپاہج اور کرم خوردہ پاکستان ہے۔

آپ سوچیں اور غور کریں کہ کیا اس شدید مذمت کا مقصد یہ تھا کہ مسلم لیگ پنجاب اور بنگال کے مقطوع حصوں کو یا آسام کے پورے صوبے میں سے ایک ضلع سلہٹ کو لینے کی حامی تھی۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ دنیا کے کسی ہوش مند آدمی کی رائے یہ ہو سکتی ہے۔ لیکن ذرا ٹھہریے، اس سے واضح تر اور روشن ثبوت آگے آتا ہے۔

اس کے بعد گاندھی جی اور مسٹر جناح میں ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ جو ستمبر ۱۹۴۴ء میں تین ہفتے تک بمبئی میں جاری رہا۔ ۲۴ ستمبر کو گاندھی جی نے مندرجۂ ذیل تجویز پیش کی تھی۔

(۱) میں اس بنیاد پر چلتا ہوں کہ ہندوستان میں دو یا اس سے زیادہ قومیں آباد نہیں ہیں بلکہ اسے ایک ایسا گھرانا سمجھنا چاہیے جس کے کئی ممبر ہوں۔

(۲) ان میں سے وہ مسلمان باقی ہندوستان سے الگ رہنا چاہتے ہیں جو شمالی و مغربی حلقے یعنی بلوچستان، سندھ، صوبۂ سرحد میں رہتے ہیں یا پنجاب کے ان اضلاع میں جہاں انھیں دوسرے عناصر پر مطلق اکثریت حاصل ہے یا مشرقی حلقے میں بنگال و آسام کے ان اضلاع میں جہاں وہ مطلق اکثریت کے مالک ہیں۔

(۳) ان علاقوں کا تعین ایک کمیشن کے ذریعے کیا جائے۔ مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کی منظوری حاصل ہو۔ ان کے باشندوں کی مرضی بالغوں کی حق رائے دہندگی یا کسی دوسرے ذریعے سے معلوم کر لی جائے۔

(۴) اگر اکثریت کی رائے علاحدگی کے حق میں ہو تو ہندوستان جوں ہی غیر ملکی اقتدار سے نجات پائے جلد از جلد علاقوں کو آزاد اور خودمختار بنا دیا جائے۔

(۵) علاحدگی کا ایک معاہدہ ہو جائے جس کے مطابق امورِ خارجہ، دفاع، داخلی وسائل حمل و نقل، کسٹم، تجارت وغیرہ کا اطمینان بخش انتظام ہو اور ان معاملات سے معاہد فریقوں کا یک ساں مفاد وابستہ ہو۔

فرمایئے اب جو حاصل کیا گیا ہے وہ اس سے کس بنا پر مختلف ہے۔ کیا پنجاب و بنگال کے اضلاع کا فیصلہ اسمبلی کے ممبروں نے نہیں کیا؟ کیا سرحد اور سلہٹ میں استصواب رائے عامہ پر عمل نہیں رہا؟ کیا بلوچستان والوں کی رائے نہیں لی گئی اور وہی علاقے جو علاحدہ نہیں ہوئے تھے اب علاحدہ کیے جا رہے تھے؟ یہاں تک کہ پنجاب کا وہ ضلع ہی مسلمانوں کے حصے میں آ رہا ہے جہاں کی آبادی پچاس اور اکیاون فیصدی کے درمیان ہے۔ یہی حالت بنگال میں کھلنا اور دیناج پور کے متعلق پیش آئی۔

اس تجویز کے علاوہ گاندھی جی نے یہ بھی لکھ دیا تھا کہ اگر یہ منظور نہ ہو تو فرما دیجیے کہ ۱۹۴۰ء والی قرارداد کے مطابق مجھے کیا کچھ ماننا چاہیے تاکہ اس کو کانگریس سے منوانے کی کوشش کروں۔

اس کے جواب میں مسٹر جناح نے کیا فرمایا؟ یہ کہ

آپ (گاندھی جی) نہیں مانتے کہ پاکستان دو حلقوں پر مشتمل ہوگا۔ شمال مغربی، شمال شرقی۔

یہ حلقے چھ صوبوں پر مشتمل ہوں گے۔ یعنی سندھ، بلوچستان، صوبہ سرحد، پنجاب، بنگال اور آسام اور ان میں صرف اس حد تک خفیف علاقہ جاتی ترمیم ہو سکتی ہے جس پر اتفاق ہو جائے، جیسا کہ قرارداد لاہور میں کہا گیا ہے۔

محض یہی نہیں بلکہ پنجاب، بنگال اور آسام میں سے صرف مطلق اسلامی اکثریت والے اضلاع کو حق علاحدگی دینے کی تجویز کے متعلق فرمایا:

اگر اس کو مان لیا جائے اور اس پر عمل ہو تو صوبوں کی موجودہ حدیں کٹ جائیں گی۔ ان پر ناقابل تلافی انقطاع کا عمل جاری ہوگا اور ہمارے پاس پاکستان کا (محض چھلکا) رہ جائے گا۔ یہ تجویز قرارداد لاہور کے سراسر خلاف ہے۔

ان واضح اور روشن الفاظ کو سامنے رکھ کر بتایئے کہ کیا وہ ناشدنی بات بے تکلفی سے قبول نہ کی گئی؟ اور مصیبت یہ ہے کہ اس پر اظہار ماتم یا اعتراف مجبوری کے بجائے یوں خوشیاں منائی جاری ہیں کہ گویا مقصود حقیقی یہی تھا۔ کیا دو بڑے صوبوں میں سے بارہ بارہ اضلاع اور ایک صوبے میں سے ایک کے سوا سب کاٹ کر علاحدہ کر دینے کو "خفیف علاقہ جاتی ترمیم" کہا جا سکتا ہے۔

اور اگر ''یہ خفیف علاقہ جاتی ترمیم'' ہے — تو اس کو ۱۹۴۴ء میں کیوں نہیں منظور کرلیا گیا تھا اور آج بے شمار جانی اور مالی نقصان کے بعد کیوں اس حقیقت کا انکشاف ہورہا ہے کہ یہ خفیف علاقہ جاتی ترمیم ہے۔ (انقلاب۔ ۷؍جولائی ۱۹۴۷ء، بہ حوالہ کاروانِ احرار: جلد ۸، نیز دیکھیے علمائے حق اور..... : جلد ۲، ص ۱۶-۶۱۱)

۷؍جون ۱۹۴۷ء: منشور ۷؍جون ۱۹۴۷ء، جلد ۱۰، صفحہ ۱۳۱ میں پاکستانی علاقوں کی آبادی کے اعداد و شمار حسبِ ذیل شایع کیے گئے ہیں:

رقبہ	مسلمان
۱۔ مغربی پاکستان۔ ایک لاکھ ۸۰ ہزار مربع میل	۱۔ مغربی پاکستان۔ ایک کروڑ ۸۶ لاکھ
۲۔ مشرقی پاکستان۔ ۵۶ ہزار مربع میل	۲۔ مشرقی پاکستان ۳ کروڑ ۱۰ لاکھ
کل ۲.۰ لاکھ ۳۶ ہزار مربع میل	کل ۴ کروڑ ۹۲ لاکھ

آبادی

(۱) مغربی پاکستان	۲ کروڑ ۴۷ لاکھ
(۲) مشرقی پاکستان	۴ کروڑ ۵۱ لاکھ
کل	۶ کروڑ ۹۸ لاکھ

یعنی صرف ایک کروڑ ۴ لاکھ غیر مسلم جن میں ہندو، سکھ، عیسائی اور شودر اقوام شامل ہیں، مسلم علاقوں میں رہے۔ جب کہ پانچ کروڑ مسلمانوں کو ہندوستان اور ریاستوں میں تقریباً ۲۹ کروڑ غیر مسلم اکثریت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔

(علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے: جلد دوم، ص ۶۰۹)

لیگ کونسل کا اجلاس اور تقسیم کی منظوری — اعلان کے بعد:

۹؍جون ۱۹۴۷ء: کانگریس نے ۱۴؍جون ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند منصوبے کی منظوری دے دی۔ مسلم لیگ کو فکر دامن گیر تھی کہ

''..... آدھا پنجاب، آدھا بنگال، ایک سلہٹ کا ضلع اور سندھ و سرحد کے ذد دیوالیہ صوبے لے کر کیا کریں گے؟ جو پہلے ہی مرکز کے رحم و کرم پر زندہ ہیں۔''

یہ درست تھا کہ انگریز کسی ایک فریق کو حکومت دے کر نہیں جا سکتا تھا، لیکن تحریک چلانا، لاٹھیاں کھانا، آنسو گیس کا سامنا کرنا اور جیل جانا مسلم لیگ کی روایات اور سیاسی اسلوب کے بالکل برعکس تھا۔ اتنے بڑے فیصلے کے لیے نواب زادہ لیاقت علی خان پارٹی کے صدر کو کس طرح آمادہ کر سکتے تھے۔ ماؤنٹ بیٹن کو بھی خوش فہمی تھی:

''لیاقت علی خاں Mad Pakistan کے بجائے کوئی زیادہ معقول حل تلاش کرنے میں مددگار ہو سکتے ہیں۔''

نواب زادہ لیاقت علی خاں جب اگلے روز وایسرائے سے ملے تو انھوں نے ماؤنٹ بیٹن کو جو جواب دیا اسے سن کر سب حیران رہ گئے:

''اگر عزت مآب مسلم لیگ کو صرف سندھ کا صحرا دینے پر راضی ہوں تو میں پھر بھی قبول کرلوں گا۔''

آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا آخری اجلاس (۱۰-۹/ جون ۱۹۴۷ء) دہلی کے امپیریل ہوٹل میں ہوا۔ جس میں ۴۲۵ کونسلروں نے شرکت کی۔ اب تقسیم عملی صورت میں سامنے تھی، اس کے اثرات نے کونسلروں کے دل و دماغ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ خاص کر اقلیتی صوبوں کے مسلمان بہت زیادہ پریشان تھے اور اپنے مستقبل کے بارے میں اب ان کی آنکھیں کھلی تھیں۔ پنجاب اور بنگال کی تقسیم ہندو اکثریتی علاقوں کے مسلمانوں کو اب احساس ہوا تھا جب ان کے علاقے ہندوؤں کے پاس چلے گئے تھے۔ امپیریل ہوٹل کے بال روم میں یہ عناصر نہایت غضب ناک ہو کر تقسیم کے خلاف چیخ رہے تھے۔ منصوبے کو ''بے وفائی'' اور ''سانحہ'' سے تعبیر کرتے تھے۔

قایداعظم نے منصوبے کے حق میں تقریر کی۔ قیام پاکستان پر حکومت برطانیہ اور کانگریس کی رضامندی پر اطمینان کیا۔ جن حالات میں منصوبے کو موجودہ شکل میں منظور کیا جا رہا تھا اس پر بھی تنقید کی۔ قایداعظم کی تقریر کے خاتمے پر مولانا حسرت موہانی نے بڑی بے باکی، استغنا اور بے نیازی کے ساتھ منصوبے کی مخالفت میں تقریر کی۔ انھوں نے کہا:

''.....اب جب کہ قایداعظم پلان کو وایسرائے کے سامنے منظور کر چکے ہیں اور ریڈیو پر اس کے لیے پسندیدگی کا اظہار کر چکے ہیں تو پھر اسے کونسل میں لانے کا کیا فایدہ.....''

قایداعظم نے جواب دیا:

"پلان کو مشروط طور پر قبول کیا گیا ہے، کونسل کی منظوری لازمی ہے۔ میری راے وزنی نہیں۔ مولانا کو اختلاف کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ اگر وہ ہاؤس کو اپنا ہم نوا بنالیں تو میں اپنی راے کے باوجود ایوان کی راے کا پابند ہوں گا۔"

مولانا مزید کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن انھیں زبردستی بٹھا دیا گیا۔ کونسل نے قایداعظم کو مکمل اختیار دے دیا کہ وہ پلان کے بنیادی اصولوں کو مفاہمت کے جذبے کے تحت منظور کرلیں اور پلان کی تفصیلات مساویانہ اور منصفانہ طور پر طے کریں۔

کیمبرج میں چودھری رحمت علی کی پاکستان نیشنل موومنٹ نے پلان کی شدید مذمت کی اور اسے مسلم امہ کے ساتھ "عظیم بے وفائی" (The Greatest Betrayal) قرار دیا:

"یہ مکمل بے وفائی ہے، سودے بازی ہے اور مسٹر جناح نے ٹکڑے ٹکڑے کیا ہے۔ جس نے برطانوی منصوبے کو مان کر تمام قوموں اور ملکوں کی بنیاد کو بکھیر دیا ہے اور برعظیم کے دس کروڑ مسلمانوں کا مستقبل سبوتاژ کردیا ہے..... ہم آخر وقت تک جنگ جاری رکھیں گے۔ ہم نہ چھوڑیں گے نہ ہی ہتھیار ڈالیں گے...... ہمارے متعلق یہ کبھی نہیں کہا جائے گا جب ملت کے لیے عظیم تر معرکہ آرائی اور عظیم تر بے وفائی کے درمیان انتخاب کا موقع آیا..... ہم نے بھی غداروں کی تقلید کی اور بے وفائی کی۔"

(ابوالکلام آزاد اور........: ص ۶۷-۵۶۶)

ڈاکومنٹ نمبر ۱۲۷: ریئر ایڈمرل وائسکاؤنٹ ماؤنٹ بیٹن کے نام مسٹر لیاقت علی خان کا مراسلہ۔ آر/۳/۱/۱۵۶: الیف الیف ۴۹-۵۰

آل انڈیا مسلم لیگ - دہلی

۱۰ر جون ۱۹۴۷ء

ڈیئر لارڈ ماؤنٹ بیٹن!

میں اس کے ساتھ آپ کی اطلاع کے لیے آل انڈیا مسلم لیگ کے منظور کردہ

ریزولیوشن کی نقل ارسال کر رہا ہوں، جو اس نے اپنے اجلاس ۹ ر جون ۱۹۴۷ء میں منظور کیا اور اس ریزولیوشن کا تعلق ملک معظم کی حکومت کے اعلان مورخہ ۳ ر جون ۱۹۴۷ء سے ہے۔

(ڈاکومنٹ نمبر ۴۵)

آپ کا مخلص

لیاقت علی خاں

آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس

۹ ر جون ۱۹۴۷ء بہ روز پیر میں منظور کردہ ریزولیشن:

آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس بحث و مباحثہ اور غور و خوض کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ ملک معظم کی حکومت کے اعلان نامہ ۳ ر جون ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کے عوام کو انتقال اقتدار کا جو منصوبہ پیش کیا گیا ہے، اطمینان بخش ہے اور کونسل اس پر مطمئن ہے کہ کابینہ مشن منصوبہ ۱۶ ر مئی ۱۹۴۶ء پر پیش رفت نہیں ہو سکتی، لہٰذا اسے ترک کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کی تقسیم ہی واحد حل رہ جاتا ہے جسے ملک معظم کی حکومت نے ۳ ر جون کے منصوبے میں تجویز کر دیا ہے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کی رائے ہے کہ ہندوستان کو درپیش مسائل کا حل ہندوستان دو حصوں پاکستان اور ہندوستان میں تقسیم کرنا ہے۔ اس بنیاد پر کونسل نے ملک معظم کے اعلان نامے پر پوری توجہ دی اور غور کیا ہے۔ اگرچہ کونسل بنگال اور پنجاب کی تقسیم سے اتفاق نہیں کر سکتی اور نہ ہی ان صوبوں کی تقسیم پر رضامندی ظاہر کر سکتی ہے، لیکن اس نے ملک معظم کی حکومت کے منصوبہ برائے انتقال اقتدار کا بہ طور مجموعی جایزہ لیا ہے۔

اس لیے کونسل آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر قاید اعظم محمد علی جناح کو مکمل اختیار دیتی ہے کہ منصوبے میں مندرج بنیادی اصولوں کو سمجھوتے کے طور پر قبول کر لیں۔ اس کے ساتھ ہی صدر کو مکمل اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ ہندوستان کی تقسیم کو ان اصولوں کی بنیاد پر پایۂ تکمیل تک پہنچائیں جن کا ذکر ملک معظم کی حکومت نے منصوبے میں کیا ہے اور اس میں ڈیفنس، مالیات اور مواصلات وغیرہ کے شعبہ جات بھی شامل ہیں۔ اس منصوبے کی تکمیل کے لیے تفصیلات طے کرنے میں مساوات اور انصاف سے کام لیا جائے۔

کونسل صدر (مسلم لیگ) قاید اعظم محمد علی جناح کو مزید اختیارات دیتی ہے کہ وہ

منصوبے کے سلسلے میں ہر قسم کا قدم اٹھا سکتے ہیں اور فیصلہ کر سکتے ہیں۔

ڈاکومنٹ نمبر ۱۲۹: ریئر ایڈمرل واسکاؤنٹ ماؤنٹ بیٹن آف برما کے نام پنڈت نہرو کا مراسلہ۔آر/۳/۱/۱۵۶:الیف الیف ۴-۵۳

۱۷۔یارک روڈ۔نئی دہلی

خفیہ:

۱۰ر جون ۱۹۴۷ء

ڈیئر لارڈ ماؤنٹ بیٹن!

میں نے ابھی آل انڈیا مسلم لیگ کے ریزولیوشن کے متن کا مطالعہ کیا ہے (ڈاکومنٹ نمبر ۱۲۷) میں محسوس کرتا ہوں کہ ریزولیوشن کسی لحاظ سے بھی اطمینان بخش نہیں ہے۔ اس کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے "کونسل اس پر مطمئن ہے کہ کابینہ مشن منصوبہ ۱۶ر مئی ۱۹۴۷ء پر پیش رفت ممکن نہیں ہے، لہٰذا اسے ترک کیا جاتا ہے۔" یہ درست ہے کہ اس منصوبے میں بڑی حد تک ترمیم کی گئی۔لیکن حقیقت میں ہم اس منصوبے کے مطابق اب بھی کئی طرح سے کام کر رہے ہیں۔ ہماری آئین ساز اسمبلی اسی منصوبے کے تحت کام کر رہی ہے اور کرتی رہے گی۔کئی صوبوں کے مسلم لیگی ممبروں نے بھی اب اس میں شرکت کر لی ہے، اس لیے یہ کہنا درست نہیں کہ اس منصوبے کو ترک کر دیا گیا ہے اور مسلم لیگ خود کسی حد تک اس منصوبے پر عمل پیرا ہے۔

کونسل کے ریزولیوشن کا دوسرا پیرا بہت زیادہ اہم ہے۔اس میں کہا گیا ہے کہ کونسل ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کی توثیق کرتی ہے اور مزید کہتی ہے کہ کونسل بنگال اور پنجاب کی تقسیم سے اتفاق نہیں کرتی اور نہ ہی اس تقسیم پر رضامند ہے۔اگرچہ ملک معظم کے منصوبے کو مجموعی طور پر منظور کرتی ہے۔اس طرح کونسل نے نئی اسکیم کی ایک بنیادی شق کو قطعی طور پر مسترد کر دیا ہے۔

تیسرے پیراگراف میں کہا گیا ہے کہ کونسل میں منصوبے کے بنیادی اصولون کو سمجھوتے کے طور پر قبول کیا ہے۔یہ واضح نہیں ہے کہ کونسل کے نزدیک بنیادی اصولوں سے کیا مراد ہے۔کونسل بنیادی اصول کا مطلب ہندوستان کی تقسیم لے سکتی ہے اور بنگال اور پنجاب کی تقسیم نہیں۔اس کا مطلب خواہ کچھ ہی ہو، مگر اسے سمجھوتے کے طور پر قبول کیا گیا ہے۔یقیناً یہ ایک سمجھوتا ہے مگر اصل نکتہ یہ ہے آیا اسے تصفیہ کے طور پر قبول کیا گیا ہے یا

نہیں؟ کونسل کے اجلاس میں جو تقاریر ہوئیں ان سے مترشح ہوتا ہے کہ اس منصوبے کے اطلاق کی بنا پر مزید مطالبات پیش کیے جائیں گے۔

کونسل نے اپنے صدر کو مکمل اختیارات سونپ دیے ہیں۔ مسٹر جناح منصوبے کے بارے میں ضروری اقدامات اور فیصلے کرنے کے مجاز بنا دیے گئے ہیں۔ اس لیے صورت حال یہ پیدا ہوتی ہے کہ کونسل نے منصوبے کو تصفیے کے طور پر خود قبول نہیں کیا بلکہ اس نے یہ اختیار اپنے صدر کو دے دیا ہے کہ اگر وہ پسند کریں تو اسے منظور کرلیں۔ اس طرح تو معاملات جوں کے توں ہی رہے۔ اس سلسلے میں اب جو کچھ ہوسکتا ہے وہ یہ ہے کہ مسٹر جناح آل انڈیا مسلم لیگ کی طرف سے منصوبے کو کلیتاً تصفیے کے طور پر قبول کر لیتے جب تک تحریری طور پر ایسا نہیں ہوتا مستقبل قریب میں دشواریاں پیدا ہونے کا اندیشہ موجود رہے گا۔ میں نے ماضی میں مسلم لیگ کی مبہم قراردادیں دیکھی ہیں جن کی ایک سے زیادہ تشریحات ہوئی تھیں اور ہمیں بہت سے مسایل کا سامنا محض اس وجہ سے کرنا پڑا تھا۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس منعقد ہونے والا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ نے منصوبے کو صاف طور پر قبول نہیں کیا، چناں چہ کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں یہ نکتہ سامنے آئے گا اور فیصلوں پر اثر انداز ہوگا۔ مجھے پورا اعتماد ہے کہ اس صورت حال کے پیدا ہونے سے پہلے ہی مسٹر جناح ملک معظم کی حکومت کے پیش کردہ منصوبے کو فرقہ وارانہ مسایل کا تصفیہ جان کر پورا اتفاق ظاہر کردیں گے اور یہ تحریری طور پر ہونا چاہیے۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا یہی قیاس کیا جائے گا کہ وہ منصوبے کے بارے میں کوئی الفاظ منہ سے نکالنے کے خواہش مند نہیں ہیں اور اسے تصفیے کے مستحق سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

آپ کا مخلص

جواہر لال نہرو

ڈاکومنٹ نمبر ۱۳۰: ریئر اڈمرل وائکاؤنٹ ماؤنٹ بیٹن آف برما کے نام سردار پٹیل کا مراسلہ

انتہائی خفیہ اور فوری۔ کابینہ کا ممبر داخلہ

نئی دہلی

۱۰ر جون ۱۹۴۷ء

ڈیئر لارڈ ماؤنٹ بیٹن!

شاید آپ کو اس ریزولیوشن کی نقل پہلے ہی مل چکی ہو جسے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے منظور کیا ہے۔ (ڈاکومنٹ نمبر ۱۲۷) اگر آپ کو موصول نہ ہوا ہو تو میں اس کی نقل ارسال کر رہا ہوں۔

آپ دیکھیں گے کہ ریزولیوشن متضاد ہے اور (منصوبہ) صاف طور پر منظور کرنے سے گریز اختیار کیا ہے۔ ایک جگہ کہا گیا ہے کہ کونسل بنگال اور پنجاب کی تقسیم سے اتفاق نہیں کرتی اور نہ ہی ان کی تقسیم سے رضامند ہے۔ ایک دوسری جگہ پر کہا گیا ہے کہ کونسل ۳/ جون منصوبے کے بنیادی اصولوں کو سمجھوتے کے طور پر قبول کرتی ہے۔ آپ ریزولیوشن کا جائزہ ان تقاریر کی روشنی میں لیں جو کونسل کے اجلاس میں ہوئیں۔ میں نے اس کی نقل انٹیلی جنس بیورو کے ذریعے حاصل کی ہے۔ میں اس کی ایک نقل ساتھ منسلک کر رہا ہوں۔ اس کارروائی سے بالکل واضح ہوتا ہے کہ پاکستان ۳/ جون منصوبے کو ہندوستان کے خلاف جارحیت کے لیے استعمال کرنے کی خاطر اسپرنگ بورڈ کے طور پر استعمال کرے گا اور اس بنیاد پر تصفیے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس سے ایسی صورت حال پیدا ہو گئی ہے جس سے ہم شدید تشویش میں مبتلا ہو گئے ہیں۔

ان حالات میں جب تک مسٹر جناح منصوبے کو واضح طور پر قبول کرنے کا بیان جاری نہ کریں آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں مشکلات کا پیدا ہونا لازمی ہے۔

آپ کا مخلص

ولبھ بھائی پٹیل

الف: ڈاکومنٹ نمبر ۱۳۰ کے ساتھ منسلک ریکارڈ:

آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ۹/ جون ۱۹۴۷ء کو صبح ساڑھے دس بجے امپیریل ہوٹل نئی دہلی میں ہوا، اجلاس کی صدارت مسٹر ایم اے جناح نے کی۔ مولانا عبدالحامد بدایوں۔ یوپی نے قرآن (پاک) کے چند حصے تلاوت کیے، اس کے بعد مسٹر لیاقت علی خاں نے بیگم محمد علی اور مسٹر اسماعیل کی وفات پر تعزیتی قرار دادوں کی منظوری حاصل کی۔

اس کے بعد مسٹر جناح نے ملک معظم کی حکومت کے منصوبے کے حصے پڑھ کر سنائے

اور کہا کہ منصوبہ کونسل کے سامنے پیش کیا جارہا ہے تاکہ کونسل اگر اسے قبول کرنا چاہتی ہے تو وہ ایسا کرسکتی ہے اور اس کے خلاف بھی فیصلہ کرسکتی ہے۔ انھوں نے مزید کہا "جو اس منصوبے کے کسی پہلو کی وضاحت چاہتے ہیں انھیں سوالات کرنے کی اجازت ہے۔" اس پر اوڑیسہ، یوپی، بنگال اور بمبئی کے نمایندوں نے مسٹر جناح سے حد بندی کمیشن کے اختیارات اور مسلم اقلیتی صوبوں میں مسلمانوں کے حقوق کے بارے میں سوالات کیے۔ ان سوالات کے جواب میں مسٹر جناح نے کہا کہ وہ اپنی ذاتی رائے کے علاوہ کچھ بھی افشا نہیں کرسکتے۔ مسلم اقلیت کے حقوق کے تحفظ کا انحصار ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تعلقات پر ہے۔

کونسل نے مسٹر جناح سے استدعا کی کہ اگر (کوئی) ممبر منصوبے کی منظوری یا استرداد کے لیے ریزولیوشن پیش کرنے کا خواہش مند ہو تو اسے اجازت دی جائے۔ مسٹر جناح نے جواب دیا کہ ریزولیوشن پیش کرنے اور ان پر بحث کرنے کا قطعاً سوال پیدا نہیں ہوتا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ایوان کے سامنے مسئلہ یہ پیش ہے کہ آیا اسے یہ منصوبہ مجموعی طور پر قبول ہے؟ اگر ایوان کو اس سے اتفاق ہے تو ایک متفقہ ریزولیوشن پاس کیا جائے جس میں منصوبے کی قبولیت کا ذکر ہو۔

ب: تقاریر:

ا۔ پروفیسر عبدالرحیم (بنگال): انھوں نے ریزولیوشن کی شدید مخالفت کی، اس منصوبے سے ہندوستان کے مسلمان تباہ و برباد ہوجائیں گے۔ اس کے نتیجے میں ملک میں کبھی بھی پائیدار امن قایم نہیں ہوسکے گا۔ اس سے مسلمانوں کو فایدہ حاصل نہ ہوگا۔ پنجاب اور بنگال کی مجوزہ تقسیم سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں ہمیشہ جھگڑا ہوتا رہے گا۔ انھوں نے مزید کہا کہ مشرقی بنگال اور مغربی پنجاب اقتصادی اور صنعتی اعتبار سے کم زور ہوں گے۔ مغربی بنگال کی کل آمدن مشرقی بنگال کی نسبت تین گنا زیادہ ہوگی۔ انھوں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ مشرقی پنجاب کے حصے میں نہایت کار آمد اضلاع آئیں گے۔ انھوں نے مسلمانوں کو نصیحت کی کہ وہ اصلی پاکستان حاصل کرنے کے لیے جنگ جاری رکھیں اور مطالبہ کیا کہ منصوبہ مکمل طور پر مسترد کردیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ کرم خوردہ

پاکستان جواب پیش کیا جارہا ہے، کانگریس کے لیڈروں نے چار سال قبل پیش کیا تھا اور اگر مسلمان اب اسے قبول کرنے پر رضامند ہیں تو اب تک جو خون ریزی ہو چکی ہے اس میں کوئی ہوش مندی نہ تھی۔ انھوں نے اپنی تقریر کے اختتام پر منصوبہ مسترد کرنے کی اپیل دل سوزی سے کی۔

۲۔ غلام حسین ہدایت اللہ۔ وزیر اعظم سندھ: انھوں نے ملک میں باہمی تصادم کے حالات پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور کہا کہ پاکستان اس قدر زیادہ کٹی پھٹی صورت میں دیا جارہا ہے کہ اس میں زندگی کے آثار نہیں ہیں اور مزید کہا کہ جغرافیائی اعتبار سے خوب خوش حال علاقہ پاکستان سے چھین لیا گیا ہے لیکن میرے سامنے تین مقاصد ہیں جن کی بنا پر میں اپیل کرتا ہوں کہ آپ منصوبے کو منظور کرلیں:

(۱) بین الاقوامی طور پر سمجھا جارہا ہے کہ برطانیہ ہندوستان سے رخصت ہورہا ہے اور وہ ہندوستان سے رخصت ہونے سے قبل اختیارات کسی کو سونپنے کا پابند ہے۔ یہ بالکل واضح ہے کہ برطانیہ کے انخلا کے بعد ہمیں ایک مسلح اور طاقتور قوم سے لڑائی لڑکر پاکستان حاصل کرنا پڑے گا۔ کیوں کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ دس ملین آدمیوں کو زیادہ دیر تک دبا کر رکھا جاسکے۔ لیکن اس کے باوجود اس کی ضمانت نہیں دی جاسکتی کہ اس قدر زیادہ خون بہانے کے بعد آپ کا مطالبہ پورا مان لیا جائے گا۔

(۲) اصول کی بنا پر آپ کو وہی علاقے ملتے ہیں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ آپ یہ علاقے آج لے سکتے ہیں یا کل جنگ بازی کے بعد۔ یہاں تک کہ اصل ریزولیوشن جس میں پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا اس میں لکھا ہے کہ مسلم علاقوں کو مسلم ریاست میں شامل کیا جائے۔ یہ درست ہے کہ آپ کو جو پاکستان دیا جارہا ہے وہ کم زور ہے لیکن آپ کو یاد رکھنا چاہیے کہ اب آپ کو ایک علاحدہ قوم کے طور پر تسلیم کرلیا گیا ہے۔ یہ قوم اپنے ملک میں خود مختار ہوگی اور اپنے مسائل خود حل کرے گی۔ میں سندھ کی طرف سے آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ہم صوبے میں کئی ترقیاتی منصوبوں پر جاں فشانی سے کام کررہے ہیں اور وسیع تعمیری منصوبے زیر غور ہیں۔ اس کے نتیجے میں ہمارا صوبہ عن قریب خوش حال ہو جائے گا۔ میں آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ اگر آپ میں سے کسی کے پاس کوئی تعمیری منصوبہ ہے تو آپ برائے مہربانی ہمیں اس سے آگاہ کریں۔ ہم اپنے ملک

کو بڑی تیزی سے صنعتی بنائیں گے، مسلم اقلیتی صوبوں سے ترک سکونت کر کے جو مسلمان تاجر اور کاری گر سندھ میں آباد ہونے کے خواہش مند ہوں گے انھیں جنت مہیا کریں گے۔ ہم نے اپنے صوبے سے سندھی اور غیر سندھی کا مسئلہ ختم کر دیا ہے اور ہم دیکھیں گے کہ سندھ جلد ترقی یافتہ ہو جائے گا۔

۳۔ ظہیر الحسن لاری۔ یو پی: ہمارے سامنے جو منصوبہ رکھا گیا ہے، انتہائی مایوس کن ہے۔ ہم اسے کبھی قبول نہیں کریں گے اور اگر ہم نے اسے قبول کر لیا تو اس سے بڑی تباہی ہو گی۔ ہم نے بمبئی کے اجلاس (ڈاکومنٹ نمبر ۸۶ جلد ہشتم) میں کابینہ مشن منصوبہ مسترد کر دیا تھا، کیوں کہ کانگریس نے صوبوں کی گروپ بندی کی مخالفت کی تھی اور اس نے گروپ بندی اسکیم کو اس انداز میں تسلیم نہیں کیا تھا جس طرح کابینہ مشن اسے نافذ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ کانگریس نے آسام کو پاکستان میں شامل نہ کرنے پر اصرار کیا تھا اور ہم نے کبھی نہیں چاہا کہ آسام پاکستان سے علاحدہ ہو۔ جب ہم نے ایک مرتبہ کابینہ مشن منصوبہ اس وجہ سے مسترد کر دیا تو اب سوال پیدا ہوتا ہے آیا ملک معظم کے منصوبے کے مطابق آسام ہمیں ملے گا یا نہیں۔ میں کونسل کو بتانا چاہتا ہوں کہ ہم کو نہ صرف آسام ہی سے محروم نہیں ہونا پڑے گا۔ بلکہ بنگال اور پنجاب کے وسیع علاقوں کو تقسیم کر دیا جائے گا اور یہ پاکستان کا نقصان ہو گا۔ اس سے مجوزہ نئی مملکت بہت زیادہ کم زور ہو جائے گی۔ درحقیقت حکومت برطانیہ نے ہمارے مطالبات میں سے ایک بھی منظور نہیں کیا۔ انھوں نے تمام کوششیں ہندوؤں کو مطمئن کرنے کے لیے کیں۔ مثال کے طور پر گاندھی جناح بات چیت (ڈاکومنٹ نمبر ۳۰ جلد نہم) راج گوپال اچاریہ فارمولا (ڈاکومنٹ نمبر ۵۷۶ جلد نہم) ڈاکٹر راجندر پرشاد کی کتاب ''انڈیا ڈیوائیڈڈ'' میں ہندوستان کو انھی خطوط پر تقسیم کرنے کی تجویز پیش کی گئی تھی جو اب ملک معظم کی حکومت کی تجاویز میں پیش کیے گئے ہیں۔ جو پاکستان ہمیں پیش کیا جا رہا ہے ہر نقطۂ نظر سے اس قدر کم زور ہو گا کہ اس سے ہمارے لیے شدید مشکلات پیدا ہوں گی۔

میرا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اگر اصول کی بنا پر بنگال اور پنجاب کی تقسیم درست ہے تو بمبئی پریذیڈنسی اور یو پی کے جن مسلمانوں نے کانگریس کی حکومت کی مخالفت کی ان کو بھی علاحدہ وطن دیا جائے۔ کیوں کہ ان کی تعداد سکھوں سے زیادہ ہے۔ ہم یقین دلاتے

ہیں کہ ہم متبادلہ آبادی اس طریقے سے کریں گے کہ یو پی کو تقسیم کر کے جو اضلاع ہمیں دیے جائیں ان میں ہم اپنی آبادی اکثریت میں بنالیں گے۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر قایم ہے کہ منصوبے کے ذریعے حکومت برطانیہ نے کانگریس کو خوش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جب ہم نے کابینہ مشن منصوبہ مسترد کیا تھا تو اس سے حکومت برطانیہ نے کوئی اثر قبول نہ کیا تھا، لیکن جوں ہی کانگریس نے پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا مطالبہ کیا حکومت برطانیہ نے فوراً ایسی تجاویز پیش کر دیں جن میں کانگریس کے مطالبات کو تسلیم کرتے ہوئے شامل کیا گیا ہے۔ حکومت برطانیہ نے کانگریس کے اس مطالبے کو اس حقیقت کے باوجود تسلیم کیا ہے جب کہ بنگال کے چند ذمے دار ہندو لیڈر بنگال کو متحد رکھنے کے لیے سرگرم ہیں۔ بہ ہر حال برطانیہ نے ان کی ایجی ٹیشن کو اس لیے لائق اعتنا نہیں سمجھا کیوں کہ وہ کانگریس کو خوش کرنے کی فکر میں تھی۔ مسلمانوں کو ادنا قوم بنایا جارہا ہے۔ اگر آپ ایسا ہی کٹا پھٹا پاکستان قبول کرنے پر رضامند ہیں تو میں آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ نے ملک میں اس قدر ایجی ٹیشن کیوں کیا؟ آپ اب جو کچھ قبول کرنے پر آمادہ نظر آرہے ہیں یہی کچھ آپ کانگریس سے سمجھوتا کر کے حاصل کر سکتے تھے، برطانیہ نے آپ کو بے وقوف بنایا ہے۔ مسلم اقلیتی صوبوں میں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے کیا تحفظات حاصل کیے گئے ہیں؟ کیا اب ہم کو دو مسلم لیگیں بنانا پڑیں گی جن میں سے ایک کا تعلق پاکستان سے ہوگا اور ایک کا ہندوستان سے؟ میں اعلان کرتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمان اپنی علاحدہ مسلم لیگ قایم کریں گے، انھوں نے جس قوت اور قربانی کی بنا پر آپ کو پاکستان لے کر دیا ہے اسی بل پر اپنے حقوق کی حفاظت کریں گے۔ میں اس منصوبے کی شدید مخالفت کرتا ہوں۔

۴۔ **غلام نبی ملک ایم اے۔ امرتسر:** میرے پیش رو مسٹر لاری نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے میں ان کی مخالفت کرتا ہوں، انھوں نے مسلم اقلیت کے حقوق پر تشویش ظاہر کی ہے۔ میں اپنے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مثال پیش کرتا ہوں جنھوں نے کفار کے ساتھ اس سے زیادہ غیر مساوی معاہدات کیے۔ اس زمانے کے مسلمانوں نے ان معاہدات کی مخالفت کی تھی، لیکن ہمارے پیغمبر نے سمجھوتا کیا، کیوں کہ اس معاہدے کی بنا پر مسلمانوں کو ایک قوم تسلیم کرلیا گیا تھا۔ اس وقت جو منصوبہ ہمارے زیر غور ہے اسے اسی روشنی میں دیکھا

جانا چاہیے۔ اگر چہ یہ منصوبہ ناقص ہے اور اس کے کئی پہلو مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ہیں، لیکن اس اعتبار سے منصوبہ اچھا ہے کہ مسلمانوں کو ایک قوم تسلیم کیا گیا ہے اور ان کو ایک خود مختار قوم کی حیثیت سے ملک میں حکمرانی کا موقع میسر آئے گا۔ مسٹر لاری کو اس قدر تشویش میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے، میں بھی ان کی طرح مسلم اقلیتی علاقے سے تعلق رکھتا ہوں، میں امرتسر کا باسی ہوں، اس کے باوجود میں اپنے آپ کو کمزور محسوس نہیں کرتا۔ فی الوقت صورت حال یہ ہے کہ اگر سکھ چند مسلمانوں کو قتل کرتے ہیں ہم فوراً انتقام لیتے ہیں اور زیادہ سکھوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہمارے پاس بہتر سپاہ ہے، ہمارے پاس صرف ہتھیاروں کی کمی ہے۔ اب پاکستان معرض وجود آنے سے یہ بھی دور ہو جائے گی۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہندوستان میں مسلمانوں پر جہاں بھی زیادتی ہوگی حکومت پاکستان ہمیشہ انتقام لینے کے لیے کمربستہ ہوگی اور اگر ضرورت محسوس کی گئی تو بدلہ لینے کے لیے مسلمان سرحدات کو عبور کرنے سے بھی گریز نہ کریں گے۔ ہمیں پنجاب کے ایک حصے کے پاکستان سے کٹ جانے کی ذرہ برابر پروا نہیں ہے، جوں ہی برطانیہ نے رختِ سفر باندھا یہ علاقہ یا تو رضا کارانہ طور پر خالی ہو جائے گا یا اسے تباہ کر دیا جائے گا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں ہندو ریاستوں کی طرف سے پنجابی مسلمانوں پر مظالم کا جو سلسلہ جاری ہے ہم اس کا پورا انتقام لیں گے۔ ایک مرتبہ ہمیں صرف آزادی کی فضا میں سانس لینے کا موقع ملنے دیں۔ اگر چہ ہم غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں جب ہم نے اپنے آپ کو ناقابل تسخیر ثابت کر دیا اور ہم نے آزادی حاصل کر لی تو ہمیں اپنے عزائم کی تکمیل سے کوئی نہ روک سکے گا۔ میں آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ اس منصوبے کو منظور کرلیں۔

۵۔ **مظہر اسماعیل۔ مدراس:** میں مسلم اقلیتی صوبے سے تعلق رکھتا ہوں۔ ہم نے حصول پاکستان کے لیے قربانیاں دی ہیں، اگر قائداعظم یہ خیال کرتے ہیں کہ ہمیں منصوبہ منظور کر لینا چاہیے تو ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ ہمارے صوبے میں کوئی فرقہ وارانہ جھگڑا نہیں۔ مدراس کے موپلے منظم ہو رہے ہیں، اس لیے مدراس کے مسلمانوں کے گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

۶۔ **پیر صاحب زکوری شریف۔ صوبہ سرحد:** میرا تعلق صوبۂ سرحد سے ہے اور

میں اس صوبے کے مسلمانوں کی ترجمانی کرنا چاہتا ہوں۔ میں پیر مانکی شریف کے جذبات
بھی بیان کرنا چاہتا ہوں جو یہاں تشریف فرما ہیں۔ ہم پٹھان ہیں اور (پٹھان) بڑے باعمل
لوگ ہوتے ہیں۔ ہم آپ کی طرح لمبی چوڑی تقریریں کرنے کے فن سے آشنا نہیں ہیں۔
ہم عمل کو ترجیح دیتے ہیں۔ جب لیگ کو خان برادران کے ہاتھوں انتخاب میں شکست کا
سامنا کرنا پڑا تھا تو اس کے بعد میں نے قاید اعظم سے ملاقات کی تھی تو انھوں نے کہا تھا کہ
آپ کو اس پر شرم آنی چاہیے۔ ابتدا میں صوبہ سرحد کے عوام پر خان برادران کا بڑا اثر تھا اور
ہم کانگریس کو اپنی جماعت خیال کرتے تھے، جب کہ مسلم لیگ کو انگریزوں کے پروردہ
لوگوں کی جماعت سمجھتے تھے۔ لیکن جب ہم نے ان مظالم کا مشاہدہ کیا جو کانگریس نے
مسلمانوں پر روا رکھے ہوئے تھے تو ہم پر خان برادران کے سحر کا اثر ختم ہو گیا اور ہم نے
کانگریس سے قطع تعلق کر لیا۔ آج صورت حال یہ ہے کہ ہم کانگریس کے لوگوں سے اس
قدر زیادہ نفرت کرتے ہیں کہ وہ صوبہ سرحد میں ہمارے خلاف جس قدر زیادہ پروپیگنڈا
کریں گے ریفرینڈم میں ہماری کامیابی اتنی ہی یقینی ہوتی جائے گی۔ ہم یقین دلانا چاہتے
ہیں کہ ریفرینڈم میں صوبہ سرحد کے مسلمان مسلم لیگ کے حق میں ووٹ دیں گے۔ میرے
بھائیوں نے یہاں مجھ سے کہا ہے کہ ہندو پٹھانوں کو کرپٹ بنانے کی کوشش کریں گے اور
ان کے ووٹ خریدیں گے ہمارے دوستوں نے پٹھانوں کو شاید سمجھا ہی نہیں ہے۔ برطانیہ
نے صوبہ سرحد میں دولت پھیلائی اور پٹھانوں کو کرپٹ بنانے کی کوشش کی، لیکن اس کے
باوجود پٹھان اب بھی انگریزوں کے شدید دشمن ہیں۔ ہندوؤں کو اپنی دولت خرچ کرنے دو،
ہم ان سے پیسے وصول کریں گے، لیکن ووٹ مسلم لیگ کو ہی دیں گے اور ہم ریفرینڈم میں
کامیاب ہوں گے۔ اب ہم جانتے ہیں کہ مسلم لیگ کیا ہے اور کانگریس کی حقیقت کیا ہے؟
مسلمان اقلیت کو خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ پٹھانوں کو اپنی اصلیت کا علم ہے
اور ہم اسے اپنے لیے قابلِ فخر سمجھتے ہیں کہ اپنی زندگی اپنے بھائیوں پر قربان کر دیں۔ آج
جب پاکستان معرضِ وجود میں آ رہا ہے اور کونسل کا اجلاس اس کمرے میں ہو رہا ہے، میں
اپنے بھائیوں سے ایک وعدہ کرنا چاہتا ہوں، میں وعدہ کرتا ہوں اور اعلان کرتا ہوں کہ قاید
اعظم کے ادنا اشارے پر میں سیکڑوں ہزاروں پٹھانوں کی مسلح فوج تیار کر دوں گا۔ یہ اس قدر
بہادر سپاہی ہوں گے کہ ان کا نام تاریخ عالم میں سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔ میں ایک

مرتبہ پھر یقین دہانی کرانا چاہتا ہوں کہ مسلمان اقلیت کو گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ باتیں کرنا قبل از وقت ہے لیکن مجھے اس میں کوئی شک نظر نہیں آتا کہ صوبے کے پٹھانوں کے دلوں میں اس وقت جو کچھ ہے وہ اس کا عملی مظاہرہ کر کے دکھا دیں گے۔ ہمیں آپ کی صرف اخلاقی مدد کی ضرورت ہے۔ ہم کانگریس کے لیے اپنا خون بہانے پر تیار ہوتے تھے جو کہ غیر ملکی جماعت تھی، ہم مسلمانوں کی سلطنت قایم کرنے کے لیے کیا کچھ نہیں کریں گے، جہاں ہماری اپنی حکومت ہو گی؟

۷۔ مولوی عبدالرحمٰن۔سی پی: میں مسلمانوں کی طرف سے آپ سے استدعا کرتا ہوں کہ ملک معظم کی حکومت کا پیش کردہ منصوبہ منظور کر لیں، خواہ اس میں وہ نقایص موجود ہیں، جن کی نشان دہی پہلے مقررین نے کی ہے۔ اس بنا پر ہمیں خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں اس سے زیادہ خطہ ارضی ملے گا جتنا افغانستان، ایران، عربیا، عراق، یمن اور فلسطین کا ہے۔ ہمارے پاس دولت بھی ان ممالک سے زیادہ ہو گی۔ ہمارے پاس صنعت اور زراعت ہو گی، اگر متذکرہ بالا ممالک خوش حال اور آزاد رہ سکتے ہیں تو مجھے اس میں شک نظر نہیں آتا کہ پاکستان بھی خوش حال اور آزاد ہو گا۔ میں اپیل کرتا ہوں کہ اس منصوبے کو منظور کر لیا جائے۔

۸۔ عبدالحمید۔آسام: میں مسلم اقلیتی صوبے کا باشندہ ہوں اور نئے منصوبہ کے مطابق میری رہایش ہندوستان میں ہو گی، اس کے باوجود میں منصوبے کی حمایت کرتا ہوں۔ اگر اس منصوبے کی رو سے مسلمانوں کی اکثریت کو آزادی نصیب ہوتی ہے تو میں بہ دستور غلام رہنے کو ترجیح دوں گا۔ میں زور دے کر کہتا ہوں کہ منصوبہ منظور کر لیا جائے۔

اس موقع پر اجلاس شام ساڑھے سات بجے تک ملتوی ہو گیا۔

۹۔ جناح صاحب کا خطاب:

اجلاس کی کارروائی شام ساڑھے سات بجے مسٹر ایم اے جناح کی صدارت میں دوبارہ شروع ہوئی۔ انھوں نے اپنی تقریر کے دوران کہا کہ منصوبے کے حق اور مخالفت میں کئی پہلو اجلاس کے سامنے پیش کیے گئے۔ ابھی سولہ مقررین کو تقریر کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اگر آپ نے مسئلے کا فیصلہ آج ہی کرنا ہے تو بحث کا سلسلہ ختم ہونا چاہیے۔ بہ صورت دیگر

اجلاس کل بھی جاری رہے گا۔ میں اس مسئلے پر آپ کی رائے جاننا چاہتا ہوں۔ اس پر ایوان کی اکثریت نے بحث بند کرنے کے حق میں رائے دی۔ اس کے بعد منصوبہ منظوری کے لیے پیش کیا گیا۔ مولانا حسرت موہانی سمیت آٹھ کونسلروں نے منصوبے کے خلاف ووٹ دیا، جب کہ ۴۶۰ ووٹ منظور کرنے کے حق میں ڈالے گئے۔ اس طرح منصوبہ منظور کرلیا گیا۔ مسٹر لیاقت علی خاں نے ریزولیوشن پڑھا اور صدر کی توثیق حاصل کی۔ اس ریزولیوشن کی رو سے منصوبہ احتجاج کے ساتھ منظور کیا گیا اور مسٹر جناح کو مزید اقدامات کے لیے اختیار سونپا گیا۔

آخر میں مسٹر جناح نے مسلم اقلیتی صوبوں (کے مسلمانوں) سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ یہ صرف آپ کی قربانیوں کا ثمر ہے کہ آج پاکستان کی حقیقت کو تسلیم کرلیا گیا ہے۔ جہاں تک مسلم اکثریتی صوبوں کا تعلق تھا ان کا مسئلہ زیادہ لایق توجہ نہ تھا۔ اب وقت آگیا ہے کہ سندھی، پنجابی اور دیگر صوبائی امتیازات ختم کردیے جائیں اور مسلمان مجتمع ہوکر اپنا وزن ڈالیں۔ انھوں نے کہا کہ اب ان کا کام ختم ہوگیا ہے۔ ان کا اصلی کام ہندوستان کے مسلمانوں کی علاحدہ سلطنت قایم کرنا تھا، علاحدہ مسلح افواج بنانا تھا اور علاحدہ ملک حاصل کرنا تھا۔ آپ کی ترقی کا راز اتحاد میں مضمر ہے۔

اس موقع پر خاک ساروں نے امپیریل ہوٹل میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی تعداد بیس تھی، پولیس اور مسلم نیشنل گارڈ نے انھیں روک دیا۔

ڈاکومنٹ نمبر ۱۳۹: ریئر ایڈمرل وائسکاؤنٹ ماؤنٹ بیٹن آف برما کے نام مسٹر گاندھی کا مراسلہ

نئی دہلی-۱۱

۱۰ رجون ۱۹۴۷ء

پیارے دوست!

راج کماری (امرت کور) نے مجھے اس گفتگو کا مقصد بتایا جو آپ نے ان سے کی تھی۔

اگرچہ آپ نے ازرہ نوازش مجھے یہ کہا ہے اور میرے لیے یہ کافی ہے کہ میں جب چاہوں آپ سے مل سکتا ہوں، لیکن میں آپ کی اس کرم فرمائی سے فایدہ نہیں اٹھاؤں گا۔ یہ

ہر حال میں چاہتا ہوں کہ آپ کو تحریری طور پر کچھ بتاؤں کہ اسکیم کو جلد کامیابی سے ہم کنار بنانے کے لیے کیا اقدامات ضروری ہیں۔

۱۔ جہاں تک صوبہ سرحد میں ریفرینڈم کا تعلق ہے مجھے اعتراف ہے کہ میری رائے پنڈت نہرو اور ان کے رفقائے کار کو پسند نہیں۔ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا تھا اگر میری رائے ان کو پسند نہیں تو اس صورت میں اس پر اصرار نہیں کروں گا۔

۲۔ لیکن اس سے میری وہ تجویز متاثر نہیں ہوتی جس میں میں نے کہا تھا کہ ریفرینڈم سے قبل قاید اعظم جناح کو صوبہ سرحد کے دورے کی دعوت دی جائے، وہ وہاں تشریف لے جائیں اور وہاں کے وزرا بہ شمول باچا خان اور خدائی خدمت گاروں سے راضی نامہ کریں، جنھوں نے صوبے کی بڑی یا بھلی خدمت کی ہے۔ لیکن مسٹر جناح کے وہاں جانے سے پہلے اس بات کو یقینی بنانا ہوگا کہ ان کے موقف کو خوش خلقی سے سنا جائے گا۔

۳۔ وہ اس تجویز کو منظور کریں یا نہ کریں لیکن قاید اعظم سے کہا جائے کہ وہ پاکستان کے منصوبے کی صحیح تصویر پیش کریں تا کہ سادہ لوح پٹھان ہندوستان یا پاکستان کے بارے میں فیصلہ کر سکیں۔ میرے خیال میں پٹھان اس حیثیت سے آگاہ ہیں جو انھیں ہندوستان میں حاصل ہوگی۔ اگر وہ نہیں جانتے تو کانگریس یا موجودہ آئین ساز اسمبلی کا کام ہے کہ وہ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے۔ ہندوستان یا پاکستان کے بارے میں مکمل معلومات کی عدم موجودگی میں ان سے رائے طلب کرنا ناانصافی ہوگا۔ ان کے لیے یہ جاننا لازمی ہے کہ ان کے تشخص کو مکمل تحفظ کس مملکت میں حاصل ہوگا۔

۴۔ ابھی تک صوبہ سرحد میں امن و امان قایم نہیں ہوا۔ اس جھگڑے کے مکمل خاتمے کے بغیر صحیح ریفرینڈم ہوسکتا ہے؟ اس وقت عوام کے دل و دماغ نہایت غضب ناک ہیں۔ نہ تو کانگریس اور نہ ہی مسلم لیگ اپنے پیرکاروں کی وجہ سے گڑبڑ کی ذمے داری سے پہلو تہی کر سکتی ہے۔ (تحریک پاکستان اور انتقال اقتدار: ص ۷۴۱)

ہندوستان پاکستان میں مسلمانون کی تعداد:

۱۱ر جون ۱۹۴۷ء: زمزم-لاہور نے اپنی اشاعت ۱۱ر جون میں ''مسلمان قوم بٹ گئی'' کے عنوان سے ہندوستان اور پاکستان میں مسلمانوں کی تعداد پر مشتمل اعداد و شمار شایع

کیے ہیں۔ یہاں اختصار و تصحیح اور تبصرے کے ساتھ انھیں پیش کیا جاتا ہے۔
الف: متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد ۹,۲۰,۵۸,۰۹۶
ب: مجوزہ پاکستان میں مسلمانوں کی تعداد:

مشرقی پاکستان:	۳,۰۶,۰۲,۵۰۹
مغربی پاکستان:	۱,۸۷,۹۹,۷۲۱
کل تعداد:	۴,۹۴,۰۲,۲۳۰
ج: ہندوستان میں مسلم اقلیت:	-۴,۲۶,۵۴,۷۹۶
د: دفعہ "ب" اور "ج" کا فرق:	۶۷,۴۷,۴۳۴

تبصرہ: گویا کہ ہندوستان میں مسلم اقلیت کے مقابلے میں پاکستان میں مسلم اکثریت بہ قدر ۶۷,۴۷,۴۳۴ زیادہ ہے۔ پھر جب کہ پاکستان میں نصف صدی کی جدوجہد کے بعد بھی اسلامی شریعت کے نفاذ کا نصب العین نصف صدی اور دور چلا گیا ہے تو کیا ۶۷,۴۷,۴۳۴ نفوس کے دنیاوی مفادات کے تحفظ کے لیے ہندوستان میں رہ جانے والی ۴,۲۶,۵۴,۷۹۶ مسلمانوں کے مفادات کو نظر انداز کر دینا یا جناح صاحب کے الفاظ میں انھیں "رایٹ آف" کر دینا مسلم لیگ اور اس کے رہنماؤں کا مدبرانہ فیصلہ ہو سکتا ہے؟

۱۲ر جون ۱۹۴۷ء: ہندوستان اور پاکستان کے قدرتی ذرایع کا مقابلہ۔ دونوں ریاستوں کے مداخل و مصارف کا نقشہ، ہندوستان اور پاکستان قدرتی لحاظ سے، کارخانوں اور دھاتوں کا موازنہ ان عنوانات کے تحت معلومات مرتب کر دیے گئے ہیں اور "مسلمان قوم بٹ گئی" کے عنوان سے یہ اعداد و شمار دیے گئے ہیں۔

۱۔ متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد	۷,۹۳,۹۸,۵۰۳
ہندوستان کی ریاستوں میں مسلمانوں کی تعداد	۱,۲۶,۵۹,۵۹۳
ہندوستان اور ہندوستانی ریاستوں میں مسلمانوں کی کل تعداد	۹,۲۰,۵۸,۰۹۶

۲۔ مجوزہ پاکستان میں مسلمانوں کی کل تعداد:

مشرقی پاکستان:	۳,۰۶,۰۲,۵۰۹
مغربی پاکستان:	۱,۸۷,۹۹,۷۲۱
کل تعداد:	۴,۹۴,۰۲,۲۳۰

۳۔ ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کی متوقع تعداد:

آزاد ہندوستان میں:	۲,۹۹,۹۵,۲۰۳
ہندوستانی ریاستوں میں:	۱,۲۶,۵۹,۵۹۳
کل تعداد:	۴,۲۶,۵۴,۷۹۶

(زمزم۔ لاہور: ۱۱ رجون ۱۹۴۷ء، ص ۳)

پاکستان کی قیمت اور قربانی:

۱۳ رجون ۱۹۴۷ء:

(۱) یہ صحیح ہے کہ یہ علاحدگی مسلمانوں کے مطالبے اور حق خود اختیاری کی بنا پر ہوئی، مگر اس سے زیادہ یہ صحیح ہے کہ اس تحریک کو پورے چالیس برس تک انگریزی مقاصد اور مصلحتوں کی رفاقت کا شرف حاصل رہا اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے پہلو بہ پہلو برطانوی شہنشاہیت کے ارکان اور مسٹر چرچل بھی اس خوشی میں برابر کے شریک ہیں۔

ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ کابینہ چرچل کے وزیرِ ہند کی حیثیت سے مسٹر ایمرے بار بار یہ ارشاد فرماتے رہے کانگریس غلطی پر ہے۔ ہندوستان ایسے جداگانہ عناصر کا مجموعہ ہے جس کا اختلاف دنیا کی تاریخ میں بے مثال ہے اور ان میں مسلم قوم سرفہرست ہے، جن کی مردم شماری ۹ کروڑ ہے۔ ہم ایک ضعیف احساسِ محرومی کے ماتحت ہندوستان کو تقسیم کرنے اور اس کے بعد اسے آزاد دیکھنے کے آرزو مند ہیں۔

(۲) یہ صحیح ہے کہ ملک کی تقسیم کا اعلان ہوگیا، مگر تقسیم کی جو صورت منظور کی گئی وہ مسلم لیگ کے فیصلوں کے خلاف اور کانگریس کے مقصد و منشا اور مطالبے کے مطابق ہے۔ اس صورت میں پنجاب کا سرسبز زراعتی علاقہ کارخانوں کا شہر، صنعتی علاقے اور وہ دریا جن کی وجہ سے پنجاب کا نام پنجاب ہے نکل گئے۔ وہ مغربی بنگال جہاں نیا ہندو صوبہ بن رہا ہے۔ جوٹ لوہا اور کوئلہ سب اس کے حصے میں آیا۔ اس حصہ ملک میں ہندوستان کی صنعتوں کا ۳۰ فیصدی حصہ ہے اور اسلامی بنگال میں صرف ۲٫۷ فیصد۔ کلکتہ بنگال کا دل ہے، وہ بھی مسلمانوں کے قبضے سے نکل گیا۔

مسلم لیگی تقسیم ہند کی خوشی میں اس امر کو بھول گئے کہ یہ خوشی انھوں نے ایک کروڑ مسلمانوں کو قربان کر کے حاصل کی ہے۔ جن کے دل مرجھا ہوئے ہیں اور جو سب سے الگ

اپنی قسمت پر از سر نو غور کر رہے ہیں۔ (مدینہ بجنور: ۱۳؍جون ۱۹۴۷ء)

۱۴؍جون ۱۹۴۷ء: ۱۴؍جون ۱۹۴۷ء کو کانسٹی ٹیوشن ہاؤس نئی دہلی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ مسٹر ولبھ پنتھ وزیر اعلا صوبہ یوپی نے مندرجہ ذیل تجویز پیش کی:

"آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے پوری توجہ کے ساتھ ان واقعات کی رفتار پر غور کیا ہے جو اس کے گذشتہ جنوری کے اجلاس سے اب تک رونما ہوئے اور خاص طور پر ان اعلانات پر جو برطانوی حکومت کی طرف سے ۲۰؍فروری ۱۹۴۷ء اور ۳؍جون ۱۹۴۷ء کو کیے گئے۔ یہ کمیٹی ان ریزولیوشنوں کی تائید و تصدیق کرتی ہے جو ورکنگ کمیٹی نے اس دوران پاس کیے ہیں۔

یہ کمیٹی برطانوی حکومت کے اس فیصلے کا خیر مقدم کرتی ہے کہ آیندہ اگست تک تمام اختیارات ہندوستانیوں کو منتقل کر دیے جائیں گے۔

کانگریس نے برطانوی کیبنٹ مشن کے اعلان مورخہ ۱۶؍مئی ۱۹۴۶ء اور بعد میں کی گئی اس کی تشریح مورخہ ۶؍دسمبر ۱۹۴۶ء کو منظور کر لیا تھا اور اسی کے مطابق وہ کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی میں جو کیبنٹ مشن کی اسکیم کی رو سے قایم کی گئی تھی کام کر رہی ہے۔ وہ اسمبلی چھ ماہ سے زیادہ سے برسر کار ہے اور نہ صرف یہ کہ اس نے ہندوستان کی ایک آزاد خودمختار ری پبلک بنانے اور ایک منصفانہ سماجی اور اقتصادی نظام قایم کرنے کے متعلق اپنے مقاصد کا اعلان کر دیا ہے بلکہ وہ تمام ہندوستانیوں کے لیے آزادی اور مواقع کی برابری کے بنیادی حقوق کے اصول پر آزاد انڈین یونین کے لیے آئین بنانے میں کافی حد تک آگے بڑھ چکی ہے۔

لیکن مسلم لیگ کے ۱۶؍مئی ۱۹۴۶ء کی اسکیم کو ماننے کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی میں شرکت سے انکار کے پیش نظر نیز کانگریس کی اس پالیسی کو سامنے رکھتے ہوئے کہ وہ کسی علاقے کے باشندوں کو ان کے اعلان کردہ اور مسلمہ رائے کے خلاف انڈین یونین میں رہنے کے لیے مجبور کرنے کا خیال بھی نہیں کر سکتی۔ اے۔آئی۔سی۔سی۔ ان تجویزوں کو منظور کرتی ہے جو ۳؍جون کے اعلان میں موجود ہیں اور جن کے ذریعے متعلقہ لوگوں کی مرضی معلوم کرنے کا طریقہ بتلایا

گیا ہے۔ کانگریس متواتر اس بات پر قایم رہی ہے کہ ہندوستان کی ایکتا کو برقرار رکھا جائے۔ کانگریس اپنے جنم دن سے جسے ساٹھ سال سے زیادہ ہوگئے ہیں ایک آزاد اور متحدہ ہندوستان حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرتی رہی ہے اور اس بڑے مقصد کے لیے ہمارے لکھوکھا آدمیوں نے مصیبتیں جھیلی ہیں۔ نہ صرف پچھلی دو مشقتیں اور قربانیاں بلکہ ہندوستان کی طویل تاریخ اور روایت بھی اس لازمی اتحاد کی شاہد ہے۔ ہندوستان کی آج کیا شکل وصورت ہے اور کوئی انسانی ہاتھ اس شکل کو نہ تو بدل سکتا ہے نہ اس کی راہ میں رکاوٹ ڈال سکتا ہے، اقتصادی حالات اور بین الاقوامی معاملات کے شدید تقاضے ہندوستان کی وہ تصویر جس کو عزیز رکھنا ہم نے سیکھا ہے ہمیشہ ہمارے دماغوں اور دلوں میں رہے گی۔ اے. آئی. سی. سی. دلی خواہش کے ساتھ یہ امید رکھتی ہے کہ جب موجودہ جذبات کی شدت کم ہوجائے گی تو ہندوستان کے مسایل صحیح نقطۂ نظر سے دیکھے جائیں گے اور سب لوگ ہندوستان میں دو قوموں کے غلط نظریے کو ناپسند اور ترک کردیں گے۔

۳ر جون ۱۹۴۷ء کی تجویزوں سے اس ملک کے چند حصوں کے ہندوستان سے الگ ہونے کا امکان ہے۔ خواہ یہ امر کتنا ہی قابل افسوس ہو، اے. آئی. سی. سی. موجودہ حالات میں اس امکان کو منظور کرتی ہے۔ اگرچہ آزادی قریب ہے مگر وقتی مشکلات بہت ہیں اور ہندوستان کی صورتِ حال کا تقاضا یہ ہے کہ ہوشیاری سے کام لیا جائے اور جو لوگ ہندوستان کی آزادی کے خواہاں ہیں، ان کی طرف سے ایک متحدہ محاذ پیش کیا جائے۔ اس نازک وقت میں اور تبدیلی کے موقع پر جب کہ غیر محبِ وطن اور سماج کو نقصان پہنچانے والی طاقتیں ہندوستان اور اس کے باشندوں کے کاز کو نقصان پہنچانے کی کوشش کررہی ہیں۔ اے. آئی. سی. سی. ہر کانگریس مین سے اور عام لوگوں سے اپیل کرتی ہے اور ان سے مطالبہ کرتی ہے کہ اپنے چھوٹے چھوٹے اختلافات اور جھگڑوں کو بھول جائیں اور ہوشیار، منظم اور مستعد ہوکر ہندوستان کی آزادی کے کاز کی خدمت کرنے کے لیے اور جو لوگ اس کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں

ان سے اس کو پوری طاقت سے بچانے کے لیے تیار رہیں۔"

(تیج مورخہ ۱۶ر جون ۱۹۴۷)

مولانا ابوالکلام آزاد نے تجویز کی تائید کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ طریقہ کار جو ۳ر جون کے پلان میں پیش کی گیا ہے قطعاً غلط ہے، مگر حالات نے ہر ایک دماغ کو مجبور کر دیا ہے کہ جو حل بھی موجودہ الجھاؤ کو ختم کر سکتا ہے اس کو تسلیم کر لے۔ کانگریس کے سامنے یہ سوال نہیں تھا کہ کون سا منصوبہ منظور کیا جائے بلکہ سوال یہ تھا کہ گومگوں اور غیر اطمینانی کی موجودہ تباہ کن حالت باقی رہے یا سب سے پہلی فرصت میں اس کو ختم کر دیا جائے۔ کانگریس متحدہ ہندوستان کے نظریے سے جدا نہیں ہوئی لیکن وہ حقِ خود ارادیت کو بھی تسلیم کر چکی تھی اور اعلان کر چکی تھی کہ جو علاقے یونین میں شامل نہ ہونا چاہیں انھیں مجبور کرنے کے وہ خلاف ہے۔

بہ ہر حال وجوہات خواہ کچھ ہوں مگر نتیجہ یہ ہے کہ ۳ر جون کو حکومتِ برطانیہ نے تقسیم ہندوستان کا پلان پیش کیا اور ۱۶ر جون تک اس کو لیگ اور کانگریس نے منظور کر لیا (۱)۔ اس پلان کو سامنے رکھ کر اگر ہندو اور مسلمان کے مفادات پر نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت بالکل عیاں ہے کہ اس تقسیم سے ہندو کو غیر متوقع کامیابی حاصل ہوئی اور مسلمانوں کو غیر قابل تلافی نقصان پہنچا۔

مسلمانوں کے حصے میں ہندوستان کے چند گوشے آئے اور باقی تمام زرخیز، آباد اور ایک دوسرے سے متصل ہندوستان پر ہندو کو من مانی حکومت اور ہزاروں برس بعد ایک ایسی پر شوکت اور عظیم الشان سلطنت قایم کرنے کا موقع مل گیا جس کا تصور کرنا بھی اس کے لیے مشکل تھا۔

ہندوستان کے بڑے بڑے شہر اور عظیم الشان بندرگاہیں ہندوؤں کے حصے میں آئیں اور مسلمانوں کی عظمت دیرینہ کا وہ گنجینہ جس کو دہلی کہتے ہیں، بلاشرکت غیرے ہندوؤں کے حوالے ہو گیا۔

این. ڈبلیو. آر اور بی. این. ڈبلیو. آر کے تھوڑے ٹکڑوں کے علاوہ تمام ریلوے لائن، تمام بڑی بڑی فیکٹریاں، تمام کانیں ہندوؤں کے سپرد کر دی گئیں۔

اور سب سے زیادہ یہ نقصان کہ مسلمانانِ ہند کی وحدت ملیہ پارہ پارہ کر دی گئی۔ اس

تقسیم کے بہ موجب ترجمان لیگ (منشور اخبار) کے بیان کے بہ موجب تقریباً پانچ کروڑ مسلمان پاکستان کے دو حصوں میں تقسیم ہوئے اور باقی پانچ کروڑ مسلمان کو ان ایک کروڑ غیر مسلموں کے عوض میں (جو پاکستان کے علاقوں میں آباد ہیں) ہندوستان کے یرغمال میں دے دیا گیا۔

اس پلان پر تبصرہ کرتے ہوئے اخبارِ مدینہ نے لکھا تھا:

"(۱) یہ صحیح ہے کہ یہ علاحدگی مسلمانوں کے مطالبے اور حقِ خود اختیاری کی بنا پر ہوئی، مگر اس سے زیادہ صحیح یہ ہے کہ اس تحریک کو پورے چالیس برس تک انگریزی مقاصد اور مصلحتوں کی رفاقت کا شرف حاصل رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے پہلو بہ پہلو برطانوی شہنشاہیت کے ارکان اور مسٹر چرچل بھی اس خوشی میں برابر کے شریک ہیں۔"

ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ کابینۂ چرچل کے وزیر ہند کی حیثیت سے مسٹر ایمری بار بار یہ ارشاد فرماتے رہیں ہے:

"کانگریس غلطی پر ہے۔ ہندوستان ایسے جداگانہ عناصر کا مجموعہ ہے جن کا اختلاف دنیا کی تاریخ میں بے مثال ہے اور ان میں مسلم قوم سرفہرست ہے، جن کی مردم شماری ۹ کروڑ ہے۔ ہم ایک ضعیف احساسِ محرومی کے ماتحت ہندوستان کو تقسیم کرنے اور اس کے بعد اسے آزاد دیکھنے کے آرزومند ہیں۔

(۲) یہ صحیح ہے کہ ملک کی تقسیم کا اعلان ہو گیا۔ مگر تقسیم کی جو صورت منظور کی گئی وہ مسلم لیگ کے فیصلوں کے خلاف اور کانگریس کے متعمد و منشا اور مطالبے کے مطابق ہے۔ اس صورت میں پنجاب کا سرسبز زراعتی علاقہ کارخانوں کا شہر، صنعتی علاقے اور وہ دریا جن کی وجہ سے پنجاب کا نام پنجاب ہے نکل گئے۔ وہ مغربی بنگال جہاں نیا ہندو صوبہ بن رہا ہے، جوٹ لوہا اور کوئلہ سب اس کے حصے میں آیا۔ اس حصۂ ملک میں ہندوستان کی صنعتوں کا ۳۰ فیصدی حصہ ہے اور اسلامی بنگال میں صرف ۲ء۷ فیصد۔ کلکتہ بنگال کا دل ہے وہ بھی مسلمانوں کے قبضے سے نکل گیا۔

مسلم لیگی تقسیم ہند کی خوشی میں اس امر کو بھول گئے کہ یہ خوشی انھوں نے

ایک کروڑ مسلمانوں کو قربان کرکے حاصل کی ہے، جن کے دل مرجھا ہوئے ہیں اور جو سب سے الگ اپنی قسمت پر از سرِ نو غور کر رہے ہیں۔''

(مدینہ ۱۳؍ جون ۱۹۴۷ء، بہ حوالہ علمائے حق اوران کے مجاہدانہ کارنامے (حصہ دوم) از مولانا محمد میاںؒ)

حاشیہ ❶: مسٹر پرشوتم داس ٹنڈن اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب وغیرہ نے اس تجویز کی مخالفت کی اور چوں کہ ''شاہ پاکستان'' کے چوب داروں کی طرح انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس میں مخالفین کا منہ بند کرنے والے چوب دار بہ اصلاح شور رضا کار نہیں رہتے، اس لیے مخالفت نے یہ شان پیدا کرلی کہ کانگریس کے دیوتاؤں کو ''مہادیو گاندھی جی'' کی پناہ لینی پڑی۔ چناں چہ گاندھی جی نے تشریف لاکر چالیس منٹ تقریر کی، مگر ثابت یہ ہوا کہ گاندھی جی بھی اس تجویز کی تائید میں اس کے سوا کوئی دلیل نہیں رکھتے تھے کہ ورکنگ کمیٹی اس کو منظور کرچکی ہے اور اگر آپ نے اس کو مسترد کردیا تو ورکنگ کمیٹی کو بھی مستعفی ہونا پڑے گا اور موجودہ گورنمنٹ بھی مستعفی ہوجائے گی۔ پھر آپ کے پاس ایسے آدمی نہیں ہیں جو کانگریس اور گورنمنٹ کو سنبھال سکیں۔

آپ نے دوسری بات یہ فرمائی کہ میں تسلیم کرتا ہوں کہ جو چیز منظور کی گئی ہے اچھی نہیں! لیکن مجھے یقین ہے کہ اس سے اچھائی ہی کا ظہور ہوگا اور امید ہے کہ کل ہند کانگریس اس ناقص تجویز سے اسی طرح اچھائی حاصل کرلے گی جس طرح مٹی سے سونا نکالا جاتا ہے۔ بہرحال گاندھی جی کی اپیل پر ہاؤس کے خیالات میں دوبارہ تبدیلی ہوئی۔ (محمد میاں)

محمد فاروق قریشی (ایڈوکیٹ لاہور) کا تبصرہ:

مولانا کہتے ہیں:

''تجویز تو منظور ہوگئی، لیکن لوگوں کا حال کیا تھا؟ تقسیم کے خیال سے ہی دل غمگین ہورہے تھے۔ شاید ہی ایسا کوئی شخص ہوگا جس نے تحفظاتِ ذہنی کے بغیر اسے تسلیم کیا ہو۔ جن لوگوں نے تقسیم کو منظور کیا تھا خود ان کے جذبات اس کے خلاف تھے۔ اس سے بدتر وہ فرقہ وارانہ پروپیگنڈا تھا جس کا ہر طرف چرچا ہورہا تھا۔ بعض حلقوں میں اعلانیہ یہ بات کہی جارہی تھی کہ پاکستان کے ہندوؤں کو ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں، کیوں کہ ہندوستان میں ساڑھے چار کروڑ مسلمان ہیں، اگر پاکستان کے ہندوؤں پر کسی قسم کا ظلم ہوا تو اس کا خمیازہ

ہندوستان کے مسلمانوں کو بھگتنا پڑے گا..... جب یہ باتیں پہلے پہل سننے میں آئیں تو مجھے بہت صدمہ ہوا، میں نے فوراً محسوس کیا کہ یہ ایک نہایت خطرناک جذبہ ہے جس کے نتائج بہت زیادہ خطرناک ہوں گے اور نقصان کا سلسلہ دور تک چلے گا۔ اس جذبے کی پشت پر یہ خیال تھا کہ ملک کی تقسیم اس شرط کے ساتھ تسلیم کی جارہی ہے کہ ہندوستان اور پاکستان اپنی اپنی طرف اقلیت کو یرغمال کے طور پر رکھیں گے تاکہ ایک اقلیت دوسری اقلیت کی ضامن ٹھہرائی جاسکے۔ مجھے اقلیتوں کے تحفظ کو انتقام پر منحصر کرنے کا یہ نظریہ بہت وحشیانہ معلوم ہوا۔ بعد کے واقعات نے میرے اندیشوں کو حق بہ جانب ثابت کیا۔ تقسیم کے بعد نئی سرحد کے دونوں جانب خون کی جو ندیاں بہہ گئیں وہ یرغمال رکھنے اور انتقام لینے کے جذبے کا نتیجہ تھیں۔"

بنگال کے ایک کانگریسی لیڈر کرن شنکر رائے نے پہلی مرتبہ مولانا کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔ انھوں نے کانگریس کے صدر اچاریہ کرپلانی سے بھی گفتگو کی اور انھیں بتایا کہ یہ نظریہ بہت خطرناک ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پاکستان میں ہندو اور ہندوستان میں مسلمان ظلم کی چکی میں پسیں گے، لیکن کرن شنکر رائے کی بات کسی نے نہیں سنی۔ بہتوں نے اس کا مذاق اڑایا..... کرن شنکر مایوس ہوکر مولانا کے پاس آئے، ان کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے، انھوں نے کانگریس کے لیڈروں کی یقین دہانیوں کی کوئی وقعت نہ دی۔

چودھری محمد علی لکھتے ہیں:

"آزاد نے صراحت تو نہیں کی کہ کون سے حلقے یرغمال کے اس نظریے کو پیش کررہے تھے، لیکن یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اس کا اشارہ پٹیل، کرپلانی (جو سندھ سے تھا) اور دوسرے متشدد مسلم دشمن لیڈروں کی طرف تھا۔ مسلمانوں میں بھی کچھ ایسے لوگ تھے، جو باہمی یرغمال نظریے کے قایل تھے، لیکن یہ بہت احمقانہ اور غیر ذمے دارانہ گفتگو تھی، کیوں کہ اخلاقی اور انسانی اقدار سے قطع نظر پاکستان میں غیر مسلموں کے مقابلے میں ہندوستان میں مسلمان تعداد کے اعتبار سے تین گنا زیادہ تھے۔ قایداعظم خود ہر مناسب موقع پر اس بات پر زور دیتے رہے کہ غیر مسلم اقلیت کو پاکستان کے شہریوں کے طور

پر مساوی حقوق حاصل ہوں گے اور وہ قانون کی پوری حفاظت کے حق دار ہوں گے۔"

دراصل چودھری محمد علی نے اپنا دامن بچانے کے لیے تجاہل عارفانہ سے کام لیا ہے۔ ان کی نظر سے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس کی کارروائی ضرور گزری ہوگی، جس میں ماؤنٹ بیٹن پلان کو کثرت رائے سے منظور کیا تھا (۹ رجون ۱۹۴۷ء) اس اجلاس میں امرتسر کے کونسلر ملک غلام نبی ایم.اے. نے جو تقریر کی وہ تشدد اور انتقام کے جذبات سے لبریز تھی، انھوں نے مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو خوف زدہ نہ ہونے کی ہدایت کی۔ مسٹر لاری کو بہ طور خاص مخاطب کیا، کیوں کہ انھوں نے بعض اندیشوں کا اظہار کیا تھا۔ فرماتے ہیں:

"مسٹر لاری کی طرح میں بھی مسلم اقلیتی علاقے کا باشندہ ہوں، اس کے باوجود میں ناتواں نہیں ہوں۔ اب صورت حال یہ ہے کہ اگر سکھ چند مسلمانوں کو قتل کرتے ہیں تو ہم فوراً زیادہ سکھوں کو موت کے گھاٹ اتار کر انتقام لیتے ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہمارے پاس بہترین سپاہی ہیں، ہمارے پاس ہتھیاروں کی کمی ہے، پاکستان کے حصول کے بعد یہ دور ہو جائے گی۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہندوستان میں کسی جگہ بھی مسلمانوں سے برا سلوک ہوا تو حکومت پاکستان ہمیشہ انتقام لینے کے لیے تیار ہوگی اور اگر ضروری ہوا تو مسلمان بدلہ لینے کے لیے سرحدات کو عبور کر جائیں گے۔ پنجاب کے اس حصے کا ہمیں ذرہ برابر ملال نہیں ہے جو پاکستان سے کٹ گیا، جوں ہی انگریزوں نے ہندوستان سے رخت سفر باندھا یہ علاقہ یا تو رضا کارانہ طور پر خالی ہو جائے گا یا پھر مکمل طور پر تباہ ہو جائے گا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں ہم تمام کارروائیوں کا پورا بدلہ لیں گے، جن کا ارتکاب ہندوستانی ریاستیں کریں گی۔ ہمیں صرف ایک مرتبہ آزادی کی فضا میں سانس لینے کا موقع دیں۔"

یہ تلخ اور انتقامی جذبات سے بھرپور تشدد آمیز تقریر فاضل مقرر نے جناح کی موجودگی میں کی، لیکن نہ تو مسٹر جناح نے بہ ذات خود نہ نواب زادہ لیاقت علی خاں نے اور نہ

ہی کسی اور ذمے دار مسلم لیگی نے اس غیر ذمے دارانہ شر انگیز تقریر کا نوٹس لیا، مقرر کو ٹوکا یا روکا اور نہ ہی تردید کی۔ مسٹر جناح کی صدارت میں ہونے والی تقریر پر صاحب صدر کی خاموشی تائید کے مترادف ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں مسٹر جناح نے اقلیتوں کا اعتماد بہ حال کرنے کے لیے گراں قدر یقین دہانیاں کرائیں۔ ۱۱؍اگست ۱۹۴۷ء کی آئین ساز اسمبلی میں ان کی تقریر تاریخی نوعیت کی نہایت اہم ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ فرقہ وارانہ تلخی کشیدگی اور خون ریز فسادات کے باوجود اقلیتوں کے خدشات دور کرنے کے لیے کوئی قانون سازی نہ ہوئی۔ حال آں کہ مولانا آزاد نے ۲۹؍ جولائی ۱۹۴۷ء کو تجویز پیش کی تھی کہ دونوں آئین ساز اسمبلیوں کا مشترکہ اجلاس بلا کر اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے متفقہ منشور تیار کرلیا جائے، لیکن اس جانب کسی کو توجہ دینے کی فرصت نہ تھی۔ اس قسم کی صدائے بازگشت آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس ۹؍جون میں بھی سنائی دی تھی، لیکن ان کی منی پر حقیقت استدعا جذباتی مقررین کی آتش بیانی کی نذر ہوگئی۔ مولانا کے متذکرہ بالا بیان کی مزید تفصیل روزنامہ ''قومی آواز'' لکھنؤ نے شایع کی ہے۔ انھوں نے عوام کو ہدایت کی:

> ''۳؍جون کے اعلان کو منظور کرلینے تک اور اس سے پہلے جو کچھ ہوا اس کو داستان ماضی سمجھنا چاہیے۔ میں جانتا ہوں کہ اس منصوبے میں بدیہی اور نمایاں خرابیاں موجود ہیں، لیکن موجودہ حالت میں اس کے سوا اور کوئی شکل ممکن نہ تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ اس منصوبے نے ایک ایسے مسئلے کو صاف کردیا ہے جسے قومی ترقی کے لیے حل کرنا انتہائی ضروری تھا۔ اب ہمیں ماضی کو فراموش کر کے مستقبل کی فکر کرنی چاہیے۔ جون کا اعلان اب مسلمہ حقیقت ہے۔ اس منصوبے کی شرایط کے مطابق بنگال اور پنجاب کی تقسیم بھی ہو چکی ہے۔ ایک مرتبہ جب عوام اور ان کے نمایندے کوئی فیصلہ کریں تو پھر ماضی کے متعلق سوچتے رہنا، گذشتہ سوالات کو اٹھانا اور ایک بار پھر تذبذب، تلخی اور تنازعے پیدا کرنا بہت بڑی غلطی ہوگی۔ اب دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ساری توجہ مستقبل پر مرکوز کردیں اور تمام متعلقہ فرقوں کے لیے حفاظت امن اور ترقی کا ایک نیا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

یہ بات یقیناً قابل افسوس ہے کہ ہندوستان کی قوم پروری کی کامیابی کا جب موقع آیا تو فرقہ وارانہ کشیدگی نے اس فتح کو ایک حد تک مسخ کر دیا، لیکن اس کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان نے ایسے ماحول اور حالت میں آزادی حاصل کی ہے جس کی مثال تاریخ میں نہیں پائی جاتی۔" (ابوالکلام آزاد اور......: ص ۳-۵۰۰)

۱۵ر جون ۱۹۴۷ء: کو مہاتما گاندھی نے نئی دہلی میں اپنی پرارتھنا کے دوران تقریر میں کہ

"ان دونوں ریاستوں (حیدر آباد، کشمیر) کو میرا مشورہ ہے کہ جغرافیائی لحاظ سے حیدر آباد ہندوستان میں شامل ہو جائے اور کشمیر پاکستان سے الحاق کر لے۔" (کاروانِ احرار: جلد ۸، ص ۳۱۸)

۱۵ر جون ۱۹۴۷ء: دہلی، ۲۸ر مئی، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی مدظلہٗ کی جانب سے مہتر چترال سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ مسلمانانِ ریاست کی شکایات جلد دور کریں۔ اس کے جواب میں حسبِ ذیل تار موصول ہوا ہے:

"تار ملا۔ یہاں ہر کام شریعت کے مطابق ہوتا ہے۔ آپ کو کسی نے غلط اطلاع دی تھی۔ مہتر چترال۔"

اس تار کے جواب میں حضرت مولانا مدنی مدظلہٗ کی طرف سے حسبِ ذیل تار بھیجا گیا ہے:

"بہ خدمت مہتر چترال! تار کا جواب موصول ہوا، شکریہ! براہِ مہربانی جمعیت علما کے کارکنوں کو رہا کیجیے۔ جیسے کہ مولانا نور الشاہدین صاحب، محمد شریف صاحب، محمد عاقل صاحب، حمروز خان اور دیگر صاحبان جن کو بغیر مقدمہ چلائے ہوئے قید کر دیا گیا ہے۔

حسین احمد

صدر جمعیت علمائے ہند (دہلی)"

(مرسلہ سید انیس الحسن۔ زمزم-لاہور: ۱۵ر جون ۱۹۴۷ء، ص ۴)

۱۵ر جون ۱۹۴۷ء: پنجاب کے مختلف اضلاع میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کی سیاسی پوزیشن کیا ہے؟ (زمزم-لاہور: ۱۵ر جون ۱۹۴۷ء)

۱۷ر جون ۱۹۴۷ء: مسلم لیگ کے صدر قایدِ اعظم محمد علی جناح نے ۱۷ر جون ۱۹۴۷ء کو نئی دہلی سے اعلان کر دیا کہ

''اقتدار اعلا کے ختم ہونے پر ہندوستانی ریاستیں اس امر میں آزاد ہوں گی کہ خواہ ہندوستان دستور ساز اسمبلی میں شریک ہوں خواہ پاکستان دستور ساز اسمبلی میں، اور چاہیں تو کسی میں شریک نہ ہوں، اور آزاد رہنا چاہیں تو یہ ان کی مرضی ہے۔

مسلم لیگ کی یہی پالیسی ہے، اس کے متعلق کسی قسم کی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔'' (روزنامہ انقلاب-لاہور: ۲۰ر جون ۱۹۴۷ء)

(بحوالۂ کاروانِ احرار: جلد ۸، ص ۱۸-۳۱۷)

بنگال کی تقسیم کا فیصلہ:

۲۰ر جون ۱۹۴۷ء: گورنر جنرل کے فرمان کے مطابق گورنر نے صوبائی اسمبلی کا اجلاس ۲۰ر جون ۱۹۴۷ء کو بلایا۔ اجلاس میں مسلم لیگ کی جانب سے قرارداد پیش کی گئی جس کا مقصد پورے بنگال کو نئی آئین ساز اسمبلی میں شامل کرنا تھا۔ قرارداد کے حق میں ۱۲۶- اور مخالفت میں ۹۰ ووٹ پڑے، لیکن مجوزہ طریقۂ کار کے مطابق مغربی بنگال کے اراکین اسمبلی کا اجلاس اسی روز علاحدہ ہوا، جس میں کثرت رائے سے فیصلہ ہوا کہ مغربی بنگال موجودہ آئین ساز اسمبلی (ہندوستان) میں شامل ہوا۔ اس کے حق میں ۵۱ جب کہ مخالفت میں ۲۱ ووٹ پڑے۔ مشرقی بنگال کے ممبروں کا علاحدہ اجلاس ہوا۔ ۱۰۶ ممبروں کی رائے تھی کہ بنگال کو تقسیم نہ کیا جائے۔ اس کے خلاف ۳۵ ممبروں نے ووٹ دیا۔ تقسیم کی صورت میں مشرقی بنگال کو پاکستان میں شامل کرنے کے حق میں ۱۰۷ ووٹ ڈالے گئے اور ۳۴ ممبروں نے خلاف ووٹ دیا۔ (ابوالکلام آزاد اور......: ص ۵۰۸)

پنجاب:

۲۳ر جون ۱۹۴۷ء: پنجاب کی صوبائی اسمبلی کا اجلاس پولیس کے بھاری پہرے میں شروع ہوا۔ (۲۳ر جون) اسمبلی کی طرف جانے والے راستوں پر خاردار تاروں سے رکاوٹیں کھڑی کی گئی تھیں۔ خبر رساں ایجنسی رائٹر کی اطلاع کے مطابق لاہور کے وسیع

علاقوں اور صوبے کے بیسیوں دیہاتوں میں تباہی مچی ہوئی تھی، پنجاب اسمبلی کے ۱۶۸ ممبر صوبے کی تقدیر کا فیصلہ کرنے کے لیے اسمبلی کی لابی میں قہقہوں اور لطیفہ بازی میں محو ایک دوسرے سے مصافحہ کر رہے تھے۔ عوام کو اسمبلی میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ صرف ملکی اور غیر ملکی اخباری نمایندے اندر جا سکتے تھے۔ مشترکہ اجلاس میں ۹۱ ممبروں نے صوبے کو متحدر کھنے اور علاحدہ نئی آئین ساز اسمبلی میں شریک ہونے کے حق مین ووٹ دیا، ان میں آٹھ یونی نسٹ مسلمان ممبر بھی شامل تھے۔ جن کا تعلق خضر حیات خان ٹوانہ کے ساتھ تھا۔ بیس منٹ کے وقفے سے مشرقی پنجاب کے اضلاع کے ۷۲ ممبروں نے علاحدہ اجلاس کیا، اس میں مسلم لیگ کے رہنما نواب افتخار حسین ممدوٹ نے ایک قرارداد پیش کی جس کا مقصد صوبے کو متحد رکھنا تھا۔ یہ قرارداد پچاس ووٹوں سے مسترد کر دی گئی، اس کے حق میں صرف ۲۲ ووٹ پڑے۔ جب ہندوستان سے الحاق کے لیے رائے لی گئی تو ۷۷ ممبروں نے اس کے حق میں ووٹ دیئے۔ ان میں ہندو، سکھ اور شیڈولڈ کاسٹ شامل تھے۔ مغربی پنجاب کے اضلاع کے علاحدہ اجلاس میں صوبے کو متحدر کھنے کی قرارداد ۲۷ کے مقابلے میں ۶۹ ووٹوں سے منظور کر لی گئی اور اسی اکثریت نے نئی آئین ساز اسمبلی میں شمولیت کے حق میں ووٹ دیا۔ (ابوالکلام آزاد اور.........: ص ۵۰۹)

۲۴، ۲۵ر جون ۱۹۴۷ء: جمعیت علماے ہند کی مجلس عاملہ کا ایک اہم اجلاس مرکزیہ کے دفتر دہلی میں ۲۴، ۲۵ر جون کو حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اجلاس میں ارکان علما میں سے حضرت شیخ الاسلام کے علاوہ مندرجۂ ذیل حضرات نے شرکت فرمائی:

مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ صاحب،	حضرت مولانا احمد سعید صاحب،
حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب،	حضرت مولانا مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی،
مولانا سید محمد شاہد صاحب فاخری،	مولانا نور الدین صاحب بہاری،
مولانا بشیر احمد صاحب،	مولانا عبد الحلیم صاحب صدیقی،
حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب،	(مولانا) محمد میاں ناظم جمعیت علماے ہند۔

مجلس عاملہ کے اراکین کے علاوہ اجلاس میں ملک کے بعض زعما، جمعیت کے دیگر رہنماؤں اور بعض اہلِ علم اور اصحابِ فکر کو خاص طور پر شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ ان میں.

سے چند شرکا کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

اراکین محترم کے علاوہ حسبِ ذیل حضرات نے خاص دعوت پر شرکت فرمائی۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی، جناب قاضی محمد احمد صاحب کاظمی،

نورالرحمٰن صاحب قدوائی، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب،

محمد جعفری صاحب، مولانا محمد میاں صاحب فاروقی (الہ آباد)

مولانا ابوالوفا صاحب شاہ جہان پوری، جناب قاضی بدرالحسن صاحب جلالی،

خواجہ اطہر حسن صاحب سہارن پور، مولانا محمد قاسم صاحب شاہ جہان پوری،

مولانا حامد الانصاری غازی- ایڈیٹر مدینہ، مولانا محمد کامل صاحب کلکتہ۔

اجلاس میں سب سے اہم تجویز ۳ر جون کے ماؤنٹ بیٹن کے منصوبہ تقسیم ملک کے بارے میں تھی۔اس سلسلے میں تمام ارکانِ عاملہ اور تمام شرکا کی متفقہ رائے تھی کہ تقسیم ملک کا فیصلہ نہ بہترین سیاسی فیصلہ ہے اور نہ مسلمانوں کے اجتماعی، ملّی مفاد کے نقطۂ نظر سے یہ صحیح فیصلہ ہے۔یہ فیصلہ کوئی مسئلہ حل نہیں کرتا لیکن بے شمار مسایل نئے کھڑے کر دیتا ہے۔جن کا کوئی حل نظر نہیں آتا۔اجلاس کی تین طویل نشستوں میں کامل غور وفکر اور بحث وتمحیص کے بعد حسبِ ذیل تجاویز پاس کی گئیں اور ان کے اعلان اور زیادہ سے زیادہ تشہیر کا فیصلہ کیا گیا۔

(۱) جمعیت علمائے ہند کی مجلسِ عاملہ کا یہ جلسہ اس حقیقت کو واضح کر دینا چاہتا ہے کہ جمعیت علمائے ہند نے ہمیشہ اس امر کا اعلان کیا ہے کہ جمعیت علما کا نصب العین ہندوستان کے لیے مکمل آزادی حاصل کرنا ہے۔

اور نیز یہ کہ ہندوستان کو تقسیم کرنا باشندگانِ ہندوستان کے لیے عموماً اور مسلمانانِ ہند کے لیے خصوصاً سخت مضرت رساں اور نقصان دہ ہے۔

چوں کہ جمعیت علما کی یہ پختہ رائے ہے، اس لیے یہ جلسہ ایک دفعہ پھر مسلمانانِ ہند کو تنبیہ کرتا ہے کہ اس ملک کی تقسیم مسلمانوں کے لیے انتہائی تکلیف دہ اور مہلک ثابت ہوگی۔

اس جلسے کی رائے میں مسلم حقوق کے تحفظ اور مسلمانوں کے سیاسی اور اقتصادی بچاؤ کی صحیح شکل وہی ہو سکتی تھی جو جمعیت علمائے نے اپنے فارمولے میں پیش کی تھی۔

یہ جلسہ اپنے اس پختہ عقیدے اور مضبوط رائے کا اظہار کرتے ہوئے گورنمنٹ برطانیہ کے اس پلان سے اپنی دلی بے زاری کا اظہار کرتا ہے جو گورنمنٹ برطانیہ نے ۳ر

جون کو ہندوستانی لیڈروں کے حوالے کیا ہے۔

اس پلان میں نہ تو مکمل آزادی کا کوئی ذکر ہے اور نہ ہندوستان کی وحدت قایم رکھی گئی ہے، اس پلان میں نہ صرف یہ کہ ملک کو تقسیم کیا گیا ہے بلکہ پنجاب و بنگال کے بھی ٹکڑے کردیے گئے ہیں اور ہندوستانیوں میں باہمی منافرت بڑھا کر حکومتِ برطانیہ یا کسی اور اجنبی طاقت کو ہندوستان اور پاکستان میں مداخلت کے لیے آسانی پیدا کرتا ہے۔

اس پلان کی وجہ سے ہندوستان کی وحدت ہی پارہ پارہ نہیں ہوتی بلکہ اس کی وجہ سے مسلمانانِ ہندوستان بھی تین حصوں میں تقسیم ہو گئے ہیں اور تقریباً پانچ کروڑ مسلمان ایک ایسی اکثریت کے حوالے کر دیے گئے ہیں جس کی تعداد ۲۵ کروڑ ہے۔

مسلمانوں کی یہ تباہی اور بے کسی اس غلط اور مستبدانہ رہنمائی کا نتیجہ ہے جس میں ایک عرصے سے وہ گمراہانہ طور پر مبتلا ہیں۔

اگر اس قسم کی نقصان دہ تقسیم ہی کو قبول کرنا تھا تو اس کا بہترین موقع وہ تھا جب کہ مسٹر گاندھی اور مسٹر راج گوپال آچاریہ اس تقسیم کی پیش کش کر رہے تھے یا اس کے لیے وہ وقت مناسب تھا جب کہ کیبنٹ مشن سے گفتگو ہو رہی تھی، لیکن اس وقت اس پاکستان کو ''چھلکا'' اور ''سایہ'' کہہ کر مسٹر جناح نے ردّ کر دیا تھا۔

اگر یہ چھوٹا اور بے حقیقت پاکستان اس وقت قبول کر لیا جاتا تو یقیناً ملک وحشیانہ قتل و غارت گری میں مبتلا نہ ہوتا اور ہزاروں بے گناہ مسلمان تباہ و برباد ہونے سے محفوظ رہتے۔

اس جلسے کی یہ قطعی رائے ہے کہ تقریباً پانچ کروڑ مسلمانوں کو ایک خطرناک حالت میں مبتلا کرانے کی تمام تر ذمہ داری مسلم لیگ کی اس غیر جمہوری اور مستبدانہ پالیسی پر عاید ہوتی ہے جو اس کا عام طرزِ عمل ہے، جمعیت علما کے نزدیک یہ ایک حقیقت ہے کہ کانگریس نے اس تقسیم کو منظور کر کے ملک کے مفاد کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے اور اپنے اصول سے کھلا انحراف کیا ہے۔

جمعیت علماے ہند کی مجلسِ عاملہ کا یہ جلسہ اس امر کو واضح کرنا ضروری سمجھتا ہے کہ جمعیت علما اپنے نصب العین مکمل آزادی کو حاصل کرنے کی جدوجہد اس وقت تک جاری رکھے گی جب تک کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو جاتی، تاہم چوں کہ اب ملک کی تقسیم ہو چکی ہے اور متعلقہ پارٹیوں نے اس کو منظور کر لیا ہے اس لیے مجلسِ عاملہ کا یہ جلسہ اپنی تمام

جماعتوں اور ماتحت شاخوں کو خواہ وہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں ہوں یا مسلم اقلیت کے صوبوں میں، یہ ہدایت کرتا ہے کہ وہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی غرض سے اصلاحی اور تعمیری کاموں پر توجہ کریں اور اس سلسلے میں حسبِ ضرورت مرکزی دفتر سے ہدایات حاصل کرتے رہیں۔

(۲) مجلسِ عاملہ کا یہ اجلاس بلوچستان کے استصواب رائے کے متعلق جمعیت علمائے صوبہ بلوچستان کو اختیار دیتا ہے کہ وہ مسلم مفاد کے پیشِ نظر اپنی صواب دید کے مطابق فیصلہ کرے۔

(۳) جمعیت علمائے ہند کی مجلسِ عاملہ کا یہ اجلاس ایسی حالت میں جب کہ صوبہ سرحد کے تمام رائے دہندوں کی اکثریت نے ابھی گذشتہ انتخابات کے موقع پر پاکستان کے خلاف اپنی آخری اور فیصلہ کن رائے کا اظہار کر دیا تھا اور اس وقت حکومت نے ان ہی انتخابات کے نتائج کی بنیاد پر ملک کی آزادی کی تعمیر کا وعدہ کیا تھا، اب گورنمنٹ برطانیہ کے پنجاب و بنگال کے طریقے کے برعکس اس صوبے میں استصواب رائے عامہ کے جدید شاخسانہ کو خلافِ قانون اور کھلی بے انصافی و جنبہ داری خیال کرتا ہے۔

مجلسِ عاملہ کی رائے میں حکومتِ برطانیہ کا یہ اقدام اور متعلقہ جماعتوں کا اس کو قبول کرنا باشندگانِ سرحد کی آزادیٔ رائے پر نا قابلِ تلافی ظلم ہے۔

اس کے باوجود بھی حکومتِ برطانیہ کو اگر بہ حالاتِ موجودہ سرحد میں رائے عامہ معلوم کرنے پر اصرار ہے تو باشندگانِ سرحد کو صرف پاکستان اور ہندوستان میں محدود کرنے کی بجائے آیندہ طرزِ حکومت سے متعلق رائے کی پوری آزادی ہونی چاہیے کہ وہ اپنے لیے جس قسم کی حکومت پسند کریں اختیار کریں۔

(۴) جمعیت علمائے ہند کی مجلسِ عاملہ کے اس اجلاس نے سلہٹ کے بارے میں کافی غور و خوض کیا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ سلہٹ کے مشرقی بنگال میں شامل ہو جانے سے مشرقی بنگال کی مسلم اکثریت کو تو محض ایک جزوی نفع پہنچتا ہے جب کہ سلہٹ کے آسام سے نکل جانے کے باعث آسام کی مسلم آبادی اس قدر قلیل اقلیت میں رہ جائے گی کہ صوبہ مذکور میں اس کی آواز بے اثر ہو کر رہ جائے گی۔ اس لیے اس مجلس کی رائے میں مسلم مفاد کے پیشِ نظر سلہٹ کا آسام میں شامل رہنا مشرقی بنگال میں شامل ہونے کے مقابلے میں

زیادہ نفع بخش ہے۔

(۵) جمعیت علماے ہند کی مجلسِ عاملہ کا یہ جلسہ مسلم اقلیت کے تقریباً پانچ کروڑ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت اوران کے مذہبی تحفظ کے پیشِ نظراس امر کوضروری سمجھتا ہے کہ جلداز جلد مسلم اقلیت والے صوبوں کے مسلمانوں کی ایک عام کانفرنس بلائی جائے اوراس میں مسلمانوں کے مذکورہ بالا امور پرغور کیا جائے۔

یہ جلسہ دفتر کو اختیار دیتا ہے کہ وہ اس سلسلے میں ضروری اور مناسب کارروائی کرے۔'' مولانا محمد میاں ناظم جمعیت علماے ہند۔دہلی (جمعیت علما کیا ہے؟ (حصۂ دوم)۱۶-۱۴)

۲۵ر جون ۱۹۴۷ء: ۲۵ر جون۔نئی دہلی (اےپ) سے اطلاع ملی کہ ڈیفنس ہیڈکوارٹر میں فیلڈ مارشل منٹگمری اورسر کلاڈ آکنلک کمانڈرانچیف افواج ہند کے درمیان ایک کانفرنس ہوئی،جس میں افواج کی تقسیم اور ہندوستان کے دفاع سے متعلق مسایل زیرِ بحث لائے گئے۔

مارشل منٹگمری کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ہندوستان تقسیم ہوگا۔ ہندوستان کس طرح برطانوی سلطنت کی دفاعی اسکیم میں کھپ سکتا ہے؟ اس سلسلے میں اُس نے پنڈت نہرواور دوسرے کانگریسی لیڈروں سے ملاقات کی۔ دوران ملاقات اس بات پر زور دیا کہ ہندوستان اور پاکستان کی افواج مشترک ہو۔لیکن کانگریسی لیڈر نے کہا کہ ایسا کرنا مشکل ہے۔کیوں کہ مسٹر جناح کا رویہ جوظاہر کرتا ہے،وہ ہندوستانی یونین سے تعاون نہیں کرنا چاہتے بلکہ وہ دوسری ریاستوں کواپنا حلیف بنارہے ہیں۔(کاروانِ احرار: جلد ۸،ص ۳۱۹)

سندھ:

۲۶ر جون ۱۹۴۷ء: ۲۶ر جون کے خاص اجلاس میں صوبہ سندھ کی اسمبلی نے ۲۰ ووٹوں کے مقابلے میں ۳۳ ووٹوں سے پاکستان کی نئی آئین ساز اسمبلی سے الحاق کا فیصلہ کیا۔

بلوچستان:

بلوچستان کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لیے شاہی جرگہ اور کوئٹہ میونسپل کمیٹی کا

مشترکہ اجلاس ہوا۔ شاہی جرگے کے تین ممبروں اور کوئٹہ کے دس میں سے پانچ ممبروں نے اجلاس میں شرکت نہ کی، بقایا ۵۴ ممبروں نے متفقہ طور پر پاکستان میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔ (ابوالکلام آزاد اور......... ص ۵۰۹)

ڈاکومنٹ نمبر ۳۹۶: ریئر ایڈمرل وائسکاؤنٹ ماؤنٹ بیٹن آف برما کے نام مسٹر گاندھی کا مراسلہ

۲۸-۲۹ / جون ۱۹۴۷ء

پیارے دوست!

میں آپ کو ایک اور خط ارسال کر رہا ہوں — اس مرتبہ اس کا تعلق صوبہ سرحد کے ریفرنڈم سے ہے۔

باچا خان نے مجھے لکھا ہے کہ انھوں نے اس منصوبے پر عمل درآمد شروع کر دیا ہے جس پر میں نے آپ اور قائد اعظم سے گفتگو کی تھی۔ وہ منصوبہ یہ تھا کہ آزاد پٹھانستان کی تحریک شروع کی جائے جس کا اپنا آئین ہو اور جب پاکستان اور ہندوستان کی یونین کے دساتیر تشکیل پا جائیں تو اس وقت آزاد پٹھانستان کی ریاست کسی ایک مملکت کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کرے۔ لیکن انھیں (باچا خان) اس مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اس لیے ریفرنڈم میں ان کے پیروکار شرکت نہیں کریں گے اور وہ اپنا ووٹ کسی کے حق میں استعمال نہیں کریں گے۔ انھیں پوری طرح معلوم ہے کہ اس طرح صوبہ سرحد اغلباً پاکستان میں شامل ہو جائے گا۔

انھوں نے اس خواہش کا اظہار بھی کیا ہے کہ میں آپ کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کراؤں کہ پنجاب سے مسلمان مرد اور عورتیں بڑی تعداد میں لائے جا رہے ہیں تا کہ صوبے کے ریفرنڈم کو متاثر کیا جائے۔ اور اہم قابل توجہ یہ ہے کہ وہ مسلمان جو صوبہ سرحد کے باشندے نہیں ہیں انھیں صوبے میں اسی مقصد کے لیے بھیجا گیا ہے۔ اس سے صوبے میں خون ریزی کے اندیشے میں اضافہ ہو گیا ہے۔

انھوں نے مزید کہا ہے کہ ہزاروں غیر مسلموں کو بھی ریفرنڈم میں حصہ لینے کا موقعہ نہیں ملے گا، انھیں دھمکیاں دی جاتی ہیں کہ اگر انھوں نے اپنی رائے استعمال کی تو انھیں سزا کا سامنا کرنا پڑے گا۔

میں نے آج کے اخبارات میں پڑھا ہے کہ قایداعظم جناح نے یہ تنازعہ کھڑا کیا ہے کہ اگر پٹھانوں نے راے دینے سے گریز کیا تو یہ ریفرنڈم کی شرایط شکنی ہوگا۔ مجھے اس بحث میں وزن نظر نہیں آتا۔

آپ کا مخلص

ایم۔ کے۔ گاندھی

(تحریک پاکستان اور اشتعال اقتدار: ص ۷۷-۱۷۷)

۲۹ر جون ۱۹۴۷ء: حضرت مولانا ابوالکلام صاحب آزاد نے ۲۹ر جون ۱۹۴۷ء کو دونوں ڈومینیوں کی دستوری اسمبلیوں کو مشورہ دیا کہ وہ مشترک اجلاس کر کے اقلیتوں کے متعلق متفقہ منشور مرتب کرلیں۔

آپ نے فرمایا:

"۳ر جون کے اعلان کو منظور کر لینے تک اور اس سے پہلے جو کچھ ہوا اس کو داستان ماضی سمجھنا چاہیے۔

میں جانتا ہوں کہ اس منصوبے میں بدیہی اور نمایاں خرابیاں موجود ہیں لیکن موجود حالات میں اس کے سوا اور کوئی شکل ممکن نہ تھی۔

یہ حقیقت ہے کہ اس منصوبے نے ایک ایسے مسئلے کو صاف کر دیا ہے جسے قومی ترقی کے لیے حل کرنا انتہائی ضروری تھا۔ ہمیں اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ ہم ماضی کو بھول کر مستقبل کی فکر کریں۔

۳ر جون کا اعلان اب مسلمہ حقیقت ہے۔ اس منصوبے کی شرایط کے مطابق بنگال اور پنجاب کی تقسیم بھی ہو چکی۔ ایک مرتبہ جب عوام اور ان کے نمایندے کوئی فیصلہ کرلیں تو پھر ماضی کے متعلق سوچتے رہنا، گذشتہ سوالات کو اٹھانا اور ایک بار پھر تذبذب، تلخی اور تنازعے پیدا کرنا بہت بڑی غلطی ہوگی۔

اب دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنی تمام توجہ مستقبل پر مرکوز کر دیں اور تمام متعلقہ فرقوں کے لیے حفاظت، امن اور ترقی کا ایک نیا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

یہ بات یقیناً قابل افسوس ہے کہ ہندوستان کی قوم پروری کی کامیابی کا جب موقع آیا تو فرقہ وارانہ کشیدگی نے اس کی فتح کو ایک حد تک مسخ

کر دیا۔ لیکن اس کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان نے ایسے ماحول اور حالات میں آزادی حاصل کی ہے جس کی مثال تاریخ میں نہیں پائی جاتی۔" (قومی آواز: مورخہ یکم جولائی ۱۹۴۷ء)

مولانا آزاد کے مشورے پر عمل کرنے کے لیے دستوری اسمبلیوں نے تو کوئی قدم نہیں اٹھایا، البتہ ۲۲؍ جولائی کی شام کو ۵ بجے نئی دہلی میں تقسیم کونسل کا اجلاس زیرِ صدارت لارڈ ماؤنٹ بیٹن وائسرائے ہند ہوا جو غالباً اسی مشورے کا عملی نتیجہ تھا۔

اس اجلاس میں ہندوستان اور پاکستان کی مجوزہ حکومتوں کے دو دو نمایندے شریک ہوئے۔ اس کونسل نے اعلان کیا:

"اختیارات کی منتقلی کے بعد اقلیتوں کے ساتھ مساویانہ اور منصفانہ برتاؤ کیا جائے گا۔ کسی علاقے میں کسی قسم اور کسی حیثیت کے تشدد کو برداشت نہ کیا جائے گا۔ ہر شہری کو عام شہری حقوق کے استعمال میں مساوی درجہ دیا جائے گا۔ دونوں حکومتیں اپنے علاقے میں بسنے والوں کو تقریر، انجمن سازی، عبادت کی آزادی، اور ان کے زبان، کلچر کے تحفظ کا یقین دلا رہی ہیں، دونوں حکومتیں اس عزم اور ارادے میں کسی قسم کی کمزوری نہیں دکھائیں گی۔ یکم اگست سے مشرقی پنجاب کے بارہ اضلاع اور مغربی اضلاع کے لیے ایک مخصوص فوجی کمان مقرر کیا جائے گا۔ دونوں حکومتیں حد بندی کمیشن کے فیصلے کو منظور کریں گی۔" (قومی آواز: ۲۶؍ جولائی ۱۹۴۷ء)

مولانا سید محمد میاں صاحب کا خیال ہے کہ یہ فیصلہ مولانا آزاد کے ۲۹؍ جون کے بیان کی روشنی میں کیا گیا تھا۔

لیگیوں کی رجعت قہقری:

۳۰؍ جون ۱۹۴۷ء: قیام پاکستان کے اعلان کے ساتھ ہی لیگیوں نے بھی خطرات کو محسوس کرتے ہوئے رجعت قہقری میں کوتاہی نہیں کی۔ چناں چہ ۳۰؍ جون کو مسلم لیگ کے صدر مدراس اسمبلی کی لیگ پارٹی کے لیڈر محمد اسماعیل صاحب نے پریس کو بیان دیتے ہوئے فرمایا:

''مدراس کے مسلمان اول ہندوستانی اور اس کے بعد مسلمان ہیں۔ ہر سچا مسلمان سچا ہندوستانی اور سچا مدراسی بھی ہے۔ میرے اس نظریے کی تائید قرآن اور حدیث سے ہوتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر اقلیت والے صوبوں کی حکومتوں نے مسلمانوں کے ساتھ اچھا سلوک نہ کیا تو کیا پاکستان ہماری امداد کے لیے ہندوستان کے خلاف کوئی فوجی کارروائی کرے گا؟ نہیں ایسا بالکل ممکن نہیں اور اسی خیال سے میں اقلیت والے صوبوں کے مسلمانوں کو یہ مشورہ دے رہا ہوں کہ اگر واقعی سچے مسلمان ہیں تو سب سے پہلے سچے ہندوستانی بنیں۔ میرا یہ خیال کسی غلطی پر مبنی نہیں ہے۔ حتیٰ کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے آپ کو قومیت و وطنیت کی طرف منسوب کرتے ہوئے خود کو ہاشمی العربی کہا ہے۔ اگر ہم اس کے خلاف کوئی طریقہ اختیار کریں گے اور اپنے آپ کو پہلے مسلمان اور بعد میں ہندوستانی قرار دیں گے تو ہم اپنے ہی دیش میں غیر ملکی بن کر رہ جائیں گے۔''

(قومی آواز: ۳۰ر جولائی ۱۹۴۷ء)

کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کے اجلاس میں چودھری خلیق الزماں صاحب (لیڈر مسلم لیگ پارٹی) نے فرمایا:

''ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ قومی جھنڈے کا احترام کرے۔ اگرچہ یہ کپڑے کا ایک ٹکڑا ہے، لیکن یہ قوم کی آرزوؤں اور عزت کا نشان ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہر مسلمان اور ہر عیسائی اس جھنڈے کو بلند کرنے میں فخر محسوس کرے گا۔'' (قومی آواز: ۲۸ر جولائی ۱۹۴۷ء)

ڈپٹی لیڈر مسلم لیگ پارٹی (سر سعد اللہ صاحب) نے فرمایا:

''میں جھنڈے کو سلام کرتا ہوں، میرے خیال میں یہ جھنڈا نشان ہے ہماری تمناؤں کا، ہماری جدوجہد کی کامیابی اور ہماری قربانیوں کا۔''

(قومی آواز: ۲۸ر جولائی ۱۹۴۷ء)

باؤنڈری کمیشن کے ممبران کا اعلان:

۳۰ر جون ۱۹۴۷ء: ۳۰ر جون کے اخبارات میں وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن

نے بہ مشورہ قائد اعظم و کانگریس باؤنڈری کمیشن کے ممبران کے ناموں کا اعلان کیا۔ دو کمیشن الگ الگ ہیں، ایک پنجاب کی تقسیم کے واسطے اور دوسرا بنگال کی تقسیم کے لیے۔

سربراہ	
سر سائرل ریڈکلف	
مشرقی سرحدی کمیشن	مغربی سرحدی کمیشن
مسلم لیگ: ۱۔ جسٹس ایس اے رحمان ۲۔ جسٹس اے ایس محمد اکرم کانگریس: ۱۔ جسٹس سی سی بسواس ۲۔ جسٹس بی کے مکرجی	مسلم لیگ: ۱۔ جسٹس دین محمد ۲۔ جسٹس محمد منیر کانگریس: ۱۔ جسٹس مہر چند مہاجن ۲۔ جسٹس تیجا سنگھ
موکل: سر شاہ نواز خان آف ممدوٹ	وکیل: چودھری سر ظفر اللہ خان

ہدایات:

بنگال کمیشن اُن علاقوں کو جن کی مسلسل آبادی کی اکثریت مسلمان ہے، علاحدہ کر دے گا۔ ایسا کرنے میں دیگر معاملات پر بھی غور کرے گا۔

اگر ضلع سلہٹ کے عوام کی اکثریت نے بنگال میں شرکت کی تو ضلع سلہٹ اور ان مسلسل علاقوں کو جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، مشرقی بنگال میں شامل کر دے گا۔

پنجاب میں جو مسلسل مسلمانِ اکثریت کے علاقے ہیں ان کو غیر مسلم علاقے سے علاحدہ کر دیا جائے گا اور حد بندی کر دی جائے گی۔ ایسا کرتے وقت دیگر امور اور معاملات پر بھی غور کیا جائے گا۔

ان ہدایات میں تقسیم کا معیار ضلع کی آبادی پر جو تھا وہ ہٹا دیا گیا اور مسلسل علاقے میں تحصیل تھانہ، اور دیہات بھی آسکتے ہیں۔

مسٹر جناح کا بیان:

۳۰ رجون ۱۹۴۷ء: مسلم لیگ کے صدر مسٹر محمد علی جناح نے آج لاہور میں ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے ۳ رجون کے تقسیم ملک کے پلان کے بارے میں کہا:

"بعض لوگ یہ سوچتے ہوں گے کہ ۳ر جون کے منصوبے کو قبول کرنا مسلم لیگ کی غلطی تھی۔ میں انھیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس کے سوا کوئی اور اقدام اتنا زیادہ خطرناک اور تباہ کن ثابت ہوتا کہ اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔"

(بہ حوالہ روزنامہ "انقلاب" لاہور: مورخہ ۱۸ر نومبر ۱۹۸۰ء)

ہندوستان پاکستان کی اقلیتیں اور مولانا آزاد:

یکم جولائی ۱۹۴۷ء: برطانوی اعلان یا تقسیم ہند کے باعث پاک و ہند کی اقلیتوں کے لیے جو مسایل پیدا ہوئے ان سے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد نے دونوں دستور ساز اسمبلیوں کو مشورہ دیتے ہوئے یکم جولائی کے ایک پریس بیان میں کہا:

"برطانوی حکومت کی ۳ر جون والی اسکیم کو کانگریس اور مسلم لیگ نے منظور کر کے ملک میں تازہ فرقہ وارانہ جنگ و جدل کی افسوس ناک تاریخ کا ورق پلٹ دیا ہے۔ جو کچھ پہلے ہوا یا اسکیم کی منظوری کے موقعے پر کیا گیا اب وہ سب کچھ ماضی کے سپرد کیا جا چکا ہے۔ میں بہ خوبی جانتا ہوں کہ اس تجویز میں چند واضح جذبات کو داخل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

دانش مندی کا تقاضہ یہ ہے کہ آج ہماری تمام تر توجہ مستقبل کی طرف ہونی چاہیے تاکہ قوموں کے درمیان سلامتی، امن اور ترقی کی نئی شاہ راہیں کھولی جا سکیں۔ یہ انتہائی بدقسمتی ہے کہ عین کامیابی کے وقت باہمی فرقہ وارانہ چپقلش کے جذبات نے ہمیں ایک حد تک ناکامیاب بنا دیا ہے۔ پھر بھی اس میں کوئی کلام نہیں کہ ہندوستان کو ایسے حالات میں کامیابی نصیب ہوئی ہے جس کی نظیر تاریخ میں ڈھونڈھے سے بھی نہیں ملتی۔ ملک میں فرقہ وارانہ بداعتمادی اور خانہ جنگی پر کتنا ہی افسوس اور غم کیوں نہ ہو پھر بھی ہمیں اس حقیقت سے آنکھیں بند نہیں کرنی چاہئیں کہ اب ہمارے ملک نے ترقی کے ایک نئے شان دار دور میں قدم رکھا ہے۔

اقلیتوں کے سوال کو حل کرنے کے لیے سکون اور تدبر کی ازبس ضرورت ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ جو علاقے ہندوستان سے علاحدہ ہوئے ہیں

وہاں کی اقلیتیں مستقبل کے متعلق ہراساں ہیں۔ اسی طرح ہندوستان کی اقلیتیں بھی بے حد خائف و پریشان ہیں کہ آیندہ ان کے ساتھ کس قسم کا سلوک روا رکھا جائے گا۔ ان کو اس حقیقت کو ہرگز فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ان کا یہ خوف وہراس ملک کی تقسیم کا زائیدہ نہیں، کیوں کہ اگر تقسیم نہ بھی ہوتی تب بھی ملک میں اقلیتوں کا مسئلہ اجتماعی حیثیت میں ہماری توجہ اور محنت کا محتاج ہوتا۔ مجھے یقین ہے کہ جہاں تک ہندوستانی حکومت کا تعلق ہے۔ اس میں نہ صرف اقلیتوں کے ساتھ انصاف کیا جائے گا بلکہ بلند نگاہی کا دامن بھی ہاتھ سے چھوڑا نہ جائے گا۔ میں یہ بھی یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کی تقسیم شدہ علاقوں میں بھی ارباب اقتدار اپنی اقلیتوں کے ساتھ اسی قسم کا طرزِ عمل اختیار کریں گے۔

۱۵ر جولائی کے بعد جب دوسری دستور ساز اسمبلی کا اجلاس منعقد ہوگا تو اولین فرصت میں دونوں مجالس کا مشترک اجلاس طلب کرنے کے انتظامات ہونے چاہئیں، تاکہ باہمی افہام و تفہیم سے دونوں سلطنتوں میں بسنے والی اقلیتوں کے لیے ایک مشترک چارٹر تیار کرلیا جائے گا، جس کے بعد کسی جگہ بھی بداعتمادی اور تلخی کی کیفیت ہمیشہ کے لیے ختم ہو سکے۔"

مولانا کے بیان کیے اس متن میں چوں کہ بعض الفاظ زاید ہیں۔ اس لیے اس بیان کی تکرار گوارا کرنا پڑی۔

گورنر جنرل پاکستان کا تقرر:

ڈاکومنٹ نمبر ۵۰۰: ریئر ایڈمرل وائسکاؤنٹ ماؤنٹ بیٹن آف برما کا مراسلہ مسٹر جناح کے نام۔ آر/۳/۱/۱۶۲: الف ۲۷

۴ر جولائی ۱۹۴۷ء

ڈیئر مسٹر جناح!

میں آپ کا ممنون ہوں گا اگر آپ مجھے جانشین اتھارٹی کی طرف سے گورنر جنرل پاکستان کے نام کی تحریری سفارش کریں تاکہ میں اسے باقاعدہ طور پر بادشاہ کے سامنے پیش کرسکوں۔

جیسا کہ میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں یہ نام لازمی طور پر آج پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میں آپ کا بہت زیادہ شکر گزار ہوں گا اگر آپ مجھے اس کا جواب فوراً ارسال فرمائیں۔

آپ کا مخلص

ماؤنٹ بیٹن آف برما

ڈاکومنٹ نمبر ۵۰۶: وایسرائے کی ذاتی رپورٹ نمبر ۱۱

ایل/ پی او/ ۶/ ۱۲۳: ۱۲۳ الیف الیف ۶۳-۱۰۰ (انتہائی خفیہ)

۴ر جولائی ۱۹۴۷ء:

(اس میں سے پاکستان کے گورنر جنرل کے تقرر کے بارے میں حصے دیے جا رہے ہیں)

۲۱۔ لارڈ اسمے کے آنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ وزیر اعظم اور کابینہ کمیٹی کے سامنے مشترکہ گورنر جنرل کے مسئلے کو رکھیں جس کی وجہ سے مین اپنے آپ کو بڑی مشکل میں گرفتار محسوس کرتا ہوں۔ یہ یاد ہوگا کہ میں نے کابینہ کمیٹی کو لکھا تھا (ڈاکومنٹ نمبر ۴۹۴ جلد دہم) کہ نہرو نے مجھ سے تحریری استدعا کی ہے کہ میں ہندوستان کا بدستور گورنر جنرل رہوں، اسی طرح مسٹر جناح مسلسل مجھ پر زور دیتے رہے کہ جب تک تقسیم کا کام مکمل نہیں ہوتا میرا اس عہدے پر فایز رہنا بہت ضروری ہے۔ میں کانگریس کو رضا مند کر سکتا ہوں (اگر چہ یہ کام مشکلات کے بغیر ممکن نہیں)۔ مجھے پاکستان کی طرف سے ایسی ہی پیش کش کی لازمی توقع تھی تا کہ میں تقسیم کے دوران کے عرصے میں دونوں ڈومینز کے مفادات کی نگہبانی غیر جانب دارانہ طور پر کر سکوں۔

۲۲۔ میرے لندن جانے سے پہلے مسٹر جناح نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر چہ ان کا خیال تھا کہ ایک کی بجائے دو گورنرز جنرل زیادہ بہتر طور پر کام کر سکیں گے، لیکن انھوں نے مجھے بہ طور خاص کہا تھا کہ میں ان دونوں گورنرز جنرل کے اوپر ایک سپریم گورنر جنرل کا منصب سنبھالوں (ڈاکومنٹ نمبر ۳۷۴ جلد دہم)۔ اس دن سے آج تک انھوں نے مجھ پر اور میرے عملے پر بار بار زور دیا کہ ہم سب یہاں رہ کر تقسیم کا کام منصفانہ طور پر طے پانے کی نگرانی کریں اور ہم سب نے مسلسل ان کو جواب دیا کہ یہ کام اسی صورت میں اطمینان بخش طریقے سے انجام پا سکتا ہے جب کہ میں خود مشترکہ گورنر جنرل کے طور پر فرایض ادا

کروں اور آپ کی خوش قسمتی ہے کہ کانگریس پہلے ہی اس طریقے سے اتفاق کر چکی ہے۔

۲۳۔ گذشتہ تین ہفتوں سے ہم مسٹر جناح سے جواب حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں لیکن انھوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ آخر میں انھوں نے مجھ سے کہہ دیا کہ جب تک وہ بل کو دیکھ نہیں لیتے اس وقت تک کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ جب انھوں نے بل دیکھ لیا تو بھی جواب نہیں دیا اور کہا کہ وہ اپنے دو دوستوں سے مشورہ کرنے کے بعد جواب دیں گے اور یہ دونوں اس وقت ریفرنڈم میں مصروف ہونے کی وجہ سے یہاں موجود نہیں ہیں۔ آخر کار وہ میرے پاس آئے ''تاکہ مجھ سے مشورہ حاصل کریں کہ انھیں کیا کرنا چاہیے۔'' انھوں نے کہنا شروع کیا کہ وہ پاکستان کے ہر صوبے میں برطانوی گورنر رکھنے کے خواہش مند ہیں، سوائے سندھ کے۔ یہاں کا گورنر مسلمان ہو سکتا ہے، کراچی میں جس کی وہ خود ذاتی طور پر نگرانی کریں گے۔ انھوں نے کہا کہ وہ پہلے ہی تینوں افواج پاکستان کے سربراہان انگریز بنا چکے ہیں اور کہا کہ انگریز افسروں کو ملازم رکھنے پر پاکستانیوں کو مطمئن کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ وہ خود گورنر جنرل بنیں۔

۲۴۔ انھوں نے کہا کہ وہ یہ قدم اٹھانے کے خواہش مند نہ تھے لیکن ان کے تین چار گہرے دوستوں اور ہم کاروں نے، جن سے انھوں نے مشورہ کیا تھا، اس پر مجبور کیا۔ جیسا کہ نواب بھوپال ان کے اصلی دوست اور مشیر ہیں، انھوں نے تین یوم قبل مجھے بتایا کہ جناح نے اس مسئلے پر بہ طور خاص ان سے مشورہ کیا اور نواب بھوپال نے ان سے کہا تھا کہ ان کے خیال میں مشترکہ گورنر جنرل اور ان کے ساتھ برطانوی ٹیم کی تجویز کو مسترد کرنا حماقت ہوگی، جو ۳۱ر مارچ ۱۹۴۸ء تک تقسیم کے کام کی تکمیل کی نگرانی کرے گی (جو کہ تقسیم کا کام مکمل ہونے پر ختم ہو جائے گی) اور یہ بالکل واضح ہے کہ اس سے لیاقت علی خان کو بھی پورا اتفاق تھا۔ میں یہ سوچ کر خوف زدہ ہو جاتا ہوں کہ مسٹر جناح جس مشیر کی بات پر کان دھرتے ہیں وہ صرف جناح ہی ہے۔

۲۵۔ وہ بڑائی کے خبط میں بری طرح مبتلا ہیں۔ جب میں نے ان کی توجہ اس جانب مبذول کرائی کہ اگر وہ آئینی گورنر جنرل بنتے ہیں تو ان کے اختیارات محدود ہوں گے، لیکن وزیر اعظم بن کر پاکستان کو اچھے طریقے سے چلا سکیں گے۔ تو انھوں نے اس حقیقت کو بیان کرنے میں ذرہ برابر پس و پیش سے کام نہیں لیا کہ ان کا وزیر اعظم وہی کچھ کرے گا جس کا

وہ کہیں گے۔ ''میری پوزیشن یہ ہے کہ میں مشورہ دوں گا اور دوسرے اس پر عمل کریں گے۔''

۲۶۔ تب مجھے یہ خیال آیا کہ بل میں ایک شق شامل کی جائے جس کی رو سے پاکستان میں ایک قایم مقام گورنر جنرل مقرر کرنے کی گنجایش رکھی جائے کہ جب گورنر جنرل اس ڈومینین کی حدود میں نہیں ہوگا تو قایم مقام گورنر جنرل کام کرے گا۔ کانگریس کی میٹنگ بل پر غور کرنے کے سلسلے میں ہو رہی تھی، اس میں یہ تجویز منظور کر لی گئی، تب مسلم لیگ کے نمایندوں کی میٹنگ میں یہ مسئلہ پیش ہوا۔

۲۷۔ اس کے ساتھ ہی مسٹر جناح نے مجھ پر اس مسئلے پر وار کیا کہ اگر ہندوستان ثالثی ٹربیونل کے ایوارڈ پر عمل نہ کرے تو اس کے خلاف کارروائی کی جائے اور پاکستان کو اثاثہ جات میں سے منصفانہ حصہ دیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ اتفاق کی بات ہے کہ تقریباً تمام اثاثہ جات انڈین یونین کی سرزمین پر پڑے ہوئے ہیں۔ اس پر مسٹر جناح کے معتمد خاص کی موجودگی میں مجھے یہ کہنے کا اچھا موقع مل گیا کہ تقسیم کے منصوبے میں پاکستان کے مفادات کے تحفظ کے لیے مشترکہ گورنر جنرل اور برطانوی عملے کی تدبیر رکھی گئی ہے، اس پر دونوں بھروسا کر سکتے ہیں کہ کام انصاف کے ساتھ ہوگا۔

۲۸۔ میں نے ان کو بتایا کہ کانگریس نے اس سسٹم سے اتفاق کیا تھا اور مجھے گورنر جنرل نام زد کر دیا تھا۔ میں نے اور میرے برطانوی عملے نے ۳۱ر مارچ تقسیم کی مدت کے اختتام تک کام کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی تھی۔ میں نے کہا کہ مجھے خوشی تھی کہ تقسیم کا زیادہ تر کام دہلی میں بیٹھ کر سرانجام پائے گا اور کراچی جانے کے لیے میں بہت کم وقت نہ نکال سکوں گا۔ اس لیے میں نے ساڑھے سات ماہ کے لیے قایم مقام گورنر جنرل کی تقرری پر کانگریس کو رضامند کر لیا تھا اور یہ کہ میں پاکستان کا دورہ قایم مقام گورنر جنرل کے ساتھ باہمی بندوبست سے کروں گا۔

۲۹۔ جناح نے اس تجویز کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کا میں مشکل سے یقین کر سکا تھا کہ اثاثہ جات کی بہ حفاظت تقسیم کے لیے اس قابل عمل طریقے کو مسترد کرنا جناح کا ...... ❶ فیصلہ تھا اور طریقے پر کانگریس کو اتفاق تھا کہ ۳۱ر مارچ تک ایک مستقل گورنر جنرل کی بجائے کراچی میں قایم مقام گورنر جنرل مقرر کر دیا جائے اور اس کے بعد بہ ہر حال وہ اپنا گورنر جنرل مقرر کریں گے۔

۳۰۔ جناح نے مجھے پختہ یقین کے ساتھ کہا کہ مشترکہ گورنر جنرل کے عدم تقرر کی بنا پر تمام نقصانات کا انھیں پورا ادراک ہے۔ ان کی خواہش تھی کہ میں بہ طور وایسرائے یا بالا گورنر جنرل کی حیثیت میں تقسیم کے کام کی نگرانی کروں، لیکن وہ ۱۵ر اگست کے بعد پاکستان کے گورنر جنرل کے علاوہ کوئی بھی پوزیشن قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

۳۱۔ میں نے ان سے کہا "آپ کو اس کی کیا قیمت ادا کرنا پڑے گی؟" انھوں نے افسردہ لہجے میں کہا "ہوسکتا ہے کہ اس سے مجھے چند کروڑ روپوں کے اثاثہ جات سے محروم ہونا پڑے۔" اس پر میں نے کچھ تلخی آمیز جواب دیا "اس کی آپ کو بہت زیادہ قیمت ادا کرنا پڑسکتی ہے جو پورے اثاثہ جات اور پاکستان کے مستقبل کی صورت میں بھی ہوسکتی ہے۔" یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

۳۲۔ میٹنگ کے سیکرٹری محمد علی نے میرے پی۔ ایس۔ وی۔ (جارج ایبل) کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھایا، اس نے بتایا کہ میٹنگ کے بعد اگلا گھنٹہ میرے بم شیل پر گفتگو پر صرف ہوا، لیکن وہ جناح کو ان کے موقف سے دست بردار کرانے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد لیاقت علی خان میرے پاس آئے اور مجھ سے استدعا کی کہ میں دونوں گورنرز جنرل سے بالا گورنر جنرل بننا قبول کرلوں اور یہ جناح کے لیے قابل قبول ہوگا۔ لیکن مجھے توقع نہیں کہ مسٹر جناح پاکستان کا پہلا گورنر جنرل بننے کی بڑی خواہش سے دست کشی اختیار کرسکتے ہیں۔ "خواہ اس کا مطلب یہ کیوں نہ ہو کہ وہ اس کے آخری گورنر جنرل ہوں گے؟" میں نے لیاقت کو بتایا، انھوں نے اپنے کندھے اُچکائے اور افسردہ لہجے میں کہا "ہم اپنی بساط کے مطابق قدم اٹھائیں گے، جو کچھ بھی ہو لیکن مجھے توقع ہے کہ آپ ہندوستان میں قیام ضرور کریں گے بہ صورت دیگر صورت حال بڑی خراب ہوگی اور اس کا خمیازہ پاکستان کو بہت زیادہ بھگتنا پڑے گا۔" اسی طرح جناح نے نہایت خلاف معمول مجھ سے استدعا کی کہ میں ہندوستان کا گورنر جنرل بن کر حالات پر اثر انداز ہوتا رہوں، انھیں تشویش تھی؛ ہندوستان کی حکومت پاکستان کے لیے مشکلات پیدا کرسکتی ہے۔

۳۳۔ میں اب بڑے گومگوں کی حالت میں ہوں۔ میرا ہمیشہ یہ خیال رہا تھا کہ میرا ناطہ دونوں مملکتوں سے رہے گا یا پھر کسی سے بھی نہیں۔ میں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا تھا کہ دونوں مجھ سے کسی ایک کے ساتھ ناطہ رکھنے کا مشورہ دیں گے۔

۳۴۔ میرا اپنا خیال یہ ہے اور میں نے ہمیشہ محسوس کیا کہ اخلاقی طور پر یہ درست نہ ہوگا، میں دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ ناطہ رکھوں۔ لیکن بدقسمتی سے مجھے اندیشہ ہے کہ میں نہرو اور کانگریس کی ساری قیادت کو اس راہ پر لگانے میں کامیاب رہا اور وہ مجھے اس پر کبھی معاف نہیں کریں گے کہ جناح کو ایک مرتبہ پھر اپنی ڈگر پر چلنے کی اجازت دے دی۔ اس لیے میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کے لیے مجھے بہت زیادہ رہنمائی کی ضرورت ہے، میں اسے کو وطن بھیجنے کی ضرورت محسوس کرتا ہوں تاکہ رہنمائی حاصل کی جاسکے۔

ایم.اف برما

حاشیہ ❶: اس مقام پر فیصلے کی صفت کے طور پر ایک لفظ تھا جو ماؤنٹ بیٹن کے اشتعال اور غصے کا غماز تھا۔ ناشر نے حذف کر دیا۔

ڈاکومنٹ نمبر ۵۰۸: ریئر ایڈمرل وائسکاؤنٹ ماؤنٹ بیٹن آف برما کا مراسلہ مسٹر ایٹلی کے نام (بہ ذریعہ انڈیا آفس) ٹیلی گرام آر/۳/۱/۱۶۲: الیف ۲۸

نئی دہلی — انتہائی اہم و خفیہ

۴ر جولائی ۱۹۴۷ء – چھ بجے شام

(وائسرائے کی جانب سے وزیر اعظم کے لیے ذاتی اور پرائیویٹ)

میں نے آج جناح سے کہا ہے (ڈاکومنٹ نمبر ۵۰۰) کہ وہ مجھے اس شخص کے نام سے تحریری طور پر مطلع کریں جسے بادشاہ کے سامنے منظوری کے لیے پیش کرنے کے خواہش مند ہوں۔ یہ جناح کا نام ہوگا۔

۲۔ اسے پیر کی رات کو آرہے ہیں اور وہ ہندوستان کی گورنر جنرل شپ کے مسئلے پر تفصیلی روشنی ڈالیں گے۔ میں شکر گزار ہوں گا اگر حزب اختلاف کے رہنماؤں کو بھی اس میں شامل کرلیا جائے۔ کیوں کہ جب میں لندن میں تھا تو میں نے ان سے کہا تھا کہ دونوں طرف کے ہندوستانی رہنما مجھے گورنر جنرل بنانے کے خواہش مند ہیں۔

۳۔ اس سلسلے میں مجھے کون سا راستہ اختیار کرنا ہے؟ میں ملک معظم کی حکومت کی رہنمائی کے لیے بہت زیادہ ممنون ہوں گا اور اس میں حزب اختلاف کی رہنمائی بھی شامل ہونی چاہیے۔

۴۔اس بارے میں فیصلہ بدھ تک ہوجانا چاہیے کیوں کہ جمعرات کو اس پر (پارلیمنٹ میں) غور شروع ہوگا۔کیا میں آپ کے جواب کی توقع منگل ۸/جولائی کی شام تک رکھ سکتا ہوں؟

ڈاکومنٹ نمبر ۵۰۹: رئیر ایڈمرل وائسکاؤنٹ ماؤنٹ بیٹن آف برما کے نام مسٹر لیاقت علی خان کا مراسلہ۔آر/۳/۱/۱۶۲: ایف ۱۸ (خفیہ)

گل رعنا، ہارڈنگ ایونیو۔نئی دہلی

۴/جولائی ۱۹۴۷ء

ڈیئر لارڈ ماؤنٹ بیٹن!

مسٹر جناح کو آپ کا خط مورخہ ۴/جولائی ساڑھے چھ بجے شام دیر سے ملا اور مجھے اختیار دیا گیا ہے کہ میں آپ کو مطلع کروں کہ جانشین اتھارٹی آل انڈیا مسلم لیگ نے ہدایت کی ہے کہ پاکستان کے گورنر جنرل کے لیے مسٹر ایم.اے جناح کا نام ہز میجسٹی بادشاہ کو منظوری کے لیے پیش کیا جائے۔

ہمیں معلوم ہوا ہے کہ کانگریس چاہتی ہے کہ آپ ہندوستان کی ڈومینین کے گورنر جنرل بنیں، اگر آپ کانگریس کی پیش کش قبول کرتے ہیں تو اس پر ہمیں مسرت ہوگی اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ دونوں گورنر جنرل تعاون اور خوش اسلوبی سے فرایض انجام دیں گے اور انصاف کے تقاضوں کے مطابق تقسیم کے کام کو مکمل کریں گے۔

آپ کا مخلص

لیاقت علی خان

ڈاکومنٹ نمبر ۵۴۴: رئیر ایڈمرل وائسکاؤنٹ ماؤنٹ بیٹن آف برما کا مراسلہ مسٹر لیاقت علی خان کے نام۔آر/۳/۱/۱۶۲: ایف ۵۱ (خفیہ)

۷/جولائی ۱۹۴۷ء

ڈیئر مسٹر لیاقت علی خان!

آپ کے خط مورخہ ۴/جولائی (ڈاکومنٹ نمبر ۵۰۹) کا شکریہ۔جس میں مجھے مطلع کیا ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ نے مسٹر جناح کا نام بہ طور گورنر جنرل پاکستان ہز میجسٹی بادشاہ کی منظوری کے لیے پیش کیا ہے۔

آپ نے اپنے خط کے دوسرے پیراگراف میں جن جذبات کا اظہار کیا ہے میں اس کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں، لیکن میں آپ پر واضح کرنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ میں نے ابھی اس مسئلے پر کوئی فیصلہ نہیں کیا۔

آپ کا مخلص

ماؤنٹ بیٹن آف برما

ڈاکومنٹ نمبر ۵۴۵: وایسرائے کی ۵۳ ویں اسٹاف میٹنگ کی روئیداد (آئیٹم نمبر ۲)

ماؤنٹ بیٹن پیپرز (خفیہ)

۷/ جولائی ۱۹۴۷ء کو صبح دس بجے وایسرائے ہاؤس کی میٹنگ کے شرکا، رئیر ایڈمرل وائسکاؤنٹ ماؤنٹ بیٹن آف برما، فیلڈ مارشل سر ای. آکن لک، (آئیٹم نمبر ۴) سر ای. میویل، راؤ بہادر وی. پی. مینن، کرنل کرے، مسٹر ای. ڈی. اسکاوٹ، کمانڈر نکولس، لیفٹیننٹ کرنل ایرسکن کروم۔

آئیٹم نمبر ۲ — گورنرز جنرل:

وایسرائے نے بتایا کہ ان کی اہلیہ کی طرف سے ہندوستان کی ڈومینین کا گورنر جنرل بننے کی تجویز کی مخالفت کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ تین چار ہفتے پہلے ان کے سارے اسٹاف نے اس سے اتفاق کیا تھا کہ ان کے لیے صرف ایک ڈومینین کا گورنر جنرل بن کر رہنا ناقابل تصور ہے۔ انھوں نے بتایا کہ یہ ان کے لیے بہت زیادہ حیران کن تھا کہ سوائے کیپٹن بروک مین باقی سارے اسٹاف نے متفقہ طور پر مشورہ دیا ہے کہ وہ اب گورنر جنرل بن جائیں۔ وہ اب بھی یہی محسوس کرتے ہیں کہ اگر انھوں نے اس پیش کش کو قبول کر لیا تو اس کا حقیقی امکان ہے کہ دیانت کے منافی کام کرنے کا الزام دیا جائے گا۔

کرنل کورے نے کہا کہ ان کی رائے بھی اسٹاف کی اکثریت کے ساتھ ہے۔ ان کا خیال تھا کہ وایسرائے کے رخصت ہونے سے پیدا ہونے والے اثرات کا پہلے پوری طرح احاطہ ہی نہیں کیا گیا...... کہ یہ اثرات بہت زیادہ سنگین نوعیت کے ہو سکتے ہیں۔ ان کی عملی صورت تباہ کن بھی ہو سکتی ہے۔

سر ایرک میویل نے بتایا کہ تین یا چار ہفتے قبل اسٹاف نے وایسرائے کو ایک ڈومینین کا

گورنر جنرل نہ بننے کا مشورہ اس لیے دیا تھا کیوں کہ وہ محسوس کرتے تھے کہ ان حالات میں انتقال اقتدار کے بعد وہ سود مند ثابت نہیں ہوں گے اور وہ تقسیم کمیٹی اور جائنٹ ڈیفنس کونسل کے اجلاس کی صدارت نہیں کریں گے۔ اب مسٹر جناح کے رویے میں تبدیلی رونما ہونے سے حالات بدل گئے ہیں۔ وائسرائے نے اس کی تصدیق کی کہ دو روز قبل مسٹر جناح نے ملاقات کے دوران انتہائی کرب کے ساتھ زور دیا تھا کہ وہ (وائسرائے) کسی بھی حیثیت میں یہاں مقیم رہیں، یہ پاکستان کی بڑی مدد ہوگی۔ اسی ملاقات میں مسٹر جناح نے اتفاق کیا تھا کہ وائسرائے جائنٹ ڈیفنس کونسل کے چیئرمین کی حیثیت سے فرائض سرانجام دیں۔ مسٹر جناح نے کہا تھا کہ کوئی بھی وائسرائے کی غیر جانب داری پر انگلی نہیں اُٹھا سکتا۔

(تحریکِ پاکستان اور انتقالِ اقتدار: ص ۷۸۶)

گورنر جنرل کے اہم مسئلے پر بہت سے مسلم لیگی محمد علی جناح کے فیصلے سے متفق نہیں تھے۔ یہ بات اس وقت سے لے کر بعد کے پچاس برسوں میں بار بار کہی گئی ہے۔ یہاں سردار شوکت حیات کے حوالے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

''راول پنڈی۔ ۲۰ر جنوری۔ سردار شوکت حیات نے کہا کہ ان کے ذاتی خیال میں قایدِ اعظم کو پاکستان کے گورنر جنرل کا عہدہ قبول نہیں کرنا چاہیے تھا اور یہ عہدہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو پیش کیا جانا چاہیے تھا۔ جب قایدِ اعظم گورنر جنرل بن گئے تو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی توہین محسوس کی اور وہ پاکستان کے دشمن بن گئے۔'' (نوائے وقت۔ لاہور: ۲۱ر جنوری ۱۹۸۲ء)

سردار صاحب کے اس بیان کو قایدِ اعظم پر تنقید اور ان کی توہین سمجھا گیا۔ اس پر انھوں نے ایک دوسرے بیان میں اس کی وضاحت کی اور اپنی بات پر مزید اصرار کیا اور کہا:

''قایدِ اعظم نڈر بے باک خوددار تھے، تاہم وہ تمام تر خصوصیات کے باوجود ایک انسان تھے۔ ہمیں مرحوم سیاسی لیڈروں کو معصوم کے طور پر پیش نہیں کرنا چاہیے۔ معصوم پیغمبر ہوتے ہیں۔ میں اب بھی کہتا ہوں کہ اگر لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو پہلا گورنر جنرل بنایا جاتا تو تقسیم کے وقت پچیس لاکھ افراد شہید نہ ہوتے، پورا پنجاب پاکستان کا حصہ ہوتا اور مسئلہ کشمیر پیدا نہ ہوتا۔''

(روزنامہ ''جنگ'' لاہور: ۲۳ر جنوری ۱۹۸۲ء)

ٹھیک انھی خیالات کا اظہار بہ تفصیل دبہ ذلایل پروفیسر ایس. ایم. برق نے کیا ہے۔
(دیکھیے کاروانِ احرار: جلد ۸، ص ۴۳-۲۴۰)

لیکن یہ متوازن آرا نہیں۔ یہ تاریخ نہیں مفروضے ہیں یا آرزوئیں۔ اور تمام تر عدم تدبر و بصیرت پر مبنی خیالات ہیں۔ اس سلسلے میں سیروائی کی رائے صائب یا کم از کم متوازن ضرور ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"یہ بات فہم سے بالا ہے کہ ایک شخص دو الگ الگ ریاستوں کا گورنر جنرل ہو۔ دونوں ریاستیں اپنی اپنی جگہ پالیسی کے تعین کے لیے آزاد ہوں تو ایک ہی گورنر جنرل دونوں کو کیسے مشورہ دے سکتا ہے؟ بالخصوص جب کہ ان میں تضاد بھی پایا جاتا ہو۔"

(بہ حوالہ مضمون سید شہاب الدین دسنوی، مشمولہ خدا بخش لائبریری جرنل، پٹنہ: ۱۱۲ تا ۱۵۷)

یہ بات پوری طرح درست نہیں! معلوم ہوتا ہے کہ بیان کنندہ نے سمجھ لیا ہے کہ مشترکہ گورنر جنرل کو دونوں ملکوں کے تمام معاملات اور کل و جز میں اختیار حاصل ہوتا۔ حال آں کہ ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کے بعد اس کے اختیارات اثاثوں کی تقسیم، جوائنٹ ڈیفنس کے مقاصد، تقسیم کے عمل کی تکمیل (باؤنڈری کمیشن کے کاموں کی نگرانی) اور دونوں ڈومینین کے درمیان اختلافات میں ثالث بالخیر کا کردار ادا کرنے تک محدود رہنا تھے۔ (ا۔س۔ش)

کنگھم کی واپسی کے لیے جناح صاحب کی درخواست:

۴ رجولائی ۱۹۴۷ء: ۴ رجولائی ۱۹۴۷ء کو انھیں انڈیا آفس سے ایک خفیہ اور ذاتی خط ملا جس میں انھیں کہا گیا کہ وہ شمال مغربی سرحدی صوبے کے گورنر کی حیثیت سے واپس آجائیں۔ اس کی درخواست مسٹر ایم. اے. جناح نے کی تھی جس کی وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے زبردست حمایت کی۔ سر اولف کیرو کی رخصت کی وجہ سے عہدہ خالی تھا اور لیفٹیننٹ کرنل سر رابرٹ لاک. ہارٹ قایم مقام گورنر تھے۔ کنگھم کا فوری ردعمل یہ ہوا کہ انھوں نے انکار کر دیا اور اس سلسلے میں تار بھی دیا۔ تار کے بعد انھوں نے ایک خط بھی لکھا جس میں انھوں نے بتایا کہ حالات بہت بگڑ چکے ہیں۔ انھوں نے لکھا:

"شمال مغربی سرحدی صوبے کے عوام کی مدد کرنے کی میری خواہش اب

پہلے کی طرح بہت شدید ہے۔ میرے، وہاں بہت سے دوست بھی ہیں، جن
کے ساتھ رہ کر مجھے واقعی بڑی خوشی ہوگی، لیکن گورنر کا عہدہ سنبھالنے کے خلاف
وجوہ زیادہ وزنی ہیں۔ میں ضمیر کی آواز کے مطابق یہ ذمہ داری اس وقت تک
نہیں سنبھال سکتا جب تک کہ یہ تین سال کے لیے نہیں تو کم سے کم دو سال کے
لیے ضرور ہو اور میں اس عرصے میں ۶۲ برس کا ہو جاؤں گا اور میں اس عمر تک یہ
ذمہ داری اُٹھانا نہیں چاہتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ ۱۶ ماہ قبل میں نے شمال
مغربی سرحدی صوبے کو چھوڑا تھا۔ یہ وقفہ میری زندگی کا بہت بڑا وقفہ ہے اور
اس وقفے کے بعد مجھے اندازہ ہے کہ دوبارہ یہ ذمہ داری سنبھالنا کتنا مشکل
ہوگا۔ اس کے علاوہ بعض گھریلو اسباب بھی ہیں۔ اگر ان سب کو پیش نظر رکھا
جائے تو مجموعی طور پر بہت کچھ بن جاتا ہے۔۔۔۔۔ مجھے امید ہے کہ آپ
وائسرائے اور مسٹر جناح کو بتا دیں گے کہ ان کی اس کریمانہ پیش کش کی میں کتنی
زیادہ قدر کرتا ہوں اور بادل نخواستہ اس سے انکار کر رہا ہوں۔"

خط کے مسودے میں بہت سی تبدیلیاں کی گئی تھیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں
نے الفاظ کے انتخاب میں کتنی احتیاط برتی ہے اور اس پیش کش پر فیصلہ کرنے میں انھیں کتنی
الجھن پیش آئی۔ انھیں انڈیا آفس سے ہمدردانہ جواب ملا جس پر ۵ر جولائی کی تاریخ درج
تھی، اس کا جواب انھوں نے ۷ر جولائی کو دیا اور لکھا:

"میں نے جمعہ کو آپ کو خط لکھا تھا۔ اس وقت سے میں اپنے دل کو ٹٹولتا
رہا ہوں اور میں نے محسوس کیا ہے کہ اپنے فرائض کے علاوہ دوسری باتوں کا
مجھ پر زیادہ غلبہ تھا، جتنا نہیں ہونا چاہیے تھا اس سے میں اور زیادہ پریشان
ہوں۔۔۔۔۔"

انھوں نے یہ اشارہ بھی کیا کہ وہ اس پر بات چیت کے لیے شاید خود انڈیا آفس
آئیں۔ اگرچہ ان کے کاغذات میں اس بات کا خاص طور پر کوئی ذکر نہیں ہے لیکن معلوم ہوتا
ہے کہ ۱۱ر جولائی کو یا اس سے قبل بات چیت ہوئی ہے اور انھوں نے پیش کش کو قبول کر لیا۔
جو کچھ ہوا اس پر لارڈ اسمے نے کچھ روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے کہا:

"جناح نے جب یہ اعلان کیا کہ وہ پاکستان کے گورنر جنرل ہوں گے

اس کے بعد جلد ہی انھوں نے کہا کہ وہ تمام صوبوں کے برطانوی گورنر برقرار رکھنا پسند کریں گے۔ میں نے انھیں بتایا کہ سر جارج سے توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ یہ دعوت قبول کرلیں گے۔ نھوں نے پہلے ہی آٹھ سال تک صوبہ سرحد پر حکومت کی ہے اور اب وہ اسکاٹ لینڈ میں آباد ہو گئے ہیں۔ البتہ میں نے وعدہ کیا کہ میں ان سے بات کروں گا۔ جیسی کہ مجھے توقع تھی جواب نفی میں آیا اور میرے انگلستان روانہ ہونے تک یہ عہدہ خالی رہا۔ ابھی میں لندن پہنچا ہی تھا کہ کننگھم مجھ سے ملنے آئے، انھوں نے کہا کہ غالباً ان پر ذاتی وجوہ کا غیر ضروری طور پر غلبہ ہوگیا تھا وہ پاکستان کی صورت حال معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے جو تصویر کھینچی وہ بہت اچھی نہیں تھی۔ جس کے بعد انھوں نے کسی حیل و حجت کے بغیر کہا میں جاؤں گا۔“

صوبہ سرحد میں ریفرنڈم:

۶ تا ۱۷ جولائی ۱۹۴۷ء: خدائی خدمت گار رہنما خان عبدالغفار کا کہنا تھا ”ہم کانگریس کے اتحادی ہیں، کانگریس نے تقسیم ہند کے منصوبے کو تسلیم کرلیا لہٰذا ہم اس فیصلے کے پابند ہیں۔ دوسرے یہ کہ ابھی تقریباً ایک سال قبل پورے ہندوستان کے ساتھ صوبہ سرحد میں بھی پاکستان کے مسئلے پر انتخابات ہوئے۔ جس میں خدائی خدمت گاروں کو کامیابی ہوئی، اب نئے سرے سے پھر اس مسئلے پر ووٹروں سے رائے طلب کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ تیسرا بڑا اور اہم اعتراض یہ تھا کہ مسلم اکثریت کے دیگر تمام صوبوں کی اسمبلیوں نے اپنے اپنے صوبے کے بارے میں فیصلے کیے۔ یہاں تک کہ بلوچستان کا علاقہ جہاں صوبائی اسمبلی کا وجود نہیں وہاں استصواب رائے کرانے کا جواز موجود ہے لیکن وہاں بھی ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ شاہی جرگے کو بلوچستان کی تقدیر کا فیصلہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے جس کا عوام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ یہ بڑی حیرت انگیز بات ہے کہ صوبہ سرحد کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جارہا ہے اور استصواب رائے کو صوبے پر مسلط کیا گیا ہے۔“ جب خدائی خدمت گاروں کی معقول دلیل پر بھی کان نہ دھرے گئے تو انھوں نے مطالبہ کیا کہ ریفرنڈم میں تیسری چوائس پختونستان کو بھی شامل کیا جائے۔ مگر ان کا مطالبہ مسترد کردیا گیا تو خدائی خدمت گاروں نے

ریفرنڈم کا بائیکاٹ کردیا۔ ۶ تا ۱۷ر جولائی تک ریفرنڈم کا سلسلہ جاری رہا۔ پولنگ بوتھوں پر سبز اور سرخ رنگ کے دو علاحدہ علاحدہ بکس رکھے گئے۔ پاکستان کے بکس کا رنگ سبز تھا جب کہ ہندوستان کے بکس کا رنگ سرخ۔ رائے دہندگان کی کل تعداد ۵,۷۲,۷۹۸ تھی۔ پاکستان کے حق میں ۲,۸۹,۲۴۴ ووٹ پڑے۔ ہندوستان کے حق میں ۲,۸۷۴ اور ۲,۸۰,۶۸۰ رائے دہندگان نے ریفرنڈم کا بائیکاٹ کیا۔ گویا پاکستان کو پچاس اعشاریہ پانچ فیصد ووٹ ملے اور اس کے خلاف انچاس اعشاریہ پانچ فیصد ووٹ ڈالے گئے۔

اگرچہ خدائی خدمت گاروں نے ریفرنڈم کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ لیکن باچا خاں نے ریفرنڈم کی حقیقت کا پردہ چاک کرتے ہوئے الزام لگایا کہ ریفرنڈم میں وسیع پیمانے پر جعلی ووٹ بھگتائے گئے۔ یہاں تک کہ سرکاری ایجنسیاں بھی اس دھاندلی میں ملوث تھیں۔ اپنے الزام کی تائید میں انھوں نے لتمبر ضلع بنوں میں متعین فوج کے دستے کے کرنل بشیر کی شہادت پیش کی کہ اس کی کمپنی کے جوانوں نے تین مرتبہ پولنگ اسٹیشنوں پر جعلی ووٹ ڈالے۔ اس قدر کھلم کھلا دھاندلی کے باوجود مسلم لیگ کو نہایت معمولی اکثریت میں ووٹ ملے۔ (ابوالکلام آزاد اور......... ص ۱۰-۵۰۹)

دارالعوام میں آزادیٔ ہند کا بل پاس ہوگیا:

۱۰ر جولائی ۱۹۴۷ء: انگلینڈ کی پارلیمنٹ میں آزادیٔ ہند کا بل پاس ہوگیا۔ ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان سے انگریزی حکومت کا خاتمہ ہوجائے گا اور دو ڈومینین قایم ہوجائیں گی جن کا نام ہندوستان اور پاکستان ہوگا۔ ان کو اختیار ہوگا کہ وہ سلطنت برطانیہ سے تعلق رکھیں یا نہ رکھیں تاہم لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کے عارضی طور پر اور مسٹر جناح پاکستان کے پہلے گورنر جنرل ہوں گے۔ (مولانا آزاد-ایک سیاسی ڈائری: ص ۴۱۴)

پاکستان کا طرزِ حکومت مسٹر جناح کی صفائی:

۱۳ر جولائی ۱۹۴۷ء: ۱۳ر جولائی کو نئی دہلی میں پریس کانفرنس میں مسٹر جناح نے سوالات کے جواب دیتے ہوئے کہا:

"اقلیتیں خواہ کسی فرقے سے تعلق رکھیں ان کے حقوق کی حفاظت کی

جائے گی۔ ان کا مذہب، ان کے عقیدے ہر طریقے سے محفوظ رہیں گے۔ ان کے جان و مال کی حفاظت کی جائے گی۔ عبادت کی آزادی میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جائے گی۔ انھیں مذہب، عقیدہ، جان، مال اور تمدن کے سلسلے میں تحفظ حاصل ہوگا۔ وہ بلا امتیاز مذہب و ملت اور نسل و رنگ ہر حیثیت سے پاکستان کے باشندے ہوں گے۔ انھیں جس طرح حقوق و مراعات حاصل ہوں گی اسی طرح ایک شہری کی حیثیت سے ان کی ذمہ داریاں بھی ہوں گی۔ انھیں حکومت کے معاملات میں حصہ لینا ہوگا اور جس وقت تک اقلیتیں حکومت کی وفادار رہیں گی اور اس سے سچا تعلق رکھیں گی انھیں اس وقت تک جب تک میرا اختیار باقی ہے کوئی اندیشہ نہ کرنا چاہیے۔''

ایک سوال کے جواب میں کہ پاکستان میں دینی حکومت ہوگی یا دنیاوی؟ مسٹر جناح نے فرمایا:

''آپ ایک مہمل سوال پوچھ رہے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ دینی حکومت سے آپ کا کیا مطلب ہے۔ خدا کے لیے آپ لوگ اپنے دماغوں سے خرافات نکال دیجیے۔''

(قومی آواز: ۱۵ر جولائی ۱۹۴۷ء، بہ حوالہ ''علمائے حق اور........: ص ۳۵-۶۳۴)

جناح صاحب اور ہندوستان میں مسلمانوں کی رہنمائی:

۱۳ر جولائی ۱۹۴۷ء: لیگی رہنماؤں نے ایک ایک کر کے فیصلہ کرلیا کہ وہ نئے قایم ہونے والے ملک پاکستان جائیں گے۔ سوال یہ تھا کہ پھر ہندوستانی مسلمانوں کی رہنمائی کون کرے گا۔ مسٹر جناح نے چودھری خلیق الزماں سے کہا کہ وہ ہندوستان میں رہ کر مسلمانوں کی رہنمائی کریں گے، لیکن یہی بات انھوں نے مسٹر آئی۔ آئی۔ چندریگر سے بھی کہی۔ چودھری صاحب کا خیال تھا کہ نواب محمد اسماعیل خاں کو یہ ذمہ داری سونپی جائے۔ پھر چودھری صاحب مسٹر چندریگر کے حق میں دست بردار بھی ہوگئے۔ لیکن ۱۳ر جولائی کو کانسٹی ٹیونٹ لیگی ارکان کا جو جلسہ ہوا اس میں منتخب چودھری صاحب ہوگئے۔ جوڑ توڑ اور راز دروں سے پردہ کی کہانی تو معلوم نہیں ہوسکی۔ چودھری صاحب کے قلم سے دوسری

تفصیلات یہ ہیں:

''صوبہ یوپی سے کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کی آٹھ نشستوں میں سے ۷ مسلم لیگ کو ملیں اور ایک رفیع احمد قدوائی کو۔ (۱) نواب اسماعیل خاں (۲) مولانا حسرت موہانی (۳) مسٹر عزیز احمد خان (۴) نواب قزلباش (۵) مسٹر رضوان اللہ (۶) بیگم اعجاز رسول (۷) خلیق الزماں۔

دوسرے صوبوں کے مسلم اقلیتی نمایندوں کی تعداد حسب ذیل تھی۔ مدراس ۴، بمبئی ۲، بہار ۵، مشرقی پنجاب ۴، مغربی بنگال ۴۔

۱۱رجون ۱۹۴۷ء کو ہم نے کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی میں لیڈر کے انتخاب کے لیے نواب اسماعیل خان کی صدارت میں جلسہ کیا، مگر چوں کہ اس میں بہت سے ممبران شریک نہیں تھے۔ لہٰذا، ۱۲رجولائی کے لیے جلسہ ملتوی کردیا گیا۔ جب ۱۲رجولائی کو جلسہ ہوا تو وہ بھی بہ وجوہات ۱۳رجولائی کے لیے ملتوی ہوگیا۔

۱۲رجولائی کی شام کو میں چندری گر کے یہاں بیٹھا تھا کہ کچھ اور مسلم ممبران کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی آگئے اور تجمل حسین بہار کے ایک صاحب نے مجھ سے کہا کہ میں خود مسلم پارٹی کی لیڈری منظور کرلوں۔ میں نے انھیں جواب دیا کہ میں نواب اسماعیل خان کی تائید کرتا ہوں اور آپ بھی انھیں کی تائید کریں۔ جب صبح ۱۳رجولائی کو وسٹرن کورٹ میں جلسہ ہوا تو مجھ سے کہا گیا کہ چندری گر صاحب بھی ایک امیدوار ہیں اور آپس میں مصالحت کی گفتگو ہورہی ہے، لہٰذا جلسہ ۳ بجے شام تک کے لیے ملتوی کردیا جائے۔ میں نے اس کو بہ خوشی منظور کرلیا۔ (یہ ملحوظ خاطر رہے کہ چندری گر صاحب کا اس وقت تک پاکستان منتقل ہونا طے نہیں ہوا تھا)۔ چندری گر صاحب نے مجھے بتایا کہ جناح صاحب نے ان سے کہا ہے کہ میں خود مسلم لیگ پارٹی کی قیادت قبول کرلوں جس سے ان کو بڑی خوشی ہوگی۔ میں نے کہا کہ بھئی میں خود نواب اسماعیل خان کی تائید کررہا ہوں اور اس آخر وقت میں ردوبدل کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نواب صاحب سے میرے تعلقات خراب ہوں گے۔ انھوں نے کہا کہ جناح صاحب سے میں ٹیلی فون ملاؤں اور آپ خود ان سے بات چیت کرلیں۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے ان سے کہا کہ آپ ٹیلی فون نہ ملائیں میں ان کو ناخوش نہ کروں گا، لنچ کے بعد دوبارہ جلسہ ہوا اور میں مسلم انڈیا کا لیڈر منتخب ہوگیا۔'' (شاہراہ پاکستان: ص ۱۰۵۶-۵۷)

پاکستان میں دینی حکومت اور مسٹر جناح:

۱۵ر جولائی ۱۹۴۷ء: ایک نامہ نگار نے قائدِ اعظم سے سوال کیا "کیا پاکستان میں دینی حکومت ہوگی؟"

جواب:

"آپ ایک مہمل سوال پوچھ رہے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ دینی حکومت سے آپ کا کیا مطلب ہے۔ خدا کے لیے آپ لوگ اپنے دماغوں سے خرافات نکال دیجیے۔"

(کاروانِ احرار: جلد ۸، ص ۲۵، بہ حوالہ قومی آواز، ۱۵ر جولائی ۱۹۴۷ء)

تقسیم ملک اور فوج کی تقسیم:

۱۶ر جولائی ۱۹۴۷ء: سب سے زیادہ تباہ کن پوزیشن یہ اختیار کی گئی تھی کہ صوبائی اصول کے بجائے فرقہ وارانہ اصول پر فوج کی تقسیم کردی گئی تھی اور پنڈت جواہر لال نہرو کی اس خواہش کو کہ فوجوں کی تقسیم صوبہ جاتی اصول پر ہونی چاہیے اور مولانا ابوالکلام صاحب آزاد کے اس اصرار کو کہ کم از کم بیس فیصدی مسلمان انڈین یونین کی فوجوں اور مرکزی دفاتر میں باقی رہنے دیے جائیں، پائے حقارت سے ٹھکرا دیا گیا تھا۔

چناں چہ مہاتما گاندھی نے اپنی عبادتی تقریر میں فرمایا تھا:

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم غیر ملکی جارحانہ حملے کے مقابلے میں متحد کیوں نہیں ہو سکتے۔ تقسیم کے موجودہ طریقے سے یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں فوجوں کے درمیان جنگ شروع ہو جائے، کیوں کہ ممکن ہے وہ اپنے آپ کو ایک دوسرے کا حریف سمجھنے لگیں۔ اس دردناک سانحہ کی تلافی صرف آنسوؤں سے نہیں ہو سکتی۔"

(قومی آواز، ۱۶ر جولائی ۱۹۴۷ء بہ حوالہ علماے حق اور......: ص ۶۳۰)

سرحد کے ریفرنڈم کا نتیجہ:

۱۸ر جولائی ۱۹۴۷ء: صوبہ سرحد کے ریفرنڈم میں دس دن صرف کیے گئے ❶۔

۱۸ار جولائی ۱۹۴۷ء کو یہ رائے شماری پر امن طریقے پر ختم ہوئی اور معلوم ہوا کہ ۴۹، ۵۰ نے پاکستان کے حق میں رائے دی۔ اعشاریہ ۴۹ نے کاسٹنگ ووٹ کا کام کیا۔ اور پورا صوبۂ سرحد پاکستان کے حوالے کر دیا گیا۔ پاکستان کے حق میں یہ کامیابی اس صورت میں حاصل ہوئی تھی کہ خدائی خدمت گاروں نے رائے شماری کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔

(علمائے حق اور.........: جلد۲، ص۶۲۶)

حاشیہ ❶: خان عبدالغفار خان اور ان کے خدائی خدمت گاروں نے اس ریفرنڈم کا بائیکاٹ کیا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ رائے شماری آزاد پٹھانستان اور پاکستان کے سوال پر ہونی چاہیے۔ ہندوستان یا پاکستان کے شمول پر رائے شماری نہ ہونی چاہیے۔ کیوں کہ پٹھان استقلال چاہتے ہیں ہندوستان یا پاکستان کا ضمیمہ بننا نہیں چاہتے اور جس حق خود ارادیت کی بنیاد پر مطالبۂ پاکستان تسلیم کیا گیا ہے اسی بنیاد پر یہ مطالبہ بھی واجب التسلیم ہے۔ لیکن خدائی خدمت گاروں کا یہ مطالبہ منظور نہیں کیا گیا، لہٰذا اس جماعت نے ریفرنڈم کا بائیکاٹ کر دیا۔

پختونستان اور بادشاہ خان:

بادشاہ خان کا خیال تھا کہ ملک کی تقسیم ہندوستان کے سیاسی اور فرقہ وارانہ مسئلے کا حل نہیں ہے۔ اس ایک قوم کے اٹھنے سے دسیوں نئے مسئلے پیدا ہوں گے اور نئی بے شمار پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں گی۔ اس لیے انھوں نے آخر وقت تک تقسیم کے اصول کی مخالفت کی۔ لیکن جب کانگریس نے بھی تقسیم کے اصول کو تسلیم کر لیا تو بالآخر بادشاہ خان نے اس اصول کی مخالفت ترک کر دی لیکن انھیں اپنی رائے کی صحت پر شبہ پیدا نہیں ہوا۔ اس لیے ان کی رائے (مخالفت) کے حوالے آتے رہے۔ آتے ہیں اور آئندہ بھی جب کبھی کوئی تاریخی تذکرہ ہوگا تو ان کی رائے کا حوالہ آئے گا۔

اس کے بعد انھوں نے پاکستان اور اس کے عوام کی خدمت کا عزم بالجزم کر لیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ جماعتی سیاست سے الگ ہو کر ملک و قوم کی خدمت اور تعمیر و ترقی کا ایک نیا دور شروع کریں۔ لیکن مسلم لیگ، اس کے رہنماؤں اور خاص طور پر خان عبدالقیوم خان کسی قیمت پر ان کا وجود برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہوئے اور ان کی کوئی معذرت، کوئی صفائی سننے اور خدمت کا کوئی موقع دینے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ سب سے زیادہ ان کے

خلاف پروپیگنڈا پختونستان کے نام پر کیا گیا۔ حال آں کہ انھوں نے صاف اعلان کر دیا تھا کہ

''آزاد پختونستان کے مطالبے سے ان کی مراد الگ ریاست کا قیام نہیں بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ صوبہ سرحد کو پاکستان کے ایک رکن کی حیثیت سے مکمل خود مختاری حاصل ہو۔''

انھوں نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ

''ان کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ پاکستان کا دستور صحیح معنوں میں وفاقی ہو، جس میں اُن صوبوں کو جو اس کے رکن ہوں پوری صوبائی خود مختاری دی جائے۔ اس طرح پٹھانوں کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی کا تحفظ ہو جائے گا۔ ایسے تحفظ کے بغیر سارے پاکستان پر پنجابیوں کا غلبہ ہو جائے گا اور ممکن ہے کہ وہ پٹھان اور دوسری اقلیتوں کو اُن کے جائز حقوق سے محروم کر دیں۔''

مولانا آزاد کا کہنا تھا کہ

''خان بھائیوں کا مطالبہ یقیناً جائز تھا اور مسلم لیگ کے لاہور ریزولیوشن سے ہم آہنگ تھا، جسے خود مسلم لیگ نے منظور کیا تھا اور جس میں بعد کو کوئی ترمیم نہیں ہوئی تھی۔''

(انڈیا ونس فریڈم (اردو): مرتبہ ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری: ص ۳۹۲)

اس کے لیے انھوں نے یہ استدلال بھی کیا کہ سرحد در حقیقت کسی صوبے کا نام نہیں ہو سکتا، پاکستان کا تو ہر صوبہ سرحدی صوبہ ہے۔ شمال مغربی سرحدی صوبے کے لیے ایک نام ہونا چاہیے جس سے اس کے قومی اور تہذیبی و معاشرتی تشخص کا اظہار ہو، جیسے سندھی بولنے والے علاقے کو سندھ کہا جاتا ہے، پنجابی بولنے والے علاقے کو پنجاب اور بلوچی بولنے والے علاقے کو بلوچستان کہا جاتا ہے۔ اسی طرح پشتو بولنے والے علاقے کو پختونستان کا نام دے دیا جائے اور بس۔''

اگر اس مطالبے میں حقیقت ہے تو پھر حکومت پاکستان کو یہ مطالبہ تسلیم کر لینا چاہیے کیوں کہ سرحد تو کوئی نام نہیں۔ جو علاقہ بڑے دیس کے ساتھ ملحق ہو اسے سرحد کہا جا سکتا ہے۔ اسی طرح افغانستان کی سرحد ہندوستان کے برابر ملتی تھی لہٰذا انگریز نے اس علاقے کو

سرحد کہنا شروع کر دیا اور یہی نام مروج ہو گیا۔ لہٰذا اس نام کے بدل لینے میں کوئی حرج نہیں۔

۳۱ رمئی ۱۹۵۲ء کے روز نامہ ''جنگ'' میں باچا خان نے حسبِ ذیل بیان دے کر بات صاف کر دی ہے کہ

''پختونستان کا اسٹنٹ افغانستان اور بھارت نے پاکستان کے خلاف پروپیگنڈے کے لیے بہ طور ہتھیار استعمال کرنے کی خاطر تیار کیا تھا۔ پختونستان سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ یہ صرف مخصوص مفادات کے لیے پنجاب کے بعض افراد ہمارے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔''

مسلم لیگ کے سابق رہنما ملک محمد قاسم سے نوائے وقت لاہور میں ایک طویل انٹرویو کے دوران نامہ نگار نے ایک سوال کیا کہ

''ولی خان اور غفار خان پاکستان کی بانی جماعت مسلم لیگ کے سربراہ حضرت قاید اعظم کی شان میں گستاخیاں کرتے ہیں اور ان کا موقف یہ ہے کہ مسلم لیگ انگریزوں کی ٹوڈی جماعت تھی۔ انگریزوں کے خلاف اصل جدوجہد تو سرخ پوشوں اور کانگریس نے کی۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟''

جواب: ''میں اس کا جواب نہیں دوں گا۔''

عبدالغفار خان کے بیان اور ملک محمد قاسم مسلم لیگی رہنما کے مختصر جواب کے بعد بات صاف ہو گئی۔ رہی عبدالقیوم خان کی بات تو سرحد کے قضیے کو پختونستان کا عنوان دے کر اپنے ذاتی وقار کے لیے اس نے اچھی خاصی عمر پائی تھی۔

اسی ضمن میں ہفت روزہ ''چٹان'' نے اپنی ۲۸ ردسمبر ۱۹۸۱ء کی اشاعت میں محمد یحییٰ جان سابق وزیرِ تعلیم صوبۂ سرحد کے ایک مضمون میں انکشاف کیا کہ

۲۶ رجولائی ۱۹۷۰ء کو بلوچستان کے نواب محمد اکبر خان بگٹی نے روز نامہ ''ڈان'' کے نمائندے کو ایک بیان دیتے ہوئے یہ انکشاف کیا تھا کہ انھوں نے پاکستان کے مرکزی حکومت کی نائب وزیرِ داخلہ کی حیثیت سے ایک فایل دیکھی ہے۔ جس میں انھوں نے عبدالقیوم خان کا نام ایک بیرونی حکومت کی ایجنٹوں کی فہرست میں دیکھا ہے۔ گیارہ سال

گزر چکے ہیں لیکن آج تک کسی نے اس بیان کی تردید نہیں کی۔"

(ہفت روزہ چٹان: ۲؍دسمبر ۱۹۸۱ء بہ حوالہ کاروانِ احرار: جلد ۸، ص ۲۸۴-۲۸۲)

ریفرنڈم، کانگریس اور خدائی خدمت گار:

باچا خان نے اپنی یادداشتوں میں ۴۷-۱۹۴۶ء کے واقعات بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ کس طرح پشتونوں پر بلا جواز ریفرنڈم مسلط کیا گیا اور خدائی خدمت گاروں کے بائیکاٹ کے باوجود اس کے نتائج ان پر ٹھونس دیے گئے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ریفرنڈم کے ان دنوں میں سر جارج کننگھم، گورنری سے سبک دوش ہو کر واپس جا چکے تھے۔ باچا خان کے لفظوں میں:

"جولائی ۱۹۴۶ء میں ہندوستان کے لیے آئین بنانے کی غرض سے میں اور مولانا ابوالکلام آزاد خدائی خدمت گاروں اور فرنٹیر اسمبلی کی طرف سے آئین ساز اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے تھے۔ ہمارے صوبے کے تین ممبر تھے۔ دو تو ہم تھے اور تیسرا ممبر ضلع ہزارہ کا باشندہ تھا۔ الیکشن میں صرف یہی ضلع ہزارہ تھا جس میں مسلم لیگ کو ووٹ ملے تھے اور مسلم لیگ کے امیدوار کامیاب ہوئے تھے۔ الیکشن میں اس قدر واضح اکثریت حاصل کر کے جس میں واضح مسائل پر ہم نے مقابلہ کیا تھا اور ایسے حالات میں جب کہ مسلم لیگ کو حکومت کی بھی پشت پناہی حاصل تھی اور ہندوستان کے تمام مسلم لیگی لیڈر اور ساری طاقت اور چالاکی ہمارے خلاف استعمال کی گئی تھی، ہماری کامیابی کا مطلب اس کے سوا اور کیا نکلتا تھا کہ ملک کی اکثریت ہماری پشت پر کھڑی تھی۔ لیکن اس کے باوجود جب ہماری نمائندگی کے سلسلے میں صوبۂ سرحد میں پھر سے ریفرنڈم کا حکم ہم پر ٹھونس دیا گیا تو ہمیں قدرتی طور پر اس صریح ظلم کے خلاف غصہ آیا اور ہم نے ریفرنڈم میں حصہ نہ لینے اور اس کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا، تاکہ دنیا کو ہمارے قہر، غصے اور ہمارے ساتھ کی گئی بے انصافی کا علم ہو جائے۔

وائسرائے کا یہ حکم نہ صرف منطق اور دلیل کے خلاف تھا، بلکہ ایک امتیازی یا استثنائی سلوک بھی تھا جو پشتونوں سے انگریزوں نے جاتے وقت روا رکھا، جسے ہم ہرگز برداشت نہیں کر سکتے تھے، جہاں سارے ہندوستان میں ایک صوبے کے ان نمائندوں سے جو اسمبلی میں موجود تھے پوچھا گیا کہ آیا وہ ہندوستان میں رہنا چاہتے ہیں یا پاکستان میں جانا چاہتے

ہیں؟ وہاں صوبہ سرحد کی اسمبلی کو یہ حق نہیں دیا گیا۔ صوبہ سرحد کی اسمبلی اور اس اسمبلی کے ممبروں کی نمایندگی اور نمایندہ حیثیت کو انگریزوں نے پس پشت ڈال دیا۔ یہ پشتونوں کی طرح پوری ملّت کی بے حرمتی تھی، جسے ہم کسی صورت میں بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

مجھے افسوس اور دکھ اس بات کا ہے کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے بھی ہمارے لیے کوئی غیرت نہ دکھائی اور ہماری حقیر سی امداد کے لیے بھی، جس کی ہمیں ان سے توقع تھی، ہمارے آڑے نہ آئی۔ اس نے ہمارے ہاتھ پاؤں باندھ کر ہمیں دشمنوں کے حوالے کر دیا۔ حال آں کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کی سنگ دلی، بے رخی اور بے حسی آسام کے صوبے کے حق میں ایسی نہیں تھی، جب کہ وہاں کے وزیر اعظم گوپی ناتھ باردولائی نے گروپ بندی ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ باردولائی کی چیخ و پکار اور شور کی وجہ سے کانگریس اس بات پر اڑ گئی اور گروپ بندی کی وہ اسکیم نہیں مانی تھی۔ حال آں کہ میں اس کا مخالف نہیں تھا۔ جب مجھ سے گاندھی جی نے دریافت کیا تو میں نے انھیں کہہ دیا تھا کہ ملک تقسیم کے سوائے ہر ایک اسکیم اچھی ہے۔ اس حال میں اور ایسے سلوک کے بعد ایک پٹھان کی حیثیت میں ہم سے یہ پوچھنا بے محل تھا کہ آیا ہم ہندوستان کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا پاکستان میں جانا چاہتے ہیں؟ چوں کہ کانگریس نے جو ہندوستان کی نمایندہ جماعت تھی ہمیں نہ صرف اپنے سے دور ہی پھینک دیا تھا بلکہ ہمیں دشمنوں کے حوالے کر دیا تھا۔ ان سے ملنا تو ہماری پٹھانی غیرت اور اخلاقیات و روایات کے لیے ایک طرح کی موت تھی۔ رہ گیا پاکستان کا مسئلہ تو اس مسئلے پر تو ہم نے مسلم لیگ کے مقابلے میں الیکشن لڑا تھا، پھر ہمیں نئے سرے سے بردردی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہم نے اسی وجہ سے مطالبہ کیا کہ ہمارے سامنے اگر کوئی ریفرنڈم کرانے کی تجویز رکھتا ہے تو بسم اللہ، وہ میدان میں آئے اور ''پشتونستان اور پاکستان'' کے مسئلے پر ریفرنڈم کر لیا جائے۔

ہمارے اس مطالبے پر بھی کسی نے کان نہ دھرا۔ ہم پر ریفرنڈم ٹھونس دیا گیا، چوں کہ ہم ریفرنڈم میں حصہ نہیں لے رہے تھے لہٰذا مسلم لیگ کے لیے میدان صاف تھا۔ ان سے جو چالاکی فریب اور زور زبردستی ہو سکتی تھی وہ انھوں نے کی لیکن پھر بھی وہ ایک سو میں سے پچاس اعشاریہ ایک ووٹ ہی مر مر کر لے سکی۔ جو ایک ملّت کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے کسی وجہ سے کافی نہیں تھے۔ انگریزوں نے نہ صرف ایک دیانت دار حکومت کی مانند

اپنے آپ کو ریفرنڈم میں غیر جانب دارانہ رکھا بلکہ انھوں نے خود براہِ راست ووٹوں میں اپنے پولیس اور فوج کے ذریعے حصہ لیا اور اپنی فوج اور پولیس کے ملازم جوق در جوق پولنگ اسٹیشنوں پر بھیجے کہ وہ ان لوگوں کے نام سے جعلی ووٹ ڈالیں جنھوں نے ریفرنڈم میں حصہ نہیں لیا تھا۔

اس سلسلے میں میرے ایک جیل خانے کے ساتھی کرنل بشیر نے ہری پور ہزارہ کے سنٹرل جیل میں ۱۹۸۵ء میں مجھے ایک داستان سنائی۔ اس وقت وہ فوج میں تھا اور اس کی کمپنی بنوں کے قریب لتمبر میں تعینات تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ تین مرتبہ اپنی کمپنی اور اس کے جوانوں کو پولنگ اسٹیشن پر لے گیا تھا تاکہ پاکستان کے حق میں ان سے جعلی ووٹ ڈلوائے۔ کرنل بشیر کو بعد میں محکمہ انٹیلی جنس میں ایک بڑا افسر مقرر کر دیا گیا تھا، جو آخر میں پنشن یافتہ ہو گیا تھا۔ ایک جرم میں دو سال کے لیے قید کی سزا ہوئی تھی اور وہ میرے ساتھ ایک ہی جیل میں رہتا تھا۔

سرحد کے ریفرنڈم کے سلسلے میں لاکھوں کی تعداد میں سرخ پوشوں یعنی خدائی خدمت گاروں کے ووٹ سرکاری ملازموں اور ان کے خوشہ چینوں یعنی مسلم لیگیوں نے جعلی طور پر بھگتائے تھے۔ کیوں کہ سرخ پوشوں نے ریفرنڈم کا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ چناں چہ خان امیر محمد خان کا جعلی ووٹ بھی ایسے ووٹوں میں شامل تھا۔ اور میرا جو اندیشہ تھا وہ درست ثابت ہوا۔

پاکستان کی اٹھارہ سالہ زندگی میں مجھے پندرہ سال جیل خانوں میں رکھا گیا ہے اور پھر ایسی قید میں جو خدا کسی کو نہ دکھائے، آمین...... اس عرصے میں ہزاروں کی تعداد میں خدائی خدمت گار موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ قید و بند میں مبتلا کیے گئے اور ان کے ساتھ ایسے ناروا سلوک ہوئے ہیں اور ان پر ایسے مظالم توڑے گئے ہیں جنھیں انسانیت برداشت نہیں کر سکتی۔

ہندوستان کی اس آئین ساز اسمبلی کا مسلم لیگ نے بائیکاٹ کیا تھا۔ میں نے مسلمان ممبروں سے اس مسئلے پر بڑی بحث کی تھی اور ان سے کہا تھا کہ آیئے! آئین ساز اسمبلی میں چلے جائیں گے اور اس میں تجویز پیش کر دیں گے کہ ہندوستان میں سوشلسٹ جمہوریت قایم کرنا چاہیے۔ نیز اگر ہندوؤں نے ہماری یہ بات مان لی تو ہم فیڈریشن میں رہ جائیں گے اور یہ اگر انھوں نے ہماری یہ بات نہ مانی تو ہم اپنے اپنے صوبوں میں فیڈریشن سے جدا

ہونے کی تجویزیں منظور کرلیں گے۔ یہ حق ہمیں حاصل ہے کہ فیڈریشن سے جدا ہو جائیں اور کہ ہمارا صوبہ ایک خودمختار ریاست بن جائے، لیکن مسلمانوں پر ایک ایسی چال چلائی گئی تھی کہ وہ کسی بات پر غور وفکر کرنے کے لیے بھی تیار نہیں تھے اور مجھے تو یہ ایک مستقل جواب دیتے تھے کہ "تم ہندو ہو۔"

خیر پاکستان بن گیا۔ کانگریسی وزارت کا واحد مسلمان صوبہ پاکستان میں شامل ہوگیا، لیکن مسلم لیگ نے اپنے آمرانہ طرزِعمل کے باعث اور جمہوری اصولوں کو پامال کرتے ہوئے ایک ہفتے کے اندر اندر خدائی خدمت گاروں کو ڈس مس کر دیا۔ وہ قیامِ پاکستان سے پہلے ہی اس وزارت کا خاتمہ چاہتے تھے، لیکن دوبارہ گورنر بننے والے جارج کننگھم نے قایدِ اعظم کے اس مطالبے کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد باچا خان اور ان کے ساتھی نئے وطن کی تعمیر وترقی میں حصہ لینا چاہتے تھے لیکن خان قیوم کو ڈر تھا کہ اگر قایدِ اعظم اور باچا خان متفق ہوگئے تو صوبے میں اس کی دال نہیں گل سکے گی۔ باچا خان اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں:

> "بٹوارہ ہو چکا تو میں نے کہا اب جب کہ پاکستان بن چکا ہے اور کانگریس اور مسلم لیگ نے تقسیم مان لی ہے تو میں اور میری پارٹی بغیر کسی قسم کا حصہ مانگے ملک وقوم کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ میری قوم پاکستان کی شہری اور وفادار ہے اور ہم اس ملک کی تعمیر وترقی میں پورا حصہ ادا کریں گے، لیکن پاکستانی حکومت پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا اور الٹا مجھ پر یہ الزام لگایا گیا کہ میں تعمیر کی آڑ میں تخریب چاہتا ہوں، لہٰذا مجھ کو گرفتار کرلیا گیا۔ مجھ پر قبالیوں سے ساز باز کا جھوٹا الزام لگایا گیا۔ اسی جرم میں میرے بیٹے ولی خان کو بھی پکڑ لیا گیا اور کچھ عرصے بعد ڈاکٹر خان صاحب اور عبدالغنی بھی گرفتار کر لیے گئے۔ بغیر کسی وکیل کے مجھے تین برس کی سزا دے دی گئی۔"
>
> (انگریز راج اور پشتون سیاست: ص ۱۲۷-۱۲۸)

نوآبادیاتی نظام — خاتمے کی مہر:

۱۸ر جولائی ۱۹۴۷ء: ۱۸ر جولائی ۱۹۴۷ء مطابق ۲۸ر شعبان ۱۳۶۶ھ یوم جمعہ کو

لندن سے رائٹر کا نامہ نگار خصوصی ''فریز روائی ٹن'' نے بہ ذریعہ تار مطلع کیا:

''آج برطانیہ کے حساب سے ٹھیک دس بج کر چالیس منٹ پر (جب کہ ہندوستان میں ٹھیک چار بج کر دس منٹ تھے) برطانوی دارالامرا میں امرا کے ایک رایل کمیشن نے تزک واحتشام اور شاہی رواسم کے ساتھ جس پر ولیم فاتح کے زمانے سے عمل درآمد ہوتا چلا آرہا ہے، ہندوستان کی آزادی پر شاہی منظوری کا اعلان کیا۔ اس طرح ہندوستان اور پاکستان کی دو عظیم الشان نوآبادیاں وجود میں آگئیں اور ہندوستان کے چالیس کروڑ باشندوں کو مکمل آزادی حاصل ہوگئی۔''

رائے لیول ۱۰۶۶ء کی نارمن فرانسیسی زبان میں پارلیمنٹ کے کلرک سر ہنری بیڈ نے یہ فیصلہ کن الفاظ کہے:

''بادشاہ سلامت اسے منظور فرماتے ہیں۔''

اس ایک جملے میں نوآبادیوں کا قیام اور وجود مضمر تھا۔

اس تزک واحتشام کی جو تفسیر اخبارات نے شایع کی وہ قرون وسطی کے بادشاہوں کے نقیب، چوب داروں، کفش برداروں اور زمین بوسی وغیرہ کے کہنہ مراسم وتخیلات کو زندہ کر رہی تھی۔

• یہ تھا خاتمہ اس جدوجہد کا جس کا آغاز کانگریس پلیٹ فارم سے ۱۸۸۵ء میں ہوا تھا۔ اس کی تائید وحمایت میں جمعیت علمائے ہند، کانگریس کے دوش بہ دوش قربانیاں پیش کرتی رہی۔ (علمائے حق اور.............: جلد ۸،ص ۲۹-۶۲۸)

تقسیم ملک اور ہندوستانی ریاستیں:

۲۵ر جولائی ۱۹۴۷ء: لارڈ ماؤنٹ بیٹن گورنر جنرل ہند نے ۲۵ر جولائی ۱۹۴۷ء کو ریاستوں کے تمام نواب، راجے، اور مہاراجے دہلی وایسرائے ہاؤس میں طلب کر لیے جن میں پچیس حکم ران اور پچھتر کے قریب باقی چھوٹی ریاستوں کے حکم ران شامل تھے۔ اس موقعہ پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ریاستی حکم رانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ

''چند دنوں تک انتقال اقتدار مکمل ہونے والا ہے اور تقسیم ہند کے نتیجے

میں دو نئی آزاد مملکتیں قایم ہونے والی ہیں۔ آپ یہ بات فراموش کر دیجیے کہ آپ ان دو مملکتوں کے بغیر اپنے وجود کو برقرار رکھ سکیں گے۔ میں نے سنا ہے کہ کچھ ریاستیں اپنے کو خود مختار اور آزاد رکھنے کے لیے اسلحہ کے ڈھیر جمع کر رہی ہیں۔ (یہ اشارہ نظام حیدر آباد کی طرف تھا)

آپ ریاستوں کے حکم رانوں نے تاج برطانیہ سے جس وفاداری کا ثبوت دیا ہمیں اس کی قدر ہے۔ میں آپ کو پھر یقین دلاتا ہوں کہ مجھے آج بھی آپ کے مفاد سب سے زیادہ عزیز ہیں۔ ایک دوست کی حیثیت سے آپ کو میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ آپ نئے ہندوستان میں مدغم ہونے کے لیے اپنے آپ کو تیار رکھیں۔

وی پی مینن اور سردار پٹیل نے اس سلسلے میں جو پیش کش کی ہے اس کی کاپیاں آپ کو مل گئی ہوں گی اور آپ نے ان کا مطالعہ کر لیا ہوگا اور کانگریس نے جو پیش کش کی ہے، وہ انتہائی غور وفکر کے بعد کی گئی ہے۔ آپ کا فرض ہے کہ اس پیش کش قبول کر لیں۔ مگر یاد رکھیں ۱۵ اگست کے بعد آپ کی ایک نہ چلے گی۔ سردار پٹیل نے میری سفارش پر آپ کے حقوق اور اعزازات بہ حال رکھنے پر ہاں کی ہے۔ اور یہ بھی اس لیے ہے کہ میں ابھی تک تاج برطانیہ کا نمایندہ ہوں۔ اور اگر آپ نے کانگریس کی اس پیش کش کو قبول نہ کیا تو پھر سردار پٹیل کو میں ۱۵ اگست کے بعد مجبور نہ کر سکوں گا کہ وہ آپ کے حقوق اور اعزازات کو بہ حال رکھے۔

آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ریاستی عوام کیا چاہتے ہیں۔ وہ آپ کی حکم رانی کی بجائے نئے اور آزاد ہندوستان کے ساتھ اپنی تقدیر کو وابستہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس خواہش کے راستے میں روڑے اٹکانے کی بجائے یہ بہتر ہے کہ آپ اپنے آپ کو نئے ہندوستان کے حوالے کر دیں۔ اگر آپ بھی اپنے آپ کو تاجِ برطانیہ کی جگہ ہندوستان کی قایم ہونے والی نئی حکومت سے وفاداری کا ثبوت دیں اور اپنی ریاستوں کو ہندوستان میں مدغم کر کے ایک نئے اور مضبوط ہندوستان کی بنیاد رکھیں تو یقین کیجیے کہ مستقبل میں آپ کے اس کارنامے پر

لوگ آپ کو خراجِ تحسین پیش کریں گے۔

آپ کانگریس کی اس پیش کش کو قبول کر لیں اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کانگریس آپ کے رتبے اور حقوق کو بحال رکھے گی۔"

اس مرحلے پر مہاراجہ بیکانیر اور مہاراجہ جے پور نے کہا کہ

"آپ نے جو فرمایا ہم دل سے اس کی قدر کرتے ہیں اور آج ہی اپنی ریاستوں کو ہندوستان میں مدغم کرنے کا اعلان کرتے ہیں۔"

اس کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے باقی ریاستوں کے حکم رانوں اور نمایندوں سے کہا کہ

"آپ نئی مملکت سے دور نہیں بھاگ سکتے۔ اس لیے اپنے دل کو مضبوط کیجیے اور ابھی مہاراجہ بیکانیر اور جے پور نے جس تدبر کا مظاہرہ کیا ہے اس پر آپ بھی لبیک کہیں۔ اگر آپ ہندوستان میں شامل نہ ہوئے تو پھر آپ کی ریاستوں کے عوام زبردستی ہندوستان کے ساتھ مدغم ہو جائیں گے اور آپ کا وجود بھی برداشت نہیں کریں گے۔"

اس کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مختلف حکم رانوں کے نام لے کر ان سے پوچھا کہ کیا وہ متفق ہیں؟ ان میں بعض انتہائی چھوٹی ریاستوں کے راجاؤں نے ماؤنٹ بیٹن کی زبان سے اپنا نام سنتے ہی کھڑے ہو کر ہاں میں ہاں ملا دی۔

کچھ ریاستی نمایندوں نے کہا ہمارے حکم رانوں نے اس بارے میں ہمیں کوئی ہدایت دے کر نہیں بھیجا اور نہ ہی ہم کو یہ اختیار حاصل ہے کہ ہم اس اہم فیصلے کو اپنی مرضی سے طے کر سکیں اور اس کے لیے ہمیں کچھ مہلت چاہیے۔ اس پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے تلخ لہجے میں کہا کہ ۲۷ر جولائی تک آپ کو مہلت ہے۔

بالآخر ۲۸ر جولائی ۱۹۴۷ء کو تمام ریاستوں نے ہندوستان یونین میں شمولیت کے فیصلے پر دستخط کر دیے۔ (عہد لارڈ ماؤنٹ بیٹن: ص ۱۹۴، بہ حوالہ روزنامہ مشرق: ۱۸ر مارچ ۱۹۸۴ء)

ہندوستان کا قومی جھنڈا اور لیگی رہنما:

۲۷ر جولائی ۱۹۴۷ء: ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی کا اجلاس ۲۷ر جولائی کو شروع

ہوا۔ اس میں قومی جھنڈے کے بارے میں پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک تجویز پیش کی، اس پر مختلف ارکان اسمبلی نے تقاریر کیں اور تجاویز پیش کیں۔ اس موقع پر ہندوستان کے مسلم لیگی ارکان نے ان خیالات کا اظہار کیا۔

مدراس مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر اسماعیل نے کہا کہ

"مدراس کے مسلمان اول ہندوستانی اور اس کے بعد مسلمان ہیں۔ ہر سچا مسلمان ہندوستانی اور سچا مدراسی بھی ہے۔ میرے اس نظریے کی تائید قرآن و حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر اقلیت والے صوبوں کی حکومتوں نے مسلمانوں کے ساتھ اچھا سلوک نہ کیا تو کیا پاکستان ہماری امداد کے لیے ہندوستان کے خلاف کوئی فوجی کارروائی کرے گا؟ نہیں۔ ایسا بالکل ممکن نہیں اور اسی خیال سے میں اقلیت والے صوبوں کے مسلمانوں کو مشورہ دے رہا ہوں کہ اگر واقعی سچے مسلمان ہیں تو سب سے پہلے سچے ہندوستانی بنیں۔ میرا یہ خیال کسی غلطی پر مبنی نہیں ہے۔ حتیٰ کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے آپ کو قومیت و وطنیت کی طرف منسوب کرتے ہوئے خود کو ہاشمی العربی کہا ہے۔ اگر ہم اس کے خلاف کوئی طریقہ اختیار کریں گے اور اپنے آپ کو پہلے مسلمان اور بعد میں ہندوستانی قرار دیں گے تو ہم اپنے ہی دیش میں غیر ملکی بن کر رہ جائیں گے۔"

اسی طرح آسام کے سابق وزیراعظم مسٹر سعد اللہ نے اعلان کیا کہ

"مسلمان انڈین یونین کے وفادار رہیں گے۔"

ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی میں مسلم لیگ کے لیڈر چودھری خلیق الزماں جنھیں ۱۲ر جولائی کو مسلم لیگ نے اپنا لیڈر منتخب کر لیا تھا اس موقعہ پر کہا:

"ہندوستان کے مسلمان اس جھنڈے کے وفادار رہیں گے۔ ہندوستان کا ہر مسلمان اس جھنڈے کی عزت اور احترام کرے گا، اس پر فخر کرے گا، اور ہندوستان کے وفادار شہری کے طور پر اس جھنڈے کے وقار کو بڑھانے کی کوشش کرے گا۔

تمام وفادار شہریوں کا فرض ہے کہ جھنڈے کی عزت کی حفاظت کریں۔

میں ہندوستان کے تمام لوگوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ گزشتہ چند سالوں کے
واقعات کو بھول جائیں اور اکٹھے مل کر ملک کی نئی تاریخ مرتب کریں۔"
(ہفت روزہ "قومی آواز" لکھنؤ: ۳۰ر جولائی ۱۹۴۷ء)

چودھری خلیق الزماں نے اپنی کتاب "شاہ راہِ پاکستان" میں بھی اپنی اس تقریر کا مفصل ذکر کیا ہے۔ اس میں انھوں نے کہا:

"مسٹر جناح نے ۶ر جولائی کے بیان کے مطابق کہ اقلیتوں کو اپنی اسٹیٹ کا وفادار رہنا چاہیے، میں نے بھی خوش دلی کے ساتھ ایک تقریر کر کے پنڈت جواہر لال کی تائید کی۔" (صفحہ: ۱۰۶۶)

گویا کہ اگر جناح صاحب اقلیتوں کو وفاداری کا سبق نہ دیتے تو چودھری صاحب وفادار نہ ہوتے؟ پنڈت جواہر لال نہرو کی تقریر کی تائید نہ کرتے یا کرنے پر مجبور ہوتے تو خوش دلی سے نہ کرتے، یاللعجب۔

خلیق الزماں صاحب کا اظہار وفاداری:

۲۷ر جولائی ۱۹۴۷ء: ۲۷ر جولائی ۱۹۴۷ء کو جب بھارت کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی میں جھنڈے کا مسئلہ پیش ہوا اور چودھری خلیق الزماں نے جھنڈے پر اپنی تجویز پیش کی تو سب سے پہلے انھوں نے مسلمانانِ ہندوستان کی طرف سے کانگریسی رہنماؤں کو یقین دلاتے ہوئے کہا کہ

"ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ قومی جھنڈے کا احترام کرے، اگرچہ یہ کپڑے کا ایک ٹکڑا ہے، لیکن یہ قوم کی عزت کا نشان ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہر مسلمان اور عیسائی اس جھنڈے کے وفادار رہے گا۔ ہندوستان کا ہر مسلمان اس جھنڈے کی عزت اور احترام کرے گا اور فخر کرے گا اور ہندوستان کے وفادار شہری کے طور پر اس جھنڈے کے وقار کو بڑھانے کی کوشش کرے گا۔
میں ہندوستان کے تمام لوگوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ گزشتہ چند سالوں کے واقعات کو بھول جائیں اور ایک ساتھ مل کر اس جھنڈے کی نئی تاریخ مرتب کریں۔" (کاروانِ احرار: جلد ۸، ص ۳۶۹)

۲۸ر جولائی ۱۹۴۷ء: اسی طرح آسام کے سابق وزیر اعظم اور ڈپٹی لیڈر مسلم لیگ پارٹی سر سعد اللہ نے اعلان کیا کہ

"آسام کے مسلمانوں کی طرف سے میں یقین دلاتا ہوں کہ وہ انڈین یونین اور جھنڈے کے وفادار رہیں گے۔ میں جھنڈے کو سلام کرتا ہوں۔ میرے خیال میں یہ جھنڈا نشان ہے ہماری تمناؤں کا۔ ہماری جدوجہد کی کامیابی اور ہماری قربانیوں کا۔"

(ہفت روزہ "قومی آواز" - دہلی: ۲۸ر جولائی ۱۹۴۷ء)

تقسیم ملک اور جمعیت علماے ہند:

۳ر جون ۱۹۴۷ء کے پلان کے متعلق جمعیت علماے ہند کی راے معلوم ہے۔ جمعیت اس فیصلے کو ملک کے فرقہ وارانہ مسایل کا حل نہیں سمجھتی تھی۔ اور جیسا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کا خیال تھا کہ ملک کی تقسیم اور پاکستان کا قیام ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کے مسایل کا حل نہیں ہے۔ پاکستان کے قیام سے جتنے مسایل حل ہوں گے اس سے زیادہ پیدا ہو جائیں گے۔ جمعیت علماے ہند کی راے بھی یہی تھی۔ انھیں خیالات کا اظہار مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے برہان میں اڈیٹوریل صفحات میں بہ ذیل "نظرات" کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

"آخر وایسراے کے اعلان مورخہ ۳ر جون کے مطابق ہندوستان تقسیم در تقسیم ہو کر دو مختلف مستعمراتی حکومتوں کی شکل میں بٹ گیا۔ یہ ہندوستان کے حق میں عموماً اور مسلمانوں کے لیے خصوصاً برا ہوا یا اچھا! اس کا فیصلہ مستقبل کرے گا۔ البتہ جہاں تک ان اسباب کا تعلق ہے جن کے باعث یہ صورتِ حال پیش آئی ہے، ان کے پیشِ نظر یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اگر دونوں حکومتوں کو خوش حالی اور امن و عافیت کے ساتھ ترقی کرنا ہے تو انھیں اُن اسباب کا خاطر خواہ تدارک کرنا ہوگا اور اس کی کوشش کرنی ہوگی کہ اب دوبارہ ان چیزوں کا اعادہ نہ ہونے پائے، جنھوں نے ہمارے ماضی قریب کے زمانے کو تلخ کامیوں،

ناگواریوں اور صبر آزما مصایب و آلام کا افسوس ناک مرقع بنا کر رکھ دیا ہے۔

اگر زندگی کی بنیاد فضایل اخلاق، شرافتِ نفس، باہمی رواداری اور عدل و انصاف پر قایم ہو اور خود غرضی، اقتدار سے ناجایز فایدہ اٹھانے کا جذبہ اور ظلم و عدوان سے دامن پاک ہو تو دو شخص مل جل کر رہیں یا الگ الگ، بہ ہر حال کسی صورت میں بھی امن کو نقصان نہیں پہنچ سکتا ہندو اور مسلمانوں میں چولی دامن کا جو رشتہ قدرتی طور پر صدیوں کی سعی رفو گری کے بعد پیدا ہو چکا ہے۔ وہ ہندوستان میں دو یونین بن جانے کے بعد بھی نہیں مٹا اور نہ مٹ سکتا ہے۔ مختلف صوبوں میں ان دونوں قوموں کی جو پوزیشن پہلے تھی اب بھی ہے۔ ایک یونین میں ہندوؤں کی غالب اکثریت ہے اور مسلمان اقلیت میں ہیں اور دوسری یونین میں مسلمانوں کو غالب اکثریت حاصل ہے اور ہندو اقلیت میں ہیں۔ جس طرح ایک یونین میں اقلیت اکثریت کے ساتھ شریکِ حکومت ہوگی دوسری یونین میں بھی یہی ہوگا۔

موجودہ زمانے میں کسی ایک قوم کے لیے یہ قطعی ناممکن ہے کہ وہ کسی اقلیت پر مطلق العنانی کے ساتھ حکومت کرے اور اس کے جایز شہری حقوق کا کوئی خیال نہ رکھے۔ یہ سب باتیں دورِ جاگیرداری کی یادگار ہیں جو فنا ہوتی جا رہی ہے اور دنیا کے نظامِ نو میں اب اس کے لیے کوئی گنجایش نہیں ہے۔ جرمنی، اٹلی، جاپان اور سب سے آخر میں برطانوی شہنشاہیت۔ ان سب کا عبرت انگیز انجام سب کے سامنے ہے۔ ان سے سبق لینا چاہیے۔

لیکن اگر کوئی شخص یہ خیال کرتا ہے کہ تقسیم ہند کے بعد تمام معاملات سلجھ جائیں گے اور ملک پر بدقسمتی و تیرہ نصیبی کے جو بادل چھائے ہوئے ہیں وہ چھٹ جائیں گے، تو سخت غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ اصل یہ ہے کہ جب تک زندگی کے متعلق صحیح نقطۂ نظر پیدا نہیں ہوتا۔ جس کا دونوں جگہ فقدان ہے، ہماری مشکلات رفع نہیں ہو سکتیں۔ اس وقت جو کچھ ہوا ہے اسے انقلاب کا صرف ایک رخ سمجھنا چاہیے۔ عوام روز بہ روز بے دار ہوتے جا رہے ہیں۔ ان میں اپنی مشکلات اور اپنے حقوق کا احساس روز افزوں ترقی پر ہے۔ دوسری جانب اقتدار و اختیار، جن ہاتھوں میں آہستہ آہستہ منتقل ہو رہا ہے ان کا حال یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ ذہنیت نے ان کے دل و دماغ کو جکڑ رکھا، اور قومی عصبیت نے ان کو حقایق کی طرف سے اندھا بنا دیا ہے۔ اس صورتِ حال کا لازمی نتیجہ ایک شدید تصادم کی شکل میں ظاہر ہوگا۔ اس وقت تک کی کش مکش و نزاع کا سبب مذہب کا اختلاف اور قومیت کا فرق و امتیاز تھا۔ لیکن

موجودہ صورتِ حال کی تہ میں شدید ترین انقلاب کی جو موجیں کروٹیں بدل رہی ہیں وہ اس بات کا کھلا اعلان ہیں کہ ملک میں دو مستعمراتی حکومتوں کے قایم ہونے کے فوراً بعد اقتصادی اور معاشی بنیاد پر نئی نئی پارٹیاں ابھریں گی اور ان کے اثر ونفوذ کے باعث ہندوستان اور پاکستان ایک شدید ترین طبقاتی جنگ میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اس بنا پر شیوۂ دانش مندی یہ ہے کہ دونوں حکومتیں مستقبل قریب میں پیش آنے والے واقعات کا ابھی سے جایزہ لے کر ان کی روک تھام کی کوشش کریں اور اس کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ اکثریت اور اقلیت کے تعلقات میں حقیقی طور پر خوش گواری پیدا کی جائے اور مذہب کے نام پر ہرگز کوئی ایسی حرکت نہ کی جائے جس سے اشتعال پیدا ہو اور نوبت خون خرابے تک پہنچے۔ پھر ملک کو اقتصادی طور پر خوش حال بنانے کی ہر ممکن سعی کرنی چاہیے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ ملک کے سرمایے کو کسی ایک طبقے کے اندر محدود کرنے کے بجاے اس کو تمام افراد پر تقسیم پھیلا دیا جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ موجودہ پلان کو دونوں پارٹیوں کا قبول کر لینا دونوں کی کھلی شکست اور صرف انگریزی سیاست کی جیت ہے۔ اس واضح اور الم نشرح حقیقت کے باوجود لیگ کا اس پر خوشی کے شادیانے بجانے اور دوسری جانب سردار پٹیل اور پنڈت پنتھ ایسے ذمہ دار ہندوؤں کا اس اسکیم کی مدح میں رطب اللسان ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ ہمارے اربابِ سیاست حقایق پذیری سے کتنے دور ہیں۔

جہاں جذبہ یہ ہو کہ میں نے کیا پایا اور دوسرے کو کیا ملا۔ اور جہاں آپس کے معاملات کو طے کرنے کے لیے ایک ایسے شخص کو پنچ بنا کر اس کے فیصلے کو بہ خوشی قبول کر لیا جاتا ہو جو دونوں کا جانا پہچانا دشمن ہو اور جس کی شاطرانہ چالیں کسی دلیل و گواہ کی محتاج نہ ہوں اور جو ہاتھ پاؤں کٹ جانے کے بعد بھی اپنے سر کو صاف بچا لے جانے کے فن میں طاق ہو۔ وہاں عوام کی فلاح و بہبود کی توقع کیوں کر اور کس حد تک ہو سکتی ہے؟ اس کا جواب صرف مستقبل دے گا۔

فانتظروا انی معکم من المنتظرین.

(برہان۔ دہلی: جولائی ۱۹۴۷ء: ص ۲ تا ۴)

لیکن ہمارے بزرگوں کی یہ بڑی حقیقت پسندی ہے کہ پاکستان اسکیم کے بارے

میں یہ خیالات رکھنے کہ باوجود جب پاکستان بن گیا اور تصور نے ایک شکل اختیار کر لی تو اس کی مخالفت میں یا اس کے وجود کو مٹا دینے کی سعی کا تصور بھی دل میں نہ لائے اور ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں اپنے رہنماؤں، کارکنوں اور منتسبین کو گردوپیش کے حالات کے مطابق ملک اور عوام کی خدمت میں مصروف ہو جانے کی تلقین فرمائی۔

ہندوستان سے جناح صاحب کی پاکستان کے لیے پرواز:

۷/اگست ۱۹۴۷ء: محمد علی جناح نے آج وہ پوشاک پہنی تھی جو وہ بہت کم پہنتے تھے۔ وہ چوڑی دار پاجامے اور شیروانی میں تھے۔ آج وہ کراچی پرواز کرنے والے تھے۔ ان کی پرواز کے لیے وایسرائے نے انھیں چاندی کے رنگ کا خوب صورت ڈی.سی-۳ طیارہ پیش کیا تھا۔

ڈی.سی-۳ کی ساری سیڑھیاں چڑھنے کے بعد انھوں نے اچٹتی ہوئی نظر اس شہر پر ڈالی جہاں انھوں پاکستان کے خواب کو حقیقت بنانے کے لیے برس ہا برس صرف کیے تھے۔ ان کے ذہن میں یہ خیال آیا ''شاید میں دہلی کو دوبارہ نہ دیکھ سکوں گا۔''

۱۰- اورنگ زیب روڈ کا ان کا مکان فروخت ہو چکا تھا۔ اسے سیٹھ ڈالمیا نے خریدا تھا۔ دل چسپ بات یہ تھی کہ جس مکان میں پاکستان کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا وہ اس مکان میں گاؤکشی کے خلاف تحریک کا صدر دفتر بنانا چاہتے تھے۔

جناح نے کراچی تک اپنی پرواز بہت خاموشی سے طے کی۔ ان کا چہرہ اس طرح پتھرایا ہوا تھا کہ کامیابی کے کسی ردِعمل کی کوئی پرچھائیں ان کے چہرے پر نظر نہیں آتی تھی۔

کراچی آنے پر جناح کے اے.ڈی.سی. سید احسان نے دیکھا کہ ہوائی جہاز کے نیچے چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے آس پاس ساری زمین آدمیوں سے پٹی ہوئی ہے۔ لوگوں کے سفید کپڑے دھوپ میں چمک رہے ہیں۔ ایسا لگتا تھا کہ ساری زمین سفید جھیل بن گئی ہے۔

جناح کی بہن نے خوش ہو کر کہا— جن! دیکھو تو!

جناح نے ٹھنڈی نظروں سے کھڑکی کے باہر دیکھا۔ جن عوام کے لیے انھوں نے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا اور حاصل کر لیا تھا، ان کا لہراتا ہوا سمندر واقعی دل کو خوش کرنے والا منظر تھا۔

جناح نے مدھم لہجے میں کہا — ''ہاں..... بہت سارے لوگ ہیں۔''

ڈی.سی.-۳ اُڑان پٹی پر دوڑ کر رک گیا۔ فضائی سفر نے جناح کو اس درجہ تھکا دیا تھا کہ انھیں اپنی سیٹ سے اُٹھنے میں تکلف ہو رہا تھا۔ ایک ساتھی نے انھیں بانہوں کا سہارا دینا چاہا، جناح نے فوراً مخالفت کی۔ انھوں نے دل میں کہا کراچی تو اپنا گھر ہے، اپنے گھر لوٹتے وقت قایدِ اعظم کو کسی سہارے کی ضرورت پڑے؟ ناممکن!

جناح کے اندر جسمانی قوت کی کمی ضرور تھی۔ لیکن قوت ارادی نے ہمیشہ ان کا ساتھ دیا۔ اسی کے سہارے وہ تن کر کھڑے ہو گئے۔ بغیر کسی کا سہارا لیے وہ ہوائی جہاز کی سیڑھیاں اُترے۔ ان کو دیکھتے ہی لوگ خوشی سے جھومنے اُچھلنے لگے۔ بھیڑ میں سے گزرتے ہوئے وہ انتظار میں کھڑی اپنی کار تک پہنچے۔ راستے میں بھی انھوں نے کسی کا سہارا نہیں لیا۔

ہزاروں کی اس بھیڑ کی زبان پر بس ایک ہی نعرہ تھا جسے وہ پورے جوش وخروش سے لگا رہے تھے ''پاکستان زندہ باد!''

گورنمنٹ ہاؤس کو پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی سرکاری رہایش گاہ بنایا گیا تھا۔ وہاں پہنچ کر پہلی بار جناح کے چہرے سے خوشی کے تاثرات ظاہر ہوئے۔ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ انھوں نے اپنے اے.ڈی.سی. سید احسان سے کہا:

''جانتے ہو؟ مجھے امید نہیں تھی کہ میں جیتے جی پاکستان کو دیکھ سکوں گا۔'' (آدھی رات کی آزادی: ص ۶۰-۱۵۹)

پاکستان میں جناح صاحب کا ورود:

۷راگست ۱۹۴۷ء: ۷راگست ۱۹۴۷ء کو مسلم لیگ کے صدر قایدِ اعظم محمد علی جناح معہ اپنی ہمشیرہ اور دوسرے عملے کے پاکستان کے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالنے کے لیے والیسرائے کے ڈکوٹہ ہوائی جہاز کے ذریعے جسے ایک انگریز پائلٹ ڈی.ڈبلیو.ایل. چلا رہا تھا، کراچی روانہ ہوئے۔ کراچی پہنچنے پر ماری پور کے ہوائی اڈے پر مسلمانوں کے بے پناہ ہجوم نے قایدِ اعظم کا فلک شگاف نعروں سے استقبال کیا۔ ہوائی اڈے سے گورنمنٹ ہاؤس تک قایدِ اعظم کا جلوس جن بازاروں سے گزرا، ہزاروں شہریوں نے انھیں خوش آمدید کہا۔

قایدِ اعظم کے کراچی روانہ ہونے پر سر محمد یامین کہتے ہیں:

''قایدِاعظم کے جانے سے ہندوستان کے مسلمانوں کے پیر اُکھڑنے لگے۔ میں نے ۸/ اگست کو لیاقت علی خان کو فون کیا اور دریافت کیا کہ آپ کا کیا ارادہ ہے؟ آیا آپ بھی پاکستان جائیں گے؟ جب کہ آپ پاکستان کے باشندے نہیں ہیں اور نہ چنذری گر ہیں، اگر آپ گئے تو یہاں کی فضا بہت خراب ہو جائے گی۔ اگر چہ میں جانتا ہوں کہ آپ نے ذاتی طور پر کانگریس والوں سے ایک قسم کی رنجش پیدا کر لی ہے۔ تاہم جو اوروں کا حشر ہوگا وہی آپ کا ہونا چاہیے۔ اگر آپ یہاں سے چلے گئے تو خدا معلوم کیا ہو۔ لیاقت علی خان نے کہا کہ انھوں نے ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ تاہم ایک دو روز بعد لیاقت علی خان بھی دہلی سے کراچی پہنچ گئے۔'' (نامۂ اعمال: ص ۱۳۲۶)

پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کا اجلاس:

۱۳/ اگست ۱۹۴۷ء: پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کا مسٹر محمد علی جناح کی صدارت میں آج دوسرا اجلاس ہوا۔ اس میں طے کیا گیا کہ مسٹر محمد علی جناح صدر آئین ساز اسمبلی و نامزد گورنر جنرل پاکستان کو قایدِ اعظم محمد علی جناح گورنر جنرل پاکستان آیندہ ۱۵/ اگست کی تاریخ سے لکھا جائے گا۔

یہ قرارداد مسٹر لیاقت علی خان وزیرِ اعظم پاکستان نے پیش کی تھی۔

جناح صاحب کا ترکِ وطن — افواہیں اور حقیقت:

اِسی سنٹرل اسمبلی (دہلی) میں قایدِ اعظم گروپ کے ڈپٹی لیڈر اور آل انڈیا مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کے ممبر سر محمد یامین کہتے ہیں:

''سب سے بڑا اہم واقعہ یہ ہے کہ قایدِ اعظم محمد علی جناح نے اپنی کوٹھی ڈالمیا کے ہاتھ اس سے کئی گنا قیمت پر فروخت کر دی جس قیمت میں خریدی تھی۔ سیٹھ ڈالمیا کی سیمنٹ فیکٹری کراچی میں ہے، جو کہ پاکستان کا دارالسلطنت مقرر کیا جا رہا ہے۔ وہاں ایک کوٹھی قایدِ اعظم نے سنا ہے کسی پارسی سے خریدی ہے اور خود دہلی سے کراچی منتقل ہو رہے ہیں۔ اس نے تمام دہلی

میں ہل چل مچادی ہے اور سوداگروں میں کھلبلی سی پڑ گئی ہے۔ اب تک تو سب اس خیال میں تھے کہ پاکستان علاحدہ ہو جائے گا تو ادھر کے آدمی اِدھر اور اُدھر کے آدمی اُدھر رہیں گے۔ اور قائدِ اعظم جن کی صحت خراب ہے، وہ سیاست سے کنارہ کش ہو کر بمبئی میں قیام کریں گے اور پاکستانیوں پر پاکستان چھوڑ دیں گے۔ مگر قائدِ اعظم کے پاکستان جانے سے رنگ بدل گیا۔ اور لوگ حیران ہوئے کہ ایسا کیوں کیا، اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اُدھر کے آدمی اِدھر اور اِدھر کے اُدھر بھاگیں گے۔" (نامۂ اعمال حصۂ دوم: ص ۲۶-۱۳۲۵)

حد بندی کمیشن کی کارگزاری:

۷/اگست ۱۹۴۷ء: مزید برآں باؤنڈری کمیشن جو اختلافی اور نزاعی حدود کے تصفیے کے لیے مقرر کیا گیا تھا، بدقسمتی سے وہ ایسے فیصلے کے تلاش کرنے میں کامیاب ہوا جو مخصوص طور پر مسلمانوں کے لیے اشتعال انگیز تھا۔

پنجاب خفیہ پولیس کے کمشنر "مسٹر جین کنس (Jenkins) نے برطانوی خفیہ پولیس کے افسر اعلا کو ۷/اگست ۱۹۴۷ء کو پنجاب کلب لاہور سے ایک خفیہ خط لکھا تھا جو کسی صورت سے لندن میں پکڑ لیا گیا اور اخبارات میں شایع کرا دیا گیا۔

مسٹر جین کنس اس خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"امید یہی ہے کہ حد بندی کمیشن کے فیصلے سے مسلمانوں میں بے چینی بڑھ جائے گی۔ اگر ایسا ہوا تو بھی میرے خیال میں مسلمان برطانوی حفاظت کے زمرے میں رہنا پسند کریں گے۔"

اس خط پر تبصرہ کرتے ہوئے پاکستان ٹائمز نے لکھا تھا، پنجاب کے سابق گورنر سر ایوان جین کنس کے رویے پر مزید روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ اس خط سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری بہت سی مشکلات کا سرچشمہ ہمارے یہ سابق حکمران ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب برطانوی حکام انتقال اختیارات کے سلسلہ میں ہمارے لیڈروں سے بات چیت کر رہے تھے تو یہ برطانوی افسر ہمارے ملک میں خفیہ ایجنٹوں کا جال بچھا کر سازش کی تیاری کر رہے تھے۔

مسٹر جین کنس کو کس طرح معلوم تھا کہ حد بندی کمیشن کا فیصلہ مسلمانوں کے لیے بے چینی کا موجب بنے گا۔ کیا ہم یہ سمجھیں کہ حد بندی کا فیصلہ پہلے ہی کیا جا چکا تھا۔ غیر منصفانہ فیصلے سے ہی پاکستان اور انڈیا کے درمیان ناخوش گوار تعلقات پیدا کیے جا سکتے تھے۔ اور مسلمانوں کے ساتھ اس لیے ناانصافی کی گئی کہ وہ کم زور پارٹی تھے اور اشتعال کے نتیجے میں جب دوسری مصیبتوں سے پریشان ہوں تو لامحالہ انگریز کو یاد کریں اور اس کی مدد کے محتاج ہو کر شاطرانِ برطانیہ کے پھندے میں دوبارہ پھنس جائیں۔

(نیا دور، انصاری وغیرہ) (خطبۂ صدارت جمعیت علمائے ہند: اجلاس عام منعقدہ بمبئی ۱۹۴۸ء، ص ۱۳)

گورداس پور کی علاحدگی:

تقسیم ضلع گورداس پور کے متعلق دو ہفتہ قبل مال آفیسر فتح سنگھ نے اپنے پٹواری دولت رام کو اطلاع دے دی تھی کہ تین تحصیلیں گورداس پور سے الگ کر دی گئی ہیں۔ کیوں کہ مرزائیوں نے جن کی تعداد قادیان میں چودہ ہزار ہے، انھوں نے اپنے آپ کو مسلمانوں سے علاحدگی کا مطالبہ کیا ہے۔ (روزنامہ ویر بھارت: لاہور)

مسلم لیگ نے اپنے میمورنڈم میں پٹھان کوٹ تحصیل کو کیوں بھارت کے حوالے کیا؟ جب کہ کشمیر جانے کے لیے صرف یہی ایک راستہ تھا۔

نواب سر شاہ نواز پیشتر سے اپنی ایک تجویز کے ذریعے پاکستانی پنجاب سے انبالہ ڈویژن الگ کرنے کا خود مطالبہ کر چکے ہیں۔ (کاروانِ احرار: جلد ۸، ص ۴۱۲)

فوج کی تقسیم اور فوجیوں کے احساسات:

۱۳/ اگست ۱۹۴۷ء: پندرہ اگست کو پنجاب اور بنگال کے سیکڑوں دیہاتوں میں ہزاروں لوگوں نے خوشی کے مارے اچھل اچھل کر جشن نہیں منایا۔ ان کے ذہن میں الجھن اور بے چینی تھی، کیوں کہ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ ہندوستان میں ہوں گے یا پاکستان میں؟

ریڈ کلف نے آئی.سی.ایس. افسروں کی مدد سے ۱۳/ اگست کو دو بھورے بڑے لفافوں میں مہر بند کر کے تقسیم کی حدوں کے بارے میں رپورٹ وائسرائے ہاؤس پہنچا دی۔ ماؤنٹ بیٹن کی ہدایت پر اس رپورٹ کو ایک ہرے رنگ کے ڈسپیچ بکس میں بند کر دیا گیا۔

جہاں اسے آیندہ ۷۲ گھنٹوں میں بند رہنا تھا۔

ہندوستانی فوج کی بارکوں اور چھاؤنیوں میں ہندو، سکھ اور مسلمان سپاہی ایک دوسرے کو جذباتی انداز میں الوداع کہہ رہے تھے۔ انھوں نے مشترکہ پریڈ کی، دعوتیں کیں، ناچے کودے، چیخے چلائے، ہنسے، قہقہے لگائے، ایک دوسرے کی صحت کے جام پیے، سیٹیاں ماریں، بھانگڑا کیا۔ راول پنڈی کے مسلمان سپاہیوں نے اپنے سکھ اور ہندو ساتھیوں کی شان دار دعوت کی۔ ہندو اور سکھ افسروں نے آنکھوں میں آنسو بھر کر اپنے مسلمان بھائیوں کا شکریہ ادا کیا اور رخصت ہونے کی اجازت مانگی۔

اس کے جواب میں کرنل محمد ادریس نے کہا:

> ''آپ چاہے جہاں بھی جائیں، یہ نہ بھولیں کہ ہم ہمیشہ بھائی بھائی رہیں گے، کیوں کہ ہمارا خون کئی موقعوں پر ساتھ ساتھ بہا ہے۔''

مجوزہ پاکستانی فوج کے صدر دفتر سے محمد ادریس کو ہدایت موصول ہوئی تھی کہ ہندوستان جانے والے فوجیوں کے ہتھیار رکھوا لیے جائیں۔ ادریس نے اس ہدایت پر عمل نہیں کیا۔

> ''یہ سچے سپاہی ہیں۔ یہاں وہ اپنے ہتھیاروں کے ساتھ آئے تھے، جاتے وقت بھی ہتھیار ان کے ساتھ رہیں گے۔''

اگلی صبح کو وہ فوجی جو محمد ادریس کی کمان میں کبھی ساتھ ساتھ لڑ چکے تھے، صرف اس لیے زندہ بچ گئے کہ کرنل ادریس نے ان کے ہتھیار نہیں رکھوائے تھے۔

(آدھی رات کی آزادی: ص ۶۱-۱۶۰)

گورنر جنرل پاکستان — حلف وفاداری کی تقریب:

ٹھیک تین بجے سہ پہر گورنمنٹ ہاؤس میں اس تاریخی تقریب کا آغاز ہوا۔ پیشتر سے معززین مرد و زن اپنی اپنی نشست پر براجمان تھے۔ قاید اعظم بھی اس کرسی پر جو ڈائس پر ان کے لیے بہ طور گورنر جنرل آف پاکستان مخصوص تھی تشریف فرما تھے۔ اتنے میں پنجاب ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر میاں عبدالرشید اپنے روایتی لباس میں ہال میں داخل ہوئے۔ معاً ان کی نظر اس کرسی پر پڑی جس پر قاید اعظم فروکش تھے۔ اسے انھوں نے توقع اور انتظامات کے خلاف سمجھ کر پروٹوکول کے انچارج کو فوراً اپنے پاس بلا کر کہا کہ

''قایدِ اعظم سے کہیں کہ وہ حلف لینے سے پہلے اس کرسی پر نہیں بیٹھ سکتے۔ کیوں کہ یہ گورنر جنرل کے لیے مخصوص ہے اور آپ عہدے کا حلف لینے سے پہلے بابائے قوم ہونے کے باوجود آپ کی پوزیشن ایک شہری کی ہے۔''

اس پر قایدِ اعظم ڈائس پر سے اٹھے اور پہلی قطار میں ایک کرسی پر تشریف فرما ہو گئے۔ اس ضابطے کی کارروائی کے بعد چیف جسٹس ڈائس کی طرف آئے اور پروٹوکول آفیسر نے اعلان کیا کہ اب قایدِ اعظم محمد علی جناح بہ طور گورنر جنرل پاکستان اپنے عہدے کا حلف اٹھائیں۔ اس پر قایدِ اعظم اپنی کرسی سے اُٹھے اور ڈائس کی طرف آئے۔ چیف جسٹس نے ان سے قاعدے کے مطابق عہدے کا حلف لیا اور قایدِ اعظم اپنی مخصوص کرسی پر آ بیٹھے۔

حلف وفاداری:

۱۴ راگست ۱۹۴۷ء: سہ پہر کو ایک شان دار تقریب میں مسٹر محمد علی جناح نے پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے پاکستان کے دارالحکومت کراچی کی ایک پرشکوہ تقریب میں حلف اٹھایا۔ یہ حلف ہز ایکسی لنسی لارڈ ماؤنٹ بیٹن وایسرائے ہند نے ان سے لیا۔ حلف کی عبارت یہ ہے:

''میں محمد علی جناح قانون کے مطابق قایم ہونے والے پاکستان، دستور حکومت سے سچی عقیدت اور وفاداری کا عہد مصمم کرتا ہوں کہ میں پاکستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے ''شہنشاہ معظم جارج ششم'' (شہنشاہِ برطانیہ) اور ان کے ولی عہدوں اور جانشینوں کا ''وفادار'' رہوں گا۔''

(روزنامہ پاکستان۔ لاہور کا ہفتہ وار ایڈیشن۔ تصویرِ پاکستان: ۱۴ راگست ۱۹۹۳ء: ص ۱۱)

پاکستان کی آئین ساز اسمبلی سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا خطاب:

ڈاکومنٹ نمبر ۴۸۹: اپنڈیکس نمبر ۲۔ عزت مآب لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے خطاب کا متن جو وہ ۱۴ راگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی آئین ساز اسمبلی سے کریں گے۔

مسٹر پریذیڈنٹ اور آئین ساز اسمبلی پاکستان کے اراکین!

شہنشاہ معظم کا ایک پیغام آپ کو آج سنانے کے لیے مجھے موصول ہوا ہے۔

شہنشاہ معظم کا پیغام:

"جب کہ نئی ڈومینین پاکستان برطانوی دولت مشترکہ کی اقوام کے اندر مقام حاصل کرنے ہی والی ہے تو میں اس پر عظمت موقع پر اپنی طرف سے مبارک باد اور نیک خواہشات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے باہمی گفتگو سے آزادی حاصل کر کے دنیا بھر کے آزادی پسند عوام کے لیے ایک مثال قایم کر دی ہے۔

مجھے معلوم ہے کہ جب میں یہ کہتا ہوں کہ آپ جمہوری اصولوں کی سر بلندی کے لیے ان کی حمایت سے محروم نہیں ہوں گے تو میں اس رائے کا اظہار برطانوی دولت مشترکہ میں شامل ہر طرح کی رائے رکھنے والوں کی طرف سے کرتا ہوں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ جس تدبر اور تعاون کے جذبے کے ذریعے آپ اس تاریخی مقام پر پہنچے ہیں اور خوشیاں منانے میں مصروف ہیں یہی جذبہ آپ کے خوش حال مستقبل اور مسرتوں کے بہترین ضامن ہیں آپ اور آپ کے قایدین کے کندھوں پر مستقبل کی بڑی ذمہ داریوں کا بوجھ آن پڑا ہے۔ میری دعا ہے کہ رب العزت آیندہ آپ کو کامیابی سے ہم کنار بنائے۔ انسانیت کی سر بلندی کے لیے آپ کی کوششوں کو میری پوری حمایت حاصل ہوگی۔"

آج میں آپ سے آپ کے وایسرائے کی حیثیت سے خطاب کر رہا ہوں، کل نئی ڈومینین پاکستان کی حکومت کی باگ ڈور آپ کے ہاتھ میں ہوگی اور میں آپ کی ہمسایہ ڈومینین آف انڈیا کا آئینی سربراہ بنوں گا۔ دونوں حکومتوں کے قایدین نے مجھے جائنٹ ڈیفنس کونسل کا غیر جانب دار چیئرمین بننے کی دعوت دی ہے، یہ میرے لیے ایک اعزاز ہے جس پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔

کل دو نئی خود مختار ریاستیں دولت مشترکہ میں شامل ہوں گی، یہ نئی اقوام نہ ہوں گی، بلکہ یہ قدیم قابل فخر تمدن کی وارث اقوام ہیں، ان کے مکمل طور پر آزاد ریاستوں کے لیڈر بڑے مدبر ہیں، دنیا بھر کی نگاہوں میں احترام سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کے شاعروں، فلسفہ دانوں، سائنس دانوں اور افواج نے انسانیت کی خدمت کے لیے ناقابل فراموش خدمات سرانجام دی ہیں۔ ان ریاستوں کی حکومتیں ناتجربہ کار اور کم زور نہیں ہیں بلکہ دنیا بھر میں قیام امن اور ترقی کے سلسلے میں اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ براہونے کی پوری صلاحیتیں رکھتی ہیں۔

پاکستان کا قیام تاریخ کا اہم واقعہ ہے، ہم جو تاریخ کا ایک حصہ ہیں اور اس کی تشکیل میں مصروف ہیں، حالات کو سنوارنے کی خواہش کے باوجود ماضی کے واقعات سے دامن نہیں بچا سکتے۔ تاریخ بعض اوقات برف کے تودے کی طرح بے حد سست رفتاری سے حرکت کرتی ہے اور بعض اوقات سیلاب کی طرح آگے بڑھتی ہے۔ حال ہی میں دنیا کے اس خطے میں ہماری مشترکہ کوششوں سے برف پگھلی اور ہم آگے بڑھے اس راہ میں کچھ رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا، لیکن ہم نے طوفانوں کی مزاحمت کے باوجود پیش رفت جاری رکھی۔ اب ماضی کی طرف دیکھنے کی فرصت نہیں ہے، اس وقت صرف آگے کی طرف دیکھنا ہے۔

میں آپ کے عظیم المرتبت قایدین کو ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں جنھوں نے انتقال اقتدار کے لیے پرامن حل تلاش کیا۔

میں اس موقع پر مسٹر جناح کی خدمات کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ ہمارے قریبی ذاتی روابط، باہمی اعتماد اور افہام و تفہیم مستقبل کے بہتر تعلقات کے لیے نیک شگون ہیں۔ انھیں آپ کا نیا گورنر جنرل بننے پر میں اپنی نیک تمناؤں کا اظہار کرتا ہوں۔

اخلاقی جرأت مندی عظمت کی حقیقی خوبی ہے اور جن لوگوں نے صلح جوئی اور امن کو اہمیت دی، اپنے مطالبات اور تمناؤں کا گہرا احساس رکھتے ہوئے ان اصولوں کی بالادستی کو تسلیم کیا، انھوں نے اعلا درجے کی اخلاقی جرأت مندی کا مظاہرہ کیا۔ میں دیگر لوگوں کے تعاون کا بھی شکر گذار ہوں، جنھوں نے گفتگو کے طریق کار کے مشورے دیے اور معاونت کی، جنھوں نے انتظامی مشینری مشکلات میں جاری ساری رکھی اور ان لوگوں کا جنھوں نے تقسیم کے مشکل کام کی راہ میں حایل بے شمار مسایل حل کرنے کے لیے دن رات کام کیا۔ یہ سارا کام ہولے ہولے پیار سے انجام پایا۔ میری خواہش تھی کہ میں اس کا اظہار بلا تاسف اور افسردگی کرتا لیکن سنگین جرایم سرزد ہوئے ہیں۔ ان کے اثرات ظاہر ہونا حق بہ جانب ہے۔ اس سے بھی کہیں زیادہ ہول ناک واقعات رونما ہوتے اگر ملک کے باشندوں کی اکثریت نے اپنے قایدین کے احترام کو ملحوظ نہ رکھا ہوتا اور ان کی مشترکہ اپیل پر کان نہ دھرے ہوتے جو مسٹر جناح اور مہاتما گاندھی نے کی تھی، اور جس کا اعادہ مستقبل کی حکومتوں نے اپنے بیان میں کیا۔

مجھے اس بیان کو دہرانے کی اجازت دیں، دونوں حکومتوں نے اعلان کیا ہے کہ ''ان کی خواہش ہے کہ تمام شہریوں کے جایز حقوق کی حفاظت کی جائے۔ اس سلسلے میں مذہب، ذات یا کسی اور شے کا امتیاز روا نہ رکھا جائے۔ تمام شہریوں کو ان کے حقوق حاصل ہوں گے اور دونوں مملکتوں کی حکومتیں اپنے تمام شہریوں کو ضمانت فراہم کریں گی کہ انھیں تقریر کی آزادی ہوگی، انجمن سازی کا حق حاصل ہوگا اور اپنے طریقے پر عبادت کرنے کی آزادی ہوگی اور ان کے کلچر اور زبان کو تحفظ فراہم کیا جائے گا۔

دونوں حکومتوں نے اس کی بھی ضمانت دی ہے کہ ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے کے سیاسی مخالفین کے ساتھ امتیازی سلوک روا نہیں رکھا جائے گا۔''

ان الفاظ کے احترام کا مطلب اس سے کم تر نہیں ہوگا کہ یہ انسانوں کے عقیدے کی آزادی کا چارٹر ہے۔

چند یوم قبل میں لاہور گیا۔ تا کہ اس لاثانی تباہی کو دیکھوں جس کی اطلاعات مجھے موصول ہوئی تھیں۔ آپ میں سے جو لوگ لاہور نہیں گئے یہ سن کر ان کی پریشانی کم ہوگی کہ وہاں تباہی میری توقع سے کہیں زیادہ کم تھی۔ میونسپل حدود کے اندر ایک ہزار مکانوں میں سے اٹھارہ سے زیادہ مکان تباہ نہیں ہوئے۔ میں اسے کم دیوانگی سے تعبیر نہیں کرتا جس کے باعث اتنا نقصان بھی برداشت کرنا پڑا۔ بلکہ میں تو ان کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں اور آپ سے بھی مستدعی ہوں کہ آپ بھی ان کی کوششوں کی ستایش کریں جنھوں نے لاہور کو مکمل تباہی سے بچالیا۔ پولیس اور آگ بجھانے والے عملے، فوج اور انتظامیہ، باہمت شہری جنھوں نے تخریبی قوتوں کی مزاحمت کی اور ان سب لوگوں کو جنھوں نے زیادتی کے متاثرین کی مدد کی اور ان کے زخموں پر مرہم رکھا، مردوں اور عورتوں میں عوام کی خدمت کا جذبہ، معاونت اور مصالحت کا جذبہ جس نے آپ کے رہنماؤں میں ولولہ پیدا کیا، یہ سیاسی اور تمدنی اخلاقیات کا جوہر ہے۔ اس سے قوم کی عظمت کی نشاندہی ہوتی ہے۔ میری دعا ہے: آپ ہمیشہ اس پر کاربند رہیں۔

یہ (تقسیم) دو دوستوں کی علاحدگی ہے، جو ایک دوسرے کا احترام اور عزت کرنا جانتے ہیں، خواہ باہمی اختلاف ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ ہمیشہ کی جدائی نہیں ہے۔ میں یہ سوچ کر خوش ہوتا ہوں کہ یہ رفاقت یا کامریڈ شپ کا خاتمہ نہیں ہے۔ میرے کئی ہم وطنوں کی

نسلوں نے یہاں جنم لیا، کئی نے اپنی زندگیاں یہاں گزاریں اور یہیں وفات پائی، بعض تجارت کی غرض سے ہنوز یہاں مقیم ہیں، کئی سرکاری اور فوجی ملازمت میں ہیں اور وہ اس میں اپنی عزت محسوس کرتے ہیں کہ انھیں یہاں خدمت کرنے کی دعوت دی گئی۔

انگریز اور ہندوستانی ایک دوسرے سے صدیوں سے آشنا ہیں، برطانوی طرزِ زندگی، رسم و رواج اندازِ تکلم اور نظریات کا (ایک دوسرے پر) گہرا اثر ہوا— اس سے کہیں زیادہ جتنا بھی خیال کیا جائے۔ میں آپ کی یادداشتوں کو تازہ کروں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کو چار سو سال قبل (تجارت کرنے کا) چارٹر ملا۔ آپ کا عظیم شہنشاہ یہاں تخت نشین تھا، جس کی حکومت میں انتہائی سیاسی اور مذہبی رواداری تھی، جس کی مثال پہلے یا بعد کے زمانے میں نہیں ملتی۔ میں دیانت داری سے محسوس کرتا ہوں کہ ہماری نسلیں اور انتظامیہ اس سے متاثر ہیں۔ اکبر کی روایات کی انگریزوں اور ہندوستانیوں نے مستقل مزاجی سے پیروی نہیں کی، لیکن میں عالمی مفاد کی خاطر دعا گو ہوں کہ ہم مستقبل میں اس عظیم حکمران کی تعلیمات پر ثابت قدمی سے عمل پیرا رہیں۔

پاکستان ہمیشہ خوش حال رہے، اس کے شہری صحت مند اور خوش رہیں، پاکستان کی سرحدات میں امن کو فروغ حاصل ہو، اور یہ اپنے ہمسایوں اور اقوام عالم کے ساتھ دوستانہ تعلقات کا سلسلہ جاری رکھے۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء: ''مشرقی پاکستان میں، پاکستان کا قومی جھنڈا نہیں پہنچ سکا تھا، لیکن ڈھاکہ میں بھی جناح کی تصویریں ہر طرف لگی ہوئی تھیں۔ یہ بات دوسری تھی کہ جناح نے اس سرزمین پر کبھی قدم نہیں رکھا تھا۔

عام طور پر گورنر جنرل کا عہدہ رسمی اور نمائشی ہوتا ہے، لیکن جناح نے گورنر جنرل ہونے کے بعد سارے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔

عجیب بات یہ تھی کہ اس موقع پر کراچی سے پانچ سو میل کی دوری پر بمبئی میں کولابا کے ایک فلیٹ میں ایک لڑکی نے اپنی بالکنی پر دو جھنڈے لگا رکھے تھے، ایک ہندوستان کا ایک پاکستان کا۔ آزادی ملتے ہی اس کے سامنے ایک مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ یہ دو جھنڈے اس کی کش مکش کو ظاہر کر رہے تھے۔

اس لڑکی کا نام دینا تھا اور وہ محمد علی جناح کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس کے لیے یہ فیصلہ کرنا

مشکل تھا کہ ''کس ملک کو اپنا مانے؟ ہندوستان کو جہاں اس کی پیدائش ہوئی تھی، یا پاکستان کو جس کی بنیاد اس کے باپ نے رکھی تھی۔''

جن لوگوں کے رشتے دار پنجاب میں تھے، انھوں نے کسی نہ کسی کے قتل ہونے، زندہ جل جانے، تلوار سے کٹ جانے یا چھرے کے وار سے مرنے یا عزت پر حملہ ہونے یا خودکشی کرنے کے واقعات سن لیے تھے یا وہ ان خبروں کو سننے کے لیے ذہنی طور پر خود کو تیار کر چکے تھے۔

ان کے لیے آزادی کا صرف ایک مفہوم تھا -- تباہی! (آدھی رات کی آزادی: ص ۱۷۷)

تقسیم ملک اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی کارگزاری - مولانا آزاد کا تبصرہ:

ماؤنٹ بیٹن نے اپنے واسطے ہندوستان کو تقسیم کرنے کے کام کے لیے تین مہینے کی مدت مقرر کی۔ کام آسان نہیں تھا، میں نے کھلم کھلا ان پر شبہ ظاہر کیا کہ اتنی کم مدت میں اتنے پیچیدہ پلان کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جا سکے گا؟ مجھے یہاں اس کارپردازی اور قابلیت کو خراج تحسین ادا کرنا چاہیے، جس کے ساتھ ماؤنٹ بیٹن نے اس کام کو سرانجام دیا۔ انھیں تفصیلات پر اتنا عبور حاصل تھا اور معاملات پر اتنی جلد قابو پالیتے تھے کہ تین ماہ کے اندر سارے مسئلے حل ہو گئے اور ۱۴/اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان دو ریاستوں میں تقسیم ہو گیا۔

میں ایک دو مثالیں دے کر یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ ماؤنٹ بیٹن نے کس پھرتی اور اعتماد کے ساتھ ان پیچیدہ مسایل کو حل کیا، جو دو ریاستوں کو قایم کرنے کے سلسلے میں پیدا ہوئے۔ جیسے ہی یہ بات طے پائی کہ ہندوستان کو تقسیم کیا جائے، ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنے اپنے مطالبات بڑھا چڑھا کر پیش کرنے شروع کیے۔ ملک میں مختلف مقامات پر فسادات ہونے لگے۔ ۱۹۴۶ء کے کلکتہ کے قتل عام کے بعد، نواکھالی اور پھر بہار میں فساد ہوا۔ پنجاب میں مارچ کے مہینے میں بلوے شروع ہوئے، پہلے صرف لاہور کے علاقے تک محدود تھے، لیکن رفتہ رفتہ وہ بڑھتے رہے اور راول پنڈی اور اس کے اطراف میں خون خرابہ ہونے لگا۔ دراصل لاہور وہ میدان تھا جسے جیتنے کے لیے فرقہ پرست ہندو اور مسلمان لڑ رہے تھے۔ ہندوؤں اور سکھوں کے نمایندوں نے کانگریس کو اس کا قایل کرنا چاہا کہ لاہور ہندوستان میں رہنا چاہیے۔ ان کا کہنا تھا کہ پنجاب کی سیاسی اور اقتصادی زندگی کا

مرکز لاہور ہے۔ اور اگر یہ پاکستان میں چلا گیا تو پنجاب بے دست و پا ہو جائے گا۔ اس لیے بہت سے لوگوں نے کہا کہ لاہور کے معاملے کو بنیادی حیثیت دینا چاہیے۔ کانگریس نے اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا اور کہا کہ اس مسئلے کو وہاں کے باشندوں کی خواہش کے مطابق طے ہونا چاہیے۔

کچھ مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کا خیال تھا کہ لاہور کا مسئلہ تشدد کے ذریعے حل ہو سکتا ہے۔ لاہور اور گرد و نواح میں جائیدادوں کے مالک زیادہ تر ہندو تھے۔ کچھ مسلمانوں نے سمجھا کہ ہندوؤں کو نقصان پہنچانے کا سب سے مؤثر طریقہ یہ ہے کہ ان کی ملکیت کو تباہ کیا جائے اور ان سے اقتصادی محاذ پر جنگ کی جائے۔ چناں چہ وہ بغیر کسی امتیاز کے ہندوؤں کے کارخانوں کو جلانے اور مکانوں کو لوٹنے لگے۔ ہندوؤں کے ایک حصے نے اس کے جواب میں مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ ان کے پاس دولت تھی اور ان کا خیال تھا کہ اس طرح وہ مسلمانوں کو لاہور سے بھگا دیں گے اور وہاں ہندوؤں کی اکثریت یقینی ہو جائے گی۔ یہ بات اعلانیہ کہی جاتی تھی کہ اس فرقہ وارانہ جنگ میں جہاں ایک فریق کا حملہ مال پر اور دوسرے کا جان پر تھا، طرفین کے فرقہ پرست لیڈر بالواسطہ یا بلاواسطہ شریک ہیں۔ چناں چہ یہ عام طور پر کہا اور صحیح مانا جاتا تھا کہ مرکزی اور صوبائی لیگ کے لیڈر ہندوؤں پر حملے کرنے کا انتظام کر رہے تھے۔ اسی طرح ہندو مہا سبھا کے لیڈروں پر یہ الزام تھا کہ وہ ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف اکسا رہے ہیں۔

بالکل ایسی ہی صورت حال کلکتہ میں پیدا ہو چکی تھی۔ مسلم لیگ کے حامی اصرار کر رہے تھے کہ کلکتہ کو پاکستان میں شامل کیا جائے اور لیگ کے مخالفوں کو فکر تھی کہ ہندوستان میں رہے۔

یہ صورت حال تھی جب ماؤنٹ بیٹن بنگال اور پنجاب کی تقسیم کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہ بات طے پا چکی تھی کہ صوبائی اسمبلی اس بات کا فیصلہ کرے گی کہ صوبہ تقسیم کیا جائے یا جوں کا توں کسی ایک ریاست میں شامل رہے؟ پنجاب اور بنگال دونوں کی اسمبلیوں نے تقسیم کے حق میں فیصلہ کیا، اس لیے صوبوں کی نئی سرحدوں کا تعین ضروری ہو گیا۔ اس کام کے لیے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ایک حد بندی کمیشن مقرر کیا اور مسٹر ریڈکلف سے اس خدمت کو انجام دینے کے لیے کہا۔ مسٹر ریڈکلف اس وقت شملہ میں تھے، انھوں نے اپنے

تقرر کو منظور تو کر لیا لیکن ساتھ ہی تجویز کیا کہ پیمائش کا کام شروع جولائی سے کیا جائے۔ ان کا کہنا تھا کہ جون کی گرمی میں زمین کے معائنے اور پیمائش کا کام ناممکن ہوگا، اس کو اگر جولائی میں شروع کیا جائے تو صرف تین چار ہفتوں کی دیر ہوگی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جواب دیا کہ وہ ایک دن کے توقف پر بھی راضی نہیں ہیں۔ اس لیے تین چار ہفتے کے التوا کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ یہ ماؤنٹ بیٹن کی مستعدی اور کارپردازی کی ایک مثال ہے۔

ماؤنٹ بیٹن کے سامنے دوسرا مسئلہ حکومت ہند کے دفاتر اور اثاثوں کی تقسیم کا تھا۔ جن صوبوں نے جوں کا توں کسی ریاست میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا، ان سے متعلق بھی دشواریاں تھیں۔ مثلاً پاکستان میں شامل ہونے والے صوبوں سے متعلق کاغذات اور دستاویزات کا علاحدہ کر کے پاکستان بھیجنا تھا۔ جو صوبے تقسیم ہونے تھے ان کا مسئلہ اور بھی گنجلک تھا۔ ماؤنٹ بیٹن نے بیشتر انتظامات اپنی نگرانی میں کرانے اور ایک کمیٹی جو اس مقصد کے لیے مقرر ہوئی تھی ہر معاملے کو جو بحث طلب ہوتا اسی وقت طے کر دیتی۔

مالیات اور فوج کی تقسیم کا معاملہ اور بھی مشکل تھا۔ لیکن ماؤنٹ بیٹن کی خوش تدبیری اور قوت عمل کسی رکاوٹ کو خاطر میں نہ لائی اور مالیات کے پے چیدہ سے پے چیدہ مسایل بھی معینہ مدت کے اندر طے پا گئے۔

یہ بات طے پا چکی تھی کہ فوج کا تین چوتھائی حصہ ہندوستان کو اور ایک چوتھائی حصہ پاکستان کو ملے گا، لیکن سوال تھا کہ فوج کو بھی فوراً تقسیم کیا جائے یا اسے دو تین سال تک ایک ملی جلی کمان کے تحت رکھا جائے؟ فوج کے کمانڈروں کا مشورہ تھا کہ فی الحال جنرل اسٹاف مشترک رہے۔ میں ان کی دلیلوں سے متاثر ہوا اور میں نے ان کی حمایت کی۔ ماؤنٹ بیٹن کی دلیلوں کے علاوہ میری سمجھ میں کچھ اور باتیں بھی آئی تھیں۔ مجھے ڈر تھا کہ تقسیم کے ساتھ فسادات بھی شروع ہوں گے اور ایسی صورت میں ایک مشترکہ فوج ہندوستان کے لیے بہت مفید ثابت ہوگی۔ میرا ذہن اس بارے میں بالکل صاف تھا کہ اگر ہم تباہی سے بچنا چاہتے ہیں تو ہمیں فوج کی فرقہ وارانہ بنیاد پر تقسیم نہیں کرنی چاہیے۔ اب تک فوج میں کبھی فرقہ وارانہ جذبات نمودار نہیں ہوئے تھے اور اگر اسے سیاست سے دور رکھا جاتا تو اس کی ڈسپلن اور غیر جانب داری پر بھروسا کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے میں نے مشترکہ کمان کے قیام پر زور دیا

اور میں اس بات کو ضبط تحریر میں لانا چاہتا ہوں کہ ماؤنٹ بیٹن نے میری پوری حمایت کی۔
مجھے یقین ہے کہ اگر فوج ایک مشترکہ کمان کے تحت رہی ہوتی تو آزادی کے بعد خون کی جو ندیاں بہیں وہ ہرگز نہ بہتیں۔

مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میرے ساتھی مجھ سے متفق نہیں تھے اور انھوں نے میری مخالفت کی۔ مجھے سب سے زیادہ حیرت ڈاکٹر راجندر پرشاد کی مخالفت پر ہوئی، وہ ایک امن پسند آدمی تھے۔ جن کا مسلک عدم تشدد تھا۔ مگر اب ان ہی کو فوج کی تقسیم پر سب سے زیادہ اصرار تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہندوستان کی تقسیم کے بعد ایک دن کے لیے بھی فوج کو مشترکہ کمان کے تحت نہ رکھنا چاہیے۔ نہ اسے رکھا جا سکے گا۔

میرے خیال میں یہ بہت نقصان دہ فیصلہ تھا۔ اس کی وجہ سے فوج فرقوں کی بنیاد پر تقسیم ہوگئی۔ مسلمان حصے پاکستان کو چلے گئے اور ہندو اور سکھ سب کے سب ہندوستان کو ملے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فرقہ پرستی کا زہر فوج میں بھی پھیل گیا، جو اب تک اس سے محفوظ تھی۔ ۱۰ر اگست کے بعد جب سرحدوں کے دونوں طرف بے گناہ مردوں اور عورتوں کا خون بہایا جانے لگا تو فوج کھڑی تماشا دیکھ رہی تھی۔ یہی نہیں، کچھ موقعوں پر تو فوج کے آدمی بھی اس لڑائی میں شریک ہو گئے۔

ماؤنٹ بیٹن نے مجھ سے غصے سے زیادہ غم کے لہجے میں کہا کہ فوج کے ہندوستانی سپاہی اور آفیسر مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کو قتل کرنے میں شریک ہونا چاہتے تھے۔ لیکن برطانوی آفیسروں نے بڑی مشکل سے انھیں روکے رکھا۔ یہ بیان ماؤنٹ بیٹن کا تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ برطانوی فوج کے بارے میں ان کی روایت کس حد تک درست تھی، مگر میں اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ سابقہ غیر تقسیم شدہ ہندوستانی فوج کے کچھ لوگوں نے پاکستان میں ہندوؤں اور سکھوں کو۔ اور ہندوستان میں مسلمانوں کو قتل کیا۔ اس طرح ہندوستانی فوج کی شاندار روایت کی خلاف ورزی ہوئی اور اس کے قابل فخر ریکارڈ پر ایک دھبا لگ گیا۔

میری رائے تھی کہ ملازموں کو بھی فرقہ وارانہ بنیاد پر تقسیم نہ کیا جائے۔ سیاسی حالات نے ہمیں تقسیم کو ماننے پر مجبور کیا تھا۔ سرکاری آفیسروں کو ان کے علاقوں سے ہٹانے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ میری رائے تھی کہ ہر صوبے کے ملازمین کو اسی صوبے میں رہنا چاہیے۔ یعنی

مغربی پنجاب، سندھ اور مشرقی بنگال کے آفیسر چاہے جس فرقے کے ہوں، پاکستان میں رہیں اور جو ملازمین ہندوستانی صوبوں میں تھے، بلا امتیاز مذہب ہندوستان میں رہیں۔ میں سمجھتا تھا کہ اگر ملازمتوں کو ہی فرقہ واریت سے پاک رکھا جائے تو دونوں ریاستوں کی فضا زیادہ بہتر رکھی جا سکے گی۔ حکومت فرقہ پرستی کے زہر سے محفوظ رہے گی اور ریاستوں کی اقلیتیں زیادہ اطمینان محسوس کریں گی۔ مجھے افسوس ہے کہ میری دلیلیں اور منت سماجت سب ناکام رہیں اور فیصلہ یہ ہوا کہ ہر سرکاری ملازم کو یہ حق دیا جائے کہ ہندوستان یا پاکستان دونوں میں سے کسی ایک ریاست کی ملازمت پسند کرلے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً سارے ہندوؤں اور سکھوں نے ہندوستان میں اور مسلمانوں نے پاکستان میں جانا پسند کیا۔

میں نے اس مسئلے پر ماؤنٹ بیٹن سے تفصیلی گفتگو کی اور انھیں فوج اور ملازمتوں کی تقسیم کے خطرناک امکانات کی طرف توجہ دلائی۔ انھیں مجھ سے اتفاق تھا اور انھوں نے حتی الامکان میری حمایت کی۔ فوج کے معاملے میں انھیں بالکل کامیابی نہیں ہوئی۔ لیکن ملازمتوں کے معاملے میں ان کی کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ آفیسروں کو حق دیا گیا کہ وہ چاہیں تو مستقلاً یا عارضی طور پر کسی ریاست کو منتخب کرلیں۔ مستقلاً فیصلہ کرنے والوں کا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا، لیکن عارضی طور پر فیصلہ کرنے والوں کو چھ ماہ کے اندر اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے کا اختیار دیا گیا۔ دونوں ریاستوں نے وعدہ کیا کہ جو لوگ واپس آنا چاہیں وہ انھیں واپس لینے کی ذمہ دار ہوں گی۔ افسوس ہے کہ اس وعدے کے باوجود عام طور پر دونوں ریاستوں نے ایسے لوگوں کے ساتھ جنھوں نے عارضی انتخاب کیا تھا، منصفانہ سلوک نہیں کیا۔

مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس معاملے میں مسلم لیگ نے نادانی اور کوتہ اندیشی سے کام لیا۔ اس نے سارے مسلمان آفیسروں کو ہندوستان چھوڑنے اور پاکستان کو منتخب کرنے پر اُکسایا۔ اس وقت مرکزی محکموں کے بہت سے اہم عہدوں پر مسلمان مامور تھے۔ لیگ نے ان سب پر دباؤ ڈالا کہ وہ ہندوستان کو چھوڑ دیں۔ جو اس پر رضامند نہیں ہوئے انھیں اس کے متعلق افواہیں پھیلا کر ڈرایا گیا کہ جب کانگریس پورے طور پر برسر اقتدار آجائے گی تو ان کا کیا حشر ہوگا۔ ان افواہوں سے مسلمان سرکاری ملازموں میں کسی قدر بے چینی پیدا ہو رہی تھی۔ اس لیے میں نے حکومت ہند پر دباؤ ڈالا کہ وہ اس بارے میں ایک اعلان کے ذریعے اپنا رویہ واضح کردے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور جواہر لال نے میری

پورے طور پر تائید کی اور ایک اعلان جاری بھی ہو گیا، جس میں مسلمان اور دوسری اقلیتوں کے سرکاری ملازموں کو یقین دلایا گیا کہ اگر وہ ہندوستان میں رہے تو انھیں نہ صرف ان کے حقوق ملیں گے بلکہ ان کے ساتھ فیاضی کا سلوک کیا جائے گا۔

اس اعلان کا نتیجہ یہ ہوا کہ کئی آفیسروں کی ڈھارس بندھ گئی اور انھوں نے ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ جب مسلم لیگ کو اس کا علم ہوا تو اس نے ان آفیسروں کو توڑنے کی مہم شروع کی۔ یہ لوگ اپنے مستقبل کے بارے میں یوں ہی کیا کم ہراساں تھے، اب لیگ نے انھیں یہ دھمکی دی کہ اگر وہ ہندوستان میں رہے تو پاکستان انھیں اپنا دشمن تصور کرے گا اور انھیں ہر ممکن طریقے سے ستائے گا۔

ان آفیسروں میں بہت سے ان صوبوں کے تھے، جو پاکستان میں شامل ہونے والے تھے۔ جب انھوں نے یہ محسوس کیا کہ مسلم لیگ کے لیڈر پاکستان میں ان کے اعزا اور ان کی ملکیت کو نقصان پہنچا کر بدلہ لیں گے تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ خود میری منسٹری میں کئی مسلمان آفیسر اہم جگہوں پر تھے، جنھوں نے میری یقین دہانیوں پر ہندوستان کے حق میں فیصلہ کیا تھا۔ لیکن جب لیگ نے ڈرانا دھمکانا شروع کیا تو ان میں سے کئی میرے پاس آئے اور آبدیدہ ہو کر کہا کہ اگرچہ ہم نے ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کیا تھا، لیکن مسلم لیگ کی اس دھمکی کے بعد ہمارا یہاں ٹھہرنا ناممکن ہے۔ ہمارے خاندان کے سارے لوگ مغربی پاکستان میں ہیں اور ہم یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ انھیں تکلیف پہنچے۔ اس لیے ہم پاکستان کو منتخب کرنے پر مجبور ہیں۔

مسلم لیگ کا مسلمان آفیسروں کو ہندوستان سے پاکستان بھگا دینا نادانی کا فعل تھا اور اس سے نقصان ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے ہندوستان کو مجموعی طور پر اتنا نقصان نہیں ہوا جتنا خود مسلمانوں کو۔ اب جو تقسیم کو منظور کیا جا چکا تھا، پاکستان کا قیام عمل میں آنے والا تھا تو یہ بات ظاہر تھی کہ اس نئی ریاست میں مسلمانوں کو ہر طرح کا فایدہ حاصل ہوگا، اگر اس کے ساتھ کچھ مسلمان ہندوستان کی ملازمت میں رہتے تو اس سے انھیں ذاتی طور پر فایدہ پہنچنے کے علاوہ ان کی جماعت کے لیے سودمند ثابت ہوتا۔ کچھ صاحب اختیار مسلمانوں کی موجودگی سے ان کی جماعت میں اعتماد پیدا ہوتا اور بہت سے بے بنیاد خدشے دور ہو جاتے۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ تقسیم پر اصرار کر کے لیگ نے کتنی نادانی کا ثبوت دیا تھا، مسلمان

آفیسروں کے بارے میں لیگ کا رویہ اس نادانی کی ایک اور مثال تھی۔
یہ طے پایا کہ ہندوستان ایک ڈومینین کی حیثیت سے ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو وجود میں آئے گا۔ مسلم لیگ نے فیصلہ کیا کہ پاکستان کا قیام ایک روز پہلے یعنی ۱۴/اگست کو عمل میں آئے۔

ان دونوں کے قیام کے سلسلے میں ایک ناخوش گوار واقعہ ہوا۔ برطانوی کامن ویلتھ میں ایک دستوری رسم ہوگئی تھی کہ ہر ڈومینین خود اپنا گورنر جنرل منتخب کرے اور بعض نے اپنے شہریوں کو اس عہدے پر مامور کیا تھا، ہندوستان بھی چاہتا تو اپنے کسی شہری کو اپنا پہلا گورنر جنرل بناتا۔ لیکن ہم لوگوں نے طے کیا کہ اچانک تبدیلی کرنا مناسب نہ ہوگا اور اگر لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہی کو گورنر جنرل منتخب کیا جائے تو اس سے انتظامی امور اور پالیسی میں ایک طرح کا تسلسل رہے گا، ساتھ ہی یہ بھی خیال تھا کہ شروع میں دونوں ڈومینیوں کا ایک ہی گورنر جنرل ہو اور جو تبدیلی مقصود ہو وہ بعد کو کی جائے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ پاکستان کے فیصلے میں بھی یہ باتیں ملحوظ ہوں گی۔
اس بنا پر ہم نے اعلان کردیا کہ ہم نے گورنر جنرل کے عہدے کے لیے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو منتخب کیا ہے۔ امید یہ تھی کہ لیگ بھی انھیں کو منتخب کرے گی۔ لیکن عین وقت پر لیگ نے یہ تجویز کر کے کہ مسٹر جناح کو پاکستان کا پہلا گورنر جنرل منتخب کیا جائے، سب کو حیرت میں ڈال دیا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جب یہ سنا تو انھوں نے ہم سے کہا کہ اب صورت حال بالکل بدل گئی ہے اور تجویز کیا کہ ہم اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں اور کسی ہندوستانی کو اس عہدے پر مامور کریں۔ لیکن ہمیں اپنا فیصلہ بدلنے کی کوئی وجہ نہیں نظر آئی اور ہم نے پھر کہہ دیا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کی ڈومینین کے پہلے گورنر جنرل ہوں گے۔

(انڈیا ونس فریڈم (اردو): ص ۳۰۰-۲۹۶)

ہندوستان کی آئین ساز اسمبلی میں آزادی کا اعلان:

۱۵/اگست ۱۹۴۷ء: پاکستان کی بنیاد اور رسمی کارروائی سے فراغت کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن کراچی سے دہلی لوٹ آئے۔ اُسی رات (۱۴/اور ۱۵/اگست کی درمیانی شب) بارہ بج کر ایک منٹ پر انھوں نے ہندوستانی آئین ساز اسمبلی میں پہنچ کر ہندوستان کی آزادی کا اعلان کردیا۔ اس سے پیشتر ہندوستان کے ہونے والے وزیر اعظم پنڈت جواہر

لال نہرو نے مختصر تقریر کے دوران کہا کہ

''کتنی مدت گزری ہم نے اپنی تقدیر بدلنے کا عہد کیا تھا۔ اب وقت آگیا ہے جب مکمل طور سے نہ سہی پھر بھی بڑی حد تک ہم اپنا عہد پورا کر سکیں گے۔ آج رات ٹھیک بارے بجے جب دنیا سو رہی ہوگی، ہندوستان ایک نئی زندگی اور آزادی کی فضا میں آنکھ کھولے گا۔ میں مانتا ہوں کہ اس قسم کے لمحے تاریخ میں کم آتے ہیں۔ جب پرانے دور سے نئے دور میں داخل ہوتے ہیں اور کسی قوم کی صدیوں کے بوجھ کے نیچے دبی ہوئی روح اپنی کھوئی ہوئی آواز پا لیتی ہے۔ یہ اہم لمحہ متقاضی ہے کہ ہم خود کو ہندوستان اور اس کے لوگوں کی خدمت کے لیے وقف کرنے کا عہد کریں اور انسانیت کی خدمت کو اپنا مسلک قرار دیں۔'' (جدوجہد آزادی میں مجلس قانون ساز کا رول: ص ۹۷-۲۹۶)

لاہور کی صورت حال اور پنڈت نہرو کی پریشانی:

۱۴؍اگست ۱۹۴۷ء: ۱۴؍اگست ۱۹۴۷ء کو جب سورج ڈوبا تو سارے ملک میں یونین جیک اتر کر خاموش تاریخ کا ایک حصہ بن چکا تھا۔

سنیاسیوں نے ان کی پیشانی پر جو راکھ لگائی تھی وہ نہرو نے کچھ دیر پہلے ہی پونچھی تھی، رات کا کھانا کھانے کے بعد اٹھے ہی تھے کہ ان کے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اگر یہ فون کچھ دیر پہلے آگیا ہوتا تو یقیناً جواہر لال نہرو کے لیے کچھ کھانا پینا مشکل ہو جاتا۔

اس وقت اندرا گاندھی کے ساتھ ان کی مہمان پدمجا نائیڈو مطالعہ گاہ میں موجود تھیں، نہرو کی تیکھی آواز سے انھوں نے اندازہ لگایا کہ کوئی ضروری پیغام ہے اور فون کی لائن خراب ہے۔

نہرو جب فون کر کے واپس آئے تو ان کے چہرے کا رنگ فق تھا۔ دونوں خواتین نے محسوس کر لیا کہ معاملہ گمبھیر ہے۔

کرسی پر نڈھال ہو کر انھوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ کچھ دیر تک ان پر سکتہ طاری رہا۔ ان کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔ آخر جب انھوں نے سر اٹھا کر دونوں خواتین کی طرف دیکھا تو ان کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

پیغام لاہور سے آیا تھا۔ ہندو اور سکھ علاقوں میں پانی کی سپلائی کاٹ دی گئی تھی، بھیانک گرمی نے لوگوں کو دیوانہ کر دیا تھا۔ ان کے محلوں کے باہر مسلمانوں کی ٹولیاں ہتھیار لگائے ہوئے کھڑی تھیں۔ پانی کے ایک ڈول کی بھیک مانگنے کے لیے جو عورتیں اور بچے باہر آ رہے تھے انھیں بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا۔ کم از کم پانچ چھ جگہوں پر شہر میں آگ لگی ہوئی تھی۔ (آدھی رات کی آزادی: ص ۱۶۹)

اور ہندوستان تقسیم ہو گیا — مولانا ابوالکلام آزاد:

۱۴؍اگست ۱۹۴۷ء: ۷؍اگست ۱۹۴۷ء کو بانی پاکستان کراچی تشریف لے آئے، ۱۱؍اگست کو دستور ساز اسمبلی پاکستان کا افتتاح کیا۔ وہ اس کے صدر بھی تھے۔ ۱۲؍و ۱۳؍ کو بھی اس کے اجلاس ہوئے۔ ۱۳؍اگست کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن کراچی پہنچے۔ ۱۴؍اگست کی سہ پہر کو انھوں نے مسٹر محمد علی جناح سے گورنر جنرل پاکستان کے عہدے کا حلف ۔ جناح صاحب کی خدمات، اُن کی سیرت، ان کے اخلاص، ان کے بہترین رویے کا اعتراف کیا اور گورنر جنرل کے عہدے پر ان کی فائز المرامی کی مبارک باد دی۔ حال آں کہ گزشتہ سات مہینوں میں ان سے پہلی ملاقات کے بعد وہ جناح صاحب کے رویے سے بے زار ہی رہے تھے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات انھیں اپنے غصے پر قابو پانا بھی مشکل ہو گیا۔ وہ اسی روز شام کو دہلی لوٹ گئے تھے۔ ۱۴؍و ۱۵؍اگست کی شب میں ۱۲ بجے ہندوستان کی ڈومینین کے قیام کا اعلان کیا، بعد کے حالات پر مولانا ابوالکلام آزاد نے ان الفاظ میں تبصرہ فرمایا ہے:

"ملک آزاد ہو گیا تھا لیکن عوام آزادی اور کامیابی کا پورا لطف نہ اٹھا سکے۔ دوسرے دن جب ان کی آنکھ کھلی تو انھوں نے دیکھا کہ آزادی کے ساتھ ایک بہت الم ناک حادثہ واقع ہوا ہے۔ ہم نے بھی محسوس کیا کہ اس منزل تک پہنچنے سے پہلے جہاں ہم ٹھیر کر آرام کر سکیں گے اور آزادی کی نعمتوں سے مستفیض ہو سکیں گے، ایک لمبا اور سنگلاخ راستہ طے کرنا ہوگا۔

کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے تقسیم کو تسلیم کیا تھا۔ چوں کہ کانگریس ساری قوم کی نمائندہ جماعت تھی اور مسلم لیگ کو کافی مسلمانوں کی حمایت حاصل تھی، اس لیے قاعدے کے مطابق اس کا یہ مطلب ہونا چاہیے تھا کہ سارے ملک نے تقسیم کو مان ہے۔ لیکن اصل

صورت حال بالکل ہی اور تھی۔

جب ہم نے تقسیم سے فوراً قبل اور فوراً بعد سارے ملک پر نگاہ ڈالی تو معلوم ہوا کہ اس فیصلے کو تسلیم کرنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ایک ریزولیوشن اور مسلم لیگ کے رجسٹر میں اس کا اندراج ہو گیا ہے۔ ہندوستان کے عوام نے تقسیم کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ ان کا دل، ان کی روح اس ظلم پر چلا اٹھی تھی۔ میں نے ابھی کہا ہے مسلم لیگ کو کافی مسلمانوں کی حمایت حاصل تھی۔ لیکن مسلمانوں کا ایک کافی بڑا حصہ ایسا تھا، جس نے ہمیشہ لیگ کی مخالفت کی تھی۔ ظاہر ہے تقسیم کے فیصلے سے ان لوگوں کو گہرا زخم لگا۔ جہاں تک ہندوؤں اور سکھوں کا تعلق تھا ان میں سے ہر ایک تقسیم کے خلاف تھا اور کانگریس کے تقسیم کو مان لینے کے باوجود ان کی مخالفت میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا تھا۔ اب جو تقسیم عملی حقیقت بن گئی تو خود مسلم لیگ کے بہت سے حامی اس کے بھیانک نتائج کو دیکھ کر دہشت زدہ ہو گئے تھے اور کھلم کھلا یہ کہنے لگے کہ تقسیم سے ان کی مراد یہ نہیں تھی۔

آج دس برس بعد جب ان ساری باتوں پر دوبارہ نظر ڈالتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ واقعات نے ہر اس بات کی تصدیق کی ہے جو اس وقت میں نے کہی تھی۔ مجھے اس وقت بھی صاف محسوس ہو رہا تھا کہ کانگریس کے لیڈروں نے تقسیم کو آزادی کے ساتھ اور کھلے دل سے نہیں مانا ہے۔ ان میں سے کچھ تو خالی غصے میں اور تنگ آ کر اور کچھ بالکل مایوس ہو کر اس پر راضی ہو گئے تھے جب دلوں پر غم اور غصے یا خوف کا جذبہ حاوی ہو جائے تو لوگوں میں حقائق پر نظر رکھ کر فیصلہ کرنے کی صلاحیت نہیں رہتی۔ جن لوگوں کے مشتعل جذبات نے انھیں تقسیم کا حامی بنا دیا تھا، وہ کیسے سوچ سکتے تھے کہ ان کے عمل کے نتیجے کیا ہوں گے؟

کانگریس کے لیڈروں میں تقسیم کے سب سے بڑے حامی سردار پٹیل تھے۔ لیکن یہ بھی تقسیم کو ہندوستان کے مسایل کا بہترین حل نہیں تصور کرتے تھے۔ درحقیقت انھوں نے اپنی پوری طاقت سے تقسیم کی حمایت صرف جھنجھلاہٹ اور احساس خودداری کو ٹھیس پہنچنے کی وجہ سے کی تھی۔ انھوں نے دیکھا کہ [illegible]قت علی خان بہ حیثیت وزیر ما[illegible]ت ان کی ہر تجویز رد کر کے انھیں قدم قدم پر زچ کر دیتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے تنگ آ کر فیصلہ کیا تھا کہ اگر تقسیم کے سوا چارہ نہیں ہے تو ملک کو تقسیم ہو جانا چاہیے۔ انھیں اس کا بھی یقین تھا کہ پاکستان کی نئی ریاست میں زندہ رہنے کی صلاحیت نہ ہوگی اور وہ زیادہ دن قایم نہ رہ سکے

گی۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ پاکستان کو تسلیم کرکے مسلم لیگ کی سخت تادیب کی جا سکے گی۔ پاکستان کی ریاست تھوڑے ہی عرصے میں بیٹھ جائے گی اور جو صوبے ہندوستان سے الگ ہوئے ہوں گے، انھیں بے پناہ مشکلوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

ملک کی تقسیم کے بارے میں عام لوگوں کے رویے کا اصل امتحان ۱۴/اگست ۱۹۴۷ء کو ہوا جب آزاد پاکستان قایم ہوا۔ اگر عوام نے تقسیم کو قبول کیا ہوتا تو پنجاب، سندھ، سرحد اور بنگال کے ہندو اور سکھ ویسی ہی خوشی مناتے جیسی کہ وہاں کے مسلمان منا رہے تھے۔ مگر ان صوبوں سے جو اطلاعات ہم تک پہنچیں ان سے اس دعوے کا کھوکھلاپن ظاہر ہو گیا کہ کانگریس کا تقسیم کو مان لینا قوم کے مان لینے کے برابر ہے۔

۱۴/اگست پاکستان کے مسلمانوں کے لیے جشن کا دن تھا، لیکن ہندوؤں اور سکھوں کے لیے سوگ اور ماتم کا! یہ کیفیت صرف عام لوگوں کی نہیں تھی بلکہ کانگریس کے اہم لیڈر بھی اسے محسوس کرتے تھے۔ ان دنوں اچاریہ کرپلانی کانگریس کے صدر تھے، یہ سندھ کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے ۱۴/اگست کو ایک بیان شایع کیا کہ آج کا دن ہندوستان کے لیے تباہی اور ماتم کا دن ہے۔ پاکستان کے ہندوؤں اور سکھوں نے کھلے بندوں اس جذبے کا مظاہرہ کیا۔ یہ واقعی عجیب و غریب صورتِ حال تھی۔ ہماری قومی جماعت نے تقسیم کے حق میں فیصلہ کیا تھا لیکن سارا ملک اس کی وجہ سے دکھی ہو گیا تھا۔

یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ اگر ہندوستانیوں کے دلوں میں تقسیم کے خیال سے غصے اور غم کے ایسے جذبات پیدا ہوئے تھے تو انھوں نے اسے کیوں منظور کیا؟ انھوں نے اور زیادہ سختی سے اس کی مخالفت کیوں نہیں کی؟ انھیں کیا جلدی تھی کہ ایسا فیصلہ کر جسے تقریباً ہر شخص غلط سمجھتا تھا؟ مانا کہ ۱۵/اگست تک ہندوستان کے مسایل کا کوئی مناسب حل نہیں نکل سکا تھا لیکن اس کی وجہ سے ایک غلط فیصلہ کر لینے اور پھر ہائے ہائے کرنے کے کیا معنی؟ میں برابر کہتا رہا تھا کہ اس وقت تک انتظار کرنا چاہیے جب تک کوئی بہتر حل سمجھ میں آئے۔ میرے بس میں جو کچھ تھا میں نے کیا۔ لیکن بدقسمتی سے میرے دوستوں اور ساتھیوں نے میری حمایت نہیں کی۔ حقیقت سے اس عجیب چشم پوشی کا صرف ایک سبب میری سمجھ میں آتا ہے اور وہ یہ کہ غصے اور مایوسی نے ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیے تھے۔ غالباً ایک خاص تاریخ یعنی ۱۵/اگست کے یقین نے ان پر ایسا جادو کیا کہ انھوں نے ماؤنٹ بیٹن کی ہر بات بغیر سوچے سمجھے

تسلیم کرلی۔

حالت ایسی تھی کہ دکھ اور رنج بھی ہوتا تھا اور ہنسی بھی آتی۔ سب سے مضحکہ خیز مسلم لیگ کے ان لیڈروں کی کیفیت تھی جو تقسیم کے بعد ہندوستان میں رہ گئے تھے۔ مسٹر جناح اپنے ساتھیوں کو یہ پیغام دے کر کراچی کے لیے روانہ ہوگئے کہ اب جو ملک تقسیم ہوگیا ہے تو انھیں ہندوستان کے وفادار شہری بن کر رہنا چاہیے ❶۔ اس الوداعی پیغام نے ان کے اندر کمزوری اور مایوسی کا ایک عجیب احساس پیدا کردیا۔ ۱۴؍اگست کے بعد ان میں سے بہت سے لیڈر مجھ سے ملنے آئے، ان کی حالت پر رحم آتا تھا۔ ان میں سے ہر ایک نے سخت افسوس اور غصے کے ساتھ مجھ سے کہا کہ جناح نے انھیں دھوکا دیا ہے اور عین وقت پر ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ پہلے پہل میری سمجھ میں نہ آیا کہ ان کے یہ کہنے کا کیا مطلب ہے کہ جناح نے انھیں دھوکا دیا؟ انھوں نے تو صاف صاف مسلمانوں کی اکثریت کے علاقوں کی بنیاد پر ملک کی تقسیم کا مطالبہ کیا تھا۔ اب پاکستان بن گیا تھا اور مشرق اور مغرب دونوں طرف مسلمانوں کی اکثریت کے علاقے پاکستان میں شامل ہوگئے تھے۔ پھر آخر یہ مسلم لیگ کے نمایندے کیوں کہہ رہے تھے کہ انھیں دھوکا دیا گیا؟

ان سے گفتگو کرنے سے مجھے معلوم ہوا کہ ان کے ذہن میں تقسیم کی ایک ایسی تصویر تھی جس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ واقعہ یہ ہے لوگوں کے ذہن پاکستان بننے کے نتائج کا کوئی اندازہ کر ہی نہیں سکے تھے۔ یہ بات قطعی طور پر معلوم تھی کہ اگر مسلمانوں کی اکثریت کے صوبے پاکستان میں شامل ہوجائیں گے تو بقیہ صوبے تو جہاں مسلمان اقلیت میں تھے، ہندوستان ہی میں شامل رہیں گے۔ یوپی اور بہار کے مسلمانوں کو تو تقسیم کے بعد بھی ہندوستان ہی میں رہنا تھا۔ اس لیے کہ وہ اقلیت میں تھے۔ یہ بات تو عجیب ہے، مگر واقعہ یہی ہے کہ مسلم لیگ کے ان لیڈروں نے حماقت میں اپنے دل میں شاید سمجھ لیا تھا کہ پاکستان بن جانے کے بعد سارے مسلمان چاہے وہ اکثریت کے علاقے کے ہوں یا اقلیت کے، ایک قوم تصور کیے جائیں گے اور انھیں اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کا پورا حق ہوگا۔ لیکن اب جو مسلمانوں کی اکثریت کے صوبے پاکستان میں شامل ہوگئے۔ پنجاب اور بنگال کی تقسیم بھی ہوگئی اور مسٹر جناح کراچی کے لیے روانہ ہوگئے تو آخر کار انھیں احساس ہوا کہ ہندوستان کی تقسیم سے نہ صرف یہ کہ انھیں کوئی فایدہ نہیں ہوا ہے، بلکہ اس کی

وجہ سے وہ اپنا سب کچھ کھو بیٹھے ہیں۔ مسٹر جناح کا الوداعی پیغام ایک ذرا سی چوٹ تھی جس نے انھیں چت کر دیا۔ اب یہ بات ان پر واضح ہو گئی کہ تقسیم کا واحد نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اقلیت کی حیثیت سے وہ اور بھی کم زور ہو گئے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ انھوں نے اپنی نادانی کی حرکت سے ہندوؤں کے دل میں غصہ اور جلن پیدا کر دی تھی۔

مسلم لیگ کے یہ لوگ برابر کہتے رہے کہ اب وہ ہندو اکثریت کے رحم و کرم پر ہیں۔ یہ بات ایسی بدیہی تھی کہ ان واقعات پر وہ جو اظہار غم کرتے تھے، اس کی وجہ سے ان کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں ہوتی تھی۔ میں نے انھیں وہ بات یاد دلائی جو میں نے کیبنٹ مشن کے زمانے میں کہی تھی۔ ۱۰ اپریل کو میں نے ایک بیان دیا تھا جس میں، میں نے ہندوستانی مسلمانوں کو بہت صاف لفظوں میں آگاہ کیا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ اگر ملک تقسیم ہوا تب ان کی آنکھ کھلے گی اور وہ دیکھیں گے کہ اکثریت والے علاقوں کے پاکستان میں شامل ہو جانے کے بعد بھی وہ ہندوستان ہی میں رہیں گے، مگر ان کی حیثیت ایک ادنا اور حقیر اقلیت کی سی ہو جائے گی۔ (انڈیا ونس فریڈم: ص ۶-۲۰۳)

حاشیہ ❶: پچھلے صفحات میں مولانا آزاد نے مسٹر محمد علی جناح کے ایک بیان کا حوالہ دیا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو ہندوستان کا وفادار شہری بن کر رہنا چاہیے۔ اس مقام پر جناح صاحب کے اصل بیان اور اس کی حقیقت پر نظر ڈال لینی چاہیے:

''اصولاً تو یہی بات ہونی چاہیے تھی کہ پاکستان کے تمام غیر مسلم شہری پاکستان کے اور ہندوستان کے تمام مسلمان اور غیر ہندو شہری ہندوستان کے وفادار شہری بن کر رہتے۔ لیکن مسٹر جناح نے یہ بات کہاں کہی تھی؟ انھوں نے تو مسلمان کو ہندوستان کی ''حکومت'' کا وفادار رہنے کا مشورہ دیا تھا اور ہندوستان کی حکومت کو ان کی ''اپنی حکومت'' قرار دیا تھا۔ حال آں کہ اگر وہ یہ کہتے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو ''ہندوستان'' کا وفادار رہنا چاہیے، تب بھی ہندوستان ان کے نزدیک ''ایک خالص ہندو ریاست'' تھا۔ (رائٹر کے نمایندے کو مسٹر جناح کا بیان ۲۵ر اکتوبر ۱۹۴۷ء) اور خود مسٹر جناح اور مسلم لیگ کے دعاوی کے مطابق مسلمان ہندوؤں کے ساتھ ایک ملک میں رہ نہیں سکتے تھے۔ ان کی ریاست اور ان کی حکومت کی وفاداری کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا، لیکن مسٹر جناح نے مسلمانوں کو یہی مشورہ دیا اور حکومت کو یہ حق بھی دیا کہ وہ کسی غیر وفادار شہری کو برداشت نہ کرے۔ ۱۳ر جولائی ۱۹۴۷ء کو نئی دہلی میں ایک پریس کانفرنس میں پاکستان کی

اقلیتوں کو یقین دلایا کہ ان کے مذہب، کلچر، زندگی اور جائیداد کی حفاظت کی جائے گی، وہ پاکستان کے پورے شہری ہوں گے اور اس سلسلے میں ان کے ساتھ کسی قسم کا امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا۔ انھیں بھی دوسروں کی طرح ان تمام ذمہ داریوں کو پورا کرنا پڑے گا جو ہر شہری پر عاید ہوتی ہیں۔ اقلیتوں کو حکومت کا وفادار بننا پڑے گا اور حکومت کی اطاعت قبول کرنی پڑے گی۔ کوئی حکومت یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ اقلیتیں حکومت کی وفادار نہ ہوں یا تخریبی اقدامات شروع کر دیں۔ کیوں کہ ہر شہری کے لیے ضروری ہے کہ وہ حکومت کا وفادار رہے۔ ایک نامہ نگار نے کہا: ''آپ کہہ رہے ہیں کہ پاکستان کی اقلیتیں حکومت کی وفادار اور اطاعت گزار رہیں، کیا آپ ہندوستان کی اقلیتوں کے بارے میں بھی یہی کچھ کہیں گے؟'' مسٹر جناح نے جواب دیا: ''یہ تمام اقلیتوں کے بارے میں ہے، خواہ وہ دنیا کے کسی بھی حصے میں آباد ہوں۔ کوئی حکومت یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی اقلیت حکومت کی وفادار نہ ہو اور حکومت کے خلاف تخریبی اقدامات شروع کر دے، تو اس کا یہ رویہ حکومت کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ میں ہر مسلمان اور ہندو شہری سے اپیل کروں گا کہ وہ اپنی حکومت کا وفادار رہے۔'' (اب ش)

ہندوستان کی آزادی — دہلی میں فسادات کی تباہ کاری:

۱۵ راگست ۱۹۴۷ء: ۱۵ راگست کو آزادی کی پہلی صبح کا خیر مقدم کرنے کے لیے خاص پروگرام مرتب کیا گیا تھا۔ رات کے بارہ بجے مجلس دستور ساز کا جلسہ ہوا اور اس میں اعلان کیا گیا کہ اب ہندوستان آزاد ہو کر ایک خود مختار ریاست بن گیا ہے۔ نو بجے صبح کو اس مجلس کا دوبارہ جلسہ ہوا جس میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے افتتاحیہ تقریر کی۔ سارے شہر پر ایک ہنگامہ خیز خوشی طاری تھی۔ تھوڑی دیر کے لیے تو تقسیم کے کرب کا احساس بھی مٹ گیا۔ شہر اور آس پاس کے علاقوں سے لاکھوں آدمی آزادی کو خوش آمدید کہنے کے لیے اکٹھا ہوئے تھے۔ چار بجے شام کو آزاد ہندوستان کا پرچم بلند ہونے والا تھا۔ اگست کی تپتی ہوئی دھوپ کے باوجود لاکھوں آدمی جمع ہوئے، بلکہ گھنٹوں پہلے سے بے پناہ گرمی میں بیٹھے انتظار کر رہے تھے۔ ایسا ازدحام تھا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اپنی کار سے باہر نہیں نکل پائے اور مجبوراً اسی کے اندر سے تقریر کرنی پڑی۔

خوشی سے وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ یہ حالت اڑتالیس گھنٹوں سے زیادہ نہ

رہی۔ دوسرے ہی روز سے فرقہ وارانہ فسادات کی خبریں دارالحکومت پر افسردگی کے بادل بن کر چھا گئیں۔ یہ خبریں قتل، غارت گری، ایذا رسانی کی تھیں۔ معلوم ہوا کہ مشرقی پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کے گاؤں پر حملے کیے ہیں، مکان جلا رہے ہیں اور بے گناہ مردوں، عورتوں اور بچوں کو قتل کر رہے ہیں۔ بالکل ایسی ہی خبریں مغربی پنجاب سے آ رہی تھیں۔ وہاں مسلمان اسی طرح ہندو اور سکھ مرد، عورتوں اور بچوں کو اندھا دھند قتل کر رہے تھے۔ غرضے کہ پورا پنجاب اس قتل و غارت کی وجہ سے قبرستان بنتا جا رہا تھا۔ وارداتیں بہت تیزی کے ساتھ یکے بعد دیگرے ہوتی رہیں۔ پنجاب کے وزیر دوڑ دوڑ کر دلّی آ رہے تھے، ان کے پیچھے مقامی کانگریس کے لیڈر آتے تھے، جو غیر سرکاری لوگ تھے۔ یہ سب ان واقعات سے دہشت زدہ تھے جو پنجاب میں رونما ہو رہے تھے، خون خرابہ اتنے بڑے پیمانے پر ہو رہا تھا کہ ان کے ہوش و حواس گم تھے اور مایوسی کے عالم میں وہ کہہ رہے تھے کہ شاید یہ کسی طرح روکا نہ جا سکے گا۔ ہم نے پوچھا کہ آپ لوگ فوج سے کیوں نہیں مدد لیتے؟ انھوں نے جواب دیا کہ پنجاب میں جو فوج ہے وہ قابل اعتبار نہیں رہی ہے اور اس سے کچھ بہت مدد کی امید نہیں کی جا سکتی۔ ان کا مطالبہ تھا کہ وہاں کے لیے دلّی سے فوج بھیجی جائے۔

پہلے دِلّی میں فسادات نہیں ہوئے۔ لیکن ایسی صورت میں کہ چاروں طرف ملک میں قتل و غارت گری کے شعلے بھڑک رہے تھے، دلّی میں جو تھوڑی بہت ریزرو فوج تھی اس کا وہاں سے ہٹانا مصلحت کے خلاف تھا۔ ہم لوگوں نے طے کیا کہ دوسرے مقامات سے فوج بلائی جائے۔ لیکن فوج کے پہنچنے سے قبل فسادات کی آگ دارالحکومت تک پہنچ گئی۔ پہلے قتل کی خبریں پنجاب سے آئیں اور ان کے پیچھے مغربی پنجاب سے پناہ گزین آنے لگے تو دلّی میں تشدد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ شہر پر قاتلوں کا قبضہ ہے۔ فسادات صرف ان بستیوں تک نہیں محدود تھے جہاں ریفیوجی (پناہ گزین) آباد تھے یا جہاں عام لوگ رہتے تھے، بلکہ وہ علاقے بھی لپیٹ میں آ گئے تھے، جہاں صرف سرکاری ملازم رہتے تھے۔ جب مغربی پنجاب کی خون ریزیوں کی خبریں دہلی پہنچیں تو دلّی کے فساد پسند عناصر کی قیادت میں لوگوں کے ہجوم نے مسلمانوں پر دھاوا بول دیا۔ دلّی میں کچھ سکھوں نے ان قاتلانہ حملوں کی تنظیم میں بہت نمایاں حصہ لیا۔

میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں کہ یرغمالوں اور انتقامی کارروائیوں کے خطرناک نظریے کے بارے میں جو غیر ذمہ دارانہ باتیں ہوئی تھیں، ان کی وجہ سے میں کس قدر پریشان اور فکر مند ہو گیا تھا۔ دلّی میں ہم نے اس نظریے پر ایک بھیانک طریقے سے عمل درآمد ہوتے ہوئے دیکھا۔ اگر مغربی پنجاب کے مسلمان ہندوؤں اور سکھوں کو قتل کر رہے تھے تو دلّی کے بے قصور مسلمانوں سے اس کا بدلہ کیوں لیا جائے؟ یرغمالوں اور انتقام کا یہ نظریہ اس قدر ظالمانہ تھا کہ کوئی بھی صحیح دماغ اور شائستہ انسان اس کی حمایت میں ایک لفظ بھی کہنا پسند نہیں کرے گا۔

فوج کا رویہ بھی اب ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ تقسیم سے پہلے یہ فرقہ وارانہ منافرت سے پاک تھی، لیکن جب فرقہ واریت کی بنیاد پر ملک تقسیم ہوا تو منافرت کے جراثیم فوج میں بھی داخل ہو گئے۔ دلّی میں جو فوج تھی اس میں زیادہ تر ہندو اور سکھ تھے۔ چند ہی روز کے اندر یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ اگر شہر میں امن قایم رکھنے کے لیے سخت کارروائی کی گئی تو یہ دلّی کی فوج کے لیے بہت سخت آزمایش کا باعث ہو سکتی ہے۔ اس لیے ہم نے جنوبی ہند سے فوج بلانے کی کارروائی کی۔ اس پر ملک کی تقسیم کا اثر نہیں پڑا تھا اور اس میں سپاہیانہ فرماں برداری کا جذبہ موجود تھا۔ جنوب سے آئے ہوئے ان سپاہیوں نے دارالحکومت کے فسادات کو رفع کرنے اور امن قایم کرنے میں بہت اہم حصہ لیا۔

خاص شہر کے علاوہ قرول باغ، لودھی کالونی، سبزی منڈی اور صدر بازار جیسے علاقے، جہاں مسلمانوں کی بڑی آبادی تھی، ان تمام علاقوں میں بھی مسلمانوں کے جان و مال محفوظ نہیں رہے تھے اور جو حالات تھے ان میں فوج کے ذریعے حفاظت کا پورا انتظام نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ایک وقت تو اس کی نوبت آ گئی کہ کوئی مسلمان اپنے گھر میں رات کو اس یقین کے ساتھ سو نہیں سکتا تھا کہ دوسرے دن وہ زندہ پلنگ سے اٹھے گا۔

ان قتل و غارت کے دنوں میں، میں نے فوجی آفیسروں کے ساتھ دلّی کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا، میں نے دیکھا کہ مسلمان بالکل پست ہو گئے ہیں اور بے بسی کا احساس ان کی طبیعتوں میں سرایت کر گیا ہے۔ بہتوں نے میرے مکان میں پناہ مانگی۔ شہر کے مشہور اور امیر خاندان کے لوگ میرے پاس محتاجی کے اس عالم میں پہنچے کہ تن کے کپڑوں کے سوا ان کے پاس کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ ان میں سے بہت سے تو دن کی روشنی میں نکلتے ڈرتے

تھے اور وہ آدھی رات کو یا صبح تڑکے فوجی پہرے کے ساتھ میرے گھر تک لائے گئے۔ جب میرا مکان بھر گیا تو میں نے اپنی چہار دیواری کے اندر خیمے لگوا دیے۔ مرد، عورتیں، امیر، غریب، نوجوان اور بوڑھے غرضے کہ ہر قسم کے لوگ موت کے ڈر سے یہاں ہاتھ پاؤں سمیٹ کر جمع ہو گئے تھے۔

یہ بات جلد ہی معلوم ہو گئی کہ امن قایم ہونے میں کافی وقت لگے گا۔ مختلف علاقوں میں دور دور پھیلے ہوئے مکانوں کی حفاظت ناممکن تھی۔ اگر ہم ایک علاقے میں پہرے کا انتظام کرتے تو کسی دوسرے علاقے میں حملے ہونے لگتے۔ اس لیے یہ طے پایا کہ سارے مسلمانوں کو یکجا کر کے انھیں محفوظ کیمپوں میں رکھ دیا جائے۔ ایسا ایک کیمپ پرانے قلعے میں قایم کیا گیا۔ یہاں اب عمارت کوئی نہیں ہے، صرف برجیاں باقی رہ گئی ہیں، جلد ہی یہ بھی بھر گئیں۔ بہت سے مسلمان یہاں لائے گئے اور انھوں نے تقریباً پوری سردیاں انھیں برجیوں میں گزاریں۔

فسادات کے زمانے میں امن و امان قایم رکھنے کے لیے متعدد اسپیشل مجسٹریٹ مقرر کیے گئے تھے۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ انتخاب اچھا ثابت نہیں ہوا اور ان میں سے بعض نے اپنے فرض کی ادائیگی میں بڑی کوتاہی کی۔ ایک مجسٹریٹ کے بارے میں تو مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک روز ایک ہندو کانگریسی اس کے پاس مدد کے لیے آیا، اس نے بتایا کہ مسلمانوں کے ایک علاقے پر حملے کا اندیشہ ہے اور بعض خاندانوں کے لیے جان کا خطرہ ہے۔ مجسٹریٹ نے ضروری کارروائی کے بجائے اس کانگریسی پر بے حس ہونے کا الزام لگایا اور کہا کہ اسے تعجب ہے کہ کوئی ہندو مسلمانوں کے لیے مدد مانگنے آتا ہے۔

اس واقعے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مختلف لوگوں پر اس بحران کا کیا اثر ہوا۔ لیکن اگر کچھ اسپیشل مجسٹریٹ اور کانگریسی اپنے منصب کے نا قابل نکلے تو دلّی کے زیادہ تر کانگریسیوں نے اس سخت آزمائش کے موقع پر اعلا ظرفی کا ثبوت دیا۔ کانگریس کے ہندو اور سکھ ممبر اپنے فرقہ پرست ہم مذہب لوگوں کی طعن و تشنیع کے باوجود ثابت قدم اور اپنے قوم پرست اصولوں پر قایم رہے۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان کی تقسیم کو عمل میں لانے کے لیے جو کچھ کیا اس پر میں اعتراض کر چکا ہوں۔ لیکن اس بحران کے زمانے میں جس طرح انھوں نے حالات پر

قابو حاصل کیا اس پر مجھے ان کو خراج تحسین پیش کرنا ہے۔ انھوں نے جس سرگرمی اور مستعدی سے ملک کی تقسیم کے پے چیدہ اور مشکل منصوبے کو سرانجام دیا، اس کی طرف میں پہلے بھی اشارہ کر چکا ہوں۔ اب انھوں نے ملک میں امن و امان قایم کرنے میں اور بھی زیادہ مستعدی اور سرگرمی دکھائی، ان کی فوجی تربیت اس آڑے وقت میں بڑی کام آئی۔ میرا خیال ہے کہ شاید ان کی قیادت اور ان کے فوجی تجربے کے بغیر ہم حالات پر اتنی جلدی اور اتنے موٴثر طریقے سے قابو نہیں پا سکتے تھے، انھوں نے کہا کہ یہ حالت بالکل جنگ کی سی ہے اور اس میں دوران جنگ کے طریقوں پر عمل کرنا چاہیے۔ جنگ کے زمانے میں ہنگامی کونسلیں چوبیس گھنٹے کام کرتی ہیں۔ ہمیں ایک کونسل آف ایکشن بنانی چاہیے، جو ہر معاملے کے پیش ہوتے ہی اس کے متعلق فیصلہ کرے اور یہ بھی دیکھے کہ اس پر عمل درآمد ہوتا ہے۔ چناں چہ ایک ایمرجنسی بورڈ بنایا گیا۔ جس میں کابینہ کے کچھ ممبر اور کچھ اونچے درجے کے فوجی اور سول آفیسر رکھے گئے۔ ساڑھے نو بجے روزانہ صبح کو اس بورڈ کا اجلاس کابینہ کے دفتر میں ہوتا تھا، جس کی صدارت خود لارڈ ماؤنٹ بیٹن کرتے تھے۔ پچھلے چوبیس گھنٹوں میں جو احکام جاری ہوتے اور ان پر جو عمل ہوتا اس کا جایزہ لیا جاتا۔ جب تک امن پوری طرح دوبارہ قایم نہیں ہوا یہ بورڈ بغیر کسی وقفے کے برابر کام کرتا رہا۔ اس کے سامنے روز صبح کو جو اطلاعات آتیں، ان سے صورت حال کی نزاکت کا اور خطرے کا اندازہ ہو جاتا تھا۔

ایک اچھے حاکم کی پہلی پہچان یہ ہے کہ وہ ذاتی پسند و ناپسند کو نظر انداز کر کے ہر ایک کی جان و مال کی حفاظت کا ضامن ہو جائے۔ ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۷ء کے ہول ناک زمانے میں جواہر لال نے ایک سچے حاکم کی ان صلاحیتوں کا بہت نمایاں ثبوت دیا۔ جس روز سے انھوں نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ حکومت کو شہریوں کے درمیان کسی قسم کی تفریق نہیں برتنی چاہیے اور ہر ایک کے ساتھ خواہ وہ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی پارسی یا بدھ ہو، یک ساں برتاؤ کرنا چاہیے۔ قانون کی نظر میں ہندوستان کے ہر شہری کا حق برابر ہے۔

ایک اچھے منتظم کی حیثیت سے ان کی صفات کا پہلا ثبوت ۱۹۴۶ء میں ملا۔ کلکتہ کے قتل عام کے بعد نوا کھالی میں فسادات شروع ہو گئے، جس میں ہندوؤں کو بہت تکلیف پہنچی۔ نوا کھالی کے ہندوؤں کا انتقام لینے کے لیے بہار کے ہندوؤں نے مقامی مسلمانوں

پر حملے شروع کر دیے اور سارے صوبے میں فسادات ہونے لگے۔ صوبے کی حکومت کے لیے حالات پر قابو پانا مشکل ہو گیا اور مرکزی حکومت کو سخت کارروائی کرنی پڑی۔ میں ان دنوں تقریباً دو ہفتے پٹنہ میں مقیم رہا۔ جس سختی اور قوت کے ساتھ جواہر لال نے ان فسادات کی روک تھام کی اس سے میں بہت متاثر ہوا۔ یوں تو ہم سب ایک ہی مقصد کے لیے کوشاں تھے، لیکن بلاشبہ اس میں سب سے مؤثر کارگذاری جواہر لال کی تھی۔

اس پوری مدت میں گاندھی جی ایک شدید ذہنی کرب میں مبتلا تھے۔ انھوں نے دونوں فرقوں کے درمیان بہتر فضا پیدا کرنے کے لیے اور مسلمانوں کی جان و مال کی حفاظت کے لیے جی توڑ کوشش کی۔ انھیں اس سے بڑی پریشانی اور تکلیف ہوئی۔ ان کی کوششوں کو وہ کامیابی نصیب نہ ہوئی جس کی انھیں امید تھی۔ اکثر وہ جواہر لال، سردار پٹیل اور مجھ کو بلا بھیجتے اور شہر کا حال دریافت کرتے۔ انھیں یہ دیکھ کر اور بھی رنج ہوتا کہ خود ہم لوگ اس بارے میں متفق نہیں ہیں کہ شہر میں کیا ہو رہا ہے۔

سچ یہ ہے کہ میرا اور جواہر لال کا رویہ سردار پٹیل کے رویے سے مختلف تھا۔ اس اختلاف کا اثر مقامی حکام پر پڑ رہا تھا اور یہ بات واضح ہوتی جا رہی تھی کہ ان حکام میں بھی دو گروہ بن گئے ہیں۔ بڑا گروہ سردار پٹیل کی نظریں دیکھتا ہے، اس لیے کہ وہ وزیرِ داخلہ تھے اور وہ وہی کرنا چاہتا تھا جس سے سردار پٹیل خوش ہوتے۔ دوسرے چھوٹے گروہ کی نظریں میری اور جواہر لال کی طرف اٹھتی تھیں اور یہ جواہر لال کے احکام بجا لانے کی کوشش کرتا تھا۔ ان دنوں دلی کے چیف کمشنر ایک مسلمان خورشید احمد تھے جو صاحب زادہ آفتاب احمد کے بیٹے تھے۔ بہ حیثیت افسر یہ مضبوط آدمی نہیں تھے۔ اس کے علاوہ انھیں یہ ڈر بھی تھا کہ اگر انھوں نے سختی کی تو ان پر مسلمانوں کی طرف داری کا الزام لگا دیا جائے گا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ صرف نام کے افسرِ اعلا تھے اور ڈپٹی کمشنر ساری کارروائیاں اپنی صواب دید کے مطابق کرتا تھا۔ یہ آفیسر سکھ تھا۔ لیکن سکھوں کے رسم و رواج کی بہت سی باتوں پر عمل نہیں کرتا تھا۔ اس نے داڑھی منڈا دی تھی اور بال ترشواتا تھا۔ بہت سے سکھ اس کو بدعتی تصور کرتے تھے۔ وہ تقسیم سے پہلے بھی دلی کا ڈپٹی کمشنر تھا۔ ۱۵ راگست سے قبل ایک تجویز تھی کہ اسے پنجاب واپس بھیج دیا جائے کیوں کہ اس کی مدت ہو چکی ہے۔ دلی کے بہت سے سربرآوردہ شہریوں نے خصوصاً مسلمانوں کے ایک بڑے حصے نے اس تجویز کے خلاف درخواست دی۔ ان کا

کہنا تھا کہ یہ ایک غیر جانب دار اور مضبوط آفیسر ہے۔ اس کٹھن وقت میں اس کا مناسب بدل ملنا مشکل ہوگا۔

شہریوں کی خواہش کے مطابق اس آفیسر کو دلّی ہی میں رکھا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کی فرقہ وارانہ کش مکش کے اثر میں آکر وہ اپنے پچھلے رویے پر قایم نہ رہ سکا۔ مجھ تک بہت سی شکایتیں پہنچیں کہ فسادیوں کے خلاف جتنی سخت کارروائی کی ضرورت تھی، وہ نہیں کررہا تھا۔ وہی مسلمان جنھوں نے سال بھر قبل اس کو دلّی میں رکھنے کی کوشش کی تھی، اب آکر یہ شکایت کرتے تھے کہ وہ دلّی کے مسلمان شہریوں کی حفاظت کا معقول انتظام نہیں کررہا ہے۔ یہ شکایت سردار پٹیل تک پہنچی، لیکن اب وہ ایسی شکایتوں پر بہت ہی کم توجہ کرتے تھے۔

سردار پٹیل وزیرِ داخلہ تھے اور اس حیثیت سے دلّی کے انتظامی امور براہِ راست ان کے تحت تھے۔ لوٹ مار اور قتل کی وارداتوں کی فہرست طول کھینچنے لگی تو گاندھی جی نے سردار پٹیل کو بلا کر دریافت کیا کہ وہ اس کشت وخون کی روک تھام کے لیے کیا کررہے ہیں؟ سردار پٹیل نے انھیں یقین دلانے کی کوشش کی کہ جو خبریں ان تک پہنچ رہی ہیں، وہ نہایت مبالغہ آمیز ہیں۔ انھوں نے یہ تک کہا کہ مسلمانوں کو ڈرنے اور شکایت کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک موقعے پر جب ہم تینوں گاندھی جی کے پاس بیٹھے ہوئے تھے تو جواہر لال نے انتہائی غم کے ساتھ کہا کہ دلّی کی صورت حال جس میں مسلمان کتوں اور بلیوں کی طرح مارے جارہے ہیں، ان کے لیے بالکل ناقابل برداشت ہوگئی ہے۔ انھیں اپنی بے بسی پر شرم آتی ہے کہ وہ مسلمانوں کو بچانے کے لیے کچھ نہیں کرسکتے۔ ان کا ضمیر انھیں ہر وقت ستاتا رہتا ہے۔ اس لیے کہ جب لوگ ان کے پاس ہیبت ناک وارداتوں کی شکایتیں لے کر آتے ہیں تو ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگوں کو کیا جواب دیں۔ جواہر لال نے اس بات کو کئی بار دہرایا کہ یہ صورتِ حال ان کے لیے ناقابل برداشت ہے اور ان کا ضمیر انھیں ایک لمحہ بھی چین سے نہیں رہنے دیتا۔

اس بات کا سردار پٹیل نے جو جواب دیا اس سے ہم ششدر رہ گئے۔ ایسے زمانے میں جب کہ دلّی میں مسلمان دن دھاڑے مارے جارہے تھے، سردار پٹیل نے نہایت اطمینان کے ساتھ گاندھی جی سے کہا کہ جواہر لال کی شکایتیں بالکل ان کی سمجھ میں نہیں آتی

ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اکاڈکا وارداتیں ہوئی ہوں، لیکن حکومت مسلمانوں کے جان و مال کی حفاظت کی ہر ممکن کوشش کر رہی ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ سردار پٹیل نے اسلئے اس بات پر ناگواری ظاہر کی کہ جواہر لال وزیرِ اعظم ہوتے ہوئے اپنی حکومت کے طرزِ عمل پر ایسے اعتراض کر رہے ہیں؟

جواہر لال چند لمحے چپ بیٹھے رہے اور پھر نہایت دل شکستہ انداز میں انھوں نے گاندھی جی کی طرف دیکھ کر کہا کہ اگر سردار پٹیل کے یہی خیالات ہیں تو پھر انھیں کچھ نہیں کہنا ہے۔

اس دوران میں ایک واقعہ اور بھی ہوا جس سے اس بات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سردار پٹیل کا ذہن کس طرح کام کر رہا تھا۔ غالباً انھوں نے یہ محسوس کیا کہ مسلمانوں پر روزانہ جو حملے ہو رہے تھے ان کا کوئی جواز ہونا چاہیے۔ چناں چہ انھوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ مسلمانوں کے علاقوں سے بہت اسلحہ برآمد ہوا ہے، جو دہلی کے مسلمانوں نے ہندوؤں اور سکھوں پر حملہ کرنے کے لیے جمع کیا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ اگر ہندوؤں اور سکھوں نے اس معاملے میں پہل نہ کی ہوتی تو مسلمان انھیں تباہ کر دیتے۔ پولیس نے سبزی منڈی اور قرول باغ کے علاقوں سے واقعی کچھ اسلحہ برآمد بھی کیا، جو سردار پٹیل کے حکم سے گورنمنٹ ہاؤس میں لاکر ہمارے معائنے کے لیے کیبنٹ روم سے ملحق کمرے میں سجادیا گیا۔ صبح کو جب ہم سب اپنے روزانہ کے جلسے کے لیے جمع ہوئے تو سردار پٹیل نے کہا کہ پہلے ہمیں پاس کے کمرے میں چل کر برآمد شدہ اسلحہ کا معائنہ کرنا چاہیے۔ وہاں پہنچ کر ہم نے ایک میز پر درجنوں باورچی خانہ کی معمولی زنگ آلود چھریاں، جیبی اور قلم و پنسل بنانے کے چاقو، جن میں سے بعض کے دستے تھے اور بعض کے دستے غائب تھے۔ کچھ لوہے کی سلاخیں جو پرانے مکانات کے جنگلوں سے نکالی گئی تھیں اور کچھ پائپ کے ٹکڑے دیکھے۔ سردار پٹیل کے خیال میں یہی وہ اسلحہ تھا جو مسلمانوں نے ہندوؤں اور سکھوں کو نیست و نابود کرنے کے لیے جمع کیا تھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ان میں سے ایک دو چاقو اٹھا لیے اور مسکرا کر کہا کہ جن لوگوں نے جنگ کا یہ سامان اس خیال سے جمع کیا تھا کہ اس سے دلی کا شہر فتح کر لیا جائے، ان کا جنگ کے بارے میں تصور بہت ہی عجیب و غریب ہوگا۔

میں ذکر کر چکا ہوں کہ دلی کے زیادہ تر مسلمانوں کو پرانے قلعے میں لاکر رکھا گیا تھا،

اب سردیاں سر پر آ گئیں تھی، ہزاروں لوگ جو کھلے آسمان کے نیچے رہتے تھے انھیں سردی سے سخت تکلیف پہنچتی تھی۔ ان کے لیے کھانے کا معقول انتظام تھا نہ پانی کا۔ وہاں سے گندگی ہٹانے کا اول تو کوئی انتظام ہی نہ تھا اور جو تھا وہ بھی بالکل ناکافی تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے ایمرجنسی بورڈ کے سامنے شہادت دیتے ہوئے پرانے قلعے میں رہنے والوں کی دل گداز حالت بیان کی۔ انھوں نے کہا کہ ان غریب مردوں، عورتوں اور بچوں کو موت کے منہ سے نکال کر زندہ درگور کیا گیا ہے۔ بورڈ نے مجھے ہدایت کی کہ میں جا کر انتظامات کا معائنہ کروں اور ضروری کارروائیاں تجویز کروں۔ اس کے بعد جلسے میں طے پایا کہ پانی اور صفائی کا فوراً انتظام کیا جائے۔ ساتھ ہی فوج سے کہا گیا کہ وہ جتنے زیادہ سے زیادہ خیمے دے سکتی ہو فراہم کرے تاکہ لوگوں کو کم سے کم کینوس کے نیچے پناہ مل سکے۔

ادھر گاندھی جی کی اذیت روز افزوں تھی۔ پہلے پوری قوم ان کی ادنا سے ادنا خواہش پوری کرنے پر تیار رہتی تھی، لیکن اب یہ عالم تھا کہ وہ منت اور التجا کر رہے تھے اور لوگوں کے کان پر جوں تک نہ رینگتی تھی۔ بالآخر حالات ان کے لیے ناقابل برداشت ہو گئے۔ انھوں نے مجھے بلا کر کہا کہ میرے پاس اب اس کے علاوہ کوئی ذریعہ نہیں رہ گیا ہے کہ اس وقت تک کے لیے برت رکھوں جب تک دلّی میں پھر سے امن و امان قایم نہ ہو جائے۔ یہ خبر سن کر کہ گاندھی جی دلّی میں امن قایم ہونے تک برت رکھنے والے ہیں، بہت سے لوگ جواب تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے، انھیں ذمہ داری کا احساس ہوا، شرمندہ اور عمل کی طرف مایل ہوئے۔ سب نے محسوس کیا کہ گاندھی جی کو اس عمر میں اور صحت کی اس حالت میں برت رکھنے سے روکنا چاہیے۔ ان لوگوں نے گاندھی جی سے اپیل کی کہ وہ اپنا ارادہ ترک کر دیں۔ لیکن گاندھی جی کا فیصلہ اٹل تھا۔

سردار پٹیل کا رویہ گاندھی جی کے دل پر سب سے بڑا بوجھ تھا۔ سردار پٹیل ان کے بہت قریب کے لوگوں میں تھے اور انھیں بہت عزیز تھے۔ دراصل سردار پٹیل کی سیاسی حیثیت ہر لحاظ سے گاندھی جی کی مرہون منت تھی۔ (انڈیا ونس فریڈم: ص ۱۳-۲۰۶)

ہندوستان کی آئین ساز اسمبلی میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی تقریر:

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء: اپنڈیکس نمبر ۱، ڈاکومنٹ نمبر ۴۸۹

اس تقریر کا متن جو لارڈ ماؤنٹ بیٹن ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کی آئین ساز اسمبلی میں کریں گے۔

جناب صدر اور اراکین آئین ساز اسمبلی، مجھے شہنشاہ معظم کی جانب سے ایک پیغام موصول ہوا ہے تاکہ آپ تک پہنچا سکوں۔ اس پیغام میں کہا گیا ہے:

"آج کے اس تاریخی دن کے موقع پر جب کہ ہندوستان برطانوی دولت مشترکہ کی اقوام میں ایک آزاد ڈومینین کے طور پر اپنا مقام حاصل کر رہا ہے، میں دلی نیک خواہشات کا اظہار کرتا ہوں۔

دنیا میں ہر جگہ آزادی کے پرستار آپ کے جشن آزادی کی خوشیوں پر شاداں ہیں کہ اقتدار باہمی رضامندی سے منتقل ہوا ہے اور یہ جمہوری نظریات کی بڑی کامیابی ہے، برطانوی اور ہندوستانی عوام کو ان نظریات کا بہت زیادہ احساس ہے۔ حوصلہ افزا پہلو یہ ہے کہ ساری تبدیلی پرامن طور پر ہو رہی ہے۔

آپ کے کندھوں پر بھاری ذمہ داریوں کا بوجھ آن پڑا ہے، لیکن جب آپ کی دانائی کو دیکھتا ہوں جس کا آپ مظاہرہ کر چکے ہیں اور عظیم قربانیاں جو آپ دے چکے ہیں تو مجھے یقین ہوتا ہے کہ آپ اپنے مستقبل کو سنوارنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

میری دعا ہے کہ آپ پر قدرت کی مہربانیاں ہوں اور آپ کے قائدین پیش آمدہ ذمہ داریوں سے فراست سے عہدہ برا ہوں۔ دنیا کی اقوام کے ساتھ دوستی، رواداری اور امن کی بنیاد پر تعلقات استوار کریں۔ آپ اپنے عوام کی خوش حالی اور انسانیت کی بہبود کے لیے جو بھی کاوشیں کریں گے، میری ہمدردی اور دعائیں آپ کے ساتھ ہوں گی۔"

مشکل سے چھ ماہ کا عرصہ گزرا ہوگا کہ مسٹر اٹلی نے مجھے وائسرائے بننے کی دعوت دی۔ انھوں نے مجھے پر واضح کر دیا کہ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے، جب کہ ملک معظم کی حکومت فیصلہ کر چکی ہے کہ جون ۱۹۴۸ء تک اقتدار ہندوستانیوں کو منتقل کر دیا جائے۔ اس وقت بہت سے لوگ سمجھتے تھے کہ ملک معظم کی حکومت نے حصول مقصد کے لیے بہت کم وقت رکھا ہے۔ پندرہ ماہ کی قلیل مدت میں اتنا بڑا کام کس طرح پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے؟

بہ ہر حال مجھے یہاں آئے ہوئے ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا اور میں نے اس سے پہلے یہ نتیجہ اخذ کرلیا تھا کہ انتقالِ اقتدار کے لیے مقرر کردہ یہ تاریخ جون ۱۹۴۸ء بہت دور ہے، اسے بہت پہلے ہونا چاہیے تھا۔ جب میں انگلستان سے روانہ ہوا تھا تو فرقہ وارانہ کشیدگی اور فسادات کی شدت کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ انتقالِ اقتدار کے مسئلے پر ممکنہ حد تک جلد فیصلہ کرنا چاہیے، کیوں کہ پورا برِ اعظم کشیدگی کی لپیٹ میں ہے۔

میں نے تمام سیاسی جماعتوں کے قایدین سے فوراً گفتگو شروع کی اور اس کا نتیجہ ۳؍ جون کے منصوبے کی صورت میں رونما ہوا۔ دنیا بھر میں اسے دانش مندانہ قرار دیا گیا ہے اور اس کی ستایش کی گئی ہے۔ منصوبہ کی تیاری میں جو حکمت عملی اختیار کی گئی وہ قایدین پر بالکل واضح تھی۔ اس کی کامیابی دراصل ان (کے تعاون) کی مرہونِ منت ہے۔

میرا یقین ہے کہ حالات کی نزاکت کے پیش نظر جہاں بہت زیادہ پیچیدگیاں ہوں اور کشیدگی پائی جاتی ہو واضح حکمت عملی ہی واحد درست طریقہ رہ جاتا ہے، میں قایدین کو تدبر، رواداری اور دوستانہ تعاون کے لیے خراج تحسین پیش کرتا ہوں، جن کی وجہ سے مقررہ تاریخ سے ساڑھے دس ماہ قبل اقتدار منتقل کرنے کے قابل ہوسکا۔

اس میٹنگ میں جس میں ۳؍ جون منصوبہ کی منظوری دی گئی تھی، قایدین ان مسودات پر غور کرنے کے لیے تیار ہوگئے، میں نے ان کے سامنے پیش کیے تھے اور جن میں تقسیم کے بعد رونما ہونے والی انتظامی صورت حال کا ذکر تھا اور ہم نے وہیں اس وقت ایک مشینری قایم کردی جسے تاریخ کی سب سے بڑی انتظامی حکمت عملی وضع کرنا تھی۔ برِ عظیم کی تقسیم، چالیس کروڑ انسانوں کی تقسیم اور دو آزاد حکومتوں کا قیام اور ڈھائی ماہ سے بھی کم عرصے میں انتقالِ اقتدار، اس سلسلے میں میری جلد بازی کی وجہ یہ تھی کہ ایک مرتبہ جب تقسیم کے اصل مسئلے پر سمجھوتا طے پاگیا ہے تو سب پارٹیوں کا مفاد اسی میں ہے کہ اسے جلد از جلد پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا جائے۔ ہم نے وقت کے تقاضے کے مطابق تیز ترین رفتار سے کام لیا۔ اس کا اصل سہرا ان وزرا اور افسران کے سر ہے جن کی دن رات کی محنت سے محیر العقول نتایج سامنے آئے۔

میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ آزادی کے حصول کے باعث آپ کو جو خوشی ہونی چاہیے تھے وہ ہندوستان کے متحد نہ رہ سکنے کی وجہ سے متاثر ہوئی ہے۔ تقسیم کے باعث آج

کے موقع کی مناسبت سے بعض خوشیوں سے لطف اندوز نہیں ہوا جا سکا۔ آپ کے قایدین نے مشکل فیصلے کرنے میں جس ہمت سے کام لیا ہے میں ان کی ستایش کرتا ہوں، آپ نے دانا محبِ وطن لوگوں کی طرح بڑی بلند ہمتی اور حقیقت پسندی کا مظاہرہ کیا ہے۔

میں ان داناؤں کا احسان مند ہوں جنھوں نے میری نازک پوزیشن کا ہمدردی سے ادراک کیا۔ مثال کے طور پر انھوں نے اپنی پہلی تجویز پر زور نہیں دیا کہ میں ثالثی ٹربیونل کا چیئرمین ہوں۔ پھر انھوں نے پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے سلسلے میں کسی قسم کی ذمے داری مجھ پر نہ ڈالنے سے اتفاق کیا۔ حد بندی کمیشن اور اس کے چیئرمین کا تقرر انھوں نے کیا، انھوں نے ہی اس کا دایرۂ کار کا تعین کیا اور اس کے ایوارڈ کو نافذ کرنا اپنے ذمے لیا۔ آپ دیکھیں کہ اگر یہ حضرات اس کام کو سرانجام نہ دیتے تو میرے لیے بڑی نازک صورت حال پیدا ہو جاتی۔

اب میں ہندوستانی ریاستوں کی جانب آتا ہوں۔ تین جون منصوبے کا تمام تر تعلق برطانوی ہندوستان میں انتقالِ اقتدار سے تھا، اور ریاستوں کے بارے میں اس میں صرف ایک ہی پیراگراف تھا جس میں تسلیم کیا گیا تھا کہ انتقالِ اقتدار کے ساتھ ہی تمام کے تمام ۵۶۵ ریاستیں آزاد ہو جائیں گی۔ یہاں ایک اور مہیب مسئلہ تھا اور اس بارے میں ہر طرف سے تشویش کا اظہار کیا جاتا تھا۔ لیکن اسٹیٹس ڈیپارٹمنٹ کی تشکیل سے اس پر قابو پانا میرے لیے ممکن ہو گیا۔ میں دور اندیش مدبر سردار ولبھ بھائی پٹیل جو کہ اسٹیٹس ڈیپارٹمنٹ کے انچارج ہیں، کا شکر گذار ہوں، انھوں نے ایک منصوبہ تیار کیا، میرے نزدیک یہ منصوبہ ہندوستانی ریاستوں اور ہندوستان دونوں کے لیے یکساں مفید ہے۔ ریاستوں کی زیادہ تر تعداد جغرافیائی اعتبار سے ہندوستان کے ساتھ ملحق ہے اس لیے اس ڈومینین کا مفاد زیادہ داؤ پر لگا ہوا تھا۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ والیان ریاست اور حکومتوں نے حقیقت پسندی سے کام لیا اور ذمے داری کا مظاہرہ کیا اور ہندوستان کی حکومت نے بھی ایسا ہی رویہ اختیار کیا، اس کے باعث الحاق کے لیے ایک ایسا مسودہ تیار ہوا جو فریقین کے لیے قابل قبول تھا، مزید برآں یہ اس قدر سیدھا سادہ اور واضح ہے کہ تین ہفتوں سے بھی کم عرصے میں تمام ریاستوں نے عملاً اس پر دستخط کر دیے اور ایک مستقل معاہدہ طے پا گیا۔ اس طرح ایک متحد سیاسی ڈھانچہ بن گیا جس میں برعظیم کا زیادہ تر حصہ شامل ہے اور جس کے باشندوں کی

تعداد تین سوملین ہے۔

صرف ایک ریاست ہے جس کی بڑی اہمیت ہے اور جس نے الحاق کے معاہدے پہ دستخط نہیں کیے اور وہ حیدر آباد ہے۔

حیدر آباد کی حجم آبادی اور وسایل کے اعتبار سے بے مثال پوزیشن ہے اور اس کے مسایل بھی خاص ہیں۔ نظام جس نے پاکستان سے الحاق کی تجویز پیش نہیں کی، ابھی تک ہندوستان سے الحاق کرنے پر بھی تیار نہیں ہوئے۔ بہ ہر حال ریاست کے اعلا مرتبت ہائی نس نے مجھے یقین دلایا ہے کہ وہ اہم شعبہ جات امورِ خارجہ، ڈیفنس اور مواصلات، میں اس ڈومینین سے تعاون کرنے کے لیے تیار ہیں، جس نے ریاست کی سرحدات کو گھیر رکھا ہے۔ حکومت کی رضا مندی سے نظام کے ساتھ گفت وشنید کا سلسلہ جاری ہے اور مجھے امید ہے کہ ہم ایسا حل تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جو سب فریقوں کے لیے اطمینان بخش ہو۔

آج سے میں آپ کا آئینی گورنر جنرل ہوں اور آپ سے ملتجی ہوں کہ آپ مجھے انھی جیسا محترم جانیں اور ہندوستان کی ترقی کے لیے وقف کر دیں۔ میں اسے اپنے لیے اعزاز تصور کرتا ہوں کہ آپ نے اپنے قایدین کی اس دعوت کی تائید کی ہے جو انھوں نے مجھے گورنر جنرل بنانے کے لیے کی۔ یہ دعوت قبول کرتے وقت میرے پیشِ نظر صرف یہ تھا کہ میں شاید آپ کے لیے ان مشکل حالات میں مددگار ثابت ہو سکوں جن کا فوری طور پر سامنا ہوگا۔ جب آزادیِ ہند کے بل پر گفتگو ہو رہی تھی تو آپ کے قایدین نے عبوری دور کے خاتمے کے لیے ۳۱ر مارچ ۱۹۴۸ء کی تاریخ کا انتخاب کیا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ مجھے اپریل میں فارغ کر دیا جائے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں اس کے بعد آپ کی خدمت کے لیے یہاں رہنا نہیں چاہتا، بلکہ میری خواہش ہے کہ ہندوستان ممکنہ حد تک جلد آزاد بن جائے، اور اس کا اپنا باشندہ گورنر جنرل بنے۔ میری اہلیہ اور خود میرے لیے یہ اعزاز اور فخر ہے کہ اس وقت تک ہم آپ کے ساتھ رہیں اور آپ کے ساتھ کام کریں۔ آپ نے ہمیشہ جس افہام و تفہیم اور تعاون کا مظاہرہ کیا، اسی طرح ہمدردی اور کشادہ دلی کے جذبات ظاہر کیے ان کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ہمارے پاس الفاظ نہیں ہیں۔

میں یہ اعلان کرتے ہوئے خوشی محسوس کرتا ہوں کہ ''میری'' حکومت (میں یہ الفاظ

استعمال کرنے کا آئینی طور پر حق دار ہوں اور اس پر فخر محسوس کرتا ہوں) نے فیصلہ کیا ہے کہ اس تاریخی موقع پر کشادہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے عفو عام کا اعلان کرے۔ اس سلسلے میں حتی المقدور وسیع القلبی سے کام لیا گیا ہے اور اخلاقیات ملکی سلامتی اور سیاسی تقاضوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس کا اعلان ان فوجی اسیروں پر بھی ہوگا جو اس وقت سزا کاٹ رہے ہیں اور جنھیں ملٹری کورٹس نے سزائیں ہوئی تھیں۔

آپ کو بڑی اہم ذمے داریوں سے عہدہ برا ہونا ہے۔ جنگ عظیم دوئم دو برس پہلے اختیام پذیر ہوئی۔ درحقیقت دو برس قبل آج ہی کے روز میں ہندوستان کے عظیم دوست مسٹر اٹلی کے ساتھ کیبنٹ روم میں بیٹھا تھا جب یہ خبر موصول ہوئی کہ جاپان نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ یہ خوشی اور شکریے کا لمحہ تھا اس کے ساتھ ہی چھ سالہ تلخیوں، تباہ کاریوں اور خون ریزی کا دور ختم ہوا۔ لیکن ہندوستان میں ہم نے اس سے بھی بڑی کامیابی حاصل کی جسے ''امن کا معاہدہ قرار دیا جا سکتا ہے جو بغیر جنگ کے طے پایا۔'' لیکن جنگ کے انتقام کی فضا ہنوز دنیا میں قایم ہے۔ جنگ میں ایسی شجاعت کا مظاہرہ دیکھنے میں آیا جس کی میں ذاتی طور پر توثیق کر سکتا ہوں اور جس کا نظارہ میں جنوب مشرقی ایشیا میں کر چکا ہوں۔ اس سلسلے میں انھیں اقتصادی طور پر زیر بار ہونا پڑا اور مردانہ جنگ میں اموات ہوئیں، مجھے ان کے ساتھ وابستگی میں فخر ہے۔ پہلے سے درپیش سیاسی مسایل سے نجات حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ اب عوام کی خوش حالی اور بہبود کی ضمانت فراہم کرنا آپ کی ذمے داری ہے، یہ ضمانت مستقبل میں عوام کو خوراک، لباس اور دیگر اشیاے ضروریہ کی کم یابی سے نجات دلانے اور متوازن معیشت کی تعمیر کے سلسلے میں مطلوب ہے۔ ان مسایل کا حل فوری طور پر پوری لگن سے منصوبہ بندی کر کے کیا جائے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ ملک کی افرادی قوت، وسایل اور قیادت کے باعث اس میں کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔

جو واقعات ہندوستان میں رونما ہوئے وہ قومی مفاد سے بہت بعید تھے: مستحکم اور خوش حال ریاست کی تشکیل عالمی امن کے سلسلے میں بین الاقوامی سطح پر اہم عامل ہے۔ اس کی سماجی اور اقتصادی ترقی اور اس کے ساتھ ہی اس کی اسٹریٹیجک پوزیشن اور مالی وسایل کا درست طور سے استعمال انقلاب بپا کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف برطانیہ عظمیٰ اور اس کی ڈومینینز بلکہ دنیا کی تمام عظیم اقوام کی نگاہیں آپ پر لگی ہوئی ہیں اور وہ اس ملک کی خوش بختی، خوش حالی

اور کامیابی کی توقع اور خواہش رکھتی ہیں۔
اس تاریخی موقع پر ہم مہاتما گاندھی کو فراموش نہیں کر سکتے جو آزادی کے معمار ہیں اور جن کی رہنمائی کے باعث یہ مقصد عدم تشدد کے ذریعے حاصل ہوا۔ ہم یہاں ان کی عدم موجودگی محسوس کرتے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ وہ ہمارے قلب و ذہن میں موجود ہیں۔
جناب صدر! آپ اور آپ کے رفقا جو سابقہ عبوری حکومت میں شامل تھے، کی لازوال حمایت اور تعاون کو ستایش کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔
آپ کے پہلے وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو عالمی شہرت کے باہمت اور بالغ نظر قاید ہیں۔ ان کا اعتماد اور دوستی میرے مشکل کام میں مددگار ثابت ہوئے۔ ان کی رہنمائی اور رفقا کا تعاون اور عوام کی حمایت سے ہندوستان مستحکم ہوگا اور عالمی برادری میں اپنا اصل مقام حاصل کرے گا۔ (انتقالِ اقتدار اور پاکستان: ص ۲۱-۸۱۶)

امرتسر ریلوے اسٹیشن — قیامت کا منظر:

۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء: ہندوستان کا یومِ آزادی پنجاب کے لیے قیامت کا دن تھا۔
امرت سر کے نئے افسر جب یومِ آزادی کا جشن منانے کے سرکاری حکم کی تعمیل کر رہے تھے تو اس جلسہ گاہ یعنی مغلوں کے قلعے سے صرف مشکل سے ایک میل کی دوری پر سکھوں کی خوں خوار ٹولی ایک مسلمان محلّے کو تباہ کرنے میں مصروف تھی۔ بغیر کوئی بحث چھیڑے یا کسی طرح کا رحم کیے انھوں نے ایک ایک مرد کو مار ڈالا، عورتوں کو ننگا کیا، ان کی عزت لوٹی، ویسی ہی حالت میں ان کا جلوس شہر بھر میں نکالا اور آخر میں سنہرے مندر میں لے جا کر ان میں بیشتر کی گردنیں کاٹ ڈالیں۔
لال اینٹوں سے بنا ہوا امرت سر کا ریلوے اسٹیشن شرنارتھی کیمپ کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ مغربی پنجاب سے آئے ہوئے ہزاروں ہندو، سکھ اسٹیشن پر ڈیرا ڈالے ہوئے تھے، جیسے ہی کوئی ٹرین آتی وہ ٹڈیوں کی طرح اس کی طرف لپکتے، سب کا کوئی دوست، رشتے دار، بچہ پیچھے چھوٹ گیا تھا۔ وہ ہر ٹرین میں ان کھوئے ہوؤں کو پکارتے ہوئے جھانکتے پھرتے، کھڑکیوں کی سلاخوں پر سر پٹکتے۔
۱۵ر اگست کی دوپہر کو اسٹیشن ماسٹر چانی سنگھ پریشان، خستہ حال شرنارتھیوں کی بھیڑ کو

چیرتا ہوا نمبر دس ڈاؤن ایکسپریس کے آنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔
جانی سنگھ نے لال جھنڈی دکھائی اور بھاری بھرکم انجن رک گیا۔
انجن کے رکنے کے ساتھ اس کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر آ گیا۔ جسے وہ ساری عمر نہ بھلا سکا۔
اس نے دیکھا کہ انجن ڈرائیور کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا ہے۔ اس کی حفاظت کے لیے چار مسلح فوجی تعینات ہیں۔
وہ سمجھ گیا کہ دال میں کالا ہے۔ کوئی خوف ناک واردات ہوئی ہے۔
پلیٹ فارم پر کھڑی شرنارتھیوں کی بھیڑ بھی حیران تھی۔ جانی سنگھ نے گاڑی کے آٹھوں ڈبوں کو دیکھا۔ ساری کھڑکیاں کھلی تھیں۔ لیکن اندر ایک آدمی نہیں دکھائی دے رہا تھا۔
کوئی دروازہ نہیں کھلا۔ کوئی آدمی باہر نہیں آیا۔
کیا اس گاڑی میں بھوت سفر کر رہے تھے؟
اسٹیشن ماسٹر نے آگے بڑھ کر پہلے ڈبے کا دروازہ کھولا اور پہلی نظر میں اسے اندازہ ہو گیا کہ اس ٹرین میں صرف لاشیں لد کر آئی ہیں۔ ڈبے کے فرش پر انسانی لاشوں کے ڈھیر گڈمڈ پڑے تھے۔ کٹے ہوئے گلے، پھٹی ہوئی کھوپڑیاں، باہر نکلی ہوئی آنتیں، کٹے ہوئے ہاتھ پیر ڈبے میں ہر طرف بکھرے پڑے تھے۔ ایسا سناٹا تھا کہ کسی کے کراہنے کی آواز بھی نہیں سنائی دیتی تھی۔
یہ سوچ کر کہ شاید کوئی زندہ بچ گیا ہو جانی سنگھ نے پکارا۔ ''یہ امرت سر ہے۔ تم لوگ ہندوؤں اور سکھوں کے درمیان ہو۔ پولیس موجود ہے۔ ڈرو نہیں۔''

(آدھی رات کی آزادی: ص ۷۸-۱۷۷)

کننگھم کی سرحد میں واپسی، کانگریس:

۱۵ / اگست ۱۹۴۷ء: کننگھم نے ۱۵ / اگست ۱۹۴۷ء کو صبح آٹھ بجے پاکستانی آئین کے تحت گورنر کے عہدہ کا حلف اٹھایا جس کے بعد ۹ بجے پرچم لہرانے کی تقریب ہوئی جس میں کانگریسی وزیر شریک نہیں ہوئے جیسا کہ امید تھی۔ ڈاکٹر خان صاحب کو کننگھم نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ وزیروں کے خلاف مظاہرے ہو سکتے ہیں، جو فسادات میں بھی تبدیلی ہو سکتے

ہیں۔ اسی شام انھوں نے ڈاکٹر خان صاحب کو ملاقات کے لیے بلایا اور وزارت کے استعفیٰ کے امکانات پر غور کیا۔ ڈاکٹر خان صاحب نے کہا کہ کئی ماہ سے استعفیٰ کا خیال ان کے ذہن میں ہے اور اگر وزارت برطرف کی گئی تو وہ کوشش کریں گے کہ کوئی گڑبڑ نہ ہو۔

دن کا اختتام یوں ہوا ''ڈنر کے بعد ہم ہندوستانی فضائیہ کی ایک خوش گوار مختصر پارٹی میں شریک ہوئے اور میں نے اچانک ہی فیصلہ کیا کہ رابن، میں اور لوئس چراغاں دیکھنے کے لیے کار پر شہر کا چکر لگائیں گے۔ جب ہم قصہ خوانی پہنچے تو ہم نے کار کی تمام بتیاں جلادیں۔ چند لمحوں میں ایک ہجوم نے جو برابر بڑھتا جارہا تھا ہمیں گھیر لیا اور ''پاکستان زندہ باد'' ''جناح زندہ باد'' ''گورنر کننگھم زندہ باد'' کے نعرے لگانے شروع کردیے۔ ہر شخص بہت خوش تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ یہ سینٹ اینڈریوز میں ریکٹر کا عہدہ اٹھانے کی تقریب تھی ہم نے آہستہ آہستہ شہر کا چکر لگایا لڑکے کار پر جھکے پڑرہے تھے اور ہمارے کانوں میں پاکستان کے حق میں نعرے لگا رہے تھے۔ ہمارے ساتھ ساتھ ایک ہزار آدمی چل رہے تھے۔ یہ ۱۹۳۰ء میں عبدالغفار خان کے جلوس جیسا تھا۔ سوائے اس کے کہ انقلاب کی جگہ پاکستان نے لے لی تھی، ایک موقعے پر ہم ''خدا، بادشاہ کو سلامت رکھے'' کی بینڈ پر دھن سن کر حیران رہ گئے۔

لوئس نے اس واقع کو اس طرح بیان کیا ہے:

''اس شام پاک فضائیہ کی شراب کی پارٹی تھی، جارج وہاں کچھ دیر رہے اور لطف اندوز ہوتے رہے، پھر انھوں نے کہا ''آؤ! شہر کی سیر کریں۔'' میں بہت زیادہ خوف زدہ ہوگیا، کیوں کہ میں یہ بالکل پسند نہیں کرتا تھا کہ وی آئی پی ایسے ہجوم کے قریب آئیں جو خطرناک ہوسکتا تھا۔ البتہ مجھے معلوم ہوتا تھا کہ اجتماع کرنے کا کوئی فایدہ نہیں ہوگا۔ میں نے ایس ایس پی رحیم سے کچھ ضمانت حاصل کی۔ جارج اور رابن ایک بڑی کار میں بیٹھ گئے، میں اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا اور ہم روانہ ہوگئے۔ کابل دروازہ کے اندر پہنچتے ہی ڈرائیور نے کار کی اندرونی بتیاں جلادیں تاکہ ہر شخص انھیں دیکھ سکے، وہ جگہ لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی، جلد ہی انھوں نے خوشی کا اظہار شروع کردیا۔ مقامی بینڈ بھی وہاں پہنچ گیا۔ جس میں صرف ایک ڈھولک اور چند بانسریاں

تھیں۔ انھوں نے جارج کو پہچان لیا اور فوراً ہی خدا، بادشاہ کو سلامت رکھے، کی دھن بجانا شروع کر دیا۔ کار کافی دیر تک روکی گئی۔ مگر ان کے ساتھ ساتھ اس کو قصہ خوانی بازار کے آخر تک پہنچنے میں کافی وقت لگا۔ جہاں وہ شاہی باغ کی طرف دروازہ سے باہر نکلے۔"

کننگھم اس سے لطف اندوز ہوئے۔ دوسروں نے پچھلے بیس برس پر نظر ڈالتے ہوئے اس کو زندگی بھر کی جدو جہد کا صلہ سمجھا۔

کانگریسی حکومت کی برطرفی:

ایک ہفتے تک تو صرف وقت گزاری کا سوال تھا، عوام کو توقع تھی کہ کسی بھی دن مسلم لیگ کی وزارت قایم ہو جائے گی۔ حال آں کہ مسلم لیگ کی صفوں میں ایسے آثار تھے کہ بعض لوگ کانگریس کے ساتھ مل کر مخلوط حکومت بنانے کا سوچ رہے تھے۔ البتہ ڈاکٹر خان صاحب اس کے خلاف تھے اور اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ مسٹر جناح اس کی منظوری دیتے۔ دریں اثنا کننگھم دونوں پارٹیوں کے رہنماؤں پر امن کی ضرورت پر زور دیتے رہے۔

انھوں نے ۱۵ر اگست کو مسٹر جناح کو ایک تار بھیجا جس میں ان سے کانگریسی وزارت کی برطرفی کے متعلق احکامات مانگے لیکن ساتھ ہی ۱۹ر اگست تک مہلت طلب کی تاکہ رمضان کا مہینہ گزر جائے۔ انھوں نے ۲۰ر اگست کو پھر تار بھیجا اور مسٹر جناح نے ۲۱ر اگست کو ٹیلی فون پر انھیں بتایا کہ انھوں نے وزارت کی برطرفی کو قانونی شکل دینے کے لیے ضروری احکامات جاری کر دیے ہیں۔ ۲۲ر اگست کی صبح کو ایک تار سے معلوم ہوا کہ مسٹر جناح نے اس مقصد کے لیے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں ترمیم کر دی ہے۔ ڈاکٹر خان صاحب ۲۲ر اگست کو دوپہر کے وقت گورنر سے ملنے آئے اور صورتِ حال ان پر واضح کر دی گئی۔ کننگھم کو امید تھی کہ وزارت بھی مستعفی ہونے کی خواہش مند ہوگی اور برطرفی سے بچنا چاہے گی۔ لیکن ڈاکٹر خان صاحب اپنے رفقا سے مشورے کے لیے چلے گئے۔ ایک بجے واپس آئے اور بتایا کہ وزارت نے مستعفی ہونے سے انکار کر دیا ہے اس لیے کننگھم کو وزارت برطرف کرنا پڑی۔ دو بجے سہ پہر انھوں نے مسلم لیگ کے رہنما عبدالقیوم کو بلایا اور

انھیں وزارت بنانے کے لیے کہا، مسٹر جناح نے ہدایت کی تھی کہ ابتدا میں وزارت عبدالقیوم اور محمد عباس پر مشتمل ہونی چاہیے۔ عبدالقیوم نے زور دیا کہ تیسرا رکن بھی ہونا چاہیے اور انھوں نے حبیب اللہ کا نام اپنے اولین انتخاب کی حیثیت سے پیش کیا، جس سے کننگھم نے اتفاق کرلیا اور فوری طور پر مسٹر جناح کو لکھا جس میں اسی بات پر زور دیا گیا۔ نئی وزارت نے ۲۳ راگست کی صبح حلف اٹھالیا۔

سرحد کے فسادات:

بعض حلقوں کی طرف سے فسادات کا اندیشہ ظاہر کیا گیا تھا جس کی نوبت نہیں آئی۔ ۲٦ راگست تک وہ اور لیڈی کننگھم نے نتھیا گلی تک سفر کیا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اکادکا لڑائیاں ہوئیں، البتہ ضلع ہزارہ میں ہری پور میں سخت فساد ہوا۔ اس کا فوری سبب وزارت کی تبدیلی بالکل نہیں تھا بلکہ پنجاب میں مسلمانوں کے قتل عام سے جو اشتعال پیدا ہوا تھا یہ اس کا نتیجہ تھا۔ اگلے ہفتے اس قسم کے فسادات بڑھ گئے جس کے متعلق کننگھم نے خود لکھا ہے:

> ''دس دن تک پہلے یہ ظاہر ہوگیا تھا کہ جب تک پنجاب میں قتل عام فوری طور پر بند نہیں ہوتا ہمارے لیے اپنے عوام کو روکنا ممکن نہیں ہوگا۔ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے قتل عام کی اتنی زیادہ اور انتہائی اشتعال انگیز باتیں مشہور ہوگئی تھیں کہ اگر ان کا ۲۵ فیصد بھی درست ہو تب بھی مسلمانوں کے لیے جوابی قتل عام کا کافی جواز تھا۔ اصل مشکل یہ ہے کہ مسلمانوں کو یقین ہے کہ ہندوؤں کو قتل کرنے والے ہجوم پر پولیس اور مسلمان فوجی گولی نہیں چلائیں گے۔ حال آں کہ ہماری پولیس حتیٰ کہ ایڈیشنل پولیس نے بھی بعض جگہوں پر اچھی کارکردگی دکھائی تھی۔ صوبے میں اچھے قسم کے مسلمانوں کا رویہ یہ ہے کہ وہ اس قتل عام کی واقعی مذمت کرتے ہیں لیکن کسی مسلمان کو اس سے روکنے کے لیے اس کو گولی مارنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔''

ستمبر کے شروع میں انھوں نے پورے صوبۂ سرحد کی صورتِ حال کے علاوہ قبایل اور سرحدی ریاستوں کی صورتِ حال کے متعلق ایک طویل سری حکومتِ پاکستان کو بھیجی اور ان سے کہا:

''برطانوی حکام کے ماضی کے معاہدہ کے بجائے نئے معاہدوں کے متعلق فیصلہ کیا جائے۔''

۷ر ستمبر کو وہ صبح سویرے نتھیا گلی سے روانہ ہوئے اور ہری پور میں جلے ہوئے بازار دیکھنے کے بعد ایک بجے دوپہر سے کچھ پہلے پشاور پہنچے۔ جب ہم قلعے کے قریب پہنچے تو وہاں جس انداز سے لوگ کھڑے تھے اور کچھ دیکھ رہے تھے اس سے اندیشہ ہوا کہ کوئی غیر معمولی بات ہوگئی ہے، ہم نے دیکھا کہ تمام دروازے بند ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ہنگامہ انیسویں لانسر کے ایک سکھ سنتری کے ۳/۸ پنجاب رجمنٹ کے مسلمان سپاہی کو گولی مارنے سے (غالباً افغانی) سے شروع ہوا تھا۔ یہ خبر پورے علاقے میں پھیل گئی اور ہندوؤں اور سکھوں پر حملے شروع ہوگئے۔

ہم لنچ کے لیے کلب چلے گئے اور واپسی پر ہم صدر بازار سے موٹر پر گزرے۔ ہم نے دیکھا کہ قلی کی قسم کے چند لوگ ایک دکان سے کپڑے کے تھانوں کے بنڈل لے کر جارہے ہیں، اس وقت چند منٹ کے فاصلے سے فرنٹیر کانسٹیبلری کا ایک دستہ گزر رہا تھا اور اس کا کوئی نوٹس نہیں لے رہا تھا۔ میں کانسٹیبلری کے صوبے دار میجر سے جو قریب تھا اور قایم مقام ایس ایس پی سے سختی سے پیش آیا اور ہم نے چند لیڈروں کو بھی پکڑا، لیکن اس وقت تک جو نقصان ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ بعد میں شام تک قتل و غارت گری بڑھ گئی، مجھے اندیشہ ہے کہ مجموعی طور پر ۱۰۰ ہندو اور سکھ مارے گئے جن میں ہمارے بہت سے کلرک اور ان کے خاندان کے افراد بھی شامل تھے۔ (ہند میں انگریز ریاست: ص ۲۵-۱۲۲)

اگست ۱۹۴۷ء: مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے آزاد ہندوستان کی تاریخ کے اولین دن (۱۵/ اگست ۱۹۴۷ء) کے حوالے سے بعض تاریخی اور وقت کے بعض سیاسی اور سماجی مسایل پر توجہ دلائی ہے اور بعض فکر انگیز خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

وطن کی آزادی اور حالات قبل و مابعد پر ایک نظر:

جس تاریخ کو برہان کا یہ پرچہ اپنی مقررہ تاریخِ اشاعت کے مطابق شایع ہونا چاہیے، وہی تاریخ ہندوستان کی آزادی کی تاریخ ہے۔ یہی وہ تاریخ ہوگی جب کہ ہندوستان انڈیا اور پاکستان کے دو علاقوں میں بٹ کر ڈھائی سو سال کے بعد اپنے

معاملات میں خواہ وہ اندرونی ہوں یا خارجی مختارِ مطلق ہوگا۔ اس خوشی میں دونوں جگہوں پر قومی جھنڈا لہرایا جائے گا اور مختلف طریقوں سے اظہارِ مسرت کر کے جشنِ آزادی کا حق ادا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ یہ سب کچھ ہوگا اور ہو رہا ہوگا۔ لیکن ایک حقیقت پسند انسان کو پھر بھی یہ سوال کرنے کا حق ہے کہ کیا یہی وہ آزادی ہے جو ہم لوگوں کو محبوب و مطلوب تھی؟ کیا یہی وہ حریت و استقلال کی ناظورۂ خوش جمال ہے جس کو حاصل کرنے کے لیے ہندوستان کی رگ و پے میں اضطراب و بے چینی کی بجلیاں دوڑ رہی تھیں؟ پھر کیا یہی وہ ہماری متاعِ گم گشتہ ہے جس کو واپس لینے کی حسرت و آرزو میں ایک طرف سراج الدولہ اور ٹیپو نے جام شہادت نوش کیا اور دوسری جانب حضرت سید احمد صاحب شہید اور ان کے رفقائے کرام کی جماعتِ حقہ نے خرقہ پوشی کے ساتھ شمشیر زنی کا ایسا کمال دکھایا کہ سرزمین بالاکوٹ کا ذرہ ذرہ آج بھی زبانِ حال سے اس کی گواہی دے رہا ہے؟ اگر دراصل یہ وہی آزادی ہے جس کا خواب حضرت شیخ الہند، (ڈاکٹر) انصاری، (حکیم) اجمل خاں، (مولانا) محمد علی، (پنڈت) موتی لال نہرو، سی آر داس وغیرہم نے دیکھا تھا تو پھر یہ کیا ہے کہ ملک اس آزادی کا استقبال فوجوں کے پہروں، سپاہیوں کی سنگینوں اور فوجی قوانین کی ہلاکت انگیزیوں کے ساتھ کر رہا ہے۔ عالم میں غلغلہ بپا ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان پر سے اپنا قبضہ اٹھا لیا۔ لیکن خود ہمارا حال یہ ہے کہ نہ زندگی مامون ہے، نہ مال اور آبرو محفوظ ہے۔ کہیں ہندو مسلمان سے سہا اور ڈرا ہوا ہے اور کسی جگہ مسلمان ہندوؤں کے ڈر سے لرزہ براندام ہیں۔ پھر ہندو ہندو میں پھوٹ ہے۔ مہا سبھا کانگریس کو ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ مسلمان مسلمان سے نبرد آزما ہے، پنجابی سندھی سے اور سندھی پنجابی سے اور سرحد کا پٹھان ان دونوں سے کھٹکا ہوا ہے اور سیاست کے میدان میں آگے چل کر ایک دوسرے سے داؤ پیچ کرنے کی فکر میں لگا ہوا ہے۔ ان اختلافات اور تعصبات کے علاوہ سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ عوام روز بہ روز تباہ ہوتے جا رہے ہیں۔ ارباب سیاست کو بڑے اور اونچے درجے کے معاملات نمٹانے سے ہی فرصت نہیں کہ وہ عوام کی پریشانی اور مصیبت کا جائزہ لے سکیں۔ ملک میں اناج کا کال ہے۔ ہر چیز گران سے گراں تر ہوتی جا رہی ہے۔ چور بازار علی الاعلان اور کھلم کھلا چل رہا ہے، ہر محکمہ میں رشوت ستانی کا بازار گرم ہے، اخلاق اس درجے گر گئے ہیں کہ انسان انسان نہیں رہا، بھیڑیا اور خوں خوار درندہ بن گیا ہے۔ خدا

پرستی کا صرف نام ہی نام ہے۔ امانت اور دیانت صرف کاغذوں میں نظر آسکتے ہیں، عمل میں ان کا کہیں وجود نہیں۔

پھر اس وقت جب کہ جشنِ آزادی کے شادیانے بج رہے ہیں ہمیں بے ساختہ بنگال و بہار سرحد و پنجاب، احمد آباد و بمبئی اور دوسرے مقامات کے ان لاکھوں انسانوں کی بھی یاد آرہی ہے جو فرقہ وارانہ سیاست کا شکار ہو کر مر گئے اور یا گھر سے بے گھر ہو کر آج بھی خانہ بربادی و بے سروسامانی کی زندگی بسر کر رہے ہیں!

ہاں اس میں شبہ نہیں کہ اب قید و بند کی زنجیریں ٹوٹ رہی ہیں اور آزادی کا دور آرہا ہے لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ آزادی فی نفسہٖ کوئی قابلِ قدر چیز نہیں ہے، اگر اس کو صحیح اور درست طریقہ پر استعمال نہ کیا جاسکے۔ تاریخ میں کیسے کیسے بہادر اور تبرد آزما بادشاہ گزرے ہیں جنھوں نے ملک کے ملک فتح کیے لیکن ان پر حکومت نہ کر سکے۔ ملک فتح کرنے کے لیے بہادری، مردانگی اور عزم و ارادے کی مضبوطی ہی درکار ہیں۔ لیکن حکومت چلانے کے لیے کمالِ عقل و فرزانگی، دوراندیشی مصلحت شناسی اور عوام و خواص کے جذبات کا ادراک و شعور، فکر و عمل کا توازن، پھر ان سب سے اہم اور مقدم یہ کہ ظاہر و باطن کی پاکیزگی اور صفائی، عدل و انصاف اور دیانت و راست بازی یہ سب اوصاف ضروری ہیں۔ پس آج جشنِ آزادی مناتے ہوئے انڈیا اور پاکستان دونوں حکومتوں کے اربابِ حل و عقد کو بارگاہ خداوندی میں عہد و پیمان کرنا چاہیے کہ اب وہ کسی طرح ماضی کے دل خراش واقعات کا اعادہ نہ ہونے دیں گے دونوں حکومتوں کا مفاد ایک دوسرے سے وابستہ ہے، اس لیے دونوں ایک دوسرے کی حلیف اور مددگار بن کر رہیں گی۔ کیوں کہ اسا سًا اسی پر دونوں کی خوش حالی اور حقیقی امن و عافیت کا دار و مدار ہے۔ اب تک ہم نے حقایق بینی سے کہیں زیادہ جذبات پرستی سے کام لیا ہے اور اس کا یہ نتیجہ ہے کہ آج آزادی بھیانک اور ڈراونی شکل میں نظر آرہی ہے۔ لیکن اب ہم کو لامحالہ حق شناسی سے کام لینا ہوگا۔ ورنہ اگر اب بھی ہم اس سے محروم رہے تو انجام شدید ترین تباہی و بربادی اور کامل ہلاکت و رسوائی کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے؟

جب تک نہ زندگی کے حقایق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ

خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات
فطرت لہو ترنگ ہے غافل نہ جل ترنگ

بہ ہر حال ہماری دعا ہے کہ انڈیا اور پاکستان دونوں آزادی سے بجا اور صحیح طور پر فایدہ اٹھا کر زیادہ سے زیادہ ترقی کریں اور نہ صرف ایشیا کے لیے، بلکہ تہذیب و تمدن، نظامِ معیشت و معاشرت، فضایل اخلاق، امن و خوش حالی اور علمی و ثقافتی عروج و ترقی کے اعتبار سے تمام دنیا کے لیے شمع راہ کا کام دیں۔ (برہان- دہلی (نظرات): اگست ۱۹۴۷ء۔ص ۲ تا ۴)

تقسیم پنجاب کی تاریخی لیگی تجویز اور اس پر عمل درآمد:

تقسیم پنجاب کی پہلی تجویز جس کے اصول پر ۱۹۴۷ء میں عمل ہوا، ۱۹۴۱ء میں نواب سر شاہ نواز ممدوٹ نے پیش کی تھی جس کا ذکر ۸ر فروری ۱۹۴۱ء کے اندراج میں آچکا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں جو کچھ ہوا اس وقت پنجاب کی تقسیم کے مقدمے میں مسلم لیگ کے موکل وہی تھے۔ اور فیصلہ باؤنڈری کمیشن انھیں کے پیش کردہ میمورنڈم کے مطابق ہوا۔ مرزا غلام نبی جاں باز نے کاروانِ احرار جلد آٹھ میں اس مقدمے میں ان کی کارگزاری، ان کے پیش کردہ میمورنڈم اس کے عواقب و نتایج پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ سامنے آیا وہ کسی غیر کی سازش کا نتیجہ نہیں بلکہ مسلم لیگ کے رہنماؤں ہی کا کیا دھرا تھا۔ مرزا جاں باز لکھتے ہیں:

مسلم لیگ کا میمورنڈم:

مسلم لیگ کی جانب سے جو میمورنڈم اس کمیشن کے سامنے پیش کیا گیا اس میں اس بات پر زور دیا گیا کہ "باہم متصل علاقے" کا صحیح یونٹ "ضلع" نہیں بلکہ "تحصیل" ہے۔ اور اس اصول کی بنا پر عارضی تقسیم کے نقشے میں مندرجہ ذیل ردّ و بدل کا مطالبہ کیا گیا۔

(۱) ضلع گورداس پور کی تحصیل پٹھان کوٹ مشرقی پنجاب کو دے دی جائے۔

(۲) ضلع امرت سر کی تحصیل اجنالہ مسلم اکثریت کی تحصیل ہے اور مسلم اکثریت کے علاقے سے متصل ہے، لہٰذا اسے مغربی پنجاب میں شامل کیا جائے۔

(۳) ضلع فیروز پور کی تحصیل فیروز پور مسلم اکثریت کی تحصیل ہے اور مسلم اکثریت

کے علاقے سے متصل ہے، لہٰذا اسے مغربی پنجاب کا حصہ تصور کیا جائے۔ اس سے آگے تحصیل فیروز پور سے متصل تحصیل زیرہ ہے۔ پھر اس سے متصل ضلع جالندھر کی تحصیل نکودر ہے اور اس سے متصل تحصیل جالندھر ہے اور یہ سب مسلم اکثریت کی تحصیلیں ہیں۔ لہٰذا انھیں مغربی پنجاب میں بہ الفاظ دیگر پاکستان میں شامل کیا جائے۔

اس کے بعد ''دوسرے امور'' کی بنا پر کچھ مزید علاقے کا مطالبہ کیا گیا تھا لیکن وہ ''ضلع'' اور ''تحصیل'' کی اصولی بحث سے علاحدہ سوال تھا۔

صرف الفاظ کی منطق کے اعتبار سے یہ طرز استدلال بے شک خوش نما اور مفید معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ بہت ہی سطحی بات تھی اور ''واقعات کی منطق'' کی جانب سے بالکل آنکھیں بند کر لینے کے مترادف تھی۔

یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ کیا اس بات کا کوئی عملی امکان ہو سکتا تھا کہ کوئی سرحدی کمیشن پاکستان کو ایک کاری ڈور (Corridoor) یا راستہ دے کر مشرقی پنجاب کے قلب میں تحصیل جالندھر کے علاقے پر پاکستان کا تسلط قایم کر دے۔ اور مشرقی پنجاب کی ریل کی مین لائن اور گرانڈ ٹرنک روڈ کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بیچ کا ٹکڑا پاکستان کے قبضے میں دے دے۔ یہی حال تحصیل نکودر کا تھا۔ ایک بہ ظاہر خلاف عقل اور ناممکن العمل مطالبہ پیش کر کے یہ کہنا یا سمجھنا کہ ہم ایک تحصیل پٹھان کوٹ کو ہاتھ سے چھوڑ رہے ہیں تو پانچ زاید تحصیلوں کا مطالبہ کر رہے تھے، خود اپنے آپ کو اور دوسروں کو دھوکا دینے کے مترادف تھا۔

دوسری طرف تحصیل پٹھان کوٹ کے معنی صرف تحصیل پٹھان کوٹ نہ تھے۔ اگر مسلم لیگ خود تحصیل پٹھان کوٹ کو اصولی طور پر مشرقی پنجاب کا حصہ تسلیم کرے تو یہ سوال یقیناً اور فوراً پیدا ہوتا تھا کہ پٹھان کوٹ اور امرت سر کے درمیان ریل اور سڑک اور تار وغیرہ کا موجودہ مواصلاتی نظام مغربی پنجاب کے حوالے کر دیا جائے یا اسے موجودہ حالت میں قایم رکھا جائے؟ یہ سوال ایسا تھا جس پر ''دوسرے امور'' کا جایز اطلاق ہوتا تھا اور اسے نظر انداز نہ کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا از خود ضلع گورداس پور کی تقسیم کا مطالبہ کرنا تحصیل گورداس پور اور تحصیل بٹالہ کے لیے سخت خطرہ پیدا کرنے کے مترادف تھا۔ اس کے علاوہ تحصیل پٹھان کوٹ کی یہ اہمیت محتاج بیان نہ تھی کہ بھارت کو ریاست جموں و کشمیر تک پہنچنے کا واحد راستہ اسی تحصیل کے ذریعے مل سکتا تھا۔ اپر باری نہری نظام کا سب سے بڑا ہیڈ ورک (مادھو پور)

بھی اسی تحصیل میں تھا۔

کوئی معمولی سمجھ بوجھ کا انسان کسی متنازعہ مقدمے میں یہ پالیسی اختیار نہیں کرتا کہ فریق ثانی سے جوابی مراعات کی امید موہوم پر اپنے کسی جائز مطالبے سے خود ہی دست بردار ہو جائے۔ تحصیل جالندھر اور نکودر کا مطالبہ محض ہوائی چیز تھی۔ اگر عملی امکانات اور ''واقعات کی منطق'' کو پیشِ نظر رکھ کر ان دونوں باتوں کا موازنہ کیا جاتا کہ مسلم لیگ کا مقدمہ تیار کرنے والے کن چیزوں کو حاصل کرنے کے لیے کن چیزوں کو ہاتھ سے دے رہے تھے؟

صاف بات یہ تھی کہ وہ ضلع گورداس پور کی ایک تحصیل نہیں بلکہ تین تحصیلوں کا تبادلہ ضلع فیروز پور کی دو تحصیلوں (فیروز پور اور زیرہ) کے ساتھ کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور اس کوشش میں انھوں نے اتنا اضطراب ظاہر کیا (اور اصل وجہ شکایت یہی تھی) کہ تحصیل پٹھان کوٹ کو بالوضاحت اور تحصیل گورداس پور اور بٹالہ کو ضمناً اپنے ہاتھ سے دے دیا۔ اور اس کے مقابلے میں جن علاقوں کو پاکستان میں لانے کی امید باندھی گئی تھی۔ وہ بہ دستور بحث و نزاع کا موضوع بنے رہے۔

ثالث کی جانب سے بے ایمانی ایک علاحدہ سوال ہے، اس کا واقعی کوئی علاج نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن اپنے مطالبات مرتب کرتے وقت خود مسلم لیگ کا ''میمورنڈم'' تیار کرنے والوں نے جس طرح عملاً تین تحصیلوں کو دے کر دو تحصیلیں حاصل کرنے کی تدبیر کی، اس کا مسلمانوں کے مفاد سے کیا تعلق ہو سکتا تھا؟ اسی بات سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ''ضلع'' کے بجائے ''تحصیل'' کے یونٹ پر زور دینے کا مقصد صرف ممدوٹ اسٹیٹ کو پاکستان میں لانا تھا، قطع نظر اس بات سے کہ اس سے کشمیر پر کیا اثر پڑتا تھا اور کن دوسرے نتائج کے امکانات پیدا ہوتے تھے۔

آج اس سوال کا کوئی واضح جواب نہیں ملتا کہ مسلم لیگ کا میمورنڈم تیار کرنے کی ذمے داری کس نے کس کو سپرد کی تھی۔ اتنی بات معلوم ہے کہ مسلم لیگ کی جانب سے مؤکل کی حیثیت میں اس مقدمے کی پیروی صوبائی لیگ کے صدر نواب ممدوٹ کر رہے تھے اور وکیل کی حیثیت سے چودھری ظفر اللہ خان تھے۔ لیکن چودھری صاحب نے کمیشن کے ایک مسلمان ممبر کے استفسار پر یہ صاف کہہ دیا تھا کہ مطالبات مرتب کرنا ان کا کام نہ تھا۔ مسلم

لیگ کیا چیز ہاتھ سے چھوڑ نا چاہتی تھی اور کیا حاصل کرنا چاہتی تھی؟ یہ طے کرنا چودھری صاحب کے قول کے مطابق مسلم لیگ کا اپنا کام تھا۔ وہ خود وکیل کی حیثیت سے ان مطالبات کی وکالت کے فرائض سرانجام دے رہے تھے، جو ان کے موکل نے تیار کر کے اُن کے حوالے کیے تھے۔

(روزنامہ "مشرق" لاہور: ۱۷رستمبر۱۹۶۴ء) (مارشل لا سے مارشل لا تک: ص ۳۵۹)

مسلم لیگ کے میمورنڈم کا اقتباس:

ریڈ کلف کمیشن کے نام مسلم لیگ کے میمورنڈم کا متعلقہ پیراگراف جس میں کہا گیا ہے کہ پٹھان کوٹ کی تحصیل مشرقی پنجاب کے حصے میں جائے گی۔

"10. If these principles are accepted, it will be found that, subject to considerations arising out of other factors, the Pathankot Tahsil of th Gurdaspur District, would be detached from the West Punjab and included in East Punjab. In every other Tahsil of the Gurdaspur District, and in every Tahsil of the remaining sixteen districts at present included in West Punjab, the Muslims have an overall Majority. The Ajnala Tahsil of the Amritsar District, which has a majority of Muslims in its population and is contiguous to the Lahore, Sialkot and Gurdaspur District, will be included in the West Punjab."

جسٹس دین محمد کی رپورٹ کا وہ حصہ جس میں انھوں نے اس بات پر اصرار کیا ہے کہ ضلع گورداس پور کو مکمل طور پر مغربی پنجاب میں شامل رہنا چاہیے۔

"Figurcs reveals that the Districts of Lahore, Gujranwala, Sialkot, Sheikhupura, Lyallpur, Montgomery and Multan can in no circumstances either in whole or in part be taken out of the category of Muslim Majority areas, and that the District of Gurdaspur too must remain in West Punjao, even if the non-Muslims have a majority in the Pathankot Tahsil."

ترجمہ:

"اگر یہ اصول مان لیے جاتے ہیں تو اور دوسری کئی وجوہات کے پیش نظر یہ بات سامنے آئے گی کہ ضلع گورداس پور کی پٹھان کوٹ تحصیل کو مغربی پنجاب سے علاحدہ کر کے مشرقی پنجاب میں شامل کر دیا جائے گا۔ ضلع گورداس پور کی ہر دوسری تحصیل میں بہ شمول اُن سولہ تحصیلوں کے جو مغربی پنجاب میں شامل کی گئی ہیں، مسلمانوں کی واضح اکثریت ہے۔ ضلع امرت سر کی تحصیل اجنالہ جہاں مسلمانوں کی آبادی کی اکثریت ہے اور جولا ہور، سیال کوٹ اور گورداس پور کے اضلاع سے بالکل قریب تر ہے، کو بھی مغربی پنجاب میں شامل کیا جائے گا۔"

حد بندی کمیشن کا فیصلہ:

مسلم لیگ کے وکیل سر ظفر اللہ نے قائد اعظم کے حکم پر ریڈ کلف کمیشن کے رُو بہ رُو پاکستان کی کیا وکالت کی؟ اس ضمن میں اُس نے شیخ بشیر احمد کو مرزائیوں کی وکالت کے لیے مقدمہ میں کیوں داخل کیا؟ مرزائیوں نے مسلم لیگ (جو کہ اُن دِنوں مسلمانانِ گورداس پور کی نمایندگی کر رہی تھی) کی موجودگی میں مرزائی لیڈر بشیر الدین محمود، دوران مقدمہ عدالت میں کیوں موجود رہا؟ اور مرزائیوں نے باؤنڈری کمیشن کی کارروائی کے دوران امریکا سے کیا

اور کیوں لٹریچر منگوایا؟ جیسے کہ احمدی اکیڈیمی ربوہ کی جانب سے شایع کردہ ایک کتابچہ (تحریکِ پاکستان میں جماعت احمدیہ کی قربانیاں) کے صفحہ نمبر ۳۴ پر درج ہے کہ

"باؤنڈری کمیشن نے لاہور میں اپنی کارروائی کا ۲۶ر جولائی کو آغاز کردیا۔ مسلم لیگ کا کیس محترم چودھری ظفراللہ صاحب نے پیش کیا۔ خود امام جماعت احمدیہ بھی تمام کارروائی دیکھنے اور سننے کے لیے عدالت میں موجود رہے اور مناسب ہدایات دیتے رہے۔ علاوہ ازیں امریکا سے باؤنڈری لٹریچر ہوائی جہاز کے ذریعے منگوایا اور لندن سے اسکول آف اکنامکس کے ایک ماہر اور ممتاز جغرافیہ دان پروفیسر اسپیٹ کو لندن سے بلوا کر اُن کی خدمات حاصل کی گئیں۔

اِن کے تمام اخراجات جماعت احمدیہ نے برداشت کیے۔ بین الاقوامی باؤنڈری فیصلوں کی نقلیں اور دیگر لٹریچر چودھری مشتاق احمد باجوہ (مرزائی) امام مسجد لندن کی مساعی سے حاصل کیا گیا۔ غرض کہ باؤنڈری کمیشن میں مسلم لیگ کے کیس کو مضبوط کرنے کے لیے جو مواد مل سکتا تھا جماعت احمدیہ نے مہیا کیا۔"

ایک اور انکشاف:

تقسیم ضلع گورداس پور کے متعلق دو ہفتہ قبل مال آفیسر فتح سنگھ نے اپنے پٹواری دولت رام کو اطلاع دے دی تھی کہ تین تحصیلیں ضلع گورداس پور سے الگ کردی گئی ہیں۔ کیوں کہ مرزائیوں نے جن کی تعداد قادیان میں چودہ ہزار ہے۔ انھوں نے اپنے آپ کو مسلمانوں سے علاحدگی کا مطالبہ کیا ہے۔ (روزنامہ "ویر بھارت" لاہور)

مسلم لیگ نے اپنے میمورنڈم میں پٹھان کوٹ تحصیل کو کیوں بھارت کے حوالے کیا؟ جب کہ کشمیر جانے کے لیے صرف یہی ایک راستہ تھا۔

نواب سر شاہ نواز پیشتر سے اپنی ایک تجویز کے ذریعے پاکستانی پنجاب سے انبالہ ڈویژن الگ کرنے کا خود مطالبہ کر چکے ہیں۔

ان شواہد کی موجودگی میں مسٹر ریڈکلف نے ۱۷ر اگست ۱۹۴۷ء کو تقسیم پاکستان اور

بنگال کا فیصلہ سنایا۔لیکن اس کا اعلان ۱۹راگست کے اخبارات میں شایع ہوا۔

باؤنڈری کمیشن فیصلہ:

دہلی۔۱۹راگست: باؤنڈری کمیشن کی رپورٹ شایع ہوگئی ہے۔اس کے آوارڈ کی رو سے پنجاب کے مغربی یعنی پاکستانی علاقے میں ملتان اور راول پنڈی کے تمام ڈویژن شامل رہیں گے اور لاہور ڈویژن کے اضلاع گوجراں والہ، شیخو پورہ اور سیال کوٹ شامل ہوں گے۔مشرقی پنجاب میں جالندھر اورانبالہ ڈویژن پورے کے پورے شامل ہوں گے اور لاہور ڈویژن کا ضلع امرت سر شامل ہوگا۔لاہور ڈویژن کے اضلاع گورداس پور کو دو نئے صوبوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔گورداس پور کے ضلع میں شکرگڑھ تحصیل جو دریائے راوی کے مغرب کی طرف واقع ہے، مغربی پنجاب کا حصہ ہوگی۔ جب کہ پٹھان کوٹ، گورداس پور اور بٹالہ تحصیلیں جو دریاے راوی کے مشرق کی طرف ہیں، مشرقی پنجاب کا حصہ ہوں گی۔ ضلع لاہور تحصیل چونیاں اور تحصیل ساری کی ساری دونوں مغربی پنجاب میں شامل ہیں۔ قصور تحصیل دونوں نئے صوبوں میں تقسیم ہوگئی ہے۔اور حد فاصل اس گاؤں سے ہیں جہاں بالائی باڑی دوآب پر تحصیل میں ملی ہے اور یہ لائن کھیم کرن ریلوے اسٹیشن تک گئی ہے اور یہاں سے یہ حد دریائے ستلج کے کنارے موضع مستیکے تک گئی ہے۔

بنگال باونڈری کمیشن کے اوارڈ کی رو سے چٹ گاؤں اور ڈھاکہ ڈویژن کا تمام علاقہ مشرقی بنگال میں شامل کردیا گیا ہے۔اور تمام بردوان ڈویژن مغربی بنگال میں ہے۔ راج شاہی ڈویژن کے رنگ پور، بوگرہ، راج شاہی اور پبنہ ضلع اور پریسیڈنسی ڈویژن کا ضلع کھنا مشرقی بنگال مین شامل کردیا گیا ہے اور پریسیڈنسی ڈویژن کے ضلع کلکتہ چوبیس پرگنہ اور مرشد آباد ڈویژن کو مغربی بنگال میں شامل کردیا گیا ہے۔ندیاج پور، دبتاج پور، جلپائی گوڑی اور مالدہ کے ضلع دونوں نئے صوبوں میں تقسیم کردیے گئے ہیں۔ ضلع ندیا کے حسب ذیل تھانے مشرقی بنگال میں شامل کردیے گئے ہیں۔

کھوکسا، کمار کھالی، کشتیا امیر پور، الن دنگا، بھیرانا راگنگالی، دمور ہودہ، چوادنگا، جیون نگر، مہرپور اور دولت پور کا وہ حصہ جو دریائے نابھ بنگال کے مشرق میں ہے۔تمام ضلع جیسور خاوہ یوں گاؤں اور گائے گھاٹے کے تھانوں کے مشرقی بنگال میں دیا گیا ہے۔دیناج

جیور علاوہ یوں گاؤں اور گائے گھاٹے کے تھانوں کے مشرقی بنگال میں دیا گیا ہے۔ دیناج پور کے نیچے لکھے ہوئے تھانے مغربی بنگال میں شامل ہوں گے۔ راج گنج، اتا بارنسی، ہری کوس منڈی، تاپن گنگا رام، پورکمار، نند تھیاباد اور کالیا گنج اور بلوا گھاٹ کا وہ حصہ جو مین لائن (شمال جنوب) کے مغرب میں ہے۔ بقیہ ضلع مشرقی بنگال میں شامل ہے۔ تمام جلپائی گوڑی ضلع علاوہ تو تیا پاجا گھر لوداد یبی گنج پت گرام اور کوچ بہار ریاست کے امکانی گوشوں کے علاوہ مغربی بنگال میں شامل ہے۔ ضلع مالدہ گماشتہ پور بچول نواب گنج شب گنج اور پولاہاٹ، کے تھانے مشرقی بنگال میں شامل ہیں۔ باقی ضلع بنگال میں رہے گا۔

(کاروانِ احرار: جلد ۸، ص ۱۳-۴۰۷)
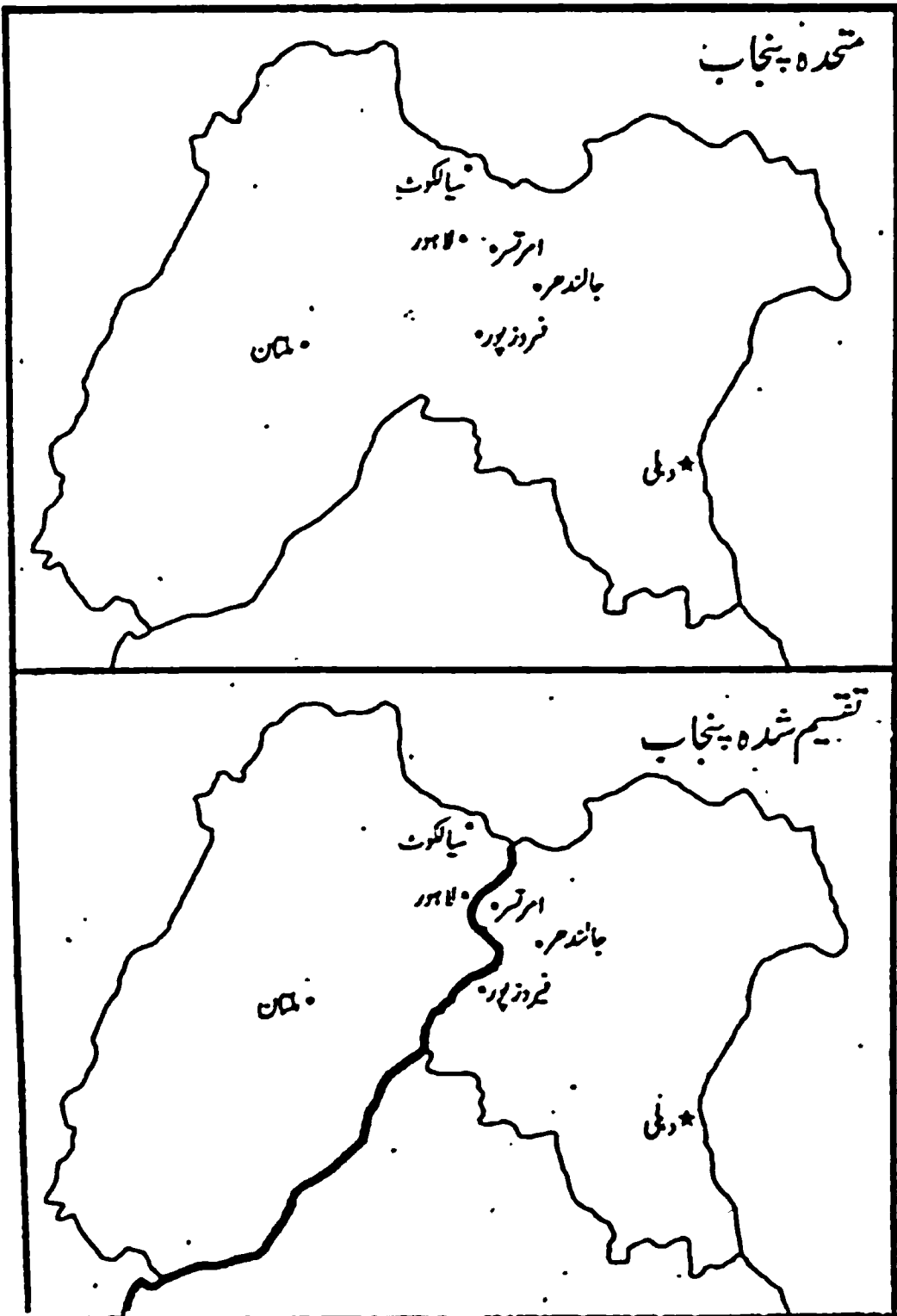
ریڈکلف ایوارڈ — حد بندی کمیشن کا تاریخی فیصلہ:

۱۶/اگست ۱۹۴۷ء: ڈسپیچ باکس سے کاغذات نکالنے کا وقت آ گیا تھا۔ دونوں فیلا لفافے ماؤنٹ بیٹن کے ہاتھ میں تھے۔ ہر لفافے میں برصغیر کے نئے نقشوں کا ایک ایک سیٹ تھا۔ اس کے ساتھ تقریباً دس ٹائپ شدہ صفحات پر مشتمل ایک مسودہ تھا۔ یہ انگلستان کی طرف سے ہندوستان کو دیا جانے والا آخری دستاویز تھا۔

ماؤنٹ بیٹن نے نہرو اور پاکستان کے وزیراعظم لیاقت علی خان دونوں کو ایک ایک لفافہ دیتے ہوئے کہا کہ آپ دونوں الگ الگ کمروں میں بیٹھ کر ان نقشوں کا مطالعہ کیجیے اور تقریباً دو گھنٹے بعد مشترکہ جلسے کے لیے واپس آجایے۔

دونوں لیڈر جب واپس آئے تو ان کے چہرے پر غصے اور بےزاری کے آثار تھے۔ یہ حال دیکھ کر ماؤنٹ بیٹن کو یقین ہو گیا کہ سر ریڈکلف نے اپنا تکلیف دہ کام مکمل غیر جانب داری کے ساتھ انجام دیا ہے۔ اسی لیے دونوں لیڈر یک ساں برہم ہیں۔

بٹوارے کی لکیر کھینچتے وقت مسٹر ریڈکلف کو جن باتوں کو ذہن میں رکھنے کی ہدایت کی گئی تھی، ان سب باتوں کا اس نے بڑی ایمان داری سے لحاظ رکھا تھا۔ اِکے دُکے جھگڑوں کو چھوڑ کر اس نے سب سے زیادہ اہمیت اس بات کو دی تھی کہ آبادی کی اکثریت کا مذہب کیا ہے؟

چناں چہ بنگال اور پنجاب کے بٹوارے کی جو لکیر اس نے کھینچی وہ تقریباً ویسی ہی تھی جیسی متوقع تھی۔ تکنیکی لحاظ سے صحیح لیکن عملی نقطۂ نظر سے تباہ کن۔

بنگال کی سرحدیں اقتصادی نقطۂ نظر سے دونوں فریقوں کے لیے بددعا بن گئیں۔ جس علاقے میں ۸۵ فیصد پٹسن پیدا ہوتا تھا وہ پاکستان کو ملا۔ لیکن وہاں ایک کارخانہ ایسا نہیں تھا، جہاں پٹسن کی کھپت ہو سکے۔ کلکتہ جہاں سے پٹسن سے بنی ۸۵ فیصد چیزیں ساری دنیا کو برآمد ہوتی تھی، ہندوستان کے حصے میں آیا، جہاں سو سے زیادہ پٹسن کی ملیں تھیں، لیکن پٹسن بالکل نہیں تھا۔

پنجاب کے بٹوارے کی لکیر کھینچتے وقت ریڈکلف کو سب سے زیادہ تکلیف اٹھانی پڑی۔ یہ سرحد، کشمیر کے قریب ایک جنگل سے شروع ہوتی تھی اور جہاں جہاں ممکن تھا سرحد نے راوی اور ستلج کا پیچھا کیا۔ لاہور پاکستان کو ملا اور امرت سر اپنے سنہرے مندر کے ساتھ

ہندوستان کے حصے میں آیا۔

جیسا کہ شروع سے ظاہر تھا کہ بٹوارے کی لکیر نے سکھوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔

جہاں جہاں ریڈکلف نے کسی وجہ سے آبادی کی اکثریت کے مذہب کا لحاظ نہیں رکھا تھا، وہاں بٹوارے کی لکیر نے جھگڑے کھڑے کیے۔ پنجاب کے شمال میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، گورداس پور۔ وہاں ریڈکلف نے راوی ندی کے حد کو بٹوارے کی سرحد مانا، جس کی وجہ سے گورداس پور اور اس سے ملحق کئی مسلمانوں کے گاؤں ہندوستان میں آگئے۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو پاکستان کا ایک چھوٹا سا حصہ خنجر کی شکل میں ہندوستان کے اندر آجاتا، یہ بات ریڈکلف نے مناسب نہیں سمجھی۔

لیکن ریڈکلف کا یہ وہ فیصلہ تھا جس کے لیے پاکستان کے لاکھوں لوگوں نے ریڈکلف کو کبھی معاف نہیں کیا۔ اگر ریڈکلف نے گورداس پور پاکستان کو دے دیا ہوتا تو جناح کو ایک چھوٹا سا گندا شہر ہی نہ مل جاتا بلکہ اس کے ساتھ ہی وہ سوغات مل جاتی جسے جنت نظیر کہا جاتا ہے۔ گورداس پور ہندوستان کو ملا۔ اگر وہ نہ ملتا تو کشمیر سے آمدورفت کا کوئی راستہ ہندوستان کے پاس نہ ہوتا۔ ایسی صورت میں کشمیر کے ہندو راجہ ہری سنگھ کے پاس پاکستان سے انضمام کے علاوہ کوئی چارہ نہ ہوتا۔ ریڈکلف کے دل میں جانب داری یا شرارت کا جذبہ نہ ہوتے ہوئے بھی اس نے بٹوارے کی لکیر جس طرح کھینچی اس کی وجہ سے کشمیر کی کنجی گورداس پور ہندوستان کے ہاتھ میں آگئی۔ اس بنیاد پر کشمیر پر دعویٰ جتانے کی خواہش ہندوستان کے دل میں جاگ سکتی تھی۔

ریڈکلف زبردست حفاظتی انتظامات کے ساتھ انگلستان واپس جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ کام کرنے والے آئی سی ایس افسروں نے اس کی آخری خدمت یہ کی کہ ریڈکلف کے ہوائی جہاز کی مکمل تلاشی لی گئی تاکہ یہ اطمینان ہو جائے کہ اس میں کوئی بم تو نہیں چھپا ہے۔

ریڈکلف کو بہ خوبی یہ معلوم تھا کہ اس نے جو سرحدیں قایم کی ہیں ان کی وجہ سے مصیبتیں آئیں گی اور خون خرابے کی نوبت آئے گی۔ وہ بے حد اداس تھا۔ لیکن وہ اپنے آپ کو الزام نہیں دے سکتا تھا۔ بٹوارے کی لکیر جہاں سے بھی گزرتی انجام وہی ہوتا تھا۔

ریڈکلف کے تقرر کے وقت نہرو اور جناح دونوں نے یقین دلایا تھا کہ اس کے فیصلے

نہ صرف وہ آخری مانیں گے بلکہ اسے بہ خوبی عملی جامہ پہنانے کی کوشش کریں گے۔ لیکن فیصلہ ہو جانے کے بعد اس کے جو حصے ان لیڈروں کو پسند نہیں آئے انھوں نے کڑی نکتہ چینی شروع کر دی۔

لندن لوٹ کر ریڈکلف نے وکالت شروع کر دی۔ لیکن بہ طور احتجاج اس نے دو ہزار پاؤنڈ کی وہ رقم قبول کرنے سے انکار کر دیا جو سرحدیں قایم کرنے کے لیے اس کا محنتانہ مقرر ہوا تھا۔

ریڈکلف نے جو سرحدیں قایم کی تھیں، وہ شایع ہو چکی تھیں اور ان کے ساتھ ہی انسانی تاریخ کی سب سے بڑی ہجرت کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا، بے سہارا لوگوں کی ٹولیاں پگڈنڈیوں سے، نہروں کے کنارے، کھیتوں کی منڈیروں سے، سڑکوں اور ریلوے لائنوں سے چل پڑیں۔

جن مسلمانوں نے پاکستان کے قیام پر خوشی کے مارے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا انھیں معلوم ہوا کہ ان کے گاؤں ہندوستان میں رہ گئے ہیں — جن سکھوں نے ہندوستان کی آزادی کا جشن منایا تھا، انھیں اچانک یہ پتا چلا کہ جن کھیتوں کو وہ پیڑھیوں سے جوتتے چلے آئے ہیں، وہ اب پاکستان کا حصہ بن چکے ہیں اور اب انھیں جلد از جلد اپنا گھر بار چھوڑ کر ہندوستان جانا ہے۔ کیوں کہ پاکستان میں اب ان کے لیے خطرہ تھا۔

بٹوارے کی حدیں قایم کرنے کی عجلت کے بارے میں ریڈکلف نے جن خطرات کی طرف اشارہ کیا تھا، ان کا بھیانک روپ سامنے آ رہا تھا۔ کئی نہریں ایسی تھیں کہ جو ایک ملک سے نکلتی تھیں، لیکن ان کی دیکھ بھال کا دفتر دوسرے ملک میں تھا — کئی مقامات ایسے تھے جہاں بٹوارے کی لکیر گاؤں کے بیچ سے ہو کر گزرتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گاؤں کی کچھ جھونپڑیاں ایک ملک میں رہ گئیں اور کچھ دوسرے ملک میں چلی گئیں۔ ایک دو بار ایسا بھی ہوا کہ بٹوارے کی لکیر نے کسی مکان کو بیچ سے کاٹ دیا، صدر دروازہ ایک ملک میں اور پچھواڑے دوسرے ملک میں۔ پنجاب کے سارے جیل خانے پاکستان میں آ گئے اور وہاں کا واحد پاگل خانہ بھی۔

پاگل خانے میں جو ہندو اور سکھ مریض تھے انھوں نے اپنے ڈاکٹروں سے گڑگڑا کر کہا کہ ہمیں ہندوستان روانہ کر دیجیے۔ ورنہ مسلمان کسی وقت بھی ہمیں قتل کرنے کے لیے

آسکتے ہیں۔

ان ڈاکٹروں نے جو ان کی حفاظت کے ذمے دار تھے یہ جواب دیا:

''کیا دیوانوں کی سی بات کرتے ہو، کیا پاگلوں کو قتل کرنے کے لیے بھی کوئی آسکتا ہے، آپ لوگ بلاوجہ خطرے کا تصور کر رہے ہیں۔''

بعد کے واقعات سے یہ ثابت ہوا کہ ہوش مند ڈاکٹروں کی بہ نسبت پاگل مریض کے پاس کہیں زیادہ دوراندیشی تھی۔ (آدھی رات کی آزادی: ص ۸۸-۱۸۵)

ملک میں امن وامان کی صورتِ حال:

یکم ستمبر ۱۹۴۷ء: کلکتہ میں پچھلے ۱۵ دِنوں میں مثالی امن رہا، کسی مسلمان کو نہیں ستایا گیا۔ زندگی کے معمولات بہ حال ہو گئے لیکن ۳۱ راگست کی رات سے حالات نے پھر کروٹ لی اور فسادات شروع ہو گئے۔ گاندھی جی پر اس واقعے کا بہت اثر ہوا، وہ ابھی کلکتہ میں حیدری ہاؤس میں مقیم تھے، آج صبح سے انھوں نے کھانا چھوڑ دیا اور اعلان کر دیا کہ ''میں نے اپنا مرن برت شروع کر دیا ہے۔ میں اس وقت تک کچھ نہ کھاؤں گا جب تک کلکتہ کے رہنے والوں کی عقل واپس نہیں آئے گی، جب تک یہاں تشدد کے واقعات ہوں گے میں بھوکا رہوں گا، خواہ مجھے اپنی جان ہی کیوں نہ دینی پڑے۔''

گاندھی جی کے برت کے اعلان سے کلکتہ میں تہلکہ مچ گیا ہے۔ عوام، خواص، طلبا کا ایک ہی تقاضا تھا کہ گاندھی جی اپنا برت توڑ دیں۔ گاندھی جی اس بات پر اڑے ہوئے تھے کہ ''جب تک پچھلے پندرہ دِنوں جیسا امن قایم نہیں ہوگا میں اپنا برت جاری رکھوں گا۔'' (آدھی رات کی آزادی۔ ترجمہ فریڈم ایٹ مڈنائٹ: از لیری کولنس و دامنک لیپیر/ مترجم سعید سہروردی: ص ۵-۲۰۴)

۳ رستمبر ۱۹۴۷ء: آج دوپہر کو شہر کے ستائیس غنڈے حیدری ہاؤس آپہنچے، ان کی نظریں جھکی ہوئی تھیں، انھوں نے اقرار جرم کیا اور معافی مانگتے ہوئے کہا ''گاندھی جی اپنا برت توڑ دیں۔'' شام تک وہ غنڈے بھی آپہنچے جنھوں نے حیدری ہاؤس کے قریب دستی بموں سے حملہ کر کے دو مسلمانوں کو قتل کر دیا تھا۔ ان کے سرغنہ نے ہاتھ جوڑ کر گاندھی جی سے کہا ''ہم نے غلطی کی ہے اب آپ ہمیں جو سزا دیں گے ہمیں منظور ہوگی۔'' انھوں نے اپنی دھوتیوں میں بندھے ہوئے چھرے، چاقو، پستول اور دوسرے ہتھیار کھول کر فرش پر

ڈال دیے۔ گاندھی جی اور ان کے ساتھی اس ڈرامائی منظر کو دیکھتے رہ گئے۔ گاندھی جی نے انتہائی کم زور لہجے میں کہا "میرے خیال میں تم لوگوں کو صرف ایک سزا ملنی چاہیے وہ یہ کہ جس علاقے کے مسلمانوں کو تم نے شکار بنایا ہے واپس اسی علاقے میں جاؤ اور ان مسلمانوں کی حفاظت کرو۔"

اس شام کو پورے ایک ٹرک بھر کر وہ تمام ہتھیار حیدری ہاؤس کے گیٹ پر جمع کر دیے گئے تھے جنھیں کلکتہ کے غنڈوں نے خود اپنی مرضی سے چھوڑ دیا تھا۔ چاقو، پستول، خودکار ہتھیار اور دستی بم بھی اِن ڈھیر میں شامل تھے۔ ہندو، سکھ اور مسلمان لیڈروں نے ایک مشترکہ بیان جاری کر کے عہد کیا کہ مستقبل میں کوئی تشدد کی واردات شہر میں نہیں ہونے دی جائے گی اور اگر ہوئی تو ہم مرن برت رکھیں گے۔ (آدھی رات کی آزادی: ص ۷-۲۰۶)

۴ر ستمبر ۱۹۴۷ء: آج شام کو سوا نو بجے گاندھی جی نے اپنا ۷۳ گھنٹوں کا برت توڑنے کے لیے سنگترے کے رس قبول کر لیا۔ کلکتہ نے اپنا عہد پورا کر دکھایا۔ پنجاب میں سرحد پر، کراچی، لکھنؤ اور دہلی جیسے شہروں میں صورتِ حال بگڑتی جا رہی تھی لیکن کلکتہ میں انسانیت اور محبت کی شمع جلتی رہی۔ (آدھی رات کی آزادی: ص ۲۰۷)

صوبہ سرحد کی صورتِ حال:

۴/۵ر ستمبر ۱۹۴۷ء: اگرچہ ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت کو بلاجواز توڑا گیا تھا (۲۲ر اگست ۱۹۴۷ء) اور اس ضمن میں کسی قدر کو ملحوظ نہیں رکھا گیا تھا لیکن خدائی خدمت گاروں نے حالات کی نزاکت کے پیشِ نظر گہری سیاسی فراست اور بالغ نظری کا مظاہرہ کیا۔ ۴ اور ۵ر ستمبر ۱۹۴۷ء کو پارٹی کے ہیڈکوارٹر سرور یاب میں صوبائی جرگہ، پارلیمانی پارٹی، زلمے پختون، خدائی خدمت گار اور قبایلی علاقوں کے نمایندوں کا ایک اجتماع ہوا۔ جس میں بعد از غور و خوض مندرجہ ذیل ریزولیوشن منظور ہوا:

(الف) خدائی خدمت گار پاکستان کو اپنا وطن تصور کرتے ہیں۔ وہ عہد کرتے ہیں کہ اس کے استحکام اور حفاظت کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کریں گے اور اس مقصد کے لیے ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے تیار ہیں۔

(ب) ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت کو برخواست کرنا اور اس کی جگہ عبدالقیوم کو

بٹھانا غیر جمہوری اقدام ہے۔ چوں کہ ہمارا ملک بڑے نازک حالات سے گزر رہا ہے اس لیے خدائی خدمت گار کوئی ایسا اقدام نہیں کریں گے جس سے مرکزی یا صوبائی حکومت کے لیے مشکلات پیدا ہوں۔

(ج) ملک کی تقسیم کے بعد خدائی خدمت گار آل انڈیا کانگریس سے اپنا ناطہ منقطع کرتے ہیں، اس لیے وہ ترنگے جھنڈا کا استعمال ترک کر کے آئندہ سے پارٹی کا نشان صرف سرخ جھنڈے کا استعمال کیا کریں گے۔

اس موقع پر خان عبدالغفار خاں نے تقریر کرتے ہوئے ایک مرتبہ پھر پختونستان کے مطالبے کی وضاحت کی۔ انھوں نے کہا:

''پختونستان سے ان کی مراد پٹھانوں کے لیے مکمل آزادی اور پاکستان کی فیڈریشن کے اندر اپنے اندرونی معاملات خود نپٹانے کا اختیار ہے۔ وہ وحدت شمال مغربی سرحدی صوبے کے چھ اسیٹلڈ اضلاع پر مشتمل ہوگی اور اس کے ساتھ ان متصل پٹھان علاقوں کا الحاق ان کی آزادانہ رائے سے ہو سکے گا۔ پاکستان اس وحدت کے امور خارجہ، ڈیفنس اور مواصلات کا ذمہ دار ہوگا۔''

انھوں نے مزید کہا کہ

''میں نے عمر بھر پختونستان کے قیام کے لیے جدوجہد کی ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے میں نے ۱۹۲۹ء میں پٹھانوں کو متحد بنانے کی خاطر خدائی خدمت گار تنظیم قایم کی۔ میں آج بھی ان مقاصد کے حصول کے لیے برسر پیکار ہوں۔ میری منزل واضح اور راستہ سیدھا ہے۔ میں اس راہ پر چلتا رہوں گا خواہ تہہ بارہ ہو جاؤں۔''

لیکن باچا خاں کے اعلانات اور بیانات کا مخالفین پر کوئی اثر نہ ہوا۔ باچا خان اور خدائی خدمت گاروں کی کردارکشی کا سلسلہ جاری رہا۔ قیام پاکستان کے وقت باچا خان بہار کے فرقہ وارانہ فسادات میں متاثرہ مسلمانوں کی بحالی کے کام میں مصروف تھے، اس لیے آئین ساز اسمبلی کے پہلے اجلاس میں شریک نہ ہو سکے تھے۔ وہ بہار سے واپس آ کر اپنے گاؤں میں مقیم تھے کہ آئین ساز اسمبلی کا اجلاس آ گیا۔ باچا خاں کا کہنا ہے کہ اس اثنا میں سردار بہادر خان ان کے پاس آئے اور کہا کہ پٹھانوں کے ساتھ بڑی ناانصافی ہو رہی ہے،

لہٰذا ان کے حقوق کی حفاظت کے لیے کراچی چل کر مرکزی حکومت سے بات چیت کرنا چاہیے۔ پٹھانوں کے حقوق کی بات سن کر باچا خان تڑپ اٹھے اور فروری میں کراچی روانہ ہو گئے۔ کراچی پہنچ کر سردار بہادر خان نے ایسا چکر چلایا کہ وزیر بن گئے اور پٹھانوں کے حقوق کو فراموش کر دیا، البتہ باچا خان معمول کے مطابق اس عظیم مقصد کے حصول کے لیے مصروف کار رہے۔ (پختون قوم اور باچا خان (گولڈ اینڈ گن): از خان عبدالقیوم خان کا اردو ترجمہ از فاروق قریشی۔ لاہور: ۱۹۹۵ء)

دہلی میں گاندھی جی کی آمد اور امن و امان کی صورتِ حال:

۹ ر ستمبر ۱۹۴۷ء: برت کی کمزوری سے گاندھی جی پوری طرح سنبھل بھی نہ پائے تھے کہ ۹ ر ستمبر کو وہ دہلی آ پہنچے۔ اس مرتبہ وہ ہریجنوں کی بستی میں نہیں ٹھیر سکے، ان کے لیے برلا ہاؤس میں ٹھیرنے کا انتظام کیا گیا۔ دہلی میں آگ لگی ہوئی تھی، ہر روز وارداتیں ہو رہی تھیں اور ان میں برابر اضافہ ہو رہا تھا۔

ہمایوں کے مقبرے اور پرانے قلعے میں ڈیڑھ لاکھ مسلمانوں کو رکھا گیا تھا۔ ان میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جو پاکستان جانا چاہتے تھے۔ وہ اس درجے خوف زدہ تھے کہ اپنے مردوں کو دفنانے کے لیے بھی ان عمارتوں سے باہر قدم نکالنے پر آمادہ نہ تھے۔ لاشوں کو وہ اونچی دیواروں کے اوپر سے باہر کی طرف گرا دیتے۔ گدھ اور کتے اپنا کام شروع کر دیتے۔ پرانے قلعے میں صرف پچیس ہزار آدمیوں کے لیے پانی کا انتظام تھا، جب وہاں ایک لاکھ سے زیادہ لوگ آ گئے تو سارا انتظام چوپٹ ہو گیا۔ ایک شخص نے اس کیمپ کے بارے میں بتایا کہ جس نالی میں لوگ قے اور پیشاب کرتے تھے اسی نالی کے پانی سے عورتیں کھانا پکانے کے برتن دھوتی تھیں۔ (آدھی رات کی آزادی: ص ۲۲-۲۲۱)

گاندھی جی کا بیان:

۱۵ ر ستمبر ۱۹۴۷ء: گاندھی جی نے ایک بیان میں کہا:

"ہندوؤں اور سکھوں کے لیے سیدھا اور صحیح راستہ اب یہی ہے کہ جن مسلمانوں کو ترکِ وطن کرنا پڑا ہے، انھیں وہ واپس لائیں۔ اگر یہ کر ڈالنے کی

ہمت انھیں ہوگئی تو یہ ہر پہلو سے قابل داد ہوگا اور پناہ گزینوں کا اہم اور دشوار مسئلہ بڑی حد تک از خود حل ہو جائے گا۔ خود پاکستان والے بلکہ ساری دنیا ان کی قائل ہو جائے گی۔"

گاندھی جی نے مزید کہا:

"مجھے معاف کیا جائے! میں پہلا الزام تو ہندوؤں اور سکھوں پر رکھوں گا، ان میں اتنی جان نہ تھی کہ منافرت کے سیلاب کو روک دیتے۔"

(صدق۔لکھنؤ: ۲۶ر ستمبر ۱۹۴۷ء: ص ۷)

سر ظفر اللہ خان کا بیان:

۱۶ر ستمبر ۱۹۴۷ء: پاکستان کے وزیرِ خارجہ چودھری سر ظفر اللہ خان نے جو یو.این.او. میں پاکستان کے نمائندہ تھے، انھوں نے حکومت پاکستان کے ایما اور اس سے مشورہ کیے بغیر یہ بیان دیا ہے:

"ہندوستان نے اگر مسلمانوں کا قتل بند نہ کیا تو پاکستان یونائیٹڈ نیشن میں شکایت کرے گا اور اگر اس سے اطمینان نہ ہو سکا تو حکومت پاکستان کو راست اقدام کے لیے غور کرنا ہوگا۔"

یہ بیان ہندوستان کے مسلمانوں کے مفاد اور مصالح کے قطعاً خلاف تھا۔ ہندوستان میں مسلم لیگی رہنما چودھری خلیق الزماں نے جو ابھی تک ہندوستان ہی میں تھے، اس پر اپنے ردِ عمل کا اظہار کیا ہے۔

نوٹ: سر ظفر اللہ خان کے بیان اور اس پر چودھری خلیق الزماں کے ردِ عمل اور بیان کے لیے دیکھیے: شاہراہِ پاکستان: انجمن اسلامیہ پاکستان، کراچی۔۱۹۶۷ء، ص ۹۰-۱۰۸۵

بہاول پور کے فسادات:

۱۹ر ستمبر ۱۹۴۷ء: ۱۳ر ستمبر کو بہاول پور (پاکستان) میں فسادات ہوئے، جن میں ہندوؤں کے مال و اسباب کو مالِ غنیمت سمجھ کر لوٹ لیا گیا تھا۔ اس واقعے سے متاثر ہو کر تاج محمد دوانی ڈپٹی انسپکٹر مدارس رحیم یار خان نے جامعہ عباسیہ بہاول پور کے شیخ الجامعہ مولانا غلام محمد گھوٹوی سے شرعی فتویٰ پوچھا کہ آیا مسلمانوں کا یہ فعل اور ہندوؤں کا مال مالِ

غنیمت سمجھ کر اس کا لوٹنا جائز تھا؟ مولانا نے تحریر فرمایا:

''جو غیر مسلم پاکستان کے حدود کے اندر رہتے ہیں، ان کا مال اور عزت سب محفوظ ہیں۔ ان سے کسی قسم کا تعرض کرنا، ان کا مال لوٹنا، انہیں قتل کرنا، سب قطعی حرام ہیں۔ اس کو مال غنیمت قرار دینا حرام کو حلال کرنا ہے، جو کفر تک پہنچتا ہے۔ ہاں جو غیر مسلم آلات جنگ کا استعمال کر کے مقابلہ کرے، اس کا مال مالِ غنیمت ہے۔ مگر وہ مسلمان بادشاہ اور اس کی فوجی جماعت کے لیے ہے، دوسرے لوگوں کے لیے جائز نہیں۔ ایسے مال کی تقسیم بادشاہِ وقت ان میں شرعی قوانین کے مطابق کرے گا۔ اگر لاعلمی میں ایسا ہوا ہے تو فوراً ایسے مال کو واپس کر دینا چاہیے۔ (مولانا) غلام محمد گھوٹوی''

مولانا عبدالماجد دریابادی نے اس پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:

''شریعتِ اسلامی کی یہ ترجمانی ایک بدنام متعصب اور ہندو کش بھاول پور کے ایک مفتی کے قلم سے ہے۔ شہر میں فسادات ۱۳ر کو ہوئے اور ۱۹ر کو یہ فتویٰ نکل گیا اور حسبِ روایت ''الجمعیۃ'' ہزار ہا فرزندانِ توحید نے لوٹا ہوا مال واپس کر دیا۔'' (صدق۔لکھنؤ: ۲۵ر جون ۱۹۴۸ء، ص ۱)

ظفر اللہ خاں کے بیان پر ردِ عمل:

۳۰ر ستمبر ۱۹۴۷ء: مولانا قاضی زاہد الحسینی صاحب نے لکھا ہے کہ ادھر تو (ہندوستان کے) مسلمان لیڈر مسلمانوں کے تحفظ کے لیے امن اور صلح کی راہ تلاش کر رہے تھے ادھر ظفر اللہ نے بھارتی حکومت کو غصہ دلانے کے لیے راست اقدام کی دھمکی دے ڈالی۔ اسی کا اظہار چودھری صاحب نے ۲۰ر ستمبر کو لکھنؤ میں اپنے ایک بیان میں فوراً فرمادیا:

''میرا خیال ہے کہ سر ظفر اللہ نے ہندوستانی حالات کے متعلق ایسا بیان دینے سے پہلے اور وہ بھی بلا پاکستان گورنمنٹ کے احکام کے، جائزہ نہیں لیا۔''

ظفر اللہ نے چودھری صاحب کے اس بیان کو بہانہ بنا کر بنی بنائی بات کو توڑنے کے لیے قائد اعظم کے ایسے کان بھرے کہ قائد نے چودھری صاحب کو کراچی طلب کر لیا۔

ملک میں امن و امان کا مسئلہ اور مولانا آزاد کا بیان اور تجاویز:

۲۹ر ستمبر ۱۹۴۷ء: ۲۹ر ستمبر ۱۹۴۷ء کو مولانا ابوالکلام صاحب آزاد نے ایک مفصل بیان اخبارات میں شایع کرایا:

"حال کے افسوس ناک حالات نے لوگوں کو اس قدر تنگ نظر کر دیا ہے کہ غیر جانب دارانہ طریقہ پر کوئی رائے قایم کرنا بالکل ناممکن ہو گیا ہے۔ عام طور پر ہر مسلمان صرف ان مصیبتوں ہی کے متعلق خیال کرتا ہے جو مشرقی پنجاب اور دہلی میں مسلمانوں پر پڑیں اور ان مظالم کو بھول جاتا ہے جو اس کے ہم مذہبوں نے مغربی پنجاب اور صوبۂ سرحد کے سکھ اور ہندوؤں پر کیے ہیں۔ اسی طرح سے سکھ اور ہندو بھی صرف انھیں مظالم کا ذکر کرتے ہیں جو مغربی پنجاب اور صوبۂ سرحد میں ہوئے ہیں۔ لیکن مشرقی پنجاب اور دہلی کے مسلمانوں کی بابت وہ کوئی ہمدردی محسوس نہیں کرتے۔ احساس کی یہ کمی ملک کے موجودہ حالات میں لازمی ہے۔ صرف وہی لوگ موجودہ مشکلات کو حل کر سکتے ہیں اور کسی نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں جو غیر جانب داری اور بے تعصبی کے ساتھ واقعات پر غور کریں۔ ایسے وسیع النظر لوگ اگرچہ بہت کم ہیں، لیکن بالکل نایاب نہیں ہیں اور یہی لوگ عام جذبات کے سیلاب میں اپنے قدم قایم رکھ کر مستقبل کے متعلق سوچ سمجھ سکتے ہیں۔ واقعات کے تمام افسوس ناک پہلوؤں پر غور کرنے کے لیے سکون کے ساتھ غیر جذباتی طور پر سوچنے کی ضرورت ہے۔

پس منظر:

موجودہ افسوس ناک واقعات ۱۶ر اگست ۱۹۴۶ء کو کلکتہ کے قتل عام سے شروع ہوتے ہیں۔ اس کے بعد نواکھالی میں ہندوؤں پر مظالم ہوئے، جس کا انتقام بہار اور یوپی کے چند اضلاع میں لیا گیا اور نواکھالی کے مقابلے میں بہار میں زیادہ اتلاف جان ہوا۔ بہار کا جواب صوبۂ سرحد نے دیا اور اس مرتبہ بھی اس ظالمانہ مقابلے میں حصہ لینے والوں نے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کی۔

اس کے بعد راول پنڈی کے ضلع میں فساد ہوا۔ اور ہر واقعہ کے بعد یہ آگ بھڑکتی گئی۔ یہ واقعات اس وقت ہوئے۔ جب ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ ہم لوگ تقسیم ہند کے خلاف سات سال سے لڑ رہے تھے لیکن برطانیہ سے چھٹکارا حاصل کرنے

کے لیے بالآخر ہم نے تقسیم ہندوستان کو بھی منظور کرلیا اور اب یہ امید تھی کہ تقسیم ہندوستان کے بعد قتل وغارت کا زمانہ ختم ہو جائے گا۔ حالات میں کچھ بہ حالی ہو چکی تھی۔ لیکن ۳ر جون کے اعلان میں لاہور کے متعلق وضاحت نہیں کی گئی تھی اور حد بندی کمیشن کی رپورٹ سے پہلے یہ نہیں معلوم تھا کہ لاہور پاکستان میں جائے گا یا ہندوستان میں رہے گا اور لاہور کو حاصل کرنے کی کوشش میں تینوں فرقوں نے فسادات میں زبردست حصہ لیا۔ ہندوؤں نے بم پھینکے، مسلمانوں نے آتش زدگی شروع کردی اور مسلمان اور سکھوں نے ایک دوسرے کو قتل کرنا شروع کردیا۔ ان حادثات کے باوجود پنجاب کے دوسرے علاقے متاثر نہیں ہوئے۔

جب یہ طے ہوا تھا کہ ہندوستان دو سلطنتوں میں تقسیم کردیا جائے گا تو یہ بات بھی واضح ہو گئی تھی کہ فرقہ وارانہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور حالات میں نمایاں تبدیلی ہو جائے گی جو غیر مسلم پاکستانی علاقے میں رہ جائیں گے وہ پاکستان کی رعایا ہوں گے، اور وہاں کی حکومت کا یہ فرض ہوگا کہ ان کی پوری پوری حفاظت کرے اور انھیں شہری حقوق سے فایدہ اٹھانے کا پورا پورا موقع دے۔ اسی طرح جو مسلمان ہندوستانی یونین میں رہ جائیں گے وہ یہاں کی رعایا ہوں گے اور انھیں وہی شہری حقوق ملیں گے جو دوسرے باشندوں کو ان دونوں سلطنتوں میں سے کسی سلطنت میں اصول وقانون کی خلاف ورزی کی جائے گی یا اکثریت کی طرف سے اقلیت پر کوئی زیادتی ہوگی تو یہ اس ریاست کا فرض ہوگا کہ وہ غلط کاروں کے خلاف ضابطے کی کارروائی کرے۔

اگر کسی سلطنت کے باشندوں کو یہ شکایت ہوگی کہ دوسری سلطنت میں ان کے ہم مذہبوں کے ساتھ برا سلوک کیا جارہا ہے تو یہ مسئلہ بھی دونوں سلطنتیں ہی آپس میں طے کریں گی۔

اگر مغربی اور مشرقی پنجاب کی حکومتوں کو اپنے اپنے حدود میں نظم ونسق سنبھالنے کا موقع مل گیا ہوتا اور وہ اپنے اپنے صوبوں میں اقلیتوں کی حفاظت کرنے کی قابل ہوگئی ہوتیں تو شاید یہ ہولناک اور روح فرسا حالات پیش نہ آئے ہوتے۔

بہ ہر حال بدقسمتی سے تقسیم کا اصول طے ہوا تھا کہ یہ نئی تحریک شروع ہوئی کہ مشرقی پنجاب کے غیر مسلموں کے جتھے تیار کیے جائیں تاکہ وہ ان حادثات کا انتقام لیں جو تقسیم

سے پہلے صوبہ سرحد اور ضلع راول پنڈی میں رونما ہوئے تھے۔ چناں چہ ظلم و تشدد کی وجہ سے تمام مسلم آبادی سرے سے فنا ہو کر ہی نہ رہ جائے۔ یہ چیز مغربی پنجاب میں تازہ ہنگاموں کے رونما ہونے کا سبب بن گئی اور وہاں مسلمانوں نے خود بدلہ لینا شروع کر دیا۔ اور خون ریزی کا ایک ایسا سیلاب بہا دیا کہ یہ خطرہ محسوس ہونے لگا کہ کہیں یہ طوفان پاکستان کے تمام غیر مسلموں کو اپنی لپیٹ میں نہ لے لے۔ یہ معاملہ تو وہ تھا جسے دونوں ڈومینیوں کی حکومتوں کو طے کرنا تھا اور اس کے متعلق انھیں دونوں کی مشترکہ ذمہ داری تھی۔ لیکن اس کے بجائے ہوا یہ کہ دونوں طرف کے عوام جمع ہو ہو کر قتل و خون ریزی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرنے لگے۔ چناں چہ یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ کہیں پورے پنجاب کی اقلیتیں فنا ہو کر نہ رہ جائیں۔

صورت یہ پیدا ہو گئی کہ جس فرقے نے خود انتقام لیا۔ وہ کچھ دنوں بعد خود ہی انتقام کے جذبے کا شکار بن کر رہ گیا۔ چناں چہ انتقام لینے کے ظالمانہ اصول نے انسانوں کو حیوانوں اور درندوں سے بھی زیادہ بدتر حالت میں پہنچا دیا۔ تنفر اور قتل و غارت کی لہریں برابر بڑھتی چلی گئیں اور جلد ہی تمام شمالی مغربی ہندوستان سرحد سے لے کر یو پی کے مغربی اضلاع اور دہلی تک ان میں گھر کر رہ گیا۔

شہر دہلی میں جو واقعات پیش آئے انھیں سے ان حادثات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جو دوسرے مقامات پر رونما ہوئے۔

دونوں فریق قصوروار:

حالات کے اس جائزے سے اتنی بات واضح طور پر سمجھ میں آ جاتی ہے کہ اس وقت ہندو، مسلمان، سکھ سب ہی ایک رنگ میں رنگے دکھائی دے رہے ہیں، خواہ وہ تلوار کو بلند کر رہے ہوں یا اسے اپنی پیٹھ کے پیچھے چھپانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ ان تینوں فرقوں کے لوگوں کے ہاتھ یک ساں طور پر خون میں رنگے ہوئے ہیں اور ایسے حالات میں کسی ایک کو بھی یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنے آپ کو بے قصور اور دوسرے کو ملزم بتائے۔ حقیقت یہ ہے کہ تینوں مساوی طور پر قصوروار ہیں۔ اسی طرح مشرقی اور مغربی پنجاب کی حکومتوں میں سے کسی کو دوسرے پر یہ الزام دینے کا حق نہیں ہے کہ اس نے

غلطی کی یا غفلت سے کام لیا۔ اس لیے کہ یہ دونوں اپنی اپنی اقلیتوں کے جان و مال کی حفاظت سے قاصر رہی ہیں۔

ہم اپنی زندگی بھر آزادی کے خواب دیکھتے رہے تھے اور آزادی کی قربان گاہ پر ہم نے اپنی عزیز سے عزیز شے کو بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ خدا خدا کر کے آزادی حاصل ہوئی۔ آج اس آزادی کی عمر ایک مہینے سے کچھ ہی زیادہ ہوئی ہے۔ ہمارے وہ تمام منصوبے کہ آزادی مل جانے کے بعد ہم ملک کی اقتصادی، ذہنی اور تعلیمی اسکیموں کو پروان چڑھائیں گے خاک میں مل کر رہ گئے اور اس مختصر سے عرصے میں ہم اب تک کچھ بھی نہ کر سکے۔ ہم نے دنیا کے سامنے تو یہ اعلان کیا تھا کہ جیسے ہی آزادی حاصل ہوگی ہم اپنی تمام تر توجہ ایک نئے ہندوستان کی تعمیر میں صرف کر دیں گے۔ اس زمانے میں جو نئے حادثات رونما ہوئے انھوں نے ہمارے تمام خوابوں کی تعبیر الٹ کر رکھ دی اور ہندوستان اس منزل سے بھی پیچھے ہٹتا ہوا دکھائی دینے لگا۔ جس پر آزادی ملنے سے پہلے پہنچا ہوا نظر آ رہا تھا۔

امید کی کرن:

بہ ہر حال وہ لوگ جنھوں نے حصولِ آزادی کے لیے کوششیں کی تھیں اب بھی مایوس نہیں ہو سکتے۔ ہماری خوش قسمتی سے مایوسیوں کی ان گھنگھور گھٹاؤں میں بھی مہاتما گاندھی کی شخصیت ہمارے لیے مینارہ روشنی کا کام دے رہی ہے۔ وہ نہایت صبر آزما زمانے میں انتہائی مصایب و آلام کے اندر قوم کی رہنمائی کر چکے ہیں۔ آج بھی جب کہ ان کی قیادت میں ملک کو آزادی حاصل ہو چکی ہے وہ ان لوگوں میں انسانیت کے اوصاف پیدا کرنے کی جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں جو وقتی حیثیت سے عقل و ہوش اور دماغی توازن کھو بیٹھے ہیں۔ ان کی آواز میں اب بھی غیر متزلزل اعتماد، عزم و ارادہ اور ہمت و جرأت کے صفات پائے جاتے ہیں اور وہ ہمیں ایک ایسے راستے پر لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں، جہاں پہنچ کر ملک تباہی اور بربادی کی مصیبتوں سے نجات پا سکتا ہے۔ وہ ہمیں آج رواداری، اخوت اور انسانی ہمدردی کے سبق دے رہے ہیں۔ انھوں نے ایسے حالات پیدا کر دینے کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دی ہے، جن میں دونوں ڈومینیوں کے باشندے امن، سکون، محبت اور پیار کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں۔"

مولانا آزاد کی تجاویز:

اس کے بعد مولانا نے حالات کی اصلاح کے لیے چند تجویزیں پیش کیں جن کا حاصل یہ تھا:

(۱) فسادزدہ علاقوں کی حکومتیں حالات کا اظہار بلا کم وکاست کریں اور مغربی اور مشرقی پنجاب کی حکومتیں اقلیتوں کی حفاظت میں اپنی ناکامی کو تسلیم کریں۔

(۲) مغربی اور مشرقی پنجاب میں منتقلین کی حفاظت کا معقول انتظام ہو، آمدورفت کے راستے محفوظ ہوں۔

(۳) فسادزدہ علاقوں میں امن قایم کیا جائے، لوگوں کو حفاظت کا یقین دلایا جائے، اور تمام خانماں خرابوں کی بحالی کا انتظام کیا جائے اور ایسے حالات پیدا کیے جائیں کہ ہر وہ شخص جو حالات کے خوف و ہراس سے ترک وطن پر مجبور ہوا ہے اطمینان کے ساتھ اپنے مستقبل اور آیندہ سکونت کے متعلق غور کر سکے۔

(۴) فرقہ وارانہ بنیاد پر ملازمتوں کی جو تقسیم ہوئی ہے اس پر نئے سرے سے غور کیا جائے۔

(۵) مشرقی و مغربی پنجاب میں مخلوط وزارتیں بنائی جائیں۔

(۶) بے گناہ لوگوں کے قتل کے خلاف اور بدترین خصلت کو روکنے کے لیے عوام اور حکومت کے ذریعے پروپیگنڈا کیا جائے۔

مولانا آزاد نے اسی دوران میں ایک اور تجویز پیش کی: ''ہندو اور مسلمانوں کے وفود ہندوستان اور پاکستان میں باہمی اعتماد پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ انڈین یونین کے مسلمان پاکستان پہنچ کر وہاں کے مسلمانوں کو سمجھائیں کہ اقلیت پر ان کی ظلم وستم کا نتیجہ مسلمانوں کے حق میں کیا ہوگا اور پاکستان کے ہندو انڈین یونین کی ہندوؤں کو اسی طرح خیر سگالی اور اقلیتوں کی حفاظت کی فہمایش کریں۔''

مولانا سید محمد میاں مولانا آزاد کے مندرجہ بالا بیان وتجاویز کے بعد لکھتے ہیں:

چودھری خلیق الزماں صاحب جو قومی جھنڈے کے ساتھ وفاداری کا اعلان کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کے بھرے اجلاس میں کر چکے تھے اور نائب وزیراعظم ہند (مسٹر پٹیل) کو اپنا ماوا اور ملجا بنا چکے تھے، مولانا آزاد نے ان کو اس مشن کی کامیابی کے لیے پاکستان بھیجا۔ لیکن

پاکستان کی طرف سے اس تجویز کی حوصلہ افزائی تو کیا ہوتی، چودھری خلیق الزماں صاحب بھی ایسے گئے کہ آج تک واپسی نہ ہوئی اور چند روز بعد ہوائی جہاز کے ذریعے سے اپنے متعلقین کو بھی پاکستان ہی بلالیا۔ (علماے حق اوران کے مجاہدانہ کارنامے: ص ۴۴۳-۶۳۶)

مولانا سید سلیمان ندوی بھی ایک ایسے ہی وفد میں شریک ہو کر پاکستان تشریف لائے تھے لیکن وہ بھی یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ان رَویوں سے ہندوستان کے مسلمانوں کو نقصان پہنچا اور فرقہ پرستوں اور متعصبوں کو نکتہ چینی کرنے کا موقع ملا۔

پاکستان کے فسادات — انڈین قونصل جنرل کا بیان:

ستمبر ۱۹۴۷ء: جناب سری پرکاش پہلے انڈین ہائی کمشنر براے پاکستان اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں:

''ہندوستان میں یہ شکایت تھی کہ پاکستان کا سلوک ہندوؤں کے ساتھ بہت خراب ہے اور پاکستان کا یہ کہنا تھا کہ ہندوستان کا رویہ مسلمانوں کے ساتھ بُرا ہے۔ مجھے اس کا احساس تھا کہ یہ بھی میرے فرایض میں ہے کہ پاکستان کے ہندوؤں کی نگہداشت کروں اور ہندوستان کے مسلمانوں کے بارے میں جو چرچا پاکستان میں ہے اس کی اطلاع اپنی حکومت کو دوں۔ مجھے خبر ملی کہ سندھ میں کچھ ہندوؤں کے ساتھ بُرا برتاؤ کیا گیا۔ میں نے فوراً وزارتِ امورِ خارجہ کو لکھا کہ اس کی تحقیقات کی جائے۔ مجھ کو یہ روکھا جواب ملا کہ یہ پاکستان کا گھریلو معاملہ ہے اور مجھے اس میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ میں نے جواب میں لکھا کہ آئینی نقطۂ نظر سے وزارت کا کہنا بالکل حق بہ جانب ہے، لیکن میں پاکستان کی وزارت کو یہ بتادینا چاہتا ہوں کہ اگر اس کو مسلمانانِ ہند کے ساتھ نازیبا سلوک کی خبر ملے تو بلا تامل مجھ کو خبر دی جائے اور میں یقین دلاتا ہوں کہ میں مکمل جانچ کر کے واقعات سے ان کو مطلع کروں گا۔ اس خط کا اثر بہت اچھا ہوا۔ اگر چہ اس سے کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا لیکن ہمارے روابط بہتر ہو گئے۔ اور پھر اگر میں کسی معاملے میں تحقیقات کرانا چاہتا تھا تو کوئی اعتراض نہیں ہوتا تھا۔ بے شمار شکایات کی تحقیقات کرا کے میں نے خود حکام متعلقہ کو اطلاعات بہم پہنچائیں۔ ان حکام میں نواب زادہ لیاقت علی خان کا بھی شمار ہے۔ یہ شرافت کا نمونہ تھے اور جملہ معاملات پر مجھ سے خلیقانہ اور دوستانہ انداز میں گفتگو کرتے تھے۔

پاکستانی ہائی کمشنر متعین ہندوستان نے میرا ذکر بہت اچھے الفاظ میں کیا۔ ہمارے مشترک احباب سے انھوں نے کہا کہ "سری پرکاش ہائی کمشنر ہندوستان متعین پاکستان ہیں۔ لیکن ایسا نظر آتا ہے کہ وہ ہندوستان میں پاکستان کے ہائی کمشنر ہیں۔" بہ مقتضائے بشریت یہ سن کر مجھے بے حد مسرت ہوئی۔ اس ریمارک کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جو لوگ پاکستان چلے آئے تھے ان میں سے چند حضرات کی شادیاں ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں سے میرے توسط سے طے ہوئیں۔ (پاکستان — قیام اور ابتدائی حالات: ۸۷-۸۶)

فسادات کی آگ بھڑکانے میں انگریز آفیسرز کا حصہ:

۴ر اکتوبر ۱۹۴۷ء: انگریزوں نے فسادات کی آگ بھڑکانے میں جو حصہ لیا تھا، وہ کچھ استعمار دشمنی کے جذبے کا اظہار اور محض قیاس آرائی نہ تھی بلکہ ایک حقیقت تھی جو واقعات کی دنیا میں رونما ہوئی تھی اور مورخ کے قلم نے اسے تاریخ کے صفحات میں محفوظ کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں سب سے پہلے کمیونسٹ پارٹی بنگال کے ترجمان "سادھونتا" (کلکتہ) کا شکر گزار ہونا چاہیے، جس کے نامہ نگار نے یہ حقیقت دریافت کی تھی، اس کے حوالے سے روزنامہ ہند۔ کلکتہ نے اپنی اشاعت ۴ر اکتوبر ۱۹۴۷ء میں اسے نقل کیا۔ مولانا سید محمد میاں نے اس کے حوالے سے اپنی کتاب میں یہ روداد نقل کی ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

"ستمبر کا مہینہ جو فسادات کا دور شباب تھا اور قتل و غارت کا سلسلہ پنجاب اور دہلی سے گزر کر یو پی اور سی پی کی طرف بڑھنا چاہ رہا تھا، اس زمانے میں جو گرفتاریاں کی گئی ہیں ان کی شہادت یہی ہے کہ برطانوی ٹوریوں کے ایجنٹ نہ صرف یہ کہ فساد کو ابھار رہے تھے۔ بلکہ فسادات کی آگ کو تیز کرنے کے لیے بڑی تعداد میں میگزین سپلائی کر رہے تھے، چناں چہ صوبہ سی پی میں انگریز افسروں کی گرفتاری کی اطلاع دیتے ہوئے نامہ نگار نے لکھا تھا:

جس طرح جین کنس، میکڈانلڈ جیسے افسروں نے پنجاب میں فرقہ وارانہ فسادات کو ہوا دی ہے اسی طرح صوبہ متوسط میں بھی بدامنی پھیلانے اور اس صوبے کو فرقہ وارانہ ہنگاموں کا مرکز بنانے کے لیے بعض انگریز افسروں کی خطرناک سازش پکڑی گئی ہے اور کئی افسروں کو گرفتار کیا گیا ہے۔

یہ انگریز افسران جبل پور کے اسلحہ خانے سے باقاعدہ طور پر اسلحہ جات اور گولیاں

بارود وغیرہ فتنہ انگیزوں اور مفسدوں کے دے رہے تھے۔ بڑے بڑے برطانوی اور اینگلو انڈین پولیس افسران کو گرفتار کرنے میں صوبائی حکومت بالخصوص پنڈت راوی شنکر شکلا وزیر اعظم نے بڑی جرأت سے کام لیا۔

لیفٹیننٹ کرنل جونس اور اسپیشل فورس کے ''مسٹر پاول'' کے گھروں کی تلاشی لیے جانے پر ساٹھ ہزار کارتوس اور بہت سی رائفلیں، ریوالور اور بندوق وغیرہ پکڑی گئیں۔

جبل پور کے پولیس انسپکٹر ٹائی منڈیز اور ایک اینگلو انڈین پولیس انسپکٹر کے مکان کی تلاشی لی گئی اور ان کی گرفتاری پر سازش کی دستاویزات اور بہت سے اسلحہ جات برآمد ہوئے۔

میجر جنرل بوکسن کے مکان کی تلاشی لیے جانے پر چوبیس ہزار کارتوس دو رائفل اور دوسرے جنگی سامان برآمد ہوئے۔(حیات شیخ الاسلام: ص ۸۶-۱۸۵)

خلیق الزماں کی جناح صاحب سے ملاقات اور کبیدہ خاطری:

۵/اکتوبر ۱۹۴۷ء: چودھری خلیق الزماں نے گورنر جنرل پاکستان سے اپنی ملاقات کا احوال اپنی تالیف ''شاہراہِ پاکستان'' میں اس طرح بیان کیا ہے:

''میں ۲/اکتوبر ۱۹۴۷ء کو تین بجے شام کراچی پہنچ گیا اور اسی دن شہید سہروردی جنرل اسے کے ساتھ کراچی پہنچے، میں نے کراچی پہنچتے ہی گورنر جنرل کے ملٹری سیکرٹری کو مطلع کر دیا اور ان سے ملاقات کے لیے وقت مانگا، تین دن کے بعد ۵/اکتوبر کو گیارہ بجے مجھے باریابی کا موقع ملا اور ملاقات کے وقت شہید سہروردی بھی موجود تھے۔ مسٹر جناح ملاقات کے کمرے میں میرا وہ بیان ہاتھ میں لیے ہوئے داخل ہوئے جو میں نے سر ظفر اللہ خان کے بیان کے سلسلے میں دیا تھا۔ معمولی صاحب سلامت کے بعد انھوں نے ٹھہر ٹھہر کر میرا بیان مجھے اس طرح سنانا شروع کیا جیسے میرا چارج شیٹ پڑھا جا رہا ہے، اس کو پڑھنے کے بعد انھوں نے مجھ سے کہا ''خلیق! تمہارا یہ بیان تین دن ہندوستان کے ریڈیو پر نشر کیا گیا، تین دن!'' میں نے کہا مسٹر جناح! اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ میں بہ ہر نوع ہندوستان کی کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی میں مسلمانوں کا لیڈر رہوں، اس لیے ہندوستان نے اس کو بڑی اہمیت دی ہے۔ مسٹر جناح نے کہا ''اس سے ہم کو بہت نقصان پہنچا ہے۔'' میں نے جواب دیا اپنے نزدیک میں نے ہندوستان کے مسلمانوں کے فایدے کے خیال سے یہ

بیان دیا ہے اور آپ نے بھی اپنے ۶ر جولائی کے بیان میں ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ ہدایت کی تھی کہ وہ اپنی حکومت کے وفادار ہوں۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ آپ کو میرا بیان ناپسند ہے اس لیے میں کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی سے یہیں سے اپنا استعفیٰ بھیج دوں گا اور ہندوستان واپس نہ جاؤں گا تا کہ کوئی دوسرا اس بار کو اٹھالے جس کو آپ کا اعتماد بھی حاصل ہو اور وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی خدمت بھی کر سکے۔

اس کے بعد وہ شہید سہروردی سے مخاطب ہوئے جنھوں نے ان کو اپنی تجاویز دکھائیں، انھوں نے ان کو پڑھ کر بلا کسی تبصرے کے واپس کر دیا، اور ہمارا انٹرویو ختم ہو گیا۔

ملاقات کے دوران اور واپس آنے کے بعد گھر پر میں اپنے دل میں سنجیدگی کے ساتھ یہ سوچتا رہا کہ آخر جناح صاحب کا اس قصے کے کھڑے کرنے سے کیا مقصد تھا؟ جو پاکستان کے اس وقت حالات تھے اس میں وہ خود مسلم اقلیتوں کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے، اور میرے نزدیک سر ظفر اللہ خان کا یہ بیان کہ مجبوراً پاکستان کو کوئی راست اقدام کرنا پڑے گا، ایک بے معنی اور فضول دھمکی تھی۔ ان حالات میں اگر میں نے ہندوستان کی مسلم اقلیت کی طرف سے ایک مصالحانہ قدم اٹھایا تھا تو جناح صاحب کا اس پر اعتراض مجھے بالکل حق بہ جانب نظر نہ آیا۔ خصوصاً جب کہ وہ ہندوستان کی مسلم اکثریت کو اکثر اپنی گفتگو میں یہ کہہ چکے تھے کہ انھوں نے ان کو رائٹ آف (ختم) کر دیا ہے، پھر رائٹ آف شدہ پانچ کروڑ کی اقلیت اگر اپنی بچت کی کوئی معقول صورت نکالنے کی کوشش کرے تو اس پر ان کو چراغ پا ہونے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔'' (شاہراہ پاکستان: ص ۱۱۰۴ تا ۱۱۰۶)

مولانا قاضی زاہد الحسینی صاحب کا خیال ہے کہ یہ سب کچھ چودھری ظفر اللہ خان کے اشارے پر ہوا تھا۔ قاضی صاحب نے ظفر اللہ خان اور مرزا بشیر الدین محمود کے بیانات سے استدلال کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ سب کچھ چودھری سر ظفر اللہ خان کے اشارے پر ہوا، اس نے ایک تو ۱۶ر ستمبر کو ہندوستانی حکومت کو راست اقدام کا الٹی میٹم دے کر امن و عافیت کے عمل میں روڑا اٹکا دیا اور دوسرا گورنر جنرل پاکستان کو ان کے پرانے مخلص کارکن سے ناراض کر دیا۔ جب کہ راست اقدام کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے کہا:

''کیوں کہ یہ واقعات (قتل و غارت) ہمارے وطن کے قریب ہو رہے

ہیں جس سے ہمارے اعزا و اقربا کی جان و مال سب فوری خطرے میں ہے۔"

یعنی سر ظفر اللہ کو اپنے اعزہ و اقربا کی جان و مال کا فکر تھا۔ چناں چہ اس کے اقربا بلکہ سب قادیانی بہ خیر و عافیت لاہور پہنچ گئے، جیسا کہ اس وقت کے آں جہانی خلیفۃ المسیح مرزا بشیر الدین محمود نے اپنے ایک خطبہ میں کہا تھا:

"تمام قادیانی قادیان سے بالکل محفوظ و مامون لاہور آ گئے۔"

(الفضل لاہور: ۱۳ اکتوبر ۱۹۴۹ء بہ حوالہ چراغ محمد از قاضی محمد زاہد الحسینی، اٹک، ۱۹۹۴ء، ص ۱۵-۴۱۴)

پاکستان بھارت تعلقات اور مسٹر جناح کا بیان:

۲۵ اکتوبر ۱۹۴۷ء: گورنر جنرل پاکستان نے رائٹر کے نمایندے کو جو انٹرویو ۲۵ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو دیا تھا، اس میں انھوں نے کہا تھا:

"پروفیسر ڈاکٹر گیڈگل نے اپنے ۹ اکتوبر کے بیان میں یہ سچی بات کہی ہے کہ نئی انڈین یونین کی موزوں اور مناسب تعبیر صرف یہ ہے کہ یہ ایک ہندو ریاست ہے یا ہندو قومی ریاستوں کا وفاق ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انڈین یونین کو ہندو ریاست کہنا اس بنا پر درست ہے کہ یہی اس کے مزاج کا سب سے نمایاں اور بالاتر پہلو ہے۔

۱۱ مارچ ۱۹۴۸ء کو قائد اعظم محمد علی جناح سے سوئٹزرلینڈ کے ایک اخبار نویس نے انٹرویو لیا، اس نے قائد اعظم سے متعدد سوالات پوچھے، ایک سوال یہ بھی تھا کہ کیا کوئی ایسی امید ہے کہ پاکستان اور بھارت اپنے بنیادی اختلافات اور جھگڑے پر امن ذرائع سے طے کر لیں؟

قائد اعظم نے اسی سوال کے جواب میں کہا کہ شرط یہ ہے کہ بھارتی حکومت غرور اور برتری چھوڑ دے اور پاکستان سے مساوی سطح پر معاملہ طے کرے، نیز حقائق کا پورا اعتراف کرے۔

نامہ نگار نے قائد اعظم سے ایک اور سوال کیا کہ آیا بھارت اور پاکستان دونوں بین الاقوامی امور میں کسی یک ساں پالیسی پر عمل کر سکتے ہیں اور اپنی بری اور بحری سرحدوں کے دفاع کے لیے دوش بہ دوش کھڑے ہو سکتے ہیں؟ اس سوال کے جواب میں بانئ پاکستان نے کہا:

"ذاتی طور پر اس باب میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے اپنے مفادات کا تقاضا یہ ہے کہ پاکستان اور ہندوستان بین الاقوامی امور و مفادات میں باہمی تعاون کے ذریعے بڑا اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اسی طرح پاکستان اور ہندوستان دونوں کے لیے یہ امر بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ بیرونی حملے کی صورت میں یہ اپنی بری اور بحری سرحدوں کے تحفظ کے لیے دوستانہ طریق پر تعاون کریں۔ مگر سارا دارومدار اس امر پر ہے کہ بھارت اور پاکستان خود اپنے اختلافات پہلے طے کر لیں۔ گھر کا اندرونی نظم و نسق بہتر ہوگا جب ہی ہم بین الاقوامی امور میں عظیم کردار ادا کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔"

(روزنامہ کوہستان-لاہور: ۲۵ر دسمبر ۱۹۶۸ء بہ حوالہ "گفتار قاید اعظم" مرتبہ احمد سعید)

مسٹر جناح نے کابینہ پلان پہلے منظور کر لیا تھا، پنڈت نہرو کے ایک بیان کا بہانہ بنا کر اس کی منظوری واپس لے لی تھی۔ حال آں کہ انھوں نے یہ منظوری لیگ کے حلقوں کی بے چینی، اخبارات کی تنقید اور بمبئی وغیرہ کے مسلمان سرمایہ داروں کی پریشانی اور احتجاج سے مجبور ہو کر واپس لی تھی۔ وہ کنفیڈریشن کے نظریے اور اس کی اہمیت کے مخالف نہ تھے۔

چناں چہ اس انٹرویو میں انھوں نے

ا۔ بین الاقوامی امور (خارجہ پالیسی) اور

۲۔ دفاع

دو امور میں ہندوستان سے تعاون اور یک ساں پالیسی واختیار کے امکان کو تسلیم کر لیا ہے۔ اب اگر دونوں حکومتیں ایک تیسرے درجے کے مسئلے "رسل و رسایل" میں ایک پالیسی پر عمل پیرا ہو جائیں اور اس طرح کا تعاون کر لیں کہ دونوں ملکوں کی خود مختاری پر آنچ نہ آئے تو کیا یہ ٹھیک کابینہ مشن پلان نہ ہو جائے گا؟ لیکن اگر یہ کابینہ مشن پلان کی بنیاد پر تصفیہ کیا جاتا تو زیادہ باعزت اور باوقار معاہدہ ہوتا۔

مسٹر جناح کی ہندوستانی مسلمانوں کو نصیحت:

۱۱ر اکتوبر ۱۹۴۷ء: ۱۱ر اکتوبر کو پاکستانی فوج سے خطاب کرتے ہوئے پاکستان کے گورنر جنرل مسٹر محمد علی جناح نے ہندوستانی مسلمانوں کو نصیحت کی:

"ہندوستان میں اپنے مسلمان بھائیوں کے لیے میری یہی نصیحت ہے
کہ وہ جس ریاست میں ہوں اس کے ساتھ بغیر کسی جھجک اور تکلف کے اپنی
وفاداری کا اظہار کریں۔"

(ہندوستان اپنے حصار میں از ایم. جے. اکبر۔ ناشر خدا بخش لائبریری۔ پٹنہ: ص ۱۲-۳۱۱)

مولانا حبیب الرحمٰن کی پاکستان میں آمد اور دہلی واپسی:

۱۷ / اکتوبر ۱۹۴۷ء: معلوم ہوا ہے کہ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اپنے خاندان کے ساتھ لدھیانہ سے لاہور پہنچ گئے۔ انڈین یونین کے لیے یہ بات کتنی افسوس ناک ہے کہ ہندوستان کی آزادی کے سپاہیوں اور وفادار شہریوں کو اس کے حلقے میں پناہ نہ مل سکی اور پناہ ملی تو پاکستان میں!

بعض شخصیتیں ایک قومی ادارے کے برابر اہمیت رکھتی ہیں اور ان کی حفاظت فرض ہے۔ مگر جب حکومت کو خود اپنے کسی فرض کا احساس نہ ہو تو اسے یاد دلانا بے سود ہے۔"

یہ مدینہ اخبار بجنور کا ایک شذرہ تھا جو صدق، لکھنؤ نے ۱۷ / اکتوبر ۱۹۴۷ء کے شمارے میں نقل کیا تھا۔

واضح رہے کہ دسمبر ۱۹۴۷ء میں مولانا لدھیانوی اپنے خاندان کے ساتھ بہ دقت تمام دہلی پہنچ گئے تھے۔ مولانا موصوف نے اسی ماہ دسمبر میں مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں آل انڈیا مسلم کانفرنس منعقدہ لکھنؤ میں شرکت بھی فرمائی تھی اور اپنی پر جوش تقریر میں پنڈت جواہر لال نہرو اور ہندوستان کی حکومت سے شدید الفاظ میں اس بات کا شکوہ بھی کیا تھا۔

بادشاہ خان کی پشاور میں تقریر اور تلقین:

۲۲ / اکتوبر ۱۹۴۷ء: ۲۲ / اکتوبر کی تاریخ تھی اور ۱۹۴۷ء کا سنہ۔ پاکستان کے شمالی مغربی سرحدی صوبے پشاور میں ایک بہت بڑا جلسہ عام ہوا، اس جلسے سے خطاب کرنے والے شخص کو اپنے حق کے طور پر ہندوستان میں رہنا چاہیے تھا۔ اس نے اپنی ساری زندگی، ایک سیکولر ملک بنانے کے لیے لڑائی میں صرف کر دی تھی اور عدم تشدد پر ایمان رکھتا تھا۔ اسے لوگ سرحدی گاندھی کے نام سے جانتے تھے۔ وہ بادشاہ خان بھی کہلاتا تھا۔ تشدد اور

بربریت کے حالیہ ننگے ناچ میں اس نے دیکھا کہ اس کی ساری زندگی کا کیا دھرا ختم ہو رہا ہے، مگر اس نے اب بھی طوفان کا رُخ بدلنے کی کوشش کی۔ جلسے میں موجود پٹھانوں سے اس نے کہا:

> ''اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے ایک ضبط و برداشت کا جذبہ ہے۔ اسلام کا لفظ ہی محبت اور خیر سگالی کو ظاہر کرتا ہے جو پٹھانوں کے قوانین کی بھی خصوصیت ہے، اس لیے اگر کوئی کسی کم زور غیر محفوظ اور بے یار و مددگار شخص کو اذیت دیتا ہے تو وہ صرف اسلام ہی کے پاکیزہ نام پر دھبا نہیں لگاتا بلکہ وہ ایک بالکل غیر پٹھانی عمل کا بھی مجرم ہوتا ہے۔''

یہ الفاظ اس دن خصوصاً بڑے دھار دار تھے۔ صوبہ سرحد اور کشمیر کی سرحدوں پر اسلام کی ایک بالکل مختلف تاویل پیش کی جا رہی تھی۔ (ہندوستان اپنے حصار میں: ایم ۔ جے اکبر، ص ۲۴۹)

حضرت شیخ الاسلامؒ کی ایک تاریخی اور ایمان افروز تقریر:

اکتوبر ۱۹۴۷ء: ۱۹۴۷ء کے قیامت خیز ہنگاموں نے پورے پنجاب کو زیر و زبر کر دیا۔ مسلمانانِ دہلی کی نصف آبادی کو اپنی جگہ سے اکھاڑ دیا۔ دہلی کے بعد یوپی کے مغربی اضلاع ان فسادات کا نشانہ تھے۔ جن کا سیلاب مشرقی پنجاب کو تباہ کر کے ان اضلاع کی سرحدوں تک پہنچ چکا تھا۔ یہاں تک کہ جوالاپور اور دہرہ دون کو تباہ کر چکا تھا۔ لاکھوں پناہ گزین (شرنارتھی) مشرقی پنجاب سے گزر کر ان اضلاع میں پہنچ چکے تھے۔ چناں چہ صرف شہر سہارن پور تقریباً پچاس ہزار پناہ گزینوں کی چھاؤنی بنا ہوا تھا، جو سرحدی علاقوں اور مغربی پنجاب سے تباہ ہو کر یہاں پہنچے تھے، جن کی ہر حرکت خون آشام تھی اور جن کی پیاس صرف خون مسلم سے ہی بجھ سکتی تھی اور فرقہ پرست رہنماؤں کا یہ مطالبہ آگ پر تیل کا کام کر رہا تھا کہ مشرقی پنجاب کی طرح دہلی اور یوپی کے مغربی اضلاع کو بھی مسلمانوں سے خالی کرایا جائے تاکہ پرشارتھیوں کے ان نقصانات کی تلافی ہو سکے جو مغربی پنجاب اور فرنٹیر اور سندھ میں ان کو اٹھانے پڑے ہیں۔ ضلع مظفر نگر اور میرٹھ کی حالت بھی اس کے قریب قریب تھی۔ مسلمانوں کا راستوں سے گزرنا موت سے کھیلنا تھا۔ ٹرین کے ذریعے سفر کرنا تو در کنار اگر اسٹیشن پر کوئی مسلمان ہوتا تھا تو ٹرین آنے کے وقت

اس کو بھی ہٹا دیا جاتا تھا، کیوں کہ ٹرینیں تباہ شدہ، نیم برہنہ شرنارتھیوں سے بھری ہوئی ہوتی تھیں اور جس قدر شرنارتھی ٹرینوں کے اندر ہوتے تھے اتنے ہی ٹرینوں کی چھتوں پر بھی ہوتے تھے۔ ہر ایک ٹرین مرقعہ عبرت ہوتی تھی۔

حکومت نے حفاظتِ امن کے لیے جو کچھ انتظامات کیے وہ قابل قدر تھے، مگر واقعہ یہ ہے کہ حالت اس کے قابو سے باہر ہو چکے تھے اور امن پسند برادرانِ وطن کی خاموش ہمدردیاں قطرۂ شبنم کی طرح بے حقیقت بن گئی تھیں۔ یہ بھی ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اگر ضلع سہارن پور، مظفر نگر، میرٹھ اور دہلی سے مسلمانوں کا تخلیہ ہو جاتا تو پھر پر شرنارتھیوں کا سیلاب ہند یونین کے آخری کناروں تک پہنچتا اور پورے ہند یونین میں مسلمانوں کا نام و نشان ملنا بھی ناممکن ہو جاتا۔ اس نازک ترین وقت میں سفینۂ ملّت کا بوڑ جانا خدا شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی صدر جمعیت علمائے ہند اپنے خلوت کدہ سے برآمد ہوا۔ درس گاہ کو چھوڑا اور ضلع مظفر نگر اور سہارن پور کے قصبات و دیہات کا دورہ کر کے مسلمانوں کو صبر و استقامت کا درس دیا، افسران حکومت کو بیدار کیا اور ان شکوک و شبہات کو دور کیا جو غیر مسلم قوم پرور اور کانگریسی کارکنوں کے دماغوں کو مسموم کر چکے تھے۔

اس دور میں آپ نے کیا درس دیا اور آپ کا پیغام کیا تھا؟ افسوس یہ ہے کہ کوئی نامۂ نگاران کو قلم بند نہ کر سکا۔ صرف ایک تقریر قلم بند ہو کر شائع ہوئی ہے جو آپ نے دیو بند کی جامع مسجد میں فرمائی تھی اس کے چند اقتباسات درج کیے جاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا:

> "۱۵ راگست کے بعد بہت بڑی حد تک غیر ملکی حکومت کے جوئے سے آزاد ہو چکے ہیں، مگر انگریزی سیاست اب تک ہمارے اندر کام کر رہی ہے۔ حکومت کی پرانی مشین اسی طرح موجود ہے۔ پرانی حکومت کے کارندوں، راجاؤں، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی ریشہ دوانیوں نے ہمارے وطن کو فساد اور قتل و غارت گری کے جہنم میں جھونک دیا ہے۔ ان کی سازشوں کے سامنے حکومتیں مفلوج اور ملک کے حقیقی خیر خواہ بے بس ہو گئے ہیں، اب یہ تمہاری ہی طاقت ہے جو ان پر فتح پا سکتی ہے۔ اگر تم حالات کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لو اور اللہ پر بھروسا کر کے فسادیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے کھڑے ہو جاؤ تو اپنے وطن اور عوام کے امن کو تباہی کے اس جہنم سے نکال سکتے ہو۔ عوام کی طاقت ان

سازشوں کو ملیامیٹ کر سکتی ہے۔"

مسلمانوں کو رحم و کرم کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا:

"اسلام محبت، رحمت، امن اور سلامتی کا پیغام ہے۔ اسلام ایک لمحے کے لیے بھی اس درندگی کو برداشت نہیں کر سکتا، جو لوگ مذہب کے نام پر یہ درندگی پھیلا رہے ہیں وہ اسلام کو بدنام کر رہے ہیں۔ اسلام اور قساوت ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔"

آپ نے قرآن پاک اور احادیث سے اس مضمون کے متعلق بہت سے شواہد پیش کیے، پھر استقامت کی تلقین کرتے ہوئے ارشاد ہوا:

"آج خوف اور بزدلی کا جو عالم ہے اس کے تصور سے بھی شرم آتی ہے۔ گھروں میں بیٹھے ڈرتے ہو، راستہ چلتے ڈرتے ہو، اپنی بستیوں میں رہتے ہوئے ڈرتے ہو، کیا تم انھیں بزرگوں کے جانشین ہو جو اس ملک میں گنی چنی تعداد میں آئے تھے؟ جب یہ ملک دشمنوں سے بھرا ہوا تھا۔ آج تم چار کروڑ کی تعداد میں اس ملک میں موجود ہو۔ یوپی میں تمہاری تعداد ۸۵ لاکھ سے زیادہ ہے، پھر تمہارے خوف کا یہ عالم کہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ رہے ہو، آخر کہاں جا رہے ہو؟ کیا تم نے کوئی ایسی جگہ ڈھونڈھ لی ہے جہاں خدا کی گرفت سے بچ سکو گے؟ جہاں تم کو موت نہیں پا سکے گی؟ موت سے بچ کر کہاں جا سکو گے؟"

"......میرے بھائیو اور عزیزو! موت ڈرنے کی چیز نہیں۔ ایک سچا مسلمان موت سے کبھی نہیں ڈرتا، موت کی تمنا کو اسلام نے صداقت کا معیار قرار دیا ہے، کفار کو مخاطب کرتے ہوئے قرآن حکیم نے کہا ہے: فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ "موت کی تمنا کرو اگر تم سچے ہو" اگر تمھیں اسلام کی سچائی پر یقین ہے تو موت سے تمہارا یہ خوف بے معنی ہے: الموت جسر یوصل الحبیب الی حبیبہ موت ایک پل ہے جو محبوب کو محبوب تک پہنچا دیتا ہے۔ پھر اسلام کے نام پر جان دے دینا موت نہیں زندگی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ "جو اللہ کے راستے میں قتل کیے جاتے ہیں ان کو مردہ مت سمجھو بلکہ یہ

لوگ زندہ ہیں۔" ہمیں ان کی زندگی محسوس نہیں ہوتی۔"

قرآن شریف اور احادیث سے شہادت کے مراتب اور فضایل بیان کرنے کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا:

"اس لیے جبن اور خوف اپنے دل سے نکال دو۔ اسلام اور جبن ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ صبر و استقلال کے ساتھ مصایب کا مقابلہ کرو، کبھی فساد کی ابتدا نہ کرو، اگر فسادی تم پر چڑھ آئیں تو ان کو سمجھاؤ لیکن اگر وہ نہ مانیں اور کسی طرح باز نہ آئیں تو پھر تم معذور ہو۔ بہادری کے ساتھ ڈٹ کر مقابلہ کرو اور اس طرح مقابلہ کرو کہ فسادیوں کو چھٹی کا دودھ یاد آجائے۔ تمہاری تعداد خواہ کتنی ہی تھوڑی ہو مگر قدم پیچھے نہ ہٹاؤ اور اپنی عزت و حرمت کی حفاظت کرتے ہوئے جان دے دو، یہ عزت اور شہادت کی موت ہوگی۔"

الزام غداری: وفاداری اور بے وفائی کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے آپ نے فرمایا:

"اس ملک کو تم نے اپنے خون سے سینچا ہے آیندہ بھی اس کو اپنے خون سے سینچنے کا عزم رکھو، یہی ملک کی حقیقی وفاداری ہے۔ اس ملک پر تمہارا ابھی اتنا ہی حق ہے جتنا کسی دوسرے باشندے کا، اور اس کی خدمت کی ذمہ داری تم پر بھی اسی طرح ضروری ہے جس طرح کسی دوسرے شخص پر عاید ہوسکتی ہے۔ وفاداری کے اظہار کا جو ڈھنگ تم نے اختیار کیا ہے وہ نہ مفید ہے نہ ضروری۔ آج اس ملک کے ساتھ اظہار وفاداری یہ ہے کہ ترقی پسند جماعتوں کا ساتھ دو، فرقہ پرستی کے جراثیم کا خاتمہ کرو۔ وفاداری کے پرانے طور و طریقے اب بدل چکے ہیں، اب افسران حکومت یا حکومت کے ساتھ وفاداری کے کوئی معنی نہیں۔ جب تک اس ملک میں جمہوریت کا نام و نشان باقی ہے حکومت ہم خود ہیں، وزرائے حکومت کو ہم نے اپنے ووٹوں سے منتخب کر کے بھیجا ہے تاکہ وفاداری کے ساتھ ملک اور اہلِ ملک کی خدمت کریں۔ یہ ثابت کرنا ان کا فرض ہے کہ وہ عوام کے وفادار اور ملک کے سچے خیر خواہ اور خادم ہیں۔ ہم کو ان سے باز پرس کا حق ہے، پھر اس غلامانہ اظہار وفاداری کا کیا مطلب؟

مختلف سمتوں سے مسلمانوں کی وفاداری کا سوال اٹھایا جا رہا ہے اور یہ سوال کچھ اس طرح سامنے لایا جاتا ہے کہ گویا انڈین یونین میں مسلمانوں کو جو مصیبتیں پیش آتی ہیں وہ کسی غیر وفاداری کا نتیجہ ہیں۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ کیا غیر وفاداری ہے جو انڈین یونین کے مسلمانوں نے کی ہے، ملک کی تقسیم سے پہلے بمبئی، بہار، گڑھ مکتیسر اور یوپی کے مختلف مقامات کے لوگوں نے جو دکھ اٹھائے ہیں وہ کس غیر وفاداری کا نتیجہ تھے اور تقسیم کے بعد دہلی اور مشرقی پنجاب کی تباہی عوام کی کس بے وفاداری کا نتیجہ تھی؟ وہ کیا غداری تھی جس کی سزا میں ان کو خانہ ویرانی اور تبادلہ آبادی کا تحفہ دیا گیا؟ اور اگر یہ سب کچھ مسلمانوں کی غیر وفاداری کا صلہ تھا تو کلکتہ، نواکھالی، پٹرا، مغربی پنجاب اور سرحد میں ہندوؤں اور سکھوں نے جو مصایب برداشت کیے ہیں وہ کس جرم کی سزا تھے؟ ملک کی تقسیم یقیناً زبردست نقصانات کا باعث ہوئی۔ لیکن اس کو غیر وفاداری کا معیار نہیں بتایا جا سکتا۔ اگر یہ غیر وفاداری کا معیار ہے تو منظور کرنے والوں پر بھی اس کی اتنی ہی ذمہ داری ہے جتنی مطالبہ کرنے والوں پر عاید ہوئی ہے۔ قوم پرور مسلمانوں کے سوا ہندوستان کی وہ کون سی فرقہ وار یا غیر فرقہ وار جماعت تھی جس نے برطانوی حکومت کے اس تحفے کو قبول نہ کیا ہو؟ جمعیت علمائے ہند کے رہنما آخری لمحے تک چیختے رہے کہ تقسیم منظور کر کے ملک کو تباہی کے جہنم میں نہ جھونکو۔ ہندوستان کا وہ کون سا وفادار تھا جس نے جمعیت علما کی آواز کو سنا؟

تقسیم کے حق میں ووٹ دینا اگر غیر وفاداری کا معیار سمجھا گیا ہے تب بھی میں پوچھتا ہوں کہ ریاستی عوام (الور، بھرت پور وغیرہ کے باشندوں) کا جرم کیا تھا جس کی پاداش میں ان کو خانماں بربادی میسر آئی۔ یہ غریب تو ووٹ دینے کے بھی قصور وار نہ تھے۔ پھر ہندوستان کے چالیس کروڑ عوام میں کتنے لوگوں کو ووٹ دینے کا حق حاصل تھا۔ زیادہ سے زیادہ آبادی کے دس فیصدی حصے کو مالی اور تعلیمی معیار کی بنا پر رائے دینے کا حق دیا گیا تھا۔ یعنی دس کروڑ مسلمانوں میں سے صرف ایک کروڑ کو رائے دینے کا حق حاصل تھا۔ اگر یہ تعداد متفقہ طور

پر تقسیم کے حق میں فیصلہ کرتی تب بھی مسلمانوں کا متفقہ فیصلہ نہ ہوتا، ایسا فیصلہ تو صرف رائے دہی بالغان کے اصول پر ہی حاصل کیا جا سکتا تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ انتخابات میں ان تمام دفتری سازشوں اور مداخلتوں کے باوجود جو پچھلی حکومت اور اس کے کارندوں کی طرف سے حامیان تقسیم کے حق میں کی گئی تھیں، تقسیم کی حمایت میں پینتالیس لاکھ ایک ہزار ایک سو چھپن ووٹ حاصل کیے گئے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ دس کروڑ مسلم عوام میں سے صرف ساڑھے چار فیصدی نے تقسیم کے حق میں اپنی رائے ظاہر کی، ساڑھے چار فیصدی کی رائے کو کس طرح پوری قوم کے سر تھوپا جا سکتا ہے اور کس طرح اس کی وفاداری یا غیر وفاداری کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

بلا شبہ ملک کے ساتھ وفاداری ملک کے ہر بسنے والے کا قومی فریضہ ہے، لیکن اس وفاداری کا معیار کسی خاص مذہب کی پیروی نہیں ہے۔ کیا ہندوستان کی آزادی کے لیے مسلمانوں نے اپنا خون نہیں بہایا؟ کیا مسلمانوں کے سوا سبھی لوگ ہندوستان کے وفادار رہے ہیں؟ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی پالیسی کے خلاف آج جو کچھ کیا جا رہا ہے کیا وہ ملک اور حکومت کے ساتھ وفاداری ہے؟ مذہبی بنیادوں پر ملک اور حکومت کے ساتھ وفاداری یا غیر وفاداری کا فیصلہ کرنا تاریخ کو جھٹلانا ہے۔ اس موقع پر کسی مذہبی فرقے کی وفاداری کے سوال کو زیر بحث لانے کے معنی اس کی سوا کچھ نہیں کہ تباہی کے بنیادی اسباب کی طرف سے چشم پوشی کی جائے اور ملک کی رجعت پسند طاقتو کے مقابلے میں اپنی شکست اور بے بسی کے لیے اس سوال کو آڑ بنایا جائے۔ عوام کی موجودہ تباہی اور ملک کی پر امن ترقی کو روکنے کی ذمہ داری صرف انھیں رجعت پسند طاقتوں پر ہے جنھوں نے فرقہ وارانہ بنیاد پر عوام میں منافرت پیدا کی اور اس نفرت کو اپنے مقاصد کا ذریعہ بنایا۔ یہ عناصر کسی ایک فرقے تک محدود نہیں تھے۔ اس لیے کسی خاص مذہبی گروہ کی وفاداری پر شک وشبہ کے لیے کوئی وجہ نہیں ہے۔"

(ارشادات: مکتبہ یوسفیہ دیوبند: ص ۹۵-۲۸۶)

مسئلہ کشمیر اور استصواب رائے:

۲ر نومبر ۱۹۴۷ء: ۲ر نومبر کو آل انڈیا ریڈیو پر ایک نشریے میں، جس کے الفاظ جب بھی کشمیر پر بحث ہوتی ہے، دہرائے جاتے ہیں۔ نہرو نے کہا:

''آج کی رات میں آپ لوگوں سے کشمیر کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ مشہور و معروف وادی کے حسن کے بارے میں نہیں بلکہ اس دہشت کے بارے میں جس کا اس نے ابھی حال ہی میں مقابلہ کیا ہے..... ۲۴ر اکتوبر کی رات تھی جب ریاست کشمیر کی جانب سے، ہم سے الحاق اور فوجی امداد کی درخواست کی گئی تھی..... سری نگر بلکہ پورے کشمیر کا مقدر تذبذب کا شکار تھا، ہم کو ہنگامی پیغامات بھیجے گئے، صرف مہاراجہ کی حکومت کی طرف سے ہی نہیں بلکہ عوام کے نمائندوں خصوصاً کشمیر کے عظیم لیڈر شیخ محمد عبداللہ، جو اس وقت نیشنل کانفرنس کے صدر بھی ہیں، کی طرف سے بھی۔ کشمیر کی حکومت اور نیشنل کانفرنس دونوں نے ہم پر انڈین یونین سے کشمیر کے الحاق کو منظور کرنے کے لیے زور ڈالا۔ ہم نے اس الحاق کو منظور کرنے کا فیصلہ کیا اور ہوائی جہاز کے ذریعہ اپنے سپاہی بھیج دیے، مگر ہم نے ایک شرط بھی لگادی کہ اس الحاق کی جب نظم و ضبط اور امن و شانتی قایم ہو جائے گی تو عوام سے بھی توثیق کرانا ہوگی۔ ہم اس بات کے لیے مضطرب تھے کہ بحران کی اس گھڑی میں عوام کو اپنی بات کہنے کا موقع دیے بغیر کوئی آخری فیصلہ نہیں ہونا چاہیے، یہ طے کرنا بہ ہر حال ان کا کام ہے اور مجھے یہ بات بھی صاف کرنے کی اجازت دیجیے کہ اس پورے عرصے میں ہمارا یہ موقف رہا ہے کہ دونوں ملکوں میں سے کسی ایک کے ساتھ الحاق کے بارے میں ایک تنازعہ ہے اور فیصلہ ریاست کے عوام کو کرنا چاہیے۔ یہ ہماری اس پالیسی کے مطابق تھا کہ ہم نے کشمیر کے الحاق کے معاہدے میں یہ شرط بھی بڑھادی۔''

دراصل یہ جناح صاحب تھے جنھوں نے استصواب رائے عامہ کے خیال کو یہ کہہ کر مسترد کردیا تھا کہ جب تک ہندوستان کی فوجیں ریاست میں ہیں وہاں ایمان داری کے ساتھ رائے شماری ہو ہی نہیں سکتی۔ جناح صاحب کو یہ یقین تھا کہ جب تک شیخ عبداللہ کی

قیادت ہے کشمیری ہندوستان کے حق میں ہی رائے دیں گے۔
اسی تقریر میں جس میں پنڈت نہرو نے الحاق کی توثیق کے لیے ''اقوام متحدہ جیسی بین الاقوامی تنظیم کے تحت، عام رائے معلوم کرنے'' کا وعدہ کیا تھا...... نہرو کے سوانح نگار ایس گوپال کے مطابق یہ ماؤنٹ بیٹن تھے جنھوں نے استصواب رائے عامہ تجویز کیا تھا، اس وقت نہ تو الحاق کے عارضی ہونے کا پہلو اور نہ ہی توثیق کا خیال کوئی مسئلہ سمجھا گیا۔ ہندوستان کے لیے شیخ عبداللہ کی وفاداری کسی قسم کے شک وشبہ سے بالاتر تھی۔ یہ جناح صاحب نہیں پنڈت نہرو تھے جنھوں نے یہ بات رکھی اور علی الاعلان کہہ دی تھی کہ الحاق کے فیصلے میں یہ شرط شعوری طور پر رکھی گئی تھی۔ (ہندوستان اپنے حصار میں)

فسادات میں برٹش استعمار کا حصہ:

۳۰ر نومبر ۱۹۴۷ء: تقسیم ملک کے نتیجے میں جو اندوہ ناک واقعات پیش آئے اور فسادات، لوٹ مار، قتل، آتش زنی، آبرو ریزی کے جو شرم ناک مظالم ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے پر ڈھائے تھے، ان کے لیے انھیں جتنا بھی مطعون کیا جائے کم ہے۔ لیکن ان تمام واقعات میں ایک تیسرا فریق بھی تھا، اس کی ریشہ دوانیوں کی طرف لوگوں نے بہت کم توجہ کی ہے، لیکن اس کا کردار بھی تاریخ سے چھپا نہیں رہا۔ یہ تیسرا فریق برٹش استعمار تھا۔ اس نے فسادات کے لیے ذہنوں کو بنایا، اس آگ کے لیے ایندھن فراہم کیا اور پھر اسے بھڑکایا۔ چناں چہ پنجاب، سی پی وغیرہ صوبہ جات سے جو رپورٹیں موصول ہوئیں ان میں اس تیسری قوت کے دست شرارت آمیز و فتنہ پرور کو صاف دیکھ لیا گیا۔ مولانا سید محمد میاں نے قومی آواز لکھنؤ ۳۰ر نومبر ۱۹۴۷ء کے حوالے سے پنڈت سندر لال کا ایک بیان نقل کیا ہے۔ مولانا محمد میاں لکھتے ہیں:

''۳ر جون کے بعد پورا ہندوستان ۱۵ر اگست کا انتظار بے تابی سے کرنے لگا۔ کیوں کہ وہ یوم حریت تھا، یوم آزادی تھا۔ ہندوستان کی گلوخلاصی کی تاریخ تھی اور اس روز پاکستان اور ہندوستان میں جشن آزادی منایا جانے والا تھا۔

لیکن ۱۵ر اگست کے آفتاب کی کرنیں ''پرچم پاکستان'' یا ''نیشنل فلیگ'' سے پہلے ان ہزاروں لاوارث لاشوں، ستم رسیدہ عورتوں اور بچوں اور خون میں تڑپتے ہوئے زخمی اور

مقتول نوجوانوں پر پڑیں جو انقلاب دشمن سازشوں کے خون ریز نتائج کا شکار ہو چکے تھے۔
فسادات کی ظاہری نوعیت فرقہ وارانہ تھی، مگر درحقیقت سنگ دل اور ملوکیت پرست ٹوڈیوں کے ہاتھ اس فرقہ پرستی کے پردے میں کام کر رہے تھے۔ چناں چہ مہاتما گاندھی کے فرستادہ خاص پنڈت سندر لال نے پنجاب کے دورے کے بعد اپنے طویل بیان میں فرمایا تھا:

میرا یقین ہے کہ کسی غیر جانب دار عدالت کے سامنے یہ ثابت کرنے میں کوئی دقت نہ ہوگی کہ اسلحہ اور گولا بارود کا زیادہ تر ذخیرہ جو مختلف مقامات پر ہندو مسلمانوں یا سکھوں نے استعمال کیا یا استعمال کیا جانے والا تھا وہ ذمہ دار برطانوی افسروں کی معرفت آیا۔

لائل پور کے مسلم ڈپٹی کمشنر نے وہاں کے ہندو چیئر مین ڈسٹرکٹ بورڈ سے کہا کہ اگر اس ضلع سے کرنل فینچ کو ہٹا دیا جائے تو پھر ایک ہندو یا سکھ بھی نہ لٹے گا۔

راول پنڈی کے تقریباً تمام سربرآوردہ ہندو اور مسلمانوں کی یہ رائے تھی کہ وہاں مارچ کے فسادات کی براہِ راست ذمہ داری مسٹر ی. ایل. کولنس ڈپٹی کمشنر اور ہوم سیکرٹری مسٹر میکڈانلڈ پر تھی۔ مشرقی پنجاب کے ایک ضلع میں جب ہندوؤں نے یہ طے کر لیا کہ اقلیت کے لوگوں کو نہ ستایا جائے گا تو ایک برطانوی فوجی افسر نے آگ کو دوبارہ سلگانے کی غرض سے موٹر میں طویل سفر کیا۔ راستے میں لوگوں پر گولیاں چلائیں اور ان کو ہلاک کر دیا۔

ایک دوسرے ضلع میں جب ایک فرقے کے لوگ پاس کی چھاؤنی میں فوجی امداد حاصل کرنے کے لیے کمانڈر کے پاس گئے تو اس برطانوی کمانڈر نے ان لوگوں سے کہا کہ ان کو برطانوی گورنمنٹ سے درخواست کرنی چاہیے کہ ملک کے انتظامات کا پھر چارج لے لے۔ اور اس درخواست پر زیادہ سے زیادہ ہندوستانیوں کے دستخط کرائے جائیں، چناں چہ اس غرض کے لیے ایک فہرست کھول دی گئی اور دستخط بھی کرا دیے گئے لیکن بعد میں اس خیال کو ترک کر دیا گیا۔

خود لائل پور میں ایک برطانوی فوجی افسر نے ایک مسلم پولیس افسر سے کہا، کیا تمہارا خیال ہے کہ ہم ہندوستان سے جا رہے ہیں؟ نہیں! ہم ملایا میں چھپ جائیں گے اور جب یہاں کے حالات خراب ہو جائیں گے تو ہم واپس آ جائیں گے۔ اس قسم کی مثالیں بہ کثرت دی جا سکتی ہیں اور اس سے بھی خراب قسم کی مثالیں موجود ہیں۔ بااختیار برطانوی افسروں نے اپنے ذرائع اور سامان کو فسادات کی آگ لگانے اور جگہ جگہ پہنچانے ہی میں نہیں بلکہ

اس کو مسلسل جلتا رکھنے میں بھی استعمال کیا۔ ہم کو شرم کے ساتھ اس امر کا اقبال کرنا پڑتا ہے کہ ہم برے ہیں۔ لیکن یقیناً نہ ہندو نہ مسلمان نہ سکھ اتنا برا ہے جتنا کہ وہ اپنے فریق مخالف کو دکھائی دیتا ہے۔ (حیات شیخ الاسلام: ص ۸۵-۱۸۴)

انتقالِ آبادی کی ہول ناکی:

اسی بیان میں پنڈت سندر لال نے ''انتقالِ آبادی'' کی ہول ناکی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ وہ اسے ایک گناہِ عظیم قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے اس گناہ عظیم کی ذمہ داری کسی ایک قوم، کسی ایک سیاسی جماعت یا کسی ایک رہنما پر نہیں ڈالی۔ انسانیت کو اس ہول ناک تباہی کی طرف لے جانے میں بہت سے رہنماؤں اور ان کی پارٹیوں کا حصہ تھا۔ پنڈت جی کے نزدیک جو اس گناہِ عظیم کے مرتکب، اس ہول ناکی کے مجرم ہیں ان پر مقدمہ چلانا چاہیے تھا۔ وہ اپنے بیان میں کہتے ہیں:

> ''انتقالِ آبادی کی کارروائی انسانیت کے ساتھ ایک گناہِ عظیم ہے۔ شاید اس سے تاریک تر گناہ انسانی تاریخ میں نہ ہوا ہوگا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کا ذمہ دار کون ہے۔ مجھے تو اکثر خیال آتا ہے کہ کم از کم ہمارے ایک درجن چوٹی کے لیڈر جن میں سب پارٹیوں کے لیڈر شامل ہونے چاہییں اور برطانوی قوم کے سیاسی لیڈروں پر اس جرم کا مقدمہ انھیں پناہ گزینوں کے سیدھے اور غیر جانب دار نمایندوں کی عدالت میں چلایا جانا چاہیے، جن پر ان مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹا ہے۔'' (قومی آواز، ۳۰ر نومبر ۱۹۴۷ء بہ حوالہ حیات شیخ الاسلام: ص ۱۸۸)

حالات پر غور و فکر:

۲۱ر دسمبر ۱۹۴۷ء: مہاتما گاندھی نے غالباً ۲۱ر دسمبر کو پنڈت جواہر لال نہرو، سردار پٹیل، مولانا آزاد اور دوسرے ذمہ دارانِ حکومت کو اپنے یہاں طلب کیا۔ وفد میں جمعیت کے حضرات بھی تشریف لے گئے اور تمام پہلوؤں پر تفصیلی گفتگو ہوئی۔

۲۶-۲۷ر دسمبر کو لکھنؤ میں مسلمانانِ ہند کی کانفرنس مولانا آزاد کی زیر صدارت ہونے والی تھی۔ مہاتما گاندھی نے تمام باتوں کو سننے کو بعد مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اور

حضرت مولانا احمد سعید صاحب وغیرہ سے فرمایا کہ آپ حضرات اس کانفرنس میں شرکت کریں اور مجھے موقع دیں کہ میں کچھ دنوں حالات کا جائزہ لے سکوں۔

(علمائے حق اور..........: جلد۲، ص ۲۹۳)

پاکستان کا مطلب کیا؟ نعرے سے جناح صاحب کی بریت!

دسمبر ۱۹۴۷ء: دسمبر ۱۹۴۷ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل کا آخری اجلاس خالق دینا ہال کراچی مین ہوا تھا۔ اس اجلاس کے حوالے سے ذوالفقار علی بھٹو دور کے پنجاب کے وزیرِ تعلیم ملک غلام نبی ایم اے نے جو خود بھی کونسل کے ممبر تھے، ایک مضمون روزنامہ نوائے وقت لاہور میں لکھا تھا۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:

''پاکستان مسلم لیگ کونسل کی آخری میٹنگ خالق دینا ہال کراچی میں ہوئی تھی جس میں قایدِ اعظم بڑے ہی لاغر اور کم زور دکھائی دے رہے تھے۔ جب ایک بزرگ نے ان سے سوال کیا کہ

قایدِ اعظم! ہم قوم سے یہ کہتے آئے ہیں کہ پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ! اس پر قایدِ اعظم نے فرمایا کہ

یہ درست ہے کہ یہ نعرہ تمام مسلمانوں کی زبان پر ہے اور یہ ان کے دل کی آواز ہے۔ لیکن یہ نعرہ میں نے ایجاد نہیں کیا اور نہ ہی میری ورکنگ کمیٹی نے یا کونسل نے کوئی ایسا ریزولیوشن پاس کیا۔'' (کاروانِ احرار: جلد ۸، ص ۲۳)

یہ بات مجھے پروفیسر جان عالم (استاذ شعبۂ اردو جناح کالج۔ کراچی نے بتائی کہ یہ سوال کرنے والے مشہور لیگی رہنما منظر عالم صاحب ایڈوکیٹ مسلم لیگ کونسل کے رکن تھے جو پروفیسر موصوف کے بڑے بھائی تھے۔ (اب ش)

پاکستان کی قیمت شہدا اور تارکینِ وطن:

نور احمد نے ''مارشل لا سے مارشل لا تک'' میں دسمبر ۱۹۴۷ء تک فرقہ وارانہ فسادات کی نذر ہو جانے والے اور تارکینِ وطن کی تعداد بتائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''۱۹۴۷ء کے آخر تک مغربی پاکستان میں مہاجرین کی آمد کا طوفانی دور ختم ہو چکا

تھا۔اس وقت تک یہاں تقریباً ساٹھ لاکھ مہاجر پہنچ چکے تھے۔ مہاجر اس کے بعد بھی آتے رہے بلکہ یوپی کے بیشتر مہاجر اس زمانے کے بعد ہی آئے۔ لیکن یہ آمد تھوڑی تعداد میں اور وقفوں کے ساتھ تھی۔ جہاں تک مغربی پاکستان کا تعلق ہے، دسمبر ۱۹۴۷ء کے آخر تک یہاں سے ترک وطن کرنے والے ہندوؤں اور سکھوں کی تعداد چالیس لاکھ سے کچھ اوپر تھی۔ اس زمانے میں سرحد کے دونوں طرف اقلیتوں پر جو حملے ہوئے۔ ان میں اتلاف جان کتنا ہوا؟ اس کی صحیح تعداد کے متعلق کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ جانی نقصان مسلمانوں کا غیر مسلموں کی نسبت کافی زیادہ ہوا۔ اس وقت عام اندازہ یہ تھا کہ مشرقی پنجاب، دہلی اور سکھ ریاستوں اور جموں وغیرہ میں جو حملے ہوئے ان میں شہید ہونے والے مسلمانوں کی تعداد ڈیڑھ لاکھ سے کم نہ تھی۔ (ص، ۳۳-۳۳۲)

۱۹۴۸ء

گاندھی جی کا مرن برت — مقصد اور پس منظر:

۱۲ر جنوری ۱۹۴۸ء: ۱۲ر جنوری، نئی دہلی۔ گاندھی جی نے گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو مطلع کیا کہ حالات قابو سے باہر ہو چکے ہیں۔ حکومت کی کوئی تدبیر کارگر ہوتی نظر نہیں آتی، میں یہ سب کچھ ہوتا اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا۔ میں آپ کو یہ بتانے آیا ہوں کہ میں مرن برت رکھنے جا رہا ہوں۔ دہلی میں مکمل امن کے سوا کوئی چیز مجھے اس فیصلے سے نہیں روک سکتی۔ ماؤنٹ بیٹن نے کہا ''میرا خیال ہے کہ جو آپ کرنے جا رہے ہیں اور اس کا جو مقصد ہے اس سے زیادہ عظیم کوئی کام نہیں ہو سکتا۔'' ماؤنٹ بیٹن نے یہ بھی بتایا کہ ہماری حکومت وہ ساٹھ لاکھ رُپے بھی پاکستان کو دینے سے انکاری ہے جو اسے ازروے معاہدہ دینے چاہییں۔ ''آدھی رات کی آزادی'' کا مؤلف لکھتا ہے:

> ''یہ سن کر گاندھی جی تن کر بیٹھ گئے۔ ''جی ہاں! یہ غلط ہے، بے ایمانی ہے، اخلاق کے خلاف ہے، بین الاقوامی وعدہ خلافی ہے۔''
>
> .....ایک بار حکومت نے جو عہد کیا ہے، وہ اس سے کس طرح پیچھے ہٹ سکتی ہے۔ ہندوستان کا طرز عمل ایسا ہونا چاہیے کہ ساری دنیا کی آنکھیں کھل جائیں۔ بین الاقوامی سطح پر ہندوستان کو اپنی روحانی طاقت کو پھیلانا چاہیے۔ کیا آزادی کے بعد نئے ہندوستان کے اصول پست ہو جائیں گے؟ نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا۔''

گاندھی جی نے ماؤنٹ بیٹن سے کہا:

> ''اب وہ اپنے برت میں ایک اور نکتہ جوڑ دیں گے۔ وہ دہلی میں امن کے لیے تو برت رکھیں گے ہی، ہندوستان کی بین الاقوامی عزت کے لیے بھی برت رکھیں گے۔ وہ اس وقت تک غذا قبول نہیں کریں گے جب تک ہندوستان پاکستان کے ساتھ معاہدے کی شرطوں کی لفظ بہ لفظ پابندی نہیں کرے گے۔''

گاندھی جی کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلنے لگی جس میں معصومیت بھی تھی اور شرارت بھی۔ انھوں نے ماؤنٹ بیٹن سے کہا:

"میری بات وہ ابھی نہیں سنیں گے۔ ایک بار مجھے مرن برت شروع کرنے دیجیے، پھر دیکھیے۔" (ص ۵-۲۴۹)

گاندھی جی کا بیان — مرن برت سے پہلے:

۱۲ر جنوری ۱۹۴۸ء: لکھنؤ کانفرنس کا زمانہ (دسمبر ۱۹۴۷ء) دہلی میں خیریت سے گزر گیا۔ لیکن دو ایک روز بعد پھر اس قسم کے واقعات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جنوری کے پہلے ہفتے میں ریلوے اسٹیشن دہلی پر بم پھٹا، مگر نشانہ کچھ ٹھیک نہیں بیٹھا اور وہ مسلمان عورتیں اور بچے بال بال بچ گئے جو بمبئی جانے کی غرض سے رات کو اسٹیشن پر جمع ہو گئے تھے اس سے چند روز بعد غالباً ۱۲ر جنوری ۱۹۴۸ء کو تیس کے قریب مسلمان جن میں عورتیں اور بچے بھی تھے، باڑہ ہندو راؤ سے مقبرہ ہمایوں جا رہے تھے، پہاڑ گنج کے قریب ان کا ٹرک فیل ہو گیا، فوراً ان پر حملہ کر دیا گیا اور ان کا تمام سامان و اسباب لوٹ لیا گیا۔ ان واقعات نے گاندھی جی کے حساس، انصاف پسند اور بہادر قلب پر خاص اثر کیا اور آپ نے کسی سے مشورہ کیے بغیر ایک پیغام لکھا جو ۱۲ر جنوری ۱۹۴۸ء (دوشنبہ) کی شام کو پرارتھنا سبھا (عبادتی جلسے) میں پڑھ کر سنایا گیا (۱):

"ایک شخص صحت کی خاطر طبعی اصولوں کے ماتحت برت رکھتا ہے، یا ایک شخص اپنی کسی غلط کاری کی اصلاح کی خاطر برت رکھتا ہے، اس قسم کے برت میں اس کی ضرورت نہیں ہے کہ برت رکھنے والا اہنسا کا بھی قایل ہو۔ لیکن برت کی ایک اور قسم ہے جو اہنسا پر یقین رکھنے والا رکھتا ہے اور یہ برت اس وقت رکھا جاتا ہے جب اہنسا کا قایل سوسایٹی کی کسی غلطی کے خلاف آواز بلند کرنا چاہتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ سوائے اس کے اس کے پاس اور کوئی چارۂ کار بھی نہیں رہا ہے۔ ایسا برت اس کے ارادے پر مبنی نہیں ہوتا بلکہ ایک اندرونی آواز ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

ایسا ہی ایک موقع میرے لیے بھی آ گیا ہے۔ ۹ر ستمبر کو میں کلکتہ سے دہلی

آیا۔ میں مغربی پنجاب جانے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن میں نہیں جا سکا، دہلی کا شہر مُردوں کی سرزمین معلوم ہوتا تھا۔ جب میں ٹرین سے اُترا تو میں نے ہر چہرے پر اداسی اور مایوسی دیکھی، یہاں تک کہ سردار (پٹیل) جو ہمیشہ خوش رہتے ہیں اور جن کی خوش گپیاں دوسروں کو مسرور کرتی رہتی ہیں مغموم نظر آتے تھے۔

اس کا سبب مجھے معلوم نہیں تھا، وہ پلیٹ فارم پر میرا استقبال کرنے آئے تھے، انھوں نے فوراً مجھے فسادات کی اندوہ ناک کہانی سنائی، میں نے یہ سنتے ہی محسوس کیا کہ مجھے دہلی میں رہنا چاہیے اور کچھ کرنا یا مر جانا چاہیے۔

پولیس اور فوج کے فوری اقدام سے حالات میں سکون تو پیدا ہو گیا لیکن یہ محض عارضی تھا، کیوں کہ دلوں میں طوفان تڑپ رہے ہیں جو کسی وقت بھی پھٹ سکتے ہیں۔ ایسی صورت حال کے معنی یہ ہیں کہ میں نے کچھ کرنے کا جو عہد کیا تھا اس کو پورا نہیں کر سکا۔ میں چاہتا ہوں کہ ہندو، سکھ اور مسلمانوں میں دوستانہ تعلقات پیدا ہو جائیں۔ کل کی سی بات ہے کہ ان میں دوستانہ تعلقات موجود تھے، لیکن آج ان کا کوئی شمہ بھی باقی نہیں ہے۔ اس صورت حال کو کوئی سچا محبِ وطن برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر چہ اندرونی آواز اکثر مجھے اُکساتی رہی لیکن میں اس سے گریز اس لیے کرتا رہا کہ کہیں یہ شیطان کی آواز نہ ہو اور میری کم زوری کا باعث نہ بن جائے میں یہ پسند نہیں کرتا کہ میں یہ محسوس کروں کہ میں بے بس ہو گیا اور میرے تمام ذرائع ختم ہو گئے۔ کیوں کہ ایک سچا ستیہ گرہی کبھی لاچار اور بے بس نہیں ہوتا۔ تلوار اور طاقت کے بجائے برت آخری طریق کار ہے، جو اختیار کیا جا سکتا ہے۔

روزانہ مسلمان دوست مجھ سے ملتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے (۲)؟ میں ان کو کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ عرصے سے میں اپنی کم زوری اور بے بسی کو محسوس کر رہا ہوں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ جوں ہی میں برت شروع کر دوں گا یہ کم زوری اور احساس لاچاری جاتا رہے گا۔ گزشتہ تین دن سے میں اس پر غور کر رہا ہوں، میں نے آخری فیصلہ کر لیا، لیکن یہ فیصلہ یکا یک مجھ پر ظاہر ہوا اور میں خوش ہوں۔ ایک نیک اور ایمان دار شخص کے پاس جان

ہی سب سے زیادہ قیمتی چیز ہوتی ہے جس کو وہ کسی نیک مقصد کے لیے دے سکتا ہے۔ میں امید کرتا ہوں اور میں دعا کرتا ہوں کہ میری نیکی میرے اس اقدام کی تصدیق کرے گی۔ میں آپ سب سے اپیل کرتا ہوں کہ آپ اپنی برکتوں سے مجھے مالا مال کریں اور میرے لیے اور میرے ساتھ دعا کریں۔

میرا برت منگل کے دن پہلے کھانے کے بعد سے شروع ہوگا، اس کی مدت غیر محدود ہے، دوران برت میں میں پانی نمک ملا ہوا یا بغیر نمک کا یا لیموں کا پانی وغیرہ پیتا رہوں گا، میں اس برت کو اس وقت ختم کروں گا جب مجھے اس کا یقین ہو جائے گا کہ تمام فرقوں کے دلوں میں اتحاد پیدا ہو گیا۔ لیکن یہ اتحاد کسی بیرونی اثر کے ماتحت نہیں، بلکہ اپنے ذاتی جذبے کے ماتحت ہونا چاہیے۔

اس کا انعام یہ ہوگا کہ ہندوستان اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کرلے گا اور اس طرح ہندوستان ایشیا پر اپنی سیادت از سرِ نو قایم کر سکے گا جس کو وہ اس وقت تیزی سے ضایع کر رہا ہے اور اس طرح اس کو تمام دنیا پر سیادت حاصل ہو سکے گی۔ مجھے اس کا یقین ہے کہ اگر ہندوستان کی حیثیت سے ختم ہو گیا تو مصیبت زدہ اور بھوکی دنیا بھی ختم ہو جائے گی۔ میرے کسی دوست یا دشمن کو (اگر چہ کوئی ہو) مجھ سے ناراض ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسے لوگ موجود ہیں جو برت کے ذریعے انسانوں کے دل و دماغ کو بدل دینے کے طریقے پر اعتقاد نہیں رکھتے لیکن مجھے امید ہے کہ عمل کی وہی آزادی جو وہ اپنے لیے طلب کرتے ہیں مجھے بھی عطا کریں گے۔

خدا میرا سب سے بڑا مشیر ہے اور یہ میں نے محسوس کرلیا ہے کہ مجھے سوائے خدا کے اور کسی دوسرے کے مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر میں نے کوئی غلطی کی ہے اور مجھ کو اس کا احساس ہو گیا تو میں بانگ دہل اپنی غلطی کا اعتراف کروں گا اور اپنے غلط قدم کی اصلاح میں کوئی پس و پیش نہیں کروں گا۔ لیکن فی الحال کوئی ایسی توقع نہیں ہے کہ میں یہ محسوس کروں کہ میں نے کوئی غلطی کی ہے۔ کیوں کہ میں اس اقدام کو ایمان داری سے کوئی غلطی ہی محسوس

نہیں کرتا۔ میں عقلی اور نقلی دلایل کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ اگر تمام ہندوستان اس برت سے متاثر ہو یا کم از کم دہلی پر ہی اس کا مناسب اثر مرتب ہو۔ تو میں برت ختم کر دوں گا۔

لیکن مجھے اس وقت اس سے بحث نہیں ہے کہ برت جلد ختم ہو گا یا دیر میں یا کبھی ختم ہی نہیں ہوگا۔ البتہ ضرورت اس امر کی ہے کہ موجودہ نازک صورتِ حال کا انسداد ہو، اس میں کسی اور رعایت کی ضرورت نہیں ہے۔

میرے گذشتہ برتوں پر یہ تنقید کی گئی ہے کہ برت رکھنے سے میرا مقصد ایک قسم کا جبر کرنا ہوتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا تھا کہ اگر میں برت رکھ کر مجبور نہ کر دیتا تو عوام کا فیصلہ یقیناً میرے خلاف ہوتا۔ لیکن جب کہ مقصد شریفانہ ہو تو مخالفانہ فیصلے کی کوئی قیمت باقی نہیں رہتی۔ ایک سچا برت فرض کی طرح خود ہی اپنا انعام ہے۔ میں یہ برت ان نتایج کے لیے نہیں رکھ رہا جو یہ پیدا کر سکتا ہے بلکہ میں یہ برت اس لیے رکھتا ہوں کہ مجھے ایسا کرنا ہی چاہیے۔ اس لیے میں ہر شخص سے یہ مطالبہ کرتا ہوں کہ وہ میرے مقصد کو صحیح طور پر جانچنے کی کوشش کرے اور اگر مجھے مرنا ہے تو امن و شانتی سے مرنے دے۔ موت میرے لیے ایک شان دار نجات ثابت ہوگی، کیوں کہ ہندوستان میں ہندو ازم سکھ ازم اور اسلام کی تباہی دیکھنے کے بجائے مر جانا پسند کرتا ہوں۔

اگر پاکستان بلا لحاظ مذہب و ملت جان و مال کی حفاظت نہیں کرتا اور مساوی درجہ عطا نہیں کرتا اور اگر ہندوستان پاکستان کی نقل کرتا ہے تو تباہی یقینی ہے۔ اسلام ہندوستان میں فنا ہو جائے گا، دنیا میں نہیں۔ البتہ ہندو ازم اور سکھ ازم جو ہندوستان کے علاوہ کہیں اور ہیں ہی نہیں وہ بالکل ہی فنا ہو جائیں گے۔

جو لوگ میرے ساتھ اختلاف رکھتے ہیں ان کی تعریف کرتا ہوں کہ وہ میرے ساتھ اختلاف رکھتے ہیں اور میرے فیصلوں کی مزاحمت کرتے ہیں۔ مجھے برت رکھ کر اپنے ضمیر کو جلا دینے کی اجازت دی جائے تا کہ وہ مُردہ نہ ہو جائے۔

اس تباہی پر غور کیجیے جس کا سامنا اس وقت ہندوستان کو کرنا پڑ رہا ہے۔

آپ محسوس کریں گے کہ کم از کم ہندوستان کا ایک فرزند ایسا ہے جو اتنا طاقت ور اور مخلص ہے کہ وہ اپنے وطن کی خاطر ایسا اقدام بھی کر سکتا ہے، اگر وہ طاقت ور اور مخلص نہیں ہے تو وہ پھر زمین پر ایک بوجھ ہے اور جس قدر جلد وہ فنا ہو جائے، اتنا ہی اچھا ہے۔ اس کی فنا ہندوستان کے لیے ہی نہیں بلکہ دوسروں کے لیے بھی اچھی ثابت ہوگی۔

میں اپنے دوستوں سے درخواست کروں گا کہ وہ میرے پاس نہ آئیں، نہ مجھے اپنے فیصلے سے باز رکھنے کی کوشش کریں، نہ میرے لیے متفکر ہوں۔ کیوں کہ میری زندگی خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے بجائے انھیں اپنے اندر روشنی کی تلاش کرنا چاہیے۔ کیوں کہ موجودہ وقت ہمارے لیے امتحان کی گھڑی ہے۔ جو لوگ اپنے فرض کو سمجھتے ہیں اور اس کو محنت سے اچھی طرح انجام دیتے ہیں وہ میری اس شریفانہ مقصد میں زیادہ امداد کر سکتے ہیں۔ برت رکھنا تزکیہ نفس کا ایک طریقہ ہے۔"

اس کے بعد آپ نے کانگریس کے کارکنوں کو چند نصیحتیں فرمائیں اور کانگریسی کارکنوں کی اخلاقی پستی کے متعلق جو شکایتیں موصول ہوئی تھیں، اس پر تنبیہ فرمائی۔

(علماے حق اور.............: جلد۲،ص ۷۰۰-۶۹۳)

حاشیہ ❶: چوں کہ پیر کے روز گاندھی جی خاموشی کا برت رکھا کرتے تھے، لہٰذا اس روز تقریر کا کام تحریر سے لیا کرتے تھے۔

حاشیہ ❷: حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب حضرت مولانا احمد سعید صاحب اور ان کے رفقا مراد ہیں۔

۱۳ر جنوری ۱۹۴۸ء: ۱۳ر جنوری کو ہمدرد دواخانہ کے قریب ایک پنجابی نوجوان نے چند مسلمانوں پر، جو ایک دکان (بھارت پینٹنگ ہاؤس) میں بیٹھے ہوئے تھے، ریوالور سے چھ فایر کردیے، تین مسلمان شہید اور ایک مجروح ہو گئے۔ اسی قسم کا ایک واقعہ اس سے دو ایک روز پہلے اسی مقام پر ہو چکا تھا۔

مال چھین لینے، دکانوں کے تالے توڑ دینے وغیرہ کے واقعات روزمرہ کی عادت ہو گئے تھے۔ ان واقعات کے تسلسل نے رہنمایانِ جمعیت علماے ہند کو مجبور کیا کہ وہ ذمہ

داران حکومت سے فیصلہ کن بات چیت کریں کہ اگر نظم ونسق کی یہی صورت ہے تو دہلی کے باقی ماندہ مسلمانوں کو اجازت دی جائے کہ وہ کسی امن کی جگہ چلے جائیں۔ ذمہ داران جمعیت علما کی ملاقات ان واقعات کے سلسلے میں گاندھی جی سے روزانہ ہوتی رہتی تھی۔ ایک روز حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے اپنے رفقا کی ترجمانی کرتے ہوئے مہاتما گاندھی سے اظہار خیال کیا۔ (علماے حق اور............: حصہ دوم، ص ۶۹۲)

گاندھی جی کا برت اور مآل کار:

گاندھی جی میں انسانی ہمدردی کا جو ہر ان کی سیرت کی بہت بڑی خوبی تھی، وہ اس کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتے تھے۔ ان کا قتل ان کی سیرت کی اس خوبی کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ ان کا قتل مسلمانوں سے ان کی محبت ہی کا نتیجہ ہے۔ اگر وقت کے مظالم کا نشانہ مسلمانوں کے بجائے کوئی اور جماعت یا ملت ہوتی تب بھی وہ اس کے لیے اسی طرح اپنی جان کی بازی لگا دیتے۔ لیکن ان کے عشق کے آتش نمرود میں کود پڑنے کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ جب کلکتہ کی سڑکوں پر، بہار کے قصبات اور بستیوں اور دہلی کے کوچہ و بازار میں یا نواکھالی و پٹرا میں اور خواہ مغربی خواہ مشرقی پنجاب میں خواہ ایبٹ آباد و ہزارہ کی گلیوں اور نالیوں میں انسانی خون بہہ رہا تھا تو یہ صرف انسانوں اور ان کے ہم وطنوں ہی کا خون نہ تھا بلکہ ان کے بھارت ورش کی عزت و آبرو تھی جو روز بازار عالم میں رسوا ہو رہی تھی اور گاندھی جی اپنے ہم وطنوں کے خون کو نہ بہتے دیکھ سکتے تھے اور نہ اپنے وطن کی عزت کو رسوا ہوتے برداشت کر سکتے تھے۔ اسی دوران اگرچہ انھوں نے اپنے وطن کی تقسیم کو دل پر پتھر رکھ کر برداشت کرلیا لیکن اب اس سے زیادہ دیکھنے اور برداشت کرنے سے ان کی ہمت نے جواب دے دیا تھا۔ اب حالات کی درستی، انسانی خون کو بہنے سے روکنے اور وطن کی عزت و آبرو کو لٹنے سے بچانے کے لیے انھوں نے اپنی جان کی بازی لگا دی تھی۔ اس کے بعد بھی ان کی روح کی پکار شاید یہی تھی کہ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا!

ہندوستان کی سرزمین پر انسانی خون کو بہنے سے بچانے کے لیے کلکتہ، نواکھالی، بہار وغیرہ میں فسادات کو روکنے اور ان کے خلاف بند باندھنے میں ان کے دل کی بے چینیوں کا اندازہ سیاسی ڈائری کی اس جلد کے مختلف صفحات میں قارئین نے ملاحظہ فرمایا، لیکن

کربلائے دہلی میں دشمنانِ قوم و وطن کی خون آشامیوں کا تذکرہ اور مظلومین وقت کی یاد میں صف ماتم بچھانا ابھی باقی ہے۔ یہ تذکرہ اگرچہ مختلف زبانوں سے مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے لیکن میں یہ قلم وقت کے کسی مجلس طراز ذاکر یا داستان طراز کے ہاتھ دینے کے بجائے تاریخ کے مبصر اور مشاہد و مورخ کے ہاتھ میں دیتا ہوں۔ شاید ان سے زیادہ اس تاریخ کو لکھنے کا اہل کوئی اور ہے بھی نہیں! یہ مولانا ابوالکلام آزاد کا قلم ہے اور ان کی ''انڈیا ونس فریڈم'' سے ماخوذ ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

> ''گاندھی جی نے کہا کہ وہ دلّی کے مسلمانوں کو اپنی آنکھوں سے قتل ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں اور یہ سب کچھ اس وقت ہو رہا ہے جب خود ان کے ولبھ بھائی حکومتِ ہند کے وزیرِ داخلہ ہیں اور دارالحکومت میں امن و امان قایم رکھنے کے ذمہ دار ہیں۔ سردار پٹیل صرف مسلمانوں کی حفاظت کرنے میں قاصر نہیں رہے ہیں، بلکہ اس بارے میں ان سے جو شکایتیں کی جاتی ہیں، انھیں بے پروائی کے ساتھ ناقابل شنوائی ٹھیرا دیتے ہیں۔ گاندھی جی نے کہا کہ اب ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ اس وقت تک برت رکھیں جب تک کہ حالت بالکل سدھر نہ جائے۔''

چناں چہ ۱۲ر جنوری ۱۹۴۸ء سے ان کا برت شروع ہو گیا۔ ایک لحاظ سے گاندھی جی کا برت سردار پٹیل کے رویے کے خلاف ایک احتجاج تھا۔ سردار پٹیل خود بھی یہی سمجھتے تھے۔

مسٹر پٹیل کا رویہ:

ہم نے ہر ممکن کوشش کی کہ گاندھی جی کو برت رکھنے سے باز رکھا جائے۔ برت کی پہلی شام کو میں، جواہر لال اور سردار پٹیل گاندھی جی کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اگلے روز صبح سردار پٹیل بمبئی جانے والے تھے۔ انھوں نے گاندھی جی سے سرکاری انداز میں گفتگو کرتے ہوئے شکایت کی کہ وہ کسی معقول وجہ کے بغیر برت رکھ رہے ہیں، دراصل اس وقت برت رکھنے کا مناسب موقع اور محل نہیں ہے۔ ان کے برت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حکومت ہند اور خصوصاً وزیرِ داخلہ پر الزامات لگائے جائیں گے۔ انھوں نے کچھ تلخی کے ساتھ کہا کہ گاندھی جی کا طرزِ عمل کچھ ایسا ہے گویا وہ انھیں مسلمانوں کے قتل کا ذمہ دار سمجھتے ہیں۔

گاندھی جی نے حسب معمول اپنے پرسکون انداز میں جواب دیا:

''میں چین میں نہیں، دلّی میں ہوں۔ میری آنکھیں اور میرے کان ابھی سلامت ہیں۔ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ میں اپنی آنکھوں اور اپنے کانوں پر اعتبار نہ کروں اور مجھ سے کہو کہ دلّی کے مسلمانوں کو شکایت کی کوئی وجہ نہیں ہے تو نہ میں تم کو قایل کر سکتا ہوں اور نہ تم مجھے۔ ہندو اور سکھ میرے بھائی ہیں، وہ میرے جسم کا حصہ ہیں۔ اگر اس وقت وہ طیش کی وجہ سے اندھے ہو گئے ہیں تو میں ان پر الزام نہیں لگاؤں گا۔ لیکن خود مجھے تکلیف اٹھا کر کفارہ ادا کرنا چاہیے۔ مجھے امید ہے کہ میرے برت سے ہندوؤں اور سکھوں کی آنکھیں کھل جائیں گی اور وہ حقیقت کو دیکھ سکیں گے۔''

سردار پٹیل گاندھی جی کے اس جواب سے بہت جز بز ہوئے اور انھوں نے گاندھی جی سے سختی سے بات کی۔ جواہر لال کو اور مجھے ان کے اس رویے سے دکھ ہوا اور حیرت بھی ہوئی، ہم خاموش نہیں رہ سکے۔ میں نے ان کے اس رویے پر احتجاج کیا اور کہا ''ولبھ بھائی ممکن ہے آپ محسوس نہ کرتے ہوں، لیکن میں شدت سے محسوس کرتا ہوں کہ آپ کا رویہ کتنا توہین آمیز ہے اور آپ گاندھی جی کو کتنی تکلیف پہنچا رہے ہیں۔''

مسٹر پٹیل کا غصہ:

یہ سن کر سردار پٹیل ایک لفظ نہیں بولے اور جانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ میں نے انھیں روکا اور کہا کہ انھیں اپنا پروگرام ملتوی کر کے دلّی میں رہنا چاہیے، کیوں کہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ واقعات کیا کروٹ لیں گے۔ انھیں ایسے موقع پر نہیں جانا چاہیے، جب گاندھی جی برت رکھ رہے تھے۔

سردار پٹیل نے تقریباً چیخ کر جواب دیا:

''میرے ٹھیرنے سے کیا حاصل ہوگا؟ گاندھی جی میری بات نہیں سننا چاہتے، وہ تو دنیا میں ہندوؤں کا منہ کالا کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اگر ان کا رویہ ایسا ہے تو وہ میرے کام کے نہیں ہیں۔ میں پروگرام نہیں بدل سکتا، مجھے بمبئی جانا ہے۔''

مجھے ان کے الفاظ سے زیادہ ان کے لہجے سے صدمہ ہوا۔ میں نے سوچا کا گاندھی جی پر اس کا کیا اثر ہوا ہوگا۔ ہم نے سوچا کہ سردار پٹیل سے اور کچھ کہنا فضول ہے اور وہ چلے گئے۔

سردار پٹیل نے گاندھی جی کی طرف سے اپنا دل سخت کر لیا تھا لیکن دلّی کے لوگوں نے نہیں کیا تھا۔ اس خبر کے پھیلتے ہی کہ گاندھی جی نے برت شروع کر دیا ہے، نہ صرف دلّی شہر میں بلکہ سارے ہندوستان میں ہل چل مچ گئی۔ دلّی پر تو بالکل بجلی کا سا اثر ہوا، بہت سے گروپ جنھوں نے اب تک گاندھی جی کی مخالفت کی تھی، اب سامنے آئے اور کہا کہ گاندھی جی کی بیش بہا زندگی بچانے کے لیے وہ سب کچھ کرنا پر تیار ہیں۔

برت توڑنے کے لیے گاندھی جی کی شرائط:

طرح طرح کے لوگ گاندھی جی کے پاس آئے اور انھیں یقین دلایا کہ وہ سب دلّی میں امن قایم کرنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن گاندھی جی پر ان کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ دو دن اضطراری دوڑ دھوپ اور مشورے میں گزر گئے۔ تیسرے روز ایک جلسے کا انتظام اس مقصد سے ہوا کہ صورتِ حال پر غور کیا جائے اور گاندھی جی کو برت توڑنے پر آمادہ کیا جائے۔

جلسے میں جاتے ہوئے میں گاندھی جی کے پاس گیا، میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ اپنے برت کو توڑنے کی شرطیں بتا دیں۔ پھر ہم انھیں لوگوں کے سامنے پیش کریں گے اور کہیں گے کہ گاندھی جی ان معاملوں کے بارے میں مطمئن ہو گئے تو اپنا برت توڑ دیں گے۔

گاندھی جی نے کہا:

> ''ہاں! یہ کام کی بات ہے۔ میری پہلی شرط یہ ہے کہ ان سارے مسلمانوں کو جو ہندوؤں اور سکھوں کے حملوں کی وجہ سے دلّی چھوڑنے پر مجبور ہوئے ہیں، واپس آنے کی دعوت دی جائے اور انھیں خود انھی کے مکانوں میں پھر سے آباد کیا جائے۔''

یہ انتہائی شایستگی اور شرافت کی بات تھی، لیکن میں جانتا تھا کہ اس پر عمل کرنا ممکن

نہیں ہے۔ تقسیم نے پنجاب کے دونوں حصوں کی زندگی تہہ و بالا کردی تھی۔ مغربی پنجاب سے لاکھوں پناہ گزین ہندوستان آچکے تھے اور لاکھوں مشرقی پنجاب سے پاکستان جاچکے تھے۔ ہزاروں مسلمان دلی چھوڑ چکے تھے اور بہت سے پناہ گزین جو مغربی پنجاب سے آئے تھے۔ ان کے خالی مکانوں میں آباد ہوگئے تھے۔ اگر صرف سیکڑوں کی بات ہوتی تو گاندھی جی کی خواہش پوری بھی کی جاسکتی لیکن یہاں مسئلہ لاکھوں آدمیوں کا تھا، ایسی صورت میں گاندھی جی کی شرائط کو پورا کرنے کی کوشش سے نئے مسئلے کھڑے ہوجاتے۔ ہندو اور سکھ مغربی پاکستان سے آئے تھے اور ایک مرتبہ اجاڑے جاچکے تھے، اور اب انھوں نے دہلی میں رہنے کی کوئی صورت نکال لی تھی۔ ان لوگوں سے مکانات خالی کرنے کو کہا بھی جاتا تو یہ جاتے کہاں؟ پھر وہ مسلمان جو دلّی سے گئے تھے، پاکستان میں منتشر ہو چکے تھے۔ اب انھیں کیسے واپس لایا جاسکتا تھا۔ غرضے کہ موجودہ صورت میں نہ مسلمانوں کو بلانا ممکن تھا اور نہ ہندوؤں اور سکھوں سے ان مکانات کو خالی کرانا جن میں وہ آباد ہو چکے تھے۔ مسلمانوں کو اس طرح آباد کرنے کی کوشش کا مطلب یہ ہوتا کہ جن مکانوں سے مسلمانوں کو ایک بار نکال کر بے گھر کیا گیا تھا، اب ان سے ہندوؤں اور سکھوں کو نکال کر بے گھر کیا جاتا۔

میں نے گاندھی جی کا ہاتھ پکڑ کر ان سے التجا کی کہ یہ شرط نہ رکھیں، میں نے کہا کہ اول تو یہ بات ناقابل عمل ہے اور دوسرے ہندو اور سکھ پناہ گزینوں سے یہ مطالبہ کرنا نہ تو ممکن تھا اور نہ اخلاقاً حق بہ جانب! کہ جن مکانوں میں وہ آباد ہو چکے تھے (اور ان کے مالکان ترکِ وطن کر کے پاکستان جاچکے تھے) انھیں خالی کر کے وہ مارے مارے پھریں۔ میں نے گاندھی جی سے درخواست کی کہ وہ اس شرط پر اصرار نہ کریں بلکہ وہ یہ شرط رکھیں کہ دلّی میں کشت و خون اور غارت گری فوراً بند ہو، وہ یہ مطالبہ بھی کر سکتے تھے کہ جو مسلمان اب بھی ہندوستان میں ہیں انھیں عزت کے ساتھ زندگی بسر کرنے دی جائے اور تمام فرقوں کے درمیان دوستانہ تعلقات دوبارہ قایم ہوجائیں۔ گاندھی جی پہلے تو راضی نہیں ہوئے، اپنی شرط پر اڑے رہے، لیکن آخر کار وہ میرے اصرار پر کچھ نرم پڑے اور مجھ سے کہا کہ اگر میں خود ان شرطوں سے مطمئن ہوں جو میں نے تجویز کی ہیں، تو وہ بھی انھیں مان لیں گے۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے میرے خیالات کا اتنا لحاظ کیا اور ساتھ ہی ان سے یہ بھی التجا کی کہ وہ میری تجویزوں کو قبول کرلیں۔

گاندھی جی نے تجویز کیا کہ مسلمانوں کی زیارت گاہیں اور مسجدیں جنھیں نقصان پہنچا ہے یا جن کی توہین کی گئی ہے، وہ انھیں واپس کی جائیں اور ان کی مرمت کی جائے، ان عمارتوں پر غیر مسلموں کا قبضہ مسلمانوں کے لیے رنج اور خوف کا باعث تھا۔ گاندھی جی اس بات کی بھی ضمانت چاہتے تھے کہ اب پھر کسی فرقے کی عبادت گاہ پر حملے نہیں ہوں گے۔
اس کے بعد گاندھی جی نے برت توڑنے کی شرطیں لکھوائیں، وہ یہ تھیں:

(۱) ہندو اور سکھ مسلمانوں پر حملے کرنا فوراً بند کریں اور انھیں یقین دلائیں کہ آیندہ وہ سب بھائیوں کی طرح ساتھ رہیں گے۔

(۲) ہندو اور سکھ ہر طرح اس بات کی کوشش کریں کہ ایک مسلمان بھی جان و مال کے ڈر سے ہندوستان نہ چھوڑے۔

(۳) چلتی گاڑیوں میں مسلمانوں پر جو حملے کیے جارہے ہیں، وہ فوراً بند کیے جائیں اور ان ہندوؤں اور سکھوں کو جو اس طرح کے حملوں میں شرکت کررہے ہیں، روکا جائے۔

(۴) جو مسلمان نظام الدین اولیاؒ، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور ناصر الدین چراغ دہلی جیسی درگاہوں کے آس پاس رہتے تھے اور مصیبت کی وجہ سے اپنے مکانات چھوڑ کر اِدھر اُدھر چلے گئے ہیں، انھیں واپس لاکر ان کے مکانوں میں پھر آباد کیا جائے۔

(۵) خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی درگاہ کو جو نقصان پہنچا تھا، حکومت اس کی مرمت کراسکتی تھی، لیکن گاندھی جی کو اصرار تھا کہ ہندو سکھ اس کی مرمت اپنے گناہ کا کفارہ سمجھ کر خود کرائیں۔

سب سے اہم ضرورت تالیف قلوب کی تھی۔ دوسری شرائط کا پورا ہونا اتنا اہم نہیں تھا، جتنا اس شرط کا۔ اس لیے ہندو اور سکھ جماعتوں کے لیڈروں کو گاندھی جی کو اس بارے میں پورے طور پر مطمئن کرنا چاہیے تاکہ انھیں ایسے کسی مسئلے کی وجہ سے دوبارہ برت نہ رکھنا پڑے۔ گاندھی جی نے کہا کہ "میں چاہتا ہوں کہ یہ میرا آخری برت ہو۔"

میں نے انھیں یقین دلایا کہ یہ ساری شرطیں پوری ہوسکتی ہیں۔ میں دو بجے جلسے میں پہنچا اور گاندھی جی کی شرطیں حاضرین کے سامنے رکھ دیں۔ میں نے کہا کہ ہم گاندھی جی کو مطمئن کرنے اور ان سے التجا کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں کہ وہ اپنا برت توڑ دیں۔ میں نے یہ بھی کہا کہ صرف قرارداد منظور کرنے کا گاندھی جی پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ دلی کے لوگ اگر

واقعی گاندھی جی کی جان بچانا چاہتے ہیں تو جو شرطیں انھوں نے رکھی ہیں ان کو پورا کرنا ہوگا۔ میں نے کہا میں یہ معلوم کرنے آیا ہوں کہ دلّی کے لوگ گاندھی جی کی شرطوں کو پورا کرنے کا وعدہ کریں گے یا نہیں؟

اس جلسے میں تقریباً پچاس ہزار آدمی تھے۔ ان سب نے ایک آواز ہو کر نعرہ لگایا کہ

''ہم سب گاندھی جی کی خواہش کو حرف بہ حرف پورا کریں گے، ہم اپنے دل اور اپنی جان کی بازی لگا دیں گے اور کوئی ایسی بات نہیں کریں گے۔ جس سے گاندھی جی کو دکھ پہنچے۔''

ابھی میری تقریر جاری تھی کہ کچھ لوگوں نے شرطوں کی نقل کرنا اور حاضرین کے دستخط لینا شروع کر دیا۔ جلسہ ختم ہونے سے قبل شرائط نامہ پر ہزاروں آدمیوں کے دستخط ہو چکے تھے۔ اِدھر دلّی کے ڈپٹی کمشنر نے کچھ ہندوؤں اور سکھوں کو اپنے ساتھ لیا اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی درگاہ کی مرمت کے لیے چل دیے۔ ساتھ ہی دلّی کی کئی سوسائیٹیوں نے برسرِ عام یہ عہد کیا کہ اپنے اپنے حلقوں میں گاندھی جی کی شرطوں کو پورا کرنے کی کوشش کریں گی۔ انھوں نے اعلان کیا وہ سب ان باتوں کو عمل میں لانے کی ذمہ داری لیتی ہیں۔ شام ہوتے ہوتے میرے پاس دلّی کے ہر علاقے سے، ہر گروہ اور جماعت کے وفد آئے اور مجھے یقین دلایا کہ ان سب کو گاندھی جی کی شرطیں منظور ہیں۔ انھوں نے اصرار کیا کہ میں گاندھی جی سے برت توڑنے کی درخواست کروں۔

دوسرے روز صبح میں نے دلّی کے نمائندہ لیڈروں کا ایک جلسہ کیا۔ ہم نے طے کیا کہ یہ سب خود برلا ہاؤس جا کر گاندھی جی کو شخصی طور پر اطمینان دلائیں۔ میں گاندھی جی کے پاس دس بجے پہنچا اور ان سے کہا کہ اب مجھے پورا اطمینان ہے کہ ان کا مقصد حاصل ہو گیا ہے۔ ان کے برت نے ہزاروں لوگوں کے دل پھیر دیے ہیں اور ان میں انصاف اور انسانیت کا جذبہ پھر سے پیدا کر دیا ہے۔ ہزاروں آدمیوں نے یہ عہد کیا ہے کہ فرقوں کے درمیان خوش گوار تعلقات پیدا کرنا ان کا اولین مقصد ہوگا۔ میں نے گاندھی جی سے استدعا کی وہ ان یقین دہانیوں پر اعتبار کریں اور اپنا برت توڑ دیں۔

گاندھی جی بہ ظاہر بہت خوش ہوئے، لیکن انھوں نے میری التجا قبول نہیں کی۔ سارا دن بحث مباحثے اور منت ساجت میں گزر گیا۔ ان کا وزن کافی گھٹ گیا تھا اور وہ اٹھ کر بیٹھ

نہیں سکتے تھے۔ برلا ہاؤس میں اپنے بستر پر سیدھے لیٹے ہوئے تھے اور جو وفد آتے ان کی باتیں سن کر یہ جانچنے کی کوشش کرتے کہ ان کے جذبے میں واقعی کتنی تبدیلی ہوئی ہے۔ آخر میں انھوں نے کہا کہ وہ دوسرے روز صبح کو جواب دیں گے۔

شرطیں پوری کرنے کا عہد:

دوسرے روز صبح ہم سب ان کے کمرے میں جمع ہوئے۔ جواہر لال وہاں پہلے سے موجود تھے۔ اور لوگوں کے علاوہ پاکستان کے ہائی کمشنر زاہد حسین بھی تھے، جنھوں نے گاندھی جی سے ملنے کی اجازت چاہی تھی۔ گاندھی جی نے انھیں بلا لیا اور وہ بھی ہم لوگوں کے ساتھ اس مجمع میں شامل ہو گئے، جس میں سردار پٹیل کے علاوہ کیبنٹ کے سارے ممبر موجود تھے۔ گاندھی جی نے اشارے سے کہا کہ جو لوگ اپنے عہد کا اعادہ کرنا چاہیں وہ کریں۔ دلّی کے تقریباً پچیس لیڈر جن میں ہر سیاسی خیال کے لوگ تھے، ایک ایک کر کے ان کے پاس آئے اور عہد کیا کہ وہ ایمان داری سے گاندھی جی کی شرطیں پوری کریں گے۔ اس کے بعد گاندھی جی کے اشارے پر ان کے حلقے کی عورتوں نے رام دھن شروع کی، ان کی پرپوتی ایک گلاس میں سنگترے کا رس لائی۔ گاندھی جی نے اشارہ کیا کہ وہ گلاس مجھے دے دے۔ میں نے گلاس لے کر گاندھی جی کے ہونٹوں سے لگایا اور انھوں نے برت توڑ دیا۔

مسٹر آرتھر مور کا برت:

گاندھی جی کا برت شروع ہونے کے بعد اسٹیٹس مین کے سابق ایڈیٹر مسٹر آرتھر مور نے بھی امپیریل ہوٹل میں برت شروع کر دیا تھا۔ ہندو مسلم فسادات کا ان کے دل پر بہت اثر ہوا تھا۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ اگر فسادات ختم نہ ہوئے تو وہ بھی مرن برت رکھیں گے۔ وہ برسوں سے ہندوستان میں تھے اور اس کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ ایک ہندوستانی کی حیثیت سے وہ اس انسانی اذیت اور ذلت کو ختم کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان پر بہت مصیبت آئی ہے، اسے دیکھتے رہنے سے مر جانا بہتر ہے۔ اب میں نے ان کے پاس کہلا بھیجا کہ گاندھی جی نے برت توڑ دیا تھا اور انھیں بھی اپنا برت توڑ دینا چاہیے۔

بعد کے حالات:

برت توڑنے کے بعد بھی گاندھی جی کی طاقت کئی دن میں رفتہ رفتہ بحال ہوئی۔ سردار پٹیل بمبئی سے واپسی پر ان سے ملنے آئے، میں اس وقت گاندھی جی کے پاس موجود تھا۔ گاندھی جی کی عظمت کا بہترین مظاہرہ ایسے ہی موقعوں پر ہوتا تھا۔ وہ بہت شفقت اور محبت کے ساتھ سردار پٹیل سے ملے، ان کے چہرے پر اور ان کے انداز میں غصے اور شکایت کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ سردار پٹیل کچھ پریشان سے تھے اور ان کے انداز میں روکھا پن اور تکلف تھا، وہ گاندھی جی سے خوش نہیں تھے اور انھیں وہ باتیں پسند نہیں آئی تھیں جو گاندھی جی نے مسلمانوں کے دل سے خوف اور خطرے کا احساس دور کرنے کے لیے کی تھیں۔

گاندھی جی کے برت کے بارے میں یہ خیال رکھنے والے اکیلے سردار پٹیل ہی نہیں تھے، جس روز سے انھوں نے امن کی خاطر یہ تدبیریں اختیار کی تھیں، ہندوؤں کی ایک جماعت میں ان سے بغض پیدا ہو گیا تھا جو دن بہ دن بڑھتا رہا تھا۔ یہ لوگ کھلے بندوں گاندھی جی کی مذمت یہ کہہ کر کرتے تھے کہ انھوں نے ہندوؤں کے جائز حقوق قربان کر دیے ہیں۔ یہ کوئی راز کی بات نہیں تھی، اسے سارا ملک جانتا تھا۔ ہندو مہا سبھا اور راشٹریہ سویم سنگھ کی قیادت میں ہندوؤں کا ایک طبقہ آزادی کے ساتھ یہ کہتا پھرتا تھا کہ گاندھی جی ہندوؤں کے خلاف مسلمانوں کی مدد کر رہے ہیں۔ انھوں نے گاندھی جی کی پرارتھنا سبھا کی بھی مخالفت شروع کر دی تھی، کیوں کہ اس میں ہندو شاستروں کے اشلوکوں کے ساتھ، قرآن اور انجیل کی آیتیں بھی پڑھی جاتی تھیں۔ کچھ لوگوں نے تو ان پرارتھنا سبھاؤں کے خلاف باقاعدہ ایجی ٹیشن شروع کر دیا تھا اور کہتے تھے کہ وہ قرآن اور انجیل کی آیتیں نہیں پڑھنے دیں گے۔ اس مقصد سے پمفلٹ اور ہینڈ بل شایع اور تقسیم کیے گئے۔ گاندھی جی کو ہندوؤں کا دشمن ٹھیرا کر لوگوں کو ان کے خلاف اُکسایا گیا۔ ایک پمفلٹ میں تو یہ تک کہہ دیا گیا کہ اگر گاندھی جی نے اپنا طور طریق نہ بدلا تو انھیں بے اثر کر دینے کی تدبیریں کی جائیں گی۔

گاندھی جی کے برت نے اس جماعت کو اور بھی برانگیختہ کر دیا اور اس نے ان کے خلاف عملی قدم اٹھانے کی ٹھان لی۔ جوں ہی انھوں نے اپنی پرارتھنا سبھاؤں کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا ان پر ایک بم پھینکا گیا۔ خوش قسمتی سے کوئی زخمی نہیں ہوا۔ لیکن اس خیال سے

سارے ملک کو شدید صدمہ پہنچا کہ کوئی شخص گاندھی جی پر ہاتھ اٹھا سکتا تھا۔ پولیس نے تفتیش شروع کی، لیکن تعجب ہے کہ نہ اس کا سراغ ملا کہ بم کس نے چھپا کر رکھا، نہ اس کا کہ بم رکھنے والے برلا ہاؤس کے باغ میں داخل کیسے ہوئے؟ یہ اور بھی تعجب کی بات تھی کہ اس واقعے کے بعد بھی گاندھی جی کی حفاظت کا معقول انتظام نہیں کیا گیا۔ اس واقعے سے کم از کم یہ بات تو واضح ہو ہی گئی تھی کہ ملک میں ایک ایسا گروہ ہے جو تعداد میں بہت کم سہی، مگر گاندھی جی کی جان لینے کی فکر میں ہے۔ ایسی صورت میں قدرتاً یہ امید کی جا سکتی تھی کہ دلی کو پولیس اور سی آئی ڈی گاندھی جی کی حفاظت کے لیے خاص احتیاطی تدابیر اختیار کرے گی۔ مگر مجھے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے لیے ہمیشہ یہ شرم اور رنج کی بات رہے گی کہ حالات کے اس علم کے باوجود معمولی احتیاطی تدابیر بھی اختیار نہیں کی گئیں۔

گاندھی جی کا حادثۂ قتل:

۳۰ر جنوری ۱۹۴۸ء: کچھ روز اور گزرے، گاندھی جی کی طاقت رفتہ رفتہ بحال ہوئی اور پرارتھنا کے بعد انھوں نے حاضرین سے خطاب کرنا شروع کر دیا۔ ان جلسوں میں ہزاروں آدمی شریک ہوتے تھے اور گاندھی جی کا خیال تھا کہ یہ جلسے ان کے پیغام کو عوام تک پہنچانے کا سب سے مؤثر ذریعہ ہیں۔

۳۰ر جنوری ۱۹۴۸ء کو ڈھائی بجے میں گاندھی جی سے ملنے گیا، ان سے کئی اہم مسایل پر گفتگو کرنی تھی اور میں ایک گھنٹے سے زیادہ ان کے پاس بیٹھا رہا، اس کے بعد میں واپس چلا آیا۔ مگر ساڑھے پانچ بجے کے قریب مجھ کو یاد آیا کہ کچھ ضروری باتوں کے بارے مین ان کی رائے لینا بھول گیا ہوں، چناں چہ میں پھر برلا ہاؤس گیا۔ وہاں پہنچ کر جب میں نے دروازے بند پائے تو مجھے بڑی حیرانی ہوئی، ہزاروں آدمی لان پر کھڑے تھے اور مجمع بڑھتے بڑھتے سڑک تک پہنچ چکا تھا، میں کچھ نہ سمجھ سکا کہ معاملہ کیا ہے؟ مجمع نے میری گاڑی دیکھ کر اندر جانے کا راستہ دے دیا۔ میں پھاٹک پر گاڑی سے اتر پڑا اور پیدل اندر گیا، مکان کے سارے دروازے بند تھے۔ کھڑکی کے شیشے سے کسی نے مجھ کو دیکھ لیا اور مجھے اندر لے جانے کے لیے آیا۔ میں اندر داخل ہوا تو کسی نے روتے ہوئے مجھ سے کہا کہ گاندھی جی کو گولی مار دی گئی ہے اور وہ بے ہوش پڑے ہیں۔

یہ خبر ایسی اچانک ملی اور اس سے دل پر ایسی چوٹ لگی کہ کچھ دیر میں سمجھ نہ سکا کہ کیا کہا جا رہا ہے۔ میرا سر چکرا رہا تھا، میں لڑکھڑاتا ہوا گاندھی جی کے کمرے میں گیا وہ فرش پر لیٹے تھے ان کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا اور آنکھیں بند تھیں۔ ان کے دونوں پوتے ان کے پاؤں پکڑے بیٹھے رو رہے تھے۔ مجھے معلوم ہوا کہ جیسے خواب میں کوئی کہہ رہا ہے ''گاندھی جی مر گئے''۔

(انڈیا ونس فریڈم: ص ۲۲-۳۱۴)

جمعیت علمائے ہند کے رہنماؤں پر گاندھی جی کا اعتماد:

انہیں دنوں کا تذکرہ ہے کہ جب بابو راجندر پرشاد صاحب صدر کانگریس اور دوسرے ذمہ دار رہنما موجود تھے اور مہاتما گاندھی سے برت کھولنے کا اصرار کر رہے تھے تو آپ نے لیٹے لیٹے رخ پھیر کر فرمایا کہ جمعیت علما کے مولانا صاحبان کہاں ہے؟ جب تک وہ نہ کہیں گے میں برت نہ توڑوں گا۔ تب حضرت مولانا احمد سعید صاحب، حافظ نسیم صاحب، جعفری صاحب (ارکانِ جمعیت) کی طرف سے ترجمانی کرتے ہوئے حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے فرمایا! مہاتما جی! گو حالات ابھی پوری طرح درست نہیں ہوئے تاہم آپ کی اس عظیم الشان قربانی سے رو بہ اصلاح ہو چلے ہیں اور فسادی عنصر کے مقابلے میں صلح پسند عناصر ابھر آئے ہیں اور غلبہ پا رہے ہیں، لہٰذا اب آپ برت کھول لیں، کیوں کہ آپ کی جان عزیز ہم سب کے لیے بہت قیمتی ہے۔ یہ سن کر مہاتما گاندھی نے فرمایا:

> ''میں آپ لوگوں کے بیان پر اعتماد کرتا ہوں، لیکن اگر بعد میں یہ ثابت ہوا کہ مجھ کو دھوکا دیا گیا تھا تو پھر میں مرن برت رکھ لوں گا اور پھر کسی کی نہ سنوں گا، میں یقین کرلوں گا کہ میں زمین پر ایک بار ہوں جس کو جلد ختم ہو جانا چاہیے۔''

پیس کمیٹی کا قیام اور امن واتحاد کا عہد نامہ:

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی تقریر اور شرایط کے اعلان کے بعد صدر کانگریس بابو راجندر پرشاد کی کوٹھی پر مختلف الخیال جماعتوں کے نمایندوں کا اہم اجلاس منعقد ہوا، اس میں کانگریس کی صوبائی اور مرکزی جماعتوں کے نمایندے، ہندو مہاسبھا، جمعیت علما، سکھوں اور

پناہ گزینوں کے ترجمان موجود تھے۔

دہلی کی مقامی حکومت کی جانب سے ڈپٹی کمشنر مسٹر رندھاوا موجود تھے۔ جلسہ میں بحث ومباحثے کے بعد ایک مسودہ بہ اتفاق رائے منظور کیا گیا، اس میں مہاتما جی کی ساتوں شرایط منظور کی گئیں۔

سرحد، بلوچستان، سندھ اور مغربی پنجاب کے پناگزینوں کے نمایندوں نے پرزور الفاظ میں یقین دلایا کہ وہ شرایط کے عمل درآمد میں اپنی جان کی بازی لگادی گے۔

مولانا حفظ الرحمن صاحب نے ایک مبسوط بیان کے دوران میں فرمایا کہ دہلی کے مسلمانوں کو اپنے پناہ گزین بھائیوں سے پوری ہمدردی ہے۔ چناں چہ مسلم نمایندوں نے اس سلسلے میں پوری جدوجہد کی اور ان ہی کی کوششوں اور تحریک سے پناہ گزینوں کے لیے انڈر پربت میلارڈ کی بارگوں اور پرانے قلعے میں رہنے کا انتظام کیا گیا۔

مسلمانوں نے حتی الوسع مسلم پناہ گزینوں سے پہلے اور زیادہ غیر مسلم پناہ گزینوں کی مدد کی کوشش کی۔

چناں چہ مسلمانوں نے ایک بڑی تعداد میں لحاف غیر مسلم پناہ گزینوں کے لیے گاندھی جی کو پیش کیے۔

سکھوں کے ایک کیمپ میں جو دیگیں وغیرہ استعمال کی جارہی ہیں ان میں سے نصف جمعیت علما نے اپنی طرف سے پیش کی ہیں۔

ہماری تو خواہش تھی کہ ہم پناہ گزینوں کے کیمپوں میں جا کر ان کی خدمت کا شرف حاصل کرتے اور ان کا غم اور درد مٹاتے، لیکن آج کل کی مسموم فضا میں ایسا ممکن نہ ہوا۔ ہم نے تیس برس تک اپنے برادرانِ وطن کے ساتھ مل کر آزادی کی جدوجہد کی ہے لیکن آج کی بے اعتمادی کی فضا میں یہ ممکن نہ رہا کہ ہم اپنے غیر مسلم پناہ گزین بھائیوں کے ساتھ مل کر بیٹھ سکیں۔

حضرت مولانا نے یقین دلایا کہ دہلی کے مسلمان اپنے غیر مسلم پناہ گزین بھائیوں کی مدد میں کسی سے پیچھے نہیں رہیں گے۔

بیانات اور تقریروں کے بعد عہد نامے کا مندرجۂ ذیل مسودہ پیش کیا گیا جس پر حاضرین نے دستخط کیے۔

راشٹریہ سیوک سنگھ اور پریس کے نمایندے اس وقت موجود نہ تھے ہندو مہا سبھا کے بھی صرف ایک ہی رکن موجود تھے۔ لہٰذا طے کیا گیا کہ صبح کو دس بجے ایک دوسرا اجتماع کیا جائے جس میں اخبارات کے ایڈیٹروں، راشٹریہ سیوک سنگھ اور ہندو مہاسبھا کے نمایندوں کو خاص طور پر دعوت دی جائے اور پھر اگر یہ سب اس عہد نامے کو تسلیم کر کے دستخط کر دیں تو فوراً مہاتما گاندھی کی خدمت میں حاضر ہو کر برت توڑ دینے کی درخواست پیش کی جائے۔

(علمائے حق اور......: جلد ۲، ص ۴-۱۰۷)

قیامِ امن کے مساعی میں کامیابی اور اس کی قیمت:

۱۹ر جنوری ۱۹۴۸ء اور مابعد: پروگرام کے مطابق ۱۹ر جنوری کو دس بجے صبح بابو راجندر پرشاد صاحب کی کوٹھی پر دوبارہ اجتماع ہوا اور باقی ماندہ جماعتوں کے نمایندوں نے بھی اس میں شرکت کی۔ شب گزشتہ کا عہد نامہ ان کے سامنے پڑھا گیا، جملہ حاضرین نے عہد نامے سے اتفاق کیا اور اس پر دستخط کر دیئے۔

عہد نامہ حسبِ ذیل تھا:

"ہم یہ اعلان کرنا چاہتے ہیں کہ یہ ہماری دلی خواہش ہے کہ ہندو، مسلمان اور سکھ اور دوسرے فرقوں کے لوگ پھر ایک بار دہلی میں بھائیوں کی طرح کامل آشتی سے رہیں۔ اور ہم عہد کرتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کی جان، مال، اور ایمان کی حفاظت کریں گے اور جو واقعات دہلی میں ہو چکے ہیں ان کو پھر نہ ہونے دیں گے۔

ہم گاندھی جی کو یقین دلاتے ہیں کہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار مبارک پر گزشتہ سالوں کی طرح اس سال بھی سالانہ عرس ہوگا۔

مسلمان سبزی منڈی، قرول باغ، پہاڑ گنج اور دوسرے علاقوں میں پہلے کی طرح چل پھر سکیں گے۔

مسلمانوں کی متروکہ مساجد جو اب ہندوؤں اور سکھوں کے قبضے میں ہیں واگذار کر دی جائیں گی۔ وہ علاقے جو مسلمانوں کے لیے مخصوص کیے جا چکے ہیں، ان پر بھی زبردستی قبضہ کرنے کی کوشش نہیں کی جائے گی۔

دہلی کے مسلمان جو یہاں سے ہجرت کر گئے ہیں اگر آنا چاہیں تو ہم معترض نہ ہوں گے۔ مسلمان پہلے کی طرح اپنا کاروبار جاری رکھ سکیں گے۔

ہم یقین دلاتے ہیں کہ ہم یہ سب کام اپنی ذاتی کوششوں سے کریں گے نہ کہ پولیس اور فوج کی مدد سے۔

ہم مہاتما جی سے درخواست کرتے ہین کہ وہ ہم پر بھروسا کرین اور برت توڑ دیں اور پہلے کی طرح ہماری قیادت کریں۔''

برت کشائی کا جلسہ:

جب تمام جماعتوں کے نمایندے نے عہد نامے پر دستخط کر چکے تو یہ سارا اجتماع برلا ہاؤس کی طرف روانہ ہوا، جہاں مہاتما گاندھی مقیم تھے اور اس وقت کابینہ کے وزرا پاکستان کے ہائی کمشنر اور پریس کے نمایندے اور فوٹو گرافر بھی پہنچ گئے تھے۔

صدر کانگریس بابو راجندر پرشاد نے دستخط کنندگان کی ترجمانی کرتے ہوئے عہد نامہ پڑھ کر سنایا اور اس بات کا اطمینان دلایا کہ عہد نامے پر دستخط کرنے والے بروقت حالات پر نظر رکھیں گے اور نہ صرف دہلی میں بلکہ پورے ہندوستان میں خوش گوار فضا پیدا کرنے کے ذمہ دار رہیں گے۔

گاندھی جی نے معاہدہ کرنے والوں کے عہد نامے کا جواب دیتے ہوئے نہایت دھیمی اور کم زور آواز میں ٹھیر ٹھیر کر فرمایا:

''عہد نامے پر راشٹریہ سیوک سنگھ اور ہندو مہا سبھا کے نمایندوں نے بھی دستخط کیے ہیں اور یہ نہیں ہوسکتا کہ دہلی کے علاوہ دوسرے حصوں کے امن سے ہم غیر متعلق ہو جائیں۔ آپ نے اس امر کو نہایت وضاحت سے پیش کیا کہ اگر ملک کے دوسرے حصوں میں فرقہ وارانہ فساد ہوا اور اقلیت کا فرقہ اپنے آپ کو محفوظ خیال نہ کر سکے تو ہم ان حالات اور واقعات سے غیر جانب دار نہیں رہ سکتے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان تمام واقعات کی ذمے داری ہم پر عاید ہوتی ہے جیسا کہ ہونا چاہیے۔

دہلی ہندوستان کا قلب ہے اور دہلی کے واقعات کا تمام ہندوستان پر اثر

پڑتا ہے۔ اگر ہم تمام ملک کے ہندو مسلمان اور سکھوں کو اس امر کا یقین نہیں دلا سکتے کہ وہ بھائی بھائی ہیں اور انھیں آپس میں میل جول اور اتحاد سے رہنا چاہیے تو ہماری تمام کوششیں بے کار ہیں اور ہندوستان کی تباہی یقینی ہے۔ اتنا کہنے کے بعد گاندھی جی خاموش ہو گئے، گاندھی جی نے جو کچھ فرمایا تھا اس کو بہ آواز بلند دہرایا گیا۔"

تھوڑی دیر خاموش رہ کر گاندھی جی نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے پھر فرمایا کہ

"آپ کو اپنے دلوں کا پورا جایزہ لینا چاہیے اور یہ دیکھنا چاہیے کہ کوئی غلط قدم تو آپ نہیں اٹھا رہے؟ تا کہ بعد کو آپ کو پچھتانا نہ پڑے۔ اس وقت اس امر کی ضرورت ہے کہ نہایت جرأت اور دلیری سے کام لے کر اپنے صحیح صحیح خیالات کا اظہار کر دیا جائے اور وہی زبان پر آئے جو دلوں میں ہے۔ آپ کو اپنے عہد نامے کی پے چیدگیوں کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے، کیوں کہ دہلی میں جو کچھ کیا گیا ہے وہی بقیہ ہندوستان میں ہونے کی ضرورت ہے۔ یعنی جس طرح دہلی میں امن و امان کا یقین دلایا گیا ہے۔ اسی طرح تمام ہندوستان میں امن کا قایم ہونا ضروری ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اس مقصد کو ایک دن میں حاصل کیا جا سکتا ہے، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ابھی تک وہ شیطان کے ساتھی بنے ہوئے تھے۔ اب انھوں نے خداشناسی کا عہد کیا ہے۔ جس کو انھیں پورا کرنا ہے۔

جو کچھ میں نے آپ کے سامنے پیش کیا ہے اگر آپ اس کو دل سے قبول نہیں کرتے یا یہ خیال کرتے ہیں کہ اس کا انجام دینا آپ کی طاقت سے باہر ہوگا تو آپ کو اس کا صاف صاف اعلان کر دینا چاہیے۔"

گاندھی جی نے اس امر پر نہایت زور دیا کہ اس سے زیادہ غلط خیال اور دوسرا نہیں ہو سکتا کہ ہندوستان صرف ہندوؤں اور سکھوں کا ہے اور پاکستان صرف مسلمانوں کا ہے۔ میں تمام شرنارتھیوں کو اچھی طرح بتا دینا چاہتا ہوں کہ دہلی میں حالات درست ہونے کے معنی یہ ہوں گے کہ پاکستان میں حالات درست ہو جائیں۔ اگر میں نے یہ محسوس کیا کہ مجھے دھوکا دیا گیا ہے یا میں نے برت توڑنے میں دھوکا کھایا تو میں دوسرا برت رکھنے میں ذرا بھر

پس و پیش نہیں کروں گا۔ اس کے بعد آپ نے ان مسلمانوں کو بلایا جو اکثر آپ سے ملتے تھے اور ان سے دریافت کیا کہ کیا وہ مطمئن ہیں اور کیا برت توڑ سکتا ہوں۔ اس کے بعد آپ نے کہا کہ یہ شک کرنا کہ مسلمان ہندوستان کو اپنا وطن خیال نہیں کرتے سب سے بڑی غلطی ہے۔ مسلمان ہندوستان کو اپنا وطن تصور کرتے ہیں اور ان کو یہیں رہنا ہے۔ گاندھی جی نے ایک کتاب کا حوالہ دیا جو آپ کو پٹنہ میں پیش کی گئی تھی، جس میں کہا گیا تھا کہ مسلمان کو قرآن یہ تعلیم دیتا ہے کہ کافر یعنی ہندو بہت خطرناک ہیں اور ان کو مٹا دینا نہایت ضروری ہے۔ آپ نے کہا کہ بعض لوگ ہندوؤں کو بتوں کا پوجنے والا خیال کرتے ہیں، حال آں کہ ہندو پتھروں کو نہیں پوجتے بلکہ اس خدا کو پوجتے ہیں جو دلوں کے اندر ہے اور جس کے ساتھ مادہ کا ایک ذرہ بھی شامل نہیں ہے۔

اس کے بعد گاندھی جی نے حاضرین سے استصواب کیا کہ اگر آپ خلوص دل سے اس عہد نامے کو قبول کرتے ہیں تو مجھے آزاد کیجیے کہ میں پاکستان یا جہاں چاہے جا سکوں۔ میری غیر حاضری میں پاکستان کے ان لوگوں کا آپ کو خیر مقدم کرنا چاہیے جو اپنے گھروں کو واپس آنا چاہتے ہیں۔ جو مسلمان دہلی سے چلے گئے ہیں وہ بھی خوش نہیں ہیں۔ اسی طرح ہندو بھی خوش نہیں ہیں کہ ان کے اچھے کاریگر یہاں سے چلے گئے، جو صنعت کہ نسلوں سے ایک فرقے میں چلی آ رہی ہو اور جس میں وہ فرقہ ماہر ہو گیا ہو، اس کو حاصل کر لینا ایک دن کا کام نہیں۔ اس کے بعد گاندھی جی نے دوبارہ حاضرین سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے دلوں کا جائزہ لیں اور مجھے دھوکہ دینے کی کوشش نہ کریں۔

مولانا آزاد کا بیان:

اس کے بعد مولانا ابوالکلام نے فرمایا کہ اسلام کے متعلق اس کتاب میں جس کا تذکرہ گاندھی جی نے فرمایا، سخت غلط بیانی سے کام لیا گیا ہے۔ آپ نے قرآن پاک کی آیت شریف کی تلاوت فرمائی جس میں بتایا گیا ہے کہ تمام انسان ایک ماں باپ کی اولاد ہیں، خواہ ان کا مذہب کچھ بھی ہو۔ گاندھی جی نے جس کتاب کا حوالہ دیا ہے اس میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ اسلام کی تعلیمات کے قطعاً منافی ہے اور اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کتاب سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان پر ایک دیوانگی پیدا ہو گئی ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا بیان:

مولانا آزاد کے بعد مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے فرمایا کہ مسلمانوں پر یہ الزام کہ وہ ہندوستان کو اپنا وطن خیال نہیں کرتے، قطعاً بے بنیاد ہے۔ مسلمانوں نے گزشتہ تین سال میں قومیت کی جو خدمت کی ہے ان پر یہ الزام قطعاً اس کے خلاف ہے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ مسلمانوں سے وفاداری کا مطالبہ کرنا قومیت کی توہین ہے۔

آپ نے فرمایا کہ دہلی میں فسادات کے دوران میں ایک موقع پر ہمارے کانگریسی دوستوں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ چوں کہ دہلی میں ہماری حفاظت کا مناسب بندوبست نہیں ہوسکتا ہے اس لیے دہلی کے باہر ہمارے تحفظ کا انتظام کردیا جائے، لیکن ہم نے اس پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کردیا تھا اور اس کو ترجیح دی تھی کہ بغیر پولیس اور فوج کی امداد کے ہم دہلی میں رہ کر کام کریں۔

آپ نے فرمایا کہ جمعیت کے مسلمان ہمیشہ مولانا آزاد اور کانگریس کے پیرو رہے ہیں اور جو لوگ پاکستان چلے گئے ہیں وہ جان کے خوف سے چلے گئے ہیں، لیکن وہ پھر ہندوستان واپس آنا چاہتے ہیں اور اگر ہندوستان پر حملہ کیا جائے تو وہ اس کی حفاظت میں اپنے خون کا آخری قطرہ بھی بہانے کو تیار ہیں۔ جو لوگ ایسا نہیں کرسکتے میں نے ان کو اکثر یہی مشورہ دیا ہے کہ وہ ہندوستان چھوڑ کر پاکستان چلے جائیں۔

آپ نے دہلی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ گاندھی جی کے برت کے سلسلے میں حالات تیزی سے بدل رہے ہیں اور فرقہ وارانہ امن و اتحاد کی فضا پیدا ہونا شروع ہوگئی ہے۔ چوں کہ حکومت کی طرف سے بھی یقین دلایا گیا ہے اس لیے میں ڈاکٹر راجندر پرشاد کی اس اپیل کی تائید کرتا ہوں کہ گاندھی جی اپنا برت توڑ دیں۔

جب مسٹر سی تنیش دت، ہندو مہا سبھا اور راشٹریہ سیوک سنگھ کی طرف سے یہ اپیل دہرا چکے تو زاہد حسین صاحب نے گاندھی جی سے چند الفاظ کہے۔

میں یہاں آپ کی خدمت میں اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ یہ عرض کروں کہ پاکستان کے لوگ آپ کے بارے میں کس قدر گہری تشویش رکھتے ہیں اور روزانہ بے شمار لوگ آپ کے متعلق مجھ سے دریافت کراتے ہیں، یہ ان کی دلی خواہش ہے کہ جلد ایسے حالات پیدا ہوں کہ جن سے آپ برت توڑ سکیں۔ اگر میں اس سلسلے میں کچھ کرسکتا ہوں اور نیز پاکستان

کے لوگ کچھ کر سکتے ہیں تو ہم اس کے لیے تیار ہیں۔

زاہد حسین صاحب کے بعد مسٹر خورشید احمد اور مسٹر رندھاوا نے مقامی حکومت کی طرف سے یقین دلایا کہ عہد نامے میں جو شرائط مذکور ہیں ان پر پوری طرح عمل درآمد کیا جائے گا۔

فرقہ وارانہ امن کے معاملے میں ہندوستان کے دارالخلافے کی جو شاندار روایات رہی ہیں ان کو پھر سے قایم کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا جائے گا۔

سکھوں کی طرف سے اقرار:

۲۱ر جنوری ۱۹۴۸ء: سردار ہربنس سنگھ نے سکھوں کی طرف سے اپنے پیش رووٴں کی تائید کی، اس کے بعد گاندھی جی نے برت توڑنے پر آمادگی کا اظہار کیا۔ یہ رسم پرارتھنا کے دوران میں ادا کی گئی ہے۔ جاپانیوں، مسلمانوں اور پارسیوں کی مذہبی کتب سے آیات پڑھی گئیں۔ ان کے بعد یہ منتر پڑھا گیا:

''مجھ کو کذب سے صداقت، ظلمت سے روشنی، فنا سے بقا کی راہ دکھا۔''

ایک ہندوستانی حمد اور عیسائیوں کی حمد پڑھی گئی۔ ان اطمینان دہانیوں کے بعد گاندھی جی برت توڑنے پر آمادہ ہوئے۔

گاندھی جی ایک تکیہ سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے، مولانا ابوالکلام آزاد نے سنترے کے رس کا ایک گلاس گاندھی جی کو پیش کیا، جس کو ''گلوکوز'' سے میٹھا کیا گیا تھا۔

گاندھی جی نے جب برت توڑا تو حاضرین نے زور سے ''گاندھی جی کی جے'' کے نعرے لگائے اور پنڈت جواہر لال نہرو کے ہونٹوں پر مسرت کھیل گئی۔ آپ اس تمام دوران میں حد درجہ متفکر اور پریشان رہتے تھے، آپ نے بھی کھانا کم کر دیا تھا اور گذشتہ چوبیس گھنٹے سے تو آپ نے کچھ نہیں کھایا تھا۔

اسی طرح اور بھی ہزاروں آدمیوں نے گاندھی جی کے ساتھ برت رکھا تھا، گاندھی جی کے توڑنے کی خبر بہت سرعت کے ساتھ نہ صرف دہلی میں بلکہ تمام دنیا میں پھیل گئی اور سب طرف سے مبارک باد کے تاروں کی بارش ہونے لگی۔

برت توڑنے کے بعد گاندھی جی نے ایک پیغام لکھا جو شام کو پرارتھنا سبھا میں پڑھا

گیا پیغام یہ تھا۔(دیکھو الجمعیۃ مورخہ ۹ ربیع الاول ۱۳۶۷ھ)

مہاتما گاندھی نے فرمایا:

''میرے تمام دوستوں نے کہا کہ ہم پر زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے۔ میں ان کے مشورے کو رَدّ نہ کرسکا اور انھوں نے جو عہد کیا ہے کہ تمام فرقوں کے مابین کامل دوستی ہوگی اس پر شک نہ کرسکا۔ گاندھی جی نے کہا میں نے یہ برت صداقت کے نام پر شروع کیا تھا، صداقت اور سچائی کا دوسرا مشہور نام خدا ہے، بغیر سچائی پر عمل پیرا ہوئے خدا کو نہیں پاسکتے۔ ہم نے سچائی سے کنارہ کیا اور افترا پردازیاں کیں اور یہ دیکھے بغیر کہ لوگ گناہ گار ہیں یا بے گناہ۔ ہم نے مردوں عورتوں اور بچوں کے قتل عام کیے، ہم نے اغوا کیے، لوگوں کو تبدیلی مذہب پر مجبور کیا اور یہ سب کام بے شرمی سے ہوئے۔ مجھے نہیں معلوم کوئی شخص ایسا بھی ہے جو کچھ کہہ سکے کہ میں نے یہ کام سچائی سے کیے۔ میں نے سچائی کا نام لیتے ہوئے برت توڑ دیا۔ لوگ جس سخت مصیبت میں ہیں، وہ قابل برداشت نہیں ہے۔

میرے سامنے راجندر بابو نے ہندوستانی میں ایک دستاویز پڑھی جس پر بہت سے نمائندوں کے دستخط موجود تھے۔ اس میں کہا گیا تھا کہ میں ان پر کوئی مزید بوجھ نہ ڈالوں اور برت توڑ کر ان کی اذیت کو ختم کردوں۔ مجھے ہند یونین اور پاکستان سے تار پر تار موصول ہورہے ہیں اور ان سب میں مجھ سے کہا گیا ہے۔ میں ان سب دوستوں کے مشورے کو رَدّ نہ کرسکا۔

مجھے ان کے اس عہد پر بھروسا ہوا کہ خواہ کچھ بھی ہو، یہاں ہندو مسلمان، سکھوں، عیسائیوں، پارسیوں اور یہودیوں میں دوستی کا ایک اٹوٹ رشتہ قائم کیا جائے گا۔ اس دوستی کو توڑنا گویا قوم کو ختم کرنا ہے۔

میں بیٹھا یہ مضمون لکھ رہا ہوں اور مجھ پر تاروں کی بارش ہورہی ہے، میں خدا سے تمنا کرتا ہوں کہ خدا مجھ کو صحت مند اور باہوش رکھے تاکہ میں بنی نوع انسان کی خدمت کرسکوں۔ اگر وہ عہد نامہ جو آج کیا گیا ہے پورا ہوا تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں دُگنی طاقت سے خدا کے سامنے یہ التجا اور تمنا

کروں گا کہ مجھے پوری زندگی نصیب ہو، تاکہ میں آخری لمحے تک بنی نوع انسان کی خدمت کرسکوں۔

یہ میرے مقصد کی ظاہری تکمیل تھی۔ لیکن جب تک باطنی تکمیل نہ ہو، یہ بے کار ہے۔ میرے عہد کا باطنی مقصد یہ تھا کہ یونین کے ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں میں ایک مخلصانہ دوستی قایم کی جائے اور یہی کام پاکستان میں کیا جائے۔

اگر ہند میں یہ کام ہو جائے تو پاکستان میں بھی یہ ضرور ہوگا، اور یہ بات میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں، ایسے یقین کے بعد جیسا کہ رات کے بعد دن کا ہے۔ اگر ہند یونین میں ظلمت ہو تو پاکستان میں روشنی کی توقع کرنا حماقت ہے، اگر ہند یونین میں بلاشک رات ختم ہو جائے تو پاکستان میں بھی ایسا ہی ہوگا اور اس حقیقت کی کئی روشن نشانیاں ہیں۔ میرے پاس پاکستان سے ہزارہا پیغامات آئے ہیں، ان میں سے ایک بھی ناراضگی کا نہیں ہے۔ کاش! خدا جو سچائی ہے، آیندہ بھی ہمیں راستہ دکھائے، جس طرح اس نے گذشتہ چھ روز سے دکھایا۔" (علمائے حق اور......... : جلد۲، ص۱۴۱-۲۰۷)

۲۶/جنوری ۱۹۴۸ء: برت کھولنے کے بعد سب سے پہلے عہد نامے کی شرط اول پر عمل ہوا۔ یعنی ۲۶/جنوری کو حضرت قطب الدین صاحب کا عرس آزادی سے منایا گیا۔ حکومت کی طرف سے بسوں اور لاریوں کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ زایرین ان کے ذریعے مزار پر پہنچے اور مراسم عرس ادا کیے۔

انتہائی کم زوری اور نقاہت کے باوجود مہاتما گاندھی خود قطب الدین صاحب تشریف لے گئے اور مراسم عرس میں شرکت کی۔

(لطیفہ) قطب صاحبؒ کے مزار پر عورتوں کی حاضری کی اجازت نہیں دی جاتی اور اس پابندی کو پوری طرح نبھایا جاتا ہے۔ مہاتما گاندھی کو اس کی خبر نہ تھی، جب مزار پر حاضر ہوئے تو حسب عادت ان کی ساتھ ان کی دو پوتیاں بھی تھیں جن کے سہارے سے گاندھی جی چل رہے تھے۔ حاضرین کی نظر لڑکیوں پر پڑی، انھوں نے مستفسرانہ انداز میں حضرت مولانا احمد سعید صاحب کی طرف دیکھا۔

حضرت مولانا نے فوراً ہی اپنے ظریفانہ انداز میں فرمایا:

''میاں یہ تو گاندھی جی کی نیکیاں ہیں۔''

اس ظریفانہ جواب سے تمام مجمع ہنس پڑا اور گاندھی جی بھی بہت محظوظ ہوئے۔

گاندھی جی پر بم پھینکا گیا:

مہاتما گاندھی کے برت کی کامیابی ان تمام طاقتوں کی ناکامی تھی جو ہندومسلم یا انڈیا اور پاکستان کی خانہ جنگی سے اپنی اغراض پوری کرنا چاہتی تھیں۔

اس شاندار ناکامی نے ان کے دماغی توازن کو ختم کر دیا اور دفعتہً وہ حرکتیں شروع کر دیں جو ان کے پروگرام کی آخری قسط ہو سکتی تھیں۔ چناں چہ برت کھولنے سے اگلے ہی روز جب کہ مہاتما گاندھی عبادتی جلسے (پرارتھنا سبھا) میں تقریر کر رہے تھے ایک بم پھینکا گیا۔ اتفاق سے وہ بم خطا کر گیا۔ مہاتما گاندھی محفوظ رہے۔ جلسے کے حاضرین بھی محفوظ رہے۔ حملہ آور موقع پر گرفتار کر لیا گیا۔ اس کی جیب سے فوجی قسم کا ایک بم برآمد ہوا۔ جس پر نمبر ۲ پڑا ہوا تھا۔

حملہ آور نوجوان نے اپنا نام مدن لعل اور اپنی سکونت پاک پٹن (مغربی پنجاب) بتائی اور یہ کہ اس وقت وہ بمبئی سے آیا ہے۔

حملہ آور کے ساتھ تین نوجوان اور تھے جو پرارتھنا کی جگہ سے کچھ اور فاصلے پر ایک موٹر کار میں بیٹھے رہے۔ جب بم پھینکا جا چکا تو وہ اپنی موٹر لے کر فرار ہو گئے۔

(الجمعیۃ، ہندوستان ٹائمز وغیرہ)

مہاتما گاندھی نے اس واقعہ سے کوئی اثر نہیں لیا اور اگلے روز پرارتھنا سبھا میں فرمایا:

''بم پھینکنے والے نے یہ کام جذبات سے اندھا ہو کر کیا ہے، دعا کیجیے کہ خدا اس کو عقل کی روشنی عطا فرمائے۔ اس شخص نے پولیس کو بیان دیا ہے کہ ''میں گاندھی جی کو مارنا چاہتا تھا، کیوں کہ میں ان کو برا آدمی سمجھتا ہوں اور اس طرح میں ہندو مذہب کو بچانا چاہتا تھا۔'' گاندھی جی نے فرمایا میرے دل میں اس کی طرف سے کوئی برائی نہیں ہے اور میں آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ آپ اس کے لیے دعا کریں۔ میری زندگی خدا کے ہاتھ میں ہے، اس لیے میرے

دل میں کوئی ڈر نہیں ہے۔ مجھ سے کہا گیا ہے کہ ملزم کے پیچھے ایک جماعت ہے اور یہ شخص اس جماعت کا آلۂ کار ہے۔ اس لیے میں اس جماعت سے کہتا ہوں کہ ہندو مذہب کو بچانے کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ وہ جوان آدمی یہ خیال کرتا ہے کہ وہ نجات دہندہ ہے، لیکن یہ غلط ہے۔ کیوں کہ اگر خدا نے کسی کو ہندو مذہب کو بچانے کے لیے مقرر کیا ہے تو وہ میں ہوں۔

مجھ سے برابر واقعہ مذکور کے متعلق پوچھا جا رہا ہے اور اس بات کی تعریف کی جا رہی ہے کہ میں اس واقعہ سے متاثر نہیں ہوا کہ میرے خیال میں یہ صرف ایک فوجی مشق تھی اور اس کے متعلق اس قدر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب تک پرارتھنا ختم ہوئی، اس وقت تک مجھے یہ نہیں معلوم ہوا کہ یہ آواز بم پھٹنے کی تھی اور یہ کہ یہ بم مجھ پر پھینکا گیا تھا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اگر یہ بم میرے سامنے پھٹتا اور مجھ کو اس کا علم ہوتا تو میں کیا کرتا۔ اس لیے میں کسی تعریف کا مستحق نہیں ہوں۔ تعریف کا مستحق تو میں اس وقت ہوتا جب یہ بم مجھے آکر لگتا اور میرے چہرہ پر مسکراہٹ ہوتی اور دل میں بم پھینکنے والے کے خلاف کوئی نفرت یا عداوت یا غم وغصہ نہ ہوتا۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کسی شخص کو اس بم پھینکنے والے گم راہ نوجوان کی مذمت نہیں کرنی چاہیے، اس نوجوان کو یہ اچھی طرح محسوس کرنا چاہیے کہ جو شخص اس کے خیالات سے اتفاق نہیں کرتا یہ ضروری نہیں کہ وہ برا آدمی ہو، برے آدمی کی زندگی اچھے لوگوں سے ہٹ کر کچھ نہیں ہوتی۔ کسی شخص کو یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ خدا نے اس کو برے آدمی کے خاتمے کے لیے بھیجا ہے، جیسا کہ ہمارا یہ نوجوان خیال کرتا ہے۔''

(علمائے حق اور............: جلد۲، ص ۱۷-۱۴)

اور گاندھی جی قتل کر دیے گئے:

۲۹ر جنوری ۱۹۴۸ء: برت سے فراغت کے بعد مہاتما گاندھی سیواگرام جانے کا قصد کر رہے تھے، مگر دہلی کے حالات اور ریاست الور کے میواتیوں کے بعض اہم معاملات کے سبب سے تذبذب تھا۔ ۲۹ر جنوری کو جمعیت علما کے حضرات سے فرمایا کہ ''آپ تمام حالات کا جائزہ لے کر میرے جانے کے متعلق آخری فیصلہ کر دیں۔ اور ۳۱ر جنوری کو مجھے

مطلع کر دیں۔"

۳۱؍ جنوری کو جمعہ کا دن تھا۔ یہ حضرات گیارہ بجے سے پہلے مہاتما گاندھی کے پاس جایا کرتے تھے۔ اس روز دوسری ضروری مصروفیتوں کے باعث تاخیر ہو گئی اور ایفائے وعدہ کا خیال نہ ہوتا تو آج ملاقات ملتوی کر دیتے۔ مگر چوں کہ یقین تھا کہ مہاتما گاندھی فیصلے کے منتظر ہوں گے، لہٰذا ملاقات کو ضروری سمجھا گیا اور ساڑھے بارہ بجے برلا ہاؤس پہنچے۔ مہاتما گاندھی سو کر اٹھ چکے تھے اور وہ ان کے پہنچنے کے منتظر تھے۔

جیسے ہی علم ہوا فوراً اپنی آرام گاہ میں بلا لیا اور گفتگو شروع کر دی۔ اثنائے گفتگو میں آپ نے حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"میں تو ان کا (رہنمایانِ جمعیت علمائے ہند کا) قیدی ہوں، اگر یہ اجازت دیں گے تو میں سیواگرام جاؤں گا۔"

حضرت مولانا احمد سعید صاحب، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے فرمایا:

ہمارے خیال میں دو ہفتے کے لیے آپ کے جانے میں مضایقہ نہیں ہے۔ آپ ضرور تشریف لے جائیے۔ مگر ۱۵؍ فروری تک دہلی واپس تشریف لے آئیے۔

مہاتما گاندھی نے فرمایا: ضرور ضرور میں ۱۵؍ تک دہلی پہنچ جاؤں گا۔ اگر کوئی آسمانی یا شیطانی آفت نہ آئی۔

یہ حضرات روانہ ہونے لگے اور برلا ہاؤس سے باہر نکل کر کار میں بیٹھنے والے تھے کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو دوبارہ بلوایا۔ مولانا موصوف واپس پہنچے تو مترجم قرآن شریف کی تین جلدیں مولانا موصوف کے حوالے کر دیں۔ یہ قرآن شریف غالباً مطالعے میں رہا کرتا تھا۔

آج کی گفتگو بہت دل چسپ تھی۔ خوش طبعی اور ظرافت کی باتیں بھی ہوتی رہیں۔ مگر کیا معلوم تھا کہ چند گھنٹے بعد شیطانی آفت اس تمام مسرت کو رنج والم سے بدل دے گی۔

برلا ہاؤس کے احاطے میں عظیم الشان کوٹھی سے تقریباً سو قدم کے فاصلے پر ایک چبوترا بنا ہوا ہے، جس پر کم و بیش دو ہزار آدمی بیٹھ سکتے ہیں۔ چبوترے کے ایک جانب سہ دری بنی ہوئی ہے۔

شام کی پرارتھنا کا جلسہ اسی چبوترے پر ہوا کرتا تھا۔ سہ دری کے قریب تخت پر گاندھی

جی بیٹھا کرتے تھے۔

پانچ بجے کے بعد حسب معمول گاندھی جی اپنے عبادتی جلسے میں جانے کے لیے کوٹھی سے نکلے، راستہ طے کیا۔ پھر چبوترے پر چڑھ کر اپنے تخت کی طرف جارہے تھے کہ حاضرین کی دورویہ صف میں سے ایک نوجوان نکل کر سامنے آیا، دونوں ہاتوں سے ڈنڈوت کیا، پھر چرن لینے کے لیے جھکا۔ جھکتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈال کر بھرے ہوئے زیوالور کو سنبھالا اور سیدھا ہوا تو دفعتہً فایر شروع کردیے۔ پہلی گولی نے سینے کی ہڈی توڑ دی، دوسری اور تیسری گولی پیٹ کو پار کرگئی، گاندھی جی زمین پر گر پڑے، چند منٹ بعد قفس عنصری سے روح پرواز کرگئی۔

قاتل گرفتار کرلیا گیا۔ قاتل نے اپنا نام ناتھورام بتایا، ضلع پونہ کا رہنے والا اور پونہ ہندو مہاسبھا کا عہدہ دار۔

بجلی سے زیادہ تیزی کے ساتھ یہ خبر دہلی میں پھیل گئی اور چند منٹ بعد ریڈیو نے تمام دنیا کو اس الم ناک حادثے کی اطلاع دے کر ماتم کدہ بنادیا۔

دہلی میں ہر شخص سراسیمہ تھا۔ رنج والم کے ساتھ خوف وہراس بھی چھایا ہوا تھا۔ خیال تھا کہ شاید اس قتل کی پشت پر کسی عام بلوہ کی اسکیم ہو۔ چناں چہ محلوں کے پھاٹک بند کردیے گئے۔ گلیوں اور کوچوں کی ناکہ بندی کرلی گئی اور حکومت نے بھی فوراً توجہ کرکے ملٹری کا معقول انتظام کردیا۔ مسلح فوجی دستوں نے شہر میں گشت لگانی شروع کردی۔

یہی حال تقریباً ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں کا تھا۔ آج ہندو مسلم تفرقہ ختم ہوگیا تھا۔ ہر شخص شریک غم تھا اور وقف ماتم۔ صرف بمبئی کے ایک محلے میں اس غلط شہرت کی بنا پر کہ قاتل مسلمان ہے، ہندوؤں نے مسلمانوں پر حملے شروع کردیے۔ چند مسلمان مقتول اور مجروح ہوئے۔ لیکن فوراً ہی جب حقیقت کا انکشاف ہوگیا تو یہ غلط رویہ بھی ختم ہوگیا۔

البتہ راشٹریہ سیوک سنگھ اور ہندو مہاسبھا کے کچھ کٹر قسم کے افراد وہ تھے جو اس عالم گیر حادثے پر بغلیں بجارہے تھے۔

حادثے سے تھوڑی دیر بعد دفتر جمعیت علما میں ایک اطلاع موصول ہوئی کہ کچھ لوگ (جو مسلمان نہیں تھے) سائیکل پر جارہے تھے اور مستانہ انداز میں کہہ رہے تھے گاندھی مرگیا! مرگیا! مرگیا!

اسی طرح اسی ٹائپ کے لوگوں نے مٹھائیاں بھی تقسیم کیں، جو بعد میں گرفتار کیے گئے، جب کہ حکومت نے فرقہ واریت کے خلاف قدم اٹھایا۔

بہ ہر حال ہزاروں لاکھوں میں ایک دو مثالیں ایسی بھی تھیں ورنہ عام طور پر ہر ایک دل پژمردہ تھا اور ہر مکان ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔

اور صرف انڈیا میں یہ حال نہیں تھا، بلکہ پاکستان کی حالت بھی یہی تھی۔ مخدوم شاد صاحب بنوری نے اطلاع دی تھی کہ

''آج ساری دنیا کے ساتھ ساتھ مملکتِ پاکستان کا پرچم بھی سرنگوں ہے۔ ساری مملکت میں سوگ ہے۔ لوگوں کے چہرے اشک بار ہیں۔ ہر شہر اور ہر فرقے میں تعزیتی اجتماعات ہیں۔ ہر ہوٹل، دکان، مکان، اور جہاں بھی سرکاری ریڈیو ہیں سب گاندھی جی کی ارتھی کا آنکھوں دیکھا حال سنا رہے ہیں (۲) اور لوگوں کی بھیڑ ہے جو اشک بار آنکھوں سے آواز پر ٹوٹی پڑتی ہے۔ ارتھی کے روز صبح کی خبروں میں پاکستان ریڈیو کے اناؤنسر نے جس غم ناک لہجے میں لوگوں کو یہ وحشت ناک خبر سنائی اس نے ہر شخص کو آب دیدہ کر دیا۔ پاکستان ریڈیو نے اپنا تمام وقت گاندھی جی کی یاد میں گزارا۔ نوحے پڑھے گئے۔ تعزیتی جلسوں کا ''آنکھوں دیکھا حال'' اور ماتمی تقریریں براڈ کاسٹ کی گئیں۔ اسی ریڈیو نے گاندھی کے احترام میں ان کا محبوب عبادتی بھجن پڑھا:

رگھو پتی راگھو راجہ رام
پتی ات پاون سیتا رام
ایشور اللہ تیرا نام
سب کو سم پتی دے بھگوان

اور ایک دوسرا بھجن

دیا کرو بھگوان سب پر دیا کرو بھگوان

اپنی پوری شان کے ساتھ سنایا۔ اس روز غالباً پہلی بار اس ریڈیو نے مسٹر کے بجائے گاندھی جی کو مہاتما گاندھی کے نام سے یاد کیا۔ پاکستان ریڈیو سے بار بار کہا گیا کہ ''گاندھی جی کے لیے آج عالم انسانیت اشک بار ہے وہ انصاف کے دیوتا تھے اور اپنی ذات میں برائیوں کی تردید کا مجسمہ تھے۔'' اس روز غالباً تاریخ میں پہلی بار ''لیگ اور احرار'' کے لیڈر ایک اسٹیج پر

جمع ہوئے۔

اسی طرح پاکستان میں منعقد ہونے والی سندھ کی سب سے پہلی اسمبلی کا اجلاس جب کراچی میں منعقد ہوا تو وزیرِ اعظم سندھ کی تحریک پر اسمبلی نے ماتمی ریزولیوشن پاس کیا۔ جس کے بعد سب ممبر تعظیم کے لیے کچھ دیر کے لیے کھڑے رہے۔ پاکستان کے عام باشندوں کے ساتھ ساتھ ملک کی باقاعدہ فوج نے بھی گاندھی جی کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔

۳ر فروری کو وزیرِ اعظم پاکستان کے حکم سے ۱۰۳ ویں انفنٹری بریگیڈ کی پریڈ کے موقعہ پر ساری فوج ہندوستان کے سب سے بڑے فرزند کی یاد میں دو منٹ تک خاموش کھڑی رہی۔ اس باقاعدہ رسم کے علاوہ بھی ہزاروں فوجی افسروں اور نیک دل سپاہیوں نے پاکستان کے عام شہریوں کے ساتھ ''قومی ماتم'' کا یہ دن دکھ اور افسوس سے گزارا۔ لاہور، سارا مغربی پنجاب، سندھ اور صوبہ سرحد کے تمام بڑے بڑے شہروں میں ہڑتال رہی، جس کے لیے مغربی پنجاب کے وزیرِ اعظم نے اپیل کی تھی۔ ہزاروں مسلمانوں نے آج روزہ رکھا اور اپنی مذہبی روایات کے مطابق گاندھی جی کے لیے خیرات دی۔ صوبائی مسلم لیگ کے صدر میاں افتخار الدین ارتھی میں شمولیت کے لیے لاہور سے دہلی گئے اور لیگی جھنڈے بھی احترام کے لیے جھکے رہے۔ مجلسِ احرار اسلام پاکستان کے تمام جھنڈے بھی ساری مملکت میں تین دن تک سرنگوں رہے۔

گاندھی جی کے عزیز دوست سرخ پوش رہنما فخرِ افغان خان عبدالغفار خان نے جنھیں سرحدی گاندھی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، یہ دن نہایت دکھ اور افسوس سے گزارا۔ سرحد کے کونے کونے سے لوگ بادشاہ خان کے پاس تعزیت کے لیے آئے۔ تحریک کے مرکز سرور یاب میں آج تک گاندھی جی کی تعزیت کے لیے آنے والوں کا ہجوم رہتا ہے۔ یہ لوگ سرحدی اور اسلامی روایات کے مطابق تعزیت کے لیے فخرِ افغان بادشاہ خان کے پاس آتے ہیں۔ خود بادشاہ خان کو گاندھی جی کی موت سے سخت دکھ پہنچا ہے اور وہ اس صدمے سے اکثر مضمحل رہتے ہیں۔

سرحد کے تمام قبایلی لیڈروں نے گاندھی جی کی وفات کو بری طرح محسوس کیا۔ فقیر اپی صاحب اور حاجی صاحب اورک زئی نے روزہ رکھا اور مختلف علاقوں اور مسجدوں میں گاندھی جی کی زندگی پر تقاریر اور ہندوستان کے لیے دعائیں کی گئیں۔ آزادی ہند کے ساتھ

جب ملک تقسیم ہوا تو دو ملکوں کے ساتھ ہی ایک تیسری قوم بھی عالم وجود میں آئی، جسے آج کل کی زبان میں پناہ گزیں یا شرنارتھی کہتے ہیں۔ گاندھی جی کی موت سے ملک کے دونوں حصوں میں اس مہاجر قوم اور ان لوگوں کی ایک گراں مایہ اور گم شدہ متاع ''اغوا شدہ عورتوں'' پر بھی بجلی گری۔ یہ شریف گھرانوں کی بیٹیاں جو آج ملک کے دونوں حصوں میں قوم کے ''اوباش لٹیروں'' کا کھلونا بنی ہوئی ہیں، دوبارہ واپسی کی بھاری امیدیں تھیں، جب لوگوں نے گاندھی جی کی موت کا حال سنا تو ان دکھی لوگوں کی آس ٹوٹ گئی، ہونٹ خشک اور چہرے مرجھا گئے، اور وہ لوگ جنھیں ہجرت کی آب و ہوا راس نہ آئی تھی زار و قطار روتے دیکھے گئے۔ پاکستان کی حکومت اور لوگوں نے جس خلوص اور دلی دکھ کے ساتھ اس حادثے کو محسوس کیا ہے اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دو قوموں اور دونوں حکومتوں میں کبھی کوئی اختلاف ہی نہیں تھا۔ (ماخوذ از اخبار ہند۔ دہلی: مورخہ ۲۰ر فروری ۱۹۴۸)

مختصر یہ کہ پورا ہندوستان اپنے کسی فرزند کی موت پر اتنا کبھی نہیں رویا ہوگا جتنا کہ آج رویا۔ یکم فروری کی صبح کو دس بجے برلا ہاؤس سے ارتھی اٹھائی گئی اور جمنا کے کنارے اس کو لے جا کر ہندو رسم کے بہ موجب نذر آتش کیا گیا۔ تقریباً تین میل راستے کے دونوں طرف لاکھوں انسانوں کے ٹھٹ کھڑے ہوئے تھے اور اگر پولیس اور فوج پوری مستعدی سے انتظام نہ کرتی تو خدا جانے کتنے انسان پاؤں میں کچل کر مارے جاتے۔

جب ارتھی کو نذر آتش کیا جا رہا تھا تو لاتعداد انسانوں کا مجمع کئی میل کے رقبے کو اس طرح پاٹے ہوئے تھا کہ تل رکھنے کی جگہ نہ تھی۔

بہر حال یہ تاریخ بھی آئی اور گزر گئی۔ کُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ.

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ العالی نے اجلاس بمبئی کے خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا ۳:

> ''گاندھی جی کا حادثہ آزاد ہندوستان کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔ لیکن اطالوی اخبار (یونٹا) کے اس الزام کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ''یہ سفاکانہ واردات صرف ایک آدمی کی دیوانگی کا نتیجہ نہیں بلکہ اس میں برطانوی استعمار کا ہاتھ کار فرما ہے۔ یہ اسی استعمار کی اشتعال انگیزی کا نتیجہ ہے۔
>
> ہندوستان میں برطانوی خفیہ سروس کے آدمی موجود ہیں اور وہ اپنا کام

کرنا جانتے ہیں۔اس واردات میں یقیناً ان کا ہاتھ ہے۔

عراق، مصر، فلسطین، موگا دیشیو (اٹلی) کے مقتولین اور یہ ''مقتول مہاتما'' سب کے سب جارج ششم کے تاج کے ہیرے ہیں۔ یہ سب کچھ اسی سوشلسٹ کہلانے والے وزیر ''مسٹر بیون'' کی کارگذاریوں کا مسرت انگیز نتیجہ ہے۔''

(انقلاب-لاہور: ۱۳؍ربیع الاول ۱۳۶۷ھ مطابق ۵؍فروری ۱۹۴۸ء)

(علمائے حق اور............: جلد۲، ص۲۶-۲۱۸)

حاشیہ ⓫: مہاتما گاندھی گیارہ بجے تک کام کرتے تھے اور گیارہ کے بعد ایک ڈیڑھ گھنٹے آرام کرتے تھے۔ یہ معینہ پروگرام تھا۔

حاشیہ ⓬: ارتھی کے ساتھ وائرلیس لگا دیا گیا تھا جس کے ذریعہ ہر چیز کی خبر دی جارہی تھی۔

حاشیہ ⓭: ملاحظہ ہو، خطبۂ صدارت اجلاس عام مرکزی جمعیت علمائے ہند۔ منعقدہ ۲۶؍ ۲۷؍۲۸؍اپریل ۱۹۴۸ء بہ مقام بمبئی۔

جمعیت علمائے ہند کی سیاسیات سے علاحدگی:

حضرت شیخ الاسلام کے خطبۂ صدارت بمبئی سے ایک اقتباس:

یکم فروری ۱۹۴۸ء: اس باب میں حضرت شیخ الاسلام مدظلہٗ العالی کے خطبۂ صدارت کا اقتباس پیش کیا جارہا ہے۔ تاکہ مستند طور پر پوری وضاحت کے ساتھ یہ مسئلہ سامنے آجائے۔

حضرت مولانا نے ارشاد فرمایا:

''جمعیت علمائے ہند ہمیشہ سیاسیات میں ہندو مسلم اشتراک واختلاط کی قایل رہی ہے۔ چناں چہ اس نے ہمیشہ مسلمانوں کو ملک کی مشترک جماعت ''کانگریس'' میں شرکت کی دعوت دی۔ عقل وقیاس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جب ہندو مسلمانوں کے ملکی اقتصادی اور شہری مفادات مشترک ہیں تو ان کی سیاست بھی مشترک ہو اور سیاسی پلیٹ فارم بھی اشتراک واختلاط کا پلیٹ فارم

ہو۔ جب مونسپل بورڈ، ڈسٹرکٹ بورڈ، کونسلیں اور اسمبلیاں مشترک ہیں۔ ان کے ایوانوں میں ہندو اور مسلمان مل کر بیٹھتے ہیں۔ مشترک طور پر ان کے عہدہ داران اور سب کمیٹیوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ مشترک طور پر رائے دے کر کسی قانون کو منظور یا مسترد کرتے ہیں۔ تو کیا وجہ ہے کہ سیاسی اور ملکی حقوق کی تحصیل وحفاظت کا پلیٹ فارم مشترک نہ ہو۔

عقل و قیاس کا فیصلہ یہ بھی ہے کہ ان مشترک جماعتوں کا انتخاب بھی مشترک اور مخلوط ہو۔ جداگانہ انتخاب ان جماعتوں کے نیچر اور فطرت کے سراسر مخالف ہیں۔

ہندوستان کبھی بھی سیاسی اور ملکی معاملات میں ہندو مسلم تفریق و امتیاز کا قایل نہیں ہوا۔ اس کی حکومتیں خواہ مسلم حاکم کے زیر اثر رہی ہوں یا ہندو فرماں روا کے زیر نگیں، کبھی بھی افتراق و امتیاز سے آشنا نہیں ہوئیں۔

اکبر بادشاہ کی قوم پروری کسی تحریر اور تفصیل کی محتاج نہیں۔ جہاں گیر بادشاہ کا عدل و مساوات بھی تاریخ میں ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ اس کے توپ خانے کے افسر اعلا راجہ بکر ماجیت تھے، جن کے ماتحت پچاس ہزار توپچی اور تین ہزار توپیں رہتی تھیں۔

اورنگ زیب عالم گیر کو کٹر مذہبی کہا جاتا ہے، مگر جب اس سے کہا گیا کہ حکومت کا منصب کسی غیر مسلم کو سپرد نہ کیا جائے تو اس نے نہایت تعجب اور حیرت سے اس اعتراض کو سنا اور بڑی بے نیازی سے جواب دیا: دنیا کے انتظامی امور میں منصب کا مدار قابلیت ہوتی ہے، مذہب کو پیشِ نظر نہیں رکھا جاتا۔ اس کے بڑے بڑے منصب داروں میں ساہو پسر راجہ سنبھا، جے سنگھ، جسونت سنگھ، سیواجی کے داماد راجندجی اور ان کے علاوہ بڑے بڑے راج پوت اور ہندو تھے، جن کی تعداد بہ قول منشی کیول رام بٹالوی سو سے زیادہ تھی (ملاحظہ ہو تاریخ تذکرۃ الامراء) مہاراجہ رنجیت سنگھ جیسے کٹر مذہبی راجہ کی وزارت میں ہندو اور سکھوں کی طرح مسلمان شریک تھے۔ پیرزادہ عزیز الدین وزیر تھے اور الٰہی بخش توپ خانے کے سردار۔ مرہٹوں کے توپ خانے

کا اعلا افسر ابراہیم کردی تھا اور حضرت سید احمد صاحب شہیدؒ نے اپنے توپ خانے کا افسر راجہ رام راج پوت کو بنایا (لارڈ ولیم بنٹیگ نے ۱۸۸۲ء کی تقریر میں ڈبلیو۔ ایم ٹارنس نے اپنی کتاب ''ایشیا میں شہنشاہیت'' سر بی رام آف بنگال نے اپنی تصنیفات میں اور پنڈت سندر لال آف الہ آباد نے اپنی کتاب ''بھارت میں انگریزی راج'' میں ایسی بہت سی مثالیں اور نظیریں پیش کی ہیں جن سے ہندو مسلمانوں کے باہمی بہتر تعلقات اور آپس کے اعتماد پر روشنی پڑتی ہے)۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے حکم ران ہمیشہ اس اُصول کے حامی رہے کہ ملاؤ اور حکومت کرو۔

حتیٰ کہ سلطنت مغلیہ کے بانی بابر بادشاہ نے اپنے بیٹے ہمایوں کو وصیت کی تھی: اے پسر! سلطنتِ ہندوستان مختلف مذاہب سے پُر ہے۔ الحمدللہ! کہ اس نے اس کی بادشاہت تمھیں عطا فرمائی۔ تمھیں لازم ہے کہ تمام تعصبات مذہبی کو لوحِ دل سے دھوڈالو اور عدل و انصاف کرنے میں ہر مذہب و ملت کے طریق کا لحاظ رکھو، جس کے بغیر تم ہندوستان کے لوگوں کے دلوں پر قبضہ نہیں کر سکتے۔ اس ملک کی رعایا مراحم خسروانہ اور الطاف شاہانہ ہی سے مرہون ہوتی ہے۔ جو قوم یا ملت حکومت کی مطیع اور فرماں بردار رہے اس کے مندر اور مزار برباد نہ کیے جائیں۔ عدل و انصاف ایسا کرو کہ رعایا بادشاہ سے خوش رہے۔ ظلم و ستم کی نسبت احسان اور لطف کی تلوار سے اسلام زیادہ ترقی پاتا ہے۔ شیعہ و سنی کے جھگڑوں سے چشم پوشی کرو۔ ورنہ اسلام کم زور ہو جائے گا۔ جس طرح انسان کے جسم میں چار عناصر مل جل کر اتحاد و اتفاق سے کام کر رہے ہیں، اسی طرح مختلف مذاہب رعایا کو ملا جلا رکھو اور ان میں اتحاد میل پیدا کرو تا کہ جسم سلطنت مختلف امراض سے محفوظ و مامون رہے۔ سرگزشتہ تیمور کو جو کہ اتفاق و اتحاد کا مالک تھا اپنی نظر کے سامنے رکھو۔ تا کہ نظم و نسق کے معاملات میں پورا تجربہ ہو (خفیہ وصیت ظہیر الدین محمد بابر شاہ بہ نام شاہ زادہ نصیر الدین ہمایوں اطال اللہ عمرہ محررہ برائے استحکام و استقامت سلطنت ❶۔

اسی اشتراک و اختلاط کا نتیجہ تھا کہ ہندو مسلمانوں کی آبادیاں مشترک

ہیں، بازار مشترک ہیں، عام کاروباری زندگی مشترک ہے۔ حتیٰ کہ اس اشتراک نے ایک مشترک زبان کے ایجاد پر مجبور کیا اور اس تقرب سے اردو یا ''ہندوستانی'' زبان عالم وجود میں آئی۔

اس مشترک زبان کے ایجاد میں جو خوش گوار تعلقات کے ترجمان کی حیثیت رکھتی ہے، ہندوستان کے جلیل القدر شیخ یعنی حضرت سلطان المشائخ نظام الدین دہلوی قدس اللہ سرہٗ العزیز نے خاص حصہ لیا۔ چناں چہ آپ نے اپنے خاص احباب کی ایک جماعت بنائی اور اس کو ہدایت کی کہ ایسی زبان تیار کریں کہ ہندوستان کے رہنے والے ہندو اور باہر کے آئے ہوئے مسلمان اس کے ذریعے لین دین اور دوسری ضرورتوں کی بات چیت کر سکیں۔ اس کمیٹی کے ارکان نو تھے۔ چار ہندو: ہردیو، سیتل دیو، چیتل دیو، سنبھل دیو۔ اور پانچ مسلمان: امیر خسرو، خواجہ سید محمد، خواجہ حسن سنجری، خواجہ سید موسیٰ اور خواجہ سید رفیع الدین ہارون۔

امیر خسرو کی مشہور کتاب ''خالق باری'' اسی حسن تعلق کی یادگار ہے جو آج تک بچوں کو پڑھائی جاتی ہے۔ برطانیہ کا دورِ حکومت سب سے پہلا دور تھا جس میں ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی نامبارک پالیسی اختیار کی گئی۔

اس تخم خبیث کو بارآور کرنے کے لیے بہت سے مٹے ہوئے نشانات ابھار لیے گئے اور نئے نئے اختلافی مسایل پیدا کر کے اس تخم خبیث کی آب یاری کی گئی۔

مسٹر بندری، ایلیٹ اور مسٹر کیمرن مامور کیے گئے کہ تاریخ میں اختراعات کریں اور فرقہ وارانہ نقطۂ نظر کی بنیاد پر پرانے واقعات کو مسخ کر کے نئی تاریخ مرتب کریں، اس مسخ کردہ تاریخ کو کورس میں داخل کر کے نوجوانوں کے دماغوں کو مسموم کیا گیا۔

اردو ہندی کا قصہ چھیڑ کر ملی جلی خوش گوار اور تہذیب کے جگر پر نشتر لگایا گیا اور اس قسم کے مہلک اور تباہ کن مسایل کی زہر افشانی کو مسلسل جاری رکھنے اور اتحاد و اتفاق کی کوششوں کو پیہم شکست دینے کے لیے جداگانہ انتخاب کا نرالا

طریقہ جاری کیا گیا۔

جب ہم اس مطالبے اس کے پیش کرنے اور اس کی منظوری کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے خود کوزہ خود کوزہ گر و خود گل کوزہ۔

یعنی برطانوی مفاد کے ایجنٹوں نے خود ہی مطالبہ ایجاد کیا خود ہی درخواست لکھی خود ہی اپنے کاسہ لیس مسلمانوں کا ایک وفد مرتب کیا جو شملہ حاضر ہوا اور پھر اس کے مطالبے کو منظور کر کے مسلمانوں پر احسان عظیم رکھا گیا اور اس طرح مسلسل احسانات کے ذریعے سے اتحاد و اتفاق کی تعمیر کو خاک ستر کر کے دلوں کی سرزمین میں بغض و عناد کا وہ جوالا مکھی تیار کیا گیا جس کا پہلا نتیجہ مطالبۂ پاکستان تھا۔ دوسرا نتیجہ وہ عبرت ناک اور لرزہ خیز کشت و خون جو ۱۶؍ اگست ۱۹۴۶ء سے شروع ہوا، جس نے لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ایک کروڑ سے زاید انسان بے خانماں ہوئے اور مہاتما گاندھی جیسا عظیم المرتبت انسان اس کی بھینٹ چڑھ گیا۔

محترم بزرگو اور دوستو! جب ہندوستان میں جداگانہ انتخاب کا فرقہ وارانہ اور غیر فطری طریقہ رائج تھا اور انتخاب کے موقع پر فرقہ وارانہ مسایل کو ابھار کر کامیابی کا مستحق اسی کو سمجھا جاتا تھا جو زیادہ سے زیادہ متعصب، تنگ نظر اور فرقہ پرست ہو، تو مجبوراً قوم پرور جماعتوں کو بھی فرقہ واریت کے میدان میں آنا پڑتا تھا، تا کہ فرقہ وارانہ زہر کو جہاں تک ممکن ہو کم کر سکیں اور جدا جدا پلیٹ فارموں سے وہ مشترک ملکی مسایل پیش کر سکیں جو درحقیقت انتخاب کا معیار ہونے چاہییں۔

۱۹۳۰ء کے بعد انڈین نیشنل کانگریس اس قدر رسوخ ملک میں حاصل کر چکی تھی کہ صحیح مینوفسٹو پیش کر کے انتخاب میں کامیابی حاصل کر لیتی تھی۔ لیکن بدقسمتی سے مسلم ضلعوں میں اس کو یہ اقتدار حاصل نہ تھا۔ لہٰذا مسلم حلقوں میں قوم پرور مسلمانوں نے جمعیت علمائے ہند کی زیرِ قیادت یہ خدمت انجام دی اور انتخابات کے موقع پر صحیح مینوفسٹو مسلمانوں کے سامنے رکھا اور اس پر رائے دینے کا مطالبہ کیا۔

۱۵/ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد جب کہ ہندوستان اپنی قسمت کا خود مالک ہوگیا ہے اور انڈین یونین کی دستور ساز اسمبلی جداگانہ انتخاب کی لعنت کو انڈیا سے ختم کر چکی ہے تو قدرتی طور پر جمعیت علماے ہند بھی اس ذمے داری سے سبک دوش ہوگئی، جو اس نے مجبوراً اپنے سر لی تھی۔ لہٰذا اس کی مجلسِ عاملہ یکم فروری (۱۹۴۸ء) کے اجلاس میں اعلان کر چکی ہے۔

''جمعیت کا دایرۂ عمل آیندہ صرف مذہبی، تمدنی اور تعلیمی حقوق و فرایض کے دایرے میں محدود رہے گا۔''

۲۲/ مارچ کو جمعیت علماے ہند کے اجلاس دہلی نے مجلسِ عاملہ کے اس فیصلے کی تصدیق بھی کر دی اور اب یہ اعلان اس کا مسلمہ اصول بن چکا ہے۔''

(خطباتِ صدارت: ص ۴۰۸-۴۰۴)

اس کے بعد حضرت صدر مدظلہٗ العالی نے جمعیت علما کی موجودہ ذمے داریوں کا تذکرہ فرمایا ہے اور مذہبی تعلیم، نظام قضا، تحفظ اوقاف کی طرف توجہ دلائی ہے جو انڈین یونین میں ملت اسلامیہ کے بقاو تحفظ کے لیے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

حاشیہ ❶: ڈاکٹر بال کرشن پرنسپل راجہ رام کالج کولا پور نے فارسی زبان کی قدیم تحریر حاصل کی تھی۔ جس کا مذکورہ بالا ترجمہ روزنامہ اخبار خلافت- بمبئی مورخہ ۱۸/ اگست ۱۹۴۶ء جلد ۵ صفحہ ۱۶۱ میں شایع ہوا تھا۔

گاندھی جی کے قتل پر جمعیت علما کی قرارداد:

۲/ فروری ۱۹۴۸ء: جمعیت علماے ہند کے پندرھویں سالانہ اجلاس عام منعقدہ بمبئی ۲۶، ۲۷/ اپریل ۱۹۴۸ء کے خطبۂ صدارت میں مہاتما گاندھی کے قتل پر حضرت شیخ الاسلام نے ان تاثرات کا اظہار فرمایا ہے:

''اس خونی ہنگامے کا سب سے زیادہ شرم ناک اور سنگین واقعہ مہاتما گاندھی کا حادثۂ قتل ہے۔ گاندھی جی، تہذیب و انسانیت کے سچے خادم اور ملک کے حقیقی خیر خواہ تھے، آپ نے اپنی تمام علمی اور عملی طاقت انسانوں کی خدمت، ملک کی آزادی اور پست اقوام کو قعر مذلت سے نکالنے کی جدوجہد میں صرف کی اور ۱۶/ اگست ۱۹۴۶ء یعنی لیگ کے ڈایریکٹ

ایکشن کی ابتدائی تاریخ کے بعد سے آپ کی تمام جدو جہد اور حیرت انگیز ایثار فدایت کو اس آگ کے بجھانے اور بربریت کے بحران کو فرو کرنے میں صرف ہوئی جس کو فتنہ انگیز پوشیدہ طاقتوں کی طرف سے بھڑکایا اور ابھارا جارہا تھا۔ آپ نے نواکھالی پہنچ کر بگڑے ہوئے تعلقات کو درست کیا، ظالم کے دل میں احساس ندامت پیدا کرکے مظلوم کی دست گیری اور امداد کی، جو نواکھالی میں مظلوم ہندوؤں کی کی تھی۔ پھر آپ پیکر امن بن کر کلکتہ پہنچے اور صرف چند روز قیام کرکے وہ نسخۂ شفا عطا فرمایا کہ قتل و غارت کا ایک سالہ جنوں دفعتہً ختم ہوگیا اور پریم ومحبت نے عداوت ونفرت کی جگہ لے لی۔ کلکتہ کے بعد آپ دہلی پہنچے اور آپ کی راست بازی اور سچائی نے آپ کو مظلوموں کا پشت پناہ بنادیا۔

گاندھی جی کو یقین تھا کہ فرقہ پرستی مہلک وبا ہے، جو اگر باقی رہ گئی تو ملک کو دسیوں حصوں میں تقسیم کردے گی اور وطن عزیز کی بلند پیشانی کو استعمار پسند طاقتوں کے آستانوں پر جھکا دے گی۔ چناں چہ آپ نے پیرانہ سالی کی تمام کمزوریوں کے باوجود جواں مردی سے اس مہلک وبا کا مقابلہ کیا، انتہا یہ کہ اس مقابلے میں اپنی گراں قدر جان کو جو ملک کا بہترین سرمایہ تھی، قربان کردیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ تقریباً تین ماہ سے ہم اپنے اس سچے رفیق اور دنیا کے عظیم ترین انسان کی رفاقت وقیادت سے محروم ہوچکے ہیں، مگر ہم محسوس کرتے ہیں کہ گاندھی جی کی قربانی رائیگاں نہیں گئی۔ آپ کی سچائی اپنی برتی طاقتوں کا آج بھی مظاہرہ کررہی ہے اور مطالبہ کررہی ہے کہ ہندو اور مسلمانوں کے تنازعات کو ختم کرنے اور متحدہ قومیت کو ترقی دینے میں جان کی بازی لگا کر اپنے ملک کو ترقی اور عروج کے بلند مقام پر پہنچائیں۔

گاندھی جی کا حادثہ، آزاد ہندوستان کی پیشانی پر کلنگ کا ٹیکہ ہے، لیکن اطالوی اخبار ''یونٹا'' کے اس الزام کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ یہ سفاکانہ واردات صرف ایک آدمی کی دیوانگی کا نتیجہ نہیں بلکہ اس میں برطانوی استعمار کا ہاتھ کارفرما ہے۔

ہندوستان میں برطانوی خفیہ سروس کے آدمی موجود ہیں اور وہ اپنا کام کرنا جانتے ہیں، اس واردات میں یقیناً ان کا ہاتھ ہے۔

عراق، مصر، فلسطین، موگاڈیشیو (اٹلی) کے مقتولین اور یہ مقتول مہاتما، سب کے سب جارج ششم کے تارج کے ہیرے ہیں۔ یہ سب کچھ اس سوشلسٹ کہلانے والے وزیر

مسٹر بیون کی کارگذاریوں کا مسرت انگیز نتیجہ ہے۔

(انقلاب-لاہور: ۵رفروری ۱۹۴۸ء بہ حوالہ ٹائمز-لندن: ۲رفروری ۱۹۴۸ء)

فسادات کے سرچشمے:

فروری ۱۹۴۸ء: برصغیر میں ایسے لوگوں کی خاصی تعداد موجود تھی جو انصاف پسند تھے، فرقہ وارانہ جذبات سے بلند تھے، نفرت اور دشمنی کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں وہ انسانی نقطۂ نظر رکھتے تھے، وہ ہر واقعے کو، ہر حادثے کو اور ہر نقصان کو انسانیت کا نقصان سمجھتے تھے، لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس وقت جو طوفان بے تمیزی آیا ہوا تھا اس نے لوگوں کے حواس گم کر دیے تھے۔ ان حالات میں ان انسان دوستوں اور منصف مزاجوں کی بات سننے کے لیے کوئی تیار نہ تھا۔ لیکن فرقہ پرستی کے سب سے بڑے دشمن، انسانیت کے پرچارک، انسان دوستی کے سب سے بڑے علم بردار کے بہیمانہ قتل نے نہ صرف ملک کے ضمیر کو بے دار کر دیا بلکہ تڑپا دیا۔ پورے برصغیر میں تہلکہ مچ گیا اور فرقہ پرستی کے سدباب کے لیے ہر جگہ دیواریں کھڑی کی جانے لگیں۔ مولانا سید محمد میاں لکھتے ہیں:

مہاتما گاندھی کے حادثۂ قتل (۳۰رجنوری ۱۹۴۸ء) کے بعد جب تحقیق کی رفتار زیادہ تیز کر دی گئی تو کمیونسٹ اخبار "نیا زمانہ" بمبئی نے لکھا تھا:

> "یہ فسادات ریاستوں میں منظم کیے جاتے اور پھر شہروں اور دیہاتوں میں پھیلتے تھے۔ چناں چہ حکومت ہند نے اس کی روک تھام کے لیے اپنا خاص عملہ مقرر کیا جس نے ریاستوں میں چھاپے مارے ہیں۔ پچھلے مہینے حکومت ہند نے بھرت پور میں انسپکٹر جنرل آف پولیس کو بھیجا جس نے دو ہی روز میں اسلحہ کے کارخانے اور ہتھیاروں کے بھرپور گودام برآمد کر لیے۔ جب ریاست کے قلعے کی تلاشی لی گئی تو وہاں سے ایک ہتھیار بنانے کا کارخانہ اور ایک ہتھیار گھر ملا۔ جہاں سے بندوقیں، اسٹین گنیں، ٹامی گنیں، برین گنیں اور سیکڑوں بم اور ریوالور برآمد کیے گئے۔
>
> پولیس کوارٹروں میں اسلحہ بنانے کا ایک بہت بڑا کارخانہ ملا، جس میں ریاست کی بڑی بڑی مشینیں کام کرتی ہیں اور خود ریاست اس کارخانے کو چلانے کے لیے بجلی مہیا کرتی ہے۔ جب ہتھیاروں کے گوداموں پر چھاپہ مارا

گیا تو وہاں سے ہزاروں بم برآمد ہوئے اور بم بنانے کی مشینری بھی ملی۔
اس اسلحہ خانے کی کنجی ہمیشہ مہاراجہ کی تحویل میں رہتی تھی۔ جب راجہ کے شاہی محلوں کی تلاشی لی گئی تو وہاں سے بھی ہتھیاروں کا وسیع ذخیرہ برآمد کیا گیا۔
اسلحہ کو چھپانے کے لیے ریاست کے تمام محفوظ مقامات بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ چناں چہ قرب وجوار کے جنگلوں میں وسیع تالاب بنائے گئے ہیں جہاں تیزاب اور بارود کو محفوظ کیا ہوا ہے۔ معلوم ہوا ہے اس ریاست میں انقلاب کے دشمنوں کو پناہ دی جاتی ہے اور توڑ پھوڑ کی پالیسی کو کامیابی سے چلانے والوں کی بلا اجرت تربیت کی جاتی ہے۔"

القصہ: واقعات کی شہادت یہ ہے کہ جس زمانے میں ہندوستان آزادی کی طرف تیزی سے قدم بڑھا رہا تھا اور ہندوستانی زعما آئینی اور پرامن طوز پر برطانیہ سے حصول اختیارات کی جدوجہد میں مصروف تھے عین اسی زمانے میں ٹوری پارٹی کے انگریز کارکن سرزمین ہند میں فسادات کی بارودی سرنگیں بچھا رہے تھے۔ ابھی ۱۵/اگست آیا بھی نہ تھا کہ یہ سرنگیں پھٹنے لگیں اور تقریباً 1/3 ہندوستان کی اقلیتوں کو نذر آتش کرنے لگیں۔ تبادلۂ آبادی کی اسکیم نے اس آگ پر تیل کا کام کیا اور بربریت و وحشت کی وہ مثالیں پیش کر دیں جن کی نظیر سے ہندوستان کی تاریخ خالی تھی۔ (حیات شیخ الاسلام: ص ۸۷-۱۸۶)

گاندھی جناح تعلقات اور گاندھی جی کا قتل:

سری پرکاش لکھتے ہیں:

"یہ بھی ایک عجیب مسئلہ ہے کہ ہندوستانی ہندو یہ سمجھتے تھے کہ گاندھی جی مسلمانوں کی جانب داری کرتے تھے۔ اس وقت جب بٹوارے کی وجہ سے ہولناک حالات سامنے تھے تو عام ہندوؤں کا یہ نظریہ تھا کہ گاندھی جی کے دل پر ہندوؤں کی تکلیفوں کے مقابلے میں مسلمانوں کے مصایب کا زیادہ اثر ہوتا تھا۔ کسی چھوٹی سی مسجد کی بے حرمتی کی خبر سے بہ نسبت ایک بڑے مندر یا گردوارے کے برباد ہونے کا ان کو زیادہ صدمہ ہوتا تھا۔ مسٹر جناح تو گاندھی جی کو مسلمانوں کا بدترین دشمن سمجھتے تھے۔ جو لوگ مسٹر جناح سے اچھی طرح واقف تھے انھوں نے مجھے بتایا کہ مسٹر جناح چاہتے تھے کہ وہ اس ملک کے مسلمہ لیڈر

ہوں۔ لیکن جب گاندھی جی سیاست کے میدان میں آگئے اور طوفان کی رفتار سے لوگوں کے دلوں میں جگہ بناتے چلے گئے تو مسٹر جناح کی اسکیم میں رخنہ پڑ گیا۔ ابتدا میں تو کچھ عرصے تک یہ دونوں دوش بہ دوش کام کرتے رہے لیکن جلد ہی ایک دوسرے سے الگ ہو گئے، کیوں کہ گاندھی جی کے انوکھے خیالات اور طرز عمل مسٹر جناح کو بالکل ناپسند تھے۔ چوں کہ گاندھی جی کی قدامت آمیز طرز معاشرت کو عام مسلمان بہ نظر اشتباہ دیکھتے تھے، اس لیے آگے چل کر وہ (مسٹر جناح) مسلمانوں کے متفقہ لیڈر بن گئے۔ انگریزوں نے اپنے اصول حکمت "باہم مخاصمت پیدا کرا کے خود حکومت کرو" کے مطابق مسٹر جناح کی حمایت شروع کر دی۔ ابھی تک میرے علم میں کوئی ایسا انگریز نہیں ہے جس نے ہندو مسلم نزاع میں ان کی ہم نوائی نہ کی ہو اور اسی کے باعث پاکستان وجود میں آیا۔

میری گورنری آسام کے زمانے میں ایک انگریز مسٹر لیوس سے ملنے کا اتفاق ہوا، جو اس زمانے میں آسام تیل کمپنی کا افسر اعلا تھا۔ اس کی باتوں سے میں نے یہ اخذ کیا کہ وہ اپنے کو اصل حاکم آسام سمجھتا تھا اور یہ کہ حکومت کو اسی کی رائے کے مطابق چلنا چاہیے۔ آخر کار ایک بار مجھے اس سے کہنا پڑا کہ "میرا اور تمہارا دونوں کا حکم ساتھ ساتھ نہیں چل سکتا۔ اور میں اسی کو بہتر سمجھتا ہوں کہ میرا ہی حکم نافذ ہو۔" ایک مرتبہ سیاسی حالات اور تقسیم ملک کی بات چھڑ گئی۔ میں نے تجاہل کے انداز میں کہا کہ مجھے اس پر بڑی حیرت ہے کہ مسٹر جناح کو گاندھی جی سے اتنی نفرت تھی؟ یہ سنتے ہی بر لیوس جوش میں آگئے اور کہنے لگے "وہ نفرت کیوں نہ کرتے! گاندھی جی نے کہا تھا کہ مسٹر جناح کا اثر بالکل ختم ہو گیا ہے اس لیے مسٹر جناح یہ جتانا چاہتے تھے کہ ان کا اثر ہنوز باقی ہے۔" یہ سن کر مجھے بڑا تعجب ہوا کیوں کہ گاندھی جی کو اچھی طرح جانتے ہوئے مجھے اس کا یقین ہی نہیں آتا تھا کہ مسٹر جناح کے بارے میں انھوں نے کبھی ایسا گمان بھی کیا ہوگا اور اس قسم کے الفاظ استعمال کیے ہوں گے۔ مسٹر لیوس نے کہا کہ "مسٹر جناح نے یہ طے کر لیا تھا کہ وہ لندن میں قیام پذیر ہو کر وہیں پریکٹس کریں گے۔ جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ ان کے بارے میں گاندھی جی کا یہ خیال ہے کہ ان کا اثر زایل ہو گیا ہے اور اسی وجہ سے لندن چلے گئے ہیں تو مسٹر جناح کو بجا تردد ہوا، اور لندن سے قطع تعلق کر کے وہ ہندوستان واپس آگئے تا کہ گاندھی جی کو دکھا دیں کہ ان کا اثر اقتدار ہنوز باقی ہے۔"

من جملہ اور باتوں کے جو گاندھی جی کو نقصان پہنچانے کے لیے گھڑی اور شایع کی گئیں ایک

روایت یہ بھی ہے۔ چند اور انگریزوں سے بھی مسٹر جناح اور پاکستان کے متعلق گفتگو ہوئی مگر انتہائی کوشش کے باوجود میں ان کو ہندوستان اور کانگریس کا نقطۂ نظر سمجھانے میں ناکام رہا۔ ایک انگریز نے تو کہا کہ ہندوستان تو پاکستان کی ایسی چھوٹی ریاست کو پامال کرنے پر تلا ہوا ہے۔ کم از کم مجھے تو اس بات کا یقین ہے کہ انگریزوں نے پاکستان بنوا کر اپنا تین سو برس کا کارنامہ ملیامیٹ کر دیا۔ مجھے اس کا بھی صدمہ ہے کہ ہمارے لیڈر تقسیم ملک پر راضی کیوں ہو گئے۔

واقعات جو بھی ہوں مگر جو باتیں میرے علم میں ہیں ان سے تو میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ گاندھی جی توازن قایم رکھنا چاہتے تھے اور انصاف پسند ہونے کے ساتھ وہ چاہتے تھے کہ اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کے ساتھ فیاضانہ سلوک کیا جائے۔ خود ہندو تو یہ سمجھتے تھے کہ گاندھی جی ہندوؤں کو خسارے میں ڈال کر مسلمانوں کی جانب داری کرتے ہیں۔ دہلی میں ان کی ''پرارتھنا'' کے جلسوں میں وقتاً فوقتاً جو ہنگامے ہونے لگے تھے ان سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ان کی جان لینے کی سازش ہو رہی تھی۔ بہ ذات خود ان کو قطعاً پریشانی نہ تھی اور ان کی حفاظت کے لیے حکومت جو تدبیریں اختیار کرتی تھی ان کو وہ پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن سازشی گروہ حکومت سے زیادہ ہوشیار تھا۔ بالآخر ۳۰ر جنوری ۱۹۴۸ء کو اس بے قصور انسان کو جس کا شمار دنیا کی اعلاترین ہستیوں میں ہے، جب وہ اپنے کمرے سے نکل کر ''پرارتھنا'' کے جلسے میں جا رہا تھا گولی کا نشانہ بنا کر اس کی جان لینے میں یہ گروہ کامیاب ہو گیا۔ یہ خبر بہت شہرت پذیر تھی کہ پچپن کروڑ روپیہ جس کا مطالبۂ پاکستان کسی مد میں کر رہا تھا، ہندوستان اس کو دینے سے انکار کر رہا تھا۔ سردار پٹیل نے لکھنؤ میں ایک جلسے میں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ یہ مطالبہ ہرگز پورا نہ کیا جائے گا۔ گاندھی جی نے دھمکی دی کہ اگر روپیہ نہ دیا جائے گا تو وہ ''مرن برتھ'' (صومِ مسلسل یہاں تک کہ موت آ جائے) رکھیں گے۔ چناں چہ گورنمنٹ آف انڈیا کی صحیح رائے کے باوجود یہ رقم ادا کر دی گئی، اس نے ان سازشیوں کو اور طیش آیا۔ اس سانحے سے سارے عالم کو صدمہ ہوا، لیکن مجھے اس میں شک ہے کہ ان قاتلوں کو بھی افسوس ہوا ہو۔ بہت سے قصے مشہور ہو گئے کہ اس خبر کے معلوم ہونے پر کچھ لوگوں نے خوشیاں منائیں۔ لیکن یہ محض خیالی باتیں تھیں جن پر بالکل توجہ نہ دینا چاہیے۔ مگر اتنا تو میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ کچھ حلقوں میں اس قبیح فعل کی ذرا بھی مذمت نہیں کی گئی۔

سہ پہر کے آخری لمحات میں جب دن بھر کام کر کے میں اپنے اسٹاف کے چند لوگوں کے ساتھ بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ ایک شخص دوڑتا ہوا میرے کمرے میں آیا اور کہنے لگا کہ دہلی سے یہ خبر نشر کی گئی ہے کہ گاندھی جی مار ڈالے گئے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے یہ سن کر کہا تھا ''کیا مہمل بک رہے ہو'' ساتھ ہی یہ بھی کہ یہ بالکل ناممکن ہے۔ پھر میں ناشتہ کرنے ہی والا تھا کہ ایک اور شخص نے آکر اس الم ناک خبر کی توثیق کی۔ اس کے بعد کھانے پینے کا سوال ہی نہ تھا، ہم سب ایک سکتے اور اضطراب کے عالم میں تھے۔ چند مسلمان احباب اور خاص کر خواتین تیزی سے آئیں اور اظہار تعزیت کرنے لگیں۔ ہم سب کے جسم سن ہو گئے تھے اور آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ مجھ میں اتنی سکت نہ تھی کہ کچھ جواب دے سکتا۔ چھ بجے ریڈیو سے یہ خبر نشر ہوئی اور سارا پروگرام منسوخ کر کے اسی کا اعادہ ہوتا رہا۔

(پاکستان — قیام اور ابتدائی حالات: ص ۹۷-۹۵)

مسٹر جناح، بادشاہ خان، پختونستان.....!

۲۳ر فروری ۱۹۴۸ء: ۲۳ر فروری ۱۹۴۸ء کو باچا خان نے پاکستان کی پارلیمنٹ کے اجلاس میں پہلی مرتبہ شرکت کی۔ وہ چاہتے تو ہندوستان کی آئین ساز اسمبلی کے حسب سابق رکن رہ سکتے تھے لیکن انھوں نے پاکستان کی اسمبلی کا رکن رہنے کو ترجیح دی اور حلف وفاداری اٹھایا۔

اس پر بانیٔ پاکستان قایداعظم محمد علی جناح بہت خوش ہوئے، انھوں نے باچا خان کو چائے پر مدعو کیا۔ دونوں عظیم رہنماؤں میں ملکی مفادات کے بارے میں گفتگو ہوئی، ماضی کی شکر رنجیاں اور چشمک کا دور لد گیا۔ قایداس حد تک مسرور تھے کہ انھوں نے باچا خان سے بلا تکلف کہا ''آج میرا پاکستان کا خواب پورا ہوا۔'' باچا خان کا کہنا تھا کہ قایدِاعظم بڑے تپاک اور گرم جوشی سے ملے اور انھوں نے مصافحہ کیا اور خلاف معمول معانقہ بھی، وہ واپسی پر کار تک چھوڑنے آئے، اپنے ہاتھ سے دروازہ کھولا اور کار کی روانگی تک کھڑے رہے۔ قایدِاعظم کے حسن اخلاق نے باچا خان کو بھی بہت متاثر کیا۔ اس ملاقات کی کامیابی اور اس پر خوشی کا اندازہ اس امر سے بہ خوبی لگایا جا سکتا ہے کہ قایدِاعظم نے مزید گفت وشنید کے لیے انھیں اگلے روز کھانے پر مدعو کیا۔ کھانے کے بعد قایدِاعظم باچا خان کو ایک علاحدہ کمرے

میں لے گئے جہاں ایک گھنٹے تک دونوں رہنماؤں کے درمیان پاکستان کے مستقبل کے بارے میں بات چیت ہوئی۔

قایدِاعظم نے باچا خان سے پوچھا اب آپ کا کیا پروگرام ہے؟ باچا خان نے کہا کہ اب آزادی حاصل ہوگئی ہے۔ میں خدائی خدمت گار کا پرانا اصلاحی پروگرام شروع کرنا چاہتا ہوں۔ باچا خان نے قاید کو خدائی خدمت گار تحریک کے اغراض و مقاصد بتائے اور واضح کیا کہ انگریزوں نے کس طرح اس سوشل تحریک کا رخ سیاست کی طرف موڑا تھا۔ باچا خان کی باتیں سن کر قایدِاعظم اپنی نشست سے بڑے پرجوش انداز میں اٹھ کر کھڑے ہوئے اور خلاف عادت باچا خان کو گلے سے لگالیا اور کہا کہ ''ایسے کام کے لیے میں ہر قسم کی مدد کروں گا۔'' باچا خان نے جواب دیا کہ ''مجھے صرف آپ کے اعتماد اور اخلاقی مدد کی ضرورت ہے۔''

قایدِاعظم نے کہا کہ ''میں ملک کا آئینی سربراہ ہوں، میری نظر میں سب جماعتیں یک ساں حیثیت رکھتی ہیں۔'' باچا خان نے قایدِاعظم کو صوبہ سرحد کا دورہ کرنے کی دعوت دی۔ قایدِاعظم نے بتایا کہ سرحد کا دورہ کرنے کا ان کا پروگرام ہے، جب وہ سرحد آئیں گے تو خدائی خدمت گاروں کے ہیڈ کوارٹر کا دورہ بھی کریں گے اور وہاں خدائی خدمت گار کے دیگر لیڈروں سے ملاقات کریں گے۔ نیز قایدِاعظم نے باچا خان سے یہ بھی کہا کہ وہ چالیس ہزار چرخے بنوانے کا بندوبست کریں۔ قایدِاعظم تعمیری پروگرام کی ابتدا اپنے ہاتھ سے چرخہ چلا کر کرنا چاہتے تھے۔

پاکستان کی سیاست میں ایک نئی خوش گوار صورت پیدا ہونے کے امکانات پیدا ہونے لگے تھے، جس کی کامیابی سے ملک ایسی ڈگر پر چل نکلتا، جہاں سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے لیے کوئی موقع نہ ہوتا۔ ملک جمہوری خطوط پر آگے بڑھتا، کالے قوانین کا خاتمہ ہوتا، انسانی عزوشرف کو ملحوظ رکھا جاتا، کسی کو انصاف سے محروم نہ بنایا جاسکتا۔ اصول واقدار کا بول بالا ہوتا، ملک ترقی کرتا اور عوام خوش حال زندگی بسر کرنے کے قابل ہوسکتے۔ لٹیروں، غاصبوں، خودغرضوں، موقع پرستوں، خوشامدیوں، چاپلوسوں، اسلام کے نام نہاد غم خواروں اور ہوس اقتدار کے بھوکوں کے لیے پاکستان میں کوئی جگہ نہ ہوتی۔ اب حالات نے ایسا رخ اختیار کرلیا تھا جس سے ان طبقات کا مستقبل تاریک ہورہا تھا، بات تنازع للبقاء کے مقطع

میں آن پڑی تھی۔ قوم کے حقیقی غم خواروں اور خوں خواروں کے درمیان پاکستان میں بھی معرکہ شروع ہو گیا تھا۔ ملاقات سے ان حلقوں میں کھلبلی مچ گئی تھی اور ملاقات کے نتیجے میں جو خوش گوار فضا قایم ہوئی تھی اسے نیست و نابود کرنے کے لیے سازشوں کے جال بنے جانے لگے تھے۔ (پختون قوم اور باچا خان)

۵ر مارچ ۱۹۴۸ء: ایک تو ملاقاتوں سے فضا خوش گوار ہو گئی تھی دوسرے ۵ر مارچ ۱۹۴۸ء کو پاکستان کی پہلی آئین ساز اسمبلی میں باچا خان نے تقریر کر کے رہی سہی کسر بھی نکال دی، اس سے ماحول مزید بہتر ہو گیا۔ اس روز جب ایک لمبا تڑنگا شخص کھدر کا سادہ لباس زیب تن کیے کھدر کی چادر اوڑھے اور اسی سے سر ڈھانپے ایوان میں کھڑا ہوا، جس کی صدارت مولوی تمیز الدین خان نایب صدر آئین ساز اسمبلی کر رہے تھے، تو سارے ایوان کی آنکھیں کھدر پوش خدائی خدمت گار رہنما کی جانب اٹھ گئیں۔ انھوں نے صدر کے توسط سے ایوان سے خطاب کرتے ہوئے اپنی ماضی کی سیاست پر روشنی ڈالی اور پاکستان کی تعمیر و ترقی کے سلسلے میں اپنے اور اپنی جماعت خدائی خدمت گار کے عزایم کا اظہار کیا۔ باچا خان اور قایدِ اعظم کے درمیان ملاقات اور افہام و تفہیم سے خود غرض اور مفاد پرست حلقوں میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ باچا خان نے اپنی تقریر میں ان شکوک و شبہات کو دور کرنا شروع کیا تو اس سے بدگمانیوں کے بادل چھٹنے لگے، اس سے ان عناصر کا پریشان ہونا لازمی امر تھا، جب اس طائفے نے باچا خان کی تقریر کا رنگ جمتے ہوئے دیکھا تو ان کی تقریر میں مداخلت شروع کر دی۔ لیکن وزیرِ اعظم نواب زادہ لیاقت علی خان، راجہ غضنفر علی خان اور ملک فیروز خان نون کی مداخلت باچا خان کے عزم و استقلال کو متزلزل نہ بنا سکی۔ انھوں نے اپنی تقریر جاری رکھی اور بڑے اعتماد سے مسکت جوابات دیے۔ یہاں ان کی تقریر کے بعض اہم حصے دیے جاتے ہیں۔

”میں نے تخفیف زر کی جو تحریک پیش کی ہے اس کا مقصد حکومت کو گرانا ہرگز نہیں ہے اور نہ ہی اس سے حکومت کی عیب جوئی مقصود ہے، دراصل میں حکومت کے بعض ذمے دار افراد اور دیگر جوانب سے اپنے بارے میں پیدا کردہ غلط فہمیوں کو دور کرنا چاہتا ہوں۔

میرے اور میری جماعت کے بارے میں اکثر کہا جاتا ہے کہ ہم پاکستان کے دشمن ہیں، ہم اسے تباہ و برباد کرنا چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں میں زیادہ دلیل بازی سے کام لینا

نہیں چاہتا۔ صرف یہ کہنا چاہتا ہوں مجھے اپنے صوبے میں جب بھی اظہار کا موقع ملا ہے میں نے اس پہلو پر خوب روشنی ڈالی ہے، مجھے جب بھی موقع ملتا ہے میں اس کی وضاحت کرتا رہتا ہوں، لیکن اس کے باوجود پاکستان کے ذمے دار حضرات شکوک و شبہات پھیلانے میں مصروف ہیں۔ آیا میں پاکستان کا دشمن ہوں یا دوست؟ شاید میں پاکستان کو تباہ کرنا چاہتا ہوں، لیکن یہ حضرات اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ میں نے متعدد مرتبہ غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی، یہ حضرات اس حقیقت سے بھی آگاہ ہوں گے کہ مجھے صوبے میں جب بھی عوام سے گفتگو کرنے کا موقع ملا، میں نے انھیں بڑے واضح الفاظ میں کہا کہ بے شک میری رائے تھی کہ ہندوستان تقسیم نہیں ہونا چاہیے۔ میرے اختلاف کی وجہ وہ نتائج ہیں جو ہندوستان میں آج سامنے آ رہے ہیں، ہزاروں نوجوان، بوڑھے، بچے اور عورتیں قتل ہو رہے ہیں۔ لیکن اب ملک تقسیم ہو چکا ہے، ہمارا تنازعہ ختم ہو گیا ہے۔

میں نے ہندوستان کی تقسیم کے خلاف کئی تقاریر کیں۔ سوال یہ ہے کہ کسی نے میری آواز پر کان دھرا؟ ہم نے صوبۂ سرحد کی مسلم لیگی حکومت کو پیش کش کی کہ آپ نظم و نسق کو اطمینان سے چلائیں، لیکن پٹھانوں کے ساتھ حکومت نے جو سلوک کیا وہ مشکل سے ہی برداشت کے قابل تھا۔ لوگ اکثر میرے پاس آتے تھے اور کہتے تھے کہ پاکستان نے ہمارے ساتھ جو سلوک روا رکھا ہوا ہے ہم اسے برداشت نہیں کر سکتے، آپ کس سوچ میں پڑے ہوئے ہیں اور آپ کے ارادے کیا ہیں؟ ہم وہ لوگ ہیں جو دنیا کی طاقت ور ترین قوت برطانیہ سے لڑے ہیں، کیوں کہ وہ ہم پر حکم رانی کرنا چاہتے تھے، میں نے انھیں سمجھایا کہ اب صورت حال بالکل مختلف ہے، وہ غیر ملکی جوا تھا اور اب مسلمانوں کی اپنی حکومت ہے۔ میں نے حکومت پاکستان سے کئی مرتبہ کہا کہ ہم آپ کا حقِ حکم رانی تسلیم کرتے ہیں۔ ہمیں ہلاکت آفرین تنازعہ سے پھنسانے کی کوششیں ہو رہی تھیں، کیوں کہ جنگ باز یہ امید لگائے ہوئے تھے کہ قومی اور حب الوطنی کے جذبات کا رخ اس جانب موڑ دیا جائے اس سے حکومت کا تعمیری کام رک جائے۔ میں نے یہ خطرہ بھانپ لیا تھا۔ آپ میرے بارے میں کوئی بھی رائے رکھیں، لیکن میں واضح کرنا چاہتا ہوں کہ میں تعمیری آدمی ہوں تخریبی نہیں۔ اگر آپ میری زندگی کو دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ میں نے اپنی زندگی ملک کی فلاح و بہبود اور تعمیر و ترقی کے لیے وقف کر رکھی ہے۔ خدائی خدمت گار سیاسی نہیں سماجی

تحریک ہے، لیکن یہ ایک طویل داستان ہے، اسے یہاں دہرانا نہیں چاہتا۔ لیکن میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس تحریک کو سماجی سے سیاسی بنانے کی ذمے داری کس پر عاید ہوتی ہے؟ برطانیہ پر۔ ہم کو کانگریس کے ساتھ اتحاد کرنے پر کس نے مجبور کیا؟ برطانیہ نے۔ میں اس حقیقت کا اظہار یہاں ہی نہیں کر رہا ہوں بلکہ میں نے یہ بات اعلا پایے کے انگریزوں سے بھی کہی ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بات کرنے کی جرأت دے رکھی ہے۔

ہم پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ خدائی خدمت گار حکومت کو تعمیری کام نہیں کرنے دیتے۔ انھوں نے کہا کہ خدائی خدمت گار حکومت کے تعمیری کاموں میں پورا پورا تعاون کریں گے۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا اور اب اس ایوان کے سامنے اعلان کرتا ہوں کہ میں اور میری جماعت ملک کی تعمیر اور ترقی کے لیے آپ کی ہدایت پر عمل کرنے کے لیے تیار ہے۔

میں تقریباً سات ماہ تک پاکستان کی انتظامیہ کا مطالعہ کرتا رہا، لیکن مجھے پاکستان اور برطانیہ کی انتظامیہ میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ ہوسکتا ہے میرا مشاہدہ غلط ہو لیکن یہ تاثر تو عام پایا جاتا ہے اس سے میرے نقطۂ نظر کی توثیق ہوتی ہے۔ آپ عوام کی آواز کو طاقت کے بل بوتے پر دبا سکتے ہیں۔ لیکن یاد رکھیں! جبر یا قوت دیرپا نہیں ہوتے۔ جبر سے وقتی طور پر مقصد حاصل ہوسکتا ہے۔ اگر آپ نے جبر سے کام لیا تو عوام آپ سے نفرت کرنے لگیں گے۔ اس کو چھوڑیے! میں آپ کو بتاتا ہوں کہ آج پاکستان میں برطانوی دور سے زیادہ کرپشن ہے اور برطانوی عہد سے زیادہ بےچینی پائی جاتی ہے۔

میں دوستانہ جذبات لے کر آیا ہوں۔ براہِ کرم ان حقایق کے بارے میں غور فرمائیں جو میں آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ اگر آپ میری معروضات کو پاکستان کے لیے سودمند خیال کریں تو بہتر ہے، بہ صورت دیگر نظر انداز کردیں۔ میرا سوال ہے کہ ہم نے برطانیہ کے خلاف جدوجہد کیوں کی؟ ہم نے انھیں ملک سے نکالنے کے لیے جنگ لڑی تاکہ ملک ہمارے قبضے میں آئے اور ہم اس پر حکومت کریں۔ لیکن صورت حال یہ ہے کہ آج پاکستان میں سابقہ دور سے زیادہ برطانوی باشندے حکومتی عہدوں پر فایز ہیں اور میری اطلاع کے مطابق مزید کو بلایا جارہا ہے۔ بدقسمتی سے ہم صوبۂ سرحد اور قبایلی علاقوں میں وہی پرانے حربے استعمال کر رہے ہیں اور اسی پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔ ہمیں اس میں کوئی

تبدیلی نظر نہیں آ رہی ہے۔ ہمارے ہندو بھائیوں نے ہندوستان میں اپنے صوبوں میں ہندوستانی گورنر مقرر کیے ہیں بلکہ عورت کو بھی گورنر بنایا ہے۔ کیا بنگال اور پنجاب میں ایک مسلمان بھی ایسا نہیں تھا جو ہمارا گورنر بننے کا اہل ہوتا؟ انگریزوں کو ہم نے نکال باہر پھینکا تھا مگر انھیں واپس بلا کر ہمارے سروں پر بٹھایا جا رہا ہے۔ کیا یہ اسلامی بھائی چارے کے جذبے سے ہو رہا ہے؟ کیا آپ اسے اخوت قرار دیں گے؟ کیا یہ اسلامی مملکت پاکستان ہے؟ انتظامیہ میں یہی ایک خرابی نہیں ہے بلکہ اور بھی برائیاں ہیں۔ حکومت وہی آرڈیننس جاری کرنے میں مصروف ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر شدید دکھ ہوا کہ سرحد کی صوبائی حکومت جب بھی کوئی کمیونک جاری کرتی ہے تو اس کی زبان اور جذبہ وہی پرانا ہوتا ہے۔ جو خاص طور پر برطانوی راج میں رائج تھا۔ اگر انگریز دروغ گوئی سے کام لیتا تھا، وہ تو غیر ملکی تھا، وہ یہاں ہماری فلاح و بہبود کے لیے نہیں آئے تھے۔ وہ تو ہمارا استحصال کرنے کے لیے آئے تھے، ان کے اپنے مفادات تھے۔ لیکن مجھے انگریزوں سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ مجھے تو اب پاکستان سے گلہ ہے کیوں کہ پاکستانی ہمارے بھائی ہیں اور ان کی حکومت ہماری حکومت ہے۔

ہمیں اب برطانوی دور کی پرانی چال بازیاں ترک کر دینا چاہییں۔ اگر ہم نے پرانے حربے نہ چھوڑے تو پاکستان جسے ہم نے بڑے مصائب اٹھا کر حاصل کیا ہے ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔''

باچا خان پر صوبہ پرستی اور صوبائی عصبیت پھیلانے کا الزام تھا۔ انھوں نے ایوان کے سامنے اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:

''مجھ پر صوبائی اور جداگانہ قومیت کے جذبات ابھارنے کا الزام لگایا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ حضرات نے خود صوبائیت کو جنم دیا، پٹھان ان باتوں کو نہیں جانتے، آپ کے سامنے سندھ کا معاملہ ہے کیا یہ صوبائیت ہم نے پھیلائی ہے؟ سوال پیدا ہوتا کہ صوبائیت کس طرح جنم لیتی ہے؟''

اس موقع پر راجہ غضنفر علی نے باچا خان کی تقریر میں مداخلت کرتے ہوئے کہا ''ہم صوبائیت پر یقین نہیں رکھتے بلکہ ہمارا یقین پاکستان پر ہے۔''

باچا خان نے اس کے جواب میں کہا ''صوبائیت کا درس کس نے دیا؟ پنجابیوں

نے۔ آپ اسلام کے مقدس نام پر وقتی طور پر عوام کا استحصال کر سکتے ہیں لیکن یہ سلسلہ تادیر نہیں چل سکتا، یہ عارضی ثابت ہوگا۔

باچا خان حقیقت حال بیان کر رہے تھے تو ان کے بارے میں پیدا کردہ شکوک و شبہات دم توڑ رہے تھے۔ پارلیمنٹ کے اراکین پر مثبت اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ حکومتی بنچوں نے دیکھا کہ راجہ غضنفر علی خان کی مداخلت کے باوجود باچا خان کے زور خطابت اور حق بیانی میں کوئی فرق نہیں آیا اور تیر رائیگاں گیا ہے تو وزیر اعظم نواب زادہ لیاقت علی خان نے خود مداخلت کی۔ ''ایسے حالات جان بوجھ کر پیدا کیے گئے ہیں۔'' وزیر اعظم نے کہا:

''میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں آپ جس قدر زیادہ اس مسئلے کو اچھالیں گے تو فضا اس سے زیادہ ناخوش گوار ہوگی لیکن میں تلخی پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ آپ میری عادت سے واقف ہیں، میں تقریریں کرنا پسند نہیں کرتا۔ میں آپ کے سامنے پہلی مرتبہ گفتگو کر رہا ہوں، اس سے میرا مقصد یہ ہے کہ آپ میرے خیالات اور نظریات کے بارے میں جان سکیں۔''

باچا خان نے کہا:

''انھوں نے وزیر اعظم کو یاد دلاتے ہوئے کہا'' آپ جب پہلی مرتبہ پشاور آئے تھے تو اس وقت ہمارے مسلم لیگی بھائیوں نے بھی آپ کے سامنے پختونستان کا مطالبہ پیش کیا تھا۔ آپ نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ ''وہ خیبر سے چٹاگانگ تک سب مسلمانوں کو متحد کرنا چاہتے ہیں۔'' اگر ہم پٹھانوں کو اکٹھا کرنا چاہتے ہیں جن کو انگریزوں نے اپنے مفادات کے لیے تقسیم کیا تھا تو اس پر اعتراض کیوں کیا جاتا ہے اور یہ کس طرح اسلام کے خلاف اقدام ہے؟ پٹھانوں کو متحد کرنے کے لیے ہم آپ کی امداد کے طلب گار ہیں۔''

ملک فیروز خان نون جن کے آبا و اجداد برطانوی سرکار کے خدمت گذار تھے اور انھیں بھی انگریزی حکومت سے وفاداری اور خدمت گذاری کے صلے میں ''سر'' کا خطاب عنایت ہوا تھا، نے فقرہ کسا ''اور پٹھان متحد ہو کر افغانستان سے جا ملیں۔''

باچا خان نے اس کا ترکی بہ ترکی جواب دیا ''ہم صرف آپ کے ساتھ الحاق کر سکتے ہیں افغانستان کے ساتھ نہیں۔ افغانستان کی نسبت آپ کا ہم پر زیادہ حق ہے۔ جب بنگالی بھائی دو ہزار میل دور رہتے ہوئے ہمارے ساتھ مل سکتے ہیں اور ہمارے بھائی بن سکتے ہیں

تو ہمارے اپنے پٹھان بھائی جو کہ بہت زیادہ نزدیک رہتے ہیں اور جنھیں برطانیہ نے تتر بتر کیا تھا متحد ہو کر آپ کے لیے کس طرح خطرہ بن سکتے ہیں؟ آپ ہمارے بھائی ہیں۔ آپ ہم سے کیوں خوف زدہ ہیں؟

لیاقت علی خان نے استفسار کیا ''آپ اس کی وضاحت کریں۔''

''میں آپ کو بتاتا ہوں کہ پختونستان سے ہماری مراد کیا ہے۔'' خان عبدالغفار خان نے جواب دیا۔ اس صوبے کے باشندوں کو سندھی کہا جاتا ہے اور ان کے علاقے کا نام سندھ ہے۔ اسی طرح پنجاب اور بنگال کی سرزمین پر بسنے والے پنجابی اور بنگالی کہلاتے ہیں۔ صوبہ سرحد کے عوام ایک ہیں، ہمارا علاقہ پاکستان کی حدود کے اندر واقع ہے، ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے علاقے کا نام بھی وہاں کے عوام کی تہذیب و ثقافت کا مظہر ہو۔ کیا یہ خواہش اسلام کی رو سے گناہ ہے؟''

نواب زادہ لیاقت علی کان نے پوچھا ''کیا پٹھان ملک کا نام ہے یا گروہ ہے۔''

باچا خان نے کہا ''پٹھان ایک گروہ کا نام ہے اور ہم اپنے علاقے کا نام پختونستان رکھنا چاہتے ہیں۔ میں واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے عوام ہم کو پٹھان کہتے ہیں اور اہل فارس ہمیں افغان پکارتے ہیں۔ ہمارا اصل نام پختون ہے، ہم پختونستان چاہتے ہیں اور ہماری خواہش ہے کہ ڈیورانڈ لائن کے اس طرف آباد پشتونوں کو متحد کر کے ان کے علاقے کا نام پختونستان رکھ دیا جائے۔ آپ اس سلسلے میں ہماری مدد کریں۔ اگر آپ کا استدلال یہ ہے کہ اس سے پاکستان کم زور ہوگا تو میں کہتا ہوں کہ سیاسی اکائی قایم کرنے سے پاکستان کبھی کم زور نہ ہوگا بلکہ مضبوط تر ہوگا۔ بہت سی مشکلات کی وجہ عدم اعتماد کی فضا ہے، جب اعتماد بہ حال ہوگا تو دشواریاں ختم ہو جائیں گی۔ حکومت کا کام خوش اعتمادی کی بنیاد پر زیادہ بہتر چلتا ہے اعتماد کے فقدان کے ماحول میں نہیں۔''

پاکستان کے بارے میں میرا تصور یہ ہے کہ یہ آزاد پاکستان ہو۔ یہ کسی خاص فرقے یا فرد کے زیر تسلط نہ ہو۔ پاکستان پر اس ملک کے تمام باشندوں کا یک ساں حق ہونا چاہیے۔ اس کے وسایل سے سب یک ساں لطف اندوز ہوں اور چند لوگوں کو اس کا استحصال کرنے کا حق حاصل نہیں ہونا چاہیے۔ اس ملک پر اس کے عوام کی حکم رانی ہونا چاہیے۔ جہاں تک فنی ماہرین کا تعلق ہے تو پاکستان کو ایسے لوگ امریکا اور برطانیہ سے منگوانا

چاہئیں جہاں تک انتظامی امور کا تعلق ہے اس سے اتفاق نہیں کر سکتا کہ پاکستان اہل افراد سے تہی دامن ہے اور یہاں سب لوگ نااہل ہیں۔ جب ہندو اپنے معاملات سنبھال سکتے ہیں تو ہم کیوں اپنا کام خود نہیں کر سکتے؟ کئی انگریزوں کو یہاں روک لیا گیا ہے اور کئی ایک واپس آرہے ہیں۔ میں کہنا چاہتا ہوں کہ یہ پاکستان کے لیے مفید نہیں ہوگا۔''

(پختون عوام اور باچا خان: ۲۳-۱۸)

جناح صاحب، پاکستان اور بعض تضادات:

۲۴؍مارچ ۱۹۴۸ء: پاکستان کی تخلیق کرنے والوں اور عوام میں جو تضادات تھے وہ خود جناح صاحب کی زندگی ہی میں نظر آنے لگے تھے۔ جناح صاحب خود اردو نہیں جانتے تھے، گجراتی ان کی مادری زبان تھی اور انگریزی ان کی بتا کا ذریعہ۔ سارے کا سارا بنگالی پاکستان اردو نہیں جانتا تھا۔ مگر یونائیٹڈ پراونس لابی کے دباؤ کی وجہ سے اردو پاکستان کی قومی زبان قرار پائی۔ ۲۴؍مارچ ۱۹۴۸ء کو جب ڈھاکہ یونی ورسٹی کے طالب علموں کو جناح صاحب خطاب کرنے گئے تو انھوں نے ان کو آگاہ کرتے ہوئے کہا تھا ''اس سلسلے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہونا چاہیے، ملک کی صرف ایک ہی زبان ہو سکتی ہے..... اور وہ صرف اردو ہی ہو سکتی ہے۔ ہربرٹ فیلڈ مین (دی انڈ اینڈ دی بگننگ: پاکستان ۷۱-۱۹۶۹ء آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس) نے کچھ زیادہ صفائی سے یہ بات کہی ہے:

> ''یہ بات مشکوک ہے کہ خود محمد علی جناح ان سیاسی الجھنوں سے واقف تھے جو اس پاکستان میں فطری طور پر مضمر تھیں جو بالآخر انھوں نے منظور کیا تھا۔'' (ہندوستان اپنے حصار میں: ص ۲۸)

ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل — حضرت شیخ الاسلام کے افادات:

۲۶؍۲۷؍اپریل ۱۹۴۸ء: جمعیت علماے ہند کے پندرھویں سالانہ اجلاس بمبئی کے خطبۂ صدارت میں ''ہندوستان میں مسلمان کا مستقبل'' کے موضوع پر حضرت شیخ الاسلام نے ان خیالاتِ زریں کا اظہار فرمایا:

درست ہے کہ ہندوستان کی تقسیم نے وطنِ عزیز کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ مسلمانوں کے لیے یہ تقسیم تباہ کن ثابت ہوئی ہے۔

وطنِ عزیز کا صرف آٹھواں حصہ کٹ کر جدا ہوا ہے لیکن مسلمانوں کا نصف سے زاید حصہ جدا ہو گیا۔ اور مسلمانوں کا تناسب 1/4 سے گھٹ کر تقریباً 1/7 رہ گیا ہے۔ اسمبلیوں، کونسلوں اور ملازمتوں میں پہلے ۳۰ یا ۳۳ فیصدی حقوق حاصل تھے، اب وہ ۱۳، ۱۴ فیصدی رہ گئے ہیں۔ تجارت کے سلسلے میں جو حیثیت حاصل تھی اس کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ چکا ہے لیکن ان تمام نقصانات کے باوجود امید ہے کہ انڈین یونین کے مسلمانوں کا مستقبل تاریک نہیں ہوگا۔

انڈین یونین کی دستور ساز اسمبلی طے کر چکی ہے کہ ہند کا نظام حکومت جمہوری ہوگا اور اس کی بنیاد کسی خاص فرقے کے مذہب پر نہیں ہوگی۔ انتخابات میں مسلمانوں کے لیے بہ قدر تناسب آبادی نشستیں مخصوص کر کے باقی پر مقابلے کا حق دے چکی ہے۔ ملازمتوں میں ایک تناسب معین کر کے قابلیت کے معیار پر مزید اضافے کا حق تسلیم کر چکی ہے۔ صوبائی اور مرکزی وزارت میں مسلم وزرا موجود ہیں اور جن صوبوں میں اس وقت مسلم وزرا نہیں ہیں توقع ہے کہ آیندہ انتخابات اس خامی کو دور کر دیں گے۔

عام شہری زندگی کے لحاظ سے جو تلخی اس وقت موجود ہے وہ عارضی ہے جو تقریباً ڈیڑھ سو سالہ تفرقہ انگیز برطانوی پالیسی کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے اور گزشتہ دس سال کی رجعت پسندی اور اشتعال انگیز تحریک نے اس کو ہوا دی ہے۔ یقین ہے مخلوط انتخاب بہت جلد خلیج کو پاٹ دے گا اور تلخی خوش گوار تعلقات کی شیرینی سے بدل جائے گی۔

یہ تمام حالات مستقبل کے متعلق ہمیں امید دلا رہے ہیں۔ البتہ اگر مسلمانوں کی خواہش ہے کہ ان کا مستقبل زیادہ شان دار اور روشن ہو تو ان کا فرض ہے کہ اپنے عمل اور کردار سے اپنی اہمیت اور افادیت کو ثابت کریں۔ انڈین یونین کے لیے جس قدر وہ زیادہ مفید ثابت ہوں گے اتنی ہی ان کی عزت اور وقعت ہوگی۔ جمہوری نظام حکومت میں نسل، مذہب یا خاندان ترقی کا مدار نہیں ہوتا۔ خدمت اور قابلیت معیارِ ترقی ہوا کرتا ہے۔ ملک و ملت کی خدمت کا صحیح جذبہ پیدا کریں، بہترین خدمت کی قابلیت پیدا کریں۔ لامحالہ کامیابی اور کامرانی ان کے ہم آغوش ہوگی۔

تقسیم ہندوستان نے مسلم مفادات کو بھی تقسیم کر دیا ہے۔ جس طرح یہ ضروری نہیں کہ جو معاملہ پاکستان کے لیے مفید ہو وہ انڈین یونین کے لیے بھی مفید ہو، بلکہ بسا اوقات

پاکستان اور ہند کے مفاد میں تضاد پیدا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری نہیں کہ جو معاملہ پاکستانی مسلمانوں کے لیے مفید ہو وہ انڈین یونین کے مسلمانوں کے لیے بھی مفید ہو، بلکہ ممکن ہے کہ کوئی معاملہ پاکستانی مسلمانوں کے لیے مفید ہو اور انڈین یونین کے مسلمانوں کے لیے تباہ کن ہو۔ جب مفادات میں اس طرح تضاد ہو، تو سوال یہ ہے کہ ہمیں انڈین یونین کے مسلمانوں کے مفاد کا لحاظ رکھنا ہوگا یا پاکستانی مسلمانوں کے مفاد کا۔ ظاہر ہے کہ ہم پر پاکستانی مسلمانوں کی ذمے داری عاید نہیں ہوتی وہ خود اپنے ذمے دار ہیں۔ ہم پر انڈین یونین کے تقریباً چار کروڑ مسلمانوں کی ذمے داری عاید ہوتی ہے۔ ہمیں ہر موقع پر وہ صورت اختیار کرنی ہے جو انڈین یونین کے مسلمانوں کے لیے مفید ہو۔

ہماری خواہش یہی ہے کہ انڈین یونین اور پاکستان کے تعلقات خوش گوار اور زیادہ سے زیادہ مضبوط ہوں، لیکن اگر کسی موقع پر ان دونوں کے نقطہ ہائے نظر میں اختلاف ہو تو ہمیں اسی اصول کی بنیاد پر فیصلہ کرنا ہوگا۔ ہمارا سیاسی فریضہ بھی یہی ہے اور یہی اخلاقی اور مذہبی فرض ہے۔

ہم اسلامی تعلیمات کا گہری نظر سے مطالعہ کر کے جس قدر اس پر صحیح طور سے عمل پیرا ہونے کی کوشش کریں گے اسی قدر ہم وطنِ عزیز کے لیے بہترین خادم، اس کے بہادر محافظ اور اس کے اہم ترین جز ثابت ہوں گے۔ بے شک پاکستان بن جانے کے بعد مسلمان مجموعی طور پر بھی اور صوبہ جاتی لحاظ سے بھی غیر موثر اقلیت بن کر رہ گئے ہیں۔ لیکن کیا اقلیت کا مستقبل تاریک ہوا کرتا ہے؟ اپنے زمانۂ حکومت میں مسلمان اس سے کہیں کم تھے۔ ۱۸۵۷ء کی مردم شماری میں تمام ہندوستان میں چار کروڑ تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ عددی اکثریت یا اقلیت پر مستقبل کا مدار نہیں بلکہ مستقبل کا مدار اہلِ ملّت کے کردار، اعمال اور اخلاق پر ہے۔ آج جو کچھ مسلمانوں کی تعداد اور ان کے علمی آثار آپ ہندوستان میں دیکھ رہے ہیں کیا یہ ان کی اکثریت کے باقیات ہیں یا سیف وسناں کے کارناموں کی یادگار؟

بے شک ہندوستان میں آٹھ سو برس سے زیادہ مسلمانوں نے حکومت کی۔ مگر کثرت تعداد ان کی شوکت و حشمت کا نتیجہ نہیں۔ یہ نتیجہ ہے ان پاک باز بندگانِ خدا کے اخلاق کا جنھوں نے اسلامی تعلیمات کا نمونہ بن کر دوسروں کے دلوں میں جگہ کی۔ ان ستودہ صفات

انسانوں نے دوسروں کی جاگیروں اور ملکیتوں پر قبضہ نہیں کیا بلکہ اپنے خصایل وشمایل سے ان کے دلوں کو مسخر کیا، دماغوں کو گرویدہ کیا اوران کے جذبات کو اس درجے فریفتہ کیا کہ جو پرائے تھے اپنے بن گئے اور جو بےگانہ تھے یگانہ ہوگئے۔ آج اسلامی تعلیمات قرآن حکیم کے حکم ومواعظ، ربانی ارشادات آپ کے سامنے ہیں، اگر آپ صحیح طور پر ان پر عمل کریں تو تاریخ پھر اپنے آپ کو دہرا سکتی ہے اور ایسے پاک نفوس سامنے آسکتے ہیں جو مرجع خلایق ہوں اور ہر فرقے اور جماعت کے نیک سیرت انسان ان کی تعظیم وتکریم پر مجبور ہوں۔

آج مسلمانوں کو جہاد کا لفظ یاد رہ گیا ہے مگر یہ یاد نہیں رہا کہ باشندگان مکہ جیسے معاندین اسلام اور دشمنانِ ملّت کے مقابلے میں صبر واستقامت اور ضبط وتحمل کے ساتھ اعلا اخلاق کے مظاہرے کو جہاد کبیر فرمایا گیا ہے۔ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا (فرقان:۵۲) اور خود اپنے نفس کے غیر صالح جذبات، غلط خواہشات اور اخلاق رذیلہ کو پامال کرنے اور اُن کے بجائے صالح جذبات اور مکارمِ اخلاق سے مزین ہونے کو ''جہادِ اکبر'' سے تعبیر کیا گیا تھا۔ کما قال صلی اللہ علیہ وسلم رجعنا من الجھاد الاصغر الی الجھاد الاکبر اس جہاد اکبر اور جہاد کبیر میں نہ تیغ وتفنگ ہے نہ خنجر وسنان، بلکہ ان میں مضبوطی اور پختگی کے ساتھ عمل ہے۔ ان ارشادات ربانی پر جو تیغ وتفنگ سے بہ درجہا مفید اور توپ اور بندوق سے بہت زیادہ زود اثر ثابت ہوتے ہیں اور جن پر عمل پیرا ہونے کے لیے میدان جنگ سے کہیں زیادہ ضبط وتحمل اور صبر واستقلال سے کام لینا پڑتا ہے۔

حاضرین کرام! ایک طرف اندازہ کیجیے۔ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی اس محبت، رافت اور مہربانی کا جو آپ کو مخلوقِ خدا کے ساتھ تھی، جس کی بنا پر ''ارحم الرحمین'' نے آپ کو ''رؤف رحیم'' کا لقب عطا فرمایا۔ دوسری جانب تصور کیجیے اس ظلم وستم، جبر وتعدی، وحشت وبربریت، بدخلقی اور بہیمیت کا جو آپ کی حق وصداقت، محبت اور ہمدردی کے جواب میں مشرکینِ مکہ کی طرف سے پیش کی جاتی تھی۔

پھر غور فرمایئے! حضرت حق جل مجدہٗ کے ارشادات گرامی پر مثلاً اس جبر وقہر وحشت وبربریت کے جواب میں سرور کاینات صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہوئی ہے:

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ

كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوعَدُوْنَ لَمْ يَلْبَثُوْا إِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ بَلٰغٌ فَهَلْ يُهْلَكُ إِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ ○ (سورۂ احقاف:۳۵)

"صبر کرو جیسا کہ صبر کرتے رہے ہیں ہمت والے رسول اور جلدی نہ کرو ان کے معاملے میں۔ یہ لوگ جس دن دیکھ لیں گے اس چیز کو جس کا ان سے وعدہ ہے، جیسے ڈھیل نہ پائی تھی مگر ایک گھڑی دن کی۔ یہ پہنچا دینا ہے اب وہی غارت ہوں گے جو لوگ نافرمان ہیں۔"

وَدَعْ اَذٰهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ. (سورۂ احزاب:۴۸)

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ. (سورۂ نحل:۱۲۵)

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ. (سورۂ حم سجدہ:۳۴)

"ان کی ایذا رسانی کو نظر انداز کر دو اور خدا پر بھروسا کرو۔"

"اپنے رب کے راستے کی طرف دانش مندی اور پسندیدہ نصیحت کے ذریعے سے دعوت دو اور بحث و مباحثے میں وہ طرز اختیار کرو کہ وہی طرز سب سے بہتر ہو۔"

"مخالفین کی مدافعت ایسی پسندیدہ صورت سے کرو کہ وہی صورت سب سے بہتر ہو۔ اس طریقۂ عمل کا نتیجے تم یہ دیکھو گے کہ جس کو تم سے عداوت تھی وہ ایسا ہو جائے گا گویا گہرا دوست ہے۔"

اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ. (سورۂ لقمان:۱۷)

"قائم رکھو نماز کو، سکھاؤ بھلی بات، منع کرو برائی سے اور برداشت کرو اس کو جو تم پر پڑے، بے شک یہ ہیں ہمت کے کام۔"

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ ○ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○

(سورۂ اعراف:۲۰۰-۱۹۹)

"عادت بنالو درگزر کی۔ حکم کرو بھلی بات کا اور کنارہ کرو نادانوں سے۔ اور اگر ابھارے تم کو شیطان کی چھیڑ تو پناہ مانگو اللہ سے وہی ہے سننے والا جاننے والا ہے۔"

اب غور فرمائیے کہ یہ ارشادات ہمیں کس درجے ضبط وتحمل کی تلقین کرتے ہیں۔ بار بار ہدایت ہو رہی ہے کہ درگزر اور معافی کو اپنے خصلت بنالیں۔ چھیڑ خوانی کے مقابلے میں چشم پوشی اختیار کریں۔ برائی کا بدلہ بھلائی سے دو اور ہمیشہ جواب دینے کی وہ صورت اختیار کریں جو سب سے بہتر ہو۔

محترم بزرگو اور دوستو! ایک طرف غور کیجیے گزشتہ دو سال کے واقعات پر اور پھر تلاوت فرمائیے اس ارشاد کو:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ. (سورۂ نساء:۱۳۵)

"اے ایمان والو! قایم رہو انصاف پر اور گواہی دو اللہ کی طرف کی۔ خدا لگتی (یعنی سچی) اگرچہ نقصان ہو تمہارا یا ماں باپ کا یا قرابت والوں کا۔"

وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى. (سورۂ انعام:۱۵۲)

"جب بات کہو تو حق کہو اگرچہ اپنا قریب ہی ہو۔"

اس قسم کی بہت سی آیتیں اور احادیث ہیں جو ایک انسان کو سب سے اونچا انسان بنا سکتی ہیں۔ بہ شرطے کہ ان پر ہر وقت اور ہر حالت میں عمل پیرا ہو۔ آج مسلمان مایوس ہیں کہ ان کا اقتدار مٹ رہا ہے۔ وہ حیران ہیں کہ مسلمان ہوتے ہوئے وہ اقتدار سے کیوں محروم ہوتے جا رہے ہیں؟ کیا خداوندی وعدے زائد المیعاد ہو گئے یا یہ وعدے (معاذ اللہ) خداوندی وعدے نہیں؟ کاش مسلمان سمجھیں اور غور کریں کہ لفظ مسلم کے ساتھ اقتدار کو لازم نہیں کیا گیا بلکہ اقتدار کی شرط اور اس کی غرض و غایت اعمال اخلاق ہیں۔ مسلمان اگر چاہتے ہیں کہ ان کی گئی ہوئی عظمت پھر لوٹے اور ان کی تہذیب جو فنا کے گھاٹ ہے زندہ ہو تو پہلی شرط یہ ہے کہ وہ زندگی کے اخلاق پیدا کریں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو جب دنیا کا اقتدار عطا فرمایا گیا تھا تو اس کی غرض وغایت یہ بتائی گئی ہے:

اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ

الْمُنْكَرِ. (سورۂ حج:۴۱)

''نماز قایم کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، بھلی باتوں کی ہدایت کریں گے، بدی کی باتوں سے روکیں گے۔''

کیا ہی اچھا ہو کہ مسلمان اس نکتے کو سمجھ لیں اور انتقام در انتقام کے اصولوں پر خاک ڈال کر اسلامی اخلاق، اسلامی احکام اور اسلامی تعلیمات کو اپنا پروگرام اپنی زندگی کا نصب العین بنالیں۔ خداوند عالم کی نصرت ان کے ساتھ ہوگی۔ کیوں کہ وہ نصرت و امداد در حقیقت ان اصولوں کی امداد ہوگی جن کی خود خداوند عالم نے تلقین فرمائی ہے اور جن پر مضبوطی سے عمل پیرا ہونے کو خداوند عالم نے خود اپنی مدد قرار دی ہے۔

كما قال الله تعالى: وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ.

(خطبۂ صدارت اجلاس بمبئی: ص ۳۲-۲۸)

باچا خان مسٹر جناح ملاقات کے خلاف سازش:

اپریل ۱۹۴۸ء: اپریل ۱۹۴۸ء میں بانیٔ پاکستان نے صوبۂ سرحد کا دورہ کیا۔ اس دورے میں ان کا خدائی خدمت گار کے ہیڈ کوارٹر سردریاب جانا طے ہو گیا تھا لیکن سازشی عناصر کی اس میں موت تھی، انھوں نے اس پروگرام کو سبوتاژ کر دیا۔

محمد فاروق قریشی لکھتے ہیں:

''اخبارات کو اندرون خانہ اور زیر زمین سازشوں کا علم نہ ہو سکا بلکہ وہ ملاقات کے لیے فضا کو مزید خوش گوار بنانے کی خبریں شایع کرتے رہے، مگر سازشی اپنا کام کر چکے تھے اور گورنر جنرل کے دل میں وسوسے ڈالنے میں کامیاب رہے تھے کہ اگر وہ خدائی خدمت گاروں کے ہیڈ کوارٹر سردریاب گئے تو انھیں وہاں خدائی خدمت گار قتل کر دیں گے۔ گورنر جنرل قاعدے قانون کو ملحوظ خاطر رکھنے کے عادی تھے، چناں چہ سازشیوں نے ریشہ دوانیوں کا جو جال پھیلایا تھا صوبے کے گورنر ڈانڈاس پریمیر قیوم خان اور دیگر ابن الوقتوں کے دام ہم رنگ زمین میں پھنس گئے اور خدائی خدمت گاروں کے ہیڈ کوارٹر جانے سے انکار کرتے وقت ایفائے عہد کا بھی لحاظ اور پاس نہ رکھا۔ انکار کے لیے عذر یہ تراشا کہ گورنر جنرل نے سرکاری ضیافتوں کے علاوہ کسی میں شرکت نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ظاہر ہے یہ فیصلہ فوری اور ہنگامی طور پر کیا گیا تھا۔ اگر اس پر عمل ناگزیر تھا تو بھی خدائی خدمت گاروں کی ضیافت کو

اس سے مستثنیٰ ہونا چاہیے تھا، کیوں کہ اس دعوت کو قایدِاعظم مارچ میں قبل ازیں قبول کر چکے تھے۔ لیکن باچاخان کو شکایت تھی کہ گورنر جنرل نے قیامِ صوبۂ سرحد کے دوران غیر سرکاری ضیافتوں میں تو شرکت کی مگر خدائی خدمت گاروں کو خدمت کرنے کا موقع نہ دیا۔

قایدِاعظم کا جلسۂ عام میں شرکت سے گریز:

سازشیوں نے غلط و بے بنیاد اطلاعات فراہم کر کے گورنر جنرل کو بہت زیادہ بدگمان بنادیا تھا۔ وہ اس پروپیگنڈے سے نفسیاتی طور پر اس حد تک مرعوب ہو چکے تھے کہ انھوں نے مسلم لیگ کے جلسۂ عام میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس پر خان ثمین جان اور دیگر مسلم لیگی برہم ہو گئے تھے، کیوں کہ قایدِاعظم کی عدم شرکت کے باعث مسلم لیگیوں کو شدید ہزیمت، ندامت اور شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا اور عوام میں ان کی بڑی کرکری ہوتی۔ قایدِاعظم کے انکار سے ان کی عزت اور وقار کا مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ چناں چہ انھوں نے پرزور اصرار کیا بلکہ بعض روایات کے مطابق خان ثمین جان خان تلخ نوائی پر اتر آئے تھے تو قایدِاعظم بادل نخواستہ جلسے میں شرکت پر آمادہ ہوئے تھے۔

مسلم لیگ کے جلسے میں گورنر جنرل نے شرکت کر کے اپنی غیر جانب داری کو مجروح کیا۔ ان کی شرکت اس دعوے سے متصادم تھی جس کا اظہار انھوں نے باچاخان سے ملاقات میں کیا تھا کہ "میں اب ملک کا گورنر جنرل ہوں، میرے نزدیک سب جماعتیں یک ساں ہیں اور میں سب کو ایک نظر سے دیکھتا ہوں۔" انھوں نے پشاور کے جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے جن خیالات کا اظہار کیا اس سے واضح جانب داری ٹپکتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ملک کے گورنر جنرل نہیں ہیں بلکہ مسلم لیگ کے صدر ہیں۔ پہلے تو انھوں نے باچاخان کو ملاقات کے دوران مسلم لیگ میں شمولیت کی دعوت دی۔ اصولی طور پر یہ ان کے منصب اور مرتبے کے سراسر منافی تھا۔ بعد میں جلسۂ عام میں انھوں نے عوام سے کہا کہ "وہ مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں جیسا کہ وہ قیامِ پاکستان کے لیے جدوجہد کے وقت تھے۔ یہ مسلم لیگ ہی تھی جس نے صوبۂ سرحد کو ہندو راج کے چنگل میں جانے سے روکا۔ آپ کیا سمجھتے ہیں آپ کی صحیح رہنمائی مسلم لیگ کر سکتی ہے یا وہ لوگ جو ہمارے مخالف تھے؟ کیا انھیں پاکستان کی نگہداشت کرنا چاہیے یا ہمیں؟" (پاکستان ٹائمز ۲۱ر اپریل ۱۹۴۸ء)

قائداعظم بے شک بابائے قوم تھے، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ ملک کے گورنر جنرل تھے، اس اعتبار سے انھیں مسلم لیگ کے حق میں پروپیگنڈا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ علاوہ ازیں انھوں نے اختلاف رائے کا جمہوری حق استعمال کرنے والوں کے بارے میں جو رائے زنی کی وہ افسوس ناک ہی نہیں بلکہ جمہوری اقدار و روایات کے بھی سراسر منافی تھی۔ اس سے جمہوریت کے مستقبل کو شدید ٹھیس پہنچی۔ ان کے انتقال کے بعد وزیراعظم نواب زادہ لیاقت علی خان یک جماعتی نظام حکومت قائم کرنے کی راہ پر چل نکلے تھے۔ انھوں نے کھلم کھلا کہنا شروع کر دیا تھا کہ ''پاکستان بچہ ہے اور مسلم لیگ اس کی ماں ہے، وہی اس کی صحیح پرورش اور نگہداشت کر سکتی ہے۔''

گورنر جنرل کی تقریر سے سیاسی فضا یک سر تبدیل ہوگئی۔ اس پر سازشی عناصر بھی بغلیں بجا رہے تھے۔ اپنے مقاصد میں کامیابی سے ان کے حوصلے بہت بلند ہو گئے تھے۔ قیوم خان جو تھوڑا عرصہ قبل خان برادران اور خدائی خدمت گاروں کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان تھے۔ اب تمام احسانات کو فراموش کر کے اپنے ممدوح کے جانی دشمن بن گئے تھے۔ اب ان کے نزدیک خان برادران پختونوں کے خدمت گذار نہیں رہے تھے بلکہ ''غیر محب وطن'' اور ''غدار'' بن گئے تھے اور خدائی خدمت گار تحریک خلاف قانون جماعت قرار دیئے جانے کی سزاوار ٹھہری تھی۔ اگست ۱۹۴۸ء میں ڈاکٹر خان صاحب کو گرفتار کرنے اور بھابڑا میں بے گناہوں کا خون بہانے کے بعد قیوم خان نے شرم سار ہونے کی بجائے بڑھکیں مارنا شروع کر دیں۔ اس نے چوک یادگار میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

''میں نے سرخ پوشوں کو سبق سکھایا ہے۔ یہ انگریزوں کی نہیں قیوم خان کی حکومت ہے۔ خدائی خدمت گار ملک کے غدار ہیں۔'' اسی کے باوجود مسلم لیگی حضرات شکوہ سنج ہیں کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی میں ۳؍ جون پلان تقسیم ہند منصوبے کی منظوری کے موقع پر باچا خان نے کیوں کہا تھا کہ ''انھیں بھیڑیوں کے سامنے ڈال دیا ہے۔'' اس سلسلے میں ''ادارہ مطالعۂ تاریخ'' نے پاکستان کی سیاسی تاریخ کی جلد آٹھ میں لکھا ہے کہ جب ۲۲؍ اگست کو قیوم خان کو اقتدار مل گیا تو پھر اس نے یکے بعد دیگرے ایسے آمرانہ اور ظالمانہ اقدامات کیے کہ پاکستان کے سارے جمہوریت پسند عناصر حیران و ششدر رہ گئے اور انھیں یوں محسوس ہوا کہ صوبۂ سرحد کے عوام کو فی الواقع ''خون خوار بھیڑیئے'' کے سپرد کر دیا

گیا تھا، (ص ۱۲۴)۔ ایک دوسری جگہ لکھا ہے کہ حکومت پاکستان نے ۲۲ راگست کو صوبہ سرحد کی عنانِ اقتدار خان عبدالقیوم جیسے خون خوار بھیڑیے کے ہاتھوں میں دے دی تھی۔ (ص ۲۱۴)

حقیقت تو یہ ہے کہ مسلم لیگ حکومتوں نے خدائی خدمت گاروں کے ساتھ ہی نہیں بلکہ اپنے ہر حریف سیاست دان کے ساتھ جو معاندانہ سلوک روا رکھا تھا، ایسا سنگ دلانہ اور بے رحمانہ سلوک تو جنگل میں بھیڑیے بھی اپنے شکار کے ساتھ نہ کرتے ہوں گے۔ مسلم لیگ کی بربریت اور قہرمانیوں کا شکار صرف غیر لیگی ہی نہ تھے بلکہ اختلاف رائے کا جمہوری حق استعمال کرنے والے دیرینہ اور صف اول کے سرگرم مسلم لیگی بھی حکم رانوں کے عتاب سے محفوظ نہ رہے تھے۔ (پختون قوم اور باچا خان: ص ۲۸-۲۶)

۱۹۴۸ء: قایدِ اعظم اور باچا خان کے درمیان غلط فہمیاں اور بدگمانیاں پیدا کرنے کا یہ پہلا موقع نہ تھا بلکہ قبل ازیں تقسیم ملک سے پہلے گاندھی جی کی تحریک پر آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے (۱۹۴۷ء میں) دونوں رہنماؤں کی ملاقات کا اہتمام کیا تھا۔ قایدِ اعظم نے باچا خان کا موقف بڑے غور سے سنا اور کہا کہ یہ ہمارا اندرونی معاملہ ہے ہم بھائی بھائی ہیں، یہ معاملہ ہم خود طے کر لیں گے۔ اس میں کسی تیسرے شخص (گاندھی) کی موجودگی کی ضرورت نہیں۔ باچا خان نے قایدِ اعظم سے اتفاق کیا اور اکٹھے وائسریگل لاج سے باہر نکلے۔ لیکن جب مفاد پرست مسلم لیگیوں کو اس صورت حال کا علم ہوا تو انھوں نے سازشیں شروع کر دیں۔ مسلم لیگ کا ترجمان انگریزی روزنامہ ''ڈان'' دہلی بھی اس میں شامل ہو گیا تھا اور اس نے باچا خان کے خلاف انتہائی زہریلا اور حقایق کے برعکس اڈیٹوریل لکھا۔ اس سے فاصلے بڑھ گئے اور سازشی اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔

باچا خان نے دیکھا کہ ملک کی تعمیر و ترقی کی ان کی پیش کش اور خواہش کو پذیرائی نہیں ملی، بلکہ بے بنیاد الزام تراشی کی گئی تو وہ عوام کو اعتماد میں لینے کے لیے رابطۂ عوام مہم پر نکل کھڑے ہوئے۔ قیوم خان جابر اور آمر شخص تھا وہ اپنی سیاسی حیثیت سے خوب واقف تھا۔ اسے خدائی خدمت گاروں کی سیاسی قوت کا بھی اچھی طرح اندازہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ باچا خان کو عوام سے رابطہ قایم کرنے کا موقع مل گیا تو ان کے سیاسی اثر و رسوخ میں مزید اضافہ ہوگا۔ یہ صورت حال قیوم خان کے سیاسی مستقبل کے لیے ہرگز سود مند نہ تھی۔

چناں چہ جب باچا خان ۱۵/جون ۱۹۴۸ء کو کوہاٹ اور بنوں کے دورے پر روانہ ہوئے تو بہادر خیل کے قریب پولیس نے راستہ روکا ہوا تھا۔ باچا خان اور ان کے ساتھیوں کو کار سے اتار کر تحصیل لے جایا گیا۔ جہاں انھیں تمام دن بھوکا اور پیاسا رکھا گیا، شام کے وقت ڈپٹی کمشنر کوہاٹ وہاں آئے، باچا خان کو ان کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے نیک چلنی کی ضمانت طلب کی۔ باچا خان نے اس کی وجہ دریافت کی تو ڈپٹی کمشنر نے کہا کہ "تم پاکستان کے خلاف ہو۔" باچا خان نے اس الزام کا ثبوت مانگا تو ڈی سی کہنے لگا کہ "بحث کی ضرورت نہیں۔" اس پر باچا خان نے ضمانت داخل کرنے سے انکار کر دیا۔ چناں چہ انھیں تین برس قید با مشقت کی سزا سنائی گئی۔ قیوم خان باچا خان کی سیاسی قوت اور مقبولیت سے اس قدر خائف تھا کہ انھوں نے باچا خان کو صوبہ سرحد کی کسی جیل میں رکھنے کا رسک نہیں لیا بلکہ صوبہ پنجاب کی منٹگمری جیل میں بھجوا دیا۔ دوسرے وہ اس طرح پختونوں اور پنجابیوں کے درمیان نفرت کی دیوار کھڑی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن سرزمین پنجاب سے باچا خان کی گرفتاری کے خلاف اور رہائی کے لیے آواز بلند ہوتی رہی۔ جیل قواعد کے مطابق باچا خان کو اس کوٹی کا بھی مستحق نہ سمجھا گیا جس کے حق دار اخلاقی قیدی ہوتے ہیں۔ جب باچا خان پوری سزا بھگت چکے تو انھیں بنگال ریگولیشن ۱۸۱۸ء کے تحت نظر بند کر دیا گیا۔ اس طرح باچا خان کو جنوری ۱۹۵۴ء تک جیل میں رکھا گیا۔

باچا خان گلہ گذار ہیں کہ پاکستان میں بغیر کسی تقصیر کے ان پر ایسے مظالم توڑے گئے جو فرنگی کافروں نے بھی روا نہ رکھے تھے۔ حکومت نے مظالم کی انتہا کر دی۔ چارسدہ میں پٹھان مرد و زن جمعہ کی نماز ادا کرنے اور اپنے گرفتار شدہ بھائیوں کے لیے دعائیں مانگنے جا رہے تھے، انھوں نے سروں پر قرآن رکھے ہوئے تھے اور مسجد میں داخل ہو رہے تھے تو اس وقت اسلامی مملکت پاکستان کے سپاہیوں نے مشین گنوں سے پٹھان مردوں اور عورتوں کے سینے اور خدا کے قرآن پر گولیاں چلائیں اور انھیں چھلنی کر دیا۔ قیوم خان نے خدائی خدمت گاروں اور ان کی جانشین جماعتوں پر جو ستم روا رکھے وہ ایک طویل داستان ہے۔

دراصل ملک میں ایک ایسا گروہ تشکیل پا گیا تھا جس نے اپنے مفادات کی خاطر ہر حربہ استعمال کیا۔ جس جانب سے بھی مخالف ہوا کے آنے کا اندیشہ محسوس کیا اس کی بیخ کنی کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑ دی۔ چناں چہ مسلم لیگ کے اقتدار پرست گروہ اور بیوروکریسی

کے گٹھ جوڑ کے نتیجے میں صرف قایدِاعظم اور باچا خان کے درمیان مفاہمت اور قربت ہی سبوتاژ نہیں کی گئی بلکہ اس گروہ نے محسوس کیا کہ قایدِاعظم کی بلند و بالا اور قد آور سیاسی شخصیت، عوام میں ان کی بے پناہ مقبولیت اور عوام کی ان کے ساتھ حد سے بڑھی ہوئی عقیدت کے باعث اس ناپاک گٹھ جوڑ کے عزایم پورے نہیں ہوسکتے تو اس گروہ نے اپنے مذموم عزایم کی تکمیل کے پیشِ نظر قایدِاعظم کو راہ سے ہٹانے سے بھی گریز نہ کیا۔ ان کی شدید علالت جس نوع کی طبی دیکھ بھال کی متقاضی تھی اور جن ادویات کی طلب گار تھی، بانیٔ پاکستان کو جان بوجھ کر ایک سازش کے تحت ان سے محروم رکھا گیا۔ حقیقت میں بابائے قوم کی موت کا ذمہ دار یہی گٹھ جوڑ تھا جس میں وزیرِاعظم نواب زادہ لیاقت علی خان، میاں ممتاز محمد خان دولتانہ، عبدالقیوم خان، سرحد کا گورنر ڈنڈاس اور بیوروکریٹ چوہدری محمد علی پیش پیش تھے۔ اس گروہ نے اپنے گناہوں کی پردہ پوشی کے لیے بعض اخبار نویسوں کو بھی خرید لیا تھا جو بہ ظاہر قایدِاعظم کے جاں نثار اور فداکار ہونے کے دعوے دار تھے اور یہی تاثر دیتے تھے۔ مگر اصل میں وہ اس گروہ کے آلہ کار بن کر پیشہ ورانہ بددیانتی کے مرتکب ہوئے تھے اور عوام تک گم راہ کن خبریں پہنچاتے تھے تا کہ مذکورہ گروہ بے نقاب نہ ہونے پائے۔

اس گٹھ جوڑ نے ویسے تو قایدِاعظم کی شدید علالت کے ایام میں ہی سرکشی اور سازشیں شروع کردی تھیں، قاید کو ذہنی اور نفسیاتی اذیتیں دینے لگا تھا، جس کا ثبوت ریکارڈ پر موجود ہے۔ مگر قاید کے انتقال پر ملال کے بعد یہ گروہ کھل کھیلا، من مانی کی انتہا کردی اور ملک میں سیاسی عدمِ استحکام پیدا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ پنجاب کے سب سے بڑے منتخب جمہوری ادارے صوبائی اسمبلی کو بلا جواز توڑنا اور پریمیر نواب افتخار حسین ممدوٹ پر بدعنوانی کے الزامات لگانا اسی سلسلے کی کڑی تھا، تا کہ وزیرِاعظم نواب زادہ لیاقت علی خان اپنے منظورِ نظر ممتاز دولتانہ کو صوبے کی مسندِ اقتدار پر بٹھا سکیں۔ چناں چہ وزیرِاعظم نے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت دھاندلی کرنے کے نئے ریکارڈ قایم کردیے تھے۔ ازاں بعد صوبۂ سرحد، بھاول پور اور سندھ اسمبلیوں کے انتخابات میں بھی اسی تجربے کو وسیع طریقے سے کامیاب طور پر آزمایا گیا اور نتایج اپنی حسبِ پسند حاصل کیے گئے۔

اس گروہ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ قاید کے انتقال کے بعد ان کی کردار کشی بھی

کرنے لگا تھا۔ چناں چہ وزیرِ اعظم نواب زادہ لیاقت علی خان کی اہلیہ بیگم رعنا لیاقت علی خان نے قاید کے سب سے پہلے سرکاری سوانح نگار ہیکٹر بولیتھو کو بتایا تھا کہ قاید ان میں دل چسپی لینے لگے تھے۔ ۳ر جون منصوبۂ تقسیم ہند کے اعلان کے بعد قایدِ اعظم نے چیدہ چیدہ مسلم بیوروکریٹس کو اپنی دہلی کی رہایش گاہ پر بلایا اور انھیں ہدایت کی کہ وہ میٹنگ کر کے اپنی تجاویز پیش کریں، اس کی ذمے داری چودھری محمد علی کو سونپی تھی۔ مگر چودھری محمد علی نے قایدِ اعظم کی واضح ہدایت اور خواہش کی ذرہ برابر پروانہ کی اور مسلم بیوروکریٹس کے اصرار اور بار بار کی یاد دہانی کے باوجود میٹنگ نہ بلائی، اس طرح قایدِ اعظم کی خواہش کی تکمیل نہ ہونے دی تھی۔

چودھری محمد علی نے اپنے سیکرٹری جنرل بننے کے پس منظر سے خود پردہ اٹھایا ہے۔ (ظہور پاکستان) انھوں نے تو یہ واقعہ معصومیت اور فخر سے بیان کیا ہے مگر اس سے ایک بیوروکریٹ کی چالاکی، عیاری اور ہوشیاری بے نقاب ہوتی ہے۔ انھوں نے خود اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے اس سلسلے میں کابینہ کو خبر نہ ہونے دی اور کابینہ سے بالا بالا فایل گورنر جنرل تک پہنچا دی اور ان سے اپنی تقرری کے احکامات حاصل کر لیے۔ اس ضمن میں سب سے دل چسپ پہلو یہ ہے کہ اس اہم منصب پر صرف چودھری محمد علی ہی فایز رہے۔ جب وہ وزیرِ خزانہ بن گئے تو بعد میں اس عہدے کو عملی طور پر ختم کر دیا گیا اور کسی اور کو سیکرٹری جنرل نہیں بنایا گیا۔ ٹرانسفر آف پاور (۱۹۴۲-۴۷ء) جلد بارہ کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ چودھری محمد علی تو قیامِ پاکستان سے پہلے ہی پاکستان کی کابینہ کے سیکرٹری بن گئے تھے۔ جن کے بارے میں لکھا ہے کہ

> "پاکستان کابینہ کے سیکرٹری اگلی صبح کراچی روانہ ہو رہے ہیں تا کہ جناح کو قایل کرنے کی کوشش کریں۔ جب تک جناح اتفاق نہیں کریں گے تو اقتصادی محاذ آرائی شروع ہو سکتی ہے جو پاکستان کے لیے تباہ کن ہوگی۔"
>
> (ص ۶۰۴ عنوان ٹدنائٹ اسٹاپ پریس)

(پختون قوم اور باچا خان: ص ۳۹-۳۵)

جمعیت علماے ہند کی سیاست سے علاحدگی — فیصلے پر تنقید و تبصرہ کی ایک نظر:

اپریل ۱۹۴۸ء: جمعیت کے پلیٹ فارم سے سیاست میں حصہ نہ لینے کا فیصلہ تو تقسیم

ملک کے فوراً بعد ہی ہوگیا تھا۔ دسمبر ۱۹۴۷ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں ہونے والی آل انڈیا مسلم کانفرنس منعقدہ لکھنؤ کے مباحث کے بعد ایک قطعی نتیجے پر پہنچا جاچکا تھا۔ لیکن جمعیت علماے ہند ایک کامل نظامِ فکر و عمل کی پابند جماعت تھی، اس کا فیصلہ اور اعلان اس کے قواعد و ضوابط کا پابند و مقتضی تھا۔ یہ فیصلہ ۲۰، ۲۱ر مارچ ۱۹۴۸ء کو کونسل کے اجلاس میں کیا گیا۔

مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے اس فیصلے کی اہمیت اور اس کے پس منظر پر برہان کے ''نظرات'' میں نہایت مدبرانہ بحث کی ہے۔ اسی میں انھوں نے تحریکِ پاکستان کے رہنماؤں کی سیرت پر بھی بعض اہم اشارے کیے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سامنے نہ قرآن تھا، نہ اسلامی تعلیمات تھیں۔ اسلام اور قرآن، اسلامی حکومت اور اسلامی نظام کے قیام کے وعدے پر مسلمانوں کو محض فریب دیا گیا تھا۔

مولانا اکبرآبادی کے سامنے تو ان کے مشاہدات تھے یا صرف آٹھ ماہ کی پاکستان کی تاریخ تھی۔ اب تو قیام پاکستان کے واقعے پر نصف صدی کی مزید مدت گزر چکی ہے لیکن جو کچھ اب تک مشاہدہ و تجربے میں آیا ہے وہ انتہائی شرم ناک اور دردناک ہے۔ اس کے بیان سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ کاش ہم مولانا اکبرآبادی کے مشاہدات و تجربات کو رد کرسکتے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے بزرگوں کی فراست اور بصیرت نے مستقبل میں حالات اور پیش آنے والے واقعات کو گویا جھانک کر دیکھ لیا تھا وہ جو کہا گیا ہے کہ

قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید

ہمیں یقین ہے کہ ہمارے بزرگ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی تو اس مقام پر فائز تھے ہی، ان کے نیاز مند اور عقیدت کیش بھی اس سرچشمے سے بہ قدر ظرف و تحمل فیض یاب ہوئے تھے۔ اس فیض یابی کا ایک ثبوت مولانا اکبرآبادی کی یہ تحریر بھی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

''پچھلے دِنوں مارچ کی ۲۰ر اور ۲۱ر کو جمعیت علماے ہند کی کونسل کا دہلی میں اجلاس ہوا اور اس نے ملک کے حالات کا جائزہ لے کر یہ فیصلہ کیا کہ اب آیندہ جمعیت سیاسیات میں براہِ راست حصہ نہیں لے گی اور جہاں تک جمعیت کے آرگنائزیشن کا تعلق ہے اس کی تمام سرگرمیاں مسلمانوں کے تمدنی، مذہبی اور تعلیمی واقتصادی معاملات وحقوق کی اصلاح اور ان

کے تحفظ تک محدود رہیں گی۔ ممکن ہے بعض عجلت پسند مسلمانوں کو اس سے یک گونہ بددلی ہو، لیکن اگر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دانش مندانِ روزگار کا مشہور مقولہ "در کما دارك الزمان" کے مطابق یہ ہی فیصلہ حق بہ جانب ہے اور یہ ہی ہونا بھی چاہیے تھا۔

گزشتہ بارہ پندرہ برس میں مسلمانوں کی جولادینی اور غیر فطری اور غیر عقلی سیاست رہی ہے اس کے الم ناک نتائج ہر شخص کے سامنے ہیں۔ اگر اس سیاست کا خلاصہ چند لفظوں میں بیان کیا جا سکے تو کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں نے "جان دے دی لاکھ سمجھاتے رہے۔"

اس قدر عظیم تباہی و بربادی کے باوجود اب بھی بعض لوگ ہیں جو یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر ہندوستان تقسیم نہ ہوتا تو مسلمانوں پر یہ آفت پھر بھی آتی اور اس وقت ان کے لیے سر چھپانے کو کوئی بھی جگہ نہ ہوتی۔ گذارش یہ ہے کہ ہندوستان کے تقسیم نہ ہونے کی حالت میں جو تباہی آتی وہ تو صرف محتمل اور غیر یقینی ہی ہے، ممکن ہے کہ آتی اور اس سے کم ہوتی یا سرے سے آتی ہی نہیں۔ لیکن تقسیم کی وجہ سے جو تباہی آئی ہے وہ تو ہر ایک کے سامنے ہے۔ دوپہر کے سورج کی طرح ایک بالکل واضح حقیقت ہے، کوئی اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ تقسیم کا مطالبہ کرنے والے کہتے تھے اور بڑے بلند بانگ دعادی سے کہتے تھے کہ ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسئلے کا واحد حل بھی ہے کہ دو مملکتیں بن جائیں ایک خود مختار مسلمان ریاست ہو، اور دوسری خود مختار ہندو ریاست۔ ایک میں مسلمان اپنے کلچر اور اپنے مذہبی صواب دید کے مطابق جو چاہیں کریں اور دوسری ریاست میں ہندوؤں کو بھی ایسا ہی کرنے کا حق ہو..... لیکن تقسیم کے ایک ماہ بعد ہی صاف ظاہر ہو گیا کہ یہ جو کچھ کہا گیا تھا سراسر جھوٹ اور فریب تھا اور واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی پوری تاریخ میں مسلمانوں نے کبھی اتنی عظیم غلطی نہیں کی جتنی کہ اس لادینی سیاست و قیادت کی تائید کر کے کی ہے۔ ایک عربی شاعر نے بالکل سچ کہا ہے۔

اذا كان الغراب دليل قوم
سيهديهم طريق الهالكينا

اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ اسلام کے "سب سے بڑے محافظ" کچھ تو جان بچا کر ہندوستان سے فرار ہو گئے ہیں اور جو باقی ہیں ان کا حال یہ ہے کہ وہ دم بہ خود ہیں۔ ان کی آنکھوں کے سامنے ناشدنی باتیں شدنی ہو رہی ہیں اور وہ دم نہیں مار سکتے اور احتجاج میں کوئی آواز بلند نہیں کر سکتے۔ گھروں میں دبکے ہوئے جان و مال کی اور عزت و آبرو کی خیر

منار ہے ہیں اور بس۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی ایک ہزار سال کی تاریخ پر پانی پھر رہا ہے اور ان لوگوں میں یہ جرأت نہیں ہے کہ کوئی جنبش بھی کر سکیں اور یہ جرأت ہو بھی تو کیوں کر؟ یہ جو کچھ ہو رہا ہے ان کی اپنی سیاست کا طبعی اور لازمی نتیجہ ہے۔ ان کی طلب کے مطابق جب پاکستان بن گیا تو وہاں جو چاہیں کریں۔ اب یہاں ان کو کسی مطالبے کا حق ہی کیا رہا ہے؟ یہ تو ہے ہندوستان کے مسلمانوں کی پوزیشن! اب رہی یہ بات کہ "تقسیم کے باعث مسلمانوں کو سر چھپانے کی جگہ تو مل گئی، تو اس کی جو حقیقت ہے وہ پاکستان کے موجودہ حالات پر نظر ڈالنے سے واضح ہو سکتی ہے۔ وہاں لاکھوں مسلمان ہیں جو "از یں سو رانده وزاں سو در مانده" کے مطابق خانماں خراب پھر رہے ہیں۔ پاکستان کے پناہ گزینوں کے وزیر کے بیان کے مطابق گورنمنٹ اب تک پناہ گزینوں پر دو کروڑ روپیہ سے زاید خرچ کر چکی ہے لیکن اس کے باوجود عالم یہ ہے کہ پناہ گزین "ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ" کا مکمل مصداق ہیں۔ یہاں اپنا سب کچھ چھوڑ کر وہاں گئے۔ اور وہاں سر چھپانے تک کے لیے اُن کے پاس کوئی جگہ نہیں ہے اور یہ تو وہ حالات ہیں جو اب پیش آرہے ہیں، آیندہ وہاں جو کچھ ہونے والا ہے اُس کا علم خدا کو ہی ہے۔ بہ ہر حال آثار اچھے نہیں ہیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس ملّت بیضا کا خود اس کی بداعمالیوں اور پیہم غلط کاریوں کے باعث کس درجے عبرت انگیز اور الم ناک انجام ہونے والا ہے۔

پھر یہاں تو مسلمانوں کا جو حشر ہوا وہ تو ہوا ہی! کہا یہ جاتا تھا کہ پاکستان میں اسلام کی حکومت ہوگی، قرآن کا قانون نافذ ہوگا، اسلامی کلچر اور مسلمانوں کی زبان پھلے پھولے گی اور مسلمان اپنے مذہبی آئین کے مطابق زندگی بسر کریں گے۔ کہنے والے کہتے تھے اور سمجھاتے تھے کہ ان میں سے کچھ بھی نہ ہوگا، یہ سب ایک سیاسی چال ہے، اسلام اور قرآن کو اغراض کا آلہ کار بنایا جا رہا ہے، جہاں پہلے سے مسلمانوں کی حکومت قایم ہے وہیں کیا ہو رہا ہے، جو اس نئی مملکت میں ہوگا؟ کیوں کہ بہ قول ذوقؔ مرحوم کے

جو دل قمار خانے میں بت سے لگا چکے
وہ کعبتین چھوڑ کے کعبہ کو جا چکے

لیکن مسلمان نہ مانے۔ انھوں نے جناح اور لیاقت علی خان کو اسلام کا محافظ، قرآن کا محافظ، اور مسلمانوں کا سب سے بڑا بہی خواہ اور ہمدرد کہا۔ اور ان کے مقابلے میں حسین احمد مدنی،

کنایت اللہ، ابوالکلام آزاد کو غدار، ملت فروش، اور ہندوؤں کے زرخرید غلام کے لقب سے پکارا۔ قدرت کے انصاف سے یہ بالکل بعید تھا کہ وہ ایک قوم کی اتنی عظیم الشان غلطی اور گمراہی کو اس کی سزا دیے بغیر یوں ہی نظر انداز کر دیتی۔ کل تک جو فریب تھا وہ آج ایک حقیقت بن کر سامنے آگیا ہے اور اب کسی کی مجال نہیں کہ اس سے انکار کر سکے۔ آج اسلام کا اور قرآن کا وہ کون سا قانون ہے جس کی بے حرمتی مسلمانوں کی اس مملکت میں علی الاعلان نہیں ہو رہی ہے؟ شراب خوری، زنا کاری، رشوت ستانی، ظلم و جور، عیاشی و فحاشی، مغرب زدگی وغیرہ وہ کون سا اخلاقی اور مذہبی گناہ ہے وہاں جس کا بازار گرم نہیں ہے؟ اب کوئی بتائے کہ کیا سانپ کے نکل جانے کے بعد لکیر پیٹنا ع

کیا زمانے میں پنپنے کی یہ ہی باتیں ہیں؟

مسلمانوں کا ہمیشہ سے شعار رہا ہے۔ تیسرے خلیفۂ راشد حضرت عثمان غنیؓ کو پہلے شہید ہونے دیا گیا اور پھر اس کا ماتم تمام عالم اسلام میں ہوا۔ جگر گوشۂ رسول کو پہلے بے کسی و کس مپرسی کے عالم میں جامِ شہادت پینے کے لیے تنہا چھوڑا گیا پھر ساری دنیا آج تک یزید پر لعنت بھیجتی ہے، آخری خلیفۂ بغداد مستعصم باللہ ابن علقمی کے ہاتھوں میں کٹ پتلی بنا کھیلتا رہا۔ لیکن جب تاتاریوں نے خلافت بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تو بغداد کے درودیوار پر مسلمانوں نے لکھا "لعن اللّٰہ من لا یلعن ابن القلقمی" عبداللہ نے فریڈرک کے ہاتھوں اندلس کا بیع نامہ کر دیا تو آج تاریخ کا ہر طالب علم اس کو ملامت کر رہا ہے۔ جعفر و صادق نے بنگال و دکن کی مسلمان ریاستوں پر تباہی و بربادی کی مہر لگا دی تو آج بچے بچے کی زبان پر ہے ؎

جعفر از بنگال و صادق از دکن

ننگِ ملت، ننگِ دیں، ننگِ وطن

بس اسی طرح آج مسلمانوں پر جو بربادی آئی ہے کوئی شبہ نہیں کہ تاریخ کی عدالت اس پر جب محاکمہ کرے گی تو وہ مسلمانوں کی گزشتہ دس بارہ سال کی سیاست کے قائدین کو نہایت برے الفاظ میں یاد کرے گی اور آئندہ نسلیں ان لوگوں کو کبھی کسی اچھے لقب سے یاد نہ کر سکیں گے۔

گزشتہ سیاست کا سب سے زیادہ تاریک اور اللہ کے نزدیک انتہائی مبغوض پہلو یہ

ہے کہ اسلام اور قرآن جیسی مقدس چیزوں کے نام پر ایسے لوگوں کے لیے ووٹ مانگے گئے جن کو سیرت واعمال کے لحاظ سے اسلام سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ ان لوگوں کی حمایت میں حاملین شریعت پر تبرا پڑھا گیا۔ ان کو سب وشتم کیا گیا اور ان پر دنیا جہاں کی غلاظت اُچھالی گئی۔ سونے کو تانبہ اور تانبہ کو سونا بتایا گیا۔ دِن کو رات اور رات کو دِن کے لقب سے پکارا گیا۔ اور یہ سب کچھ اغراض فاسدہ کی خاطر کتابِ الٰہی کا نام لے کر ہوا۔ بہ قول حضرت حافظ شیرازی کے یہ آسان ہے کہ ایک شخص شراب پیے، رندی اور بدمستی کرے۔ لیکن اگر وہ قرآن کو دام تزویر بناتا ہے تو پھر اس کے جرم کا کوئی حد وحساب ہی نہیں ہے۔ پاکستان سے اگر تھوڑا بہت فایدہ پہنچ سکتا تھا تو پنجاب، سندھ، اور سرحد کے مسلمانوں کو پہنچ سکتا تھا۔ یو پی، بہار، بمبئی، مدراس اور سی پی وغیرہ کے مسلمانوں کے لیے تو اس میں کوئی منفعت ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کے باوجود ان کا پاکستان کی حمایت میں سرگرم ہونا اور یہاں کے حقوق سے صرفِ نظر کر لینا ''پرائے شگون اپنی ناک کٹا لینا'' یا خودکشی کر لینا نہیں تھا تو اور کیا تھا؟ جو قوم عقل وخرد کے تمام تقاضوں سے اندھی ہو کر خود اپنی موت کو دعوت دے وہ قدرت کے قانونِ مکافات کی گرفت سے کیوں کر بچ سکتی ہے؟ بدقسمتی سے مسلمان حکومتِ خود اختیاری یا ''مسلم اسٹیٹ'' کے پُر فریب لفظ سے اتنے مسحور ہوئے کہ انھوں نے ہر واضح حقیقت کو جھٹلانے میں ذرا تامل نہیں کیا۔ حال آں کہ ان کو سمجھنا چاہیے تھا کہ محض حکومت کوئی چیز نہیں ہے، یہ ایک طاقت اور قوت ہے جو مفید بھی ہو سکتی ہے اور مضر بھی۔ طاقت اگر کسی عیاش طبع اور آوارہ مزاج نوجوان کے جسم میں ہوگی تو وہ اس کا غلط استعمال کر کے خود اپنے آپ کو ہلاک کر لے گا اور اپنی اولاد میں بھی بیماری کے جراثیم چھوڑ جائے گا اور یہ ہی طاقت اگر صالح جسم میں ہوگی تو وہ اس کا صحیح استعمال کر کے اس سے مفید کام انجام دے گا۔

''مسجد تو شب بھر میں بن بنا کر تیار ہو گئی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ من کا پرانا پاپی کتنے عرصے میں نمازی بنتا ہے۔''

جہاں تک جمعیت علمائے ہند کے سیاسی مسلک کا تعلق ہے۔ ہر شخص کو اچھی طرح معلوم ہے کہ جمعیت شروع سے اب تک برابر متحدہ قومیت کی زبردست حامی رہی اور اس کی تمام سیاست اسی ایک محور پر گردش کرتی رہی ہے۔ اسی بنا پر وہ تقسیم ہند کی شدید مخالف تھی اپنے مخصوص نظریے کے ماتحت جمعیت نے تیس سال تک مسلمانوں کی رہنمائی کی۔ اگرچہ

گزشتہ دس برسوں میں مسلمانوں کی اکثریت نے اس کی بات نہیں مانی لیکن واقعات و حقایق نے بالکل واضح طور پر ثابت کر دیا گیا ہے کہ پالیسی دراصل جمعیت کی ہی ٹھیک اور درست تھی اور یہ حقیقت ہے کہ اگر آج ہند کے مسلمان اپنے برادرانِ وطن سے مساوات و برابری کے سلوک کا مطالبہ کر سکتے ہیں تو محض جمعیت کے پچھلے کارناموں کی ہی وجہ سے کر سکتے ہیں اور آج ان کے مصایب و آفات میں اگر کوئی انجمن موثر اور مفید کام کر سکتی اور کر رہی ہے تو وہ صرف یہ ہی ایک جماعت ہے۔ اور یہی وہ ایک جماعت ہے جس کی وجہ سے کانگریس اور حکومت سے امید کی جا سکتی ہے وہ مسلمانوں کے ساتھ انصاف کرے گی۔
"اگر یہ جماعت نہ ہوتی تو کون بتا سکتا ہے کہ آج ہند میں مسلمانوں کا کیا مقام ہوتا۔"

متحدہ قومیت کی قایل ہونے باوجود اب جب کہ دو مملکتیں بن گئی ہیں جمعیت نے پاکستان کی اپنی شاخوں سے تعلق منقطع کر لیا ہے اور ان کو ہدایت کی ہے کہ وہ پاکستان کے پُر امن اور وفادار شہری کی حیثیت سے اسلام کے جمہوری اصول اور تعلیمات کی روشنی میں وہاں کے لوگوں کی خدمت کریں اور اپنے لیے ایک الگ اور جداگانہ لائحۂ عمل بنائیں۔ رہا ہندوستان کا معاملہ! تو یہاں اب جمعیت کوئی براہِ راست سیاسی کام نہیں کرے گی کیوں کہ مخلوط انتخاب کے رایج ہو جانے کے بعد اب کسی فرقہ وارانہ جماعت کے لیے خواہ وہ اپنے نظامِ فکر و عمل کے اعتبار سے کیسی ہی جمہوری اور ہمہ گیر ہو۔ سیاسی کام کرنے کی گنجایش ہی نہیں رہی ہے۔ اب جمعیت کا کام مسلمانوں کے تمدنی، مذہبی، تعلیمی اور اقتصادی معاملات کی اصلاح تک محدود رہے گا اور درحقیقت یہ ہی اصلی کام ہیں جن کو بہت پہلے سے کرنا چاہیے تھا۔ یہ کام کیا کیا ہیں اور ان کو کس طرح کرنا چاہیے؟ اس پر ہم آیندہ اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔

سطور بالا میں مسلمانوں کی گزشتہ سیاسی غلطیوں کی نسبت ہم نے جو کچھ لکھا ہے۔ حاشا وکلا اس سے مقصد کسی پر حملہ کرنا یا کسی کی دل آزاری کرنا ہرگز نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ وقت ابتلاے عام کا اور ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی اور مواسات کا ہے، نہ کہ ملامت کرنے اور برا بھلا کہنے کا۔ مصیبت سب پر ہی آ کر پڑی ہے اور نہ صرف مسلمانوں پر بلکہ ہندوؤں اور سکھوں پر بھی اور "وعند الشدايد تذهب الاحقاد" بلکہ مقصد ان باتوں کے ذکر سے یہ ہے کہ جمعیت کی رہنمائی میں آگے بڑھنے اور اپنے مستقبل کی فکر کرنے سے

پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی گزشتہ غلطیوں کا ایک مرتبہ پوری وسعت قلب ونظر سے جایزہ لے لیں اور آیندہ کے سفر میں اس کا خیال رکھیں کہ پھر اس کا اعادہ نہ ہو، ہر حال ماضی کا نتیجہ ہوتا ہے اور حال سے مستقبل پیدا ہوتا ہے۔ ماضی کی غلط اندیشیوں نے یہ حال بد دکھایا اگر ہم اس کو اس وقت کامل طور پر محسوس کر لیں اور عزم وہمت کے ساتھ آگے بڑھیں تو امید ہے ملک کا مستقبل حوصلہ افزا ہوگا۔ (برہان-دہلی: اپریل ۱۹۴۸ء: ص۲ تا ۶)

آزادی کے مسلمان علم بردار:

۲۱ر اگست ۱۹۴۸ء: مدینہ بجنور میں ایک مضمون ''آزادی کی علم بردار شخصیتیں'' شایع ہوا ہے، اس میں انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، مفتی محمد کفایت اللہ صاحب، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ (مدینہ-بجنور: ۲۱ر اگست ۱۹۴۸ء)

حیدرآباد دکن اور انڈین گورنمنٹ کے تعلقات — خطرناک موڑ:

۲۵ر اگست ۱۹۴۸ء: حیدرآباد، ۱۹ر اگست۔ حکومتِ نظام نے یہ پریس نوٹ جاری کیا ہے کہ حکومت نظام ان اختلافات کو جو اس کے اور حکومتِ ہند کے مابین پیدا ہو گئے ہیں، ادارہ اقوام متحدہ کے سامنے لے جائے گی۔ حیدرآباد کے وزیرِ اعظم میر لائق نے پنڈت جواہر لال نہرو وزیرِ اعظم ہند کو جو مراسلہ بھیجا ہے اس میں انھوں نے کہا ہے کہ

> ''حیدرآباد اور ہندوستان کے باہمی اختلافات نے خطرناک صورت اختیار کر لی ہے اور اس کی وجہ سے امن کو خطرات پیدا ہو گئے ہیں۔ اس لیے حیدرآباد نے اس مسئلے کی طرف ادارۂ اقوام متحدہ کی توجہ مبذول کرانے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ اس کی امداد سے ان کے اختلافات طے ہو جائیں اور پُرامن طریقے پر ہندوستان اور حیدرآباد کے مابین تصفیہ ہو جائے۔''

(مدینہ-بجنور: ۲۵ر اگست ۱۹۴۸ء)

بانیٔ پاکستان کا انتقال — تکفین وتدفین:

۱۱ر ستمبر ۱۹۴۸ء: گورنر جنرل پاکستان مسٹر محمد علی جناح کا شب کو انتقال ہو گیا۔ ان کی

آخری مذہبی رسوم خوجہ اثنا عشری عقیدے کے مطابق ادا کی گئیں۔ ان کے غسل و کفن کا انتظام مولانا انیس الحسنین نے خوجہ اثنا عشری عقیدے کے مطابق کیا تھا اور انھیں نے گورنر جنرل ہاؤس میں جناح صاحب کی استراحت گاہ میں ان کی نمازِ جنازہ پڑھائی تھی۔ بعدہٗ میت کو فوج کے حوالے کر دیا تھا۔ مولانا انیس الحسنین کراچی کے ایک معروف شیعہ عالم تھے، وہ کراچی کی مشہور آبادی ''رضویہ سوسائٹی'' کے بانی اور سندھ مدرستہ الاسلام کراچی میں شیعہ تھیالوجی کے مدرس تھے۔ مولانا انیس الحسنین کا ایک انٹرویو ۱۱ر ستمبر ۱۹۵۰ء کو انگریزی ہفت روزہ ''نیشن'' کراچی میں چھپا تھا۔ اس میں انھوں نے کہا:

''یہ ۱۱ر ستمبر ۱۹۴۸ء کی شب کا واقعہ ہے، میں گہری نیند سویا ہوا تھا کہ علی الصباح مجھے اُٹھایا گیا، دریافت کرنے پر نہایت راز داری کے ساتھ بتایا گیا کہ قایدِ اعظم کا انتقال ہو گیا ہے اور مجھے گورنر جنرل ہاؤس بلایا گیا ہے، مجھے لے جانے کے لیے گاڑی موجود ہے، وہ گاڑی مجھے ''ڈان'' کراچی کے دفتر لے گئی، وہاں سے ایک دوسری گاڑی میں مجھے فوراً گورنر جنرل ہاؤس پہنچا دیا گیا۔

وہاں میری ملاقات یوسف ہارون اور ان کی والدہ سے ہوئی۔ وہ مجھے قایدِ اعظم کے بیڈ روم میں لے گئے جہاں عظیم قاید کی میت ان کے بیڈ پر پڑی ہوئی تھی، جسے سیدھا کر دیا گیا تھا۔ مجھ سے کہا گیا کہ میت کی تجہیز و تکفین کا سارا انتظام مجھے کرنا ہے۔ میں واپس آیا تاکہ ضروری چیزیں حاصل کروں۔

آٹھ بجے صبح میں نے رحیم علی چھاگلا صدر خوجہ اثنا عشری جماعت اور الحاج سیٹھ عبدالرسول سیکرٹری خوجہ اثنا عشری جماعت کے ساتھ مل کر یہ ناخوش گوار فریضہ ادا کرنا شروع کیا، ابھی میں نے قایدِ اعظم کا غسل خانہ کھولا ہی تھا تاکہ رسوم شروع کی جائیں کہ گورنر جنرل کے سیکرٹری آئے اور بہت تحکمانہ لہجے میں پوچھا کہ آپ کو یہ اجازت کس نے دی ہے؟ میں نے ان سے کہا کہ آپ محترمہ فاطمہ جناح سے پوچھ لیجیے! وہ خواتین کے کمرے کی طرف گئے۔ انھیں جواب ملا ''مولانا انیس الحسنین ہی غسل دیں گے۔'' وہ یہ جواب پا کر وہاں سے چلے گئے۔

اس کے بعد دروازے بند کر دیئے گئے اور غسل دیا جانے لگا۔ غسل خانے میں میرے علاوہ چند لوگ اور تھے۔ ان میں حاجی شیخ ہدایت علی عرف حاجی مکو (غسال خوجہ اثنا

عشری جماعت) آفتاب علوی ابن حاتم اے علوی اور ایک نوجوان اور تھا۔ غسل کے بعد کفن دیا گیا جو کہ قایدِ اعظم کی ذاتی ملکیت تھا اور جسے خانہ کعبہ سے چھوا کر پاک کیا گیا تھا۔ تکفین کے بعد مندرجۂ ذیل حضرات نے میری اقتدار میں نمازِ جنازہ ادا کی:

جناب یوسف ہارون، جناب سید ہاشم رضا، جناب سید کاظم رضا، جناب آفتاب علوی، جناب حاجی شیخ ہدایت علی عرف حاجی مکو۔ ان کے علاوہ چار دوسرے افراد تھے جن کے نام اب مجھے یاد نہیں۔ نماز جنازہ کے بعد میت کو باہر لایا گیا اور فوج کے حوالے کر دیا گیا۔ گورنر جنرل کا باڈی گارڈ میت کے جلوس کی قیادت کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ مسلح فوج کا ایک دستہ تھا، ان کے پیچھے ایک گاڑی پر قومی جھنڈے میں لپٹا ہوا قایدِ اعظم کا جسدِ خاکی رکھا تھا، جسے پاکستان نیوی کے نوجوان کھینچ رہے تھے۔ میت کے جلوس میں فوج کے لیفٹیننٹ، غیر ملکی نمایندے اور غم زدہ لوگوں کا ایک ہجوم تھا، جنھوں نے اپنے محبوب قاید کو ان کی آخری آرام گاہ تک پہنچایا۔'' (ماہنامہ الامیر - کراچی: ستمبر ۱۹۹۶ء، ص ۴۶-۴۷)

مسلمانوں کے طریقے پر نماز مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھائی۔ اس میں کوئی خوجہ اثنا عشری، قادیانی وغیرہ شریک نہیں ہوا۔ بعد میں جب مولانا عثمانی مرحوم کو معلوم ہوا کہ جناح صاحب کے غسل و کفن خوجہ شیعہ طریقے پر کیا گیا تھا اور ان کی نمازِ جنازہ بھی اسی عقیدے کے مطابق پڑھ کر میت کو مسلمانوں کے حوالے کیا گیا، اس کے بعد انھوں نے نماز جنازہ پڑھائی تھی تو انھیں تعجب آمیز افسوس ہوا تھا اور انھوں نے کہا تھا ''تو بعض حضرات درست ہی کہتے تھے۔ بات صرف بے عملی ہی کی نہیں، بدعقیدگی کی بھی تھی۔''

مسٹر جناح کے انتقال کے بعد چوں کہ یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ ان کا تعلق خوجہ جماعت سے تھا اور ان کی بہن مس فاطمہ جناح نے ''مائی برادر'' (اردو ترجمہ ''میرا بھائی'') لکھ کر اس بات پر مہرِ تصدیق لگا دی تھی کہ ان کا تعلق مسلمانوں سے نہیں، اس لیے مس فاطمہ کی نماز جنازہ چھپ کر کسی کمرے میں پڑھنے کے بجائے میدان میں ان کے عقیدے کے مطابق پڑھائی گئی۔ نماز پڑھانے کی سعادت کے حصول کے لیے مولانا مفتی محمد شفیع خلیفہ راشد حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نہ صرف پہنچ گئے تھے بلکہ سبقت کر کے مصلے پر کھڑے بھی ہو گئے تھے لیکن شیعوں نے انھیں مصلے سے کھینچ کر الگ کر دیا تھا اور خود اپنے طریقے پر نماز پڑھائی تھی۔

حیدرآباد (دکن) میں پولیس ایکشن:

۱۳ ستمبر ۱۹۴۸ء: سری پرکاش لکھتے ہیں:

''موسم گرما ۱۹۴۸ء میں کراچی میں ایک جوش وخروش تھا۔ اس کا باعث یہ تھا کہ ایک انگریز جس کا نام کاٹن تھا بین الاقوامی قوانین کو نظر انداز کرتے ہوئے چند مرتبہ بہ ذریعہ جہاز حیدرآباد دکن کو اسلحہ اور گولا بارود کثیر مقدار میں پہنچا چکا تھا۔ بہ ظاہر اس کو نظام حیدرآباد سے ہمدردی تھی اور ہر طریقے سے ان کی مدد کرنا چاہتا تھا تاکہ ہندوستان کی ریاست حیدرآباد پر قبضہ کرنے کی ''خراب'' نیت کا سدباب ہو سکے۔ قاسم رضوی اور اس کے رضاکاروں نے تو ہندوستان کے خلاف علم بغاوت ہی بلند کر دیا تھا اور اس کوشش میں تھے کہ سمندر تک تو ہر سہ طرف اور ہو سکے تو لال قلعہ دہلی پر بھی آصف جاہی پرچم لہرانے لگے۔ ہمارے وزیر داخلہ سردار پٹیل نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ چوں کہ حیدرآباد بالکل ہندوستان کا مرکز ہے اس لیے وہ اس ملک سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ حیدرآباد نے نہ تو پاکستان سے الحاق کا اعلان کیا تھا نہ ہندوستان سے۔ مگر پاکستان خود ہی حیدرآباد کو اپنا جزو سمجھ رہا تھا کیوں کہ اس کا فرماں روا ایک مسلمان تھا اگرچہ آبادی میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔

پاکستان کو اس پر سخت ناگواری تھی کہ ہندوستان ریاست حیدرآباد کو اپنے میں ضم کر لینا چاہتا ہے۔ مگر خود نظام حیدرآباد کی آرزو تھی کہ ریاست حیدرآباد ایک آزاد مملکت بن جائے۔ پاکستان عملاً کاٹن کو اس کی کارروائی میں مدد پہنچا رہا تھا تاکہ اتنا سامانِ جنگ پہنچ جائے کہ ضرورت ہو تو یہ ریاست ہندوستان سے مقابلہ کر سکے۔ سب سے پہلے ہندوستان ہائی کمیشن کے کانوں میں یہ بھنک پڑی کہ اس قسم کی ساز باز ہو رہی ہے اور ان افواہوں کی تصدیق کر کے دہلی کو خبردار بھی کر دیا۔ اس اطلاع سے دہلی کو پریشانی ہوئی۔ مجھے یاد ہے کہ ہندوستان کی وزارت امورِ خارجہ نے ہائی کمیشن کو ایک خط درشت لہجہ میں لکھا کہ ہر پہلو سے تحقیق کرنے پر یہ پتا چلا کہ یہ بالکل گپ ہے اور اس قسم کی کوئی تحریک نہیں ہے۔ آئندہ اس نوعیت کی احمقانہ افواہیں وزارت امورِ خارجہ کے پاس نہ بھیجی جائیں۔ مگر ایسے واقعات دیر تک پردۂ راز میں نہیں رہ سکتے۔ چناں چہ خود کاٹن ایک دن مجھ سے ملنے آیا تاکہ اپنی کارگزاریاں فخر کے ساتھ مجھے بتائے۔ اس نے کہا ''میں ابھی حیدرآباد سے آیا ہوں اور سامانِ جنگ کے ہندوستانی کارخانوں پر بہت نیچے پرواز کی، مگر مجھ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا نہ پہنچ

سکتا تھا۔'' مجھے بہت غصہ آیا اور میں نے کہا کہ ''قانوناً ہائی کمیشن کا احاطہ ہندوستانی سرزمین ہے اور میں تم کو گرفتار کر سکتا ہوں۔ لیکن چوں کہ میرے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے کہ میں تم کو سیدھے دہلی بھیج سکوں اس لیے اپنے ارادے کی تکمیل سے معذور ہوں۔'' میں نے اس کو صاف صاف بتا دیا کہ وہ اپنی شرم ناک حرکتوں سے پاکستان اور ہندوستان کے باہمی تعلقات کو اور زیادہ خراب کر رہا ہے، میں نے یہ بھی کہا کہ ''تم پاکستان کے اغماض کے سہارے بین الاقوامی قاعدوں کی خلاف ورزی کر رہے ہو اور یہ بہت برا ہے۔'' اس کے دماغی سکون پر مجھے تعجب ہوا۔ میری خشم ناک گفتگو سن کر اس نے نہایت اطمینان سے نظام کی تعریف کی اور کہا کہ ''بہ ہر حال میں ان لوگوں کو اچھا سمجھتا ہوں جو مجھے اچھا سمجھیں۔ حیدر آباد کے لوگ میری بڑی قدر و منزلت کرتے ہیں۔'' میں نے وزیرِ مواصلات سردار عبدالرب نشتر (جن سے میری شناسائی دہلی اسمبلی کے زمانے سے تھی اور ہم دونوں نے حال ہی میں ایک ہوائی سفر کے معاہدے پر دستخط بھی کیے تھے) سے اس کا ذکر کیا اور کہا کہ کاٹن ہوائی سفر کے بین الاقوامی قوانین کی صریحی خلاف ورزی کر رہا ہے، لہٰذا حکومتِ پاکستان کو اس کے خلاف کارروائی کرنا چاہیے۔

یہ بات سردار عبدالرب نشتر کو بہت گراں گزری۔ وہ بولے کہ ''ہم غیر ملکی باشندوں کی آمد و رفت نہیں روک سکتے۔ ماسوا اس کے حیدر آباد نے ہنوز ہندوستان میں شامل ہو جانے کا اعلان نہیں کیا ہے۔ میں نے پیلس ہوٹل میں کاٹن کو اس شان سے رہتے دیکھا ہے کہ گویا وہی اس ہوٹل کا مالک ہے۔ اس میں شک نہیں کہ پاکستان اس کو بہ نظرِ مقبولیت دیکھتا تھا۔ جب کاٹن کی کارروائی کی شہرت ہوئی تو میں نے دہلی کے ایک ممتاز اخبار میں پڑھا کہ ہندوستانی ہائی کمشنر اپنی تنخواہ سیدھی کرنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں کر رہا ہے۔ اس کا فرض تھا کہ گورنمنٹ آف انڈیا کو ان امور سے باخبر رکھے۔ اس خبر کے جواب میں خود میں تو کچھ لکھ نہیں سکتا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ حکومتِ ہند میری صفائی دے گی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کو کوئی پروا نہ تھی اس لیے اس خبر کی تردید تک نہ کی۔ تب میں نے سرگرجا شنکر باجپائی سیکرٹری جنرل امور خارجہ کو لکھا کہ ''ہندوستانی ہائی کمیشن نے شروع ہی میں گورنمنٹ آف انڈیا کو کاٹن کی نقل و حرکت اور کارروائی کی اطلاع دے دی تھی، مگر خود حکومت نے اس اطلاع کو اہمیت نہ دی بلکہ مجھی کو تنبیہ ملی کہ اس طرح کی بے بنیاد اطلاعات نہ بھیجا کروں۔

ان حالات میں آپ کو چاہیے کہ میرے خلاف ایسے الزامات کی تردید پریس کے ذریعے شایع کردیں۔" اس کے جواب میں انھوں نے بہت سرد مہری دکھائی اور مجھے لکھا کہ "ایسی باتوں کی پروانہ کرو اور اس معاملے کو جیسا ہے ویسا ہی رہنے دو۔" میں ذرا حساس طبیعت رکھتا ہوں اس لیے مجھے ناگوار گزرا۔ مگر خاموشی کے سوا چارہ کار کیا تھا؟ اس کے بعد سے گورنمنٹ آف انڈیا نے کاٹن کی آمد و رفت پر کڑی نظر رکھنے کا حکم دے دیا کہ اس قسم کے طیاروں کو مار گرایا جائے۔ اگرچہ کاٹن نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ کراچی سے حیدرآباد (دکن) عام راستے سے جایا کرتا ہے، مگر میں نے پتا لگایا کہ وہ سمندر پر سے پرواز کر کے گووا تک جاتا تھا جو اس وقت پرتگالی مقبوضہ تھا۔ پھر بلند پروازی کر کے گووا سے قدیم ریاست حیدرآباد تک ہندوستان کی ایک مختصر سرزمین پر سے چلا جاتا تھا۔ اس میں شک کی بالکل گنجایش نہیں کہ کاٹن ایک بے نظیر پائلٹ تھا۔

بالآخر گورنمنٹ آف انڈیا نے پولیس ایکشن کی ٹھان لی اور فوج حیدرآباد بھیج دی گئی۔ پاکستان کا کہنا ہے کہ یہ حملہ بے سبب اور "زبردست مارے اور رونے نہ دے" کا مصداق تھا۔ کیوں کہ ایک طاقت ور بے اصول دشمن نے ایک کمزور مسلم فرماں روا پر حملہ کردیا۔

ہماری فوج ۱۳/ ستمبر ۱۹۴۸ء کو حیدرآباد میں داخل ہوئی۔ کاٹن کا طیارہ اور سامانِ جنگ کا کہیں نشان نہ تھا۔ مجھے یقین ہے کہ خود اسی کے ملک نے خلاف ورزی قانون کے جرم میں سزا دی ہوگی۔ مسٹر جناح کا انتقال ۱۱/ ستمبر ۱۹۴۸ء کو ہوا۔ ہماری فوج کے حیدرآباد میں داخل ہونے کی خبر اسی روز یعنی ۱۳/ ستمبر کو سہ پہر کے وقت کراچی پہنچی۔ تقریباً چار پانچ ہزار برافروختہ افراد کا ہجوم ہندوستانی ہائی کمیشن کے دفتر پہنچا۔ اس وقت شام ہو چکی تھی۔ دن بھر کام کرنے کے بعد موٹر پر ہوا خوری کے لیے چلا گیا تھا۔ واپسی پر یہ مجمع نظر آیا۔ حکومت پاکستان نے جو محافظ ہائی کمیشن کو دیے تھے انھوں نے صدر دروازہ بند کردیا تھا۔ باہر یہ لوگ نعرے لگا رہے تھے۔ اس جم غفیر کے قریب پہنچ کر میں موٹر سے اتر پڑا۔ چوں کہ ساری عمر ایسے ہی ہنگاموں سے سابقہ پڑتا رہا تھا اس لیے بغیر کسی قسم کے خطرے کے احساس کیے ہوئے اس مجمع میں گھس پڑا۔ اس وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا لیکن مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔

بہت سے لوگ میرے چاروں طرف اکٹھا ہو گئے اور نعرہ لگانے لگے کہ "تم بزدل

انسانو! تم لوگوں نے اسی وقت حملہ کیا جب ہمارے ''باپ'' کا انتقال ہوا۔'' ان کا مطلب مسٹر جناح سے تھا جن کا انتقال دو دن پیشتر ہوا تھا۔ مجھے خود ہی علم نہ تھا کہ یہ حملہ کیسے ہوا؟ لیکن چوں کہ میں ایمان داری سے یہ سمجھ رہا تھا کہ جو کچھ میں کہنے والا ہوں وہ درست اور صحیح ہے اس لیے میں نے جواب دیا کہ ''قایدِ اعظم کی رحلت کا صدمہ ہم لوگوں کو بھی ویسا ہی ہے جیسا آپ سب کو ہے۔ دراصل ہماری فوج کو کل ہی حیدر آباد میں داخل ہونا تھا لیکن مسٹر جناح کی وفات کی وجہ سے ایک روز سوگ منایا گیا، اسی وجہ سے ہماری فوج نے کل نقل و حرکت نہیں کی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ میرے ان الفاظ کا کتنا اچھا اثر ہوا۔ کچھ آوازیں سنائی دیں کہ ''ہاں ہاں! یہ سچ ہے، ہم نے بھی ایسا ہی سنا ہے۔'' تب میں نے پوچھا کہ آپ لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ لوگ بولے ''ہم چاہتے ہیں کہ حیدر آباد سے اپنی فوج ہٹالو۔'' میں نے کہا کہ اس مضمون کا تار میں اپنے وزیرِ اعظم کو ابھی روانہ کیے دیتا ہوں۔ اپنے ایک اسسٹنٹ کو بلا کر میں نے کہا کہ میرے کہنے کے مطابق تار لکھو، تار کا مضمون قریب قریب یہ تھا کہ ''یہاں کے لوگ حیدر آباد پر حملے کی وجہ سے بہت جوش میں ہیں، وہ چاہتے ہیں فوج فوراً واپس بلالی جائے۔ اس سے لوگ ذرا مطمئن ہوئے۔ پھر میں نے پوچھا کہ آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ ''وہ بولے کہ ہندوستان کے خلاف پاکستان اعلانِ جنگ کردے۔'' میں نے کہا یہ بالکل درست ہے۔ لیکن آپ کی فوج کو حملے کا حکم دینے کا مجھے کوئی اختیار نہیں۔ اپنی اس خواہش کا اظہار آپ اپنے وزیرِ اعظم سے کیجیے۔ ہر طرف سے شور بلند ہوا۔ ''بالکل ٹھیک ہے، بالکل ٹھیک ہے۔'' اس کے بعد تین منٹ سے کم میں یا یوں کہیے کہ پلک جھپکتے میں یہ ہزاروں آدمیوں کا مجمع چھنٹ گیا۔ اس سے قبل کبھی بھی میں نے اتنی جلدی اتنے بڑے مجمع کو منتشر ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ بعد کو مجھے اطلاع ملی کہ یہ لوگ وزیرِ اعظم کی قیام گاہ پر گئے اور مکان کے کچھ دروازے اور کھڑکیاں توڑ ڈالیں اور یہ مطالبہ کررہے تھے کہ ہندوستان کے خلاف فوراً اعلانِ جنگ کردیا جائے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ وزیرِ اعظم باہر نکل کر ان لوگوں کے سامنے آئے اور ہوم گارڈ والوں سے کہا ''ہاتھ اٹھاؤ۔'' (کون لڑائی میں جانا چاہتا ہے) کسی نے بھی ہاتھ نہ اٹھایا۔ اس پر وزیرِ اعظم بولے ''بتاؤ کس برتے پر میں ہندوستان سے جنگ کروں۔'' ندامت کے ساتھ یہ مجمع منتشر ہوگیا۔

میں اپنی قیام گاہ پر پہنچا ہی تھا کہ اعلا افسران پولیس و نیز مقامی افسران میرے پاس

آئے۔ یہ حضرات شروع ہی سے مجمع کے پیچھے کہیں تھے۔ ان سب نے اس مجمع کے طرزِ عمل کی مجھ سے معافی چاہی اور متردد ہو کر مجھ سے دریافت کیا کہ مجھے کہیں چوٹ تو نہیں لگی اور ساتھ ہی اس مجمع کے برتاؤ پر اظہار ندامت کیا۔ پھر مجھ سے پوچھا کہ اگر میں مناسب سمجھوں تو محافظین کی تعداد بڑھادی جائے۔ میں نے یقین دلایا کہ میں خیریت سے ہوں مجھے کسی قسم کا صدمہ نہیں پہنچا، ساری عمر ہجوم سے مڈبھیڑ کا عادی رہا ہوں، بلکہ ان لوگوں سے مل کر خوشی ہوئی۔ کوئی ایسی ناگوار بات نہیں پیش آئی جس کی معافی آپ چاہیں۔ اس مجمع کا طرزِ عمل میرے ساتھ قطعاً قابلِ شکایت نہ تھا۔ رہا پولیس گارڈ کا سوال، آپ چاہیں تو موجودہ گارڈ بھی ہٹالیں۔ مجھے کسی محافظ کی ضرورت نہیں۔ میں پاکستان کو بیرونی ملک نہیں سمجھتا بلکہ یہاں والوں کو اسی طرح اپنا بھائی سمجھتا ہوں جیسا بٹوارے سے قبل محسوس کرتا تھا۔

وزارتِ امورِ خارجہ (پاکستان) سے مسلسل ٹیلی فون پیغامات، دریافت، خیریت کے آنے لگے کہ مجھے کوئی جسمانی صدمہ تو نہیں پہنچا۔ ساتھ ہی ساتھ اس واقعے پر اظہار تاسف بھی کیا جاتا تھا، میں وہی جواب دے دیتا تھا کہ جو پولیس افسران سے کہا تھا۔ سیکرٹری وزارتِ امورِ خارجہ نے ٹیلی فون پر مجھ سے کہا "حالات معلوم ہوئے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ کا طرزِ عمل کیا رہا۔ آپ نے بالکل وہی کیا جس کے وہ سزاوار تھے۔" اس پیغام سے جو تسکین ممکن تھی میں نے حاصل کی۔

ایک یا دو روز بعد گورنمنٹ ہاؤس میں نئے گورنر جنرل کو حلف دینے کی رسم میں شرکت کے لیے میرے پاس دعوت نامہ آیا۔ اس وقت ہندوستان اور پاکستان دونوں برطانوی حکومت کے زیرِ سایہ تھے۔ مسٹر جناح کی جانشینی کے لیے ملک معظم کی منظوری خواجہ ناظم الدین کے لیے آگئی تھی۔ پینتیس سال قبل خواجہ ناظم الدین اور میں کیمبرج میں ہم عصر رہ چکے تھے اور باہمی تعلقات ہنوز اچھے تھے۔

(پاکستان — قیام اور ابتدائی حالات: تخلیقات - لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۹۔۱۰۵)

حیدرآباد دکن — رضاکاروں کا فتنہ:

اکتوبر ۱۹۴۸ء: مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے حیدرآباد کے واقعے پر ایک شذرہ لکھا ہے؛ اس کا ایک ٹکڑا ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔ اس نے حالات کی خرابی کے واقعی پس منظر پر

کچھ روشنی پڑتی ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

حیدر آباد کا ڈرامہ شروع ہوا اور چار دن کے اندر ہی اندر ختم بھی ہو گیا۔

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشہ نہ ہوا

بہ ہر حال اب جب کہ کمیونسٹوں اور رضا کاروں کے فتنے کا سر قلم ہو چکا ہے اور جیسا کہ نظام نے خود اپنے اعلانات اور بیانات میں صاف صاف کہا ہے اور حیدر آباد کے فوجی گورنر نے بھی نظام کے رویے کی تعریف کرتے ہوئے اس کو تسلیم کیا ہے کہ اصل فساد کا باعث رضا کار ہی تھے، جنھوں نے والیِ دکن کو بے دست و پا کر دیا تھا اور اس بنا پر انڈین یونین کے ساتھ وہ خوش اسلوبی سے اپنی صواب دید کے مطابق معاملات طے نہ کر سکتے تھے۔ ہمیں امید قوی ہے کہ انڈین یونین والیِ دکن اور ان کی ریاست کے ساتھ وہی معاملہ کرے گی جو اس کو گاندھی جی کے ایک سچے اور مخلص پیرو کی حیثیت سے کرنا چاہیے۔ ہماری گزشتہ فرقہ وارانہ سیاست کے منحوس اثرات بہت کچھ مٹ چکے ہیں لیکن اب بھی کہیں کہیں باقی ہیں، جو لوگ یا جو جماعتیں اس کا شکار ہو گئیں ان کو مرضِ بحران کا مریض سمجھنا چاہیے اور اس مرض کے علاج کا بہترین طریقہ یہ ہی ہے کہ طاقت و قوت کی بجائے انسانی اور اخلاقی اصول سے کام لے کر ان کے دل و دماغ کو بدلنے اور ان پر قابو پانے کی کوشش کی جائے۔ طبیب کے لیے یہ طریقۂ علاج صبر آزما اور فرصت طلب ضرور ہے، لیکن اصل علاج یہ ہی ہے جس سے مرض کی بالکل بیخ کنی ہو سکتی ہے۔ (برہان- دہلی: اکتوبر ۱۹۴۸ء)

بھودان، گرام دان تحریک:

ہندوستان میں سرودیہ یعنی تعمیری کاموں کے ذریعے سماجی اصلاح اور بہبود کی کوشش کا فلسفہ مہاتما گاندھی کے خیالات اور ان کی عملی کوششوں کی دین ہے۔ ۱۹۴۸ء میں گاندھی جی کی وفات کے بعد ان کے خیالات کو ماننے والوں نے ''سرودیہ سماج'' کے نام سے ایک غیر سیاسی جماعت گاندھیائی مقاصد کے لیے کام کرنے کی غرض سے قایم کی۔ اس کے بعد ''اکھل بھارتیہ سرو سیوا سنگھ'' کے نام سے ایک دوسری جماعت وجود میں آئی۔ اس تحریک میں اصل جان ۱۹۵۱ء سے پڑی جب آچاریہ ونوبا بھاوے نے بھودان کی تحریک شروع کی۔

اس کے ذریعہ سرودیہ تحریک گاندھی جی کے خیالات کو سمونے کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں بغیر تشدد کے سیاسی واقتصادی انقلاب اور سماجی انصاف لانے کا ہراول بن گئی۔

بھودان کے معنی ہیں کہ زمین دار کسان رضا کارانہ طور پر اپنی زمین کا کچھ حصہ بے زمین زراعتی مزدوروں میں تقسیم کرنے کے لیے دان کریں۔ بھودان کے تصور نے اس وقت جنم لیا جب آچاریہ بھاوے نے تلنگانہ میں ۱۹۵۱ء کے زرعی فسادات کے بعد بہ حالی امن کے لیے اس علاقے کا دورہ کیا۔ ایک جگہ وہ کسی جلسے کو خطاب کر رہے تھے کہ کسی شخص نے اپنی زمین کا ایک قطعہ ونوبا کو دان کے طور پر پیش کیا۔ یہیں سے بھودان تحریک شروع ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے بے زمینوں میں تقسیم کرنے کے لیے ملک گیر پیمانے پر زمینوں کے رضا کارانہ عطیات کی اپیل کی اور پدیاترا شروع کی۔

گرام دان کے تصور کی ابتدا اس وقت ہوئی جب بھاوے مئی ۱۹۵۲ء میں ریاست اتر پردیش کی پدیاترا پر تھے کہ منگروٹھ نامی گاؤں کے کسانوں نے مشترکہ طور پر اپنی ساری زمینیں ونوبا کو دان کر دیں۔ بعد میں ان زمینوں کو گاؤں والوں کے درمیان اس منصفانہ طریقے سے تقسیم کر دیا گیا کہ بے زمین مزدوروں کو بھی زمین مل گئی۔ لیکن یہ مثالی گرام دان عام پیمانے پر قابل عمل نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے ونوبا نے ''سلبھ گرام دان'' کا تصور پیش کیا جس میں توقع کی جاتی ہے کہ گاؤں کی ۷۵ فیصد آبادی گرام دان کرے گی۔ گاؤں کی ۵۱ فیصد اراضی کی ملکیت ایک گرام سبھا کو دے دی جاتی ہے۔ بیسواں حصہ بے زمینوں اور ضرورت مند کسانوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔

گرام دان تحریک کا مقصد محض بے زمین لوگوں کے لیے زمین ہی نہیں مانگنا ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ہر گاؤں میں ''گرام سوراج'' قایم کرنا ہے۔ اس مقصد کے لیے گاؤں میں امورِ عامہ کے انتظام کے لیے گرام سبھا ضرورت مند کسانوں کو قرض دینے کے لیے گرام کوش اور امن وامان کی برقراری کے لیے ''شانتی سینا'' قایم کی جاتی ہے۔ شانتی سینا کے رضا کاروں کو عام حالات میں ''لوک سیوک'' کہتے ہیں اور فسادات اور ہنگاموں کے زمانے میں وہ ''شانتی سینک'' کہلاتے ہیں۔ سرودیہ کے پروگرام میں ہر گاؤں میں کھادی اور دست کاریوں کو فروغ دینا، صفائی ستھرائی، طبی امداد، جھگڑوں کا نپٹانا اور نظم وضبط قایم رکھنا ہے۔ (فرہنگ سیاسیات: ص ۱۱۶)

۱۹۴۹ء

گاندھی جی کے قاتلوں کی پھانسی:

۱۰ر جنوری ۱۹۴۹ء: ۱۰ر جنوری ۱۹۴۹ء کو مشرقی پنجاب ہائی کورٹ نے نتھورام گاڈ سے اور اس کے ساتھ نارائن اپٹی کی اپیل خارج کر دی۔ اور ان دونوں کو ۱۵ر نومبر ۱۹۴۹ء کو صبح آٹھ بجے انبالہ جیل میں پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا گیا۔ جیل آفیسروں کا بیان ہے کہ

''جب قاتلوں کو پھانسی کے تختے کی طرف لے جایا جا رہا تھا اس وقت وہ پرسکون اور خوش نظر آ رہے تھے۔ مرنے سے پیشتر دونوں نے ''اکھنڈ بھارت امر ہے'' اور ''بندے ماترم'' کا نعرہ لگایا۔''

قرارداد پاکستان:

۱۲ر مارچ ۱۹۴۹ء: قراردادِ مقاصد کے عنوان سے ایک قرارداد جو پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان نے دستور ساز اسمبلی میں پیش کی تھی، کثرت رائے سے پاس ہو گئی۔ قرارداد میں کہا گیا ہے:

''چوں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ہی کل کائنات کا بلاشرکت غیرے حاکم مطلق ہے، اس نے جمہور کے ذریعے مملکتِ پاکستان کو جو اختیار و اقتدار سونپا ہے وہ اس کی مقررہ حدود کے اندر مقدس امانت کے طور پر استعمال کیا جائے گا۔

مجلس دستور ساز نے، جو جمہور پاکستان کی نمائندہ ہے، آزاد و خود مختار پاکستان کے لیے ایک دستور مرتب کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

جس کی رو سے مملکت اپنے اختیارات و اقتدار کو جمہور کے منتخب نمائندوں کے ذریعے استعمال کرے گی۔

جس کی رو سے جمہوریت، حریت، مساوات، رواداری اور عدل عمرانی کے اصولوں کا جس طرح اسلام نے ان کی تشریح کی ہے، پورا اتباع کیا جائے گا۔

جس کی رو سے مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات و مقتضیات کے مطابق، جس طرح کہ قرآن و سنت میں ان کا تعین کیا گیا ہے، ترتیب دے سکیں۔

جس کی رو سے اس امر کا قرار واقعی اہتمام کیا جائے گا کہ اقلیتیں، اپنے مذاہب پر عقیدہ رکھنے، ان پر عمل کرنے اور اپنی ثقافتوں کو ترقی دینے کے لیے آزاد ہوں۔

جس کی رو سے وہ علاقے جو اب تک پاکستان میں داخل یا شامل ہو گئے ہیں اور ایسے دیگر علاقے جو آئندہ پاکستان میں داخل یا شامل ہو جائیں ایک وفاق بنائیں گے جس کے صوبوں کو مقررہ اختیارات و اقتدار کی حد تک خود مختاری حاصل ہوگی۔

جس کی رو سے بنیادی حقوق کی ضمانت دی جائے گی اور ان حقوق میں جہاں تک قانون و اخلاق اجازت دیں مساوات، حیثیت و مواقع، قانون کی نظر میں برابری، عمرانی، اقتصادی اور سیاسی انصاف، اظہارِ خیال، عقیدہ، دین، عبادت اور جماعت سازی کی آزادی شامل ہوگی۔

جس کی رو سے اقلیتوں اور پس ماندہ و پست طبقوں کے جائز حقوق کے تحفظ کا قرار واقعی انتظام کیا جائے گا۔

جس کی رو سے نظامِ عدل گستری کی آزادی پوری طرح محفوظ ہوگی۔

جس کی رو سے وفاق کے علاقوں کی صیانت اس کی آزادی اور اس کے جملہ حقوق کا جس میں اس کی خشکی وتری اور فضا پر صیانت کے حقوق شامل ہیں، تحفظ کیا جائے گا۔

تاکہ اہلِ پاکستان فلاح و بہبود کی منزل پا سکیں اور اقوام عالم کی صف میں اپنا جائز و ممتاز مقام حاصل کریں اور امن عالم اور بنی نوع انسان کی ترقی و خوش حالی کے لیے اپنا بھرپور کردار ادا کر سکیں۔"

یہ قرارداد منظور ہونے کے بعد ۱۹۵۶ء اور ۱۹۷۳ء کے آئین کا دیباچہ بنادی گئی تھی اور اگرچہ دستور سازی میں اس کی اہمیت کی کبھی پروا نہیں کی گئی لیکن اصولی اعتبار سے وہ دستور کی ایک بالاتر دستاویز تھی۔ جنرل ضیاء الحق کے دور میں اسے دستور کے دیباچے کے بجائے دستور کا حصہ بنا دیا گیا۔ اور عدلیہ کے بعض فیصلوں میں اس کی مؤثر حیثیت کا عملاً اعتراف بھی کیا گیا۔ لیکن بعد میں اس سے سپریم کورٹ کے فیصلے نے اس کی بالاتری اور

دستور سازی میں اس کی مؤثر حیثیت کے برعکس فیصلہ کردیا، اب دستور ساز اسمبلی اُن کی پابند نہیں کہ اس میں شامل اصولوں کی روشنی دستور سازی کرے۔ بالا اثر حیثیت دستور ساز اسمبلی کی ہے، وہ کوئی قانون بھی بنا سکتی ہے، کسی دفعہ میں ترمیم و تنسیخ کرسکتی ہے، خواہ قرارداد مقاصد کے اصول کچھ ہوں۔ چودھری محمد یوسف ایڈوکیٹ کی ایک تحریر سے اس مسئلے پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''قراردادِ مقاصد پاکستان کی نظریاتی اساس ہے۔ مملکت کا دستور اسی اساس پر استوار ہوسکتا ہے..... یہ ہر دستور کا دیباچہ ہے۔ اس کی موثر حیثیت اعلا عدالتوں میں شروع ہی سے زیر بحث رہی ہے۔ ایک نقطۂ نظر یہ۔ ہا کہ اس قرارداد میں درج اصول چوں کہ قرآن وسنت سے اخذ کیے گئے ہیں، اس لیے یہ قرارداد مملکت کا عقیدہ ہے۔ ہر قانون حتیٰ کہ دستور کی ہر دفعہ کو اس عقیدے پر پورا اترنا ہوگا۔ جہاں کہیں قرارداد میں درج اصولوں سے انحراف پایا جائے گا وہ انحراف باطل اور غیر موثر ہوگا۔ قرارداد میں درج اصول، قانون و دستور کی ہر دفعہ پر حاوی اور بالادست رہیں گے۔ سکینہ بی بی کے کیس میں ہائی کورٹ لاہور کے تین ججوں (شیخ ریاض احمد، راجہ افراسیاب، ملک محمد قیوم) پر مشتمل فل بنچ نے یہی فیصلہ دیا۔ متنازعہ امر یہ تھا کہ ۱۹۸۸ء میں بے نظیر صاحبہ کی ایڈوایس پر صدر مملکت نے بے شمار قیدیوں کو موت، عمر قید اور دیگر سزاؤں کی معافی، تبدیلی اور تخفیف کے احکامات جاری کیے۔ صدر مملکت نے یہ احکامات دستور کے آرٹیکل ۴۵ کے تحت حاصل اختیارات استعمال کرتے ہوئے جاری کیے۔ جب کہ ان احکامات کو چیلنج کرتے ہوئے یہ مؤقف اختیار کیا گیا کہ دستور کا آرٹیکل ۴۵ اسلامی احکامات (قرارداد مقاصد میں درج اصولوں) کے منافی ہونے کی وجہ سے باطل ہے۔ لاہور ہائی کورٹ نے اس مؤقف کو تسلیم کرتے ہوئے دستور کے آرٹیکل ۴۵ کو غیر مؤثر قرار دیا۔ ایسے نقطۂ نظر کو اختیار کرتے ہوئے مختلف مقدمات میں فل مذکور بنچ میں شامل ججوں کے علاوہ ہائی کورٹ لاہور کے کئی ججوں اور دیگر صوبوں کی ہائی کورٹس نے بھی ایسے کئی فیصلوں میں قرارداد مقاصد کی برتر حیثیت پر صاد کیا ہے۔ دستوری طور پر یہ فیصلے حتمی حیثیت نہیں رکھتے۔ چناں چہ حتمی تصفیہ کے لیے معاملہ سپریم کورٹ کے سامنے پیش ہوا جہاں ڈاکٹر نسیم حسن شاہ کی سربراہی میں سپریم کورٹ نے اس نقطۂ نظر کو مسترد کردیا۔ اور یہ قرار دیا کہ قراردادِ مقاصد کو دستور میں کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ یہ دستور

کے دیگر آرٹیکلز کے مساوی درجے میں ہے۔ جب کبھی اس کا کسی دیگر دستوری دفعہ سے تصادم سامنے آئے گا تو عدالت یہ تصادم دور کرنے کے بارے میں خود بے بس ہوگی اور وہ زیادہ سے زیادہ پارلیمان کو اس بارے میں متوجہ کرا سکتی ہے۔

سپریم کورٹ کے فیصلے سے پاکستان کے اساسی نظریے پر زبردست زد پڑتی ہے۔ کسی مملکت کی اعلا عدالتیں اس کے اساسی نظریے کی محافظ و نگران ہوتی ہیں۔ اس حیثیت میں اگر مملکت کے دیگر ادارے جیسے مقننہ یا انتظامیہ، نظریاتی اقدار کو پس پشت ڈال دیں اور اس کے ضعف کا باعث ہوں تو تلافی کی صورت اعلا عدالتوں سے رجوع ہے۔ اس بے داد پر دادرسی کے لیے اعلا عدالتوں کا فورم اپنی ہیئت تشکیل کی وجہ سے موجود ہوتا ہے۔ یہ اصول قانون کی بنیاد ہے کہ "ہر ظلم کے خلاف دادرسی موجود ہوتی ہے۔" مگر یہ کیسی دادرسی ہے کہ سپریم کورٹ اپنی بے بسی کا اعلان کر دے اور دادرسی کے لیے مظلوم کو ظالم کے دروازے پر دھکیل دے؟ یہ عدالت نہیں، یہ انصاف نہیں..... خاص طور پر جب معاملہ مملکت کی اساسی اقدار کا ہو..... اور عدالت کا حکم یہ ہو..... نظریے کی محافظ و نگراں، اپنی شان منصب سے یوں بے نیاز ہو جائے۔"

(حرف آغاز (از چودھری محمد یوسف ایڈوکیٹ) قرارداد مقاصد بہ نام سپریم کورٹ آف پاکستان از قلم سردار شیر عالم خاں ایڈوکیٹ، ناشر۔ الشریعہ اکیڈمی۔ گوجرنوالہ ۱۹۹۴ء: ص ۸-۷)

۱۳/ مارچ ۱۹۴۹ء: پاکستان دستور ساز اسمبلی کا اجلاس۔ پاکستان میں غیر مذہبی ریاست کے قیام کا قطعی فیصلہ۔ (مدینہ۔ بجنور: ۱۳/ مارچ ۱۹۴۹ء)

قومی اسمبلی (ہند) میں کشمیر کی نمائندگی:

۱۶/ جون ۱۹۴۹ء: ۱۶/ جون ۱۹۴۹ء کو کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کے اجلاس میں کشمیری نمائندے پہلی بار شریک ہوئے۔ مولانا حسرت (موہانی) نے جناب شیخ عبداللہ سے گفتگو کے دوران بڑی بے باکی سے کہا کہ آپ لوگوں نے مہاراجہ کشمیر کی حکم رانی کو بہ حال رکھا ہے۔ آخر یہ کہاں تک درست ہے؟ جب کہ بڑودہ، میسور اور بھوپال کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔

(حسرت موہانی — ایک سیاسی ڈائری: ص: ۶۷)

میثاق ہائے جنیوا:

۱۲ر اگست ۱۹۴۹ء: میثاق ہائے جنیوا سے مراد وہ چار بین الاقوامی معاہدے ہیں جن پر جنگ سے متاثر ہونے والے انسانوں کی حفاظت کے لیے جنیوا میں ۱۲ر اگست ۱۹۴۹ء کو ۵۸ حکومتوں اور ویٹکن کے نمائندوں نے دستخط کیے۔ اس سلسلے کا پہلا میثاق میدان جنگ میں پائے گئے زخمیوں اور مریضوں کی حالت بہتر بنانے سے متعلق تھا۔ اسی موضوع پر جنیوا میں ۱۸۶۴ء میں پہلے میثاق پر دستخط ہوئے تھے اور اس کی جگہ موجودہ میثاق نے لی۔ جنیوا میثاق کی تاریخ صلیب احمر کی بین الاقوامی کمیٹی کے قیام سے وابستہ ہے۔ ۱۸۶۴ء کے میثاق پر ۱۹۰۶ء اور ۱۹۰۷ء میں نظر ثانی کی گئی۔

۱۹۴۹ء کا دوسرا میثاق بحری جنگ میں حصہ لینے والے فوجیوں کے ساتھ سلوک کے بارے میں ہے۔ تیسرا میثاق جو سب سے اہم ہے جنگی قیدیوں کے ساتھ سلوک اور ان کی واپسی کے بارے میں ہے۔ جنگی قیدیوں کے سلسلے میں اس کے پیش رو میثاق پر جنیوا میں ۱۹۲۹ء میں دستخط ہوئے تھے۔ چوتھا میثاق جنگ کے دوران شہری آبادی کی حفاظت سے متعلق ہے۔ (فرہنگ سیاسیات ص ۲۰-۲۱۹)

جشن یوم آزادی میں مولانا حسرت کی عدم شرکت:

۱۵ر اگست ۱۹۴۹ء کو گورنر جنرل ہندوستان سی راج گوپال اچاریہ نے جشن یوم آزادی کے سلسلے میں ایک سرکاری دعوت کی، جس میں مولانا حسرت موہانی کو بھی مدعو کیا۔ مولانا لکھتے ہیں کہ راجہ جی کے یہاں شب کی دعوت تھی میں بھی مدعو تھا مگر موٹر یا سواری کا انتظام نہ ہو سکا اس لیے نہ گیا۔ علاوہ ازیں حاصل شدہ آزادی کو حقیقی آزادی سمجھنے کا بھی میرے دل کو اطمینان نہیں —! بنابریں اس دعوت میں حسرت نہ جا سکے اور یہیں سے مولانا کی صحت گرنا شروع ہوگئی۔ عمر کے تقاضے کے ساتھ دماغی کیفیت میں بھی بہت حد تک خشکی کا دخل شروع ہوگیا۔ (حسرت موہانی — ایک سیاسی ڈائری)

آزاد ہندوستان کا دستور:

۲۶ر نومبر ۱۹۴۹ء کو اسمبلی کا کام جاری رہا، مجلس دستور ساز نے دو سال گیارہ ماہ

اٹھارہ دن میں بھارت کا دستور بنایا۔ اس دستور بنانے پر حکومت کا ۶۳ لاکھ روپیہ خرچہ آیا۔ یہ دستور ۲۲ حصوں میں ہوا۔ اس دستور کی رو سے آزاد بھارت اعلا اختیار رکھنے والا غیر مذہبی جمہوریہ اور دولت مشترکہ کا ممبر بن گیا۔ ڈاکٹر امبیڈکر دستور بنانے والی کمیٹی کے صدر تھے۔ دستور کے شروع میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ ہم باشندگان ہندوستان نے ہندوستان کو ایک مکمل اور موثر جمہوری سلطنت بنانے، اس کے تمام شہریوں کو اقتصادی اور سیاسی انصاف حاصل کرنے، اظہار خیالات عقیدہ، مذہب اور عبادات کی آزادی عطا کرنے، سب کو یکساں موقع اور نسبت بخشنے، نیز ان میں شخصی وقار اور قومی اتحاد قایم کرنے اور اخوت بڑھانے کے واسطے ہندوستان کو آئینی طور پر ایک اعلا جمہوریت میں تشکیل دینے کے لیے مستحکم ارادہ کر کے اپنی اساسی دستور ساز اسمبلی میں اس آئین کو دل سے قبول اور منظور کرتے ہیں۔ اس طرح یہ آئینی دستور منظور ہو گیا۔ (حسرت موہانی — ایک سیاسی ڈائری)

حضرت شیخ الاسلام کا فکر انگیز اور ایمان پرور خطبہ:

۱۹۴۹ء: "۱۹۴۷ء کے ہنگاموں کو ابھی پورے دو سال بھی نہیں گزرے تھے، وطن عزیز کی فضا میں تلاطم موجود تھا، طرح طرح کی آوازیں تھیں اور طرح طرح کے تاثرات، اس وقت ناگ پور کانفرنس میں حضرت اقدس نے جو خطبۂ صدارت (زبانی) ارشاد فرمایا وہ نہایت فکر انگیز اور ایمان پرور اور افادیت کے لحاظ سے وہ گویا صحیفۂ لقمان تھا۔ جس کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے اور اس سے ہمیشہ سبق لینا چاہیے۔ حضرت شیخ الاسلام قدس اللہ سرہ العزیز نے خطبۂ مسنونہ کے بعد فرمایا:

"حضرات! جمعیت علمائے ہند کوئی نئی جماعت نہیں ہے جو پچھلے دو چار برس میں قایم ہوئی ہو، بلکہ یہ وہی جماعت ہے جس نے ہندوستان میں سب سے پہلے آزادئ ہند کی جدوجہد شروع کی تھی، اس کی بنیاد ۱۸۰۳ء میں رکھی گئی تھی۔

ہندوستان میں سب سے پہلے انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی کی شکل میں آئے تھے، جن کو بادشاہ دہلی نے بہ طور ملازم رکھا تھا کہ وہ بنگال، بہار، اڑیسہ وغیرہ کی مال گذاری وصول کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا کریں۔ ڈاکٹر ہنٹر نے خود اس کا اقرار کیا ہے۔ لیکن انگریز نے آہستہ آہستہ ایسی تدابیر اور حیلے اختیار کیے کہ ان کی قوت بڑھتی گئی اور بادشاہ دہلی

سے آہستہ آہستہ کچھ اختیارات حاصل کر کے انھوں نے اپنے پیمان اور وعدوں کو توڑنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ۱۸۰۳ء میں انھوں نے شہنشاہ دہلی کو بالکل مجبور اور بے بس کر کے یہ لکھوا لیا کہ آج سے تمام ملک کا انتظام کمپنی کے سپرد ہوگا۔

ہندوستان انگریزوں کی آمد سے پہلے نہایت خوش حال اور دولت مند ملک تھا۔ یہاں ضروریات زندگی اور سونے چاندی کی اس قدر افراط تھی کہ جس کی نظیر دنیا بھر میں نہ ملتی تھی۔ یہاں صرافوں کی دکانوں پر سونے چاندی کے ایسے ڈھیر لگے رہتے تھے جیسے کسی منڈی میں اناج کے ڈھیر ہوتے ہیں۔ ۱۷۷۲ء میں سونے کے ۲۰۰ سکے اور چاندی کے ۸۰۰ سکے رائج تھے۔ اکبر اور جہانگیر کے دور میں نو قسم کی اشرفیاں چلتی تھیں۔ جن میں سب سے بڑی اشرفی ایک سو دو تولے کی ہوتی تھی۔ اناج کی اتنی کثرت تھی کہ ایک رُپے کا چار من گیہوں ملتا تھا۔ اور ایسا ہی دوسری ضروریات زندگی کا حال تھا۔

انگریز کی لوٹ مار: انگریزوں نے ہندوستان آنے کے بعد نہایت بھیانک اور ظالمانہ طریقوں سے ہندوستان کو لوٹنا شروع کیا، آہستہ آہستہ حکومت پر قبضہ کیا، پھر بھاری بھاری ٹیکس لگائے، لگان اور مال گذاریاں مقرر کیں، تمام بڑے عہدوں پر انگریز افسروں کو مقرر کیا اور ہندوستانیوں کو صرف ادنا درجے کی ملازمتیں دیں اور جابرانہ طریقوں سے ہندوستان کی تمام دولت وثروت کو لوٹ کر انگلستان پہنچا دیا۔

ان بڑھتے ہوئے مظالم اور زیادتیوں کو دیکھتے ہوئے حضرات علما نے یہ محسوس کیا کہ اگر انگریزوں کو ہندوستان سے جلد نہ نکالا گیا تو ہندوستانیوں کی تباہی و بربادی کی کوئی انتہا نہ رہے گی۔ چناں چہ ۱۸۰۳ء میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فتویٰ دیا کہ ہندوستان کی آزادی ختم ہو چکی ہے، ہم سب کا فرض ہے کہ متحد ہو کر جلد بدیشی حکومت کو ہندوستان سے نکالیں۔ یہ فتویٰ آج بھی فتاویٰ عزیزیہ میں موجود ہے اور اسی پر جمعیت علماے ہند کی بنیاد رکھی گئی ہے، اسی وقت سے آزادیٔ ہند کی تحریک شروع ہوئی ہے۔

جمعیت علما کے کارنامے: جمعیت علما اس وقت سے برابر اپنی جدوجہد میں مصروف رہی۔ شروع میں اس کی تحریک خفیہ طور پر چلائی گئی۔ ۱۸۲۴ء میں صوبہ سرحد کے اطراف میں مورچہ لگایا گیا، جہاں چھ سال تک برابر انگریزوں سے جنگ ہوتی رہی۔ ۱۹۰۷ء میں حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز نے ریشمی خط کی تحریک شروع کی اور ۱۹۱۴ء تک اسے

اس حد تک پہنچا دیا۔ اگر اس وقت کچھ ملک کے خائن خیانت نہ کرتے تو اسی وقت ہندوستان آزاد ہو چکا ہوتا۔ اسی دوران میں ۱۸۸۵ء میں کانگریس قایم ہوئی جو کسی ایک فرقے کی جماعت نہ تھی بلکہ اس میں ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی وغیرہ سب شریک تھے۔

سمجھ دار مسلمانوں اور علماے کرام نے جو پہلے ہی سے آزادیٔ وطن کے لیے جدو جہد کر رہے تھے، کانگریس کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر انگریزوں کو نکالنے کے لیے بڑی سے بڑی قربانیاں دیں۔ ان میں سے بہت سوں کو پھانسیاں دی گئیں، کالے پانی کی سزائیں دی گئیں، سخت سے سخت قید میں رکھا گیا، لیکن وہ بڑی سے بڑی قربانی سے بھی نہ گھبرائے۔ اگر تاریخ کو اٹھا کر دیکھا جائے تو آزادیٔ وطن کی راہ میں کسی کی بھی قربانیاں اتنی نہیں ہیں جس قدر علماے کرام کی ہیں۔

انگریز کی آخری کوشش: بہ ہر حال ہندو مسلمانوں کے اتحاد کی اس تحریک کو کامیاب ہوتا دیکھ کر انگریزوں نے آخری کوشش یہ کی کہ مسلمانوں کو کانگریس سے الگ رکھا جائے۔ بد قسمتی سے ہمارے بہت سے بھائی انگریزوں کے اس فریب کا شکار ہوئے۔ جس کا نتیجہ تقسیمِ ہند کی بھیانک صورت میں رونما ہوا۔ جس میں لاکھوں ہندو مسلمان قتل ہوئے، لاکھوں تباہ و برباد ہوئے، ہزارہا عورتوں کی عصمت دری ہوئی اور کروڑوں رُپیہ کا مال لوٹا گیا اور برباد کیا گیا اور آج تک ان مصیبتوں سے چھٹکارا نہ ملا۔

آج کچھ بے وقوف کہتے ہیں کہ جمعیت علما فرقہ پرست جماعت ہے۔ حال آں کہ میں نے آپ کو بتایا کہ جمعیت علما کوئی نئی جماعت نہیں ہے وہ ہمیشہ سے آزادیٔ وطن کے لیے سب فرقوں کی مشترک جماعت کانگریس کے ساتھ قربانیاں دیتی رہی ہے۔ اس نے کبھی فرقہ واریت کو اپنے اندر نہ آنے دیا۔ اس کے فارمولے، تجاویز اور ریکارڈ موجود ہیں۔ دیکھو اس نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ تمام فرقے باہم میل جول کے ساتھ ملک کی خوش حالی کے لیے کوشش کریں اور اتحاد و اتفاق کے ساتھ رہیں۔ جیسے وہ انگریزوں کے آنے سے پہلے مل جل کر رہتے تھے۔ ان کے گھر، دکانیں، کھیت اور باغات کے معاملات، لین دین ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ ان میں باہم کوئی نفرت اور دشمنی نہیں تھی۔ بے شک بادشاہ اور رجواڑے لڑا کرتے تھے مگر وہ حکومتوں کی لڑائی ہوتی تھی۔ ان سب کی فوجوں میں سب فرقوں کے لوگ ہوتے تھے۔"

حضرت مولانا نے تقسیم کے بعد پیدا شدہ حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا:

"محترم بزرگو! ہندوستان ہمارا وطن ہے، ہم اور ہمارے آباؤ اجداد یہیں پیدا ہوئے تھے اور یہیں مرے، ہم سب کو یہیں رہنا ہے، ہماری ترقی اور خوش حالی آپس کے اتحاد اور اتفاق سے ہو سکتی ہے، لڑائی ہمیشہ تباہی لاتی ہے، ہم بگڑیں گے تو ہمارا ملک بگڑے گا، ہم نبھتے ہیں تو ہمارا ملک بھی نبھتا ہے، ہم سب ہندوستانی ہیں اور ایک قوم ہیں۔ اس لیے ہم سب کو بھائی بھائی کی طرح محبت کے ساتھ مل جل کر رہنا ہے، جیسے ہم پہلے رہا کرتے تھے۔

پریشانیاں جلد ختم ہو جائیں گی! مسلمانو! یہ ٹھیک ہے کہ آج تقسیم کے بعد ہماری حالت بہت نازک ہو گئی ہے اور ہمیں طرح طرح کی پریشانیاں درپیش ہیں۔ لیکن یہ سب پریشانیاں جلد ختم ہو جانے والی ہیں اور آخر ہم سب کو یہیں مل جل کر رہنا ہے۔ ہندوستان کی حکومت ہندو حکومت نہیں ہے، وہ غیر مذہبی حکومت ہے۔ وہ سب فرقوں کو ان کے برابر حقوق دیتی اور دینا چاہتی ہے اور یہی اس کا اعلان ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ نیچے درجے کے بعض افسر اور سرکاری ملازم اپنی الگ پالیسی چلاتے ہیں، لیکن یہ اسی مشین کے پرزے ہیں جو انگریز نے چلائی تھی اور جس کے ذریعے وہ حکومت کرتا تھا۔ لیکن انگریز ہندوستان سے جا چکا ہے، اس کا اثر بھی جو کچھ باقی ہے وہ جا کر رہے گا۔ اس لیے ہمیں گھبرانا اور بھاگنا نہیں چاہیے۔ بلکہ پورے صبر اور استقلال کے ساتھ اپنا وطن سمجھتے ہوئے یہیں رہنا چاہیے۔ کیا یہاں سے بھاگ کر کوئی تم کو مصیبتوں سے بچا لے گا؟ تم حیدرآباد بھاگ کر گئے تھے تو اس کا نتیجہ شرمندگی کے سوا کیا ہوا اور آخر تم یہیں لوٹ کر آئے۔ اس لیے تمھیں بتاتا ہوں کہ اگر تم صبر و استقلال کے ساتھ رہو گے، سچائی پر قایم رہو گے، سب کی بھلائی اور بہتری چاہو گے تو خدا تمہارے ساتھ ہوگا اور جس کے ساتھ خدا ہو پھر اس کو کس چیز کا ڈر ہو سکتا ہے ---؟

آزمائش: تم مسلمان ہو، تمہارے باپ دادا تو موت کے ایسے شیدائی تھے کہ اس کی آرزو کیا کرتے تھے اور تم آج موت اور پریشانیوں سے ڈرتے ہو؟

اسی لیے میں عرض کرتا ہوں کہ اگر تم صبر اور استقلال کے ساتھ یہاں رہو گے اور سچائی کی راہ پر قایم رہو گے، تو خدا کی مدد تمہارے ساتھ ہوگی۔ چوں کہ قرآن کریم نے تمھیں بار بار اس کی تاکید کی ہے۔ اس کے بعد اگر تم کہیں کسی ظالم کے ہاتھ سے مارے بھی جاؤ تو تمھیں اس موت سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ چوں کہ وہ شہادت کی موت ہوگی۔ اور تم

جانتے ہو کہ شہادت کی موت کا کتنا بلند رُتبہ ہے؟ جس کے لیے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بار بار آرزو کی اور فرمایا میرا دل چاہتا ہے کہ میں خدا کی راہ میں مارا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر مارا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں۔ تو پھر کیوں تم ایسی موت سے ڈرتے ہو، مصیبتیں آیا ہی کرتی ہیں۔ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ایمان والو! تمھیں دنیا میں ہر طرح سے آزمایا جائے گا۔ لیکن اگر تم نے صبر کیا اور استقلال کے ساتھ سچائی کی راہ پر قایم رہے تو پھر تمہارے ساتھ خدا کی مدد ہوگی اور تمہارے لیے کامیابی کی خوش خبری ہوگی۔

تقریر ختم کرتے ہوئے حضرت مولانا نے فرمایا:

جمعیت علما کا نصب العین: بھائیو! یہی وہ تبلیغ اور تعلیم ہے جو اب جمعیت علما کا نصب العین ہے۔ وہ مسلمانوں کی جہالت، بے علمی اور مذہب سے ناواقفیت کو ختم کرنا چاہتی ہے اور اسی کے لیے برابر کوشش کر رہی ہے۔ اگر چہ کچھ مالی مشکلات کی وجہ سے اور کچھ کارکنوں کی کمی کی وجہ سے وہ ایسی کوشش نہ کر سکی جیسی ہونی چاہیے تھی، لیکن آپ حضرات کی مدد سے امید ہے کہ وہ پوری کوشش کرتی رہے گی۔ پس آج یہی مذہبی خدمات اور تعلیم کی ترویج اس کا نصب العین ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ آپ بھی اس کے نصب العین کو اپنائیں۔

دینی اور دنیاوی تعلیم کو مسلمانوں میں پھیلائیں، جا بجا مدرسے اور نائٹ اسکول قایم کریں۔ دین کو پھیلائیں اور سب کو دین کا پابند بنانے کی کوشش کریں۔

اسی نصب العین کی طرف جمعیت علما آپ کو بلاتی ہے۔ سیاسی نصب العین تو حاصل ہو چکا ہے۔ ملک بدیشی راج سے آزاد ہو گیا ہے۔ اب بھی جو سیاسی امور ہیں وہ جمعیت علما کے پلیٹ فارم سے نہیں بلکہ مشترک جماعت کے پلیٹ فارم سے انجام دیے جائیں گے اور ان میں مسلمانوں کو برابر حصہ لینا چاہیے۔ انھیں چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ جمعیت علما کے بھی ممبر بنیں اور کانگریس کے بھی، تا کہ وہ سیاسی معاملات میں کانگریس کی راہ سے حصہ لے سکیں اور مذہبی خدمات میں جمعیت علما کی راہ سے۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

(ارشادات: ص ۳۰۵-۲۹۶)

۱۹۵۰ء

ہندو کا پیام ہندوؤں سے:

۱۶؍جنوری ۱۹۵۰ء: پنڈت سیتارام شکل ممبر صوبہ کانگریس کمیٹی یوپی و سابق ایم۔ ایل اے کا اخباری بیان لکھنؤ سے ۱۶؍جنوری کو:

''میں نے نہایت حیرت اور افسوس کے ساتھ پڑھا کہ اجودھیا اور پٹنہ کی بعض مسجدوں میں مورتیاں رکھ دی گئی ہیں، ہندو دھرم برائی کا بدلہ برائی سے لینا نہیں سکھاتا۔ جس وقت راون کے قبضے میں مہارانی جانکی تھیں تو اس وقت راون کی بہو سنو چنا رام چندر جی کی فوج میں آئی، لیکن کسی نے اس سے مذاق تک نہ کیا بلکہ سب اس سے عزت کے ساتھ پیش آئے اور اس کی خواہش کے مطابق ستی ہونے کے لیے اس کے شوہر کا سر اسے مل گیا رام راج کے معنی ہی یہ تھے کہ رام کی حکومت میں کسی کو کسی طرح کا بھی دکھ نہ تھا۔

میں نے مانا کہ پاکستان نے بہت زیادتیاں کی ہیں، لیکن اس کے انتظام کے لیے پنڈت جواہر لال اور سردار پٹیل کافی ہیں۔ پاکستان کا جواب سرکاری پر چھوڑ دینا چاہیے اور سیاست کے چکر میں پڑ کر ہندوؤں کو اپنا نقصان نہیں کرنا چاہیے۔ ایک طرف مسجدوں میں سنکھ بجانا اور دوسری طرف کشمیریوں سے ووٹ لینا یہ دونوں ایک ساتھ ممکن نہیں۔ مسجد میں تلوار کے زور سے مورتی رکھنے کے بجائے انصاف رواداری اور محبت کا نقش نہ صرف مسلمانوں بلکہ دنیا بھر کے انسانوں کے دلوں میں بٹھانا چاہیے۔''

(صدق۔لکھنؤ: ۲۷؍جنوری ۱۹۵۰ء)

ہندوستان کا دستور اور قومی ترانہ — منظور ہو گیا:

۲۶؍جنوری ۱۹۵۰ء: ۲۶؍جنوری ۱۹۵۰ء کو بابو راجندر پرشاد کی صدارت میں دستور ساز اسمبلی نے گزشتہ سال جو آئین مرتب کیا تھا اسے آج منظور کر دیا۔ اشوک چکر والا ترنگا

قومی پرچم اور ہندی قومی زبان قرار پائی۔ اس کے ساتھ قومی گیت ''جن من گن ادھی نا یک جیے ہیے'' منظور ہوا۔ (حسرت موہانی — ایک سیاسی ڈائری)

دستورِ ہند کا نفاذ:

۲۶ رجنوری ۱۹۵۰ء کو خود مختار ہندوستان اور غیر مذہبی آئینی دستور کا نفاذ ہونے پر ہندوستان کے پہلے صدر جناب بابو راجندر پرشاد چنے گئے۔ اور وزیرِ اعظم جناب پنڈت جواہر لال نہرو کا از سرِ نو انتخاب عمل میں آیا۔ سارے ملک میں خوشی کے شادیانے بجائے گئے۔ اس طرح ہندوستان نے اپنی مکمل آزادی اور جمہوری نظام کے قیام کا اعلان و اشتہار کر دیا۔

اس سال کی مردم شماری میں ہندوستان کی کل آبادی چھتیس کروڑ چھیالیس لاکھ بتلائی گئی۔ ملک کو اقتصادی ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لیے سرکار نے پنج سالہ منصوبے کا اعلان کیا، یہ منصوبہ دراصل ان اسکیموں کا مجموعہ تھا جو پہلے ہی سے چلائی جا رہی تھیں، کچھ اسکیمیں بعد میں مزید شامل کر لی گئیں۔ (حسرت موہانی — ایک سیاسی ڈائری)

ہندوستان کی سیکولر اسٹیٹ:

۲۶ رجنوری ۱۹۵۰ء: ہندوستان میں آزاد ملک کا پہلا دستور نافذ کر دیا گیا اور اس کے نفاذ کے بعد نئی کابینہ نے حلف اٹھالیا۔ دستور کمیشن کے قیام، اس کی جدوجہد اور دستور کی منظوری و نفاذ کی مختصر تاریخ یہ ہے:

کانگریس کی قراردادوں کے مطابق ۱۹۴۷ء کے شروع ہی میں دستور سازی کا کام شروع کر دیا گیا تھا۔ اولاً دستور ساز اسمبلی نے دستور سازی کے رہنما اصول طے کر کے ڈاکٹر بی آر امبیڈکر کی صدارت میں ایک ڈرافٹنگ کمیٹی بنا دی۔ ۴ رنومبر ۱۹۴۸ء کو اس نے پہلا مسودۂ قانون دستور ساز اسمبلی کے سامنے پیش کر دیا اور اس کی ہدایات کی روشنی میں ترمیم و اصلاح کے بعد دستور کو آخری شکل دے دی گئی۔

۲۶ رنومبر ۱۹۴۹ء تک اسمبلی کا کام جاری رہا، مجلس دستور ساز نے دو سال گیارہ ماہ اٹھارہ دن میں بھارت کا دستور بنایا۔ اس دستور بنانے پر حکومت کا ۶۴ لاکھ روپیہ خرچ آیا۔ یہ

دستور ۲۲ حصوں میں ہوا۔ اس دستور کی رو سے آزاد بھارت اعلا اختیار رکھنے والا غیر مذہبی جمہوریہ اور دولت مشترکہ کا ممبر بن گیا۔

(مولانا آزاد — ایک سیاسی ڈایری: مرتبہ: اثر ابن یحییٰ انصاری: ص ۴۴۴)

ڈاکٹر امبیڈکر دستور بنانے والی کمیٹی کے صدر تھے۔ دستور کے شروع میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ ہم باشندگان ہندوستان نے ہندوستان کو ایک مکمل اور مؤثر جمہوری سلطنت بنانے، اس کے تمام شہریوں کو اقتصادی اور سیاسی انصاف حاصل کرنے، اظہار خیالات عقیدہ، مذہب اور عبادات کی آزادی عطا کرنے، سب کو یکساں موقع اور نسبت بخشنے، نیز ان میں شخصی وقار اور قومی اتحاد قایم کرنے اور اخوت بڑھانے کے واسطے ہندوستان کو آئینی طور پر ایک اعلا جمہوریت میں تشکیل دینے کے لیے مستحکم ارادہ کر کے اپنی اساسی دستور ساز اسمبلی میں اس آئین کو دل سے قبول اور منظور کرتے ہیں۔ اس طرح یہ آئینی دستور منظور ہو گئے۔ (حسرت موہانی — ایک سیاسی ڈایری: مرتبہ: اثر ابن یحییٰ انصاری: ص ۲۷۹)

دستور کی منظوری کے کامل دو ماہ کے بعد ۲۶ رجنوری ۱۹۵۰ء کو ملک میں یہ دستور نافذ کر دیا گیا۔

۲۶ رجنوری ۱۹۵۰ء کو خود مختار ہندوستان اور غیر مذہبی آئینی دستور کا نفاذ ہونے پر ہندوستان کے پہلے صدر بابو راجندر پرشاد چنے گئے اور وزیر اعظم جناب پنڈت جواہر لال نہرو کا از سر نو انتخاب عمل میں آیا اور ان کی نئی کابینہ نے حلف اٹھایا۔ سارے ملک میں خوشی کے شادیانے بجائے گئے۔ اس طرح ہندوستان نے اپنی آزادی اور غیر مذہبی جمہوری نظام کے قیام کا اعلان کر دیا۔ (مولانا آزاد — ایک سیاسی ڈایری: ص ۴۴۶)

ڈاکٹر رشید الدین خان (دہلی) لکھتے ہیں:

''موجودہ ہندوستانی ریاست ایک عظیم الشان تاریخی جدوجہد کے بعد وجود میں آئی ہے۔ یہ شہریوں کا ایک اشتراک (Association) ہے، جس میں ہر شہری برابر اور آزاد ہے۔ اور ذات، عقیدہ، رنگ، نسل، زبان، علاقہ، سکونت (Domicile)، مرتبے کے امتیاز کے بغیر مساوی حیثیت میں اس کا رکن ہے۔ ہندوستانی ریاست نہ تو مذہبوں کا وفاق ہے اور نہ مذہبی فرقوں کا مجموعہ ہے۔ ہندوستان کے تمام شہری قانونی اور آئینی اعتبار سے ایک عام متحدہ

قومی معاشرتی ریاست کے عناصر ترکیبی ہیں۔

موجودہ ریاست کی بنیاد ایک دستور ہے جو بنیادی، غیر مذہبی (Secular) اور انسانی ہاتھوں کا بنایا ہوا ہے۔ اس لیے ایک اسٹیٹ کو اسٹیٹ کے طور پر اور ایک سیکولر اسٹیٹ کے طور پر کام کرنا چاہیے۔ نہ اس سے کچھ کم، نہ اس سے کچھ زیادہ۔"

(Federal India: by Dr. R.D. Khan, Page:70)

(بہ حوالہ برصغیر پاک و ہند کی شرعی حیثیت: ص ۱۸-۱۷)

مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے اس جمہوری دستور کی تیاری میں مشکلات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اِس پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:

"بہ ہر حال کانگریس اور مسلم لیگ میں فرقہ وارانہ مسایل پر سمجھوتا نہ ہوسکا اور انجام کار دو قومی نظریہ پیدا ہوا اور اس کی بنیاد ہی پر ملک کی تقسیم عمل میں آئی اور اسی کی بنیاد پر پاکستان کو اسلامی حکومت قرار دیا گیا۔ تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے بعد ہندو مسلمانوں میں جو نہایت شدید قسم کی منافرت، دشمنی اور عداوت پائی جاتی تھی وہ اور پاکستان میں اسلامی حکومت کا قیام، یہ دونوں چیزیں ایسی تھیں جن کے پیش نظر اغلب یہی تھا کہ ہندوستان میں ہندو حکومت قایم ہوتی! لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ یہاں پارلیمنٹری نظام جمہوریت اختیار کیا گیا۔

اس نظام کے ماتحت ہر شخص جو ہندوستانی ہے، مذہب، ذات پات، رنگ و نسل کے اختلاف کے باوجود یک ساں شہری حقوق رکھتا ہے، پیشوں میں، ملازمتوں میں، عہدوں میں، غرض کسی ایسی چیز میں جس کا تعلق اسٹیٹ سے ہے مذکورہ بالا چیزوں میں سے کسی کی بنیاد پر کوئی کسی قسم کا امتیازی برتاؤ نہیں کیا جائے گا۔ ہر شخص جو بالغ ہے اس کو رائے دینے کا حق ہوگا۔ شہری حقوق اس ملک کے ہر باشندے کو یک ساں طور پر حاصل ہوں گے۔ حق رائے دہندگی (Adult Franchise) کے ذریعے پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کا انتخاب ہوگا اور یہی پارلیمنٹ اور اسمبلیاں گورنمنٹ بنائیں گی۔ اس طرح جو گورنمنٹ بنے گی اس کی تشکیل میں تمام اہالیان ملک کا دخل ہوگا۔ گویا اصل

طاقت بلا اختلاف مذہب وملت عوام کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جس کو چاہیں حکومت کے منصب پر بٹھا سکتے ہیں اور جب چاہیں اسے الگ بھی کر سکتے ہیں۔

اب لیجیے مذہبی آزادی! اس سلسلے میں دستور اعلان کرتا ہے کہ

۱۔ ہندوستان کے سب لوگوں کو مساویانہ طور پر عقیدہ (Conscience) کی آزادی کا حق ہوگا اور ان کو اس بات کا بھی حق ہوگا کہ وہ آزادی کے ساتھ جس مذہب کو چاہیں مانیں، اس پر عمل کریں اور اس کی تبلیغ کریں۔

۲۔ ہر مذہبی فرقے یا طبقے کو اس کا حق ہوگا کہ وہ مذہبی اور خیراتی کاموں کی خاطر:

الف: ادارے قایم کریں اور چلائیں۔

ب: مذہبی معاملات میں اس کا وہ خود انتظام کریں۔

ج: اس ادارے کے لیے منقولہ یا غیر منقولہ جائیداد حاصل کریں۔

ز: اور اس جائیداد کا انتظام قانون کے مطابق وہ خود کریں۔

(The Constitution of India, Part: iii, Article 25,26)

جب یہ دفعات دستور ساز اسمبلی میں پیش ہوئیں تو اقلیتی فرقوں کے نمایندوں کی طرف سے ان کا بڑے جوش وخروش کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا۔ چناں چہ ایک صاحب نے فرمایا:

''جناب! یہ ہے اکثریت کا وہ عادلانہ اور مساویانہ برتاؤ جو اقلیتوں کو ان کے ساتھ دو قالب و یک جاں بنا دے گا۔''

ایک اور صاحب نے کہا:

''میں اکثریتی فرقے کا تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اقلیتی فرقوں کے ساتھ بڑے عدل اور انصاف سے کام لیا ہے۔''

(Constitutional Assembly Debates. Vol, vii. Pages 260-67)

دستور نے صرف یہی اعلان نہیں کیا ہے کہ ہر شخص کو مذہبی عقاید و اعمال

اور اس کی تبلیغ و اشاعت کی آزادی ہوگی، بلکہ ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ حکومت مذہب کے معاملے میں بالکل غیر جانب دار ہوگی اور اس بنا پر حکومت کے فنڈ سے جو تعلیمی ادارے چلیں گے، ان میں کسی مذہب کی تعلیم کا بندوبست نہیں ہوگا۔"

(The Constitution of India, Part: iii, Article 28)

(برصغیر پاک وہند کی شرعی حیثیت: ص ۲۳-۲۲)۔

حضرت شیخ الاسلام اور ہندوستان کا سیکولر دستور:

دستور ہند کی اس غیر فرقہ واری جمہوری اور سیکولر حیثیت کا اعتراف شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نے بھی فرمایا۔ لیکن حضرت نے مسلمانوں کو متنبہ بھی فرمادیا کہ مسلمانوں کو اپنے بہت سے مذہبی، تہذیبی اور معاشرتی کام خود ہی انجام دینا ہوں گے۔ اس کے لیے ہمیں سیکولر اسٹیٹ سے کسی قسم کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ جمعیت علماے ہند کے سالانہ اجلاس حیدرآباد دکن (اپریل ۱۹۵۱ء) میں اپنے خطبہ صدارت میں فرمایا:

"ان تباہیوں اور بے پناہ مشکلات کے باوجود جو تقسیم ہند کے بعد برداشت کرنی پڑی ہیں، یہ بات قابل اطمینان ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس کا اقتدار اعلا اپنے نظریات کے محور سے نہیں ہٹا۔ گاندھی جی کی قربانی ایک کھلی حقیقت ہے، پنڈت نہرو، مولانا آزاد، راج گوپال اچاریہ جیسے گاندھی جی کے ساتھیوں کی جدوجہد کا نتیجہ ہے کہ انڈین یونین کا دستور اساسی (Constitution) جمہوریت اور غیر فرقہ واریت کے اصول کو پر وضع کیا گیا۔

یہ بات قابل مسرت ہے کہ یہ "دستور" ہندوستان کے ہر ایک باشندے کو مساوی حیثیت دیتا ہے، بلا اختلاف مذہب وملت ہر ایک کے لیے ترقی کے دروازے کھلے رکھتا ہے اور ہر ایک ملت کو موقع دیتا ہے کہ وہ بقا و تحفظ اور ترقی کے راستے سوچے اور آزادی کے ساتھ ان پر عمل کرے۔ اس لیے اس دستور کے بہ موجب ذمے داری خود ہمارے اوپر آتی ہے، ہمارا فرض ہے کہ پوری مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ ہم اس کو انجام دیں۔

جمہوری دستور ساری ذمے داری جمہور پر ڈالتا ہے، جمہوریہ کی حفاظت اور ترقی جمہور کا فرض ہے۔ جمہور کی اصلاح جمہوریت کی درستی ہے۔ جمہور کی شائستگی، سرگرمی اور ایثار سے جمہوریہ ترقی کرتا ہے۔ آج مسلمانوں پر جمہوریہ ہند کا اہم عنصر ہونے کے لحاظ سے کیا ذمے داری عاید ہوتی ہے؟ اس کو وہ کس طرح انجام دے سکتے ہیں؟ کہاں تک اس ذمے داری کو انجام دے چکے ہیں اور آیندہ انھیں کیا جدو جہد کرنی ہے؟ مسلمانوں کا فرض ہے کہ ان تمام باتوں پر غور کریں اور جسدِ ملک کا ایک بازو ہونے کی حیثیت سے ہمارے ملی اور اجتماعی فرایض کیا ہیں؟ ہم کس طرح اپنے مذہب، مذہبی علوم، اسلامی تہذیب، اپنے مآثر و معابد اور اپنے اوقاف کی حفاظت کرسکتے ہیں اور ان کو ترقی کے راستے پر کس طرح لگا سکتے ہیں؟ کیا کیا مشکلات سنگِ راہ ہیں اور ان کو رفع کرنے کی کیا صورتیں ہیں؟ غرض کہ اسلامی تہذیب و ثقافت کی حفاظت و ترقی کے ساتھ ساتھ ملک کی ''تعمیر جدید'' میں اپنی حیثیت اور تاریخی عظمت کے مطابق ان کا حل تلاش کرنا جمعیت علماے ہند کا فرض ہے۔''

(خطباتِ صدارت: ادارہ نشر واشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم، گوجراں والہ ۱۹۹۰ء: ص ۲۶-۴۲۵)

حضرت شیخ الاسلام کی بالغ نظری:

اکتوبر ۱۹۵۶ء میں جمعیت علماے ہند کے سالانہ اجلاس منعقدہ سورت کے خطبۂ صدارت میں بھی ہندوستان کے سیکولر دستور اور مسلمانوں کے فرایض کے سلسلے میں حضرت شیخ الاسلام نے فرمایا:

''ہماری ماضی بعید تاریخ کا سب سے روشن باب ہے۔ ماضی قریب دورِ غلامی اور اب نو سال سے آزادی مملکت میں نوزائیدہ جمہوریہ کا تجربہ کررہے ہیں۔ ہم اس آزاد مملکت میں باعزت شہری بن کر رہیں یا پس ماندہ اور از پا افتادہ، خود فراموش و معاذ اللہ خدا فراموش بن کر زندگی گزاریں۔ یہ ہمارے فکرِ صحیح، فراست، بے دار مغزی اور ہمارے عمل اور کردار پر موقوف ہے۔ کوئی بھی صحیح الحواس پس ماندگی کو پسند نہیں کرسکتا۔ ہر ایک سلیم الفطرت پس ماندگی کی

ذلت وخواری کو موت سے بدتر سمجھتا ہے۔

مگر عزیزان محترم! جب تک سعی پیہم اور جدوجہد کی روشنی نمایاں نہ ہو پس ماندگی کی تاریکی کو چھانٹا نہیں جا سکتا۔

پس ماندگی ظلمت وتاریکی ہے اور جدوجہد نور اور روشنی۔ جب بھی کوشش اور سعی پیہم کی روشنی دھیمی پڑتی ہے پس ماندگی کی تاریکی ابھر آتی ہے۔ آپ اگر پس ماندگی کی تاریکی ختم کرنا چاہتے ہیں تو صراطِ مستقیم پر جدوجہد کی روشنی تیز کر دیجیے۔ دنیا کا کام ہو یا دین کا، جماعتی ہو یا انفرادی، ہر ایک کے لیے قانون قدرت یہی ہے۔

لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰی انسان کو وہی ملتا ہے جو اپنی کوشش سے حاصل کرے۔ اللہ رب العالمین کا فضل واحسان اور اس کی بخشش ہے کہ اس نے انسان کو احسن تقویم کا پیکر زیبا عطا فرما کر خلعتِ خلافت سے نوازا۔ بر و بحر پر اس کے اقتدار اور اس کی عظمت کا جھنڈا لہرا کر وَلَقَدْ کَرَّمْنَا کی سند عطا فرمائی۔ اب یہ انسان کا کام ہے کہ عمل صالح اور عمدہ کردار سے اس جھنڈے کو سر بلند رکھتا ہے یا اپنی بے عملی سے اس کو سرنگوں کر ڈالتا ہے۔

عزیزان محترم! ہندوستان جیسے مختلف مذاہب اور مختلف تہذیبوں کے گہوارے میں جمہوری نظام حکومت کے لیے دو ہی اصول ہو سکتے تھے۔ سب مذہبی یا لامذہبی؟

ہندوستان کے لیے دوسرا اصول یعنی لامذہبی جمہوریہ ہی طے کیا گیا ہے جس کی ایسا جمہوریہ کہ نہ اس کی دستور ساز وقانون ساز مجالس میں مذہب کے نام پر نمائندگی ہو اور نہ نظام حکومت کسی مذہب یا فرقے کا جانب دار ہو۔ تمام فرقے اس کی نظر میں صحیح معنی میں یکساں ہوں۔ کیوں کہ یہی ایک صورت ہے جس سے اقلیت اور اکثریت کے نفرت انگیز احساس کو ختم کیا جا سکتا ہے اور یہی ایک صورت ہے جو اقلیتوں کے دماغ سے احساس کم تری دور کر کے ان کو اپنی قابلیتوں کے جوہر دکھانے پر آمادہ اور ان کے افراد کو روشن مستقبل کی توقع دلا کر ترقی کے راستے پر تیز گام کر سکتی ہے۔

لیکن اس صورت میں کسی بھی ملت اور فرقے کو اپنی تہذیب و ثقافت کی حفاظت اور ترقی کے لیے سیکولر جمہوریہ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا اور اپنی جدوجہد کو اس کی امداد پر موقوف رکھنا، سیکولر جمہوریہ کے بنیادی تصورات سے انحراف ہے اور ایسا غلط اعتماد اور ایسی بے محل توقع ہے کہ اس کے لیے "خواب پریشاں" یا "نقش برآب" کا لفظ ہی موزوں ہو سکتا ہے۔

بہ ہر حال سیکولر جمہوریہ کو سیاسی لحاظ سے آپ کتنا ہی قابل اطمینان اور باعثِ مسرت محسوس کریں، مگر یہ اطمینان کبھی بھی نہ ہونا چاہیے کہ وہ آپ کے علوم، آپ کے مذہب اور آپ کی روایات کی حفاظت کر سکتا ہے۔ اپنے علوم، اپنی تہذیب اور اپنے کلچر کی حفاظت خود ہمارا اپنا فرض ہے اور اس فرض کو صرف ہمیں ہی انجام دینا ہے۔ سیکولر جمہوریہ کا امانت دار فریضہ صرف یہ ہے کہ وہ ہماری کوشش میں رکاوٹ نہ ڈالے اور ہو سکے تو مناسب حالات میں ترقی کے مواقع پیدا کرتا رہے۔ سعی پیہم بہ ہر حال اہل ملت کا فرض ہے۔ اگر مثال پیش کرنے کی اجازت ہو تو میں سیکولر جمہوریہ کو ایک زرخیز زمین سے تشبیہ دوں گا۔ اس کی خوبی صرف یہ ہے کہ تخم عمل کو ضایع نہیں ہونے دیتی۔ تخم پاشی اور آب یاری بہ ہر حال کاشت کار کا فرض ہے۔ ملوکیت میں وہ عمل بارآور ہوتا ہے جو خوش نودی شاہ کے لیے ہو۔ جمہوریت میں وفاداری کی یہ جنس ختم ہو جاتی ہے۔ یہاں وہی عمل بارآور ہوتا ہے جو جمہور اور جمہور کے وطن عزیز کے لیے ہو۔"

(خطبات صدارت: ص ۶۶-۴۶۴، نیز دیکھیے: برصغیر پاک و ہند کی شرعی حیثیت: ص ۲۷-۲۴)

تبصرہ بر دستور ہند:

مذہبی نقطۂ نظر سے کسی دستور کے بارے میں دو ہی باتیں کہی جا سکتی ہیں، یہ کہ دستور اسلامی ہے یا نہیں؟ لیکن کسی دستور کے اسلامی نہ ہونے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ خلاف اسلام بھی ہے! اگر کسی ملک کے عوام اپنے سیاسی، معاشی، ملکی، شہری، ترقیاتی، دفاعی مقاصد کے حصول اور تحفظ کے لیے کوئی دستور بنا لیتے ہیں، تو یہ بات خلاف اسلام نہیں۔ خالص دنیاوی مفادات کے حصول کے لیے بھی کسی ایسے معاہدے میں شرکت اسلامی تعلیمات اور

قانون شریعت سے متصادم نہیں۔ پھر ایک ایسے ملک میں جہاں مسلمان اکثریت میں نہ ہوں، عددی اعتبار سے وہ اقلیت ہی شمار ہوں۔ اگر وہ اس ملک کی اکثریت اور غیر اقلیتوں کے ساتھ مل کر ایک ایسا دستور بنالیتے ہیں جس کے تحت اکثریت اور اقلیت کے عددیت سے قطع نظر، یک ساں حیثیت میں تمام مذاہب کے احترام اور کسی مذہب میں خواہ اکثریت میں ہو، خواہ اقلیت میں عدم مداخلت کا اصول طے کر لیتے ہیں، جس میں مذہبی عقاید، عبادات، مساجد، مدارس، اوقاف، تعلیم وتربیت کے نظام، تحریر، تقریر اور حصول معاش کے لیے پیشے کی آزادی اور آگے بڑھنے کے یک ساں مواقع کی ضمانت موجود ہو۔ جس میں مذہبی، غیر مذہبی، سیاسی، اقتصادی، تعلیمی، اصلاحی، تبلیغی جماعت بنانے، ملک میں آزادانہ گھومنے پھرنے، عوام کو اپنا ہم خیال بنانے کی سعی کرنے اور ملک کے کسی حصے میں بھی آباد ہو جانے، جائیداد بنانے، کاروبار کرنے کا حق تسلیم کیا گیا ہو، جس میں ذات پات کی اونچ نیچ اور نسل وخون کی کسی برتری کی نفی کی گئی ہو، وہ دستور غیر اسلامی کیوں کر ہو سکتا ہے؟ سب سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ جس دستور کے تحت مذہبی تبلیغ کی آزادی نے مسلمانوں کے لیے اسلامی خدمات کا ایک وسیع میدانِ عمل مہیا کر کے اسلامی انقلاب کے وسیع امکانات پیدا کر دیے ہوں، جس دستور کی بنیاد مندرجۂ ذیل انسانی اصولوں اور عالمی سچائیوں پر ہو، ہم اس کے خلافِ اسلام ہونے کا فیصلہ کیوں کر دے سکتے ہیں:

> ''کانگریس نے ہندوستان کے ہر شہری مرد اور عورت کے لیے مساوی حقوق اور مواقع کی حمایت کی ہے۔ اس نے تمام گروہوں اور مذہبی گروہوں کے درمیان رواداری اور خیر سگالی کے جذبات پیدا کر کے اتحاد قایم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے بہ حیثیتِ مجموعی تمام عوام کے لیے مکمل مواقع کی حمایت کی ہے، تا کہ وہ اپنی خواہشات اور صلاحیتوں کے مطابق ترقی کر سکیں۔ اس نے اس بات کی بھی حمایت کی ہے کہ ایک قوم کے دایرے میں رہتے ہوئے ہر گروپ اور علاقے کو آزادی ملے تا کہ وہ اپنی زندگی اور اپنے کلچر کو ترقی دے سکے۔ اسی لیے یہ کہا گیا کہ اس مقصد کے لیے علاقوں یا صوبوں کی جہاں تک ممکن ہو لسانی اور کلچرل بنیادوں پر تشکیل نو ہو۔ اس نے ان لوگوں کی حمایت کی، جن پر سماجی ظلم ہوا، جن کے ساتھ ناانصافی ہوئی تا کہ مساوات میں حایل

تمام رکاوٹوں کا خاتمہ ہو۔

کانگریس نے ایک جمہوری ریاست قایم کی، جس میں تمام شہریوں کے لیے مساوی بنیادی حقوق اور آزادیوں کی دستور کے ذریعے ضمانت دی گئی ہے۔ یہ دستور وفاقی نوعیت کا ہے جس کے قایم کرنے والی وحدتوں کو خود اختیاری دی گئی ہے اور اس کے قانون ساز اداروں کا قیام بالغ رائے دہی کے اصول پر ہوتا ہے، وفاق ہند اس کے اجزا کی خواہش کے مطابق ہے۔ وفاقی اکائیوں کو زیادہ سے زیادہ آزادی دینے کی خاطر ضروری ہے کہ وفاقی سبجیکٹ کی فہرست کم سے کم ہو۔ مزید یہ کہ اکائیوں کی خواہش کے مطابق مشترک فہرست بھی بنائی جائے۔

دستور ملک کے عوام کو جو بنیادی حقوق دے گا، وہ یہ ہیں:

۱۔ ہر شہری کو رائے کے اظہار، جماعت بنانے، پُرامن طریقے سے بغیر اسلحہ کسی بھی مقصد کے لیے اجتماع کرنے کی، جو قانون کے خلاف نہ ہو، آزادی ہوگی۔

۲۔ ہر شہری کو ضمیر کی آزادی ہوگی اور اختیار ہوگا کہ وہ کسی بھی مذہب پر قایم رہے، لیکن اس سے امن عامہ اور اخلاقی اقدار متاثر نہ ہوں۔

۳۔ اقلیتوں کے کلچر، زبان اور رسم الخط کا تحفظ کیا جائے گا۔

۴۔ تمام شہری قانون کی نظر میں برابر ہوں گے اور مذہب، فرقے، یا جنس کی بنیاد پر کوئی امتیاز نہیں کیا جائے گا۔

۵۔ سرکاری ملازمتوں میں مذہب، فرقے یا جنس کی بنیاد پر کسی قسم کا امتیاز نہیں برتا جائے گا۔

۶۔ عام مقامات پر واقع تمام کنووں، تالابوں، سڑکوں، اسکولوں کو جن کی دیکھ بھال ریاستی یا لوکل فنڈ سے ہوتی ہو یا جنھیں کسی نے عام استعمال کے لیے وقف کرایا ہو، ہر شہری کو استعمال کرنے کا مساوی اختیار ہوگا۔

۷۔ ہر شہری کو اسلحہ رکھنے اور ساتھ لے جانے کا اختیار ہوگا، جو اس سلسلے میں بنائے گئے قوانین اور تحفظات کا پابند ہوگا۔

۸۔ کسی شخص کو اس کی آزادی سے محروم نہیں کیا جائے گا، نہ اس کی ملک اور جائیداد کو ہتھیایا جائے گا یا اسے ضبط کیا جائے گا، سوائے اس کے کہ ایسا قانون کے تحت ہو۔

۹۔ تمام مذہب کے معاملے میں ریاست غیر جانب دار رہے گی۔

۱۰۔ رائے دہی کا حق دنیا کے عام معیار بلوغیت کے مطابق ہوگا۔

۱۱۔ ریاست مفت اور لازمی تعلیم فراہم کرے گی۔

۱۲۔ ہر شہری اس کے لیے آزاد ہوگا کہ وہ ہندوستان بھر میں جہاں چاہے آئے جائے یا سکونت اختیار کرے، کوئی بھی پیشہ اختیار کرے۔ وہ قانونی چارہ جوئی یا تحفظ کے معاملے میں ہند کے تمام علاقوں میں مساوی حیثیت رکھے گا۔

ریاست پست اقوام اور مظلوم افراد کی حفاظت اور ان کی ترقی کے لیے ضروری تحفظات فراہم کرے گی، تا کہ وہ تیزی سے ترقی کر سکیں اور قومی زندگی میں اپنا بھرپور کردار ادا کر سکیں۔ خصوصیت سے ریاست قبایلی علاقوں کے عوام کی نسلی تقاضوں کی مناسبت سے اور اچھوتوں کے طبقے کی تعلیم، سوشل اور معاشی ترقی کی کوشش کرے گی۔

(Selected Works of Maulana Abul Kalam Azad, Edited by Dr. Ravindra Kumar, vol. 2, New Dehli (India), 1991. Pages: 121-23)

یہ کانگریس پارٹی کا وہ منشور ہے جو اس نے ۱۹۴۵ء میں انتخابات کے موقع پر شایع کیا تھا۔ حال آں کہ یہ وہ انتخابات تھے جنھیں مسلم لیگ نے ہندوستان میں کفر و اسلام کا معرکہ قرار دیا گیا تھا۔ کانگریس نے اس وقت بھی اپنے فکری نظریاتی نظام میں توازن برقرار رکھا تھا تو یہ بہت بڑی بات تھی۔ کانگریس کے انتخابی منشور کے یہ اصول و مقاصد آزاد ہندوستان کے دستور میں اختیار کر لیے گئے ہیں۔

ہندوستان کا دستور انسانوں کا بنایا ہوا دستور ہے، اس کی بنیاد کسی آسمانی کتاب پر نہیں ہے۔ اس لیے یہ خامیوں اور نقایص سے بالکل پاک نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر اس میں ترمیم و اصلاح کا دروازہ کھلا ہے تو اس کے خوب سے خوب تر بن جانے سے ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی توجہ اور ان کے مساعی نے اسلام کا نام لیے بغیر ہندوستانی

دستور میں بہت سے ایسے اصول و مقاصد کو شامل کروادیا ہے، جن کی روح اور فکری پس منظر اسلام کے نظام عدل اور انسانیت کے بنیادی حقوق و مفادات پر مبنی ہے۔ اگر ہندوستان کے مسلمان بصیرت اور حکمت سے کام لیں تو دستورِ ہند کی خامیاں اور نقائص دور کروا کے معاشرتی صلاح و فلاح کی بے شمار باتیں جن کا تعلق اسلامی تعلیمات سے ہے، اس میں شامل کرواسکتے ہیں۔

(برصغیر پاک و ہند کی شرعی حیثیت: مرتبہ: ابوسلمان شاہ جہان پوری: ص ۳۳-۳۰)

ہندوستان کا دستور اور چھوت چھات:

ہندوستان میں آزادی سے قبل جات پات کے نظام میں سب سے ادنا طبقہ اچھوت کہلاتا تھا۔ ملک کی آبادی میں اس وقت تقریباً ساڑھے پانچ کروڑ سابق اچھوت ہیں، جو اب مندرجہ فہرست جاتیاں (شیڈولڈ کاسٹس) کہلاتے ہیں اور گاندھیائی اصطلاح کے مطابق وہ ''ہریجن'' یعنی خدا کے فرزند ہیں۔

ہندوستان کا ۱۹۵۰ء کا دستور جمہوری اور نامذہبی ہے، جس نے چھوت چھات کو کالعدم قرار دیا ہے۔ پارلیمنٹ نے ۱۹۵۵ء میں چھوت چھات کی ممانعت کا قانون منظور کیا جس کے مطابق ہریجنوں سے امتیازی سلوک کرنے کو قانوناً جرم قرار دیا، جس کی سزا چھ ماہ قید اور پانچ سو روپے جرمانہ مقرر تھی۔ ۱۹۷۶ء میں اس قانون میں ترمیم کر کے اس کی خامیوں کو دور کیا گیا اور چھوت چھات کا برتاؤ کرنے والوں کی سزا کو اور سخت کیا گیا، اور اس طرح کے مقدمات میں مدعی اور مدعا علیہ کے درمیان مصالحت کی گنجائش ختم کر دی۔

(فرہنگ سیاسیات: ص ۱۹۴)

تمدنی تعلیمات کی انڈین کونسل میں حضرت شیخ الاسلام کی نامزدگی:

۲۵ / مارچ ۱۹۵۰ء: گورنمنٹ آف انڈیا نے وزیرِ تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کو تمدنی تعلیمات کی ہندوستان کونسل کا صدر نامزد کیا ہے۔ مولانا نے ۲۵ / حضرت کو اپنی کونسل کا ممبر نامزد کیا ہے۔ اس میں ملک کے نام ور دانش ور اور ماہرین تعلیم شامل ہیں۔ ان میں ایک رکن شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند بھی ہیں۔

(مولانا آزاد — ایک سیاسی ڈائری: ص ۴۴۹)

نہرو لیاقت پیکٹ:

۲؍اپریل ۱۹۵۰ء: نئی دہلی میں پاکستان اور ہندوستان کے وزرائے اعظم کے مابین ایک معاہدہ طے پایا۔ مولانا آزاد کے بہ قول:

"دونوں ممالک کی اقلیتوں سے متعلق مسایل کو حل کرنے کا دلیرانہ اقدام کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں پہلے بھی معاہدے کیے گئے تھے لیکن اس زمانے میں بدقسمتی سے پاکستانی رہنماؤں کو ایسے اہم مسئلے کے فوری حل کی اہمیت کا احساس نہ تھا۔ موجودہ معاہدے کی اہمیت یوں ہے کہ پاکستانی رہنماؤں نے احساس کرلیا ہے اور معترف ہو چکے ہیں کہ اگر باہمی تعاون سے اقلیت کا مسئلہ حل نہ کیا گیا تو نتیجہ خود ان کے اپنے ملک کی خودکشی کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ معاہدے کا اہم پہلو یہ بھی ہے کہ ایک بورڈ میں حکومت، اقلیت اور اکثریت تینوں کے نمایندے ہوں گے اور بورڈ نگرانی کرے گا کہ آیا دونوں ممالک میں معاہدے کا نفاذ ہو رہا ہے کہ نہیں۔ اس کمیٹی کا قیام فریقین کا جذبۂ خیر خواہی ظاہر کرتا ہے اور دونوں ممالک کی اقلیتوں کو پُر امید کرنے کا باعث ہوا ہے۔ (خلافت۔ بمبئی: ۲۳؍اپریل ۱۹۵۰ء)

ہندوستان کے مسلمانوں کو مولانا آزاد کی نصیحت:

۲۱؍اپریل ۱۹۵۰ء: دہلی میں جمعیت علماے ہند کے عظیم الشان جلسے میں تقریر کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد نے مسلمانانِ ہند سے اپیل کی ہے کہ

> "مسلمان ہندوستان کے وفادار شہری بن کر رہیں اور اپنے دلوں میں خوف و ہراس کو جگہ نہ دیں اور پاکستان جانے کا ارادہ رکھنے والے مسلمان ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے مفاد کو صدمہ نہ پہنچائیں۔ ملک میں جذبہ خیر خواہی و تعاون کا ماحول پیدا کرنے میں حکومت کا ہاتھ بٹائیں۔"

(آثار و نقوش: مولانا ابوالکلام آزاد)

لیاقت نہرو پیکٹ اور اس پر ردِ عمل:

یہ معاہدہ ۲؍اپریل ۱۹۵۰ء کو نئی دہلی میں پاکستان اور ہندوستان کے وزرائے اعظم کے مابین طے پایا تھا جو "لیاقت نہرو پیکٹ" کے نام سے مشہور ہوا۔ اس معاہدے کے قیام میں مولانا آزاد نے خاص حصہ لیا تھا۔ وہ اس بات میں نہایت سنجیدہ تھے کہ یہ معاہدہ

کامیاب ہو۔اس سلسلے میں چند بیانات کا مطالعہ نہایت مفید ہوگا:

(۱) ۱۰/اپریل ۱۹۵۰ء کو مسٹر لیاقت علی خان نے ریڈیو پاکستان سے اس معاہدے کی یوں وضاحت کی کہ مجلس قانون ساز ۲۳/ مارچ کی منظور کردہ قرار دادِ مقاصد کے اصولوں کے مطابق ہے۔

(۲) ۱۳/اپریل کو نئی دہلی میں صدر جمہوریہ ہند بابو راجندر پرشاد نے سکھوں کے ایک جلسۂ استقبالیہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ نہرو لیاقت معاہدے کو مکمل طور پر کامیاب بنانے کے لیے سب کو کوشاں رہنا چاہیے۔

(۳) ۲۱/اپریل ۱۹۵۰ء کو دہلی میں جمعیت علمائے ہند کے عظیم الشان جلسۂ عام میں ہزاروں مسلمانوں نے شرکت کی۔امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد نے اپیل کی کہ

> ''مسلمان ہندوستان کے وفادار شہری بن کر رہیں اور اپنے دلوں میں خوف و ہراس کو جگہ نہ دیں اور پاکستان جانے کا ارادہ رکھنے والے مسلمان ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے مفاد کو صدمہ نہ پہنچائیں۔ملک میں جذبۂ خیر خواہی و تعاون کا ماحول پیدا کرنے میں حکومت کا ہاتھ بٹائیں۔''

آگے مولانا نے فرمایا کہ

> ''دونوں ممالک کی اقلیتوں سے متعلق مسایل کو حل کرنے کا دلیرانہ اقدام کیا گیا ہے۔اس سلسلے میں پہلے بھی معاہدے کیے گئے تھے لیکن اس زمانے میں بدقسمتی سے پاکستانی رہنماؤں کو ایسے اہم مسئلے کے فوری حل کی اہمیت کا احساس نہ تھا۔موجودہ معاہدے کی اہمیت یوں ہے کہ پاکستانی رہنماؤں نے احساس کرلیا ہے اور معترف ہو چکے ہیں کہ اگر باہمی تعاون سے اقلیت کا مسئلہ حل نہ کیا گیا تو نتیجہ خود ان کے اپنے ملک کی خودکشی کی صورت میں ظاہر ہوگا۔معاہدے کا اہم پہلو یہ بھی ہے کہ ایک بورڈ میں حکومت، اقلیت اور اکثریت تینوں کے نمایندے ہوں گے اور بورڈ نگرانی کرے گا کہ آیا دونوں ممالک میں معاہدے کا نفاذ ہو رہا ہے کہ نہیں۔اس کمیٹی کا قیام فریقین کا جذبۂ خیر خواہی ظاہر کرتا ہے اور دونوں ممالک کی اقلیتوں کو پُر امید کرنے کا باعث ہوا ہے۔'' (خلافت۔بمبئی: ۲۳/اپریل ۱۹۵۰ء)

(۴) مولانا کی گذارش کے مطابق اجیت پرشاد نے بہ ذات خود ''ندیا'' کا دورہ کر کے حالات کی تحقیق کی تھی۔ مکتوب الیہ کے نام مولانا کے خط نمبر ۷ میں اسی طرف اشارہ موجود ہے۔ (آثار و نقوش مولانا ابوالکلام آزاد: مرتبہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری۔ کراچی، ۱۹۹۷ء، ص ۴۷-۴۶)

۴۵ ہزار مسلمانوں کی اسلام میں واپسی:

۱۲ مئی ۱۹۵۰ء: آج پٹیالہ یونین کے ۴۵ ہزار مسلمان جو ۱۹۴۷ء میں فساد کی وجہ سے پٹیالہ سے نکل گئے تھے اور انھیں ہندو بنا دیا گیا تھا، اب وہ از سرِ نو مسلمان ہو گئے ہیں اور بھارت سرکار نے انھیں نئے سرے سے پٹیالہ یونین میں بسانے کا کام شروع کر دیا ہے۔ اس طرح سکھوں اور مسلمانوں کے تعلقات بہتر ہونے لگے ہیں۔

(مولانا آزاد-ایک سیاسی ڈائری: ص ۴۵۳، بہ حوالہ خلافت- بمبئی: ۱۴ مئی ۱۹۵۰ء)

مولانا ابوالکلام آزاد کی تقریر سری نگر:

۲۴ جون ۱۹۵۰ء: مولانا آزاد وزیر تعلیم ہند نے سری نگر کے اوسنگھ کالج کے تقسیم اسناد میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ اہالیانِ کشمیر، مسئلہ کشمیر خود حل کر سکتے ہیں جب وہ ذہنی اور دماغی حیثیت سے اس کے اہل ہو جائیں گے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ عمومی تعلیم کا پورا بندوبست کیا جائے۔ انگریزوں کی ڈیڑھ سو سالہ حکومت کے بعد ابھی پندرہ فی صد آدمی لکھنا پڑھنا جانتے ہیں ملک کو فوراً ایک نصب العین مقرر کر کے اس پر عمل شروع کر دینا چاہیے۔ قدیم عہد میں ہندوستانیوں کے ذہن بلند اور وسیع تھے اسلام نے بھی یہ تعلیم دی ہے کہ وسیع النظری اور رواداری سے کام لو۔ حقیقت و صداقت کسی کی ملکیت نہیں ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ جن ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعلیمات اتنی وسیع ہوں ان میں تنگ دلی نظر آئے۔ جب مسلم لیگ کو عروج حاصل ہوا تو اس نے اپنی سیاست کی بنیاد مذہب پر رکھی تھی مگر اب عملاً ہندوستان میں لیگ کا وجود ختم ہو چکا ہے تاہم بعض لوگ اسی کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں اگر یہی تعصب اور تنگ دلی کی فضا طاری رہی تو ہندوستان تباہ ہو جائے گا۔ تعلیم کے بعد ہی تعصب کا قلعہ منہدم ہوگا اور ہم ہندوستانی روایات کے مطابق ترقی کا شاندار محل تعمیر کر سکیں گے۔

مولانا آزاد کو حادثہ پیش آگیا:

۲۶ رجون ۱۹۵۰ء: نئی دہلی میں مولانا آزاد جب اپنی نئی قیام گاہ کی خواب گاہ سے باہر نکل رہے تھے تو گر پڑے اور انھیں زخم آگئے بائیں ہاتھ کی کلائی کی ہڈی اور سیدھے پیر کے انگوٹھے میں تڑک آگئی۔ فوراً دواخانہ لے جا کر ایکسرے لیا گیا اور پٹیاں باندھی گئیں۔ رات بے چینی سے گزری پھر انھیں ان کے مکان میں منتقل کر دیا گیا۔ آج شام انھیں ذرا آرام رہا صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد مولانا آزاد کی مزاج پرسی کے لیے پندرہ منٹ تک مولانا کے ساتھ رہے۔ (مولانا آزاد-ایک سیاسی ڈائری: ص ۴۵۵)

نظام دکن کے خلاف سید قاسم رضوی کی درخواست:

۷ رجولائی ۱۹۵۰ء: حیدر آباد کی عدلیہ میں میر لائق علی اور ۱۶ ملزمین کی پیشی میں سید قاسم رضوی نے ایک عرض درشت پیش کی کہ حیدر آباد کے راج پرمکھ میر عثمان علی خاں نظام دکن کو بھی مجلس اتحاد المسلمین کا مجرم قرار دے کر ان پر فردِ جرم عاید کی جائے اور انھیں بھی ملزمین کی جیل میں لایا جائے یا ان پر اسپیشل عدالت قایم کی جائے۔ لیکن عدلیہ نے اسے نامنظور کر دیا۔ (مولانا آزاد—ایک سیاسی ڈائری: ص ۵۵۶)

ہم ہندو راج کو قایم نہیں ہونے دیں گے! سردار پٹیل کا اعلان:

۲ راگست ۱۹۵۰ء: ہندوستان کے جمہوری غیر مذہبی دستور کا نتیجہ تھا کہ سردار ولبھ بھائی پٹیل نے ہندو راج کا مطالبہ کرنے والوں کو متنبہ کیا۔ خلافت بمبئی کے مطابق:

''۲ راگست ۱۹۵۰ء کو دہلی میں وزیرِ داخلہ سردار پٹیل نے پنڈت کنزرو (H. N. Kunzru) کے اعتراض کے جواب میں کہا کہ ملک میں شہری آزادی پر پابندی نہیں ہے۔ میں یہ ثابت کرنے کو تیار ہوں کہ ملک کا ایک طبقہ اس پر مطمئن نہیں ہے کہ اس نے گاندھی جی کو قتل کر ڈالا، بلکہ ہندو مہا سبھا کے سابق صدر مسٹر بھوپتکر کے ایک ساتھی نے مجھے مطلع کیا کہ یہ طبقہ وزیرِ اعظم نہرو کو بھی قتل کر ڈالنا چاہتا ہے۔ مسٹر بھوپتکر جلتے ہوئے بنگال پر تیل چھڑک کر ملک میں امن کو برباد کرنا چاہتے ہیں، لیکن ہم ہندو راج اور برہمن راج کے

مدعیان کو ہرگز کامیاب نہ ہونے دیں گے۔"

(مولانا آزاد — ایک سیاسی ڈائری: ص ۴۵۸)

نواب صدر یار جنگ کا انتقال اور حضرت شیخ الاسلام کی تعزیت:

۱۱ر اگست ۱۹۵۰ء: حضرت صدر یار جنگ نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی بھیکم پور ضلع علی گڑھ کا ۱۱ر اگست ۱۹۵۰ء کو انتقال ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ انھیں غریقِ رحمت کرے۔ حضرت شیخ الاسلام نے نواب صاحب مرحوم کے انتقال پر ان کے صاحب زادے نواب عبید الرحمٰن خاں شروانی کو تعزیت کا جو خط تحریر کیا ہے۔ وہ نقل کیا جاتا ہے۔

"جناب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی مرحوم اور میرے والد حبیب اللہ صاحب مرحوم و مغفور پیر بھائی تھے، دونوں حضرت شاہ مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے۔ مرحوم نے ہمیشہ اس نسبت کو ملحوظ رکھا اور ابتدا سے جو تعلق و نسبت مجھ سے قایم ہوئی اسے آخر تک نباہا۔

دارالعلوم دیوبند سے بھی مرحوم کو اچھا خاصا تعلق تھا اور مملکت حیدرآباد کے صدر الصدور امور شرعیہ کے ہونے کے بعد تو یہ تعلق اور زیادہ بڑھ گیا تھا۔ مختلف مواقع پر دیوبند پہنچ کر وہاں کے تعلیمی، انتظامی اور اصلاحی امور کو بہ چشم خود دیکھا اور ضروری امور پر مشورے دیتے رہے۔

اگرچہ میرا ان سے بہت کم ملنا ہوتا، لیکن جب بھی ملاقات ہوئی وہ بڑی گرم جوشی اور عنایت مربیانہ سے ملتے رہے۔

اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کی مذہبی اور علمی خدمات کی بنا پر مرحوم کو اپنی رحمت و رضوان سے مالا مال کرے۔ آمین

ننگِ اسلاف

حسین احمد غفرلہٗ

اغوا شدہ خواتین کی واپسی:

۱۲ر اگست ۱۹۵۰ء: مولانا عبدالماجد دریابادی نے مس مردولا سارابائی کا ایک بیان "ایک شرم ناک موضوع" کے عنوان سے شایع کیا ہے جو اس طرح ہے:

''مس مردولا سارا بائی کا بیان ۱۱ر اگست کو نئی دہلی سے آیا ہے کہ آخر جون ۱۹۵۰ء تک:

''۶,۶۷۰ چھینی ہوئی عورتیں اور لڑکیاں پاکستان سے ہندوستان واپس آ چکی ہیں اور اس کے مقابلے میں ۱۳,۳۰۲ چھینی ہوئی عورتیں اور لڑکیاں ہندوستان سے پاکستان واپس بھیج چکی ہیں۔''

ان اعداد کو پڑھ کر دل بے اختیار ہندوستان کو داد دینے پر آمادہ ہو گیا تھا کہ حقیقتاً اس شرافت کی دوڑ میں جیت اسی کی ہے جو ''لینے'' پر نہیں ''دینے'' پر زیادہ سے زیادہ آمادگی دکھائے کہ عین اسی وقت لاہور کی خاتون فاطمہ بیگم کا یہ بیان بھی نظر کے سامنے آ گیا کہ ''۴۰ ہزار مسلم عورتوں اور لڑکیوں کے لکھے ہوئے نشان اور پہلے سے ہمارے پاس موجود ہیں۔''

اور ساتھ ہی ہندوستان کے اہل اقتدار کے نام ان کی موثر اپیل کے یہ فقرے ہیں کہ

''اگر وہ سچے دل سے مسلم اور غیر مسلم لڑکیاں ہند اور پاکستان سے نکالنا چاہتے ہیں تو آئیں ہمارے ساتھ معاہدہ کریں، میں ان کو یقین دلاتی ہوں کہ پاکستان کی حدود کے اندر کوئی غیر مسلم عورت زندہ موجود ہو اور کیسے ہی بااثر اور بارسوخ آدمی کے پاس کیوں نہ ہو مجھے اس کا پتا بتائیں۔ میں ایک ایک لڑکی، عورت اور بچے کے لیے پاکستان کے مشرق و مغرب میں پہنچوں گی اور اسے نکال کر ہندوستان کے حوالے کر دوں گی، مجھے اپنی ذات پر خدا کے فضل و کرم سے اتنا بھروسا ہے کہ میں ہر پاکستانی سے خدا کے نام پر بھیک مانگ سکتی ہوں اور میں دعویٰ سے کہہ سکتی ہوں کہ جس لڑکی کو حکومت کا زبردست ہاتھ نہیں نکال سکا میں اسے نکال لاؤں گی۔''

ہندوستان کا سیکولرازم۔ پرشوتم داس ٹنڈن کی نظر میں:

۲۰ر ستمبر ۱۹۵۰ء: پرشوتم داس ٹنڈن صدر کانگریس نے ۲۰ر ستمبر ۱۹۵۰ء کو ناسک میں کانگریس کے ستاونویں سالانہ اجلاس کے خطبۂ صدارت میں کہا:

''ہم پاکستان کے قیام کو تو نہ روک سکے، لیکن ہندوستان میں ہماری پالیسی ہندو، مسلمان، سکھ، بدھی، جین، پارسی اور عیسائی میں امتیاز نہیں کرتی..... ہمارے دستور کے تحت ہماری حکومت غیر مذہبی ہے۔ اس میں ہر شہری کو

مساوی حقوق حاصل ہیں۔ یہ ہمارے ملک کی شرافت اور دوراندیشی کا ثبوت ہے۔" (مولانا آزاد—ایک سیاسی ڈائری: ص۴۶۳)

۱۱/اکتوبر کو صدر کانگریس بابو پرشوتم داس ٹنڈن نے دہلی سے شائع ہونے والی ایک اپیل میں ہندوستان کی غیر مذہبی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:

"ہندوستان میں کسی مذہبی کتاب پر کوئی حکومت قایم نہیں کی جاسکتی، کیوں کہ یہاں بہت سی مذہبی کتابیں موجود ہیں۔ لہٰذا مذہبی حکومت کے قیام کا مطالبہ ہندوؤں کی آپس میں خانہ جنگی کا باعث ہوجائے گا، اس لیے کہ وہ خود مختلف کتابوں کے پیرو کار ہیں۔ چناں چہ یہاں تمام مذہبی فرقوں کو مذہبی آزادی حاصل ہیں۔" (برصغیر پاک وہند کی شرعی حیثیت: ص۲۱)

کولمبو منصوبہ:

جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیا کی اقتصادی ترقی کے لیے کولمبو منصوبہ لنکا کے دارالحکومت میں جنوری ۱۹۵۰ء میں دولتِ مشترکہ کے وزراے خارجہ کی ایک کانفرنس میں وضع کیا گیا۔ بعد میں اس میں جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک اور ولایاتِ متحدہ امریکا نے بھی شمولیت کی۔......

کولمبو منصوبہ ایک مشاورتی کمیٹی کی نگرانی میں چلایا جاتا ہے اور اس کے لیے کولمبو میں تکنیکی تعاون کی کونسل (Council for Technical Coperation) بھی قایم ہے، جسے دولتِ مشترکہ کی حکومتوں کے ایما پر یم کیا گیا تھا۔ اس کے مقاصد متعلقہ ملکوں کو انتظامی اصلاحات، طبی و صنعتی خدمات اور سرکاری عملے کی تربیت کے سلسلے میں رہنمائی اور مدد بہم پہنچانا ہے۔ اس طرح کے منصوبوں کے لیے مالیات متعلقہ ملکوں، دولتِ مشترکہ کی حکومتوں، ولایاتِ متحدہ اور عالمی بنک کے ذریعے فراہم کی جاتی ہیں۔ اقوام متحدہ کا ادارہ مشیروں اور ماہروں کو بھیج کر مدد کرتا ہے۔

(مزید مطالعے کے لیے دیکھیے: فرہنگ سیاسیات: ص۴۴-۳۴۶)

سیکولرازم کا مثبت پہلو اور ہندوستانی دستور:

سیکولرازم کی اصطلاح مغرب میں وجود میں آئی، جہاں اس کے معنی لادینی یا مذہب

سے علاحدگی کے ہیں۔ لیکن زمانۂ حال میں ہندوستان میں سیکولرازم یا نامذہبیت، کا اپنے مثبت معنی میں مطلب یہ ہے کہ ریاست میں کسی بھی مذہب کو کوئی خصوصی درجہ نہ دیا جائے اور اس کے مثبت معنی یہ ہیں کہ سب مذہبوں کو برابر کا درجہ دے کر سب کا یک ساں احترام کیا جائے۔ اور یہ بھی کہ مملکت اعزاز اور روزگار دیتے وقت اپنے شہریوں کے درمیان مذہب، ذات اور عقیدے کی بنا پر کسی قسم کا فرق اور امتیاز نہیں برتے گی۔

لیکن سیکولرازم کا اٹھارویں اور انیسویں صدیوں میں جس طرح ارتقا مغربی یورپ میں ہوا ہے، اس کے سیاق و سباق میں اس اصطلاح کا صحیح اردو ترجمہ ''لادینی'' یا ''لادینیت'' ہے۔ یورپ میں لادینی کی تحریک مسیحی کلیسا کی فرسودگی کے خلاف ایک ردِّعمل تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ معاشرہ، اخلاقیات، تعلیم اور سیاسی زندگی کو مذہب سے الگ کیا جائے اور مذہبی طبقہ معاشرے اور مملکت کے امور میں کوئی مداخلت نہ کرنے پائے۔ چناں چہ اسی اصول کے تحت ولایاتِ متحدہ امریکا کے دستور نے مملکت اور دین کے درمیان ایک اٹوٹ دیوار حایل کر دی ہے۔ نہ دین کو مملکت سے کوئی سروکار ہے اور نہ مملکت کو دین سے۔ (فرہنگ سیاسیات، ۲۲۳-۲۲۴)

۱۹۵۱ء

علماے پاکستان کا متفقہ بیان:

۲۱؍تا ۲۴؍جنوری ۱۹۵۱ء: ملک کے اکتیس نام ور علما و مشائخ کا ایک اجلاس کراچی میں علامہ سید سلیمان ندوی کی صدارت میں پاکستان میں اسلامی دستور سازی اور اس کے نفاذ کے مسئلے پر ہوا۔ اجلاس کے بعد علما کا متفقہ بیان شائع ہوا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے:

> ''ایک مدتِ دراز سے اسلامی دستورِ مملکت کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں لوگوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اسلام کا کوئی دستور مملکت ہے بھی یا نہیں؟ گر ہے تو اس کے اصول کیا ہیں اور اس کی عملی شکل کیا ہو سکتی ہے؟ اور کیا اصول اور عملی تفصیلات میں کوئی چیز بھی ایسی ہے جس پر مختلف اسلامی فرقوں کے علما متفق ہو سکیں؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کے متعلق عام طور پر ایک ذہنی پریشانی پائی جاتی ہے اور اس ذہنی پریشانی میں ان مختلف دستوری تجویزوں نے اور بھی اضافہ کر دیا ہے جو مختلف حلقوں کی طرف سے اسلام کے نام پر وقتاً فوقتاً پیش کی گئیں۔ اس کیفیت کو دیکھ کر یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ تمام اسلامی فرقوں کے چیدہ اور معتمد علیہ علما کی ایک مجلس منعقد کی جائے اور وہ بالاتفاق صرف اسلامی دستور کے بنیادی اصول ہی بیان کرنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ ان اصولوں کے مطابق ایک ایسا دستوری خاکہ بھی مرتب کر دے جو تمام اسلامی فرقوں کے لیے قابل قبول ہو۔''

اجلاس میں ملک کے جن ۳۱ نام ور علما و مشائخ نے شرکت فرمائی ان کے نام یہ ہیں:

۱۔ علامہ سید سلیمان ندوی (صدر مجلس ہذا)

۲۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی (امیر جماعتِ اسلامی پاکستان)

۳۔ مولانا شمس الحق افغانی (وزیرِ معارف۔ ریاستِ قلات)

۴۔ مولانا محمد بدر عالم (استاذ الحدیث دار العلوم الاسلامیہ اشرف آباد (ٹنڈو الہ یار) سندھ)

۵۔ مولانا احتشام الحق تھانوی (مہتمم دار العلوم الاسلامیہ اشرف آباد۔ سندھ)
۶۔ مولانا محمد عبدالحامد قادری بدایونی (صدر جمعیت علماے پاکستان۔ سندھ)
۷۔ مولانا مفتی محمد شفیع (رکن بورڈ آف تعلیمات اسلام مجلس دستور ساز پاکستان)
۸۔ مولانا محمد ادریس (شیخ الجامعہ جامعہ عباسیہ بہاول پور)
۹۔ مولانا خیر محمد (مہتمم مدرسہ خیر المدارس۔ ملتان شہر)
۱۰۔ مولانا مفتی محمد حسن (مہتمم مدرسہ اشرفیہ، نیلا گنبد۔ لاہور)
۱۱۔ پیر صاحب محمد امین الحسنات (مانکی شریف۔ سرحد)
۱۲۔ مولانا محمد یوسف بنوری (شیخ التفسیر دار العلوم الاسلامیہ اشرف آباد۔ سندھ)
۱۳۔ مولانا حاجی محمد امین (خلیفہ حاجی ترنگ زئی، المجاہد آباد۔ پشاور صوبہ سرحد)
۱۴۔ قاضی عبدالصمد سربازی (قاضی قلات۔ بلوچستان)
۱۵۔ مولانا اطہر علی (صدر عامل جمعیت علماے اسلام۔ مشرقی پاکستان)
۱۶۔ مولانا ابوجعفر محمد صالح (امیر جمعیت حزب اللہ۔ مشرقی پاکستان)
۱۷۔ مولانا راغب احسن (نائب صدر جمعیت علماے اسلام۔ مشرقی پاکستان)
۱۸۔ مولانا محمد حبیب الرحمٰن (نائب صدر جمعیت المدرسین، سرسینہ شریف۔ مشرقی پاکستان)
۱۹۔ مولانا محمد علی جالندھری (مجلس احرار اسلام پاکستان)
۲۰۔ مولانا داؤد غزنوی (صدر جمعیت اہل حدیث۔ مغربی پاکستان)
۲۱۔ مفتی جعفر حسین مجتہد (رکن بورڈ آف تعلیمات اسلام۔ مجلس دستور ساز پاکستان)
۲۲۔ مفتی حافظ کفایت حسین مجتہد (ادارہ عالیہ تحفظ حقوق شیعہ۔ لاہور، پاکستان)
۲۳۔ مولانا محمد اسماعیل (ناظم جمعیت اہل حدیث۔ لاہور، پاکستان)
۲۴۔ مولانا حبیب اللہ (جامعہ دینیہ دار الہدیٰ، ٹیڑھی۔ خیر پور میرس)
۲۵۔ مولانا احمد علی (امیر انجمن خدام الدین شیرانوالہ دروازہ۔ لاہور)
۲۶۔ مولانا محمد صادق (مہتمم مدرسہ مظہر العلوم، کھڈہ۔ کراچی)
۲۷۔ پروفیسر عبدالخالق (رکن بورڈ آف تعلیمات اسلام، مجلس دستور ساز پاکستان)
۲۸۔ مولانا شمس الحق فرید پوری (صدر و مہتمم مدرسہ اشرف العلوم۔ ڈھاکہ)
۲۹۔ مفتی محمد صاحب داد (سندھ مدرسۃ الاسلام۔ کراچی)

۳۰۔ مولانا محمد ظفر احمد انصاری (سیکرٹری بورڈ آف تعلیماتِ اسلام۔ مجلسِ دستور ساز پاکستان)
۳۱۔ پیر صاحب محمد ہاشم مجددی (ٹنڈو سائیں داد۔ سندھ)

اسلامی مملکت کے بنیادی اصول:

اجلاس میں اسلامی دستور کے جو بنیادی اصول بالاتفاق طے پائے تھے وہ یہ ہیں:

"اسلامی مملکت کے دستور میں حسبِ ذیل اصول کی تصریح لازمی ہے:

(۱) اصل حاکم تشریعی وتکوینی حیثیت سے اللہ رب العالمین ہے۔

(۲) ملک کا قانون کتاب وسنت پر مبنی ہوگا اور کوئی ایسا قانون نہ بنایا جا سکے گا، نہ کوئی ایسا انتظامی حکم دیا جا سکے گا جو کتاب وسنت کے خلاف ہو۔

(تشریحی نوٹ) اگر ملک میں پہلے سے کچھ ایسے قوانین جاری ہوں جو کتاب وسنت کے خلاف ہوں تو اس کی تصریح بھی ضروری ہے کہ وہ بہ تدریج ایک معینہ مدت کے اندر منسوخ یا شریعت کے مطابق تبدیل کر دیے جائیں گے۔

(۳) مملکت کسی جغرافیائی، نسلی، لسانی یا کسی اور تصور پر نہیں بلکہ ان اصول ومقاصد پر مبنی ہوگی جن کی اساس اسلام کا پیش کیا ہوا ضابطہ حیات ہے۔

(۴) اسلامی مملکت کا یہ فرض ہوگا کہ قرآن وسنت کے بتائے ہوئے معروفات کو قایم کرے، منکرات کو مٹائے اور شعایر اسلامی کے احیاو اعلا اور مسلمہ اسلامی فرقوں کے لیے ان کے اپنے مذہب کے مطابق ضروری اسلامی تعلیم کا انتظام کرے۔

(۵) اسلامی مملکت کا یہ فرض ہوگا کہ وہ مسلمانانِ عالم کے رشتۂ اتحاد واخوت کو قوی سے قوی تر کرنے اور ریاست کے مسلم باشندوں کے درمیان عصبیت جاہلیہ کی بنیادوں پر نسلی، لسانی، علاقائی یا دیگر مادی امتیازات کے ابھرنے کی راہیں مسدود کر کے ملتِ اسلامیہ کی وحدت کے تحفظ واستحکام کا انتظام کرے۔

(۶) مملکت بلا امتیاز مذہب ونسل وغیرہ تمام ایسے لوگوں کی لابدی انسانی ضروریات یعنی غذا، لباس، مسکن، معالجہ اور تعلیم کی کفیل ہوگی جو اکتسابِ رزق کے قابل نہ ہوں یا نہ رہے ہوں یا عارضی طور پر بے روزگاری، بیماری یا دوسرے وجوہ سے فی الحال سعی اکتساب پر قادر نہ ہوں۔

(۷) باشندگانِ ملک کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو شریعتِ اسلامیہ نے ان کو عطا کیے ہیں۔ یعنی حدود قانون کے اندر تحفظ جان و مال و آبرو، آزادیٔ مذہب و مسلک، آزادیٔ عبادت، آزادیٔ ذات، آزادیٔ اظہار رائے، آزادیٔ نقل و حرکت، آزادیٔ اجتماع، آزادیٔ اکتسابِ رزق، ترقی کے مواقع میں یک سانی اور رفاہی ادارات سے استفادے کا حق۔

(۸) مذکورہ بالا حقوق میں سے کسی شہری کا کوئی حق اسلامی قانون کی سند جواز کے بغیر کسی وقت سلب نہ کیا جائے گا۔ اور کسی جرم کے الزام میں کسی کو بغیر فراہمی موقعہ صفائی و فیصلہ عدالت کوئی سزا نہ دی جائے گی۔

(۹) مسلمہ اسلامی فرقوں کو حدودِ قانون کے اندر پوری مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ انھیں اپنے پیروؤں کو اپنے مذہب کی تعلیم دینے کا حق حاصل ہوگا۔ وہ اپنے خیالات کی آزادی کے ساتھ اشاعت کر سکیں گے۔ ان کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کے اپنے فقہی مذہب کے مطابق ہوں گے اور ایسا انتظام کرنا مناسب ہوگا کہ انھیں کے قاضی یہ فیصلے کریں۔

(۱۰) غیر مسلم باشندگانِ مملکت کو حدودِ قانون کے اندر مذہب و عبادت، تہذیب و ثقافت اور مذہبی تعلیم کی پوری آزادی حاصل ہوگی اور انھیں اپنے شخصی معاملات کا فیصلہ اپنے مذہبی قانون یا رسم و رواج کے مطابق کرانے کا حق حاصل ہوگا۔

(۱۱) غیر مسلم باشندگانِ مملکت سے حدودِ شرعیہ کے بہ قدر جو معاہدات کیے گئے ہوں، ان کی پابندی لازمی ہوگی اور جن حقوق شہری کا ذکر دفعہ نمبر ۷ میں کیا گیا ہے ان میں غیر مسلم باشندگانِ ملک اور مسلم باشندگانِ ملک سب برابر کے شریک ہوں گے۔

(۱۲) رئیسِ مملکت کا مسلمان مرد ہونا ضروری ہے جس کے تدین، صلاحیت اور اصابت رائے پر جمہور یا ان کے منتخب نمایندوں کو اعتماد ہو۔

(۱۳) رئیسِ مملکت ہی نظمِ مملکت کا اصل ذمہ دار ہوگا۔ البتہ وہ اپنے اختیارات کا کوئی جز و کسی فرد یا جماعت کو تفویض کر سکتا ہے۔

(۱۴) رئیسِ مملکت کی حکومت مستبدانہ نہیں بلکہ شورائی ہوگی۔ یعنی وہ ارکانِ حکومت اور منتخب نمایندگانِ جمہور سے مشورہ لے کر اپنے فرایض انجام دے گا۔

(۱۵) رئیسِ مملکت کو یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ وہ دستور کا کلاً یا جزواً معطل کر کے شوریٰ کے بغیر حکومت کرنے لگے۔

(۱۶) جو جماعت رئیسِ مملکت کے انتخاب کی مجاز ہوگی وہی کثرتِ آرا سے اسے معزول کرنے کی بھی مجاز ہوگی۔

(۱۷) رئیسِ مملکت شہری حقوق میں عامۃ المسلمین کے برابر ہوگا اور قانون مواخذہ سے بالاتر نہ ہوگا۔

(۱۸) ارکان و عمالِ حکومت اور عام شہریوں کے لیے ایک ہی قانون و ضابطہ ہوگا، اور دونوں پر عام عدالتیں ہی اس کو نافذ کریں گی۔

(۱۹) محکمۂ عدلیہ، محکمۂ انتظامیہ سے علاحدہ اور آزاد ہوگا تاکہ عدلیہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں ہیئت انتظامیہ سے اثر پذیر نہ ہو۔

(۲۰) ایسے افکار و نظریات کی تبلیغ و اشاعت ممنوع ہوگی جو مملکتِ اسلامی کے اساسی اصول و مبادی کے انہدام کا باعث ہوں۔

(۲۱) ملک کے مختلف ولایات و اقطاع مملکت واحدہ کے اجزا انتظامی متصور ہوں گے۔ ان کی حیثیت نسلی، لسانی، یا قبایلی واحدہ جات کی نہیں بلکہ محض انتظامی علاقوں کی ہوگی۔ جنھیں انتظامی سہولتوں کے پیش نظر مرکز کی سیادت کے تابع انتظامی اختیارات سپرد کرنا جائز ہوگا۔ مگر انھیں مرکز سے علاحدگی کا حق حاصل نہ ہوگا۔

(۲۲) دستور کی کوئی ایسی تعبیر معتبر نہ ہوگی جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔"

اجلاس میں حکومتِ پاکستان کی مقرر کردہ کمیٹیوں کے بارے میں کہا گیا:

"مجلس دستور ساز پاکستان کی مقرر کردہ کمیٹیوں نے بنیادی حقوق اور بنیادی اصولوں کے متعلق جو سفارشات پیش کی ہیں ان کے بارے میں اس اجتماع کی یہ متفقہ رائے ہے کہ یہ سفارشات اسلامی اصولوں سے مطابقت نہیں رکھتیں۔"

بیان میں یہ شکایت بھی کی گئی:

"اس اجتماع کی خواہش تھی کہ اس موقع پر اسلامی اصولوں کے مطابق ایک تفصیلی خاکہ بھی مرتب کر دیا جائے، چناں چہ اس غرض کے لیے مجلس

دستور ساز پاکستان کے صدر سے درخواست کی گئی کہ وہ تعلیماتِ اسلامیہ بورڈ کی سفارشات کا ایک نسخہ اس اجتماع کو مہیا کر دے تا کہ اگر وہ اسلامی اصولوں کے مطابق درست ہو تو اس کی توثیق کر دی جائے یا اگر اس میں کچھ کمی ہو تو اسے پورا کر دیا جائے اور نئے سرے سے ایک چیز مرتب کرنے میں محنت صرف نہ کرنی پڑے۔ لیکن صاحب موصوف نے بعض وجوہ سے اس درخواست کو قبول نہ فرمایا۔"

فروری ۱۹۵۱ء: شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوری کے ترجمہ قرآن مجید کے بارے میں حضرت شیخ الاسلام کی رائے گرامی!

"سب سے عظیم الشان معجزہ جناب سرورِ کائنات حضرت خاتم الانبیاء سید المرسلین علیہ افضل الصلوٰۃ والسلام کا اور سب سے بڑا انعام اپنے بندوں پر حضرت رب العالمین جل وعلیٰ شانہٗ کا یہ قرآن عظیم الشان ہے جو کہ تمام کتب وصحفِ سابقہ کا مہیمن اور جملہ انبیاء ورسل کے علوم کا جامع ہے۔ جس شخص کو اس میں سے کوئی بھی حصہ ملا وہ اس کے لیے حظ وافر اور انتہائی خوش قسمتی کا سامان ہے۔ اور کیوں کر نہ ہو؟ یہی تو وہ حبلِ متین ہے جو کہ خلق اور خالق کے مابین عروۃ وثقی لا انفصام لھا کا کام دیتی ہے اور یہی تو وہ بحر ذخار حقیقی ہے جس کے بیش بہا موتی حسبِ ارشاد لا تنقضی عجائبہ ختم ہونے پر نہیں آتے۔ ہر چند کہ متقدمین اصحابِ معارف ویقین نے اپنی آخری قوت تک اس کی خدمات میں صرف کر دی، مگر موفق متاخرین نے آ کر دکھلا دیا کہ لاکھوں درِ گراں مایہ اس بحر ناپیدا کنار کے قعر میں پھیلے ہوئے اب تک موجود ہیں جن پر کسی غواص کے ہاتھوں کا گزر تک نہیں ہوا۔ ولنعم ماقیل، کم ترك الاول للآخر ولو ان مافی الارض من شجرۃ اقلام والبحر یمدہ من بعد سبعۃ ابحر ما نفدت کلمات اللّٰہ. ہزار ہزار تبریک کے مستحق وہ لوگ ہیں جو اپنی عمر گراں مایہ کو اس کی خدمت میں صرف کرنے میں دریغ نہیں فرماتے۔ اور ہزار ہزار ملامت کے مستحق وہ اشخاص ہیں جو اپنی گردنیں ان کتاب عزیز لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ کے سامنے نہ جھکاتے ہیں اور نہ اس میں غور وخوض کرتے ہیں۔

حضرت مولانا احمد علی صاحب (وفقہ اللّٰہ لما یحبہ ویرضاہ و اسعدہٗ علی

قلل المرادات المرضیہ ورقاہ) کو عنایات ازلیہ کی نظر انتخاب نے ازل ہی سے جن کر اس عظیم الشان امر کے لیے مسبوق بالحسنیٰ قرار دے دیا تھا، جن کی جد و جہد اور جاں فشانیاں بفضلہٖ تعالیٰ عرصۂ دراز سے اس چمنستان میں بار آور ہو رہی ہیں۔ و ذٰلک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء۔

میں نے مولانا موصوف کی یہ تحریر در بارۂ ربط آیاتِ قرآنیہ وایضاح معانی فرقانیہ مختلف مقامات سے دیکھی۔ بحمد اللہ نہایت مفید اور کار آمد تحریر پائی۔ دل چسپ اور صحیح و ضروری مضامین کا خلاصہ اس طرح اس میں بھر دیا گیا ہے کہ عوام اور خواص دونوں کو بہت زیادہ آسانی کے ساتھ دررِ گراں مایہ ہاتھ آسکیں گے۔ میری نظر سے کوئی مضمون ایسا نہیں گزرا جو کہ مسلک اہل سنت والجماعت کے خلاف ہو یا اس پر کوئی گرفت ہو سکے۔ مجھ کو قوی امید ہے کہ اگر لوگ اس عجیب و غریب تحریر کو غور و خوض کے ساتھ مطالعہ فرمائیں گے تو کتاب اللہ کے سمجھنے کا بہت بڑا فرض ادا کریں گے۔

آخر میں مولانا موصوف کو اس کامیابی پر مبارک باد دیتا ہوا دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے دارین میں ان کو سرخرو اور کامیاب فرمائے اور اپنی لقا اور رضوان کے اعلا درجات سے ان کو مالا مال کرے۔ آمین

واللّٰہ ولی التوفیق وصلی اللّٰہ علیٰ خیر خلقہ سیدنا محمد والہٖ وصحبہٖ وسلم۔

ننگ اسلاف

حسین احمد غفرلہٗ

خادم العلم بدار العلوم دیوبند

تحریر من جمادی الاول ۱۳۵۱ھ

۱۸ر مئی ۱۹۵۱ء: وزیر تعلیم انڈیا مولانا ابوالکلام آزاد یورپ کے پہلے سفر ۱۸ر مئی ۱۹۵۱ء کو بمبئی سے روانہ ہوئے تھے۔ وہ ۲۱ر مئی کو لندن پہنچے اور تقریباً وسط جون تک لندن میں مقیم رہے اور انڈیا آفس لائبریری سے متعلق معاملات پر گفتگو میں وقت گزارا تھا۔ لندن سے مولانا پیرس تشریف لے گئے تھے جہاں یونسکو کی چھٹی عام کانفرنس میں مولانا نے یونسکو کے نصب العین کے موضوع پر ایک عظیم الشان خطبہ دیا۔ پیرس، اٹلی، ترکی، ایران کا دورہ

کرتے ہوئے اور کراچی میں مختصر قیام کے بعد دہلی تشریف لے گئے تھے۔کراچی میں مولانا نے بانیٔ پاکستان کی قبر پر حاضر ہو کر فاتحہ پڑھی تھی۔

حضرت شیخ الاسلام کا ایمان افروز مکتوب:

۲۳ر ستمبر ۱۹۵۱ء:

میرے محترم! اس زمانے میں جب کہ مدینۂ منورہ دارالاسلام ہو گیا تھا اور جہاد کی آیتیں نازل ہو چکی تھیں، غزوۂ بدر و اُحد ہو چکا تھا، سورۂ آل عمران نازل ہوتی ہے اور اس میں اخیر میں یہ آیت ہے:

لَتُبْلَوُنَّ فِيٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا وَّاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ O

(سورۂ آل عمران:۱۸۶)

”تم ضرور بالضرور اپنی جانوں اور مالوں کے متعلق آزمائش کیے جاتے رہو گے اور تم ضرور بالضرور اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) اور مشرکین سے بہت زیادہ اذیت کی باتیں سنتے رہو گے اور اگر تم صبر کرو اور پرہیزگاری کرو تو یہ اعلا ترین امور میں سے ہے۔“

اگر یہ حکم اس وقت صبر و تحمل کا تھا تو آج کیا معنی ہے؟ صبر و تحمل، استقلال اور عالی ہمتی سے کام لینا اور اسلام کے مضبوط کرنے میں لگے رہنا ہمارا اور آپ کا فریضہ ہے۔

میرے محترم! سب سے پہلے جمعیت علما نے پتر کا (اخبار) کے خلاف آواز اٹھائی، احتجاج کے لیے مسلمانوں کو آمادہ کیا، اس پر عمل درآمد ہوا۔ چناں چہ ایڈیٹر نے معافی مانگی۔ چیف ایڈیٹر نے بہت زیادہ زور دار الفاظ میں تمام مسلمانوں سے معافی مانگنے کا اور اپنے کلکتہ کے ہسپتال میں بیمار ہونے کا عذر کیا۔ پھر گورنمنٹ نے ایڈیٹر کے خلاف دعویٰ دائر کیا، ضمانت لی گئی۔ ادھر چیف ایڈیٹر نے اعلان کیا کہ لکھنے والے کو برخاست کر دیا گیا۔ دو پیشیاں ہو چکی ہیں، معلوم نہیں کورٹ سے کیا فیصلہ ہوتا ہے۔ اگر خدانخواستہ اس کو کوئی سزا نہ دی گئی تو جمعیت ورکنگ کمیٹی کو بلا کر مشورہ کرنے والی ہے کہ ہم کو حالت موجودہ میں کیا

کارروائی کرنی چاہیے۔ ان امور کو آپ کیوں پس پشت ڈالتے ہیں؟ آپ اس سے زیادہ اس ملک میں کیا کر سکتے ہیں اور اس سے پہلے انگریزی راج میں کیا کر سکے؟ کیا ایسے واقعات پہلے نہیں ہوئے ہیں؟

تعلیمات کے متعلق آپ جو کچھ لکھ رہے ہیں جمعیت اس کے مقابلے کے لیے تجویز اور اپنی جدوجہد جاری کر چکی ہے، نصاب بن چکا ہے، کتابیں شایع ہو چکی ہیں، طرزِ عمل بتلایا جا چکا ہے، آئے دن اس کے لیے کوشش عمل میں لائی جارہی ہے مگر مسلم پبلک نہ جاگتی ہے نہ کوئی تعمیری پروگرام عمل میں لاتی ہے، تو بتلایئے کامیابی کیسے ہو اور الزام دینا کس طرح صحیح ہے؟

غرض کہ جوش کو عمل میں لایئے بلکہ ہوش کو بھی ساتھ رکھیے۔ آگا پیچھا بھی دیکھیے، ماحول سے نظر نہ ہٹایئے۔ والسلام

ننگِ اسلاف

حسین احمد غفرلہٗ

۲۱/ ذی الحجہ ۱۳۷۰ھ

حضرت شیخ کا ایک فکر انگیز اور تاریخی خط:

۲۳/ ستمبر ۱۹۵۱ء: حضرت کے ایک عقیدت کیش تصدق حسین عارفی۔ بہلول پور ضلع بجنور نے حضرت کو ایک بہت پُر جوش خط لکھا تھا، جس میں ہندوستان مسلمانوں کی کس مپرسی ہندوؤں کے تعصب اور اسلام دشمنی کا تذکرہ کرتے ہوئے تجویز پیش کی تھی کہ مسلمانوں کی ایک کل ہند کانفرنس بلائی جائے جس میں علمائے دین اور مسلمان امرا کو مدعو کرنا چاہیے اور ہندوستان سے مسلمانوں کو ہجرت کر جانی چاہیے۔ جذبات خواہ کتنے ہی مخلصانہ ہوں ان کی اہمیت کا تعلق ان کی عملی قدر و قیمت سے ہوتا ہے اور ایک مدبر کا فرض ہے کہ جذبات میں اعتدال پیدا کر کے مخاطب کو ان کی عملی قدر کی طرف متوجہ کردے۔ حضرت شیخ الاسلام نے مکتوب الیہ کو ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ کے جن حقایق اور واقعات کی طرف توجہ دلائی انھیں ہر ذی شعور تاریخ میں پڑھ اور اپنے چاروں طرف دیکھ سکتا ہے، لیکن ان پر بہت کم غور کیا گیا ہے۔ جوش و جذبات کی فراوانی اور کثرتِ توہمات نے ہمیشہ مسلمانوں کی آنکھیں بند ہی رکھیں۔ حضرت شیخ الاسلام نے اس مکتوب گرامی کے

ذریعے غفلت و نادانی کے انھیں پردوں کو ہٹانے اور حقایق سے آشنا کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ حضرت کا مکتوب یہ ہے:

محترم المقام زید مجدکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

والا نامہ باعثِ سرفرازی ہوا، آپ کی غیرتِ دینی باعثِ مبارک باد ہے، جزاکم اللہ خیر الجزاء، ووفقنا وایاکم لما یحب ویرضیٰ۔ آمین

میرے محترم! آپ جذباتِ دینیہ مبارکہ رکھتے ہوئے اس وقت اس کو کیوں فراموش کیے ہوئے ہیں کہ آپ کہاں اور کس ماحول میں ہیں؟ اگر آج ملک تقسیم نہ ہوا ہوتا تو کیا آج وہ مشکلات پیش آتیں جو آج درپیش ہیں؟ اس وقت مسلمان جمہوری ہند میں ۳۷ فیصدی ہوتے جو کہ مؤثر اقلیت ہے، دس کروڑ ہوتے، مگر آج چار کروڑ ہیں، جو ۹ یا ۱۰ فیصدی پڑتے ہیں۔ ایسے ہی امور کے ماتحت جمعیت تقسیم کے مخالف رائے رکھتی تھی، مگر ہماری نہیں سنی گئی۔ فرقہ پرست ہندو تو دل سے چاہتا ہے کہ ہندوستان میں ایک بھی مسلمان باقی نہ رہے۔ وہ اپنی من مانی کارروائی عمل میں لائیں۔ زعمائے لیگ پہلے کہتے تھے، نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب نے لیگ کے جلسہ شاہ جہان پور میں کہا تھا کہ ہم چاہتے ہے کہ ”جہاں ہماری اکثریت ہے وہاں ہم حکومت کریں اور من مانی کارروائی عمل میں لائیں۔ اور جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہو وہاں ان کی حکومت ہو اور وہ اپنی من مانی کارروائی عمل میں لائیں۔“ تو جب آپ نے ملک کو تقسیم کرالیا تو پھر آپ کو کیوں طیش آتا ہے؟ یہ ان کا کرم ہے کہ وہ اس کو سیکولر قرار دیتا ہے ورنہ آپ کے اور لیگ کے قراردادوں اور اعمال کا مقتضی تو یہی ہے کہ وہ اپنی اکثریت کے حصے میں جو چاہیں کریں اور آپ دم نہ ماریں، جیسے کہ آپ پاکستان میں جو چاہتے ہیں کر رہے ہیں اور کوئی دم نہیں مار سکتا۔ اگر آپ یہ تجویز کرتے ہیں کہ جلسہ کر کے اگر وہ آپ کی نہ مانیں تو ہندوستان سے مسلمان نکل جائیں، تو یہ تو ان کی عین منشا ہے۔ پھر آپ ہی فرمائیں کہ یہ چار کروڑ مسلمان یہاں سے نکل جائیں گے؟ آپ اور میں یا ہمارے جیسے دس بیس ہزار نکل گئے بھی تو کیا سب نکل پڑیں گے؟ اور اگر نکل بھی پڑے تو کون سی زمین ان کو ٹھکانا دے گی؟

ہجرت کی تحریک جو کہ تحریکِ خلافت میں کی گئی تھی کیا ہوا؟ اسی تقسیم ملک کے بعد جو

مسلمان یو پی، بہار، مشرقی پنجاب وغیرہ سے نکل کر گئے ان کا کیا حشر ہوا؟ اور آج کیا ہو رہا ہے؟ سیکڑوں نہیں، ہزار دو ہزار نہیں، آج تک لاکھوں کی مقدار میں مسلمانوں کو سر چھپانے کی جگہ نہیں مل سکی۔ ہندوستان نے ہندو شرنارتھیوں کے لیے کچھ کیا بھی اور بہت کچھ کیا مگر ابھی تک ہزاروں یا لاکھوں شرنارتھی کیمپوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ باوجود کروڑوں رُپے خرچ کر دینے کے سب کا انتظام نہیں ہو سکا۔ مگر پاکستان اتنا تو درکنار، (اس کا) آدھا، تہائی بلکہ دسواں حصہ بھی نہیں کر سکا اور افغانستان یا عرب تو کیا کر سکتے ہیں، اور ان کو آپ کے ساتھ یا ہندوستانی مسلمانون کے ساتھ کیا ہمدردی ہے، ذرا احوال کو غور سے دیکھیے۔

صوبہ جاتی تعصب سندھ میں، پنجاب میں، بنگال میں، یو پی، بہار وغیرہ کے مسلمانوں سے نہایت بدترین صورت میں عمل میں لایا جارہا ہے۔ یہاں کے مسلمان وہاں انتہائی مشکلات میں مبتلا ہیں۔ اپنے اوطان کو واپس آنے کے لیے سو دو سو نہیں، ہزار دو ہزار نہیں، لاکھوں کی تعداد میں بے قرار ہیں۔ پرمٹ اور پاسپورٹ اور حدود پر حکومتوں کے سپاہی مانع ہیں ورنہ اب تک مہاجرین کا دو تہائی یا تین چوتھائی حصہ واپس آچکا ہوتا۔ اور بالفرض آپ اور ہم دس بارہ ہزار نکل بھی گئے اور وہاں آرام کی جگہیں بھی مل گئیں تو جو مسلمان یہاں باقی رہیں گے ان کے دین وایمان کا کیا حشر ہوگا؟ اور کون ان کی حفاظت کرے گا اور کیا وہ مرتد اور شدھ نہ ہو جائیں گے؟

میرے محترم! مکۂ معظمہ کی زندگی قبل الہجرۃ پر غور کیجیے، وہاں سے ان عشاقِ رسول علیہ السلام نے جن کو سچا اور مکمل مسلمان مانتے ہیں، حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ اور خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اس وقت تک ہجرت نہیں کی اور اس کے بعد بھی حضرت عباس رضی اللہ عنہ ان کی اولاد اور ان کا گھرانہ وغیرہ باقی رہے، کفار سب کچھ کرتے اور سب کچھ کہتے تھے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کو خصوصی دشمنی تھی، پھر کیا انھوں نے صبر وتحمل کو ہاتھ سے دیا یا مصایب جھیلتے ہی رہے اور استقامت کے ساتھ گزر کرتے، اسلام کو تھامتے رہے اور اسلام کی مضبوطی اور اشاعت کو عمل میں لاتے رہے۔ شرک اور بت پرستی اسلام میں سب سے بڑا گناہ ہے، آپ اس کو دیکھتے ہیں، بت خانے اور مندر آپ کے سامنے ہیں، مشرکانہ جلوس اور بت نکلتے ہیں، مشرکانہ نعرے لگائے جاتے ہین۔ آپ ان کو دیکھتے ہیں، سنتے ہیں، مگر صبر وتحمل کرتے ہیں، اُف نہیں کرتے اور یہ کہتے

ہوئے گزر جاتے ہیں لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْن. آج اس سے بڑھ کر کون سی بات ہے جس پر آپ کو طیش آتا ہے۔ سوچیے اور عواقب پر نظر ڈالیے۔ یہ دارالاسلام نہیں ہے، اپنے ہی ہاتھوں سے تقسیم کرایا ہوا ہے، آپ نے اور ہم نے کیا ہے، آپ کے اور ہمارے بزرگوں نے محمود غزنوی اور محمد ابن قاسم سے پہلے یہاں کے شہروں اور قصبوں اور دیہاتوں میں سکونت اختیار کی، اس وقت کی حالت اور آج کی حالت میں کس قدر فرق ہے، مگر انھوں نے یہ نہیں دیکھا کہ ہم ہزار دو ہزار، ہم لاکھ دو لاکھ ہیں اور ملک کفار سے بھرا ہوا ہے۔ یہ انتہائی دشمنی رکھتے ہیں، خدا جانے کس وقت کیا ہوگا، مگر آج آپ کو اس قدر عاقبت بینی بے چین کر رہی ہے۔

جب آپ کے پاس قوت آئی اور آپ کی فوجیں یہاں داخل ہوئیں اس وقت بھی آپ انتہائی اقلیت میں تھے، آج تو آپ چار کروڑ ہیں، اس وقت آپ کے زیر نظر انقلابات زمانہ نہیں رہے جو کہ تاریخ میں ہمیشہ سے ظہور پذیر رہے ہیں۔ مگر آج انقلابات سے خائف ہیں، اس وقت کیا مشرکین آپ کے دوست تھے؟ ان میں مشرکانہ جذبات نہ تھے؟ زمانے کے انقلابات اس وقت معدوم ہو گئے تھے، مانا کہ آپ کے ہاتھ میں قوت آ گئی تھی مگر اس کے دوام کا کون متکفل تھا؟ آپ یہاں ہی رہے، اسلام کی تبلیغ کی اور کروڑوں کو مسلمان بنالیا، آج آپ ہمت ہار کر یہاں سے نکلنے پر آمادہ ہیں۔

بھارتیہ جن سنگھ:

۲۱ر اکتوبر ۱۹۵۱ء: دائیں بازو کے ہندو قوم پرستوں کی سیاسی جماعت جسے کلکتہ میں ۲۱ر اکتوبر ۱۹۵۱ء کو شیاما پرشاد مکرجی نے قایم کیا۔ یہ ایک کل ہند پارٹی تھی اور ملکی سیاست کی ہر سطح پر ۲۶ برس تک سرگرم رہ کر مارچ ۱۹۷۷ء کے پارلیمانی چناؤ میں جنتا پارٹی کی کامیابی کے بعد یکم مئی ۱۹۷۷ء کو باضابطہ طور سے جنتا پارٹی میں ضم ہو گئی۔

(مقاصد و عزائم کے تفصیلی مطالعے کے لیے دیکھیے: فرہنگ سیاسیات: ص ۱۱۲)

مولانا مودودی اور جماعت اسلامی ❶:

۶ر نومبر ۱۹۵۱ء: محمد اقبال اوکاڑہ (ضلع منٹگمری) کے نام:

محترم المقام زید مجدکم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ
والا نامہ باعثِ سرفرازی ہوا۔ جناب کو مودودی صاحب کی تحریریں دیکھ کر اس قدر متاثر ہونا کہ اسلام سے بدظن ہوجائیں، تعجب خیز ہے۔
(اولاً) علامہ مودودی خود اقرار کرتے ہیں کہ میں عالم نہیں ہوں۔ وہ ترجمان (القرآن) نمبر ۲۷ ۳ ربیع الاول ۱۳۵۵ھ میں تحریر فرماتے ہیں:

"مجھے گروہ علما میں شامل ہونے کا شرف حاصل نہیں ہے۔ میں ایک بیچ کی راس کا آدمی ہوں، جس نے جدید وقدیم دونوں طریقہ ہائے تعلیم سے کچھ کچھ پایا ہے اور دونوں کو چوں کو چل پھر کر دیکھا ہے۔ اپنی بصیرت کی بنا پر نہ تو میں قدیم گروہ کو سراپا خیر سمجھتا ہوں اور نہ جدید گروہ کو۔"

تعلیم میں ان کا صاف اقرار ہے کہ میں نے کچھ کچھ حصہ پایا ہے۔ اس کے بعد ان کا کوئی حکم شرعی امور کے متعلق آیا قابل وثوق واعتماد قرار دیا جاسکتا ہے؟
"نیم طبیب خطرۂ جان نیم ملا خلل ایمان" مشہور مقولہ ہے۔
(ثانیاً) علاوہ ازیں داڑھی کے مسئلے میں ان کی کیا کسی دوسرے کی رائے میں کتنا ہی بڑا اختلاف کیوں نہ ہو، اس کی وجہ سے اصول مذہب اسلام اور اس کے عقاید اور فرایض اعمال پر کیا اثر پڑ سکتا ہے، جس کی بنا پر آپ اسلام سے بدظن ہونے پر آمادہ ہوگئے ہیں۔
علامہ مودودی صاحب کا یہ قول "میرے نزدیک داڑھی کا بڑا اور چھوٹا ہونا یک ساں ہے۔ صحابہ میں صرف دو ایک آدمی ایسے ملتے ہیں جن کی داڑھی مشت برابر ہے۔" یہ صرف ان کی رائے ہے کہ دونوں یک ساں ہیں۔ یہ رائے ایک ناقص العلم یا ناقص العقل کی رائے ہے، جس کے مقابل تمام فقہائے اسلام کی تصریحیں موجود ہیں کہ داڑھی کی مقدار کم از کم ایک مشت ہونی چاہیے، تو آیا مودودی صاحب کی رائے قابل اعتبار ہوگی یا تیرہ سو برس کے مستند علما اور فقہائے مذاہب کی؟
(ثالثاً) اگر آپ نے یہی اصول رکھا کہ ہزار بارہ سو برس کے بعد آنے والے ایک نیم تعلیم یافتہ کی جو کچھ رائے ہو وہ پرانے کامل تعلیم اور معتبر علما کی رائے اور روایات سے اونچی شمار کی جائے تو پھر تمام دین ہی کو سلام کرنا پڑے گا۔ اس دور فتن وغلبہ ہوا وہوس وعجب

وتکبر خود پسندی وخود رائی میں نہ صرف ادھورے علم والے بلکہ بڑی بڑی سندوں والے بھی ایسے ملیں گے کہ اپنی خواہشات نفسانی کے لیے تمام متقدمین کے دفتروں کو اساطیر الاولین اور بکواس کہہ کر ٹھکرا دیں گے اور اپنے غلط سے غلط افکار کو سب سے اونچا بتلا کر لوگوں کو اس طرف بلائیں گے۔ گزشتہ معتمدین اہل تقویٰ اور اہل علم کی تحمیق اور تجہیل کریں گے اور اپنے آپ کو سب سے زیادہ مفکر، سب سے زیادہ محقق بتائیں گے۔

داڑھی کے متعلق مندرجہ ذیل امور پر غور فرمائیں۔

! قرآن مجید میں مذکور ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ

> ''میری اماں کے بیٹے! میری داڑھی اور میرا سر مت پکڑ۔'' لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي ۔ (سورۂ طٰہٰ: ۹۴) اگر حضرت ہارون علیہ السلام کی داڑھی قبضہ (مشت) سے چھوٹی ہوتی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کس طرح پکڑ سکتے تھے؟''

۲- جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی داڑھی کا خلال وضو کے وقت میں کیا کرتے تھے یعنی داڑھی کے بالوں میں جڑوں کے نیچے سے انگلیاں ڈال کر پانی پہنچایا کرتے تھے۔ ترمذی جلد اول صفحہ ۶ میں ہے:

> عن حسان بن بلال قال رایت عمار بن یاسر توضاء فخلل لحیته فقیل له او قال فقلت له اتخلل لحیتك قال وما یمنعنی ولقد رایت رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یخلل لحیته، عن عثمان رضی اللّٰه عنهٗ ان النبی صلی اللّٰه علیه وسلم کان یخلل لحیته. قال ابو عیسٰی هٰذا حدیث حسن صحیح.

ابن ماجہ صفحہ ۲۵ میں ہے:

> عن ابن عمر رضی اللّٰه عنهما قال کان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم اذا توضاء عرك عارضته بعض العرك ثم شبك لحیته باصابعه من تحتها. (صحہ ابن السکن)

یہ روایتیں متعدد صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، بیہقی، دارقطنی وغیرہ محدثین نے ذکر فرمائی ہیں۔ ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان صحابہ کرام کی داڑھیاں نہ خس خسی تھیں نہ چھوٹی تھیں بلکہ اتنے بڑے بڑے بال تھے کہ ان میں نیچے سے انگلیاں ڈال کر پانی پہنچایا جاتا تھا۔ جڑ کے نیچے انگلیاں ڈال کر پانی پہنچانا ایک مشت یا اس سے زاید ہی میں ہوگا۔ ابوداؤد میں ہے:

اخذ كفا من ماء فادخله تحت حنكه فخلل به لحيته.

"کیا چھوٹی داڑھی یا خس خسی میں یہ ہوسکتا ہے یا اس کی ضرورت پڑسکتی ہے؟"

۳-عن انس بن مالك رضى الله عنهٗ قال كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يكثر دهن راسه وتصريح لحيته.

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سر میں تیل کی مالش اور کنگھی سے داڑھی کے بالوں کا سنوارنا بہ کثرت کرتے تھے۔"

کھلی ہوئی بات ہے کہ خس خسی داڑھی میں نہ کنگھی ہوتی ہے نہ اس کی ضرورت پڑتی ہے کہ اس کو سنوارا جائے اور یہی حال چھوٹی داڑھی کا ہے۔

٤- كان رسول الله صلى الله عليه وسلم فى المسجد فدخل رجل ثائر الراس واللحية فاشار اليه رسول الله صلى الله عليه وسلم بيده ان اخرج كانه يعنى اصلاح شعر راسه ولحيته ففعل الرجل ثم رجع فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم اليس هذا خيرا من ان ياتى احدكم ثائر الراس كانه شيطان. (موطا امام مالک، ص ۳۷۶ و مشکوٰۃ: ص ۳۲۸)

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تھے، پس ایک شخص پراگندہ سر اور داڑھی داخل ہوا تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکل جانے کا حکم دیا۔ آپ کا مقصد یہ تھا کہ اپنے سر اور داڑھی کے بالوں کو سنوارے تو اس نے ویسا ہی کیا۔ پھر لوٹ کر آیا تو آپ نے فرمایا کہ کیا یہ اس سے بہتر نہیں ہے کہ تم میں سے کوئی پراگندہ بال اس طرح آئے کہ گویا کہ وہ شیطان ہے۔"

ظاہر ہے کہ داڑھی اور سر کے بالوں میں پراگندگی جب ہی ہوسکتی ہے جب کہ وہ

دراز ہوں خس خسی یا چھوٹے بالوں میں نہ پراگندگی ہوتی ہے نہ ان کے سنوارنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور نہ وہ سنور سکتے ہیں۔

۵-عن عائشة رضی اللّٰه عنها قالت قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم عشر من الفطرة قص الشارب واعفاء اللحیة والسواك والاستنشاق بالماء وقص الاظفار وغسل البراجم ونتف الابط وحلق العانة وانتقاص الماء یعنی الاستنجاء. الحدیث. یعنی دس چیزیں فطرت میں سے ہیں موچھوں کا کترنا اور داڑھی کا بڑھانا اور مسواک کرنا۔

(ابن ماجہ: ص ۲۵، مسلم: ص ۱۲۹، ابوداؤد: ص ۸)

اس حدیث میں جو کہ نہایت قوی روایت ہے، دس چیزوں کو جن میں سے داڑھی کا بڑھانا اور مونچھوں کا کتروانا بھی ہے، فطرت بتلایا ہے اور فطرت عرف شرع میں ان امور کو کہا جاتا ہے جو کہ تمام انبیا اور رسولوں کی معمول بہ اور متفق علیہ ہیں اور ہم کو ان پر عمل کرنے کا حکم ہے۔صاحب مجمع البحار صفحہ ۶۵-اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

عشرة من الفطرة ای من السنة ای سنن الانبیاء علیهم السلام التی اُمرنا بالاقتداء بهم فیهارك، ای من السنة القدیمة التی.....اختارها الانبیاء علیهم السلام واتفقت علیها الشرایع فكانها امر جبلی فطروا علیه.....الخ

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ شرح مسلم صفحہ ۱۲۸ میں فرماتے ہیں: قالوا ومعناه انها من سنن الانبیاء صلوات اللّٰه وسلامه علیهم. اس حدیث سے صاف ظاہر ہو گیا کہ داڑھی بڑھانے کا تمام شریعتوں میں حکم تھا اور یہی سنت تمام انبیائے علیہم السلام کی رہی ہے اور چوں کہ حضرت ہارون علیہ السلام کی داڑھی کم از کم ایک قبضہ تھی جیسا کہ ہم پیچھے کہہ آئے ہیں تو یقیناً تمام انبیا علیہم السلام اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی داڑھی بھی کم از کم ایک مشت ضرور تھی اور چوں کہ ہم کو ان انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کی اقتدا کرنے کا حکم کیا گیا ہے۔اُولٰئِكَ الَّذِیْنَ هَدَی اللّٰهُ فَبِهُدٰاهُمُ اقْتَدِهْ. ان لیے ہم کو بھی اس امر یک مشت میں ان کا اقتدا کرنا ہوگا۔

۶-عن ابن عمر رضی اللّٰہ عنہما عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال خالفو المشرکین وفروا اللحی واحفو الشوارب وکان ابن عمر اذا حج اواعتمر قبض لحیتہ لما فضل اخذہ. (باب اعفاء اللحی عفوا کثر واو کثرت اموالھم) وبسندہ عن ابن عمر رضی اللّٰہ عنہما قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم انھکو الشوارب واعفو اللحی. (صحیح بخاری: ص ۸۷۵۔ نسائی: ص ۷۔ مسلم: ص ۱۲۹۔ ابوداؤد: ص ۲۳۱)

اس حدیث صحیح میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے داڑھی کے مطلقاً بڑھانے کا حکم کیا ہے، جس مین کوئی حد مقرر نہیں فرمائی گئی، جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ داڑھی کو بڑھاتے ہی رہنا چاہیے، اگر چہ وہ بڑھ کر پاؤں.... زمین تک پہنچ جائے۔ چناں چہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

والمختار ترکھا علی حالھا وان لایتعرض لھا بتقصیر ولا غیرہ.

امام طبرانیؒ فرماتے ہیں:

ذھب قوم الی ظاھر الحدیث فکر ھو اتناول شیئ من اللحیۃ من طولھا وعن عرضھا. (فتح الباری: جلد ۱۰، ص ۲۹۶)

مگر چوں کہ اس طرح کا عمل بدنمائی پیدا کرتا ہے اور بسا اوقات صورت بگڑ جاتی ہے اور لوگوں کو استہزا اور تذلیل کا موقع ملتا ہے اور یہ چیز جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ناپسند تھی، نیز آپ اپنی داڑھی کے طول وعرض سے کترا کرتے تھے، اس لیے اس کی حد معلوم کرنی ضروری سمجھی گئی۔ چوں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے افعال واقوال کے مشاہدہ کرنے والے ہیں، اس لیے ان کے عمل کو اس بارے میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ترازو بنایا ہے اور حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما جو کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے فدائی ہیں اور آپ کی سنتوں کی پیروی میں نہایت زیادہ پیش پیش رہنے والے ہیں، ان کے عمل کو بہ طور معیار پیش کیا ہے۔

وكان ابن عمر اذا حج او اعتمر قبض على لحيته فما فضل اخذه.

''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما جب حج یا عمرے سے فارغ ہوتے تھے تو اپنی داڑھی کو مٹھی سے پکڑ لیتے تھے، جو حصہ زاید ہوتا تھا اس کو کتروا دیتے تھے۔''

جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عرض اور طول میں داڑھی کا کترنا اسی مقدار اور کیفیت سے ہوتا تھا۔ علاوہ ازیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بھی ایسا ہی کرتے تھے۔ حافظ ابن حجرؒ فتح الباری میں طبری سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وقال قوم اذا زاد على القبضه يوخذ الزايد ثم ساق بسند الى ابن عمر انه فعل ذلك بزجل ومن طريق ابى هريرة انه فعله. (فتح الباری: جلد۱۰، ص۶۹۶)

''یعنی ایک جماعت کہتی ہے کہ داڑھی جب ایک مشت سے زاید ہو جائے تو اس زاید کو کتر دیا جائے، پھر (طبری) نے اپنی سند سے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔''

اسی عمل اور طریقے کو فقہائے حنفیہ اور شافعیہ وغیرہ نے کتب فقہ وغیرہ میں ذکر فرمایا ہے۔

۷- عن جابر رضى الله عنه قال كنا تعفى السبال الا فى حج او عمرة. (ابوداؤد: جلد۲، ص۲۲۰)

''یعنی ہم لوگ داڑھی کے اگلے اور نکلنے والے حصے کو بڑھا ہوا رکھتے تھے، مگر حج اور عمرے میں۔ یعنی حج اور عمرہ سے فارغ ہو کر کتر دیا کرتے تھے۔''

جس کی تفصیل حضرت ابن عمرؓ کے عمل سے ہو گئی ہے۔ اس حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجرؒ شرح بخاری: جلد۱۰، صفحہ ۲۹۹ میں فرماتے ہیں:

واخرج أبو داؤد من حديث جابر بسند حسن قال كنا نعفى السبال الا فى حج او عمرة وقوله نعفى بالضم اوله و تشديد الفاء اى نتركه وافراً وهذا يؤيد ما نقل عن ابن عمر

فان السبال بكسر المهمله وتخفيف الموحده جمع سبلة بفتحتين وهى ماطال من شعر اللحية فاشار جابر الى انهم يقصرون منها فى النسك.

یہ حدیث صاف طور پر بتلا رہی ہے کہ عام صحابہ کرامؓ تمام سال میں داڑھی کا اگلا اور لابنا حصہ کترواتے نہیں تھے، ہاں جب حج یا عمرہ کرتے تھے تو ایک مشت سے زاید حصے کو کتروا دیتے تھے۔

۸- عن يزيد الفارسى وكان يكتب المصاحف قال رايت النبى صلى الله عليه وسلم فى المنام زمن ابن عباس فقلت لابن عباس انى رايت رسول الله صلى الله عليه وسلم فى النوم فقال ابن عباس ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يقول ان الشيطان لايستطيع ان يشتبه لى فمن رآنى فى النوم رآنى هل تستطيع ان تنعت هذا الرجل الذى رايتهٗ فى النوم قال نعم انعت لك رجلابين الرجلين جسمه ولحمه الى البياض اكحل العينين حسن الضحك جميل دوائر الوجه قد ملأت لحيته مابين هذه الى هذه قد ملاء ت نحره قال عوف ولا ادرى وكان مع هذا لنعت فقال ابن عباس لو رأيته فى اليقظة مااستطعت ان تنعتهٗ فوق هذا.

(ترمذی فی الشمائل: ص ۳۰)

"یعنی یزید فارسی جو کہ مصاحف کو لکھا کرتے تھے، انھوں نے کہا کہ میں نے حضرت ابن عباسؓ کے زمانے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا تو میں نے ابن عباسؓ سے ذکر کیا کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا ہے، تو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ شیطان میری صورت نہیں بنا سکتا، اس لیے جس شخص نے بھی مجھ کو خواب میں دیکھا ہے اس نے مجھ ہی کو دیکھا ہے۔ کیا تم اس شخص کا جس کو خواب میں دیکھا ہے حلیہ بیان کر سکتے ہو؟

میں نے کہا ہاں، وہ متوسط بدن اور قامت کا تھا، گندم گوں، سفیدی نائل، سرگیں آنکھوں والا، اچھا ہنسنے والا، چہرے کے خوب صورت دایروں والا، اس کی داڑھی نے یہاں سے یہاں تک (دائیں سے بائیں تک کے حصے کو بھر دیا ہے اور سینے کو بھر دیا ہے، پہلے کلام میں داڑھی کی چوڑائی اور دوسرے میں لمبائی بتلائی)۔

(راوی عوف نے کہا کہ اس کے علاوہ جو چیزیں حلیے کی ذکر کی تھیں ان کو میں اس وقت نہیں جانتا یعنی بھول گیا) تو حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اگر تم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جاگتے ہوئے دیکھتے تو اس سے زیادہ بیان نہ کر سکتے۔"

یہ روایت صاف طور پر بتلا رہی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی داڑھی لامبی اور چوڑی اتنی تھی کہ سینۂ مبارک کی لمبائی اور چوڑائی کو اس نے ڈھانک رکھا تھا۔

(الف) ان روایات معتبرہ پر غور فرمائیے آیا ان سے وہ بات ظاہر ہوتی ہے جس کو آپ نے ترجمان سے نقل فرمایا یا اس کے برعکس؟ سابقین انبیا علیہم السلام سبھوں کا عمل کم از کم ایک مشت بلکہ اس سے زاید داڑھی رکھنے کا ظاہر ہوتا ہے۔

(ب) نیز جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی داڑھی مبارک کم از کم ایک مشت بلکہ اس سے زاید اتنی ثابت ہوتی ہے جس میں تخلیل فرماتے تھے، کنگھی سے درست فرمایا کرتے تھے، وہ اتنی بڑی اور گنجان تھی کہ اس نے سینۂ مبارک کے اوپر کے حصے کے طول و عرض کو بھر لیا تھا۔

(ج) حضرت عمار ابن یاسر، حضرت عبداللہ ابن عمر، حضرت ابو ہریرہ، حضرت جابر رضی اللہ عنہم سے صراحتاً یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک مشت یا اس سے زاید داڑھی رکھتے اور رکھواتے تھے۔

(د) تمام صحابہؓ کا یہی عمل ہونا التزاماً ثابت ہوتا ہے، کیوں کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ داڑھی لمبی رکھتے تھے، بہ جز حج اور عمرہ کے کترواتے نہیں تھے۔

(ہ) جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام صحابۂ کرامؓ اور امت کو داڑھی بڑھانے کا بلا تحدید و تقید ارشاد اور حکم فرمایا ہے۔

(و) اس عمل کو بلا تحدید مسلمانوں کے لیے مابہ الامتیاز قرار دیا ہے جو کہ ان کا مخصوص شعار اور یونی فارم ہوگا، نہ منڈانا جایز ہوگا نہ شس جسی رکھنا نہ چھوٹی رکھنا۔

ان تصریحات کے ہوتے ہوئے مودودی صاحب کا یہ فرمانا (جو آپ ذکر فرماتے ہیں) بالکل غلط ہے۔ ناواقفیت کی وجہ سے یا نفسانی خواہشات سے ایسا واقع ہوا ہے۔ فقہاے حنفیہ، شافعیہ وغیرہ کی تصریحات پر آپ کو عمل کرنا چاہیے۔ مودودی صاحب کی تصانیف اس قسم کی غلطیوں سے بھری ہوئی ہیں، ان کے مطالعے سے بچنا چاہیے۔

مودودی صاحب علومِ دینیہ کے فاضل نہیں ہیں، آپ کا یہ فرمانا:

"جب مولانا مودودی جیسے فاضل نے یہ کہا کہ چھوٹا اور بڑا ہونا برابر ہے تو منڈوانا بھی کوئی حرج نہیں، کیوں کہ یہ علما کا اپنی طرف سے اضافہ ہے، ملک کے رواج کے مطابق رکھ بھی سکتا ہے اور منڈوا بھی سکتا ہے۔"

خود ان کی تصریح کے خلاف ہے وہ کسی مشہور درس گاہ کے سند یافتہ نہیں ہیں۔ نہ کسی ایسی درس گاہ میں انھوں نے پڑھا ہے نہ کسی مشہور دینی فاضل کے یہاں علوم دینیہ کی تحصیل کی ہے؟ ان امور کا خود ان کو اور ان کے متبعین کو اقرار ہے۔ ان کا مبلغ علم صرف مطالعہ ہے۔ اس پر آپ کا ارشاد کہ "منڈوانا بھی کوئی حرج نہیں رکھتا، علما نے اپنی طرف سے اضافہ کر دیا ہے۔" انتہائی ظلم اور علما سے بہت شنیع بدظنی ہے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد خالفو المشرکین قصو الشوارب وفروا اللحی. سے صریح بغاوت ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہم کو اور تمام مسلمانوں کو ہدایت عطا فرمائے۔ آمین

مودودیوں کا اتباع کتاب وسنت کا ڈھول پیٹنا اور اس طرح سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور عملِ صحابہ کی مخالفت کرنا انتہائی تعجب خیز ہے۔ والی اللہ المشتکی

والسلام

ننگِ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ

۱۵ر محرم الحرام ۱۳۷۱ھ / ۱۶ر نومبر ۱۹۵۱ء

(مکتوب نمبر ۵۰، مکتوبات شیخ الاسلام: جلد چہارم، ص ۱۷۸ تا ۱۸۷)

اس مکتوبِ گرامی پر مرتب مولانا نجم الدین اصلاحی کے قلم سے یہ حاشیہ ہے:

حاشیہ ❶: شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کے تبحر علمی کا یہ ایک ادنا کرشمہ ہے۔ کتاب وسنت اور صحابہؓ کی زندگی پر عبور واطلاع کے بغیر مدعی امامت وامارت ہونا دین اور شریعت کی توہین کے مترادف ہے، بلا اس مبلغ علم اور سطحی معلومات کے ساتھ مسلمانوں کی قیادت کا نتیجہ سوائے گمراہی پھیلنے اور پھیلانے کے اور دوسرا کیا ہوگا۔ یہ لیڈر کی قسم کے مولوی دنیا اور دین کے لیے سب سے بڑی مصیبت ہیں جس کی بہتات پاکستان کے نبوت خیز علاقوں میں بہت ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں پر رحم فرمائے۔ اعفا اللحیۃ کے نام سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا رسالہ شائع ہو چکا ہے، مکتبہ دینیہ دیوبند سے ملتا ہے ضرور ملاحظہ فرمایا جائے بہت ہی پر از معلومات رسالہ ہے۔ (یہی رسالہ مکتبہ رشیدیہ، اردو بازار۔ کراچی نے ''جمال مسلم'' نامی کتاب میں مل سکتا ہے)۔

مجتہدین ائمہ اربعہ کے اقوال کا خلاصہ ان کی کتابوں سے ہم درج کر کے یہ ظاہر کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کا فتویٰ شریعت کے معاملے میں ایک اناڑی کا فتویٰ ہے اور ان کے حوارئین ومویدین ان سے کہیں زیادہ ناواقف ہیں اور کم علم ہیں۔ جملہ مسایل حلت وحرمت، جواز وعدم جواز پر شریعت کا کوئی حکم ائمہ اربعہ کی تصریحات سے خالی نہیں۔ حنفیہ کا مذہب داڑھی کے بارے میں یہ ہے کہ اس کا کاٹنا حرام ہے۔ (ملاحظہ ہو درمختار) نہایہ میں قبضہ سے زاید کو کاٹنے کا جواز ہے۔ مالکیہ کا مذہب یہ ہے کہ داڑھی کا منڈانا اور کترانا اگر مثلہ کی صورت اختیار کر لے حرام ہے۔ ہاں اگر زیادہ بڑھ جائے اور کترنے سے مثلہ کی صورت نہ پیدا ہو تو خلاف اولا ہے (ملاحظہ ہو شرح الرسالۃ لابی الحسن وحاشیۃ للعدوی) شوافع کا مذہب (جیسا کہ ازرعیؒ نے کتاب الام کے حوالے سے لکھا ہے) حرمت کا ہے (ملاحظہ ہو ابداع مطبوعہ مصر) حنابلہ کا یہ مذہب ہے کہ داڑھی منڈانا حرام ہے (ملاحظہ ہو شرح للنبھتی و شرح منظومۃ الآداب) ان تصریحات کے خلاف جو بکتا ہے وہ بہ قول صاحب الابداع سفہ وضلالۃ اوفسق وجہالۃ اور غفلۃ عن ہدی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ (اصلاحی)

عالمی علما کانفرنس۔ کراچی:

۳؍دسمبر ۱۹۵۱ء: آیندہ ماہ کراچی میں عالمی علما کانفرنس کے دعوت نامہ کے سلسلے میں جنرل سیکرٹری ڈاکٹر منور الحسن انصاری اور اسسٹنٹ سیکرٹری مسٹر ظفر احمد آیندہ ہفتہ مشرق وسطیٰ کے دورے پر جا رہے ہیں۔ یہ ڈاکٹر مصدق (ایران) اور مفتی اعظم فلسطین ودیگر علما کو

دعوتِ شرکت دیں گے۔

ہندوستان سے مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی اور مفتی کفایت اللہ کو مدعو کیا ہے۔(مولانا آزاد- ایک سیاسی ڈائری: ص ۴۷۵)

۱۹۵۱ء کے انتخابات اور اس کے بعد!

انتخاب میں قیوم خان کی دھاندلیوں کی داستان بڑی اذیت ناک ہے۔ وہ صوبۂ سرحد کا مطلق العنان حکم ران تھا۔ اس کے سامنے مرکز کو بھی دم مارنے کی ہمت نہ تھی۔ چناں چہ ۱۹۵۱ء کے صوبائی انتخاب میں قیوم خان کے امیدواروں کے ہاتھوں مسلم لیگ مرکزی پارلیمانی بورڈ کے اٹھارہ ٹکٹ یافتہ امیدواروں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ مرکزی جنرل سیکرٹری یوسف خٹک کو بھی قیوم خان کے امیدوار نے شکست دے دی تھی، مگر مرکزی مسلم لیگ کے کان پر جوں تک نہ رینگی تھی۔ جب قیوم خان کی قہر مانیوں سے مسلم لیگی محفوظ نہ تھے اور مرکزی قیادت بے بس تھی تو غیر لیگیوں پر اس نے کیا کیا مظالم نہ توڑے ہوں گے؟ اور سرخ پوشوں کی سیاسی قوت کو ختم کرنے کے لیے کیا کچھ نہ کیا ہوگا؟ حسن جعفری کے مطابق ۱۹۵۱ء کے صوبائی عام انتخابات میں اس ''شیرِ سرحد'' نے سرکاری درندگی کا جو مظاہرہ کیا وہ فی الحقیقت فقید المثال تھا۔ (ص ۲۱۴) اس کی دو حلقوں سے بلا مقابلہ کامیابی کی حقیقت یہ تھی کہ ہزارہ کے حلقے سے اس نے مخالف امیدوار کو گرفتار کر لیا تھا اور پشاور چھاؤنی کے حلقے سے حریف امیدوار کے کاغذات نام زدگی کی تائید کرنے والے ووٹر کو راتوں رات اغوا کر لیا گیا تھا اور اگلے روز اس سے بیان دلوایا گیا کہ میں نے کاغذات نام زدگی پر دستخط لاعلمی کی بنا پر کیے اور مجھے دھوکا دیا گیا۔ (ایضاً ص ۱۷۹)

نیشنل عوامی پارٹی کے صدر عبدالولی خان نے قومی اسمبلی میں قیوم خان اور مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے مظالم کی داستان بیان کی، جسے سن کر ہر شریف آدمی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے کہ ایک نو بیاہتا جوڑے کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا۔ ان کے گھر کا سامان لوٹ لیا گیا۔ یہاں تک کہ دلہن کے تن سے عروسی جوڑا زبردستی اتروا کر نیشنل گارڈ والے لے گئے تھے۔ قیوم خان اس موقع پر ایوان میں موجود تھے۔ انھوں نے ولی خان کی زبانی حقیقت حال سنی مگر تردید نہ کر سکے تھے۔

حسن جعفر زیدی نے لکھا ہے کہ

"قیوم خان نے سرخ پوشوں سے فارغ ہونے کے بعد ان مسلم لیگیوں کی طرف رخ کیا جو کسی نہ کسی وقت اور کسی نہ کسی طرح اس کے اقتدار کے لیے خطرہ بن سکتے تھے۔ اس نے پیر مانکی شریف کے علاوہ کئی مسلم لیگیوں کو صوبے سے بے دخل کر دیا اور پورے صوبے میں اپنے حقیقی یا مصنوعی سیاسی مخالفین کے خلاف مار دھاڑ اور پکڑ دھکڑ کا ایسا سلسلہ شروع کیا کہ سرحد کے عوام ہری سنگھ نلوہ کا استبدادی زمانہ بھول گئے تھے۔"

(پختون قوم اور باچا خان: ص۲۱۴)

ہندوستان کی مردم شماری:

۱۹۵۱ء: کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان کی کل آبادی ۳۶ کروڑ چھ لاکھ ۷۴ ہزار تین سو چورانوے ہے۔ اس میں مسلمانوں کی تعداد تین کروڑ چونسٹھ لاکھ ستتر ہزار آٹھ سو اکتالیس ہے۔ (مدینہ۔ بجنور: ۲۸ر مئی ۱۹۵۳ء)

۱۹۵۲ء

ہندوستان کی ترقی اور مشکلات کی راہ اور عزائم — مولانا آزاد کا بیان:

۱۳ار جنوری ۱۹۵۲ء: مرکزی حکومت کے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں کہ کانگریس جو کچھ کرنا چاہتی تھی وہ سب تو نہیں کر سکی، لیکن پھر بھی اس نے جو کچھ کیا ہے وہ کسی طرح کم نہیں ہے۔

چھ سال کی جنگ عظیم کے خاتمے پر جب ہندوستان کو آزادی ملی اس وقت یہاں تباہی اور بربادی پھیلی تھی، ہماری آزادی کا پہلا دن بھی چین اور سکھ کا دن نہ تھا۔

ہم نے جس طرح آزادی پائی دنیا کی تاریخ میں ایسی مثال نہیں ملتی۔ ہمیں ڈیڑھ سو سال کی پرانی سرکاری مشینری ہی کے ذریعے نظامِ حکومت چلانا پڑا۔ پرانے افسر اپنے دماغوں کو نہ بدل سکے صرف وزرا بدل گئے۔

ہم اپنی پالیسیوں اور ترقی کی تدبیروں پر غور کر رہے تھے کہ دفعتہً لاکھوں پرشارتھیوں اور خانماں برباد لوگوں کا سوال اُٹھ کھڑا ہوا، جنہیں خوراک اور عافیت بہم پہنچانا فرض اوّلین تھا۔ اس سلسلے میں ہم چار سال سے منہمک ہیں۔ ایک ارب رُپیہ خرچ کر چکے ہیں اور ابھی اس سے زاید رقم درکار ہے۔

بدقسمتی سے کشمیر کا مسئلہ اچانک اس وقت سامنے آ گیا جب ہم فوجی بجٹ پر کم رُپیہ خرچ کرنے کی بات سوچ رہے تھے۔ ہمیں اپنی سرحدوں کی حفاظت بھی کرنا ہے۔ تین ارب سالانہ کل آمدنی میں سے ایک ارب ستر کروڑ رُپیہ سالانہ ڈیفنس پر اور چالیس کروڑ رُپیہ پرشارتھیوں پر خرچ ہوتا ہے۔ ہم نے اپنی بہت سی صنعتی و حرفتی اسکیمیں تکمیل کو پہنچادیں اور بہت سی ایسی ہیں جن پر عمل ہو رہا ہے۔ ہمیں گھبرانا نہیں چاہیے اور خود اعتمادی سے کام لینا چاہیے۔ گھریلو دھندوں کی طرف بھی مرکزی و صوبائی حکومتیں پورا دھیان دے رہی ہیں۔ کھڑگ پور میں ایک ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ کھول دیا گیا ہے جس میں تین ہزار کاریگروں کو ٹریننگ دی جا سکے گی، فی الحال پانچ سو کاریگر ٹریننگ پا رہے ہیں۔

تعلیم کا سوال بھی ایک اہم سوال ہے۔ نیچی جماعتوں کو ترقی دیے بغیر ملک آگے نہیں بڑھ سکتا، پہلے صرف پندرہ فیصدی لوگ خواندہ تھے لیکن اب اس سے کہیں زیادہ ہیں۔ ہم کسانوں کے رہن سہن کا معیار بڑھانا چاہتے ہیں، اس لیے انھیں خواندہ بنانا ضروری ہے۔ ہندی ہماری راشٹریہ بھاشا یعنی ملکی زبان ہے، لیکن ہمارے ملک میں پندرہ اور زبانیں بولی اور لکھی جاتی ہیں۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ تنگ خیالی ہر ایک بات کے لیے زہر ہے۔

الیکشن میں کانگریس نے اپنے امیدوار مقاصد کو سمجھ کر اور سامنے رکھ کر کھڑے کیے ہیں۔ ووٹروں کو بھی یہ لازم ہے کہ وہ سوچ سمجھ کر اپنے ووٹ کو مستحق پارٹی کے حق میں استعمال کریں جو ساٹھ پینسٹھ سال سے ملک کی خدمت کر رہی ہے۔

(مدینہ۔بجنور: ۱۳ر جنوری ۱۹۵۲ء، ص ۱)

۱۷ر جنوری ۱۹۵۲ء: دیو بند ۱۱ر جنوری...... مجھے معلوم ہوا ہے کہ مفاد پرست لوگ مجھ سے غلط باتیں منسوب کر کے دوستوں کو دھوکا دے رہے ہیں۔ اس لیے میں اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ میرا جو بیان الجمعیۃ مورخہ ۲۹ر ستمبر ۱۹۵۱ء میں شایع ہوا ہے وہ میرا ہی ہے اور اشاعت ہی کے لیے دیا گیا تھا۔ میں اب تک اُسی پر قایم ہوں اور میرے خیالات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ میں تمام ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں سے پرزور اپیل کرتا ہوں کہ وہ صرف کانگریس کو ووٹ دیں، اسی میں ملک اور وطن کی بھلائی ہے اور صرف ایسا ہی کرنے سے ملک ترقی کر سکتا ہے۔ (مدینہ۔بجنور: ۱۷ر جنوری ۱۹۵۲ء، ص ۱)

آزاد ہندوستان کے پہلے انتخابات ـــ مولانا آزاد کی تقریر:

۱۷ر جنوری ۱۹۵۲ء: رام پور ۱۲ر جنوری، مولانا آزاد نے کل یہاں گاندھی میدان کے ایک عام جلسے میں تقریر کرتے ہوئے عوام کو مشورہ دیا کہ وہ اپنا ووٹ اس جماعت کو دیں جس نے ملک کے لیے ستر سال تک قربانیاں کی ہیں۔

مولانا آزاد نے کانگریس کی تاریخ کو بتاتے ہوئے کہا کہ اس نے خدمات، قربانی اور تاریخ کی ایک روایت قایم کر دی ہے۔ جب کانگریس برطانی شہنشاہیت سے آزادی کی جنگ لڑ رہی تھی تو ہندو مہا سبھا اور دوسری جماعتیں جو اس وقت عوام کے ہیرو ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں وہ نہ صرف کانگریس کی مخالفت کر رہی تھیں بلکہ وزارت کی گدیوں پر بیٹھ کر

برطانیہ کا ساتھ دے رہی تھیں۔

مولانا نے رائے دہندوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ایسی جماعتوں پر کیسے اعتبار کیا جا سکتا ہے، جن کی یہ روایت ہو کہ آزادی کی جنگ کی انھوں نے مخالفت کی ہو اور ملک کے دشمنوں کا ساتھ دیا ہو۔ مولانا نے یہ بھی کہا کہ کوئی جماعت کانگریس کی مخالفت اس خیال سے نہیں کر رہی ہے کہ وہ اپنی حکومت بنائے گی بلکہ اس کا مقصد ملک میں پارلیمنٹ اور اسمبلی کی نشستوں کا حاصل کرنا ہے۔

مولانا آزاد نے بتایا کہ کانگریس نے ملک کے لیے بہترین دستور بنایا اور بالغ رائے دہی کا حق عطا کیا، جو دنیا کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا اور آزادی حاصل ہونے کے بعد جتنے مختصر عرصے میں کانگریس نے ملک کی بھلائی کے لیے جیسے کام کیے ہیں ویسے کسی دوسرے ملک نے نہیں کیے۔

مخالف جماعتوں کے اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہ کانگریس نے اپنے پانچ سالہ دور حکومت میں ملک کے لیے کچھ نہیں کیا۔ مولانا آزاد نے کہا کہ ملک کی تاریخ لکھنے والے بتائیں گے کہ کانگریس نے اس ایمان داری اور سچائی سے ملک کی خدمت کی ہے۔ یہ ایک عظیم الشان کارنامہ تھا جو کانگریس نے اپنے محدود ذرائع کے باوجود انجام دیا۔

مولانا نے عوام سے اپیل کی کہ وہ ووٹ دیتے وقت ان باتوں کو ذہن میں رکھیں۔ مولانا نے ان دو آزاد امیدواروں کی تعریف کی جو کانگریسی امیدواروں کے حق میں دست بردار ہو گئے ہیں۔ (مدینہ۔ بجنور: ۷ار جنوری ۱۹۵۲ء، ص ۱)

پختون کانفرنس دہلی:

۸ر فروری ۱۹۵۲ء: پختون کانفرنس نئی دہلی میں شرکت کے لیے افغانستان کا ایک وفد ہندوستان آیا تھا۔ یہ وفد ۷ر فروری کو شب میں حضرت شیخ الاسلام کی زیارت کے لیے دیوبند پہنچا۔ ۸ر فروری کی صبح کو حضرت شیخ الاسلام کی خدمتِ بابرکت میں باریافت ہوا اور ملاقات و زیارت کی سعادت حاصل کی۔ حضرت نے وفد کی ملاقات سے بہت خوشی ظاہر فرمائی۔ آپ نے فرمایا اگر مجھے آپ کی تشریف آوری کا علم ہو جاتا تو ملاقات کے لیے خود دہلی پہنچ گیا ہوتا۔

حضرت نے سفر نامۂ اسیر مالٹا کی چار جلدیں مولانا فضل ربی (مقیم کابل) کے لیے تحفہ عنایت فرمائیں اور ایک طالب علم کو متعین فرمایا کہ وہ وفد کو دارالعلوم کی سیر کرائے۔
حضرت شیخ آج ہی کان پور تشریف لے جا رہے ہیں۔
(الجمعیۃ - دہلی: ۱۹ر ستمبر ۱۹۵۵ء، ص ۵)

الیکشن میں مولانا آزاد کی جیت:

۱۳ر فروری ۱۹۵۲ء: نئی دہلی، ۹ر فروری، آج مولانا آزاد کی کامیابی کا باضابطہ اعلان کر دیا گیا۔ مولانا آزاد کے حریف ہندو مہا سبھا کے امیدوار شری بیشن چندر سیٹھ تھے۔ مولانا آزاد نے ۱۰۸۱۸۰ ووٹ حاصل کیے، جب کہ ان کے مقابل امیدوار کو ۳۴۲۷ ووٹ ملے۔ اس طرح مولانا نے اپنے مقابل امیدوار سے ۳۴۷۵۳ ووٹ زیادہ حاصل کر کے لوک سبھا میں سیٹ حاصل کر لی۔ (مدینہ - بجنور: ۱۳ر فروری ۱۹۵۲ء)

پاکستان میں تحریک شراب بندی:

۱۷ر مئی ۱۹۵۲ء: کراچی، ۸ر مئی، کل رات مسجد آرام باغ میں مفتی محمد شفیع کی صدارت میں بعد نماز عشا ایک جلسۂ عام میں ایک قرارداد پاس کی گئی جس میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ کے خلاف کارروائی کرے۔
مفتی محمد شفیع نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ شراب پر پابندی عاید نہ کرنے کی آواز صرف ایک اخبار یا ایک شخص کی نہیں ہے بلکہ اس کی پشت پر وہ عنصر ہیں جو پاکستان میں اسلامی حکومت کا قیام پسند نہیں کرتے ہیں۔ انھوں نے قرآن و حدیث کے حوالے سے بتایا کہ شراب حرام ہے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاے راشدینؓ کے زمانے میں شراب قانونی طور پر ممنوع تھی۔ جماعت اسلامی، اہل حدیث اور جمعیت طلبا نے اسلام کے نمایندوں نے قرارداد کی موافقت میں تقریریں کیں۔ جماعت اسلامی کے نمایندے ماسٹر ممتاز صاحب کی تقریر کے دوران میں ایک شخص نے کھڑے ہو کر یہ کہا کہ جہاد شروع کر دو۔ اس پر مقرر نے کہا کہ وہ تقریر ختم کر لیں۔ بعد میں جہاد کرنا۔ (مدینہ - بجنور: ۱۷ر مئی ۱۹۵۲ء، ص ۵)

پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن اور حالات مابعد!

۳ر جون ۱۹۵۲ء: احرار یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ پانی سر

سے گزر چکا ہے اور میرزائی منہ زوری کے علاوہ سینہ زوری پر تل گئے ہیں، تو مولانا لال حسین اختر نے کراچی میں مختلف مکاتبِ فکر کے علما کی ایک میٹنگ بلائی۔ ان کے سامنے تمام واقعات رکھے اور ۳؍ جون ۱۹۵۲ء کو ایک مجلسِ مشاورت طلب کی۔ اس کے دعوت نامے پر مولانا احتشام الحق تھانوی، مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا یوسف کلکتوی اور مولانا لال حسین اختر کے دستخط تھے۔ اس مجلسِ مشاورت نے ذیل کے مطالبات مرتب کیے:

(۱) قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔

(۲) چودھری ظفر اللہ خاں کو وزیرِ خارجہ کے عہدے سے سبک دوش کیا جائے۔

(۳) تمام کلیدی عہدوں سے احمدیوں کو ہٹایا جائے۔

اس غرض سے آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن بلانے کا فیصلہ کیا گیا۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اجلاس کی صدارت فرمائی اور کنونشن منعقد کرنے کے لیے ایک بورڈ مقرر کیا گیا، اس کے ارکانِ حسبِ ذیل تھے:

علامہ سید سلیمان ندویؒ، مفتی محمد شفیع، مولانا عبدالحامد بدایونی، علامہ یوسف کلکتوی، علامہ مفتی صاحب داد، مولانا سلطان احمد، مولانا شاہ احمد نورانی، مولانا لال حسین اختر، الحاج ہاشم گزدر اور مفتی جعفر حسین مجتہد۔ مولانا احتشام الحق تھانوی کنوینر چنے گئے۔ الحاج محمد ہاشم گزدر کے مکان پر بورڈ کا اجلاس ۱۳؍ جولائی ۱۹۵۲ء کو ہوا۔ مندرجۂ ذیل چودہ جماعتوں کو آل پارٹیز کنونشن میں شمول کے لیے دعوت نامے جاری کرنے کا فیصلہ کیا گیا:

(۱) جمعیت علمائے پاکستان — (۲) جمعیت علمائے اسلام

(۳) جماعتِ اسلامی — (۴) تنظیم اہلِ سنت والجماعت

(۵) جمعیت اہلِ سنت — (۶) جمعیت اہلِ حدیث

(۷) مؤتمر اہلِ حدیث پنجاب — (۸) ادارہ تحفظِ حقوقِ شیعہ پنجاب

(۹) مجلسِ تحفظِ ختم نبوت — (۱۰) مجلسِ احرارِ اسلام

(۱۱) جمعیۃ العربیہ — (۱۲) جمعیۃ الفلاح

سید عطاء اللہ شاہ بخاری میرزائی سیاست کے اتار چڑھاؤ کا عمیق مطالعہ کر رہے تھے۔ انھوں نے رفقا کو ہدایت کی کہ ہر مکتبۂ خیال کے علما سے مل کر انھیں قادیانی امت کے عزائم سے آگاہ کریں۔ پھر اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے جو رائے سب کی ہو اس کے

مطابق عمل کیا جائے۔ اس غرض سے شاہ جی نے ۱۳ر جولائی ۱۹۵۲ء ہی کو لاہور میں آل مسلم پارٹیز کانفرنس منعقد کی جس میں صوبہ بھر کے علماو مشائخ نے شرکت کی۔ اس غرض سے جو دعوت نامہ جاری کیا گیا، اس پر مولانا غلام محمد ترنم، مفتی محمد حسن، مولانا احمد علی، مولانا محمد علی جالندھری، مولانا داوٗد غزنوی، مولانا نور الحسن بخاری اور سید مظفر علی شمسی کے دستخط تھے۔ اس کانفرنس میں سیدنا مہر علی شاہؒ کے فرزند ارجمند حضرت سید غلام محی الدین شاہ تشریف لائے۔ اس کانفرنس میں میرزائیوں کو اقلیت قرار دیے جانے، سر ظفر اللہ کو وزارتِ خارجہ سے ہٹائے جانے اور قادیانی افسروں کو کلیدی آسامیوں سے الگ کیے جانے کا مطالبہ کیا گیا۔ اِدھر کراچی میں ۱۳ر جولائی ہی کو اس امر کا فیصلہ کیا گیا کہ مسئلہ قادیانیت پر آخری غور و خوض کرنے کے لیے ۱۶ر ۱۷ر ۱۸ر جنوری ۱۹۵۳ء کو کراچی میں تمام مکاتب فکر کا کنونشن منعقد کیا جائے۔ اس ابتدائی اجتماع میں شرکت کے لیے مولانا ابوالحسنات قادری، شیخ حسام الدین، ماسٹر تاج الدین انصاری، اور مولانا مرتضیٰ احمد میکش لاہور سے کراچی گئے اور کنونشن کی تیاریوں کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ یہ کوئی معمولی چیز نہ تھی بلکہ مرزائیت کے شدید احتساب کی طرف ایک فیصلہ کن اقدام تھا، چوں کہ یہ سب کچھ احرار رہنماؤں کی مساعی سے ہو رہا تھا، لہٰذا مرزا بشیر الدین محمود احرار کے خلاف محاذ قایم کیے ہوئے تھے اور ان کی ملی بھگت سے احرار کے خلاف مقدمات قایم کیے جا رہے تھے۔ چناں چہ شیخ حسام الدین، ماسٹر تاج الدین انصاری اور سید عنایت اللہ شاہ بخاری وغیرہم گرفتار کیے گئے۔ اس افسر شاہی کا خمیازہ ۱۸ر جولائی ۱۹۵۲ء کو اہلِ ملتان نے بھگتا کہ تھانہ کپ کے باہر پولیس نے احتجاجی جلوس پر فائرنگ کی، جس سے تین آدمی شہید اور تیرہ زخمی ہو گئے۔ ان زخمیوں میں سے بھی تین ہسپتال میں دم توڑ گئے۔ لاہور ہائی کورٹ کے ایک جج کو انکوائری پر مامور کیا گیا۔ اس نے پولیس فائرنگ کی حمایت کی، لیکن ان شہیدوں کا خون رنگ لایا۔ تمام صوبے میں میرزائیوں کے خلاف غم و غصے کی لہر دوڑ گئی، حتیٰ کہ پنجاب مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ نے بھی میرزائیوں کو اقلیت قرار دینے کا ریزولیشن پاس کیا۔ اس سلسلے میں عوام کے جذبات کا یہ حال تھا کہ منیر انکوائری رپورٹ کے مطابق ۶ر مارچ ۱۹۵۳ء سے پہلے صوبہ بھر میں ۳۹۰ جلسے منعقد ہوئے تھے۔ جن میں سے ۱۶۷ کا اہتمام مجلسِ احرار کی مختلف شاخوں نے کیا اور ان میں محولہ بالا مطالبات کی تائید کی گئی۔ جو علما کراچی کانفرنس میں شریک ہوئے، وہ یہ تھے:

(۱) مولانا ابوالاعلیٰ مودودی — (۲) سید عطاء اللہ شاہ بخاری
(۳) مولانا ابوالحسنات قادری — (۴) مولانا محمد یوسف بنوری
(۵) مولانا احمد علی لاہوری — (۶) مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی
(۷) مولانا شمس الحق وزیر معارف قلات — (۸) خلیفہ حاجی ترنگ زئی، پشاور
(۹) پیر سرسینہ شریف ڈھاکہ — (۱۰) مولانا راغب احسن ایم اے ڈھاکہ
(۱۱) مولانا اطہر علی ڈھاکہ — (۱۲) مولانا سخاوت الانبیاء ڈھاکہ
(۱۳) مولانا محمد امین امیر جماعت ناجیہ (۱۴) مولانا عزیز الرحمٰن ناظم حزب اللہ ڈھاکہ
(۱۵) مفتی محمد حسن جامعہ اشرفیہ لاہور — (۱۶) مولانا محمد ادریس کاندھلوی
(۱۷) مولانا ظفر احمد عثمانی — (۱۸) علامہ سید سلیمان ندوی
(۱۹) مفتی محمد شفیع دیوبندی — (۲۰) مولانا سلطان احمد امیر جماعت اسلامی
(۲۱) مولانا مفتی صاحب داد خان صاحب سندھ مدرسہ کراچی
(۲۲) مولانا عبدالحامد بدایونی — (۲۳) مولانا محمد یوسف کلکتوی
(۲۴) مولانا محمد اسماعیل گوجرانوالہ — (۲۵) مولانا سید محمد داؤد غزنوی
(۲۶) مولانا محمد علی جالندھری — (۲۷) مولانا احتشام الحق تھانوی

(۱) اس کانفرنس میں خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم پاکستان کے رویے کو منفی قرار دے کر راست اقدام کا فیصلہ کیا گیا۔

(۲) قادیانی فرقے کے کامل مقاطعے کی تجویز پاس کی گئی۔

(۳) چوں کہ خواجہ ناظم الدین، سر ظفر اللہ خاں کو برطرف کرنے پر راضی نہ تھے، اس لیے ان سے استعفیٰ کا مطالبہ کیا گیا۔

(۴) کئی ایک مقتدر مسلمانوں اور مختلف مذہبی جماعتوں کے نمائندوں کی ایک جنرل کونسل بنائی گئی۔ اس میں سے پندرہ ممبروں کو مجلسِ عمل کا رکن قرار دیا گیا۔ پہلے آٹھ اور پھر سات ممبر منتخب کیے گئے، جو حسب ذیل تھے:

(۱) سید عطاء اللہ شاہ بخاری — (۲) مولانا ابوالحسنات قادری
(۳) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی — (۴) مولانا عبدالحامد بدایونی
(۵) حافظ کفایت حسین — (۶) پیر صاحب سرسینہ شریف مشرقی پاکستان

(۷) مولانا محمد یوسف کلکتوی (۸) مولانا احتشام الحق تھانوی
(۹) پیر غلام مجدد سرہندی (۱۰) مولانا نور الحسن
(۱۱) ماسٹر تاج الدین انصاری (۱۲) مولانا اختر علی خاں
(۱۳) مولانا محمد اسمٰعیل گوجرانوالہ (۱۴) سید مظفر علی شمسی
(۱۵) حاجی محمد امین سرحدی

پاکستان میں تحریک نفاذ اسلام:

۲۶ر جون ۱۹۵۲ء: بنیادی اصولوں کی کمیٹی نے سفارش کردی کہ اردو کو پاکستان کی سرکاری زبان قرار دیا جائے۔ بنگالی کے رسم الخط کو بدلنے کی تجویز جب مجید نظامی نے اپنے ایک اداریے میں کی تو الطاف حسین (ایڈیٹر ڈان کراچی) نے کہا کہ سردست اس مسئلے کو نہ اٹھایے، چوں کہ ڈھاکہ میں کمیٹی کی سفارش کے خلاف شدید ردعمل ہو رہا تھا۔ اس لیے الطاف صاحب نے اس تجویز کو بے وقت قرار دیا۔ مجید نظامی نے بنگلہ کے لئے عربی رسم الخط جسے خود بنگالی حروف قرآن کہتے تھے تجویز کیا تھا۔ بنگالی گھرانے اس سے واقف تھے اور ان کا بہت سا دینی لٹریچر اس رسم الخط میں تھا، بلکہ ایک وقت تھا کہ مسلمانوں کی بنگلہ اسی میں لکھی جاتی تھی۔

ڈھاکہ میں جب احتجاج نے تشویش ناک کی صورت اختیار کرلی تو نورالامین کی حکومت نے دفعہ ۱۴۴ نافذ کردی۔ طلبہ نے اس پابندی کو ۲۱ر فروری کو توڑا۔ پولیس سے تصادم ہوا اور تین طلبہ ہلاک ہوگئے۔ بنگلہ پرستوں نے اس سانحے پر ایک ایسی اردو دشمن تحریک چلائی کہ اردو بنگال سے قریب قریب جلاوطن ہوگئی۔ مرنے والے طلبہ کو شہادت کے مرتبے پر فائز کردیا۔ جہاں ان کا خون گرا تھا وہاں شہید مینار تعمیر ہوگیا۔ یہ مینار بعد میں زیارت گاہ خاص وعام بن گیا۔ ہر سال ۲۱ر فروری کے روز ہزاروں مرد وزن یہاں برہنہ پا آتے اور تجدید عہد کرتے۔ ڈھاکہ کا بیت المکرم اجتماع امت کے لیے وہ کچھ نہ کرسکا جو کچھ تشتت وافتراق کے لیے اس مینار نے کیا۔ (آہنگ بازگشت از محمد سعید: ص ۳۲۹)

امرت پتریکا کے خلاف احتجاج۔ حضرت شیخ الاسلام کی تقریر:

۱۷ر اگست ۱۹۵۲ء: دیوبند، ۱۲ر اگست، مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم

دیوبند کے زیر صدارت ''امرت پتریکا'' کے خلاف ایک احتجاجی جلسہ ہوا۔ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی شیخ الحدیث دارالعلوم وصدر جمعیت علماے ہند نے اپنی تقریر ایک آیت سے شروع کی اور کہا کہ

''کوئی عزت بغیر جنگ کے قایم نہیں رہ سکتی۔ اگر تمہاری مڈبھیڑ کسی کے ساتھ ہو جائے تو تم کو ڈٹ جانا چاہیے اور اپنا قدم پیچھے نہ ہٹانا چاہیے۔ چاہے تمہاری جان چلی جائے۔ مگر اپنے مقصد کے اوپر مضبوطی کے ساتھ قایم رہنا چاہیے۔ چاہے حالات کتنے ہی سنگین ہوں اور ناکامی کی صورت سامنے ہو لیکن تم کو کبھی ناامید اور مایوس نہ ہونا چاہیے۔''

حضرت شیخ الحدیث نے سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

''ہم نے احتجاجی جلسہ کیا تا کہ حکومت سن لے، اور اگر اس نے پروانہ کی تو کیا ہم خاموش بیٹھ جائیں گے؟ نہیں! ہم کو آگے بڑھنا ہے۔ اگر کوئی شنوائی نہ ہوئی تو ہم کو جیل جانا پڑے گا، قانون شکنی کرنی پڑے گی، مصیبتیں برداشت کرنی ہوں گی اور ممکن ہے کہ اس کے بعد بھی کچھ اور کرنا پڑے۔ آپ کو اس راہ میں بچوں کو، بیویوں کو اور گھربار کو چھوڑنا پڑے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کسی صورت میں برداشت نہیں کی جائے گی اور جو کچھ ہمارا مذہب ہم کو اجازت دے گا ہم وہ کریں گے۔ آپ کو تیار رہنا چاہیے۔''

(مدینہ، ۱۷ر اگست ۱۹۵۲ء)

روزانہ امرت پتریکا۔ الہ آباد کے جس مضمون کے خلاف حضرت شیخ الاسلام نے احتجاج فرمایا تھا، جو اخبار کے بچوں کے صفحے پر ۶ر اگست کو شائع ہوا تھا، اس توہین آمیز مضمون کے خلاف نہ صرف مسلمانوں میں اشتعال پیدا ہوا تھا بلکہ سنجیدہ اور پڑھے لکھے ہندوؤں نے بھی مضمون کے توہین آمیز اور غیر اخلاقی اسلوب کی شدت کو محسوس کیا تھا۔ چناں چہ اچاریہ جگل کشور، مسٹر ترلوکی سنگھ وغیرہ نے بھی اس پر اپنے دکھ اور افسوس کا اظہار کیا تھا۔ اچاریہ جگل کشور نے کہا:

''امرت پتریکا کی ۶ر اگست کی اشاعت میں بچوں کے کالم میں پیغمبر اسلام کے بارے میں انتہائی قابل اعتراض مضمون دیکھ کر مجھے انتہائی دکھ ہوا۔

یہ مضمون سخت قابلِ مذمت ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس مضمون نے جو بدمزگی نہ
صرف ہمارے مسلمان بھائیوں، بلکہ ہر معقولیت پسند انسان کے اندر پیدا کی
ہے اس کا تدارک کرنے کے لیے اس اخبار کے ایڈیٹر کوئی ضروری قدم
اٹھائیں گے۔" (مدینہ۔ بجنور: ۱۷راگست ۱۹۵۲ء)

دوسروں کے بزرگوں کا احترام کرو! حضرت شیخ الاسلام کی تقریر:

۲۱راگست ۱۹۵۲ء: سہارن پور، ۱۵راگست، جامع مسجد میں ایک عظیم الشان جلسہ حضرت مولانا حافظ عبداللطیف صاحب ناظم مدرسہ مظاہر العلوم وصدر جمعیت علمائے سہارن پور کی زیرِ صدارت ہوا۔ تکبیر کے فلک شگاف نعروں میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب تقریر کے لیے کھڑے ہوئے۔ آپ نے تقریر میں فرمایا ہر ایک مذہب اور مذہب کے پیشواؤں کا ادب اسلام کی تعلیم ہے۔ حکومت نے مذہبی پیشواؤں کی توہین کا سدِ باب نہ کیا تو اس کا مستقبل تاریک ہے۔ سمجھ دار، شریف اور عقل مند غیر مسلم بھی امرت پتریکا کی دریدہ دہنی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ ڈسپلن ہر مقصد کی کامیابی کے لیے ضروری ہے۔ کالی جھنڈیاں، ہڑتال اور جلوس جمعیت کے پروگرام کے ماتحت نہیں تھے۔

حضرات! آپ کو معلوم ہے کہ پانی سر سے گزر چکا ہے۔ احتجاج کے سلسلے میں جو تجویز آپ حضرات کو پڑھ کر سنائی گئی ہے اس کے الفاظ سے اہمیت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

لایومن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین.

جب حضرت عمرؓ نے اس حدیث کو سنا تو فرمایا کہ آپ میرے نزدیک ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں، مگر میری جان سے زیادہ نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا ومن نفسک یا عمر (اپنی جان سے بھی) اے عمر۔ حضرت عمرؓ نے سننے کے بعد تھوڑی دیر سوچا اور پھر دل کو مضبوط کر کے فرمایا۔ یا رسول اللہ آپ میری جان سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔ انت یارسول اللہ احب الی من نفسی۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ الآن یا عمر (ہاں اس وقت عمرؓ) اسی مضمون کی اور روایات بھی

موجود ہیں جن میں ارشاد ہوا ہے کہ تاوقتے کہ میں جان و مال سے اور اولاد سے زیادہ محبوب اور عزیز نہ ہوں اس وقت تک ایمان مکمل نہیں ہوتا۔

عمل خواہ کتنا ہی کیا ہوا ہو، لیکن اگر اس کے ایمان میں رسول کی محبت اور عظمت داخل ہے تو ہر تکلیف اور ہر مصیبت برداشت ہو سکتی ہے۔ مگر جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی اور توہین ایک لمحے کے لیے بھی برداشت نہیں ہو سکتی۔ ہم نے ہندوستان کے آزاد کرانے کے لیے ہزاروں مصایب برداشت کیے ہیں اور معلوم نہیں آیندہ بھی کتنے ہی مصایب برداشت کرنے پڑیں گے۔ لیکن خواہ مسلمان کتنا ہی کم زور ہو، شانِ نبوت میں یہ دریدہ دہنی کبھی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ ہمیں اسلام نے تعلیم دی اور حکم دیا ہے کہ ہر مذہب کی اور ہر مذہب کے پیشواؤں کی تعظیم کریں۔

فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی شخص اپنے ماں باپ کو گالی نہ دے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ حضرت! اپنے ماں باپ کو کون گالی دے سکتا ہے؟

حضرت نے ارشاد فرمایا کہ جب تم دوسرے کے ماں باپ کو گالی دو گے تو وہ تمہارے ماں باپ کو گالی دے گا۔ یعنی اپنے ماں باپ کو گالیاں دلوانے کے تم سبب بنو گے۔ قرآن حکیم نے بہت صاف صاف تعلیم دی ہے کہ تم کسی مذہب کے پیشواؤں کو برا بھلا مت کہو، ورنہ وہ تمہارے خدا کو برا کہیں گے۔ ہر ملک اور مذہب و قوم کا یہ طریقہ رہا ہے کہ انھوں نے دیگر مذاہب اور اس کے پیشواؤں کا احترام کیا ہے۔

روے زمین پر ہماری تعداد کچھ تھوڑی نہیں ہے۔ ہماری تعداد ۷۰ کروڑ ہے۔ ان ۷۰ کروڑ میں سے ایک فرد بھی شانِ نبوت میں ایسی توہین اور ایسی دریدہ دہنی کو ایک لمحے کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتا۔

حکومت کا فرض تھا کہ اس قسم کے واقعات پر جو حال میں پیش آچکے ہیں اور جن میں مسلمانوں کے مذہبی پیشواؤں کی شان میں گستاخیاں کی جا چکی ہیں۔ نہایت سختی کے ساتھ گستاخیاں کرنے والوں کو سزا دی جائے تا کہ کوئی بھی آیندہ جرأت نہ کر سکے۔ افسوس حکومت نے غفلت سے کام لیا۔ اگر اس نے اب بھی پوری قوت کے ساتھ کام نہ کیا اور اس دروازے کو پوری طرح بند نہ کیا تو میں کہوں گا کہ مستقبل حکومت کے لیے نہایت تاریک ہے۔ (مدینہ۔ بجنور: ۲۱ر اگست ۱۹۵۲ء، ص ۱)

حضرت شیخ الاسلام کی نصیحت:

اگست ۱۹۵۲ء: حکیم مولانا سید محمود الحسن (مظفر نگر) نے حضرت شیخ الاسلام کو ۶ر اگست ۱۹۵۲ء کو ایک خط لکھا تھا اور اب کانگریس میں شامل رہنے یا نہ رہنے کے بارے میں حضرت کی رائے عالی دریافت کی تھی۔ حضرت نے انھیں یہ جواب دیا:

"محترم المقام زید مجدکم

بعد از سلام مسنون آں کہ آپ مجھ سے زیادہ واقف کار اور سمجھ دار ہیں۔
استخارہ کیجیے اور جو کچھ سمجھ میں آئے، اس پر عمل کیجیے۔"

مولانا طاہر قاسمی کا انتقال:

۱۰ر اکتوبر ۱۹۵۲ء: ۵ر اکتوبر ۱۹۵۲ء کو تین بجے دیوبند میں مولانا محمد طاہر قاسمی کا انتقال ہوگیا۔ (الجمعیۃ-دہلی: ۱۰ر اکتوبر ۱۹۵۲ء، ص ۴)

محمد طاہر مرحوم قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے چھوٹے بھائی اور حافظ محمد احمد مرحوم کے بیٹے تھے۔

مجلس عاملہ جمعیت علمائے ہند کا اجلاس:

۱۷ر اکتوبر ۱۹۵۲ء: دہلی، ۱۲ر اکتوبر، مجلس عاملہ جمعیت علمائے ہند کا اجلاس آج ساڑھے آٹھ بجے صبح سے بارہ بجے تک جاری رہا۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی صدر جلسہ تھے۔ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد اجلاس کے شروع ہی میں تشریف لے آئے تھے۔

اس نشست میں بنیادی مذہبی تعلیم کے مسئلے کو حکومت ہند کے سامنے پیش کرنے کے لیے طریق کار طے کیا گیا ہے۔ اسی طرح اسپیشل میرج بل پر بھی غور کیا گیا، جو اس وقت ہند پارلیمنٹ میں پیش ہو چکا ہے اور عن قریب منظور ہو کر نافذ ہونے والا ہے۔ اس کی روشنی میں مسلمانوں کی بعض ایسی شادیاں بھی عمل میں آسکیں گی جو اسلام کی رو سے ناجائز ہوں گی اور پھر ان کا اثر وراثت پر پڑے گا۔ اس خاص پہلو کو دور کرنے کے لیے طے کیا گیا ہے کہ حکومت ہند کو توجہ دلائی جائے اور مسلمانوں کو اس سے مستثنیٰ کیا جائے۔

اسی طرح متعدد اخبارات اور رسایل میں اہانت مذہب اور اسلام اور بزرگانِ اسلام کی شان میں گستاخی کا جو سلسلہ جاری رہا ہے، آیندہ اس کے معقول اور موثر انسداد کے لیے یہ طے کیا گیا ہے کہ حکومت ہند کو توجہ دلا کر اس کی تکلیف دہ صورت حال کو مستقل طور پر ختم کیا جائے اور ایسے مجرمین کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے معقول قدم اٹھایا جائے تا کہ آیندہ کوئی ایسی جرأت نہ کر سکے۔

مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کی آبادکاری کا مسئلہ برابر تعطل میں پڑا ہوا ہے۔ اس سلسلے میں مجلس عاملہ نے مولانا لقاء اللہ عثمانی پانی پتی کے ایک مکتوب پر غور کیا اور طے کیا کہ حضرت مولانا احمد سعید صاحب، مولانا حفظ الرحمن صاحب اور مسٹر سید محمد جعفری پر مشتمل ایک وفد اس معاملے کو حضرت مولانا آزاد اور حکومت ہند کے سامنے پیش کرے اور کوئی موثر فیصلہ کن طریق کار اختیار کرنے پر زور دے۔ (مدینہ۔ بجنور: ۷ار اکتوبر ۱۹۵۲ء)

ناظم عمومی جمعیت علماے ہند کی اپیل:

۹ر نومبر ۱۹۵۲ء: مسلم وقف بل اور قاضی بل کے متعلق جمعیت علماے ہند کے ناظم عمومی مولانا حفظ الرحمن صاحب سیوہاروی کی ایک ضروری اپیل۔

(مدینہ۔ بجنور: ۹ر نومبر ۱۹۵۲ء)

نومبر میں حضرت شیخ الاسلام بمبئی تشریف لے گئے، وہاں دو دن قیام رہا، حضرت نے تقاریر فرمائیں۔ ایک تقریر میں حضرت نے فرمایا کہ ہندوستان علم وفن کا مرکز اور مستقر ہے۔ علم میں جامعیت اور تعمق صرف یہاں کا حصہ ہے۔ قاضی اطہر مبارک پوری نے حضرت کے افادات مرتب کر کے چھپوا دیے ہیں۔ (مدینہ۔ بجنور: ۲۱ر نومبر ۱۹۵۲ء)

شیخ الاسلام کی ایک بصیرت افروز تقریر:

۲ر دسمبر ۱۹۵۲ء: حضرت شیخ الاسلام نے دیوبند میں ایک نہایت فکر انگیز اور بصیرت افروز تقریر فرمائی تھی۔ یہ تقریر مدینہ، بجنور کی ۹ر دسمبر کی اشاعت میں نقل کی گئی ہے۔ تقریر یہ ہے:

"دیوبند ۲ر دسمبر، دینی تعلیم اور مدارس عربیہ پر تبصرہ کرتے ہوئے حضرت شیخ الاسلام

دامت برکاتہم نے فرمایا کہ ابھی کچھ ہی دن ہوئے کہ مسلمان اپنے خرچے سے ہندوستان میں لاکھوں مدارس اسلامیہ چلارہے تھے اور اس طرح علوم دینیہ اور اسلام کی خدمت کررہے تھے، لیکن حالات ہمیں اور سب مسلمانوں کو بتلارہے ہیں کہ بین الاقوامی معاشی بحران کی وجہ سے مسلمان اس قابل نہیں رہ گئے ہیں۔ایسی حالت میں اگر وقف بل منظور ہوجاتا ہے اور اوقاف کی آمدنی جایز طریقے پر خرچ ہوتی ہے تو یقیناً مدارس اور مکاتب اسلامیہ کا احیاو اِجرا ان کا پہلا اہم ترین اور جایز مصرف ہوگا اور اس طرح تمام ملک میں لاکھوں قرآن و حدیث کا درس دینے والے مدارس قایم رہ سکیں گے۔اس کے علاوہ ہزارہا مساجد اور مذہبی آثار کی مرمت اور خدمت کی صورتیں نکل سکیں گی۔اگر ہم اس قابل ہوجاتے ہیں کہ مکاتب میں اپنے خرچ پر دینی تعلیم کا انتظام کرسکیں تو ہم گورنمنٹ سے کہہ سکتے ہیں کہ جبریہ تعلیم میں مسلمان بچوں کی دینی تعلیم کا انتظام کیا جائے، جس کے مصارف ہم برداشت کریں گے۔لیکن غور کیجیے اور سوچیے کہ اگر اوقاف کی کروڑہا روپے کی آمدنی سے اسلامی ادارے محروم ہوگئے اور ان پر ناجایز قبضہ ہوگیا تو ان امور کے لیے کیا انتظام ہوگا؟

اسی طرح قاضی بل ہمارے لیے بے حد ضروری ہے۔روزمرہ سیکڑوں ایسے مسایل ہمارے سامنے آتے ہیں جن کا حل سوائے اس کے نہیں کہ مسلمان مفتی اور فقیہہ حاکم ان کا فیصلہ کرے اور اس پر عمل درآمد کیا جائے۔اگر یہ نہیں ہوتا تو خدا جانے کتنے معاملات میں مسلمان سے خلاف شرع امور سرزد ہوجاتے۔

ابھی بمبئی کے مسلم اوقاف پر ایسی کمیٹی مقرر کردی گئی ہے جس میں مسلم و غیر مسلم سب موجود ہیں اور وہ مسلم اوقاف کے علاوہ غیر مسلم پراپرٹیز کے بھی نگراں ہیں۔اس کا نتیجہ جو کچھ ہوگا وہ ظاہر ہے اور لاکھوں رُپے جن مصارف میں جس طرح خرچ ہوں گے وہ بھی مسلمانوں سے پوشیدہ نہیں، نیز حیدرآباد کے مسلم اوقاف کے لیے بھی ایک اسی قسم کی کمیٹی کی تجویز زیرِ غور ہے۔

حدیث شریف میں ارشاد ہے کہ تین چیزوں کا ثواب انسان کے لیے قیامت تک جاری رہتا ہے۔ایک اولاد صالح جو دعائے مغفرت کرے، دوسرے علم نافع، تیسرے صدقۂ جاریہ یعنی کوئی شخص کوئی جائیداد وغیرہ وقف کرے کہ جس کے ذریعے سے دینی کام انجام پائے اور عوام کو نفع پہنچے۔یہ تینوں امور ایسے فرمائے گئے ہیں جن سے انسان کو قیامت تک

ثواب ملتا رہتا ہے۔ مثلاً آپ کے سامنے ہزار ہا ایسے مدارس ہیں جن میں بچے قرآن شریف پڑھتے ہیں اور ان کے ذریعے عام مسلمانوں کو دینی احکام کا علم ہوتا ہے، غور فرمایئے کہ ان مدارس کی مدد کرنے والے یا ان کے لیے جائیدادیں وقف کرنے والے شخص کا اللہ کے یہاں کس قدر بلند مقام ہوگا (ان شاء اللہ)۔ ایک حافظ بچہ آج جو آپ کو حقیر معلوم ہوتا ہے کل رب العزت کی بارگاہ میں اسے اختیار دیا جائے گا کہ وہ دس ایسے شخصوں کی سفارش کرے جو عذاب کے مستحق ہوں اور وہ عذاب کے مستحق دس مسلمانوں کی بخشش کا سبب بن جائے گا۔ آج کل لوگ اپنے بچوں کو انگریزی تعلیم دلا کر خوش رہتے ہیں، ان کے فیشن سوٹ بوٹ اور انگریزی بال، والدین کی نافرمانی بلکہ پے در پے توہین و تذلیل کو معیارِ تہذیب سمجھتے ہیں۔ داڑھی اور سادہ زندگی، موٹا لباس اور موٹا کھانا کھانے کو حقیر نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ حال آں کہ کل اعمال کے جزا و سزا کا وقت آئے گا تو معلوم ہوگا کہ بچہ جو قرآن و حدیث کی تعلیم میں لگایا گیا تھا آج والدین اور اپنے بڑوں کے لیے ایسی حالت میں کام آرہا ہے جب کوئی مددگار نہیں ہو سکتا۔ اور وہ بچہ جو سوٹ بوٹ اور انگریزی بال کلین شیو سے مزین رہتا تھا، ایسے وقت میں باز پرس اور عذاب کا سبب بن رہا ہے۔ بہ ہر حال دینی مدارس جس قدر اشاعتِ دین کرتے ہیں اسی قدر واقف اور ان کی مدد کرنے والوں کے لیے ثواب اور فلاحِ اُخروی کا نتیجہ ثابت ہوتے ہیں۔ مگر افسوس کہ آج کل اوقاف ایسے متولیوں کے ہاتھ میں ہوتے ہیں کہ ان سے بدکاری اور جرائم کا کام لیا جاتا ہے۔ میری نگاہوں سے خود ایسے کئی اوقاف گزرے کہ مسجد کے لیے وقف ہیں، مگر مسجد میں جماعت نہیں ہوتی بلکہ اس میں جرائم اور قمار بازی ہوتی ہے۔ اس صورت میں واقف کو ثواب نہیں ملتا اور وقف کا مقصد فوت ہوتا ہے۔ اب اگر وقف بل منظور ہو جاتا ہے تو ان تمام برائیوں کا انسداد ہو سکتا ہے اور آیندہ کے لیے بڑی آسانیاں ہو جاتی ہیں۔

اسی طرح قاضی بل بھی مسلمانوں کے لیے ضروری ہے۔ یہ مسئلہ ہمارے لیے نیا نہیں، حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمتہ اللہ علیہ نے ایک مستقل کتاب اسی مسئلے پر لکھی ہے۔ اس کا نام ''الحلیۃ الناجزۃ'' ہے، اس میں وہی مسائل بیان کیے گئے ہیں جو مسلمانوں کے لیے انتہائی ضروری ہیں اور جن کا حل مشکل سے ملتا ہے۔ یہ تجویز ہمارے سامنے ۱۹۳۶ء سے ہے، مگر اس وقت اس کی تکمیل کی کوئی صورت نہ تھی اب امید ہو چلی ہے

کہ وہ تجویز پوری ہو سکے۔

بہ ہر حال میں تمام مسلمانوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وقف بل اور قاضی بل کی حمایت میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں اور گورنمنٹ کے چیف سیکرٹری کے پاس اپنی رائے بھیجیں، جلسے کر کے تجویز پاس کریں اور وہ اخبارات میں شایع کرائیں اور سیکرٹری کے پاس بھیجیں۔

جو لوگ اس کی مخالفت کر رہے ہیں وہ ناواقف ہیں اور ناسمجھ بھی، اور زیادہ تر اپنے ذاتی مفاد کے پیشِ نظر مخالفت کر رہے ہیں۔ ان کی باتوں میں آ کر اسلام اور دینی تعلیم کو نقصان نہ پہنچایئے اور جوش کے بجائے ہوش مندی سے سوچیے اور مسایل پر غور کرنے کی عادت ڈالیے۔

اس کے بعد حضرت شیخ نے مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کو یاد رکھنے کی اور اس کی نعمتوں کا شکریہ بھیجتے رہنے کی ہدایت فرماتے ہوئے کہا کہ ہم اللہ کی نعمتوں کا شمار نہیں کر سکتے۔ ہمارا ہر سانس اس کی نعمتوں سے بندھا ہوا ہے، مگر سخت افسوس کا مقام ہے کہ ہم زیادہ تر اللہ کو بھولتے جا رہے ہیں۔ ہر مصیبت اور ہر آفت سے وہی نجات دلا سکتا ہے اور وہی مدد کر سکتا ہے۔ سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ ہمارا خاتمہ ایمان پر ہو جائے۔ خدانخواستہ اگر ایمان پر خاتمہ نہ ہوا تو انتہائی عذاب اور ذلت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لہٰذا ہر وقت یہی دعا کرتے رہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کا خاتمہ ایمان پر فرمائے۔ آمین

۱۹۵۳ء

مفتی اعظم ہند کا سانحۂ انتقال — حضرت شیخ کی تعزیت:

یکم جنوری ۱۹۵۳ء: گزشتہ شب ساڑھے دس بجے مفتی اعظم ہند حضرت مولانا محمد کفایت اللہ شاہ جہان پوری ثم دہلوی کا انتقال ہو گیا۔ اور ان کے تنہا ایک وجود کے اس دنیا سے اٹھ جانے سے علم و بصیرت کا ایک پورے عہد کا خاتمہ ہو گیا۔ حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ ایک نادر الوجود علمی و دینی شخصیت کے مالک تھے۔ فقہ اسلامی میں ان کے پائے کی کوئی علمی شخصیت پورے عالم اسلامی میں موجود نہ تھی۔ وہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے نامور تلامذہ اور حضرت شیخ الاسلام کے رفقائے درس میں سے تھے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کے انتقال کی خبر آناً فاناً پورے ملک میں پھیل گئی۔ دیوبند میں یہ خبر شب ہی میں پہنچ گئی اور سیکڑوں افراد جن میں تلامذہ، اساتذہ، علمائے کرام اور سیاسی لوگ صبح کی پہلی گاڑی سے دہلی کے لیے روانہ ہو گئے۔ حضرت شیخ الاسلام پر اس حادثے کا خاص اثر ہوا تھا اور آپ بھی دہلی کے لیے روانہ ہو گئے تھے اور اگرچہ نماز جنازہ میں شریک نہیں ہو سکے تھے، لیکن تدفین میں شرکت کا موقع مل گیا تھا۔ حضرت شیخ الاسلام نے مفتی صاحبؒ کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار فرمایا تھا۔ حضرت کا یہ بیان مفتی صاحبؒ کے علمی مقام کی بلندی کی بھی ایک بڑی شہادت ہے۔ حضرت نے بیان میں فرمایا:

وَمَا كَانَ قَيْسٌ هُلْكُهُ هُلْكُ وَاحِدٍ
وَلٰكِنَّهُ أَرْكَانُ قَوْمٍ تَهَدَّمَا

"قیس کی وفات ایک آدمی کی وفات نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ قصرِ ملّت کے ستون گر گئے ہیں۔"

زین ماتم ار سپہر بہ قانوں گریستے
از چشم اختراں ہمہ شب خوں گریستے

"یہ ایک ایسا ماتم ہے کہ اگر آسمان بھی قاعدے سے رونا چاہے تو تاروں کی

آنکھوں سے تمام رات خون کے آنسو روتا رہے۔"

حضرت مولانا المفتی محمد کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے۔ اگرچہ ہزاروں علما نے حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ العزیز سے علوم عقلیہ ونقلیہ کا استفادہ کیا۔ مگر قدرت کی فیاضیوں نے جو خاص جامعیت اور سابقیت مفتی صاحب مرحوم کو عطا فرمائی تھی وہ بہت ہی کم کو نصیب ہوئی ہے۔ مفتی صاحب مرحوم ابتدا ہی سے نہایت ذکی، سمجھ دار، مستقل مزاج، عالی حوصلہ، معاملہ فہم واقع ہوئے تھے۔ آپ کو علوم عقلیہ اور نقلیہ سے بھی طبعی مناسبت تھی۔ تقریر وتحریر کے میدانوں میں آپ ہمیشہ پیش پیش رہے اور دوسروں کے مقابلے میں بازی لے گئے۔

اخلاقِ فاضلہ میں خداوندِ عالم نے کمال عطا فرمایا تھا۔ دریاے سیاست کے بہترین شناور تھے۔ تدبر وتفکر کے انمول موتیوں سے آپ کا دامن بھرا رہتا تھا۔ ہر معاملے کی گہرائی اور آخری تہہ تک پہنچنا آپ کی ذکاوت کا ہمیشہ شاہ کار رہا ہے۔

جس طرح آپ بلند پایہ مفتی، وسیع النظر عالم، دوراندیش زیرک، دقیقہ رس سیاست داں تھے، ایسے ہی آپ بہترین مدرس اور استاذ بھی تھے۔ دقیق وغامض مضامین کے سمجھانے کا بہترین ملکہ خداوند عالم نے آپ کو عطا فرمایا تھا۔

علمی کمالات کے ساتھ حسنِ خط کی دولت بھی آپ کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی تھی۔ خطاطی گویا فطری جوہر تھا۔ چناں چہ نسخ اور نستعلیق دونوں قسم کے خطوں پر آپ بے نظیر مہارت رکھتے تھے۔

تحریکِ آزادیٔ وطن اور خلافت کمیٹی کی تائید اور جمعیت علماے ہند کی رہنمائی میں آپ نے جس فراست اور استقلال کا ثبوت ۱۹۱۸ء سے لے کر وفات کے وقت تک دیا؛ ہندوستان کے اعلا سے اعلا قومی لوگوں کی زندگی اس کی مثال سے خالی ہے۔

شہرت طلبی اور نام ونمود کی خواہش کی ہوا بھی آپ کے پاس سے ہو کر نہیں گزری تھی۔ فروتنی اور تواضع میں آپ بالکل اپنے استاذ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ کے قدم بہ قدم اور آسمانِ تقویٰ کے چمکتے ہوئے ستارے تھے۔ باوجود اعلا قابلیتوں کے (جن کے ذریعے وہ بڑی سے بڑی عزت، شہرت اور دولت حاصل کر سکتے تھے) آپ نے یک سوئی اور گم نامی کے گوشے میں ساری زندگی گزار دی۔ بہ ہر حال حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کی وفات اور جدائی

نے ہم خدامِ جمعیت کی کمر توڑ دی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

لَا یُدْرِكُ الْوَاصِفُ الْمُطْرِیْ خَصَائِصَهٗ
وَلَوْ سَابِقًا فِیْ كُلِّ مَا وَصَفَا
حَلَفَ الزَّمَانُ لَیَأْتِیَنَّ بِمِثْلِهٖ
حَنِثَتْ یَمِیْنُكَ یَا زَمَانُ فَكَفِّرِ

"حد سے بڑھ کر تعریف کرنے والا (جو ہر ایک وصف کے بیان کرنے میں سب سے بڑھا ہوا اور بے نظیر ہو) آپ کی خصوصیات کے بیان کرنے سے قاصر رہے گا۔

زمانے نے قسم کھائی کہ آپ کی مثال پیش کرے گا۔ اے زمانہ تیری قسم پوری نہیں ہوئی، لہٰذا کفارہ ادا کر۔"

فَرَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ وَاَرْضَاهُ وَخَلَفَ عَلَیْنَا بِخَیْرٍ.

ننگِ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ

(مفتی اعظم کی یاد میں: ص ۶۷، ۶۸)

اینٹی قادیانی تحریک:

۱۵ر جنوری ۱۹۵۳ء: قادیانیوں کی تبلیغی سرگرمیاں اور احرار کے خلاف تحریک شروع کی تو مسلمانوں میں اشتعال پیدا ہوا اور کوئٹہ، اوکاڑہ، راول پنڈی میں چند قادیانی قتل ہوئے۔ مرزا بشیر الدین محمود کی تقریریں جلتی پر تیل کا کام کر رہی تھیں۔ ۱۵ر جنوری ۱۹۵۲ء کے الفضل میں اس کا اعلان چھپا کہ ان علما سے خون کا بدلہ لیا جائے گا۔

(۱) سید عطاء اللہ شاہ بخاری
(۲) ملاّ عبدالحامد بدایوانی
(۳) ملاّ احتشام الحق تھانوی
(۴) ملاّ مفتی محمد شفیع
(۵) ملاّ مودودی

ان علما کا جرم یہ تھا کہ انھوں نے احرار کی دعوت پر میرزائیت کے عزائم کا عمیق مطالعہ کیا اور قادیانیت سے متعلق مشترک لائحۂ عمل میں ہم آواز ہوگئے۔ مرزا بشیر الدین اور چودھری سر ظفر اللہ خاں اس قدر دلیر ہو چکے تھے کہ روز بہ روز عامۃ المسلمین سے بے پروا ہوتے گئے۔ سر ظفر اللہ خاں نے ۱۷ر مئی ۱۹۵۲ء کو جہانگیر پارک کراچی میں قادیانی امت

کے ایک جلسۂ عام سے خطاب کرنے کا اعلان کیا۔ مسلمانوں نے اسے اپنے لیے چیلنج سمجھا اور مساجد میں اس پر احتجاج کیا۔

خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم پاکستان نے انٹیلی جنس بیورو کی رپورٹ پر چودھری ظفر اللہ خاں کو جلسے میں شریک ہونے سے منع کیا، لیکن چودھری صاحب استعمار کے گھوڑے پر سوار تھے۔ اپنے وزیر اعظم کی بات نہ مانی۔ ان سے کہا کہ وہ (خواجہ صاحب) اس بات پر مصر ہوں تو وہ اپنے عہدے سے استعفیٰ دینے کو تیار ہیں۔ یہی وہ زمانہ تھا جب امریکی وزیر خارجہ نے وزیر اعظم پاکستان کو یہ تاثر دیا کہ چودھری ظفر اللہ خاں کو راضی نہ رکھا گیا تو امریکا پاکستان کی مدد کرنے کو تیار نہ ہوگا، حتیٰ کہ گندم مہیا کرنا مشکل ہو جائے گا۔ جس کی پاکستان کو اس وقت سخت ضرورت ہے۔ اس کا انکشاف خواجہ صاحب نے انکوائری کمیٹی کے رو بہ رو شہادت دیتے ہوئے کیا۔ چودھری ظفر اللہ خاں نے کراچی کے جلسۂ عام میں کہا کہ ''احمدیت ایک ایسا پودا ہے جو اللہ تعالیٰ نے خود لگایا ہے، اب وہ جڑ پکڑ گیا ہے، اگر یہ پودا اُکھاڑ دیا گیا تو اسلام ایک زندہ مذہب کی حیثیت سے باقی نہ رہے گا، بلکہ ایک سوکھے ہوئے درخت کی مانند ہو جائے گا اور دوسرے مذاہب پر اپنی برتری کا ثبوت مہیا نہ کر سکے گا۔ (تحقیقاتی رپورٹ اردو متن: ص ۷۷) اس مسئلے کے ردِعمل میں فساد ہو گیا، نتیجتاً مرزائیوں کی بعض عمارتوں کو نقصان پہنچا۔

۲۱ر جنوری ۱۹۵۳ء: خواجہ ناظم الدین سے ملاقات کے لیے پیر صاحب سرسینہ شریف، مولانا عبدالحامد بدایونی اور ماسٹر تاج الدین انصاری پر مشتمل ایک وفد مرتب کیا گیا، اس کی خواجہ صاحب سے ۲۱ر جنوری ۱۹۵۳ء کو ملاقات ہوئی۔ انھوں نے مطالبات پر ہم دردی کا اظہار کیا، لیکن فرمایا کہ وہ ان مطالبات کو تسلیم کرنے سے قاصر ہیں۔

۱۶ر فروری ۱۹۵۳ء: خواجہ صاحب ۱۶ فروری ۱۹۵۳ء کو لاہور آئے تو مولانا اختر علی خاں، مولانا ابوالحسنات قادری، سید مظفر علی شمسی اور ماسٹر تاج الدین پر مشتمل ایک دوسرے وفد نے ان سے ملاقات کی۔ لیکن خواجہ صاحب نے وہی عذر کیا کہ بعض مشکلات کے پیشِ نظر وہ ان مطالبات کو تسلیم کرنے کی پوزیشن میں نہیں۔ ادھر کراچی میں علما کا ایک وفد، جس میں علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا احتشام الحق تھانوی، مولانا مفتی محمد شفیع، مولانا عبدالحامد بدایونی، اور مولانا اختر علی خاں شامل تھے، خواجہ صاحب سے ملا۔ اس وفد کو بھی خواجہ صاحب

نے وہی جواب دیا۔ اس سے اگلے روز ماسٹر تاج الدین انصاری، مولانا ابوالحسنات اور سید مظفر علی شمسی نے سردار عبدالرب نشتر کی موجودگی میں خواجہ صاحب سے ملاقات کی اور اتمام حجت کیا کہ ایک مہینہ گزر چکا ہے، لیکن خواجہ صاحب اپنے جواب پر قایم رہے۔ فرمایا کہ مرزائیوں کو چھیڑنے سے امریکا ہمیں گندم نہیں دے گا اور نہ مسئلہ کشمیر کے حل میں ہماری مدد کرے گا۔ جب خواجہ صاحب کے دوٹوک جواب سے مجلسِ عمل کے راہ نما مایوس ہو گئے تو ۲۶ر فروری ۱۹۵۳ء کو اس پر غور و خوض کرنے کے لیے کراچی میں اجلاس بلایا گیا۔ اس اجلاس میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری، ماسٹر تاج الدین انصاری، صاحب زادہ فیض الحسن، سید نور الحسن بخاری، مولانا سلطان احمد امیر جماعتِ اسلامی سندھ، مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا احتشام الحق تھانوی، مولانا محمد یوسف کلکتوی اور سید مظفر علی شمسی شریک ہوئے۔ مولانا ابوالحسنات نے صدارت کی اور فیصلہ کیا کہ راست اقدام کی شکل کیا ہو؟ پانچ رضا کار مطالبات کے جھنڈے اٹھا کر وزیرِ اعظم کی کوٹھی پر جائیں اور پُر امن رہ کر لگاتار مظاہرہ کریں۔ اسی قسم کا مظاہرہ گورنر جنرل کی کوٹھی پر جاری رہے۔ مولانا ابوالحسنات کو پہلا ڈکٹیٹر مقرر کیا گیا اور عوام سے اپیل کی گئی کہ وہ رضا کاروں کے ساتھ مطلقاً نہ جائیں۔ حکومت نے ۲۶ر ۲۷ر فروری کی درمیانی رات کو سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور ان کے رفقا کو گرفتار کر لیا۔ جن میں ماسٹر تاج الدین انصاری، سید مظفر علی شمسی، مولانا لال حسین اختر، مولانا ابوالحسنات قادری اور مولانا عبدالحامد بدایونی وغیرہم بھی تھے۔ اس سے اگلے روز پنجاب میں احرار کے تمام متعلقین پکڑ کر جیلوں میں ڈال دیے گئے۔ جس سے صوبہ بھر میں برہمی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اسی سلسلے میں لاہور، گوجرانوالہ، سیال کوٹ، اور لائل پور میں پکڑ دھکڑ کا طوفان آ گیا۔ یہی فضا راول پنڈی اور منٹگمری (ساہی وال) میں پیدا ہوئی۔ ہر جگہ حکومت سے ٹکراؤ ہونے لگا۔ مولانا تاج محمود لائل پور میں تحریک کے راہنما تھے۔ انھوں نے انتظامیہ کو معطل کر دیا۔

۲۶ر مارچ ۱۹۵۳ء: مختصر یہ کہ پنجاب پولیس کے اوسان خطا ہو گئے، کئی شہروں میں ڈپٹی کمشنروں کو ان کے تشدد کے باعث عوام نے گدھوں پر سوار کرایا اور پھرایا۔ جب صوبائی نظم و نسق بالکل معطل ہو گیا تو مرکزی حکومت کے رنگا رنگ وزیر اور اعلا حکام لاہور آ گئے۔ ملک غلام محمد گورنر جنرل کا دماغ بے ٹھکانہ ہو گیا۔ اُس زمانے میں اسکندر مرزا

ڈیفنس سیکرٹری تھے، ان سب کی ملی بھگت سے ۲۶؍ مارچ ۱۹۵۳ء کو لاہور میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ سارا شہر فوج کے انتظام میں آ گیا۔ غرض قادیانیت کے خلاف یہ سب سے بڑی تحریک تھی جو پاکستان میں چلی اور حکومت نے اپنے بہیمانہ تشدد کا پورا پورا مظاہرہ کیا۔

شاہ جی اپنے ساتھیوں سمیت پہلے کراچی سنٹرل جیل میں رکھے گئے، پھر سکھر جیل میں بھجوا دیا گیا، جہاں ان سے آخری بیماری چمٹ گئی۔ منیر انکوائری کمیٹی نے کام شروع کیا تو شاہ جی ۲۵؍ جولائی ۱۹۵۳ء کو لاہور سنٹرل جیل میں منتقل کر دیے گئے۔ میاں محمود علی قصوری نے لاہور ہائی کورٹ میں شاہ جی کی نظر بندی کے خلاف رٹ دائر کر دی۔ جسٹس ایس اے رحمٰن نے قانونی غلطی کا فایدہ دے کر ۸؍ جنوری ۱۹۵۴ء کو شاہ جی اور ان کے ساتھیوں کو رہا کر دیا۔ شاہ جی نے رہا ہوتے ہی اپنی پہلی تقریر میں جسٹس منیر کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اسی سال انھیں مجلس تحفظِ ختم نبوت کا صدر منتخب کیا گیا۔ آپ نے ایک جلسۂ عام میں اعلان کیا کہ میں آج بھی اور حشر کے دن بھی ان تمام شہیدوں کے خون کا ذمہ دار ہوں۔ انھیں عشق نبوت کی پاداش میں اسلامی سلطنت کے ہلاکو خانوں نے قتل کیا ہے۔ یہ کوئی نئی چیز نہیں، حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بھی اپنے زمانے میں سات ہزار حافظِ قرآن صحابہؓ کو ختم نبوت کی خاطر شہید کرایا تھا۔ شاہ جی کو حکومت کے بہیمانہ تشدد پر انتہائی غصہ تھا اور تحریک کے سبوتاژ کیے جانے پر سخت غم زدہ تھے۔ ہمیشہ حکومت پر کڑی تنقید کرتے۔ حکومت نے ۱۹۵۵ء میں انھیں ۶ ماہ کے لیے گھر میں نظر بند کیا تھا۔ پھر ۱۴؍ اپریل ۱۹۵۵ء کو خانیوال کی تقریر میں پکڑ لیا۔ کوئی پانچ چھ ماہ مقدمہ چلتا رہا۔ اسی دوران میں اسکندر مرزا نے بہ طور صدر پاکستان سید مظفر علی شمسی کی معرفت شاہ جی سے ملاقات کی خواہش کی، لیکن شاہ جی ٹال گئے، تا آں کہ ۱۹۵۶ء کے آخر میں ان کے جسمانی عوارض عود کر آئے اور وہ ایک طویل بیماری کا شکار ہو گئے۔ پھر ۱۶؍ مارچ ۱۹۶۱ء کو ان پر فالج کا شدید حملہ ہوا اور ۲۱؍ اگست کی شام کو چھ بج کر ۵۵ منٹ پر تحریکِ ختم نبوت کا سب سے بڑا قاید ۴۲ برس کی لازوال جدوجہد کے بعد اس فانی کائنات سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔

منیر انکوائری رپورٹ:

احرار اپنے سیاسی عمل سے دست بردار ہو چکے تھے اور صرف قادیانیت ان کی

جدو جہد کا محور تھا، لیکن ۱۹۵۳ء کی تحریکِ ختمِ نبوت میں قادیانی اور سرکاری دوایر سے ان کے خلاف بے پناہ گولہ باری کی گئی اور قلم فروش دانش وروں کا ایک طائفہ ان کے متعلق خرافات نگاری میں مشغول ہوگیا۔ اس سلسلے میں حکومت نے بے شمار پیہ صرف کیا اور ان تمام بے دین قلم کاروں کو سرکاری خزانے سے نوازا جو اس تحریک کی رسوائی کے لیے احرار کو مطعون کرنے کا سکہ رکھتے تھے۔ المختصر قادیانیت کا محاسبہ پاکستان دشمنی قرار دیا گیا۔ سب سے زیادہ افسوس ناک منیر انکوایری رپورٹ تھی۔ جسٹس منیر نے تحقیقات کے دوران میں نہ صرف علما کا استہزا کیا بلکہ چیف جسٹس ہونے کے زعم میں اسلام کے خلاف ایک ایسی دستاویز مرتب کی جس سے یورپ کے عیسائی حلقوں نے بے لگام ہوکر فایدہ اٹھانا چاہا۔ یہ ایک ایسی رپورٹ تھی کہ اس کے خلاف کئی ایک مسلمان دانش ور نے جو تحریکِ ختمِ نبوت میں شامل نہ تھے اور جنھیں احرار سے عمر بھر سیاسی اختلافات رہے، اس کے خلاف اپنے بعض مقالوں، کئی کتابوں اور اکثر تقریروں میں احتجاج کیا۔ جسٹس منیر نے سب سے زیادہ غصہ احرار کے خلاف نکالا اور ان کے متعلق اس قسم کی لغو زبان استعمال کی کہ اس طرح کی زبان استعمال کرنے کا حوصلہ کبھی بشیر الدین محمود کو بھی نہ ہوا تھا۔

بہ ہر حال ختمِ نبوت کی تحریک احرار کی انتھک جدو جہد کا نتیجہ تھی۔ انھوں نے اسلام کے ایک بنیادی مسئلے پر تمام مکاتبِ فکر کے علما کو یک جا کیا اور ایک ایسی تحریک کی نیو (بنیاد) اٹھائی جو اس وقت کے لادین وزرا اور عیاش افسروں کے ستم کا شکار ہوگئی، لیکن مسلمانوں کے دل و دماغ میں ہمیشہ کے لیے قادیانیت سے تنفر راسخ ہوگیا۔ فی الجملہ احرار کے اس امتیاز کو سلب کرنا ناممکن ہے کہ وہ اس تحریک کے سرخیل تھے۔

(تحریکِ ختمِ نبوت: از شورش کاشمیری، ص ۹۸-۸۸)

خواجہ ناظم الدین وزیرِ اعظم پاکستان کی برطرفی:

۱۷ر اپریل ۱۹۵۳ء: جس ہونی سے خواجہ ناظم الدین وزیرِ اعظم پاکستان ڈر رہے تھے، وہ ہو کے رہی۔ غلام محمد نے انھیں ۱۷ر اپریل ۱۹۵۳ء کو برخواست کر دیا۔ جو لوگ یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ غلام محمد مفلوج و محصور ہے ان پر اس کا یہ اقدام بجلی بن کے گرا۔......خواجہ صاحب نے ملک غلام محمد سے شکایت کی کہ میرا رویہ لیاقت علی خان کی جانب نہایت درست

رہا ہے۔ ملک صاحب نے کہا ”خواجہ صاحب! رہنے دیجیے، آپ لیاقت علی خان ہیں اور نہ میں ناظم الدین۔“ خواجہ صاحب تھوڑا سا کسمسائے، ملکۂ معظمہ سے مدد چاہی لیکن چاروں طرف خاموشی رہی اور حالات کے بہاؤ میں پرکاہ کی طرح بہہ گئے۔ چند دِنوں کے بعد میں نے انھیں ملیر چھاؤنی کے ایک بنگلے کے لان میں کرتے اور چوڑی دار پاجامے میں ٹہلتے دیکھا۔ چہرے پر بہ دستور معصومیت تھی۔

ملک غلام محمد نے واشنگٹن سے محمد علی بوگرا کو...... جو وہاں سفیر تھے۔ بلا کر وزیرِ اعظم بنا دیا۔ لیگ پارٹی نے انھیں اپنا لیڈر منتخب کرلیا اور یوں حکم ران سیاسی پارٹی نے ملک صاحب کے اقدام پر مہر تصدیق ثبت کردی۔ (آہنگ بازگشت از محمد سعید: ص ۳۴۲)

مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کی آبادکاری اور جمعیت علما:

۵ رمئی ۱۹۵۳ء: دہلی، ۳۰ راپریل، مولانا لقاء اللہ عثمانی پانی پتی جو مولانا حفظ الرحمٰن کے بلانے پر چند دن ہوئے دہلی آئے تھے، پانی پت واپس چلے گئے۔ دہلی سے واپس ہوتے ہوئے مولانا لقاء اللہ نے ایک اخباری نمایندے کو بتایا کہ مولانا حفظ الرحمٰن نے مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کی آبادکاری کے سلسلے میں مجھ کو بلایا تھا اور اس سلسلے میں مولانا حفظ الرحمٰن کی معیت میں دو مرتبہ میں نے مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات کی اور اس مسئلے سے متعلق مولانا حسین احمد مدنی کا ایک مکتوب بھی مولانا آزاد کو پیش کیا۔ مولانا آزاد اس مسئلے میں خاص طور سے توجہ کررہے ہیں۔

مشرقی پنجاب کے وزیر بحالیات سردار اوجل سنگھ نے بتایا کہ وہ مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کو دوبارہ بسانے اور ان کی جائیدادیں واپس کرنے نیز مساجد، مقابر، خانقاہوں اور درس گاہوں وغیرہ کے تخلیے کے مسئلے پر پوری توجہ کررہے ہیں اور اس سلسلے میں ضلعوں کے افسروں اور محکمہ کسٹوڈین کو ضروری ہدایات دے چکے ہیں۔

مولانا لقاء اللہ نے کہا کہ مشرقی پنجاب کے جن برباد شدہ مسلمانوں نے اپنی جائیداد کی واپسی کے لیے درخواستیں ابھی تک نہیں دی ہیں وہ جلد از جلد اپنی درخواستیں ضلع کے ڈپٹی کمشنر کے پاس بھیج دیں۔ (مدینہ۔بجنور: ۵ رمئی ۱۹۵۳ء)

پاکستان میں ہندوؤں پر مظالم کا ہندوستان کے مسلمانوں سے بدلا!

شولاپور، یکم مئی، وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے یہاں ایک تقریر میں ان لوگوں کی سختی سے مذمت کی جو پاکستان میں ہندوؤں کی مبینہ بدسلوکی کی مثال دے کر ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں، جیسا کہ پاکستان میں ہندوؤں کے ساتھ ہو رہا ہے۔

پنڈت نہرو نے کہا ان لوگوں کا یہ طرزِ فکر سراسر غلط ہے۔ دستور کے تحت ہندوستان میں سب لوگوں کو برابر کے حقوق دیے گئے ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ ہندو مسلمان سب ہی ان حقوق سے پورا پورا فایدہ اٹھائیں اور ترقی کریں۔ (مدینہ۔بجنور: ۵رمئی ۱۹۵۳ء)

مولانا ابوالکلام آزاد--- قایم مقام وزیراعظم ہند:

۳۱رمئی ۱۹۵۳ء: ۲۸رمئی ۱۹۵۳ء کو پنڈت نہرو ملکہ الزبتھ کی تقریب تاج پوشی مین شرکت اور یورپ کے دورے پر دہلی سے روانہ ہو گئے۔ آج کے اخباروں میں یہ خبر شایع ہوئی ہے کہ پنڈت جی کی عدم موجودگی میں مولانا آزاد قایم مقام وزیراعظم ہوں گے۔

۳۱رمئی ۱۹۵۳ء کو گورنمنٹ آف انڈیا نے اعلان شایع کر دیا کہ مولانا ابوالکلام آزاد قایم مقام وزیراعظم مقرر کیے گئے ہیں اور انھوں نے اس حیثیت سے کام شروع کر دیا ہے۔

(خلافت۔بمبئی: یکم جون ۱۹۵۳ء و مولانا آزاد—ایک سیاسی ڈاری: ص ۴۹۵)

مولانا آزاد قایم مقام وزیراعظم، ایک معاصرانہ چشمک:

ڈاکٹر کاٹجو وزیر قانون انڈیا کے نام مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک خط اور اس پر ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری کا حاشیہ، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کی مرکزی کابینہ میں بھی ایک دوسرے کے خلاف جوڑ توڑ اور سازشیں ہوتی رہتی تھیں اور کوئی اس سے محفوظ نہیں تھا۔

مائی ڈیر ڈاکٹر کاٹجو!

فرائیڈے کو میں نے نیشنل اسٹینڈرڈ بمبئی میں ایک غلط خبر دیکھی۔ ۔س اس کی تردید کر سکتا تھا، مگر چوں کہ اس میں آپ کا نام لیا گیا تھا، اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ آپ کو

دکھادوں۔ چناں چہ میں نے آپ کو دکھایا اور آپ نے ایسی خبر کے نکلنے پر سرپرائز ظاہر کیا۔ آپ نے مجھ سے کہا کہ میں اس کی تردید کرادوں، لیکن میں نے یہی مناسب سمجھا کہ یہ معاملہ آپ پر چھوڑ دوں۔ پھر رات کو جب آپ سے ٹیلی فون پر میں نے پوچھا تو آپ نے کہا کہ مسٹر پائی نے ایک بیان پریس کو دے دیا ہے۔ میں آپ سے یہ کہہ سکتا تھا کہ بیان پریس کو دینے سے پہلے مجھے دکھا دیا جائے لیکن اس اعتماد کی وجہ سے جو مجھے آپ پر تھا، میں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

دوسرے دن صبح کو میں بہت بزی تھا، اس لیے اخبارات کو اطمینان سے نہیں دیکھ سکا اور مجھے اس کا خیال بھی نہیں ہوا کہ آپ کا دیا ہوا بیان اخبار میں دیکھ لوں۔ لیکن رات کو میرے پاس دہلی اور دہلی سے باہر کی بہت سی انکوائریاں آئیں۔ مجھ سے کہا گیا کہ آج پی ٹی آئی نے ایک نیوز ایٹم شایع کیا ہے اور لکھا ہے پرائم منسٹر کے آفس کے لیے کوئی آفیشیٹنگ ارینجمنٹ نہیں کیا گیا ہے۔ حال آں کہ پرائم منسٹر کی موجودگی میں یہ بات پریس میں نکل چکی ہے کہ ان کے جانے کے بعد آپ آفیشیٹ کریں گے۔ چناں چہ میں نے اخبار منگوا کر دیکھا تو واقعہ پی ٹی آئی نے اتھارٹیٹو ریسورس کا حوالہ دے کر یہی بات لکھی ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ آپ نے اس طرح کی غلط بات کا پریس میں دینا مناسب تصور کیا۔ اس سے زیادہ کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ ❶

آزاد

حاشیہ ❶: مئی ۱۹۵۳ء کے اواخر میں پنڈت جواہر لال نہرو لندن میں ملکہ الزبتھ کی تقریب تاج پوشی میں شرکت اور یورپ اور افریقہ کے بعض ممالک کے دورے پر روانہ ہوئے تھے۔ پنڈت جی کی عدم موجودگی میں مولانا آزاد کو قایم مقام وزیر اعظم کی حیثیت سے فرایض انجام دینا تھا۔ یہ بات اسی وقت اخباروں میں آ گئی تھی اور پنڈت جی کی روانگی کے دو روز بعد ۱۳ر مئی کو گورنمنٹ آف انڈیا نے نوٹیفکیشن بھی جاری کر دیا تھا۔ روزنامہ ''خلافت'' بمبئی کی اشاعت یکم جون ۱۹۵۳ء مظہر ہے:

> ''۳۱ر مئی ۱۹۵۳ء کو گورنمنٹ آف انڈیا نے اعلان شایع کر دیا کہ مولانا ابوالکلام آزاد قایم مقام وزیر اعظم مقرر کیے گئے ہیں اور انھوں نے اس حیثیت سے کام شروع کر دیا ہے۔''

یہ ایک سرکاری فیصلہ تھا جو حکومت کی سطح پر دستور کے مطابق کیا گیا تھا اور جس روز پنڈت جی روانہ ہوئے تھے اسی روز اخبارات میں خبر آگئی تھی اور بعد میں سرکاری طور پر بھی اس کا اعلان کردیا گیا تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ خود کیبنٹ کے بعض ارکان اس سے خوش نہ تھے اور انھوں نے اس قسم کی کوئی خبر شایع کروادی تھی اور وزیر قانون مسٹر کانجو کا قلب بھی رنج کے اس اثر سے محفوظ نہ تھا۔ مولانا آزاد نے اپنے خط میں اس مسئلے پر روشنی ڈالی ہے۔ خط کے آخری جملوں میں ان کے دکھ کی کسک کو صاف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ (آثار ونقوش، مرتبہ: ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری)

لیاقت نہرو پیکٹ: ❶

۵ / جون ۱۹۵۳ء: مرکزی وزیر آبادکاری ہند مسٹر اجیت پرشاد کے نام ایک خط میں مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:

"ایک نہایت ضروری معاملے کی نسبت آپ کو لکھتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ جولائی میں پاکستان سے ہماری بات چیت ہونے والی ہے۔ ایجنڈے میں سب سے پہلا ایٹم "پرایم منسٹرز اگریمنٹ" ہے۔ یعنی جو اگریمنٹ مسٹر نہرو اور لیاقت علی میں ہوا تھا۔ اس اگریمنٹ کی رو سے بنگال کی مائینا ریٹی کمیونٹیز کے لیے دونوں گورنمنٹوں نے اپنی اپنی ذمے داریوں کو تسلیم کیا تھا اور اب اس پر بحث ہوگی کہ دونوں نے کہاں تک اپنی ذمے داریوں کو پورا کیا ہے؟

اس سلسلے میں بنگال کے ان مسلمانوں کی حالت کا سوال فوراً سامنے آجائے گا جو فساد کی وجہ سے پاکستان جانے پر مجبور ہوئے تھے اور ہم نے ذمے لیا تھا کہ انھیں واپس ان کے شہروں اور گھروں میں بسادیں گے اور ان کی زمینیں انھیں واپس مل جائیں گی۔ سوال اٹھایا جائے گا کہ ہم نے کہاں تک اپنی ذمے داری پوری کی ہے؟ جو حالات وقتاً فوقتاً بنگال کے مسلمانوں کے خاص طور پر ضلع ندیا کے، ہمارے علم میں آتے رہے ہیں، انھیں دیکھتے ہوئے مجھے اندیشہ ہے کہ ہم کامیابی کے ساتھ شاید اپنے آپ کو ڈیفنس نہیں کرسکیں گے اور پاکستان کو موقع ملے گا کہ وہ ہم پر الزام لگائے۔

پنڈت نہرو نے اور میں نے کئی بار ڈاکٹر رائے سے کہا تھا کہ وہ خود ندیا جا کر وہاں کی حالت کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور لوکل آفیسرز پر نہ چھوڑیں، لیکن وہ ابھی تک وہاں جانے

کے لیے وقت نہیں نکال سکے۔ پاکستان سے گفتگو کرتے ہوئے ہم گورنمنٹ بنگال کو درمیان میں نہیں لا سکتے، کیوں کہ آخری ذمے داری ہماری ہے۔ گورنمنٹ بنگال کو ریلیف کے لیے رُپیہ بھی ہم ہی نے دیا ہے۔

یہ معاملہ بہت اہم ہے اور میں چاہتا ہوں کہ جلد سے جلد آپ وقت نکالیں اور ندیا جا کر وہاں کے حالات کا ڈایریکٹ معاینہ کریں، تا کہ ہم مضبوطی کے ساتھ معلوم کر سکیں کہ واقعی حالت کیا ہے؟ آپ کی رپورٹ گورنمنٹ بنگال کو بھی مدد دے گی اور ہمارے سامنے بھی اصلی حالت رکھ دے گی۔

مہربانی کر کے کوشش کیجیے کہ یہ کام انجام پائے۔ ہر اعتبار سے یہ ضروری ہے

آزاد

(آثار ونقوش مولانا ابوالکلام آزاد، مرتبہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری۔ کراچی، ۱۹۹۷ء: ص ۴۵-۴۶)

حاشیہ ۱۰: قرارداد کے مطابق وزیرِ اعظم پاکستان لیاقت علی خان نے ہندوستان کا دورہ کیا تھا اور ۲۰ر جولائی ۱۹۵۳ء کو وزیرِ اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو نے اقلیتوں اور مسئلہ کشمیر پر بات چیت کی تھی۔

مولانا آزاد کا دورہ کشمیر:

۱۱ر جون ۱۹۵۳ء: مولانا ابوالکلام آزاد قایم مقام وزیرِ اعظم ۱۱ر جون ۱۹۵۳ء کو سری نگر پہنچے تھے۔ انھوں نے اس روز یا دوسرے روز (۱۲ر جون) کو شیخ عبداللہ سے بات چیت کی۔ مولانا ایک خط میں پنڈت جواہر لال نہرو کو لکھتے ہیں "کل شیخ عبداللہ سے دو گھنٹے باتیں ہوئیں۔ آج پھر ہو گی۔"

پنڈت جی اس زمانے میں ملکہ الزبتھ کے جشن تاج پوشی اور دولت مشترکہ کے وزراے اعظم کی کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گئے ہوئے تھے۔ مولانا چاہتے تھے کہ کشمیر کا مسئلہ وہاں کے عوام کے مفاد میں شیخ عبداللہ اور نیشنل کانفرنس کے رہنماؤں کی موجودگی میں طے ہو جائے۔

پاکستان کے وزیرِ اعظم محمد علی بوگرا بھی اسی سلسلے میں لندن گئے ہوئے تھے اور دونوں رہنماؤں نے اس مسئلے پر گفتگو کے لیے ملاقات پروگرام میں شامل تھی۔ مولانا آزاد اس

ملاقات کے نتائج معلوم کرنے کے لیے بے چین نظر آتے ہیں۔

۲ر جون کو ملکہ کی تاج پوشی کی رسم وی ایم گرجا گھر لندن میں تزک و احتشام سے انجام پائی تھی اور ۹ر جون کو پاک و ہند کے وزرائے اعظم کی گفتگو شروع ہو چکی تھی۔

خط کے دیگر مسائل میں ایک مسئلہ نیپال کے اندرونی خلفشار کا تھا جو ہندوستان کے لیے باعث تشویش تھا۔ کوریا کا مسئلہ پچھلے چھ سات سال سے الجھا ہوا تھا۔ مولانا اس مسئلے کو عالمی امن کے تناظر میں دیکھتے تھے اور مسئلے کے حل کے لیے ہندوستان نے بعض ذمہ داریاں بھی قبول کر لی تھیں اور مولانا کا خیال تھا کہ اس سلسلے میں ہندوستان کو زیادہ ایثار، ہمت اور فراخ دلی سے کام لینا چاہیے۔ جیسا کہ مولانا کے خط بہ نام پنڈت جواہر لال نہرو سے ظاہر ہوتا ہے۔ (آثار و نقوش: ص ۱۶۷)

ہندوستان کا سیکولر دستور اور مذہب کی آزادی: ❶

جون ۱۹۵۳ء: آزادی کے بعد ہندوستان کے دستور میں جن بنیادی حقوق کو تحفظ دیا گیا ہے اس میں مذہب کے اختیار اور مذہبی تبلیغ کا حق بھی ہے۔ مولانا کا کارڈینل گریشیاس بمبئی کے کیتھولک آرک بشپ کے نام مولانا کا یہ خط جو مذہب کی تبدیلی کے حق میں حکومت کی پالیسی کی وضاحت میں ہے، بہت اہمیت رکھتا ہے۔ خط یہ ہے:

''ڈیئر کارڈینل گریشیاس

تھینکس فور یور لیٹر آف......... جس کے ساتھ آپ نے اپنے ایک اسٹیٹ منٹ کی کاپی بھی بھیجی ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

آئی فیل ویری سیڈ تو تھنک.........

میں آپ کو یقین دلاؤں گا کہ جہاں تک گورنمنٹ آف انڈیا کا تعلق ہے اس کی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے اور انڈین کانسٹی ٹیوشن نے جن فنڈامینٹل رائٹس کو تسلیم کیا ہے وہ ان تمام انڈی ویجولز، کمیونٹیز اور گروپس کے لیے ہیں، جو انڈین یونین ٹیری ٹوریز کے اندر رہتے ہیں یا باہر سے آ کر انھوں نے یہاں قیام اختیار کیا ہے۔

فارن مشنریز نے گزشتہ ڈیڑھ سو برس کے اندر جو عظیم الشان ایجوکیشنل اور ہیومنی ٹیرین سروس انڈیا کی انجام دی ہے، اس کا ہم سب کو پورا پورا اعتراف ہے۔ ایسٹ انڈیا

کمپنی ایک عرصے تک اس کی مخالف رہی تھی کہ ماڈرن ایجوکیشنل کا ہندوستانیوں کے لیے انتظام کرے۔ یہ سیرام پور کی مشنری سوسایٹی تھی جس نے سب سے پہلے ماڈرن ایجوکیشن کا اسکول اور کالج کھولا اور ہندوستان کی انٹلک چول لائف میں ایک نئے انقلاب کی بنیاد ڈالی۔ ہندوستان کی متعدد زبانیں اپنی ماڈرن لٹریری لائف کے لیے انھیں مشنری سوسائٹیوں کے زیر بار احسان ہیں جنھوں نے بائبل کا ترجمہ کرنے کے لیے ان زبانوں کی گرامر اور ڈکشنری تیار کی، پریس کے نئے نمونے پیدا کیے اور پھر ان کے اسکرپٹ کا ٹائپ ڈھال کر انھیں ڈیولپ منٹ اور پروگریس کی شاہ راہ پر لگا دیا۔ انڈین لیڈرز ان واقعات سے بے خبر نہیں ہیں۔ انھوں نے ان خدمتوں کی قدر و قیمت کا ہمیشہ کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ انڈین انڈی پنڈنٹ کے بعد مشنری سوسائٹیوں نے ہم سے کہا تھا کہ اگر ہم آپ کی موجودگی انڈیا میں پسند نہیں کرتے تو وہ خدمات آیندہ جاری نہیں رکھیں گی۔ لیکن ہم نے انھیں اطمینان دلایا کہ ہم ان کی خدمات کی قدر و قیمت کا اعتراف کرتے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ وہ اپنا کام جاری رکھیں۔

آپ نے اپنے خط میں اس اسٹیٹ منٹ کا حوالہ دیا ہے جو گورنمنٹ آف انڈیا کے ہوم منسٹر نے ۲۱/اپریل ۱۹۵۳ء کو انڈین پارلیمنٹ میں دیا تھا۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آپ نے اس اسٹیٹ منٹ کو جس شکل میں دیکھا ہے اور اس سے جو نتیجہ نکالا ہے وہ حقیقت کے خلاف ہے۔ اس اسٹیٹ منٹ کا تعلق ایک خاص شکایت سے تھا جو گورنمنٹ کے علم میں آئی تھی اور گورنمنٹ اس کی انکوایری کرنا چاہتی تھی۔

میں ابھی اس معاملے کے بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہتا لیکن میں آپ کو توجہ دلاؤں گا کہ ایک پرٹیکلر بات کو لے کر اس طرح کا رنگ دینا کہ وہ ایک جنرل بات بن جائے اور پھر اس سے طرح طرح کے نتیجے نکالنا، درست طریقہ نہیں ہے۔ اصلی سوال یہ ہے کہ فارن مشنری جماعتوں کے بارے میں اس وقت تک گورنمنٹ آف انڈیا کی جو پالیسی رہی ہے، کیا اس میں اب کوئی تبدیلی ہوئی ہے؟ میں آپ کو یقین دلاؤں گا کہ اس طرح کی کوئی بات نہیں ہوئی ہے اور جو اندیشے آپ کی طبیعت میں پیدا ہوئے ہیں وہ یک قلم بے بنیاد ہیں۔

آپ نے لکھا ہے کہ اگر ضرورت ہوئی تو آپ دلی آئیں گے اور پرایم منسٹر سے ملیں گے۔ میں پرایم منسٹر کی جانب سے اور اپنی جانب سے آپ کو یقین دلاؤں گا کہ آپ جب

کبھی ملنا چاہیں گے ہم نہایت خوشی کے ساتھ وقت نکالیں گے اور آپ کی ملاقات کی خوشی حاصل کریں گے۔

ہوم منسٹر کا مقصد یہ تھا کہ پچھلے زمانے میں بعض مشنری سوسائٹیوں نے ماس کنورژن کا جو طریقہ اختیار کیا تھا وہ کنورژن کا صحیح طریقہ نہیں ہے اور اگر اس طرح کا طریقہ اب کام میں لایا جائے گا تو گورنمنٹ اسے قابل اعتراض طریقہ سمجھے گی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے جو ہوم منسٹر نے اب کہی ہو۔ انڈی پنڈنس کے بعد اس بارے میں ذمے داری مشنری جماعتوں نے بارہا اس بارے میں گفتگو ہوئی اور انھوں نے گورنمنٹ کے پوائنٹ آف ویو سے اتفاق کیا۔ اسی طرح جب انڈین کانسٹی ٹیوشن ترتیب دیتے ہوئے فنڈامینٹل رائٹس کا سبجیکٹ پیش آیا تھا تو کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی نے اس معاملے پر پوری طرح غور کیا تھا اور اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ''ماس کنورژن'' کا طریقہ فی الحقیقت مذہبی کنورژن نہیں ہے۔ اسمبلی کے کرسچین ممبرز نے بھی اس سے اتفاق کیا تھا۔

مذہبی کنورژن کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ایک بالغ عمر کا آدمی اس بات پر غور کرتا ہے کہ اپنے مذہب کے بارے میں کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے؟ اور جب وہ مطمئن ہو جاتا ہے کہ اسے اپنا مذہب چھوڑ کر ایک دوسرا مذہب اختیار کرنا چاہیے تو وہ اپنی فری چوائس سے دوسرا مذہب اختیار کر لیتا ہے۔ یہ دماغ اور دل کا سچا کنورژن ہے اور اس کا حق ہر آدمی کو ملنا چاہیے۔

لیکن ایک دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کسی سوشل یا اکنامک کاز کی وجہ سے بہت سے آدمیوں کا ایک گروپ اس پر آمادہ ہو جاتا ہے کہ ایک مذہب کے سرکل سے نکل کر دوسرے مذہب کے سرکل میں داخل ہو جائے۔ اگر اس گروپ کے ہر انڈیویجول آدمی سے پوچھا جائے کہ اس نے پرانا مذہب کیوں چھوڑا تو وہ اس کے جواب میں کوئی ایسی بات نہیں بتلا سکے گا جس سے معلوم ہو کہ واقعی اس نے مذہبی سچائی کے پروبلم پر غور کیا ہے اور اس کو سمجھا ہے۔ اکثر حالتوں میں یہ گروپ یک قلم ناسمجھ اور جاہل آدمیوں کا ہوتا ہے جو کسی حال میں بھی اس قابل نہیں ہوتے کہ مذہب کے بارے میں کوئی رائے قایم کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کے کنورژن کو مذہبی کنورژن نہیں کہا جا سکتا۔ کنورژن کی جگہ اسے کسی دوسرے نام سے پکارنا چاہیے۔ لیکن کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی نے اسے ''ماس کنورژن'' کے نام سے پکارا تھا۔

اسی طرح نابالغ بچوں کا معاملہ ہے۔ اگر ان کو کوئی شخص کنورٹ کرتا ہے تو فی الحقیقت یہ کنورژن نہیں ہے۔

جہاں تک پہلے قسم کے کنورژن کا تعلق ہے، اس کا حق انڈیا میں ہر شخص کو حاصل ہے۔ ہر مذہب کا ماننے والا اگر چاہیے تو اپنے مذہب کو پری چنگ کے ذریعے دوسروں کے آگے پیش کر سکتا ہے اور دوسروں کو پورا حق ہے کہ اگر وہ چاہیں تو اپنی فری چوائس سے اپنا مذہب بدل لیں۔ انڈین کانسٹی ٹیوشن نے اس حق کا اعتراف کیا ہے اور ایک منٹ کے لیے گورنمنٹ آف انڈیا کا یہ منشا نہیں ہے کہ اس حق میں انٹرفیر کرے۔ جہاں تک فارن کرسچین مشنریز کا تعلق ہے، بلاشبہ انھیں بھی یہ حق حاصل ہے کہ جو بالغ عمر کا آدمی اپنی خوشی سے کرسچین ہونا چاہتا ہے، اسے کرسچین بنائیں۔ ان کے اس حق میں جو انھیں انڈین کانسٹی ٹیوشن نے دیا ہے کوئی مداخلت کرنی نہیں چاہتا۔

لیکن جہاں تک دوسری قسم کے کنورژن کا تعلق ہے، یعنی اس کنورژن کا مجھے یقین ہے کہ کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کے کرسچین ممبروں کی طرح آپ بھی تسلیم کریں گے کہ یہ حقیقتاً مذہبی کنورژن نہیں ہے اور اب چاہیے کہ اس طرح کے کنورژن کا طریقہ اختیار نہ کیا جائے۔ ۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۸ء میں میری جس قدر گفتگو فارن مشنریوں سے ہوئی تھی میں کہہ سکتا ہوں کہ سب نے تسلیم کیا تھا کہ اس طرح کے ماس کنورژن کا طریقہ مناسب نہیں ہے اور وہ نہیں چاہتے کہ اسے اختیار کریں۔

آزاد

(آثار و نقوش: ص ۸-۱۴۵)

مولانا ابوالکلام آزاد کے اس خط پر ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری کے قلم سے ذیل کا ایک حاشیہ بھی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

حاشیہ ❶: تبدیلی مذہب تاریخ مذاہب کا ایک اہم موضوع رہا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا آزاد نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ صرف ہندوستان کے دستور کا محض اعلان ہی نہ تھا، صاف محسوس کیا جا سکتا ہے کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے مولانا کی سوچی سمجھی رائے اور ان کے قلب کا اطمینان بھی اسی فیصلے میں تھا۔ ان کا بیان حکومتِ ہند کے وزیرِ قانون کے بیان کا دفاع اور حکومت کی پالیسی کی صرف وضاحت ہی نہیں، اس کے ساتھ دلایل کی قوت بھی ہے۔ یہ نہ صرف

مولانا آزاد کی ذاتی رائے تھی بلکہ اکابر مسلمانانِ ہند کا سوچا سمجھا فیصلہ بھی یہی تھا۔

مولانا محمد علی کی کوششوں سے ۱۹۲۴ء میں ایک اتحاد کانفرنس ۲۶ر ستمبر تا ۲ر اکتوبر دہلی میں پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں ہوئی تھی۔ اس میں مسلم زعما میں سے مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب (صدر جمعیت علماے ہند)، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد، حکیم محمد اجمل خاں، مولانا احمد سعید دہلوی (ناظم جمعیت علماے ہند) وغیرہم شریک ہوئے تھے۔ اس کانفرنس میں مسجد کے سامنے باجا بجانے، گائے کی قربانی کرنے، ترک مذہب کے حق، مرتد کی سزا، انفرادی اور اجتماعی صورتوں میں تبدیلی مذہب، بانیانِ مذاہب کے احترام، اختلافات کے تصفیے، قومی پنچایت کے قیام وغیرہ کے بارے میں جو فیصلے کیے گئے تھے ان کی تفصیل کے لیے "قرار داد اتحاد کانفرنس منعقدہ دہلی" (مطبوعہ آئی ایم ایچ پریس۔ دہلی) اور کفایت المفتی جلد نہم: صفحہ ۶۲-۳۴۳ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ مختصراً چند خاص فیصلے یہ ہیں:

۱۔ ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ چاہے جس مذہب کو مانے اور جب چاہے اسے بدل سکے۔ دھرم بدلنے کی وجہ سے وہ قابل تعزیز نہ سمجھا جائے گا اور نہ اس کو کسی قسم کی اذیت پہنچائی جائے گی۔

۲۔ ہر ایک فرد یا جماعت کا حق ہے کہ بحث کر کے یا سمجھا بجھا کر جو دوسرے مذہب میں چلا گیا ہو اسے واپس لا سکے، مگر زبردستی یا دھوکا دے کر یا کسی ناجائز طریقے سے مثلاً کسی چیز کا لالچ دے کر کوئی کسی کا مذہب تبدیل نہ کرائے۔

۳۔ تبدیلیٔ مذہب کے متعلق کوئی پوشیدہ بات نہ ہونی چاہیے۔ کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ دوسرے مذہب والوں کو ان کی اپنی جگہ میں عبادت گاہ بنانے سے روکے یا اس میں خلل ڈالے۔ نئی عبادت گاہ دوسرے مذہب کی عبادت گاہ سے کچھ دور بنائی جائے۔

۴۔ پندرہ آدمیوں کی ایک قومی پنچایت بنائی جائے اور اسے حق دیا جائے کہ مختلف مذہبوں کے مقامی نمایندوں کی رائے سے وہاں مقامی پنچایت قایم کرے جو اس قسم کے سب ہی جھگڑوں کو نبٹا دیا کرے۔ پنچایت کو اپنے قواعد و ضوابط بنانے کا بھی حق ہوگا۔ اس پنچایت کے صدر مہاتما گاندھی ہوں گے اور حکیم اجمل خاں (مسلمان) لالہ لاجپت رائے (ہندو) مسٹر کے نریمان (پارسی) ڈاکٹر ایس کے دت (عیسائی) ماسٹر سندر سنگھ لایل پوری (سکھ) ممبر خصوصی ہوں گے۔ باقی ممبروں کو وہی چن لیں گے۔ (اس ش)

ایران میں انقلاب۔مصدق کی برطرفی:❶

۱۳راگست ۱۹۵۳ء: ایران میں ہندوستان کے سفیر تاراچند کو ایک خط میں مولانا آزاد نے لکھا:

''مائی ڈیئر تاراچند!

آپ کی چٹھی مورخہ ۱۹راگست مجھے پہلی ستمبر کو وصول ہوئی۔ان چند دِنوں کے اندر ایران کی دنیا یک قلم بدل گئی۔جس ایران میں کل تک مصدق سے بڑھ کر اور کوئی طاقت ور شخصیت نہ تھی،آج اسی ایران میں سب سے زیادہ بے یار و مددگار شخصیت مصدق کی ہے!

یہ انقلاب جس تیزی سے ہوا وہ ابتدا میں ناقابل فہم تھا،لیکن پھر جب تفصیلات آئیں تو معلوم ہوا کہ آرمی کی طرف سے مصدق دھوکے میں رہا تھا۔وہ اس کے ساتھ نہ تھی، جب وقت آیا تو نکلی اور مصدق کا تخت الٹ دیا۔''

ڈاکٹر محمد مصدق وزیرِ اعظم ایران کو شاہ ایران آریہ مہر نے ۱۳راگست ۱۹۵۳ء کو برطرف کر کے مسٹر زاہدی کو وزارت عظمیٰ کے منصب پر متمکن کر دیا تھا۔

۱۹۵۱ء میں مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کے دورے کے موقع پر ۱۰رجون کو تہران میں مولانا آزاد نے ڈاکٹر محمد مصدق سے ملاقات کی تھی اور اس سوال کے جواب میں کہ آیا تیل کو قومی ملکیت قرار دیے جانے کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟ مولانا نے فرمایا تھا ''یہ تو ایران کا حق ہے۔'' ۱۹۵۳ء تک اس مسئلے نے پیچیدہ صورت اختیار کر لی تھی۔مولانا کو حالات کی نزاکت کا اندازہ ہوا تو انھوں نے ۱۹رجون ۱۹۵۳ء کو ڈاکٹر مصدق کو ایک خط میں مشورہ دیا:

''آپ متنازع تیل کے مسئلے میں اپنا رویہ نرم رکھیں اور برطانیہ سے تصفیہ کرنے کی کوشش کریں۔'' (آثار ونقوش:ص ۶۳-۶۴)

حاشیہ ❶:ایران میں انقلاب ۱۳راگست ۱۹۵۳ء کو آیا تھا۔۱۹راگست کی سفارتی ڈاک سے اس کی تفصیل یکم ستمبر کو پہنچی۔(آثار ونقوش)

پاک و ہند کے وزرائے اعظم کے مذاکرات اور اعلامیہ:

۱۶راگست ۱۹۵۳ء: کو پاکستان کے وزیر اعظم بھارت، کے دورے پر نئی دہلی گئے۔

چار روز تک مذاکرات کا سلسلہ جاری رہا۔ مشترکہ اعلامیہ میں کہا گیا تھا:

❁ کشمیر سمیت دونوں ملکوں کے باہمی مسایل پر بھرپور اور صاف صاف گفتگو ہوئی۔ دونوں ممالک کے وزرائے اعظم باہمی مفادات کے پیش نظر درپیش مسایل کو جلد از جلد بُرامن اور تعاون سے حل کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ ان کی یہ ٹھوس رائے ہے کہ مسئلہ کشمیر کو کشمیری عوام کی خواہشات کے مطابق یوں حل کیا جائے جس سے ان کی فلاح و بہبود کو فروغ ملے اور ریاست کے عوام کی زندگی میں کم از کم خلل پیدا ہو۔ عوام کی خواہشات کو جاننے کا سب سے قابل عمل طریقہ منصفانہ اور غیر جانب دارانہ رائے شماری ہے۔

❁ اس خوش گوار صورت حال کو پاکستان کے وزیر خارجہ نے منیلا میں بیٹھ کر سبوتاژ کر دیا۔ انھوں نے ۶ ستمبر کو امریکا کے ساتھ دفاعی معاہدہ سیٹو میں شامل ہونے کی حامی بھر لی اور اپنی حکومت کو اعتماد میں لینے کی ضرورت تک محسوس نہ کی۔ حال آں کہ کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ قبول کرتے وقت پاکستان نے دوٹوک الفاظ میں اعلان کیا تھا کہ کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ قبول کرنے کا مطلب کوئی قبل از وقت عہد و پیمان نہیں ہے۔ وزرائے خارجہ کے غور و فکر سے ابھرنے والے فارمولے کا پاکستان جائزہ لے گا، اس کی مزید شرکت کا دارومدار اس فارمولے کے محتاط تجزیے پر ہوگا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے پاکستان کے وزیر خارجہ سر محمد ظفر اللہ خان نے حکومت کے واضح اور غیر مبہم اعلان کے باوجود دفاعی معاہدے کی دستاویز پر دستخط کر کے پاکستان کو اس دلدل میں کیوں پھنسایا؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ وزیر خارجہ کے دینی مسلک (قادیانیت) کو پاکستان میں پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ عام مسلمان برہم اور متنفر ہے۔ وزیر خارجہ کو ملک میں اپنا مستقبل غیر روشن نظر آتا تھا اس نے حکومت کی رائے جانے بغیر معاہدے پر دستخط کر دیے۔ اس کے عوض عالمی عدالت انصاف میں جج کا منصب حاصل کر لیا اور یہ معاہدے پر دستخط کر دینے کے صرف ایک ماہ بعد ہوا۔

بھارتی وزیر اعظم نے نئی صورت حال پر احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ امریکا کی جانب سے پاکستان کو فوجی امداد اور تعاون سے بھارت اور پاکستان کے مسایل متاثر ہوں گے اور خاص کر مسئلہ کشمیر، امریکی فوجی تعاون سے خطے کی موجودہ صورتِ حال میں وصفی تبدیلی رونما ہوگئی ہے۔ ہندوستان اب کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ جیسا کہ بھارت ماضی میں تیار ہوگیا

تھا۔ بھارت کے لیے جو نیا خطرہ پیدا ہو گیا ہے اسے پیش نظر رکھتے ہوئے بھارت ریاست کشمیر میں اپنی مسلح افواج اور فوجی ساز و سامان رکھنے میں بالکل آزاد ہے۔

پاکستان کے دفاعی معاہدوں میں شامل ہونے سے ہندوستان کے مطابق خطے کی صورتِ حال تبدیل ہوگئی، طاقت کا توازن بدل گیا اور ہندوستان نے استصواب رائے کرانے کے بارے میں سابقہ رویے میں تبدیلی پیدا کرلی، وگرنہ ہندوستان کشمیر میں استصواب رائے کے ذریعے اس کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ اس کی تصدیق پاکستان کے ایک سفارت کار ڈاکٹر افضل اقبال نے مولانا آزاد کے حوالے سے کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''راجہ غضنفر علی خان ہندوستان میں پاکستان کے ہائی کمشنر تھے۔ ہندوستانی معاشرے کے ہر طبقے سے ان کے تعلقات قریبی اور خوش گوار تھے۔ جب پاکستان کو امریکی معاہدے کے مطابق اسلحہ کی فراہمی کا اعلان ہوا تو سرد جنگ ہمارے دروازے تک آن پہنچی۔ نہرو نے کشمیر میں استصواب رائے کرانے سے دست کشی اختیار کرلی اس پر راجہ غضنفر علی شدید مضطرب ہوئے۔ ہندوستانی کابینہ کے اراکین پاکستان ہاؤس (تقسیم سے قبل لیاقت علی خان کی رہائش گاہ ''گلِ رعنا'') میں تشریف لائے۔ وہ مولانا آزاد اور ہندوستان کے طاقتور وزیرِ خوراک رفیع احمد قدوائی تھے۔ سفارت خانوں کی ضیافتوں یا دیگر تقریبات میں شمولیت مولانا کا کبھی معمول نہ تھا۔ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب گورنر جنرل غلام محمد دہلی آئے تھے، جن کا دعویٰ تھا کہ پنڈت نہرو کے ساتھ ان کے ذاتی تعلقات بے تکلفانہ اور دوستانہ ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ راجہ صاحب کے لیے مراسلے میں مولانا آزاد کی گفتگو کا ایک جملہ ہو بہو درج کیا گیا تھا جو کچھ اس طرح کے تاثر کا تھا:

"Why did you do this Kashmir was falling in your lap like gripe fruit."

''یہ آپ نے کیا کیا؟ کشمیر پکے ہوئے پھل کی طرح آپ کی گود میں گر رہا تھا۔''

آگے چل کر یہی سفارت کار لکھتا ہے:

''مولانا آزاد کا استدلال تھا کہ اس وقت پاکستان نے امریکا سے اسلحہ حاصل کرنے کا معاہدہ کر کے غیر دانش مندی کا مظاہرہ کیا۔ اسے اس مقصد کے لیے اس وقت تک انتظار کرنا چاہیے تھا جب ایڈمرل نمز کشمیر میں استصواب کے منتظم کا عہدہ سنبھالتا..... ان کے خیال میں پاکستان نے اہم موقع پر فاش غلطی کا ارتکاب کیا اور ہندوستان کو وعدے سے منحرف ہونے کا موقع فراہم کر دیا۔''

(ڈاری آف اے ڈپلومیٹ: ڈاکٹر افضل اقبال، کراچی، ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، ۱۹۸۶ء: ص ۷۶-۷۵، بہ حوالہ ''ابوالکلام آزاد اور حریت پرست مسلمانوں کی سیاست: ص ۶۵۵)

حیدر آباد دکن:

حیدرآباد کے مستقبل کے بارے میں بھی مولانا سخت فکرمند تھے۔ حیدر آباد نے مسلم تہذیب وثقافت کی بڑی آب یاری کی۔ مولانا اس دولت، سرمائے اور اثاثے کو محفوظ بنانا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ حیدر آباد ہندوستان کے قلب میں واقع ہے۔ یہاں کا حکم ران مسلمان ہے لیکن ریاست کی مسلمان آبادی صرف چودہ فیصد ہے اور غالب اکثریت غیر مسلموں کی ہے۔ ان کی خواہش تھی کہ حیدر آباد کے مستقبل کا مسئلہ خوش اسلوبی سے افہام و تفہیم اور سیاسی انداز میں طے پا جائے۔ انھوں نے اس سلسلے میں حیدر آباد دکن کے وفد کو سمجھانے کی کوشش بھی کی کہ وہ حکومت ہندوستان سے معاملات طے کر لیں، بہ صورت دیگر فرقہ واریت کا عفریت اور تقسیم کے مضرات سے ریاست بچ نہ سکے گی۔ وفد کے قاید میر لایق علی بہت زیادہ خوش فہمیوں میں مبتلا تھے اور انجمن اتحاد المسلمین کے رضا کاروں کی مدد سے صورت حال کو سنبھال لینے کی غلط فہمی کا شکار تھے۔ ان کی گفتگو سن کر مولانا نے خاموشی اختیار کر لی، جیسا کہ غیر معقول رویے پر ان کا معمول تھا۔ خوش فہمیوں کے اسیر حیدر آباد کو روز بد سے بچا نہ سکے اور مولانا نے جن اندیشوں کی نشان دہی کی تھی وہ بالکل درست ثابت ہوئے۔

مولانا آزاد اور مسلم لیگ:

مولانا سیاست میں مسلمانوں کے طرز عمل سے مطمئن نہ تھے۔ ۱۹۰۵ء میں ان کا

رابطہ غیر مسلم انقلابیوں سے پیدا ہو چکا تھا، لیکن وہ مسلمانوں کو بہ حیثیت مجموعی فعال دیکھنا چاہتے تھے تا کہ تحریک آزادی میں ان کا حصہ نظر آئے۔ ان کی تو خواہش تھی کہ وہ تحریک آزادی میں ہراول کا کردار ادا کریں۔ جیسا کہ انھوں نے ''الہلال'' میں لکھا:

''پس چاہیے تھا کہ ہندوستان کی تمام قومیں مسلمانوں کے پیچھے پیچھے ہوتیں۔''

مزید لکھتے ہیں:

''ہندوستان کے لیے ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا داخل حب الوطنی ہے، مگر آپ کے لیے ایک دینی فریضہ ہے اور داخل جہاد فی سبیل اللہ۔ آپ کو اللہ نے اپنی راہ میں مجاہد بنایا ہے اور جہاد کے معنی میں ہر وہ کوشش داخل ہے جو حق، وصداقت اور انسانی بند استبداد و غلامی کو توڑنے کے لیے کی جائے۔ آج جو لوگ ملک کی فلاح اور آزادی کے لیے اپنی قوتوں کو صرف کر رہے ہیں یقین کیجیے کہ وہ بھی مجاہد ہیں اور ایک ایسے جہاد میں مصروف ہیں جس کے لیے دراصل سب سے پہلے آپ کو اٹھنا تھا۔''

وہ قوم کو صدا دیتے تھے:

''غفلت و سرشاری کی بہت سی راتیں بسر ہو چکیں، اب خدا کے لیے بستر مدہوشی سے سر اٹھا کر دیکھیے کہ آفتاب کہاں تک نکل آیا ہے؟ آپ کے ہم سفر کہاں پہنچ گئے ہیں اور آپ کہاں پڑے ہیں؟''

مولانا اس درد سے تڑپ رہے تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کو اپنے خیالات کے سانچے میں ڈھالنے کے جذبے کے تحت مسلم لیگ کے تاسیسی اجلاس میں بھی شرکت کی، لیکن وہ مطمئن نہ تھے۔ اس کا اظہار انھوں نے ''الہلال'' میں تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ مسلمانوں کی حالت زار کی نقشہ کشی کرتے ہوئے ''تاریخ آزادی جو لکھی جائے گی'' کے زیر عنوان رقم طراز ہیں:

''جو ہونے والا اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے نہیں روک سکتی، یقیناً ایک دن آئے گا جب کہ ہندوستان کا آخری سیاسی انقلاب آچکا ہوگا، غلامی کی وہ بیڑیاں جو اس نے خود پاؤں میں ڈال لی ہیں۔ بیسویں صدی کی ہوائے حریت

کی تیغ سے کٹ کر گر چکی ہوں گی اور وہ سب کچھ ہو چکے گا جس کا ہونا ضرور ہے۔ فرض کیجیے اس وقت ہندوستان کی ملکی ترقی کی ایک تاریخ لکھی گئی تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس میں ہندوستان کے سات کروڑ انسانوں کی نسبت کیا لکھا جائے گا؟......ایک بدبخت اور زبوں طالع قوم، جو ہمیشہ ملکی ترقی کے لیے ایک روک، ملک کی فلاح کے لیے ایک بدقسمتی، راہِ آزادی میں سنگ گراں، حاکمانہ طمع کا کھلونا، دست اجانب میں بازیچۂ لعب، ہندوستان کی پیشانی پر ایک گہرا داغ اور گورنمنٹ کے ہاتھوں میں ملک کی امنگوں کو پامال کرنے کے لیے ایک پتھر بن کر رہی۔ اس میں لکھا جائے گا کہ ایک قابل رحم مگر مسحور انسانوں کا گلہ، جس کے ہر فرد کو کسی زبردست کاہن نے اپنے منتر سے جانور بنا دیا تھا، جو اپنے بچانے والے آقا کے ہاتھ میں اپنی گردن کی رسی دیکھتی تھی اور خوش ہوتی تھی۔ جس میں کوئی انسانی ارادہ، کوئی انسانی حرکت اور کوئی انسانی زندگی کا ثبوت نہیں تھا۔ جو نہ اپنے دماغ سے سوچ سکتی تھی اور نہ اپنی آواز سے بول سکتی تھی، نہ اپنے پاؤں سے چل سکتی تھی اور نہ اپنے ہاتھ کو اپنا ہاتھ سمجھ کر اٹھا سکتی تھی۔ ایک معمول، جو ہمرایزر کے ارادے پر زندہ ہو، ایک پتھر جو بغیر کسی ذی روح کے حرکت دیے ہل نہ سکتا ہو اور سب سے آخر یہ کہ ایک بدبختی کا داغ جو انسانیت کی پیشانی پر ہو۔" (ابوالکلام آزاد اور قوم پرست......: ص ۶۰۲-۶۰۰)

سید سلیمان ندوی کا انتقال- دارالعلوم دیوبند کا جلسۂ تعزیت:

۲۹ر نومبر ۱۹۵۳ء: دیوبند، ۲۴ر نومبر، علامہ سید سلیمان ندوی کے انتقال کی خبر سے دارالعلوم کے طلبہ اور اساتذہ میں غم واندوہ کی لہر دوڑ گئی۔ ایک گشتی مراسلے کے ذریعے فوراً ایک تعزیتی جلسے کا اعلان وانعقاد کیا گیا۔ جلسے سے متعدد اساتذہ نے خطاب کیا۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی، شیخ الحدیث دارالعلوم نے علامہ مرحوم کی علمی اور مذہبی خدمات کا تذکرہ فرمایا اور کہا "ہمیں افسوس ہے کہ مرحوم اپنی رحلت سے کچھ پہلے ہندوستان چھوڑ چکے تھے۔ مگر مولانا کی رحلت ہمارے اور ہندوستان کے علمی حلقوں کے لیے ناقابل تلافی نقصان ہے۔" بعد میں مولانا کی مغفرت کے لیے دعا کی گئی۔

دارالعلوم میں بہار کے طلبہ نے بھی مولانا مرحوم کے علمی تذکرے اور تعزیت میں ایک جلسہ کیا۔ (الجمعیۃ-دہلی: ۲۹ر نومبر ۱۹۵۳ء، ص ۴)

سید سلیمان ندوی (پ ۱۸۸۴ء) مشہور محقق، مؤرخ اور سیرت نگار تھے۔ دارالمصنفین کے ناظم اور معارف اعظم گڑھ کے مدیر شہیر تھے۔ نیشنلسٹ خیالات رکھتے تھے، زندگی بھر جمعیت علمائے ہند سے تعلق رہا، اس کے صدر ہوئے، مجلسِ عاملہ کے رکن رہے، متعدد سب کمیٹیوں کے ممبر منتخب ہوتے رہے، لیکن مرحوم کا ذوقِ عملی سے زیادہ علمی تھا۔ وہ دورِ آخر کے علمائے محققین کے سرخیل تھے۔ جون ۱۹۵۰ء میں پاکستان آگئے تھے۔ ان کی پاکستان ہجرت کو ہندوستان کے مسلمان حلقوں میں پسند نہیں کیا گیا تھا۔ ان کے اس عمل سے ہندوستان کے مسلمانوں کو نقصان پہنچا تھا۔ پاکستان میں وہ کوئی علمی و عملی کارنامہ انجام نہیں دے سکے۔ ۲۳ر نومبر ۱۹۵۳ء کو کراچی میں انتقال ہوا تھا۔ (اس ٹ)

انٹی قادیانی-تحریکِ راست اقدام:

۱۹۵۳ء کی تحریک راست اقدام میرزائیت کے خلاف سب سے بڑی تحریک تھی۔ اس سے پہلے میرزائیت کی پیدائش سے لے کر کسی دور میں اتنا زبردست مظاہرہ کبھی نہ ہوا تھا۔ یہی تحریک تھی جس میں!

(۱) مسلمانوں کے تمام فرقوں نے متحد العمل ہو کر احتجاج کیا۔

(۲) حکومت نے مسلمانوں کی متفقہ آواز کو ٹھکرا کر اس سے ٹکر لی۔

(۳) پنجاب میں پولیس کا نظام شل ہو گیا۔ صوبائی سیکرٹریٹ کا ماتحت عملہ خوف ناک حکومتی تشدد کے خلاف تحریک میں احتجاجاً شامل ہو گیا۔ اس کے علاوہ لاہور میں ریلوے، ٹیلی گراف اور ٹیلی فون کے عملے نے بھی ہڑتال کی۔

(۴) اکثر اضلاع کی انتظامیہ بے بس ہو گئی۔

(۵) حکومت نے پاکستان کی بہادر فوج کو اپنی ہی قوم کے خلاف استعمال کیا۔

(۶) فوج نے مارشل لا کی شدت کو ہمہ جہت استعمال کیا۔

(۷) ان علما کو جو تحریک میں شامل تھے، ایک منتقمانہ ذہن کے ساتھ بہیمانہ سلوک کا مستحق گردانا گیا۔

(۸) مسلمانوں کی ایک ڈار جیل میں بند کر دی گئی۔ بہت سے مسلمان، پولیس اور فوج نے سرِ عام شہید کیے۔

(۹) بعض پولیس افسر جو گناہ گار راتیں گزارنے کے عادی تھے، انھوں نے مسلمانوں کو سرِ عام گولیوں سے بھون ڈالا اور ان کی لاشوں کے ساتھ انتہائی وحشیانہ سلوک کیا۔

(۱۰) میرزائیوں نے اپنی جیپوں اور کاروں میں سوار ہو کر بے گناہ مسلمانوں کو شہید کیا۔

(۱۱) میرزائیوں کو ہر عنوان سے تحفظ دیا گیا۔

(۱۲) سب سے احمقانہ ناٹک تحقیقاتی عدالت کا وہ ڈرامہ تھا جو پنجاب ہائی کورٹ کے چیف جسٹس محمد منیر کی صدارت میں کھیلا گیا۔ جسٹس محمد منیر نے علما کا استخفاف کیا اور جب ۳۸۷ صفات پر مشتمل انگریزی میں رپورٹ تیار کی تو وہ اسلام کے نام پر قایم شدہ مملکت کے ایک صوبائی چیف جسٹس کی اسلام کے خلاف شرم ناک دستاویز تھی۔

اس تحریک کا آغاز کیوں کر ہوا؟ احرار کے باب میں بیان ہو چکا ہے۔ میرزا بشیر الدین محمود عالمی اقتدار کی شہ پر اقتدار کا خواہاں نہ ہوتا، میرزائی افسر اپنے عقاید کی آبادی میں منہمک نہ ہوتے، سر ظفر اللہ خاں وزارت خارجہ کی مسند پر فروکش ہو کر مختلف عہدوں پر قادیانیوں کی بھرتی نہ کرتا اور سفارت خانوں میں قادیانی امت دوہری خدمات کے لیے مامور نہ ہوتی تو نہ مختلف مکاتبِ فکر کے علما متحد العمل ہوتے اور نہ مسلمانوں میں تحریک اس شباب کو پہنچتی۔ اس تحریک کے پھیلاؤ کا واحد سبب یہ تھا کہ میرزائی خطرہ واضح ہو چکا تھا۔ خواجہ ناظم الدین سیدھے سادھے مسلمان تھے۔ انھوں نے مجلسِ عمل کے وفود سے صاف صاف کہا اور تحقیقاتی عدالت کے سامنے بیان دیتے ہوئے بھی اعتراف کیا کہ وہ مجلسِ عمل کے مطالبات تسلیم کرنے کی پوزیشن میں نہ تھے۔ کیوں کہ خارجی دباؤ قادیانیوں کے حق میں تھا اور امریکا ظفر اللہ خاں کی علاحدگی پر پاکستان کی غذائی ضروریات کے لیے گندم دینے کو تیار نہ تھا۔ صرف یہی چیز ظاہر کرتی ہے اور یہ اس وقت کے وزیر اعظم کا بیان تھا کہ میرزائی رسوخ کا حال کیا تھا اور ظفر اللہ خاں نے استعماری طاقتوں کو اپنے لیے کیوں کر ڈھال رکھا تھا۔

آل پاکستان مسلم پارٹیز کانفرنس کے مطالبات، احرار کے باب میں درج کیے جا چکے ہیں۔

(۱) قادیانیوں کو جداگانہ اقلیت قرار دیا جائے۔

(۲) سر ظفر اللہ خاں کو وزارتِ خارجہ سے سبک دوش کر دیا جائے۔

(۳) میرزائی افسروں کو کلیدی آسامیوں سے ہٹایا جائے۔

(۴) ربوہ کی بقیہ اراضی پر مہاجرین کو آباد کیا جائے۔

جب خواجہ صاحب نے مندرجۂ بالا عذر کے تحت ان مطالبات کو تسلیم کرنے سے انکار کیا تو ان پارٹیز نے ایک مجلسِ عمل قایم کی اور اس طرز کے راست اقدام کا فیصلہ کیا کہ

(۱) خواجہ ناظم الدین مطالبات تسلیم نہ کرنے کے عذر پر مستعفی ہو جائیں۔

(۱) میرزائیوں کا کامل مقاطعہ کیا جائے۔

تمام پارٹیز سے پندرہ ارکان کی ایک مجلسِ عمل قایم کی جائے جو راست اقدام کی انچارج ہو اور راست اقدام یہ تھا کہ پانچ رضا کار مطالبات کے جھنڈے اٹھا کر وزیر اعظم کی کوٹھی پر جائیں اور پُر امن رہ کر لگاتار مظاہرہ کریں۔ اسی قسم کا مظاہرہ گورنر جنرل ہاؤس پر کیا جائے۔ عوام سے اپیل کی گئی کہ وہ رضا کاروں کے ساتھ بالکل نہ جائیں۔ مولانا ابوالحسنات کو پہلا ڈکٹیٹر مقرر کیا گیا۔ خواجہ ناظم الدین سے آخری وفد ۲۲ر فروری کو ملا۔ خواجہ صاحب نے دوٹوک جواب دے دیا تو ۲۶ر فروری کو اس صورت حال پر غور کرنے کے لیے کراچی میں مجلسِ عمل کا ایک اجلاس ہوا، اس میں راست اقدام کا فیصلہ کیا گیا، لیکن اسی شب یعنی ۲۶ر اور ۲۷ر فروری کی درمیانی رات کو حکومت نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا ابوالحسنات قادری، ماسٹر تاج الدین انصاری، مولانا لال حسین اختر اور سید مظفر علی شمسی کو بعض دوسرے رفقا سمیت کراچی میں گرفتار کر لیا۔ ہر تحریک کا خاصہ ہے کہ جب اس کے راہ نما اس طرح گرفتار کیے جاتے ہیں تو عوام بھڑک اٹھتے ہیں اور ان کا احتجاج ہمہ گیر ہو جاتا ہے۔ ملک میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی، پنجاب آگ بگولا ہو گیا۔ تمام صوبے میں تحریک کے نمایاں راہ نما اور معروف کارکن بھی اسی رات پکڑ لیے گئے۔ لاہور، گوجرانوالہ، سیال کوٹ، راول پنڈی، لائل پور اور منٹگمری میں تحریک کا طوفان برپا ہو گیا۔ راقم نے لاہور کے احتجاجی جلوس خود دیکھے، ان کا جوش و خروش بے پناہ تھا لیکن سب پُر امن تھے۔ وہ دہلی دروازے

سے نکلتے اور فلیمنگ روڈ سے گورنمنٹ ہاؤس کی طرف جاتے۔ پولیس انھیں اسمبلی ہال کے چوک میں روکتی اور گرفتاریاں کرتی۔ آخر پولیس نے اپنے وحشیانہ تشدد کا آغاز کیا اور مختلف اکابر کی گرفتاریوں کے بعد ان مورچوں پر حملہ آور ہوگئی جو اس غرض سے قایم تھے۔ مولانا اختر علی خاں ایڈیٹر ''زمیندار'' تحریک سے نکل جانا چاہتے تھے، لیکن عوام کے دباؤ میں آکر گرفتار ہوگئے۔ حضرت مولانا احمد علی نے ایک جلوس کی راہ نمائی کی، انھیں گرفتار کرلیا گیا۔ پولیس کا اندازہ یہ تھا کہ وہ رضا کاروں کو پکڑتی اور ٹرکوں پر سوار کر کے کہیں دور جا کر چھوڑ دیتی۔ ۲؍ مارچ کو افسروں نے ایک میٹنگ کر کے اپنی امداد کے لیے فوج کو درخواست کی اور رات دفعہ ۱۴۴ لگا کر جلوس وغیرہ نکالنے کی ممانعت کردی۔ اِدھر ۳؍ مارچ کو جناح باغ میں فوج پہنچ گئی، اس کے ساتھ بارڈر پولیس بھی آگئی، لیکن اندرون شہر کا علاقہ دفعہ ۱۴۴ سے مستثنیٰ رکھا گیا۔ ادھر انارکلی میں ۱۳۱ آدمی دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی میں پکڑے گئے۔

(تحریک ختم نبوت، از: شورش کاشمیری: ص ۱۳۲-۱۳۱)

ایک اندازے کے مطابق ایک ہزار مسلمان اس تحریک میں شہید کیے گئے۔ کس قدر مجروح ہوئے معلوم نہ ہوسکا۔ لیکن گرفتار شدگان کے متعلق پندرہ ہزار کا اندازہ لگایا گیا۔

اس تحریک اور حکومتی تشدد نے کئی چیزوں کا جنم دیا۔

(۱) اپنی ہی قوم سے وحشیانہ سلوک کیا گیا۔ جس سے نوکر شاہی کو سیاست کا چسکا پڑ گیا اور اس نے حکومت کا خواب دیکھنا شروع کیے۔

(۲) جمہوریت کا فانوس گل ہوگیا۔ ملک غلام محمد نے میاں ممتاز دولتانہ کو خواجہ ناظم الدین سے برخاست کرایا۔ پھر ماہ بعد خواجہ ناظم الدین کو برخاست کردیا اور نیشنل اسمبلی توڑ ڈالی۔

(۳) مولوی تمیز الدین اسپیکر نیشنل اسمبلی نے برخاستگی کے خلاف رٹ کی، لیکن جسٹس منیر نے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کی حیثیت سے ملک غلام محمد کے فعل کو جایز قرار دے کر ایک غیر قانونی اقدام کی توثیق کی۔ نتیجتاً عدالتی وقار مجروح ہوگیا اور ملک سازشوں کی ایک نئی ڈگر پر آگیا۔

(۴) فوجی جرنیلوں کا مزاج سیاسی ہوگیا اور وہ ملک پر حکم رانی کے خواب دیکھنے لگے۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے خودنوشت سوانح حیات جس سے اس میلان کی نشان

وہی ہوتی ہے۔

(۵) جس جماعت نے ملک بنایا تھا یعنی مسلم لیگ وہ نوکر شاہی کی داشتہ ہوگئی۔

(۶) عوام اور حکومت متحارب نہیں تو متصادم ادارے ہو گئے۔

اس تحریک کا سب سے بڑا المیہ تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ تھی۔ گورنر پنجاب نے تحقیقاتی عدالت کو آرڈیننس نمبر ۳، ۱۹۵۳ء کی ہدایات و شرایط کے مطابق قایم کیا تھا۔ جسٹس محمد منیر اس کے صدر اور جسٹس محمد رستم کیانی ممبر تھے۔ کمیٹی کی تجویز کردہ ترمیموں کے بعد فسادات پنجاب سے متعلق تحقیقات عامہ ایکٹ ۱۹۵۴ء بن گیا۔ یکم جولائی ۱۹۵۳ء کو تحقیقات کا آغاز ہوا۔ کل ایک سو سترہ اجلاس ہوئے، جن میں ایک سو بارہ اجلاس شہادتوں کے لیے مخصوص رہے۔ کمیشن نے ۲۸ رفروری ۱۹۵۴ء کو اپنا کام ختم کیا اور انگریزی میں تین سو ستاسی صفحات کی ایک رپورٹ لکھی۔ اس کا اردو ترجمہ سرکاری اہتمام میں کرایا گیا جو محکمۂ تعلقات عامہ نے اسی سایز کے چار سو پینتیس صفحات میں شایع کیا۔ اس تحقیقات میں جو ادارے شامل کیے گئے وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) حکومت پنجاب
(۲) صوبہ مسلم لیگ
(۳) مجلسِ احرار
(۴) مجلسِ عمل (مقرر کردہ مجلسِ ختم نبوت۔ پنجاب)
(۵) جماعت اسلامی
(۶) صدر انجمن احمدیہ۔ ربوہ
(۷) احمدیہ انجمن اشاعت اسلام۔ لاہور

میاں ممتاز دولتانہ نے ایک درخواست میں استدعا کی کہ انھیں بھی ایک فریق بنایا جائے۔ اس پر عدالت نے انھیں ایک فریق قرار دے دیا اور ہدایت کی کہ وہ ایک تحریری بیان داخل کریں۔ (تحریکِ ختم نبوت: ص ۹-۱۲۸)

تحریک راست اقدام کے بعد:

تحریک راست اقدام کے بعد پاکستان سیاسی طور پر ایک کٹے ہوئے پتنگ کی طرح ہوگیا۔ اس کے بعد شاید ہی کوئی سال جمعیت خاطر کا ہو۔ ہر روز سیاسی شرارتیں جنم لیتیں اور مقتدرین قومی استحکام کو داؤ پر لگا کر قمار بازی کے شغل میں منہمک ہوتے۔ خواجہ ناظم الدین کی وزارت عظمیٰ تحریکِ ختم نبوت کے خون سے گل گوں ہوئی تو میاں ممتاز دولتانہ کی وزارت

کا صفایا کیا گیا۔ اس کے بعد ملک غلام محمد نے بہ طور گورنر جنرل ۱۷ اپریل ۱۹۵۳ء کو خواجہ ناظم الدین کی وزارت عظمیٰ کا پتا کاٹ دیا۔ ادھر اگلے سال ۱۹۵۴ء کے موسم بہار میں مسلم لیگ کو مشرقی پاکستان میں شکست فاش ہوئی۔ اس سے ملکی معاملات کا نقشہ بدل گیا۔ ملک غلام محمد نے ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو مجلس دستور ساز توڑ دی۔ جسٹس منیر نے اس اقدام کی عدالتی توثیق کی۔ مسٹر محمد علی بوگرہ نے جنرل ایوب خان کو کابینہ میں شریک کیا۔ وہ کمانڈر انچیف بھی رہے اور وزیر دفاع بھی! اس کشاکش میں ملکی حالت کا سفینہ منجدھار میں گھرا رہا۔ اُدھر جون ۱۹۵۵ء میں نئی دستور ساز اسمبلی کے انتخابات مکمل ہوئے۔ اسی دوران میں ملک غلام محمد کی بیماری بے قابو ہوگئی۔ ان کی جگہ اسکندر مرزا نے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالا۔ چودھری محمد علی نے ۱۹۵۶ء کا آئین تیار کیا۔ مسٹر محمد علی بوگرہ کے بعد انھیں وزیر اعظم بنایا گیا، لیکن آئین بنانے کے بعد وہ زیادہ عرصے وزارت عظمیٰ کی مسند پر متمکن نہ رہے۔ کوئی مرکزی شخصیت نہ تھی، دوسرے درجے کے سیاست دان آپس میں اس طرح لڑ رہے تھے جس طرح اورنگ زیب کے بعد قلعے میں مغل شاہ زادوں کی آپا دھاپی کا دور دورہ تھا۔ چودھری محمد علی نے استعفیٰ دیا تو ان کی جگہ شہید سہروردی وزیر اعظم ہوئے۔ اسکندر مرزا نے پہلے ان سے نواب مشتاق احمد گورمانی کو پنجاب کی گورنری سے سبک دوش کرایا، پھر ری پبلکن پارٹی سے ساز باز کر کے انھیں نکال دیا۔ ان کی جگہ چندریگر آئے، لیکن کچھ عرصے بعد وہ بھی چلے گئے۔ ملک فیروز خان نون وزیر اعظم ہوئے، لیکن ان کا چراغ اسکندر مرزا نے مارشل لا کی صرصر سے گل کر دیا۔ اسکندر مرزا سازشی طبیعت کے سیمابی انسان تھے۔ انھیں کسی پہلو چین نہ تھا۔ انھوں نے ایوب خان کی ملی بھگت سے مارشل لا نافذ کیا۔ پھر چند دن میں انھی کے خلاف گٹھ جوڑ کرنے لگے۔ ابھی مارشل لا کا چوتھا ہفتہ شروع نہ ہوا تھا کہ ایوب خان نے اسکندر مرزا کو جلاوطن کر دیا اور وہ رخت سفر باندھ کر لندن روانہ ہوگئے۔ اس کے بعد ملک پر جو بیتی وہ سب کے سامنے ہے۔ ایک طویل عرصے کے لیے مارشل لا نافذ ہوگیا۔ اس سے پہلے تقریباً ساڑھے پانچ سال کی مدت میں پانچ وزرائے اعظم مقرر ہو چکے تھے۔ ایوب خان نے اپنی سوانح عمری کے چھٹے باب میں لکھا ہے کہ ایک لمبے عرصے سے کراچی میں سیاسی سوانگ کھیلا جا رہا تھا اور بہ قول اسکندر مرزا صورت حال ناقابل برداشت ہو چکی تھی۔ ملک غلام محمد اس سے پہلے ۱۹۵۴ء ہی میں ایوب خان کو ملک کی عنان سونپنے کے لیے تیار

تھے اور وہ راضی نہ ہوتے تھے۔ آخر ۷/اکتوبر ۱۹۵۸ء کو آٹھ بجے شب اسکندر مرزا نے ۲۳/ مارچ ۱۹۵۶ء کا آئین منسوخ کر ڈالا اور ملک کو مارشل لا کے حوالے کر دیا۔ یہ پاکستان کی تاریخ میں ایک دردناک المیے کا آغاز تھا۔ اسکندر مرزا خود تو صدر ہی رہا، ایوب خان کو مارشل لا کا چیف ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا، لیکن بیل منڈھے نہ چڑھی۔ ابھی تین ہفتے نہ ہوئے تھے کہ اسکندر مرزا اپنے ہی مارشل لا کا شکار ہو گیا۔ ۲۷/اکتوبر کی شب کو تین جرنیلوں، جنرل اعظم، جنرل برکی اور جنرل شیخ نے اسکندر مرزا کو آدھی رات کے وقت جگا کر سبک دوشی کے کاغذ پر دستخط لیے اور انگلستان روانہ کرنے سے پہلے چار پانچ روز کوئٹہ میں رکھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں اس سے بعض رازہائے درون پردہ دریافت کیے گئے اور ان کی دولت کے خفیہ ذخائر سے متعلق پوچھا گیا، پھر اس کے بعد لندن بھیج دیا۔

(تحریکِ ختمِ نبوت، از: شورش کاشمیری: ص ۱۶۰-۱۵۹)

۱۹۵۴ء

ہندوستان میں خاتمۂ زمین داری کی تاریخ — حضرت شیخ کے افکار عالیہ:

۲۶ رجنوری ۱۹۵۴ء: غازی پور کے مولانا ابوالحسن حیدری الحسینی حضرت شیخ الاسلام سے نسبت رکھنے والے ایک خاص مرتبے کے بزرگ تھے۔ غالباً ان کی کچھ زمین ان کے قبضے سے نکل گئی تھی۔ اس واقعے پر یہ تعزیت نما خط جو زمین داری کے خاتمے کی مجمل تاریخ بھی ہے، حضرت نے تحریر فرمایا:

آج تو ہندی زمین دار سبھی مرتے ہیں
اس کا کیا ذکر ہے برباد ہوئے تم یا ہم

محترم المقام زید مجدکم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

عرصۂ دراز کے بعد والا نامہ باعث سرفرازی ہوا۔ دل شکن مضمون نے جگر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے، مگر اس میں آپ بھی بے قصور نہیں ہیں، یوپی میں اس کی ابتدا انگریزی زمانہ ۱۹۱۲ء یا پہلے سے ہوتی ہے، جب سے کہ موروثیت کے قانون کی بنیاد ڈالی گئی۔ پہلے دس برس کے کاشت کار کو حقِ موروثیت دیا گیا اور عرصے تک چلتا رہا۔ دور بین زمین دار اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ زمین دارہ کی خیر نہیں ہے۔ ضرورت ہے کہ زمینوں کی خود کاشت ہو، مگر غافل لوگ خوابِ خرگوش میں مبتلا رہے۔ غالباً ۱۹۲۶ء میں قانون آگے بڑھایا گیا اور ایک برس تک کاشت کار کو حق موروثیت دیا گیا۔ اس قانون نے زمین داروں کو مفلوج بنا دیا تھا۔ اس وقت بہت سے زمین داروں کو تنبہ ہوا اور فارم بنانے، سیر قایم کرنے، پرانے کاشت کاروں کو بے دخل کرنے کا عمل زیادہ تر جاری کیا گیا۔ مگر عام زمین دار اس وقت بھی حسبِ عادت غافل ہی رہے۔ زمانے نے آگے قدم بڑھایا اور زمین دارے کے بالکل مٹانے کی تحریک شروع ہوئی۔ اس وقت ضروری تھا کہ لوگ چونکیں اور اس مہلت سے نفع اٹھائیں۔ اس وقت تمام زمین کو خود کاشت یا سیر کر لینے کا موقع ملا تھا۔ مگر

افسوس آپ نے کچھ نہ کیا اور مخمور غفلات ہی رہے۔ اب جب کہ قانون پاس ہو کر معمول بہ اور نافذ بھی ہو گیا تب آپ کی آنکھ کھلی۔ ایسے غافل و مخمور کی حالت پر جس قدر بھی آنسو بہایا جائے کم ہے۔ صوبہ بنگال، آسام، مدراس اور بہار وغیرہ میں انگریز پہلے سے یہی کر چکے تھے۔ لارڈ ڈلہوزی اور بہت سے انگریزوں کی پالیسی یہی تھی۔ خوش قسمتی سے یوپی اور پنجاب وغیرہ بچ گئے تھے، موجودہ حکومت نے اس کی تکمیل کی ہے۔ بہ ہر حال آپ اگر غفلت نہ کرتے تو یہ صورت دل خراش پیش نہ آتی۔ میں اس معاملے میں کر ہی کیا سکتا ہوں؟ میرا تعلق اربابِ حکومت سے تقریباً بالکل ہی منقطع ہے۔ نہ میں ان کے پاس جاتا ہوں نہ وہ مجھ کو پوچھتے ہیں۔

میری اُن کی رسم الفت مٹ گئی　　　مدتیں گزریں زمانہ ہو گیا

میں آپ کے والا نامے کو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے پاس بھیج رہا ہوں، اگر ان سے کچھ ہو سکے گا تو کریں گے۔ واللہ الموفق

ننگِ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ

۲۱ ر جمادی الاولیٰ ۱۳۷۳ھ

۲۶ ر جنوری ۱۹۵۴ء

حضرت شیخ الاسلام کا دورہ آسام:

۲۷ ر فروری ۱۹۵۴ء: دار العلوم، ۱۷ ر فروری، آج حضرت شیخ الاسلام آسام کے دورے پر روانہ ہو گئے۔ خیال ہے کہ حضرت وسط مارچ تک واپس تشریف لائیں گے۔ زائرین اور معتقدین سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ واپسی کا انتظار فرمائیں اور اطلاع کے بغیر زحمتِ سفر نہ کریں۔ فرید الوحیدی (الجمعیۃ۔ دہلی: ۲۷ ر فروری ۱۹۵۴ء، ص ۲)

مولانا شبیر احمد عثمانی اور حیدر آباد کا وظیفہ:

مارچ ۱۹۵۴ء: مکتوبات شیخ الاسلام کی جلد اول شائع ہوئی اور اواخر مارچ ۱۹۴۳ء کا مکتوب سامی مولانا حبیب الرحمٰن خاں لدھیانوی کی نظر سے گزرا، جس میں علامہ شبیر احمد عثمانی کے لیے حیدر آباد (دکن) کے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ سے وظیفے کی تقرری کا ذکر تھا۔ حضرت لدھیانوی مرحوم کو اس سے دکھ ہوا، ان کا خیال تھا کہ یہ مخالفت میں اڑائی ہوئی محض

افواہ تھی۔ حضرت شیخ الاسلام نے مرحوم کے خط کے جواب میں فرمایا:

"حضرت مولانا شبیر احمد صاحب مرحوم کے متعلق جوان کی تنخواہ حیدر آباد کے متعلق لکھا گیا ہے وہی مجھ کو علم ہے اور موثوق ذریعے سے ہے۔ ممکن ہے کہ غلط ہو، مگر یہ بھی قابل غور ہے کہ سر اکبر حیدری صاحب نہ کوئی متشرع متقی تھے نہ ان کو تحریکات آزادی سے لگاؤ تھا، بلکہ انگریز کے پروردہ اور اُس کے آوردہ تھے اور اگر تحریک آزادی کی رکاوٹوں میں حصہ لے کر حضرت شیخ الہند کی تحریک کے مٹانے میں ایسے حضرات کو کام میں لائیں تو کیا تعجب ہے۔ میرے اور شیخ الہند کے روکنے کے لیے کیا کیا نہیں کیا گیا؟ اور کیسے کیسے طریقے نہیں برتے گئے؟ اس کا علم واقفین اسرار انگریزیہ کو بہت کچھ ہے۔ میرے لیے تو بہت سے طرق ترغیب اور ترہیب کے لیے عمل میں لائے گئے اور اس میں بہت سے ثقات اور ارباب تقویٰ سے مدد لی گئی۔ میں نہیں کہتا کہ وہ سب فاسد الملیۃ تھے، مگر انھوں نے کیا اور بہت کچھ کیا۔ بہت سے کم زور تھے وہ ڈر گئے اور جو کچھ نہ کرنے چاہیے تھا، وہ کر گزرے۔ بہ ہر حال یہ زمانہ اور حال گزر چکا۔ والعلم عند اللہ وھو الحسب لنا ولھم۔

مولانا مرتضیٰ حسن صاحب مرحوم کے لیے وہ کلمہ غلط نہیں لکھا گیا۔ واقعات تو بہت زیادہ ہیں، اتنے لکھنے سے کوئی دوسرا زیادہ نفع نہیں اٹھا سکتا۔ ہماری معلومات تو اب بھی پردہ ہی میں ہیں اور ان شاء اللہ رہیں گی۔ یوم تبلی السرائر کے شرور سے اللہ تعالیٰ ان کو اور تمام مسلمانوں کو محفوظ رکھے۔

محترما! حضرت شیخ الہند کی تحریک نے بہت سوں کی قلعیاں کھول دیں اور بہت سے دوستوں کو دشمن اور بہت سے دشمنوں کو دوست ثابت کر دیا یا ظاہر کر دیا۔ عجیب امتحان تھا جس نے کھرے کھوٹے کا تمیز کر دیا۔

مرا دردیست اندر دل اگر گویم زبان سوزد
وگر دم درکشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد

عالی جاہا! آپ کی یہ تنقیدات میری سمجھ میں نہیں آئیں۔ کاش! آپ کی حضرت شیخ الہند سے تنہائیوں میں باتیں ہوتیں تو شاید اس قدر حسنِ ظن یا اخفا پر ہم کو آپ مجبور نہ فرماتے۔"

۲۲ر مارچ ۱۹۵۴ء: معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کو حضرت شیخ

الاسلام کے اس جواب سے اطمینان نہیں ہوا۔انھوں نے پھر کوئی بات لکھی تھی۔حضرت نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا:

''آپ کو جو کچھ معلومات میرے خیال میں ہیں وہ بہت کم ہیں بہ ہر حال جو کچھ گزر اگزر گیا ع

درمیان ما و جاناں ما جرائے رفت رفت

تلک امة قد خلت لها .....الآیۃ ناکارہ اس تحریک کا اٹھانے والا نہ تھا، بلکہ محرک مرحوم کا نالایق اور ناکارہ خادم تھا اور ہوں۔میرا خیال ہے کہ ادائے خدمت میں میں نے کوتاہی نہیں کی

نہ مرتے مرتے محبت سے منہ پھیرا کبھی میں نے
جفائیں سیکڑوں جھیلیں وفا پر اپنی نازاں ہوں

میں ہمیشہ کوشاں رہا کہ اکابر کی شان میں گستاخی اور سوئے ادبی کی نوبت نہ آئے۔ میرا خیال ہے کہ میں اس میں پوری طرح سے یا بڑے درجے تک کامیاب رہا۔واللہ اعلم۔''

حضرت شیخ الاسلام کی ایمان پرور تقریر:

۲۵؍اپریل ۱۹۵۴ء: حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی نے انجمن اسلامیہ کے سالانہ جلسے میں شرکت فرمائی اور ایک نہایت ایمان پرور تقریر فرمائی اور بتایا کہ ہماری مشکلات و مصایب کیا ہیں؟ مسلمانوں کے فوز و فلاح کا دور دورہ صبر و رضا پر ہے، لیکن مسلمانوں نے کتاب وسنت کی روشنی میں چلنا اور زندگی کی روحانی قدروں کو چھوڑ دیا ہے۔

(مدینہ۔بجنور: ۲۵؍اپریل ۱۹۵۴ء)

مجاہدِ ملت کا حقیقت افروز بیان:

۱۶؍جون ۱۹۵۴ء: دہلی، جمعیت علماے ہند کے جنرل سیکرٹری مولانا محمد حفظ الرحمٰن نے نکاسی جائیدادوں کے متعلق حسبِ ذیل بیان اخبارات کو دیا ہے۔

حکومت ہند نے نکاسی جائیدادوں کے معاملے کو آخری طور پر نبٹانے کے لیے یہ طے کر دیا ہے کہ جلد ہی تمام نکاسی جائیدادیں حکومت اپنے قبضہ میں لے کر پاکستان سے آئے ہوئے شرنارتھیوں کے معاوضوں میں تقسیم، نیلام یا الاٹ کر دے گی۔

اس موقع پر اس خیال سے کہ کسی ہندوستان کے باشندے کی حق تلفی نہ ہو، حکومت نے یہ بھی اعلان کر دیا ہے جو لوگ ہندوستان کے شہری ہیں اور کبھی پاکستان نہیں گئے (یا اگر کسی وجہ سے پاکستان چلے گئے تھے تو ۱۸ر جولائی ۱۹۴۸ء سے قبل بغیر پرمٹ کے یا اس کے بعد ۱۹ر اکتوبر ۱۹۴۹ء تک مستقل پرمٹ پر ہندوستان واپس آکر آباد ہو گئے ہیں) اور ان کی جائیدادیں غلطی سے نکاسی قرار دے دی گئی ہیں اور کسٹوڈین کی نگرانی میں ہیں، ان کو چاہیے کہ اپنی جائیداد اور اپنے حق کی واپسی کے لیے قانون نکاسی جائیداد کی دفعہ ۱۶ کے تحت فوراً درخواست دے دیں۔ ایسی درخواستوں کے لیے ۱۲ر مئی ۱۹۵۴ء سے دو ماہ (۶۰ دن) کی مدت مقرر کی گئی ہے۔ اور یہ درخواستیں (کسی اسٹامپ یا کورٹ فیس کے بغیر) رجسٹری کے ذریعے حسب ذیل پتہ پر بھیجی جائیں گی۔

''سیکرٹری منسٹری آف ری ہیبلی ٹیشن گورنمنٹ آف انڈیا۔ نئی دہلی''

جن لوگوں کے مقدمات اس وقت کسٹوڈین ڈیپارٹمنٹ میں زیرِ سماعت ہیں وہ بھی اپنے مقدمے کا فیصلہ خلاف ہونے کی صورت میں فیصلے کی تاریخ سے دو ماہ کے اندر اندر دفعہ ۱۶ کے تحت درخواست دے سکیں گے۔

صوبہ یوپی کے جو لوگ ''نہرو لیاقت پیکٹ'' مورخہ ۱۰ر اپریل ۱۹۵۰ء کے تحت حکومت ہند کی اجازت سے ہندوستان واپس آکر آباد ہو چکے ہیں ان کی جائیدادیں بھی واپس کی جائیں گی۔ اس لیے ایسے لوگوں کو بھی دفعہ ۱۶ کے مطابق اپنی درخواستیں فوراً دے دینی چاہییں۔

حکومت ہند کے اس اعلان کی روشنی میں اس سے قبل بھی میں مسلمانانِ ہند کو توجہ دلا چکا ہوں اور اس بیان کے ذریعے دوبارہ توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ ایسے تمام مسلمان جن کی جائیداد غلط طور پر نکاسی قرار دے دی گئی ہے مقررہ مدت کے اندر اندر جلد ہی دفعہ ۱۶ کے مطابق اپنی درخواستیں دے دیں تاکہ وہ اپنے حق سے محروم نہ رہ جائیں اور اس آخری مہلت سے فائدہ اٹھا سکیں۔

جمعیت علمائے ہند کی تمام صوبائی اور ماتحت شاخوں اور تمام کارکنوں کا فرض ہے کہ اپنے اپنے حلقۂ اثر میں مسلمانوں کو حکومتِ ہند کے اس اعلان سے باخبر کریں اور اخبارات میں بھی اس سرکلر کی اشاعت کرائیں، تاکہ حق داروں کی دادرسی ہو سکے اور کوئی شخص بے

خبری کے باعث اپنے حق سے محروم نہ رہ جائے۔

اس طرح وکلا صاحبان اور تمام ہم دردانِ ملّت سے بھی گذارش ہے کہ ناواقف لوگوں کو اس اعلان سے باخبر کر کے اپنا اخلاقی فرض ادا کریں۔ مدیرانِ جرائد اور اخبارات اس سرکلر کی اشاعت کر کے ممنون فرمائیں۔

جمعیت علمائے ہند نے غیر نکاسی جائیدادوں کے بارے میں اپنا جو میمورنڈم پارلیمنٹ میں اور حکومتِ ہند میں پیش کیا ہے اس کی کوشش اپنی جگہ جاری رہے گی اور پارلیمنٹ کی سلیکٹ کمیٹی میں بھی ان مطالبات کے لیے پوری پیروی کی جائے گی۔ لیکن حکومتِ ہند کے اس اعلان سے فایدہ اٹھانے والوں کو اس کے نتیجے کا انتظار کیے بغیر فوری طور پر اپنی درخواستیں روانہ کر دینی چاہییں۔ (مدینہ۔ بجنور: ۲۱/ جون ۱۹۵۴ء)

علی گڑھ کے فسادات:

۱۷/ جون ۱۹۵۴ء: علی گڑھ کے فسادات کے بارے میں جمعیت علمائے ہند کی رپورٹ۔ (مدینہ۔ بجنور: ۱۷/ جون ۱۹۵۴ء)

جمعیت علما کانفرنس:

۲۰/ جون ۱۹۵۴ء: ادری، جمعیت علما کانفرنس میں حضرت شیخ الاسلام کی تقریر۔ آپ نے مسلمانوں کو مخالف طاقتوں کے ستانے پر صبر و تحمل سے کام لینے کی تلقین فرمائی۔ الجمعیۃ میں حضرت کی تقریر کا خلاصہ درج کیا گیا ہے۔

(الجمعیۃ۔ دہلی: ۲۰/ جون ۱۹۵۴ء، ص ۲+۵)

مجاہدِ ملت کا بیان:

۲۱/ جون ۱۹۵۴ء: نکاسی جائیداد کے متعلق مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ناظم عمومی جمعیت علمائے ہند کا بیان۔ (مدینہ۔ بجنور: ۲۱/ جون ۱۹۵۴ء)

حضرت شیخ الاسلام کا ایمان افروز مکتوب! ❶

۲۵/ جون ۱۹۵۴ء: نظر بندی کا علم فقط اس خط سے ہوا۔ اگر چہ عرصۂ دراز سے کوئی والا نامہ نہیں آیا تھا، مگر یہ خیال نہ تھا۔ حق تعالیٰ آپ حضرات کے اس دینی جہاد کو قبول فرمائے

اور باعثِ کفارۂ سیئات اور ترقی درجات کرے۔ آمین

محترما! اس دورِ فتن میں دین کو پکڑنا قبض علی الجمر کا مرادف ہے۔ سوچ سمجھ کر کام کرنا چاہیے۔ اگر تعلیماتِ دینیہ کا مشغلہ ہو تو زیادہ مفید اور ضروری معلوم ہوتا ہے، ورنہ تبلیغی جماعت کا پروگرام انسب ہے۔ کم از کم سلفِ صالح کے قدم بہ قدم تو رہنا نصیب رہتا ہے۔ جو جماعتیں نئی نئی زرق برق پوشاک میں نمودار ہو رہی ہیں ان کی چمک دمک میں محو ہو جانا انتہائی خطرناک ہے۔ مودودیوں کی گم راہی سے آپ غالبًا بالکل ناواقف ہیں۔ آپ فرماتے ہیں "جماعتِ اسلامی کے معاملے میں بندہ اکثر متردد رہتا ہے۔ کیا اس جماعت کی مخالفت کرنا ضروری ہے، یا نظام اسلامی کے پیش نظر ان سے اتفاق کیا جائے، یا توقف و سکوت بہتر ہے؟" آپ اس قدر غافل کیوں ہیں؟ ان کی کتابوں کو تنقیدی اور گہری نظر سے دیکھیے۔ وہ تو چودہ سو برس والے طریقۂ اسلامیہ کے علاوہ ایک نیا اسلام بنا رہے ہیں، جس میں ہر پروفیسر، ہر گریجویٹ، ہر عربی زبان سے شد بد رکھنے والا مجتہد مطلق ہے۔ یہی نہیں کہ اس کو اجتہاد کرنا جائز ہے بلکہ اس پر اجتہاد کرنا اس قدر ضروری اور لازم ہے جیسا کہ سانس کے لیے ہوا اور پیاس کے لیے پانی ضروری ہے۔ اس اسلام میں بڑے سے بڑے صحابی پر بھی اعتمادِ کلی نہیں ہے۔ اگر چہ وہ خلیفۂ اول ہی کیوں نہ ہو۔ عام صحابہ تو کسی شمار و قطار میں نہیں ہیں اور جب کہ صحابہ اور اربابِ قرن اول اس حال میں ہوئے تو تابعین اور بعد والے کس درجے میں مانے جا سکتے ہیں۔ یعنی امام ابو حنیفہ، امام شافعی، امام مالک وغیرہ رحمہم اللہ تعالیٰ اور دوسرے ائمۂ حدیث یا ائمۂ فقہ یا ائمۂ جرح و تعدیل کیا درجہ رکھ سکتے ہیں۔ اہلِ سنت والجماعت کا متفقہ اصول تمام صحابہؓ کی عدالت کا جو کہ دلالت قطعیہ سے ماخوذ ہے بالکل ان کے نزدیک واہی اور لچر ہے۔ کوئی ہستی صحابہؓ، تابعینؒ، تبع تابعینؒ وغیرہم میں سے قابلِ تقلید مطلق نہیں ہے اور نہ کوئی ان میں سے معیارِ حق ہے، بلکہ ہر ایک انسانی کمزوریوں سے بالفعل متصف ہے۔ ان کا بنیادی عقیدہ دستورِ جماعت اسلامی دفعہ ۶ میں حسبِ ذیل ہے:

> "رسولِ خدا کے سوا کسی انسان کو معیارِ حق نہ بنائے، کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے، کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو، ہر ایک کو خدا کے بنائے ہوئے اس معیار کامل پر جانچے اور پرکھے اور جو اس معیار کے لحاظ سے جس درجے میں ہے اس کو اسی درجے میں رکھے۔"

اب آپ اس عقیدے اور اس دفعہ پر غور فرمائیے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے اور کس قدر الحاد اور بے دینی اس کی تہہ میں رکھی گئی ہے اور تمام سلفِ صالح کی کس قدر بے اعتباری درایتاً اور روایتاً، شریعتاً اور طریقتاً اس میں کوٹ کر بھری گئی ہے اور اس سے کتنے زہریلے جراثیم دین میں پیدا کیے گئے ہیں؟ کیا آپ کتاب اور سنت کو اس عقیدے کے بعد ثابت کر سکتے ہیں اور کسی زندیق و ملحد پر اتمام حجت کا راستہ کھول سکتے ہیں جب کہ ہر دو طریقہ (روایت، درایت کا مدار صحابۂ کرامؓ ہی پر ہے اور وہ معیار اور مدار حق نہ رہے اور نہ تنقید سے ہی بالاتر رہے اور نہ ان کی ذہنی غلامی جائز رہی۔ ظاہر ہے کہ تنقید کسی برائی ہی کی وجہ سے ہوتی ہے، تو جب ان میں خرابیاں اور برائیاں موجود ہیں تو ان کی روایت کا کیا اعتبار ہے اور اسی طرح ان کی درایت کا کیا اعتبار ہوگا اور.....

علیٰ ہذا القیاس ان کے طریقے پر چلنا یعنی ذہنی غلامی بھی اگر صحیح نہیں ہے تو خیر القرون ہونا اور "کنتم خیر امة اخرجت اللناس" اور امة وسطا وغیرہ آیات کو کس طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ تمام وہ احادیث صحیحہ جو کہ گوناگوں فضائل صحابہ سے بھری ہوئی ہیں سب بے کار ہو جاتی ہیں، کیوں کہ سلبِ کلی کا مصداق بہ جز اس کے نہیں ہو سکتا۔

افسوس صد افسوس! بہت سے علما اور فارغین دارالعلوم بھی مودودی صاحب کی تلبیات کے شکار ہو رہے ہیں، آپ بھی ان جماعت کی تنظیم اور ڈسپلن کی تعریف کرتے ہوئے اس میں شرکت کی خواہش کر رہے ہین یا تردد مین ہیں۔ جس طرح چکڑالوی، قادیانی، مشرقی نے نیا دین اور نیا اسلام بنایا ہے اسی طرح مودودی صاحب نے نیا اسلام بنایا ہے۔ سابقین مجددین کی تجدیدات کو لات مار کر اپنی تجدیدات کو سب سے بالاتر فرماتے ہیں اور تمام اہلِ سنت والجماعت کے متفقہ اصول کو ٹھوکر مارتے ہیں۔ تمام علما اور اہل طریقت حتیٰ کہ حضرت مجدد سرہندیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور اکابر علم و طریقت میں کیڑے نکال کر سب کی انتہائی تذلیل و توہین کرتے اور سب سے نفرت دلاتے ہیں۔ بہ ہر حال سوچیے اور سمجھیے اور اسلاف کرام کے طریقے پر چلیے، واللہ معکم اینما کنتم۔

مولانا عبداللہ صاحب۔ درخواستی سے میں واقف نہیں اور نہ ان کے اصول سے واقف ہوں، اس لیے کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اگر ان کے اصول و اعمال اسلاف اہلِ سنت و الجماعت کے مطابق ہوں تو ان کا ساتھ دیجیے۔ آپ مودودیوں کی تنظیم اور جدوجہد کو

سراہتے ہیں۔ محترما! قادیانیوں اور عیسائیوں کی تنظیم و جدوجہد اس سے بہ درجہا بالاتر ہے، پھر کیا حکم دیں گے؟

جو رشتے دار ادھیڑ عمر والی بیعت ہونا چاہتی ہیں ان کو آپ خود کیوں نہیں بیعت کر لیتے؟ آپ نیابتاً میری طرف سے ان کو بیعت کرلیں اور امور بیعت پر عہد لے کر تسبیحات ستہ تلقین فرمادیں۔ والسلام

ننگِ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ

۲۳ر شوال المکرم ۱۳۷۳ھ

۲۵ر جون ۱۹۵۴ء

(مکتوبات شیخ الاسلام: جلد چہارم، مکتوب ۳۵ بنام مولانا قاضی محمد مظہر حسین صاحب۔ چکوال ضلع جہلم)

اس مکتوب پر مرتب مکتوب شیخ الاسلام مولانا نجم الدین اصلاحی کے قلم سے حاشیہ بھی ہے، مولانا فرماتے ہیں:

حاشیہ ❶: جماعت اسلامی مسلمانوں کے لیے ایک طاغوتی کیڑا ہے جس کے جراثیم برابر پھیلتے رہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہٗ پر اپنی ہزاروں رحمت کا نزول فرمائے کہ آپ نے اس جماعت کی لغزشوں اور اہلِ سنت والجماعت کے خلاف عقاید کی ترویج و اشاعت پر روک ٹوک فرمائی، جس سے بے شمار بندگانِ خدا محفوظ رہ گئے۔ اس گروہ کے اندر نہ تو کوئی ثقہ عالم اور نہ معمر بزرگ ہے اور نہ بڑے لوگوں یعنی ہندوستان و پاکستان کے مستند علما و فضلا اس کی دینی حیثیت و ثقاہت کے قائل ہیں بلکہ اس کا سارا کارنامہ قدیم گم راہ جماعتوں کی طرح پروپیگنڈا اور تنقید ناروا ہے اور کتابوں اور رسایل کی فروخت ذریعۂ ترویج و اشاعت ہے۔ چند نوخیزوں کی ٹولی ہے، اس کا کام یہ ہے کہ جہاں سے جس عالم دین کی طرف سے ان پر کوئی زد پڑتی ہے وہ فوراً اس کی پگڑی اچھالنے اور اس کی تحریروں سے عبارت نکال کر غلط مفہوم کے ساتھ اس کی تشہیر شروع کر دیتے ہیں۔ چناں چہ ایسا ہی نقشِ حیات وغیرہ کتابوں کی عبارتوں پر اعتراض کا حال ہے جس کو شیخ الاسلام نے ظاہر فرمادیا ہے۔ جس جماعت کا بنیادی اصول انبیا اور صحابہ پر لب کشائی ہو اس کا خدا حافظ ہے۔ یہ جماعت سلف کی ان جماعتوں کے مشابہ ہے جن کو خوارج اور معتزلہ وغیرہ سے یاد کیا جاتا ہے۔ ہندوستان و پاکستان وغیرہ میں روافض اور اہلِ تشیع حضرات کو اس سے بڑا فایدہ پہنچا۔

حضرت حاجی امداد اللہ رحمتہ اللہ علیہ جن کی فارسی عبارتوں کو شیخ الاسلام قدس سرہٗ نے درج

فرمایا ہے اس کا ترجمہ جلد دوم مکتوب ۵۲، ۵۳ میں گزر چکا ہے۔ ہاں صراطِ مستقیم صفحہ ۱۰۸ کا خلاصہ مفہوم یہ ہے کہ التفاتِ دایمی کی حقیقت یہ ہے کہ ہر وقت ذاتِ باری کا تصور قایم رہے اور کوئی چیز اس میں مانع نہ ہو، جس طرح کہ کسی کے دل کے اندر جب کسی کام کا پورا پورا خیال قایم ہو جاتا ہے وہ حوائج ضرور یہ وغیرہ کے اوقات میں بھی اسی طرف متوجہ رہتا ہے۔ پس ذات واجب الوجود کی طرف التفات کلی وانہماک دایمی رہنا ہی عین مقصود سالک ہونا چاہیے۔ اسی جانب حضرتؒ نے متوجہ فرمایا ہے۔ بقیہ خطوط جلد چہارم مولانا مظفر حسین صاحب ملاحظہ فرمائیں۔

اردو زبان کی بقا۔ حضرت شیخ کے ارشادات:

۱۳ر جولائی ۱۹۵۴ء: ناگ پور ۸ر جولائی۔ شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی صدر جمعیت علمائے ہند، دہلی سے بنگلور تشریف لے جاتے ہوئے پرسوں ساڑھے چار بجے ناگ پور سے گزرے۔ ایک کثیر مجمع نے اسٹیشن پر آپ کا پر جوش استقبال کیا۔

ناگ پور کارپوریشن نے اردو اسکولوں کو بند کرنے کا جو فیصلہ کیا ہے اس سلسلے میں حضرت شیخ مدظلہٗ العالی سے مشورہ کیا گیا۔ حضرت شیخ نے فرمایا کہ اردو کو قایم رکھنے اور ترقی دینے کے لیے ہم سب کو وہی کرنا چاہیے جو پورے ہندوستان میں اردو کے بہی خواہ کر رہے ہیں۔ ہر قسم کی آئینی جدوجہد پُر امن طریقے پر کرتے رہنا چاہیے۔ حضرت شیخ نے اپنا ایک واقعہ بیان فرمایا کہ جب میں احمد آباد جیل میں تھا اور بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا تو میری نظر دیوار پر پڑی۔ ایک چیونٹا دیوار پر چڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے بار بار گر پڑتا تھا۔ وہ کبھی آدھی دیوار طے کرتا کبھی تین چوتھائی اور گر پڑتا۔ ۲۳ مرتبہ وہ ناکام رہا۔ لیکن چوبیسویں مرتبہ وہ دیوار پر چڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔ حضرت شیخ نے فرمایا کہ میں اپنا قلم رکھ کر اس چیونٹے کی اس جدوجہد کو بہ غور دیکھتا رہا اور یہ سبق حاصل کیا کہ ہمیں بھی اپنے صحیح مقاصد کے لیے متواتر سعی کرتے رہنا چاہیے۔ آپ نے کلام مجید کی آیت تلاوت فرمائی۔

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا.

''اور وہ لوگ جو ہماری راہ میں جدوجہد کرتے ہیں ہم ان کے لیے راہیں کھول دیتے ہیں۔''

حضرت شیخ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے کوشش اور جدوجہد پر وعدہ فرمایا ہے کہ ہم ضرور

بالضرور ان کو اپنے راستوں کی ہدایت فرمائیں گے۔ یہ وعدہ کوشش کی شرط پر ہے، لیکن جدوجہد کی تحدید نہیں فرمائی ہے بلکہ جدوجہد کرتے رہنا چاہیے۔ اس بارے میں ہمارا حال یہ ہو جو اس شعر میں کہا گیا ہے ؎

دست از طلب ندارم تاکام من برآید
یاتن رسد بجاناں یا جاں زتن برآید

اردو کے سلسلے میں ایک سوال کے جواب میں حضرت شیخ نے یہ فرمایا کہ اردو اخبارات رسایل اور کتابیں زیادہ سے زیادہ چھاپی جائیں اور ہم انھیں خرید کر پڑھیں۔ اردو کی ترقی میں مشاعرے اور ادبی مجلسیں بھی مفید ہو سکتی ہیں۔

شیخ الاسلام کی دورے سے واپسی:

۳۰ر جولائی ۱۹۵۴ء: جنوبی ہند کے تین ہفتے کے دورے کے بعد حضرت شیخ الاسلام واپس تشریف لے آئے۔ (الجمعیۃ-دہلی: ۳۰ر جولائی ۱۹۵۴ء)

مولانا سید محمد میاں کی والدہ ماجدہ کا انتقال:

۳۱ر جولائی ۱۹۵۴ء: دہلی ۲۸ر جولائی۔ مولانا سید محمد میاں کی والدہ ماجدہ آج شب ۱۲ بجے کر ۲۰ منٹ پر رحلت فرما گئیں۔ (الجمعیۃ-دہلی: ۳۱ر جولائی ۱۹۵۴ء، ص ۱)

مولانا مودودی اور جماعت اسلامی:

۱۵ر اگست ۱۹۵۴ء:

محترم المقام زید مجدکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مودودیوں سے جو حضرات وہاں پر ہیں ناواقف ہیں، ان کی کتابیں دیکھتے نہیں یا اگر دیکھتے بھی ہیں تو تنقیدی نظر اور غور سے نہیں دیکھتے۔ جو نوٹ میں نے دستور اسلامی کا آپ کو لکھا تھا کہ صفحہ ۵-۶ عقیدۂ رسالت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''رسولِ خدا کے سوا کسی انسان کو معیارِ حق نہ بنائے، کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے، کسی

کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو.....الخ اس پر غور فرمایئے کیا یہ انبیاے سابقین علیہم السلام جن پر ایمان لانا اور ان کی رسالت میں تفریق نہ کرنا ضروری ہے اس کا انکار نہیں؟ اور کیا یہیں سے ان صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی عدالت کا انکار نہیں ہوتا جن کی تعدیل اور مقبولیت میں آیات قطعیہ وارد ہیں۔ کیا یہ عقیدہ اسلام کو باقی رکھنے والا ہے۔ کیا اس میں وہ لاتعداد روایتیں ذخیرۂ احادیث کی جو کہ انفرادی طور پر صحاح میں مدح صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے لیے اور اجتماعی طور پر وارد ہیں ان سب کا انکار نہیں ہے اور کیا ایسے عقیدہ کے ہوتے ہوئے کوئی شخص فرقۂ ناجیہ اہلِ سنت میں شمار کیا جاسکتا ہے؟ اور کیا اس قاعدہ اور دستور کے تسلیم کرنے کے بعد احادیث اور قرآن قابلِ اعتماد ہوسکتے ہیں؟ مدار دین کے نقل کا صحابۂ کرامؓ ہیں۔ جب وہ انفراداً اور اجتماعاً معیار حق نہیں، نہ تنقید سے بالاتر ہیں تو ان پر کیسے اعتماد کیا جاسکتا ہے اور ان کی مرویات کا کوئی اعتبار کیا جاسکتا ہے۔ اس پر تو روافض کا کہنا کہ انھوں نے قرآن میں تحریف کی، اس میں سے دس پارے نکال دیے گئے وغیرہ وغیرہ سب قابلِ قبول ہوسکے گا۔ کیا اس میں تقلید صحابہؓ و تابعین کرامؒ اور ائمہ کا انکار نہیں۔ غور فرمایئے، یہ جماعت اسلام کو برباد کرنے اور اس کے اصول و فروع کو جڑ سے اکھاڑ دینے کے لیے نیا مذہب بنارہی ہے اور ہمارے ہی نادان اور بھولے بھالے علما اور عوام اس کی رو میں بہتے جارہے ہیں۔ فالی اللہ المشتکی

جو عبارت کہ جناب نے نقشِ حیات جلد اول ۳۲۵ کی نقل فرماکر قابلِ اعتراض قرار دی ہے وہ عبارت میری نہیں، تاریخ روہیل کھنڈ معروف بہ حیات حافظ رحمت خاں کے مصنف کی ہے جو کہ نقشِ حیات میں صفحہ ۳۲۴ سے شروع ہوکر صفحہ ۳۲۷ کی دوسری سطر تک چلی جاتی ہے۔ اگر یہ موردِ اعتراض ہے تو اعتراض تاریخ کے مصنفِ مذکور پر ہوسکتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ مؤرخ مذکور حکم شرعی بیان نہیں کررہا ہے بلکہ بادشاہ روہیل کھنڈ کے کارنامے کو دکھلا رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ حافظ رحمت خاں صاحب مرحوم کی حکومت اس کو اپنا فریضہ نہیں سمجھتی تھی اور نہ اس پر عامل تھی۔ اب یہ بات دوسری ہے کہ حکومت مذکور اس میں حق پر تھی یا غلط کار تھی۔ مؤرخ تو اس کے کارنامے دکھلا رہا ہے۔ ممکن ہے کہ حکومت مذکور کا یہ عمل شرعاً صحیح ہو۔ کوئی اس زمانے کی حالت اس کی مقتضی ہو اور ممکن ہے کہ پالیسی نظر شارع میں غلط ہو۔ بہرحال یہ تاریخی واقعہ ہے، اس کو حکم شرعی نہیں کہا جاسکتا۔ علیٰ ہذا القیاس

حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کے متعلق جو شبہ ہے وہ بھی بے موقع ہے۔ یہ دونوں حضرات مرحومین احکام الٰہیہ سے بہ نسبت ہمارے بہت زیادہ واقف تھے اور وہ اپنے ماحول سے بھی بہ نسبت ہمارے زیادہ واقف تھے۔ اگر انھوں نے گوالیار کے راجہ اور وزیر کو لکھا ہے تو مقتضائے وقت اور ماحول کی بنا پر لکھا ہے۔ آپ خود فرماتے ہیں کہ ''اھون البلیتین'' بعض اوقات میں مختار ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے اس وقت کا یہ مقتضی ہو۔ ہم کو حسن ظن کا حکم دیا گیا ہے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک میں راجہ مہندر پرتاپ کو حکومت مؤقتہ کا پریذیڈنٹ تسلیم کرنا حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے مشورے اور حکم سے نہیں ہوا، وہ تو اس وقت مالٹا میں اسیر تھے۔ ثانیاً ایسا کرنا بھی ماحول کی ہی بنا پر تھا جس کو یہ حضرات مشاہدہ کر رہے ہیں، یہ پریذیڈنٹی (صدارت) ہمیشگی کی نہ تھی، بلکہ حکومت مؤقتہ (عارضی حکومت) کی تھی۔ شہنشاہ عالمگیر مرحوم کے مقالے کے متعلق بھی شبہ بے موقع ہے اور وہ مقالہ ملازمتوں کے متعلق ہے حکومت کے متعلق نہیں...... وہ پالیسی جو کہ کسی عہدے کے اہل تھے عالمگیر مرحوم نے ان کی اس عہدے کی قابلیت کی بنا پر ان کو مقرر کیا۔ اہل غرض نے اس پر اعتراض کیا اور شریعت کی آڑ لے کر اپنے آپ کو حق بہ جانب قرار دیا۔ یقیناً اس میں ان کا اعتراض غلط اور عالمگیر مرحوم کا جواب صواب ہے۔ ملازمتوں کے متعلق حکومت اگر قابلیت کا لحاظ نہ کرے گی اور ماہر فن کو مقرر نہ کرے گی تو کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ ابن اریقط دئلی کو رہبر طریق مدینۂ منورہ بنایا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ہجرت سے چند مہینے پہلے سے اس کو مقرر کیا تھا اور سخت خطرے کے وقت میں اس پر اعتماد کیا تھا۔ کیا کنواں کھودنے، پاخانہ پیشاب صاف کرنے، مسجد بنانے، تعمیر کرنے، سڑک صاف کرنے وغیرہ میں مذہب کو دخل دیا جانا ضروری ہے؟ عالمگیر مرحوم کے جواب پر غور فرمائیے، ہاں اگر مسلمان قابل ہو اس کو ترجیح دی جانی چاہیے اور جب کہ آپ اہل ذمہ کے متعلق خدماتی عہدوں میں بھی ان کو جگہ نہ دیں گے تو کس طرح حکومت چلا سکیں گے۔ اور چیزوں کے متعلق بھی اپنے شبہات لکھ دیں، مجھ کو فرصت نہیں ہے اگر ہو سکا تو لکھ دوں گا، ورنہ خفا مت ہونا۔

پھر جناب شاہ صاحب کو آپ لوگوں نے غلطی میں مبتلا کر دیا ہے۔ وہ بے چارے مجھ کو کیا جانیں، میں خود سخت نالائق اور ناکارہ ہوں، ان کو آپ وہاں کسی بزرگ سے مرید

کرا دیجیے یا خود مرید کر لیجیے، میں تو خود نااہل و ناکارہ ہوں۔

ذکر کے متعلق جو کچھ تحریر کیا ہے بہتر اور امید افزا ہے، ہمیشہ ذات حق سبحانہٗ وتعالیٰ کی طرف متوجہ رہنا چاہیے جو کہ بے چون و بے چگون تمام کمالات سے موصوف اور تمام نقایص سے پاک اور منزہ ہے۔ یہ ملکہ راسخہ جامۂ فعلیت بہ صورت "وهم علی صلواتهم دائمون" قایم ہوجائے۔ "صراطِ مستقیم" میں ہے:

"وحقیقتش التفات دایمی است بسوئے ذات بے چون و بے چگون در ہمہ اوقات در نشست و برخاست و عروض مکاسب و مصایب و اوقات خوردن و آشامیدن بحیثیت کہ ہیچ امر مانع التفات نہ گردد بہ مشابہ آں کہ ہرگاہ محبت چیزے یا اہتمام کارے در دل شخصے کہ راسخ گردد پس دریں اشتغال بحوائج ضروریہ و اعمال معاشیہ دلش کما ینبغی بسوئے ہماں امر متوجہ می ماند چناں چہ بر ہر صاحب وجدان پوشیدہ نیست۔" (صراطِ مستقیم: صفحہ ۱۰۸)

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے جب کہ ملکہ حاصل ہوگیا ہے تو اس کو فعلیت کا درجہ دیجیے اور دوام حضور کی کوشش کیجیے، اگر کوئی طالب راہ حق آئے اس کو اسلاف کا راستہ بتائیے۔ اگر آپ اپنے آپ کو اس کے لایق نہیں سمجھتے مگر جس پروردگار نے اس کو بھیجا ہے وہ اس کا کفیل اور مربی ہے۔ حضرت قطب عالم حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ العزیز فرماتے ہیں:

"دریں راہ جز درد نایافت و حسرت حرماں ہیچ نمی سزاید چہ نایافت صورت نیستی دارد و آں چہ یافت دارد صورت ہستی دارد و ہستی بالا سالک است و نیستی موجب ثمرات بے غایات پس بریں درد نایافت ماند تا زید و بکار خود باید بود کار خلق حسب اجازت مشائخ باید کرد ما و شما وسیلہ بیش نیستم مالک خود کار ممالیک خود می کند و سائط را بہانہ نہادہ در درد پوش فیضان خود کردہ واللہ معنا و معکم۔"

(مکتوب پنجم: ص ۲۱۷)

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

"اگرچہ ایں روسیاہ گم راہ ہم سزاوار ایں امر عظیم نیست مگر امتثال امر بزرگاں نمود بیعت تبرکا می کند لہٰذا آں برگزیدہ کونین را نیز بہ طور یکہ ایں مد برا از بزرگان خود اجازت دادہ می آید مناسب کہ ہر کدام کس طالب کہ رجوع نماید

اخذ بیعت نمودہ تعلیم نام خدا نمایند ہرگز انکار نہ کنند ہدایت کنندہ ہادیٔ مطلق است آن را کہ خواہد فرستادہ ہدایت ہم خواہد کرد۔" (ص ۲۱۲)

مدرسہ کا چکوال میں ہونا زیادہ مفید معلوم ہوتا ہے۔ استخارۂ مسنونہ سات مرتبہ کیجیے، اگر جواب میں کوئی ہدایت ہو فبہا ورنہ رجحان قلبی پر عمل کیجیے۔ والسلام

ننگِ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ

۱۵؍ ذی الحجہ ۱۳۷۳ھ، دیوبند

(م ۱۵؍ اگست ۱۹۵۴ء)

(مکتوبات شیخ الاسلام: (جلد چہارم)، مکتوب نمبر ۳۶)

شیخ الاسلام کے لیے قومی حکومت کا اعزاز:

۱۷؍ اگست ۱۹۵۴ء: نئی دہلی، ۱۴؍ اگست۔ یوم آزادی کی ساتویں سال گرہ کے موقع پر ایک غیر معمولی گزٹ کے ذریعے خطابات کا اعلان کیا گیا ہے۔ یہ خطابات ان نامور شخصیتوں کو دیے گئے ہیں جنھوں نے تعلیم، سائنس، ادب اور سماجی امور میں جمہوریہ ہند کی غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں۔ خطاب پانے والوں میں ڈاکٹر رادھا کرشنن، ڈاکٹر ذاکر حسین، راج گوپال اچاریہ اور کئی دوسرے اشخاص کے ساتھ مولانا سید حسین احمد مدنی پرنسپل دارالعلوم دیوبند بھی شامل ہیں۔ (مدینہ۔ بجنور: ۱۷؍ اگست ۱۹۵۴ء)

شیخ الاسلام کا ایک تاریخی خط:

۱۸؍ اگست ۱۹۵۴ء: بعض حضرات یہ چاہتے ہیں کہ لوگ ان کے مشوروں پر عمل کریں، جماعتیں ان کی مرضی کے مطابق چلیں، تحریکیں ان کے اشاروں پر آگے بڑھیں اور یہ کہ ان کے جو ذاتی مقاصد اور شخصی مصالح ہیں وہ ضرور پورے ہوں اور اگر کسی وجہ سے ایسا نہ ہو سکے تو وہ اشخاص سے ناراض، جماعتوں کے مخالف، تحریکوں کے نکتہ چیں بن جاتے ہیں اور ان کے ذاتی مصالح و مفادات کا نقصان گویا کہ پوری جماعت اور نہ صرف ملت اسلامیہ کا بلکہ عالم اسلام کا نقصان بن جاتا ہے۔ جمعیت علماے ہند کی تاریخ کے مختلف ادوار میں اس کو جن مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا اور نکتہ چینوں کا ہدف بننا پڑا اگر اس کے پس منظر میں تلاش کیا جائے تو اسی قسم کی کوئی بات نکل آئے گی۔ چناں چہ ایک زمانے میں اور خصوصاً الیکشن کے

قریب جب اس کی سرگرمیاں بڑھ جاتی ہیں اور لوگوں کے ذاتی مفادات پر اس کی زد پڑتی ہے تو خاص طور پر اس قسم کا پروپیگنڈا شروع ہو جاتا ہے کہ جمعیت اب شیخ الہندؒ کے زمانے والی جمعیت نہیں رہی، وہ اپنے مقاصد سے ہٹ گئی ہے، اب وہ کانگریس کا ذیلی ادارہ بن گئی ہے، حتیٰ کہ شیخ الاسلام بھی اس سے مایوس ہو گئے ہیں، اس کے تعاون سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔ اس لیے اب ہمیں بھی اس کے سوا کوئی راہ تلاش کرنی چاہیے۔ ایک ایسے ہی موقع پر حضرت نے یہ خط تحریر فرما کر مخالفوں اور نکتہ چینوں کے پروپیگنڈے کا تار پود بکھیر دیا ہے۔

مولانا محمد ابراہیم جادا ضلع سورت کے نام ایک مکتوب سامی میں تحریر فرماتے ہیں:

''برادرانِ اسلام صوبہ گجرات و ضلع سورت!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

میرے علم یہ بات لائی گئی ہے کہ صوبہ گجرات اور ضلع سورت میں یہ پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے کہ حسین احمد جمعیت علماے ہند سے بے زار اور علاحدہ ہو چکا ہے۔ اس لیے میں آپ بھائیوں کی خدمت میں صریح الفاظ میں عرض رسا ہوں کہ اس پروپیگنڈے میں ذرہ بھر بھی سچائی نہیں بالکل غلط افواہ ہے۔ میں اب بھی جمعیت علماے ہند کا ممبر ہوں، جیسا کہ مالٹا کی واپسی کے بعد سے تھا اور ویسا ہی جمعیت کا خادم ہوں جیسا کہ سال ہا سال سے چلا آ رہا ہوں۔ میں حسب طاقت و ضرورت جمعیت علماے ہند کی خدمات انجام دے رہا ہوں اور مسلمانانِ ہند کے لیے ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ فرداً فرداً جمعیت علماے ہند کے ممبر بنیں اور اس کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے مسلمانوں کی تقویت اور بہبودی کا ذریعہ ہوں۔ موجودہ احوال اور دورِ حاضرہ میں بہ جز اس کے مسلمانوں کی مشکلات کے حل ہونے کا کوئی دوسرا ذریعہ ہندوستان میں بہ ظاہر نظر نہیں آتا۔ اس لیے سب حضرات کو اس میں زیادہ سے زیادہ شریک ہونا اور تعاون کرنا از بس ضروری ہے اور یہ عظیم الشان خدمت دینی ہے۔ وعلی اللہ التکلان۔

والسلام

ننگِ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ

وارد حال بنگلور مدراس

۱۸؍ ذی الحجہ ۱۳۷۳ھ، دیوبند

۳۰؍ اگست ۱۹۵۴ء

غلط الزامات کی تردید — حضرت شیخ کا بیان:

۲۸؍اگست ۱۹۵۴ء: دہلی ۲۰؍اگست۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مدظلہٗ العالی نے اپنے بیان میں دہلی کے بدنام اخبار ''نئی دنیا'' کے ان الزامات کو انتقامی جذبہ قرار دیا ہے جو اس نے اخبار ''مسیح'' میں شائع شدہ ایک مضمون کا سہارا لے کر زعمائے جمعیت پر عاید کیے۔ حضرت مولانا نے ''نئی دنیا'' کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اس کا یہ اقدام نہ صرف مذہب اسلام کے خلاف ہے بلکہ انسانیت اور تہذیب پر ایک بدنما دھبہ ہے۔ حضرت مولانا کا پورا بیان درج ذیل ہے:

''جمعیت علمائے ہند اسلام اور مسلمانوں کے دینی اور وطنی مفاد کے حصول اور دفع مضار کے لیے قایم کی گئی ہے، اس نے اپنی طاقت کے موافق ابتدا سے آج تک اس نصب العین کے ماتحت کسی جد و جہد میں کوتاہی نہیں کی۔

اسی سلسلے میں اس نے دونوں اخبار الجمعیۃ (اردو) اور مسیح (انگریزی) کو جاری کیا۔ اس کا مقصد کسی خاص جماعت یا پارٹی یا کسی شخص کی خدمات انجام دینا نہیں رہا ہے۔

مگر افسوس کی بات ہے کہ اخبار ''نئی دنیا'' جب سے وجود میں آیا ہے اس نے الجمعیۃ اور مسیح اور اس کے کارکنوں کے خلاف گندگی اچھالنے، ان کے وقار کو گرانے، ان کو بدنام کرنے میں اس قدر انتقامی سرگرمیاں جاری کیں کہ مترشح ہونے لگا کہ وہ صرف شخصی انتقامات اور شخصی مفاد کے لیے جاری کیا گیا ہے۔ ملی اور وطنی مفاد کا دعویٰ صرف اس کا ڈھونگ ہے۔

اس کے مقابلے میں کارکنان الجمعیۃ و مسیح نے اعلا درجے کی شرافت اور حوصلہ مندی کا ثبوت دیا۔ انھوں نے کلوخ انداز را پاداش سنگ است تو در کنار کلوخ کا کلوخ سے بھی جواب نہیں دیا بلکہ صبر و سکون کو عمل میں لا کر آیت وَإِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا اور آیت وَإِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ أَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجَاهِلِيْنَ کو معمول بنایا۔ فجزاھم اللّٰہ خیر الجزا۔

اس مرتبہ جو تحریر ''نئی دنیا'' میں مسیح کے مضمون کے متعلق شایع کی گئی وہ بھی انتقامی سلسلے کی ایک ناپاک کڑی ہے۔ ہم نے نہایت ٹھنڈے دل سے اس پر غور کیا۔ اور پھر ہر دو جانب سے شایع ہونے والے مضامین کو نہایت غور سے دیکھا۔ ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ

تحریر ''نئی دنیا'' کی نہ صرف مذہب اسلام اور اس کی مقدس تعلیمات کے خلاف ہے بلکہ انسانیت اور تہذیب پر بھی نہایت بدنما دھبہ ہے، جس سے جمعیت علما اور کارکنان الجمعیۃ اور مسیح کے وقار کو نقصان پہنچانا اور ان کو بدنام کرنا اور ان کے ذریعے سے ملی خدمات اور قومی کارگذاریوں میں رکاوٹ ڈالنا مقصود ہے۔ مسیح کے مضمون کا سیاق اور سباق اور روایت کو جعلی (موضوع) کہہ دینا اس کو ہر قسم کی گرفت سے پاک کر دیتا ہے۔ اس پر نئی دنیا کی تحریر ہمارے نزدیک شخصی انتقام کی شرم ناک تصویر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سبھوں کو ہدایت فرمائے۔ آمین''

والسلام

ننگِ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ

(مدینہ۔ بجنور: ۲۸ راگست ۱۹۵۴ء، ص ۳)

جمعیت علمائے صوبہ یوپی کا اجلاس اور تجاویز:

لکھنؤ، ۱۳ راگست: مجلسِ عاملہ جمعیت علما اتر پردیش کا دو روزہ اجلاس کل سہ پہر کو ختم ہو گیا۔

ایجنڈے کے پیشِ نظر پہلے دن کے اجلاس میں صوبے کے عام حالات، حالیہ فسادات تنظیم جمعیت اور دفتر صوبہ کی مالیات پر ہر پہلو سے غور وخوض کیا گیا اور دوسرے دن کے اجلاس میں مقتضائے حال کے پیشِ نظر سب سے اہم تجویز متعلقہ حالیہ فسادات منظور ہوئی۔ بابری مسجد کے مقدمہ اور عید قرباں کے موقعہ پر بعض پابندیوں کو دور کرنے کے لیے بھی حکومت کو توجہ دلائی گئی۔ توقع ہے کہ جمعیت علمائے صوبہ کا ایک ذمے دار وفد وزارے حکومت یوپی سے مل کر صورتِ حال پر بات چیت کرے گا۔ ایک تجویز کے ذریعے صدر اور ناظم اعلا کو اختیار دیا گیا کہ وہ صوبے میں متعدد مساجد پر جنھیں غیر مسلم ناجائز طور پر استعمال کرتے ہیں یا رہائش رکھتے ہیں یا منہدم کرتے ہیں یا ان کی تعمیر میں رکاوٹ ڈالتے ہیں، متعلقہ غیر مسلموں اور لوکل حکام سے باہمی گفت وشنید کر کے باحسن وجوہ حل نکال لیں۔

اردو تعلیم کے سلسلے میں پیش آمدہ مشکلات کے حل کے لیے محبانِ اردو کا ایک وفد وزیر تعلیم سے ملنے کے لیے طے پایا۔

(۱) لوکل حکام کو سخت ہدایات دی جائیں کہ ان کے علاقہ میں اگر فرقہ وارانہ فساد ہوا تو وہ اس کے ذمہ دار قرار دیئے جائیں گے۔

(۲) جن حکام کی غفلت یا مجرمانہ جنبہ داری ثابت ہو ان کو محکمانہ سزا دی جائے۔

(۳) قتل، غارت گری، آتش زنی جیسے تباہ کن جرایم کی ایسی عبرت ناک سزائیں دی جائیں کہ فرقہ پرستوں کو آیندہ امن سوز حرکات کی جرأت نہ ہو سکے۔

(۴) تعزیری ٹیکس لگایا جائے۔

(۵) مظلومین کے نقصانات کی تلافی کی جائے۔

(۶) مذکورہ بالا مقامات میں جو فسادات ہوئے ہیں ان کی صحیح صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے ایک آزاد کمیشن تحقیقات کے لیے مقرر کیا جائے۔

عیدالاضحیٰ کے بارے میں ایک تجویز میں کہا گیا ہے:

اگر چہ یہ امر موجب اطمینان ہے کہ امسال عیدالاضحیٰ کے موقع پر صوبے میں کوئی فساد رونما نہیں ہوا۔ تاہم جمعیت علماے صوبہ کی مجلسِ عاملہ یہ محسوس کرتی ہے کہ ایسی صورت میں جب کہ مسلمان گاے اور گاے کی نسل کے ذبیحے کو چھوڑ چکے ہیں تو ایک مذہبی حق قربانی پر کسی قسم کی ناروا پابندی عاید نہ ہونی چاہیے۔

مگر یہ دیکھا گیا ہے کہ صوبے کے متعدد مقامات پر عید سے ایک یا دو روز قبل جب کہ قربانی کے جانور خریدے جا چکے ہیں، لوکل حکام کی طرف سے ایسی منادی کی گئی کہ جن میں گاے اور گاے کی نسل کے علاوہ دوسرے جانوروں کی ممانعت بھی داخل تھی اور اس بنا پر مسلمانوں میں سخت تشویش پیدا ہوئی۔

اس لیے مجلسِ عاملہ کا یہ جلسہ حکومت یوپی کو پرزور توجہ دلاتا ہے کہ وہ عیدالاضحیٰ کے زمانے میں وقت سے بہت پہلے لوکل حکام کو یہ ہدایت دے کہ وہ اس قسم کی منادی کر کے ایسی فضا پیدا نہ کریں کہ جس سے مسلمانوں کو اپنے مذہبی حق کو استعمال کرنے میں تشویش ہو جاتی ہے اور توجہ دلانے پر لوکل حکام کو اپنی غلطی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

ایک اور تجویز میں کہا گیا ہے کہ مجلسِ عاملہ جمعیت علماے صوبہ کا یہ جلسہ مسجد بابری (اجودھیا) کے قضیۂ نامرضیہ کی موجودہ صورتِ حال اور اس کی طوالت کو جو ہر ایک حق پسند انسان کے نزدیک انتہائی تکلیف دہ اور دل آزار ہے۔

گورنمنٹ سے اس مطالبے کو دہراتا ہے کہ مسجد کے معاملے کو فیصل کرنے کے لیے جلد از جلد ایک اسپیشل عدالت کا تقرر کیا جائے۔(مدینہ-بجنور:۹ر ستمبر ۱۹۵۴ء)

معاہدۂ بلقان:

اگست ۱۹۵۴ء: یونان، ترکی اور یوگوسلاویہ کے درمیان اگست ۱۹۵۴ء میں ہونے والا معاہدہ جس کے تحت معاہدین نے کسی ایک رکن ملک پر جارحیت ہونے کی صورت میں امداد باہمی کا عہد کیا، یہ معاہدہ بیس سال کی میعاد کے لیے طے پایا تھا اور اسے رسمی طور پر منسوخ نہیں کیا گیا۔ لیکن ۱۹۵۵ء کے بعد سے یوگوسلاویہ اس سے بے تعلقی کا اعلان کرتا رہا۔(فرہنگ سیاسیات: ص۳۹۸)

نظام آباد کے فسادات:

یکم ستمبر ۱۹۵۴ء: ۱۵ر اگست کو نظام آباد میں جو غنڈہ گردی کا مظاہرہ اور وہاں کے دولت مند مسلمانوں کو لوٹنے اور انھیں تباہ کرنے کی جو سازش کی گئی تھی اس کے متعلق جمعیت علماے حیدرآباد نے پانچ سو شہادتیں جمع کرلی ہیں۔ جمعیت علما کے لیڈروں نے نظام آباد کے فساد پر اپنے رنج وغم اور غصے کا اظہار کیا ہے اور غنڈہ عناصر کو سخت سزائیں دینے اور متاثرین کے نقصانات کی تلافی کا مطالبہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں ۲۲ر اگست کو فسادات کے اسباب اور پیش آمدہ واقعات پر مبنی ایک رپورٹ بھی مرتب کی گئی ہے۔

(ملخصاً)(مدینہ-بجنور: یکم ستمبر ۱۹۵۴ء)

اعزاز قبول کرنے سے شیخ الاسلام کی معذرت:

۳ر ستمبر ۱۹۵۴ء: ملک کے ساتویں یوم آزادی پر ملک کے جن نامور حضرات کو خطابات سے نوازا گیا تھا ان میں حضرت شیخ الاسلام کا نام نامی بھی تھا۔ حضرت سے بڑھ کر اس کا مستحق کون تھا کہ اسے قبول کرتا، لیکن حضرت نے اپنے اخلاص عمل اور ایثار کا جو نمونہ پیش کیا اس کی نظیر صدیوں پر پھیلی ہوئی اسلام اور ہندوستان کی تاریخ آزادی میں شاید ہی مل سکے۔ یہ مقام اخلاص و ایثار گویا کہ حضرت کے لیے مخصوص تھا کہ حضرت شکریے کے ساتھ اسے قبول فرمانے سے معذرت کردیں۔ حضرت نے اس موقع پر صدر جمہوریہ ہند بابو

راجندر پرشاد کو جو مکتوب سامی تحریر فرمایا ہے اس میں ان کے قومی منصب کے پورے احترام کے ساتھ خطاب قبول کرنے سے معذرت کر دی ہے۔ حضرت فرماتے ہیں:

''بہ حضور جناب فیض مآب صدر جمہوریہ ہند دام اقبالکم

بعد از آداب عرض آں کہ اگر چہ اب تک مجھ کو باقاعدہ کوئی اطلاع نہیں دی گئی مگر اخباروں میں شائع شدہ اطلاعات سے معلوم ہوا کہ جناب نے پدم د بھوشن نمبر ۲ کے تمغے سے بنا بر صدارت جمعیت علماے ہند اور خدمات علمیہ دار العلوم دیو بند اور جدو جہد آزادیٔ وطن میری عزت افزائی فرمائی ہے (اگر واقعہ صحیح ہے) تو میں آپ کی اس قدر دانی اور عزت افزائی کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوا عرض رسا ہوں کہ چوں کہ ایسا تمغہ میرے نزدیک پبلک کی نگاہوں میں بے لوث آزاد خادمان ملک وملت کی آزادیٔ رائے اور اظہارِ حق کو مجروح کرنا اور قومی حکومت کی صحیح اور سچی رہنمائی کے لیے ایک قسم کی رکاوٹ ہے اور چوں کہ یہ امر میرے اسلافِ کرام مرحومین کے طریقے اور وضع کے خلاف بھی ہے اس لیے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ بہ صد شکریہ اس تمغے کو واپس کر دوں۔

ننگِ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ

۲ر تمبر ۱۹۵۴ء''

قومی خطاب خدمات کا محض ایک کاغذی اعتراف ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ سماجی و عملی زندگی میں بعض رعایات اور ایک بڑی نقد رقم بھی ہوتی ہے، جیسا کہ سر سید احمد خاں کو برٹش منافادات کے تحفظ و استحکام کے نتیجے میں اور حافظ محمد احمد (مہتمم دار العلوم) کو برٹش استعمار کی خدمات کے صلے میں ملی تھیں اور یہ حضرات ان سے متمتع بھی ہوئے تھے۔ حضرت شیخ الاسلام کا عمل اس کے برعکس تھا۔ برٹش عہد میں جان ہتھیلی پر رکھ حوادث سے کھیلتے زندگی گزاری تھی اور آزادی کے بعد ہر طرح کے منافادات، خطابات اور قومی وملکی خدمات کے اعترافات سے بے پروا اور بے نیاز رہ کر زندگی بسر کی تھی اور آزادانہ ملک وقوم اور دین وملت کی خدمت میں زندگی کے آخری لمحوں تک مصروف رہے تھے۔

مولانا نجم الدین اصلاحی نے اس مکتوب کے حاشیے میں حضرت کی سیرت کے بعض خصایص اور امتیازات پر روشنی ڈالی ہے۔

جمعیت کی مجلسِ عاملہ کا اجلاس، شرکا اور تجاویز:

۳ر ستمبر ۱۹۵۴ء: دہلی ۲ر ستمبر۔ جمعیت علماے ہند کا ایک وفد عن قریب شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب کی معیت میں وزیرِ اعظم مسٹر نہرو سے ملاقات کرے گا اور انھیں ملک کے اندر ہونے والے حالیہ فسادات کی طرف متوجہ کرے گا۔ اس امر کا فیصلہ آج جمعیت علماے ہند کی مجلسِ عاملہ میں کیا گیا تھا۔ اجلاس میں فسادات سے متعلق تجویز کے علاوہ ایک تجویز حاجیوں کو مستقل طور پر انکم ٹیکس سرٹیفکیٹ سے مستثنیٰ کرنے اور دوسری تجویز مشرقی پنجاب اور پیپسو کی مساجد کی فہرست تیار کرنے کے متعلق ہے۔ یہ تجاویز وزیرِ اعظم کو پیش کی جائیں گی۔ صبح پونے دس بجے اجلاس شروع ہوا، دو نشستیں ہوئیں۔ شام کی نشست میں حضرت مولانا آزاد بھی تشریف لائے۔ چھ بجے اجلاس ختم ہوا۔ تین اہم تجویزیں منظور کی گئیں۔

مندرجۂ ذیل اراکین مجلسِ عاملہ نے اس میں شرکت کی:

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مدظلہٗ العالی، حضرت علامہ ابوالکلام صاحب آزاد، سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب، مولانا مسعود علی صاحب ندوی، مولانا سید محمد شاہد فاخری صاحب، مولانا سید فخر الدین احمد صاحب، مولانا نور الدین صاحب بہاری، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی، مولانا محمد ابوالوفا صاحب، مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی صاحب، مولانا سید محمد میاں صاحب، مسٹر غلام رسول قریشی۔

حسبِ ذیل حضرات خصوصی دعوت پر شریک اجلاس ہوئے:

مولانا قاضی احمد حسین صاحب، مولانا محمد اسماعیل سنبھلی، مولانا محمد قاسم صاحب شاہ جہان پوری، سید محمد جعفری، پروفیسر محمد اجمل خاں صاحب، مولانا عبدالحمید صاحب نعمانی۔

تجویز: ملک کے مختلف حصوں بالخصوص اتر پردیش اور حیدر آباد دکن میں حالیہ فسادات کا جو تسلسل رونما ہے اور جن میں مسلمانوں کو جان و مال کا شدید نقصان اٹھانا پڑا ہے جمعیت علماے ہند کی مجلسِ عاملہ ان واقعات اور حوادث کو انتہائی تشویش کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔

مجلسِ عاملہ روزِ روشن کی طرح یہ یقین رکھتی ہے کہ یہ فسادات ہندو مسلم فسادات نہیں

کہے جا سکتے بلکہ اکثریتی فرقے کے مجنون فرقہ پرستوں کے غنڈہ پن کا نتیجہ ہیں۔ ایسی صورت میں ریاستی حکومتوں کا غنڈہ اور مفسد طبقہ پر قابو نہ پانا اور ان کا من مانی کارروائیوں کے لیے بے خوف ہو کر قتل، غارت گری اور آتش زنی جیسے شرم ناک امور برپا کرنا، ریاستی حکومتوں کے لیے حد درجے افسوس ناک امر ہے۔

مجلسِ عاملہ انتہائی تکلیف کے ساتھ یہ محسوس کرتی ہے کہ فرقہ پرست مفسدوں نے ملک کے امن کو تباہ کرنے میں جس دلیری اور بے باکی کا ثبوت دیا ہے اس کے مقابلے میں قیام امن و حفاظت جان و مال و آبرو کے لیے ریاستی حکومتیں قطعاً ناکام رہی ہیں اور ان کے ماتحت حکام اکثر و بیشتر اس سلسلے میں حد درجے غفلت شعار بلکہ بعض مقامات پر فرقہ پرستوں کے جانب دار ثابت ہوئے ہیں۔ تکلیف کا یہ احساس اس حالت کو دیکھ کر شدت اختیار کر لیتا ہے کہ ان جرایم کے انسداد اور مجرموں کی پاداش کے لیے جو مؤثر اقدامات ہو سکتے ہیں وہ ہر موقع پر عمل میں نہیں لائے جاتے نہ برباد شدہ مظلوموں کو خاطر خواہ امداد بہم پہنچائی جاتی ہے۔

مجلسِ عاملہ ان تمام حقایق کو پیشِ نظر لا کر ریاستی حکومتوں اور خصوصاً مرکزی حکومت پر یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتی ہے کہ ان فسادات کا انسداد تب ہی ممکن ہے کہ

(الف) تمام اضلاع کے حکام کو ایک واضح پالیسی کے ذریعے ہدایات دی جائیں کہ جس جگہ فساد رونما ہوگا اس ضلع کے حکام نااہل قرار دیے جائیں گے اور اگر غفلت شعاری یا جانب داری ثابت ہوگی تو ان کو محکمانہ سزا کا مستوجب قرار دیا جائے گا۔

(ب) جس فساد زدہ علاقے کی پولیس قتل، غارت گری اور آتش زنی کے مجرموں کی صحیح تفتیش میں ناکام رہے گی اور اصل مجرموں کو پاداش عمل کے لیے پیش نہ کر سکے گی اس کی ترقیات موقوف کر دی جائیں گی اور ان کو غفلت شعاری کی پاداش بھگتنی پڑے گی۔

(ج) مظلومین کے نقصانات کا معاوضہ دیا جائے۔

(د) جس فریق کی زیادتی ثابت ہو اس پر تعزیری پولیس مقرر کی جائے اور اس کے تمام اخراجات اعلا فریق پر عاید کیے جائیں۔

(ہ) حالیہ فسادات کے متعلق ایک آزاد کمیشن مقرر کیا جائے جس میں سرکاری صاف دماغ اعلا افسران اور غیر سرکاری افراد شامل ہوں۔ یہ کمیشن جلد سے جلد فسادات کے متعلق

تفتیش کر کے اس حقیقت کو منظرِ عام پر لاتے ہوئے کہ فسادات اندرونی یا بیرونی کسی قسم کی سازش کا نتیجہ ہیں اور جو تہمتیں فرقہ پرست عناصر مسلم اقلیت کے ذمے لگا کر فساد کے لیے بہانہ بناتے ہیں ان کی اصل حقیقت کیا ہے اور اس پردے میں کون سے ہاتھ کام کر رہے ہیں۔

(د) نیز آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا مرکزی دفتر ہندو مسلمانوں پر مشتمل ایک بورڈ بنائے اور جہاں کہیں فساد رونما ہو کم از کم ایک ہندو اور ایک مسلمان تحقیقات کے لیے بھیجا جائے اور اس کی رپورٹ شائع کی جائے۔

مجلسِ عاملہ اس سلسلے میں یہ بھی محسوس کرتی ہے کہ جمعیت علمائے ہند کا ایک وفد جو حضرات ذیل پر مشتمل ہو، جلد از جلد پرائم منسٹر سے ملاقات کرے اور صورتِ حال پر توجہ دلائے، نیز سطور بالا میں جو تجاویز پیش کی گئی ہیں وہ بھی ان کی خدمت میں پیش کر کے ایک واضح پالیسی کا مطالبہ کرے۔

مجلس عاملہ ملک کے ہر طبقے سے انسانیت، ملک و وطن کی محبت کے نام پر پرزور اپیل کرتی ہے کہ وہ مل جل کر مضبوط اخلاقی قوت کے ساتھ اس فرقہ پرستی کا قلع قمع کرنے کے لیے پرزور جدوجہد کریں اور وطن عزیز کو فرقہ پرستی کی اس لعنت اور بدنامی سے بچائیں۔

ارکان وفد: شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی، حضرت مولانا احمد سعید صاحب، حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، حضرت مولانا مسعود علی صاحب ندوی، حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب۔ حضرت مولانا محمد شاہد فاخری صاحب، حضرت مولانا نورالدین صاحب بہاری، قاضی احمد حسین صاحب بہاری، سید محمد جعفری صاحب (دہلی)۔

تجویز: چوں کہ مشرقی پنجاب اور پیپسو میں تقسیم ہند کے بعد ایسے حالات پیش آئے کہ وہاں کی تمام مسجدیں ویران ہو گئیں اور اوقاف کا معاملہ بھی تاریکی میں پڑ گیا، لہٰذا اجلاس ہذا ایک کمیٹی تجویز کرتا ہے جو مشرقی پنجاب اور پیپسو میں دورہ کر کے مساجد و اوقاف کی مکمل فہرست اور اوقاف کے متعلق ضروری حوالے فراہم کرے۔

مجلس کو امید ہے کہ ہر دو ریاستوں کی حکومتیں اس کمیٹی کے لیے سہولتیں بہم پہنچائیں گی۔ مولانا محمد میاں صاحب اور مولانا لقاء اللہ صاحب عثمانی اس کمیٹی کے ارکان منتخب کیے

گئے اور مزید تین ارکان کے اضافے کا اختیار دیا گیا۔

تجویز: مجلسِ عاملہ جمعیت علماے ہند کا یہ اجلاس حکومت ہند سے پرزور مطالبہ کرتا ہے کہ پلگرم پاس کے ذریعے جانے والے زائرین کو انکم ٹیکس سرٹیفکیٹ کی پابندی سے مستقل طور پر مستثنیٰ کردیا جائے۔

مجلسِ عاملہ حکومتِ ہند کے اس نقطۂ نظر کو استحسان کی نظر سے دیکھتی ہے کہ اس کو حجاج کی مشکلات کا پورا احساس ہے اور اسی احساس کا نتیجہ ہے کہ گزشتہ جون میں جب جمعیت علماے ہند کے ایک معزز وفد نے پنڈت نہرو وزیرِاعظم ہند سے ملاقات کرکے یہ مشکلات پیش کیں تو وزیرِاعظم موصوف نے اس سال کے حجاج کو مستثنیٰ کرنے کے احکام صادر کردیئے، اس لیے اس اجلاس کا مطالبہ ہے کہ اس استثنا کو مستقل حیثیت دے دی جائے تاکہ فریضۂ حج کی ادائیگی اور زیارت کے نیک مقصد میں رکاوٹ باقی نہ رہے۔

مجلسِ عاملہ اس تجویز کو بروے کار لانے کے لیے ناظم عمومی کو اختیار دیتی ہے کہ وہ مرکزی حکومت سے اس مسئلے میں گفت وشنید کریں اور مناسب سمجھیں تو موٴثر وفد کے ذریعے اس کو حل کرانے میں سعی کریں۔ (مدینہ-بجنور: ۹رستمبر ۱۹۵۴ء)

خطاب کی واپسی:

۴رستمبر ۱۹۵۴ء: نئی دہلی، ۴رستمبر۔ معلوم ہوا ہے کہ مولانا حسین احمد مدنی نے پدم وبھوشن کا خطاب جو ان کو صدر جمہوریہ نے یوم جمہوریہ کے موقع پر دیا تھا شکریے کے ساتھ واپس کردیا ہے اور کہا ہے کہ اس کو قبول کرنا میرے اور میرے بزرگوں کے اصولوں کے خلاف ہے۔ (مدینہ-بجنور: ۹رستمبر ۱۹۵۴ء)

الجمعیۃ اور میسیج کے خلاف الزام کی تردید:

۹رستمبر ۱۹۵۴ء: جمعیت علماے ہند کے اخبار الجمعیۃ (اردو) اور میسیج (انگریزی) پر الزامات کی تردید از مولانا ابوالکلام آزاد۔

مولانا آزاد کا بیان یہ ہے:

جمعیت علماے اور اس کے اخبار ''الجمعیۃ'' اور ''میسیج'' پر الزام کی تردید — امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کا بیان۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اخباروں کو بیان دیتے ہوئے کہا کہ میں نے اخبار میثاق کا وہ مضمون دیکھا جس کی بنا پر دلی کے ایک اخبار نے جمعیت علماے ہند پر یہ الزام لگایا ہے کہ اس نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین گوارا کی۔

سبحانك هذا بهتان عظيم

کچھ عرصہ ہوا جمعیت علما کے انگریزی ہفتہ وار میثاق میں ایک مضمون شائع ہوا تھا جسے اس نے مشہور اسلامی رسالے مسلم ڈائجسٹ سے نقل کیا تھا۔ اس پر دہلی کے ایک اخبار نے اک دم سے بہت زوردار الفاظ میں شور مچانا شروع کر دیا کہ اس مضمون سے آں حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان میں گستاخی کی گئی ہے۔ مولانا آزاد اس سلسلے میں کہتے ہیں کہ

''اس مضمون میں اول سے لے کر آخر تک ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جو آں حضرت کی شان مقدس کے خلاف ہو۔ مضمون ایک جرمن نومسلم نے لکھا ہے جو ایک دوسرے اخبار ''مسلم ڈائجسٹ'' میں نکلا تھا، میثاق نے اس سے نقل کیا۔ پورا مضمون اسلام کی حمایت میں لکھا گیا ہے اور یہ بات واضح کی ہے کہ اسلام نے شراب کو حرام ٹھہرا کر نوع انسانی کی ایک بہت بڑی خدمت انجام دی۔

چوں کہ حدیث کی کتابوں میں اس مضمون کی ایک روایت موجود ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ''نبیذ'' پیش کی گئی تو آپ نے فرمایا ''اس میں اور زیادہ پانی ملاؤ، اس سے مضمون نگار نے...... 0 یہ روایت قابل اعتماد نہیں انگریزی میں جو لفظ لکھا ہے وہ اسپوریس (Spuriaus) ہے یعنی ایسی بات جو گھڑی اور ناقابل اعتماد ہو۔

میں نہیں خیال کرتا کہ کوئی آدمی جسے دیانت داری کا ذرا بھی پاس اور لحاظ ہو اس مضمون سے یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ نعوذ باللہ آں حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی توہین گوارا کی گئی ہے۔ مضمون نگار ایک یوروپین نومسلم ہے اس نے جو کچھ لکھا وہی قابل تحسین ہے۔ اس سے زیادہ کی توقع ہم اس سے نہیں کر سکتے۔ اس لیے ضروری ہے کہ نبیذ والی روایت کی حقیقت واضح کر دی جائے۔

عربی میں نبیذ ایسے مشروب کو کہتے ہیں جس میں مٹھاس کے لیے کشمش یا کھجور ملا دی گئی ہو۔ اس زمانے میں شکر نہیں تھی۔ اس لیے مٹھاس کے لیے شہد، کھجور اور کشمش کام میں لاتے تھے۔ مکہ معظمہ کے کنوئیں ''زمزم'' کا پانی کسی قدر کھاری ہے، اس لیے ان کا

کھاری پن دور کرنے کے لیے لوگ کھجور یا کش مش اس میں ڈال دیا کرتے تھے۔

اس روایت کا مطلب یہ ہے کہ کھجور ملایا ہوا پانی آپ کو پیش کیا گیا۔ پانی کی مقدار کم تھی کھجور کے ٹکڑے زیادہ ڈالے گئے تھے، اس لیے مٹھاس تیز ہوگئی تھی۔ اگر آپ اسے پی لیتے تو دوسروں کے حصے میں کچھ نہ آتا۔ آپ کے خلق عظیم نے یہ گوارا نہ کیا کہ تنہا پی لیں۔

آپ نے فرمایا اس میں اور پانی ڈالو۔ مطلب یہ تھا کہ مقدار زیادہ ہو جائے اور دوسرے لوگ بھی شریک ہو سکیں۔ ساتھ ہی فرمایا جب کبھی اس طرح کا پانی بناؤ تو بہت زیادہ میٹھا بنا کے خود ہی نہ پی لو بلکہ زیادہ پانی ڈال کر دوسروں کو بھی پلاؤ۔ پانی کا کھاری پن دور کرنے کے لیے مٹھاس کی تھوڑی سی مقدار کافی ہے۔ اس لیے میٹھا شربت بنانا ضروری نہیں۔

اگر کش مش اور کھجور پانی میں ڈال کے زیادہ عرصے تک چھوڑ دی جائے تو اس میں جوش آجاتا ہے اور پھر اسے ایک خاص طریقے سے تیار کر کے پئیں تو وہ ایسا مشروب ہو جاتا ہے کہ اگر تین چار پیالے مسلسل پے جائیں تو سرور کی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ اس دوسری قسم کے مشروب پر بھی نبیذ کا اطلاق ہوا۔ کیوں کہ کش مش اور کھجور سے یہ بھی بنائی گئی۔ روایت میں جو ''نبیذ'' کا لفظ آیا ہے اس سے مقصود پہلی قسم ہے، دوسری قسم نہیں ہے۔ چناں چہ محققین اصحاب حدیث نے یہ بات واضح کر دی ہے اور آئمہ لغت نے صاف طور پر لکھ دیا ہے کہ نبیذ کا اطلاق دونوں قسموں پر ہوتا ہے۔ لیکن بہ ہر حال اس مضمون نگار نے تو روایت کو ناقابل اعتماد کہہ کر رد وکد کا دروازہ ہی بند کر دیا۔ اس نے یہ بات صاف کر دی کہ اگر روایت میں ''نبیذ'' کا اطلاق واین (Wine) پر ہوا ہے یعنی ہلکی قسم کی شراب پر، تو یہ قابل اعتماد نہیں۔ کیوں کہ آں حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ذہن مبارک کسی حال میں بھی اس سے آشنا نہیں ہو سکتا تھا۔ (مدینہ۔ بجنور: ۹ ر ستمبر ۱۹۵۴ء)

حاشیہ ❶: اس مقام پر طباعت کے وقت کاغذ کی شکن نے عبارت کو ناقابلِ قرأت کر دیا ہے۔ لیکن مضمون کا مفاد سمجھنے میں دشواری نہیں ہوتی۔

مولانا آزاد کی اس تحریر کی ایک تلخیص ہفت روزہ چٹان۔ لاہور میں شایع ہوئی تھی۔ یہاں اسے بھی شامل کر دیا جاتا ہے تا کہ قارئین کرام کے دل میں مفہوم کی صحت کے بارے میں کوئی شک باقی نہ رہے مذکورہ تلخیص یہ ہے:

''میں نہیں خیال کرتا کہ کوئی آدمی جسے دیانت داری کا ذرا بھی پاس اور لحاظ ہو اس مضمون سے یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ نعوذ باللہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کی گئی ہے۔

مضمون نگار ایک یورپین نومسلم ہے اس نے جو کچھ لکھا وہ قابل تحسین ہے اس سے زیادہ کی توقع ہم اس سے نہیں کر سکتے۔ عربی میں ''نبیذ'' ایسے مشروب کو کہتے ہیں جس میں مٹھاس کے لیے کشمش یا کھجور ملادی گئی ہو۔ اس زمانے میں شکر نہیں تھی۔ اس لیے مٹھاس کے لیے شہد، کھجور یا کشمش کام میں لاتے تھے۔ مکۂ معظمہ کے کنوئیں ''زم زم'' کا پانی کسی قدر کھارا ہے۔ اس لیے اس کا کھارا پن دور کرنے کے لیے لوگ کھجور یا کشمش اس میں ڈال دیا کرتے تھے۔

اس روایت کا مطلب یہ ہے کہ کھجور ملایا ہوا پانی آپ کو پیش کیا گیا۔ پانی کی مقدار کم تھی، کھجور کے ٹکڑے زیادہ ڈالے گئے تھے۔ اس لیے مٹھاس تیز ہوگئی۔ اگر آپ ویسے ہی پی لیتے تو دوسروں کے حصے میں کچھ نہ آتا۔ آپ کے خلق عظیم نے یہ گوارا نہ کیا کہ تنہا پی لیں آپ نے فرمایا اس میں اور پانی ڈالو۔ مطلب یہ تھا کہ مقدار زیادہ ہو جائے اور دوسرے لوگ بھی شریک ہو سکیں، ساتھ ہی فرمایا:

> ''جب کبھی اس طرح کا پانی بناؤ تو بہت زیادہ میٹھا بنا کے تنہا خود ہی نہ پی لو بلکہ زیادہ پانی ڈال کر دوسروں کو بھی پلاؤ! پانی کا کھارا پن دور کرنے کے لیے مٹھاس کی تھوڑی سی مقدار کافی ہے۔ اُسے میٹھا شربت بنانا ضروری نہیں۔''

اگر کشمش یا کھجور پانی میں ڈال کر زیادہ عرصے تک چھوڑ دی جائے تو اس میں جوش آجاتا ہے اور پھر اسے ایک خاص طریقے سے تیار کر کے پئیں تو وہ ایسا شربت ہو جاتا ہے کہ اگر تین چار پیالے مسلسل پیے جائیں تو سرور کی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ اس دوسری قسم کے مشروب پر بھی نبیذ کا اطلاق ہوا کیوں کہ کشمش اور کھجور ہی سے یہ بنائی گئی۔ ائمہ لغت نے صاف لکھ دیا ہے کہ نبیذ کا اطلاق دونوں قسموں پر ہوتا ہے لیکن روایت میں جو نبیذ کا لفظ آیا ہے اس سے مقصود پہلی قسم ہے۔ دوسری قسم نہیں ہے۔ چناں چہ محققین اصحاب حدیث نے یہ بات واضح کر دی ہے۔

اس مضمون نگار نے تو روایت کو نا قابل اعتماد لکھ کر ردّ و کد کا دروازہ ہی بند کر دیا اس نے یہ بات صاف کر دی کہ اگر روایت میں نبیذ کا اطلاق وائن (Wine) پر ہوا ہے یعنی ہلکے قسم کی شراب پر تو یہ قابل اعتماد نہیں۔ کیوں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دہن مبارک کسی حال میں بھی اس سے آشنا نہیں ہو سکا۔ (حوالہ ہفت روزہ چٹان - لاہور ۲۰ ستمبر ۱۹۵۴ء)

جمعیت کے وفد کی وزیر اعظم سے ملاقات — حضرت شیخ کی سربراہی:

۹ر ستمبر ۱۹۵۴ء: حضرت شیخ الاسلام مدظلہ العالی کی سربراہی میں جمعیت علماے ہند کا ایک وفد وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو سے ملاقات کرے گا اور انھیں مسلمانوں کے مسایل اور ملک کی سیاسیات میں اپنے نقطۂ نظر سے آگاہ کرے گا۔

(مدینہ۔ بجنور: ۹ر ستمبر ۱۹۵۴ء)

جمعیت علماے ہند کا یہ اجلاس ۳ر ستمبر کو ہوا تھا۔ اس کی روداد اور پاس شدہ تجاویز چند صفحے پہلے تفصیلاً پیش کی جا چکی ہے:

رفیع احمد قدوائی کا انتقال:

۲۴ر اکتوبر ۱۹۵۴ء: مرکزی وزیرِ خوراک انڈیا رفیع احمد قدوائی کا ۲۴ر اکتوبر ۱۹۵۴ء کو دہلی میں انتقال ہو گیا۔

روزنامہ ''خلافت''، بمبئی کے حوالے سے ''مولانا آزاد۔ ایک سیاسی ڈایری'' میں اثر ابن یحییٰ انصاری لکھتے ہیں:

''مرکزی وزیرِ خوراک رفیع احمد قدوائی کا آج چار بج کر پینتالیس منٹ پر حرکتِ قلب بند ہو جانے سے (دہلی میں) انتقال ہو گیا۔ ہندوستان اپنے ایک سچے خادم سے محروم ہو گیا۔ آپ ضلع بارہ بنکی، قصبہ مسولی کے رہنے والے تھے۔ کئی بار جیل کی صعوبتیں جھیلیں۔ آپ کا دورِ وزارتِ خوراک نہایت کامیاب اور بے داغ رہا۔

۲۵ر اکتوبر ۱۹۵۴ء دہلی سے اسپیشل ٹرین کے ذریعے مسٹر رفیع احمد قدوائی کی نعش اپنے آخری سفر پر مسولی (بارہ بنکی) کے لیے روانہ ہو گئی۔ پورے فوجی اعزاز کے ساتھ ''محاذ اغذیہ'' کے اس فاتح اعظم کی میت توپ گاڑی کے ذریعے دو طرفہ چشم نم لاکھوں انسانوں کے درمیان سے دہلی اسٹیشن پر لائی گئی۔ کل دوپہر آپ کو مسولی میں سپرد خاک کیا جائے گا۔ متعدد وزرا میت کے ساتھ گئے۔ اپنے قابل ترین رہنما کی موت پر سارے ملک میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ ملک بھر میں سرکاری دفاتر بند ہو گئے۔ تفریحی تقریبات بھی ملتوی ہو گئیں۔ ہندوستان بھر میں تعزیتی جلسے ہوئے۔

پاکستان کی قانون ساز اسمبلی برخواستگی:

۲۴/اکتوبر ۱۹۵۴ء: گورنر جنرل پاکستان ملک غلام محمد ایبٹ آباد گئے ہوئے تھے، انہیں معلوم ہوا کہ خواجہ ناظم الدین گروپ نے ان کے خلاف ایک خطرناک منصوبہ بنایا ہے۔ وہ فوراً لوٹے اور ۲۴/اکتوبر ۱۹۵۴ء کو مجلسِ قانون ساز کو یک قلم برخواست کر دیا۔

(آہنگ بازگشت: از محمد سعید، ص ۳۵۰)

مولوی تمیز الدین مجلسِ دستور ساز کے صدر تھے۔ انھوں نے گورنر جنرل کے اس اقدام کے خلاف ہائی کورٹ میں مقدمہ دائر کر دیا۔ ہائی کورٹ نے ان کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ لیکن جب مقدمہ فیڈرل کورٹ میں پہنچا تو ایک قانونی نکتے کی وضاحت نے غلام محمد کے اقدام کا جواز پیدا کر دیا۔ (ایضاً: ص ۳۵۲)

رفیع احمد قدوائی کے انتقال پر حضرت شیخ کی تعزیت:

۲۸/اکتوبر ۱۹۵۴ء: شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی صدر جمعیت علمائے ہند نے رفیع احمد قدوائی مرحوم کی اچانک وفات پر گہرے افسوس کا اظہار کیا ہے۔ آپ نے اپنے پیغام الم و تعزیت میں فرمایا:

> ''ایک بہادر محبِ وطن کی وفات سے وہ خلا پیدا ہو گیا ہے، جس کا پُر ہونا بہت مشکل ہے۔ قدرت نے آپ کو غیر معمولی خصوصیات عطا فرمائی تھیں، جن کو آپ نے ملک اور قوم کی خدمت میں صرف کیا۔ یہاں تک کہ قوم کی خدمت کرتے ہوئے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو جوارِ رحمت میں مقامِ اعلا عطا فرمائے اور آپ کے پس ماندگان کو صبرِ جمیل بخشے۔''
>
> (الجمعیۃ- دہلی: ۲۸/اکتوبر ۱۹۵۴ء، ص ۱)

قدوائی مرحوم مرکز میں وزیرِ خوراک تھے۔ ۲۵/اکتوبر کو دہلی میں انتقال ہوا تھا مسولی (ضلع بارہ بنکی- یوپی) میں ان کے آبائی وطن میں دفن کیا گیا تھا۔

سہارن پور میں حضرت شیخ الاسلام کی تقریر:

۲۶/اکتوبر ۱۹۵۴ء: ۱۴/۱۵/اکتوبر کو موضع سڈھاڑہ (متصل قصبہ شاہ پور، ضلع

مظفر نگر) میں ضلع جمعیت کی ایک میٹنگ ہوئی، جس میں متعدد اکابر کے علاوہ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی مدظلہ نے بھی شرکت فرمائی۔

۱۴/اکتوبر بعد نمازِ عشا جلسہ منعقد ہوا۔ مولانا محمد قاسم کی مفصل تقریر کے بعد حضرت شیخ الاسلام نے تقریر فرمائی، حضرت نے فرمایا:

"آج ہم آزاد ہیں۔ ہم نے آزادی کی جدوجہد میں صرف حصہ ہی نہیں لیا بلکہ پیش روکی حیثیت سے کام کیا ہے، لہٰذا ہمارا یہ وطن ہے، ہمیں یہیں رہنا ہے اور اس کی ترقی میں برابر کا حصہ لے کر اس کو آگے بڑھانا ہے۔ آج کچھ فرقہ پرست طرح طرح کی آوازیں اٹھارہے ہیں، مگر بہادر مسلمان ایسی آوازوں سے مرعوب نہیں ہوسکتا۔ اس کو جم کر اپنے ملک کی خدمت کرنی ہے اور اپنے ایمانی جذبے سے اور اعلا اخلاق سے دین وملت کو محفوظ رکھنا ہے۔" دو بجے شب کو حضرت کی تقریر پر جلسہ ختم ہوا۔

۱۵/اکتوبر کو صبح بعد نماز فجر سیکڑوں کی تعداد میں مسلمانوں نے حضرت شیخ الاسلام کے دست مبارک پر بیعت کی۔ اس کے بعد حضرت نے اپنے دست مبارک سے مدرسے کی بنیاد رکھی۔ آٹھ بجے (صبح) دوسرا جلسہ منعقد ہوا۔ ایک بجے حضرت ناولی تشریف لے گئے۔ ایک گھنٹہ ٹھہر کر مظفر نگر آکر نماز جمعہ ادا کی۔ اسی روز شام کو حضرت دیوبند واپس ہوگئے۔

(الجمعیۃ: ۲۶/اکتوبر ۱۹۵۴ء، ص ۴)

رفیع احمد قدوائی کا انتقال اور پنڈت نہرو پر اثر:

یکم نومبر ۱۹۵۴ء: صفِ اول کے کانگریسی اور ہندوستان کے وزیرِ خوراک رفیع احمد قدوائی کا ۲۴/اکتوبر ۱۹۵۴ء کو دہلی میں انتقال ہوگیا۔ ان کے انتقال کا ملک کے ہر طبقۂ خیال میں ماتم کیا گیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو سے ان کا بہت قریبی اور عزیزانہ تعلق تھا۔ وہ اس حادثے سے بہت متاثر ہوئے۔ ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے:

ڈیرین ۲۵/اکتوبر۔ وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو آج صبح یہاں اپنے عزیز دوست اور ساتھی مسٹر رفیع احمد قدوائی کے انتقال کی خبر سن کر اتنے غمگین ہوگئے کہ ان کے لیے کھڑا رہنا محال ہوگیا اور وہ سر پکڑ کر صوفے پر بیٹھ گئے۔

پنڈت نہرو غم کی شدت سے ایک لفظ بھی نہ کہہ سکے، لیکن ان کا اداس اور پیلا چہرہ ان کے دلی رنج وغم کا پوری طرح آئینہ دار بن گیا تھا۔

بعد میں پنڈت نہرو نے یہاں اخبارات کو ایک بیان دیتے ہوئے کہا "میں مسٹر رفیع احمد قدوائی کے بارے میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ان کا انتقال ذاتی اور قومی دونوں اعتبار سے ایک ایسا الم ناک سانحہ ہے جو میری لیے نا قابل برداشت ہے۔

پنڈت نہرو نے اپنے بیان میں کہا کہ ۳۵ برس تک آزادی کی جدوجہد اور آزادی کے بعد حکومت کے ممبر کی حیثیت سے ہم لوگ اچھے اور برے زمانوں میں مل جل کر کام کرتے رہے۔ پرانے ساتھیوں کی موت ہمیشہ بہت تکلیف دہ ہوتی ہے۔ اوز ایسے موقعوں پر تنہائی کا احساس بڑھ جاتا ہے، لیکن رفیع صاحب کے انتقال سے ہم پر زیادہ کاری ضرب پڑی ہے۔

پنڈت نہرو نے کہا کہ آزادی کے جدوجہد کے زمانے میں اور آزادی کے بعد رفیع صاحب نے اپنے ملک کی نہایت ہی شان دار خدمات انجام دی ہیں اور کسی کی اتنی کمی محسوس نہیں ہوگی جتنی ان کی کمی محسوس کی جائے گی۔

پنڈت نہرو نے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کے نام ایک تعزیتی تار میں کہا کہ مسٹر رفیع احمد قدوائی کے انتقال کی خبر یہاں ابھی ابھی موصول ہوئی ہے، مجھے اپنے عزیز ترین دوست اور قابل ترین ساتھی کے انتقال کا سخت افسوس ہے، ملک کی خدمت کے سلسلے میں ان سے زیادہ بہادر اور کوئی شخص نہیں تھا۔

پنڈت نہرو نے اپنے بحری تار میں کہا ہے کہ رفیع صاحب کے انتقال سے حکومت اور ہندوستان دونوں کو زبردست نقصان پہنچا ہے اور میرے لیے ان کے پرانے ساتھی اور وزیر اعظم دونوں حیثیتوں سے یہ نقصان اور بھی بڑا ہے اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں اکیلا رہ گیا ہوں۔

پنڈت نہرو نے بیگم قدوائی کے نام ایک تعزیتی تار بھیجا ہے جو دہلی میں آج شام کو موصول ہوا ہے، جس میں انھوں نے کہا ہے کہ آپ کے ساتھ سارا ملک مسٹر قدوائی کا سوگ منا رہا ہے۔

پنڈت نہرو نے کہا کہ رفیع صاحب نے آزادی کی جدوجہد اور اس کے بعد نئے ہندوستان کی تعمیر میں بڑا اہم حصہ لیا ہے۔

پنڈت نہرو نے یہ تار ڈیرین سے بھیجا جو شمال مشرق میں چین کا زبردست بحری مرکز

ہے۔انھوں نے کہا ہے کہ میں آپ سے کہہ نہیں سکتا کہ مجھے اس خبر سے کتنا افسوس ہوا ہے۔

(مدینہ۔بجنور: یکم نومبر ۱۹۵۴ء)

رفیع احمد قدوائی کا ماتم:

رفیع احمد قدوائی کے انتقال پر حکومت ہند کا اعلانیہ شائع ہوا ہے، اس میں کہا گیا ہے:

"۲۴ر اکتوبر کی شام کو مسٹر رفیع احمد قدوائی وزیر خوراک وزراعت کی وفات کی خبر صدر جمہوریہ نے گہرے رنج والم کے ساتھ سنی۔ان کی موت سے حکومت اور قوم ایک عظیم محب وطن، منتظم اور مدبر سے محروم ہوگئی ہے۔ان کی کامیابیوں نے سب سے خراج تحسین حاصل کیا تھا۔وہ ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے گاندھی جی کی آواز پر لبیک کہا اور جدوجہد آزادی میں حصہ لیا۔ان کی تنظیمی قابلیت کے باعث کانگریسی لیڈروں کے درمیان جلد ہی ان کی ایک پوزیشن بن گئی۔ان کو دس سال قید کی سزا دی گئی تھی۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو تحریک آزادی سے کتنا لگاؤ تھا اور آزادی کے مخالف ان سے کتنے خوف زدہ تھے۔"

قدوائی مرحوم کے انتقال پر ملک کے صدر سے لے کر حکومت کے اراکین، سیاسی جماعتوں کے سربراہان، بیرونی ممالک کے نمائندوں وغیرہ تک کے تعزیتی بیانات شائع ہوئے ہیں۔ان میں سے چند بیانات یہ ہیں:

صدر جمہوریۂ ہند کے بارے میں رپورٹ میں کہا گیا ہے:

"۲۵ر اکتوبر۔صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد بہ ذات خود رفیع صاحب کے مکان پر بیگم رفیع کے پاس تعزیت کے لیے گئے۔صدر جمہوریہ رفیع صاحب کی نعش پر چند منٹ تک سر جھکائے خاموش کھڑے رہے۔پھر قدوائی صاحب کی میت پر آپ نے پھول چڑھائے۔صدر جمہوریہ نے وزیر ریلوے مسٹر لال بہادر شاستری سے ان انتظامات کے بارے میں بھی مشورہ کیا جو مسٹر قدوائی کی میت کو ان کے وطن مسولی لے جانے کے بارے میں کیے جارہے تھے۔"

مولانا ابوالکلام آزاد مرکزی وزیر تعلیم نے آل انڈیا ریڈیو سے تقریر میں قدوائی

مرحوم کو خراج تحسین پیش کیا:

''نئی دہلی، ۲۵ر اکتوبر۔ مرکزی وزیر تعلیم و مولانا ابوالکلام آزاد۔ نے آج مرحوم رفیع احمد قدوائی کی وفات پر آل انڈیا ریڈیو دہلی سے ایک تقریر نشر کرتے ہوئے فرمایا؛

یہ عجیب بات ہے کہ انسان کی زندگی کی قدر و قیمت اس وقت محسوس ہوتی ہے جب موت کا بے رحم پنجہ اسے ہم سے جدا کر دیتا ہے، اگرچہ رفیع صاحب کی موت کو ابھی ۲۴ گھنٹے نہیں گزرے ہیں لیکن انھیں گھنٹوں میں ہم نے دیکھ لیا ہے کہ جو زندگی ہم سے جدا ہوئی ہے اس کی عوام میں کتنی عزت ہے۔ صبح سے شام تک بے شمار مرد و عورت ان کی میت کے پاس سے گزر کر انھیں خراج عقیدت ادا کر چکے ہیں اور کوئی ایسی آنکھ نہ تھی جو اشک بار نہ ہو۔

رفیع صاحب کی موت ایک قومی نقصان ہے اور قوم کا ہر فرد اس قومی نقصان کو محسوس کر رہا ہے ان کا شمار ان چند لوگوں میں تھا جنھیں آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد قوم کی خدمت کا موقع ملا۔ آزادی سے پہلے وہ انتھک سپاہی تھے اور آزادی کے بعد ایک انتھک وزیر۔ جب ملک کو ایسے لوگوں کی ضرورت تھی جو آزادی کی راہ میں اپنا عیش و آرام قربان کر سکیں۔ رفیع صاحب نے اپنی قربانی پیش کی۔ آزادی کے بعد ملک کو قابلیت کی ضرورت تھی، انھوں نے ملک کو قابلیت پیش کی۔ ان کی زندگی قربانی اور قابلیت دونوں کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ جب میں نے رفیع صاحب کے انتقال کی خبر سنی تو میرا خیال تیس برس کے واقعات کی طرف پلٹا اور میں سوچنے لگا کہ کانگریس میں میں نے انھیں پہلی بار کب دیکھا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ یہ غالباً ۱۹۲۵ء کی بات ہے، یہ وہ زمانہ تھا جب کانگریس کی سرگرمیاں دو جماعتوں میں تقسیم ہو گئی تھیں۔ ایک جماعت وہ تھی جو تعمیری پروگرام پر یقین رکھتی تھی اور دوسری جماعت کی قیادت پنڈت موتی لال نہرو اور اجمل خاں کے ہاتھوں میں تھی۔ انھوں نے اپنی اس جماعت کا نام سوراج پارٹی رکھا تھا۔ اس پارٹی کو ایسے لوگوں کی ضرورت تھی جو کونسلوں کے الیکشن وغیرہ کا کام آرگنائز کر سکیں۔ اس وقت رفیع صاحب اس

پارٹی میں شامل ہوئے اور انھوں نے بہت جلد پنڈت موتی لال نہرو کا اعتماد حاصل کرلیا۔ ۱۹۳۷ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء پاس ہو جانے پر یوپی میں پنڈت پنت کی سرکردگی میں کانگریس کی پہلی وزارت بنی، اس میں ایک وزیر قدوائی صاحب تھے۔ جب کانگریس نے صوبوں میں وزارتیں بنانے کا فیصلہ کیا تو ایک پارلیمنٹری بورڈ بنایا گیا، جس میں ڈاکٹر راجندر پرشاد اور سردار پٹیل تینوں اس کے ممبر تھے دوسرے صوبوں کے ساتھ یوپی سے متعلق کام بھی میرے سپرد تھا۔ جب میں لکھنؤ گیا تو وزارت کے لیے بہت سے نام میرے سامنے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان میں قدوائی صاحب کا نام نہیں تھا لیکن جب لوگ مجھ سے ملے تو ہر ایک نے رفیع صاحب کا نام پیش کیا اور پنت جی انھیں وزارت میں لینے کے خواہش مند تھے۔ وزارت کے بعد وہ وقت آیا جب ان کی عملی قابلیتیں اُبھریں اور ان کی شخصیت نے ایک اور اچھی جگہ حاصل کرلی۔ ملک جب آزاد ہوا اور مرکز میں وزارت بنی تو ہم نے محسوس کیا کہ قدوائی صاحب کو مرکز میں آنا چاہیے۔ چناں چہ مرکز میں جن ذمے داریوں کو انھوں نے انجام دیا اس کا ہر شخص کو اعتراف ہے۔ خوراک کے مسئلے کا حل ان کی زندگی کا شان دار کارنامہ ہے، جس کو ملک ہمیشہ یاد رکھے گا۔ جس وقت خوراک کا روگ قابو سے باہر تھا اس وقت یہ کام قدوائی صاحب کے سپرد کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انھوں نے ڈھائی سال کی مدت میں اس مسئلے کا حل تلاش کردیا کہ ہم آج اطمینان کا سانس لے رہے ہیں۔ کامیاب زندگیاں وہی ہوتی ہیں جن کی موت کو لوگ بھلا نہ سکیں۔ رفیع صاحب کی زندگی ایک کامیاب زندگی تھی۔

جب آزادی کے دور کی تاریخ لکھی جائے گی اس وقت چند آدمیوں کے نام مؤرخ نہیں بھلا سکے گا اور مجھے یقین ہے کہ ان ناموں میں سے ایک نام رفیع احمد قدوائی کا ہوگا۔''

پاکستان کے ہائی کمشنر راجہ غضنفر علی خاں نے کہا:

''میرے عزیز اور محترم دوست رفیع احمد قدوائی کی اچانک اور افسوس

ناک موت سے مجھ پر شدید ضرب پڑی ہے، وہ نہایت ہی ممتاز منتظم اور سیاست دان تھے اور آخر وقت تک اپنے ملک کی خدمت کرتے رہے۔ رفیع صاحب بڑی ہر دل عزیز شخصیت کے مالک تھے، وہ ہر اس شخص کی مدد کرنے کو تیار رہتے تھے جس کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ ان لوگوں کا شمار ممکن نہیں جو ذاتی دوست، مددگار یا قومی لیڈر کی حیثیت سے ان کا سوگ منائیں گے۔ میں رفیع صاحب کے خاندان والوں کے رنج وغم میں شریک ہوں۔ میری دعا ہے کہ خدا ان کی روح کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔''

مسٹر ایس این اگروال جنرل سیکرٹری کانگریس:

''مجھے رفیع صاحب کے اچانک انتقال سے سخت صدمہ پہنچا ہے۔ ان کے انتقال نے ہمیں ایک عظیم سیاست داں، ایک تجربہ کار منتظم اور آزادی اور جمہوریت کے لیے مسلسل جدوجہد کرنے والے سے محروم کر دیا ہے۔ مسٹر قدوائی مرکزی حکومت اور کانگریس دونوں کے لیے طاقت کے ستون کی حیثیت رکھتے تھے۔ غذا کے مسئلے کو حل کر کے انھوں نے ملک کی جو خدمت انجام دی ہے، اسے کبھی فراموش نہ کیا جا سکے گا۔''

مسز پنڈت:

''ٹوکیو، ۲۶ر اکتوبر: رفیع صاحب کی موت میرے لیے خاندان کے ایک فرد کی موت ہے۔ رفیع صاحب ایک زبردست عملی آدمی تھے۔ اور ان کی موت سے ملک کو جو نقصان پہنچا ہے اس کا پورا ہونا دشوار ہے۔''

مسٹر دیش مکھ وزیرِ مالیات:

''ٹوکیو، ۲۶ر اکتوبر: رفیع صاحب کی موت ایک زبردست قومی نقصان ہے۔ ملک کے غذائی مسئلے کو حل کر دینا رفیع صاحب ہی ایسے بہادر اور مستعد آدمی کا کام تھا۔ رفیع صاحب کو ملک کی تاریخ میں ایک بلند مقام ملے گا۔ ان کی موت سے ملک ایک اعلا منتظم کی خدمات سے محروم ہو گیا۔''

این سی چڑ جی صدر ہندو مہا سبھا:

''ڈاکٹر ایس پی مکر جی کی موت کے بعد مسٹر قدوائی نے سخت قدم اٹھا کر

کشمیر میں غدارانہ سرگرمیوں کو روک دیا۔ ورنہ کشمیر ہندوستان کے ہاتھ سے نکل جاتا۔ مسٹر قدوائی کی اچانک موت نے ہم سے ایک منتظم کو چھین لیا ہے جو کام کرنا جانتا تھا۔ مسٹر قدوائی نے خوراک کے مسئلے کو مضبوطی کے ساتھ حل کیا اور کنٹرول ہٹا کر عوام کو اطمینان کا سانس لینے کا موقع دیا۔''

(سہ روزہ مدینہ۔ بجنور: یکم نومبر ۱۹۵۴ء)

مجاہد ملت کا دورہ:

۱۰ر نومبر ۱۹۵۴ء: رائے پور، جمعیت علماے ہند کے ناظم عمومی مولانا حفظ الرحمٰن وسط ہند کا دورہ کرتے ہوئے ۱۰ر نومبر کو رائے پور پہنچے، یہاں مولوی سمیع اللہ صاحب کے زیر صدارت ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ایک اخلاقی تحریک کے ذریعے ہم نے برطانیہ جیسی زبردست حکومت سے ملک کو آزادی دلائی۔ آزادی حاصل کرنا اتنا مشکل نہیں ہے جتنا کہ اسے برقرار رکھنا۔

مولانا نے کہا کہ آج ہماری حکومت تعمیری کام کرنے کی کوشش کر رہی ہے تاکہ ملک ترقی حاصل کرے اور غربت دور ہو۔ پانچ سالہ منصوبہ بڑی تیزی کے ساتھ ترقی کر رہا ہے۔ قدوائی صاحب نے ڈھائی سال میں غذائی مسئلہ حل کر کے رکھ دیا اور آج ان کے مرنے کے بعد بھی لوگ انھیں یاد کرتے ہیں۔ ہمارے ملک میں اجتماعی منصوبوں کو بھی بڑی اہمیت دی جا رہی ہے۔ روس اور امریکا سے انجینئر آ رہے ہیں اور وہ ہمارے ملک کی موجودہ ترقی کو دیکھ کر حیرت کرتے ہیں۔

فرقہ پرستی کی مذمت:

مولانا نے فرقہ پرستی کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ جو اپنے آپ کو انسان کہتا اور سمجھتا ہے وہ ایک منٹ کے لیے بھی فرقہ پرستی برداشت نہیں کر سکتا۔ ہمیں میل جول کے ساتھ زندگی بسر کرنی چاہیے۔ جو لوگ بغض و عناد سے کام لیتے ہیں وہ انسان نہیں کہے جا سکتے۔ فرقہ وارانہ فسادات کو خون خواری اور درندگی کا کوئی بھی نام لیجیے، لیکن دل چاہتا ہے کہ ڈکشنری میں کوئی ایسا لفظ ہوتا جو اس سے بھی زیادہ بھیانک معلوم ہوتا۔

معلوم نہیں آپ کا دل اسے محسوس کرتا ہے یا نہیں، جو چیز ۱۹۴۷ء میں ہوئی تھی وہ

۱۹۵۴ء میں نہیں رہی۔ اس فرقہ پرستی کو ہم زندہ رکھنا نہیں چاہتے اور ہم اسے ہرگز برداشت نہیں کر سکتے۔ ملک کے لیے فرقہ پرستی ایک کوڑھ اور لعنت ہے۔ اگر ایک مسلمان بھی باقی نہ رہے تو پھر بھی اس ملک میں بٹوارہ اور تقسیم ہو سکتی ہے۔ نہرو جی پر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے بے جا طرف داری کرتے ہیں۔ نہرو جی فرقہ پرستی کے نتیجے سے بہ خوبی واقف ہیں۔ اگر ہندو بھائی ہی یہاں رہے تو ان میں ذات پات کے لحاظ سے فرقہ پرستی کی لعنت برقرار رہے گی۔ ہم میں اتنی بلندی پیدا ہو کہ ہم فرقہ پرستی کو پیروں تلے کچل دیں۔ یہ بات اس وقت ہی پیدا ہو سکتی ہے جب ایک دوسرے میں مذہب اور دھرم کے راستے سے پریم اور محبت ہو کوئی آدمی یہ محسوس کرے کہ وہ کسی کو دکھ دے کر خوش ہو سکتا ہے تو یہ سخت بے وقوفی کی بات ہے۔ تمام چیزوں میں یک سانیت اور ایکتا پیدا کریں۔

مولانا نے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مسلمان محسوس کریں کہ یہ ہمارا ملک ہے، اس ملک کا فایدہ ہمارا فایدہ ہے، اس کا نقصان ہمارا نقصان ہے، اس ملک کی زندگی ہماری زندگی ہے۔ اس موقع پر ہم خود کو غلام محسوس نہ کریں۔ ہم ہی اس دیش کے راجہ ہیں اور ہم ہی پرجا۔ یہاں کی حکومت ہماری ہی رائے سے بنتی ہے۔ اقلیت بھی ایک توازن ہے، اگر انسان غلام ہو جائے تو اس کی روح فنا ہو جاتی ہے۔ ہم میں خوف یا احساس کم تری پیدا نہ ہونا چاہیے۔

مولانا نے یہ بھی کہا کہ اردو زبان ہندو، مسلم، سکھ سب ہی کی زبان ہے۔

شری مہنت جی ایم ایل اے صدر ضلع کانگریس نے مولانا کی آمد کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انھیں اور حاجی عبدالغنی کو ضلع کانگریس رائے پور کی جانب سے ہار پہنایا۔

(مدینہ۔ بجنور: ۲۵ر نومبر ۱۹۵۴ء)

۱۹۵۵ء

کل ہند دینی تعلیمی کنونشن:

۸؍جنوری ۱۹۵۵ء: بمبئی میں کل ہند دینی تعلیمی کنونشن کا آج دوسرا اجلاس زیرِ صدارت ڈاکٹر میر ولی الدین منعقد ہوا۔ مولانا یوسف نجم الدین صدرِ استقبالیہ تھے۔ شرکا میں مولانا حسین احمد مدنی، قاری محمد طیب، مولانا حفظ الرحمٰن، ڈاکٹر محمد مجیب، مولانا شاہد فاخری، مولانا ابوالوفا اور مولانا محمد قاسم شاہ جہان پوری کے علاوہ اور بہت سے اکابر و مشاہیرِ وقت موجود تھے۔ (مولانا آزاد— ایک سیاسی ڈائری: ص ۵۱۶)

مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک تاریخی تقریر:

۱۹؍جنوری ۱۹۵۵ء: کانگریس کے سالانہ اجلاس مدراس (۱۹۵۵ء) میں قرار داد نمبر (۱) پر مولانا کی تعارفی تقریر۔ یہ قرار داد بھی مولانا ہی نے پیش کی تھی۔ (ا س ش)

"جہاں تک سوسایٹی اور اسٹیٹ کے سسٹم کا تعلق ہے دنیا اس وقت کیپٹل ازم اور سوشل ازم میں بٹی ہوئی ہے اور دونوں نے ایک ریجڈ عقیدہ کا نیچر پیدا کرلیا ہے۔ کیپٹل ازم کے حامی اب کے لیے تیار نہیں کہ پرائیویٹ انٹر پرایز کے سسٹم سے رائی برابر ادھر اُدھر ہوں۔ اسی طرح سوشل ازم کے حامی اس کے لیے تیار نہیں کہ کسی حال میں بھی پرائیویٹ انٹر پرایز کو ٹالیریٹ کریں۔ گویا یہ دونوں سسٹم ایک طرح کے مذہبی ڈاگما ہیں۔ جنھیں ایک فیتھ فل کو بلا چون و چرا مان لینا چاہیے اور ذرا بھی ان سے اِدھر اُدھر نہیں ہونا چاہیے۔

انڈی پنڈنس کے بعد ہمارے سامنے یہ سوال آیا کہ ہمیں کون سی راہ اختیار کرنی چاہیے؟ ہم نے اس سے انکار کیا کہ سوسایٹی اور اسٹیٹ کے لیے یہ ضروری ہے کہ کسی ایک ریجڈ سسٹم پر مذہبی عقیدے کی طرح ایمان لائیں۔ ہم نے محسوس کیا کہ اکنامک صورتِ حال کے لحاظ سے ہمارا ملک اس وقت ایک خاص طرح کے اسٹیج سے گزر رہا ہے۔ ہمیں اپنے ملک کی حالت دیکھنی چاہیے اور اس حالت کا جو تقاضہ ہو اس کے مطابق آگے بڑھنے کا

نقشہ بنانا چاہیے۔ جس فیلڈ میں ہمیں پرائیویٹ انٹر پرایز کی ضرورت ہے، وہاں پرائیویٹ انٹر پرایز کو انکریج کرنا چاہیے۔ جس فیلڈ میں اسٹیٹ انٹر پرایز کی ضرورت ہے وہاں اسٹیٹ انٹر پرایز کو نیشنلایزیشن کے اصول پر قایم کرنا چاہیے۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ ملک کی انڈسٹری کو دو قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک سیکٹر پرانی انڈسٹری کا ہے، دوسرا نئی انڈسٹری کا۔ پرانی انڈسٹری میں ہمیں دیکھنا چاہیے کہ موجودہ حالت میں اسٹیٹ کن کن چیزوں میں ہاتھ ڈال سکتا ہے اور کہاں تک نیشنلایزیشن پریکٹیکل ہے، خاص کر کے انڈسٹری میں۔

یہی وجہ ہے کہ میں کیپٹل ازم اور سوشل ازم کے الفاظ کہنا پسند نہیں کرتا۔ کنزرویٹوازم اور پروگریسوازم کے ٹرمز کو ترجیح دیتا ہوں۔ اکنامک فیلڈ میں کنزرویٹوازم یہ ہے کہ ہم حالات کے بدلنے کے ساتھ سسٹم کی تبدیلی سے انکار کردیں اور جو پرانا ڈھانچا چلا آرہا ہے اسی کو لیے بیٹھے رہیں۔ پروگریسوازم یہ ہے کہ حالات کی تبدیلی کے ساتھ سسٹم بھی بدلے جائیں اور دولت کی تقسیم کا دایرہ روز بہ روز وسیع کیا جائے۔ ہمیں اس بارے میں کنزرویٹو نہیں ہونا چاہیے، پوری طرح پروگریسو ہونا چاہیے۔

ہم نے پانچ برس کی پلاننگ میں بھی اسی اصول کو پیش نظر رکھا ہے۔ جن انڈسٹریوں کا نیشنلایزیشن ضروری ہے ان میں ٹرانسپورٹ، کمیونی کیشن، اور بینکنگ کا ہر میدان سب سے پہلے نمودار ہوتا ہے۔ ہم کئی سال سے اس پر غور کررہے تھے کہ ائیرسروس کا نیشنلایزڈ ہونا ضروری ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ بالآخر وہ وقت آگیا کہ ہم اس اہم پروگریس کا اعلان کریں۔ یہ دراصل ہماری نیشنل انڈسٹری کی تاریخ میں ایک نئے چیپٹر کا آغاز ہے۔

میں شری جگ جیون رام اور ان کی منسٹری کے کارکنوں کو اس موقعے پر مبارک باد دیتا ہوں کہ ان کے ہاتھوں یہ کام انجام پایا۔

مولانا آزاد نے اجلاس میں ریزولیوشن نمبر (۱) پیش کرتے ہوئے فرمایا:

"پہلے میں اس کی وضاحت کردینا چاہتا ہوں کہ ہندوستان میں سوشلسٹ سماج کا مطالبہ کرکے کانگریس کوئی نیا نعرہ یا نئی آواز بلند نہیں کررہی ہے، بلکہ اپنے پرانے راستے ہی پر چل رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے سوشل ازم کے بجاے سوشلسٹ سماج کی اصطلاح اپنا لی ہے۔ اگر کسی ممبر کے ذہن میں اس کے نئے نعرہ ہونے کا خیال آیا ہو تو اسے فوراً نکال دینا چاہیے۔ یہ کوئی نہ سمجھے کہ کانگریس کے دستور میں کوئی نئی تبدیلی کی جارہی ہے۔ کانگریس

کا راستہ وہی ہے اور وہی رہے گا، جس پر سب کو چلنا ہے۔''

اس موقع پر ریزولیوشن کی وضاحت و تائید میں مولانا نے جو تقریر فرمائی تھی ''ٹائمز آف انڈیا'' نے اسے پیغمبرانہ اسلوب کی حامل سحر اثر تقریر قرار دیا تھا۔ مولانا نے اس تقریر میں وہ اصول دیا جس پر ہندوستان کے معاشی اقتصادی نظام کی بنیاد قایم ہوئی۔ مولانا کی یہ تاریخی اور فکر انگیز تقریر یہاں نقل کی جاتی ہے۔ اس سے قارئین کرام، عالم دین، مفسر، ادیب، مدبر مولانا آزاد کے مطالعے کی جامعیت اور فکر کی بلندی کا اندازہ کر سکیں گے۔

نوٹ: مولانا آزاد نے اس تحریر میں ہندوستان کے لیے جس قسم کے معاشی اقتصادی نظام کی طرف اشارہ کیا ہے اس کے بارے میں ان کے خیالات نہایت منظم اور مرتب تھے۔ مولانا نے اس مضمون کا کانگریس کے ساٹھویں اجلاس منعقدہ مدراس (جنوری ۱۹۵۵ء) میں ریزولیوشن بھی پیش کیا تھا اور تقریر بھی فرمائی تھی۔ اثر ابن یحییٰ انصاری نے ''مولانا آزاد- ایک سیاسی ڈایری'' میں اس اجلاس کی روداد کے سلسلے میں لکھا ہے:

''۱۹؍جنوری ۱۹۵۵ء سے ستیہ مورتی نگر مدراس میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ساٹھواں اجلاس کانگریس کے صدر یو این ڈھیبر کے زیر صدارت شروع ہوا۔ اسٹیج پر صدر اجلاس اور پنڈت نہرو، مولانا آزاد، راج گوپال اچاریہ، سی ڈی دیش مکھ، ٹی ٹی کرشنم اچاری، وی کے کرشنا مینن وغیرہم بہت سے لیڈران موجود تھے۔ صدر نے اپنی تقریر میں کہا کہ کانگریس کا ساٹھواں اجلاس اس لحاظ سے تاریخی حیثیت رکھتا ہے کہ ملک میں ایک نئے معاشی اور اقتصادی سماج کی تعمیر کا کام ہاتھ میں لینا ہے۔''

ریزولیوشن کی وضاحت میں مولانا کی مکمل تقریر نقل کرتے ہیں لیکن پہلے وہ نوٹ ملاحظہ فرمایئے جو ہفت روزہ ''چٹان'' لاہور نے اس تقریر کے بارے میں لکھا تھا:

> ''مولانا ابوالکلام آزاد نے پچھلے دنوں مدراس اور میسور میں دو اہم تقریریں کیں۔ اوّل الذکر تقریر میں جو آپ نے کانگریس کے ساٹھویں اجلاس میں فرمائی ''ہندوستان کی جدید منزل مقصود'' یعنی ''سوشلسٹ طرز کے سماج'' سے متعلق قرارداد پیش کی۔ ''ٹائمز آف انڈیا'' نے، جس کا دامن نگارش مولانا کے سلسلے میں ہمیشہ بخل کے دھبوں سے داغ دار رہا ہے، اپنے شخصیات

کے کالم میں مولانا کے اس طرزِ بیان کو پیغمبرانہ انداز سے تعبیر کیا اور لکھا کہ وہ بول نہیں رہے تھے بلکہ سامعین پر جادو کر رہے تھے۔

معاصر عزیز مدینہ کے صفحات سے ہم اس تقریر کے علمی اجزا کو قارئین کے استفادے کے لیے نقل کرتے ہیں۔"

مولانا نے فرمایا:

"آپ سب جانتے ہیں کہ دنیا اس وقت دو ازموں -- کیپٹل ازم (سرمایہ داری) اور سوشل ازم (اشتراکیت) میں بٹی ہوئی ہے اور دو بلاک ان "ازموں" کی قیادت کر رہے ہیں۔ دونوں کا متفقہ مقصد یہ ہے کہ سوسائٹی کی تشکیل ایسے خطوط پر کی جائے جو عوام کے لیے سودمند ہو۔ لیکن یہاں پھر اس غلطی کو دہرایا گیا ہے جو انسان نے اکثر مقاصد اور ذرائع میں تمیز نہ کر کے کی ہے۔ اس کی کلاسیکی مثال اس پروفیسر کی ان کوششوں میں ملتی ہے جو ستاروں کے مطالعے کے لیے ایک بہت بڑی دوربین بنانا چاہتا تھا۔ لیکن دوران تکمیل ہی میں ایک ستارے کا بھی مطالعہ کیے بغیر وہ اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

اس قسم کی غلطی سوشل ازم کے داعی کر رہے ہیں۔ انھوں نے ایک سوشلسٹ اصول مرتب کر لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر سوشل ازم پر مؤثر طور پر عمل پیرا ہونا ہے تو پھر اس پر آنکھ بند کر کے "الف" سے "ے" تک عمل پیرا ہونے کی ضرورت ہے۔ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو پھر یہ "سوشل ازم" سوشل ازم نہیں رہے گا۔ ایسے ہی سرمایہ داری کے داعی اپنے اپنے اصول سے بری طرح چمٹے ہوئے ہیں۔

کارل مارکس کا حوالہ دیتے ہوئے مولانا آزاد نے کہا:

"مارکس عظیم ترین مفکر تھا، جس نے صنعتی انقلاب کے بعد امیروں اور غریبوں میں پیدا ہونے والی خلیج کو پاٹنے پر زور دیا۔ مارکس نے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ایک نظریہ پیش کیا، لیکن بعد میں یہ "ذریعہ" بہ ذاتِ خود "مقصد" کی شکل اختیار کر گیا۔ اس سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ کس طرح سرمایہ داری اور سوشل ازم کے مبلغوں نے ذرائع کی پوجا شروع کر دی اور مقاصد کو نظر انداز کر دیا۔"

مولانا آزاد نے کہا:

"حقیقی چیز یہ ہے کہ دولت کی تقسیم منصفانہ طور پر ہو۔ یہ مقصد خواہ "قومیانے" سے

حاصل ہوتا ہے یا کسی اور ذریعے سے، ایک بالکل مختلف چیز ہے۔

ہماری رائے میں یہ بالکل غلط ہے کہ سوشل ازم موثر اسی وقت ہوسکتا ہے جب اس پر ''الف'' سے ''ے'' تک عمل کیا جائے۔ مختلف ممالک میں مختلف مسائل ہوتے ہیں اور ایک ہی اصول سب پر نافذ نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے ہم نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ ہم کسی ''ازم'' سے بھی خود کو منسلک نہیں کریں گے۔ ہم کسی ایسی چیز کو قبول نہیں کریں گے جو ہمیں صرف اذعانی اصولوں پر چلنے کے لیے مجبور کرے۔ ہم اس پر بھی یقین نہیں رکھتے کہ دنیا میں صرف دو ''ازم'' کیپٹل ازم اور سوشل ازم ہی ہیں۔ ہم تو یہاں تک بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان دو ازموں کے علاوہ دنیا میں کوئی تیسرا اور چوتھا ''ازم'' بھی ہوسکتا ہے۔ اسی لیے ہم نے ''سوشل ازم'' کے بجائے دانستہ ''سوشلسٹ طرز کے سماج'' کی اصطلاح رکھی ہے۔

ہماری قرارداد سوشل ازم کے بنیادی اصولوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ اصول سودمند ہیں اور سوشلسٹ طرز کے سماج کی تشکیل میں بہت مدد دے سکتے ہیں۔ اس قرارداد میں کہا گیا ہے کہ پیداوار کے بڑے بڑے ذرائع سماجی ملکیت یا کنٹرول میں ہونے چاہییں۔ نیز یہ کہ تدریجی طور سے پیداوار میں اضافہ کیا جانا چاہیے تاکہ قومی دولت کی منصفانہ تقسیم کا مقصد حاصل ہوسکے۔ آج سب سے بڑا امتحان یہ ہے کہ پیداوار کو کس طرح بڑھایا جائے اور جب تک دولت میں اضافہ نہیں ہوتا اس وقت تک یہ لوگوں میں تقسیم نہیں ہوسکتی۔''

مولانا نے نجی سرمایہ لگانے والوں کو یقین دلاتے ہوئے کہا:

''سوشلسٹ طرز کے سماج'' میں نجی سرمایہ کاروں کے لیے پوری جگہ موجود ہے۔ کانگریس نے ۱۹۴۸ء میں حکومت کی معاشی پالیسی سے متعلق بیان کی پوری تائید کی ہے۔ حکومت کی اس پالیسی میں نجی سرمایہ کارون کے لیے ایک واضح مقام موجود ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ کانگریس نے اس نظریے کی پوری حمایت کی ہے کہ افزایش پیداوار کے لیے نجی سرمایہ کاروں کو حکومت کا پورا تعاون و امداد ملنی چاہیے۔ جمشید پور فولادسازی کے کارخانے کی توسیع کے لیے حکومت نے ٹاٹا والوں کو قابل ذکر اقتصادی امداد دی ہے۔ ہمارے سامنے اصل منزل مقصود پر پہنچنا ہے اور وہ ہے پیداوار میں اضافہ کرنا اور اگر یہ مقصد یعنی پیداوار میں اضافہ ہمیں نجی سرمایہ کاروں کو مدد دینے سے حاصل ہوسکتا ہے تو ہم اس میں کبھی دریغ

نہیں کریں گے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی حکومت نجی سرمایہ کاروں کو کھلی چھٹی بھی نہیں دے سکتی۔ قیمتوں اور منافع پر کچھ نہ کچھ کنٹرول ضرور ہونا چاہیے۔

اکثر یہ آواز اٹھائی جاتی ہے کہ نجی سرمایہ کاروں کے ہاتھوں میں جو صنعتیں ہیں ان کو ''قومیا'' دیا جائے، لیکن اصل سوال یہ ہے کہ یہ اقدام ہماری معاشیات کے لیے طاقت کا سبب بنے گا یا کم زوری کا؟ ہمارا نصب العین یہ ہے کہ پیداوار میں اضافہ ہو۔ پس اگر ہم نجی صنعتوں کو ''قومیانے'' کا قدم اٹھاتے ہیں تو یقیناً یہ قدم صنعتی ترقی کی راہ میں حائل ہوجائے گا۔ چوں کہ سرکاری عملہ جو ان نجی صنعتوں کو اپنے انتظام میں لے گا، ہوسکتا ہے اس میں وہ صلاحیت، تجربہ اور قابلیت نہ ہو جو ان لوگوں میں ہے جو ان صنعتوں کو برسوں سے چلا رہے ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ بہتر یہ ہے کہ وہ رُپیہ جو ان نجی صنعتوں کو قومیائے جانے پر ان کے مالکوں کو بہ طور ہرجانہ دیا جائے، اسے نئی قومی صنعتیں قایم کرنے کے لیے استعمال کیا جائے۔ (آثار ونقوش: مرتبہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری: ص ۹-۱۸۷ و ۵-۲۱۳)

شیخ الاسلام کا سفر پونا اور جلسے میں شرکت:

۲۵ر جنوری ۱۹۵۵ء: پونہ (ڈاک سے) مسلمانانِ پونا کی خوش قسمتی سے حضرت شیخ الاسلام ۱۵ر جنوری کو پونا اسٹیشن دکن کوئن سے آٹھ بجے تشریف لائے۔ اسٹیشن پر پہلے ہی سے جمعیت کے ممبروں، رضا کاروں و معززین شہر جمعیت کے جھنڈے لیے ہوئے موجود تھے۔ جوں ہی گاڑی پلیٹ فارم پر آکر رکی پونا اسٹیشن نعرہ ہائے تکبیر و شیخ الاسلام زندہ باد کی صداؤں سے گونج اٹھا۔ حضرت شیخ کو ایک کرسی پر بٹھا کر مختلف جماعتوں و جمعیت پونا کی جانب سے پھولوں کے ہار پیش کیے گئے۔ ہجوم زیادہ ہونے کی وجہ سے مولانا مقصود صاحب ترکی نے اعلان فرمایا کہ یہاں مصافحہ نہ کیا جائے۔ جلسہ گاہ میں اسٹیج پر مصافحہ کرایا جائے گا۔ کھڑکی چھاؤنی اسٹیشن پر بھی فدایانِ شیخ نے شایانِ شان استقبال کیا اور جھنڈے لیے ہوئے شیخ کے ساتھ پونا تک آئے۔

حضرت شیخ اور مولانا محمد قاسم اور مولانا اسعد میاں کار کے ذریعے اپنی جائے قیام شطرنجی والا چوکی ۹ بجے پہنچے۔ عشا کی نماز کے بعد کھانا تناول فرمایا۔ جلسے کی کارروائی ۱۰ بجے شب شروع ہوئی۔ مولانا مقصود صاحب ترکی نے شیخ کی صدارت کا اعلان کیا۔ مولانا قاری

وصی الدین صاحب نے قرآن شریف کی تلاوت کی۔ ان کے بعد حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے سیرت پر تقریر فرماتے ہوئے جمعیت کے مقاصد و خدمات پر نہایت وضاحت کے ساتھ تقریباً دو گھنٹے تک ولولہ انگیز انداز میں روشنی ڈالی، جس کا سامعین پر اچھا اثر ہوا۔ بعد میں حضرت شیخ کو قیام گاہ سے بلایا گیا تا کہ دعا فرمائیں۔ مگر خدا کے فضل و کرم سے حضرت شیخ نے انسانی خلافت پر قرآن و حدیث کی روشنی میں جامع تقریر فرمائی، سامعین نہایت ذوق و شوق کے ساتھ حضرت کے ارشادات گرامی بہ غور سنتے رہے۔ بامبالغہ حاضرین کی تعداد کسی حال میں بھی بیس ہزار سے کم نہ تھی۔ آخر میں حضرت شیخ نے نہایت رقت آمیز الفاظ میں دعا فرمائی۔

جلسے میں احمد نگر، ستارہ، شولا پور، بیجا پور کے حضرات بھی موجود تھے۔ گویا کہ شیخ کی زیارت کے شوق میں پورا مہاراشٹر امڈ آیا تھا۔

۱۶ر جنوری کو بعد نماز فجر حضرت شیخ نے مرد و عورت تقریباً ایک سو افراد کو بیعت مبارک سے فیض یاب فرمایا۔ (الجمعیۃ - دہلی: ۲۵ر جنوری ۱۹۵۵ء، ص ۴)

جمعیت علماے ہند کا اجلاس کلکتہ اور اس کی تجاویز:

۱۱ر فروری ۱۹۵۵ء: کو کلکتہ میں جمعیت علماے ہند کا اٹھارواں سالانہ اجلاس عام شروع ہوا، حضرت شیخ الاسلام نے ایک مفصل، معلومات افزا، فکر انگیز اور ایمان افروز خطبہ صدارت ارشاد فرمایا۔ اجلاس ۱۳ر فروری تک جاری رہا۔ (مدینہ - بجنور: ۲۱ر فروری ۱۹۵۵ء)

کلکتہ جمعیت علماے ہند کی مجلس مضامین نے جمعیت کے سالانہ اجلاس کے لیے اپنے ۱۲ر فروری کے اجلاس میں حسب ذیل قراردادیں منظور کیں۔

تعزیتی قرارداد:

اس قرار داد میں علامہ سید سلیمان ندوی، مسٹر رفیع احمد قدوائی، مفتی اعظم اور دوسرے مشاہیر و علماے کرام کی وفات حسرت آیات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا اور متوفیوں کے لواحقین سے اظہار ہم دردی کے بعد ان کے لیے دعاے مغفرت کی گئی۔

دینی تعلیم:

جمعیت علماے ہند کا یہ اجلاس اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے کہ قومی حکومت کا یہ اولین فرض ہے کہ وہ جلد سے جلد وطن عزیز سے جہالت کی تاریکی کو دور کرنے کی مہم جاری کرے تاکہ دستور کی طے شدہ پالیسی کے مطابق قومی ترقی کے لیے ملک کا کوئی باشندہ نوشت وخواند سے محروم نہ رہے اور ہر ایک بچے و بچی کے لیے بنیادی (پرایمری) تعلیم مادری زبان میں مفت ولازمی قرار دی جائے۔ یہ اجلاس ساتھ ہی اس حقیقت کا اظہار بھی ناگزیر سمجھتا ہے کہ اگر انسان کا صحیح رابطہ اور حقیقی تعلق اپنے خدا کے ساتھ نہ ہو اور وہ اپنی دینی واخلاقی تعلیم سے بے بہرہ رہے تو وہ صحیح معنی میں نہ اپنے خالقِ حقیقی کی معرفت حاصل کر سکتا ہے اور نہ مخلوق خدا کے ساتھ سچی اخوت ومحبت کا رشتہ قایم کر سکتا ہے۔

اس اجلاس کے نزدیک بچوں کو بنیادی مذہبی تعلیم اسی عمر میں دی جانی ضروری ہے جو قومی حکومت کی جانب سے پرایمری تعلیم کے لیے تجویز کی گئی ہے (یعنی چھ سال سے گیارہ سال تک) اس لیے عمر کا یہی وہ حصہ ہے جس میں بچے کے دل ودماغ پر جو بھی نقش ثبت ہو جاتا ہے عموماً وہی آخر وقت تک قایم رہتا ہے۔

یہ اجلاس منظورہ بالا امور کے پیش نظر جمعیت علماے ہند کی دعوت پر آل انڈیا دینی تعلیمی کنونشن کے انعقاد، اس کی تجاویز اور اس کی جانب سے "مرکزی دینی تعلیمی بورڈ" کے قیام کو بہ نظرِ استحسان دیکھتا ہے اور ہندوستان کی تاریخ میں وحدت کلمہ کے پیش نظر یک جہتی کے اس کردار کو تاریخ کا ایک بے نظیر شاہ کار سمجھتا ہے اور امید رکھتا ہے کہ مستقبل قریب میں مسلمانوں کے مختلف مکاتب خیال کے بچوں کے لیے مرکزی بورڈ کی نگرانی میں اپنے اپنے مسلک کے مطابق جدا جدا بنیادی مذہبی تعلیم کے نصاب مرتب ہو کر دینی تعلیم کی عام ترویج کے لیے وسیع ومؤثر اقدامات کیے جا سکیں گے۔

جمعیت علماے ہند کا یہ اجلاس مرکزی بورڈ کو اس مبارک جدوجہد میں اپنا ہر قسم کا تعاون اور اشتراک پیش کرتے ہوئے ہندیونین میں قایم جمعیت کی تمام شاخوں کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ مرکزی بورڈ کے نیک مقاصد کی عملی تشکیل میں ہاتھ بٹائیں اور پوری تن دہی سے اس دینی خدمت کو انجام دیں۔

محرک: مولانا حفظ الرحمٰن، مؤید: مولانا شاہد فاخری، بالاتفاق منظور۔

مذہبی تعلیم کی ٹریننگ:

تجویز: جمعیت علمائے ہند کا یہ اجلاس اسامی بنیادی تعلیم کو وسیع تر بنانے اور آل انڈیا دینی تعلیمی کنونشن کی تجویز متعلقہ تربیتی سینٹر کو مد: پہنچانے کے لیے طے کرتا ہے کہ جمعیت علمائے ہند کی جانب سے ایک ایسا ٹریننگ سینٹر قایم کیا جائے جس میں مذہبی تعلیم سے واقف معلمین کو اس طرح تربیت دی جانے کہ وہ بنیادی مذہبی تعلیم کے نصاب کو چھوٹے بچے اور بچیوں اور بے پڑھے لکھے بالغوں میں ایک خاص مدت کے اندر تعلیم دے سکیں اور نصاب کی تعلیم کے علاوہ بچوں اور ان کے والدین میں دینی ماحول پیدا کر سکیں۔

محرک: مولانا حفظ الرحمٰن، مؤید: مولانا نوراللہ صدر جمعیت علما صوبہ بہار

درسی کتابیں:

تجویز: آزاد ہندوستان کا دستور "سیکولر دستور" ہے، جس میں یہ صراحت کی گئی ہے کہ ملک و وطن میں تعلیمی نظام سیکولر اصول پر ہوگا۔

جمعیت علمائے ہند کا یہ اجلاس دستور کے اس فیصلے کو وطن میں بسنے والے تمام شہریوں کے لیے صحیح اور درست سمجھتا ہے۔ لیکن انتہائی افسوس کے ساتھ اس حقیقت کو ظاہر کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہے کہ ہند یونین کی اکثر ریاستوں میں حکومت کی جانب سے قایم شدہ اسکولوں میں ان کتابوں کو درس میں شامل کیا جا رہا ہے جن میں عام طور پر ایک ہی فرقے کے ان عقاید و روایات کو نمایاں کیا گیا ہے جو ہند یونین میں موجود دوسرے مذاہب کی تعلیم خصوصاً اسلامی عقاید اور اسلامی دینی رجحانات سے صراحتاً متصادم ہیں اور کتابوں میں دوسرے فرقوں کے عقاید و روایات کو غلط طور پر پیش کیا گیا ہے۔

یہ اجلاس دستور ہند کے فیصلے اور ریاستوں کے طرز عمل کے درمیان اس تضاد کو انتہائی تشویش کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور حکومت ہند اور ریاستی حکومتوں سے پر زور مطالبہ کرتا ہے کہ سیکولر دستور اور سیکولر تعلیمی ماحول کے پیش نظر تمام کتابوں کو درس سے خارج کر دیا جائے اور صرف ان ہی کتابوں کو کورس میں شامل رکھا جائے جو صحیح معنی میں سیکولر بنیاد پر مرتب کی گئی ہوں۔

یہ اجلاس اس سلسلے میں یہ بھی ضروری سمجھتا ہے کہ ٹیکسٹ بک کمیٹیوں میں ایسے ماہر

تعلیم افراد کا انتخاب کیا جایا کرے جو دیانت و انصاف کے ساتھ سیکولر اصول تعلیم کو پیش نظر رکھ کر اور یہ جائزہ لے کر ایسی کتابوں کو درس کے لیے منتخب کریں کہ جو صحیح معنی میں سیکولر اصول پر لکھی گئی ہوں اور کسی بھی مذہب کے خلاف کوئی بات اس میں موجود نہ ہو۔

یہ اجلاس حکومت ہند اور ریاستی حکومتوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ ٹیکسٹ بک کمیٹیوں میں مختلف فرقوں کے صاف دماغ ماہرین تعلیم کو بھی منتخب کیا جایا کرے تاکہ مذکورہ بالا مقصد کو مدد مل سکے۔ محرک: مولانا حفظ الرحمن۔ بہ اتفاق منظور

کسٹوڈین کے متعلق قرارداد:

تجویز: جمعیت علمائے ہند کا یہ اجلاس حکومت ہند کے اس فیصلے کو بہ نظر استحسان دیکھتا اور اس پر مبارک باد پیش کرتا ہے کہ اس نے نکاسی جائیداد کے قانون کو فسخ کر کے، ۷/مئی ۱۹۵۴ء کے بعد کسی بھی شخص کو نکاسی نہ قرار دیئے جانے کی پالیسی کا اعلان کر دیا ہے۔

اس کے ساتھ ہی یہ اجلاس حکومت ہند کو پُر زور توجہ دلاتا ہے کہ دفعہ ۱۶ کی درخواستوں کے فیصلے میں جو اصطلاحی پیچیدگیاں در پیش ہیں اور جن کی وجہ سے غیر نکاسی مسلمانوں بالخصوص غریب اور بے پڑھے لکھے چھوٹے طبقے کے لوگوں کو ہند یونین کا شہری ہوتے ہوئے بھی انتہائی مشکلات پیش آ رہی ہیں، مثلاً پرانے راشن کارڈوں کا مطالبہ یا ایک مرتبہ انکوائری مکمل ہو جانے کے بھی دوبارہ تحقیقات وغیرہ، ان سب پیچیدگیوں کو جلد از جلد دور کر کے صرف اس نکتے کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ کسی شخص کا مستقل طور پر ہندوستان میں مقیم ہونا اس کے غیر نکاسی ہونے کی دلیل ہے۔ دفعہ ۱۶ کی درخواستوں کے فیصلے جلد از جلد صادر کر دیے جائیں۔

اس سلسلے میں یہ بھی ضروری ہے کہ جن لوگوں نے دفعہ ۱۶ کی درخواستیں پیش کر دی ہیں ان کی جائیدادوں کو فیصلے سے قبل نیلام نہ کیا جائے تاکہ ایک شہری باشندے کا حق معرض خطر میں نہ پڑ سکے۔ یہ اجلاس یہ بھی مطالبہ کرتا ہے کہ کسٹوڈین کے فیصلوں کے بعد جو کیس منسٹری میں برسوں سے بغیر فیصلے کے رکے پڑے ہیں انھیں جلد از جلد دفعہ ۱۶ کا سرٹیفکیٹ مل جانا چاہیے۔

دوسری قراردادیں حسب ذیل ہیں:

اوقاف:

حکومت بمبئی نے "لینڈ ایکوزیشن ایکٹ ۱۸۹۴ء" میں ترمیم کا جو بل ایل اے ۱۴ ایل ۱۹۵۴ء پیش کیا ہے۔ وہ مذہبی مقامات، عبادت گاہوں، مقابر اور اوقاف کے تحفظ کے بنیادی دستوری حق سے بالکل متصادم اور سرا سر خلاف ہے۔

جمعیت علمائے ہند کا یہ اجلاس اس بل کی شدید مخالفت کرتے ہوئے حکومت بمبئی سے اپیل کرتا ہے کہ وہ اس مسودۂ قانون کو واپس لے لے۔

یہ اجلاس جمعیت علما بمبئی اسٹیٹ کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ تجویز ہذا کو اپنے مؤقر وفد کے ذریعے کابینہ حکومت بمبئی کے سامنے پیش کر کے اس بل کی واپسی کے لیے اصرار کرے اور اس کی مضرتوں کو کابینۂ مذکور پر واضح کرے۔

محرک: مولانا حفظ الرحمٰن، بالاتفاق منظور۔

علاقائی زبان بنانے کا مطالبہ:

جمعیت علمائے ہند کا یہ اجلاس اس حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے کہ اردو ہندو مسلمانوں کی یک جہتی باہمی یگانگت اور میل ملاپ کی ایک بہترین یادگار ہے اور کسی مخصوص فرقے کی زبان نہیں ہے۔ صدر جمہوریہ ہند کی توجہ مبذول کرانا ضروری سمجھتا ہے کہ وہ جلد از جلد انجمن ترقی اردو ہند کے اس مطالبے کی منظوری صادر فرمائیں کہ دستور ہند کی دفعہ ۲۳ کے مطابق اردو کو اتر پردیش میں "ریجنل لنگویج" (ثانوی سرکاری زبان کی حیثیت دی جائے)۔ محرک: مولانا حفظ الرحمٰن۔ بالاتفاق منظور۔

مساجد کا انخلا:

تجویز: جمعیت علمائے ہند کا یہ اجلاس مغربی بنگال کی حکومت سے پرزور مطالبہ کرتا ہے کہ تقسیم ہند کے خصوصاً ۱۹۵۰ء میں پیش آمدہ فرقہ وارانہ فساد کی وجہ سے مساجد مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گئی ہیں یا ان پر ریفیوجیز قابض ہیں، ان سب کا فوراً انخلا کرا کے ان تمام مساجد کو بنگال وقف کمیٹی یا متعلقہ متولیوں کے حوالے کر دے تا کہ اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق ان کو استعمال کیا جا سکے یا ان کی حفاظت کی جا سکے۔

محرک: مولانا حفظ الرحمٰن صاحب۔ بالاتفاق منظور

اسلامی تعطیلات:

تجویز: یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ بہت سے سرکاری دفاتر اور محکموں میں مسلم تہواروں کی تعطیلات کے بارے میں بڑی بے انصافی اور بے توجہی ہے ....
حوالے کا اس سے آگے کا تراشہ ضائع ہوگیا، لیکن تجویز کا مفہوم واضح ہے کہ گورنمنٹ کے تمام دفاتر میں بالالتزام اسلامی تہواروں کے موقع پر مسلمانوں کے لیے تعطیل لازمی ہونی چاہیے۔ (ابن ش)

جمعیت علماے ہند کا اجلاسِ کلکتہ کا اختتام:

کلکتہ، ۱۵ر فروری: کل گزشتہ شب ساڑھے بارہ بجے جمعیت علماے ہند کا اٹھارھواں سالانہ عام اجلاس نعرہ تکبیر اللہ اکبر اور شیخ الاسلام زندہ باد کے نعروں کی گونج میں ختم ہوگیا۔ انسانوں کا ایک سمندر تھا جو محمد علی پارک میں سمٹ آیا تھا۔ پارک کے باہر دور دور تک سڑک پر آدمی ہی آدمی نظر آرہے تھے۔

رات کے اجلاس کی سب سے اہم تجویز مغربی بنگال کے ان مسلمان آبادکاروں سے متعلق تھی جو تقسیم کے بعد عموماً اور ۱۹۵۰ء کے ہنگامے کے بعد خصوصاً بے گھر ہوکر اپنے ہی وطن میں بے وطن ہوکر رہ گئے تھے۔ اجلاس حضرت شیخ الاسلام کی دعا پر ختم ہوا۔

(الجمعیۃ - دہلی: ۱۸ر فروری ۱۹۵۵ء، ص ۲)

حضرت شیخ الاسلام کا دورۂ الہ آباد:

۱۵ر فروری ۱۹۵۵ء: منگل کے روز (۸ر فروری کو) دہلی ایکسپریس سے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی الہ آباد تشریف لائے اسٹیشن پر شہر و پرگنہ چاپل کے عمائدین نے حضرت کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ شہر اور گرد و نواح سے بڑی تعداد میں عقیدت مند جمع ہوگئے۔ بدھ کی صبح کو مولانا محمد قاسم صاحب شاہ جہان پوری اور مولانا محمد اویس نگرامی کی تقاریر کے بعد حضرت شیخ نے اپنے ایمان افروز خیالات سے حاضرین کو مستفید فرمایا۔

(الجمعیۃ - دہلی: ۱۵ر فروری ۱۹۵۵ء، ص ۴)

حضرت شیخ الاسلام کا دورۂ بہار:

۲۰ر فروری ۱۹۵۵ء: مولانا منت اللہ رحمانی نے حضرت شیخ الاسلام کے بہار کے آٹھ اضلاع کے دس روزہ دورے کا پروگرام شائع کیا ہے۔ حضرت کا یہ دورہ تبلیغی اور

اصلاحی ہوگا۔ تفصیل یہ ہے:

۲۷ر فروری صبح کو براہ بھاگل پور روانگی برائے سنتھال پرگنہ
۲۸ر فروری صبح چلمل ضلع بھاگل پور
۲ر مارچ شام کو بھاگل پور سے روانگی
۳ر مارچ صبح مبارک پور ضلع مونگیر، شام بن منکی
۴ر مارچ شام بن منکی سے روانگی
۵ر مارچ صبح مونگیر
۶ر مارچ مونگیر سے گیا
۷ر مارچ صبح روانگی چندوا ضلع پلاموں
۸ر مارچ صبح روانگی گنج، ضلع آرہ، براہِ ڈائس گنج

(الجمعیۃ- دہلی: ۲۰ر فروری ۱۹۵۵ء، ص ۱)

معاہدہ بغداد:

فروری ۱۹۵۵ء: شرقِ اوسط کے دفاع کے لیے ایک فوجی معاہدہ جو مغربی طاقتوں کے ایما پر عراق اور ترکی کے درمیان فروری ۱۹۵۵ء میں ہوا۔ اس معاہدے میں یہ گنجایش رکھی گئی کہ عرب لیگ کے ارکان اور دوسرے ممالک جنھیں شرقِ اوسط کے امن وتحفظ سے دل چسپی ہے اس میں شریک ہو سکتے ہیں۔ بہ شرطے کہ دونوں فریق (عراق اور ترکی) انھیں تسلیم کرتے ہوں۔ اس شرط سے اسرائیل اس دایرہ سے خارج ہوگیا۔ اسی سال برطانیہ، ایران اور پاکستان اس معاہدے میں شریک ہوئے لیکن شرقِ عربی میں اس کی شدید مخالفت کی گئی اور کوئی بھی عرب ملک اس میں شامل نہیں ہوا۔ ولایات متحدہ نے باضابطہ رکنیت نہیں قبول کی، لیکن ۱۹۵۶ء کے بعد سے اس کے نمایندے اس کی فوجی اور اقتصادی کمیٹیوں میں شرکت کرتے رہے اور امریکا معاہدین کو فوجی ساز وسامان اور اسلحہ فراہم کرتا رہا۔ اس معاہدے کا علانیہ مقصد شرقِ اوسط کو روس کے امکانی حملے سے دفاع کے لیے منظم کرنا تھا۔ لیکن در پردہ یہ برطانیہ کی استعماری پالیسی کا ایک حربہ تھا، کیوں کہ اس کے ذریعے وہ شرقِ اوسط میں اپنے نفوذ کو برقرار رکھنا اور عرب قومیت کو دبانا چاہتا تھا۔

جولائی ۱۹۵۸ء میں عراق میں فوجی انقلاب آنے کے بعد عراق نے اس کی

کارروائیوں میں حصہ لینا چھوڑ دیا اور بالآخر مارچ ۱۹۵۹ء میں اس سے بالکل علاحدہ ہوگیا۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں معاہدے کے صدر مستقر کو بغداد سے انقرہ منتقل کردیا گیا اور اگست میں اس کا نام معاہدۂ بغداد کے بجائے ''تنظیم معاہدۂ وسطیٰ'' (سینٹو) کردیا گیا۔ یہ تنظیم ۱۹۷۹ء میں تحلیل کردی گئی۔ (فرہنگ سیاسیات: ص ۳۹۸)

لیگی حکومت سے نجات کا دن:

۱۵؍اپریل ۱۹۵۵ء: مشرقی پاکستان میں بنگلہ عوام نے پاکستان کی لیگی حکومت سے نجات کا دن منایا اور مولانا بھاشانی اور مشرقی پاکستان کے دیگر سیاسی قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ (مولانا آزاد-ایک سیاسی ڈایری)

حضرت شیخ الاسلام کی حج کے لیے روانگی:

۹؍جون ۱۹۵۵ء: آج مولانا سید حسین احمد مدنی بمبئی تشریف لائے۔ ۱۳؍جون کو بہ ذریعہ محمدی جہاز حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوں گے۔

(مولانا آزاد-ایک سیاسی ڈایری: ص ۵۲۶)

شیخ الاسلام پر مولانا لدھیانوی کا مضمون-سیرت مبارکہ کی ایک جھلک:

۱۷/۲۱؍جون ۱۹۵۵ء: مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی حضرت شیخ الاسلام کے خاص ارادت مندوں میں سے تھے۔ ان کا ایک مضمون حضرت کے دینی مقام اور سیاسی خدمات اور سیرت مبارکہ کا تعارف میں شایع ہوا ہے، چوں کہ یہ مضمون ایک خاص موقع پر شایع ہوا ہے، اس کا ایک خاص پس منظر ہے اور اس سے حضرت شیخ الاسلام کی سیرت کے ایک خاص پہلو پر روشنی پڑتی ہے، اس لیے کئی اعتبار سے اس کی اہمیت کے پیش نظر یہ مضمون سیاسی ڈایری میں شامل کیا جاتا ہے۔ مولانا لدھیانوی لکھتے ہیں:

''حضرت شیخ اندازاً ۱۷ برس کے بعد حج کو تشریف لے جارہے ہیں۔ جنگ کے زمانے میں ۱۹۳۹ء یا ۱۹۴۰ء میں حج کو تشریف لے گئے تھے تو میں نے لاہور کے اسٹیشن پر پوچھا کہ خطرے کے زمانے میں آپ حج کو تشریف لے جارہے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ

کے راستے میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔

آپ کی زندگی کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے اور بہت کچھ لکھا جائے گا، لیکن حضرت مولانا کی زندگی کے دو مقام ایسے ہیں جن کا جاننا ضروری ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کو مکہ معظمہ میں انگریزوں نے شریف حسین کے ذریعے گرفتار کیا اور آپ کے ساتھیوں کو بھی گرفتار کیا گیا، تو اس موقع پر حضرت مدنی مدظلہ پر کوئی مقدمہ نہیں تھا بلکہ شریف حسین کی گورنمنٹ نے کوشش کی کہ آپ مدینہ شریف واپس تشریف لے جائیں، لیکن حضرت مولانا نے اس موقع پر یہ کوشش فرمائی کہ مجھے گرفتار کرلیا جائے اور حضرت شیخ الہندؒ کے پاس جدہ پہنچا دیا جائے۔ چناں چہ آپ اپنی کوشش میں کامیاب ہوئے۔ اس کوشش کا نتیجہ کیا تھا؟ پھانسی کا تختہ اور یہ بات آپ کے علم میں تھی کہ حکومت برطانیہ اور حکومت ہند نے حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے رفقا یعنی مولانا عزیز گل صاحب، مولانا حکیم نصرت حسین صاحب اور مولانا عبدالوحید صاحب (جن کی عمر ان تمام حضرات سے کم تھی) پھانسی دینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ حضرت مدنی حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے رفقا کے ساتھ شریک ہوکر ہر قسم کی سزا برداشت کرنے کو تیار تھے۔ مگر آپ کا گرفتار ہونے سے مقصد یہ تھا کہ میں اپنے شیخ اور بوڑھے استاذ کی ان مصیبت کے زمانے میں کوئی خدمت کرسکوں۔ چناں چہ مصر میں یہ تمام قافلہ گرفتار ہوکر پہنچا اور ان سب حضرات کو مالٹا میں نظر بندی کر کے بھیج دیا گیا۔ مولانا چار سال سے زاید وہاں رہے۔ چھ ماہ میں قرآن شریف حفظ کرلیا تا کہ رمضان شریف میں اپنے استاد کو سنا سکیں۔

ساتھیوں کے لیے کھانا پکایا اور حضرت شیخ الہندؒ کی ہر وہ خدمت کی جو ایک شاگرد کو استاذ کی کرنی چاہیے۔ پیری مریدی اور استاذی شاگردی کا مقام سمجھنا ہو تو حضرت مدنی دامت برکاتہم کے اس عمل سے سمجھنا چاہیے کہ اپنے شیخ اور استاذ کے لیے آپ نے پھانسی کے تختے کو اپنی زندگی پر ترجیح دی۔ یہ تو اللہ کا فضل ہے یہ لوگ انگریزی گرفت سے بچ گئے۔ موت کے تختے کو خدمت کے لیے قبول کرلینا مولانا مدنی کا ہی مقام ہے۔

ہندوستان کی جنگِ آزادی میں جس طرح سچائی اور دیانت داری سے آپ نے کام کیا اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ ۱۹۴۶ء کے الیکشن میں مولانا آزاد نے گفتگو کے دوران میں فرمایا کہ مولانا حسین احمد مدنی کا دل جس طرح اللہ کے سامنے جھکا ہوا ہے اسی طرح ان

کا جسم بھی اللہ کے سامنے جھک گیا ہے۔ یہ ایک ایسی سچائی ہے جس سے زیادہ کوئی تعریف نہیں کی جا سکتی۔

حضرت مدنی حج کو بھی تشریف لے جا رہے ہیں اور ۱۷ سال کے بعد اپنے رشتے داروں اور عزیزوں سے بھی ملیں گے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد سفر حج کا ارادہ سات برس تک آپ نے نہیں فرمایا۔ کیوں؟ اس لیے کہ حضرت یقین رکھتے تھے کہ ہندوستان میں نئے مسایل جو پیدا ہو گئے ہیں ان کا مقابلہ کرنا ہے تاکہ آزادی قایم رہ سکے اور مسلمانوں کو یقین دلانا کہ وہ اطمینان سے بیٹھے رہیں، ان شاء اللہ حالات بہتر ہوں گے۔ اس کام کے لیے حضرت مولانا نے جو مسافت طے کی ہے وہ لاکھوں میل سے کم نہیں ہے۔ چوں کہ پروپیگنڈے کے عادی نہیں بلکہ اس کو غلط سمجھتے ہیں اس لیے دنیا نہیں جانتی کہ آپ نے اس زمانے میں ملک کی کیا خدمت کی۔

حضرت مدنی کسی ایک کے نہیں بلکہ سب کے ہیں:

بعض لوگوں نے یہ غلط فہمی پھیلا رکھی ہے کہ مولانا مدنی کسی خاص جماعت یا گروہ سے وابستہ ہیں۔ ایسا سمجھنا لوگوں کی غلطی ہے۔ حضرت مولانا کی پوری انسانیت سے محبت ہے اور اس کی خدمت کرنے کا جذبہ ہے۔ کوئی بھی آدمی آپ کے پاس جائے، وہ آپ کا کیسا ہی مخالف ہو، کسی جماعت سے تعلق رکھتا ہو اس کی تکلیف دور کرنے کے لیے آپ پوری کوشش فرماتے ہیں۔

میرا یقین ہے کہ مولانا کا یہ سفرِ حج ہندوستان کے لیے بہت برکتوں کا باعث ہوگا۔ ہم سب کو اللہ سے دعا کرنی چاہیے کہ حضرت خیریت سے تشریف لے جائیں اور اپنے نیک ارادوں میں کامیاب ہوں اور خیر و عافیت سے واپس تشریف لائیں تاکہ آپ کے روحانی اور علمی فیض سے ہندوستان کے لوگ نفع اٹھائیں۔"

حج کے لیے حضرت شیخ روانہ ہو گئے -- صاحب زادہ محترم کا خط:

۱۸ر جولائی ۱۹۵۵ء: حضرت شیخ الاسلام اپنے صاحب زادہ محترم اسعد میاں اور دیگر رفقا کے ساتھ حج بیت اللہ اور زیارت روضۂ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے لیے

تشریف لے گئے ہیں۔ صاحب زادۂ محترم ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"اس سال مدینہ طیبہ میں گرمی شدید ہے، لُو چل رہی ہے اور آدھی رات تک لُو چلتی رہتی ہے۔ مکۂ معظمہ کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ وہاں گرمی اس سے بھی زیادہ ہے۔ حضرت مدنی خدا کے فضل سے بہ خیریت ہیں۔ اپنے مشاغل میں شب و روز مصروف رہتے ہیں۔ دن کا اکثر حصہ حرم نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں مراقبہ، تلاوت کلام اللہ شریف اور ذکر میں گزرتا ہے۔" (الجمعیۃ - دہلی: ۱۸ر جولائی ۱۹۵۵ء، ص۱)

غلام محمد گورنر جنرل پاکستان کا انتقال:

۶ر اگست ۱۹۵۵ء: غلام محمد گورنر جنرل پاکستان کو بیماری کے بہانے اسکندر مرزا نے گورنر جنرل ہاؤس سے رخصت کر دیا۔

۲۹ر اگست ۱۹۵۶ء: سابق گورنر جنرل پاکستان ملک غلام محمد کا کراچی میں انتقال ہو گیا۔ ان کے جنازے میں چند لوگ شریک ہوئے۔ انھیں شارع فیصل پر عیسائیوں کے قبرستان میں امانتاً دفن کیا گیا تھا، لیکن یہی ان کا مستقل مدفن بن گیا۔ غلام محمد ۲۹ر اگست ۱۸۵۸ء کو لاہور کے محلّہ ککے زیاں میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۱ء پاکستان کے وزیر خزانہ رہے اور ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۵ء تک گورنر جنرل کے عہدے پر فائز رہے۔ پاکستان میں جمہوریت کے ساتھ انھوں نے جو کچھ کیا تھا اور عوام پر آمریت کے لیے جو دروازہ کھولا تھا اسی آمریت نے ان پر گورنر جنرل ہاؤس کا دروازہ بند کیا۔ ان کی موت پر نہ کسی آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا نہ کسی نے ان کے کسی عزیز سے تعزیت کی۔ افسوس کہ مسلمانوں کا قبرستان بھی ان کے نصیب میں نہ آیا۔

حضرت شیخ الاسلام کی حج سے واپسی:

۱۸ر اگست ۱۹۵۵ء: دیوبند، گزشتہ شب حضرت شیخ الاسلام اپنے رفقاے کرام کے ساتھ حج کے مبارک سفر سے تشریف لائے۔ حضرت ۲۷ر ذی الحجہ ۱۳۷۴ھ کو اسلامی جہاز سے بمبئی پہنچے تھے اور ۲۸ و ۲۹ر ذی الحجہ کی درمیانی شب میں دیوبند پہنچ گئے۔ آپ کے ساتھ صاحب زادۂ محترم مولانا محمد اسعد صاحب اور حضرت کے خادم خاص قاری اصغر علی مدرس دارالعلوم بھی تھے۔

بنگال کے قحط اور فسادات کے ذمے دار:

۱۴ر ستمبر ۱۹۵۵ء: مجلسِ دستور ساز میں آج دوسرے روز اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے مسٹر محمد ایوب کھوڑو نے مسٹر حسین شہید سہروردی پر الزام لگایا کہ وہ بنگال میں قحط اور فسادات کے ذمے دار ہیں، جب کہ وہ وزیرِ خوراک تھے۔ انھوں نے کہا کہ ۱۹۴۶ء میں جب کلکتہ میں ہزاروں لوگ قتل کیے جارہے تھے تو مسٹر سہروردی ایک کلب میں ڈانس کررہے تھے۔ مسٹر کھوڑو نے الزام لگایا کہ غنڈوں کو مسٹر سہروردی کی آرام گاہ میں پناہ ملتی تھی۔ مسٹر سہروردی نے الزامات کی صحت سے انکار کیا۔

(الجمعیۃ- دہلی: ۱۶ر ستمبر ۱۹۵۵ء، ص ۶)

اقبال سہیل کا انتقال ہوگیا:

۱۳ر نومبر ۱۹۵۵ء: اعظم گڑھ، ۹ر نومبر اردو کے مشہور شاعر اور اعظم گڑھ کے ممتاز وکیل اقبال سہیل کا ۷، ۸ر نومبر کی درمیانی شب کو انتقال ہوگیا۔ وہ ایک عرصے سے فالج میں مبتلا تھے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر تقریباً ۷۵ برس کی تھی۔ (مدینہ: ۱۳ر نومبر ۱۹۵۵ء، ص ۱)

اقبال سہیل مرحوم سیاسی لحاظ سے نیشنلسٹ خیال رکھتے تھے۔ جمعیت علمائے ہند کی خدمات کے معترف تھے اور حضرت شیخ الاسلام سے خاص نسبت ارادت رکھتے تھے۔ وہ اپنے وقت کے بہت بڑے شاعر تھے۔ بعض حضرات کا خیال تھا کہ وہ شاعرانہ کمال میں علامہ اقبال مرحوم سے کسی طرح کم نہ تھے۔ اگر انھیں مولوی عبد السلام ندوی جیسا کوئی مصنف اور نقاد مل جاتا تو ان کی شخصیت بہت بلند نظر آتی۔ ۱۹۳۸ء میں جب علامہ اقبال مرحوم نے حضرت شیخ الاسلام کے خلاف ایک قطعہ لکھا تھا تو اقبال سہیل مرحوم تڑپ اٹھے تھے اور اس کا جواب میں ایک شان دار فارسی نظم میں حضرت شیخ الاسلام کا دفاع کیا تھا۔

۱۹۵۶ء

پاکستان کے دستور کے خلاف مظاہرہ:

۱۰ر جنوری ۱۹۵۶ء: ڈھاکہ، کل یہاں پر ایوان اسمبلی کے سامنے ڈھاکہ کے طلبہ نے ایک مظاہرہ کیا۔ یہ مظاہرہ پاکستان کے دستور کے خلاف کیا گیا، جو کل ہی دستور ساز اسمبلی میں پیش کیا گیا ہے۔ (مدینہ۔ بجنور: ۱۷ر جنوری ۱۹۵۶ء)

مسلمانوں کے ارتداد کی تردید — مولانا محمد میاں کا بیان:

۱۵ر جنوری ۱۹۵۶ء: دہلی، ۱۲ر جنوری۔ حضرت مولانا سید محمد میاں ناظم جمعیت علمائے ہند نے نوائے وقت لاہور کے ایک شذرے کے جواب میں حسب ذیل بیان دیا ہے:

> ''نوائے وقت پاکستان کا ایک سنجیدہ پرچہ مانا جاتا ہے۔ مگر اس کی اشاعت مورخہ ۱۱ر جنوری ۱۹۵۶ء کے صفحہ تین پر ایک شذرہ پڑھ کر بہت حیرت ہوئی۔ شذرے میں کہا گیا ہے کہ ''جمعیت علمائے ہند کی صوبائی اور اضلاعی شاخوں نے جمعیت کے مرکز کو خبر بھیجی ہے کہ پیپسو یونین میں ۱۷ ہزار، ہماچل پردیش میں ۳۳ ہزار، بھرت پور میں ۷۰ ہزار، اجمیر مارواڑ میں ۴۷ ہزار اور مغربی یوپی کے اضلاع میں تقریباً ۲۰ ہزار مسلمانوں کو صرف گزشتہ تین سال کے عرصے میں مرتد بنالیا گیا ہے۔''

میں متحیر ہوں کہ اس غلط اور بے بنیاد خبر کو کس لفظ سے تعبیر کیا جائے! سفید جھوٹ کا لفظ بھی اس غلط خبر کی تردید کا حق پوری طرح ادا نہیں کرسکتا۔ نوائے وقت کو اگر اس کی کسی خود ساختہ ایجنسی نے جمعیت علما کے حوالے سے یہ خبر دی ہے تو اس کو بلا کسی شک وشبہ کے یقین رکھنا چاہیے کہ یہ خبر قطعاً غلط ہے۔ جمعیت علمائے ہند کی ہزاروں شاخوں میں سے کسی ایک شاخ نے بھی اس قسم کی کوئی اطلاع نہیں دی اور نہ اس قسم کی بے بنیاد رپورٹ جمعیت علما کی

کوئی شاخ دے سکتی ہے۔ البتہ جمعیت علماے ہند کی کارگذاریوں کی رپورٹوں میں نہایت فخر و مسرت کے ساتھ اظہار کیا جاتا ہے کہ ۱۹۴۷ء کے فساد زدہ علاقوں میں مسلمانوں کی دینی تعلیم کا انتظام جمعیت علماے ہند کی طرف سے کیا جارہا ہے اور بالخصوص مشرقی پنجاب، پیپسو، ہماچل پردیش اور بھرت پور الور میں جگہ جگہ تعلیمی مرکز قایم کر کے کوشش کی جارہی ہے کہ مسلمان مذہب سے واقف ہوں اور ان کی آیندہ نسلیں پہلے سے زیادہ صحیح العقیدہ اور پختہ مسلمان ہوں۔ (الجمعیۃ۔ دہلی: ۱۵رجنوری ۱۹۵۶ء، ص ۱)

قاضی عبدالغفار مرادآبادی کا انتقال:

۲۵رجنوری ۱۹۵۶ء: اردو کے مشہور صحافی، ادیب و انشا پرداز اور حیات اجمل، آثار ابوالکلام، لیلیٰ کے خطوط، مجنوں کی ڈایری وغیرہا کے مصنف قاضی عبدالغفار مرادآبادی کا ۱۷رجنوری ۱۹۵۶ء کو انتقال ہوگیا۔ (مدینہ: ۲۵رجنوری ۱۹۵۶ء، ص ۴)

پاکستان کے اسلامی جمہوریہ ہونے سے سہروردی صاحب کی ناراضگی:

۹رفروری ۱۹۵۶ء: مسٹر حسین شہید سہروردی نے کہا ہے کہ مشرقی پاکستان مشترکہ انتخاب کے بغیر پاکستان کے دونوں بازوؤں میں مساوات کے اصول کو تسلیم نہیں کرے گا۔ انھوں نے الزام لگایا کہ حکومت پاکستان کو اسلامی جمہوریہ قرار دے کر عوام کو فریب میں مبتلا کررہی ہے۔ (مدینہ۔ بجنور: ۹رفروری ۱۹۵۶ء)

جمعیت علما کی صوبائی سالانہ کانفرنس:

۲۱رفروری ۱۹۵۶ء: لکھنو، دفتر جمعیت علماے صوبہ اترپردیش میں متعدد اضلاع کی شاخوں سے صوبہ جمعیت علما کانفرنس کے لیے دعوتی خطوط موصول ہوئے، ان تمام خطوط پر غور کرنے کے بعد حضرت مولانا محمد قاسم صاحب ناظم اعلا جمعیت علما اُترپردیش نے اس سال جمعیت علماے صوبہ کانفرنس کے لیے خلیل آباد ضلع بستی کو منظوری دے دی اور مندرجہ ذیل تاریخوں کا تعین فرمادیا۔

۳۰ و ۳۱رمارچ اور یکم اپریل ۱۹۵۶ء مطابق ۱۶، ۱۷، ۱۸رشعبان ۱۳۷۵ھ جمعہ، سنیچر، اتوار۔ (مدینہ: ۲۱رفروری ۱۹۵۶ء)

مدرسۂ مسعودیہ نورالعلوم کے سالانہ جلسے میں حضرت شیخ کی شرکت:

۲۱رفروری ۱۹۵۶ء: انتہائی مسرت کے ساتھ اعلان کیا جاتا ہے کہ ہندوستان کی مشہور عربی درس گاہ مدرسۂ مسعودیہ نورالعلوم کا جلسۂ سالانہ بہ تواریخ ۲۱ر۲۲ر۲۳رفروری ۱۹۵۶ء احاطہ جامع مسجد بہرائچ میں نہایت شان وشوکت سے منعقد کیا جارہا ہے، جس میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی مدظلہٗ العالی، حضرت مولانا ابرارالحق صاحب خلیفہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الحدیث حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب ایم. ایل.اے.، حضرت مولانا محمد احمد صاحب پھول پوری فضل رحمانی، حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب فاروقی لکھنوی، مبلغ اسلام حضرت مولانا قاری وودالحی صاحب لکھنوی نے شرکت کا وعدہ فرمایا ہے۔ نیز حضرت مولانا ابوالوفا صاحب شاہ جہان پوری وحضرت مولانا محمد قاسم صاحب شاہ جہان پوری، ماہر تعلیم قرآن مولانا محمد یعقوب صاحب دہلوی، مولانا ظہیر احمد صاحب مفتاحی، زایر حرم حمید صدیقی صاحب وساجد صاحب لکھنوی کی شرکت کی بھی توقع کی جارہی ہے۔

اس عظیم الشان جلسے میں علمائے کرام کے مواعظ حسنہ اور مختلف تعلیمی مظاہروں کے علاوہ حضرت شیخ الاسلام مدظلہ، مدرسۃ المعلمین کا افتتاح فرمائیں گے جو معلمین قرآن و مدرسین عربی کی تعلیم وتربیت کے لیے پورے ہندوستان میں اپنی نوعیت کا پہلا ادارہ قایم کیا جارہا ہے۔ اراکین: مدرسۂ عربیہ مسعودیہ نورالعلوم۔ بہرائچ (مدینہ: ۲۱رفروری ۱۹۵۶ء)

حضرت شیخ کے دورۂ بہار کا پروگرام:

۲۴رفروری ۱۹۵۶ء: آخری چند برس میں حضرت شیخ الاسلام کی صحت بہت خراب رہنے لگی تھی لیکن ملک وقوم کی خدمت کی سرگرمیوں اصلاحِ امت المسلمین کے کاموں کے انہماک میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ حضرت نے ۱۹۵۶ء میں تقریباً ایک ماہ تک مسلسل سفر میں رہ کر جس طرح خدمات انجام دیے اور ایثارِ وقت کا جو مظاہرہ فرمایا وہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ زندگی بھر حضرت نے اسی طرح خدمات انجام دی تھیں، لیکن حیرت کی بات ضرور تھی۔ حضرت کا یہ پروگرام مولوی محمد حسن مونگیری متعلم دارالعلوم دیوبند نے مرتب کر کے چھپوادیا تھا۔ پروگرام یہ ہے:

تاریخ	دن	مقام	پہنچنے کا وقت	مدت قیام
۲۴ر فروری ۱۹۵۶ء	جمعہ	برن پور	۶ بجے صبح آسن سول	۱۰ بجے شب تک
			۷ بجے صبح برن پور	
۲۵ر فروری ۱۹۵۶ء	شنبہ	جمشید پور	۱۰ بجے دن	اگلے روز ۲ بجے دن
۲۶ر فروری ۱۹۵۶ء	یک شنبہ			
۲۷ر فروری ۱۹۵۶ء	دوشنبہ	قرض گرام، ضلع بردوان	۹ ۱/۲ بجے دن	۸ بجے شب
۲۸ر فروری ۱۹۵۶ء	سہ شنبہ	مونگیر	۹ ۱/۲ بجے دن	دوسرے دن ۱۲ بجے
۲۹ر فروری ۱۹۵۶ء	چہارشنبہ	بلاس پور	۸ بجکر ۱۰ منٹ شب	دوسرے دن ۱ بجے
یکم مارچ ۱۹۵۶ء	پنج شنبہ	لہریا سرائے دربھنگہ	۱۱ بجے دن	دوسرے دن ۱ بجے
۲ر مارچ ۱۹۵۶ء	جمعہ	گوپیا۔ ضلع مظفر پور	۷ بجے شب	دوسرے دن ۹ بجے
۳ر مارچ ۱۹۵۶ء	شنبہ			
۴ر مارچ ۱۹۵۶ء	یک شنبہ	ڈوڑیا، ضلع پورنیہ	۷ بجے صبح	شام تک
۵ر مارچ ۱۹۵۶ء	دوشنبہ	کاشی باڑی	۵ بجے صبح	دس بجے دن
		کشن گنج	۱۱ بجے دن	اگلے دن صبح ۵ بجے
۶ر مارچ ۱۹۵۶ء	سہ شنبہ	مبارک پور	۴ بجے دن	اگلے دن صبح ۴ ۱/۲ بجے
۷ر مارچ ۱۹۵۶ء	چہارشنبہ	مانڈر	۸ بجے دن	شام تک
۸ر مارچ ۱۹۵۶ء	پنج شنبہ	جل جل	۹ بجے دن	اگلے دن نماز فجر
۹ر مارچ ۱۹۵۶ء	جمعہ	چہار	۷ بجے صبح	۹ بجے دن
		چمپانگر	۱۰ بجے دن	نماز عصر تک
		سنہولی	۵ بجے شام	۸ بجے شب
		ناتھ نگر	۹ بجے شب	۶ ۱/۲ صبح
۱۰ر مارچ ۱۹۵۶ء	شنبہ	شیر گھاٹی		
۱۱ر مارچ ۱۹۵۶ء	یک شنبہ	گیا		اگلے دن ۶ ۱/۲ صبح
۱۲ر مارچ ۱۹۵۶ء	دوشنبہ	بنارس		
۱۳ر مارچ ۱۹۵۶ء	سہ شنبہ	چائل (الہ آباد)		
۱۴ر مارچ ۱۹۵۶ء	چہارشنبہ	لکھنؤ		
۱۵ر مارچ ۱۹۵۶ء	پنج شنبہ	نگینہ (بجنور)		
۱۶ر مارچ ۱۹۵۶ء	جمعہ	واپسی دیوبند۔ یوپی		

(الجمعیۃ۔ دہلی: یکم مارچ ۱۹۵۶ء)

۲۸؍فروری ۱۹۵۶ء: شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کے ۲۰ روزہ دورہ بہار (۲۴؍فروری تا ۱۶؍مارچ ۱۹۵۶ء) کا پروگرام۔ (مدینہ۔بجنور: ۲۸؍فروری یکم مارچ ۱۹۵۶ء)

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی انتقال فرما گئے:

۹؍ستمبر ۱۹۵۶ء: دہلی ۲؍ستمبر ۱۹۵۶ء رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کا انتقال ہوگیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر چونسٹھ برس کی تھی۔ (مدینہ۔بجنور: ۹؍ستمبر ۱۹۵۶ء، ص ۱)

حضرت لدھیانوی اور آپ کے خاندان کے تمام اصاغر و اکابر کو حضرت شیخ الاسلام اور بزرگانِ دیوبند سے خاص عقیدت تھی۔ انتقال سے ایک سال قبل جب حضرت شیخ حج کے لیے تشریف لے جا رہے تو آپ نے ایک نہایت عمدہ مضمون حضرت شیخ الاسلام پر لکھا تھا۔ میری نظر سے یہ مضمون مدینہ، بجنور کی اشاعت ۱۷، ۲۱؍جون ۱۹۵۵ء میں گزرا تھا۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر زیر مطالعہ ڈائری کے پچھلے صفحات میں درج کردیا ہے۔

اجمیر میں حضرت شیخ الاسلام کی تقریر:

اکتوبر ۱۹۵۶ء: اجمیر (ٹونک سے) جمعیت علما کی تعلیمی کانفرنس میں شرکت کے لیے احمد آباد جاتے ہوئے شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی، اور صاحب زادۂ محترم مولانا سید اسعد میاں، مولانا سید محمد شاہد فاخری ایم.ایل.اے.، یوپی، سجادہ نشین دایرہ شاہ اجمل الہ آباد، ان کے صاحب زادے مولانا سید محمد خالد فاخری، نیز حضرت مولانا ابوالوفا شاہ جہاں پوری اور مولانا محمد قاسم صاحب شاہ جہان پوری ۱۷؍اکتوبر کو صبح ایک روز کے لیے اجمیر اترے تھے۔

مسلمانوں کی خواہش اور شدید اصرار پر حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نے جامع مسجد شاہ جہانی میں نماز جمعہ پڑھائی اور نماز کے بعد تقریباً دو گھنٹے پر جوش اور پند و نصیحت سے لبریز ارشادات سے مسلمانوں کو محظوظ و مستفید فرمایا۔ آپ نے ارشاد فرمایا:

"مجھے انتہائی مسرت ہے کہ آج میں اس مقدس اور برگزیدہ ہستی کے آستانے پر آیا ہوں جو ہندوستان میں رشد و ہدایت اور فیوض ظاہری اور باطنی کا سرچشمہ تھی۔ میرا تو یقین ہے کہ جس طرح حضرت حق تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں مبعوث فرما کر تمام

عالمِ انسانیت پر انعام اور احسان فرمایا ہے اسی طرح ہندوستان میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو بھیج کر اس سرزمین پر بسنے والوں کے لیے اپنے فضل و کرم اور رشد و ہدایت کا ایک بڑا وسیلہ پیدا فرمایا ہے۔ چناں چہ یہی شخصیت تھی جس نے ہندوستان میں نورِ اسلام پھیلا دیا، لاکھوں نے فیض پایا، بے شمار انسان ان کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے اور ہزاروں اولیاء اللہ انھیں کے فیض سے مستفید ہو کر ولایت کے درجے کو پہنچے، کروڑوں انسانوں کی اصلاح ہوئی اور فیوض و برکات کے وہ چشمے بہے جن سے آج تک انسانیت سیراب ہو رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔''

حضرت شیخ نے فرمایا:

''میں دیوبندی ہوں اور دارالعلوم دیوبند کا صدر مدرس ہوں، لیکن میں آپ کو یہ بتا دوں کہ ہمارے متعلق بہت سی غلط باتیں مشہور کر دی گئی ہیں۔ حال آں کہ ہم سب اور ہمارے تمام اکابر حضرت خواجہ معین الدین چشتی علیہ الرحمہ سے اسی طرح تعلق و وابستگی رکھتے ہیں جس طرح کوئی دوسرا رکھتا ہو۔ اس لیے کہ ہمارے تمام اکابر اور ہندوستان میں تمام بزرگوں اور اولیائے کرام کا سلسلہ حضرت خواجہ موصوف ہی تک پہنچتا ہے اور سب کو ان ہی سے نسبتِ شرف حاصل ہے۔

ہمارے متعلق جو کہا جاتا ہے وہ محض اس لیے کہ ہم تصوف اور روحانیت کے ساتھ ساتھ شریعت مقدسہ کی ظاہری پابندی بھی پوری طرح کرتے ہیں اور احکام و عقاید کی تعمیل پر بھی سختی سے پابند ہیں۔ ورنہ حضرت خواجہ صاحب کی شانِ برگزیدگی کے ہم سب بھی قایل اور ان کے فیوض و انوار کے خوشہ چیں ہیں اور اس میں کسی کو بھی کلام نہیں ہو سکتا کہ ہندوستان میں اولیاء اللہ کے تمام سلسلے اسی مرکز سے پھیلے۔''

حضرت شیخ الاسلام نے سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے مسلمانوں کو نہایت ضروری نصیحتوں اور اپنے گراں قدر وعظ حسنہ سے مستفید فرمایا اور آج کے نازک حالات میں اسلام اور ایمان کی مضبوطی، توکل علی اللہ اور صبر و استقلال کی تلقین فرمائی۔

(مدینہ: ۲۸/ اکتوبر ۱۹۵۶ء)

۲۹/ اکتوبر ۱۹۵۶ء: سورت میں جمعیت علمائے ہند کے اجلاس عام (۲۷ تا ۲۹/ اکتوبر) کے آخری سیشن (۲۹/ اکتوبر) کو جلسے سے خطاب کرتے ہوئے حضرت شیخ الاسلام

نے نہر سویز پر قومی اقتدار کی بحالی کی تحسین فرمائی اور صدر جمہوریہ مصر جنرل جمال عبدالناصر کے لیے دعا کی اور مبارک باد دی۔ حضرت کے بہ قول انڈونیشیا، برما، چین، نیپال، مصر وغیرہ میں جو انقلاب آیا وہ اس لیے ممکن ہو سکا کہ ہندوستان سے انگریزوں کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ حضرت نے اپنے خطاب میں فرمایا:

''محترم بزرگو! کچھ عرصہ ہوا ہندوستان میں آزادی کی تحریک شروع ہوئی تھی، یہی زمانہ تھا کہ خلافت کی تحریک بھی چلی تھی۔ مسلمانوں نے دونوں تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ ناسمجھ لوگ کہہ دیتے ہیں کہ مسلمانوں نے ترکوں کی شہنشاہیت بحال کرنے کے لیے تحریک میں حصہ لیا تھا، مگر اسی وقت تحریکِ خلافت کے لیڈر مولانا محمد علی صاحب مرحوم اور ہمارے محترم رہنما شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ نے بار بار فرمایا تھا کہ ہمارا بڑا مقصد ہندوستان آزاد کرانا ہے۔

ہم فقط خلافت کی آزادی نہیں چاہتے، بلکہ تمام مظلوم اقوام کی آزادی چاہتے ہیں، کیوں کہ ہندوستان کی غلامی نے پورے ایشیا کو غلام بنا رکھا ہے۔ یہ اگر آزاد ہوتا ہے پورا ایشیا زندہ ہو جاتا ہے۔ جب میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ مالٹا میں تھا تو وہاں تین ہزار سیاسی قیدیوں میں نصف کے قریب جرمنی تھے۔ باقی نصف میں دوسرے ممالک کے قیدی تھے۔ ان میں چالیس آدمی مصر کے بھی تھے۔ یہ مصری دوست کہا کرتے تھے کہ اگر ہندوستان سے انگریزوں کا اقتدار ختم ہو جائے تو پھر ہم انگریز کو بحر قلزم میں دھکیل دیں۔ اب تو صورت یہ ہے کہ اگر ہم کچھ بھی سر اٹھاتے ہیں تو انگریز ہندوستان سے اتنی فوجیں لے آتا ہے کہ ان کی گنتی بھی مشکل ہوتی ہے۔

یہ ہندوستان ہی تھا جس کی غلامی کی بہ دولت انگریز برما، چین، ملایا، جاوا، سماترا، نیپال، افغانستان، ایران، مصر، افریقہ، عدن، سوڈان، بحرابیض کے کناروں پر واقع تمام ممالک پر چھایا ہوا تھا۔

ترکوں کا جنگی بیڑا دنیا میں سب سے بڑا تھا۔ جب ابراہیم پاشا امیر البحر تھا تو دھوکا دے کر ترکوں کا بیڑہ تباہ کیا گیا۔

یہ تمام باتیں تحریکِ آزادی کے زمانے میں بار بار بتائی گئیں، مگر اس وقت بہت سے لوگ ان کے سمجھنے سے قاصر رہے۔ آج ہم کھلی آنکھوں دیکھ رہے ہیں کہ ہندوستان آزاد ہوا

تو انڈونیشیا، برما، چین، نیپال وغیرہ تمام ممالک سے انگریزی اقتدار ختم ہوگیا۔نہر سویز مصر کی حدود میں ہے، مصر کی سرزمین پر ہے، لامحالہ مصر کی ہے۔لاکھوں مصریوں کی جانیں اس کی تیاری میں قربان ہوئی ہیں۔مگر انگریز نے اس نہر پر اس طرح قبضہ کر رکھا تھا کہ اس کا تصور بھی مشکل تھا کہ انگریز کی اس گرفت سے یہ نہر نجات پاسکتی ہے۔

ہندوستان آزاد ہوا تو مصریوں کو بھی جوش آیا۔اللہ تعالیٰ کرنل ناصر صدر جمہوریہ مصر کی ہر طرح مدد فرمائے۔اس کو یہ ہمت ہوئی کہ نہر سویز پر اپنا اقتدار قایم کرلیا۔

ہم کرنل ناصر کو مبارکباد دیتے ہیں۔اللہ تعالیٰ اس کی مدد فرمائے۔

(خطباتِ صدارت: گوجرانوالہ (پاکستان)، ۱۹۹۰ء:ص ۷-۴۹۶)

سورت میں حضرت شیخ الاسلام کی تقریر:

۲۷/اکتوبر ۱۹۵۶ء: سورت، جانشینِ شیخ الہند حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نے آج یہاں ہندوستانی مسلمانوں کو فرقہ پرستی سے آگاہ کیا اور کہا وہ تنگ نظری اور فرقہ پرستی سے ہر وقت ہوشیار رہیں۔وہ یہاں جمعیت علماے ہند کے انیسویں سالانہ عام اجلاس سے خطاب کررہے تھے۔مولانا نے کہا حکومت کی نگاہ میں تمام فرقے برابر ہیں۔اقلیتوں کو چاہیے کہ وہ ملک کی ترقی میں برابر کا حصہ لیں۔

نظام حیدرآباد کا احترام برقرار رہے گا:

یکم نومبر ۱۹۵۶ء: حیدرآباد، ۲۱/اکتوبر ۱۹۵۶ء، وزیرِ اعظم مسٹر نہرو نے نظام حیدرآباد کو جو یکم نومبر کے بعد راج پرمکھ نہیں رہیں گے، یقین دلایا ہے کہ ان کے موجودہ مرتبے، حقوق اور حقوقِ خصوصی میں جن کی دستور میں ضمانت دی جاچکی ہے، کوئی فرق نہیں آئے گا اور ۲۵/جنوری ۱۹۵۰ء کے سمجھوتے اور دوسرے سمجھوتوں کا احترام کیا جائے گا۔

یہ بات کنگ کوٹھی سے جاری شدہ ایک اعلانیہ میں بتائی گئی ہے۔نظام نے وزیرِ اعظم کی اس عنایت کا اور ذاتی رفاقت کا جو انھوں نے نظام کی راج پرمکھی کے زمانے میں قایم رکھی، شکریہ ادا کیا۔(مدینہ-بجنور: یکم نومبر ۱۹۵۶ء)

ائمہ مساجد کی تربیت کا آغاز:

۵؍نومبر ۱۹۵۶ء: آج حضرت شیخ الاسلام نے دہلی میں جمعیت علماے ہند کے زیر اہتمام امام صاحبان کے لیے چھ مہینے کے ایک تربیتی کورس کا افتتاح فرمایا۔ اس تقریب میں قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے بھی شرکت فرمائی۔ اس میں انھیں نہ صرف دینی معلومات سے بہرہ مند کیا جائے گا بلکہ انھیں وقت کے تقاضوں سے آگاہ رہنے کی تلقین بھی کی جائے گی۔ توقع کی جاتی ہے کہ ائمہ مساجد کی تعلیم و تربیت کے ذریعے نظام مساجد کو بھی استحکام حاصل ہوگا اور مسجدوں کو دینی تعلیمی مقاصد کے لیے منظم کرنے کا موقع ملے گا۔

جمعیت علماے ہند کی پالیسی اور خدمات:

نومبر ۱۹۵۶ء: جمعیت علماے ہند کا سالانہ اجلاس حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کی صدارت میں سورت میں ہوا تھا۔ اس اجلاس کے فیصلوں اور جمعیت کی خدمات پر مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے برہان میں ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:

”جمعیت علماے ہند کا سالانہ جلسہ جو ابھی گزشتہ ماہ میں سورت میں ہوا تھا اس اعتبار سے بہت اہم تھا کہ یہ جلسہ ایک ایسے وقت میں ہوا ہے جب کہ ایک طرف ملک میں دوسرے الیکشن کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور دوسری طرف گزشتہ ایجی ٹیشن اور اس کے اثرات مابعد کی وجہ سے مسلمان ایک اضطراب ذہنی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ آزادی کے بعد سے اب تک جمعیت کی بڑی توجہ مسلمانوں کے دینی معاملات کے علاوہ اس پر رہی ہے کہ وہ مسلمانوں میں خود اعتمادی اور بھروسا پیدا کرے اور اس راہ میں جو رکاوٹیں ہیں ان کو دور کرے۔ اس سلسلے میں اب تک جمعیت نے جو کچھ کیا ہے وہ ایک جماعت کے فخر کرنے کے لیے کافی ہے اور اس کا صحیح اندازہ اس وقت ہو سکتا ہے جب کہ آج سے آٹھ برس پہلے کی عام حالت کا مقابلہ آج کی حالت سے کیا جائے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اب جمعیت نے مسلمانوں کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کے انتہائی ضروری اور تعمیری کام کی طرف بھی توجہ کی ہے اور اس سلسلے میں ایک تجویز میں اس اسکیم کو بروئے کار لانے کا خاکہ پیش کیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ مذہب کی پابندی، اعلا اخلاق اور پاکیزہ سیرت ان سب چیزوں کا اقتصادی حالت کی خوش گواری کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کادا

لفقر یکون کفراً فرما کر اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا تھا۔ لیکن ہم لوگوں کا جو نظام فکر قایم ہو گیا ہے اور جس میں ہم صدیوں سے مبتلا ہیں اس میں علما کے لیے اقتصادیات کی کوئی بات کرنی بھی گناہ تھی اور اس کو صرف دنیا والوں کے لیے مخصوص سمجھا جاتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ جمعیت نے یہ اہم تجویز پاس کر کے اسلام کی، مسلمانوں کی اور خود اس ملک کی بڑی اہم اور عظیم الشان خدمت انجام دی ہے۔ یہ نہایت ضروری اور بنیادی کام ہے اور ایک ہمہ گیر اور آل انڈیا پروگرام کی حیثیت سے صرف جمعیت ہی اسے انجام دے سکتی ہے۔ ضرورت ہے کہ ماہرین اقتصادیات و معاشیات کے مشورے سے ایک باقاعدہ پنج سالہ یا دو سالہ پلان کی حیثیت سے اس کام کو انجام دیا جائے۔

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

(برہان- دہلی: نومبر ۱۹۵۶ء، ص ۴)

۱۹۵۷ء

حضرت شیخ الاسلام کا ایک بصیرت افروز مکتوب گرامی:

۶؍جنوری ۱۹۵۷ء: حضرت شیخ الاسلام کا یہ مکتوب سامی کرپی رام پور ضلع سلطان پور کے مولوی محمد فاروق کے نام ہے۔ مکتوب الیہ کو ''نقش حیات'' کے بعض بیانات میں چند اشکال پیش آئے تھے۔ حضرت کے جوابات سے وہ معدوم ہو جاتے ہیں۔ مکتوبات شیخ الاسلام'' کے مرتب مولانا نجم الدین اصلاحی نے اس پر ایک طویل حاشیہ تحریر کیا ہے اور مکتوب الیہ کے اعتراضات کا رد کیا ہے۔ اگر حضرت کے جوابات سے کسی محترم قاری کی تشفی نہ ہو تو مکتوبات کی جلد چہارم میں مکتوب نمبر ۱۲۶ پر مرتب کے حاشیے سے استفادہ فرمائیں۔

حضرت کا مکتوب سامی یہ ہے:

''محترم المقام زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاج شریف، والا نامہ مورخہ ۱۸؍شوال مطابق ۱۹؍مئی باعث سرفرازی ہوا تھا۔ جس میں تین اعتراضات نقش حیات جلد ثانی پر تھے۔ میں بہ وجہ بیماری اور عدیم الفرصتی عریضہ لکھنے سے معذور رہا اور آج کی تاریخ آگئی، امیدوار معافی ہوں۔

(پہلا اعتراض) موجودہ سیکولر اسٹیٹ کو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کی تعریف دارالاسلام پر دارالاسلام قرار دینا ہے۔

محترما! میں نے کسی جگہ کتاب مذکور میں اس سیکولر اسٹیٹ کو دارالاسلام نہیں لکھا ہے، نہ جمہور کے قول پر اور نہ حضرت شاہ صاحبؒ کے قول پر۔ پھر میں نہیں سمجھتا کہ آپ کا یہ اعتراض کس طرح وارد ہوتا ہے۔ جو وجوہ حکومت کے شرم ناک کارناموں کے آپ ذکر فرما رہے ہیں مجھ کو ان کا انکار نہیں ہے، پھر میں کس طرح اس کو دارالاسلام قرار دے سکتا ہوں اور اگر کسی جگہ موجودہ سیکولر اسٹیٹ کی تائید کرنے کے الفاظ سے آپ نے اس کو سمجھا ہے تو وہ از قبیل اھون البلیتین ہے نہ بہ حیثیت دارالاسلام ہے۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فتویٰ درحقیقت ان علما کو سمجھانے کے لیے لکھا گیا تھا جو کہ دارالاسلام اور دارالحرب کے متعلق درمختار وغیرہ کتب فقہ سے مندرجۂ ذیل عبارت سے استدلال کرتے ہوئے عہد انگریزی کو دارالاسلام قرار دے رہے تھے۔

لا تصير دار الاسلام دار الحرب الا بامور ثلاثة باجراء احكام اهل الشرك وباتصالها بدار الحرب و بان لا يبقى فيها مسلم او ذمي بالامان الاول على نفسه و دار الحرب تصير دار الاسلام باجراء احكام اهل الاسلام فيها كجمعة وعيد وان بقي كافر اصلي وان لم تتصل بدار الاسلام.

(درمختار: جلد ۳، ص ۲۷۷)

اس زمانے میں علمائے زمانہ ہندوستان کو دارالاسلام قرار دیتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ ملک میں اقامت جمعہ وعیدین جیسے احکام اسلامیہ علانیہ جاری ہیں حکومت متسلطہ ان میں رکاوٹ نہیں ڈالتی، اس لیے ہندوستان دارالحرب نہیں ہے، دارالاسلام ہی ہے۔ لہٰذا یہاں جہاد نہیں ہوسکتا۔ دارالاسلام ہی کے احکام نافذ ہوں گے۔ اگرچہ اقتدار اعلا انگریزوں کا ہے، اس کی حقیقت شاہ صاحب" اپنے فتویٰ میں نہایت بسط وتفصیل کے ساتھ ذکر کررہے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ میں سیکولر اسٹیٹ ہند کو دارالاسلام قرار دے رہا ہوں "توجيه القول بمالا يرضىٰ به قائله" ہے اور خلاف تصریحات ہے۔

دوسرے اور تیسرے اعتراض میں آپ کا یہ اعتراض کہ حضرت شاہ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو سیکولر اسٹیٹ بنانے کا ارادہ کرنے والا اور صرف انگریزوں کا نکالنے والا میں قرار دیتا ہوں، بالکل خلاف واقع اور تصریحات سے روگردانی ہے۔ بہ ہر حال یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں اور اگر بالفرض کوئی عبارت ایسی ہے جس کی دلالت مطابقی یہی ہے دوسری توجیہ اس میں نہیں ہوسکتی تو وہ غلط ہے، میں اس سے رجوع کرتا ہوں۔ فرقہ وارانہ حکومت اور سیکولر اسٹیٹ کے درمیان میں بھی تو ایسی صورتیں ہیں جن کو اسلام قبول کرسکتا ہے۔ مغلیہ حکومت کو دیکھیے اور غور فرمائیے۔

والسلام

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ۔ دیوبند

ذی قعدہ ۱۳۷۶ھ (م ۶/جون ۱۹۵۷ء)

جمہوریت کیا ہے؟ شیخ الاسلام کا بصیرت افروز خطاب:

۱۱ تا ۱۳ ار فروری ۱۹۵۷ء: جمعیت علمائے ہند کا اٹھارہواں اجلاس عام ۱۷ / ۱۸ / ۱۹ / جمادی الثانی ۱۳۷۶ھ / ۱۱ / ۱۲ / ۱۳ ار فروری ۱۹۵۷ء کو کلکتہ میں ہوا، اس کے خطبہ صدارت کا ایک اقتباس پیش کیا جارہا ہے، جس کا ایک ایک لفظ حکیمانہ اور مدبرانہ درس ہے، کاش! ہمیں توفیقِ عمل نصیب ہو۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ. (سورۂ رعد: ۱۱)

یہ ارشاد خداوندی جس کا مفہوم اردو کے مشہور شعر میں ادا کیا گیا ہے:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

یہ ارشاد ایک حقیقت ہے جو نمایاں طور پر ہمارے سامنے ہے۔ مستقبل کے تمام خطرات جن کی تعداد بہت کچھ بیان کی جاتی ہے اسی وقت تک ہیں جب تک ہم اپنی حالت میں تبدیلی نہ کریں۔ لیکن اگر ہم اپنے اخلاق و خصائل، اپنے جذبات و رجحانات اسلامی اصول پر ڈھال لیں تو ہمارے اپنے خطرات تو درکنار ہم دوسروں کے خطرات بھی دور کر سکتے ہیں۔

حالت کی تبدیلی کے یہ معنی نہیں کہ ہم اسلامی نظریات اور اسلامی اخلاق و تہذیب سے علاحدگی اختیار کریں بلکہ تبدیلی کا مفہوم یہ ہے کہ جو بعد پیدا ہو گیا ہے اس کو مرض مہلک تصور کریں اور جتنا جلد ممکن ہو ہم اسلامی اصول و نظریات سے اتنے قریب ہو جائیں جتنا ہم اپنی روح اور جان یا اپنے رنگ اور دلوں سے قریب ہیں۔

جنگِ عظیم کا وہ ہمہ گیر فتنہ و فساد جو بارہ سال پہلے دنیائے انسانیت کو تہ و بالا کر چکا ہے اور جس کے آثار بر و بحر میں دوبارہ نظر آرہے ہیں جن سے دنیا کی ہر چھوٹی بڑی طاقت خائف اور دہشت زدہ ہے، صرف اس لیے ہے کہ دنیا ''گندم نما جو فروش'' ہے۔ خدمتِ خلق، آزادیٔ رائے، اخوت، مساوات، ہمدردیٔ نوع انسان جیسے سنہری عنوانات اور ان کے خوش نما ''سائن بورڈ'' سامنے ہیں اور پردے میں خود غرضی، مفاد پرستی، غرور و نخوت، اور تحقیر و نفرت کی وہ تمام بارودی سرنگیں بچھی ہوئی ہیں جو امن و اطمینان کے بڑے بڑے قلعوں کو ہمیشہ مسمار کرتی رہی ہیں۔ چپے چپے پر جمہوریت کے پرچم لہرائے جارہے ہیں، مگر

خود علم بردارانِ جمہوریت روحِ جمہوریت سے نا آشنا ہیں۔

اس سے بڑھ کر ابلہ فریبی کیا ہو سکتی ہے کہ رائے شماری کو روح جمہوریت قرار دیا جائے۔ حال آں کہ رائے شماری تشکیل حکومت کا طریقہ ہے، روحِ جمہوریت نہیں۔

روحِ جمہوریت وہ اخوت ہے جس کی دعوت قرآن حکیم نے دی ہے۔

یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی. (سورۂ حجرات:۱۳)

روحِ جمہوریت وہ مساوات ہے جو رنگ و نسل اور دولت و ثروت کے ہر ایک امتیاز کو مٹا کر اعلان کرتی ہے۔

کلکم بنو آدم و آدم من تراب. (حدیث شریف)

روحِ جمہوریت وہ احساسِ اخوت ہے جو سردارِ دو جہاں رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں ہمیں آمادہ کرتا ہے کہ بارگاہ رب العزت میں سر نیاز خم کرتے ہوئے اعتراف کریں۔

انی اشھد ان العباد کلھم اخوۃ. (حدیث شریف)

روحِ جمہوریت وہ خدا شناسی ہے کہ مخلوق میں جلوۂ خالق نظر آئے اور ساری مخلوق اللہ کا کنبہ معلوم ہو۔

روحِ جمہوریت وہ خدا رسی ہے جو خدمت خلق کے راستے سے میسر آئے۔

الخلق عیال اللّٰہ. (الحدیث)

روحِ جمہوریت وہ عدل و انصاف ہے جو اپنے پرائے، دوست و دشمن، ملکی اور غیر ملکی میں کوئی امتیاز روا نہ رکھے اور دشمن کے لیے بھی وہی فیصلہ کرے جو خود اپنے لیے ہو۔

وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا. (سورۂ مائدہ:۸)

روحِ جمہوریت وہ آزادیٔ ضمیر اور آزادیٔ رائے ہے جو دین و مذہب کے بارے میں بھی کسی قسم کا جبر و اکراہ روا نہ رکھے، جس کا اعلان یہ ہو۔

لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ. (سورۂ بقرہ:۲۵۶)

غور فرمائیے یہ ہیں اسلامی نظریات۔ آج دنیا میں جو کچھ فتنہ و فساد ہے، مشرق و مغرب میں جو آتش فشاں تیار ہو رہے ہیں، ہندیونین کی سرزمین میں فرقہ پرستی کی جو سرنگیں بچھی ہوئی ہیں وہ سب اس لیے ہیں کہ اقوام عالم ان نظریات سے بے گانہ بلکہ گندم نما جو

فروش — یعنی زبان پر یہی انسانیت نواز اصول ہیں اور عمل اور کردار ان کے برعکس اور ان سے کوسوں دور ہے۔

آج ہماری پستی کا اصل سبب یہی ہے کہ ہمارا عمل ان نظریات کے مطابق اور ان اصول کا آئینہ دار نہیں ہے۔ آپ خوب سمجھ لیجیے کہ اقوام عالم کی کش مکش کے اندر ایک روشن پہلو یہ نظر آ رہا ہے کہ خود ان متصادم قوموں کی نگاہوں میں دنیا کے امن و اطمینان کے لیے ان نظریات کا استقبال ضروری ہوتا جاتا ہے۔ پس نہایت واضح اور غیر مبہم پیشین گوئی یہ ہے کہ جس قدر جلد آپ کا کردار ان اصول کے مطابق اور ان کے معیار پر صحیح اور درست ہو جائے گا، اتنی ہی جلد دنیا آپ کو آنکھ کا تارا بنانے کے لیے تیار ہو جائے گی۔

وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ. (سورۂ آل عمران:۱۳۹)

آپ دوسروں کا انتظار نہ کریں، آپ کے لیے انتظار درست نہیں، کیوں کہ آپ تو وہ ہیں کہ ان اصول کی مقدس امانت عمل کرنے اور عمل کرانے کے لیے آپ کے سپرد ہوئی ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ. (سورۂ آل عمران:۱۱۰)

پس آپ ہر ایک انتظار سے بے نیاز و مستغنی ہو کر اپنے کردار و عمل سے ان نظریات کی تصدیق کر دیں، تاکہ آپ خود بھی کامیاب و فائز المرام ہوں اور دوسروں کے لیے بھی مشعل ہدایت بن سکیں۔

(ارشادات و مضامین اور تقریریں: از حضرت شیخ الاسلام، مکتبہ دینیہ - دیوبند، ص ۸-۳۰۶)

انتخاب میں مولانا آزاد کی کامیابی:

۱۷ مارچ ۱۹۵۷ء: مولانا ابوالکلام آزاد لوک سبھا کے الیکشن میں پنجاب کے گڑ گاؤں کے حلقے سے کھڑے ہوئے تھے۔ انتخاب ۱۰ مارچ کو ہوا تھا۔ اس حلقے میں مولانا آزاد کا مقابلہ جن سنگھ کے امیدوار سے تھا۔ اس حلقے میں ۴،۳۴،۶۱۴ کل ووٹ تھے۔ ان میں سے ۲،۸۶،۸۳۴ ووٹ ڈالے گئے۔ ان میں سے ۶۰ ووٹ رد کر دیے گئے۔ مولانا آزاد نے ۱،۹۱،۲۲۱ ووٹ حاصل کیے، جب کہ مقابل امیدوار کو ۹۵،۵۵۳ ووٹ ملے۔ اس

طرح مولانا آزاد اپنے حریف کے مقابلے میں ۹۵،۲۶۸ ووٹ زیادہ حاصل کر کے لوک سبھا کے ممبر منتخب ہو گئے۔ (مدینہ-بجنور: ۱۷ر مارچ ۱۹۵۷ء)

حضرت مجاہدِ ملت کی انتخاب میں کامیابی:

۲۷ر مارچ ۱۹۵۷ء: جمعیت علماے ہند کے ناظم اعلا مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی امروہہ کے حلقۂ انتخاب سے پارلیمنٹ کے لیے ممبر منتخب ہو گئے۔ انھیں ۲۲۰،۴۷ ووٹ ملے۔ ان کے مقابلے میں جن سنگھی امیدوار دوتارام کو ۵،۵۷۴، پی ایس پی کے امیدوار مولانا عبدالقیوم کو ۴۱،۹۸۵، اور آزاد امیدوار رام منوہر لال نے ۲۱،۶۷۴ ووٹ ملے۔

(مدینہ-بجنور: ۱۷ر مارچ ۱۹۵۷ء، ص۱)

حضرت شیخ الاسلام کا ایک ایمان افروز مکتوب گرامی:

۱۳ر جون ۱۹۵۷ء: شیخ الاسلام قدس اللہ سرہٗ العزیز ماہ اگست ۱۹۵۷ء میں صاحب فراش ہو گئے۔ اس مرض سے چند روز پیشتر حضرت موصوف نے اپنے ایک ارادت مند کے خط کے جواب میں جو مکتوب گرامی تحریر فرمایا تھا اس کو حضرت کی وصیت کہا جا سکتا ہے۔ آج جب کہ ہم حضرت کے نقش قدم پر چلنا اپنا فرض سمجھتے ہیں تو ضروری ہے کہ جماعتی مقاصد کے لیے حضرت کے ان ارشادات کو اپنی زندگی کا ایک وظیفۂ عمل بنالیں۔ حضرت کے جواب سے پہلے غلام محمد مصطفیٰ صاحب کا مکتوب بھی نقل کیا جاتا ہے۔

گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغہاے سینہ را

حضرت اقدس! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

خدا کرے مزاج گرامی بہ خیر ہو۔ آپ کا یہ خادم بھی بحمد اللہ بہ خیر و عافیت ہے۔ اپنے تین سالہ تجربات کی روشنی میں جو جمعیت علما گزیڈیہہ کی نظامت کے سلسلے میں حاصل ہوئے ہیں حسب ذیل معروضات خدمت عالی میں پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔

سیدی! جمعیت علماے ہند کے اغراض و مقاصد پر پورا یقین رکھتے ہوئے ہم لوگ چاہتے ہیں کہ حضرت والا کی رہنمائی میں مسلمان باعزت زندگی گزارنے کے قابل ہو سکیں۔ اس لیے ہماری یہ پختہ راے ہے کہ جمعیت علماے ہند کے نظام کی بقا اور اس کے پروگرام جو

کلی جدوجہد سب دین کا کام ہے اور خدا کے یہاں اجروثواب کا باعث، ان شاء اللہ تعالی -- میں بدقسمتی سے عالم دین نہیں ہوں، لیکن علما کے کفش برداری کا فخر حاصل ہے۔ مگر مجھ کو یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے کہ بہت سے علماے کرام جمعیت علما کے کام میں کوئی اشتراک نہیں کرتے۔ میں نے جب بھی ان کی خدمت میں جمعیت علما کا کوئی پروگرام پیش کیا اور کچھ وقت مانگا گیا تو یہ کہہ کر ٹال مٹول کیا گیا کہ ہم بھی دین کا کام کررہے ہیں، تصوف کے مراحل طے کررہے ہیں، جس کے لیے شور، ہنگامہ مضر ہوتا ہے۔ پھر کس طرح سے ہم جماعتی کام کریں؟ حضرت والا کے بہت سے متوسلین اور خلفا کے بھی یہی خیالات ہیں اور وہ غالباً جمعیت علما کے کام میں وقت لگانا وقت کی بربادی سمجھتے ہیں۔ ان حالات میں ضرورت ہے کہ حضرت والا اپنے ایک واضح بیان کے ذریعے جمعیت علما کے ساتھ وابستگی کی شرعی حیثیت بیان کرکے راستہ صاف فرمائیں۔ اگر واقعی جمعیت علما کی خدمت کرنا دین کا کام نہیں اور جمعیت کی خدمت تضیع اوقات ہے تو پھر ہم لوگوں کی بھی رہنمائی کی جائے کہ اتنی دردسری کی ضرورت نہیں۔ میں تو اب تک بلکہ اب اور زیادہ محسوس کرتا ہوں کہ وقت کی پکار ہے کہ جمعیت علما کی ترقی ہم ہندی مسلمانوں کا نصب العین ہونا چاہیے -- الخ --

اخیر میں دست بستہ گذارش ہے کہ ممبر سازی کا وقت قریب ہے، ایک واضح اعلان حضور کی طرف سے اخبارات میں بھی شائع ہونا چاہیے۔ فقط

والسلام

احقر غلام محمد مصطفیٰ

ناظم عمومی جمعیت علما، تھانہ گریڈیہہ ضلع ہزاری باغ صوبہ بہار

۱۳؍جون ۱۹۵۷ء

جواب از حضرت شیخ الاسلام:

مسلمانوں کی بہت سی مشکلات کا حل نیز خود اسلام کی ترقی اور اس کے بہت سے فرائض اور واجبات کی ادائیگی اجتماعی قوت اور صحت نظام پر موقوف ہے اور اس زمانہ انحطاط میں بالخصوص ان ملکوں میں جہاں اسلامی حکومت نہیں ہے اور مسلمان اپنی اقلیت کی وجہ سے وہاں پر نہایت کم زور اور ان کی آواز نہایت گری ہوئی ہے، اشد ضرورت ہے کہ ان میں اجتماعی قوت اور نظام مکمل ہو۔ بالآخر انڈین یونین (بھارت) میں تقسیم ہند کے بعد یہ

ضرورت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے، اس لیے تمام مسلمانوں کا عموماً اور علماے اسلام کا خصوصاً اہم فریضہ ہے کہ وہ جاگیں اور تحفظ و بقا کی صورتیں عمل میں لائیں، اختلافات کو مٹائیں اور اجتماعی قوتوں کو بڑھا کر صحیح نظام پر گامزن رہیں۔ ورنہ عند اللہ اور عند الناس سخت مواخذے اور گرفت کے مستحق ہوں گے۔ خود کو بھی برباد کریں گے اور قوم و ملت نیز دین و مذہب کی بربادی کا وبال بھی اپنے اوپر لیں گے۔ انھیں امور کو دیکھتے ہوئے باعزت اور سمجھ دار بزرگوں نے جمعیت علماے ہند کی بنیاد رکھی تھی جو کہ اپنی ابتدا اور سال ہا سال سے آج تک میدانِ عمل میں اپنی طاقت کے مطابق مخلصانہ سربہ کف چلی آ رہی ہے۔ مگر آج بہت سے عاقبت نا اندیش مسلمان اور علماے کرام اس میں جدوجہد کرنے اور جمعیت کے نظام کر بڑھا کر مسلمان کی اجتماعی قوت کو بالا کرنے سے جان چراتے ہوئے نظر آتے ہیں، یہ ان کی سخت غلطی ہے۔ میں ان کو متنبہ کرتا ہوں اور زوردار لہجے میں آگاہ کرتا ہوں کہ وہ اپنی انفرادی، اصلاحی جدوجہد کے ساتھ ساتھ اجتماعی قوت زیادہ سے زیادہ عمل میں لائیں۔ ہرگز ہرگز اس میں غفلت اور سہل انگاری کو راہ نہ دیں، ورنہ سخت خطرات سے دوچار ہوں گے اور اس کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ ہند یونین میں جمعیت علماے ہند کے نظام کو زیادہ سے زیادہ مستحکم اور مضبوط بنائیں۔ واللہ المستعان!

دستخط مبارک

جماعت اسلامی اور مولانا مودودی:

۷ر ستمبر ۱۹۵۷ء: مولانا عبد الجلیل صاحب، نمبر ۲۶ فیلڈ رجمنٹ، لاہور گیٹ نے حضرت سے چند سوالات فرمائے تھے۔ ان میں ایک سوال یہ تھا:

''ہمارے یہاں یہ بحث ہے کہ جماعت اسلامی پاکستان کے رسالوں اور اخبارات میں یہ مضمون (یعنی خط) آپ کی طرف منسوب کیا گیا ہے کہ آپ نے مودودی کے متعلق یہ مندرجۂ ذیل فقرے استعمال کیے ہیں ''ایسے ٹٹ پونجیے اپنی بدبختی کے سوا کر ہی کیا سکتے ہیں'' ایسے کم بخت، ایسے بد نصیب، بد بخت اور ایسے خبیثوں سے منہ لگانا..... الخ کیا واقعی یہ آپ کی عبارت ہے؟ آپ کا شائع کردہ خط چوں کہ لمبا تھا اس لیے اقتباسات لکھے گئے ہیں۔ ہم یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ یہ بھی انھیں کے ہتھکنڈوں میں سے ایک ہے جو کسی کی عبارت کو کسی کے سر منڈھ دیتے ہیں اور پھر علما کو بدنام کرنے کا راستہ نکال لیتے ہیں، جیسا کہ تھوڑا

عرصہ ہوا مولانا قاسمؒ کی عبارت کو کس چالاکی، توڑ مروڑ کر مفتی مہدی حسن صاحب دیوبندی سے فتویٰ حاصل کیا اور پھر حاشیہ آرائی کی، جو کہ اخبارات میں تفصیل سے آچکا ہے۔ یہ بھی اسی میں سے ایک ہے۔ جواب سے آگاہ فرما کر تسلی دیں تا کہ ہم ان کو جواب دے سکیں۔''

حضرت نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا:

''محترما! آپ نے اس جواب کو دیکھا اور اس کے طویل ہونے کی وجہ سے اس کے اقتباسات نقل کر دیے، مگر یہ نہیں دیکھا کہ وہ میرا جواب کس کو لکھا گیا تھا اور کہاں لکھا گیا تھا اور کن باتوں کا جواب تھا۔ اگر اس کی تحقیق فرماتے تو آپ کو پوچھنے کی ضرورت نہ پیش آتی اور نہ مودودیوں کے ہتھکنڈے آپ پر مخفی رہتے۔ واقعہ یہ ہے کہ قصبہ گنگوہ ضلع سہارن پور میں کچھ لوگ مودودی جمع ہو گئے تھے اور اپنے عقاید اور طریقے کا اعلان اور تبلیغ اور دعوت جاری کی تھی، ان کی ہذیانات کے متعلق ایک سوال آیا تھا۔ من جملہ اور ہذیانات کے جس میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرامؓ اور ائمہ عظامؒ کی توہین اور بے ادبی ذکر کی گئی تھی۔ ایک یہ بھی ہذیان لکھا کہ یہ لوگ حضرت ابو سعید صاحب کے متعلق نہایت ذل خراش الفاظ استعمال کرتے ہیں اور ان کی زیارت کے متعلق نازیبا الفاظ کہتے ہیں۔ (واضح ہو کہ) حضرت شاہ ابو سعید رحمۃ اللہ علیہ ہمارے سلسلۂ مشائخ چشتیہ صابریہ میں نہایت معزز اور محترم بزرگ گزرے ہیں، جو کہ تقریباً ۱۱۴۰ھ میں فوت ہوئے تھے۔ حضرت شاہ نظام الدین بلخی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ اور حضرت شاہ محب اللہ الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے مرشد ہیں۔ ان کا مزار حضرت شاہ عبد القدوسؒ کی خانقاہ کے قریب ایک قبے میں ہے۔ یہ جوابی خط میں نے اسی شخص کو گنگوہ میں بھیجا تھا جنھوں نے یہ سوال بھیجا تھا۔ مدرسۂ اشرفیہ کے مدرس مولوی عبد الحمید صاحب حسن پوری تھے، انھوں نے اس خط کو شائع کر دیا۔ اب قابل غور یہ بات ہے کہ اس خط میں جو الفاظ ٹٹ پونجیے، کم بخت، بدنصیب وغیرہ کے لکھے گئے ہیں انھیں لوگوں کے لیے ہیں جن کے تذکرے سائل نے اپنے خط میں کیے ہیں اور وہی لوگ ہیں جو کہ گنگوہ میں مودودی مسلک پھیلاتے تھے اور بزرگان دین کی شان میں گستاخیاں کرتے ہوئے اول فول بک رہے تھے۔ مودودی صاحب کو ان الفاظ کا اپنے اوپر اوڑھنا یا مودودیوں کو اپنے امیر کو اس کا مصداق بنانا یہ ان کا پروپیگنڈا اور ہتھکنڈا ہے۔ اصل خط میں مودودی (ابو الاعلیٰ) صاحب کا نہ کوئی تذکرہ تھا نہ ابو الاعلیٰ صاحب کا جواب میں کوئی تذکرہ

ہے۔ بہ ہر حال ان الفاظ کے مصداق وہ اشخاص ہیں جنھوں نے گنگوہ میں بدزبانیاں اور بے عنوانیاں کی تھیں اور اسی وجہ سے جمع کے الفاظ لائے گئے ہیں۔ اگر مودودی صاحب کی طرف روئے سخن ہوتا تو مفرد لایا جاتا۔ گنگوہ میں نہ مودودی صاحب موجود تھے نہ ان کو وہاں آنے کا موقع ملا۔ (ثانیاً) بالفرض اس کے مصداق اگر مودودی صاحب ہی قرار دیئے جائیں تو انھوں نے اسلاف کرام کی شان ہائے عالیہ میں کیا کیا ہرزہ سرائی نہیں کی ہے؟ یہ الفاظ تو نہایت ہی ہلکے ہیں۔ مودودیوں کو اپنے گریبان میں منہ ڈال کر سوچنا چاہیے۔ یہاں تو "جَزَآءُ سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُھَا" بھی نہیں کیا گیا ہے، چاہیے تو یہ تھا کہ "کلوخ انداز را پاداش سنگ است" کا معاملہ کیا جائے۔ جب کسی کے باپ کو گالی دو گے تو کب تمہارا باپ گالی سے بچ سکتا ہے۔ اگر کسی کو اپنے باپ کی عزت مطلوب ہے تو اس کو ضروری ہے کہ دوسروں کے آباواجداد کی عزت اور تکریم میں کوتاہی روا نہ رکھے۔ قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم لا یسب احدکم والدیہ قالوا یارسول اللہ ھل یسب احد والدیہ قال نعم یسب ابا الرجل فیسب اباہ (او کما قال)۔ اور ٹٹ پونجیا تو کوئی ایسا شنیع اور سب وشتم کا لفظ نہیں ہے، اس کے معنی کم مایہ کے ہیں، جس کی تمام پونجی ٹاٹ ہو۔ کم مایہ ہونے کا خود مودودی صاحب کو اقرار ہے۔ بہ ہر حال یہ الفاظ ان کے لیے نہیں لکھے گئے اور نہ لکھنے کے وقت ان کا خیال تھا، یہ الفاظ فقط ان مودودیوں کے لیے تھے جنھوں نے گنگوہ میں اودھم مچا رکھی تھی۔ مودودی صاحب کے لیے ان الفاظ کو قرار دینا یہ ان ناواقفوں اور ان کی جماعت کا ہتھکنڈا ہی ہے اور بس۔

حسین شہید سہروردی کی وزارت عظمیٰ سے برخواستگی:

۱۴ر اکتوبر ۱۹۵۷ء: پاکستان کے گورنر جنرل مسٹر اسکندر مرزا نے ۱۴ر اکتوبر ۱۹۵۷ء کو پاکستان کے وزیر اعظم مسٹر حسین شہید سہروردی کو وزارتِ عظمیٰ کے منصب سے برخواست کردیا۔ (آہنگ بازگشت: از محمد سعید، ص ۳۶۱)

"نکہت گل" کے بارے میں حضرت شیخ کی رائے گرامی:

۳۰ر اکتوبر ۱۹۵۷ء: مندرجہ ذیل خط حضرت شیخ الاسلام قدس اللہ سرہٗ العزیز نے

دوران علالت وصال سے ایک ماہ چھ روز قبل جناب علیم اختر مظفر نگری کے مجموعہ کلام "نکہتِ گل" کے سلسلے میں اپنے دست مبارک سے لکھا:

محترم المقام زید مجدکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج مبارک، نکہتِ گل نے مشام کو معطر اور دل ودماغ کو مسرور کیا۔ جزاکم اللہ خیرالجزاء۔ حسب ارشاد نشان زدہ اوراق پر خصوصی طور پر توجہ کی گئی۔ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنی رضا اور خوش نودی اور قبولیت سے نوازے اور مزید توفیق عنایت فرمائے۔ آمین! اس توجہ اور عنایت کا شکر گذار ہوں۔ بفضلہ تعالیٰ صحت روبہ ترقی ہے۔ دعوات صالحہ سے فراموش نہ فرمائیں۔ والسلام

ننگِ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ

دارالعلوم دیوبند

۵ ربیع الثانی ۱۳۷۷ھ (م ۳۰ اکتوبر ۱۹۵۷ء)

(الجمعیۃ-دہلی (شیخ الاسلام نمبر): ۱۹۵۸ء، ص ۱۶۵)

حضرت شیخ الاسلام کا ایک معلومات افزا مکتوب گرامی:

• ۱۰ نومبر ۱۹۵۷ء: حضرت کا یہ خط مولانا احمد اللہ صاحب برن پور بردوان کے نام ہے اور ان کے مدرسۂ عربیہ کے دستور پر رائے گرامی اور ان کی بہن کے حج سے بہ خیریت واپسی پر اظہارِ مسرت کے مضمون میں ہے۔ یہ خط حضرت کی وفات سے تقریباً ایک ماہ قبل کا ہے۔ اس سے حضرت کی بیماری اور صحت کی کیفیت پر روشنی پڑتی ہے۔ اس حالت میں بھی حضرت اپنے وابستگان سے بہ ذریعہ مراسلت تعلیم وتربیت اور مشورہ وہدایت کا تعلق رکھتے تھے۔ حضرت کا خط مبارک یہ ہے:

محترم المقام زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

والا نامہ مورخہ ۲۵ اکتوبر باعثِ سرفرازی ہوا، احوال مندرجہ سے آگاہی ہوئی۔ اگرچہ میرا مرض زایل نہیں ہوا مگر تخفیف ضرور ہے۔ روزانہ نقل وحرکت پر سانس چڑھ جاتا

ہے۔ آپ حضرات کی دعاؤں اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کا سخت محتاج ہوں۔ مسجد میں نماز جماعت کے لیے جانا شروع کیا تھا، سانس چڑھنا معالجین نے دیکھا تو منع کر دیا اور بہ تاکید کہہ دیا کہ مہمان خانے میں ہی پنج وقتہ جماعت کیا کر۔ چناں چہ اسی پر عمل ہے۔ علاج اور پرہیز جاری ہے۔

آپ کے مدرسے کا دستور اور تفصیلی خاکہ بھی دیکھا۔ بعض چیزوں میں الجھن بھی ہوئی۔ مگر اتنی دوری پر کس طرح گفت وشنید ہوسکتی ہے۔ اگر زندگی ہے اور اجتماع کی نوبت آئی تو دیکھا جائے گا۔ ماشاء اللہ مدرسہ ترقی عمدہ طور پر کر رہا ہے۔ اللہم زد فزد۔

ہمشیرہ صاحبہ کی حج سے بہ خیریت واپسی پر خوشی ہوئی، اللہ تعالیٰ قبولیت سے نوازے آمین۔ ان کو اسم ذات چھ ہزار یا پاس انفاس بتلا دیجیے۔ آپ کے استاذ صاحب اگر مداومت ذکر پر کرتے ہیں تو بارہ تسبیح اور پاس انفاس بتلا دیجیے۔

والسلام

ننگِ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ - دیوبند

۱۶؍ربیع الثانی ۱۳۷۷ھ (م ۱۰؍نومبر ۱۹۵۷ء)

دل صد پارہ کی داستان قاش قاش فروشی و تیمارداری

چشم گریاں کے چند آنسو

ایامِ علالت اور مرض الوفات کی تفصیلات

"اس مضمون سے صرف حضرت قطب عالم شیخ الاسلامؒ ہی کی یاد تازہ نہیں ہوگی، بلکہ یہ مضمون پرانے رفیق مولانا وحید احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی یاد بھی تازہ کر رہا ہے جو تقریباً بیس سال ہوئے وفات پا چکے، مولانا وحید احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ حضرت شیخ الاسلام قدس اللہ سرہٗ العزیز کے برادر زادے تھے۔ چوں کہ اپنے والد کی وفات کے بعد بچپن سے حضرت شیخ الاسلامؒ کے زیرِ تربیت اور حضرت قدس اللہ سرہٗ العزیز کے ہم دم رہے تھے، حتیٰ کہ اسارتِ مالٹا کے زمانے میں بھی ساتھ نہیں چھوٹا۔ اس لیے حضرت کو ان سے بہت زیادہ تعلق خاطر تھا۔

یہ مضمون نگار (مولوی رشید احمد صاحب وحیدی) انھیں کے صاحب زادے ہیں۔ آپ معاف فرمائیں اگر کہیں اس مضمون میں بے ربطی اور انتشار محسوس کریں۔ ایک نوخیز فراق زدہ جس کا دل و دماغ صدمے سے پراگندہ ہے، جمعیت خاطر کہاں سے لائے۔ البتہ جن کو محبوب کی طرح ذکرِ محبوب بھی محبوب ہے وہ اس کی قدر کریں کہ بلا تصنع نہایت سادگی کے ساتھ وہ حالات ان کے سامنے آئیں گے جن کے وہ مشتاق ہیں اور جو ایک سوانح نگار کے لیے انمول موتی کی قیمت رکھتے ہیں۔" (الجمعیۃ)

جمعہ کا دن تھا اور اگست کی ابتدائی تاریخیں کہ ڈیڑھ ماہ کا پروگرام صرف ۲۲ دن میں ختم فرما کر حضرت مدراس سے واپس ہوئے۔ ہمیں خوشی بھی تھی، مگر خوشی سے زیادہ حیرت اور تعجب۔ اپنی زندگی کے ۲۵ سال اسی در پر گزرے، حضرت کو قریب و دور سے دیکھا، نہ

قریب جا کر مقام کی بلندی کا کچھ پتا چلا، نہ دور سے اس آفتاب و مہتاب کی منور کرنوں کی ماہیت کا اندازہ ہوا۔ لیکن ظاہر میں نگاہوں نے جو کچھ بھی مشاہدہ کیا اسی بنیاد پر یہ چند سطور سپرد قلم کر رہا ہوں۔ زندگی کے من جملہ اور حیرت انگیز گوشوں کے ایک گوشہ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ کیسے سخت سے سخت موقع ہو، گھر میں مریض جاں بہ لب ہو، برسات کی لگاتار جھبڑی یا موسم سرما کی طوفانی سرد ہوائیں ہوں، غرض کوئی بھی چیز امام زمانہ شیخ وقت حضرت اقدس کے طے شدہ پروگرام میں رخنہ نہیں ڈال سکتی تھی اور نہ ہی متعینہ پروگرام میں کبھی تنسیخ کا سوال پیدا ہوتا تھا۔ اس صورت میں تقریباً بیس بائیس دن قبل واپسی پر ہم سب کا متحیر ہونا لازمی تھا۔ مگر جلد ہی یہ حیرت ختم ہوگئی اور اس کے بجائے فکر نے دل و دماغ کے ہر گوشے پر تسلط کر لیا۔ کیوں کہ رفیق سفر مولانا اسعد صاحب مدظلہ سے معلوم ہوگیا کہ حضرت کی طبیعت اس درجے خراب ہوگئی کہ آیندہ سفر جاری رکھنا نہ صرف دشوار تھا بلکہ خطرناک بھی تھا۔ اس وقت شکایت صرف یہ تھی کہ زیادہ چلنے یا تقریر کرنے سے سانس پھولنے لگتا ... کی وجہ سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ مجبور ہو کر بیٹھ جاتے تھے۔ اگرچہ اس خبر وحشت اثر سے دلوں کو تکلیف ضرور پہنچی، مگر یہ کہ حضرت مدظلہ العالی کو اب حضرت رحمۃ اللہ علیہ کہنا پڑ گیا۔ اس کا تصور بھی ذہن کے کسی گوشے میں نہیں آسکتا تھا۔ مدراس سے واپسی پر دہلی سے حکیم ظہیر الدین صاحب برکاتی ٹونکی اور حکیم جلیل صاحب و حکیم اسماعیل صاحب کا تجویز کردہ نسخہ حضرت ساتھ لائے تھے۔ ان حضرات نے پوری توجہ سے معاینہ فرما کر نسخہ تجویز فرمایا تھا۔ دیوبند پہنچ کر اس کا استعمال شروع کر دیا۔ تین چار روز بعد حکیم برکاتی صاحب اور حکیم جلیل صاحب دیوبند تشریف لائے اور دوبارہ معاینہ فرما کر نسخے میں ترمیم فرمائی۔ مگر کوئی خاطر خواہ افاقہ محسوس نہ ہوا۔ اس کے علاوہ بعد مسافت کے باعث وقت پر مشورہ بھی ناممکن تھا، لہٰذا مقامی سول ہسپتال کے ڈاکٹر جناب سبحان علی صاحب کی طرف رجوع کیا گیا۔ حضرت نے باوجود اس تکلیف کے سفر سے آتے ہی سبق شروع فرما دیے تھے۔ یوں تو ہمیشہ ہفتوں اور مہینوں کے سخت ترین سفر کے بعد بھی دیوبند پہنچ کر سبق یا دوسرے معمولات میں کوئی فرق نہ آتا تھا۔ انتہا یہ کہ اگر کبھی خاص سبق کے وقت تشریف لاتے اور طلبہ دورۂ حدیث درس گاہ میں موجود نہ ہوئے تب بھی فوراً طلب فرماتے اور دس بیس جو کچھ پہنچ جاتے درس شروع فرما دیتے۔ مگر اس سفر کے بعد مولانا اسعد صاحب و اہلیہ محترمہ اور سب خدام کا اصرار یہی تھا

کہ حضرت کچھ دنوں آرام فرمائیں اور مکمل آرام کے بعد سبق پڑھائیں۔ مولانا اسعد صاحب نے بہ اصرار حضرت سے گزارش کی، مگر حضرت برابر سبق پڑھاتے رہے۔ آخر کار آٹھ نو دن کے بعد جب تنفس کی شکایت سے بالکل مجبور ہوگئے تو بڑے دکھ کے ساتھ مدرسے سے باضابطہ چھٹی لے لی۔ ڈاکٹر سبحان علی صاحب ہی کی تجویز سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ سہارن پور تشریف لے گئے تاکہ وہاں ایکسرے کرائیں۔

اسی سفر میں حضرت، حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری سے ملاقات کے لیے رائے پور تشریف لے گئے اور واپسی میں بھٹ میں جناب شاہ مسعود صاحب رئیس بھٹ کے اصرار پر ایک شب قیام فرمایا، دوسرے دن واپس تشریف لائے۔

ایکسرے کے نتیجے میں یہ بات صاف ہوگئی کہ پھیپھڑے میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ البتہ گردے میں خرابی ہے جس کی وجہ سے نہ قلب کو صاف خون ملتا ہے اور نہ قلب پوری طرح عمل کرتا ہے، جس کی وجہ سے بلڈ پریشر بھی ہائی ہے۔ اس درمیان میں حضرت اسباق و سفر کے علاوہ خطوط کے جوابات، تصنیف و مطالعہ وغیرہ کچھ کرتے رہے اور نماز کے لیے مسجد تشریف لے جاتے رہے۔ جملہ معمولات بدستور جاری رہے، لیکن بعد میں ڈاکٹروں کے شدید اصرار پر مشاغل ملتوی فرمائے۔ حضرت کے لیے اس سے زیادہ تکلیف دہ اور کوئی چیز نہ تھی کہ ان کو ان مشاغل سے روک دیا گیا جن کو آپ حاصل زندگی تصور فرماتے تھے۔ کڑوی سے کڑوی دوا آپ کے لیے قابل برداشت تھی۔ ایک خاص قسم کا نمک جو قلب کے لیے مفید سمجھا جاتا ہے جس کی شوریت کا یہ عالم کہ ایک لقمہ منہ میں رکھنا کام و دہن کی آزمائش تھی۔ وہ سب برداشت، مگر ترک مشاغل ناقابل برداشت۔ بہ ہر حال بیٹھ کر نماز پڑھنے کی شرط تو ایک روز کے لیے بھی تسلیم نہیں کی۔ باقی اور مشاغل پندرہ روز کے لیے ترک فرمادیے۔ آج جب کہ صحیح حالات قلم بند کیے جا رہے ہیں تو یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ اس پندرہ روزہ آرام کے زمانے میں بھی یہ کتابیں جو قریب کی الماری میں رکھی تھیں مطالعہ فرمائیں، یعنی حکیم الامت (از مولانا عبدالماجد صاحب)، محمد علی کی ذاتی ڈائری (از مولانا عبدالماجد صاحب)، حیاتِ شبلی (از سید سلیمان صاحب ندویؒ) کا مکمل مطالعہ فرمایا۔ اس کے علاوہ مختلف شروح ترمذی و بخاری اور علم عقاید میں نبراس وغیرہ کا مطالعہ فرماتے رہے۔ ایک بار میں حاضر ہوا تو چھوٹے صاحب زادے عزیزم ارشد سلمہٗ کی درسی کتابوں میں سے مرقات

(منطق) مطالعہ فرمار ہے تھے۔ یہاں تک کہ اسے بھی مکمل کرلیا۔ ایک میز چارپائی کے پاس رکھوالی تھی، اس پر خطوط وغیرہ اور تعویزوں کا فایل تھا۔ مطالعے سے فراغت پاتے ہی خطوط کے جواب لکھتے، بعض تصانیف اور طلبائے دارالعلوم کی درخواستیں ملاحظہ فرماتے، اس پر حسب ضرورت سفارش اور نوٹ لکھتے تھے، غرضے کہ کسی وقت بھی اس آرام کے زمانے میں ایسا نہ دیکھا کہ حضرت چپ چاپ تکیہ پر سر رکھ کر آرام فرما رہے ہوں۔ ہم میں سے ہر ایک حاضر ہوتا اور دل میں یہ تمنا ہوتی کہ کوئی ضرورت یا کسی چیز کی حاجت ہو تو پوری کر کے شرف خدمت حاصل کرے، مگر دس بارہ منٹ خاموش کھڑے رہنے کے بعد بھی جب مخاطب کرنے کی ہمت نہ ہوتی تو زور زور سے سانس لیتا یا آہستہ سے کھانستا۔ مگر مطالعے کی ہمہ تن مشغولیت کا یہ عالم ہوتا تھا کہ کتاب سے نظر ہٹنی ہی مشکل تھی۔ بڑی ہمت سے اگر کوئی پوچھ لیتا کہ حضرت مزاج کیسا ہے تو حسبِ عادت فرماتے الحمدللہ! بہت اچھا ہوں اور پھر کتاب دیکھنے لگتے۔

ایک ہفتہ بہ ظاہر محنت اور کہنے کو آرام کے بعد باہر تشریف لانے کا ارادہ ظاہر فرمایا۔ مگر معالجین کو اس معمولی آرام پر اطمینان نہ ہوا تو انھوں نے اُن کی میعاد اور بڑھادی، جسے منظور فرمالیا۔ مگر اس آرام کے زمانے میں برابر چارپائی سے اٹھ کر اپنے حجرۂ مبارک تک تشریف لاتے اور وہاں گھنٹوں کام کرتے، اس کے علاوہ تخت پر نماز کے لیے تشریف لاتے، یہی نہیں بلکہ برابر کھڑے ہو کر فرایض کے علاوہ سنت نفل اور تہجد ادا فرماتے رہے۔ دو ہی چار دن گزرے ہوں گے کہ باہر تشریف لانے پر پھر اصرار شروع فرمایا۔ اہلیہ محترمہ اور صاحب زادہ مولانا اسعد صاحب برابر فرماتے رہے کہ کچھ دن انتظار فرمائیں۔ طبیعت کچھ ٹھیک ہونے پر ضرور باہر تشریف لے جائیں۔ لیکن اگر ایک طرف مہمانانِ کرام کے سینوں میں شوق زیارت کا شعلہ جوالہ سلگ رہا تھا، اگر ایک طرف دور دراز سے آنے والی بے تاب نگاہیں اپنے پیر و مرشد کے منور چہرے کی بے تحاشہ متلاشی تھیں، اگر ایک طرف مخلصین اور محبین کا سینہ محبت و عقیدت، جدائی کی بھٹی میں سلگ سلگ کر صرف ایک نظر دیکھ لینے کی آرزو کر رہا تھا تو دوسری طرف مہمان نوازی میں سنت ابراہیمی کا عامل، اخلاق و محبت کا پیکر، مخلصین کے اخلاص کا قدرداں، محبین کے مرض روحانی کا معالج خود بھی ان سے ملنے کو بے قرار تھا۔ پھر کیوں وہ اس نقصان کو خاطر میں لاتا جو ہماری ظاہر بین نگاہیں باہر نکلنے میں

محسوس کررہی تھیں۔ ویسے تو صبح ہی صبح نماز و وظائف سے فارغ ہوکر مطالعہ فرماتے رہتے اور ملنے والوں میں سے جس کو اندر جانے کا موقع ملتا، بڑے زور سے فرماتے "دیکھو بھائی مسجد کس قدر قریب ہے، مگر مجھے ڈاکٹر اور حکیم نے مسجد تک جانے سے روک دیا ہے، یہاں تک کہ باہر جانے کی اجازت نہیں دیتے کہ میں مہمانوں کے ساتھ باہر ہی جماعت کرلیا کروں۔" ایک دن ظہر کی نماز پڑھ کر بغیر کسی کو اطلاع کیے ہوئے چپکے سے باہر آگئے بجلی کی طرح یہ خبر پھیل گئی اور تھوڑی ہی دیر میں مہمانوں کے علاوہ شہری حضرات اور طلباے کرام کا ہجوم ہوگیا۔ حضرت نہایت شفقت سے فرمارہے تھے بھائی! بیٹھ جاؤ، کھڑے نہ رہو، لیکن اتنے دِنوں کے بعد حضرت کو دیکھ کر کس کو ہوش تھا جو آپ کا فرمان سنتا۔ اس کے بعد برابر حضرت اقدس عصر کے بعد مہمانوں کی خاطر باہر تشریف لاتے اور مغرب تک قیام فرماتے۔ اس کے علاوہ مسجد میں تشریف لے جاتے تھے۔ غرضے کہ حالت بہت اطمینان بخش ہوگئی تھی۔ ہم سب بیماری کو تقریباً فراموش کرچکے تھے۔ خود حضرت نے ایک وقت متعین فرمالیا تھا کہ فلاں دن سے سبق پڑھاؤں گا۔ رشد و ہدایت کا سلسلہ یوں تو آخر دم تک جاری رہا، جیسا کہ آگے آئے گا۔ مگر کبھی کبھی خصوصی طور پر عام مجلس میں بہت زور دے کر مختلف طریقے سے لوگوں کو سمجھاتے رہے۔ اس درمیان میں ایک مرتبہ جناب ڈاکٹر عبدالعلی صاحب اور ان کے برادر ہندوستان کی مشہور ہستی جناب محترم مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی اور ڈاکٹر صاحب کے صاحب زادے محترم محمد حسنی تشریف لائے۔ درمیان گفتگو میں حضرت نے محمد حسنی صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علی میاں سے مخاطب ہوئے "آج کل آپ کیا رہے ہیں؟" حضرت اپنے مخصوص محبین کے اخلاص و محبت کو بڑی حد تک محسوس فرماتے تھے اور ایسے لوگوں سے جب ملاقات ہوتی تو عورتوں، بچوں تک کے بارے میں اطمینان بخش طریقے سے خیریت دریافت فرماتے۔ ایک بار جس نے دامن پکڑلیا، پھر وہ خواہ کتنا ہی کھنچتا چلا جائے یا کسی قدر تغافل برتے، سال ہا سال کے بعد بھی صورت دیکھ کر دیدہ و دل فرش راہ کرنے کو تیار ہوجاتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ جیسا کہ دنیا دیانت داری اور ایمان داری سے اس بات کی معترف ہے کہ حضرت لوگوں کی اصلاح اور ان کے معاملات کی درستگی، اخلاق کی پاکیزگی، عقاید کی صحت، یہاں تک کہ ان کے آپس میں اتفاق و محبت کی خواہش میں حرص کی حد تک بے قرار و مضطرب رہتے۔ قارئین کرام پھر اصل واقعے

کی طرف آئیں، محترم علی میاں ندوی نے عرض کیا کہ حضرت ان کو میں نے کچھ عربی وغیرہ سکھادی تھی، اب ماشاء اللہ ایک رسالہ عربی ہی ''البعث'' کے نام سے نکال رہے ہیں۔ حضرت نے پوچھا ''اس کی اشاعت کا کیا حال ہے؟'' علی نے عرض کیا حضرت ہندوستان میں تو کم، مگر غیر ممالک اور بالخصوص عربی ممالک میں اشاعت کافی ہے۔ حضرت نے فرمایا، ان کو اپنے مدرسے (ندوۃ العلماء) میں کیوں نہیں لے لیتے۔ آج کل مدرسوں کی بقا اور اس کی ترقی کا خیال نہایت ضروری ہے، ماشاء اللہ یہ اس قابل ہیں کہ کتابیں پڑھا سکیں۔ علی میاں نے عرض کیا مگر حضرت میں اس دن سے ڈرتا ہوں کہ لوگ طعنہ دیں، جیسا کہ بالعموم اس صورت میں بعض سنجیدہ طبقے میں بھی اس پر چہ میگوئیاں ہوتی ہیں کہ اپنے ہی اہل خاندان کو قومی ادارے سے فایدہ پہنچایا جارہا ہے۔ یہ سن کر حضرت ایک دم سنبھل کر بیٹھ گئے اور ہمہ تن متوجہ ہوکر فرمایا کہ بھائی! قوم وملت کے لیے اوران کی فلاح وبہبود کی خاطر سب کچھ برداشت کرنا چاہیے، بے شک دین کی اشاعت پیش نظر ہونی چاہیے۔ پھر کسی کے کہنے کی مطلق پرواہ ہونی چاہیے، دنیا والوں کی زبان کون بند کرسکتا ہے؟ آپ اپنے مدرسے کی خدمت اور اس سے ہونے والی دین کی اشاعت کا جایزہ لیں اور فوراً صاحب زادے کے سپرد کچھ کتابیں کردیں۔ علی میاں نے عرض کیا، خیال ہے کہ بلا معاوضہ شروع کرادوں، یہ سنتے ہی حضرت نے چونک کر فرمایا ہرگز نہیں، بلا معاوضہ خدمت لینے سے مدرس کو ذمے داری کا احساس مطلق باقی نہیں رہتا، آپ ہر طرف سے بے نیاز ہوکر ان کو کتابیں دے دیجیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غیروں کے علاوہ اپنوں سے کب محفوظ رہے، اس کے بعد عربی کا یہ جامع شعر پڑھا:

ما نجا اللّٰه والرسول معاً
من لسان الوریٰ فکیف انا

بھائی! ہماری تو کوئی حیثیت نہیں ہے، دنیا تو اللہ اور رسول پر زبان درازی کرنے سے نہیں چوکتی۔ غرض کہ اس قسم کی محفلیں طالبان ہدایت کے لیے روزانہ ہی قایم ہونے لگی تھیں۔ مگر آہ! کیا بدنصیب تھا وہ وقت، وہ ساعت، وہ لمحہ جب کہ اچانک دوبارہ تنفس کا حملہ ہوا۔ صد حسرت وافسوس اس بار کا حملہ جان لیوا ہی ثابت ہوا۔ ویسے تو اس درمیان میں بھی برابر اثر رہا۔ مگر صرف اس حد تک کہ صبح کو پندرہ بیس منٹ کے لیے ہوگیا اور پھر دن بھر آرام

رہتا تھا۔ایک بار حکیم صدیق حسن صاحب بریلوی کا علاج شروع ہوا، موصوف کے نسخے سے مرض میں کافی افاقہ ہو گیا۔حکیم صاحب نے بھی آرام ہی پر زیادہ زور دیا، اس لیے حضرت نے باہر نکلنا ترک فرمادیا اور اندر ہی رہ کر تمام معمولات پورے فرماتے رہے۔نماز اب بھی باہر پڑھتے تھے، مگر بجائے مسجد جانے کے باہر ہی مہمان خانے میں کافی لمبی جماعت ہو جاتی تھی، مگر حضرت مدظلہٗ برابر اظہار تاسف فرماتے تھے اور اکثر فرماتے افسوس مسجد اتنی قریب ہے پھر بھی مجھے روکا جا رہا ہے۔حالت بہتر صورت اختیار کر رہی تھی۔حکیم صدیق صاحب دو چار روز رہ کر واپس تشریف لے گئے، اسی وقت میں مجھے دارالعلوم کے کتب خانے سے کوئی کتاب غالباً (اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ) نکلوانی تھی۔حضرت اپنے کمرے میں مصروفِ مطالعہ تھے، میں حاضر ہوا، ڈرتے ڈرتے عرض کیا، حضرت ایک سفارش لکھ دیں، کتاب مل جائے گی۔آہ آپ نے اپنے مخصوص انداز میں تیز مگر نہایت شفقت آمیز اور ملایم لہجے میں فرمایا، گدھا ہو گیا ہے، میرے نام پر کتابیں لیتا ہے اور گم کر دیتا ہے۔(گزشتہ سال یہ واقعہ ہو چکا تھا، مگر پھر گم شدہ کتاب مل گئی تھی) میں نے عرض کیا، حضرت اب میں پوری ذمے داری کے ساتھ حفاظت کروں گا۔حضرت نے درخواست لے لی، پڑھی، دستخط فرمائے، کتاب مل گئی۔آہ! بے درد موت تو نے ہم سے کس قدر انمول خزانہ چھین لیا۔تو نے اپنے دامن علم و عمل، کمال و ہنر، فضل و تقویٰ کے جواہرات سے بھر لیا اور ہم تشنگان تہذیب و اخلاق کو روتا تڑپتا چھوڑ کر اپنی سنگ دلی کا ثبوت دیا۔اب نہ محبت سے وہ ڈانٹ سننے کو ملے گی، نہ دل جوئی اور خاطر داری کرنے والی نگاہیں۔ایک عجیب مسکراہٹ کے ساتھ جس میں ایک طرف لطف اندوزی کی کیفیت ہوتی تو دوسری جانب اصلاح کا خیال پوشیدہ، چھوٹی بڑی باتوں پر فرماتے گدھا کہیں کا، بے وقوف ہو گیا ہے۔

صاحب زادہ ارشد سلمہ کوئی ضد کرتے اور مچل مچل کر ابا جی! میرے ابا جی! اور ابا جی — ہاتھ سے ہٹاتے ہوئے فرماتے ہٹ جا بے وقوف کہیں کا۔کبھی کبھی فرماتے جا اپنی آپا (والدہ محترمہ) سے مانگ لے۔صاحب زادے اس پر بھی ضد کرتے، اچھا آپ ان سے کہہ دیں، میں بلا کر لاتا ہوں، اور جھٹ جا کر کہتے آپا ابا جی بلا رہے ہیں۔اتنی دیر میں حضرت مطالعہ میں مصروف ہو جاتے اور جب آپا آ جاتیں تو فرما دیتے دیکھو یہ گدھا کیا کہتا ہے، مجھے تنگ کر رہا ہے۔آپا اسے زور سے گھورتیں، مگر ضد اور اصرار کا اتنا بڑا سہارا، اتنا

خلیق باپ جس کو نصیب ہو، وہ کس کی کب پروا کرتا۔ قیمتی سے قیمتی بڑی سے بڑی چیز ذرا سے اصرار پر حضرت بچوں میں سے کسی کے حوالے فرما کر اپنے سر سے بہت بڑا بوجھ اتار دیتے تھے۔ ایام علالت میں افریقہ سے کوئی صاحب گھڑی لائے جو دیں ہے کسی نے دی تھی۔ یہ گھڑی کم از کم اس ماحول میں عجیب تھی، حضرت نے قبول فرمائی اور تکیے کے نیچے رکھ لی۔ عزیزم ارشد سلمہٗ کو پسند آگئی اور بلا کسی پس و پیش کے تکیے کے نیچے سے نکال کر جیب میں لگالی، حضرت کو خیال بھی نہیں آیا۔

آہ! حضرت کی مبارک زندگی کے کس کس پہلو کو یاد کیا جائے، کس کس گوشے کو اجاگر کیا جائے۔ صحیح معنوں میں صحابہؓ کے اخلاق، ایثار، طہارت و عبادت، حب وطنی، فریفتگی دینی کا نمونہ دیکھنا ہوتا تو اس دور میں نائب رسول اکرم شیخ العرب والعجم امام حدیث حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھ لیتے۔ ان ایام میں جب حضرت باہر تشریف لانے لگے تھے، نماز ظہر جماعت سے ادا کرنے کے بعد، مغرب کے بعد تک باہر قیام فرماتے تھے، عصر بعد عام اجتماع ہو جاتا تھا اور اس اجتماع میں ہر شخص کو حق تھا کہ اپنی صلاحیت یا اپنی ذوق کے مطابق جو ضرورت پیش کرنی چاہے پیش کر دے۔ ایک صاحب نے عرض کیا حضرت بہت دنوں سے تمنا ہے کہ آپ ہمارے گاؤں تشریف لے چلیں۔ حضرت نے بہت آہستگی سے فرمایا، بھائی میری خوش نصیبی ہے کہ اللہ پاک نے مجھے آپ لوگوں کی خدمت کا موقع دیا ہے مگر میری مجبوری اس سعادت میں مانع ہے، فرمایا بھائی میں تو خود مجبور ہو رہا ہوں۔ ان شاء اللہ بہ شرط صحت و زندگی ضرور آپ کے یہاں آؤں گا۔ اس محبت بھرے جواب نے وہ ایسا محبت وعقیدت اور مسرت و سرور سے بھرپور مجلس سے اٹھا کہ اس وقت کی لذت تا حیات فراموش نہ کر سکے گا۔ بعض مخلصین جس میں سے مولانا اسعد صاحب، مولوی سلطان الحق صاحب ناظم کتب خانہ دار العلوم وغیرہ کو درخواستوں کی بے موقع اور بے محل کی تکلیف نہایت شاق گزرتی تھی یہ اشاروں سے منع کرتے تھے۔ ایک روز جب اشارے سے بھی کام نہ چلا تو مولانا سلطان الحق صاحب نے ہمت کر کے زور سے فرمایا بھائی اب تو حضرت کو آرام کر لینے دو۔ آہ! صرف ایک جواب جو حضرت نے خدام کی محبت کو ملحوظ رکھ کر نہایت شفقت سے عنایت فرمایا تھا روزانہ کی کش مکش کے لیے کافی اور آئندہ کے لیے مسکت ہو گیا، فرمایا بھائی دنیا آرام کی جگہ تھوڑی ہے، یہاں آرام کے لیے نہیں پیدا ہوئے ہیں۔ اس ایک

جواب میں نصیحت تھی، طالب علم کے لیے تالیف قلب کا سہارا تھا اور خدام کو خدمت خلق اور محبت خلق کا ایک سبق تھا۔ ان دنوں میں ہندو اور مسلمان ضرورت مند تعویذوں کی درخواست بھی پیش فرماتے رہے۔ حضرت غایت محبت وشفقت سے اس قسم کی درخواستیں مولانا اظہر صاحب بہاری فاضل دار العلوم (مجاز حضرت) کے حوالے فرما کر نقش کے متعلق کچھ ہدایات فرما دیتے وہ حسب ضرورت تعویز عنایت فرما دیتے۔ اللہ اللہ! آخری وقت تک بیماری کی شدت کے باوجود اخلاق ومحبت کا یہ پیکر، انسانیت وشرافت کا حامل سیرت محمدی کا نمونہ پیش کرتا رہا۔ بعض اوقات سانس کی تکلیف بیٹھنے کی وجہ سے سخت ہو جاتی، مگر مغرب تک بیٹھنا ضروری تھا۔

بہ ہر حال مقدرات میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ معالج خوش تھے کہ علاج کامیاب ہے، صحت دن بہ دن ترقی کر رہی ہے۔ اب ترقی صحت کی رفتار تیز کرنے کے لیے نسخے میں ترمیم کرنی چاہیے۔ ترمیم کی گئی، مگر کیا معلوم تھا کہ مقدرات میں کوئی ترمیم نہیں ہو سکتی۔ دفعۃً مرض میں زیادتی ہوئی اور اس قدر زیادتی ہوئی کہ دن رات کا چین ختم ہو گیا۔ آہ! جس شخص کی لغت میں "آرام" محض مہمل اور بے کار لفظ تھا، وہ اب مجبور اور لاچار تھا اور غیر اختیاری طور پر چارپائی پر پڑا رہنے پر مجبور تھا۔ مگر یہ مجبوری صرف ان کاموں میں تھی جن کا تعلق اسباب دنیا سے تھا، کیوں کہ جس مقدس مشغلے میں حضرت کی زندگی کا ایک ایک سانس گزرتا تھا وہ اب بھی بدستور، بلکہ روزافزوں ترقی پر تھا اور ہمہ وقت ذکر وتسبیح توبہ واستغفار میں گزرتا تھا۔ سنتوں اور مستحباب تک کی پابندی بدستور تھی۔ اب کمزوری کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ سہارے کے بغیر نہ اُٹھ سکتے تھے اور نہ بیٹھ سکتے تھے۔ مگر غذا کے وقت تکیے سے الگ ہو جانا ضروری تھا۔ سب کا اصرار ہوتا کہ ٹیک ہی لگا کر کھانا تناول فرما لیں، مگر صاف فرما دیتے "نہیں بھائی یہ چیز سنت کے خلاف ہے" اور اپنے سہارے پر کھانا تناول فرماتے۔

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب تشریف لائے، اندر آتے ہی ان دونوں بزرگوں نے نظروں ہی نظروں میں کیا باتیں کیں، ان کو تو خدا جانے یا خدا کے یہ ولی، ہم نے تو اتنا سنا کہ حضرت نے فرمایا، حضرت آپ نے کیوں تکلیف فرمائی۔ آپ کی وہاں سے دعا ہی کافی تھی۔ شیخ الحدیث صاحب مدظلہٗ نے فرمایا، حضرت اللہ پاک آپ کا سایۂ مبارک قائم رکھے۔ کوئی تکلیف مجھے نہیں ہوتی۔ حضرت ایام علالت میں کبھی راضی نہ ہوئے کہ بستر

پر نماز پڑھیں۔ نہ تیمم کے لیے کبھی تیار ہوئے۔ مگر ڈاکٹر اور گھر والے برابر اصرار کر رہے تھے۔ جب حضرت نے اصرار کی شدت دیکھی تو شیخ الحدیث صاحب سے فرمایا دیکھیے ان لوگوں نے مسجد چھڑا دی، جماعت چھڑا دی۔ اب بستر پر نماز کے لیے کہہ رہے ہیں، کیا حکم ہے۔ حضرت شیخ الحدیث صاحب نے فرمایا کہ حضرت میرے خیال میں تو کوئی حرج نہیں ہے، سطح برابر ہے اور نماز کے لیے اتنی شرط کافی ہے۔ پھر تیمم کے لیے حضرت نے دریافت فرمایا۔ اس پر انھوں نے فرمایا کہ پانی سے چوں کہ نقصان نہیں ہوتا، صرف نقل و حرکت میں دقت ہوتی ہے، اس لیے مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ اللہ اللہ الحب للہ کی اس سے اچھی مثال اور کہاں ملے گی جو ہمارے بزرگ پیش کر سکتے ہیں۔ عشق و محبت کے حدود شریعت و احکام خداوندی کے حدود سے کبھی متجاوز نہیں ہو سکتے۔ ۲۷ر نومبر کو طبیعت بہت زیادہ خراب ہوگئی۔ تو مولانا اسعد صاحب نے حکیم ذکی احمد صاحب دہلوی کو فون کیا۔ موصوف شام تک تشریف لائے۔ حضرت نے پوری تفصیل سے تمام احوال سنائے۔ انھوں نے حکیم صدیق صاحب کے ایک نسخے سے موافقت فرمائی۔ مگر غذا میں دو ایک چیزیں اور بڑھا دیں۔ اس کے علاوہ حکیم جلیل صاحب دہلوی کے مشورے سے دو ایک طاقت کی دوائیں بھی تجویز فرمائیں۔ اگلے روز شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب ڈاکٹر برکت علی صاحب کو سہارن پور سے اپنے ہم راہ لے کر تشریف لائے۔ ڈاکٹر صاحب نے پون گھنٹے تک معاینہ کیا۔ نسخہ تجویز کیا مگر ان کو حیرت تھی کہ حضرت کس طرح زندہ ہیں۔ کیوں کہ ان کے نزدیک طبی لحاظ سے زندہ رہنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ بہ ہر حال یہ تو معلوم ہی ہو چکا کہ اس تمام عرصے میں کبھی چار پائی پر نماز نہیں پڑھی، بڑی دقت اور مشکل سے جب کہ کروٹ لینا سخت دشوار تھا، قریب کی چوکی پر تشریف لے جاتے اور وضو فرما کر بڑی بڑی سورتوں سے نماز ادا فرماتے۔ ۳۰ر نومبر کا واقعہ ہے کہ فجر کی نماز پڑھ رہے تھے، غالباً فرض کی دوسری رکعت تھی۔ میں قریب ہی کوئی کام کر رہا تھا۔ مولانا اسعد صاحب کہیں باہر سے تشریف لائے اور اندر قدم رکھتے ہی چیخے دیکھو، دیکھو، میں گھبرا کر مڑا اور ایک عجیب افسوس ناک واقعہ دیکھا کہ ایک لمحے میں جب تک ہم دوڑ کر قریب پہنچیں حضرت تخت کے نیچے گر چکے تھے۔ میں اور مولانا اسعد صاحب نے بڑھ کر اٹھایا۔ زبان مبارک پر اللہ اللہ جاری تھا۔ کھانسی کی شدت سے سانس رکنے لگا تھا۔ مولانا عزیز احمد قاسمی نے پیر پر اور جلدی جلدی میں نے پشت پر اور مولانا اسعد

صاحب نے سینے پر ہاتھ پھیرا اور جب کچھ سکون ہوا تو مولانا اسعد صاحب نے عرض کیا حضرت چارپائی پر تشریف لے چلیں، پوچھا نماز کا وقت ہے، عرض کیا گیا جی ہاں ہے، فوراً نیت باندھ لی اور اطمینان سے اسی طویل قرأت اور طویل رکوع وسجدوں کے ساتھ فرض ادا کر کے بستر پر تشریف لے گئے۔ مولانا عزیز احمد صاحب نے پوچھا، حضرت آپ کو کچھ محسوس ہو رہا تھا، فرمایا بھائی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا، اس لیے میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ صرف اتنا یاد پڑتا ہے کہ تخت زور زور سے گھوم رہا ہے۔ ادھر مدراس سے واپسی ہی پر صاحب زادے مولانا اسعد صاحب نے ایک خیال یہ بھی ظاہر فرمایا تھا کہ حضرت پر جادو کا اثر ہے۔ پھر مختلف قرائن سے یہ چیز پایۂ ثبوت کو پہنچتی رہی۔ اس سلسلے میں بھی مختلف عامل لگے ہوئے تھے اور برابر عمل کر رہے تھے۔ پندرہ نومبر کے بعد جب سانس کی تکلیف اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ تمام رات سیدھے بیٹھ کر گزرتی تھی۔ اگر ذرا سی بھی دائیں بائیں آگے پیچھے ٹیک لگا لیتے تو فوراً سانس تیز ہو جاتا تھا، اور جب کچھ دیر سیدھے بیٹھ جاتے تو نیند کا ایسا جھونکا آتا کہ سنبھل نہ پاتے۔ آہ! ایسی قابلِ رحم حالت دیکھ کر کوئی ایسا سنگ دل بھی نہ ہوگا جس کا دل نہ پسیجے، جب حالت زیادہ خراب ہونے لگی تو مولانا اسعد صاحب نے رات میں اوقات مقرر فرمائے، تاکہ کسی وقت تنہائی نہ رہنے پائے۔ چناں چہ ایک بار اپنے وقت پر میں حاضر ہوا۔ فرمایا کیوں آیا؟ میں نے عرض کیا، حضرت میں تو روز ہی آتا ہوں، فرمایا اچھا، تیری ڈیوٹی کا وقت ہو گیا ہے۔ اچھا تجھ سے پہلے جو شخص تھا اس کو بھیج دے وہ جا کر سو جائے۔ اس پراگندہ بیانی میں ایک واقعہ اور سن لیجیے۔ محترم مولانا قاری اصغر علی صاحب دام ظلہم العالی سے اکثر و بیشتر حضرات واقف ہیں، قاری صاحب یوں تو دارالعلوم میں مدرس ہیں، مگر شروع ہی سے حضرت کے گھر پر مقیم ہیں، حضرت سے مجاز بھی ہیں، گھر کی تمام تر ذمے داری موصوف پر رہی ہے اور انھوں نے نہایت نظم وضبط سے کام کو سنبھال رکھا ہے۔ خطوط کے جوابات اور گھر کے خرچ کا حساب انھیں سے متعلق رہتا تھا۔ موصوف نے ہر قسم کے خانگی اخراجات وسامان کے فراہمی کی پوری ذمے داری خود ہی سنبھال رکھی تھی۔ حضرت مہینے کے شروع میں رُپے عنایت فرمادیتے اور وہ علی الحساب خرچ کرتے۔

۳؍ دسمبر کی بات ہے کہ صبح کے وقت قاری صاحب کی قیام گاہ میں جانے کا ارادہ کر لیا۔ ہم نے عرض کیا حضرت کیوں تکلیف فرماتے ہیں، ہم بلا لاتے ہیں، چناں چہ قاری

صاحب تشریف لائے۔ فوراً دریافت فرمایا حساب مکمل کرلیا؟ قاری صاحب نے فرمایا جی ہاں (ہر ماہ تقریباً ہزار ڈیڑھ ہزار کا حساب معمولی بات تھی)۔ حضرت نے بہت معمولی رقم عنایت فرمائی جو مشکل سے ایک دکان دار کے حساب کو کافی ہوسکتی تھی۔ قاری صاحب نے فرمایا حضرت اس میں کیا ہوگا؟ حضرت نے بڑے اطمینان و وقار استغنا و بے پروائی سے فرمایا لے جاؤ، خدا پر بھروسا رکھو، وہی پورا کرنے والا ہے۔ قاری صاحب اُٹھ کر اپنے کمرے میں تشریف لے گئے، پھر کچھ خیال آیا، مجھ سے فرمایا۔ دیکھو شیروانی میں سے بٹوا لے آؤ، میں نے بٹوا پیش کردیا۔ اس کو بالکل خالی کرلیا۔ شاید بیس پچیس رُپے نکلے ہوں گے۔ فرمایا ''لے جا قاری صاحب کو دے آ'' میں نے قاری صاحب کو جا کر دے دیے۔ اس وقت حضرت سے اگر کوئی چند آنے پیسے مانگ لیتا تو ظاہری اسباب کے طور پر چند آنے بھی نہ ملتے۔ مگر اس قسم کی کمی کا احساس ہم جیسے مادی اسباب پر سہارا رکھنے والوں کو ہوتا ہے، اس اللہ تعالیٰ کے ولی کی نگاہ حقیقت میں ان تمام مادی وسایل سے بالاتر تھی اور یہی توکل اور استغنا اس کے لیے طرۂ امتیاز تھا۔ اللہ اللہ! اس عالم میں بھی حقوق کا اتنا پاس و لحاظ تھا کہ بچوں کی بڑی سے بڑی خواہش کو نہایت خندہ پیشانی سے پورا فرما دیتے اور بچوں ہی پر کیا ہم ایسے خوش نصیب جو والد مرحوم (مولانا وحید احمد صاحب مدنی مرحوم اسیر مالٹا) کے انتقال کے بعد بہت کمسنی میں ان کے سایۂ عاطفت اور دامن شفقت میں آگئے تھے، جس شاہانہ طور پر زندگی بسر کر رہے تھے، کبھی ذہن پر کسی فکر و پریشانی کا سایہ بھی نہ پڑ سکا تھا۔ یہی نہیں بلکہ گھر کا تمام خرچ علاوہ ان کے جو ہمارے قیام دیوبند کے سلسلے میں ہوتا تھا، حضرت ہی کے ذمے تھا۔ ہمارے لیے حکم تھا کہ کبھی چھوٹی بڑی کوئی ضرورت ہو مجھ سے کہہ دو، اس میں خورد نوش کے علاوہ سامانِ تعیش کے طور پر ہر چیز شامل تھی۔ ایک روز کا واقعہ ہے، طبیعت کچھ سنبھلی تھی، حجرۂ مبارک میں کچھ تحریر فرما رہے تھے، میں حاضر ہوا۔ ایک دم نظر اٹھائی، جیسے کسی کے منتظر ہوں، فرمایا لے یہ لے جا اور چار عدد منی آرڈر فارم عنایت فرمائے جو مختلف جگہ جا رہے تھے۔ ایک صاحبہ نے اپنی پوری کیفیت اور مفلسی کے ذکر کے بعد لکھا تھا کہ میں یہاں مسلم نسواں اسکول میں تعلیم حاصل کر رہی ہوں، اس ماہ فیس نہ ہونے کی وجہ سے ڈر ہے کہ نام خارج ہو جائے، آپ مدد فرمادیں تو میں بہت بڑی دشواری سے بچ جاؤں۔ حضرت نے ان کو تسلی دلائی تھی اور فیس مع کچھ زاید روانہ فرمادی۔ ایک صاحب نے سردی کے

سامان کے لیے مدد طلب کی تھی۔ انھیں مکمل سردی، سامان تیار کرنے کے لیے خرچ روانہ فرمایا۔ ایک منی آرڈر ان کے نام تھا۔ اس کے علاوہ جو سلسلے مستقل امداد کے تھے بیماری کے شدید سے شدید زمانے میں بھی کبھی ذہن سے فراموش نہ ہوئے۔

بعض اوقات سخت حیرت ہوتی جب پوری غفلت اور نہایت کرب و بے چینی کے باوجود جب بھی ذرا سا ہوش آتا تو فوراً دریافت فرماتے، مہمانوں نے کھانا کھالیا، اسعد کہاں ہے؟ اس سے کہو کہ مہمانوں کے ساتھ کھانا کھائے، ان کے آرام کا مکمل خیال رکھے۔ ایک بار مولانا اسعد صاحب کہیں چلے گئے۔ اتفاق سے ایک مہمان کھانے سے رہ گئے تھے، فوراً مولانا اسعد صاحب کو بلوایا، جب وہ آئے تو سخت غضب ناک تھے، فرمایا تو کہاں ٹھوکریں کھاتا پھر رہا ہے، مہمان بھوکے رہیں اور تجھے پتا نہ چلے، اس دن سے آج تک موصوف نے اپنی ہمیشہ کی عادت کے خلاف کبھی باہر کھانے پر مہمانوں کا ساتھ نہ چھوڑا۔

مولانا یوسف صاحب قبلہ امیر تبلیغی جماعت اور ان کے رفیق خاص مولانا انعام الحسن صاحب ان کے ہم راہ مولوی عبدالمنان صاحب تینوں حضرات مزاج پرسی کو تشریف لائے، حضرت نے بڑے تاثر کے ساتھ فرمایا، آپ حضرات نے بڑی تکلیف فرمائی، میں تو بالکل اچھا ہوں، باہر نکلنے کو ڈاکٹروں نے منع کر دیا ہے۔ آپ حضرات کی دعائیں ہی کافی ہیں جو وہاں سے رہ کر ہو سکتی ہیں۔ اس کے بعد مولوی عبدالمنان صاحب سے مخاطب ہوئے، کہیے والد صاحب کا مزاج کیسا ہے؟ اشارہ مولوی عبدالسبحان صاحب میواتی کی طرف تھا، موصوف اپنے وقت کے جید عالم، زاہد، صوفی، متقی اور بہت نیک آدمی ہیں، آج کل سخت بیمار ہیں، حضرت کو ان سے ہمیشہ تعلق خاطر رہا ہے، دونوں بزرگ آپس میں ایک دوسرے کا اس طرح احترام فرماتے رہے کہ اللہ اکبر! ایک عام آدمی اس آداب و تعشق سے یقیناً بے بہرہ ہوگا۔ حضرت ہمیشہ ملاقات کے وقت کھڑے ہو کر استقبال فرماتے تھے۔ مولوی عبدالمنان نے اپنے آپ سے مخاطب پاکر قریب ہی بیٹھتے ہوئے عرض کیا حضرت دعا فرمائیں، حالت بہت خراب ہے۔ حضرت نے ان کے درد اور تاثر کو جو ان کی گفتگو سے ظاہر تھا محسوس فرمالیا اور نہایت شفقت سے سمجھانا شروع کیا، بھائی ویسے بھی وہ ہمیشہ پاک و صاف رہے اب بالکل ہی پاک ہو کر جانے کا خیال ہے اور بھائی بہ ظاہر یہ ضرور ہے کہ

تمہارے لیے یہ انتہائی غم و پریشانی کا موقع ہے، مگر بیماری تو خدا کی رحمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک اور خاص بندوں پر ڈالتا ہے۔ جب وہ کسی پر اپنا فضل فرمانا چاہتا ہے تو اسے دنیا کی تکلیف و مصائب میں ڈال کر آخرت کی تکلیفوں سے نجات عطا فرماتا ہے۔ پھر والد صاحب قبلہ پر تو خدا کی خاص نگاہِ کرم ہمیشہ ہی رہا ہے۔ ان کو جس قدر اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے نوازے کم ہے۔ بیماری میں پریشان ہونا ٹھیک نہیں ہے، خدا سے ہر لحہ بہتری اور بھلائی کی توقع رکھنی چاہیے، اس سے استغفار طلب کرنی چاہیے، یہ ایک آزمائش آپ کے لیے ہے، جہاں تک ہو سکے اس کی رضا طلب کرنی ضروری ہے، ہر لحہ اس کے فکر میں صرف ہونا چاہیے، جہاں تک ممکن ہو ان کی خدمت کیجیے، یہی چیز سعادت دارین و فلاح کا باعث ہے، ان کو خوب آرام پہنچایئے، ماشاء اللہ آپ عقل مند ہیں، کبھی بیماری و تکلیف میں جذبات کو عقل پر غالب نہ آنے دیں۔ تقریباً آدھ گھنٹہ اسی قسم کی اطمینان بخش تقریر فرماتے رہے۔ تینوں حضرات اس جامع و بلیغ نصیحت سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ آنکھوں میں محبت و عقیدت کے آنسو لے کر اجازت چاہی اور باہر آ گئے۔ دروازے پر آتے ہی تینوں کی رائے اس پر متفق تھی کہ حضرت نے اپنے بارے میں بہت دور تک اشارہ فرما دیا ہے اور تینوں کے قلوب اس مایوسانہ تجویز پر فکر آمیز تائید پیش کر رہے تھے۔ آہ! کیا خبر تھی کہ یہ خیال اس درجے صحیح ثابت ہوگا۔ حضرت کی تکلیف کے خیال سے ملنے والوں کو حتی الامکان ملنے سے روکا جا رہا تھا کہ گفتگو و سلام و مصافحہ سے حضرت والا کو تکلیف کا اندیشہ تھا۔ مگر کوئی چھوٹے سے چھوٹا یا بڑے سے بڑا شخص بھی اگر کسی کی معرفت چپکے سے اطلاع کر دیتا تو ناممکن تھا کہ بغیر بلائے اس کو جانے دیں۔ ایک بار جناب حاجی بدر الدین صاحب نے اندر آنے کی اجازت چاہی۔ حضرت نے طلب فرمالیا اور گئے، بہت دنوں کے بعد حضرت کو دیکھ کر بے اختیار رونے لگے۔ حضرت کمال محبت و شفقت سے جیسے کوئی بچے کو سمجھائے دیر تک سمجھاتے رہے۔ باہر مہمانوں کی خدمت کے لیے ایک خادم سلیم اللہ رہتے ہیں۔ انھوں نے عرض کی کہ میں روزانہ صرف آدھ گھنٹے کی اجازت چاہتا ہوں کہ پردہ کرا کر حاضر ہو جایا کروں اور کچھ خدمت کیا کروں، اللہ اکبر! کس قدر یگانگت اور محبت سے فرمایا بھائی تمہارے لیے یہ بہت کافی ہے کہ تم میرے مہمانوں کی خدمت کرتے رہو۔ سلیم اللہ تمہارا مجھ پر بڑا احسان ہے جو تم میری غیر حاضری میں مہمانوں کا خیال رکھتے ہو، بس تمھیں اور خدمت کی ضرورت

نہیں ہے۔

ششماہی امتحان دے کر میں نے سوچا، حضرت کی حالت کچھ ٹھیک ہے۔ میں وطن چلا جاؤں، ہمت کر کے اجازت نامہ پیش کر دیا۔ مگر آہ! خدائے رحمٰن ورحیم کا مجھ روسیاہ پر کتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے آخری ایام میں خدمت کی سعادت میری قسمت میں لکھی تھی۔ حضرت نے ڈانٹ دیا کہ کوئی ضرورت نہیں ہے، گھر جانے سے تعلیم کا نقصان ہوگا۔ اس کے بعد دبے لفظوں میں ناگواری کے ساتھ اجازت بھی مرحمت فرمادی۔ مگر خدا کا لاکھ احسان مجھ میں یہ سعادت اس وقت پیدا ہوگئی اور میں باوجود گھر والوں کے اصرار کے اس اجازت پر مطمئن نہ ہوا اور ارادہ ختم کر دیا۔ آہ! اسی دن شام کو حضرت کی طبیعت خراب ہوئی اور ایسی خراب ہوئی جس کے نتیجے میں یہ گھڑی دیکھنے پڑی۔ اسی زمانے میں ایک صاحب بہار سے جو کسی لائن پر گارڈ تھے، تشریف لائے۔ اللہ پاک نے انھیں اس سعادت سے مشرف فرمایا کہ وہ مرید ہوگئے، پانچ چھ روز خدمت اقدس میں رہے۔ جب جانے لگے تو بہت متاثر تھے۔ حضرت نے انھیں نصیحت فرمائی بھائی ہمیشہ ذکر اللہ کرتے رہنا، عمر کا جو حصہ اللہ تعالیٰ کی یاد میں گزرے وہی حاصل زندگی ہے، باقی ہر لحہ بے کار ہے۔ جہاں تک ممکن ہو اٹھتے بیٹھتے خدا کا ذکر کرتے رہنا، شریعت کی اتباع، خدا اور اس کے رسول کے کام کی تابع داری ایک مسلمان پر انتہائی ضروری ہے، نماز کا پوری طرح خیال رکھنا نہایت ضروری ہے۔

وصال سے دو چار دن قبل تنفس کی شکایت تو قطعی ختم ہو چکی تھی۔ ایک نئی تکلیف سینے میں درد کی شروع ہوگئی تھی۔ ایک دن ظہر کے وقت جب پہلی بار یہ تکلیف شروع ہوئی، مگر مطلق نہ کسی سے فرمایا اور نہ کسی طرح اظہار ہونے دیا، شام کو جب بے چینی زیادہ بڑھی تو اہلیہ محترمہ نے دریافت فرمایا کیا کوئی تکلیف ہے؟ آخر بہت مجبور ہو کر فرمایا ہاں! آج دوپہر سے سینے میں درد ہے۔ وہ پریشان ہوگئیں، فوراً مولانا اسعد صاحب کو اطلاع کرائی، وہ باہر ہی تھے، انھوں نے ڈاکٹر سبحان صاحب کو بلوا کر نیند کا انجکشن لگوا لیا، جس سے کافی سکون ہوا، مگر اس کے اثر کے بعد اکثر حصہ دعا و استغفار میں گزرتا، ہر وقت فرماتے رہتے یا الٰہ العالمین درماندہ ام اللھم لك الحمد و الشکر۔ رات میں ۳ بجے چار بجے کبھی دو بجے نوافل پڑھتے، ہم میں سے کوئی حاضر ہوتا جو وضو کراتا، نماز پڑھواتا۔ اس کے بعد ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے اور دعائیں پڑھتے رہتے۔ ایک بار میں نے عرض کیا، حضرت تکلیف بہت

زیادہ ہے؟ فرمایا، دیکھو بھائی میں کس قدر مجبور ہو گیا ہوں، کس قدر افسوس کی بات ہے، اتنا کم زور ہو گیا ہوں کہ مجھ میں ذرا بھی صبر وضبط وتحمل کی طاقت نہیں رہی۔ اتنی ذرا سی تکلیف برداشت نہیں ہوتی۔ ہر لمحہ ہاتھ پر ہاتھ ملتے رہتے اور فرماتے جاتے، ہائے افسوس عمر ضایع ہوئی۔ کبھی کبھی بے تحاشہ حسرت وافسوس کی ماری ہوئی ایک آہ نکلتی اور فرمانے لگتے یا اللہ کیا منہ دکھاؤں گا؟ یا اللہ من مسکینم رحم کن بر من بے چارہ و مسکین۔ برادر مکرم فرید الوحیدی صاحب حاضر خدمت ہوئے اور قریب کھڑے ہو گئے، فرمایا کیا ہے؟ وہ بولے ہمیں تو کچھ طبیعت آج نسبتاً بہتر معلوم ہوتی ہے۔ فرمایا الحمد للہ۔ عرض کیا خود جناب کو اپنی طبیعت کیسی معلوم ہوتی ہے۔ فرمایا تم چلتے ہو، پھرتے ہو، کام کرتے ہو، میں پڑا ہوا ہوں، بس اس سے بڑی تکلیف کیا ہوگی؟ تمام عمر بے کاریوں میں ہی ضایع ہوئی۔ اب آخر عمر میں بھی پڑا رہتا ہوں۔ بھائی صاحب نے فرمایا۔ حضرت آپ یہ نہ فرمائیں، ان شاء اللہ تعالیٰ چند دنوں میں آپ بھی کام شروع فرما دیں گے اور جو کام ہم تمام عمر ادھورا بھی نہ کر سکے وہ جناب صرف دو گھنٹے میں پورا فرمالیں گے۔

رکاوٹ کے باوجود کبھی جب کوئی ملنے آتا تو باوجود ہزار دقت و پریشانی کے فوراً اٹھ کر مصافحہ فرماتے تھے اور بار بار فرماتے تھے بھائی ناحق تکلیف فرمائی ہے، آپ حضرات کی دعا ہی بہت کافی ہے، بیمار کون نہیں ہوتا، مجھے ڈاکٹروں نے منع کر دیا ہے نہ مسجد تک جانے کی اجازت ہے، نہ باہر جا کر نماز پڑھنے کی اجازت ہے۔

اللہ اللہ عقیدت مندوں کا اس درجے خیال تھا کہ جناب مولانا حفظ الرحمٰن صاحب قبلہ ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ ان سے گفتگو کے درمیان فرمایا مولانا عبد الحلیم صاحب کے بارے میں آپ کیا کر رہے ہیں۔ مولانا نے فرمایا میں پوری کوشش کر رہا ہوں۔ فرمایا اگر آپ کا کوئی سفر بمبئی کی طرف کا ہو تو بہ ذات خود کوشش فرمائیں، ورنہ تار دے کر کوشش کریں۔ حضرت مولانا عبد الحلیم صاحب صدیقی۔ ہر حال حضرت کے پرانے متوسلین میں سے ہیں۔ ان کے معاملات سے تعلق خاطر زیادہ تعجب انگیز نہیں۔ جناب صاحب زادہ مستحسن الدین صاحب فاروقی، مالک مدیر رسالہ آستانہ و پیام مشرق کی نظر بندی سے حضرت کو اتنی ہی تکلیف تھی۔ انھیں ایام میں مولانا محمد میاں صاحب ناظم جمعیت علمائے ہند مزاج پرسی کے لیے حاضر ہوئے تو ان سے فاروقی صاحب کے بارے میں اس

انداز سے گفتگو فرمائی جس میں تاثر کے ساتھ برہمی بھی نمایاں تھی۔ حضرت کو غالباً خیال یہ تھا کہ صاحب زادہ صاحب کے بارے میں کوشش نہیں کی گئی۔ جب مولانا محمد میاں صاحب نے تفصیل سے بیان کیا کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کس طرح ہر ایک ممکن کوشش کو عمل میں لا چکے ہیں تو یہ برہمی تو شفقت سے بدل گئی، مگر صاحب زادہ صاحب کی نظر بندی سے جو قلب مبارک پر گہرا اثر تھا وہ پھر بھی بدستور باقی رہا۔

بیماری سے چھ سات دن قبل میں نے والدہ محترمہ کو اور بعض رشتے داروں کو فیض آباد سے بلا لیا تھا۔ مغرب کے قریب یہ قافلہ پہنچا۔ والدہ کے بارے میں ان کو معلوم تھا کہ ان کی طبیعت بھی خراب ہے۔ چناں چہ جس وقت وہ سلام کرنے کے لیے حاضر ہوئیں، دیکھتے ہی فرمایا کب آئیں۔ انھوں نے عرض کیا، ابھی حاضر ہوئی ہوں۔ فرمایا کیا گاڑی لیٹ آئی ہے۔ کیوں کہ گاڑی کا وقت کافی دیر پہلے گزر چکا تھا۔ اس کے بعد فرمایا بلا وجہ کیوں تکلیف کی، تمہاری طبیعت تو خود ہی خراب تھی۔ دادی محترمہ (اہلیہ حضرت) نے عرض کیا آپ نے رشید کو نہیں جانے دیا تھا، اس نے گھر والوں کو یہیں بلا لیا، اس پر مسکرا کر خاموش ہو گئے۔

وصال سے تین دن قبل تنفس اور سینے کے درد کی شکایت مطلق ختم ہو چکی تھی۔ اب عام خیال یہ تھا کہ بالکل صحت ہو چکی ہے۔ صرف کمزوری باقی ہے۔ مگر آہ! کسے خبر تھی کہ حق تعالیٰ نے ہر طرح کے معمولی سے معمولی تزکیہ کے بعد حیات مقدس کی شمع کی لو کو بھڑکا دیا ہے اور اب کچھ دیر بعد اس تاریک دور میں علم و عرفان کا یہ چراغ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو کر ہم بے کسوں کو تاریکی میں روتا چھوڑ دے گا۔

تین چار دن قبل از قسم طعام تمام چیزوں سے حضرت کو بالکل بے رغبتی ہو گئی تھی۔ پہلے معمولی طور پر ایک چمچہ یا کچھ کم و بیش دلیا نوش فرما لیا کرتے تھے۔ مگر اب اصرار کے باوجود بھی اس کو قبول کرنے پر راضی نہ ہوتے۔ کچھ عجیب اتفاق ہے کہ عموماً تمام مشائخ اور خصوصاً مولانا محمد قاسم نے آخر وقت میں پھل کی خواہش کا اظہار فرمایا، چناں چہ مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے لیے لکھنؤ سے ککڑی منگائی گئی تھی۔ حضرت نے بھی آخر میں سردے کی خواہش کا اظہار فرمایا اور من جانب اللہ اسلاف کی سنت پر طبیعت اس درجے مجبور ہوئی کہ جب مولانا محمد قاسم صاحب اور مولانا محمد شاہد صاحب فاخری ملاقات کو تشریف لائے تو فرمایا کہیے کیا آج کل سردا نہیں مل سکتا۔ انھوں نے عرض کیا ضرور مل جائے گا۔ چوں

کہ اس سے قبل مولانا اسعد صاحب مولانا فرید الوحیدی صاحب وغیرہ نے دہلی، سہارن پور، میرٹھ ہر جگہ تلاش کیا۔ مگر کہیں دستیاب نہ ہوا۔ اس لیے حضرت نے فرمایا کہاں مل سکتا ہے۔ مولانا وحید الدین صاحب قاسمی نے عرض کیا ان شاء اللہ دہلی سے مل جائے گا۔ مولانا شاہد صاحب نے عرض کیا، جی ہاں تلاش کے بعد بہت امید ہے کہ مل جائے۔ پھر فرمایا زندگی میں پہلی بار کسی چیز کی خواہش کی تھی وہ بھی پوری نہ ہوئی۔ اللہ اللہ بڑی بات فرمائی، دراصل زندگی اس قسم کی خواہشات وتمناؤں سے بہت بلند و بالا رہی۔ مگر اس وقت آخری بار خواہش فرمائی تھی تو کون سمجھ سکتا ہے کہ اس خواہش میں بھی سنت اسلاف اور طلب رضائے الٰہی کا کہاں تک جذبہ تھا اور اپنی خواہش طبعی کا کیا حصہ تھا اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ حضرت نانوتویؒ کے لیے لکھنؤ سے لکڑی منگوائی گئی تھی تو حضرت کے لیے مولانا سجاد حسین صاحب کی معرفت کراچی سے اور مولانا حامد میاں صاحب نے لاہور سے سردہ بھیجا۔ ہزار تکالیف کے باوجود بھی تیمارداروں کی تکلیف کا اس درجے خیال ہوتا تھا کہ ہمہ وقت فرماتے رہتے تم لوگ جاؤ، آرام کرو، میں بالکل اچھا ہوں۔ ایک بار رات کو آنکھ کھلی سب جمع تھے۔ نہایت بے چینی سے فرمایا بھائی میں تو پریشان ہوں، تم لوگ کیوں اپنی نیند خراب کرتے ہو، جاؤ سو جاؤ۔ بعض اوقات جب زیادہ پریشان ہوتے تو دادی محترمہ سے فرماتے دیکھو ان لوگوں سے کہہ دو کہ چلے جائیں اور جا کر آرام کریں۔ ایک بار ان تک کسی طریقے سے خبر پہنچی کہ ارشد سلمہٗ رات کو چار بجے مسجد میں دیگر مخلصین کے ساتھ دعا میں شریک ہوتے ہیں اور روزے رکھتے ہیں۔ مولانا اسعد صاحب کو بلا کر سخت تاکید فرمائی کہ اس سے کہہ دو کہ یہ حرکتیں چھوڑ دے۔ اس کا یا تمہارا جاگنا مجھے بچا نہیں سکتا اور اگر قسمت میں کچھ نہ ہوگا تو بھی جاگنا فضول ہے۔ غرضے کہ اس طرح تیمارداروں کا خیال رکھتے۔ مگر پھر بھی بچے موجود ہی رہتے۔ اکثر اوقات بچیوں میں سے عمرانہ سلمہا، صفوانہ سلمہا موجود ہوتیں۔ آپ ان سے مذاق فرماتے۔ ایک بار صفوانہ نے پوچھا کہ اباجی آپ کس کی طرف ہیں؟ فرمایا میں عمرانہ کی طرف ہوں، عمرانہ نے اسے ایک طمانچہ مار دیا۔ حضرت نے فوراً فرمایا اب میں صفوانہ کی طرف ہوں، کیوں کہ عمرانہ نے اسے مار دیا ہے۔ اس طرح اپنا اور بچوں کا دل خوش کرتے رہتے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت کا طبعی طور پر ہمیشہ یہ نمونہ دیکھنے میں آیا کہ اپنے بچوں کے ساتھ ملازموں کے بچوں سے برابر تلطف ومہربانی کا برتاؤ رکھتے تھے۔ دو بجے

عبدالصمد اور شمس العارفین حضرت سے بہت ہل گئے تھے۔ عبدالصمد کے بارے میں اکثر فرماتے یہ سیٹھ ہے۔ اس کا نام مت لیا کرو یہ سیٹھ ہے۔ ایک بار شمس ادھر سے گزرا، دیکھتے ہی فرمایا کیوں بھائی آج کھانا نہ کھلاؤ گے، بھوکا ہی رکھو گے۔ اسی طرح دوسرے محلے کے بچے جب نظر پڑتے فوراً کچھ نہ کچھ کھانے کو دیتے۔ کم از کم مدینہ کی کھجوروں سے نوازتے۔ آخر وقت تک اس چیز پر زور دیتے رہے کہ اس سال بہ شرط زندگی عید پر ارشد و سعید کی شادی ضرور کروں گا۔ دادی محترمہ سے بار بار فرماتے کہ انتظام مکمل رکھو۔ اس مرتبہ ٹانڈہ چل کر ان دونوں کی شادی کرنی ہے۔ آج حضرت کا یہ فرمان جو وہ اپنی طرف زندگی کی شرط کے ساتھ منسوب کر رہے تھے، پورا نہ ہو سکا۔ مگر ہمارے لیے ایک آخری اور نہایت ضروری وصیت ضرور حاصل ہو گئی۔ اللہ پاک اس وصیت پر عمل کر کے ان کے حکم کی تعمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ وصال کی آخری رات تھی، عشا کی نماز پڑھ کر تخت ہی پر بیٹھ گئے، حالت بہت اچھی تھی۔ باقاعدہ مسکرا مسکرا کر گزشتہ لوگوں کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ والدہ سے پوچھا، کیا اب بھی ٹانڈے میں تمہارے مکان پر الو بولتا ہے۔ ہمیشہ صبح کے وقت ایک مخصوص مقام پر بیٹھ کر وہاں الو بولتا رہا ہے، والدہ نے عرض کیا جی ہاں! فرمایا ہاں ہمارے بچپن میں اس جگہ املی کا بہت بڑا درخت تھا۔ اس پر ہمیشہ ایک الو بولتا تھا۔ وہ حسب عادت آج بھی بولتا ہے۔ میں نے عرض کیا حضرت یہ کیا ضروری ہے کہ جو اس وقت بولتا تھا آج بھی وہی ہو؟ فرمایا ہاں بھائی ان کی عمریں چھ چھ سو سال تک ہوتی ہیں۔ پھر والدہ سے مخاطب ہوئے۔ اللہ داد پور ہمارے بچپن میں اس قدر آباد تھا کہ حیرت ہوتی ہے، وہ سب لوگ کہاں گئے۔ فرمایا کہ والدہ کہتی تھیں کہ ایک زمانے میں ہر طرف بڑے بڑے لوگوں کی چار پائیاں بچھی ہوئی ہوتی تھیں اور مال و دولت کی فراوانی تھی، لوگوں کی کثرت تھی۔ پھر والدہ سے اظہار رائے کے طور پر فرمایا کہ اس الو کے بارے میں سنا ہے کہ یہ بہت منحوس ہوتا ہے۔ والدہ نے کہا جی ہاں، جہاں یہ بولتا ہے وہ جگہ اجاڑ ہو جاتی ہے۔ فرمایا کہ سب تو مر گئے، اب کسے لے جانا چاہتا ہے۔ پھر ٹانڈے میں اپنے خاندانی مزار کے بارے میں گفتگو شروع فرمائی، والدہ نے کہا کہ اس پر بعض لوگوں نے عرس شروع کر دیا ہے۔ یہ سن کر انتہائی غضب ناک ہو کر فرمایا، ہرگز نہیں ہو سکتا، کون لوگ ہیں وہ؟ برادر مکرم فرید الوحیدی اور چچا فضل الرحمٰن صاحب نے تفصیل سنائی تو فرمایا کہ ان کو جس طرح ہو سکے روکنا چاہیے۔ بھائی

صاحب نے کہا کم از کم اس وقت ایک حکم امتناعی حکومت کی طرف سے جاری ہو جائے، پھر آگے کارروائی ہوتی رہے گی۔ اس قسم کی باتیں دیر تک ہوتی رہیں۔ مجھ کو چوں کہ رات میں حاضر ہونا تھا، اس لیے میں سونے چلا گیا۔ رات کو تقریباً ڈھائی بجے حاضر ہوا اور حتیٰ الامکان بہت آہستگی سے کہ آنکھ نہ کھل جائے سرہانے جا کر بیٹھ گیا۔ محسوس ہوا کہ حضرت برابر اللہ اللہ کر رہے ہیں اور کروٹ لے رہے ہیں۔ عرض کیا حضرت آج کچھ تکلیف زیادہ ہے۔ فرمایا ہاں بھائی، لو مجھے اٹھا دو! میں نے سہارا دے کر اٹھا دیا، فرمایا پانی لاؤ۔ جلدی سے پانی پیش کیا۔ ایک گھونٹ لے کر فرمایا، اچھا رکھ دے۔ سردا کاٹ لے، میں کاٹنے لگا۔ فرمایا تھوڑا ہی کاٹنا۔ اتنی دیر میں میں نے طشتری میں چند قتلے پیش کیے۔ فرمایا تم بھی ساتھ ہی کھاؤ میں نے عرض کیا، حضرت آپ کھالیں۔ آخر کار دو قتلے چھوڑ دیئے اور فرمایا کہ لے کھالے۔ میں نے عرض کیا کہ رکھ دوں پھر کسی وقت کھا لیجیے گا۔ بہت سختی سے منع فرمایا نہیں کھالے، خبردار رکھنا مت، میں نے اسے کھالیا۔ پھر فرمایا، دیکھ ڈبے میں اناس ہو تو شربت لے آ۔ میں سمجھ نہ سکا اور بجائے شربت کے قتلے پیش کر دیئے۔ فرمایا یہ نہیں شربت، جب تک میں شربت گلاس میں لے کر آیا ایک قاش منہ میں رکھ لی تھی، اسے تھوکنا چاہا ارشاد فرمایا سلفچی لاؤ۔ میں نے آگے ہاتھ کر دیا۔ کچھ پس و پیش کے بعد ہاتھ پر تھوک دیا اور اس کا رس چوس لیا تھا۔ میں نے شربت پیش کر دیا بجائے شربت پینے کے میری طرف دیکھتے رہے، میں نے چاہا کہ اس کو میں رکھ لوں۔ یہ محسوس فرماتے ہی بہت زور سے ڈانٹا، پھینک اس کو، حالات کی نزاکت کے پیش نظر تعمیل حکم کے سوا اور میرے لیے کوئی راستہ نہ تھا۔ اس لیے ان کے سامنے سلفچی میں ڈال دیا۔ شربت پی کر ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ میں نے پان اور دودھ کے بارے میں پوچھا۔ دودھ کا نام سنتے ہی متلی آنے لگی۔ سلفچی لے کر میں تیار ہو گیا۔ مگر قے نہیں ہوئی، فرمایا دیکھو بھائی نام سے تو متلی ہوتی ہے، دودھ کس طرح پی لوں۔ میں بدن دبانے لگا تو حضرت کچھ پڑھنے لگے۔ جب کچھ دیر ہو گئی تو ترنم کے ساتھ فرمانے لگے ۔

الٰہی. مری زندگی ہے یہ کیسی

نہ سوتے کٹے ہے نہ روتے کٹے ہے

میں نے طبیعت کے بہلنے کی غرض سے عرض کیا کہ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اپنی کتاب مقدمہ مشکوٰۃ میں روایت و درایت کے مسئلے میں فلاں بحث کی، اس بارے

میں جناب کی رائے کیا ہے؟ اس کے جواب میں دیر تک حضرت سمجھاتے رہے۔ اس کے بعد فرمایا لیٹا دو، میں نے آہستہ سے لیٹا دیا۔ تقریباً ۴ بجے سعید الوحیدی کا وقت ہو گیا تھا، اسے جگا کر میں سونے چلا گیا۔ صبح کو معلوم ہوا کہ خلاف عادت اس سے بہت باتیں کیں۔ ویسے رات کو فرما چکے تھے جب کہ کسی نے اس کی محنت نہ کرنے کی شکایت کی تھی کہ یہ اس کا بچپن ہے۔ بڑا ہو کر ان شاء اللہ یہ سب کو شریعت پر چلائے گا، لیکن یہ بیوی کا غلام نہ بن جائے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ صبح کو اذان کے بعد فوراً وضو فرمالیا جب کہ روزانہ اذان کے کافی دیر کے بعد وضو کرتے تھے۔

نماز کے بعد حاضر ہوا تو نماز پڑھ کر وظیفہ پڑھ رہے تھے۔ میں آہستہ سے گیا اور فوراً واپس آ گیا۔ ۱۲ بجے کے قریب پھر حاضر ہوا تو حضرت کو صحن میں دیکھا، دل بہت خوش ہوا۔ بہت دنوں کے بعد یہ انتقال مکانی ہوا تھا۔ مگر آہ! کیا خبر تھی کہ وہ مقبول و مقرب بندہ جس نے محبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور سنت سے فریفتگی اور سنت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرنے میں اپنی پوری عمر صرف کی تھی، اللہ تعالیٰ نے اپنے اس مقبول و محبوب بندے کی یہ شان اس آخری وقت میں کس طرح بالا کی -- اگر چہ یہ فعل غیر ارادی اور غیر اختیاری تھا۔ مگر عجیب اتفاق یہ ہے کہ نبی اکرم فخر دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم بھی انتقال سے چند گھنٹے قبل دو صحابیوں کے سہارے پر حجرۂ مبارک سے نکل کر مسجد میں تشریف لائے تھے اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ وفات کا وقت بھی تقریباً وہی تھا جس وقت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دنیا سے حجاب فرمایا۔

یہ امر واقعہ ہے کہ حضرت کے کسی فعل و عمل سے اس قسم کا خیال بھی نہ گزرا کہ اب چند گھنٹوں میں کیا ہونے والا ہے۔ میں باورچی خانے میں عزیزم ارشد سلمہٗ کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا۔ حضرت صحن میں سو کر اٹھے تھے اور بیٹھ کر ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے ارشد سے کہا ماشاء اللہ! ارشد ابا جی ہم کو دیکھ رہے ہیں، ان شاء اللہ عن قریب اسی طرح وہ بھی کھانا تناول فرمائیں گے۔ اتنی دیر میں مولانا اسعد صاحب ایک رسالہ جو حضرت نے تصور شیخ کے بارے میں ایام علالت ہی میں تصنیف فرمایا تھا، لے کر آئے اور دستخط کے لیے پیش کیا، ان پر دستخط فرما کر اندر تشریف لے گئے۔ ہم دونوں کھانا کھا کر خدمت میں حاضر ہوئے تو کھانا تناول فرما رہے تھے، میں مورچھل ہاتھ میں لے کر مکھی اڑانے لگا۔ اس وقت محسوس کیا کہ یہ

بے دلی سے چند لقمے تناول فرمائے، وہ بھی اس طرح کہ ذرا سامنہ میں لے کر کچھ سوچنے لگتے اور فضا میں گھورنے لگتے۔ یہ گھورنا یہ سوچنا کھاتے کھاتے رکنا اس وقت جب کہ دردناک حادثہ گزر چکا ہے بامعنی معلوم ہوتا ہے۔ کھانا کھا کر سردے کا شربت طلب فرمایا۔ شربت پی کی ٹیک لگا کر بیٹھ گئے اور مولانا اسعد صاحب سے فرمایا کہ آنکھوں کے سامنے کچھ دھندلا پن محسوس ہوتا ہے۔ مگر چوں کہ اس دن ابر تھا اس لیے مولوی اسعد صاحب اور سب نے یہی سمجھا کہ ابر کی اندھیری کے سبب سے یہ احساس ہے اور حضرت کو مطمئن کر دیا۔ دادی محترمہ نے عرض کیا کہ اب آپ لیٹ جائیے۔ فرمایا ہاں لیٹ جاؤں گا، تم جاؤ کھانا کھاؤ۔ بڑی لڑکی ریحانہ سلمہا کی طرف اور مولانا اسعد صاحب کی اہلیہ محترمہ کی طرف اشارہ فرمایا دیکھو بچیاں بھوکی ہیں، جاؤ یہ تمہارے بغیر نہ کھائیں گی۔ انھوں نے عرض کیا مجھے بھوک نہیں ہے، میں کچھ دیر میں کھالوں گی اور بچیوں کو اگر بھوک ہوگی تو وہ بھی کھالیں گی۔ فرمایا نہیں تم سب کی بڑی ہو، سب تمھیں ہر کام میں آگے رکھنا چاہتی ہیں۔ عرض کیا یہ سب گستاخ ہیں، کہنا نہیں سنتی ہیں۔ اس پر بہت زور سے قہقہہ لگایا۔ آہ! ذات اقدس کا یہ آخری بڑا طویل اور بہت زمانے کے بعد قہقہہ سنا تھا۔ کیسے نہ کہوں کہ یہ قہقہہ موت کے استقبال کے لیے تھا۔ اس قہقہے کے بعد فرمایا تم سب کی بڑی ہو، سب پر نگاہ رکھو، ان کو نصیحت کرو، ان سے کام لو، اگر کبھی انکار کریں یا کچھ بے ادبی کر دیں تو معاف کر دو۔ سب سے حسن اخلاق کا برتاؤ رکھو، دنیا کی باتوں کا خیال کبھی نہ کرنا چاہیے۔ بڑا کچھ کہے تو خاموشی سے سن لو، ہر ایک سے محبت کا معاملہ ہونا چاہیے، چند دن کی زندگی میں کسی سے ناراض ہونا ٹھیک نہیں ہے، ہر ایک کے کام آنا چاہیے، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سوائے خدا کے اور کسی سے توقع اور امید نہ رکھنی چاہیے۔ اگر کسی سے امید نہ رکھو گی تو کسی سے نہ شکایت ہوگی، نہ کسی سے کوئی تکلیف پہنچے گی۔ ہر بات میں خدا سے مدد مانگنی چاہیے۔ اس کا ذکر کثرت سے کرو۔ اس قسم کی نصیحت فرمائی اور مسکرا مسکرا کر ہنس ہنس کر اس طرح فرماتے رہے کہ کسی کا گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ یہ نصائح آخری ہیں یا اب یہ میٹھے بول سننے کو نہ ملیں گے۔ اس کے بعد خود ہی بستر پر تشریف لے گئے اور لحاف اوڑھ کر دائیں کروٹ لیٹ گئے۔ مولانا اسعد صاحب بدن دبانے لگے، ہم سب کمرہ بند کر کے نکل آئے۔ حضرت کی زندگی میں میری یہ آخری حاضری تھی۔ اس کے بعد کیا کیفیت گزری، میں معلوم نہ کر سکا، کیوں کہ وہاں سے آکر سیدھے کمرے میں سو گیا۔

تقریباً ۳ بجے کا وقت تھا ایک دم شمس روتا ہوا آیا۔ بھائی رشید بھائی رشید! ابا جی کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کا انتقال بھی جمادی الآخر کے مہینے میں ظہر کی نماز کے بعد یوم جمعرات کو ہوا اور ان کے شاگرد (بالواسطہ) کا انتقال بھی عین اسی مہینے میں ظہر کے بعد جمعرات کو ہوا۔ جیسا کہ جناب حامد الانصاری غازی اور مولانا جمیل الرحمٰن صاحب نائب مفتی دارالعلوم دیوبند کی تحقیق سے یہ بات سوانح قاسمی میں مذکور پائی گئی ہے۔

(از مولوی رشید احمد صاحب وحیدی فیض آبادی نبیرہ حضرت شیخ الاسلام قدس اللہ سرہٗ العزیز)

مرض الوفات کے حالات

(از: مولانا سید فخر الحسن، استاذ دار العلوم دیو بند)

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ O
(سورۂ رحمٰن: ۲۷)

یہ سن کر کہ الجمعیۃ حضرت شیخ الاسلام مولانا وسیدنا قطب عالم السید حسین احمد مدنی نضر اللّٰہ وجھہ یوم المحشر کے تذکار میں شیخ الاسلام نمبر نکال رہا ہے، میرے دل میں بھی آیا کہ مرض وفات کے کچھ حالات جن کا علم خود مجھ کو ہے یا جس کی تفصیل صاحب زادہ مولانا اسعد سلمہٗ کے ذریعے سے مجھ کو معلوم ہے قلم بند کردوں۔ شاید کہ شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کے متوسلین کے زمرے میں قیامت کے دن اس ناکارہ کا بھی نام آجائے۔ وما ذالك على الله بعزيز۔

حضرت شیخ الاسلام قدس اللہ سرہٗ العزیز کو حق تعالیٰ نے اس قدر کمالات نبوت کا جامع پرتو بنایا تھا کہ انسان حیران ہو جاتا ہے کہ کیا کیا لکھے۔ زہد واتقا، فقر وفاقہ، غنا واستغنا، عزم واستقلال، سخاوت وشجاعت، صلۂ رحمی، یتامیٰ، بیواؤں اور اہلِ مساکین، حاجت مندوں، غریبوں، بےکسوں کے ساتھ ہم دردی، علوم شریعت وطریقت میں کمال، عزیمت صادقہ، قوتِ قلب، حیرت انگیز سیاسی بصیرت، ریاضات ومجاہدات، مجاہدانہ زندگی، تواضع وانکسار، ایثار وخاک ساری، اخفائے احوال، مہمان نوازی، اکرام ضیف، من كان يومن بالله واليوم الآخر فليكرم ضيفه پر مکمل عمل، مدنی زندگی، مسجد نبوی میں سال ہا سال درس قال اللہ وقال الرسول، اسارت مالٹا، مختلف جیلوں میں سال ہا سال قیام کرکے مجاہدات ومراقبات، تعلق مع اللہ واستغراق فی اللہ، دنیائے اسلام کی مرکزی درس گاہ دار العلوم دیو بند میں ۳۲ سال تک اصح الکتب بعد کتاب اللہ یعنی صحیح بخاری شریف اور ترمذی شریف کا درس، چھوٹوں کے ساتھ غایت لطف وکرم، بڑوں کا نہایت درجۂ ادب واحترام۔ یہ اس قدر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے کمالات ہیں کہ اگر صرف عنوانات ہی شمار کرائے جائیں تو

ان کی ہی فہرست بہت طویل ہو، تفصیل کے لیے تو دفاتر کی ضرورت ہے۔ پھر اہل قلم اور اہل بصیرت حضرات ضرور کچھ نہ کچھ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ان فضایل پر روشنی ڈالیں گے۔ اس لیے یہ احقر فخر الحسن چند مخصوص امور جن کا تعلق مرض وفات سے ہے، قلم بند کر رہا ہے۔

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کو سب سے پہلے قلب کا دورہ مدراس کے سفر میں پیش آیا، جس کی وجہ سے حضرت شیخ صاحب زادہ مولانا اسعد سلمہٗ کے ساتھ جلد دیوبند واپس تشریف لے آئے۔ شروع شروع میں یہ خیال کیا گیا کہ یہ تنفس کا دورہ ہے جو جلد ہی ان شاء اللہ جاتا رہے گا، لیکن اسی کے ساتھ پھر حوالی قلب میں درد محسوس ہونے لگا۔ شروع میں یہ تکلیف خفیف سے تھی لیکن آئے دن یہ تکلیف ترقی کرتی رہی۔ سب سے پہلے دیوبند کے مشہور ڈاکٹر اور ہسپتال کے انچارج ڈاکٹر سبحان علی صاحب نے معاینہ کر کے قلب کا پھیلاؤ تجویز فرمایا۔ پھر مزید اطمینان کے لیے وہ خود حضرت والا کے ساتھ اس سفر میں (جس میں حضرت والا بھٹ اور رائے پور تشریف لے جا رہے تھے) تشریف لے گئے۔ تاکہ درمیان میں سہارن پور کے سول سرجن صاحب سے بھی مشورہ لیا جائے۔ چناں چہ سہارن پور میں ایکسرے کرایا گیا اور بھی ٹیسٹ کیے گئے، پوری طرح معاینہ کے بعد ڈاکٹر سبحان علی صاحب اور سول سرجن صاحب سہارن پور اس پر متفق ہو گئے کہ قلب کا پھیلاؤ شروع ہو چکا ہے۔ حضرت شیخ کے پروگرام کے مطابق قصبہ بھٹ کے مشہور رئیس جناب شاہ مسعود صاحب کی کار آئی ہوئی تھی، حضرت سہارن پور سے بھٹ تشریف لے گئے، ایک شب وہاں قیام فرمایا۔ اس سے پہلے ایک شب کے لیے حضرت مولانا شاہ عبد القادر صاحب دامت برکاتہم کے یہاں رائے پور میں قیام فرمایا۔ وہاں حضرت رائے پوری مدظلہٗ اور دوسرے اکابر کی یہ رائے ہوئی کہ واپسی میں سہارن پور کے مشہور ڈاکٹر برکت علی صاحب کو (جو کہ حضرت رائے پوری مدظلہٗ کے عرصے سے معالج اور کامیاب معالج ہیں اور اپنے تجربے کے اعتبار سے بڑی شہرت رکھتے ہیں) دکھلایا جائے۔ چناں چہ ڈاکٹر برکت علی صاحب نے معاینہ کر کے پہلے ڈاکٹروں ہی کی رائے سے اتفاق فرمایا اور مزید اطمینان کے لیے (الیکٹرو کارڈیوگراف) لیا گیا اور خون وغیرہ کا بھی ٹیسٹ کرایا گیا اور پوری تحقیق اور اطمینان کے بعد جناب ڈاکٹر برکت علی صاحب سہارن پوری کا علاج شروع کرا دیا گیا۔ مقامی طور پر ڈاکٹر سبحان علی صاحب بھی معاون رہے۔ اس کے بعد محترمی مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبد العلی

صاحب ناظم دارالعلوم ندوہ کو لکھنؤ سے بہ ذریعہ تار بلایا گیا۔ تاکہ وہ طبی اور ڈاکٹری دونوں کے ماتحت حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ کے علاج اور طریقۂ علاج پر نظر فرمائیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اور ان کے ساتھ مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی لکھنؤ سے تشریف لائے۔ ڈاکٹر صاحب نے تشخیص اور تجویز دونوں سے اتفاق فرمایا اور معمولی ترمیم کے بعد بھی ڈاکٹری علاج ہوتا رہا۔ اس علاج سے درمیان میں قدرے افاقہ ہوگیا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اور مولانا سید ابوالحسن علی میاں صاحب نے لکھنؤ پہنچ کر یہ خواہش کی کہ یوپی کے مشہور اور تجربہ کار ڈاکٹر عبدالحمید صاحب کو بھی معاینہ کرایا جائے۔ چناں چہ محترم ڈاکٹر عبدالحمید صاحب موصوف کو ٹیلی فون کیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب ممدوح جن کے متعلق مشہور ہے کہ وہ باہر کسی مریض کو مشکل ہی سے دیکھنے جاتے ہیں، لیکن مولانا اسعد صاحب سلمہٗ کی طلب پر بہت جلد دیو بند تشریف لے آئے۔ ہم خدام کو یہ حیرت تھی کہ ابھی تو باہم مشورہ ہو رہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب تشریف بھی لے آئے۔ بہ ہر حال ڈاکٹر صاحب ممدوح نے اولاً حضرت شیخ کا معاینہ زنان خانہ میں جا کر ہی فرمایا۔ کیوں کہ حضرت شیخ کو تمام ڈاکٹروں نے نقل و حرکت اور باہر آنے سے قطعاً روک دیا تھا اور تمام خدام اور متوسلین تقریباً ایک ماہ سے شرفِ دیدار سے محروم تھے۔ یہ خادم بھی اسی طرح مشتاق زیارت تھا۔ دوپہر کو ایک بجے کے قریب میرے پاس ایک خادم پہنچا جس کو مولانا محمد ازہر صاحب دربھنگوی خلیفہ حضرتؒ نے میرے پاس بھیجا کہ اگر آپ حضرت شیخ کی زیارت کرنا چاہیں تو ظہر کی نماز آج حضرت شیخ اپنے مہمان خانے میں ادا فرمائیں گے، کیوں کہ ڈاکٹر عبدالحمید صاحب ممدوح نے یہ چاہا ہے کہ حضرت کو چند قدم چلا کر بلڈ پریشر کا جائزہ لیا جائے۔ حال آں کہ یہ خبر نہایت پوشیدہ اور مخفی رکھی گئی تھی، مگر دیدارِ شیخ کے شیدائی جو عرصے سے اس کے منتظر تھے کہ کسی صورت زیارت نصیب ہو جائے۔ شمع کے محفل میں آنے سے قبل ہی پروانہ وار مہمان خانے میں جمع ہونے لگے اور بہ قول امیر خسرو

خبرم رسیدہ امشب کہ نگار خواہی آمد
سرمن فدائے راہے کہ سوار خواہی آمد
ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ برکف
بہ امید آں کہ روزے بہ شکار خواہی آمد

چناں چہ حضرت شیخ کے مہمان خانے میں تشریف آوری کے بعد تشنگانِ دیدار کا اس قدر ہجوم ہوا کہ مہمان خانے کے دروازوں کو بند کرا دینا پڑا اور بہت سوں سے ناگواری اور جھگڑا مول لینا پڑا۔ مہمان خانے میں نماز ظہر ادا ہوئی۔ یہ مجلس اگرچہ مختصر تھی مگر اتنی پر کیف اور مشتاقانِ زیارت کے لیے ایسی ولولہ انگیز کہ صاحب زادہ عزیز مولوی رشید الوحیدی (نبیرہ حضرت شیخ قدس اللہ سرہٗ) کے جذبات ارادت نے فوراً یہ شعر موزوں کر دیے:

کیا تو نے نہیں دیکھا اے شاہد مستانہ
محفل میں نظر آیا وہ جلوۂ جانانہ ....

جو غنچہ و گل اب تک محروم تبسم تھے
ہے ان کے لبوں پر بھی خوشیوں کا اک افسانہ

مے نوشوں نے بڑھ بڑھ کر پھر جام اٹھائے ہیں
ساقی تری آمد سے گردش میں ہے پیمانہ

وہ کون سی ہے دیدی دیوانے پکار اٹھے
یارب رہے محشر تک باقی ترا مے خانہ

بے ہوش یہاں کوئی تقدیر سے ہوتا ہے
اس در کا بھٹکنا بھی منزل کو ہے پا جانا

گم کردۂ منزل کو کیا شوق جہاں بینی
بہتر ہے دو عالم سے ایک رہبر فرزانہ

کیا شوقِ تماشا ہے ساقی ترے رندوں کا
اک جذب کا عالم ہے اور خود سے ہیں بیگانہ

اب تک تھی نگاہوں پر پابندیٔ نظارہ
اب جلوہ نما خود ہے وہ جلوۂ جانانہ

ہے جس کی نگاہوں میں پیغامِ عمل کوشی
راس آتی ہے مومن کو وہ جرأتِ رندانہ

تنہائی میں سوچا ہے میں نے یہ رشید اکثر
ہے ان کی غلامی بھی اک رتبۂ شاہانہ

بہ ہر حال نمازِ ظہر ہوئی، با جماعت ہوئی اور حضرت قدس اللہ سرہٗ العزیز نے باوجود ڈاکٹروں کے منع کرنے کے نماز کھڑے ہو کر ادا فرمائی۔ سبحان اللہ، اللہ اکبر!

اس غایت نقاہت اور کم زوری میں اتباعِ عزیمت و سنت کی کیسی مثال قدم قدم پر پیش فرمائی۔ آہ! آج اس شیدائی سنت کو دیکھنے کے لیے آنکھیں ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئیں۔ بہ ہر حال ڈاکٹر صاحب ممدوح نے معاینہ فرمایا اور پہلے ڈاکٹروں کی رائے سے ہی اتفاق فرمایا۔ غرضے کہ ڈاکٹری علاج برابر جاری رہا اور پوری توجہ کے ساتھ تقریباً ڈیڑھ ماہ کامل یہ علاج چلتا رہا۔ لیکن معمولی تخفیف کے بعد جو مرض ٹھیر گیا تھا اس میں فرق نہیں ہوا۔ یہ امتدادِ مرض خود پریشان کن تھا۔ تب حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہٗ شیخ الحدیث مظاہر العلوم سہارن پور اور دوسرے اکابر اور صاحب رائے حضرات کا مشورہ ہوا کہ حضرت کو دہلی یا لکھنؤ لے جایا جائے۔ آخر میں دہلی کے لیے رائے قرار پائی اور دہلی میں قیام وغیرہ کا انتظام بھی ہو گیا۔ مولانا اسعد صاحب سلمہٗ جواب تک بے دریغ روپیہ حضرت شیخ کے علاج پر صرف کر رہے تھے، آپ کا اصرار تھا کہ دہلی میں جو ڈاکٹر امراض قلب کے ماہر ہیں ان کو دیوبند بلا کر حضرت کا معاینہ کرایا جائے اور جو بھی ان کی فیس ہو وہ پیش کی جائے۔ مگر خود ڈاکٹروں نے یہ جواب دیا کہ جب تک ہسپتال میں داخلہ نہ ہو اس طرح جا کر دیکھ آنا بے کار ہے۔ کیوں کہ دیوبند میں وہ آلات اور وہ ضروریات جو علاج کے لیے ضروری میں مہیا نہیں ہو سکتیں۔ بہ ہر حال رائے یہی ہوئی کہ حضرت کو دہلی لے جایا جائے۔ تمام انتظامات مکمل ہو گئے، حتیٰ کہ حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم حضرت شیخ (نور اللہ مرقدہٗ) کو رخصت کرنے کے لیے سہارن پور سے تشریف بھی لے آئے۔ لیکن اسی دن اچانک مولانا حکیم عبد الجلیل صاحب اپنے بڑے بھائی مولانا حکیم محمد اسماعیل صاحب ممبر شوریٰ دار العلوم کے مشورے اور اصرار سے دیوبند پہنچے اور انھوں نے مقامی اطبا کے ساتھ حضرت شیخ کا معاینہ کیا۔ نبض دیکھی، نبض میں کم زوری بے حد تھی، اس حالت میں سفر کرنے کی سختی سے مخالفت کی۔ خواہ جس قدر سہولتیں بھی سفر میں مہیا ہوں، لیکن سفر سفر ہی ہے۔ ضرور تکلیف دہ حرکات کا سامنا کرنا پڑے گا اور مظنون راحت کے لیے متیقن تکلیف کو خریدیں ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔

اس طرف ڈاکٹری علاج سے کوئی معتد بہ افاقہ نہیں ہوا تھا تو جناب محترم سید محمد شفیع

صاحب اور دوسرے مخلصین اور اکابر کی یہ رائے ہوئی کہ جب کہ موجودہ حالات میں حضرت شیخ کو دہلی نہیں لے جانا ہے تو پھر علاج بجائے ڈاکٹری کے یونانی تجربتاً کرا کر دیکھ لیا جائے۔ چناں چہ اس ذیل میں جناب حکیم ذکی احمد صاحب مالک جید برقی پریس دہلی، محترم جناب حکیم عبدالحمید صاحب متولی ہمدرد دواخانہ دہلی اور جناب حکیم محمد صدیق صاحب امروہوی ثم بریلوی کے اسمائے گرامی سامنے آئے۔ لیکن یہ خیال کر کے کہ یہ دہلی کے دونوں حضرات نہ مستقل وقت دے سکتے ہیں نہ یہاں دیوبند میں قیام فرما سکتے ہیں۔ بہتر ہو کہ جناب حکیم محمد صدیق صاحب بریلوی جو اپنی حذاقت اور مہارت فن میں ید طولیٰ رکھتے ہیں، ان کو بلا لیا جائے۔ نیز حکیم عبدالجلیل صاحب کو بھی تکلیف دی جائے اور بعدہ ان حضرات کو بھی دہلی سے دیوبند آنے کی تکلیف دی جائے۔ چناں چہ جناب حکیم صاحب موصوف کو بریلی سے لینے کے لیے جناب حکیم رمضان الحق صاحب لکھیم پوری کو بہ ہم راہی مولانا نسیم اللہ خاں صاحب فیض آبادی روانہ کیا گیا۔ حکیم صاحب ممدوح ازراہِ کرام فوراً ان کے ہم راہ تشریف لے آئے۔ حکیم صاحب ممدوح اور دیوبند کے دوسرے اطبا جناب مولانا حکیم محمد عمر صاحب طبیب خاص دارالعلوم اور جناب حکیم محمد شفیق صاحب و مولانا حکیم عبدالجلیل صاحب دہلوی، صاحب زادہ مولانا حکیم جمیل الدین صاحب رحمہ اللہ ان سب نے حضرت رحمتہ اللہ علیہ کو دیکھا، مشورے کیے اور جناب حکیم محمد صدیق صاحب بریلوی نے نسخہ تجویز فرمایا، جس کو سب نے پسند فرمایا۔ اب یہ دوسرا علاج یونانی شروع ہو گیا۔ اس علاج کے دوران میں حضرت شیخ کو کافی افاقہ ہوا اور کچھ دنوں کے بعد حضرت شیخ نمازِ ظہر کے لیے برابر مسجد میں تشریف لانے لگے۔ اس کے بعد عصر کے بعد بھی اپنے دولت کدہ پر جہاں عصر کے بعد روزانہ تشریف فرما ہوا کرتے تھے جلوہ افروز ہونے لگے۔ مشتاقانِ دیدار کا نہ پوچھیے کہ کس طرح ہجوم رہا۔ دور و نزدیک کے لوگ بھی یہ خوش خبری پا کر تشریف لانے لگے۔ وہی پرانی مجلس فیض و افادہ پھر شروع ہو گئی۔ حتیٰ کہ سلوک و طریقت کے زیرِ تربیت مسترشدین اپنے حالات لکھ کر پیش کرنے اور رہنمائی پانے لگے۔

محترم جناب مولانا حکیم محمد صدیق صاحب بریلی سے اور عزیز مکرم جناب مولانا حکیم عبدالجلیل صاحب دہلی سے کئی بار تشریف لائے اور کئی کئی دن قیام فرمایا۔ اس سلسلۂ علاج و آمد و رفت و مہمان نوازی میں بھی جس فراخ حوصلگی کا ثبوت صاحب زادہ مولانا

اسعد سلمہٗ نے دیا وہ بے مثال و بے نظیر ہے۔ قیمتی دواؤں، علاج کی سہولتوں اور اطبا و ڈاکٹروں کی آمد و رفت پر ہزاروں رُپیہ صرف کر ڈالا۔ لیکن مرض میں پھر شدت ہوئی تو دہلی کے طبیب حاذق اور تجربہ کار حکیم عبدالحمید صاحب کو بہ ذریعہ ٹیلی فون تکلیف دی گئی۔ حکیم صاحب قبلہ بہ معیت مولانا قاضی سجاد حسین صاحب تلمیذ حضرت رحمۃ اللہ علیہ دیوبند تشریف لائے، معاینہ کیا، سابق نسخے دیکھے اور مفید مشورے دیے۔ نتیجے میں افاقہ محسوس ہوا۔ خدام کی طبیعت پھر شگفتہ ہوگئی۔

اسی اثنا میں جناب حکیم محمد یٰسین صاحب نگینوی لکھنوی ممبر مجلسِ شوریٰ دارالعلوم دیوبند تشریف لائے۔ حضرت شیخ قدس سرہٗ اب نماز صبح کے لیے بھی مسجد میں جانے لگے تھے۔ حکیم یٰسین صاحب نے شدت سے منع کیا لیکن حضرت کی ہمت خداداد کو کوئی پابند نہیں کر سکتا تھا۔ ایک دن اہلِ خانہ میں سے کسی نے فرطِ محبت میں یہ جرأت کی کہ حضرت کے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کرا دیا۔ حضرت شیخ چپکے سے اٹھے تاکہ نمازِ فجر کے لیے باہر تشریف لے جائیں۔ دیکھا کہ دروازہ باہر سے بند ہے، نہایت ناراضگی اور خفگی کا اظہار فرمایا۔ اس کے بعد ناشتے کے وقت جو کچھ اطبا نے بتلا رکھا تھا، اہلیہ محترمہ مدظلہا اور صاحب زادی ریحانہ سلمہا لے کر آئیں تو اس ناراضگی سے ہاتھ مارا کہ تمام برتن بھی گر کر ٹوٹ پھوٹ گئے۔ بڑی معافی کے بعد اس شرط پر ناشتہ کیا کہ مجھ پر نماز کے لیے کوئی پابندی نہیں لگائی جائے گی۔ یہ سب کچھ اتباعِ سنت کے غایت جذبے کے تحت تھا۔ اس کو آج آنکھیں ڈھونڈ رہی ہیں اور رو رہی ہیں۔ مرض میں چوں کہ مد و جزر برابر جاری تھا، مرض میں پھر شدت ہوئی اور یہاں تک تکلیف بڑھی کہ حضرت شیخ کو نہ دن کو چین تھا نہ شب کو آرام۔ نہ دائیں طرف سہارا لے کر چین ملتا تھا اور نہ بائیں طرف، نہ سامنے کو تکیہ پر جھک کر سکون نصیب ہوتا تھا نہ پیچھے کو سہارا لے کر، غرضے کہ اس طرح کی بے چینی اور اضطراب میں جس میں دس منٹ کے لیے بھی حضرت کو مسلسل کئی رات نیند نہ آسکی، تقریباً یہ حالت حضرت پر گیارہ دن مسلسل گزری۔ مزید یہ تکلیف ہوئی کہ حضرت کو ابکائیاں برابر آنے لگیں۔ کوئی چیز معدہ قبول نہیں کرتا تھا۔ کوئی دوا کوئی غذا ان دو دن میں حضرت کے معدے تک نہیں پہنچی۔ اس کرب و بے چینی کے ایام میں ایک دن جو غالباً پہلا دن تھا جب کہ میں اپنے گھر حسبِ معمول عشا کے بعد سو گیا تھا تو تقریباً دس بجے شب کو مولانا ازہر صاحب

در بھنگوی پہنچے کہ مولانا اسعد آپ کو بلا رہے ہیں۔ حضرت شیخ کی طبیعت زیادہ ناساز ہے۔
یہ بات سن کر یقین فرمایئے کہ چند منٹ کا راستہ طے کرنا دشوار ہو گیا۔ حضرت کے مکان پر
پہنچا تو دیکھا کہ مولانا اسعد صاحب سلمہٗ اور مولوی رشید الدین صاحب، دامادِ حضرتؒ و
مولوی رشید الوحیدی سلمہٗ وسعید الوحیدی سلمہٗ حافظ ارشد میاں سلمہٗ سب موجود ہیں اور باری
باری حضرت کا جسم مبارک دبا رہے ہیں۔ لیکن اللہ اکبر کس قدر کرب و بے چینی ان آنکھوں
نے دیکھی کہ کسی کل چین ہی نہیں پڑتا تھا۔ جس صبر واستقلال کے کوہ گراں نے کبھی تکلیف کو
تکلیف ہی نہ سمجھا تھا اس کی زبان پر کراہنے کی کیسی آواز تھی جس کو سن کر کلیجہ پھٹا جاتا تھا۔
کس درد بھری آواز سے اسم ذات زبان پر بار بار جاری تھا، جس کا کیف سننے ہی سے تعلق
رکھتا ہے۔ جب رات کے بارہ بجے تو حضرت اقدس کو قدرے سکون ہوا تو احقر اس کے بعد
اپنے گھر چلا آیا۔ لیکن نیند کس کو آتی تھی، ان گیارہ دنوں میں دعائیں اور دوائیں سب ہی
بے کار ثابت ہوئیں۔ کتنی بار حضرات اساتذہ دارالعلوم حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب
دامت برکاتہم معہ دوسرے اساتذہ وطلبہ مخلصین کے جمع ہوئے۔ بخاری شریف کے ختم کیے
گئے اور طلبہ ومحبین نے دہاڑیں مار مار کر الحاح وزاری کے ساتھ جناب رب العزت میں
صحت کے لیے دعائیں کیں، لیکن ان ایام میں مرض کا اشتداد بڑھتا ہی گیا۔ چناں چہ اس
پریشانی میں جناب حکیم ذکی احمد خاں صاحب دہلی کے مشہور طبیب کو دہلی سے بلایا گیا۔
مولانا وحید الدین صاحب قاسمی حکیم صاحب ممدوح اور جناب حکیم عبدالجلیل صاحب تینوں
حضرات بہ ذریعہ کار تشریف لائے۔ حضرت کا معاینہ فرمایا۔ سابقہ تمام یونانی نسخوں کو دیکھا،
جن میں سے حکیم محمد صدیق صاحب کے اوّل نسخے کو پسند فرمایا، لیکن اوبکائی کی شدت کی وجہ
سے ایک خوراک بھی دوا نہیں دی جا سکی۔ جب یہ حالت حضرت شیخ الحدیث مدظلہٗ سہارن
پور کو معلوم ہوئی تو وہ بہ ذریعہ کار محترم ڈاکٹر برکت علی صاحب کو ہم راہ لے کر تشریف لائے
اور پھر مجبوراً ڈاکٹری علاج شروع کرا دیا گیا، جس سے اوبکائی بھی رک گئی اور سکون ہونا
شروع ہو گیا اور نیند بھی آنے لگی۔ دو دن کے بعد حوالی قلب میں درد شروع ہوا۔ لیکن وہ بھی
دوسرے دن سے کم ہوتا گیا۔

حضرت شیخ کے وصال سے چھ دن قبل سے روزانہ صاحب زادہ مولانا اسعد صاحب
سلمہٗ کی کرم فرمائی سے اس احقر کو بعد مغرب آدھ گھنٹہ حاضری کا موقع حضرت کے پاس مل

جاتا تھا۔ ایک دن میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ ''حضرت اب کیا تکلیف ہے؟''
حضرت نے فرمایا کہ بس تکلیف یہی ہے کہ میں نکما یہاں پڑا ہوا ہوں اور تم سب لوگ کام
کر رہے ہو، پڑھا رہے ہو اور میں نے ساری عمر ضایع ہی کی، ساری عمر برباد کی۔ کچھ بھی نہیں
کرسکا۔ گریہ کا عالم طاری ہوگیا۔ اللہ اللہ جس شیخ مقدس کی علمی و عملی زندگی اس قدر کامیاب
گزری ہو کہ اس کا کوئی بھی لمحہ خدمتِ خلق اور تعلق مع اللہ سے خالی نہ ہو، جس کا سونا جاگنا
عبادت ہو، لیکن خشیۃ اللہ کا اب پر یہ عالم ہے۔ چناں چہ وفات سے دو روز قبل جناب مولانا
قاری اصغر علی صاحب خادم خاص وخلیفۂ خاص حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا سید
فخر الدین احمد صاحب صدر مدرس مدرسہ شاہی مراد آباد جن کو حضرت نے اپنی حیات میں
درسِ بخاری شریف کے لیے عارضی طور پر بلالیا تھا، ان دونوں کی موجودگی میں تذکرہ فرمایا
کہ میری چند نمازیں جو تیمم سے ہوئی ہیں ان کے بارے میں فرمایا کہ بیٹھے بیٹھے بلا وضو رہا
رہا ہوں، اس لیے مجھ کو اس کا بڑا قلق ہے اور پھر یک دم گریہ کا عالم طاری ہوگیا اور حضرت شیخ
اس قدر روئے کہ رونا رکتا ہی نہیں تھا۔ جس شجاع، قوی دل، استقلال وعزم کے کوہ گراں
نے بڑی سے بڑی مصیبت پر کبھی ایک آنسو تک کسی کے سامنے نہیں گرایا تھا وہ آج کس
طرح بلک بلک کر اللہ کے ڈر سے اس طرح رو رہا تھا کہ سارا جسم کانپ رہا تھا۔ بیم
ورجا مومن کی شان ہے۔ جب بیم وخشیت کا غلبہ ہو تو گریہ کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ ایسے
وقت ان خاصانِ خدا پر مشاہدۂ حق کا اس قدر غلبہ ہو جاتا ہے کہ وہ گرد و پیش سے بالکل بے
خبر ہو کر بے قابو ہو جاتے ہیں۔ اللہ کی لاتعداد نعمتوں اور بے شمار احسانات کی بارش کے
مقابلے میں وہ اپنی طاعات اور خدمات کو ذرۂ بے مقدار سے زیادہ نہیں جانتے۔ بہ ہر حال
یہ روحانی کیفیات کا مدوجزر تھا، مگر مرض میں بالکل تخفیف تھی، نہ کرب و بے چینی تھی، نہ کسی
خاص تکلیف کا اظہار تھا، ہاں اشتہا کئی دن سے نہ تھی اور بار بار ابکائیاں آتی تھیں۔ آخر میں
یہ ابکائیاں بھی چار دن قبل بالکل بند ہوگئی تھیں۔ منگل کے دن ۳/دسمبر ۱۹۵۷ء کو طبیعت کافی
سکون پر تھی۔ بدھ کے دن ۴/دسمبر کو بھی یہ احقر بعد مغرب حاضر خدمت ہوا، طبیعت کو بہت
خوش پایا۔ مولانا اسعد سلمہٗ نے ''القول الجمیل'' میں سے چند آیات کی نشان دہی چاہی تو
حضرت شیخ اٹھ کر بتلانے کے لیے تیار ہوگئے۔ لیکن اصرار کے بعد آپ نے لیٹے لیٹے بہت
جلد ان آیات کو بتلا دیا جن کی تلاش تھی۔ ہائے اب ایسا جامع شیخ کہاں سے لائیں جو اپنی

ادنا توجہ سے مشکلات علمی کو حل فرمادیا کرتا تھا۔ اس کے بعد مولانا اسعد سلمہٗ اور مولوی رشید الدین صاحب حضرتؒ کے داماد، رشید الوحیدی اور سعید الوحیدی سلمہما خدمت میں لگ گئے اور اس سارے گھر نے حضرت کی اس قدر خدمت کی کہ حضرت شیخ ان سب سے خوش دنیا سے رخصت ہوئے۔ بالخصوص مولانا اسعد صاحب سلمہٗ قابل مبارک باد ہیں کہ انھوں نے تو حضرت شیخ کو اپنے سے اس قدر خوش دنیا سے رخصت کیا کہ شاید ہی کوئی بیٹا اپنے محترم باپ کو اس طرح رخصت کر سکے۔ جزاہم اللہ عنا وعن سائر المسلمین۔

میں اس شب میں جو جمعرات کی شب ہے، یہ سمجھ کر کہ آج حضرت کی طبیعت ماشاء اللہ بہت اچھی ہے، جلد چلا آیا۔ مجھ کو کیا معلوم تھا کہ حضرت شیخ کی اس عالم میں یہ رات آخری رات ہے۔ چناں چہ جمعرات کی صبح کو حضرت تقریباً دس بجے دن اپنی جگہ سے اٹھ کر چھڑی کے سہارے گھر کے صحن میں جہاں حضرت کی اہلیہ محترمہ، صاحب زادی ریحانہ سلمہا، بہو بیٹیاں سب موجود تھیں، تشریف لے آئے اور دھوپ میں تھوڑی دیر آرام فرمایا۔ گھر والوں نے جہاں اس قدر کمزوری میں چلنے سے تشویش محسوس کی، وہاں اس کی بھی خوشی ہوئی کہ حضرت اب خود چھڑی کے سہارے سے چلنے لگے۔ اس کے بعد حضرت اپنی چارپائی پر تشریف لے آئے۔ تقریباً بارہ بجے دن کو حضرت شیخ نے کچھ کھانے کی اشتہا کا اظہار فرمایا۔ چناں چہ غذا پیش کی گئی۔ طبیعت اس وقت نہایت ہشاش بشاش تھی۔ چناں چہ حضرت نے جو خط مولانا احمد شفیع صاحب اسلام آبادی کو جو "تصورِ شیخ" پر لکھا تھا، اس پر دستخط فرمائے اور مولانا طاہر علی کلکتوی کے خط کو ملاحظہ فرمایا۔ گھر والے بھی بڑے خوش تھے کہ آج تو حضرت نے غذا بھی قبول فرمائی ہے اور یہ کام بھی کیے۔ بس حضرت کا مرض تو زائل ہوگیا، ضعف ہی ضعف باقی ہے۔ چناں چہ حضرت تقریباً بارہ بج کر ۴۵ منٹ پر قیلولہ کے لیے لیٹ گئے اور صاحب زادہ اسعد سلمہٗ حضرت کی کمر اور بدن دبانے لگے۔ اسی اثنا میں حضرت شیخ الہند علیہ الرحمہ کی چھوٹی صاحب زادی جو مولانا اسعد سلمہٗ کی رضاعی والدہ بھی ہوتی ہیں، کچھ بات مولانا اسعد سلمہٗ سے کرنے لگیں۔ تو اس پر حضرت شیخ نے فرمایا کون ہے، کیا بات ہے؟ گویا ہوش و حواس بالکل بجا تھے۔ اب ایک بج چکا تھا، اس کے بعد بھی مولانا اسعد سلمہٗ بدن دباتے رہے۔ جب دیکھا کہ حضرت سو گئے ہیں تو وہاں سے ہٹ گئے۔ اس کے بعد ایک بج کر ۳۰ منٹ تک کوئی نہ کوئی اس کمرے میں جاتا رہا جہاں حضرت

اقدس آرام فرما رہے تھے۔ لیکن بدن میں حرکت یا بے داری کا کوئی اثر نہیں پایا۔ جب دیکھا کہ ڈھائی بج چکے ہیں اور ظہر کی نماز کا وقت مولانا کے معمول سے زیادہ ہو رہا ہے تو حضرت کے گھر میں سے تشریف لے گئیں اور اٹھانا چاہا۔ بار بار آواز دی، لیکن کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی، نہ آنکھ کھول کر دیکھا، نیند ہے کہ وہ ٹوٹتی ہی نہیں۔ اب گھبراہٹ شروع ہوئی۔ باہر سے مولانا اسعد سلمہٗ کو بلایا گیا۔ انھوں نے نبض کو دیکھا تو نبض نہیں تھی۔ اس کے بعد فوراً قاری اصغر علی صاحب کو بلایا گیا۔ مجھے بھی دارالحدیث میں سید راحت میاں سلمہٗ نے جب کہ میں ابوداؤد شریف کا سبق پڑھا کر تین بجے حاضری لے رہا تھا، یہ خبر دی کہ حضرت کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہے، جلد چلیے۔ خدا کی شان میں اور مولانا محمد حسین صاحب بہاری مدرس دارالعلوم دیوبند اسی وقت بہ ذریعہ کار جلال آباد ضلع مظفر نگر کے مدرسہ مفتاح العلوم کے سالانہ جلسے کی شرکت کے لیے سوار ہو کر روانہ ہونے والے تھے، حق تعالیٰ کا بڑا احسان ہے اور شکر ہے کہ پہلے ہی یہ اطلاع مل گئی۔ فوراً گھبرا کر زنان خانے میں پہنچا۔ دیکھا کہ حضرت بالکل سو رہے ہیں۔ موت کے کوئی آثار نمایاں نہیں ہیں۔ نہ آنکھیں کچھ کھلی ہیں نہ منہ پر کچھ آثار پروازِ روح کے ہیں، نہ چہرے پر مردنی ہے۔ اس حالت کو دیکھ کر حیران ہوا۔ نبض دیکھی تو نبض بالکل ساقط تھی۔ صدعین پہ ہاتھ رکھے تو کچھ نہ پایا۔ دل گھبرا گیا۔ اتنے میں حکیم محمد عمر صاحب اور اس کے بعد ڈاکٹر صاحب تشریف لے آئے اور انھوں نے قلب پر آلہ لگا کر وہ خبر سنائی کہ جس کے سننے کے لیے کوئی کان اور باور کرنے کے لیے کوئی دل تیار نہ تھا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس وقت مولانا سلطان الحق صاحب ناظم کتب خانہ دارالعلوم، مولانا سعید احمد صاحب نبیرہ حضرت مولانا گنگوہیؒ مدرس دارالعلوم بھی پہنچ چکے تھے۔ چار پائی کو درست کیا گیا۔

مگر عجیب شان دیکھی اب نہ آنکھیں بند کرنے کی ضرورت پیش آئی، نہ لبوں کو سمیٹنے کی، یہ سب باتیں خود بہ خود ہو گئیں۔ آنکھیں اس طرح بند کہ اوپر کی پلک نیچے والی سے پیوست، دہن مبارک اس طرح بند کہ اوپر کا ہونٹ نیچے کے ہونٹ سے بالکل ملا ہوا۔ چہرہ قبلہ رخ، چہرے پر آثار مسرت اور بشاشت کے نمایاں اثرات، یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ

حضرت اس دنیا سے رحلت فرما گئے ہیں۔ جس سے میں یہ سمجھنے پر مجبور ہوا کہ حضرت نے مراقبۂ ذات اور مشاہدۂ ذات کی حالت میں آنکھیں بند کر کے ہم سب کو چھوڑ کر اپنے رفیق اعلا سے دائمی ملاقات کی دولت پائی۔

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہٗ مہتمم دارالعلوم جو ۵/دسمبر جمعرات کی شام کو چھ بجے سہارن پور پہنچ کر بہ ذریعہ کار جلال آباد تشریف لے جانے والے تھے، خدا کی کارسازی ملاحظہ فرمائیے اور قلب کے فیصلے کی داد دیجیے کہ وہ مراد آباد سے پروگرام کے خلاف چل پڑے اور ٹھیک ساڑھے تین بجے دیوبند تشریف لے آئے، جس کے لیے سہارن پور اسٹیشن پر کار بھیجی جا چکی تھی۔ مغرب کے وقت حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم بھی سہارن پور سے تشریف لے آئے۔ مغرب سے پہلے تذکرہ رہا کہ حضرت کو کس وقت دفن کیا جائے۔ احقر کی یہ رائے تھی کہ جمعہ کی صبح تک کم از کم ضرور تاخیر فرمائی جائے۔ لیکن صاحب زادہ اسعد میاں سلمہٗ اور جناب قاری صاحب خادم خاص دونوں کی شدت سے یہ رائے تھی کہ چوں کہ حضرت شیخ اپنی زندگی میں دفن میں تاخیر کے (فرمان نبوی) کے پیش نظر بالکل مخالف تھے، تو میں یہ نہیں چاہتا کہ ان کے دفن میں تاخیر کی جائے۔ تاہم بات سب کے مشورے سے یہ طے پائی کہ ۹ بجے کے بعد ۱۰ بجے تک نماز جنازہ ہو جائے گی۔ اس درمیان میں حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، کا ٹیلی فون مراد آباد سے موصول ہو گیا کہ وہ تشریف لا رہے ہیں تو کام کرنے والوں نے اس کی کوشش کی کہ وہ شریک نماز جنازہ ہو سکیں۔ اس سلسلے میں روڑکی کے اسٹیشن پر کار بھیجی گئی تاکہ مولانا موصوف کو جلد دیوبند لایا جا سکے۔ مغرب کے بعد غسل کے لیے تیاری شروع ہو گئی۔ حضرت کو اسی کمرے میں غسل دلایا گیا جس میں علالت کے زمانے میں حضرت آرام فرما رہے تھے۔

غسل حضرت شیخ الحدیث اور حضرت قاری محمد طیب صاحب کی ہدایت سے مولانا عبدالاحد صاحب مدرس دارالعلوم، مولانا راشد حسن صاحب دے رہے تھے۔ ان کے معاون مولانا محمد حسین صاحب بہاری، مولانا شوکت علی خاں، مولانا عزیز احمد صاحب بی۔ اے۔ فیض آبادی اور دو حضرت" کے مخصوص تلامذہ میں سے مولوی محمد عثمان ہزاروی و مولوی محمد زکریا کراچوی تھے اور یہ احقر فخر الحسن بھی اول سے آخر تک موجود رہا۔ ان کے علاوہ مولانا بشیر احمد خاں صاحب و مولانا نصیر احمد صاحب و مولانا محمد ہارون صاحب بھی کچھ وقت کے

لیے موجود تھے۔ اکابر کی ہدایت کے مطابق نیز حضرتؒ کی خواہش کے موافق اُس تولیہ کی جس میں حضرتؒ نے یہ آخری حج بیت اللہ کا احرام باندھا تھا، کفن کی قمیض بنائی گئی اور اس قمیض میں اُن تبرکات کو جو حضرتؒ کے نزدیک جان سے زیادہ عزیز تھے، قلب کی جانب پیوست کر کے کفنا دیا گیا۔ تبرکات کی تفصیل میں قصداً نہیں ذکر کر رہا۔ جس کا جی چاہے مولانا اسعد سلمہٗ سے معلوم کر سکتا ہے اور یہ قول حضرت شیخ الحدیث مدظلہٗ جو انھوں نے اس وقت ہی یہ جملے مجھے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ "یہ شیخ جو سراسر تبرک ہیں، ان کو تبرکات کی حاجت نہیں، لیکن تم اپنی تمنائیں پوری کرلو، جنازہ اب تیار ہو گیا۔" رات کے آٹھ بج چکے ہیں۔ اب باہر لے جانے کی فکر ہے۔ سب غیر مرد باہر ہو گئے۔ اب گھر کی عورتوں نے حضرتؒ کے چہرۂ اقدس کی زیارت کی اور یہ ان کے لیے اب آخری دیدار تھا۔ اس میں کافی وقت صرف ہو گیا۔ ۹ بجے کے قریب جنازہ حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم کے نظم سے اس دروازے سے باہر لایا گیا جو زنان خانے کا دوسرا دروازہ کہلایا جاتا ہے۔ جو بڑے دروازے اور پھاٹک کی طرف ہے۔ جنازے کی چارپائی میں باہر لا کر لانبی لانبی دائیں بائیں دو بلیاں باندھی گئی تھیں تاکہ جنازہ اٹھانے کی سعادت زیادہ سے زیادہ محبین کو مل سکے۔ لیکن مجمع اس قدر تھا کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ بار بار مجھ سے کہا گیا کہ نظم کیا جائے۔ میں نے عرض کیا کہ میں آج نظم سے عاجز ہوں۔ یہ مجمع میرے بس کا ہرگز نہیں ہے۔ آخر بڑا پھاٹک کھلا، میں پھاٹک کھلنے سے پہلے باہر پہنچا۔ مولانا محمد عثمان صاحب نبیرہ حضرت شیخ الہندؒ اور مولانا راشد حسن صاحب ہم تینوں نے چلاّ چلاّ کر سب کچھ کہہ لیا، لیکن کوئی اثر نہیں ہوا۔ آخر میں مجمع نے کچھ جگہ دی اور جنازہ مولسری کے احاطے میں نودرہ کے سامنے لے جانے کے لیے روانہ ہو گیا۔ میں بھی آگے آگے تھا۔ لیکن میں نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے مجمعوں کے انتظام کیے ہیں، لیکن اس رات تو اس قدر مجھ پر دھکے پڑے، اور مجھ پر ہی کیا نہ معلوم کتنے دبے، کتنے بچے، کتنوں کو دھکے دیے گئے، بوڑھوں کو ان کے بڑھاپے کا خیال کیے بغیر دھکوں کا شکار کیا گیا۔ الامان الحفیظ! مشکل سے یہ پانچ منٹ کا راستہ پچاس منٹ میں طے کیا گیا۔ نودرہ کے سامنے جنازہ پہنچا تو اب جنازہ رکھنے کی جگہ میں جو لوگ پکڑے ہوئے تھے وہ چھوڑنے کو تیار نہیں۔ بڑی مشکل سے دس منٹ کے بعد جنازہ نودرہ کے سامنے رکھا گیا۔ اس کے بعد جہاں پر اذان پنج وقتہ دی جاتی ہے وہاں لاؤڈ اسپیکر کو کھلوا

کر اعلان کیا اور بار بار چلایا تب جا کر مجمع کچھ سکون پر آیا اور سب لوگ جہاں جہاں تھے اپنی جگہ بیٹھ گئے۔

اس کے بعد حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ کا جنازہ دار الحدیث کے زیریں ہال میں رکھا گیا اور انتظام کے ساتھ اس کا موقع دیا گیا کہ لائن وار لوگ جائیں اور حضرت شیخؒ کا آخری دیدار کر لیں۔ یہ سلسلہ تقریباً ۱۲ بج کر ۳۰ منٹ تک جاری رہا۔ بہت سا مجمع اوپر کی گیلری سے جا کر، جو چاروں طرف ہے جس میں ہزاروں آدمی بہ یک وقت زیارت کر سکتے ہیں زیارت کر رہے تھے، آرہے تھے اور جا رہے تھے۔ آخر کار بارہ بج کر ۴۰ منٹ پر نمازِ جنازہ شروع ہوئی۔ نمازِ جنازہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی دامت برکاتہم نے پڑھائی۔ نمازیوں کا مجمع اس قدر تھا کہ میں اس کا اندازہ نہیں کر سکتا۔

مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ سیکڑوں کی تعداد میں دیوبند کے برادرانِ وطن اہل ہنود بھی شامل تھے، جنھوں نے یک دم وفات کی خبر پاتے ہی اپنی اپنی دکانیں بند کر دی تھیں اور شوگر مل بھی فوراً بند کر دیا گیا تھا اور مل کے ذمے داران اور مالکان برابر شریک رہے۔

ایک بجے شب کے قریب جنازہ شمالی دروازے سے دار جدید ہو کر قبرستان لے جایا گیا۔ یہ مسافت قریبہ جو زیادہ سے زیادہ آٹھ منٹ میں جنازہ کے ساتھ عموماً طے کر لی جاتی ہے اس میں پورا ڈیڑھ گھنٹہ صرف ہوا۔ جنازے کے قبرستان میں پہنچنے کے بعد جہاں شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب، مولانا محمد یوسف صاحب (امیر تبلیغ جماعت) حضرت مولانا حفظ الرحمٰن ناظم اعلا جمعیت علماے ہند، حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب، حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب و دیگر اکابر بھی موجود تھے، قبر میں جناب مولانا عبدالاحد صاحب، صاحب زادہ مولانا اسعد صاحب سلمہٗ، مولانا راشد حسن صاحب، مولانا شوکت علی خاں صاحب نے اتارا اور قیامت تک کے لیے اس خزینۂ علم و معرفت کو آرام سے سلا دیا۔

مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ ۝

(سورۂ طٰہٰ: ۵۵)

جمعرات کی اس رات میں اور جمعہ کے دن بھر کوئی گاڑی ٹرین، لاری، بس، پرائیوٹ کار ہی نہ تھی جو حضرت شیخ کے جنازے کی شرکت کے لیے سیکڑوں ہزاروں کی تعداد

ئیں متوسلین کو دیو بند نہ پہنچا رہی ہو اور یہ سلسلہ تو آج ۱۳ر دسمبر کو ان سطور کے لکھنے تک برابر جاری ہے اور نہ معلوم کب تک جاری رہے گا۔

جمعہ ۶ر دسمبر کو حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم دامت برکاتہم کی زیر قیادت ایک تعزیتی جلسہ دارالعلوم کے بڑے ہال میں ہوا، جس میں رقت آمیز تعزیتی کلمات حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے فرمائے، اس کے بعد حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مدظلہ کے لیے فرمایا گیا کہ وہ اپنی قوت قلبی کو کام میں لاکر کچھ ارشاد فرمائیں، لیکن مولانا موصوف تو کھڑے ہوتے ہی بے اختیار ہو گئے۔ کچھ کہنا چاہیں نہ کہا جائے، آخر دل پر قابو پایا اور آپ نے ایک مختصر و جامع عالمانہ تقریر فرمائی۔ اس کے بعد جلسہ دعا پر برخواست ہوا۔

اساتذہ اور طلبہ کی پژمردگی میں تو آج تک تخفیف نہیں۔ لیکن شریعت مطہرہ نے صرف تین دن عزا کی اجازت دی ہے۔ چناں چہ تین روز مسلسل قرآن خوانی، تسبیح و تہلیل اور ایصال ثواب ہوتا رہا۔ اسباق بند رہے، اساتذہ، طلبہ اور جملہ کارکنان دارالعلوم دیو بند اس مشغلۂ پاک سے دل بہلاتے رہے۔ اس کے بعد اسباق شروع ہو گئے، مگر ایصال ثواب کا یہ سلسلہ آج تک جاری ہے اور ان شاء اللہ تا قیامت جاری رہے گا۔

اللّٰھم ارفع درجات الشیخ فی جنات النعیم بمنك و کرمك برحمتك یا ارحم الراحمین۔

حضرت شیخ قدس اللہ سرہٗ العزیز کا ادنیٰ تلمیذ
احقر فخر الحسن

مدرس دارالعلوم دیو بند،

۲۰ر جمادی الاول ۱۳۷۷ھ جمعۃ المبارک / ۱۳ر دسمبر ۱۹۵۷ء

۹؍دسمبر ۱۹۵۷ء: مرکزی وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد نے حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کے سانحۂ انتقال پر ایک تعزیتی بیان دیا ہے۔ انھوں نے کہا:

"ہندوستان کی جنگ آزادی میں مولانا حسین احمد مدنی کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ ان کے والد اپنے پورے خاندان کے ساتھ مدینۂ منورہ چلے گئے۔ مولانا مدینہ ہی میں تعلیم دینے لگے۔

مولانا محمود حسن کی گرفتاری کے ساتھ مولانا مدنی بھی گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیئے گئے تھے۔ جنگ ختم ہونے کے بعد جب وہ رہا کیے گئے تو مولانا مدنی بھی ہندوستان آ گئے۔"

مولانا آزاد نے کہا:

"مولانا مدنی اترپردیش کانگریس کے چوٹی کے رہنماؤں میں تھے اور جب بھی کانگریس نے کوئی تحریک شروع کی تو مولانا نے ضرور اس میں شرکت کی۔" (مدینہ: ۹؍دسمبر ۱۹۵۷ء)

حضرت شیخ الاسلامؒ کے الم ناک حادثۂ انتقال پر بلاتفریق مذہب و قوم ہر طبقۂ خیال اور مکتبۂ فکر کے مسلمانوں اور غیر مسلموں نے اظہار رنج کیا ہے اور حکومت اور عوام کے حلقوں نے یکساں طور پر جلسوں اور اخبارات میں مراسلات و پیغامات کے ذریعے حضرت کے ورثا اور جمعیت علمائے ہند کے ارکان سے تعزیت کی ہے۔ ان میں ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر جمہوریۂ ہند، پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم ہندوستان بھی شامل ہیں۔

حضرت شیخ الاسلامؒ کے حادثۂ وفات کے موقع ہندوستان، پاکستان اور یورپ، ایشیا اور افریقہ کے ممالک کے سیکڑوں اکابر و مشاہیر اور قومی، سیاسی، دینی رہنماؤں کے پیغامات اور علمی تعلیمی اداروں اور سیاسی سماجی جماعتوں کے خصوصی اجلاسوں کی قرار دادوں سے روزنامہ الجمعیۃ۔ دہلی، مدینہ۔ بجنور اور دوسرے اخبارات و رسائل کے صفحات بھرے ہوئے ہیں۔

جانشین شیخ الہندؒ کی وفات:

۱۲؍دسمبر ۱۹۵۷ء: حضرت شیخ الاسلامؒ کی وفات پر مولانا عبدالماجد دریابادی نے

اپنے ہفت روزہ صدق جدید-لکھنؤ میں جو تعزیتی نوٹ شائع کیا ہے درج کیا جاتا ہے:

''پرچہ مرتب ہو چکا تھا کہ خبر ملی کہ جانشین شیخ الہندؒ اور شیخ الحدیث وصدر دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا حسین احمد معروف بہ مولانا مدنی نے ایک طویل اور صبر آزما علالت کے بعد جمعرات ۶/دسمبر کے ۳ بجے سہ پہر کو اپنے مستقر دیوبند میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

نہ صرف ہندوستان بلکہ کہنا چاہیے کہ عالم اسلامی کے لیے یہ ایک حادثۂ عظیم ہے۔ مولانا اپنے علم وفضل سے قطع نظر اپنے بعض اخلاقی کمالات کے لحاظ سے بھی بالکل فرد تھے۔ مولانا کی علمی حیثیت سے شاگرد اور باطنی حیثیت سے مسترشدین بے شمار تعداد میں ہندوستان، پاکستان بلکہ بعض اور بلاد اسلامیہ میں بھی پھیلے ہوئے ہیں۔ ان سب کی خدمت میں مخلصانہ تعزیت عرض ہے۔'' (صدق جدید: ۱۲/دسمبر ۱۹۵۷ء، ص۲)

پاکستان میں شیخ الاسلامؒ کا ماتم:

۱۲/دسمبر ۱۹۵۷ء: لاہور، یہاں شیخ الہند مولانا حسین احمد مدنیؒ کی رحلت پر تمام مذہبی اور سماجی حلقوں میں شدید رنج وغم کا اظہار کیا گیا۔ امیر جماعت اسلامی مولانا مودودی نے دیوبند میں مولانا حسین احمد کے بڑے لڑکے مولانا اسعد مدنی کو تعزیت کا پیغام بھیجا ہے۔

مولانا مظہر علی اظہر نے ایک بیان میں کہا ہے کہ شیخ الہندؒ کی وفات حسرت آیات سے علم وعمل اور مذہب وسیاست کے حلقوں میں خلا پیدا ہوا ہے، اسے پُر کرنا ان کے عقیدت مندوں اور قدر دانوں کے بس کی بات نہیں۔ مالٹا کی اسیری سے لے کر آزادیٔ ہند تک آپ کو ایک ناسازگار ماحول میں کام کرنا پڑا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آپ کو آخری لمحات زندگی میں بھی سرد آہوں اور گرم آنسوؤں سے نجات حاصل ہوئی یا نہیں! تاہم امید ہے کہ خدمت ملک وملت کی خارزار وادی میں جس عزم وخلوص سے آپ نے ایک عمر گزاری ہے اس کے لیے آپ کے عقیدت مند جدوجہد جاری رکھیں گے۔

مولانا مجاہد الحسینی نے ایک بیان میں کہا ہے کہ ایشیا کی سب سے بڑی اسلامی درس

گاہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنی کا سانحۂ ارتحال دنیائے اسلام کے لیے ایک حادثۂ عظیم کی حیثیت رکھتا ہے۔ مولانا کو نہ صرف زہد وتقویٰ اور علم وفضل کے اعتبار سے اعلا مقام حاصل تھا بلکہ جنگ آزادی کی تاریخ میں آپ کے مجاہدانہ کارنامے بھی مثالی حیثیت رکھتے ہیں۔

مدرسہ جامعۂ حنفیہ ٹمپل روڈ لاہور میں حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی صدر جمعیت علمائے ہند شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کی وفات حسرت آیات کی وجہ سے مدرسہ کے اساتذۂ کرام وطلبہ نے بہ غرض ایصال ثواب تین بار قرآن کریم ختم کیا۔ مدرسہ کے ناظم اعلا مولانا عبدالحلیم قاسمی اور ناظم مولانا عبدالعلیم قاسمی نے خطبات جمعہ میں حضرت شیخ الاسلام مرحوم ومغفور کی مجاہدانہ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور اجتماع عام نے حضرت مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کے بعد مندرجہ ذیل قرارداد تعزیت منظور کی۔

مسلمانانِ لاہور کا یہ عظیم اجتماع حضرت شیخ الہند مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے حادثۂ ارتحال کو دنیائے علم کے لیے ایک سانحۂ عظیم تصور کرتا ہے اور حضرت مدنیؒ کی وفات حسرت آیات سے دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے خصوصاً جو عظیم نقصان ہوا ہے وہ ناقابل تلافی ہے۔ حق تعالیٰ حضرت شیخ الہند کو مقام اعلیٰ علیین عطا فرمائے۔ اس کے علاوہ مسجد شیرانوالہ اور مسجد شاہ محمد غوث میں بھی تعزیتی قراردادیں منظور کی گئیں۔

پشاور میں سرحد نیشنل عوامی پارٹی نے مولانا حسین احمد مدنی کی وفات کا سوگ منایا۔ پارٹی کے صدر دفتر سے ایک سرکلر شایع کیا گیا ہے جس میں آزادی کی راہ میں مولانا کی قربانیوں کا بالتفصیل ذکر کیا گیا ہے۔ مولانا مرحوم جو خلافت اور کانگریس کے ممتاز رہنماؤں میں سے تھے ہمیشہ جنگِ آزادی کی صف اول میں ہی رہے۔

(مدینہ۔بجنور: ۷/دسمبر ۱۹۵۷ء)

دہلی میں تعزیتی جلسہ:

۲۱/دسمبر ۱۹۵۷ء: دہلی کے رام لیلا گراؤنڈ میں کانگریس کمیٹی دہلی کے زیر اہتمام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے سانحۂ انتقال پر ایک تعزیتی جلسہ ہوا۔ اس جلسے میں صدر آل انڈیا کانگریس مسٹر یو این دھیبر، مولانا ابوالکلام آزاد وزیرِ تعلیم اور پنڈت جواہر لال نہرو وزیرِ اعظم اور دوسرے بہت سے مختلف جماعتوں کے سیاسی رہنماؤں اور حکومت

کے اہم اراکین نے تقریریں کیں اور حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو خراج عقیدت پیش کیا۔ صدر کانگریس مسٹر ڈھیبر نے کہا:

''صدر صاحب، بہنو اور بھائیو! آج ہم مولانا حسین احمد مدنیؒ کی وفات کا غم منانے جمع ہوئے ہیں، ایک زمانہ تھا جب ہمیں انگریزوں اور فرقہ پرستی کا مقابلہ کرنا تھا اور اس کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمارے پاس جو بڑا خزانہ تھا اس خزانے میں بہت سے پنّے (ہیرے جواہرات) تھے۔

ان میں سے ایک پنہ (ہیرا) تھا مولانا مدنیؒ انھوں نے اپنی ساری زندگی ملک کے لیے وقف کردی تھی۔ وہ مختلف ممالک میں گھومے، ان کے دل میں ایک تمنا تھی کہ میرے ملک کا جھنڈا اُونچا رہے اور عوام آزاد ہوں اور جب انھوں نے دیکھا کہ گاندھی جی کی قیادت میں ہمیں اور آسانی سے آزادی حاصل ہوسکتی ہے تو انھوں نے ان کے ساتھ مل کر کام کیا، بعد میں اس کے علاوہ کوئی دوسرا طریقہ نہیں سوچا۔ ایک وقت آیا جب ہندوستان میں فرقہ پرستی کی ہوا چلی۔ بہت سے لیڈر اس میں بہہ گئے، لیکن مولانا نے خواب میں بھی نہیں سوچا کہ اپنی پالیسی سے ہٹیں۔

انھوں نے طے کرلیا تھا کہ میں نے اپنا دایاں ہاتھ ہندوستان کو دے دیا ہے اور میں ترنگے جھنڈے کے نیچے آگے بڑھوں گا اور اسی کے نیچے رہ کر ملک کو آزاد کرانا میرا فرض ہے۔

جیل میں بھی انھوں نے بڑی مصیبتیں سہیں اور آزادی کے بعد بھی خدمت کرتے رہے۔ تعلیم کے معاملے میں جو ملک کا بنیادی سوال تھا اس میں بھی وہ پوری طرح مصروف رہے۔ ان کی وفات سے ایک اور جگہ خالی ہوئی اور بھارت کا ایک خدمت گار چل بسا۔ ان کی زندگی سے ہمیں یہ سبق لینا چاہیے کہ ہم بھارت کے ہیں اور ہم سب کو ایک خاندان کی حیثیت سے یہاں رہنا ہے۔ یہی سبق لے کر ہمیں یہاں سے جانا چاہیے۔''

پنڈت جواہر لال نہرو نے حضرت مولاناؒ کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا:

''صدر صاحب، بھائیو اور بہنو! ایسے موقع پر مجھے کافی دقت ہوتی ہے کہ کیا کہا جائے۔ یہ کوئی بحث کی بات نہیں، بہت وجوہ کی بنا پر دل کو دھچکا لگتا ہے اور اس کا اظہار کرنا مناسب ہے۔ مجھے پرانا زمانہ یاد آتا ہے جب مولانا حسین احمدؒ نے ہندوستان کی جنگِ

آزادی میں حصہ لیا۔ مولانا مدنی" سے تیس پینتیس برس سے کچھ میرا بھی تعلق رہا۔ وہ ایک زمانے تک کانگریس کے بڑے لیڈروں میں رہے۔ میں جب اس وقت کا خیال کرتا ہوں تو کئی تصویریں میرے سامنے آجاتی ہیں۔

شروع میں خلافت کا سوال اُٹھا، پھر عدم تعاون کی تحریک شروع ہوئی، بڑھتے بڑھتے سوراج کی تحریک بن گئی۔ ساری تحریک میں وہ ہمارے ساتھ رہے اور ہم نے طرح طرح کے تجربے حاصل کیے۔

مولانا مدنی کے گزر جانے سے اس زمانے کی اور آج کے زمانے کی ایک اور کڑی نکل گئی، جو باقی کڑیاں ہیں وہ بھی رفتہ رفتہ نکل جائیں گی اور پھر آج ہی کے نوجوانوں کو سارا بار اپنے کندھوں پر لینا ہوگا۔ وہ اس بار کو کیسے سنبھالیں گے؟ یہ دیکھنے کی بات ہے کہ پرانے زمانے نے ہمیں کچھ سبق دیے ہیں جو اس نئے زمانے کو یاد رکھنے چاہییں اور ان سبق دینے والوں میں مولانا مدنی بڑے لیڈروں میں تھے۔

وہ بہت روز سے بیمار تھے، ضعیف بھی ہو گئے تھے لیکن جب خاص خطرے کا موقع آتا تھا تو سب سے آگے آتے تھے۔ ملک میں طرح طرح کی بحثیں اٹھیں، ان کا اٹھنا قدرتی تھا، کیوں کہ یہاں مختلف مذاہب ہیں۔ سیاسی بحثیں بھی پیدا ہوتی تھیں لیکن ۱۹۴۰ء سے آگے کھل کر یہ تصویر سامنے آئی اور اس بات پر غور ہوا کہ ہمارے درمیان کیا رشتے ہونے چاہییں۔ بعد میں دستور بنا تو اس میں بھی اس کو رکھا گیا۔ یقیناً اس پر بہت کچھ عمل بھی ہوا۔ لیکن پھر بھی یہ سمجھنا کہ پوری طرح اس پر عمل ہوا صحیح نہ ہوگا۔

اب بھی جذبات بھڑکتے ہیں، کش مکش ہوتی ہے، پریشانیاں ہوتی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک سماج میں کچھ کمزوریاں ہیں، لیکن اس پر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ انقلابی زمانے میں اونچ نیچ ہوتی ہی ہے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ عام جھکاؤ کس طرف ہے۔ ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ قوم غلط طرف نہ جھک جائے۔ اندرونی جھگڑے اپنا اثر پیدا کرتے ہیں، اس لیے ہمیں ہوشیار رہنا ضروری ہے۔ اصولی طور پر ایک مذہب کے لوگ اپنے آپ کو الگ قوم سمجھیں۔ یہ آج کے زمانے کی بات نہیں، خاص طور سے ہندوستان میں جہاں سیکڑوں، ہزاروں برس سے بہت سے مذہبوں کے لوگ رہ رہے ہیں، وہ قوم کی حیثیت سے سب ایک ہیں۔ مذہبی کش مکش مناسب نہیں۔ اس سے ملک کی

ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوگی۔ یہ تعجب کی بات ہے کہ اس ملک میں فرقہ پرست جماعتیں اب تک موجود ہیں اور وہ نہیں سمجھتیں کہ وہ کس دنیا میں رہتی ہیں۔

مولانا حسین احمدؒ نے جو پالیسی اختیار کی اس سے بڑا فایدہ پہنچا۔ ہماری ذمے داری ہوجاتی ہے کہ اس سبق کو یاد رکھیں اور اس پر عمل کریں اور بھولے بھٹکوں کو سنبھالیں۔ جب بڑا آدمی گزر جاتا ہے تو کوئی نہ کوئی سندیسہ اور سبق دے جاتا ہے۔ ضروری ہے کہ ہم اس کی قدر کریں اور اس سبق کو یاد رکھیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ مولانا حسین احمدؒ کی زندگی سے ہمیں جو سبق ملتا ہے اسے ہم یاد رکھیں گے اور اس پر عمل کریں گے۔

اس کے بعد تعزیتی قرارداد منظور ہوگئی اور تمام حاضرین دو منٹ تک خاموش کھڑے رہے۔'' (مدینہ۔ بجنور: ۲۱ر دسمبر ۱۹۵۷ء)

مولانا ابوالکلام آزاد وزیرِ تعلیم ہند نے لیلا گراؤنڈ دہلی کے جلسۂ تعزیت میں تقریر کرتے ہوئے حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے بارے میں فرمایا:

''دوستو! ہم آج یہاں اس لیے جمع ہوئے ہیں کہ مولانا حسین احمد مدنی مرحوم کے انتقال پر غم وافسوس کا اظہار کریں۔

مولانا مرحوم نے ملک کی جو خدمتیں کی ہیں ان کی بڑی قدر و قیمت ہے اور وہ اس قدر شان دار ہیں کہ ہم انھیں فراموش نہیں کر سکتے۔ ابھی ان کی عمر چھوٹی تھی کہ ان کے والد فیض آباد سے حجاز چلے گئے، تاکہ زندگی کے آخری دن مدینۂ منورہ بسر کرسکیں۔ یہ بھی ان کے ہم راہ چلے گئے۔ جو لوگ حجاز چلے جاتے ہیں ان میں سے اکثر ایسے ہوتے ہیں کہ اپنے گزارے کے لیے اوقاف پر اعتماد کرتے ہیں۔ لیکن ان کے خاندان نے ایسا نہیں کیا بلکہ انھوں نے بساطی کی دکان کی، اس سے خاندان کا خرچ چلا اور اسی حالت میں انھوں نے تعلیم حاصل کی۔ ہندوستان آئے مگر پھر مدینۂ منورہ چلے گئے اور پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہے۔ اس وقت ان کا سیاست سے تعلق نہ تھا۔ ۱۹۱۶ء میں شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ حجاز گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شریفِ مکہ برطانیہ سے مل کر بغاوت کا انتظام کررہا تھا، ان کی موجودگی میں بغاوت کا نعرہ بلند ہوا، یہ مولانا محمود حسنؒ برداشت نہ کرسکتے تھے۔

کسی طرح یہ خبر سنی گئی کہ وہ (شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ) بغاوت کے خلاف ہیں۔ شریف حسین نے انھیں جدہ لا کر برطانیہ کے حوالے کردیا۔ ان کی گرفتاری ہوئی تو

مولانا حسین احمد مدنی نے اکیلے رہنا پسند نہ کیا اور انھوں نے بھی اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔ چناں چہ مالٹا میں دونوں کو نظر بند کر دیا گیا۔ جنگ ختم ہوئی اور مولانا محمود حسن صاحبؒ اور ان کے ساتھیوں کی رہائی عمل میں آئی۔ وہاں سے وہ ہندوستان آئے۔

کچھ دن بعد کلکتہ کی جامع مسجد میں میں نے مدرسہ کھولا تاکہ عدم تعاون کے سلسلے میں جن طلبہ کو کالج چھوڑنا پڑا تھا ان کی تعلیم کا انتظام ہو سکے۔ اس مدرسے میں مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ مدرس اول رہے اور وہاں کام کرتے رہے، لیکن وہ سیاسی جلسوں میں بھی شریک ہوتے تھے اور سرگرم پارٹ ادا کرتے تھے۔ ۱۹۳۰ء میں انھوں نے اپنے آپ کو آزادی کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ کانگریس کی تحریک میں انھوں نے مردانہ وار حصہ لیا اور قید و بند کی مصیبتیں سہیں، اس سے بھی زیادہ مصیبتیں وہ تھیں جو اپنے ہی ہم مذہبوں کے ہاتھوں انھیں پیش آئیں۔

۱۹۴۵ء میں جب الیکشن ہوا تو انھوں نے کانگریس کی طرف سے دورہ کیا اور اپیل کی کہ مسلمان کانگریس کو ووٹ دیں۔ اس کی انتہائی غیر شریفانہ طریقے سے مخالفت کی گئی۔ ضلع ہبلی کے مقام پر تو ان کی جان کے لالے پڑ گئے۔ ریلوے پولیس نے مداخلت نہ کی ہوتی تو جان کا خطرہ تھا۔ لیگیوں نے عوام کو دھوکا دے کر مذہبی پاگل پن کو اُجاگر کیا اور جب عوام میں پاگل پن ہو جائے تو اس کی کوئی حد نہیں ہوتی۔

لیکن مولانا مدنیؒ پہاڑ کی طرح جمے رہے اور ان کی استقامت میں تزلزل نہیں ہوا۔ انھوں نے یوپی کا دورہ کیا۔ وہاں بھی بعض مقامات پر پتھر پھینکے گئے لیکن وہ اپنے اصول پر قایم رہے۔ انھوں نے جو روش اختیار کر لی تھی اور جسے ایمان سمجھتے تھے اس پر قایم رہے۔ ان کی ذات محترم تھی۔ ان کا انتقال قومی نقصان ہے۔ مجھے یقین ہے کہ سب کے دل میرے ساتھ ہیں اور سب ان کی وفات کو قومی نقصان سمجھتے ہیں۔ درگاہِ خداوندی میں دعا ہے کہ وہ انھیں اپنی رحمت سے سرفراز فرمائے۔

(مدینہ۔ بجنور: ۲۱ر دسمبر ۱۹۵۷ء)

حضرت شیخ الاسلام کے شاگردوں کی تعداد:

(از مولانا قاری محمد میاں صاحب، مدرس مدرسۂ عالیہ فتح پوری۔ دہلی)

دار العلوم دیوبند نے اپنی پوری مدت چورانوے سال میں جو فضلا پیدا کیے ہیں ان

کی تعداد ۶,۶۳۰ ہوتی ہے۔ اس میں سے ۳,۸۵۶ صرف حضرت شیخ الاسلام کے شاگرد ہیں۔ باقی ۲,۷۷۴ دیگر مشائخ رحمہم اللہ کے۔

حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہٗ ۱۳۴۶ھ میں دارالعلوم دیوبند کی مسندِ حدیث پر رونق افروز ہوئے ۱۳۴۶ھ سے ۱۳۷۷ھ تک کے فضلا کی تعداد سنہ وار نقشۂ ذیل سے ظاہر ہے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ دارالعلوم کی ایک صدی کے پورے سرمایے میں سے نصف سے زاید حصہ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کا ہے۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء

ہجری	عیسوی	تعداد طلبہ	ہجری	عیسوی	تعداد طلبہ
۱۳۴۶ھ	۱۹۲۸ء	۶۸	۱۳۶۲ھ	۱۹۴۴ء	۱۶۰
۱۳۴۷ھ	۱۹۲۹ء	۶۵	۱۳۶۳ھ	۱۹۴۵ء	۱۵۸
۱۳۴۸ھ	۱۹۳۰ء	۹۰	۱۳۶۴ھ	۱۹۴۶ء	۲۱۵
۱۳۴۹ھ	۱۹۳۱ء	۹۱	۱۳۶۵ھ	۱۹۴۷ء	۲۰۶
۱۳۵۰ھ	۱۹۳۲ء	۱۲۵	۱۳۶۶ھ	۱۹۴۸ء	۱۱۶
۱۳۵۱ھ	۱۹۳۳ء	۱۵۶	۱۳۶۷ھ	۱۹۴۹ء	۱۵۷
۱۳۵۲ھ	۱۹۳۴ء	۱۶۱	۱۳۶۸ھ	۱۹۵۰ء	۱۴۸
۱۳۵۳ھ	۱۹۳۵ء	۱۹۶	۱۳۶۹ھ	۱۹۵۱ء	۱۲۱
۱۳۵۴ھ	۱۹۳۶ء	۱۵۸	۱۳۷۰ھ	۱۹۵۲ء	۱۲۸
۱۳۵۵ھ	۱۹۳۷ء	۱۸۸	۱۳۷۱ھ	۱۹۵۳ء	۱۲۶
۱۳۵۶ھ	۱۹۳۸ء	۱۸۳	۱۳۷۲ھ	۱۹۵۴ء	۱۴۱
۱۳۵۷ھ	۱۹۳۹ء	۱۷۴	۱۳۷۳ھ	۱۹۵۵ء	۱۱۹
۱۳۵۸ھ	۱۹۴۰ء	۱۵۷	۱۳۷۴ھ	۱۹۵۶ء	۱۴۸
۱۳۵۹ھ	۱۹۴۱ء	۱۹۳	۱۳۷۵ھ	۱۹۵۷ء	۱۴۱
۱۳۶۰ھ	۱۹۴۲ء	۲۲۹	۱۳۷۶ھ	۱۹۵۸ء	۱۶۴
۱۳۶۱ھ	۱۹۴۳ء	۱۹۳	۱۳۷۷ھ		۱۸۴

کل میزان: ۳۸۵۶

نوٹ: واضح رہے کہ مدارس اسلامیہ میں تعلیمی سال شوال المکرم سے شروع ہوتا ہے۔ رجب اور شعبان کے مہینے دروس کے اختتام، امتحانات اور ختم دورۂ حدیث کی تقریبات کے ہوتے ہیں۔ شعبان کے ختم ہوتے ہوتے سالانہ تعطیل کے لیے مدارس بند ہوجاتے ہیں اور عام طور پر اساتذہ وطلبہ اپنے گھروں کو رخصت ہوجاتے ہیں۔ شوال سے نیا تعلیمی سال شروع ہوجاتا ہے۔ اور داخلوں کی تکمیل کے بعد اواخر ماہ تک دروس کا آغاز ہوجاتا ہے۔

حضرت شیخ الاسلام دارالعلوم دیوبند میں شوال ۱۳۴۶ھ مطابق اپریل ۱۹۲۸ء میں تشریف لائے تھے اور صدر المدرسین اور شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کے منصب پر فائز ہوئے اور کامل ۳۰ سال اس منصب علیا پر فائز رہے۔ دارالعلوم میں حضرت کا آخری تعلیمی سال شوال ۱۳۷۶ھ (مئی ۱۹۵۶ء) سے شروع ہوا۔ ۱۹۵۷ء کے آخری چند ماہ میں مرض میں بہت اضافہ ہوگیا تھا اور مولانا سید فخرالدین شیخ الحدیث مدرسہ شاہی مرادآباد کو بلا کر آپ کے دروس انھیں تفویض کردیئے گئے تھے۔ حضرت کے زمانے میں دارالعلوم نے ہمہ جہت ترقی کی۔ مولانا قاری محمد میاں کی تحقیق کے مطابق آپ کی تیس برس کی تدریس کے دوران ۳۸۵۶ طلبہ فارغ التحصیل ہوئے، جب کہ اس سے پہلے کے ۶۴ برس کی مدت میں اس کے نصف سے کم طلبہ (۲۷۷۴) فارغ ہوئے تھے۔ بلاشبہ اس ترقی میں دیگر اسباب کا دخل بھی تھا، لیکن خود حضرتؒ کے قدوم میمنت لزوم اس ترقی کا سب سے بڑا سبب تھا۔

زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

موت التقی حیات لانفاذ لہا
قدمات قوم وھم فی الناس احیاء

"متقی اور پرہیزگار کی موت غیر فانی زندگی ہے، یہ لوگ بہ ظاہر مر چکے ہیں۔
حال آں کہ عالم انسانیت میں دراصل زندہ یہی ہیں۔"

جب عالم مخلوقات کی زبان نقارہ خدا ہوتی ہے تو غور فرمائیے اس کی شان کتنی بلند ہوگی، جس کے لیے اکابر علما اور مشائخ دل کی گہرائیوں سے شہادتیں پیش کریں۔ اسی اصول پر شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق اکابر علما اور مشائخ کی چند شہادتیں پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) **حضرت شیخ الہندؒ اور شیخ الاسلامؒ:** شیخ الہندؒ نے بجائے اپنے شیخ الاسلام کو دارالعلوم کلکتہ کی صدارت سے نوازا اور کلکتہ رخصت کرتے وقت شیخ الہندؒ نے شیخ الاسلام کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر پر رکھا، آنکھوں سے لگایا، سینے سے چمٹایا اور تمام بدن پر اس کو پھیرا، اس وقت کا عالم ہی اور تھا۔ (دیباچہ مکتوبات شیخ الاسلام: جلد ۱، ص ۱۸)

(۲) **حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ:** حضرت مولانا حسین احمد صاحب بہت شریف طبیعت کے ہیں، باوجود سیاسی اختلافات رکھنے کے بھی کوئی کلمہ خلاف حدود ان سے نہیں سنا گیا (اشرف العلوم)۔

میں اپنی جماعت میں مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کے حسن تدبر اور مولانا حسین احمد صاحب کے جوش عمل کا معتقد ہوں۔ ایک صاحب نے حضرت مدنی کے کسی مجاہدانہ عمل کا حوالہ دیتے ہوئے عرض کیا کہ حضرت آپ کا اس پر عمل نہیں ہے؟ فرمایا "بھائی میں ان جیسی (مولانا مدنی جیسی) ہمت مردانہ کہاں سے لاؤں۔"

(مقدمہ و دیباچہ مکتوبات شیخ الاسلام)

(۳) **حضرت مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ صاحبؒ:** حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب فیض آبادی ثم المدنی آسمان علم ہدایت کے آفتاب اور زہد ورع میں یگانہ اور جہاد تخلیص وطن کے ایک ممتاز شاہ سوار ہیں، ہندوستان کے مسلمان ان کی ذات گرامی پر جس قدر فخر کریں بجا ہے........

(۴) **حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہٗ شیخ الحدیث مظاہر العلوم سہارن پور:** میرے نزدیک ابوحنیفۂ زمانہ، بخاریؒ اور جنیدؒ اور شبلیؒ عصر، حضرت اقدس شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مدظلہٗ کی مدح میں کچھ لکھنے والا مادح خورشید مداح خود است کا مصداق ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ مولانا کی اسارت کی خبر پر حضرت مولانا تھانوی قدس سرہٗ نے کس قدر رنج وحزن کا اظہار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا "مجھے خیال نہیں تھا مولانا مدنی سے مجھے اتنی محبت ہے۔" مختصر یہ کہ اس ناکارہ کے نزدیک حضرت مدنی ہی رشد وہدایت اور علم وفضل کے درخشاں آفتاب ہیں۔

(۵) **عارف باللہ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری مدظلہٗ:** بھائی حضرت شیخ مدنی کا ذکر کیا پوچھتے ہو، پہلے تو ہم یوں ہی سمجھتے رہے مگر وقت کی نزاکتوں اور ہنگامہ آرائیوں مین جب ہم نے اس مرد مجاہد کو آنکھ اٹھا کر دیکھا تو جہاں شیخ مدنی کے قدم تھے وہاں اپنا سر پڑا دیکھا۔ اجی حضرت اس وقت ہر دو منصب پر فائز المرام ہیں اور ملک و ملّت کی خاطر باطل کے مقابلے مین حق کا دامن تھام کر جس مردانہ صورت میں استقامت اور استقلال کے ساتھ قربانیاں پیش فرما رہے ہیں یہ شانِ حسینیت کا مظاہرہ ہے۔

(۶) **حضرت مولانا الیاس صاحبؒ:** حضرت مولانا مدنی نے وہ دریا ہضم کیے جن کا ایک جرعہ بھی بے خود کرنے کے لیے کافی ہے۔ (بہ حوالہ مولانا احتشام الحسن صاحب)

(۷) **مناظر اسلام حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی مدظلہٗ:** حضرت مولانا مدنی مدظلہٗ نے وطن وملّت کے لیے عموماً اور لکھنؤ میں مدح صحابہؓ و آزادئ ہند کے سلسلے میں خصوصاً جو بے غرض خدمات انجام دی ہیں ان کی شرح محال ہے۔ بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہی ہے مسلمانانِ عالم کا سچا رہنما جو اس الحاد کدۂ ہند میں مشعل اسلامی لیے پھر رہا ہے۔ مسلمانو! اپنے اس شیر دل انسان کی رہنمائی سے فایدہ حاصل کرو۔ زندہ باد حسین احمد مدنی......

(۸) حضرت مولانا عزیر گل صاحب مدظلہ: مدنی آقا کے پیارے، شیخ الہند محمود حسنؒ کے سچے جانشین، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی مدظلہ العالی کے اوصاف کوئی کیا لکھ سکتا ہے، کسی کی کیا ہمت اور کیا مجال! پھر اگر کوئی جرأت بھی کرے اور دن رات ایک کرے مدت دراز گزر جائے دفاتر پُر ہو جائیں مگر حسین احمد مدنی کے اخلاق و عادات عمل و عبادات اور مجاہدانہ خدمات پر پھر بھی روشنی نہیں ڈال سکتا۔ درحقیقت وہ قابل فخر ہستی ہے کہ جس کی اطاعت میں مسلمانانِ عالم کی دین اور دنیا کی بھلائی اور آزادی ہند کا راز مضمر ہے۔

(۹) شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب: الشیخ العرب والعجم امام الاحرار حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی دامت برکاتہم کی ذات گرامی اور مقدس حالات کوئی کیا لکھ سکتا ہے! یہ خدا کا بندہ ہر آن اور ہر دم ملک وملت اور مسلمانانِ ہند کی فلاح و بہبود کی خاطر اپنا عیش و آرام وقف کیے ہوئے ہے۔ دنیا کو اس وقت مولانا کی سخت ضرورت ہے۔ خدا اس شیر دل مجاہد کو تادیر قایم رکھے۔

نوٹ: یہ تمام رائیں حسین احمد نمبر مرتبہ محمد یوسف صاحب جوہر نہٹور ضلع بجنور اور مقدمہ و دیباچہ مکتوبات شیخ الاسلام سے ماخوذ ہیں۔

نذر عقیدت از رحمت نجمی صاحب میرٹھ: وہ جن کو شیخ حرم شیخ العرب والعجم اور شیخ الاسلام کے پیارے اور مبارک خطابات سے دنیا تقریباً نصف صدی سے یاد کر رہی تھی۔

وہ علوم دینیہ کے بحر ناپیدا کنار اور مسند درس کی زینت تھے، ہر ملک کے تشنگان علوم دینیہ اپنی خاطر خواہ پیاس بجھاتے تھے، خانقاہوں کی وہ رونق تھے، سلوک وطریقت کی بادیہ پیمائی کرنے والوں کو آپ کی ذات سے روحانی غذا ملتی تھی اور معرفت وحقیقت کی راہیں کشادہ ہوتی تھیں۔ محراب ومنبر کو ان کے دم سے زینت تھی، خطیب اعظم اور امام المسلمین تھے، ان کا خطبہ جوش وجلال سے لبریز ہوتا تھا اور سامعین کے قلوب میں گرمی وحرارت پیدا کرتا تھا۔ وہ میدان سیاست میں ایک مجاہد اعظم کی حیثیت سے آئے اور ملت کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر بے دار کیا اور اس کے اندر آزادئ وطن کے لیے ایک جوش ایک ولولہ اور ایثار وقربانی کا ایک ایسا جذبۂ صادقہ پیدا کر دیا اور ایسا غیر فانی جذبہ جس نے برطانوی شہنشاہیت کی تمام مادی وقہرماں طاقتوں کو ہلا کر رکھ دیا۔

حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیح وارث

تھے۔ موصوف نے وراثت کے فرایض کو کما حقہٗ پورا کیا۔ ہاں! آج ساری ملت گواہ ہے کہ آپ نے جانشینی کے فرایض کو کما حقہٗ پورا کیا۔ انھوں نے کلمۂ حق بلند کرنے کے صلے میں اینٹیں اور پتھر کھائے، گالیاں سنیں، طعنے اور الزام تراشیاں برداشت کیں، بے عزتی کے شرم ناک مظاہرے دیکھے مگر کبھی ان کی پیشانی پر بل نہ آیا۔ وہ اپنے ستانے والوں اور ایذا پہنچانے والوں کو ہمیشہ درگذر اور معاف کرتے رہے اور کسی وقت بھی انتقام لینے کا جذبہ پیدا نہ ہوا۔ ان کا دن اور رات کا اول حصہ خدمت ملک وقوم کے لیے وقف تھا اور شب کے آخری حصے میں ''صوفی شب زندہ دار'' کی حیثیت سے مصلے پر کھڑے ہو کر اپنے مولا سے دل لگاتے اور راز و نیاز کی باتیں کرتے رہتے۔

آپ کے اندر قدرت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عفو و کرم، حضرت صدیق اکبر کا خلوص، حضرت عمر فاروق کا جوش وجلال، حضرت عثمان غنی کی حیا اور انکساری اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا علم و کمال موجود تھا۔

قدرت نے صدیوں بعد آپ کی ذات کو ہمارے اندر پیدا کیا تھا۔ مگر صد حیف کہ اتنی جلدی واپس بلالیا کہ ہم سب حیرت زدہ اور از خود رفتہ ہو کر رہ گے۔

حضرت شیخ الاسلامؒ نے نصف صدی کے قریب تک جو قربانیاں پیش کیں ہندوستان کے واسطے تھیں، مگر بدقسمتی سے آزادی کے وقت ملک کے حصے بخرے ہو گئے۔ ہزاروں لاکھوں بندگانِ خدا کا ناحق خون بہا، وطن سے بے وطن ہوئے، اس طرح اچانک تقسیم کا حضرت شیخ پر جو اثر تھا اس کا اندازہ لگانا خدام کے واسطے وہم و گمان و فہم و قیاس کی پرواز کی بلندیوں سے بہت دور ہے۔ دیگر علمائے اکابر کی بھی یہی کیفیت تھی۔ بہ ہر حال قدرت کو منظور تھا وہ ہو گیا اور ہو چکا۔

اب حضرت آخری عمر میں ضعیفی و بیماری اور کمزوری کے باوجود ملت اسلامیہ کو جس تعمیر کی جانب لے جا رہے تھے وہ کسی پر مخفی نہیں۔ ہم سب خدام کا فرض ہے کہ حضرت کی آخری خواہش کے مطابق ملت اسلامیہ میں اسلام کی روح پھونک دیں تاکہ حضرتؒ کی روح پاک کو دائمی سکون حاصل ہو۔

(از: مولانا مفتی سید عبدالرحیم صاحب لاج پوری قادری، امام بڑی مسجد)

لقب شیخ الاسلام کا تاریخی پس منظر اور اس کی تاریخی حیثیت:

دنیائے اسلام میں سب سے پہلے حضرت صدیق اکبر اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہما اس لقب کے ساتھ موصوف ہوئے۔ یہی دونوں یکے بعد دیگرے شیخ الاسلام کہلائے۔ ان کے زمانے کے بعد سلف صالحین میں چار صدی تک اس خطاب کی شہرت نہ ہوئی۔ پانچویں، چھٹی صدی میں اس خطاب نے شہرت عامہ اختیار کر لی۔ پھر سیکڑوں اس لقب کے ساتھ موصوف ہو کر دنیا میں مشہور ہوئے، جس پر تاریخ شاہد ہے۔

شیخ الاسلام ابوالحسن علی السعدی، شیخ الاسلام عطاء بن حمزۃ السعدی، شیخ الاسلام علی بن محمد الاسبیجابی، شیخ الاسلام عبدالرشید البخاری جو صاحب خلاصۃ الفتاوی کے دادا تھے۔ شیخ الاسلام برہان الدین علی المرغینانی صاحب ہدایہ، شیخ الاسلام نظام الدین عمر ابن صاحب الہدایہ، شیخ الاسلام محمود الاوزجندی وغیرہم رحمہم اللہ تعالیٰ۔ نیز شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانی، شیخ الاسلام زکریا الانصاری وغیرہما، یہ سب حضرات فقہاے اعلام، اساطین دین، امت اسلامیہ کے دینی و دنیاوی رہبری کرنے والے مدار اسلام تھے۔ احکام شرعیہ کا انھیں پر مدار تھا۔ یہ ائمہ حدیث وفقہ ہیں جو اپنے اپنے دور میں اپنی نظیر خود تھے۔ ساتویں اور آٹھویں صدی میں اس نے اور عموم اختیار کر لیا، مذاہب اربعہ مشہورہ میں پانچویں صدی سے لے کر آٹھویں نویں صدی تک سیکڑوں شیخ الاسلام ہوئے۔ سلف میں یہ لقب ایسے شخص کو دیا جاتا تھا جو فقیہ وقت، جامع معقول و منقول، فقہی، علمی، نزاعی مشکلات کا حل کرنے والا منصب افتا پر فایز اور متبحر فی العلوم ہو۔ کتاب اعلام الاخیار میں کفوی کا بیان ہے:

کان العرف علی ان شیخ الاسلام یطلق علی من یصدر الافتاء و حل المشکلات فیما شجر بینهم من النزاع والخصام من الفقهاء العظام والفضلاء الفخام و قد اشتهر بها من اخیار المائة الخامسة و السادسة اعلام منهم شیخ الاسلام ابوالحسن علی السعدی، و شیخ الاسلام عطاء ابن حمزة السعدی و شیخ الاسلام علی بن محمد الاسبیجابی و شیخ الاسلام عبدالرشید البخاری جد صاحب الخلاصة و شیخ الاسلام برهان الدین علی

المرغيناني صاحب الهداية و شيخ الاسلام نظام الدين عمر بن صاحب الهداية و شيخ الاسلام محمود الاوزجندی وغیرهم کذا ذکره الکفوی فی ترجمه شیخ الاسلام محمود الاوزجندی. (تعلیقات الفوائد: ص١٦)

ایسے شخص کو بھی شیخ الاسلام کا لقب دیا جاتا تھا جس کی زندگی اسلام میں گزری ہو اور اسلامی خدمات انجام دیتا رہا ہو۔ ایسے شخص کو بھی شیخ الاسلام کا لقب دیا جاتا تھا جو درجۂ ولایت پر پہنچا ہوا ہو۔ ایسے شخص کو بھی شیخ الاسلام کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ جو متبع کتاب و سنت اور متبحر فی العلوم ہو۔ شیخ الاسلام حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے ترجمہ میں حافظ سخاوی نے کتاب الجوہر فی مناقب العلامہ ابن حجر میں ذکر کیا ہے، جس کو شہاب خفاجی احمد ابن محمد المصری الحنفی نے عنایۃ القاضی حاشیہ تفسیر بیضاوی میں نقل کیا ہے، جس کو صاحب تعلیقات الفوائد نے صفحہ ۱۰۱ میں کتاب مذکور کے حوالے سے پیش کیا ہے:

وفي حواشي تفسير البيضاوی المسماة بعناية القاضي الشهاب احمد بن محمد الخفاجي المصرى الحنفي عند قوله تعالیٰ واذا لقو الذين امنوا قالو امنا ..... الايته، قال السخاوی فی کتاب الجوهر فی مناقب العلامة ابن حجر. شيخ الاسلام الطلقة السلف على المتبع لكتاب الله و سنته رسوله مع التبحر فی العلوم من المعقول و المنقول وربما يوصف به من بلغ درجة الولايته وقد يوصف به من طال عمره فی الاسلام فدخل فی عداد من شاب شيبة فی الاسلام كانت له نوراً ولم تكن هٰذه اللفظة مشهوره بين القدماء بعد الشيخين الصديقؓ و الفاروقؓ فانه وردو صفها بذلك ثم اشتهر بهاجماعة من علماء السلف حتى ابتذلت على راس لمائة الثامنة فوصف بهامن لايحصی وصارت لقبًا لمن ولی القضاء الاكبر ولوعری عن العلم والسن فانا لله وانا اليه راجعون. انتهىٰ كلام السخاوی. قلت ثم

صارت والامن لقبالمن تولی منصب الفتویٰ و ان عری عن
لباس العلم والتقوی انتھی۔ (کلام الخفاجی)

ہمارے دور میں یہ لقب مولانا ے مدنی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ذات کے ساتھ ایسا خاص ہوا کہ ہر خاص و عام اسی لقب سے انھیں یاد کرتا ہے۔ شیخ الاسلام مولانے مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ تبحر عالم، جامع علوم وفنون، محدث، مفسر، فقیہ متکلم، حاوی شریعت وطریقت، درجۂ ولایت پر فایز، روحانی وشرعی مقتدا، اختلافی مسایل کی الجھنوں کو دور کرنے والے، حلاّل مشکلات ظاہری و باطنی، مجاہد فی سبیل اللہ، احیاے سنت میں مساعی، کتاب اللہ اور احادیث نبی کریم کے متبع، سنت پر عامل، حق گوئی پر جری، اخلاق حسنہ اور تواضع و انکسار کا مجسمہ، خدمت خلق طبیعت ثانیہ، پیشواے قوم، مقتداے سالکین، زبدۂ عارفین، دنیاے اسلام میں حیات گزارنے والے ذاکر لیل ونہار، متقی و پرہیزگار، حب فی اللہ وبغض فی اللہ کی تصویر، جوانی و پیری اسلام میں گزارنے والے مبلغ دین و احکام شرعیہ، طبیب امراض دلی، علماے سلف کی یادگار، اپنے زمانے کے بایزید وشبلی وغیرہ اوصاف کے حامل تھے۔ جس پر ''نقش حیات'' و ''مکتوبات شیخ الاسلام'' شاہد ہیں۔

بنابہ عبارات بالا کی تشریحات کے اس خطاب کے شایان اور مستحق تھے۔ اس لیے خداوند عالم جل مجدہٗ نے مقبولیت بارگاہ ایزدی ظاہر فرمانے کے لیے ہر خاص و عام کی زبان پر اس خطاب کو جاری کرادیا، آج دنیاے اسلام ان کو شیخ الاسلام کے لقب سے پکارتی اور یاد کرتی ہے۔

ایں سعادت بہ زور بازو نیست
تانہ بخشد خداے بخشندہ

(از: حضرت مولانا سید مہدی حسن صاحب، صدر مفتی دارالعلوم دیوبند)

شجرۂ مبارکہ حسینیہ رشیدیہ صابریہ چشتیہ
قدس اللہ اسرارہم

حضرت شیخ الاسلام قدس اللہ سرہٗ العزیز کو چاروں سلسلوں کے مشائخ سے اجازت بیعت حاصل تھی اور آپ چاروں سلسلوں میں بیعت فرمایا کرتے تھے۔ مگر اذکار و ظائف عموماً طریقۂ چشتیہ ہی کے بتایا کرتے تھے اور اکثر یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ ہمیں جو کچھ ملا اسی سلسلے سے ملا۔ جس کا کھائے اس کا گائے۔ مولانا عبدالجلیل سلہٹی مقیم خانقاہ حسینیہ دارالعلوم دیوبند نے ان چاروں سلسلوں کے شجرے اس طرح مرتب فرمائے کہ ہر ایک شیخ سلسلے کے وطن اور سنہ وفات وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ یہاں صرف مشائخ چشتیہ کا شجرہ شائع کیا جا رہا ہے، کیوں کہ حضرت اپنے متوسلین کو یہی شجرہ عنایت فرمایا کرتے تھے۔

نام	مسقط راس مع سنہ ولادت
۱۔اللّٰھم بجاہ قطب العالم سیدنا و مرشدنا مولانا سید حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہٗ العزیز	بہ مقام بانگرمؤ ضلع اناؤ، جہاں آپ کے والد ماجدؒ درس دیا کرتے تھے اور وطن اصلی آپ کا اللہ داد پور قصبہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد--۱۹ر شوال ۱۲۹۶ھ/۶ر اکتوبر ۱۸۷۹ء دوشنبہ اور سہ شنبہ کی درمیانی رات بہ وقت ۱۱ بجے۔
۲۔و بجاہ شیخ المشائخ سیدنا قطب الزماں مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز	قصبہ گنگوہ ضلع سہارن پور صوبہ یوپی، ولادت ۶ر ذی قعدہ ۱۲۴۴ھ بہ روز دوشنبہ بوقت شب
۳۔و بجاہ شیخ المشائخ سیدنا الحاج الحافظ الشیخ امداد اللہ المہاجر قدس اللہ سرہٗ العزیز	تھانہ بھون ضلع مظفر نگر صوبہ یوپی
۴۔و بجاہ شیخ المشائخ سیدنا نور محمد الجھنجھانوی قدس اللہ سرہٗ العزیز	جھنجھانہ ضلع مظفر نگر صوبہ یوپی، سنہ ولادت ۱۲۰۱ھ مطابق ۱۷۸۶ء
۵۔و بجاہ شیخ المشائخ سیدنا عبدالرحیم الشہید قدس اللہ سرہٗ العزیز	افغانستان
۶۔و بجاہ شیخ المشائخ سیدنا عبدالباری الامروہوی قدس اللہ سرہٗ العزیز	قصبہ امروہہ ضلع مرادآباد صوبہ یوپی
۷۔و بجاہ شیخ المشائخ سیدنا عبدالہادی الامروہوی قدس اللہ سرہٗ العزیز	قصبہ امروہہ ضلع مرادآباد صوبہ یوپی
۸۔و بجاہ شیخ المشائخ سیدنا عضدالدین الامروہوی قدس اللہ سرہٗ العزیز	قصبہ امروہہ ضلع مرادآباد صوبہ یوپی
۹۔و بجاہ شیخ المشائخ سیدنا الشیخ محمد المکی قدس اللہ سرہٗ العزیز	مکہ معظمہ

سنہ وفات	مقام دفن
۱۲ر جمادی الاولیٰ ۱۳۷۷ھ/۵ر دسمبر ۱۹۵۷ء بہ روز جمعرات بعد دوپہر بہ عمر ۸۱ سال ۶ ماہ ۲۴ یوم قمری اور ۷۹ سال ۲ ماہ ایک یوم شمسی۔ مع یوم پیدائش ووفات	مقبرہ دارالعلوم دیوبند (مقبرہ قاسمی)
بہ روز جمعہ ۸ یا ۹ر جمادی الثانی ۱۳۲۳ھ	قصبہ گنگوہ ضلع سہارن پور صوبہ یوپی
۱۲ر جمادی الثانی ۱۳۱۷ھ	(جنت المعلیٰ) مکہ معظمہ
۴ر رمضان المبارک ۱۳۰۹ھ	جھنجھانہ ضلع مظفر نگر صوبہ یوپی
۲۷ر ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ	پنجتار ملک ولایت صوبہ سرحد
۶ر محرم ۱۲۲۶ھ	قصبہ امروہہ ضلع مرادآباد صوبہ یوپی
یوم جمعہ ۴ر رمضان المبارک ۱۱۹۰ھ	قصبہ امروہہ ضلع مرادآباد صوبہ یوپی
۲۷ر رجب المرجب ۱۱۷۲ھ	قصبہ امروہہ ضلع مرادآباد صوبہ یوپی
۱۱ر رجب المرجب ۱۱۷۲ھ	قصبہ امروہہ ضلع مرادآباد صوبہ یوپی

نام	مسقط راس مع سنہ ولادت
١٠۔ وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا الشاہ محمدی قدس اللہ سرہٗ العزیز	قصبہ امروہہ ضلع مرادآباد صوبہ یوپی
١١۔ وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا محب اللہ الہ آبادی قدس اللہ سرہٗ العزیز	وطن ولادت صدر پور وطن قیام الہ آباد، صوبہ یوپی
١٢۔ وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا ابی سعید الگنگوھی قدس اللہ سرہٗ العزیز	قصبہ گنگوہ ضلع سہارن پور صوبہ یوپی
١٣۔ وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا نظام الدین البلخی قدس اللہ سرہٗ العزیز	تھانیسر ضلع کرنال، صوبہ پنجاب
١٤۔ وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا جلال الدین التھانیسری قدس اللہ سرہٗ العزیز	مسکن آپ کا تھانیسر ضلع کرنال، صوبہ پنجاب، ولادت ٨٩٤ھ
١٥۔ وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا قطب العالم شیخ عبد القدوس الگنگوھی قدس اللہ سرہٗ العزیز	قصبہ ردولی ضلع بارہ بنکی صوبہ یوپی، ولادت ٨٩١ھ
١٦۔ وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا محمد الردولی قدس اللہ سرہٗ العزیز	قصبہ ردولی ضلع بارہ بنکی صوبہ یوپی
١٧۔ وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا احمد العارف الردولی قدس اللہ سرہٗ العزیز	قصبہ ردولی ضلع بارہ بنکی صوبہ یوپی، ولادت ٨١٩ھ
١٨۔ وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا الشیخ عبدالحق الردولی قدس اللہ سرہٗ العزیز	قصبہ ردولی ضلع بارہ بنکی صوبہ یوپی
١٩۔ وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا جلال الدین کبیرالاولیاء الفانی فی قدس اللہ سرہٗ العزیز	پانی پت، ضلع کرنال صوبہ پنجاب
٢٠۔ وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا شمس الدین الترک الفانی فی قدس اللہ سرہٗ العزیز	ترکستان

مقام دفن	سنہ وفات
اکبرآباد، موتی گڑھ، صوبہ یوپی	۳ر رجب المرجب ۱۱۷۲ھ
الہ آباد، صوبہ یوپی	۹ر رجب المرجب ۱۱۸۵ھ
قصبہ گنگوہ ضلع سہارن پور، صوبہ یوپی	۱۱۴۰ھ
بلخ	۸ یا ۲۴ر رجب المرجب ۱۰۳۵ھ
تھانیسر ضلع کرنال، صوبہ پنجاب	۱۴ر ذی الحجہ ۹۸۹ھ
قصبہ گنگوہ ضلع سہارن پور، صوبہ یوپی	یوم سہ شنبہ ۲۳ر جمادی الثانی ۹۴۰ یا ۹۲۵ھ
ردولی، ضلع بارہ بنکی، صوبہ یوپی	۱۷ر صفر ۸۹۸ھ
ردولی، ضلع بارہ بنکی، صوبہ یوپی	۱۷ر صفر ۸۷۲ھ
ردولی، ضلع بارہ بنکی، صوبہ یوپی	۱۵ر جمادی الثانی ۸۳۷ھ
پانی پت، ضلع کرنال، صوبہ پنجاب	۵ر ذی قعدہ یا ۱۳ر ربیع الاول ۷۶۵ھ
پانی پت، ضلع کرنال، صوبہ پنجاب	۹ر شعبان یا ۱۰ر جمادی الثانی ۷۱۶ھ

نام	مسقط راس مع سنہ ولادت
۲۱۔ وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا علاء الدین علی احمد الصابر قدس اللہ سرہٗ العزیز	اجودھن غالباً، ولادت ۱۹ ربیع الاول ۵۹۴ھ شب پنجشنبہ
۲۲۔ وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا فرید الدین شکر گنج الاجودھنی قدس اللہ سرہٗ العزیز۔	ملتان۔ ولادت غرہ رمضان المبارک ۵۶۹ھ
۲۳۔ وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا قطب الدین بختیار الکاکی قدس اللہ سرہٗ العزیز	اوش توابع فرغانہ۔ ولادت شب دوشنبہ ۵۸۲ھ
۲۴۔ وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا مرکز الطریقۃ معین الدین حسن السنجری قدس اللہ سرہٗ العزیز	سنجرستان یا سیستان
۲۵۔ وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا الشیخ عثمان الہارونی قدس اللہ سرہٗ العزیز	قصبہ ہارون توابع خراسان
۲۶۔ وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا الحاج السید الشریف الزندانی قدس اللہ سرہٗ العزیز	زندانہ توابع بخارا
۲۷۔ وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا مودودی الچشتی قدس اللہ سرہٗ العزیز	چشت۔ ولادت ۴۲۰ھ بہ عہد خلافت القائم باللہ
۲۸۔ وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا ابی یوسف الچشتی قدس اللہ سرہٗ العزیز	چشت۔ ولادت ۳۷۵ھ
۲۹۔ وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا ابی محمد المحترم الچشتی قدس اللہ سرہٗ العزیز	چشت۔ ولادت محرم شب عاشورہ ۳۳۱ھ
۳۰۔ وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا ابی احمد الابدال الچشتی قدس اللہ سرہٗ العزیز	چشت۔ ولادت ۲۶۰ھ
۳۱۔ وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا ابی اسحاق الشامی قدس اللہ سرہٗ العزیز	شام

سنہ وفات	مقام دفن
۱۳ ربیع الاول ۶۹۰ھ	پیران کلیر شریف ضلع سہارن پور، صوبہ یوپی
۵ محرم ۶۶۸ھ یا ۶۹۷ھ یا ۶۷۰ یا ۶۹۰ھ	پاک پٹن شریف
۲۴ یا ۱۴ ربیع الاول ۶۶۳ھ	دہلی۔ مہرولی شریف
۶ رجب المرجب ۶۳۲ھ (اس میں اختلاف بہت ہے)	اجمیر شریف
۵ شوال ۶۳۳ھ یا ۵۶۷ھ یا ۵۹۷ھ	مکہ شریف متصل مکان شریف صاحب
۳ رجب ۶۲۱ھ	زعرانہ بلاد بخارا
۵۷۷ھ یا ۵۲۷ھ	چشت
یکم جمادی الاولیٰ ۴۰۰ھ	چشت
۴ ربیع الاولیٰ ۴۱۱ھ	چشت
غرہ جمادی الاخریٰ ۳۵۵ھ بہ عہد خلافت المطیع باللہ	چشت
۱۴ جمادی الاولیٰ یا اخریٰ ۳۲۹ھ	عکہ از بلاد شام

نام	مسقط راس مع سنہ ولادت
۳۲۔ وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا ممشاد علو الدینوری قدس اللہ سرہٗ العزیز	قصبہ دینور شہر ہائے حنبل سے ہے نزدیک قریلیین
۳۳۔ وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا ابی ہبیرۃ البصری قدس اللہ سرہٗ العزیز	بصرہ۔ولادت ۱۶۷ھ
۳۴۔ وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا حذیفۃ المرعشی قدس اللہ سرہٗ العزیز	قصبہ مرعش ملک شام نواح دمشق
۳۵۔ وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا السلطان ابراہیم بن ادہم البلخی قدس اللہ سرہٗ العزیز	اصل آپ کی بلخ سے ہے۔
۳۶۔ وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا فضیل بن عیاض قدس اللہ سرہٗ العزیز	سمرقند
۳۷۔ وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا عبدالواحد بن زید قدس اللہ سرہٗ العزیز	مدینۂ منورہ
۳۸۔ وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا امام الاولیاء الخواجہ حسن البصری قدس اللہ سرہٗ العزیز	مدینۂ منورہ
۳۹۔ وبجاہ امیر المومنین باب مدینۃ العلم سیدنا علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ	مکۂ معظمہ۔ولادت ۱۳؍رجب بروز جمعہ واقعہ فیل سے ۳ سال بعد
۴۰۔ وبجاہ سید الانبیاء والمرسلین سیدنا ومولانا محمد صلی اللہ علیہ وسلم طہر قلبی عما سواك و نورہ بانوار معرفتك و عشقك وارزقنی لما تحبہ و ترضاہ و ارض عنی فی الدنیا و الآخرۃ یا کریم۔	مکۂ معظمہ۔بروز دوشنبہ ۹ ربیع الاول سال فیل موافق سن ۴۰ حکومت کسریٰ

سنہ وفات	مقام دفن
۱۴ر محرم الحرام ۲۹۹ھ بہ عہد خلافت المقتدر باللہ	قصبہ دینور
۷ر شوال ۲۷۵ھ	بصرہ
۱۴ر یا ۲۴ر شوال ۲۵۲ھ بہ عہد خلافت المستعین باللہ	بصرہ نزد بعض
یکم شوال ۱۸۷ھ یا ۱۶۶ھ	درشام علی الاصح
محرم ۱۷۷ھ	مکہ معظمہ بگورستان جنت المعلیٰ
۲۷ر صفر ۱۷۶ھ یا ۱۷۸ھ	بصرہ
یکم رجب یا ۴ر محرم ۱۱۰ھ اس میں اختلاف بہت ہے۔	بصرہ
۲۱ر رمضان المبارک ۴۰ھ	نجف اشرف غالباً
دوشنبہ ۹ یا ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ بوقت دوپہر	مدینہ منورہ زاداللہ نورہا

شجرۂ نسب حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ

سیّدنا و مولانا سیّد الاوّلین والآخرین و محبوب رب العالمین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

۱	نبیرہ۔ سیدنا الامام حسین رضی اللہ عنہٗ
۲	سیدنا الامام علی زین العابدین
۳	سید حسن اصغر
۴	سید علی
۵	سید موسیٰ حمصہ
۶	سید حسین
۷	سید محمد، ثانی المعروف بہ سید ناصر ترمذی
۸	سید حسین
۹	سید علی
۱۰	سید شاہ احمد توختہ تمثال رسول (علیہ السلام)
۱۱	سید شاہ محمد
۱۲	سید شاہ عمر
۱۳	سید شاہ ابوبکر
۱۴	سید شاہ حمزہ
۱۵	سید شاہ احمد زاہد
۱۶	سید شاہ زید
۱۷	شاہ نور الحق رحمہم اللہ تعالیٰ
۱۸	شاہ محمد زاہدی
۱۹	شاہ عبد الواحد
۲۰	شاہ راجو
۲۱	شاہ منور
۲۲	شاہ قلندر
۲۳	شاہ لدھن
۲۴	شاہ محمود
۲۵	شاہ محب اللہ
۲۶	شاہ صفۃ اللہ
۲۷	شاہ خیر اللہ
۲۸	شاہ محمد ماہ شاہی
۲۹	شاہ مدن
۳۰	سید شاہ نور اشرف
۳۱	سید جہانگیر بخش
۳۲	سید پیر علی
۳۳	سید حبیب اللہ
❀	سیدنا شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی (رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین)
	اولاد
	① مولانا سید اسعد۔ سید امجد، ② حافظ سید ارشد سلمہ، ③ سید اسجد سلمہ، ④ ریحانہ۔ احمد سلمہ، ⑤ عمرانہ، ⑥ صفوانہ، ⑦ فرحانہ

حضرات خلفائے مجازین

وہ خوش نصیب منتسبین جنھیں مرشد عالم شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز نے چشتیہ صابریہ امدادیہ، نقشبندیہ مجددیہ، قادریہ، سہروردیہ، چاروں سلسلوں میں بیعت کرنے کی اجازت دی۔ (صوبہ وار فہرست درج ذیل ہے)

صوبۂ مشرقی پاکستان:

۱۔ مولوی تخلیص حسین صاحب مرحوم، سید پور، ڈاک خانہ سید پور، ضلع سلہٹ
۲۔ حاجی عبدالباری صاحب، جھنگاباڑی، ڈاک خانہ چوڑکھائی، ضلع سلہٹ
۳۔ حاجی ابرومیاں صاحب، تالی باڑی، ڈاک خانہ چوڑکھائی، ضلع سلہٹ
۴۔ مولانا بشیر احمد صاحب، باگا، ڈاک خانہ باگا، ضلع سلہٹ
۵۔ مولوی مقدس علی صاحب، محلہ شیخ، ڈاک خانہ بنیاچنگ، ضلع سلہٹ
۶۔ مولوی سید عبدالخالق صاحب مرحوم، سید پور، ڈاک خانہ سید پور، ضلع سلہٹ
۷۔ ڈاکٹر علی اصغر نوری صاحب، غنر گاؤں، ڈاک خانہ کمار گاؤں، ضلع سلہٹ
۸۔ مولوی حبیب الرحمٰن صاحب، موضع رائے پور، ڈاک خانہ ذرلب پور، ضلع سلہٹ
۹۔ سلیمان خاں صاحب، مولوی بازاری،
۱۰۔ مولوی عبدالرحیم صاحب، جڑی پاڑہ، ڈاک خانہ کنائی گھاٹ، ضلع سلہٹ
۱۱۔ مولوی مجاہد علی صاحب، گنگا جل، ڈاک خانہ جل، ضلع سلہٹ
۱۲۔ مولوی عبدالمتین صاحب چودھری، پھول باڑی، مقیم حال ڈھاکہ دکھن، ضلع سلہٹ
۱۳۔ مولوی عبدالرحمٰن صاحب، موضع دھولیا، ڈاک خانہ ناگاوڑا، ضلع سلہٹ
۱۴۔ مولانا تجمل علی صاحب، اکھورا حمد پور، ڈاک خانہ کوڑار بازار، ضلع سلہٹ
۱۵۔ مولوی علاؤالدین صاحب، بنیاچنگ، ڈاک خانہ بنیاچنگ، ضلع سلہٹ
۱۶۔ مولوی عبدالمنان صاحب، موضع اٹھالیا، ڈاک خانہ شیلاجوڑی، ضلع سلہٹ

۱۷۔ مولوی عبداللطیف صاحب، مولوی بازاری، موضع نالی ہوری، ڈاک خانہ کھائل کوڑا، ضلع سلہٹ

۱۸۔ مولوی سراج الحق صاحب، موضع پران گاؤں، ڈاک خانہ کلیر بھنگا، ضلع سلہٹ

۱۹۔ مولوی عبدالحق صاحب، موضع غازی نگر، ڈاک خانہ پتھاریا، ضلع سلہٹ

۲۰۔ مولوی عبدالمومن صاحب، موضع پران گاؤں، ڈاک خانہ کلیر بھنگا، ضلع سلہٹ

۲۱۔ مولوی یونس علی صاحب، موضع رائے گڑھ، ڈاک خانہ ڈھاکہ دکھن، ضلع سلہٹ

۲۲۔ مولوی عبدالسنان صاحب، موضع گنوئی، ڈاک خانہ بنیاچنگ، ضلع سلہٹ

۲۳۔ مولوی عبدالعزیز صاحب، موضع مروخانی، ڈاک خانہ منشی پاڑہ، ضلع سلہٹ

۲۴۔ مولوی محمد علی صاحب، موضع بلرام پور، ڈاک خانہ منشی بازار، ضلع سلہٹ

۲۵۔ مولوی ریاض الرب صاحب، ڈھاکہ دکھن، ڈاک خانہ ڈھاکہ دکھن، ضلع سلہٹ

۲۶۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب مرحوم، ساکن چوڑکھائی، ضلع سلہٹ

۲۷۔ مولانا حسن علی صاحب مرحوم، گورٹن گھاٹ، ضلع سلہٹ

۲۸۔ مولانا لطف الرحمٰن صاحب، حامد نگر، ڈاک خانہ برونہ، ضلع سلہٹ

۲۹۔ مولانا حافظ عبدالکریم صاحب، موضع اسلام آباد، ڈاک خانہ لکھی پاشا، ضلع سلہٹ

۳۰۔ مولانا بدر عالم صاحب، مغل بازار مدرسہ، ڈاک خانہ مغل بازار، ضلع سلہٹ

۳۱۔ مولانا مسعود الحق صاحب حالی، شیخ الحدیث، پٹیا، ڈاک خانہ پٹیا، ضلع چاٹگام

۳۲۔ مولانا مفتی احمد الحق صاحب، مدرسہ معین الاسلام، ڈاک خانہ ہاٹ ہزاری، ضلع چاٹگام

۳۳۔ مولوی عبدالستار صاحب، فتح پور، ڈاک خانہ بدن ہاٹ، ضلع چاٹگام

۳۴۔ مولوی احمد شفیع صاحب، مدرسہ معین الاسلام، ڈاک خانہ ہاٹ ہزاری، ضلع چاٹگام

۳۵۔ مولوی عبیدالرحمٰن صاحب، موضع امام نگر، ڈاک خانہ نظیر ہاٹ، ضلع چاٹگام

۳۶۔ مولوی عبدالرحمٰن صاحب، موضع گنجی، ڈاک خانہ مہاجنی، ضلع چاٹگام

۳۷۔ مولوی محمد عثمان صاحب، موضع اندھر بارہ، ڈاک خانہ بھالی کمن، ضلع چاٹگام

۳۸۔ مولوی محمد ادریس صاحب، معرفت ایمان علی صاحب موضع سارنگ سنتوش پور، ڈاک خانہ امان اللہ، ضلع چاٹگام

۳۹۔ مولوی عبدالحلیم صاحب، پیرکمن، ضلع چاٹگام

۴۰۔ مولوی شمس الدین صاحب، معرفت وکیل باڑی، کنچن نگر، ڈاک خانہ کنچن پور، ضلع چاٹگام
۴۱۔ مولوی عبدالغنی صاحب، ہادل سینیئر مدرسہ، ڈاک خانہ مارشورڈانگا، ضلع پابنہ
۴۲۔ مولوی ریحان الدین صاحب، موضع فرید پور، ڈاک خانہ لکھی پور، ضلع نواکھالی
۴۳۔ مولانا دلاور حسین صاحب چاند پوری، فینی، ڈاک خانہ فینی، ضلع نواکھالی
۴۴۔ مولوی عزیز الحق صاحب، عدیل پور، ڈاک خانہ چنگا تلی، ضلع نواکھالی
۴۵۔ مولوی کلیم اللہ صاحب، مدرسہ انفرالعلوم ننگل کوٹ، ضلع پٹرہ
۴۶۔ مولوی محب الرحمٰن صاحب، فینوا، ڈاک خانہ فینوا، ضلع پٹرہ
۴۷۔ مولوی علی اشرف صاحب، سیرام پور، ڈاک خانہ مغل بازار، ضلع پٹرہ
۴۸۔ مولانا امین الحق صاحب، یمن سنگی جامعہ قرآنیہ، محلہ لال باغ، ڈھاکہ
۴۹۔ مولوی محمد یونس صاحب، باقر گنجی، موضع جرخلیفہ، ڈاک خانہ رادھا بلب، ضلع باقر گنج
۵۰۔ حافظ طیب علی صاحب مرحوم

صوبہ آسام:

۵۱۔ مولوی عبدالواجد صاحب، موضع ملاگرام، ڈاک خانہ موہینا، ضلع کچھاڑ
۵۲۔ مولوی سعید علی صاحب، امام مسجد درگاہ بٹرشی، ڈاک خانہ کریم گنج، ضلع کچھاڑ
۵۳۔ مولانا مقدس علی صاحب، موضع بوڑی بائل، ڈاک خانہ غنیر گرام، ضلع کچھاڑ
۵۴۔ مولانا عبدالجلیل صاحب، شیخ الحدیث دارالحدیث بدر پور، ضلع کچھاڑ
۵۵۔ مولانا مصدر علی صاحب، دارالعلوم بانس کندی، ضلع کچھاڑ
۵۶۔ مولوی بشارت علی صاحب، دارالعلوم بانس کندی ضلع کچھاڑ
۵۷۔ مولانا احمد علی صاحب بدر پوری، شیخ الحدیث دارالعلوم بانس کندی، ضلع کچھاڑ
۵۸۔ مقبول علی صاحب، بانس کندی، ضلع کچھاڑ
۵۹۔ ماسٹر غلام احمد صاحب، بانس کندی، ضلع کچھاڑ
۶۰۔ مولوی معین الدین صاحب، مدرس دارالعلوم بانس کندی، ضلع کچھاڑ
۶۱۔ مولوی جواد علی صاحب، مدرس دارالعلوم، بانس کندی، ضلع کچھاڑ
۶۲۔ برمز علی صاحب، موضع تاراپور، ڈاک خانہ توپ خانہ سلچر، ضلع کچھاڑ

۶۳۔ حافظ محمد مستقیم صاحب، محلہ بیرنگا، سلچر، ضلع کچھاڑ

۶۴۔ حافظ مکرم علی صاحب مرحوم، بانس کندی، ضلع کچھاڑ

۶۵۔ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب، موضع جلال پور، ڈاک خانہ سری گوری، ضلع کچھاڑ

۶۶۔ حافظ شفیق الرحمان صاحب، بانس کندی، ضلع کچھاڑ

۶۷۔ مولوی قاری عبدالمطہر صاحب، ساکن بھنگا ڈر، ڈاک خانہ بیرنگا سلچر، ضلع کچھاڑ

۶۸۔ مولوی قاری عبدالصمد صاحب، موضع بوڑی بائل، ڈاک خانہ خنیر گرام، ضلع کچھاڑ

۶۹۔ مولوی عبدالمصور صاحب، ساکن مباقل، ڈاک خانہ بھنگا بازار، مقیم حال دارالحدیث

بدر پور ضلع کچھاڑ

۷۰۔ مولوی معتصم علی صاحب، موضع محمد پور، ڈاک خانہ دکھن رنگ پور، ساؤتھ لالہ، ضلع کچھاڑ

۷۱۔ مولوی مظفر علی صاجب، مدرسہ اسلامیہ الگا پور، ڈاک خانہ الگا پور بازار، ضلع کچھاڑ

۷۲۔ مولوی عبدالحق صاحب، موضع محمد پور، ڈاک خانہ دکھن رنگ پور، ساؤتھ لالہ، ضلع کچھاڑ

۷۳۔ مولوی عبدالحق صاحب، عاصم گنجی، موضع سات گھری، ڈاک خانہ موہنیا، ضلع کچھاڑ

۷۴۔ حافظ عبدالنور صاحب، کریم گنجی، موضع گندر نجانی، ڈاک خانہ باڑی گرام، ضلع کچھاڑ

۷۵۔ مولوی جلال الدین صاحب، سوناتولی، ساکن کھودرا کندی، ڈاک خانہ کالی گنج بازار، ضلع کچھاڑ (حال مقیم گنٹ ہائی اسکول۔ شیلانگ)

۷۶۔ حافظ عبدالرحیم صاحب، ساکن ملاگرام، ڈاک خانہ موہنیا، ضلع کچھاڑ

۷۷۔ محمد نجابت علی صاحب، ساکن کھدرا کندی، ڈاک خانہ کالی گنج بازار، ضلع کچھاڑ

۷۸۔ حاجی عبدالمالک صاحب، ساکن بڑشی، ڈاک خانہ کریم گنج ضلع کچھاڑ

۷۹۔ حاجی شمس الحق صاحب، ساکن بڑشی، ڈاک خانہ کریم گنج ضلع کچھاڑ

۸۰۔ حاجی محبت علی صاحب، ساکن سوناباری گھاٹ، ضلع کچھاڑ

۸۱۔ مولوی رحیم الدین صاحب، امام مسجد جامع، بانس کندی، ضلع کچھاڑ

۸۲۔ مولوی محسن علی صاحب، مدرس دارالعلوم، بانس کندی، ضلع کچھاڑ

۸۳۔ فرمان علی صاحب، بانس کندی، ضلع کچھاڑ

۸۴۔ مولوی اصدر علی صاحب، ساکن روپائی بائی، ضلع کچھاڑ

۸۵۔ مولوی عبدالرزاق صاحب، الگا پور، ضلع کچھاڑ

۸۶۔ مولوی منذر علی صاحب، تاراپور، ضلع کچھاڑ
۸۷۔ مولوی امان اللہ صاحب مرحوم، کریم گنجی، ساکن شوٹری کنڈی، ڈاک خانہ واشر بازار، ضلع کچھاڑ
۸۸۔ مولوی کریم الدین صاحب، ساکن بانس کندی، ضلع کچھاڑ
۸۹۔ مولوی سعید احمد صاحب، موضع رنگ پور، ڈاک خانہ دکھن رنگ پور، ساؤتھ لالہ، ضلع کچھاڑ
۹۰۔ مولوی عبدالباری صاحب، ساکن نیتائی نگر، ڈاک خانہ نیتائی نگر بازار ضلع کچھاڑ
۹۱۔ مولوی محمد اسحاق صاحب، مدرسہ عربیہ اسلامیہ مسجد دھاکائی پٹی ساکن گندی ماری ڈاک خانہ دوگاؤں ضلع نوگاؤں
۹۲۔ مولوی ضمیر الدین صاحب، گورنمنٹ ہائی اسکول ڈھوبری، ڈاک خانہ دوگاؤں ضلع گوال پاڑہ

صوبہ بہار:

۹۳۔ مولانا حافظ عبدالرحمٰن صاحب مرحوم، مدرسہ شمس الہدیٰ، پٹنہ
۹۴۔ اطہر حسین صاحب، موضع پورائن، ڈاک خانہ بونسی، ضلع بھاگل پور
۹۵۔ حاجی محمد ایوب صاحب، موضع جبل پل، ڈاک خانہ بارہ ہاٹ، ضلع بھاگل پور
۹۶۔ خلیل الرحمٰن صاحب، موضع جبل پل، ڈاک خانہ بارہ ہاٹ، ضلع بھاگل پور
۹۷۔ مولوی محمد یعقوب صاحب، موضع ببورا، ڈاک خانہ سنہولا ہاٹ، ضلع بھاگل پور
۹۸۔ اشرف علی صاحب، موضع عظمت پور، ڈاک خانہ نرائن پور، ضلع بھاگل پور
۹۹۔ عبدالرحمٰن صاحب، موضع عظمت پور، ڈاک خانہ نرائن پور، ضلع بھاگل پور
۱۰۰۔ حاجی مظہر الحق صاحب، سریا، ضلع بھاگل پور
۱۰۱۔ مولوی محمد انور صاحب، ساکن کیتھانیکر، ڈاک خانہ کوپاپرسا، ضلع بھاگل پور
۱۰۲۔ حکیم فدا حسین صاحب، موضع سریا، ضلع بھاگل پور
۱۰۳۔ مولانا عبدالسلام صاحب، کوروڈیہہ، ڈاک خانہ پوریني، ضلع بھاگل پور
۱۰۴۔ حاجی احمد حسن صاحب، موضع سنہولی، ڈاک خانہ پوریني، ضلع بھاگل پور
۱۰۵۔ مولانا قاری فخر الدین صاحب، جامعہ قاسمیہ، شہر گیا
۱۰۶۔ مولانا نبیہ حسن صاحب، موضع کودمری، ڈاک خانہ پنجرانواں، ضلع گیا

۱۰۷۔ حاجی منہاج الدین صاحب، تمباکو مرچنٹ، دھامی ٹولہ، شہر گیا
۱۰۸۔ مولوی عبداللہ صاحب چھپروی، موضع وڈاک خانہ مانجھا اسٹیٹ، ضلع سارن
۱۰۹۔ حاجی محمد عاقل صاحب، حیا گھاٹ۔ باس پور، ضلع دربھنگہ
۱۱۰۔ مولوی محمد ازہر صاحب، موضع وڈاک خانہ رتھوس، براہ کمتول، ضلع دربھنگہ
۱۱۱۔ مولوی عبدالرشید صاحب، موضع مبارک پور، ڈاک خانہ سلکھوا بازار، ضلع مونگیر
۱۱۲۔ قاری مہدی بخاری صاحب، مدرسہ تجوید القرآن، جامع مسجد، شہر مونگیر
۱۱۳۔ مولوی ادریس صاحب، موضع نوکنہ۔ ڈاک خانہ اسلام پور، ضلع پورنیہ
۱۱۴۔ مولوی اظہر صاحب، موضع اورنگ آباد، ضلع گیا، مقیم حال برواڈیہہ گریڈیہہ، ضلع ہزاری باغ

صوبہ یوپی:

۱۱۵۔ مولانا نعیم اللہ صاحب، موضع بھولے پور، ڈاک خانہ ہنسور، ضلع فیض آباد
۱۱۶۔ مولوی عبدالجبار صاحب، ہنسور، ضلع فیض آباد
۱۱۷۔ مولوی حافظ محمد طیب صاحب (نابینا)، قصبہ بھدرسہ، محلہ آمنہ بی بی کا احاطہ، ضلع فیض آباد
۱۱۸۔ مولوی فیض اللہ صاحب گونڈوی، مدرسہ احمدیہ، مغل پورہ، شہر فیض آباد
۱۱۹۔ مولانا اویس صاحب۔ (استاذ ندوۃ العلماء)، قصبہ نگرام، ضلع لکھنؤ
۱۲۰۔ مولانا محمد یونس صاحب (مرحوم)، قصبہ بگھرہ، ضلع مظفر نگر
۱۲۱۔ حافظ عبداللطیف صاحب (مرحوم)، امام جامع مسجد گڑھی پختہ، ضلع مظفر نگر
۱۲۲۔ حکیم محمد سلیمان صاحب (مرحوم ومغفور)، موضع وڈاک خانہ نولی، ضلع غازی پور
۱۲۳۔ مولانا قاری اصغر علی صاحب جنس پوری، نئی منزل دارالعلوم دیوبند، ضلع سہارن پور
۱۲۴۔ مولانا سید محمود حسن صاحب، موضع پٹھیڑ برتھا کا ستھہ عرف پٹھیڑ کلاں، ضلع سہارن پور
۱۲۵۔ مولوی ہدایت علی صاحب، مدرسہ ہدایت المسلمین کربی، ڈاک خانہ دودھارا، ضلع بستی
۱۲۶۔ مولوی قطب اللہ صاحب، موضع جھنکھیا، ڈاک خانہ عاز کوٹ سری، ضلع بستی
۱۲۷۔ مولوی سید محمد احمد صاحب (مرحوم)، نگینہ، ضلع بجنور
۱۲۸۔ مولوی عزیز الرحمن صاحب، مہتمم یتیم خانہ، شہر بجنور
۱۲۹۔ مولوی سید احمد شاہ صاحب، مراد آبادی انشرکانچ، شہر بجنور

۱۳۰۔ مولوی عبدالحی صاحب، موضع انجان شہید، ضلع اعظم گڑھ

۱۳۱۔ مولوی صفات اللہ صاحب، محلہ بالائی پورہ، مئو ناتھ بھنجن، ضلع اعظم گڑھ

۱۳۲۔ مولوی مشتاق احمد صاحب، مدرسہ دارالعلوم، قاضی داموں پورہ، مئو ناتھ بھنجن، ضلع اعظم گڑھ

۱۳۳۔ حاجی محمد احمد صاحب، قصبہ مہگاؤں، ضلع الہ آباد

۱۳۴۔ کریم بخش صاحب آزاد، دکان جناب اکبر حسین صاحب چھپائی والی، گلی کرنیل گنج، شہر کان پور

۱۳۵۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سنبھلی، مدرس مدرسہ چلہ، امروہہ، ضلع مرادآباد

۱۳۶۔ مولوی محمود احمد صاحب، جامع مسجد حسن پور، ضلع مرادآباد

صوبۂ مغربی بنگال:

۱۳۷۔ مولانا احمد اللہ صاحب، برن پور مسلم ہائی اسکول، ڈاک خانہ برن پور، ضلع بردوان

۱۳۸۔ مولوی عبدالخالق صاحب، شانتی باغ، ڈاک خانہ شیر وزاے، ضلع بردوان

۱۳۹۔ غلام محی الدین صاحب، رحمت نگر، ڈاک خانہ برن پور، ضلع بردوان

۱۴۰۔ مولوی عبداللہ صاحب، کوارٹر نمبر ۳، لائن نمبر ۵۷، ڈاک خانہ برن پور، ضلع بردوان

شہر کلکتہ:

۱۴۱۔ مولانا محمد طاہر صاحب، کریم گنجی، مدرس مدرسہ کلکتہ، شہر کلکتہ

صوبۂ مدھیہ پردیش:

۱۴۲۔ حافظ عبداللطیف صاحب (نابینا)، مدرسہ عربیہ اسلامیہ بیجناتھ پارا، ضلع رائے پور

صوبۂ مدراس:

۱۴۳۔ جناب سی بشیر احمد صاحب، نمبر ۳، محمد رضا اسٹریٹ، پرنام بٹ، ضلع شمالی ارکاٹ

۱۴۴۔ مولانا شیخ حسن صاحب مالاباری، شیخ الحدیث مدرسۂ باقیات الصالحات، ویلور، ضلع شمالی ارکاٹ

مشرقی پنجاب:

۱۴۵۔ مولانا نیاز محمد صاحب، مدرسۂ عربیہ اسلامیہ، قصبہ نوح، ضلع گوڑگاؤں
۱۴۶۔ مولوی جمیل احمد صاحب، معرفت مولانا نیاز محمد صاحب، قصبہ نوح، ضلع گوڑگاؤں
۱۴۷۔ میاں جی محمد رمضان صاحب، موضع مالب، ضلع گوڑگاؤں

دلّی:

۱۴۸۔ منشی اللہ دتہ صاحب، تبلیغی مرکز نظام الدین، نئی دہلی
۱۴۹۔ قاری عبدالشکور صاحب سہنس پوری، امام حوض والی مسجد، نئی سڑک، دہلی

مغربی پاکستان:

۱۵۰۔ مولوی خورشید احمد صاحب (مرحوم)، قصبہ عبدالحکیم، ضلع ملتان
۱۵۱۔ مولوی حامد میاں صاحب دیوبندی (مرحوم)، مسلم مسجد، چوک انارکلی، ضلع لاہور
۱۵۲۔ مولانا حکیم عبدالحکیم صاحب (مرحوم)، سلیمانی دواخانہ، فیض باغ، ضلع لاہور
۱۵۳۔ مولوی مظہر حسین صاحب (مرحوم)، بہ مقام بھین، تحصیل چکوال، ضلع جہلم
۱۵۴۔ مولوی رحمت اللہ صاحب (مرحوم)، مدرسہ عربی مودب چک نمبر ۱۷/ ڈی این بی، ڈاک خانہ ہیڈ راز قان، ریاست بھاولپور
۱۵۵۔ مولوی عبدالحق صاحب دامانی (مرحوم)، موضع شیر وکہنہ، ڈاک خانہ کولاچی، ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خان

بمبئی:

۱۵۶۔ مولانا احمد بزرگ صاحب (مرحوم)، سملک، ڈاک خانہ ڈابھیل، ضلع سورت
۱۵۷۔ مولانا عبدالصمد صاحب کاچھوی (مرحوم)، ضلع سورت
۱۵۸۔ مولانا عبدالصمد صاحب، موضع وانکانیر، ڈاک خانہ باردولی، ضلع سورت
۱۵۹۔ مولانا عبدالغفور صاحب قریشی، مدرسہ فرقانیہ، شہر عثمان آباد
۱۶۰۔ سید سلیمان شاہ صاحب قادری، شہر عثمان آباد
۱۶۱۔ سید بدیع الدین صاحب، ضلع عثمان آباد

۱۶۲۔ مولانا عبدالحکیم صاحب، ضلع عثمان آباد
۱۶۳۔ سید طالب علی صاحب، مہتمم مدرسہ مصباح العلوم، شاستور، تعلقہ لاتور، ضلع عثمان آباد
۱۶۴۔ مولوی عبدالصمد صاحب، شاستو، تعلقہ عمرکہ، ضلع عثمان آباد

برما:

۱۶۵۔ مولوی مظفر احمد صاحب (مرحوم)، موضع مینگوی، ڈاک خانہ بوسیڈانگ، ضلع اکیاب

جنوبی افریقہ:

۱۶۶۔ مولانا بایزید صاحب شہید، رسٹن برگ، ٹرانسوال، جنوبی افریقہ
۱۶۷۔ صاحب زادہ محترم مولانا اسعد صاحب زیدمجدہم (بہ اجازت خلفا)

تصدیق از مولانا حافظ قاری اصغر علی صاحب خلیفہ و معتمد خصوصی حضرت شیخ الاسلامؒ
میں اس کی تصدیق کرتا ہوں کہ یہ فہرست بالکل صحیح ہے۔

اصغر علی غفرلہ
مدنی منزل دارالعلوم دیوبند
۳۰؍ جمادی الثانی ۱۳۷۷ھ

حضرت شیخ الاسلامؒ کے صلبی اقارب اور ذریۃ طیبہ

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد مولانا حاجی شاہ سید حبیب اللہ صاحب مہاجر مدنی نور اللہ مرقدہٗ خلیفۂ مجاز حضرت شاہ فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی قدس اللہ سرہٗ کے پانچ صاحب زادے اور ایک صاحب زادی تھیں، جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(۱) سب سے بڑے صاحب زادے **حضرت مولانا حاجی سید صدیق احمد صاحب** نور اللہ مرقدہٗ خلیفۂ مجاز حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔

(۲) ان سے چھوٹے **حضرت مولانا شاہ حاجی سید احمد صاحب** رحمۃ اللہ علیہ تھے جو حضرت گنگوہی رحمہ اللہ سے بیعت تھے۔ مگر حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کے وصال کے بعد انھیں بیعت کی اجازت حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوریؒ اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ دیوبندی نے عطا فرمائی۔ آپ نے مدینۂ منورہ میں مدرسۂ علوم شرعیہ قایم فرمایا جو آج تک نہایت ترقی کے ساتھ جاری ہے۔

(۳) ان سے چھوٹے حضرت قطب الاقطاب قدوۃ العارفین سراج العارفین سراج السالکین راس المحدثین **شیخ الاسلام مولانا الحاج الحافظ شاہ سید حسین احمد صاحب مدنی** قدس اللہ سرہٗ العزیز خلیفۂ مجاز حضرت قطب العالم مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ و خلیفۂ مجاز حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ دیوبندی و خلیفۂ مجاز حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس اللہ سرہٗ العزیز تھے۔

(۴) ان سے چھوٹے **حضرت مولانا الحاج سید محمود احمد صاحب** سابق قاضی القضاۃ حکومت سعودی عرب و موجودہ سرپرست مدرسۂ علوم شرعیہ مدینۂ منورہ دامت برکاتہم ہیں (اب ان کی بھی وفات ہوگئی)۔

(۵) سب سے چھوٹے **حضرت مولانا سید جمیل احمد صاحب** رحمۃ اللہ علیہ تھے۔

(۶) ان پانچوں بھائیوں میں صرف ایک بہن ریاض فاطمہ رحمۃ اللہ علیہا تھیں۔

(۱) حضرت مولانا صدیق احمد صاحب قدس سرہٗ کی پہلی شادی جناب سید عابد حسین صاحب ساکن شہزاد پور قصبہ اکبر پور ضلع فیض آباد کی صاحب زادی سے ہوئی تھی۔ جن سے صرف ایک صاحب زادے مولانا سید وحید احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ اسیر مالٹا تھے۔ ان کی اہلیہ کے انتقال کے بعد دوسری شادی مولانا عبدالحق صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی بہن سے ہوئی۔ مگر ان اہلیہ سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ ان اہلیہ کی موجودگی ہی میں حضرت مولانا صدیق احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہو گیا۔ مولانا سید وحید احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی نشو و نما مدینۂ منورہ میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ کی زیر نگرانی ہوئی۔ مالٹا میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ اور حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ کے ساتھ صغر سنی میں اسیر رہے۔ تعلیم و تربیت بھی ان ہی دونوں بزرگوں کی زیر نگرانی دارالعلوم دیوبند میں ہوئی۔ دارالعلوم دیوبند میں معین مدرس بھی رہے اور آخر میں مدرسہ عزیزیہ بہار شریف ضلع پٹنہ میں استاذ ادب مقرر ہوئے۔ ۴۵ سال کی عمر میں بہ مقام ٹانڈہ ضلع فیض آباد وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔ موصوف عربی، فارسی، انگریزی، فرانسیسی، ترکی، ہندی، بنگلہ، پشتو اور بعض دوسری زبانوں کے ماہر تھے۔ مولانا سید وحید احمد صاحب کی شادی حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ کی ماموں زاد بہن کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ انتقال کے وقت آپ نے تین صاحب زادے اور دو صاحب زادیاں چھوڑیں۔ سب سے بڑے صاحب زادے عزیزم حافظ سید فرید الوحیدی سلمہٗ ہیں جو دارالعلوم دیوبند میں مبلغ اور ناظم شعبۂ امورِ خارجہ ہیں۔ موصوف نے عربی اور دینیات کی تکمیل دارالعلوم دیوبند سے کی ہے اور انگریزی میں مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ سے بی اے کے پہلے سال کا امتحان پاس کرلیا۔ اور دوسرے سال کی تیاری کر رہے ہیں۔ نہایت اچھے مقرر اور انشا پرداز ہیں۔ آپ کی متعدد کتب بھی شایع ہو کر مقبول عوام و خواص ہو چکی ہیں۔ ان سے چھوٹے عزیزم حاجی حافظ سید رشید الوحیدی سلمہٗ دارالعلوم کے آخری درجوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ نہایت نیک صالح اور اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلنے والے ہیں، بہت اچھے شاعر اور انشا پرداز ہیں۔ پاکستان و ہندوستان کے اکثر رسایل و اخبارات میں ان کی نظمیں اور مضامین شایع ہوتے ہیں۔ سب سے چھوٹے صاحب زادے عزیزی سید سعید الوحیدی سلمہٗ دارالعلوم کے درجۂ وسطیٰ میں پڑھ رہے ہیں، ذہین،

طباع اور تیز ہیں۔ بڑی صاحب زادی عزیزہ صفیہ سلمہا کی شادی اعزہ ہی میں جناب مولوی رضا حسین صاحب ساکن قصبہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد کے صاحب زادے جناب ضیاء الحسن صاحب فاروقی ایم اے (علیگ) سے ہوئی ہے۔ موصوف اس وقت جامعۂ ملیۂ اسلامیہ کالج میں سیاسیات کے لکچرر ہیں اور آج کل اک فلر فاؤنڈیشن کی جانب سے وظیفہ یاب ہو کر میکگل یونی ورسٹی مانٹریل (کینیڈا) میں اسلامیات پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ ان سے چھوٹی صاحب زادی عزیزہ رضیہ سلمہا کی شادی عنایت اللہ صاحب منتظر اعظمی سے ہوئی ہے، جنھوں نے علی گڑھ یونی ورسٹی سے ایم اے کے پہلے سال کا امتحان پاس کر لیا ہے اور دوسرے سال کے امتحان کی تیاری میں مشغول ہیں۔ یہ بھی اعزہ ہی میں سے ہیں اور ہونہار محنتی، اچھے شاعر اور انشا پرداز ہیں۔ موصوف بھی آج کل جامعہ ملیہ میں استاذ ہیں۔

عزیزی سید فرید الوحیدی کی شادی راقم الحروف کے برادر بزرگ سید توکل حسین صاحب بی اے، ایل ایل بی (علیگ) وکیل کاوی پور ضلع سلطان پور کی صاحب زادی عائشہ سلمہا سے ہوئی ہے۔ عزیز مذکور کے ایک لڑکا نور چشم حمید الوحیدی سلمہٗ عمر چار سال اور ایک لڑکی نور چشمی جویریہ سلمہا بہ عمر ایک سال ہے۔ عزیزی رشید الوحیدی سلمہٗ کی شادی راقم الحروف کے چھوٹے بھائی سید مشتاق احمد سلمہٗ کی صاحب زادی بشریٰ سلمہا سے ہوئی ہے۔ عزیزم سعید الوحیدی ابھی غیر شادی شدہ ہیں۔

مولانا سید احمد صاحب کی پہلی شادی ان کی ماموں زاد بہن سے ہوئی تھی۔ مگر ان اہلیہ سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اس بیوی کے انتقال کے بعد دوسری شادی مولانا صدیق احمد صاحب کی بیوہ سے ہوئی۔ جو مولانا عبدالحق صاحب مدنیؒ کی بہن تھیں۔ اس شادی کے بعد خاندان کے افراد پر مدینۂ منورہ میں بہت زیادہ مصیبتیں آئیں۔

تقریباً سات افراد خاندان انھیں مصایب کا شکار ہو کر انتقال فرما گئے۔ (ظاہر ہے یہ خاندان ہندوستان سے منتقل ہوا تھا، یہ جنگ کا زمانہ تھا، برطانیہ ترکوں سے برسر پیکار تھا، غالباً اس بنا پر کہ یہ حضرات برطانیہ کی رعایا رہ چکے تھے) مولانا سید شاہ حبیب اللہ صاحبؒ اور ان کے دو صاحب زادے مولانا سید احمد صاحبؒ اور مولانا محمود احمد صاحب مدظلہٗ گرفتار کر کے ایڈریانوپل روانہ کر دیے گئے تھے۔ حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ اس وقت مالٹا میں نظر بند تھے۔ ان پریشان کن حالات میں مولانا سید احمد صاحبؒ کی دوسری

اہلیہ، مولانا سید محمود احمد صاحب کی موجودہ اہلیہ اور حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ کی صاحب زادی یہ تینوں عورتیں مولانا عبدالحق صاحب مدنیؒ کے ساتھ ترکی جانے کے لیے روانہ ہوئیں۔

اثنائے سفر میں مولانا سید احمد صاحبؒ کی دوسری اہلیہ یعنی مولانا عبدالحق صاحب مدنیؒ کی بہن کا ریل گاڑی ہی میں انتقال ہوگیا۔ مولانا عبدالحق صاحب مدنی شام میں کسی ضرورت سے ٹھہر گئے تو بقیہ دو عورتوں کا تنہا قافلہ بڑی بڑی مصیبتیں برداشت کر کے ایڈریانوپل پہنچا۔ ایڈریانوپل میں مولانا سید حبیب اللہ صاحبؒ کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد جب واپسی کی اجازت ہوگئی تو مولانا سید احمد صاحب، مولانا محمود احمد صاحب مدظلہٗ اور ان کی اہلیہ اور حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ کی صاحب زادی مدینۂ منورہ واپس لوٹیں تو شام میں حضرت مولانا مدنیؒ کی صاحب زادی کا انتقال ہوگیا اور شام ہی میں حضرت مولانا سید احمد صاحبؒ کی تیسری شادی ہوئی۔ یہ اہلیہ اب تک حیات ہیں اور مدینۂ منورہ میں مقیم ہیں۔ ان سے مولانا سید احمد صاحبؒ کی ایک صاحب زادی عائشہ مرحومہ ہوئیں، جن کی شادی صاحب زادہ مولانا اسعد سلمہٗ ابن حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے ہوئی تھی۔ ان سے ایک صاحب زادہ نور چشم احمد سلمہٗ ہے، جس کی عمر اس وقت سات سال ہے۔ یہ صاحب زادے مدرسۂ علوم شرعیہ میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور اپنی نانی کی زیرِ پرورش ہیں۔ جس وقت عائشہ مرحومہ کا انتقال ہوا اس بچے کی عمر صرف دس ماہ تھی۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی پہلی شادی موضع قتال پور ضلع اعظم گڑھ میں ہوئی تھی، جن سے دو لڑکیاں ہوئیں، جن میں سے ایک کا انتقال شام میں ہوا۔ (جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں) اور دوسری کا انتقال صغر سنی میں ہوگیا۔ ان اہلیہ کے انتقال کے بعد حضرت مولانا مدنیؒ کی دوسری شادی قصبہ بچھرایوں ضلع مراد آباد میں قاری حکیم غلام احمد صاحب کی بڑی صاحب زادی سے ہوئی۔ جن سے دو صاحب زادے اخلاق احمد و اشفاق احمد ہوئے۔ صاحب زادہ اخلاق احمد کا انتقال بہ عمر آٹھ سال اور اشفاق احمد کا بہ عمر ڈیڑھ سال مدینۂ منورہ ہی میں ہوگیا۔ ان بچوں کی والدہ کا انتقال بھی مدینۂ منورہ ہی میں ہوا۔ ان تینوں افراد کا انتقال اس زمانے میں ہوا جب کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحبؒ مالٹا میں اسیر تھے۔ ان اہلیہ کے انتقال کے بعد حضرت

شیخؒ کی تیسری شادی دوسری اہلیہ کی چھوٹی بہن سے ہوئی، جن سے دو بچے ہوئے۔ ایک صاحب زادہ عزیزم مولانا اسعد سلمہٗ اور دوسری صاحب زادی ماجدہ خاتون مرحومہ۔ ماجدہ خاتون کا انتقال بہ زمانہ صغر سنی سلہٹ میں ہوگیا۔ اسعد سلمہٗ کی پہلی شادی کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ دوسری شادی مولانا حمید الدین صاحب صدر مدرس مدرسہ عالیہ کلکتہ کی صاحب زادی بریرہ خاتون سے ہوئی۔

صاحب زادہ اسعد سلمہٗ کی والدہ ۱۳۵۵ھ (۱۹۳۶ء) میں انتقال فرما گئیں۔ ان کی قبر دیو بند ہی میں حضرت شیخ الاسلامؒ کی قبر کے پائتیں ہے۔ پھر حضرت شیخ الاسلامؒ کی چوتھی شادی حضرتؒ کے چچا زاد بھائی سید بشیر الدین صاحب مرحوم کی منجھلی لڑکی سے ہوئی، جن سے دو صاحب زادے عزیزم ارشد سلمہٗ اور عزیزم اسجد سلمہٗ اور پانچ صاحب زادیاں عزیزہ ریحانہ سلمہا، عزیزہ رخسانہ مرحومہ، عزیزہ عمرانہ سلمہا، عزیزہ صفوانہ سلمہا اور عزیزہ فرحانہ سلمہا ہوئیں۔ رخسانہ مرحومہ کا انتقال بہ عمر آٹھ سال ہوگیا۔ اس طرح حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ کے کل تین صاحب زادے اور چار صاحب زادیاں بحمد اللہ بہ قید حیات ہیں۔

زادهم الله مجداً وسعادةً في الدارين وطال بقاء هم.

صاحب زادہ عزیزم اسعد سلمہٗ نے دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی اور آج کل دارالعلوم ہی میں مدرس ہیں۔ موصوف بہت اچھے مقرر نیک اور صالح ہیں۔ مہمان نوازی، تواضع وانکسار اور اخلاق و ایثار میں اپنے والدؒ کے صحیح جانشین ہیں۔ موصوف اپنے والد سے بیعت ہیں اور اشغال باطنی میں حضرت شیخ الاسلامؒ کی زیر سرپرستی پوری جدوجہد کی۔ حضرت شیخؒ کے انتقال کے بعد شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مجاز حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوریؒ نے اور حضرت شیخؒ کے دیگر خلفا نے صاحب زادہ اسعد سلمہٗ کو بیعت کرنے کی اجازت دی۔

صاحب زادی عزیزہ ریحانہ سلمہا کی شادی عزیزم رشید الدین سلمہٗ ابن مولانا حمید الدین صاحب صدر مدرس مدرسہ عالیہ کلکتہ سے ہوئی، جن سے ایک صاحب زادے احمد سلمہٗ ہیں۔

صاحب زادے عزیزم ارشد سلمہٗ بہ عمر ۱۵ سال دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل

کر رہے ہیں۔ موصوف نے ۸ سال کی عمر میں حفظ قرآن پاک جناب مولانا قاری اصغر علی صاحب مدرس دارالعلوم دیوبند ومجاز حضرت شیخ الاسلامؒ سے ختم کیا۔ نہایت سعید و ہونہار ہیں۔ خوش قسمتی سے گزشتہ سال آسام میں ایک تراویح حضرتؒ کی موجودگی میں سنا چکے ہیں۔ ذکر قلبی اور وظائف سے ابھی سے لگاؤ ہے۔

تین صاحب زادیاں عزیزہ عمرانہ و عزیزہ صفوانہ و عزیزہ فرحانہ سلمہن اور ایک صاحب زادے عزیزم امجد سلمہٗ ابھی صغیر سن ہیں۔

حضرت شیخ الاسلامؒ کے چھوٹے بھائی جناب حاجی سید محمود احمد صاحب اس وقت مدینۂ منورہ میں صدر مجلس اوقاف اور بہت باثر ذی ثروت شخصیت ہیں۔ اس سے قبل گورنر مدینہ کی کیبنٹ کے ممبر اور مختلف سرکاری کمیٹیوں کے ممبر اور رجسٹرار و قاضی القضاۃ رہ چکے ہیں۔ مگر اب خرابی صحت اور دیگر مشاغل کی بنا پر تمام سرکاری کاموں سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ ان کے ایک صاحب زادے عزیزم سید حبیب صاحب اور تین صاحب زادیاں ہیں۔ تینوں صاحب زادیاں ابھی غیر شادی شدہ ہیں۔ صاحب زادہ سید حبیب کی شادی ہو چکی ہے، جن سے تین صاحب زادے نور چشم احمد، محمد و عرفان سلمہم اور دو صاحب زادیاں مریم و فائزہ سلمہما ہیں۔ ایک تیسری بچی بھی ابھی حال ہی میں ہوئی ہے۔ مگر اس کا نام نہیں معلوم ہو سکا۔ صاحب زادہ سید حبیب نہایت دانش مند، جفاکش اور قابل ہیں۔ موصوف عربی کے علاوہ ترکی اور اردو زبان بھی بہت اچھی طرح بولتے اور سمجھتے ہیں۔ حکومت سعودی عرب میں کافی اثر و رسوخ رکھتے ہیں۔ گورنر مدینہ کی کیبنٹ کے نیز دیگر سرکاری کمیٹیوں کے ممبر ہیں۔ بعض اوقات گورنر مدینہ کی عدم موجودگی میں گورنری کے فرائض انجام دیتے ہیں۔

حضرت شیخ الاسلامؒ کے سب سے چھوٹے بھائی مولانا سید جمیل احمد صاحب تھے، جنھوں نے صرف پچیس سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ عمر کی اس قلیل مدت میں مرحوم نے ترکی عربیہ کالج میں تعلیم پائی اور آخری امتحان میں سب سے اول آئے۔ حکومت ترکی نے مخصوص وظیفہ بھی دیا، مگر عمر نے وفا نہ کی۔

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ کے (جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے) صرف ایک بہن ریاض فاطمہ مرحومہ تھیں۔ ان کی شادی راقم الحروف کے حقیقی ماموں جناب سید

فاروق احمد صاحب ساکن ہنسور ضلع فیض آباد سے ہوئی تھی۔ جن سے دو لڑکیاں ہوئیں۔ مگر حاجی سید فاروق احمد صاحب کو مدینۂ منورہ میں اپنے وطن کی یاد نے ستایا اور وہ اپنے بیوی بچوں کو مدینۂ منورہ ہی میں چھوڑ کر اپنے وطن واپس چلے آئے۔ ان کے آنے کے بعد ان کی اہلیہ اور بچیوں کا انتقال ہو گیا۔

یہ حضرت شیخ الاسلام کے اخلاف اور صلبی اقارب کا تذکرہ تھا۔ اسلاف اور سلسلۂ نسب کے متعلق مولانا عزیز احمد صاحب کا مکتوب ملاحظہ فرمائیے، جو بہ طور تکملہ پیش کیا جا رہا ہے۔

محترم ومکرم زیدعنایتکم۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

حضرتؒ کے شجرۂ نسب کے بارے میں آں جناب نے تذکرہ فرمایا تھا، میں نے آکر اسعد میاں سے عرض کیا تو اسعد میاں نے نقش حیات کا وہ نسخہ دکھایا جو حضرتؒ کے پاس رہتا تھا۔ اس میں حضرتؒ نے صفحہ آخر پر خاندانی شجرۂ طریقت کے اختتام پر جو عبارت تھی اس پر ایک کاغذ چپکا کر ایک عبارت تحریر فرمائی ہے جس سے شجرۂ نسب پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ وہ عبارت بعینہٖ نقل کر کے خدمت میں روانہ کر رہا ہوں۔ نئی دنیا نے جو شجرہ شائع کیا ہے اس شجرۂ نسب کے ساتھ خاندانی شجرۂ طریقت کو مخلوط کر دیا ہے۔ حضرتؒ کی تحریر کردہ عبارت حسب ذیل ہے:

"یہ شجرہ شاہ نور الحق صاحب تک شجرۂ طریقت بھی ہے اور نسب نامہ بھی۔ مگر ان کے بعد کا نسب نامہ شجرۂ طریقت سے جدا ہوتا ہے۔ نسب نامہ اور دیگر احوال کی تفصیل حضرت شاہ ولایت احمد صاحب مرحوم لاہرپوری کی مساعی جمیلہ سے حسب ذیل حاصل ہوئی ہے، جس کے ہم نہایت شکر گذار ہیں۔ جزاہم اللہ خیر الجزاء

عہد سلطان مبارک شاہ جون پوری (یہ دوسرا بادشاہ جون پور کا تھا) ۸۰۲ھ لغایتہ ۸۰۴ھ اس کے مختصر عہد میں اکثر سادات مستقر خلافت جون پور میں تشریف لا کر بہ حصول علوفہ و جاگیر علیٰ قدر مراتب بادشاہ مرحوم سے مواضعات مفصلۂ ذیل میں مسکن گزیں ہوئے۔

مورثان سادات ٹانڈہ ضلع فیض آباد و سادات موسوی و سادات بچھوکر و سادات

ملوپور پرگنہ کادی پور ضلع سلطان پور و سادات وردے پور و سادات کمال پور تکنی و سادات منڈیا ہو پرگنہ خاص و سادات دیوگاؤں پرگنہ خاص۔

ذکر سادات ٹانڈہ:

سادات آں بسیار نجیب اندر و اکثر در قبایل ایشاں صاحب جاہ جلال بودہ اند۔ ودر سیادت ایشاں ہیچ شکے نیست۔ اور سادات بوی وخرسواں بھی نہایت صحیح النسب تھے۔ وصلت ومصاہرت ان کی سادات ٹانڈہ سے تھی۔ سادات ٹانڈہ وغیرہ حضرت سید احمد توختہ تمثال رسول (علیہ السلام) کے اولاد میں ہیں۔ اس طرح سید شاہ زید بن سید شاہ احمد زاہد بن سید شاہ حمزہ بن سید شاہ ابوبکر بن سید شاہ عمر بن سید شاہ محمد بن حضرت مخدوم سید شاہ احمد توختہ تمثال رسول (علیہ السلام) بن سید علی بن سید حسین بن سید محمد مدنی المعروف سید ناصر ترمذی بن سید حسین بن سید موسیٰ حمصہ بن سید علی بن سید حسین اصغر بن حضرت امام علی زین العابدین علی جدہٗ وعلیہم السلام۔ سید محمد مدنی عرف سید ناصر ترمذ تشریف لائے اور ان کی اولاد سے حضرت مخدوم سید احمد توختہ تمثال رسول (علیہ السلام) لاہور تشریف لائے اور ۶۰۲ھ میں وصال ہوا۔ لاہور میں مزار ہے۔ ان کی اولاد میں سے سید شاہ زید بن سید شاہ احمد زاہد مورث سادات ٹانڈہ وغیرہ کے ہیں۔ ان کی اولاد میں سے ایک بزرگ سید شاہ عبدالوہاب قدس سرہٗ کا مزار بہ مقام شاہ دہورا متصل جون پور ہے۔ ان کی ایک کرامت یہ تھی کہ ان کے مکان کے سامنے سے جس کسی کافر کا جنازہ نکلتا تھا تو پھر جل نہ سکتا تھا۔ یہ بزرگ چشتی تھے۔ حضرت سید احمد توختہ تمثال رسول (علیہ السلام) کے کوئی اوپر کے اجداد سے حضرت سلطان الطائفہ جنید بغدادی قدس سرہٗ کے خلیفہ تھے۔ ان کو حضرت نے دعا دی تھی کہ تمہاری نسل میں بہ کثرت اولیاء اللہ ہوں گے اور ہمیشہ ایک قطب ہوا کرے گا۔

نوٹ: توختہ ترکی لفظ ہے، اس کے معنی بہت دیر تک کھڑا رہنا ہے۔ ان کے پیرو مرشد نے آپ کو اندر حجرے میں بلایا اور ذکر وشغل میں مشغول ہوگئے، آپ جب حجرے میں جانے لگے تو حجرہ اندر سے بند پایا۔ آپ اس کی دہلیز پر کھڑے ہوگئے اور رات بھر کھڑے رہے۔ علی الصباح جب شیخ نے حجرہ کھولا تو آپ کو کھڑا دیکھ کر توختہ کا لقب عنایت فرمایا۔ اور تمثال کی وجہ یہ ہے کہ آپ کے ہم عصر کسی بزرگ نے واقعہ میں حضور نبی کریم صلی

اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اس زمانے میں حضور کی اولاد میں کوئی حضور کی شبیہ موجود ہے؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سید احمد تو ختہ کی زیارت کرو، وہ میرا ہم شبیہ ہے۔ اس کو دیکھا تو گویا کہ مجھ کو دیکھا۔ اسی لیے آپ تمثال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملقب ہوئے۔

حضرت مخدوم سید نور الحق چشتی ٹانڈوی قدس اللہ سرہٗ العزیز حضرت سید احمد تو ختہ تمثال رسول صلی اللہ علیہ وسلم (قدس اللہ سرہٗ) کی اولاد سے تھے اور وہ سید محمد مدنی المعروف بہ سید ناصر ترمذی کی اولاد سے تھے۔ اور وہ سید حسین اصغر ابن حضرت امام علی زین العابدین ابن شہید کربلا حضرت امام حسین علی جدہ وعلیہم السلام کی اولاد سے تھے، متفق علیہ نسابین ہے۔ (عمدۃ الطالب منبع الانساب، کنز الانساب، ائمۃ الہدیٰ، تاریخ آئینہ اودھ)

شاہ ولایت احمد صاحب موصوف تحریر فرماتے ہیں:

”بڑی محنت اور تحقیق سے جو حالات شجرۂ نسبی حضرت شیخ الاسلام ..... دریافت ہوئے وہ پیش کیے جاتے ہیں۔ افسوس کہ سید شاہ زید ابن سید شاہ احمد زاہد کے نیچے کا سلسلہ نہ دریافت ہو سکا۔“

(از: مولانا عزیز احمد صاحب قاسمی، فاضل دیوبند، بی اے جامعۂ ملیہ۔ ناظم شعبۂ تبلیغ دار العلوم دیوبند)